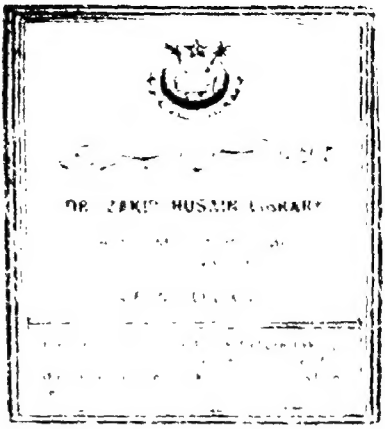

Ref DUE DATE

Cl. No. 810.5 Acc. No 42905
166T4

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

18 AUG 2006

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

طنز و مزاح نمبر

۷۱، ۷۲

جنوری، فروری ۱۹۵۹ء

مرتب

محمد طفیل

فی پرچہ
دس روپے

زرِ سالانہ
بیس روپے

ادارہ فروغِ اردو لاہور

ترتیب

مدیر — محمد طفیل ، ۷

مقالے

۱ — ہنسنے کی بنیاد اور اس کی اہمیت — ڈاکٹر سید اعجاز حسین ، ۱۱
۲ — طنز و مزاح — ڈاکٹر خورشید الاسلام ، ۱۷
۳ — طنز و مزاح نگاری — ڈاکٹر وزیر آغا ، ۲۵
۴ — اردو ادب میں طنز و ظرافت — پروفیسر محمد الدین احمد ، ۴۹
۵ — اردو شاعری میں طنز — ڈاکٹر شوکت سبزواری ، ۸۵
۶ — ہجو گوئی کی تاریخ — قاضی عبدالصمد ، ۹۶
۷ — پیروڈی اردو ادب میں — ظفر احمد صدیقی ، ۱۱۳
۸ — فارسی ادب میں طنز و مزاح — پروفیسر علم الدین سالک ، ۱۲۲

دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

۱ — پروفنگ کا سفر — (انگریزی) ۱۴۹
۲ — کینڈائیڈ — (فرانسیسی) ۱۶۰
۳ — تعریفات — (فارسی) ۱۷۳
۴ — کتا اور بلی — (روسی) ۱۷۷
۵ — آزادی تقریر — (چینی) ۱۸۴
۶ — ملا نصر الدین کا خلیفہ — (عربی) ۱۸۷
۷ — سہرا گدھا — (اطالوی) ۱۹۳
۸ — ڈان کوکزوٹ — (ہسپانوی) ۱۹۷
۹ — حکایات ملا نصیر الدین ہجی — (ترکی) ۲۰۴
۱۰ — ایک رات — (بنگالی) ۲۰۸
۱۱ — ہم لکھنؤ گئے — (ہندی) ۲۲۰

طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے

۱ — رفیق ہند — ۲۲۵
۲ — پنجاب پنچ — ۲۳۴
۳ — دہلی پنچ — ۲۳۶
۴ — مکھن لعل — ۲۴۰
۵ — ملا دوپیازہ — ۲۴۳
۶ — لاہور پنچ — ۲۴۵
۷ — جالندھر پنچ — ۲۴۷
۸ — بنارس پنچ — ۲۴۸
۹ — آگرہ پنچ — ۲۴۹
۱۰ — دکن پنچ — ۲۵۱

۳۶۸۹۶
یہ جا ب کرنی بشیر حسین

۱۰ — سویرے جو کل آنکھ میری کھلی — سعادت حسن منٹو ، ۶۰۹
۱۱ — ہم ایک مرثیہ خریدیں گے — احمد ندیم قاسمی ، ۶۱۴
۱۲ — وداع چاشنی والے — ابراہیم جلیس ، ۶۱۷
۱۳ — قصہ پہلے درویش کا — اے حمید ، ۶۲۳
۱۴ — چشم حسور بیت کی ایک دوپہر — فرقت کاکوروی ، ۶۲۹
۱۵ — نام میں کیا — احمد جمال پاشا ، ۶۳۷

اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر

اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر — محمد عبداللہ قریشی ، ۶۴۲
۱ — جعفر زٹلی — ۶۴۴
۲ — سودا — ۶۵۳
۳ — میر — ۶۵۸
۴ — انشا — ۶۶۵
۵ — مصحفی — ۶۷۵
۶ — رنگین — ۶۸۱
۷ — معروف — ۶۸۷
۸ — بقا — ۶۸۹
۹ — میر ضاحک — ۶۹۰
۱۰ — میر حسن دہلوی — ۶۹۲
۱۱ — کلمتان — ۶۹۳
۱۲ — حمد حمد شعرا — ۶۹۴
۱۳ — شاکر ناجی — ۶۹۶
۱۴ — نظیر اکبرآبادی — ۶۹۹
۱۵ — تائب — ۷۱۵
۱۶ — بیگم — ۷۱۶
۱۷ — عشرت — ۷۱۷
۱۸ — محسن دہلوی — ۷۱۷
۱۹ — اکبر الہ آبادی — ۷۲۲
۲۰ — شبلی — ۷۴۱
۲۱ — حالی — ۷۴۹
۲۲ — ریاض خیرآبادی — ۷۵۸
۲۳ — اقبال — ۷۶۷
۲۴ — غلام علی خاں — ۷۷۸
۲۵ — فوق — ۷۸۴
۲۶ — جوشش عظیم آبادی — ۷۹۱
۲۷ — ظریف لکھنوی — ۷۹۶
۲۸ — تمنا بیمسہ ندوی — ۸۰۳
۲۹ — جوشش عظیم آبادی — ۸۲۷
۳۰ — شاد عارفی — ۸۱۰

۳۱	چراغ حسن حسرت	۸۱۴
۳۲	مجید لاہوری	۸۱۶
۳۳	حمیدہ بیگم کاشمیری	۸۲۰
۳۴	خضر تمیمی	۸۲۶
۳۵	عاشق محمد غوری	۸۳۳
۳۶	اکبر لاہوری	۸۳۷
۳۷	نازش رضوی	۸۴۱
۳۸	پنڈت ہری چند اختر	۸۴۳
۳۹	سید محمد جعفری	۸۴۵
۴۰	ظریف جبلپوری	۸۴۹
۴۱	ضمیر جعفری	۸۵۲
۴۲	فرقت کاکوروی	۸۵۳
۴۳	راجہ مہدی علی خاں	۸۵۴

مزاحیہ کردار

۱	خوجی	رتن ناتھ سرشار، ۸۵۷
۲	حاجی بغلول	منشی سجاد حسین، ۸۶۱
۳	چچا چھکن	امتیاز علی تاج، ۸۶۵
۴	مرزا جی	ایم۔ سلیم، ۸۶۸
۵	قاضی جی	شوکت تھانوی، ۸۷۱

مزاحیہ کالم

۱	ہمدرد	محمد علی جوہر، ۸۷۵
	زمیندار	ظفر علی خاں، ۸۸۰
	انقلاب	عبدالمجید سالک، ۸۸۲
	صدق	عبدالماجد دریابادی، ۸۹۲
	امروز	چراغ حسن حسرت، ۸۸۷
	نوائے وقت	؟ ۸۹۵
	امروز	احمد ندیم قاسمی، ۸۹۹
	چٹان	؟ ۹۰۳
	نکدان	مجید لاہوری، ۹۰۶

لطائف

اردو ادیبوں کے لطیف لطائف — شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

غالب، سرسید احمد خاں، وحید الدین سلیم، ذوق، ناسخ، انشا، سودا، فغاں، داغ، یگانہ، اقبال، میر حسن، فیض الحسن سہارنپوری، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولوی عبدالحق۔ اکبر الہ آبادی، عشرت لکھنوی، ریاض خیرآبادی اور ابوالکلام آزاد

محمد طفیل ایڈیٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارۂ فروغ اردو ایبک روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

میں اپنی اس نا پیرگوشش کو پیارے مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں جن کی زندگی کا آغاز اب ہوا ہے
محمد خلیل

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
طلوع

خاکساری برتتے برتتے بال سفید ہو گئے ہیں۔ کسی نے کہا "خوب میں آپکے نمبر" تو ہم مائے انکسار کے کہتے ہیں "اچھا کس قابل ہیں؟" سوفیصد جھوٹ بولتے بولتے یہ دن آ گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کرتی ہوں اب لاکھ برخود غلط کہے ہم بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیں ——"جی ہاں! ہم نے خوب نمبر نکالے ہیں"

تکلف سے یا اس نہیں رہا تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم کسی ایسی بات میں پکڑے جائیں جس پر سچ ہی سچ کا اطلاق ہوا ورنہ سے سچی بات ہی کوئی نہ ہو۔ ہم اپنے نمبروں کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ ہم نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ کہنا ہے تو صرف یہ کہ —— اب تک کسی نے کیا نہیں۔

اچھے رسالوں نے بے تک اچھے نمبر نکالے ہیں مگر ان کے موضوعات محدود رہے، جیسے کسی ایک شاعر پر، ایک ادیب پر، یا پھر کسی بھی مختصر سے موضوع پر۔ اس کام کی افادیت سے انکار مجھے بھی نہیں مگر یوں کسی ایک بڑے موضوع کو چن کر اُسے شیشے میں کسی نے نہیں اتارا۔

اقرار کرتے ہی چلیں تاکہ یہ الزام عائد نہ ہو کہ ہم کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ نگار، مخزن، اوبی دنیا، نیرنگِ خیال، ہمایوں، ساقی، عالمگیر اور ادب لطیف نے اپنی اپنی جوانی میں کام کے نمبر نکالے ہیں اور ان سب کا باوا آدم ہے نگار —— یہ ہماری رائے ہے —— آپ کو اختیار ہے مانیں نہ مانیں —— ان میں سے اگر کسی سے ڈر لگتا بھی ہے تو مدیر نکالنے ہی سے ممکن ہے وہ یہ کہہ دیں کہ نکالیے تو جناب! آپ نے سرے پار یہ کیسے کون کون سے نمبر نکالے ہیں ——؟

بزعمِ خود یہ نمبر بھی ایک طرح سے طنز و مزاح کی تاریخ ہے۔ جب سے اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا اس وقت سے لے کر اس کی جوانی تک کا نام کچا چٹھا —— کچا چٹھا کا لفظ زیادہ تر ہمیں سودا، حجرات، رنگین، انشاء اور مصحفی کے سالانہ کچی گوشوارہ کی وجہ سے لکھنا پڑا ہے ورنہ یہ موضوع بہ ذات خود شہ لیغارہ بھی ہے اور صحت بخش بھی۔

طنز و مزاحیہ چیزیں پڑھتے پڑھتے خواہ مخواہ کچھ شوخ قسم کے فقرے قلم کی زبان پر آ گئے ہیں ورنہ مجھ ایسا انکسار مآب یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہیں ہوا۔ ہاں اتنی دعا آپ بھی کریں کہ میں اُن موضوعات پر بھی کام کر سکوں جن کے لیے میرا دل انگڑائیاں لیتا رہتا ہے تاکہ اس وقت کی جھوٹی بات کل کلاں کو سچی ہو جائے۔

جب سے دنیا بنی ہے پریشانیوں سے چھٹکارا کوئی نہیں پا سکا۔ بادشاہ ہو تو، فقیر ہو تو، وزیر ہو تو، غریب ہو تو، کوئی سلطنت کے عشق میں

مقاما کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ازل سے چلا آتا ہے اور تا ابد چلتا رہے گا۔ ایسے میں انسان اگر اپنے لیے تھوڑی سی خوشی کے چند لمحے بھی نہ نکال سکتا تو پھر کیا ہوتا۔ سوچیے اور خوش ہوئیے گا۔

جملہ سے یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث پٹڑ بقراطیہ قسم کی باتیں چھوڑ کر اصل موضوع پر آجائیں ورنہ کہیں واقعی دو بات نہ ہو جائے جو اہل قلم کہتے ہیں۔

پہلے جناب یونس احمر خان کے مضمون سے بات نکل چلی ہے۔ اب اس کی ترتیب کے بارے میں سب دوست جلدی جلدی باتیں سن لیں اور یہیں چھٹی دیں۔

۱۔ مضامین ۔ اس عنوان کے تحت اب تک جتنے بھی کارآمد مضمون چھپے تھے وہ سب برآمد کیے۔ جو گوشے شہ نشین پر تھے سجا دیے گئے۔ اب بہ مضمون نکل ہے کہ اس موضوع پر اس سے بھی زیادہ کیا ہوتا۔ اس حقہ میں کلیم الدین احمد جیسے پڑھے لکھے انتہا پسند بھی ہیں (جو میں نہ مانوں) میں نہ مانوں کی تنبیہ کیے امار ہیں) ڈاکٹر خورشید الاسلام اپنے نکتہ شناسی بھی اور ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے معتدل پسندی بھی اور پروفیسر محمد الدین سالک ایسے عالم بھی۔ غرض اس حقہ میں جتنے بھی تمباکو کار ہیں انھوں نے اس موضوع کو پانی کر دیا ہے۔ واقعی ہے ہم نے پانی چھوڑا ہے نہیں کہا۔

۲۔ دنیا کی بڑی زبانوں کا طنزیہ و مزاحیہ ادب ۔ ہمارے بعض مزاح نگار بدنام ہیں کہ انھوں نے فلاں انگریز مصنف کا زجمہ اپنے نام سے کر ڈالا۔ فلاں نے فلاں فرانسیسی ادیب کی تخلیق کو اپنے الفاظ میں ڈھال دیا۔ فلاں فارسی کے مصنف کا لفظی ترجمہ فلاں صاحب نے کر ڈالا۔ یہ باتیں بھی ہیں اور بھونڈی اس بحث میں خواہ مخواہ الجھ کر کیوں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی ٹھانیں۔ ہمیں یہ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ انگریزی و فارسی کا ادب و مزاح نگاری پر بڑا اثر ہے۔ بڑا اثر ہے ——— ہمارے ادیب ان زبانوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تحریری فارسی اور ورڈ اسپیسی کے علاوہ دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے بھی نمائندہ چیزیں پیش کر دیے ہیں تاکہ یہ تازہ ہم پس منظر کا کام دیں یا نہ دیں دنیا کے طنز و مزاحیہ ادب کا تقابلی سا نقشہ سامنے آجائے۔

۳۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ابتدائی نمونے ۔ یوں تو مزاح سے لے کر اب تک سینکڑوں ہی مزاحیہ پرچے نکلے ہیں بلکہ ایک علامہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اردو پنچ سے بھی پہلے ٹرخ سو سے زیادہ پنچ اخبار نکلا کرتے تھے۔ بہرحال ہم نے بھی محنت سے کچھ ابتدائی نمونے اکٹھے کیے ہیں۔ اس سے پس منظر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے پہل نثر میں کس معیار کی چیزیں لکھی جاتی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو نمونے اودھ پنچ سے پہلے کے ہیں کچھ اسی دور کے۔

۴۔ اودھ پنچ کا دور ۔ اودھ پنچ سے اردو مزاح نگاری کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس معیار کا مزاحیہ پرچہ تھا اس معیار اور انداز کا کوئی دوسرا پرچہ اب تک نہیں نکلا۔ اس پرچے کا کارنامہ لوگوں کو صرف ہنسنا ہنسانا ہی نہیں تھا بلکہ اسی اعتبار سے بھی بیدار کرنا تھا۔ ہمارے نزدیک تو اس پرچے کا زیادہ تر مقصد سیاسی بیداری ہی تھا مگر اس نے آڑ میں طنز و ظرافت کی۔ اودھ پنچ کے اب تک جتنے انتخابات چھپے ہیں ہم نے ان سے مدد لی۔ اس کے علاوہ خود بھی اودھ پنچ کی فائلوں میں غوطہ زن رہے۔ ہمارے اس انتخاب میں دوسرے انتخابات سے زیادہ مواد ملے گا اور یہ مختلف ہم نے انتخاب ہی انتخاب پر زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس پر کہ معلوم ہو سکے کہ اس پرچے کا عام معیار اور انداز کیا تھا اور اس میں کیا کچھ چھپتا تھا۔ اس کی کوہارے علاوہ اب تک کسی نے پروا نہیں کیا ——— اس اخبار کے بارے میں اودھ پنچ ہی کے شاعر کا کہنا یہ بھی ہے ؎

مزا عجب ہے کچھ اس پرچے میں کہ صورت طفل ——— جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال

۵۔ فتنہ اور عطر فتنہ ۔ یہ پرچے نیاض خیر آبادی نے نکالے اور اودھ پنچ کے زمانے ہی میں نکالے۔ یہ پرچے اودھ پنچ کی ٹکر کے تو نہ تھے مگر نیاض

کی شگفتہ بیانیوں نے بھی کی حیثیت کو منوا ہی لیا۔ اودھ پنچ کے ساتھ تو مکھتے عالموں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی اس کی حیثیت بھی تھی ورنہ اکیلے سجاد حسین کیا کر لیتے مگر اودھ پنچ اور ریاض اکیلے ہی تھے۔ ان پرچوں کے بارے میں بھی ہماری یہی کوشش ہے کہ ان پرچوں کے اقتباسات سے زیادہ اس پرچے کے عام معیار اور روش کا اندازہ ہو سکے۔ بہرحال طنز و مزاح کے مسئلے میں ان پرچوں کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا ——— جب خطہ صورت ریاض نے اپنے آپ کو بھی نہ بخشا ہو تو اوروں کی تو بات ہی جانے دیں۔ اگر آپ نے ریاض کی تصویر دیکھی ہے تو پھر ان کا یہ شعر بھی دیکھیے ؎

بڑے یک طینت، بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں

۶۔ شیرازہ۔ اودھ پنچ سے زیادہ سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ تھا اور عطر تھا، عطر تھا تو شیرازہ سے زیادہ شیرازہ میں۔ چراغ حسن حسرت جیسے باغ نظر اور بذلہ سنج اس کے مدیر تھے۔ یہ پرچہ اودھ پنچ کے کوئی نصف صدی کے بعد نکلا۔ آتا کھارا اور باکمال کچھ تو ریاض تھے نے اور کچھ حسرت صاحب کی جغرافیت نے۔ اس پرچے میں زیادہ تر حسرت صاحب ہی چھائے رہے۔ اگر فقہ، عطر فقہ ریاض کی وجہ سے مقبول ہوا تو شیرازہ حسرت صاحب کی وجہ سے۔ بہرحال اسے یہ امتیاز ضرور حاصل رہا کہ اس کی ہر بات میں وقار اور اس کی ہر چیز میں فنی اور علمی شان تھی۔ حسرت صاحب نثار کی حیثیت ہی سے زیادہ ابھرے مگر جب کبھی وہ نظم میں کچھ کہہ گئے ہیں تو وہ بھی مزے کی چیز ہو گئی۔ شگفتہ اتحاد پارٹی کی شان میں ؎

تیرے گورے گورے گال ——— اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال ——— وغیرہ

۷۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کا دور۔ جس ادیب نے بھی نثر میں لکھا ہے اس کے ہاں ڈھنڈھورے سے شگفتہ، طنزیہ اور مزاحیہ چیزیں مل ہی جاتی ہیں جب صوبہ پنجاب علامہ راشد الخیری کے ہاں بھی اس نوع کی چیزیں مل جاتی ہیں تو پھر بھلا اور کون پیچھے رہا ہوگا۔ ہم نے اس سلسلے کو خواجہ شمس الدین کے سپرد کیا ہے اور یہ چاہا ہے کہ جن کی تحریروں میں اس موضوع سے متعلق نمایاں حصہ ہر صورت اٹھا کر دیا جائے۔ اس حصے میں بڑے بڑے ادیبوں کے نام سامنے آتے ہیں مگر سب کے سب باقاعدہ قسم کے طنز نگار یا مزاح نگار نہ تھے تاہم ان میں سے کچھ کو چھوڑ دینے سے تو اس موضوع کی ارتقائی کڑیاں ملانے میں دشواری ہوتی۔ بہرحال اس حصے میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تبرک نہیں ہے کام کی چیزیں ہیں۔ انہی سے بعد کے مزاح نگاروں کو نئی راہیں ملی ہیں۔

۸۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زریں دور۔ ہم چونکہ خود اس دور سے گذر رہے ہیں، یہی وجہ ہے شاید کہ ہم اپنے سے پہلے دور ہی کو طنزیہ و مزاحیہ ادب کا زریں دور سمجھتے ہیں۔ جب اس دور میں پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج اور شوکت تھانوی ہوں تو ہم کیوں نہ اس دور کو زریں دور کہیں۔ یہ حصہ پطرس سے شروع ہو کر زمانہ حال کے لکھنے والوں تک آ جاتا ہے۔

۹۔ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر۔ حصہ نظم کے بارے میں فاضل مقالہ نگار محمد عبداللہ قریشی نے ابتدا ہی میں اس کی ترتیب کے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے اس لیے میں چپ بھی رہوں جب بھی حرج کچھ نہیں۔ اردو نثر سے پہلے اردو نظم میں ہی طنزیہ و مزاحیہ چیزیں ملتی ہیں

آخر میں ہم جو شاعروں سے گلا کرتے تھے وہ سب ہم پیش کر دیتے تو ڈر یہ تھا کہ بعض مستطیعین قسم کھا کر دست کش ہو جاتے "بائیس شاعر مجھے بدمعاش لگتے ہیں" ہم نے کئی اداکاروں شبانہ اور فرشتوں سے اس حقیقت کو بھایا ہے، پھر زنانہ حمائی کے شاعروں سے زیادہ مردم شمار پر پوری مجبوری۔ موجودہ شمارہ پر خیر جانبداری سے کام کرنے کا یہ موقع ہے لیکن نہیں کہ ہم بڑی محبل باتیں کرتے ——— آخر میں اس حقے کے بارے میں یہ بات اور سن لیجئے ——— خوب ہے یہ چیز!

۱۔ مزاحیہ کردار۔ جب تک کوئی بڑا لکھنے والا نہ ہو وہ کسی کردار کو زندہ جاوید بنا ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں مزاح نگار پیدا ہو کے مگر وہ سینکڑوں زندہ کردار نہ دے سکے کہنے کو تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ زیادہ سے زیادہ چھ سات کردار پیش کر سکتے ہیں جیسے خوجی، حاجی بغلول، چاچا چکن، سیزادی اور قاضی جی، بس! ——— مجھے یہ ہمدردی نہ کئی کرداروں کو روشناس کرانا چاہا مگر وہ زیادہ کردار روشناس کرانے کی دھن میں مارے گئے۔

۲۔ مزاحیہ کالم۔ شروع سے لے کر اب تک اخباروں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اس کا ایک کالم تو ضرور مزاحیہ ہو۔ بے شمار اخبار نکلے بیشمار ہی مزاحیہ کالم لکھے گئے۔ اگر ان سب کے مزاحیہ کالموں کو یہاں درج کر دیتے تو وہ بھی ہزاروں صفحوں میں پھیلتے۔ ہم نے صرف چند فیاض اخباروں کے مزاحیہ کالموں کو یہاں جگہ دی ہے۔ یہاں ایک بات کہنے کی ہے کہ نکموں نکموں کو تو جگہ ملی نہ ہوگی وہ یہ کہ یکا لڑے سے اور اب بھی لکھتے رہے ہیں۔ ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی نہ ہے۔

۱۲۔ ادیبوں کے لطائف۔ یہ موضوع بھی بڑا مزا چڑا ہے مگر فاضل مضمون نگار شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے فرمایا میں ادیبوں کے اچھے اچھے لطیفے جمع کر دیے ہیں۔ اگر ہمارا پرچہ پہلے ہی زیادہ ضخیم نہ ہو جاتا تو اس موضوع پر اور بھی کچھ پیش کرتے۔

آخر میں مجھے ان چیزوں کے انتخاب کے بارے میں یہ اعتراف کرنا ہے کہ یہ ضرور غلط نہیں ہے کہ میں نے بہتی چیز چنی ہوں، وہ سب اس موضوع پر لکھنے والوں کی شاہکار ہی ہوں میں نے انھیں صرف اپنی عینک سے دیکھا ہے ——— اگر میری عینک کا نمبر ٹھیک نہیں ہے تو اس پر آپ بے شک ماتم کریں ——— بہرحال یہ چیزیں مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند ضرور ہیں۔ پسند کے علاوہ ایک مجبوری کو اور بھی پیش نظر رکھا جائے۔ وہ یہ کہ بعض لکھنے والوں کی سب تحریرات میرے سامنے نہ تھیں۔ ایسا ممکن بھی نہ تھا۔ اللہ کی شان! یوں ٹھوکر کھانا بھی میری ہی ناقصیوں میں شمار ہوگا۔

کچھ نام ایسے ضرور نکل آئیں گے جن کا اس نمبر میں آنا ضروری ہو گئیں کیا کروں اس نمبر کی ضخامت کے ہاتھوں مجبور ہوں صورتِ میں بھی پریشان ہوں جب تو اور پریشان ہوتا ——— اور تو اور میں نے خود اس نمبر کے لیے ایک بڑا سرکتہ الآرا "مضمون لکھا تھا مگر وہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے رکھا پڑا رہ گیا ——— پنجابی میں ایک مثل ہے "ملاح دا مُنہ سدا ای سُکا ہے"[1]

محمد طفیل

---

[1] ملاح کا منہ پانی سے محروم ہی رہتا ہے

ادارۂ نقوش، "پطرس کی یاد" میں آئندہ شمارہ پیش کرے گا

ہنسنے کی ابتدا اور اہمیت

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

قدرت کا رسم سمجھیے یا دستور کہ ہر آدمی رونے یا ہنسنے پر مجبور ہے۔ زندگی کے یہ دونوں اٹل مسکہ ضروری ہیں، ان دونوں کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلے کون پیدا ہوا اور بعد میں کون؟ اس کا فیصلہ کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ زیادہ تر تو لوگوں نے جھگڑے سے بچنے کے لیے مرغ و قند کی طرح کہہ دیا ہے کہ ؎

شادی و غم جہاں میں توام ہے

موضوع کے اعتبار سے فی الحال ہم اپنے لیے بھی یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ تقدیم و تاخیر کی بحث سے قطع نظر کر کے اہمیت پر غور کریں حالانکہ یہ گفتگو بھی الجھن اور دماغ ریزی کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن یہ عام خیال کہ رونے کے لیے بھی خوش دلی کی ضرورت ہے مسئلہ کو سلجھانے میں بڑی مدد کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر خوش دلی کے گریہ و بکا بھی شنیدہ و دیدہ ہوا ہے اور اندازہ بھی یہی ہوتا ہے کہ دنیا زیادہ تر خوشی کی طالب ہے۔ ہنسنے کے مقابلے میں رونے سے گریز کرتی ہے اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جذبات کے لحاظ سے ہنسنے کی اہمیت زیادہ اور اتنی عظیم ہے کہ اگر خوشی دنیا سے اٹھ جائے تو غالباً عمل عالم کو چھانٹنے میں فرشتوں کو بھی تکلف ہو۔ انسان کا جینا دوبھر ہو جائے اور خدا جانے کیا کیا ہو جائے۔

ہنسنے کی اہمیت مسلّمان کر آیئے اس پر غور کریں کہ اس کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم کو اس دور کی زندگی پر نظر ڈالنی ہوگی جس کی تاریخ پر ناواقفیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ بقول مومن ؎

یا وہ ایام کہ بے رنگ تھی تصویر جہاں　　دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں

انسانی حالات و واقعات پردۂ خفا میں ہیں۔ قیاس و خیال آرائی کے سوا کوئی تحریری ثبوت نظر نہیں آتا مگر یہ خیال آرائی بے بنیاد نہیں، اس کے پس پشت عقل و نفسیات کا شاخسانہ بھی ہے چنانچہ بغیر تاریخ و تحریر کے بھی یہ بات قابلِ قبول نظر آتی ہے کہ ہنسنے کی ابتدا آدمی نے اس وقت کی جب وہ تہذیب و تمدن سے بیگانہ تھا۔ ہنوز وہ عہدِ حجری میں بھی قدم نہ رکھ سکا تھا۔ بال و ناخن بڑھائے لحیم شحیم پیکر کے ساتھ بغیر غار و گاہ کے جنگل جنگل قلاشی معاش میں پھرتا تھا اپنی حفاظت کے لیے برّی و باراں سے لڑتا تھا، ہو تو خوار رہا تو رہا سے مقابلہ کرتا تھا، اپنے ہم جنسوں سے بھی نبرد آزما ہوتا تھا اور جب کبھی پرخچے اڑاتا تھا تو چاہے اس کے پاس معنی خیز الفاظ نہ ہوں

لہ اس مضمون کی تیاری میں مغرب کے بعض ممتاز مصنفین خصوصاً برگساں، جیمس سلی البرٹ ملر وغیرہ کے خیالات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

یاد رہے جوں وہ خوشی سے ہنسنے لگا تھا اور بازی جیت کر شرمندہ مغلوب اور اپنے کو غالب دیکھ کر شادمانی کے ساتھ زور زور سے ہنسنا شروع کیا تھا۔ اسی طرح ہر ترقی کے نشہ میں سرشار ہو کر پوری قضا کو شاداں و خنداں محسوس کرتا تھا۔ خود بھی ہنستا اور وہ سروں کو بھی ہنساتا اور اسے راہ و رسم ترقی کا وصف پاتا۔

اس ہنسی کے پیدا ہونے خود بخود یا بقول "تھیوفریسٹس" وغیرہ کے ٹھیلے بدذات ہونے کو ہنسنے کی ابتدا کہا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہنسی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انسان نے اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھا۔ اس کی طرف "حاشر" نے اشارہ کیا ہے۔ ہنسی کی تہذیب کی جس طرح وحشی یا نیم وحشی گروہوں کو رفتہ رفتہ انسان نے محنت کرکے کارآمد خوبصورت بنایا اسی طرح اس وحشیانہ فعل کو بھی مدتوں کے یا نی سے صاف کرکے ایک چیز بنا دیا۔ ہر مہذب سوسائٹی کے لیے ہنسنا ہنسانا ضروری سا ہو گیا یہاں تک کہ زندگی میں اس کی پسندیدگی کا باعث ہوا چنانچہ "مزاح الموئین" ایک مخصوص و قبول و تہذیب و ذکاوت کی علامت سمجھی گئی۔

ہنسنے کے ارتقاء میں جو کچھ انسان نے محنت کی وہ تمدن کا قابل قدر کارنامہ ہے لیکن اگر ہنسی میں ذات خود ترقی کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اس کی گیرائی اس پایہ کی نہ ہو سکتی کہ اس کو آدمی کا جوہر خاص سمجھا جاتا اور دوسرے مخلوق سے تمیز کرنے میں انسان کی شناخت بیان کی جاتی۔ یہ وہ حیوانِ ناطق نہیں بلکہ حیوانِ خندہ بھی ہے۔ علاوہ اور خصوصیات کے ہنسی ایک قسم تشدی کی صفت سے متصف بھی ہے کسی کو ہنستے دیکھ کر دوسرا شخص بھی ہنسنے لگتا ہے۔ اس ہنسی میں کچھ دیر کے لیے سامع خود دنیا بھول جاتا۔ ذہنی خلفشار کی شدت خود بخود محو ہو جاتی۔ کشاکش سے نجات کا احساس ہوتا جو کچھ دیر کی ہنسی اس کو ایک ایسی تازگی بخش دیتی کہ وہ دنیا کو برداشت کرنے کی از سر نو قوت آجاتی۔ وہ پرانی الجھنوں کو حال کی ذہنی مسرت سے تقریب قریب مردانہ وار برداشت کرنے کی طاقت محسوس کرتا۔

ہنسی ہنسنے کی بنیاد غیر متحس جذبات پر بھی کی گئی ہے اسی کے بطن سے ظرافت اور اس سے متعلق بذلہ اجزاء کی پیدائش بھی ہوتی رہی ہے۔ طنز، بذلہ سنجی، پھبتی، فقرے بازی وغیرہ سب اسی ہنسنے ہنسانے کی مختلف صورتیں یا علامتیں ہیں گویا ہنسنا ایک برگد کا درخت ہے جس کی جڑ پر یہ خود ایک درخت بن گئیں۔ سایہ کی لطافت و نزاکت کا مزا کرایا علم و ہیئت سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تمام تمدن و مہذب معاشرے کچھ دن اس کی چھاؤں میں آرام کر لینا ضروری تصور کرنے لگے لیکن باوجود نفاست و بلندی کی منزلیں طے کرنے کے اصل سے فروع کی نسبت باقی رہی۔ اس شگوفہ کے غنچہ پر دل آزاری شامل تھی وہ کسی نہ کسی نامناسب صورت میں غور کرنے پر اب بھی نظر آتی ہے۔ ظرافت کتنے ہی معصوم انداز میں کیے مگر عموماً کسی نہ کسی حالت سے ضرور متعلق رہتا ہے۔ ہنسنے والے کو خوش ہوتے دیکھ کر جس پر مذاق کا شبہ لگایا جاتا ہے اس کے دل سے پوچھیے تو باوجود ظاہری اظہار مسرت کے بہ باطن وہ رونا ہوگا گویا اس ترقی یافتہ صورت میں بھی ظرافت دل آزاری سے باز نہ آئی۔ اب یہ اور بات ہے کہ جارحانہ انداز نے ظرافت کا چہرہ بدل لیا ہو اور دل شکنی جمہوری شعور اور مذاق عام میں شدت محسوس نہ ہونے دے۔ دکھ درد کے باوجود مجروح شخص اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اپنے کو مجلسی ہونے کا ثبوت دے۔

ہنسی کی ابتدا جیسے بھی ہوئی ہو لیکن قرینہ یہ کہتا ہے کہ اس کا مائدہ اور بنیاد دونوں ارتقائی منازل میں متغیر ہوتے رہے۔ صرف دشمن کی کشت و خون سے فتح یابی ہنسی کا واحد سبب نہیں رہا بلکہ مختلف و متعدد وجوہات سے ہنسنے ہنسانے کا سرمایہ بنتے رہے اور یہ کہا گیا ہے اس کی بنیاد تضحیک و تذلیل پر قائم ہوئی لیکن رفتہ رفتہ نشوونما کے بعد میں ہنسنا اصلاح و تربیت کا ذریعہ بھی بن گیا۔ اکثر مقامات پر ہمدردی و بہی خواہی کی جھلک ہنسی میں نظر آنے لگی۔ اس ہنسی کو برقرار رکھنے کے لیے تقریر، تحریر، شکل، صورت، الفاظ، حرکات و سکنات وغیرہ کا سہارا لیا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ فنون لطیفہ کی حدیں داخل ہو گئیں چنانچہ طربیہ بن کر ڈرامہ کی جان بن گیا اور ادب کے محاسن میں شمار ہونے لگا۔

چنانچہ ہندستانی سنسکرت کے جس مشہور گرنتھ بلندی عطا کی اس کا تقاضا تھا کہ اس کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے ظرافت کو بھی وقتاً فوقتاً سانچے میں ڈھالا جائے۔ موقع و محل کے لحاظ سے الفاظ و لہجہ کا اس طرح پیش کرنا کہ مجلس ہنس پڑے اور بے ادبی کو درگزر کرتے ہوئے ہر محل سے سرسبز ہو جائے مستقل ایک فن بن گیا۔ واردہ ہیئت کے لحاظ سے مذاق کے مختلف پہلو ہو گئے۔ امتیازی خصوصیات کی بنا پر اہل علم نے ظرافت کو سمجھ بوجھ کر خانوں میں بانٹ دیا چنانچہ ہجو سے لے کر عزت تک اسی کی بکھری ہوئی حکایتیں ہیں۔ ان میں سے بعض اجزاء اپنے اصل سے زیادہ قریب ہیں یعنی ان کی سرشت میں اخلاقی سے زیادہ ملاّزاری ہے مثلاً ہجو، طنز، پھبتی وغیرہ ان کا مقصد کسی کو ذلیل کرنا ہوتا ہے برخلاف اس کے مزاح کے جو نظر زیادہ تر ہمدردی و اصلاح کا جذبہ ہوتا ہے۔ البرٹ مائیکل مزاح (HUMOR) کے سلسلے میں جو لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے[1]:

"مزاح کے تبسم میں ترحم شامل ہوتا ہے جس پر ہنسی کرتا ہے اس سے اس کو محبت ہو جاتی ہے۔"

یہی مصنف آگے چل کر کہتا ہے کہ مزاحیانہ ہنسی میں محبت کے جزو کو غالب ہونا چاہیے مگر کچھ مصنفین ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ مزاح بھی اپنے اصل کی خصوصیات سے برتر نہیں یعنی اس میں بھی کچھ نہ کچھ قابل گرفت خرابیاں موجود ہیں مثلاً اور کچھ ہو نہ مزاح میں احساس برتری کا جذبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ بہرحال صدیوں کی محنت و ترقی کے باوجود ظرافت میں کراہت کا پہلو شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جیسے جیسے انسانی تہذیب بڑھتی گئی سماج نے اپنے طور پر ظرافت کو حسب توفیق ایسی فن کاری سے سنوارا کہ اکثر اوقات وہ کراہت نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے مگر اس کے وجود سے انکار کلیتاً نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ جب اس کے تجزیہ میں خرابیاں موجود نہیں تو معاشرہ نے اس کو فائدہ رکھنے کی ہزارہا سال سے جدوجہد کیوں کی؟ اس کے وجود میں تھوڑی سی بھی کراہت تھی تو ختم کرنے کی فکر کیوں نہ کی گئی۔ غالباً اس میں فائدہ اتنا زیادہ ہے کہ نقصان کو بھلا دیا یا نظر انداز کر دیا گیا۔ آیئے ذرا مزید کے لیے اس کے فوائد پر بھی نظر کریں اور یہ بھی سوچیں کہ سماج میں اس کی پیدائش کے اسباب کیا ہیں اور ممکن ہو تو یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ فوائد جذباتی تصورات کے نتائج ہیں یا سماج کو ان سے دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے۔

سفر زندگی میں ہنسنا ہنسانا ایسا ہی ہے جیسا کڑی دھوپ کے بعد شجر سایہ دار کا میسر آجانا۔ یعنی غم جب لذت حیات کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے تو تھوڑی دیر کی خوش دلی از سر نو تازگی عطا کر دیتی ہے۔ نہ صرف سفر کی تکان دور ہو جاتی ہے بلکہ جن حادثات و واقعات کو بوجھ سمجھ کر راہرو اپنی زندگی سے پریشان تھا اس کو پھر ایک نئی قوت سے اٹھانے کی ہمت اپنے میں پاتا ہے۔ جتنی دیر وہ ہنسنے ہنسانے میں رہتا ہے اتنا وقت وہ روزمرہ کے غموں سے الگ ہو کر زندگی کی بھیانک تصویر کے بجائے اس کے حسین و دلکش رُخ کو دیکھتا ہے اور خوشی خوشی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے گویا اسے ایک ایسی مقوی دوا مل گئی جس کے سہارے وہ غم دوراں کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا ہے اس لیے کہ اس کو ایک تبدیلی مل جو بجائے خود چاہے تفریحی ہو مگر اس تفریح میں اور بھی لوگ شامل تھے جو کسی نہ کسی غم سے چھٹکارا حاصل کرنے یا زندگی کو زیادہ خوشگوار بنانے کی فکر میں تھے۔ وہ ان سب کو ہم جماعت اور ساتھی سمجھ کر تنہائی و کسمپرسی کے پنجہ سے اپنے کو آزاد پاتا ہے۔ سب کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی اپنے کو ہنسنے پر مائل پاتا ہے علاوہ اور باتوں کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہنسی بذاتہٖ ایک کشش ہے یا یوں سمجھیے کہ اس میں وہ مقناطیسی اثر ہے کہ دوسروں کو لے تحاشا اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ عام اس سے کہ سننے والا راز کو سمجھ کر ہنس رہا ہے یا بے سمجھے بوجھے شریک بزم ہو گیا ہے، دوسروں کو ہنستے دیکھ کر اس طرح ہنسنے لگتا ہے گویا سب کچھ سمجھ کر وہ صرف ہنسا ہی جاتا ہے۔ جملہ اہل محفل

---

[1] ORIGIN OF WIT AND HUMOR

ایک دوسرے کے پیچھے ہم خیال کہنے لگے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوش دلی جماعت میں بغیر امتیاز و اختلاف سب کے سب ہنسنے والے ایک دل ایک خیال ایک ساتھ ہیں۔ اس طرح گویا ہنسی میں متحد و منسلک کرنے کی بے نظیر صلاحیت ہے اس لحاظ سے ہنسنا فلاسفی طور پر مجلسی ہوا کہ ہنسنے والے متعدد ہونے کے باوجود بھی اتفاق و اتحاد کا ایک مستقل رابطہ بن جاتا ہے۔

ہنسنے کا دوسرا اجتماعی پہلو یہ ہے کہ ہنسی کی دل لگی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ہنسنا اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق اختلاف کا باعث ہے لہٰذا وہ غیر سماجی عمل ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دل آزاری کے پس پشت اصلاحی و تربیتی خصوصیات لیے کہ ہنسی آتی بھی عموماً ان ہی لوگوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے جو بر خود غلط یا گندم نما جو فروش ہوتے ہیں جس کی مثالیں آپ کو سودا کی ہجو سے لے کر اکبر کی ۔ اجی شاعری تک میں ملتی ہیں۔ اکبر ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اب کہاں تک بنگلے میں صرف ایماں کیجئے
تا کجا عشق بتاں میں سست پیماں کیجئے
ہے بھی بہتر علی گڈھ جا کے سیدے کہوں
مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

اکبر ایک زمانے تک سرسید کو بر خود غلط انسان سمجھتے تھے مگر ان کی خدمات کے قائل بھی تھے اس لیے ہمدردی بھی رکھنا چاہتے بھی تھے کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔

سودا کے زمانے میں ایک بر خود غلط مولوی نے حقت عرب کا فتویٰ دے دیا تھا سودا کہاں ضبط کر سکتے تھے ایک قصیدہ اس کی ہجو میں کہہ کر عوام و خواص کے سامنے پیش کر دیا۔ ایک بند اس قصیدہ کا یہ ہے ؎

بگڑا ہے آج مجھ سے یہ فیل ۔۔۔ تا لطیف پر لے کہ کھانا روا ہے چیل
کہتا ہے چاند خاں کیا کن نے عوام فیل ۔۔۔ حقت پہ مینڈکی کی میاں جی کی سودا سیل
اک سخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

اس طرز عمل پر جس کو بظاہر دل آزاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے حقیقتاً ایک غلط کار کی اصلاح کرنے کا بھی جذبہ ہوتا ہے دوسرے لوگوں کو متنبہ کرنے کا بھی خیال رہتا ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ نہ پکڑے۔ اس بات کو جب ہم سوچتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی دل آزاری جو اتنے فوائد پر مشتمل ہے اس خاموشی سے بہتر ہے جو کسی ایک فرد کو اور اس کی تقلید سے ایک بڑی جماعت کو نقصان پہنچانے والی ہے ——

ہنسی اور سماج کا تعلق ایک اور پہلو سے بھی نمایاں ہوتا ہے زندگی کے نقشہ میں جب کبھی نئے حالات، جدید رسوم یا فیشن نے رنگ آمیزی کی ہے تو ہنسنے نے سبقت آگے بڑھ کر حصہ لیا ہے اس نئے نئے باتوں کا مذاق اڑایا ہے، مخالفت میں قہقہے بلند کیے ہیں لوگوں کو کورانہ تقلید سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ڈاڑھی کے متعلق واہم نظریہ کو کہ انسان آدمی ہونے سے پہلے ارتقا کی منزلوں میں بندر ما ابتدا آمشق میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، تحریر و تقریر سے اس مسئلہ کی اتنی مخالفت نہ ہوئی ہوگی جتنا ہنس ہنس کر لوگوں نے آسمان کا

مذاق اڑایا چنانچہ اُنہوں نے کسی جلسے میں بڑے مزاح سے شاعر اکبر نے کہا ؎

ڈاڑھی صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے ۔۔۔ میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

نقل مذہب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں ۔۔۔ اور یہ نکتہ کہ میرا اصل ہے کیا بھول گئے

لکھنؤ ہے کہ یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر ہنسنے سے اتنے بڑے مسئلہ کی مخالفت کی گئی تو ہنسی کو جلسے مجلس کے غیر محلی کہنا چاہیے۔ بظاہر اعتراض صحیح ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہنسنے والے کی مصلحت جلسہ یا تحریک کی تذلیل یا مخالفت نہ تھی بلکہ اسکی حمایت یا اشاعت تھی وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اپنے علم الانسان یا انکشاف کو ہر شخص تک پہنچا دے اور اس کو اس کے لئے ہنسی سے بہتر کوئی ذریعہ نہ ملا۔ ہنسی کے ذریعہ سے بھی اگر کسی کو اپنا خیال پہنچا دیا تو مقصد حاصل ہو گیا۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ جب کوئی لباس یا فیشن یا خیال نیا پیدا ہوتا ہے تو سماج میں پہلے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے لیکن جب اس کو قبول عام کی سند مل جاتی ہے تو وہ اسی ہنسی بات کو جو ابتدا زمانہ سے بے جان ہو رہے ماحول میں نامانوس نظر آتی ہیں جن کی مخالفت میں پہلے اس نے ہنسی ہنسی کر تازہ وارد ان بساط دل کو رُلا دیا تھا اب اسی چیز کو مقبول و مروج ہو جانے پر ان کی موافقت میں وضع قطع خیال پہناؤ نشست صرف کرتا ہے گویا ہنسنا سماج کی ارتقا کا ایک سہارا بن کر چلتا ہے حسب ضرورت کبھی آگے رہتا ہے کبھی پیچھے مدحت دونوں پہلو اختیار کر لیتا ہے لیکن ہر حال میں معاشرہ کی اصلاح و تربیت پیش نظر رہتی ہے۔ معاشرے کی بہبود کے سلسلہ میں ہنسی کبھی بڑی کشمکش میں پڑ جاتی ہے جب رضا یا ارتقا سے وہ اس تعاون بھی آجاتی ہے جہاں سماج خود پیچ و تاب میں ہوتی ہے کہ اب کون سا راستہ اختیار کیا جاوے۔ آگے بڑھنے والے اشارہ کرتے ہیں کہ راہ راست جانے پر ہم ہے اور پیچھے والے اپنی طرف بلاتے ہیں کہ آباؤ اجداد کی بتائی ہوئی منزل پر ہم ہی ہیں، آگے بڑھنا خطرناک ہے تو وہاں پہنچنے کے لئے کہ آسانی سے ہنسنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اس ہی کشمکش کو اکبر نے بڑی خوبصورتی سے ایک مختصر مزاحیہ قطعہ میں پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر ۔۔۔ تو صاف کہتے ہیں سید کہ رنگ ہے میلا

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں ۔۔۔ خود اپنی قوم پہ پھبتی ہے شور واویلا

جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر ۔۔۔ زیادہ حد سے دریدے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

اِدھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی کچھ نہیں سکتے ۔۔۔ اُدھر یہ دُھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا

اِدھر ہے وسعت تدبیر و مصلحت ناپاک ۔۔۔ اِدھر ہے وحی ولایت کی ٹوک کا ٹیلا

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را ۔۔۔ بلائے صحبت لیلےٰ و فرقت لیلےٰ

بہرحال ہنسنا اور قوم کی ترقی کا ساتھ ہونا اور اس کی ساتھ ہے جہاں تقریر و تحریر کا عمل جاری نہیں ہو سکتا وہاں بھی اپنی جماعت و افراد کو ایک خاص راستہ پر قائم بنے کی تلقین ہنسی کرتی ہے۔ اس کا دائرہ اثر علمی دنیا سے وسیع ہے تقریر یا تحریر وہیں کام کر سکتی ہے جہاں پڑھے لکھے لوگ ہوں لیکن ہنسنا بے نیاز ہے کسی صحبت سے چاہے کسی گوشہ میں علم کی روشنی ہو یا نہ ہو ہنسنے والوں کو بھی اپنا جھنڈا گاڑ دیتا ہے۔ جاہل بلکہ جنگلی تباکل اس کا سہارا لیکر آگے بڑھتے رہے ہیں۔ ان کی معاشرت و تہذیب علم و تعلیم سے بیگانہ رہی ہے اپنی جماعت کو باپ دادا کے مذہبی رسوم وغیرہ قائم رکھتے ہیں۔ علاوہ اور محرکات کے ہنسنا بھی ان کے بہت کام آیا ہے سماج کی ترقی میں ہنسی کا ایک زبردست قوت رہی ہے چاہے طبقہ پڑھے لکھے لوگوں کا رہا ہو یا جاہل اور جنگلی افراد کا۔

یہاں تک ہنسنے اور سماج کے ربط کی بیان ہے جو ہمارے خیال سے شستہ و مکمل ہے اس لیے کہ جتنا خود مطالعہ کیا جاتا ہے معاشرہ اور ہنسی کے ارتباط کے بہت سے پہلو نکلتے آتے ہیں مگر وقت کی قلت کے ساتھ سامانہ کتابی دامن کا بھی گلہ ہے اور نہ شاید ہر ایک کی نگاہ میں کامل ہو سکے

چنانچہ اس ضمن میں متعدد جملے لفظاً نقل کر دیے گئے ہیں کیونکہ اگر وضاحت کے ساتھ پیش کیے جاتے تو ایک پوری کتاب کی ضخامت درکار ہوگی۔ اب اور باتوں کو چھوڑ کر یہ دیکھنا ہے کہ ہنسنے سے دماغی اور جسمانی فوائد بھی ہیں یا نہیں؟ کہا یہ جاتا ہے کہ ہنسنا صحت کے لیے مفید ہے اس سے دماغ و جسم پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس خیال کی تائید میں مختلف نظریے پیش کیے جاتے ہیں اور تجربہ کرنے سے دعوے کے بطلان کی صد سے عملی کر دیتی ہے اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں غور کرنا پڑے گا کہ ترددو کشمکش، غیظ و غضب اور خوف کے جذبات معدہ تک ہضم و طوبت پہنچانے والے غدود جس کمی کی انسان کو مختلف وسواس خناسی ہے۔ برخلاف اس کے ہنسنا ان تمام مخالف صحت جذبات کا زور توڑ کر دیتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ غدد لعابیہ حاسۂ پر صالح اجزا کے ساتھ معدہ تک پہنچ جاتی ہے۔ نشوونما کے راستے کر کے انسان کو صحت مند جسم و دماغ کا مالک بنا دیتی ہے ڈاکٹر جیمس کا کہنا ہے کہ:

"ہنسنا آپ کے ہاضمہ کی مالش کرتا ہے جس سے جگر، آنتیں وغیرہ سب متاثر ہو کر متحرک ہو جاتے ہیں پھیپھڑے کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے اس لیے بھی ان کی صحت خراب نہیں ہوتی ہے۔"

اسی ڈاکٹر کی رائے ہے کہ یہ مالش ایسے لوگوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے جو روٹھو صوب نہیں کرتے یا کاہل ہوتے ہیں لیکن ہنسنے میں جو مالش ہوتی ہے وہ سب ہی کے لیے مفید ہے کیونکہ یہ عضلہ کی راہ میں جو کاٹھ کی طرح پھیل رہتی ہیں ان کو نہ صرف صاف کر دیتی ہے بلکہ ان گوشوں تک صالح اجزا پہنچا دیتی ہے جو کسی وجہ سے اب تک محروم رہتے۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی ہنسنا اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف جسمانی فوائد حاصل ہوتے ہیں بلکہ دماغ کی بھی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ احساس کمتری بلند ہیں تبدیل کرنے کے لیے ہنسنا جتنا کارآمد ہے شاید ہی کوئی دوسرا طریقہ اتنا اثر کرتا ہو۔ ہنسنے کے بعد ایک بات یہ ہوتی ہے کہ نفس کہتا ہے کہ ہم احساس کمتری کا شکار نہیں اور اسی اعلان کے بعد سے ہی آپ اپنی عزت و وقار کا سہارا لے کر بھرپور اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ خوش گوار موقعوں کی تلاش خود داری کے احساس سے ہو جاتی ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے عالم میں شدید فرار و خود فریبی کی ذہنیت ہے لیکن یہ اعتراض صحیح ہو لیکن باوجود اس کے بھی نتیجہ اچھا ہوتا ہے ہنسنے سے احساس کمتری تو دور ہو جاتا ہے چاہے راستے اس نے کوئی بھی اختیار کیے ہوں۔ بقول غالب ؎

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اس سے بحث نہیں ہے کہ آپ میں احساس کمتری پیدا کرنے والے کو شکست ہوئی یا نہیں؟ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہنسنے ہنسانے میں آپ کا جذبۂ خود اعتمادی برقرار رہا آپ کے دل و دماغ کو مجہول و مرعوب ہونے سے اس نے بچا رکھا آپ کی انفرادیت کو ابھرنے کا موقع دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ خودداری کے ساتھ خطرناک راستوں سے بچتے ہوئے اپنے ارادوں اور حوصلوں کی جھیل میں آگے بڑھتے چلے گئے!

طنز و ظرافت

ڈاکٹر خورشید الاسلام

میرے لیے ایماں میں دل کشی ہے مگر میں کفر کو بُری نگاہ سے نہیں دیکھتا، عمل کرتا ہوں مگر کاہلی کو عزیز رکھتا ہوں۔ اپنے نفس کا احترام کرتا ہوں مگر آپ نشے میں ہوں تو آپ کی رفاقت کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے آپ کے ساتھ اور آپ پر قہقہہ لگانے میں کوئی تامل نہیں۔ مجھے اپنے ماحول سے محبت ہے لیکن میں اپنے ماحول پر حکمران نہیں ہوں۔ میں دنیا کی مسلّمہ قدروں کو نہیں مانتا مگر پھر بھی میری مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں۔ میں عام طور سے بزدل ہوں لیکن ہمت اور جوانمردی سے یکسر محروم بھی نہیں ہوں۔ یہ دونوں حالات پر منحصر ہیں۔ میں چور نہیں ہوں لیکن کبھی کبھار کوئی چیز چرا لینے میں بھی مجھے عار نہیں۔ میں زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہوں لیکن صراطِ مستقیم کے مقابلے میں پُرپیچ راہیں مجھے زیادہ پسند ہیں۔ میں جنوب کی سمت چلتا ہوں تو مجھے فوراً شمال کا خیال آتا ہے اور شمال کی طرف جاتا ہوں تو دفعتاً میرا رُخ جنوب کی طرف ہو جاتا ہے۔

"ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر"

کچھ اس قسم کے تضاد میری شخصیت کی سرشت میں ہیں۔ میں شیکسپیئر کا ظریف کردار فالسٹاف ہوں۔ اگر آپ مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں تو آپ ظرافت اور ظرافت کی شریعت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ نے ڈان کوزوٹ کا نام بھی سُنا ہوگا۔ اس میں اور مجھ میں تین فرق ہے۔ میں ظریف کردار ہوں وہ ظریفانہ کردار ہے جو بات میری فطرت ہے وہ اس کی فضا ہے اور یہی بات خوبی میں بھی ہے۔ میں فریب میں مبتلا نہیں ہوں یہ دونوں عزیب میں مبتلا ہیں۔ یہ خود ظریف نہیں ہیں اپنے خالقوں کی بدولت ایک خاص فضا میں پہنچ کر ظرافت کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ میں واقعات پیدا کرتا ہوں یہ واقعات میں محصور ہیں۔ میں بھی ایک حد تک غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہوں لیکن میرے مبالغے میں فنی واقعیت ہے۔ یہ دونوں بھی ایک حد تک غیر فطری و مبالغہ آمیز ہیں لیکن ان میں فنی واقعیت کی کمی ہے اور اسی لیے کچھ مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ باتیں میں نے فالسٹاف کی زبانی ادا کی ہیں۔ اب آپ تھوڑی دیر کے لیے فالسٹاف کو غائب اور مجھے حاضر مان لیں تو مشکل آسان ہو جائے۔ ہمارے ادب میں اور بالخصوص نثر میں طنز و ظرافت کی روایت پرانی نہیں اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارا ادب بھی کچھ ایسا پرانا نہیں۔ اُردو نثر نے اپنے فنی شرائط کے ساتھ انیسویں صدی کے آغاز میں جنم لیا۔

اس کا جزو بنگالی مدد میں بھا لیکن اس کو جزو دینے والے وہ لوگ تھے جو مے و نغمہ کو "آندہ رہا" کہتے تھے۔ ان کے خیالات اور رجحانات میں قدیم معاشرت کی آسودگی تھی۔ زمانہ انقلاب، تجربہ اور استدلال کا تھا۔ مغرب کا اثر غیر شعوری طور پر زندگی کے ہر گوشے پر پڑ رہا تھا لیکن چونکہ ابھی تک قدیم اور جدید متوازی چل رہے تھے اس لیے نثر بھی کچھ عرصہ تک قدیم اور جدید کے دام میں گرفتار رہی جس کی بہترین مثال "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" ہیں لیکن آہستہ آہستہ مغرب کا اثر دل و دماغ تک پہنچ گیا۔ سیاست بدلی تو اخلاق اور عقاید میں بھی تزلزل پیدا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور معاشرت کے اندرون میں وہ تصادم رونما ہوا جو طنز و ظرافت کا اصل الاصول ہے۔ غدر کے بارہ سال بعد غالب کے خطوط اور نذیر احمد کی "مراۃ العروس" شائع ہوئے اور ان کے پانچ سال بعد شگفتہ کے "اودھ پنچ" جاری ہوا۔ "اودھ پنچ" مشرق و مغرب کے تصادم کا پہلا مظہر ہے۔ اس کے گلشن والوں میں چار حضرات کے نام سرِ فہرست ہیں۔ رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، نواب آزاد اور اکبر الہ آبادی۔ ان سب کی منزل ایک ہے اور وسیلۂ سفر بھی ایک ہے لیکن صلاحیت اور موضوع کے حدود میں فرق ہے اسی لیے ان کے تخلیقی کارنامے فنی ہیئت، مجموعی اثر اور نوعیت حیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اودھ پنچ کے بارے میں رشید صاحب کا خیال ہے کہ وہ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا حامل تھا۔ اس تنقید کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کے نصب العین میں توازن کی سخت کمی تھی۔

بہرحال یہ مسئلہ بہت طویل ہے اور یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ بحیثیت مجموعی "اودھ پنچ" کی ظرافت میں گہرائی اور طنز میں گیرائی کی کمی ہے۔ لیکن ہمیں زمانہ کی پابندیوں اور مجبوریوں کو ذہن سے یکسر محو نہیں کر دینا چاہیے۔ "اودھ پنچ" کی ظرافت ہے مگر تلخ سے خالی نہیں۔ کہیں کہیں جو یاس ہے مگر پھر بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ الفاظ کی بازی گری ہے لیکن اس میں فطری روانی ہے۔ وہ قہقہوں سے فروغ پاتی ہے لیکن یہ سیدھے نہیں۔ اس کا طنز تیز ہے لیکن زہرناک نہیں۔ اس میں یکسانیت ہے مگر ہر چار کے بعد فضا کچھ اس طور سے بیدار ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں یک بیک جگنو چمک اٹھے ہوں۔ "اودھ پنچ" کے صفحات میں آپ موضوعات کی رنگا رنگی، الفاظ کی کثرت، خیالات و جذبات کی بے جا فراوانی، کثرتِ مسکراہٹوں اور بیشتر قہقہوں کی وہ طغیانی نظر آئے گی "الامان" اور ایسا معلوم ہوگا کہ فطرت نے خزانوں کے در کھول دیے ہیں اور یہ ساری دولت بے ضرورت اور بے خیال لٹائی جا رہی ہے۔ سجاد حسین کا سیاسی طنز مجموعہ ہے مگر سطحی ہے۔ وہ معاصرات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں، واقعہ اور خیال سے کہیں ان کی طبیعی خوش دلی طنز میں وہ شادابی اور تازگی پیدا کر دیتی ہے کہ روح میں بوندیں پڑنے کا سماں دکھائی دے۔ شہرت کا وارد ماران کے ناول "حاجی بغلول" پر ہے جو ڈکنس کے پک وک پاپرز (PICK WICK ABROAD) کا چربہ ہے۔ بساط بہت وسیع ہے۔ سجاد حسین کی بساط محدود ہے۔ ڈکنس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا کردار زندہ اور جیتا ہے، یہ بات سجاد حسین کو نصیب نہیں پھر بھی اس میں شگفتہ ظرافت ہے۔

"اودھ پنچ" کے دوسرے کامیاب رکن نواب آزاد ہیں جن کے متعلق رشید صاحب کی رائے یہ ہے کہ:

"نواب آزاد نے جس دل نشین اور معقول پیرائے میں طنز کی ہے اس کا جواب
بحیثیت مجموعی اردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔"

یہ رائے صحیح ہے۔ ان کے طنز میں گہرائی بھی ہے اور شگفتگی بھی ہے۔ اس میں ظرافت ہے، پرتمنا

اور بعض ناقدین نامعلوم صدیک کم ہیں۔ ان کے وہ خطوط جو آنند سے لکھے گئے ہیں "بہت رواں، سادہ اور خیال انگیز ہیں۔ پہلی کو لکھتے ہیں:۔

"میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں، کوئی آن کوئی دھت، کوئی لحظہ بھی تو آئینۂ خیال کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگن کی واٹر سلک کی گول پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ نفرت سے یاد آجاتا ہے۔"

آزاد نے تعریفات کی ایک لغت بھی مرتب کی ہے جس میں جید زاکانی اور ڈاکٹر جانسن کا تتبع کیا گیا ہے لیکن ان کا سا ایجاز و اختصار پیدا نہیں ہو سکا۔ بعض تعریفیں دلچسپ ہیں مثلاً:

تعلیم نسواں = عام جلسوں میں اپنی ہوشیاریوں کو لے جانا

یا پارلیمنٹ = وہ پالی جہاں کے اصیل اور ٹینی دونوں کٹتے ہیں

سجاد حسین اور نواب آزاد نے جو کچھ لکھا ہے نثر میں لکھا ہے، اکبر نے نظم میں لیکن اکبر کی وسعت نظر، فنی شعور اور جذبہ کی شدت ان میں سے کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ ان عناصر اربعہ میں رتن ناتھ سرشار ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی مشہور داستان "فسانۂ آزاد" تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسے دیوزاد کا کارنامہ ہے جس سے دنیا نے انکار کر دیا جس نے خود بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا اور جو اپنے افسانہ کے ہیرو کو بھی نہ سنبھال سکا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ زندہ رہا۔ اگر رتن ناتھ سرشار کی مخلوق ہے لیکن مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ خالق و مخلوق میں پردے حائل نہ تھے۔ آزاد مشرقی ہے لیکن اب کی ہر چیز کا استقبال کرتا ہے۔ اس میں خیال اور عمل کی بے پناہ قوتیں ہیں۔ لیکن چونکہ ماحول میں ان کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے طبیعت بالی ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہے اور بیشتر تعمیری تنقید کرتا ہے اور اس تنقید میں صحت مند طنز بھی ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کو خود پر قابو حاصل نہیں ہے اس لیے الفاظ اور جذبات دونوں کو فراخ دلی سے لٹاتا ہے۔ وہ مذہب، کتب، میکدہ اور محفل ہر ایک کے ہر گوشہ کو چھیڑ کر دیکھتا ہے اور دیکھ کر چھیڑتا ہے اور جب لکھنؤ کی محدود معاشرت میں اس کی قوت عمل کا اظہار نہیں ہو پاتا تو وہ مشق کو بیٹھتا ہے اور گھنٹوں بلا رہنے کے بعد روم و روس کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور آخر میں مہمانی داستانوں کے ہیروؤں کی مثال ہو جاتا ہے جس کے معنی خیال کی وسعت اور میدان کی تنگی کے ہیں۔ آزاد اس زمانے کی معاشرت کا دماغ اور رتن ناتھ سرشار کا ہمزاد ہے۔ خوجی ظریفانہ کردار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ خاص واقعات میں محصور ہو کر ہی ظریف معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ ظریف ثابت نہیں ہو سکتا۔

میری رائے میں خوجی لکھنؤ کی وہ قدیم معاشرت ہے جو اپنی آخری سانسیں پوری کر رہی ہے۔ اس میں روحانی قوت فقدان ہے جس کی کمی توہم پرستی سے پوری ہوتی ہے۔ اعتماد کی کمی ہے جس کی تلافی بے جا فخر سے ہوتی ہے۔ وہ صحت مند اقدار سے محروم ہے اس لیے افیون کا استعمال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے گزرا ہوا زمانہ چاند کا غار، حال جیم کا ذوب اور مستقبل ٹوٹا ہوا ہے اس لیے زندگی خود فریبی کے سہارے گزرتی ہے۔ سرشار نے خوجی کا کردار بڑی خوبی سے تراشا ہے۔ ڈان کیخوٹ میں ہے

کہ ان کی پر نیزہ سے حملہ کرے۔ خوبی زور آزمائی کی بات پہ اپنی قدرتی ملنگتے ہیں جو کلڑی کی ہے، محض کھوکھلی ہے کبھی کام نہیں آتی، [illegible] اور وقت پڑنے پر زور سے پکارتے ہیں لانا میاں قوی"۔ وہ کبھی نہیں لائی جاتی، اس سے کبھی دا نہیں ہوتا، وہ محض واہمہ ہے۔ خوبی حرکات اور سکنات سے الفاظ اور بیانیے سے اور کبھی کبھی معصومیت کا لباس پہن کر ظرافت پیدا کرتا ہے لیکن اس کے طریف ہونے کا راز اس کی خود فریبی اور اس کے ماحول میں ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

"حضور بات یہ ہوئی کہ غلام اب چشمہ سار ایک پیالی میں افیون گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف نظر کرتا ہوں تو زور کا عالم۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یا خدایا کیا اسرار ہے۔ خور کے دیکھتا ہوں تو رکشی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ پیڑ کا درخت ہے مگر دم کے دم میں ہمارے حضور اصف لشکن پھر سے آن کر ہاتھ پہ بیٹھ گئے۔"

بہر حال فسانہ آزاد کے حدود رافق سے سہلتے ہیں۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کا رشتہ انسان، خدا اور ماحول سے ہے لیکن اس میں کچھ واضح اور جاندار ہے اور بہت کچھ دھندلا اور بے جان ہے۔

۱۹۱۳ء میں رتن ناتھ سرشار کا انتقال ہو گیا، دو سال بعد شیخ ممتاز حسین نے اسے پھر زندہ کیا۔ اس بار لکھنے والوں میں صرف ایک شاعر کا نام یاد رکھنا چاہیے اور وہ سید مقبول حسین ظریف ہیں جنھیں مکالمات میں کمال حاصل ہے۔

ریاض الاخبار کے ساتھ ساتھ آفتاب خیرآبادی نے دو مزاحیہ رسالے "فتنہ" اور "عطر فتنہ" کے نام سے نکالنے شروع کیے، جن کا مقصد انقلاب یا اصلاح نہیں آسودگی تھا۔ ان کے بارے میں یہ تبصرہ کافی ہے ؎

بلبل چہک رہا تھا ریاض جمال میں

آپ چاہیں تو اس جمال کو فریب بھی کہہ سکتے ہیں۔

مغربی تعلیم اور مغربی ادب کا اثر بڑھتا رہا اور روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ انقلاب فرانس کی تاریخ اور روسو اور والٹیر کی تحریریں خواص میں عام طور سے مقبول ہو گئیں۔ فوجیت کا وہ جذبہ جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے اوائل میں دنیا کی سیاست اور قوموں کے انحطاط کا محرک تھا، تعلیم یافتہ طبقے کا دین و ایمان ہو گیا۔ آزادی اور جمہوریت کے تصورات طامس پین، گوئٹے، ورڈزورتھ اور ایسنسر اور سارٹر جیسے کے واسطے سے درس گاہوں میں فروغ کر گئے۔ ذہنی آزادی اور قومی تشخص اور اپنے تہذیبی سرمائے کو کھنگالنے پرکھنے اور جانچنے کا حوصلہ اور تصور پیدا ہوا۔ طنز و ظرافت میں ایک بنیادی تبدیلی یہ ہوئی کہ خیال جائز طور پر طنز و ظرافت کی بنیاد متصور کیا جانے لگا۔ [illegible] طنز و ظرافت کا دائرہ عمل پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو گیا۔ اب معاشرت اور سیاست ہی نہیں بلکہ فرہنگی اور اخلاقی اور [illegible] بھی طنز و ظرافت کا میدان و نشانہ بن گئیں۔ تیسرے یہ کہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادب کے اسالیب اور موضوعات سے ہمارا ادب متاثر ہونے لگا۔ چوتھے یہ کہ ایک عام آفاقی نقطۂ نظر بھی پیدا ہونے لگا۔ اس پیچیدہ تحریک کو سمجھنے کے لیے جن عظیم لکھنے والوں کے تین گروہ ذہن میں رکھیے۔ سجاد انصاری، مہدی، عاوی اور قاضی عبدالغفار، دوسرے بیرحضرت علی اور [illegible] تیسرے اچھا کلام آناد اور ظفر علی خاں۔

[illegible] اگرچہ اتنا ہی فرق ہے جتنا فلسفہ اور شاعری میں لیکن ان کے یہاں انسانی ذات

آفاقی قدریں ملتی ہیں، یہ کسی محدود نقطۂ نظر کے قائل نہیں، امارت کے خلاف ہیں، وہ امارت عقیدے کی ہو، علم کی ہو یا پیسہ گاری کی۔ دونوں شمس کی امارت کے قائل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سجاد انصاری کے خیال میں قرۃ العین کو شہید نہ کرنا چاہیے اور حیدر فاروقی کے خیال میں عصمت چغتائی کے لیے پنیا کی گئی ہے۔ ایک طنز نگار ہے دوسرا بذلہ سنج اور خوش مذاق۔ دونوں نفاست کے قائل ہیں یا دو صوفی کے دشمن۔ دونوں کے یہاں تشکیک ہے، دونوں چھوٹے پیمانہ پر تصویریں بناتے ہیں اور اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں۔ سجاد مشرق اور مغرب دونوں کی شراب ملا کر پیتے ہیں۔ مہدی مشرق کے آب و انگور سے پرتگال شراب بناتے ہیں مغرب کی آزادی، عقیدہ کی آزادی اور حسن پرستی ان کی بہترین قدریں ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے وہ ان کے طنز و ظرافت کا نشانہ ہے۔

قاضی عبدالغفار کا طنز مغرب کی سیاست اور مشرق کے اخلاق پر ہے لیکن ان کے طنز میں تبلیغ کم اور ترغیب زیادہ ہے۔ خطابت نہیں ہے، ولولہ آسائی ہے۔ ہیجان نہیں ہے ضبط ہے اور طنز نگار کی حیثیت سے انھیں عبدالماجد دریابادی پر ترجیح حاصل ہے۔ "نقش فرنگ" میں طنز کا موضوع وہی مغرب کی سیاست اور مشرق کا اخلاق ہے۔ سیاست کی ریاکاری اور اخلاق کی زبوں کاری ہے لیکن "لیلیٰ کے خطوط" میں وہ سجاد انصاری اور مہدی الافادی کے ہم جلیس ہو جاتے ہیں اور ان پرانے شعوبہ اور بچھتے ہوئے اسلوب کا اضافہ کرتے ہیں۔ ان کا طنز آفاقی ہے۔ وہ بھی حسن پرست ہیں، نفاست پسند ہیں، عقیدہ، زہد، علم اور دولت کی امارت کے خلاف ہیں مشرقیت اور مغربیت کا خوشگوار امتزاج چاہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی طوائف کی تصویر کھینچی ہے جو ماں، بہن اور بیوی بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے وہ ہیں "یاما ہی پٹ (YAMA THE PITT) کی جینی (JENNY) سے خیال کے لحاظ سے بلند اور کردار کے لحاظ سے کچھ پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں محدود معاشرتی اور اقتصادی حدود نظر نہیں ہے اور اس لیے قاضی عبدالغفار، میر محفوظ علی اور عبدالماجد سے برتر ہیں۔ یہاں ان سب حضرات طنز کا نشانہ انگریز، مغربیت، مغربی سیاست اور وہ بیگانے ہیں جو بیگانوں سے بدتر ہیں۔

میر محفوظ علی کا طنز مولویانہ ہے اور مقصد بھی وہی ہے۔ ان کے یہاں زاویۂ نظر محدود، واقفیت سطحی اور جذبات کا تنوع مفقود ہے۔ "شیخ سعادت کی صاحبزادیاں" کامیاب نہیں ہے، پھر بھی کہیں کہیں اس ویرانہ میں جو قبیل الفاظ و غیر ضروری اظہار فضلیت کے بگولوں کی زمین ہے شگفتہ طنز نظر آجاتا ہے۔

ظفر علی خاں، صحافی ہیں۔ ان میں وہ ہمہ دوی نہیں جو وسعت علم سے پیدا ہوتی ہے۔ مغرب کی سیاست پر انھوں نے چند کامیاب طنزیہ عبارتیں لکھی ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کے طنز میں خشونت بھی ہے اور گریز بھی، خشونت تیور میں پائی جاتی ہے اور گریز پرتہ میں۔ ان کا طنز انتہائی سطحی، انتہائی محدود اور انتہائی بے جان ہوتا ہے۔ ان کے طنز کے بارے میں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی نیز ہے۔ دیکھیے میں نے نیت قلب بجز نہیں کہا ہے۔ ممکن ہے آپ غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

ابوالکلام آزاد کی معلومات میں شبہ نہیں، شخصیت کی عظمت میں شبہ نہیں، ان کی زبان میں کلام نہیں۔ ان کی زبان ہے، ان کا طنز بھی عہد نامۂ عتیق کا طنز ہے جس میں ہیجان، خطابت اور ظاہری شان و شوکت سبھی کچھ ہے۔ وہ پر مسلط ہو جاتے ہیں، مرعوب کن ہیں۔ ان کے طنز میں تیزی بھی ہے اور تلخی بھی۔ ان میں آفاقیت بھی ہے اس سے

تصویر کو کامیاب ہوتے ہیں۔ علی گڑھ، شملہ کانفرنس اور اس قسم کی دوسری تحریریں زبان و بیان کی چٹانیں ہیں جن میں طنز کا لاوہ گردش کرتا ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر ہم ان ظرافت نگاروں کے حلیے پر ایک نظر ڈال سکتے ہیں جو ہم سے قریب ہیں اور جن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے معنی میں اردو کو ظرافت، ظرافت کو اودی رنگ اور ادبی رنگ کو آفاقیت بخشی ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ضبط بحث نہ ہو جائے اس لیے ملا رموزی، علیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی پر ایک نظر ڈالتے چلیں اور خدا بخشے صدیقی اور پطرس کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھ دیجیے۔

ملا رموزی خیالات کے لحاظ سے قدامت پرست اور زبان کی لحاظ سے ازل پرست ہیں۔ گلابی اردو لکھتے ہیں لیکن لکھنے میں روانی اور اسلوب میں جان ہوتی ہے۔ کچھ مضامین گلابی اردو سے بچ کر بھی لکھے ہیں۔ وہ بیشتر زبان سے کمتر واقعہ سے اور بشاشہ و نادر خیال سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کا موضوع وہی پامال مشرقیت ہے جنھیں ان کی نظر میں مذہب کا درجہ حاصل ہے۔ مغربیت کی سطح پر نظر ڈالتے ہیں اور کائنات کو خدا کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ الفاظ بنانے اور ترکیبیں وضع کرنے پر کافی توجہ صرف کرتے ہیں مگر بیشتر ایجاد بندہ کی مثل صادق آتی ہے۔ ان میں فنی ضبط کی شدید کمی ہے ورنہ یہ تضمین کے ساتھ کھپا سکتا تھا کہ ان کی ظرافت ادب میں اچھی جگہ پاتی۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "زندگی" ہے جس میں بیوی، مشاعرہ، ریل کا سفر اور کئی مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بعض اچھے ہیں۔ ان کا طنز ضرورت سے زیادہ واضح اور ان کی ظرافت زبان کی بدولت فطری ہونے کے باوجود مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

علیم بیگ چغتائی کھلنڈرے ہیں۔ انھیں ہر بات میں ہنسی کا پہلو اور ہر واقعہ میں مضحک بات نظر آجاتی ہے خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خیال کی آفت سے بری ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ذہنی کاوشوں کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھتے۔ واقعہ میں ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو اناطول فرانس کے لیے مذہب ہیں اور مولوی کے لیے شیطان ہیں ہے۔ ہلکی پھلکی چیزیں لکھتے ہیں۔ لیکن ان میں جو انوں کی زندگی اور زندگی کی جمالی کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں۔ کولتار، گلی، فل بوٹ، کھر پا بہادر اور اس قسم کی دوسری کتابیں اور مضامین ان بالغوں کے لیے لکھے ہیں جو بلوغت کی حسرت میں مر گئے یا پھر ان لوگوں کے لیے جنھیں پیرانہ سالی بالغ کہتے ہیں۔ بہرصورت ریل کے سفر میں وقت گزارنے کے لیے اچھے ہیں۔

شوکت تھانوی نام سے پیرانہ سالی کی صورت سے نوجوان اور تحریر سے کبھی کبھی افسانہ و خیزاں اور کبھی کبھی جوان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان کا مزا الجھی ہے، واقعہ کا الجھی اور خیال کا الجھی۔ ان میں برتری کا وہ احساس بھی نہیں جو ملا رموزی دنیا اور آخرت سے۔ نہ وہ اصلاحی جذبہ ہے جو پڑھنے والے کو دنیا اور آخرت دونوں سے بیزار کر دیتا ہے، نہ خیال بھیگی ہے جو رشید صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ روزنامہ کے معاملات، اشتہاص کے کردار اور واقعات کے موڑوں سے کام لیتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ طنز پیدا کرتے ہیں جس میں ظرافت ہوتی ہے اور وہ ظرافت جو بہلانے کے لیے ہوتی ہے۔ "بڑے بھلے" اور "شیش محل" ان کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

فرحت اللہ بیگ ماضی کو حال میں تبدیل کر سکتے ہیں، حال میں مستقبل کا جلوہ دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں، وہ

ظرافت کے دلدادہ ہیں۔ عداشمس سے ہمدردی رکھتے ہیں لیکن ہمدردی میں شگفتہ تنقید کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان
کی زبان ظرافت کی جان ہے۔ فرحت انداز جملوں سے وہ کام لیتے ہیں جو شیریں قول محال (PARADOX) سے لیتے
ہیں۔ ان کی سب سے بڑی آرزو ادب میں گہرا قدر اضافہ ہے۔ "دنیا احمد کی کہانی پھول والوں کی سیر" آخری وصیت" ان کے
نمایاں کارنامے ہیں۔

پطرس سے مرزہ زندگی کو طنز و مزاحی انداز میں پیش کرتے ہیں، وہ تماشا بنتے ہیں خود کبھی تماشہ نہیں بنتے۔ ان کے یہاں
ذہنی کشمکش کا عنصر بہت کم ہے لیکن ان کی ظرافت میں خوشگوار طنز اور ان کے طنز میں گہری انسانیت ہے۔ انھوں نے
استاد، طالب علم، دوست، بیوی، سیاست اور شہریت پر انتہائی لطیف انداز میں تنقید کی ہے جو عام انسانی تجربوں پر مبنی ہے
اور اس کے باوجود خاصہ کی چیز ہے۔ ان کی سادگی میں بھی کبھی سعدی کی گلستاں کا مزا آجاتا ہے۔

"کتے" "سائیکل" "استاد" اور "لاہور کا جغرافیہ" ان کے اچھے مضامین ہیں۔ لیکن ہر مضمون واقعیت، حسن تعمیر
اور ہمیں ظرافت کی بدولت ہزار لطیفانہ مضامین کا حریف ہے۔ غالب کے بعد زیب تبسم کی شان مجتبیٰ پطرس کا حصہ ہے۔

رشید احمد صدیقی کے فن اور ان کے خیال میں پیچیدگی ہے۔ لیکن ان کا مطالعہ غیر ضروری نہیں ان کے طنز میں پہلی نظر
میں ظرافت کا، دوسری میں بلاغت کا اور تیسری میں انفرادی اور اجتماعی شامت کا "احساس ہوتا ہے اور بعد میں یہ تینوں ملکر
تعجب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

رشید صاحب میں "سوئفٹ کی تیزی" اناطول فرانس کا کنایہ اور ڈکنس کی خوش طبعی" نہیں ہے۔ البتہ قول محال
کی پرچھائیں ان کے حصہ ہے، بات میں سے بات نکالنا اور ہر بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کا فن ہے۔ ہارنے کے باوجود زندہ
گزارنا اور خوش دلی سے زندگی پر فتح پانا، رشید صاحب کے بہترین مضامین کی بہترین قدریں ہیں۔ وہ ہر اس چیز پر طنز کرتے
ہیں جو فرد کی آزادی، سکون اور آسودگی کو تباہ کرتی ہیں۔ وہ پولیس ہو یا گواہ، ٹیچر کلکٹر ہو یا مزدور، مولوی ہو یا سیاست داں
ایڈیٹر ہو یا استاد، فن کار ہو یا روشن خیال بیوی، شاعری ہو یا عدم تعاون اپنی کمزوری ہو یا دوسروں کی حماقت۔ ان کی بہتر
"مضامین رشید" اور "گنجہائے گرانمایہ" ہیں۔

رشید صاحب کا صرف ایک جملہ یاد رکھیے!

"اس زمانے میں لوگ اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی بیویوں کو آرٹ
سمجھتے ہیں۔"

اس ایک جملہ میں ان کی شخصیت، بصیرت اور فن سب کچھ ہے۔

چرچھلن، امتیاز علی تاج کے قلم کا مرہون منت ہے یہ K. JEROME کی مخلوق کا چربہ ہے۔
گاہے گاہے شائع ہوتے ان کا مکمل مجموعہ ابھی تک پردہ غیب میں ہے۔ یہ مرنے ہلکی پھلکی، رواں اور شگفتہ زبان میں
ہیں اور بقول سرور صاحب اگرچہ دوسروں نے بھی اور یہاں دوسروں سے مراد اغیار نہیں ہیں، اس کردار کے خاکے
مگر مولوی مدن والی بات کسی کو نصیب نہ ہوئی۔

تاج کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کردار کو ہندوستانی فضا، ہندوستانی لباس اور ہندوستانی مزاج میں ڈھال دیا ہے۔ چربہ اُتارنے کا فن محمد حسین کے بعد اگر کسی کے حصّے میں آیا ہے تو وہ امتیاز علی تاج ہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اظہارِ کمال کے لیے نئی وادیاں تلاش نہیں کیں۔

بہرحال ہمارے طنز و ظرافت پچھلے اٹھتر برس میں نشو و نما کی بہت سی منزلوں سے گزرے۔ چند لکھنے والوں نے ان میں اپنے ماحول کی بیباک اور بے لوث ترجمانی کی۔ رتن ناتھ سرشار کے زمانے میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اکبر نے اسے فنی نقطۂ نظر سے معراجِ کمال کو پہنچایا۔ ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار نے اسے حقائق سے لبریز کیا۔ رضت اللہ نے اسے پیار کیا، پطرس اور رشید احمد صدیقی نے اسے خوش سلیقگی سے برتا۔

لیکن ابھی تک ایک مربوط اور علیم کا رنامے کی کمی ہے۔ ممکن ہے یہ اسی قسم کی خواہش ہو جو مولانائے روم کو تھی ؎

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مزاح اور مزاح نگاری

وزیر آغا

سنجیدگی کائنات کی ازلی و ابدی خصوصیت ہے اور اس کے تمام اجزاء میں ایک برقی رَو کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ کائنات کا ہر واقعہ کسی مجبور رستاسے کی اڑان سے لے کر نکڑی کے جالے کی تعمیر تک اور زندگی کی ہر رَو جنسی کشش کی پُراسرار لے گرہ بچ کی حرارت نہاں تک ایک عجیب ہی سنجیدگی سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی مجموعی طور پر ایک تیز رو ہوا کی طرح درشت کو جھکر کرتی کسی نامعلوم منزل کی طرف اس والہانہ انداز سے بڑھ رہی ہے کہ ع

لئے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسی سنجیدہ کائنات اور ایسی سنجیدہ زندگی کے زیرِ سایہ انسان کا سنجیدہ کاموں اور سنجیدہ تعمیری کارناموں میں جانا ایک بالکل فطری امر ہے تاہم یہاں یہ نکتہ ضرور ہے کہ سنجیدہ زندگی کا ایک انتہائی سنجیدہ جزو ہونے کے باعث اس کی ذات یکسر خشک نہ ہو جائے اور وہ محض ایک مشین کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتا نہ چلا جائے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے انسان کو ایک ایسی قوت بھی بخشی ہے جس سے کام لے کر وہ کائنات کی خوفناک سنجیدگی اور زندگی کی سہما دینے والی مشکل پر ہنس سکتا اور یوں مسکرا کر بلکہ قہقہہ اس دیوانہ وار پیش قدمی میں وقفہ پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے تیز بہاؤ سے ہم آہنگ ہے۔

چنانچہ زندگی کی بے رحم سنجیدگی اور ماحول کی ٹھوس واقعیت جو قریب قریب ہر شے کو اپنے فولادی بازوؤں میں کسے ہوئے ہے، انسان کے احساسِ مزاح کی حدت سے پگھل کر لچکیلی اور ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ احساسِ مزاح ماں کے اس لطیف و سنجیدہ جذبہ کی طفلانہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کارناموں کے پیشِ نظر نمودار رہتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ماں کا تبسم انہماک کی ترغیب دیتا ہے لیکن احساسِ مزاح کے طفیل انسان ایک لحظہ رُک کر اپنی سنجیدہ کاوشوں اور جذباتیت سے سنجیدہ ہو ایک نظر ڈالتا ہے اور اسے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ لامحدود لازوال کائنات میں یہ کاوشیں اور تدبیریں کتنی معمولی حیثیت طفلانہ صورت کی حامل ہیں۔ مشہور لطیفہ ہے کہ کسی نے آئیڈو جی بم کے بارے میں پروفیسر آئن سٹائن سے اس کے خیالات دریافت کئے تو آئن سٹائن نے مسکرا کر جواب دیا:

"ہائیڈروجن بم سے ہماری زمین کے تباہ ہو جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں اور بالفرض اگر یہ تباہ ہو بھی گئی تو اس سے اتنی بڑی کائنات میں قطعاً کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

تاج کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کردار کو ہندوستانی فضا، ہندوستانی لباس اور ہندوستانی مزاج میں ڈھال دیا ہے۔ چربہ اتارنے کا فن محمد حسین کے بعد اگر کسی کے حصے میں آیا ہے تو وہ امتیاز علی تاج ہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے کمال کے لیے نئی وادیاں تلاش نہیں کیں۔

بہرحال ہمارے طنز و ظرافت پچھلے اٹھتر برس میں افسانہ نما کی بہت سی منزلوں سے گزرے۔ چند لکھنے والوں نے ان میں اپنے اپنے حصول کی بیمارئ بے باک اور بے لوث نزجمانی کی۔ رتن ناتھ سرشار کے زمانے میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ پھر نے اسے فنی نقطۂ نظر سے معراج کمال کو پہنچایا۔ ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار نے اسے حقائق سے لبریز کیا ــــ فرحت اللہ نے اسے پیار کیا، پطرس اور رشید احمد صدیقی نے اسے خوش سلیقگی سے برتا۔

لیکن ابھی تک ایک مربوط اور علیم کارنامے کی کمی ہے۔ ممکن ہے یہ اسی قسم کی خواہش ہو جو مولانا نے روم کو لکھی ؎

گفتہ کریافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مزاح اور مزاح نگاری

وزیر آغا

سنجیدگی کائنات کی ازلی و ابدی خصوصیت ہے اور اس کے تمام اجزاء میں ایک بہتی رَو کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ کائنات کا ہر واقعہ کسی مجبور راستے کی اڑان سے لے کر بکٹری کے جالے کی تعمیر تک اور زندگی کی ہر رَو جنسی کشش کی پُراسرار تہہ سے کرہ ہوا کی حرارت و نہاں تک ایک عجیب سی سنجیدگی سے ہم آہنگ ہے۔ زندگی مجموعی طور پر ایک تیز رو ہوا کی طرح درشت جوش کو مجبور کرتی کسی نامعلوم منزل کی طرف اس والہانہ انداز سے بڑھ رہی ہے کہ ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسی سنجیدہ کائنات اور ایسی سنجیدہ زندگی کے زیر سایہ انسان کا سنجیدہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کارناموں میں یکسر منہمک ہو جانا ایک بالکل فطری امر ہے تاہم یہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ سنجیدہ زندگی کا ایک انتہائی سنجیدہ جزو ہونے کے باعث اس کی انفرادیت یکسر خستہ ہو جائے اور وہ محض ایک مشین کی طرح فطرت کے اشاروں پر ناچتا نہ چلا جائے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے انسان کو ایک قوت بخشی ہے جس سے کام لے کر وہ کائنات کی خوفناک سنجیدگی اور زندگی کی سہما دینے والی کشمکش پر ہنس سکتا اور یوں مسکرا کر بلکہ قہقہہ لگا کر اس دیوانہ وار پیش قدمی میں رخنہ پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے تیز بہاؤ سے ہم آہنگ ہے۔

چنانچہ زندگی کی بے رحم سنجیدگی اور ماحول کی ٹھوس مادیت جو قدم قدم پر شے کو اپنے فولادی بازوؤں میں جکڑے ہوئے ہے، انسان کے احساسِ مزاح کی حدت سے پگھل کر لچکیلی اور ملائم ہو جاتی ہے۔ یہ احساسِ مزاح ماں کے اس لطیف و دلنواز تبسم کی طرح ہے جو بچوں کی طفلانہ کاوشوں اور ٹھوس تعمیری کارناموں کے پیش نظر نمودار ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ماں کا تبسم تو بچوں کو مزید انہماک کی ترغیب دیتا ہے لیکن احساسِ مزاح کے طفیل انسان ایک لحظہ رُک کر اپنی سنجیدہ کاوشوں اور جذباتیت سے سنجی ہوئی قدروں پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اسے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ لاحد دور و لازوال کائنات میں یہ کاوشیں اور قدریں کتنی معمولی حیثیت کی حامل اور طفلانہ حرکت کی امین ہیں۔ مشہور لطیفہ ہے کہ کسی نے آئنسٹائن سے ہائیڈروجن بم کے بارے میں پروفیسر آئن سٹائن سے اس کے خیالات دریافت کیے تو آئن سٹائن نے مسکرا کر جواب دیا:

"ہائیڈروجن بم سے ساری زمین کے تباہ ہو جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں اور بالفرض اگر یہ تباہ ہو بھی گئی تو اس سے اتنی بڑی کائنات میں قطعاً کچھ فرق نہیں پڑے گا۔"

یہ احساس مزاح و یاس کے مقابلہ میں تبسم ہنسی اور قہقہہ ہی دراصل ہیں اس خلیہ کائنات میں زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں اور
لے سہارے ہم زندگی سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مگر ایک اور طرح بھی یہ احساس مزاح انسانی زندگی کو قابل برداشت بنانے کا ذمہ دار ہے وہ اس طرح کہ انسان کائنات میں
سے بظاہر خواب پرست ہے اور اکثر و بیشتر اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے ٹوٹنے سے ایک ایسا رنگ محل تیار کرتا رہتا ہے
کی اساس بعض خوابوں پر قائم ہوتی ہے اس کے برعکس زندگی خواب ہو یا نہ ہو ایک سپاٹ اور ٹھوس حقیقت نہ ہو رہے چنانچہ جب
کی امنگوں اور آرزوؤں کے رنگ محل اس کرخت اور خوفناک حقیقت سے زور دیا یہ پر ٹکراتے ہیں تو وہ کائنات کی سب سے زیادہ
ہیں اور غم زدہ ہستی بن جاتا ہے اور کبھی کبھی خود کشی کے ذریعے اپنی عظیم زندگی کا خاتمہ کرنے پر بھی تل جاتا ہے۔ احساس مزاح کا کام
ہے کہ وہ انسان کی بے نگاہ نقائص سے زود رنج انگیزوں اور ہیولائی سراب خوابوں پر تبسم انداز سے تنقید کرے اور یوں اسے خفائق کی کرخت
خوفناک صورت دیکھ کر اس شدید مایوسی سے بچائے جو اس کی خوابوں کی منزل پر ہمیشہ سے اس کی منتظر ہے اور جس سے اس کا نازک
دماغ بالکل پامال ہے۔ دیکھا جائے تو احساس مزاح کا یہ کارنامہ ایک بہت بڑی انسانی خدمت ہے۔

زندگی کی کرخت سچائی سے انسان کو بچانے اور اسے شکست خواب سے پیدا ہونے والے ناقابل برداشت صدموں
ہنسی طور پر تیار کرنے کے علاوہ احساس مزاح کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے
اور انسان کے مابین ایک ناقابل شکست رشتہ معرض وجود میں آتا ہے۔ عام زندگی میں بھی دیکھیے کہ ہنسی ایک متعدی بیماری کی طرح
ہے اور جہاں چند لوگ ہنس رہے ہوں وہاں ناگہیر بے جانے بھی ان کی ہنسی میں شریک ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

قواعد و ضوابط سے انحراف کرتا ہے دیکھا جائے تو مزاحیہ کردار صرف اس لیے مزاحیہ رنگ میں نظر آتا ہے کہ اس سے بعض ایسی
ہنسی نہ صرف افراد کو باہم مربوط ہونے کی ترغیب دیتی ہے بلکہ ہر اس فرد کو نشانہ تمسخر بھی بناتی ہے جو سوسائٹی کے مروجہ
حرکتیں سرزد ہوتی ہیں جن سے سوسائٹی کے دوسرے افراد محظوظ ہوتے ہیں مثلاً اگر ایسا کردار چارلی چپلن کی طرح اپنی اس عینک کی تلاش
کرے جو اس نے اپنی ناک پر لگا رکھی ہو تو خواہ مخواہ اس پر ہنسنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ قدیم قبائل میں اجنبیوں کے لباس، گھنٹا اور
عادات و اطوار کو نشانہ تمسخر بنانے کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں وہ اسی زمرے میں شامل ہیں۔ دراصل ہنسی اس فرد کا خلاق اڑاتی
ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا بھی ہٹتا ہے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے چنانچہ یہ بات
ہنسنے والوں کے لیے تو باعث انبساط ہوتی ہے لیکن اس فرد کو سخت ذلت سے ضرور دوچار کر دیتی ہے جس کے خلاف
عمل میں آتے بہر حال یہ بات طے ہے کہ ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلہ بان محض غیر شعوری طور پر اپنی
بھیڑ کو ہانک کر اپنے گلے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلے سے
ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو

اس کے مضامین سے کچھ نہ کچھ کشید کی سعی کرتا ہے۔ سماجی لحاظ سے ہنسی کا یہ پہلو اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس کی بدولت سوسائٹی ان تمام بیرونی لیکن مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے جن کو یہ نشانہ تمسخر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ ہنسی ان تمام اندرونی تقاضوں کے اضمحلال کی طرف بھی توجہ دلاتی ہے جو مضحکہ خیز صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اُردو ادب میں اکبر الہ آبادی کے ہاں مزاح کا جو اقداری پہلو سب سے نمایاں انداز میں کارفرما نظر آتا ہے وہ ہنسی کے اسی اصلاحی رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کائنات پر سنجیدگی مسلط ہے اور یہاں ہر ذی روح سنجیدہ زندگی کے بڑے اور اساسی اصولوں پر گامزن ہے۔ انسان کی امتیازی خصوصیت البتہ یہ ہے کہ وہ اس سنجیدگی کو چند لمحات کے لیے سمجھی سانپ کی کینچلی کی طرح اتار پھینکتا ہے اور ہنسی جیسے خالص حیاتیاتی تعیش (Biological Luxury) سے زندگی کے کھردرے کناروں کو ہموار کر لیتا ہے مگر ہنسی سے جو مسرت اسے حاصل ہوتی ہے وہ آرٹ اور فلسفے سے حاصل شدہ مسرت سے اس حد تک مختلف ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ عضویاتی مظاہر بھی شریک کار ہوتے ہیں۔ آرتھر کوسلر کے الفاظ میں:

"خیالات و احساسات ایک خوبصورت تصویر کو دیکھ کر یا ایک اعلیٰ نظم پڑھ کر ہمارے دلوں میں ضرور مرتعش ہوتے ہیں لیکن ایسا خاص عضویاتی مظاہرہ پیدا نہیں ہوتا جو ہنسی کے وقت معرض وجود میں آتا ہے اور یہ چیز محض ہنسی سے مخصوص ہے کہ انسان ایک لطیفے کو سن یا پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کا اتنے نمایاں انداز میں اظہار کرتا ہے۔"[1]

ہنسی کے اس عضویاتی مظاہرہ کی تشریح کرتے ہوئے چارلس ڈارون رقمطراز ہے:

"ہنسی کے دوران میں منہ کھل جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے پیچھے اور اوپر کی طرف ہٹ آتے ہیں اسی طرح اوپر والا ہونٹ قدرے اور اوپر کو اٹھ جاتا ہے اور شدید ہنسی کے دوران میں تو سارا جسم کانپنے لگتا ہے، سانس میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے اور آنسو بہ نکلتے ہیں۔"[2]

اسی طرح پروفیسر سلی نے اپنی کتاب "انجائمنٹ آف لافٹر" میں ہنسی کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور خفیف تبسم، مسکراہٹ اور قہقہے کا ایک ہی کیفیت کے تین مختلف مدارج قرار دیا ہے لیکن اس سلسلے میں جی۔ ٹی۔ گریگ نے جو نکتہ پیدا کیا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ گریگ لکھتا ہے:

"دروازہ پر سے چھلانگ لگانے یا بندوق کی لبلبی دبانے سے ذرا قبل آپ ایک لمبا سانس لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے سینے میں روکے رکھتے ہیں ہنسی کے وقت

---

[1] Arthur Koestler—Insight & Outlook, P. 3 & 4.

[2] Charles Darwin—Expression of Emotions, P. 208, 214.

بھی آپ اسی طرح ایک لمبا سانس لیتے ہیں مگر اسے روکنے کی بجائے آہ و نالہ کے چھوٹے تیز جھٹکوں کی صورت میں خارج کر دیتے ہیں۔

ہنسی کے اس جذباتی مظاہرے کے پس پشت ان تحریکات کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے جن سے احساس مزاح کو تحریک ملتی ہے اور ہنسی کا سیلاب پھوٹ بہتا ہے چنانچہ یہ سوال کہ ہنسی کیوں پیدا ہوتی ہے ایک خاصا اہم سوال ہے اور اوائل زمانہ قدیم سے مفکرین کے لیے بحث و تمحیص کا موضوع بنا رہا ہے۔ گرگیٹ نے مزاح پر اپنی مشہور کتاب میں تین سو تریسٹھ (۳۶۳) ایسی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن میں اس موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے مگر اس سب کے باوصف یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ابھی تک ہنسی کے مسئلے کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پوری طرح حل نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اگر ہنسی کے موضوع پر پیش کردہ نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے تو اس سے مسئلہ زیر بحث کا ایک قریبی جائزہ لینے میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل انسانی فکر کی تاریخ میں مزاح کے مسئلے پر دو نہایت دلچسپ نظریے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریہ تو یونان کے مفکر اعظم ارسطو اور سترھویں صدی کے انگریز مفکر تھامس ہابز کا ہے اور دوسرا نظریہ جرمن فلاسفر امانوئل کانٹ کا جسے بعد ازاں شوپنہار نے اپنے نظریے میں سمویا ہے۔ پہلے نظریے کے خالق ارسطو نے ہنسی کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہنسی کسی کی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرض وجود میں آتی ہے جو درد انگیز نہ ہو۔ اسی طرح سترھویں صدی عیسوی میں ہابز نے یہ نظریہ پیش کیا کہ:

"ہنسی کچھ نہیں سوائے اس جذبۂ افتخار یا احساس برتری کے جو دوسروں کی کمزوریوں یا خامیوں سے تحریک پاتے ہیں۔"[1]

اپنی گزشتہ خامیوں سے تقابل کے باعث معرض وجود میں آتا ہے"

بنیادی طور پر ارسطو کے نظریہ برتری اور ہابز کے نظریہ برتری میں بہت کم فرق ہے کیونکہ ہنسی چاہے دوسروں کی پستی یا کمزوری سے تحریک پائے یا اس بدصورتی اور کمزوری کے بالمقابل ایک احساس برتری کے جو دوسروں کی کمزوریوں یا خامیوں ہی سے تحریک پائے گی۔ ہابز کا نظریہ دراصل ایک اخلاقی نظریہ تھا جس کا سہارا لے کر اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہر وہ ہنسی غیر اخلاقی ہے جو دوسروں کی توہین کرے اور جس میں تحقیر کا عنصر موجود ہو۔ یہاں اگر ہابز کے نظریے پر تنقید کریں اور کہیں کہ کئی ایسے پیدا ہونے والی ہنسی یا بچوں کے معصومانہ قہقہوں میں جذبۂ افتخار کہاں؟ تو بحث طول پکڑ جائے گی۔ یہاں محض اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ہابز کا نظریہ اس زمانے کے اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے جب اچھی سوسائٹی میں بلند آواز سے ہنسنا ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ہنسی کے متعلق دوسرا نظریہ ایمینوئل کانٹ کا ہے جس کے مطابق ہنسی اس وقت نمودار ہوتی ہے جب کوئی چیز ہوتے ہوتے رہ جائے اور ہماری توقعات اچانک ایک جھٹکے کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائیں۔ کانٹ کے اس نظریہ کی توضیح اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہماری توقعات ایک غبارے کے اندر ہوا کی مانند لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی ہوتی ہیں اور ہم کسی خاص نتیجے پر پہنچ کر نابی سے پہلے رہے ہوتے ہیں کہ اچانک غبارے میں ایک سوراخ پیدا ہو جاتا ہے اور ہماری توقعات کا سارا دباؤ غبارے کو پھلانے

---

[1] Hobbes—Human Nature in Works (Molesworth 1840) Vol. IV, P. 46

کی بجائے اس سوراخ کے راستے باہر پھوٹ نکلتا ہے ——— یہ پھوٹ نکلنا ہی ہنسی کہلاتا ہے۔

قریب قریب اسی نظریے کا دوسرا علمبردار شوپنہار ہے جس کے مطابق ہنسی تخیل اور حقیقت کے مابین ناہمواری کے وجود کا اچانک محسوس کر لینے سے جنم لیتی ہے[1]۔ اس کی دانست میں جتنی خلاف توقع یہ ناہمواری ہوگی اتنی ہی شدید طور پر ہنسی کی نمود ہوگی۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میکس ایسٹمن نے ارسطو اور کانٹ کے ان بظاہر متضاد نظریات کی ایک بڑے اچھے انداز سے تنقیح کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ دونوں نظریے اپنی اپنی جگہ ہنسی کو سمجھنے میں ہمارے معاون ہیں۔ ایسٹمن نے لکھا تھا کہ بچے کو ہنسانے کے دو آسان طریقے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ آپ ہنسیں اور جب بچہ آپ کی طرف متوجہ ہو جائے تو اپنے چہرے کے خطوط کو یوں سکیڑیں کی آپ کی صورت خوفناک دکھائی دے۔ اس پر بچہ ہنس دے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز پکڑ لیں جسے بچے کے قریب لے جانے سے وہ پسند کرتا ہو اور جب بچہ ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے لگے تو مسکرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ بچہ اسے زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دے گا۔

ایسٹمن کی رائے میں بچے کو محظوظ کرنے کے یہ دونوں طریقے ارسطو اور کانٹ کے نظریات سے شدید مماثلت رکھتے ہیں چنانچہ ارسطو کا نظریہ کہ ہنسی کسی ایسی کمی یا بدصورتی سے نمودار ہوتی ہے جو دراگیر نہ ہو اس چہرے کی طرح ہے جس کے خطوط کو مسکرا کر خوفناک بنا لیا جائے اور کانٹ کا نظریہ کہ ہنسی توقع کے پیدا ہونے اور پھر اچانک ختم ہو جانے سے نمودار ہوتی ہے اس ہاتھ کی طرح ہے جو کسی شے کو تھامنے کے لیے بڑھے اور پھر دیکھے کہ وہ شے وہاں نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو مسکرس کا مسخرہ بھی ان دونوں طریقوں ہی سے تماشائیوں کو ہنسانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ پہلے تو اپنے چہرے پر سفید اور سُرخ رنگ مل کر اور ایک بیہودہ سا لباس پہن کر آتا ہے اور پھر جب کوئی شرزور کسی وزنی شے کو اٹھانے کا مظاہرہ کر چکتا ہے تو یہ مسخرہ بڑے اہتمام سے اسی شے کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے اور پھر اچانک اسے ہاتھ لگا کر پیچھے ہٹ آتا ہے اور لوگ مارے ہنسی کے بے حال ہو جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل مزاح کے مسئلے پر جن اور مفکرین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer)، جوزف ایڈیسن (Joseph Addison)، الیگزینڈر بین (Alexander Bain) اور پروفیسر لپس (Lipps) کے نام خاصے اہم ہیں لیکن دراصل اس طویل دور میں مذکورہ بالا دو نظریے ہی ایسے تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف اسالیب فکر کے طور پر قائم ہوئے اور مفکرین کے مابین بحث و تمحیص کا موجب بنے۔

بحث و تمحیص کا یہ سلسلہ زمانے کے کتنا عرصہ جاری رہتا کہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی پروفیسر بیرگسن نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف An Essay on Laughter میں نہ صرف ان دونوں نظریوں کو گہنا کر دیا بلکہ چند نئے قابل قدر نکات بھی پیش کیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر بیرگسن نے ہنسی کی وجہ میں گہرائی انتہائی مسرت اور عملی مذاق وغیرہ کو خاصی اہمیت دی اور قابل تمسخر اشیاء اور واقعات میں

---

[1] Kant—Critique of Judgment, 2nd ED. 1914. P. 223.
Schopenhauer—The World as Will & Idea, P. 130.
Eastman—Enjoyment of Laughter, P. 25

اخلاقی عیب اور کھان، جسمانی نقائص، بے قاعدگی، بھینگا پن اور بے حیائی وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا۔ مجموعی طور پر پروفیسر سیلی نے ہنسی اور کھیل میں فرق بتاتے ہوئے خاصا زور دیا اور ہنسی کے اجزا میں شامل کی سی مسرت آمیز جرأت اور کھیل کی طرف نمایاں رجحان کو مقدم جانا۔

ہنسی کے محرکات کے ضمن میں پروفیسر موصوف نے لکھا کہ ہنسی مسرت کے اس اچانک سیلاب سے عرضِ وجود میں آتی ہے جو کسی ہیجانی دباؤ کے ہٹ جانے یا کسی غیر متوقع شے کی اچانک آمد سے پیدا ہوتا ہے اور جو ہمیں یکایک زندگی کے ایک بلند مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو پروفیسر سیلی نے یہ لکھ کر بیسویں صدی سے پہلے کے نظریات کو انتہائی خوبی سے مربوط کیا اور اپنے اصلی تجزیاتی مطالعے سے ہنسی کے سلسلے میں نہایت قیمتی اضافے کیے۔

لیکن شاید یہ زمانہ مزاح پر نت نئی تحقیقات کا زمانہ تھا کیونکہ پروفیسر سیلی کی معرکۃ الآرا کتاب کے فوراً بعد مزاح پر دو نہایت گہرائی کتابیں منصۂ شہود پر آئیں اور ان کی بدولت مزاح کے مسئلے پر اس قدر روشنی پڑی جو اس سے قبل کئی صدیوں کی تحقیقات سے بھی نہیں پڑی تھی۔ یہ کتابیں تھیں ——— ہنری برگسان کی کتاب ہنسی (Laughter) اور سگمنڈ فرائڈ کی کتاب

Wit & Its Relation to The Unconscious

برگساں نے لکھا کہ زندگی لچک اور تحرک سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسے صبا رفتار گھوڑے کی مانند ہے جو افق کی تلاش میں سرگرداں کسی مقام پر ٹھہرے بغیر بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ برگساں کے طابع زندگی کسی مقام پر ٹھہرنا یا پلٹ کر دیکھنا یا کسی اندازِ میں کسی شے کو پیش کرنا جانتی ہی نہیں لیکن بھی زندگی جس کی خصوصیت تحرک اور لچک ہے جب کسی مقام پر ٹھہراؤ، جمود اور میکانکی عمل کا نقشہ دکھائے تو بے اختیار ہماری ہنسی کو تحریک مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سرکس کا مسخرہ جو بحیثیت انسان زندگی کا مظہر ہے جب کسی حادثے کا تصور پیش کرتا ہے اور کسی فرنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دھڑام سے فرش پر گر پڑتا ہے تو ہم بے اختیار ہنس دیتے ہیں ——— برگساں کے الفاظ میں "ہر بار جب کوئی شخص کسی حادثے کی طرح خود کو پیش کرے وہ مزاحیہ رنگ اختیار کر جاتا ہے"۔

ہنری برگساں نے ہنسی کو خالص ذہنی عمل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جذبات مثلاً رحم کے جذبات کی ہلکی سی رو بھی اسے ختم کر دیتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ ہم کبھی اشیاء پر نہیں ہنستے۔ چہرانوں پر صرف اس وقت ہنستے ہیں جب ان کی حرکات بعض انسانی حرکات سے مشابہت پیدا کر لیتی ہیں اور انسانوں پر ہم اس وقت ہنستے ہیں جب وہ اشیاء کے مانند خود کو پیش کرتے ہیں یعنی جب ان کی لچک میکانکی عمل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

برگساں کی رائے میں ہنسی نہ صرف سوسائٹی کے ہر اس عمل کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے جو میکانکی صورت اختیار کرنے اور جمود کو مستحکم ہو جانے میں مدد بہم پہنچاتا ہے بلکہ اس کا کام فراریت کے ان تمام رجحانات کا قلع قمع کرنا بھی ہے جن کے زیرِ اثر فرد سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ہٹتا نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہنسی فرد کو دوبارہ "کل" میں مدغم ہو جانے کی ترغیب دیتی ہے۔

اسی زمانے میں مزاح کے مسئلے پر قلم اٹھانے والا دوسرا شخص مشہور ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ تھا جس نے وٹ (WIT) کو اس لیے تجزیاتی مطالعے کے لیے منتخب کیا کہ اس کے باعث اس کے نظریۂ لاشعور پر روشنی پڑ سکتی تھی لیکن اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ضمناً اس عظیم مفکر نے مزاح کے مسئلے پر بھی گہری نظر ڈالی اور ایک ایسا نظریہ پیش کر دیا جس کی بنیادوں پر آج بھی انکار کے نئے نئے محل استوار کیے جا رہے ہیں۔

فرائڈ نے مزاح کی چار صورتیں پیش کیں۔ یہ ضرر لطائف، اغراضی لطائف، مضحک اور خالص مزاح۔ یہ ضرر لطائف کا حصہ ہیں اس لئے اور کچھ نہیں کہ وہ الفاظ یا افکار کی جادوگری سے سماجی انسباط بہم پہنچائیں۔ دوسری طرف اغراضی لطائف وہ ہیں جو طریق کار تو وہی اختیار کرتے ہیں جو بے ضرر لطائف کا ہے لیکن جو ساتھ ہی ساتھ کسی جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بھی تسکین کرتے ہیں۔ یہ تیسرے لطائف کسی نہ کسی کے خلاف ضرور صف آرا ہوتے ہیں۔

(فرائڈ کے مطابق بے ضرر لطائف سے حصولِ مسرت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں کھو کر انسان واپس اپنے بچپن کے احوال میں پہنچ جاتا ہے اور وہی طریق فکر و استدلال اختیار کرتا ہے جو عام زندگی میں بسر کرنے کے لیے جو ضروری قوت درکار ہوتی ہے اس میں ایک بچت (Economy) پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

(اس کے برعکس اغراضی لطائف ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کو آزاد کرتے ہیں جو عام زندگی میں ماحول اور سوسائٹی سے ہم آہنگ نہ ہونے کی صورت میں دبائی جا چکی ہیں یا یہ خواہشات اغراضی لطائف کا خوش نما لباس زیب تن کیے اور لوگوں سنسر کے پہرہ والوں کو دھوکا دے کر اپنے قید خانہ میں سے اس دریدہ دیری کے ساتھ باہر نکل آتی ہیں کہ باہر کی پبلک کو بھی ان کے قیدی ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ لطائف کے ذریعے ان جنسی یا تشدد آمیز خواہشات کی تسکین اس دباؤ سے حاصل قوت (Repressive Energy) میں بچت پیدا کرتی ہے جو ان خواہشات کی عدم تسکین کی صورت میں انتہائی ضروری تھی اور یہی بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

(مزاح کی تیسری صورت مضحک سے متعلق ہے۔ مضحک سے حصولِ مسرت کے متعلق فرائڈ نے لکھا ہے کہ یہاں مسرت قوتِ تخیل (Imaginative Energy) میں بچت سے پیدا ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ مضحک تحریک میں یقین دلاتی ہے کہ ایک خاص کام کی تکمیل کے لیے ہمیں اس قدر قوت کی ضرورت ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کام تو اس سے بہت کم قوت کے صرف سے بھی انجام دیا جا سکتا ہے چنانچہ فاضل قوت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" اس کی بہترین مثال ہے۔

آخر میں فرائڈ نے خالص مزاح کا ذکر کیا ہے اور اس سے حصولِ مسرت کو قوتِ جذبات (Emotional Energy) میں بچت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر الف ایک مصیبت میں گرفتار ہے اور ب کو اس سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن الف کی کسی بات سے ب کو محسوس ہوتا ہے کہ الف اپنی مصیبت کا مذاق اڑا رہا ہے تو ب بھی الف کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ یوں ب کی جمع شدہ ہمدردی میں ایک بچت پیدا ہوتی ہے اور یہ بچت ہنسی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔

اوپر ہنسی کے بارے میں فرائڈ کے نظریات کو نسبتاً تفصیل سے بیان کیا گیا ہے یہ اس لیے کہ اگرچہ اس نصف صدی میں ہنسی کے بارے میں کئی نئے نظریات پیش کیے گئے ہیں تاہم دراصل اس ضمن میں فرائڈ کے نظریات ہی سنگِ بنیاد کا کام دیا ہے۔ چنانچہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ فرائڈ کے بعد آج تک مزاح کے مسئلے پر جو تین نہایت قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئیں (ہماری مراد گریگ[1] ایسٹ مین[2] اور آرتھر کوسٹلر[3]

---

[1] I.Y.T. Greig —The Psychology of Laughter & Comedy

[2] Max Eastman—Enjoyment of Laughter

[3] Arthur Koestler—Insight & Outlook

کی کتابوں سے ہے، ان میں سے کم و بیش دو مغربی گریگ اور کوسلر کی کتابوں میں فرائڈ کے نظریات ہی نے بنیادی کام سرانجام دیا ہے۔ گریگ نے جہاں فرائڈ کے بنیادی نظریوں سے اتفاق کیا وہاں اس نے مزاح کے پس پشت فرائڈ کی پیش کردہ جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی بجائے محبت یا نفرت کے جذبات کو نمایاں جگہ دی اور کہا کہ چونکہ عام زندگی میں ہم ان رجحانات کی کھلے بندوں تسکین نہیں کر سکتے لہٰذا یہ مزاح کے ذریعے اس انداز سے تسکین حاصل کر لیتے ہیں کہ سوسائٹی کی اقدار کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا مجموعی طور پر گریگ نے فرائڈ کے نظریے میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

البتہ ایسٹمن[1] نے اس مسئلے کو ایک بالکل مختلف زاویے سے دیکھا اور مزاح کو ایک قطعاً علیحدہ انسانی جبلت (Instinct) قرار دے دیا۔ اس نے لکھا کہ مزاح کھیل کی جبلت (Play Instinct) ہے اور اس کا بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو صدمے یا مایوسی کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے۔

اس سلسلے میں ایسٹمن نے مزاح کے مندرجہ ذیل چار اصول پیش کیے[1]:

الف : اشیاء صرف اس وقت مزاحیہ رنگ اختیار کرتی ہیں جب ہم خود مزاح کے موڈ میں ہوں۔ اگر ہم بہت سنجیدہ ہوں تو مزاح کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔

ب : جب ہم مزاح کے موڈ میں ہوتے ہیں تو خوش گوار چیزیں (ناخوشگوار چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

ج : ہنسی کھیل کا رجحان بچپن کا ابتدائی نشان ہے اور بچوں کی ہنسی مزاح کو اس کے سادہ ترین انداز میں پیش کرتی ہے۔

د : باتوں میں ہنسی کھیل کا یہ رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے لہٰذا وہ ناخوشگوار اشیاء کو مزاحیہ رنگ میں دیکھنے اور ان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔

فرائڈ کے بعد مزاح کے مسئلے پر گریگ اور ایسٹمن کے علاوہ جس تیسرے مصنف نے طبع آزمائی کی اس کا نام آرتھر کوسلر ہے۔ ضمناً یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آرتھر کوسلر کے نظریات مزاح پر جدید ترین تحقیقات کا حکم رکھتے ہیں۔

آرتھر کوسلر کے نظریات کے مطابق[2] انسانی زندگی پر دو رجحانات مسلط ہیں۔ تشدد اور مدافعت کا رجحان جسے اس نے Self Assertive کا نام دیا ہے۔ پھیلاؤ اور آفاقیت کا رجحان جسے اس نے Self—Transcending سے معنون کیا ہے۔ تشدد اور مدافعت کے رجحان کے زیر سایہ انسان برتری، جنسی تشدد اور خود غرضی کے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور آفاقیت کے رجحان کے تحت ہمدردی، محبت اور بے غرضی کا ——— آرتھر کوسلر کے مطابق اوّل الذکر طریبہ اور مخالف المیہ کی تخلیق کا ضامن ہے مگر ان دونوں کی آمد کا راستہ ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک سا طریق اختیار کرتے ہیں۔

اس طریق کار کو مصنف مذکور نے "عمل رابطہ" (Bisociation) کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح مزاح کی تخلیق دو مختلف ذہنی منازل کے مابین ایک رابطہ کی رہین منت ہے اسی طرح آرٹ بھی ایک عمل رابطہ سے معرض وجود میں

---

[1] Eastman—Enjoyment of Laughter, 1937 ED, P. 19

[2] Arthur Koestler—Insight & Outlook, 1949 ED.

ہے چنانچہ تشبیہ یا استعارہ جو آرٹ کی جان ہے محض دو اشیاء کے مابین ایک ایسے ربط کا نام ہے جو اس سے قبل کبھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ یہی ربط مزاح اور لطیفہ کی جان ہے جس کی مدد سے ہمارا تخیل دو جداگانہ جذبات سے ہم آہنگ رہتا ہے) یکایک ان جذبات سے اس کو چھڑا لیتا ہے اور جذبات کے منہ زور بہاؤ کو ایک تماشائی کی طرح دیکھنے لگتا ہے ـــــ یوں ہماری ہنسی تحریک ملتی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے ہنسی کے مسئلے پر مفکرین کے خیالات کو مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن ہونے جیسا ہے کہ ہنسی کا یہ مسئلہ جتنا دقیق و وسیع نظر ہوتا چلا گیا تا آنکہ دور جدید میں اس کی بعض گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اہل فکر کو کڑی ذہنی کشمکش میں سے گذرنا پڑا۔ اس ضمن میں پروفیسر سٹی فرائڈ، البسٹ جین اور آرتھر کوئسلر کے نظریات خاص طور پر ہنسی کے مسئلے کے بیشتر پہلوؤں اور زاویوں کو زیر بحث لانے میں کامیاب ہوئے اور یہیں محسوس ہوا کہ وہ مسئلہ جس کی طرف قدیم مفکرین نے محض چند جملوں میں اشارہ کیا تھا آج ایک باقاعدہ مطالعے کا درجہ اختیار کر چکا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے چھپے ہوئے پہلو یقینی طور پر ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔

مگر جہاں مزاح کے پس پشت مختلف تحریکات کا جائزہ لیا گیا ہے وہاں ضروری ہے کہ مزاح کے تدریجی ارتقاء پر بھی اجمالی بحث کر لیا جائے تاکہ مزاح کی ارتقائی کیفیات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

مزاح کے تدریجی ارتقاء کو اس طوفانی ندی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو پتھروں اور چٹانوں سے سرشکنی شور مچاتی اور بھاگ اٹھاتی آخر کش ایک وسیع کشادہ اور پرسکون دریا کی صورت اختیار کر لے اور پھر وسیع و بے پایاں سمندر میں مل کر ابدیت سے ہم کنار ہو جائے۔ لیکن چونکہ اس کی کشادگی اور وسعت کا صحیح اندازہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے اس کے طوفانی آغاز کا جائزہ لیا جائے لہٰذا ہم مزاح کو اس کے اولین ماحول اس کی جم بھومی میں دیکھنے پر مجبور ہیں۔

غور کریں تو بچے یا وحشی کے پاس بلند ہانگ قہقہوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن اس کے مزاح میں وسعت اور گہرائی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کا مزاح محض اس طوفانی ندی کی طرح ہے جو معمولی پتھر سے بھی ٹکرائے تو شور مچاتی ہے۔ چنانچہ وہ ایسی باتوں پر بے اختیار قہقہے لگاتا ہے جو بالغ نظر انسانوں کے ذوق مزاح سے کافی پست ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر وحشی انسان کا وہ اولین قہقہہ جو اس نے دشمن کی کھال ادھیڑتے وقت لگایا تھا آج کی مہذب دنیا میں قطعاً ناقابل قبول ہے لیکن چونکہ ساری تاریخ انسان کی مختصر سی زندگی میں خود کو کلیتہً دہرا دیتی ہے لہٰذا وحشی انسان کے ان قہقہوں کی صدائے بازگشت بچوں کے لطیفوں نہ قہقہوں میں سنائی دے گی جو وہ کسی شے کو ٹوٹتے یا گرتے یا بدشکل ہوتے دیکھ کر لگاتے ہیں۔

بہرحال انسانی مزاح کے نشوونما میں ایک تدریجی انداز کارفرما نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں دیکھنے کو قہقہے کا آغاز ہی اس وقت ہوا جب انسان نے حیوان کی میکانکی زندگی سے نجات پائی۔ حیوانی زندگی کا مابہ الامتیاز جبلت اور طبعی رجحان کا تسلط تھا۔ یہاں تخیل محض جبلت کے سامنے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ اس کے تخیل نے طبعی رجحان سے اپنا دامن جھٹک کر علیحدہ کر لیا اور طبعی رجحان کے میکانکی عمل کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔ اس عمل سے انسان کو اس بات کا اچانک احساس ہوا کہ اس کی زندگی فضول اور بے معنی بھی ہو سکتی ہے۔ اس احساس نے

اس کے قہقہے کو تحریک دی۔

مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا "تولیتی" انسان کے اس قہقہے میں شدت اور گونج تو بہت تھی لیکن گہرائی اور رفاقت کا فقدان تھا۔ اس کا مزاح زیادہ تر عملی مذاق تک محدود تھا یا پھر وہ ان باتوں کو نشانہ تمسخر بناتا تھا جو اس کے اپنے ماحول سے مختلف تھیں۔ آج بھی اجنبیوں خاص طور پر سفید رنگ کے لوگوں کے لباس، چال، بول چال اور عادات واطوار کی نقلیں کرنا وحشی قبیلوں میں بہت عام ہے اور ان پر دل کھول کر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔ ——— نہ صرف قہقہے بلکہ بعض اوقات تو یہ لوگ مارے ہنسی کے تالیاں بجانا اور پاؤں کو زور زور سے زمین پر پٹخنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ ——— دور کیوں جائیے یہاں پنجاب کے دور دراز دیہات میں آج بھی جب کوئی زمیندار سوٹ پہن کے نظر آتا ہے تو دیہاتیوں کے بوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ ضرور کھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔

دراصل وحشی انسان کا ذوقِ مزاح ہمارے ہاں کے اسکول کے بچوں کے ذوقِ مزاح سے شدید مماثلت رکھتا ہے۔ وہی عملی مذاق اور تحریری انداز لیکن ہمدردی کی افسوسناک کمی۔ دراصل مزاح میں ہمدردانہ پہلو کی فراہمی بعد کی بات ہے جب کہ وحشی قبیلوں کی تنگ اور گھٹی ہوئی فضا نے ہر لطیفہ سنتے ہوئے سوشل نظام کے لیے جگہ خالی کر دی۔ چنانچہ سوسائٹی میں طبقاتی حد بندی مزاح کے نشوونما ارتقاء کے لیے ایسی ضروری ہے اور چونکہ وحشی قبائل میں اس طبقاتی حد بندی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا لہٰذا وہ زیادہ سے زیادہ اجنبیوں ہی کو نشانہ تمسخر بناتے اور دل کھول کر قہقہے لگاتے ہیں۔

طبقاتی کشمکش کے علاوہ ہمارے سوشل ارتقاء کی ہر نوع ذہنی وسعت، اخلاقی اقدار، سیاسی اور سماجی آزادی اور دولت کے تصور نے بھی ہمارے ذوقِ مزاح پر بڑے نمایاں اثرات رقم کیے ہیں۔ اب ہمارا مزاح یقینی طور پر گروہ کی ہنسی Choral Laughter سے ترقی کر کے فرد کی ہنسی (Individual Laughter) تک جا پہنچا ہے۔ دراصل سوشل ارتقاء نے کہیں صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد جا کر ایسی فضا پیدا کی ہے جس میں انفرادی آزادی کے تصور نے اپنے پاؤں مضبوط کر لیے ہیں اور فرد کے قہقہے یا تبسم میں نہ صرف گہرائی اور انفرادیت کی جھلک نظر آنے لگی ہے بلکہ اس کے مزاح میں بھی پہاڑی ندی کی پُرشور سرگوشی کی بجائے پُرسکون دریا کی دھیمی لے سنائی دے رہی ہے۔

پس آج ہمارا مزاح ان مدارج تک جا پہنچا ہے جہاں سے پلٹ کر ہم اپنی سنجیدہ زندگی پر اس بے نیازی سے نگاہ دوڑا سکتے ہیں جس طرح کوئی بوڑھا اپنے شباب کی ان داستانوں پر نظر دوڑاتے جو ایک وقت اتنی سنجیدہ اور جذباتی تھیں لیکن جو آج اسے محض حماقتیں نظر آتی ہیں اور جن پر وہ اب آسانی سے قہقہے لگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آج مزاح ایک ایسے مقام پر بھی جا پہنچا ہے جہاں اس نے یاس کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ اب جہاں یاس مزاح کو بے اختیار ہو کر قہقہے لگانے سے باز رکھتی ہے وہاں مزاح بھی یاس کو آنسوؤں میں تبدیل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ "ان دو وحشیوں کا یہ حیرت انگیز ملاپ ہے ——— ایک بہت سخت دوسری بہت نرم۔ دنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے لیکن یہ کتنی خوفناک جگہ ہوتی اگر یہاں آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔"[1]

---

1. Stephen Leacock – Humour & Humanity, P. 233

(۲)

گزشتہ فصل میں احساسِ مزاح کی اہمیت ہنسی کے پس پشت مختلف تحریکات اور وحشی سے مہذب انسان تک مزاح کے تدریجی ارتقاء کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے۔ اب ہم مزاح نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ دیکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ مزاحیہ اور طنزیہ ادب جن کیفیتوں سے خالص مزاح Humour طنز Satire تعریف Parody رمز Irony وغیرہ سے اپنی بقدر کے لیے خون گرم حاصل کرتا ہے وہ خود کن عناصر کے اجتماع سے مرتب ہوتی اور کس انداز سے مزاحیہ و طنزیہ ادب کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے خالص مزاح کو لیجیے جس کی تعریف سٹیفن لی کاک Stephen Leacock نے ان الفاظ میں کی ہے:-

"مزاح کیا ہے؟ یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فن کارانہ اظہار ہو جائے۔"[1]

مزاح کی یہ توضیح دراصل مزاح کی تخلیق سے تعلق ہے اور اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ مزاح نگار اپنی نگاہ و دور بیں سے زندگی کی ان ناہمواریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ دوسرے ان ناہمواریوں کی طرف مزاح نگار کے ردِ عمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا اور اس ماحول کو پسند بھی کرتا ہے جس نے ان ناہمواریوں کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویۂ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ مزاح نگار اپنے "تجربے" کے اظہار میں فن کارانہ انداز اختیار کرتا ہے اور اسے سپاٹ طریق سے پیش نہیں کرتا۔ لیکوک کی رائے میں خالص مزاح کی پیش کش ان تینوں عناصر کی رہینِ منت ہے۔

جیسا کہ لی کاک کی توضیح سے معلوم ہوا مزاح نگار اس خود کے ساتھ جس کا وہ مضحکہ اڑاتا ہے ایک "ذہنی کھیل" میں شریک ہو جاتا اور اس سے محظوظ ہونے لگتا ہے لیکن طنز نگار کا معاملہ اس سے کچھ جدا ہے۔ دراصل طنز کے پس پشت مرکزی خیال یہ ہوتا ہے کہ خود طنز نگار کسی انسانی قدر سے محظوظ ہے جس کا وہ مضحکہ اڑا رہا ہے۔ نتیجتاً اسے اپنے نشانۂ تمسخر سے کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ یہاں اگر رونالڈ نکس Ronald Knox کا ایک فقرہ مستعار لیا جائے تو ہم کہہ سکتے کہ "مزاح نگار ہرن کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔"[2] چنانچہ جہاں مزاح نگار کا طریق کار یہ ہے کہ وہ ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا ہے وہاں طنز نگار ان ناہمواریوں سے نفرت کرتا اور انھیں خندۂ استہزا میں اڑا دینے کی طرف ہر دم مائل رہتا ہے۔ البتہ طنز کے کسی ایک مدارج ضرور ہیں۔ چنانچہ کبھی تو یہ محض ایک فرد کو نشانۂ تمسخر بناتی ہے اور کبھی ان ارتقائی منازل پر پہنچ جاتی ہے جہاں یہ انسان اور سماج کی مستقل حماقتوں اور عالم گیر ناہمواریوں کو طشت از بام کرتی اور انسان کو انسانیت سے قریب تر لانے میں مدد دیتی ہے۔

---

1. Stephen Leacock—Humour & Humanity, P. 11
2. Ronald Knox—Essays on Satire, P. 31

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری اور مناسب ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک طنز کو اپنی، افادیت کے باعث مزاح پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہاں مزاح ایک قومی کارنامہ ہے وہاں طنز ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کی دانست میں طنز ہی ادب میں مستقل اقدار کی حامل ہے لیکن درحقیقت یہ نظریہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طنز سماج اور انسان کے پستی پر ہنسنے والوں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتی ہے لیکن دوسری طرف خالص مزاح بھی تو ہماری بجھی ہوئی طبیعتوں اور بے مزا زندگیوں کو مسرور کرتا اور ہمیں مست بہم پہنچاتا ہے۔ فی الواقع افادیت کے نقطۂ نظر سے دونوں ہمارے رفیق و غمگسار ہیں اور ہم ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے سے قاصر۔ پس اپنی تحقیقات کے دوران میں ہم اسی درمیانی راستے کو اختیار کریں گے۔

مزاح نگاری اپنے نمود کے لیے جن عناصر کی رہین منت ہے ان میں سے ایک محاذ (Comparison) ہے۔ مختلف چیزوں کی آپس میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی کو پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ مزاح نگار بالعموم مزاح کی تخلیق کے لیے اس حربے سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھاتا ہے۔ عام زندگی میں موازنہ کی مثال کسی شریر آدمی کے اس عکس سے ہو سکتی ہے جو کسی فرد کے مجسمے کو مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ یہ عکس بیک وقت اس فرد کا اصلی عکس بھی ہے اور اس سے قطعاً مختلف بھی اور اسی لیے یہ ہنسی کو پیدا بھی کرتا ہے۔ اردو ادب میں کنہیا لال کپور کی کتاب "چنگ و رباب" کا ایک جملہ "شیخ سعدی سے لے کر شیخ چلی تک" اس کی نمایاں مثال ہے کہ اس کی تخلیق میں اس مشابہت اور تضاد کے بیک وقت وجود نے حصہ لیا ہے۔ شیخ سعدی اور شیخ چلی میں "شیخ" کا لفظ مشترک ہے لیکن اس وقت چلی اور سعدی کا تضاد ایک ایسی شدید ناہمواری پیدا کرتا ہے کہ ہم بے اختیار ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اسی طرح پطرس کے مشہور مضمون "کتے" کے آغاز میں بھی مزاح کو تحریک اس مشابہت اور تضاد کے بیک وقت وجود سے ملی ہے جو مشاعروں اور کتوں کے ہنگامے کے مابین ہے۔

مزاح نگاری کا دوسرا کارآمد حربہ زبان و بیان کی بازیگری ہے۔ لفظی بازیگری سے مزاح پیدا کرنے کے کئی ایک طریق ہیں جن میں شاید سب سے پرانا طریق تکرار (Repetition) ہے مگر اس ضمن میں جس طریق کو ازمنۂ قدیم سے اہمیت ملی ہے وہ صنعت لفظی (Pun) کے نام سے مشہور ہے۔ رعایت لفظی کا مقصد یہ ہے کہ کسی لفظ کو اس انداز سے استعمال کیا جائے کہ اس لفظ کے دو مختلف مطالب کا احساس ہو۔ چنانچہ اس کی مدد سے بالعموم ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو عام انداز سے کہی جائے تو ایک شدید ترین ردعمل کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلے لیکن رعایت لفظی کے لیے جدت شرط ہے ورنہ تکرار سے بالعموم اس کی مزاحیہ کیفیت الٹا طنز پذیر ہو جاتی ہے۔ لفظی بازی گری کا اور نمونہ مضحکہ خیز املا سے مزاح کی تخلیق ہے۔ لیکن اس کا افق اس وجہ سے محدود ہے کہ یہاں مضحک پہلو تک صرف انسانی آنکھ ہی رسائی حاصل کر پاتی ہے۔ ان کے علاوہ لطائف سے پیدا ہونے والا مزاح بھی بڑی حد تک الفاظ ہی کا رہین منت رہتا ہے کہ یہاں الفاظ کی کمیت (Economy) سے مضحک نکات کو بڑی تیزی اور شدت سے پیدا کیا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی لفظی بازیگری کے یہ تمام نمونے لیکن مضحک نکات بذلہ سنجی (Wit) کے زمرے میں شامل ہیں۔ بذلہ سنجی کو مزاح سے بہ آسانی تمیز کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ مزاح ایک کیفیت ہونے کے باعث سارے کے سارے ادب پارے میں ایک برقی رو کی طرح سرایت کر جاتا ہے اور ہم جس مقام سے

اسے لطیفہ میں پوری نہ ہیں صاف طور پر محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ مزاح کو علیحدہ کر کے دکھانا بہت مشکل ہے۔ دوسری طرف اگرچہ بذلہ سنجی کا فایان ترین عنصر مزاح ہے اور اسی لیے مزاح نگار اسے عمدے کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ تاہم بذلہ سنجی کا رشتہ الفاظ کے ساتھ اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ مزاح کے برعکس یہ علیحدہ کر کے بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ اس گفتگو کو زیادہ واضح طور پر اشکال ۱ اور ب کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔

(ب)

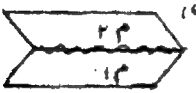

(ا)

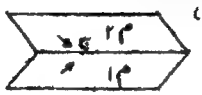

ان دونوں اشکال (ا اور ب) میں م ۱ اور م ۲ ہمارے تصورات کے دو میدان ہیں۔ شکل ا لطیفے سے متعلق ہے اور بتاتی ہے کہ لطیفہ کس طرح سے ہنسی کو بیدار کرتا ہے۔ اس شکل کے مطابق جب دو مجرد تصورات (ذہن میں سے ایک م ۱ اور دوسرا م ۲ کا تصور ہے) ایک نقطے پر جا کر ملتے ہیں تو ایک ایسا برقی جھٹکا لگتا ہے جو لطیفے کی جان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ لطیفہ لیجیے:-

"گورنر کو پاگل خانے کا ملاحظہ کرنا تھا چنانچہ پاگل خانہ میں بڑے انتظامات کیے جا رہے تھے ایک پاگل نے جو دیر سے کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا ایک آفیسر سے پوچھا۔

پاگل : کیوں جی کون آ رہا ہے؟

آفیسر : گورنر!

پاگل : کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جب آیا تھا تو دو اسرائے تھا۔"

یہاں تصورات کے دو میدان موجود ہیں ـــــ گورنر کی پاگل خانہ میں آمد برائے ملاحظہ (م ۱) اور گورنر کی پاگل خانے میں آمد بطور پاگل (م ۲)۔ چنانچہ جب ان دو تصورات کا مقام ج پر ٹکراؤ ہوتا ہے اور ہم پاگل کے یہ الفاظ پڑھتے ہیں کہ وہ بھی شروع شروع میں غور کو ماسٹر اسے سمجھتا تھا تو ہنسی کا ایک شرارہ پیدا ہوتا ہے۔

دوسری شکل یعنی ب میں ایسا کوئی خاص شرارہ موجود نہیں۔ یہ شکل مزاح سے متعلق ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مزاح م ۱ اور م ۲ کی حتمی انضمام کے ساتھ ساتھ چلتا ہے قدم قدم پر کاشتا اور اپنے سفر کے دوران میں ہلکے ہلکے شرارے پیدا کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ مزاح کی امتیازی کیفیت یہ ہے کہ اس کے باعث جو تبسم معرض وجود میں آتا ہے وہ ایک نمایاں مسکراہٹ میں تبدیل ہو کر دیکھتے دیکھتے قہقہہ بن جاتا ہے اور پھر دیکھتے دیکھتے سنجیدگی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے لیکن یہ سنجیدگی ابدی نہیں ہوتی۔ اگلے ہی موڑ پر اسے پھر وہی تبسم کی رفاقت میسر آ جاتی ہے اور یوں یہ چکر برقرار رہتا ہے۔ مغربی ادب میں ٹمان کا ہکزوٹ Don Quixote اور مسٹر پک وک Mr. Pickwick اور ہمارے اپنے ادب میں خوجی اور چاچھکن کے مطالعے میں مزاح کی یہ کیفیت بڑی واضح ہے۔

مزاح نگاری کا تیسرا اہم عنصر مزاحیہ صورتِ واقعہ (Humorous Situation) ہے۔ یہ صورتِ واقعہ تین اہم عناصر کی رہین منت ہوتی ہے ـــــ ناہمواریوں کی اچانک پیدائش، انجمن میں اپیرائسن کے مقابلے میں ناظر کا احساسِ برتری اور یہ تلخین کہ احساس کہ اس واقعے میں صدمے یا دکھ کا پہلو موجود نہیں۔ یہی بات ایک مثال سے اس طرح واضح ہو سکتی ہے:

"اس تجربہ نے فنکار بائیسکل کی طبیعت نازک پر گراں گزری چنانچہ اس میں یکلخت دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو پیڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جانو سامنے رہا تھا لیکن میرا پاؤں ہمیشہ ہوا میں طرف کو مڑا ہوا رہتا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً پھیل کر قریب نیچے پہنچ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لیے میں ٹانگیں اوپر نیچے کرنے لگا تو یہ ہوتے ہوتے تھوڑی تک پہنچ گئے۔"

(مرحوم کی یاد میں" ——— پطرس)

یہاں زندگی کی روانی میں دفعتاً ناہمواری سی پیدا ہوگئی ہے۔ ایک بھلا چنگا آدمی دیکھتے دیکھتے عجیب سی الجھن میں گرفتار ہوگیا ہے۔ ایک ایسی الجھن جس نے چند لمحوں کے لیے اس کے عام انسانی وقار کو ختم کر کے ہمارے احساس برتری کو تحریک دے دی ہے لیکن چونکہ ظاہر ہے کہ شخص کسی سخت چوٹ یا شدید ذہنی صدمے سے محفوظ ہے اس لیے اگر اس کی ہیئت کذائی ہماری ہنسی کو بیدار کر دیتی ہے تو یہ حالات کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس اگر یہی شخص سائیکل سے گر پڑتا ہے اور اس کی ایک ٹانگ سخت مجروح ہو جاتی ہے تو ایک حسی انسان تو شاید بے اختیار ہنس دے۔ لیکن ایک مہذب انسان کے ہونٹوں پر خفیف سے تبسم کا نمودار ہو جانا بھی بعید از قیاس ہے۔

صورت واقعہ سے پیدا ہونے والا بہترین مزاح وہ ہے جو کسی شعوری کاوش کا رہین منت نہ ہو بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہو جائے۔ چنانچہ صورت واقعہ کی تعمیر میں ایک اچھا مزاح نگار فطری، غیر متوقع اتفاق وقت (Coincidence) سے بھی کام لیتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ عملی مذاق (Practical Jokes) سے بہت کم مدد طلب کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عملی مذاق مزاح کی ایک کھردری صورت ہے اور چونکہ اس کی تعمیر میں بڑی حد تک شعوری کاوش کو دخل حاصل ہے لہٰذا اس سے پیدا ہونے والے مزاح میں وہ گہرائی اور لطافت موجود نہیں ہوتی جو صورت واقعہ کے مزاح کا مابہ الامتیاز ہے۔

مزاح نگاری کا چوتھا حربہ مزاحیہ کردار (Humorous Character) ہے۔ وہ مزاحیہ کردار جس کی بدولت تمام کا تمام ماحول مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بے شک مزاحیہ کردار کو نمایاں کرنے کے لیے پہلے ایک مناسب ماحول ہموار کرنا از بس ضروری ہے تاہم جب ایک بار اس انوکھے کردار کی تخلیق ہو جاتی ہے تو پھر اس کا سرسری سا تذکرہ ہی ماحول کی ساری نہج کو انحطاط پذیر کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈان کوکزوٹ (Don Quixote) یا تونچی کا نام ہی لیا جائے تو ہم ہنسنے کے لیے غیر ارادی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ عام زندگی میں بھی دیکھیے کہ مولویوں، فلاسفروں یا ہنگ لکھوں کے متعلق لطائف محض مولوی، فلاسفر یا لکھ کے لفظ ہی سے ایک غیر سنجیدہ فضا کی تعمیر کر لیتے اور ناظر کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر پیدا کر دیتے ہیں۔

جہاں تک مزاحیہ کردار کی پیش کش کا تعلق ہے ایک کامیاب مزاح نگار کردار کے مختلف اجزاء یا عناصر کے مابین اس نہج کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے جس سے ناظر کو کردار کی ناہمواریوں کا احساس ہو سکے۔ چنانچہ مزاح نگار کی نظر انتخاب ایک ایسے کردار پر پڑتی ہے جس میں لچک کا فقدان ہوتا ہے اور جو ایک نارمل انسان کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں

لے سکتا ہے پس ایک مکمل مزاحیہ کردار کو قدم قدم پر انوکھے واقعات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ واقعے کی ضرورت کا مطلب ہی یہ ہے کہ کردار اصول کی اچانک تبدیلی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ ایسے موقعوں پر مزاحیہ صورتِ حالت اور مزاحیہ کردار ایک ہو جاتے اور اعلیٰ مزاح کی تخلیق میں مدد بہم پہنچانے لگتے ہیں۔

مزاح نگاری کا آخری حربہ پیروڈی یا تحریف ہے لیکن پیروڈی صرف مزاح سے ہی تعلق نہیں بلکہ طنز نگار بھی اس حربے سے فائدہ اٹھاتا ہے تاہم یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تحریف ایک علیحدہ صنفِ ادب کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور نتیجۃً ایک علیحدہ مطالعے کی طالب ہے ——— پیروڈی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ اپنے عروج پر اس کا انتہا پسند یا نظریاتی خامیوں کو نظرِ عام پر لانا ہوتا ہے لیکن اس سے ورے یہ حالاتِ زمانہ کا تھوڑا بہت کسی بلند پایہ مضمون کو خفیف مضمون میں تبدیل کرتی یا محض لفظی تبدیلیوں سے تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہے چنانچہ تحریف کے مقصد کا تعین کرنے والوں میں خاصا بُعد پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک تحریف کا مقصد نہ صرف معاصر ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو روکنا اور ان کی اصلاح کرنا ہے بلکہ زندگی کی ناہمواریوں کو ہدفِ طنز بنانا بھی ہے۔ دوسروں کے نزدیک تحریف صرف تفریح پر مبنی ہے اور اس کا مقصد بجز تفریح اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر داؤد رہبر کی یہ رائے بڑی وزنی ہے کہ ان دونوں گروہوں کو ایک طرح کا سمجھوتہ کر لینا چاہیے ——— وہ یوں کہ گروہ اوّل اصلاحی تنقید کی شرط چھوڑ دے اور گروہ ثانی تفریحِ محض کی[1] ——— پیروڈی کے ساتھ چند الفاظ تقلیب خندہ آور Burlesque کے بارے میں بھی لکھنے انتہائی ضروری ہیں۔ تحریف کی طرح تقلیب خندہ آور بھی لفظی نقالی ہے لیکن جہاں تحریف کے پیشِ نظر بالعموم اصل کی تضحیک ہوتی ہے وہاں تقلیب خندہ آور کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ کسی ادب پارے کو دوبارہ اس انداز سے لکھا جائے کہ مزاح کی تخلیق ہو سکے[2] نیو آکسفورڈ ڈکشنری میں لکھا ہے کہ پیروڈی کو مصنف کی کسی خاص تخلیق تک محدود رہنا چاہیے۔ اس طرح کہ اس کے پیشِ نظر اصل کی مزاحیہ انداز میں تنقید ہو لیکن تقلیب خندہ آور ایک وسیع تر چیز ہے جو کسی مصنف کے عام انداز یا کسی جماعت کی خاص نہج کی نقل اتارتی ہے محض اس لیے کہ ہنسی مذاق کو تحریک ہو[3]۔

اور اب طنز ——— طنز جو بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور احساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردِ عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے خشمگیں بنا دیا ہو۔ اُردو ادب میں طنز کا سرور بھی بڑی عمدگی سے اسی ردِ عمل کا رہینِ منت ہے جو ایک غیر ملکی حکومت کے تشدد، مسلسل سماجی اُلجھنوں اور فرد کی زندگی میں مسلسل ناکامیوں کے باعث پیدا ہوا اور جس نے طنز نگار یعنی ایک حساس اور دردمند انسان کو اپنے ماحول کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ اس ردِ عمل کے زیرِ اثر طنز نگار نے ان تمام مسدود پر تیز تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا جو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کی پیداوار تھے

---

[1] فارسی اور اُردو میں پیروڈی کا تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر داؤد رہبر (ادبی دنیا ستمبر ۱۹۴۶ء)

2. "To Burlesque anything means to make fun out of it, not of it"—Stephen Leacock (Humour & Humanity) P. 65

3. New Oxford Dictionary XXII. Introductions.

اور جن کے باعث معاشرہ مسلسل کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ طنز کا استعمال تخریب پسندی کی علامت ہے۔ دراصل طنز کی تخریبی کارروائی صرف ناسور پر نشتر چلانے کی حد تک ہے۔ اس کے بعد زخم کا مندمل ہو جانا اور خود بامور ساتی کا اپنے مرض سے نجات حاصل کر لینا یقیناً اس کا بہت بڑا تعمیری کارنامہ ہے لیکن طنز کے لیے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو جو کونین کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرنے کے دوسرے پردہ دری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف فن کا مانند پیرایۂ اظہار اختیار کرے اور نہ یہ کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ دری کو زندگی اور سماج کی حاشیہ نا ہمواریوں کی پردہ دری کا وسیلہ بنا لے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا طنز، طنز نہیں رہتی۔ محض چبھتی، استہزائیہ ہجو کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور شاید اسی لیے اپنے صحیح راستے سے بھٹک کر اس حاروا میں جا گھستی ہے جہاں تخریب کا جواب تخریب سے ملتا ہے اور نشانۂ تمسخر وار کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی بجائے غضبناک ہو کر جوابی حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

طنز کے بارے میں آرتھر کوئسلر[1] کا خیال ہے کہ ہمارے اذہان زندگی کی بیزار کن یکسانیت اور بے رنگ تکرار سے اس قدر بے حس ہو چکے ہیں اور ہم زندگی کے ناسوروں کو دیکھ دیکھ کر ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک طنز نگار انھیں مبالغہ آمیز انداز سے پیش نہ کرے۔ ہماری نگاہیں ان پر جمتی ہی نہیں پاتیں۔ پس طنز نگار کی جیت اسی میں ہے کہ وہ زندگی اور سماج کی ناہمواریوں کو یوں بڑھا چڑھا کر اور ایسے مزاحیہ انداز سے پیش کرے کہ ہم ان ناہمواریوں کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں اور ہمیں طنز نگار کی بات بُری بھی نہ لگے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مزاح کی طرح طنز بھی موانہ، مبالغہ، غلو، بازیگری اور تحریف وغیرہ کے حربے استعمال کرتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مزاح کے برعکس طنز میں "نشتریت" کا پہلو ضرور غالب رہتا ہے اور یہ اپنے نشانۂ تمسخر کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار ضرور کرتی ہے۔

مزاح اور اس کے اقسام کی یہ بحث طنز و مزاح کے قبیلے کے ایک آخری رکن کا تذکرہ کیے بغیر نامکمل رہے گی۔ ہماری مراد اس صنفِ ادب سے ہے جسے اصطلاح عام میں رمز (Irony) کہتے ہیں اور جو تحریف کی کامیاب ضد یعنی "مبالغہ" کے برعکس کم بیانی (Under statement) کا سہارا لے کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ آج رمز ادب میں ایک مستقل اور اہم مقام حاصل کر چکی ہے اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ مخالف کے دلائل، نظریات اور طریق استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے یوں بیان کیا جائے کہ اس کے کمزور پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ بظاہر یہ کسی شے کا نہایت سنجیدگی اور متانت سے ذکر کرتی ہے اور اس سے مکمل اتفاق کرتی ہے۔ لیکن درپردہ اس کی جڑیں بڑی تیزی سے کاٹتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی پیشہ شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس بیچارے کو تو کبھی بھوک ہی نہیں لگی۔ اس نے صرف دس انگلیوں، پانچ پراٹھوں اور دو درجن کے آٹھ گلاسوں کے ساتھ ناشتہ کیا" تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ نہیں جو بیان ہوا بلکہ

---

[1] Arthur Koestler—Insight & Outlook, P. 95

اس کا قطعی الٹ ہے دوسرے لفظوں میں رمز کرنے والا (Ironist) مخالف کے نقطۂ نظر کو اپنا کر اس طریق سے بیان کرتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر ایک مہمل صورت اختیار کر جاتا ہے اور دراصل اسی میں رمز کرنے والے کی جیت بھی ہے۔

(۳)

اب مزاح اور اس کے مسائل (طنز، تعریف، رمز وغیرہ) کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہ اظہار و بیان کے یہ مختلف انداز کیونکر طنزیہ و مزاحیہ ادب کی تخلیق میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اب ہم اردو ادب کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان معلومات کی روشنی میں جو اب تک حاصل ہوئی ہیں اردو ادب میں طنز و مزاح کے ارتقاء کا ایک تاریخی اور تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے لیکن اس سے قبل کہ ایسا کیا جائے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اردو ادب کی نشوونما میں دوسری زبانوں کی ادبیات نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ انگریزی اور فارسی۔ چنانچہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا جائزہ لینے سے قبل یہ نہایت ضروری ہے کہ انگریزی اور فارسی کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی اہم ترین خصوصیات کا بھی مختصر سا جائزہ لیا جائے تاکہ آگے چل کر یہ معلوم ہو سکے کہ طنزیات و مضحکات کے میدان میں ہماری اپنی نگارشات نے کہاں کہاں سے اثرات قبول کیے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے انگریزی ادب کو لیجیے جس کی نمایاں ترین خصوصیت "خالص مزاح" کی ابتدا اور اس کا تدریجی ارتقاء ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں طنز کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ انگریزی ادب میں بھی طنز کے اچھے نمونے ملتے ہیں تاہم یہ بات شاید انگریزی ادب ہی سے مخصوص ہے کہ یہاں مزاح طنز کا لبادہ اوڑھے بغیر نمودار ہوا اور ادب اور معاشرے میں ایک مخصوص مقام حاصل کرتا چلا گیا۔ انگریزی ادب میں خالص مزاح کی اس بتدریج آمد کی پہلی وجہ تو انگریزی فضا کا وہ گھریلو پن ہے جو اس ملک کی ہر شے پر ایک لطیف دھند کی طرح مسلط ہے۔ دوسری وجہ انگریزی کردار کی وہ انفرادیت اور غیر ہمواری ہے جو انگریزی فضا، انگریزی خاندان اور نتیجتہً انگریزی ادب میں ایک مزاحیہ کردار کی صورت میں بڑے بھرپور انداز میں موجود ہے اور تیسری وجہ سکون اور رعایت کی وہ فضا ہے جو بیرونی حملوں اور ملکی انقلابوں سے بڑی حد تک محفوظ رہی اور جس کے باعث انگریزی خاندان کے حلقے میں بھی سکون و عافیت کا دور دورہ رہا۔

لیکن انگریزی ادب کا خالص مزاح آغاز کار ہی سے انگریزی ادب کا طرۂ امتیاز نہیں رہا۔ دراصل یہاں "خالص مزاح" کا وجود نسبتاً ایک جدید تر واقعہ ہے اور انیسویں صدی سے قبل اس کا وہ مخصوص رنگ غائب ہے جو انیسویں صدی کے نصف اوّل میں جین آسٹن کی تحریروں سے نمودار ہوا اور جو کال ورلے تک پہنچتے پہنچتے بمشکل اپنے بھرپور انداز سے ظاہر ہو سکا۔ بعض بات مستثنیات کے تابع ضرور ہے۔ چنانچہ مزاح کے ہلکے رنگوں کو شیکسپیئر، سٹرن، شیریڈن اور ایڈیسن کی تحریروں میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے تاہم مجموعی طور پر اس طویل دور میں طنز، تعریف اور رمز ہی کا تسلط نظر آتا ہے۔

انگریزی ادب میں طنزیات و مضحکات کا آغاز چاسر سے ہوا۔ چاسر کے اشعار میں بلند بانگ دعووں کے پہلو بہ پہلو لطیف رمز کے بھی خاصے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ وہ ہم پر بھی ہنستا ہے اور خود پر بھی اور بہ حیثیت مجموعی زندگی کی طرف

اس کا ردِ عمل ہمدردانہ ہے۔

چاسر کے بعد انگریزی ادب میں اگلا اہم نام شیکسپیئر کا ہے۔ دراصل شیکسپیئر ہمارے انگریزی ادب میں ایک روشنی کے مینار کی طرح سر بلند کھڑا ہے اور جس صنف ادب میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے اس کے نقوش ابدی طور پر ثبت ہو گئے ہیں چنانچہ طنز و مزاح کے ضمن میں بھی شیکسپیئر کے ہاں ایک انفرادی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اگر عیب جوئی بھی کرتا ہے تو اس مقصد کے ساتھ نہیں کہ کسی کا مضحکہ اڑایا جائے بلکہ اس لیے کہ منظر ہموار سا جائے۔ اس کی دنیا میں تحمل، حسن سلوک اور ہمدردی کے عناصر پر کثرت ملتے ہیں اور یہی چیزیں دراصل مزاحیہ ادب کی جان ہیں۔

شیکسپیئر کا دور انگلستان کی عظمت کا دور ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے ایک ایسا انحطاط پذیر زمانہ آتا ہے جس میں مذہبی جنون اور بدلے ہوئے سماج نے زندگی کو نئے نئے رنگ تفویض کر دیے ہیں۔ چنانچہ اس دور میں یا تو ملٹن Milton جیسے بے حد پیچیدہ فن کار ملتے ہیں یا ڈرائیڈن Dryden پیپس Pepys اور بٹلر (Butler) جیسے طنز کے گرویدہ۔ مجموعی طور پر اس زمانے کے ادب میں طنز اور رمز کی فراوانی ہے۔

یہ دور بحالی صدی اور ریسٹوریشن کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں طنز کے لیے جو میدان تیار ہوا وہ اس سے اگلی صدی میں کچھ اور بھی وسعت اختیار کر گیا۔ چنانچہ اٹھارویں صدی میں شعر کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طنز، تحریف اور رمز کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں شعری تخلیقات میں پوپ Pope کی تیز طنز اور نثر میں سوئفٹ (Swift) کی شدید رمز کے نمونے بکثرت ملتے ہیں وہاں ڈرامے میں ہم شیریڈن (Sheridan) اور گولڈ اسمتھ (Goldsmith) کے پُر لطف قہقہوں اور ناول میں فیلڈنگ کی مہذب رمز اور اسٹرن (Sterne) کے ہمدردانہ مزاح سے بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت انگریزی مضمون نگاری Essay-Writing کا وہ عروج بھی ہے جو ایڈیسن (Addison) اور اسٹیل (Steele) کی تحریروں کی رہین منت ہے۔ ان دونوں مضمون نگاروں نے نہ صرف انگریزی نثر میں سادگی اور جاذبیت پیدا کی بلکہ اسے وہ خوشگوار اور پُر لطف انداز بیان بھی بخشا جو آگے چل کر خالص مزاح کی نمود میں ایک بنیادی عنصر ثابت ہوا۔

انگریزی ادب میں اٹھارویں صدی کا دور آخر اور انیسویں صدی کا نصف اوّل اس لحاظ سے خاصے اہم ہیں کہ اس عرصے میں دو ایسے فن کار پیدا ہوئے جنھوں نے ادب میں خالص مزاح کے نقوش کو نمایاں کرنے میں ایک اہم حصہ لیا۔ ان میں سے ایک مرد تھا، چارلس لیمب (Charles Lamb) اور دوسری عورت، جین آسٹن (Jane Austen)۔ چارلس لیمب کے مضامین ایڈیسن اور اسٹیل کی سی خوشگوار لطافت کے حامل ہیں لیکن یہاں مزاح نسبتاً زیادہ لذیذ ہے۔ چارلس لیمب کی اپنی زندگی ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو آزادی اور مسرت سے محروم کسی تنہا سڑک پر بڑھتا چلا جائے اور سڑک کے اختتام پر ایک تاریک کنواں منہ کھولے اس کا منتظر ہو۔ لیکن اس کی تصانیف میں ہلکی زندگی اور زندگی سے انتہائی شغف کی ایک داستان مضمر ہے اور اسی چیز نے اس کے مزاح میں بھی توانائی پیدا کر دی ہے۔

اس دور کی ناول نگار جین آسٹن کے ناولوں میں پہلی بار خالص مزاح کا نکھرا ہوا رنگ ملتا ہے۔ وہ رنگ جس کو بعد ازاں شروع ہو کر انگریزی میں خالص مزاح کی تکمیل یافتہ صورت میں نمودار ہونا ہے۔ جین آسٹن کے مزاح کا مزاج انتہائی ٹھنڈا ہے اور یہ نہ

بیشتر اوقات محض کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ انگریزی کے مخصوص مزاح سے قریب تر ہے۔

انگریزی ادب میں انیسویں صدی ناول کے آغاز و عروج کا زمانہ ہے اور ناول کی وساطت سے مزاحیہ کردار کی تخلیق کا بھی تذکرہ ہے۔ چنانچہ جین آسٹن کے مزاحیہ کرداروں کے فوراً بعد چارلس ڈکنس کے بے شمار ایسے کردار ملتے ہیں جو اپنی کسی نہ کسی بھرپور کے باعث مزاحیہ رنگ اختیار کر جاتے ہیں۔ ڈکنس کردار نگاری کا بادشاہ ہے اور اس کے ناولوں میں جو کم و بیش ایک درجن (۱۹۰۰) کردار ملتے ہیں ان میں سے بیشتر مزاحیہ کرداروں کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کردار اس شدید ہمدردی اور شفقت کی فضا میں سانس لیتے ہیں جو ان کی تعمیر میں صرف ہوتی ہے اور جو بالعموم صحیح مزاحیہ کردار کی تخلیق کی ضامن ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈکنس کے ناولوں میں واقعے سے پیدا ہونے والا مزاح کردار کے مزاج سے ہم آہنگ بھی نظر آتا ہے اور یہی وہ انفرادی انداز ہے جس نے ڈکنس کے مزاح کو انفرادیت بخشی ہے۔

اسی دور میں ڈکنس کے ساتھ ساتھ تھیکرے (Thackery) کا نام بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔ تھیکرے کے مزاح کا مخصوص رنگ یہ ہے کہ وہ مسکراتا ہے، پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے، پھر مسکراتا ہے۔ اپنے شانوں کو جھٹکتا ہے اور زندگی کی بوالعجبیوں کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے۔ تھیکرے کے آرٹ میں بڑی حقیقت نگاری ہے اور یہی چیز اسے زندگی کے بہت بڑے محتسب کا درجہ بخش دیتی ہے۔ علاوہ ازیں تھیکرے ہی نے پہلی بار مزاحیہ تعریف کے رنگ کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

انیسویں صدی میں چارلس ڈکنس کے علاوہ پی کاک (Peacock) کے ناولوں میں بھی مزاح کی کارفرمائی نظر آتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پی کاک کے ناول دس میں سے نو حصے محض مزاح ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

اسی دوران میں شاعری کے ضمن میں جن شعراء نے مزاح نگاری کو پروان چڑھایا ان میں کالورلے (Calverley)، سٹیفن (Stephen)، اسکوائر (Squire) اور سوئن برن (Swinburne) کے نام خاصے اہم ہیں۔

اور اب ہم اس رجحان کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انگریزی مزاح نے اپنے قدم پوری طرح سے جما لیے ہیں اور اس میں تنوع، گہرائی اور نکھار پیدا ہو چکا ہے۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کے طویل عہد حکومت کا وہ درمیانی زمانہ ہے جب انگریزی مزاح ایک ایسی نئی روش اختیار کرتا ہے جسے بے معنی مزاح (Nonsense Humour) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بے معنی مزاح ایک پُراسرار طریق سے انگریزی ادب کی وہ توں متناقض خصوصیات کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح کا فرار ہے جو ناظر کو متقل و متشدد کے جہان سے نجات دلا کر ایک نسبتاً پاگل دنیا میں لے جاتا ہے —— ایک ایسی دنیا میں جہاں حماقت (Absurdity) نے شاعرانہ لباس پہن لیا ہے اور بے ڈھنگا پن اُبھر کر یوں نمایاں ہوا ہے کہ قہقہے ہونٹوں کے قفل توڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور ساری فضا بہجت سے لبریز ہو گئی ہے۔ اس مزاح کو عام کرنے والوں میں ایڈورڈ لیئر (Edward Lear)، لیوس کارول (Lewis Carroll) اور گلبرٹ (Gilbert) کے نام خاصے اہم ہیں۔

اور اب بیسویں صدی —— وہ صدی جس کے انگریزی ادب میں خالص مزاح کا رنگ دن بدن گھٹتا جا رہا ہے اور مزاح طنز کی آمیزش سے آزاد ہو کر ایک بالکل نئی صورت اختیار کر رہا ہے۔ جیکبز (Jacobs)، جیروم کے جیروم (Jerome—K—Jerome)

ا ہم نے ظریفی اور انگریزی مزاح نگاروں کو یہاں ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ سب جدید انگریزی مزاح کے نمائندے ہیں ویسے انگریزی اور ظریفی مزاح کے رنگوں میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے لیکن یہاں اس فرق کو زیر بحث لانا اس لئے غیر ضروری طور پر طول دینے کے مترادف ہوگا۔

طنز میں ایک شے رجحان کی حکایتی کتا ہے بنا نچہ یہاں بات کو کھلے بھتے اور سپاٹ انداز سے پیش کرنے کی بجائے بالواسطہ طریق سے پیش کرنے کی کوشش صاف ظاہر ہے۔

رندی و سرمستی اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ کی اس رَو کے ترجمان خیام اور سعدی کے علاوہ خسرو اور حافظ بھی ہیں لطف ادا اور جدت اسلوب کے مرجد سعدی تھے لیکن اس ضمن میں امیر خسرو نے بھی اسلوب کے سینکڑوں نئے پیرائے پیدا کیے خسرو کا یہ شعر دیکھیے

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

اس کے اسلوب کی جدت کا نمایاں ثبوت ہے۔

لیکن فارسی ادب میں رندی و سرمستی اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے میں سب سے اہم نام حافظ شیرازی کا ہے حافظ کے کلام میں سنجیدہ و سنجیدہ کا عام انداز ان کے بات کرنے کا انوکھا ڈھنگ اور ان کی زاہد و محتسب پر برجستہ اور مہذب پھبتیاں اپنی مثال آپ ہیں ؎

ساقیا برخیز و دردہ جام را — خاک بر سر کن غم ایام را

حافظِ شہر کہ مردم ملکش میخوانند — قولِ ما نیز ہمیں است گر او آدم نیست

گر ز مسجد بخرابات شدم عیب مگیر — مجلسِ وعظ در انجا ست کہ خواہد شد

طنزیات و مضحکات کی تیسری قابلِ ذکر رَو پیروڈی یا تحریف کی رَو ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایران میں ایسے تحریف نگار پیدا ہوئے جن کی تحریفیں پیروڈی کے معیار پر پورا اترتی ہیں بلکہ صرف یہ کہ فارسی زبان کے محدود طنزیہ و مزاحیہ ادب میں یہ رَو موجود ضرور ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں اسے وہ فروغ حاصل نہیں ہوا جو اس کا قدرتی حق تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگرچہ ایران کی فضا تحریف کے لیے بے حد سازگار تھی اور تحریف نگاری کے بیشتر عناصر بھی ایرانی معاشرت میں موجود تھے تاہم جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ایک تو بعض مذہبی قیود نے طنز و تحریف کو پنپنے کا موقع نہیں دیا اور دوسرے ایرانی عوام اور ادبا میں اغماض و درگزر کی وہ جملہ خصوصیات بھی موجود نہیں تھیں جو طنز و تحریف کے فروغ بے مثال کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ چنانچہ فارسی ادب میں طنز کی طرح پیروڈی کے فروغ کی ممکنات بھی رب کر رہ گئیں۔

لیکن اس سب کے باوجود فارسی ادب میں تین ایسے تحریف نگار ضرور ملتے ہیں جن کا تذکرہ یہاں ضروری ہے ——— عبید زاکانی، ابو اسحاق اطعمہ اور نظام الدین محمود قاری یزدانی المعمہ۔ ان میں سے عبید زاکانی اپنی تحریفات کے علاوہ نظم و نثر میں طنزیہ طریقِ کار کے لیے بھی بہت مشہور ہیں۔ جہاں تک تحریفات کا تعلق ہے عبید زاکانی نے زیادہ تر ان کا سہارا لے کر بعض فارسی شعراء کے کلام کا اس طریق سے مضحکہ اڑایا ہے کہ خود ان شعراء کی تضحیک ہو سکے۔ براؤن[1] کے قول کے مطابق ان تحریفات میں سے بیشتر پہلے درجے کی ہیں اور

[1] Browne—Literary History of Persia, Vol III, P. 299

اہلِ فارس انھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ البتہ طنزیات و مضحکات کے ضمن میں عبید زاکانی کی بعض تصنیفات یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ مثلاً "اخلاق الاشراف" میں انھوں نے اپنے زمانے کے پست اور غیر اخلاقی رجحانات پر زوردار طنز کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے "تعریفات" میں بعض چبھتی ہوئی بے حقیقتیوں کو منظرِ عام پر لانے اور سماج کے بعض مخصوص میلانات کو ہدفِ طنز بنانے کی کوشش کی ہے۔ عبید کی مدرسی تصانیف "رسیس نامہ" اور "موش و گربہ" بھی طنز و مزاح کے سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی زبان کے دوسرے اہم تحریف نگار ابو اسحاق اطعمہ ہیں۔ اطعمہ نے بہت سے فارسی شعراء کا کلام تحریف کیا ہے اور اپنی تحریفات میں انتزاعاً کھانوں کے نام گنوائے ہیں۔ اطعمہ کی تحریفوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اور اصل کلام میں اگر کوئی ربط ہے تو صرف اس قدر کہ اصل کلام اور تحریف دونوں کی زمین ایک ہی ہے۔ چنانچہ یہ تحریفیں پیروڈی کا کوئی بلند نمونہ پیش نہیں کرتیں۔ اطعمہ کی تحریف کا انداز کچھ اس قسم کا ہے۔ شاہ نعمت اللہ کا ایک قطعہ تھا ؎

گوہر بحر بے کراں مائیم — گاہ موجیم و گاہ دریائیم
ماہ بین آمدیم در دنیا — کہ نہاد را بخلق بنمائیم

اطعمہ نے اس کی تحریف یوں کی ؎

رشتۂ لاک موفت مائیم — گہ خمیریم و گاہ بغرائیم
ماہ زاں آمدیم در مطبخ — کہ بما پختہ قلیہ بہ نمائیم

اطعمہ کی بیشتر تحریفات ان کی کتاب "کنز الاشتہا" میں موجود ہیں۔ یہ کتاب پہلے نایاب تھی لیکن ۱۸۸۸ء میں مرزا حبیب اصفہانی نے اس کا ایڈیشن نکالا اور عوام کو پہلی بار اس سے متعارف ہوئے۔

ابو اسحاق اطعمہ نے تو پھر بھی ایک نیا راستہ نکالا۔ لیکن فارسی زبان کے تیسرے تحریف نگار یعنی البسہ نے محض اطعمہ کی نقل پر ہی اکتفا کیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جہاں ابو اسحاق اطعمہ تحریف کرتے ہوئے مختلف کھانوں کے نام لیتا تھا وہاں البسہ نے ان کی جگہ مختلف لباسوں کے نام لینے شروع کیے اور اسی نسبت سے اپنا تخلص البسہ رکھا۔ ان کے علاوہ فارسی زبان میں اور کوئی قابلِ ذکر تحریف نگار نہیں۔ البتہ جدید ترین فارسی ادب میں صحیح پیروڈی کی طرف رجحان عام ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میرزا ابوالحسن خندق یقیناً میرزا جلال الدین اور ذبیح اللہ بہروز کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی زبان و ادب میں طنز و مزاح کی آخری رَو وہ ہے جو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۹ء کے انقلابات کے بعد نمودار ہوئی اور جو آج بھی سرزمینِ ایران میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ طنز و مزاح کی اس رَو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر پہلی بار ایران کی سیاسی بیداری نے نمایاں اثرات مرتسم کیے ہیں چنانچہ اس کا مزاح بھی زیادہ تر صحافتی ہے دوسری خصوصیت اس رَو کی یہ ہے کہ اس پر پہلی بار طنز و مزاح کے مغربی نظریات نے اثر ڈالا ہے بلکہ ایرانی ادباء کے ہاں طنز و مزاح کے مغربی

۱؎ اس سلسلے میں "مختصر کنگرہ نویسندگانِ ایران" تیرماہ ۱۳۲۵ھ مطبوعہ تہران میں ڈاکٹر پرویز خانلری کے مقالے "نثر فارسی در دورۂ اخیر" کا مطالعہ ضروری ہے۔

موروں کے استعمال کی طرف ایک تازہ رجحان بھی ملتا ہے۔

آج کے ناری ادب اور صحافت میں طنز و مزاح کے سلسلے میں مرزا علی اکبر دہخدا کا نام قابل ذکر ہے کہ روزنامہ صور اسرافیل" کا نگارش فارم "چرند و پرند" انہی کے ذہن و قلم کا نتیجہ ہے۔ ویسے دہخدا نے اپنے طنز کے ان طبقات کو زیادہ تر ہدف طنز بنایا ہے جو ایران کی تباہی میں ستر راہ رہے تھے۔ اسی طرح صادق ہدایت اور مسعود فرزاد نے سیاست اور سماج پر نکتہ چینی کے سلسلے میں نام پیدا کیا ہے۔ اور فریدون توللی نے نثری پیرایہ نظم سے طنز کا کام استعمال کیا ہے۔ ان کے علاوہ طنز و مزاح کے سلسلے میں ابوالقاسم حالت اور صدیق اعلم کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

جدید فارسی دور کی ایک خصوصیت بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں بعض خالص مزاحیہ رسالے مثلاً "حاجی بابا" "باباشمل" "توفیق" اور "چلنگر" بھی منصہ شہود پر آئے لیکن سب کے سب گزشتہ حالات کے باعث یہ سارے روزنامے بند ہو چکے ہیں۔

اُردو ادب میں طنز و ظرافت

کلیم الدین احمد

(۱)

زندگی درد و غم کا دوسرا نام ہے۔ ہماری زندگی ہی ہماری مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ ہم اس دنیا میں ستائے جانے کے لیے لائے گئے ہیں۔ انسان کمزور ہے اور اس کا ماحول لاپروا۔ انسان حساس ہے اس لیے اس کا دل بہ آسانی رنج و الم کا نشانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے دل میں فطرت نے ایسی امنگیں، ایسی تمنائیں ڈال دی ہیں کہ وہ فطری طور پر ان امنگوں، ان تمناؤں کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن جہاں اس کی تمناؤں نے عملی صورت اختیار کی وہیں اس کی تکلیفوں کی داستان شروع ہو گئی۔ کیونکہ جس دنیا میں اسے لایا گیا ہے وہ اس کی تمناؤں کی مطلق پروا نہیں کرتی۔ یہ دنیا نہ اس کی تمناؤں سے آگاہ ہے اور نہ ان سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ مزہ یہ ہے کہ حساس انسان اس بے حس لیکن طاقتور دنیا سے ٹکراتا ہے اور تکلیفیں سہتا ہے۔ یہ زندگی کی حقیقت ہے لیکن یہ پوری حقیقت نہیں۔ اگر یہی پوری حقیقت ہوتی تو شاید زندگی دشوار ہو جاتی۔ زندگی میں ایسے واقعات، ایسے مناظر ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب انسان اس تلخ حقیقت کو وقتی طور پر بھول جاتا ہے۔ پس منظر میں ہمیشہ یہی تلخ حقیقت ایک مہیب دیو کی طرح موجود رہتی ہے لیکن پیش منظر میں اکثر ایسے واقعات، ایسے مناظر، ایسے متبسم لمحے بھی ملتے ہیں کہ انسان اس خوفناک اور تاریک پس منظر کے باوجود بھی مسکرا اٹھتا ہے یا قہقہہ بلند کرتا ہے۔ یہ واقعات، مناظر اور لمحے بھی زندگی کے اجزا ہیں اور جو حضرات انھیں پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ یونان کے گریاں فلسفی کی طرح زندگی سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے۔

کہا گیا ہے کہ انسان ہنسنے والا جانور ہے۔ یہ پوری حقیقت نہیں لیکن اس جملے میں انسان کی ایک اہم خصوصیت کا انکشاف ہے۔ فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے۔ یہاں ہنسی کی ماہیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔ یہ بات عام ہے کہ ہم ہنستے ہیں جیسے ہم غصہ کرتے ہیں، نفرت یا محبت کرتے ہیں، جاگتے یا سوتے ہیں اور ہنسی ہماری صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہنسی کا مادہ انسان سے سلب کر لیا جائے اگر وہ اسباب نیست و نابود ہو جائیں جن کی وجہ سے ہم ہنستے ہیں تو پھر انسان ممکن ہے کہ فرشتہ ہو جائے لیکن وہ انسان باقی نہ رہے گا۔ غالباً فرشتے ہنستے نہیں اور نہ ہنسی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جہاں ہر شے مکمل، موزوں و متناسب ہو وہاں ہنسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ہنسی جو عدم تکمیل اور ٹیڑھے پن کے احساس کا نتیجہ ہے جسے اس کا احساس نہیں یعنی جسے ہنسی نہیں آتی اسے ہم انسان شمار نہیں کریں گے۔ ادب میں انسان کے تمام وجائی اوصاف اس کے جبلتے

حواس کو بروئے کار لایا جاتا ہے ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناقابلی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ادب میں اس کا بھی وجود ناگزیر ہے۔ ادب زندگی، زندگی کے ہر پہلو، زندگی کے تضاد و تناقض، زندگی کے جملہ حواس و مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے، ہنسی بھی انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے اس لیے ادب ہنسی کا بھی ترجمان ہے۔ زندگی کے کسوٹ انگیز پہلو کی حکایتی ادب میں اسی قدر ضروری ہے جس قدر زندگی کے رقت انگیز پہلو کی۔ زندگی میں روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی، ہم روتے بھی ہیں اور پھر ہنستے بھی ہیں۔ ادب اس روشنی اور تاریکی، اس خوشی اور غم، اس ہنسی اور آنسو کا آئینہ ہے۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ ادب کا وہ حصہ جو ہنسی کا سامان ہے بیکار اہم نہیں، یہ محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے اور بس۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ سنجیدہ متین زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے، وہ بر وقت ہم سنجیدہ اور گمبھیر امور میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اس لیے اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے تفریح طبع کی، دل بہلانے کی، دماغ میں تازگی پیدا کرنے کی۔ جس طرح ہم روزانہ کام کی تھکن، یک رنگی، دشواری سے وقتی نجات حاصل کرنے کے لیے سنیما چلے جاتے ہیں، ہنسانے والی ہم سنجیدہ مشکل تحریروں کے مطالعہ سے تنگ آجاتے ہیں تو ان ہلکی، لطیف تحریروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن سے سنجیدہ تحریروں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر غلط ہے۔ موضوع سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ، بوجھل جیسا ہلکا، دشوار جیسا آسان، پیچیدہ ہو یا سیدھا سادہ، غرض ہر قسم کا موضوع محض خام مواد ہے جس سے ادیب مصرف لیتا ہے، اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے تو وہ ہر قسم کے موضوع پر اپنے آرٹ کے سارے ساز و سامان صرف کرتا ہے اور پڑھنے والا، دونوں قسم کی تحریروں (سنجیدہ اور مزاحیہ تحریروں) کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ موضوع مزاحیہ ہی لیکن اگر ادیب نے اپنے موضوع پر بحث کرنے میں سنجیدگی سے کام لیا ہے تو پڑھنے والا بھی اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ موضوع سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ اردو انشا پرداز اس حقیقت سے واقف نہیں۔

میں نے کہا ہے کہ ہنسی عدم تکمیل اور بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ تکمیل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناقابلی ہے اس لیے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں۔ دنیا اور زندگی کی ناقابلی اور ناموزونیت مسلم ہے۔ ہم محض اس ناقابلی کے احساس کا اظہار کر سکتے ہیں یا اس احساس کے ساتھ ساتھ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ دوسرے احساس میں پہلے احساس کا وجود ضروری ہے لیکن پہلے احساس کے ساتھ دوسرے احساس کا وجود لازمی نہیں۔ پہلے قسم کے احساس کا نتیجہ خالص ظرافت ہے، دوسرے کا نتیجہ ہے طنز اور ہجو۔ خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے اور پھر دوسروں کو ہنساتا ہے۔ وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہشمند نہیں۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص و ناقابل نظر سے اس کا جذبۂ تکمیل، حسن، موزونیت، انصاف جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبے سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ خالص ظرافت اور ہجو کی راہیں الگ الگ، اور منزلیں جدا جدا ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ کرنا عموماً دشوار ہے۔

خالص ظرافت نگار ہو یا ہجو گو دونوں صناع ہیں۔ دونوں کے کارنامے تخلیقی ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار محض کسی بے ڈھنگی کا منظر پیش نہیں کرتا۔ وہ اس بے آہنگی کی تخلیق بار آور کرتا ہے اور اسے دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ظرافت نگار اور کسی دوسرے صناع میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ وہ بھی مشاہدہ سے کام لیتا ہے۔ اس کی آنکھیں دنیا اور زندگی کے صحیح اور پر خلوص مناظر کو دیکھتی ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا انتخاب کر لیتی ہیں جو اس کے مخصوص آرٹ کے لیے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ

اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ وہ دنیا کے ہر گوشے، زندگی کے ہر شعبے سے واقف ہوتا ہے کیونکہ اس کا مواد ہر جگہ ہے اور اگر اسے اپنے کام کی چیز کا صحیح احساس ہے تو وہ کسی چیز سے قطعاً احتراز نہیں کرے گا۔ وہ اپنا مراد و کاوش کے ساتھ جمع کرتا ہے، اس پر غور کرتا ہے، مشاہدہ کی کسوٹی پر اسے پرکھتا ہے، تخیل، وجدانی خیال کی مدد سے پورا کرتا ہے اور دیکھی ہوئی یا تصور کی ہوئی چیزوں کو صنعت کارانہ شعور و مہارت سے رنگین کرتا ہے۔ اس کے دل میں اصلاح کا جذبہ موجزن نہیں ہوتا۔ وہ صناع ہے خالق اصلاح نہیں۔ اس کے کارنامے بھی صحیح معنوں میں تخلیقی ہوتے ہیں۔ یہ کارنامے ہماری تفریح کا باعث ہوتے ہیں لیکن تفریح اصل مدعا نہیں۔ اس کا منتہا ایک حسین، مکمل و موزوں کارنامے کی تخلیق ہے۔ جو تفریح ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ ایک حد تک اتفاقی ہے۔

ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر سکتا اٹھتا ہے لیکن اور کسی قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجو گو کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجو گو بے ڈھنگے، ناقص، بدصورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ ناانصافی، بیرحمی، ریا کاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ اس کی ہجویں انہی جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ وہ بھی صناع ہے اس لیے وہ اپنے جذبات کو محض سپید سادے طور پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات سے ان کی شدت کے باوجود علیحدگی اختیار کرتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہو کر انھیں اپنے خام مواد میں لا کر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے اور اس صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں زیادتی ہوتی ہے۔ ہجو گو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں، خامیوں، فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے لیکن ہجو گو انسان ہے اور انسانی حدود میں گھرا ہوا ہے اس لیے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس کی ہجوں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت اور اس کی ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبہ سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے بہرکیف ہجو گو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور رونا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، ترحم، انصاف، فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، تعفن، حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلہ میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔

(۲)

ہجو کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ نظم و نثر۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں اور جو فرق ہے تو اسے ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی وزن۔ اگر وزن نہ ہو تو پھر ہجو یہ نظم و نثر میں تمیز ممکن نہیں۔ شاعر اور نثر نگار دونوں ہجو کے میدان میں ایک ہی مقصد لے کر گامزن ہوتے ہیں۔ دونوں کی راہیں اور منزلیں ایک ہیں۔ صرف ایک اشہب وزن پر سوار اور دوسرا پا پیادہ ہے۔ یہ طرز خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شعر اور نثر میں ایما و رمز بنیادی فرق ہے۔ وزن شعر میں ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں۔ دورِ حاضر میں بعض سنجیدہ شعرا نے ثابت کر دکھایا ہے کہ وزن شعر کی ذاتی خصوصیت نہیں۔ وہ ایک مخصوص صورت میں اپنے احساس شعری کی ترجمانی کرتے ہیں جسے نظم معریٰ کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی نثر کے بجائے کو وزن کے جامہ سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ شعر کے زمرہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شعر ہمارے تجربات، حسین و دلکش قیمت تجربات کا حسین و موزوں اور کامل ترجمان ہے نثر میں ہمارے خیالات کا صاف،

مختصر اور بے کم و کاست اظہار ہوتا ہے۔ دونوں کی راہیں جدا جدا اور منزلیں الگ الگ ہیں۔ جس طرح غزل یا نظم اور مقالہ میں صنفی اور بنیادی فرق ہے بعینہٖ اسی طرح ہجویہ نظم اور ہجویہ نثر میں بھی صنفی اور بنیادی فرق ہے۔ اس جگہ ایک دوسری غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ سمجھا یہ بھی جاتا ہے کہ ہجویہ نظم میں شاعری بلند پایہ شاعری کا وجود ممکن نہیں۔ عام گفتگو میں شاعری جذبات کی ترجمانی کا دوسرا نام ہے۔ ہجویہ نظم میں کسی شخص کے معائب یا کسی عام انسانی نقص کا طنزیہ انکشاف ہوتا ہے اس لیے ان نظموں میں بظاہر جذبات کا (اور جذبات سے تمام قسم کے جذبات مراد ہوتے ہیں) وجود نہیں ہوتا۔ اس روایتی مغالطہ نظر میں جذبات صرف وہی ہیں جن سے غزلیں بھری پڑی ہیں۔ انہی احساسات مخصوص و محدود احساسات کو شعریت کا حامل سمجھا جاتا ہے جو عشق و عشق سے وابستہ ہوتے ہیں یا جو بے ثباتی دنیا، موت یا زیادہ سے زیادہ وطن کی محبت، آزادی کی لگن سے سروکار رکھتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجویہ نظم جذبات کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہجو گو شاعر نا انصافی، بے رحمی، ظلم اور اسی قسم کے انسانی نقائص کے مشاہدہ سے متاثر ہوتا ہے اور اسی مشاہدہ سے متاثر ہو کر اس کا جذبۂ نفرت، غضب، حقارت جوش میں آتا ہے۔ انہی جذبات کا اظہار وہ اپنی نظم میں کرتا ہے۔ اگر جذبۂ عشق ایک چمنده طاقت ہے تو جذبۂ نفرت بھی ایک طاقتور نمود ہے۔ اگر کوئی حسین فطری منظر ہمارے ذوق حسن کو بیدار کرتا ہے تو کوئی مکروہ انسانی منظر ہمارے احساس غضب کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اگر معشوق کے جسمانی حسن کی تعریف میں ہم رطب اللسان ہو سکتے ہیں تو کسی شخص کے اخلاقی قبح کا مقارنت آمیز انکشاف بھی کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہجویہ نظم میں بھی جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور پیمانۂ شعر میں ہر قسم کے جذبات سما سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بعض طرح غزل کے اشعار یا کسی رومانی نظم میں شدت جذبات کا وجود ہو سکتا ہے اسی طرح ہجویہ نظم میں بھی جذبات کی شدت ہو سکتی ہے اور اگر کسی شعر یا نظم میں بلند پایہ شاعری ہو سکتی ہے تو پھر ہجویہ نظم میں بھی بلند پایہ شاعری کا وجود ممکن ہے۔

اردو میں ہجویہ شاعری کو زیادہ فروغ نہ ہوا، ریختی اور ہزلیات سے یہاں بحث نہیں۔ خالص ہجو کی طرف بہت کم شعرا نے توجہ کی اور ان میں صرف دو چار ہی کم و بیش کامیاب ہوئے۔ سودا کے معاصرین میں مکین، ضاحک وغیرہ نے اس میدان میں ہاتھ دوڑائے لیکن آگے نہ بڑھ سکے۔ انشا، مصحفی کی نوک جھونک سے دنیا واقف ہے لیکن ان کی ہجویں محض ذاتی بغض و عناد کی ترجمان تھیں اور اس قسم کی ہجووں میں بھی ان کا رتبہ بلند نہیں۔ اودھ پنچ کے سلسلہ میں شہباز، ظریف وغیرہ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی مگر کوئی زندہ کارنامہ پیش کر سکے۔ موجودہ زمانہ میں بعض ترقی پسند شعراء نے اور ان کے ہم مسلک شعراء نے طنز و ظرافت سے کام لیا لیکن ان کی طنز و ظرافت محض سطحی ثابت ہوئی۔ اردو میں صرف چار شعراء ایسے ہیں جن کی ہجویہ نظمیں قابل ذکر ہیں یعنی سودا، اکبر، اقبال اور جوش۔

رشید احمد صاحب کہتے ہیں:

> بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔

یہ صحیح نہیں۔ ہجو گو شاعر اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر کسی ذاتی جذبۂ عناد، بغض و تعصب سے متاثر ہو کر کہا وہ ہجو گو ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہجو میں ذاتی عنصر کا وجود ناگزیر ہے۔ اساسی شرط یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبہ کو عالم گیری عطا کر سکے یعنی وہ اپنی شخصیت کو علیحدہ کر کے اپنے جذبۂ نفرت و غضب کو عام انسانی نقائص کے خلاف برانگیختہ کر سکے مثلاً زید، عمرو و بکر یعنی کسی فرد یا

ساتھ ہے تو شاعر کے ساتھ انصاف برتتی۔ اس ناانصافی کی وجہ سے اس کے دل میں غم و غصہ نے جہاں سر اٹھایا۔ کامیاب ہجو گو شاعر اپنے جذبات کے بیان کو تاثر میں ڈھالتا ہے اور مخصوص حاضر سے قطع نظر کر کے ناانصافی، عالمگیر انصاف کو اپنی فکر کا نشانہ بناتا ہے۔

ہجو میں دلکی بے لوث برہمی نکھر نے کم ملتے ہیں۔ شاعر انسان ہے اور اس کے جذبات فانی ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے ذاتی جذبات کو عالمگیر بنا سکتا ہے لیکن جب تک وہ فرشتہ خدا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ ذہن و دل کی بے لوث برہمی کو مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہجو گو انسان ایک برہم انسان ہے اور اس کی برہمی بے لوث نہیں ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس برہمی کا سبب بظاہر نظر آئے اور اس کے تحت شعور کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہو اس لیے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ نہیں کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک ہو۔ بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ ذاتی جذبہ محض ذاتی نہ رہے بلکہ عالمگیر ہو جائے۔ اگر اگر سودا کی ہجویں ناقص ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے احساسات کو قابو میں نہیں لاتے، ان سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے اور انھیں شعلۂ تخیل کی مدد سے ذاتی آلائشوں سے پاک نہیں کرتے۔ سودا میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک بلند پایہ ہجو گو کے لیے ضروری ہیں۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت حاضر جواب تھے۔ بقول آزاد ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے۔ لیکن اس زندہ دلی کے باوجود جب وہ برہم ہوتے تو پھر ان کی برہمی کی انتہا نہ ہوتی۔ ان کی برہمی سے ان کے معاصرین آشنا تھے اور اس سے خائف رہتے تھے کیونکہ ان کے ترکش میں طنز کے ہزاروں تیر تھے جن کی چبھن بے پناہ تھی۔ لوگ ان سے خائف رہتے تھے لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوتے۔ ان کا تخیل تیز رو اور بلند پرواز تھا۔ وہ ایک لمحہ میں قوافی تصویریں مرتب کر سکتے تھے۔ ایک جگہ ایک رنگین و متحرک تجزیہ "قصیدہ در ہجو اسپ اسنی بقصیدہ روزگار" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نالی قتی کا ان کے کہ ان تک کروں بیاں	فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا	ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر	دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے	میں گر اس کی تھان کی ہووے نہ استوار
ہے پر اس قدر کہ جو تلوا ہے اس کا سن	پھٹے وہ دل کہ جو نہ ہووے اس کے دیوانے کے نثار
لیکن مجھے زرونے نوا رہ یاد ہے	شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو اسوار
مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں	جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زنہار

دیکھا! سودا کیسی سوجھتی ہے اور جو سوجھتی ہے خوب سوجھتی ہے لیکن وہ اپنے اشہب تخیل کی جولانی کو روک نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے ان کی ہجویں رطب و یابس سے بھری پڑی ہیں اور اعتدال، تناسب کی کمی نظر آتی ہے۔ اگر ان کی سوجھ میں بوجھ کا کچھ زیادہ دخل ہوتا تو یہ ہجویں زیادہ بلند پایہ ہو جاتیں۔ ہجویہ نظموں میں جزئیات کے حسن، ان کی فنکارانہ اور موزونیت سے حسن نظم میں افزائش ہوتی ہے لیکن اگر جزئیات کی ایسی فراوانی ہو کہ نظم کا حسن صورت مسخ یا ناقص ہو جائے تو یہی جزئیات عیب شمار کی جاتی ہیں۔ یہی عیب سودا کی نظموں کا اہم ترین عیب ہے۔ ان نظموں میں جزئیات کی ایسی فراوانی ہے کہ گویا اشجار کی زیادتی سے جنگل نظر نہیں آتا۔ اردو شعرا اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہر نظم کی ایک صورت ہوتی ہے جو الفاظ، تعقل، خیالات سے الگ اور بلند ہوتی ہے اور کسی نظم کی کامیابی کے لیے

اس شعر میں صورت کا وجود فالتو ہے۔ سودا اس شعر صورت سے واقف نہ تھے۔ ان کے تخیل کی سبک روی اور بلند پروازی خراماں خراماں ہر جگہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ان کی نظموں کو ضرورت سے زیادہ طویل اور ڈھیلی بنا دیتی ہے۔ اگر اختصار سے کام لیا جاتا تو ان کے شعر میں اضافہ ممکن تھا۔ اس خراماں کے ساتھ سودا ضرورت سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مبالغہ مشرقی شاعری کا بڑا عیب ہے لیکن مبالغہ بجائے خود کوئی بری شے نہیں۔ یہ شاعری اور دوسرے فنون کے لیے ضروری بھی ہے اور حسین بھی معلوم ہو سکتا ہے ایک مغربی نقاد کہتا ہے کہ مبالغہ آرٹ کی جان ہے۔ یہ سب صحیح لیکن مبالغہ جب حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر اہم ترین عیب بن جاتا ہے مثلاً اس گھوڑے کی ہجو میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں ؎

کہتا تھا کوئی ہے یہ بزرگوں ہی میں سے اسپ — کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ — کہتا تھا کوئی تجھ سے پھر تجھ کو یوں کیا سوار
اس محضہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز — پھٹنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر وہ چار
دھوبی کمار کے گئے حواس دن چڑھے تھے گم — اس ماجرے کے سن کیا دونوں نے اں گذار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر — پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا وہ کمہار
ہر شب اس کی دیکھ کے کر خوف کا خیال — لٹکے ہی واں تھے جیب تماشے کے بے شمار

پہلے دو شعر تک مضائقہ نہ تھا۔ یہاں جائز حد تک اس گھوڑے کی ہجو کی گئی ہے لیکن بقیہ اشعار میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلے شعر میں کہنے والے واقعی گھوڑے کو "بزرگوں" یا ولایت کا حمار نہیں سمجھتے۔ دوسرے شعر میں بھی کہنے والے نے محض ظرافت، اچھی ظرافت سے کام لیا ہے لیکن بعد کے شعروں میں اس گھوڑے کو واقعی گدھا تصور کیا جاتا ہے اور پھر اسے خرس بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ذوقِ لطیف کے لیے بے لطفی کا سبب ہوتا ہے پھر یہاں تکرار بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ گھوڑے کو گدھے سے تشبیہ دی جا چکی ہے پھر بار بار اسی تشبیہ کی تکرار مذاق سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ تکرار بھی سودا کا ایک عام نقص ہے۔ وہ ایک ہی بات کو بار بار مختلف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جس سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔

گھوڑے کی ہجو بے سبب ضرور ہے لیکن اپنی دلچسپی کے باوجود بھی یہ بلند پایہ ہجو یہ شاعری کی مثال نہیں، یہاں موضوع اہم نہیں، جذبات کی شدت بھی نہیں اور نہ مختلف عناصر کی شدت کے ساتھ آمیزش ہوئی ہے۔ غرض یہاں ایک بھی ایسا عنصر نہیں جو بلند پایہ شاعری کے لیے ضروری ہے۔ یہی کمی دوسری نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ دوسری ہجوؤں میں قدوی، ضاحک، حکیم خوش نویسی، فولاد خاں کو تو اں، دولت مند بخیل وغیرہ کو طنز کا شکار بنایا گیا ہے۔ "قصیدہ شہر آشوب" اور "مخمس شہر آشوب" میں سنجیدگی و متانت کے ساتھ زیادہ اہم امور کی طرف توجہ کی گئی ہے لیکن ان سب نظموں کو پیش نظر رکھ کر بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سودا کا میدان تنگ ہے۔ وہ جملہ انسانی نقائص، سماج کی ناانصافیوں، مختلف طبقوں اور پیشوں، کل انسانیت کو حلقۂ ہجو میں داخل نہیں کرتے۔ سودا میں سنجیدگی و متانت مرجود تھی۔ اگر وہ سنجیدگی و متانت کو اپنی سب نظموں میں برقرار رکھتے، اگر وہ سنجیدگی و متانت کے ساتھ اہم انسانی اور سماجی نقائص کا انکشاف روا رکھتے تو ان کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہو جاتی۔ بہرکیف سودا نے اچھی ہجویں لکھی ہیں بشیدی فولاد خاں کو تو اں اس طرح اپنی لاچاری کا اظہار کرتا ہے ؎

خلق جب دیکھ کر کہے یہ بیداد — کہتے ہیں کوتوال سے فریاد
ہوئے ہے تو کہ میں بھی ہوں ناچار — گرم ہے چوٹیوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کوشش — بیڑی پنگڑی کا میرے سر پہ ہے مول
یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور — دیکھو لونگ کہاں کہاں ہے چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل — ہے ایرش کے گھر میں چور محل
دیکھیے گر بتاں کو بھی بخدا — ہاتھ میں ہے انھوں کے کوندھنا
کس کو ماروں میں کس کو گالی دوں — چوری کرنے سے کون ہے خالی

یہ طنز کی عمدہ مثال ہے اور یہاں طنز ظرافت کے دوش بدوش ہے ؎

دیکھیے گر بتاں کو بھی بخدا
ہاتھ میں ہے انھوں کے کوندھنا

سودا میں ظرافت کا مادہ طنز پر غالب ہے۔ غالباً اسی ظرافت کی عمہ گیری کی وجہ سے ان نظموں میں شدت جذبات کی کمی ہے۔ "شہر آشوب" کے علاوہ شاید ہی کہیں پُر اثر اور شدید جذبات کی مثالیں مل سکیں۔ سودا ایسے شگفتہ طبیعت واقع ہوئے ہیں کہ وہ غضب، نفرت، حقارت اور اسی قسم کے تیز و تند جذبات سے آشنا نہ تھے۔ وہ غصہ ہوتے تھے لیکن جو کچھ کہہ کر اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے یعنی غصہ انھیں ہجو گوئی پر آمادہ کرتا لیکن جہاں انھوں نے ظرافیا جہاں ان کا تخیل مائل پرواز ہوا تو پھر غصہ فرو ہو جاتا اور اس کے بدلے ان کے دماغ میں نئے نئے مضامین، انوکھے خیالات، دلچسپ، رنگین، جاذب نظر تصویروں کی آمد ہے انھیں ایک قسم کی مسرت ہوتی اور ان کی نظم غضب کے بدلے اس مسرت کا اظہار ہوتی۔ وہ مسرت جو ایک صناع کو اپنے کارنامہ تخلیق میں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قاری بھی کبھی غضب ناک اور برہم نہیں ہوتا بلکہ خوش ایجاد اور اس کے حسین و دلکش نتائج کو دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ مثل روز روشن ہے کہ سودا کی ہجو یہ شاعری کے تقاضے وصدود کے باوجود اردو میں اس وقت تک سودا سے بہتر کوئی دوسرا ہجو گو شاعر نہیں پیدا ہوا۔

مغرب سے کہ شعراء مابعد پر سودا کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ سودا کے بعد اکبر کا نام آتا ہے لیکن اکبر نے سودا سے استفادہ نہیں کیا اور اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ وسعت اور تنوع مضامین کے لحاظ سے اکبر کو سودا پر فضیلت حاصل ہے لیکن اس فضیلت کا نوحہ ماکبر کا عہد ہے اس عہد کی تصویر عبدالماجد صاحب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

"اکبر جب دنیا سے روشناس ہوتے ہیں تو ان کے ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کو فرد بھرے چند سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کے نتائج بھگت رہی ہے، اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے ..... نفاق، خود غرضی و عیاری، نفس پروری اور

عیش پرستی کا گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی مسلمات کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لیے انگریزی عدالتیں ہیں، تعلیم کے لیے انگریزی مدرسے ہیں، سفر کے لیے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لیے انگریزی شفاخانے ہیں... عزت و حکومت کے لیے انگریزی عہدے ہیں، حصولِ معاش کے لیے انگریزی پیشے ہیں، زینت و آرائش کے لیے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بانات ہیں، غرض جس طرف بھی نگاہ پڑتی ہے حدِ نظر تک ایک غیر محدود مستقبل ہی پر چم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا ہے.....

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے۔ تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے۔ تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا خمیر اس خیال پر اٹھا ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کیے جائیں..... عقل و دانش کا یہ مفہوم قرار پایا کہ انگریزی مصنف کے قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے اور اپنے علوم و فنون، اپنے شعائر و رسوم، اپنے عقاید و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ یہ فضا تھی جس میں اکبر نے آنکھیں کھولیں۔"

یعنی وہ زمانہ تھا جب دو مختلف تمدنوں میں زبردست تصادم ہوا تھا اور اس تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور انگریزی تمدن اپنی دلفریبی کا سکہ لوگوں پر جما رہا تھا، اپنے محاسن فراموش ہو چلے تھے اور محسنِ غیر میں نگاہیں محو تھیں۔ اکبر پرانے تمدن، پرانے نظام کے پرستار تھے اور وہ نئے تمدن، نئے نظام کے نقائص کا انکشاف کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی نظر کے سامنے ایک نامحدود میدان نظر آیا کیونکہ انگریزی تمدن کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ سودؔ کے سامنے یہ حدود نہیں تھا۔ ان کے زمانے میں اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے لیکن انگریزی تمدن نے اپنا جادو شروع نہیں کیا تھا۔ سودؔ زیادہ سے زیادہ مٹنے والی تہذیب، اٹھی ہوئی شان و شوکت، گزری ہوئی عظمت کو حسرت بھری نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرف زمانے میں انتشار کی صورت نمایاں تھی۔ پراگندگی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یہ پراگندگی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ سودا اسی پراگندگی کا نقشہ اپنے "مخمس شہر آشوب" میں کرتے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ ان کے زمانے میں سماج کی وہ طبقہ بندی ممکن ہی نہ تھی جو اکبر کا خصوصی حصہ ہے۔ اکبر کا قدم پرانی تہذیب پر جما ہوا تھا اور وہ اس محفوظ و مثبت مقام سے نئی تہذیب کی بڑھتی ہوئی فوج کا مقابلہ کرتے ہیں اور حتی تہا اس یلغار کو روکنا چاہتے ہیں۔ اسی مقصد میں اپنی فطری طنز و ظرافت سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی تیز اور باریک بین نگاہیں دشمن کی کمزوریوں کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ ان کمزوریوں کی اپنی طنز و ظرافت سے قطع و برید کرتے ہیں۔

مضامین کی وسعت اور تنوع مسلم ہے لیکن اکبر سودا کے مرتبہ تک نہیں پہنچتے کیونکہ ان کا آرٹ سودا کے آرٹ سے بنیادی طور پر کم مرتبہ ہے۔ سودا اپنے جذبات و حیالات کے اظہار کے لیے فکر کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ضرورت سے زیادہ طولانی اور تفصیلی ہیں پھر بھی وہ نظمیں ہیں۔ اکبر نہایت مختصر قطعہ، رباعیوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جس قسم کی نظمیں اکبر لکھتے ہیں ان کے لیے یہ مختصر سانچے زیادہ موزوں ہیں۔ اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی جس قسم کے سانچے اکبر کی نظموں میں ملتے ہیں وہ سانچوں کی حیثیت سے نسبتاً کم مرتبہ ہیں۔ ان سانچوں میں دست تجدید کی ممکن نہ تھی۔ ان کی تنگ دامانی ان کا اصل نقص ہے۔ اکبر کا آرٹ مختصر تصویریں بناتے بناتے کبھی کبھی اور بہت مختصر تصویریں حسین بھی ہیں اور موثر بھی اور اپنے مقصد میں کامیاب، ملاحظہ ہو ؎

وہ حفظ وضع کے کشتیں نہیں قید کچھ اور	بھینس کو گون پہنا دیجیے عاشق ہو جائیں
اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے	صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلۂ من	کچھ حدیثیں ہیں کچھ مٹا ہے
سودہ مٹنا بھی اب ہے مشکل پولس	ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے
لنچ کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی	چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر	پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

یہ ہے اکبر کا آرٹ مختصر پیمانہ میں وہ ایسی بھرپور نظمیں لکھتے ہیں جو تیر بہدف ہو جاتی ہیں وہ ایسے ایسے شعر نما شعر نما شعر نما

پیچیدگی، تخیل کی جولانی کی گنجائش تھی، سودا کے تخیل کو وسعت کی ضرورت تھی۔ تنگی میں اس کا دم خانچ گھٹنے لگتا۔ اکبر کا تخیل تنگی میں خوش ہے۔ اسے کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔ مطلب یہ نہیں کہ سودا کی تصویریں ہمیشہ مفصل اور طویل پیمانہ پر ہوتی ہیں۔ مختصر اور موثر تصویریں یہاں بھی ملتی ہیں۔ یہاں بھی وہ صوتوں اور اکثر ایک مصرع میں ایک مرقع پیش کر دیا جاتا ہے، ایسا مرقع جو زندہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے ؎

ضعیفی نے کی اس کی فربہی گم — گیا ماتی کل اور رہ گئی دُم
کھانا آدھے تو اس طبع ٹوٹے — جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے
بسکہ مطبخ میں سردی ہتی ہے — ناک باورچیوں کی بہتی ہے
وہ جو سودا بکے ہے لاینحل — آپ کرتا ہے وزدیِ معنی

اصل یہ ہے کہ سودا مفصل یا مختصر اور ہمیشہ زندہ مرقعے پیش کرتے ہیں۔ اکبر کسی ظرافت آمیز خیال یا کسی تیز طنز کا بیان کرتے ہیں۔ سودا میں ڈرامائی نگاری کی قوت ہے اس لیے جو تصویریں وہ مرتب کرتے ہیں وہ جیتی جاگتی، جاری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ اکبر محض انوکھے خیال، ہنسنے اور ہنسا دینے والے نکتے، تیز و تند طنز و طنز سے ہمارے دماغ کو محظوظ کرتے ہیں اور اسے متحرک کرتے ہیں، یعنی اکبر میں نکتہ سنجی (WIT) ہے۔ یہ مادہ سودا میں بھی موجود ہے لیکن اس حد تک نہیں البتہ ظرافت میں سودا اکبر سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

اکبر اگر مفصل نظمیں کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے تو ان کی ہجویں شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ بلند پایہ ہو جاتیں۔ اگر وہ اپنے خیالات کا تسلسل کے ساتھ اظہار کرتے، اگر وہ مختلف نقوش کو جمع کر کے ایک نقش کامل تیار کرتے، اگر ان کی نظموں میں خیالات کی بار کی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ ہوتی، اگر وہ مختلف جذبات، شدید جذبات پر قابو رکھتے تو ریزۂ خیالی کا الزام جو ان نظموں پر عاید ہوتا ہے وہ عاید نہ ہوتا۔ بہرکیف اکبر کے ادبی ماحول کا لحاظ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ قابلِ ستائش ہے۔ سیاسی اسباب کی وجہ سے جو قابلِ ہجو صورتیں پیدا ہو گئی تھیں انھیں وہ پنچ جن کر طنز کے خنجر سے قطع کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہر چیز کو دیکھتی ہیں، معمولی باتوں کو بھی وہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی ہجو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے جہاں وہ مغربیت کا اثر دیکھتے ہیں، جہاں انھیں مادیت کا گمراہ کن اثر نظر آتا ہے تو وہ فوراً آمادۂ پیکار ہو جاتے ہیں۔ "بے تیری" کو رائے تقلید، بدمذاقی اور رنگ نظری" انھی چیزوں کے وہ مخالف تھے اور انھی سے وہ جنگ آزما تھے۔ ان کے عہد کا مرقع ان کی ہجوں کو جمع کر کے مرتب کیا جا سکتا ہے اور بیان ہجوں کی تاریخی اہمیت ہے اور اسی مرقعے کے ساتھ ساتھ اس عہد پر بے مثل انفرادی تنقید بھی ملتی ہے۔

اکبر کے رنگ نے قبول عام کی سند حاصل کی انھیں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو شاید سودا کی نظموں کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ رشید احمد صاحب لکھتے ہیں:

"اکبر اپنے رنگ میں منفرد ہے، ان کے رنگ میں بعض لوگوں نے لکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔"

جن لوگوں نے اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ان میں سے ایک اقبال بھی ہیں۔ "مانگ ورا" کے اشعار میں جو ظریفانہ شعلہ ہے ان میں صاف اکبر کا رنگ جھلکتا ہے، ملاحظہ ہو ؎

مشرق میں اصول بن جاتے ہیں — مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے بس کے — واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

وہ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — وہ سر ڈھکنا اسلام کی ہے راہ
روش مغربی ہے مدِ نظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
بیٹھ کر اٹھ کھڑے ہوئے کیا یہ — پڑ گیا اس کے قدر پہ آکے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردہ کے کوئی حامی نہیں — نعمت بی بی کے مرنے کے ہی سے بے زن ہو گئے
وعظ میں خواہ مخواہ آپ نے یہ صاف صاف — پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

صاف ظاہر ہے کہ ان شعروں میں اقبال نے اکبر کا تتبع کیا ہے۔ سطحی نظر خاص طور پر ان میں اور اکبر کے شعروں میں تمیز بھی نہیں کر سکتی خیالات، طرزِ بیان، لب و لہجہ، اختصار، غرض سبھی خصوصیات یہی ہیں جو اکبر کی بحروں میں ملتی ہیں لیکن دوسرے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رنگ اقبال کے لیے فطری نہ تھا اور وہ طبیعت پر زور دے کر اس قسم کے اشعار موزوں کرتے ہیں۔ اقبال میں وہ شوخی و تنوع، وہ شگفتہ مزاجی نہ تھی جو رویا زل سوما اور اکبر کو فطرت نے ودیعت کی تھی۔ ان کا دل کنول کی طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ وہ سنجیدہ و متین واقع ہوئے تھے اس لیے جب وہ ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو ان کی ہنسی مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور ان کی ظرافت میں آورد کی جھلک ہوتی ہے ؎

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے
مہذب ہے تو اے عاشق قدم باہر نہ دھرنا سے
نہ جرأت ہے تجھ میں تو قصد خودکشی کیسا
یہ مانا درد ناکامی گیا تیرا گذر حد سے
کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو
کرایے پر منگا لوں گا کوئی افغان سر حد سے

یہاں وہ سبکی و تیزی نہیں جو اکبر کے شعروں میں ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی الجھی خوش طبعی پر آمادہ ہے۔ غالباً اقبال نے خود محسوس کیا کہ اس رنگ میں وہ نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اس لیے انھوں نے اس راہ کو جلد ترک کر دیا لیکن ان کی وہ مزاحیہ نظمیں ہیں جو قصداً متانت و سنجیدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان میں وہ اکثر قصداً یا بلا قصد طنز سے مصرف لیتے ہیں۔ ان نظموں میں وہ اکبر یا کسی دوسرے شاعر کی تقلید نہیں کرتے بلکہ انھوں نے اپنا ایک علیحدہ رنگ قائم کر لیا ہے۔ "جمعیت اقوام" "ایک بحری قزاق اور سکندر" "موسولینی" "اجتہاد" "جہاد" "پنجابی مسلمان" یہ چند مثالیں ہیں جو "ضرب کلیم" میں ملتی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہم ہنستے نہیں زیادہ سے زیادہ متبسم ہوتے ہیں۔ اکثر تبسم کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں طنز خالص طنز ہے اور یہ طنز اقبال کی سنجیدگی و متانت کی کامیاب ترجمان ہے۔ "تنفیسی خلائی" ملاحظہ ہو ؎

شاعر بھی ہیں پیدا علماء بھی حکماء بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مخلص ایک — ہر ایک ہے گو شرع معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیخوں کو سکھا دیں رمِ آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا غنہ — تاویل مسائل کو بجا نانے ہیں بہت سے

ظاہر ہے کہ یہ طرز زیادہ رنگین اور منقوح نہیں لیکن یہاں کسی کی تقلید نہیں۔ یہ رنگ انفرادی ہے اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے ہماری توجہ کا مستحق ہے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر شعراء سیاست، مذہب اور مذہبی پیشوا، مروجہ اخلاق کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ یہ سب بلاواسطہ یا بالواسطہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال سے متاثر ہوئے ہیں لیکن جوش کے علاوہ کوئی ذکر کا مستحق نہیں۔ جوش میں ایک حد تک طنز و ظرافت کا مادہ موجود ہے۔ "مولوی" "خانقاہ" "شیخ" میں یہ مذہب کی بعض صورتوں کی ہجو کرتے ہیں۔ اس طرح اکثر سیاست کے میدان میں بھی جا نکلتے ہیں لیکن جوش کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو (اور یہ خیالات نئے، انفرادی نہیں) بہت اہم سمجھتے ہیں اس لیے وہ ان سے اپنی شخصیت کو علیحدہ نہیں کر سکتے یعنی ان کے خیالات ذاتی رہتے ہیں عالمگیری اختیار نہیں کرتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الامان! خانقاہ کی دنیا — معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں مگر کے سمند — یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عار ہے خدا کو — کام لیتے ہیں سنگ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال — ہر ہنر ہے ایک ننگ سوال
کون بہتر ہے ابر و باری — ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

یہ خانقاہ کی دنیا کی ہجو نہیں اپنی مذمت ہے۔ قاری شاید وقتی طور پر متاثر تو ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار کا اثر دیر پا نہیں ہوتا۔ جوش مسلسل اشعار یا نظمیں لکھتے ہیں وہ اکبر کی طرح مختصر نظموں یا دو تین شعروں پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان کی نظموں میں تکرار و مبالغہ کی وہ یا وہ گوئی نہیں جو سودا کا مخصوص عیب ہے۔ یہ سب سہی لیکن جوش کی ہجویہ نظموں میں اس دلچسپی کی کمی ہے جو سودا اور اکبر کی نظموں کی خصوصیت ہے اور دلچسپی کی کمی یا فقدان آرٹ میں سب سے زیادہ اہم عیب شمار کیا جاتا ہے۔

اس مختصر سی تنقید سے ظاہر ہو گیا کہ اردو میں صرف اکبر اور سودا ہجویہ شاعری کے میدان میں مستقل قدم کے ساتھ گامزن ہوئے اور اس میدان میں آگے بڑھے لیکن یہ دونوں بھی ایسے کارنامے نہیں پیش کر سکے جن کا مغرب کے اعلیٰ ہجویہ کارناموں کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ اس میدان میں سودا اور اکبر کی کاوشوں کے باوجود بھی کافی گنجائشیں باقی ہیں اور اگر اردو شعراء اس طرف توجہ کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن محض توجہ کافی نہیں۔ ہجو ایک فن ہے، ایک اہم فن ہے، ہجویہ نظم ایک صنف شاعری، ایک دلچسپ اور اہم صنف شاعری ہے اور اس صنف میں بھی بلند پایہ شاعری ممکن ہے۔ اگر شعراء اس فن کے امکانات و مقاصد کو سمجھیں، اسے فن کی حیثیت سے برتیں اور ہجو خصوصیتیں ایک ہجو گو شاعر کے لیے ضروری ہیں انہیں پہچانیں تو ترقی ممکن ہے ورنہ نہیں۔ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس سے اس صنف شاعری کی ترقی کی امیدیں وابستہ ہوں۔

(۳)

اردو نثر میں طنز و ظرافت کی وہ کمی نہیں جو نظم میں ملتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نسبتاً نثر میں طنز و ظرافت کی افراط ہے اور اس افراط میں بیسویں صدی کے مصنفین کا ہاتھ زیادہ آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسے حضرات کی کافی تعداد ہو گئی ہے جو طنزیہ اور ظریفانہ مضامین صرف لکھتے ہی نہیں بلکہ لکھنے پر مُصر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کمی کے الزام سے اُردو کے دامن کو پاک کر دیا جائے۔ ان کے قلم سے مضامین کا سیلاب جاری ہے۔ وہ اس کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ مضامین معیاری ہیں یا نہیں۔ وہ کیفیت کو کمیت پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ بہرکیف ان مصنفین اور انشا پردازوں کو تین گروپ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ انشا پردازیں ہیں جن کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور جو ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا اندرونی دعا نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرا گروپ اُن مقصد ہے جو نقائص انسانی سماجی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی خواہ ہر قسم کے نقائص کو مٹانا چاہتا ہے یا کم سے کم ان نقائص کو دیکھ کر برافروختہ ہو جاتا ہے۔ اس گروپ کے انشا پرداز کا جذبہ غضب جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبۂ غضب کی اپنی بجوں میں ترجمانی کرتا ہے۔ اس قسم کے انشا پرداز خالص طنز کے حوض ظرافت اور طنز، زیادہ تر طنز سے مصرف لیتے ہیں۔ ہنسنا ہنسانا ان کا نصب العین نہیں ہوتا لیکن اکثر وہ اس میں بھی کامیاب ہوتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد کسی نقص کو رفع کرنا یا اپنے جذبۂ نفرت، غضب و حقارت کی ترجمانی ہے۔ تیسرا گروپ وہ ہے جس کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہتا ہے یہاں مقصد ظرافت نہیں بلکہ اپنے فلسفۂ زندگی کی یا ان مشاہدوں کی جن پر اس فلسفہ کی بنیاد ہے ظرافت آمیز نقاشی ہے۔

(۱) پہلے گروپ میں سب سے پہلا نام غالب کا ہے۔ غالب کی طرزِ تحریر کی خصوصیتوں کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

"وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و ممارست یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں بعض لوگوں نے خطوط مکاتبات میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اس کو مرزا کے دماغ سے وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹکل، سوشل اور مذہبی مضامین کے لوگوں نے ڈھیر لگا دیے ہیں۔ باتیں گرانی اور ناول میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خطوط کتابت کے مجموعہ دماغ ..... اور

اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔"

میں تو یہ کہوں گا کہ مرزا کی تحریر صرف خلعتِ کتابت کے واسطے ہی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی بلکہ اس وقت تک بھی کوئی اردو انشا پرداز جملہ خوبیہائے تحریر و لطف بیان کے غالب کی تحریر کی مثال نہیں پیش کر سکا۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولیٹیکل، سوشل اور ریلیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں۔ بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ غالب کی نثر ہر قسم کے موضوعات کے لیے موزوں و مناسب نہیں۔ اس کا دائرہ کسی حد تک محدود ہے اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ اکثر غالب اپنے خطوط میں سجع عبارت لکھنے کا التزام کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ابھی تک اردو میں جو خالص ظرافت کے نمونے ایسے نمونے جو ادبی معیار پر بھی پورے اترتے ہیں وہ غالب کے معیار سے بہتر کہاں، اس معیار کی گرد کو بھی نہیں پاتے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں اس طرف توجہ کی گئی ہے اور متعدد مصنفین اس میدان میں اترے اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی غالب کی بلند مرتبہ شخصیت کا حامل نہیں۔ کسی کا تخیل بھی غالب کے تخیل کی باریکی، تیزی، زور، بلند پروازی کو نہیں پہنچتا۔ ان کی ذہنیت میں وہ گہرائی اور پختگی نہیں جو غالب کی ذہنیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کہیں غالب کی شوخی، رنگینی، بے ساختگی، پرلطفی، قوتِ ایجاد کی شکل بھی نہیں ملتی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی کی انشا ادبی معیار کے لحاظ سے غالب کی انشا کو نہیں پہنچتی۔

غالب کی زندگی میں ان کی مدد قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگرچہ وہ عسرت و تنگدستی میں زندگی بسر نہ کرتے تھے۔ لیکن دنیا کی دولت و حشمت سے انھیں اس قدر میسر نہ تھا جتنا وہ چاہتے تھے۔ پھر بھی ان کی طبیعت میں غضب کا اُبھار تھا جو کبھی انھیں چلے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ان کی طبیعت کا ابھار ان کے ہر ہر لفظ، ہر ہر جملے سے ٹپکتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ رنج و افسردگی کے بیان میں بھی وہی اُبھار ہے۔ اصل یہ ہے کہ ظرافت ان کی فطرتِ ثانی تھی۔ جہاں قلم اٹھایا، ظرافت کے پھول جھڑنے لگے:۔

"میاں کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو۔ کل شام کو میر صاحب روانہ ہوئے، یہاں ان کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوشامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند دیوار چپ، جی چاہتا ہے پھٹنے کو مگر نا چار چپ۔ وہ تو غنیمت تھا کہ شہر و یاران، نہ جانِ نہ پہچان ورنہ ہمسایہ میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دو ٹکی لائی۔ امام ضامن علیہ السلام کی نیاز کا بندھا ہوا روپیہ بانٹا۔ ۵۰ روپے خرچ راہ دیے مگر ایسا جانتا ہوں کہ میر صاحب اپنے ساتھ نیاز کا روپیہ واپس لائیں گے، اپنے بازو سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پاپیادہ لے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔"

یہاں صرف ظرافت ہی نہیں بلکہ گویا غالب نے ایک زندہ سین پیش کیا ہے۔ ڈرامہ نگاری کی قوت غالب

میں موجود تھی۔ وہ بعض کسی شے، کسی واقعہ، کسی سین کا بیان ہی نہیں کرتے بلکہ اسے نظر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ ہماری قسم کے صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ شوخی سے تو خطوط بھرے پڑے ہیں:۔

"موصوف بہت تیز ہے" روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا کبھی کھانا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ رکھتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ نہ بہلانا اور بات ہے۔"

اس شوخی کے ساتھ متانت و سنجیدگی بھی موجود ہے لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مثلاً جب یوسف مرزا کو ان کے باپ اور ان کے پیٹے کی تعزیت میں خط لکھتے ہیں تو اس میں لہجہ سنجیدہ و متین ہو جاتا ہے اور الفاظ میں ایک خاص قسم کا اثر آ جاتا ہے۔ شوخی و بذلہ سنجی سے وہ قطع نظر کرتے ہیں۔ تکلفات سے یک قلم کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور سیدھے سادے مؤثر پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان مثالوں اور ان جیسی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب صرف ہنسانے پر ہی قادر نہ تھے۔ وہ رونے رلانے کی بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس طرف انھوں نے زیادہ توجہ نہ کی۔ غالباً ان کی شوخ طبیعت اور ان کا فلسفہ "مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو" دونوں مانع آئے ورنہ اس قسم کی عبارت میں بھی بے مثل ہوتے:۔

"تا توانی زور پر ہے، بڑھاپے نے کمی کر دیا ہے، ضعف آسمنی کا باقی، گرانجانی رکاب میں پاؤں ہے، ہاگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز درپیش ہے، زاد راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر نامہ سیاہ بخش دیا تو خیر اور اگر باز پرس ہوئی تو دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے"

اگر اردو انشا پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کر سکیں، اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنھیں فنا نہ ہو تو پھر وہ اپنی ساتیں اداسنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں۔

غالب کے خطوط کے بعد "اودھ پنچ کی رعنائیاں نازنظم و نثر" سامنے آتی ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے وہ مختلف مذاق بھی رکھتے تھے ——— اودھ پنچ کے مضامین کے متعلق جگبست نے یوں اظہار خیال کیا ہے:۔

"قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف اور پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے حاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیے..... اودھ پنچ کے

ظریفوں کی شوخ و ظرافت طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔۔۔۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیریلی مسکراہٹ سے ملتا ہے یہ خود بھی ظرافت پر بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔"

کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن مجھے بڑی سے کامل اتفاق ہے کہ "اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں۔" بلکہ میں تو کہوں گا کہ بحیثیت مجموعی اودھ پنچ کی ظرافت کو ادبی ظرافت نہیں کہہ سکتے ہیں۔ "بلکہ سنجیدہ و تسخر" اور ظرافت کے ادبی مفہوم میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ جو طنز اور ظرافت اودھ پنچ کے مضامین میں ملتی ہے وہ کبھی 'خام' ناقص اور طفلانہ ہے۔ ان مضامین کی یہ خامی نہیں کہ ان میں غالب کی زیریلی مسکراہٹ نہیں ملتی۔ اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ اودھ پنچ کے ظرائف خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ زیریلی مسکراہٹ اور بے تکلف قہقہہ دونوں ہی ادبی شان نمایاں ہو سکتی ہے۔ اودھ پنچ نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا تھا یہ کام ایک حد تک ضروری بھی تھا اور مستحسن بھی لیکن پنچ نے جو خدمتیں انجام دیں وہ وقتی تھیں ان کی اہمیت تاریخی ہے ادبی نہیں۔ اودھ پنچ کی ظرافت میں ادبی شان کی نمایاں کمی ہے۔ جو ظرافت یہاں ملتی ہے وہ ادبی نہیں بازاری ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:-

"وہ مارا۔ کہیں جی۔ تم لاکھ شور و غل مچایا کیے، ہم نے اپنی تہذیب کا لگا ہی دیا۔ بڑے بوڑھے کھل میں لگا لگا نکسیا ہم سے کہیے تو بڑے بڑے بانس لگا دیں لیکن یہ اتنی بھی چوڑی باتیں ہی کا ہے پر ہیں خدا ہم بھی تو سنیں، آپ نے ابھی تک سنا ہی نہیں اجی بی زہرہ کا نکاح ہو گیا۔ منشی کے بھی کوئی فریدار پیدا ہوتے ہیں۔ اب تو سب کی سب رنڈیاں لتھڑا کے بیٹھے کریں۔ خیریت سے ذرا سی گڑھیا میں منہ دھو رکھیے، خدا نخواستہ نہ اور رنڈیوں کو مراق نہ تھقان نہ آتو جی کی ہی طبیعت ایسی، رنڈیاں گھر نہ پڑیں تو کیا کریں۔"

اودھ پنچ کے پہلے دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین، سرشار، ظریف، بجر، آزاد، شہباز، برق، شوق، اکبر کا نام عصمت سے لیا جاتا ہے اور اس کے دوسرے دور میں سب سے ممتاز نام سید محفوظ علی صاحب کا شمار کیا جاتا ہے۔ میں خالص ظرافت کے سلسلے میں سجاد حسین، سرشار اور محفوظ علی صاحب کا ذکر کافی سمجھتا ہوں۔ سجاد حسین اور سرشار دونوں نے اردو میں غالباً پہلی مرتبہ ایک ظریف کردار پیش کیا ہے۔ حاجی بغلول اور خوجی کے بغیر اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں لیکن جو حقیقت کہ اردو ادب ان سے بہتر کردار نہ پیش کر سکا اردو ادب کی ایک سنگین تنقید ہے۔ وشید احمد صاحب فرماتے ہیں:-

"حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس کے پک وک اباؤٹ کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص چربہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حاجی بغلول اردو کی ظریفانہ ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آیا۔"

اگر کوئی شے کسی خاص ادب میں اپنا جواب نہ رکھتی ہو تو اس سے اس کی اہمیت اور قدر و قیمت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ حاجی بغلول اور پکوک میں وہی فرق ہے جو ایک مدھم شمع اور آفتاب میں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حاجی بغلول کا کیرکٹر اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے لیکن جہاں کسی دوسرے ادب سے مقابلہ کیا پھر اس کیرکٹر کی تخلیقی خامیاں ظاہر ہو جاتی ہے۔ حاجی بغلول صرف "ایک طور پر" اور "ایک حیثیت سے" ہی پکوک کا مکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ حاجی بغلول سراسر نامکمل اور ناقص ہے۔ اس کی اہمیت ہی ہے کہ اس سے ایک نئی راہ کھلتی ہے۔ خوجی کا کردار حاجی بغلول سے بہتر ہے۔ یہاں کسی کا مکمل اور ناقص چربہ نہیں۔ یہ ایک تخلیقی کارنامہ ہے کافی رنگین اور متنوع، خوجی خود ظریف ہیں اور اس ظرافت کا سبب ہیں جو دوسروں میں ہے۔ وہ خود بھی ہنستے ہیں اور لوگوں کو ہنسانے بھی ہیں اور لوگ ان پر ہنستے بھی ہیں۔ وہ ایک منفرد ہستی رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت مختلف عناصر سے بنی ہے۔ خوجی کا کردار کسی ایک خصوصیت یا کسی خاص طرز گفتار پر مبنی نہیں اور ان کی شخصیت ان کے گفتار و کردار سے چھن چھن کر پڑتی ہے۔ ان کے کردار پر دوسروں کے الفاظ اور اعمال سے مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شخصیت دوسروں کی شخصیتوں سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم کی وجہ سے ان کی ہستی پر نت نئی روشنی پڑتی ہے۔ خوجی کے کمالات کی فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں، فرماتے ہیں:۔

"شنو میاں! خاجہ بدیع ہفت زبان ہے، وہ کون سی زبان ہے جس سے یہ واقف نہیں۔ فرنچیسے۔ عربی، فارسی، ترکی اور فرانسیسی سب میں عبور، انگریزی زبان کا بادشاہ۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

"حضرات سنیے آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم آدمی مستغنی ہوتا ہے اور پری استغنا سے بھی آپ خوب واقف ہیں۔ مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا شاق گذرتا ہے اور وجہ کیا کہ ہم کسی سے دب نکلیں۔ جب طمع ہمارے مزاج میں کچھ نہیں گئی۔ لالچ سے ہمارے لوگ بھاگتے ہیں۔ حرص کے قریب نہیں جاتے ہیں پھر ہمارے نزدیک بادشاہ و وزیر اور امیر اور غریب اور مفلس سب یکساں۔"

خوجی نے دنیا دیکھی ہے۔ ان کے ساتھ مختلف و متنوع قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ساری دنیا نے ان کی قدر کی ہے:۔

"مصر میں وہ اعزاز ہوا کہ سبحان اللہ استنبول اور قسطنطنیہ میں تو وہ قدر افزائی ہوئی کہ زمانہ واقف ہے۔"

ہم خوجی کے اور محاسن کی قدر کریں یا نہ کریں لیکن ان کی قوت ایجاد کی ضرور قدر کرتے ہیں۔ ان کی قوت ایجاد بلا کی ہے بات کی بات میں وہ ایک ایپک مرتب کر سکتے ہیں۔ "صف شکن علی شاہ" کی داستان ملاحظہ ہو:۔

"حضور بات یہ ہوئی کہ غلام لب چشمہ سار ایک پیالی میں آہستہ آہستہ افیون گھول رہا تھا کہ بس درخت کی طرف نظر کرتا ہوں نور کا عالم! الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، یا خدا یہ کیا ہوا ہے۔ خود کہ کے دیکھا تو روشنی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ چنار کا درخت گرم کے بم میں جلتے حضور صف شکن پھر سے آن کر بالقدر بیٹھ گئے ..... ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پٹھانوں

دریا تھا اس طرف ہمارے صف شکن لشکر موجود آتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک للکار لے کر کچھ بڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ پھٹ اور ہزار ٹکڑے ہو گئی .....

میں مزے مزے افیون گھول رہا تھا اور افسر اور سوار اور پیادے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کہ پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی۔ ہیں! یا الٰہی یہ تالیاں کس نے بجائیں سب کے سب پھر غور سے دیکھنے لگے۔ پیالی ہونٹ تک لے ہی گیا تھا کہ اوپر کوہ سیوں نے باڑھ ماری، کوئی چار سو بندوقیں ایک ہی دفعہ سر ہوئیں اور آدھے آدمی مجروح اور مقتول ہوتے مگر واہ رے میں خدا گواہ ہے، پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی اب سنیے کہ فوراً صف شکن علی شاہ موجود اور میرے ہاتھ پر جھپٹ کر چوکی افیون سے تر کی اور زور سے چوکی کھولی نوہ قطرے پہاڑ تک کی خبر لائے اور پہاڑ جو پھٹا تو ایا مادھوں اور لطف یہ کہ ادھر کا ایک آدمی ضائع نہ ہوا بس میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا۔ بیر کیا خدا جانے وہ کون چیز نایاب شے ہے۔"

خوجی کے کیرکٹر میں نئی کیرکٹر پنہاں ہیں۔ خوجی جیسا وہ اپنے کو سمجھتے ہیں، خوجی جیسا انھیں ناول کے دوسرے کردار سمجھتے ہیں، خوجی جیسے وہ پڑھنے والوں کو نظر آتے ہیں۔ اس سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا اپنے زاویۂ نظر کے ساتھ ساتھ اور بہتوں زاویوں سے بھی واقف ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود بھی خوجی کا کیرکٹر ناقص ہے اور یہ نقص وہی ہے جو فسانہ آزاد کا عام نقص ہے یعنی تکلف اور اس تکلف کا لازمی نتیجہ ضرورت سے زیادہ طوالت اور خانہ پری۔ بقول عبدالباری آسی صاحب:۔

"نگاہ خورد بین طوالت کلام کی وجہ سے ہر داستان کو لند صورت سمدان کی داستان خیال کرنے لگتی ہے۔"

بہرحال خوجی اردو میں ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

سجاد حسین اور سرشار نے زندہ کردار کی تخلیق کرنے کی کوشش، کم و بیش کامیاب کوشش کی تھی۔ سید محفوظ علی صاحب تمثیلیہ کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔ تمثیلیہ ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی نہایت دشوار ہے اس میں کامیابی کے لیے طاقتور تخیل، زبردست شخصیت اور حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے۔ سید محفوظ علی میں یہ اوصاف موجود نہیں۔ "شیخ سمادالله صاحب کی صاحبزادیاں" تمثیلیہ کی صنف میں کوئی بلند پایہ جگہ پانے کے لائق نہیں۔ یہ ایک خشک دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کا تخلیقی سطح ہے۔ خیالات معمولی ہیں۔ اس میں نہ تخیلیہ ہیجان ہے اور نہ کوئی زندہ شعلہ زن حقیقت کا انکشاف:۔

"آہ سرد کھینچ کر، ہاں بھئی کیا، خدا کی شان کبھی ہم اس پڑوس میں تیزو والے سمجھے جاتے تھے۔ سینما ہر دوم ہم جانتے تھے، کھانا پکانا ہم جانتے تھے، آج بھر ہڑم بیزم گنے ہے ہم مگر اس کی وجہ جانتی ہوں۔ ارے پیسہ آئی مت گیا پیسہ گئی مت گئی گانٹھ میں دام تو سب کریں سلام۔"

ہمارے کی نگاہوں کے سامنے تشکیلیہ کی اعلیٰ مثالیں موجود ہیں وہ اس قسم کی مثال سے مرعوب و متاثر نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا کہ یہ آرٹ نہایت دشوار ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس آرٹ کے جاننے اور برتنے والے اردو میں بہت کم پائے جاتے ہیں کہ محفوظ علی صاحب نے "پنجابی رنگ" کو ترک کر کے اسپکٹیر سے قریب ہونے کی کامیاب اور مستحسن کوشش کی ہے نظامی فرماتے ہیں :-

"سب نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب ہیں۔ اسے اکبر الہ آبادی ہیں۔ ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور از سر تا پا مرقع ظرافت کوئی نہیں لکھتا یا میرے علم میں نہیں ہے"

یہ تنقید نہیں تعریف ہے اور اس تعریف میں صحت صرف اس قدر ہے کہ محفوظ علی صاحب کا لب و لہجہ اودھ پنچ کے مقابلہ میں زیادہ متین و سنجیدہ ہے۔ وہ مسخرے پن پر ریجھ کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے سنجیدہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے خیالات میں گہرائی نہیں اور ان کی تنقیدی قیمت نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی سنجیدگی، سبکی، لطافت، باریکی کی منافی ہے اور اکثر تو یہ ناقابل برداشت بے رنگی کا سبب ہو جاتی ہے :-

"میرے تجربہ میں صاحب دین ایک مختلف المزاج و الکیفیت چیز ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب دین کا مزاج کسی دوسرے صاحب دین کے مزاج کے ساتھ تو ہمیشہ گرم تر رہتا ہے مگر غیر صاحب دین کے ساتھ سرد خشک اور غصہ اور ریل کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے صاحب دین کے لیے چاہے وہ فہرست چندہ لے کر آئے یا دعوت چاہے ایک صاحب دین ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحب دین کے لیے چاہے وہ خفیف درخواست ہی لے کر آئے وہ نہایت بطی الفہم"

محفوظ علی صاحب کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کی رائے تسلیم کرنے کے قابل نہ تھی لیکن انھوں نے اپنی ظرافت پر نہایت جامع تنقید کی ہے :-

"میری طبیعت کی افتاد شوخی و ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ میں زیادہ تر غم و درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں ..... جس قدر جی کا بہاؤ دکھ کی جانب ہے سکھ کی جانب نہیں مگر جناب اکبر کی ہم نشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج بڑھے مجھ کو بھی شوق ہوا کہ اردو کے اس میدان میں طبع آزمائی کروں ..... میری ظرافت ..... درحقیقت ظرافت نہیں ہے میں نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ اردو ہے اور لوگوں میں زندہ دلی اور لطیف نکتہ چینی کا شوق

پیدا کرنے کو طرز تیار کیا ہے ..... اکثر مضامین میں جناب آکبر کا پیرایہ میرے پیش نظر ہے۔ وہ نظم کے دو مجلسوں میں جو بات کہتے ہیں میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا کیا ہے۔ بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی، بعض کی عبارت اور کی سلجھے سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے۔ نرسنہ بھی ایسا کیا ہے کہ بعض شوخ مضامین کو رکاکت میں گر جانے کے اندیشہ سے متانت کی چادر اڑھا دی ہے ..... ہنسی مذاق میرا کام نہ تھا مگر میں نے تھوڑی زبان اردو کی خلط اس میں دخل دیا ہے ..... گو میں جانتا ہوں کہ لطافت و ظرافت جس کا نام ہے وہ ان مضامین میں نہیں ہے تاہم نہ ہونے کے مقابلے میں کچھ ہونا بہتر تھا۔"

خواجہ صاحب کی ظرافت فطری نہیں اکتسابی ہے۔ وہ اپنے کو لیے دیے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ قدم سنبھل سنبھل کر رکھتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے ذرا تصنع اور آورد کا شبہ ہوتا ہے۔ "مقتول کا رقص" :-

"کل میدان جنگ میں ایک مقتول تڑپتا تھا۔ میں نے اس کے سر کو زانو پر رکھا اور اس کے رقاص جسم کی بہار دیکھی۔ حاک الموت نے کہا اس کو میری گود میں دے دو، میں نے کہا ٹھہرو! اس کے رقص کی سیر تو کر لوں۔ فرشتہ بگڑا اور بولا کوئی اپنی جان سے جاتا ہے آپ کو اس میں مزا آتا ہے۔ میں نے کہا بھائی ہر قوم کا ایک رقص اور اس میں ایک لطف ہے۔ صوفی باطنی تلوار سے مجروح ہو کر ناچتا ہے اور زنگی ظاہری تیغ سے دونوں میں ایک ادا ہے۔ مرنے والے نے کہا ناچے کا لفظ صوفی کی توہین ہے۔ میں بولا سب مہذب ناچتے ہیں ..... بادشاہ اور پوپ تک اس لفظ پر عمل کرتے ہیں، پوپ صوفی کو رقص میں کیا مارے۔ تہذیب مادی ہر بار و معانی دونوں کا ایک ہی شعار ہے ..... "

یہ ہے خواجہ صاحب کا رنگ۔ خواجہ صاحب کی اصل اہمیت ان کی انشا ہے۔ وہ نہایت ہی آسان، سادہ، پُر لطف طرز میں لکھتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ رعایت لفظی کے دام میں نہیں جا پھنستے اور ہمیشہ سنجیدگی و متانت سے کام لیتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور ان کی پاکیزہ اردو سے اگر فرحان انشا پرداز استفادہ کریں تو بہت کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور اپنی انشا کو بہت سے نقائص سے پاک کر سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی پاکیزہ اردو کی ایک مثال ملاحظہ ہو، ایسی مثال جس میں ظرافت مطلق نہیں :-

"پروانوں اس پر یوں کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آکر جل جاتا ہے، کہیں بلبل پھولوں کو گلے سے لگاتا ہے، لوہے کو مقناطیس کی محبت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے، تنکا کہربا پر فریفتہ ہے، دیوار پاتا ہے تو لپک کر سینہ سے چمٹ جاتا ہے مگر چکوے چکوی کی محبت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔

وہ آپس میں مل نہیں سکتے ساری عمر ترستے ہیں اسی واسطے تو کہا ہے کہ بچوں اچھی کو نہ ستاؤ
وہ تو خود محبت کے ستائے ہوئے جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں"

کسی مزاح نگار کی حیثیت سے اس وقت ایکسرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی مرحوم کافی شہرت رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اپنی شہرت کے باوجود بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل یہ ہے کہ ان دونوں کی ذہنیت ترقی کے مدارج طے کرنے کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے اور یہ ذہنیت وہی ہے جسے "انڈر گریجویٹ ذہنیت" کہتے ہیں۔ دونوں استعاد بہم پہنچانے سے پہلے مصنف بن بیٹھے۔ ان کے کارناموں کو اگر کسی طالب علم کا کارنامہ شمار کیا جائے تو قابل تحسین ہے اس سے زیادہ وقعت دینا تنقید اور مذاق عمیق پر دانستہ ظلم کرنا ہے۔ ان کی خامی کا الزام ایک حد تک پڑھنے والوں پر بھی عاید ہوتا ہے۔ ان کے مضامین اس قدر مشہور ہوئے ان کی اس قدر مانگ ہوئی کہ انھوں نے سمجھا کہ تصنیف کی دشوار یوں سے انھوں نے کامل اختیار حاصل کر لیا ہے اس لیے مزید کاوش کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو شروع سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامن گیر رہی حالانکہ ان کی کھیتی میں خود رو گھاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ انھیں لازم تھا کہ جو کچھ وہ لکھتے اسے محض مشق سمجھتے۔ لکھتے اور لکھ کر پھاڑ دیتے، دراہستہ آہستہ مطالعہ، مشاہدہ، غور و فکر میں وسعت، باریکی اور گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ دونوں کو شوق بھی ضرور ہے لیکن جو کچھ سوجھتی ہے وہ محض سطحی قسم کی چیز ہے۔ بذلہ سنجی اور تمسخر لطیف ظرافت کا بدل نہیں ہو سکتے اس کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی کی گنجائش نہیں ان کا رنگ اپنی جگہ پر پختہ ہو گیا ہے۔ دونوں کے مضامین سے ایک ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان کی جہالت پر تو خیر رونا آتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ کی تہذیب ملاحظہ فرمائیے کہ وہاں ہر معزز آدمی کی شناخت صرف یہ ہے کہ اس کے سر پر گوریں آگے پیچھے ادھر ادھر ہانپتا ہوا زبان نکالے دم ہلاتا ہوا کتا ضرور ہو اور اگر کسی مغربی آدمی کے ساتھ کتا نہ ہو تو اس کے متعلق یہ بھی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ آدمی بھی ہے یا نہیں اور اگر آدمی ہے تو یونہی سا ہے۔ مغربی خواتین کا یہ حال ہے کہ بغیر کتے کے ان کو لطف زندگی ہی حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک ان کے نرم و معطر آغوش میں ایک پلا نہ دبا ہو وہ اپنے عدم وجود کو کیساں سمجھتی ہیں اور اگر پلا دبا ہوا ہے تو اس سے ایسی محبت کرتی ہیں کہ انسان اس پر رشک کرے، اسے اس طرح چومتی چاٹتی اور دبوچتی ہیں کہ ان کے عشاق کتا بن کر پیدا ہونے پر فطرت سے شاکی ہو جاتے ہیں یا کتا بن جانے کے لیے دست بدعا ہوتے ہیں۔ ..... قدر سگ انگریز داند یا بداند اس کی میم"

"چودھری صاحب نے اب واہ واہ دینا شروع کر دی اور میں پڑے پڑے ان کی کوششوں کی داد دے رہا تھا وہ چلا رہے تھے اے نالائق بیخ بہ جنگ .....

اشدۃ امن الرقص..... ارے اخرج من المگر داب، ارے مردی ناقہ نکال بھگا کر
پھر میرے اوپر گرے میں نے آنکھ کھول کر دیکھا ساری دنیا گھوم رہی تھی چودھری صاحب
نے پڑے پڑے دھاڑ کر کہا "ایہا الشیخ..... ایہا الو..... ابن الاوبر الخنزیر
..... تم نہ اٹھو..... واللہ..... ارے بھائی شیخ ارے اشدۃ امن الرقص.....
ارے ارے..... ابے روک..... روک..... ارے نکال..... یا اللہ
..... ایہا الشیخ من المردی اخرج من الماء گرداب..... نالائق..... بدمعاش
..... واللہ بھائی شیخ..... مگر تو یہ کیجیے بھلا ان باتوں سے کہیں ناقہ نکلنے والی تھی"

ان مثالوں سے دونوں کی شخصیت اور ذہنیت نمایاں ہے اور دونوں کی ترقی بھی کچھ رُک سی گئی ہے۔ شوکت تھانوی کے سارے کارنامے پر ان کے اس مصرع سے روشنی پڑتی ہے ؎

قدر سنگ آنگہ بزداند یا بداند اسس کی سیم

یا اس دوسرے مصرع سے ؎

تو مشو نازکہ سارا اندھیا میری گردن پر

جو شخص ایسے مصرعے سوزمل کر کے سمجھے کہ اس نے ظرافت کا ایک شاہکار پیش کر دیا ہے اسے ظرافت کے معنی سے کوئی شناسائی نہیں ہو سکتی۔ شوکت تھانوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا پرتو ان مصرعوں میں ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں ہی انگریزی ٹریجڈی ذہنیت ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہی انڈیگریجویٹ ذہنیت اس دوسری مثال میں بھی نظر آتی ہے۔ الشدزی کسی طالبعلم کا شاہکار ہو سکتا ہے۔ پورے افسانے کی ساری جزئیات سے مصنف کی کمزوری اور خامی ظاہر ہوتی ہے۔ جب میں اپنے طالب علموں کو کبھی کہتا ہوں کہ کوئی دلچسپ مقالہ لکھو اور اس میں جس قدر ممکن ہو طنز و ظرافت سے مصرف لو تو وہ اس قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں۔

میں پطرس کو شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی دونوں پر ترجیح دیتا ہوں اور ترجیح دینے کی وجہ یہی ہے کہ پطرس کی ذہنیت زیادہ پختہ ہے۔ اس میں وہ سطحیت نہیں۔ پطرس غلط اُردو لکھتے ہوں، ان کی ظرافت اکتسابی ہو لیکن ان نقائص کے باوجود محض اپنی شخصیت کی گہرائی کی وجہ سے شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کی ظرافت کی ایک اچھی مثال یہ ہے :-

"علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سولہ بیویوں سے دریافت کیا، خود تجربہ کرتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجیے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی دیتی ہے کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار صبح دم تک بھونکتے چلے گئے تو ہم للہ دے ہی چکے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع

دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے جنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا تو ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بقا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرقی کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزار بار دھتکار آرڈر دیا لیکن ایسے موقع پر پہدھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔"

یہ ایک مشاعرہ کا بیان دلچسپ بیان تھا۔ اب ایک دوسرا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

"جلسہ شروع ہوا۔ ایک نے صور اٹھایا، سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے کسی کے بگڑے ہوئے زر خرید بے لگام ریڈیو سٹ پر اسکور سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا نعرہ لگیرین کا اور جن کی شاعری مذاہب قدیمہ سے مشابہ تھی پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کرتے ہیں لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکلا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ صدر کے بعد سے اب تک میز سپیٹی کے تمام اندراجات فوتی و پیدائش درج ہیں۔ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ برپا ہوا۔ اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا، دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں جناب صدر سیکرٹری مشاعرہ مصرعہ طرح سب کے سب شامیانے کے نیچے گل مکت ہو گئے۔"

جو فرق ان دو مثالوں میں نظر آتا ہے۔ وہی فرق پطرس اور رشید احمد صاحب میں موجود ہے۔ پطرس میں وہ بے ساختگی، وہ آمد، وہ برجستگی نہیں جو رشید احمد صاحب میں موجود ہے۔ پطرس کی مشاقی نسبتاً کچھ بے جا اکتسابی معلوم ہوتی ہے۔ رشید احمد صاحب کی ہر ایک سطر سے فطرت مصنوعیت سے کہیں کی تحریروں میں ایک ادبی شان ہوتی ہے جو شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور پطرس کی تحریروں میں نظر نہیں آتی۔ مزاح نگار ایک ادیب ہے۔ اس کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہیں۔ وہ بعض مشاہدہ اور قوت ایجاد سے کام لے کر صرف ایسے واقعات ایسے کردار کی تخلیق نہیں کرتا جن سے بے اختیار ہنسی آجائے۔ وہ اس واقعیا کردار کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے اس لیے اسے الفاظ کی جستجو اور انتخاب میں کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی واقعیا کردار کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو اگر اسے حسین اور موزوں الفاظ کے ذریعہ پیش نہ کیا جائے تو دنیائے ادب میں اس کی وقعت نہیں ہو سکتی۔ عموماً اردو مزاح نگار اس حقیقت

کو فراموش کرتے ہیں، انھیں سوجھتی ہے اور خوب سوجھتی ہے لیکن جب تک ان کی سوجھ میں بوجھ اور خصوصاً ادبی حسن کی جلوہ نہ ہو تو پھر وہ کسی معرفت کی نہیں۔ رشید احمد صاحب کی سوجھ میں ہمیشہ بوجھ کا عنصر بھی غالب رہتا ہے اور اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ طنز و مزاح کو بھی ادب کی ایک صنف سمجھتے ہیں اس لیے اپنی تحریروں میں ادبی محاسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت خام ہے۔ رشید احمد صاحب کی شخصیت اور فنیت دونوں اس الزام سے پاک ہیں۔ وہ محض مصنف بننے کی تمنا نہیں رکھتے۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی و متانت ہے۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور ان کی ظرافت میں خیالات کی گہرائی ہوتی ہے یعنی وہ محض لفاظی ظرافت سے ہمیں محظوظ ہی نہیں کرتے بلکہ ہمیں دعوت فکر بھی دیتے ہیں۔ قہقہہ کے بعد طبیعت میں سنجیدہ متانت کی طرف رجوع کرتی ہے جو عموماً ان کی تحریروں میں ہوتا رہتا ہے یعنی اعلیٰ ظرافت محض ہنسی نہیں اس میں کچھ اور بھی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے خیالات سے اتفاق کریں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشوار پسندانہ غور و فکر کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور وہ چند واضح متعین خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں:-

"آج سے لگ بھگ ۱۵ برس ہوئے آپ کو چوری کے صحیفۂ اخلاق کا مطالعہ کرادوں۔ گو زمانہ ایسا آگیا ہے کہ دوسرے معاملات کو مانند چوری کے صحیفۂ اخلاق اور چور میں بہت جلد تفاوت پیدا ہو گیا ہے۔ شاعروں کی مانند چوروں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ لیکن نہ واقف فرمائیے۔ ... ہے ممکن ہے ہماری آپ کی برادری میں بعض ایسے تنگ نظر اور بے وقوف چور بھی ہوں جو میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہو جائیں کہ میں نے ان کو شاعروں سے کیوں تشبیہ دی لیکن ان کے اطمینان کے لیے میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ میری نیت چوروں کی دل آزاری نہیں ہے شاعروں کی ہمت افزائی ہے اس لیے کہ بغیر چوری کے شاعری ناممکن ہے۔ چوری کے فروغ سے شاعری کا فروغ ہوتا ہے جیسے ہر وزگاری کا فروغ بیداری ہے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کسی ملک و قوم کی بیداری کا معیار وہاں کی ہر وزگاری ہے غیر متمدن اقوام میں بے روزگاری نہیں پائی جاتی۔"

رشید احمد صاحب کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اکثر موضوع سے بہک جاتے ہیں "آپ معاف فرمائیں میں یقیناً موضوع گفتگو سے دور جا پڑا ہوں۔" اس قسم کے جملے اکثر لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی کمزوری کا احساس ہے۔ اگر یہ بہکنا ارادی ہو اور اسے جائز حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ دل چسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن رشید احمد صاحب ضرورت سے زیادہ بہک جاتے ہیں اس لیے اکثر پڑھنے والے کی طبیعت میں الجھن سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی بسیار نویسی کے دام میں جا پھنسے ہیں جو الفاظ انھوں نے عظیم بیگ چغتائی کے متعلق لکھے ہیں وہ خود ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں:-

"امید ہے کہ رسالوں کے مختلف اور بے شمار اڈیٹر صاحبان بھی ان پر رحم فرمائیں گے کیونکہ ان صاحب کی مروت ان کو بسیار نویسی پر مجبور کرتی ہے اور بسیار نویسی کا دوسرا نام کم سے کم صحیفۂ ظرافت میں عنوبت بھی ہے۔"

بسیار نویسی کا لازمی نتیجہ ہے غور و فکر کی کمی۔ نیاز فتحپوری نے ٹھیک کہا ہے:۔

"لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کا دماغ تھک گیا ہے اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں تاہم کوئی نہ کوئی سنجیدہ خیال ان کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔"

موجودہ مزاح نگاروں میں رشید احمد صاحب سب سے زیادہ فطری صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش وہ مختصر تحریروں کے علاوہ بسیط اور پیچیدہ، زیادہ اہم ظریفانہ کارناموں کی طرف بھی توجہ کرتے۔

(۲) دوسرے گروپ میں وہ ظرافت نگار آتے ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے جو بعض چیزوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں یا جو کسی خاص مشاہدہ سے متاثر ہو کر اپنے جذبۂ غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس گروپ میں پنچ کے لکھنے والوں میں واب سید محمد آزاد کا نام داخل ہے انھوں نے نثر میں وہی کام کرنا چاہا تھا جسے اکبر نے نظم میں اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ بھی مغربیت کے خلاف تھے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے لیکن انھیں اکبر کی طرح ممتاز کامیابی نصیب نہیں ہوئی جتنی اکبر کو نظم میں میسر ہوئی۔ آزاد میں نہ وہ زور تخیل ہے، نہ وہ قوت ایجاد جو اکبر کا مخصوص حصہ ہے۔ ان میں وہ شوخی اور شگفتگی بھی نہیں اور ان کی طنز کے تیر اس قدر کارگر بھی نہیں ہوتے۔ ان کی طنز کا نمونہ یہ ہے:۔

"یہاں ہوٹلوں اور مکانات عام میں اکثر نوکروں کی جگہ خوبصورت طرح دار، تربیت یافتہ، چست کمسن عورتیں ہیں اور یہی لوگ ہر قسم کے کام دن کو اور رات کو کرتی اور کرتی رہتی ہیں اور اس خوش اخلاقی اور مروت سے پیش آتی ہیں کہ آدمی ان پر جان دینے لگتا ہے۔ حضور کے سر مبارک کی قسم میری تو یہ کیفیت ہے کہ بے اختیار ان کو مارے محبت اور اخلاق کے گلے سے لگا لینے کو جی چاہتا ہے۔"

آزاد میں وہ تنوع نہیں جو اکبر میں نظر آتا ہے۔ ان کی طنز زندگی کے ہر رخ پر حاوی نہیں۔ اس طنز کی کاٹ گہری نہیں۔ اکبر کے مقابلہ میں آزاد کی طنز پر سطحی معلوم ہوتی ہے۔ جوش و ہیجان، نفرت و غضب کے محرکات بھی موجود نہیں۔ طرز سیدھا سادا اور دھیما ہے:۔

"میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتابیں دیکھوں۔ کوئی آن کوئی ادا کوئی لحظہ بھی تو آنکھ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹر سلک [illegible] پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پانی مرکس نظر سے یاد آتا [illegible] کی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے گھومتے دیکھتا ہوں اور جوش [illegible] ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔ جب کسی معزز

بیٹی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں تو تمہاری چاپتیوں کو خوانی
انگلیوں سے کھلنا یاد آتا ہے اور کیا ہی گھبراتا ہے۔"

آزاد کے زمانے کا لحاظ کر کے اور یہ بھی پیش نظر رکھ کر کہ ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ اُردو میں موجود نہ تھا ان کی کوششیں لائق تحسین ہیں لیکن ان کی اہمیت تاریخی ہے اور ان سے ادب وانشا، لب ولہجہ کے متعلق موجودہ زمانے کے نوجوان مزاج نگار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

آزاد کے بعد موجودہ طنز نگاروں میں تین نام سامنے آتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، ملا رموزی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ ان میں وہ شے موجود ہے جو دوسرے رہروانِ راہ طنزیات میں مفقود نہیں۔ اردو انشا پرداز کسی مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کرسکتے ہیں وہ اس مسئلہ یا واقعہ یا خیال کو طنزیہ طور پر بھی پیش کرسکتے ہیں لیکن عموماً یہ مسئلہ یا واقعہ یا خیال ان کے دلوں میں زبردست ہیجان نہیں پیدا کرتا۔ اس سے ان کے دماغ میں ایک مُحرّر پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زیادہ تر اُردو طنزیات کا سلسلہ، سرد و بے جان معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے طنزیت محسوس کی ہے وہ صرف حس ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے احساسات شدید ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات اُبلنے لگتے ہیں، ان کے خیالات میں بلا کا طوفان برپا کرتا ہے ان جذبات و خیالات اور ان کی شدت سے وہ خود بھی متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں:

"جو تاریکی چھٹی صدی مسیحی میں جہالت نے پھیلائی تھی جبکہ اسلام کا ظہور ہوا تھا، ویسے ہی تاریکی آج تہذیب و تمدن کے نام سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام اپنی غربت اور بے کسی میں مبتلا ہے۔ اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی تاریکی بُت پرستی تھی تو اس کی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے۔ پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے۔ خدا کی پرستش اس وقت بھی نہ تھی اور اس کے پوجنے والے آج بھی نہیں، دنیا کی وہ کونسی بیماری ہے جو آج پھر عود نہیں کر آئی؟ جبکہ وہ بیماری تھی تو کیا اس کی حالت ویسے ہی نہ تھی جیسی کہ آج ہے۔ پہلے وہ پتھر کی چٹان پر بیماری کی کروٹیں بدلتی ہوگی اب چاندی اگر سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے لیکن بیمار کے بستر کے بدل جانے سے بیماری کی حالت نہیں بدل سکتی۔"

دیکھا اس قسم کی شاندار، پُر زور، زندہ تحریر کے سامنے جملہ طنزیہ تحریریں بے رنگ و بے اثر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ وجہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں ہر ہر لفظ خلوص سے پُر ہے جو کچھ کہا گیا ہے وہ پہلے دل میں محسوس کیا گیا ہے۔ پھر کو بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے، انسانی کمزوری، بدتمیزی، بے رحمی، ناانصافی کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس مشاہدہ سے اس کا دل بیتاب ہو جاتا ہے وہ شدت احساس سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ ان چیزوں کو کچل ڈالے، بدی کے اس پھولتے پھلتے درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات و خیالات کے اٹھتے ہوئے طوفان کو ایک زبردست طوفان بنا دیتا ہے۔ ایسا طوفان جو اپنی فوق الفطری طاقت سے ساری گندگیوں کو پاک صاف کر دیتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں یہی فوق فطری زور ہے

ہے اس مذہبی کی وجہ سے ان کی انشا محض انشا یعنی لفظوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ایک کھنچی ہوئی تلوار ایک بڑھتا ہوا سیلاب، ایک تباہ کن طوفان اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے۔ یہ ایسا اعصابی تموج ہے جو انھی بن کر ہوشے کو نگل جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"لیکن خدا بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور ہیبت ناک ہلاکت پھیلانے کی ایسی شدید البلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ زمین کی پشت پر جو درندوں نے بھٹ بنائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں مگر نہ تو ایسی زہرناکی ابھی تک کسی میں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی توپوں کو حاصل ہے اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسا کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے لگے اور چیرنے پھاڑنے کے لیے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں۔ پھر اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے۔ اس ہائی گو دیکھو جو مشرقی یورپ کے بدن سے چھوٹا ہوا اٹھتا ہے اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو لامارک اور ڈسوسی سرزمین میں خون اور گوشت کے لیے پلا ہے۔ یہ کیسے عجیب ہیں! یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں! ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہیں ہوئی اور خداوند کا ایسا غضب جو اب تک کبھی زمین پر نہ ہوا۔"

اگر اردو ادب اس قسم کی طنز کی زیادہ مثالیں پیش کر سکتا تو پھر وہ طنزیات کے میدان میں دوسرے ادبوں کے مقابلہ میں اس قدر پیچھے نہ رہتا۔ اس قسم کی مثالیں ابوالکلام آزاد صاحب کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ تحریر زندہ ہے اور اس کا ہر ہر لفظ زندگی کا حامل ہے اور ہر لفظ بولتا چالتا متحرک نظر آتا ہے۔ یہ طرز تحریر مولانا ابوالکلام کے ساتھ وابستہ ہے اور یہاں کی شخصیت کا نتیجہ ہے۔ یہ اپنے طور پر بالکل منفرد ہے۔ مولانا ابوالکلام کی عبارت سلیس یا محدود نہیں ہوتی۔ ان کی روش عام روشوں سے یک قلم علیحدہ ہے اور یہ ایک حد تک اجنبی بھی معلوم ہوتی ہے اس میں شان ہے، رعب و دبدبہ ہے۔ زور ہے اور کہیں کہیں ثقالت بھی ہے۔ اس میں سلاست، روانی نہیں جو دوسرے انشا پردازوں کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مولانا ابوالکلام نے عام طرز سے علیحدہ ہو کر، شاہراہ اردو سے دور ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ ہر شخص کا یہ کام نہیں لیکن ان کی شخصیت کو اس نئی راہ کی ضرورت تھی اور اگر وہ عام روش اختیار کرتے تو شاید اپنی انفرادیت کو کھو بیٹھتے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کا مخصوص رنگ ہے۔ وہ ہر کام، ہر موقع کے لیے موزوں بھی نہیں۔ اس قسم کی انشا کا دائرہ محدود ہے یہ خاص خاص موضوعات کے لیے مناسب ہے اور اس کا ہر موقع و بے محل استعمال مضحک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے موقع محل سے استعمال کیا ہے اور جس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان کے لیے یہ نہایت موزوں و کامیاب ہے۔

جو خلیبانہ ہیجان اور جوش مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے وہ مولانا ظفر علی خاں کی تحریروں میں موجود نہیں، مولانا ابوالکلام کی آواز بلند آہنگ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی دھیمی ہے۔ مولانا ابوالکلام میں بے پناہ جوش ہے مولانا ظفر علی خاں

ہیں خلوص کے باوجود وہ بے پناہ جذبات کی شدت نہیں۔ مولانا ابوالکلام کی انشا ایک زندہ متحرک قوت ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی انشا نسبتاً سرد و ساکت نظر آتی ہے لیکن صرف نسبتاً ہی ورنہ ان کی تحریر میں بھی زور ہے، ایک ایسی قوت ہے جو اسے عام سطح سے بلند کرتی ہے۔

"آج دنیا کا نظام حکومت جن اخلاقی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہے وہ غرق آہن و طیارہ، اژدر دوم توپیں ہیں، فلک پرواز طیارے ہیں، قطار اندر قطار عسکریوں کی جگر گداز گھنیں ہیں، صف اندر صف پولس کی ہیبت فرسا لاٹھیاں ہیں جن سے جابرانہ قوانین کی ہیبت زیردستوں کے قلوب میں بٹھائی جاتی ہے۔ ملوکیت کا یہ عفریت جس نے عسکریت کی گود میں پرورش پائی ہے آج ربع مسکون پر چھایا ہوا ہے اور ناتوانوں کے جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ مغرب اس خونخوار دیو کا زادبوم تھا۔ کاش یہ اپنے وطن ہی میں رہتا مگر اس نے ایشیا کو بھی اپنا گھر بنا لیا اور اس وقت مشرق اقصیٰ اس کی جہنمی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔"

اس مثال میں ظفر علی خاں کی انشا اپنے بلند ترین مقام پر ہے لیکن یہ بلند ترین مقام بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا کے معمولی مقام سے بہت نیچے واقع ہوا ہے۔ دونوں خلوص کے حامل ہیں، دونوں سیاسی طنز کی راہ میں گامزن ہیں لیکن جو پائداری ابوالکلام آزاد کی تحریر کا خصوصیت ہے وہ ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، نسبتاً ظفر علی خاں کی تحریریں ہنگامی سی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دلچسپ ہیں، اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتی ہیں لیکن انھیں بقائے دوام غالباً حاصل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان کی سیاسی کشمکشوں نے موجودہ ادب پر اثر ڈالا ہے اور برابر ڈال رہی ہیں۔ ان کشمکشوں کا اثر آئندہ ادب میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ایک طرف تو ہمارے نئے پسند شعرا اور ادیب ہیں جو اپنے نئے پسند خیالات سے دنیا کو بلند آہنگ آواز میں مطلع کر رہے ہیں۔ اسی کا ایک نتیجہ وہ ہجویہ یا تبصرہ تحریریں ہیں جن کی مثالیں ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار وغیرہ کے ہاں ملتی ہیں جن میں وقتی خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ دستے نہیں، جن چیزوں کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا ہے وہ وقتی چیزیں ہیں اور موجودہ سیاسی دور کے گذر جانے کے بعد ان کی محض تاریخی اہمیت باقی رہے گی اس لیے عموماً یہ نظمیں اور تحریریں بھی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور آئندہ دور کا مؤرخ ان کی مدد سے اس زمانے کی تصویر مرتب کرنے میں کامیاب ہوگا۔ عموماً وقتی جلد گذر جانے والے موضوعات پر لکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ تصنیف کی اہمیت محض تاریخی باقی رہ جاتی ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مصنف اپنی کبھی نہ مٹنے والی انشا کی مدد سے ان وقتی دلچسپی رکھنے والے موضوعات کو بقائے جاودانی عطا کرتے ہیں لیکن ایسے مصنف بہت کم ہوتے ہیں اور ابوالکلام آزاد اس قسم کے ایک انشا پرداز ہیں۔ ظفر علی خاں اس گروہ میں داخل نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کا دائرہ محدود ہے۔ ملا رموزی کا موضوع محض سیاسیات ہی نہیں اس لیے ملا رموزی میں تنوع مضامین زیادہ ہے۔ مجھے ملا رموزی کی گلابی اردو سے بحث نہیں۔ "گلابی اردو" غالباً اپنے نیاپن کی وجہ سے مشہور ہو گئی لیکن اس کی ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ اس قسم کی چیز وقتی طور پر اور کم خوراک میں اچھی لگتی ہے لیکن زیادہ مقدار میں ناقابل برداشت ہو جاتی ہے

ابی اُردو" بالکل قابلِ اعتنا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ "نکات" کی کیا اہمیت ہے۔ ملا رموزی اپنے نکات کے مقصد پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

"پہلا نکات یا نکات کے عنوان سے جو کچھ لکھا جائے گا اس کا پہلا مقصد تو یہ ہوگا کہ رسالہ "بہدار" کے پڑھنے والوں میں جو حضرات ہنسی، مذاق، تفنن، خوش دلی کی نعمت سے ابد آلآخر محروم رہتے ہیں یا..... جن کے دماغوں سے تفریح و ظرافت کی تازگی ضائع ہو چکی ہے..... انھیں گدگدایا جائے اور بتلا دیا جائے کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ رد حلقی جینے رہنا ہی متانت نہیں بلکہ کسی وقت مسکرا دینا، کھلکھلانا یا قہقہہ لگانا بھی طبی اصول سے مفید صحت ہے۔

دوسرا مقصد اس عنوان سے یہ ہوگا کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے باریک نکتے سمجھا دیے جائیں گے جن کا تعلق آپ کی روزمرہ زندگی سے ہے لہٰذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے جن کے اندر مذاق اور دل لگی کے علاوہ انتہا کی متانت و سنجیدگی محسوس کی جائے کیونکہ بعض مواقع پر نری ظرافت بھی خطاب و بیان کی تاثیر و اہمیت کو کم کر دیتی ہے مگر ایسے سنجیدہ نکات پر آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ نکات کا لکھنے والا ملا رموزی بھی کسی جماہن کی باسی کڑھی بن گیا ہے جس میں کوئی چٹپٹا اُبال بھی نہیں آتا بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آپ ہماری ظرافت کی ایک ایک سطر میں بھی کام کی باتوں کو تلاش کرتے رہیے وہ ملیں گی اور بکثرت ملیں گی انشاء اللہ۔"

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملا رموزی نے ظریف طبیعت پائی ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نکات میں سیاست، مذہب، تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت اور ادب و قومیت کے نکتوں سے بحث کی گئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت اور ان کے متین نکات کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی رائے یہ ہے:۔

"ملا رموزی کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملیں گی جن میں ظرافت صرف ظرافت کی خاطر کا اصول مدِنظر رکھا گیا ہے۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کی برائیوں کا استیصال ہے۔ کسی کے ذریعہ ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہیں وہ اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں۔ جو باتیں مصلحین کی زبان پر بھی نہیں آتیں وہ ان کی زبانِ قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں اور ان کی ادراکی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں۔

غرض ابھی ایک وسیع اور شاندار استقبال ہمارے سامنے ہے جس کا راستہ

ملا رموزی نے کھول دیا ہے یقیناً آئندہ ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ حاصل کریگی اور قوم کے شہرہ دلوں کے لیے سرمۂ چشم ثابت ہوگی اور ملک کے تاریک گوشوں کے لیے بھی روشنی کا کام دے گی۔"

مجھے اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملا رموزی کی ظرافت میں "ظرافت صرف ظرافت کی خاطر" کا اصول مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ کوئی مقصد ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ظرافت وسیع مضامین پر حاوی ہے لیکن مجھے اس بیان سے قطعی و کلی اختلاف ہے کہ "ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ پیدا کرے گی۔" ہر زبان اور ہر زمانہ میں مختلف قسم کے ادیب ہوتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو صحیح معنی میں ادیب نہیں کہے جا سکتے۔ وہ لکھ تو لیتے ہیں اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں کافی مشہور اور ہر دلعزیز بھی ہوتی ہیں لیکن ہر ذی فہم جانتا ہے کہ یہ چیزیں ادب کا جزو نہیں اور نہ ہو سکتی ہیں اور وہ مصنفین بھی اپنی حقیقت اور اپنے مقام سے باخبر ہوتے ہیں۔ دوسرے ادیب وہ ہیں جنھیں ادیب بننے کی خواہش ہے لیکن جو ادیب ہونے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے کارنامے پیدا ہونے سے پہلے ہی محرو ہوتے ہیں۔ کچھ ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں اور زیادہ تعداد ایسوں کی ہی ہوتی ہے، جو اپنے زمانے میں ادیب کہلاتے ہیں اور جنھیں دوسرے بھی ادیب شمار کرتے ہیں لیکن جن کی ادبی عمر صرف ان کے دور تک رہتی ہے اور اس دور کے گذر جانے کے بعد وہ فراموشی کی غلیج میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ ملا رموزی اسی قسم کے ادیبوں میں داخل ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اہمیت کو خود ان کا عہد مانتا نہیں مانے لیکن وہ بقائے دوام کی نعمت ازل سے ساتھ لاتے ہیں۔ ایسے ادیب کم ہوتے ہیں اور ملا رموزی ایسے ادیبوں میں نہیں۔ ان کی تحریریں بس ایسی ہیں کہ موجودہ زمانے میں لوگ پڑھیں گے، کسی حد تک محظوظ ہوں گے لیکن اس زمانے کے گذر جانے کے بعد اسی قسم کے دوسرے مصنفین پیدا ہو جائیں گے اور ان کی طرف دنیا متوجہ نہ ہوگی۔ شاید ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوگی۔ عبدالقادر صاحب نے ملا رموزی کا اڈیسن سے مقابلہ کیا ہے لیکن ملا رموزی کا صحیح مقابلہ ان موجودہ انگریزی مقالہ نگاروں سے ہے جو آج کل تو مشہور و معروف ہیں لیکن جن کی ادبی عمر غالباً ان کی عمر طبعی کے برابر یا اس سے کم ہے، وجہ یہ ہے کہ ملا رموزی کی نہ وہ نوعیت ہے نہ وہ انشا جس میں پائداری کا عنصر ہوتا ہے اور جو بقائے دوام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں جن کی طرف رشید احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے:-

"وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سب باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں یا ان الفاظ اور لہجہ میں نہیں لکھنا چاہیے جن میں ملا صاحب لکھنے کے عادی ہیں۔ ملا صاحب کی تحریروں میں ایک چیز اکثر کھٹکتی ہے اور اس چیز کا احساس سوا ملا صاحب کے ہر ایک کو ہے یعنی وہ دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اچھالنے کی زیادہ فکر میں رہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کے سبب سے ان کی بہترین ظرافت بدترین طنز اور بہترین طنز بدترین ظرافت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جو چیز پیشہ بنا لی جائے گی وہ ہمیشہ

تیج نظر آتے ہیں اور جو چیز بطور مشغلہ تفریح برسرکار رہے گی وہ ہمیشہ مقبول و محبوب ہوگی۔ ملا رموزی صاحب نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے۔"

ملا رموزی انتخاب، انتخاب موضوعات اور انتخاب الفاظ سے کام نہیں لیتے۔ انھیں موقع و محل، تناسب، موزونیت کا لحاظ نہیں رہتا اور انھوں نے ظرافت اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے یعنی ان میں وہ سلیقگی جو ایک کامیاب ادیب کے لیے ضروری ہے موجود نہیں۔ ان سب باتوں کا حاصل یہ ہے کہ ملا رموزی میں صناعی، ایسی صناعی جو بامذاق ہو اس کی کمی ہے:۔

"خدا جانے یہ کنگ بلمفر پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس پھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبہ کے ماتحت استعمال فرماتے ہیں اور تو کچھ نہیں لباس کی اس تبدیلی سے بڑی تکلیف یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السلام علیکم کہہ گذرتے ہیں اور وہ آہستہ سے معاف کیجیے میں ہندو ہوں کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ایک ہندو بھائی ہمارے ڈبے میں عین اس وقت گھس پڑے جب ہم صبح کے ناشتے کے بیٹھے تھے آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچا کر لینے کے لیے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ انھوں نے ڈبہ ذرا خالی پا کر ایک سیٹ پر نیا انگریزی ونج کا بستر بچھایا اور مع کوٹ پتلون اس پر لیٹ گئے اور ایک کتاب کھول کر سینے پر تان لی۔ پھر ایک پتلون کی جیب میں لیٹے لیٹے اس طرح ہاتھ ڈال لیا گویا سر آشٹن چیمبرلین وزیر خارجہ و کنوینر یا اسٹیشن لندن سے جمعیۃ الاقوام کی شرکت کے لیے اپنے خانے کے اسپیشل میں جنیوا جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال کر سر سہلا لیتے تھے گویا کسی بڑے ہی زبردست ریاضی معاجے کو ملاحظہ سے حل فرما رہے ہیں۔"

تصویر کافی صاف کھینچی ہے، اور بس۔ اس میں کوئی صاف بات نہیں کوئی انفرادیت نہیں کوئی پائداری نہیں۔

(۳) تیسرے گروپ میں وہ انشا پرداز ہیں جن کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے جو اپنے فلسفۂ زندگی کو ظرافت اور طنز کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان میں ایک خصوصیت ہوتی ہے جو دوسروں میں نہیں ملتی۔ ان کی مختلف تحریریں منتشر نہیں ہوتیں وہ گویا ایک سلسلہ میں منسلک ہوتی ہیں اور سب مل کر مصنف کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ایسی تحریروں میں ایک قسم کا تسلسل نظر آتا ہے جس کی وجہ سے اس کے حسن میں ایک حد تک اضافہ ہوتا ہے۔ کم از کم انتشار و پراگندگی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس گروہ میں سلطان حیدر جوش اور مجاہد علی انصاری کے نام قابل ذکر ہیں۔ سلطان حیدر جوش نثر فرنگی خصوصاً انگریزی مصنفین سے متاثر ہوئے ہیں اور ان مصنفین کی تقلید کرنا چاہتے ہیں اور ایک حد تک اس تقلید میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی آمیزش کی وجہ سے ان کی ظرافت میں گہرائی آجاتی ہے۔ بیرونگ سلطان حیدر جوش کی تخلیق ہے اور غالباً انھی پر ختم ہو گیا ہے:۔

"معلوم نہیں نیچر کو اپنی ترقی کرنے والی مخلوق کے راستہ کہاں کا بیر ہے کہ جس قدر مشکلات سے پیچھا چھڑاتی ہے اسی قدر وہ اور زیادہ مشکلات حائل کرتی جاتی ہے۔ جب انسان نے

پیدل چلنے سے قدم آگے بڑھا کر زین سواری شروع کی تو نیچر نے محض لطف کر گاگ جانے سے آگے بڑھ کر گھوڑے پر سے گر کر مر جانا پیدا کر دیا۔ پھر انسان نے گاڑی بنائی تو آس کا ٹوٹ جانا اور زیادہ مہلک چیز وجود میں آئی، جب ریل نے دنیا کے وجود میں قدم رکھا تو ریل سے کٹ جانے کا سخت مہلک حادثہ بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انسان جس قدر اپنے آرام و آسائش حاصل کرنے کے زور میں آگے بڑھتا جاتا ہے نیچر اسی قدر تکلیف اور مشکلات حاصل کرتی جاتی ہے۔ یہی حالت سوسائٹی کی ہوئی وہ جس قدر آگے بڑھتی گئی پابندی اور دھوکہ سے تو خلاصی حاصل نہ کر سکی مگر اس کی ترقی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، ابھی وہ سوسائٹی کی اس منزل تک نہیں پہنچی تھی جہاں اس کا پہنچنا مقصد تھا..... اگر فرض کر لیا جائے کہ دنیا اس منزل تک پہنچ بھی گئی تو اس کو فی الواقع آگے بڑھنا کہیں گے یا پیچھے ہٹنا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ ترقی کرے گی یا پھر اسی پہلے وحشی انسان کے مین میں چلی جائے گی اور کچھ عجیب نہیں کہ اس مرتبہ پھر وہ انسان سے بندر کے قالب میں پہنچ جائے کیونکہ بندر کو انسان سے بدرجہا بے فکری، مساوات اور مسرت حقیقی حاصل ہے۔"

یہ ہے سلطان حیدر جوش کا رنگ اور اس رنگ میں گہرائی اور پختگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی تحریروں میں بے ساختگی اور برجستگی کی کمی ہے لیکن کہہ سکتے ہیں کہ بیساختگی اور برجستگی اس قسم کی فلسفیانہ ظرافت کے لیے موزوں بھی نہیں۔ جوہات ان کی تحریروں کو ممتاز بناتی ہے وہ غور و فکر کا وجود، خیالات و تجربات کی گہرائی اور سنجیدہ اور متین لب و لہجہ ہے۔ سلطان حیدر جوش ایک مخصوص شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے الفاظ سے عیاں ہے۔ وہ نوجوان مزاح نگاروں کی طرح غیر ذمہ دارانہ طور پر محض ہنسنے ہنسانے کے لزومات کی تلاش نہیں کرتے اور انھیں تلاش کر کے قارئین کے سامنے پیش نہیں کرتے، وہ سستی شہرت کے طلبگار نہیں اس لیے وہ عام فہم اور عام پسند قسم کی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں اور علمی رنگینی، علمی یدطولیٰ کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا ہے اس لیے ان کے مضامین کبھی شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، طالوت موزی کے مضامین کی طرح عام پسند نہیں ہو سکتے لیکن ان کے مضامین شاید اس وقت پڑھے جائیں گے جب شوکت تھانوی وغیرہ کے نام سے بھی لوگ واقف نہ رہیں گے۔ ان کے مضامین کا حلقۂ اثر لازمی طور پر محدود ہے۔ یہ مضامین ان ہی لوگوں کو متاثر و محظوظ کر سکتے ہیں جنھیں خود غور و فکر کی عادت ہے، جو خیالات کی کشمکش سے بچنا نہیں چاہتے ہیں، جو ادب کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ان سب اوصاف کے باوجود سلطان حیدر جوش کے مضامین میں چند مخصوص عیوب بھی ہیں ان کی ظرافت نگاری انکسابی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے تخیل میں غیر معمولی باریکی، بلند پروازی اور فراوانی نہیں ہے۔ ان کی انشا غیر معمولی دلچسپیوں کی حامل نہیں ہے۔

"آہ دنیا ترقی یافتہ دنیا تمام تمول، تمام قابلیت، تمام ساعتیں، تمام قوتیں ایجاد و اختراع صرف اس بات پر صرف کر رہی ہے کہ گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں گزشتہ کے گزشتہ نیست و نابود ہو جائیں، خوبصورت اور قد آور نوجوان عین عالم شباب میں اسی پرانی خیالی عزت کے

پیچھے اپنی بیش بہا جانوں کو قربان کر رہے ہیں اور سونے کے بڑے بڑے انبار لوہے کی گولیوں اور چیزوں کے لیے لٹائے جا رہے ہیں۔ صدیوں پرانی صناعی کی قابلِ قدر یادگاریں اور اس کے ساتھ ہی نیچر کی خانہ ساز بھول بھلیاں صورتیں اسی طوفانِ بے تمیزی کی رَو میں بہی چلی جاتی ہیں۔"

اس میں ایک زور ہے، ایک روانی ہے، ایک اثر ہے لیکن یہ زور یہ روانی یہ اثر فطری نہیں بلکہ سلطان حمید جوش کے قصد و ارادہ کا نتیجہ ہے، اس وجہ سے اس میں سیکی اور لطافت نہیں بلکہ ایک قسم کی گرانی محسوس ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ بک قلم مصنوعی نہیں یہ غور و فکر کا مادہ سجاد علی انصاری میں بھی موجود تھا، نوجوانی کا تقاضا تھا اس لیے ان کے الفاظ میں نرمی کے عوض تیزی تھی۔ ان کی طرز میں کاٹ بھی زیادہ تھی لیکن وہ سلطان حمید جوشؔ کی طرح پختہ کار انسان نہ تھے اس لیے ان کے خیالات میں وہ گہرائی وہ تسلسل و متانت نہیں۔ انھیں اپنی زمہ داری کا اس قدر احساس بھی نہیں۔ بظاہر سجاد علی انصاری کو زمہ داری کا زیادہ احساس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ زمہ داری اس قسم کی زیادتی کی حامل ہے جو عموماً ان نوجوانوں میں نظر آتی ہے جو اپنی زمہ داری کا احساس کرنا چاہتے ہیں اور اس احساس میں غلو سے مصنف لیتے ہیں اس قسم کا غلو ان میں نظر آتا ہے لیکن اس غلو اور صحیح زمہ داری کے صحیح احساس میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ بہرکیف فی الحال سجاد علی انصاری میں زمہ داری کا مادہ دوسرے نوجوان انشاپردازوں سے زیادہ ہے:۔

"فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے، ایک حقیقت جب ٹھنتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے۔ خدا نے ابتدا میں صرف فرشتوں کو پیدا کیا تھا۔ اس وقت تخلیق شیطنت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خود ملکوتیت میں عناصرِ شیطنت مضمر ہیں سلسلۂ ارتقا سے شیطان خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ معلم الملکوت کی فطرت میں ملکوتیت کے وہ تمام عناصر مکمل ہو چکے تھے جو تخلیقِ شیطنت کے لیے لازمی تھے۔ فطرتاً اس کے لیے یہ محال تھا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی ملکوتیت پر قانع رہے۔ وہ شیطنت پر مجبور ہو گیا۔ اس کے سامنے ایک نئی حقیقت کی وسعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ کسی طرح فرشتہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

یہ ہے سجاد انصاری کا رنگ۔ اس میں فلسفیانہ رنگ نمایاں ہے۔ وہی رنگ جو سلطان حمید جوش میں بھی موجود ہے لیکن یہاں وہ پختگی نہیں، وہ گہرائی نہیں، متانت و سنجیدگی بہرحال موجود ہے۔

اس قسم کی طنز اور عام پسند طنز میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ یہ کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن یہ کچھ دوسری چیز ہے، اس سے بالکل مختلف جس کی مانگ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر کیا کرتے ہیں۔

فلسفیانہ ظرافت میں بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔ سلطان حمید جوش صاحب نے اس کی ابتدا کی ہے۔ سجاد انصاری میں اس کی کچھ شاخیں ملتی ہیں لیکن اس رنگ کی ابھی ابتدا ہے اور اس کی وسعتیں نظر میں کسی ایسے رہرو کی جو اس راہ میں جرأت کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔

(۴)

طنز و ظرافت کے میدان میں رہرو تو بہت ہیں لیکن شاید پانچ نام ایسے ہیں جو بقا کے زمرہ میں ہیں سودا، اکبر، غالب،

مدیر شعار، ابوالکلام آزاد۔

ابھی اُردو میں ادبی طنز و ظرافت کے لیے الگ سوگھا شیں ہیں نظم اور نثر دونوں میں۔ اگر اُردو دانشا پردازاس فن کی اہمیت کو سمجھیں، اس کی خصوصیتوں سے شناسائی بہم پہنچائیں تو بہت کچھ ترقی ممکن ہے۔ (معاصر جلد ۳ نمبر ۲ فروری، مارچ، اپریل ۱۹۲۲ء)

مسئلہ (نوٹ:۔ اردو ادب میں طنز اور ظرافت سے متعلق پروفیسر سید محمد محسن نے کچھ شبہات ظاہر کیے تھے۔ معاصر جلد ۴ نمبر ۱ نوٹ کی سطروں میں انہی شبہات کو رد کرنے کی کوشش کی گئی تھی)

محسن صاحب نے صحیح کہا ہے کہ تنقید میں جن الفاظ کا استعمال ہو وہ صاف اور متعین مفہوم رکھتے ہوں۔ میں نے اپنی مختلف تحریروں میں اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً معاصر جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۳۴ پر یہ جملے ملیں گے:۔

"اصل یہ ہے کہ عموماً انسان کا دماغ زرا کاہل ہوتا ہے۔ نہ وہ صاف طور پر سوچتا ہے اور نہ اپنے خیالات کو صاف غیر مبہم پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ غور و فکر ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے محنت و مشق کی ضرورت ہے اور ہر شخص میں اس دماغی محنت و مشق کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ تعلیم ناقص ہوتی ہے اور اس صلاحیت سے صحیح مصرف لینا نہیں سکھاتی۔ عام بول چال، روزمرہ کے تعلقات میں انسان کو اس نقص کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ کم و بیش کامیابی کے ساتھ اپنا کام چلاتا ہے لیکن سائنس میں اسے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بےکم و کاست بیان کرے اور انھیں دوسروں تک پہنچا سکے اس لیے سائنس میں الفاظ علامات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر علامت ایک مخصوص چیز کا اظہار ہوتی ہے اور اس طرح خیالات صفائی کے ساتھ معین اور غیر مبہم پیرایہ میں الفاظ کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ تنقید میں بھی اظہار خیال کے لیے صاف و معین الفاظ کی ضرورت ہے، ایسے الفاظ کا استعمال لازمی ہے جن کے مفہوم مقرر شدہ ہیں یا جن کے مفہوم اور الفاظ (جو ان کے آگے پیچھے مستعمل ہوں) کے مفہوم کی وجہ سے صاف و مقرر ہو جائیں۔"

ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق محسن صاحب کی رائے میری رائے سے مختلف نہیں۔

دوسری بات جو محسن صاحب نے کہی ہے وہ ہنسی کے سبب سے متعلق ہے۔ محسن صاحب نفسیات کے ماہر ہیں اس لیے انھیں ہنسی اور دوسری چیزوں کے اسباب سے خاص دلچسپی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ہنسی کے سبب سے (جس مفہوم میں محسن صاحب اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں) بحث نہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"فطرت نے انسان کو ہنسی کا مادہ عطا کیا ہے اور ہنسی مختلف وجوہ کی بنا پر آتی ہے یہاں ہنسی کی ماہیت اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔"

اس لیے ان کی تحریر کا یہ دلچسپ اور اہم حصہ جہاں تک اس کا میرے مقالے سے تعلق ہے، غیر متعلق ہے۔ میں نے کہا ہے

ہنسی عموماً دو مکمل بے ڈھنگے پن کے احساس کا نتیجہ ہے اور محسن صاحب بھی اس سے اتفاق ظاہر کرتے ہیں:-

"اس میں شک نہیں کہ ہنسی یا احساس ظرافت کے لیے کسی ناموزونیت اور بے ڈھنگے پن کا مشاہدہ ضروری ہے"

یہ بے ڈھنگا اور دوسرے جملے میں کوئی تضاد نہیں:-

"ہنسی بھی ایک انسانی خصوصیت اور زندگی کی ناتمامی کا نتیجہ ہے"

جی اگر زندگی ناتمام نہ ہوتی تو پھر کسی ناموزوں بے ڈھنگی شے کا مشاہدہ ممکن نہ ہوتا۔ یہی بات میں نے ایک دوسری جگہ واضح کر دی ہے:-

"جس دنیا میں ہم سانس لیتے ہیں وہ مکمل سے خالی ہے۔ انسان اور انسانی فطرت میں بھی یہی ناتمامی ہے اس لیے ہنسی کے مواقع کی کمی نہیں"

ان جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ مجھے ہنسی کے فوری اور خارجی سبب سے بحث نہیں ہے۔ میں نے ہنسی کے حقیقی سبب پر کچھ لکھنے سے قصداً احتراز کیا ہے اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے محسن صاحب بھی متفق ہیں۔ پھر میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ ہمیں دنیا اور زندگی کی ناتمامی اور ناموزونیت کی وجہ سے ہنسی کے مواقع ملتے ہیں اور ہم ہنستے ہیں تو کسی ناموزوں واقعہ کے مشاہدہ سے۔ مجھے امید ہے کہ میرے اس بیان سے محسن صاحب کے وہ شبہات جن کا تعلق اس خاص نکتہ سے ہے رفع ہو جائیں گے۔

اب میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے کیوں ہنسی کے سبب پر بحث کرنے سے احتراز کیا۔ بات یہ ہے کہ تنقید ایک مستقل فن ہے۔ یہ فن دوسرے علوم و فنون سے مصرف لیتا ہے لیکن کوئی دوسرا فن تنقید کا بدل نہیں ہو سکتا۔ نقاد مختلف علوم و فنون سے واقف ہوتا ہے لیکن اسے اس واقفیت سے ناجائز مصرف نہیں لینا چاہیے یعنی اسے اپنی تنقید کو تاریخ، معاشیات، نفسیات وغیرہ میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے خصوصاً اسے ایسے تاریخی، معاشیاتی، سیاسی، نفسیاتی مسئلوں سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے جو تنقید سے سروکار رکھتے ہوں اور جن پر تاریخ، معاشرت، نفسیات کے ماہر بحث نہ کر چکے ہوں۔ ہنسی کا سبب بھی اس قسم کا ایک مسئلہ ہے۔ اس سبب کی تلاش ہمیں تنقید کی حد سے باہر لے جاتی ہے اور نفسیات کی نظر میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ آسان نہیں اور اس پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک مفصل مقالے کی ضرورت ہے جس کی گنجائش میرے مضمون "اردو ادب میں طنز و ظرافت" میں نہ تھی۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ نفسیات ابھی نیا اور نوخیز سائنس ہے اور باوجود بھی یہ انسانی دماغ کی اتھاہ گہرائیوں سے مطلق واقف نہیں۔ انسانی دماغ بھی کائنات کی طرح وسیع ہے۔ اس کی پیچیدگی اس کے تاریک رستے اور گوشے اس باریک اور دشوار قوانین سے مکمل واقفیت میسر نہیں آ سکتی۔ محسن صاحب کہتے ہیں کہ "ہنسی عموماً طمانیت دلیکن کا صوری اظہار ہے" وہ پھر فرماتے ہیں کہ "ہنسی حقیقت میں اپنی موزونیت اپنی عدم کمزوری اپنے مکمل ہونے کے احساس کی آئینہ دار ہے" لیکن یہ تعریف بھی ہنسی کی تمام صورتوں پر حاوی نہیں۔ مثلاً اس ہنسی کو جسے عرف عام میں کھسیانی ہنسی کہتے ہیں۔ اس قسم کی ہنسی اپنی موزونیت کی آئینہ دار نہیں۔ یہ اپنی ناموزونیت کی پردہ دار ہے۔ پھر ہنسی کا ایک سبب اعصاب کی کمزوری بھی ہے۔ جو لوگ NERVOUS ہوتے ہیں وہ بات بات پر بلا وجہ ہنستے یا مسکراتے ہیں اور یہ ہنسی ان کی موزونیت طمانیت یا تمکین کا صوری اظہار نہیں۔ اس قسم کی مختلف مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

میں نے ظرافت، طنز، ہجو کو تین انگریزی لفظوں کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے جو ترتیب وار یہ ہیں SATIRE, IRONY, HUMOUR۔ ہجو گو شاعر کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی محسن صاحب کو کچھ اختلاف ہے۔ ہجو گو شاعر انسان بھی ہے اور شاعر بھی ایک حد تک ہجو گو شاعر انسان ہے اور اس کی ہجو دل کی ابتدائی عناد اور تعصب سے ہوتی ہے لیکن وہ شاعر یعنی صناع بھی ہے اور شاعر یا صناع

کی حیثیت سے اپنے ذاتی جذبات سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور اپنے ذاتی جذبہ کو عالمگیری UNIVERSALITY عطا کرتا ہے۔ یہ علیحدگی (DETACHMENT) ہر صناع کے لیے ضروری ہے ورنہ وہ کامیاب صناع شمار نہیں کیا جا سکتا۔ محسن صاحب نے شاید اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ میں نے ہجو کو طنز کا مترادف قرار دیا ہے، یہ صحیح نہیں۔ رشید احمد صاحب نے طنز کو ہجو کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اسی لیے میں نے ان کی تعریف کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔ پھر میرے ان دو جملوں میں کوئی تضاد نہیں:۔

"ہجو گو شاعر ایک پرمذاق انسان ہے اور اس کی ہمدردی بے ثبوت نہیں ہوتی ہے۔"

اور:۔ "ہجو گو ایک بلند پایہ اخلاق کا حامل ہوتا ہے اور وہ اپنے بلند مقام سے انسانی کمزوریوں خامیوں اور فریب کاریوں کو اپنی طنز کا نشانہ بناتا ہے۔"

میں نے ابھی کہا ہے کہ ہجو گو شاعر اپنے ذاتی جذبات سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور انھیں عالمگیری عطا کرتا ہے۔ ہجو اگر وہ محض ذاتی عناد اور تعصب کا اظہار ہے تو زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی اور اس کا اثر دیرپا اور عالمگیر نہیں ہوتا۔ انسانی کمزوریوں خامیوں اور فریب کاریوں کی جو مذمت ہوتی ہے وہ بلند اخلاقی کے نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ اگر یہ بلند اخلاقی نقطۂ نظر موجود نہ ہو تو پھر مذمت کی اہمیت باقی نہیں رہتی اور اس کا کوئی اثر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہجو گو شاعر ایک بلند اخلاقی مقام سے ان خامیوں کا انکشاف کرتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب نے ہجو میں صناعت کے وجود کو فراموش کر دیا ہے اور ان خصوصیتوں سے سروکار نہیں رکھا جو ہجو گو کو صناع بناتی ہیں۔

محسن صاحب نے ہجو اور طنز کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور اس سلسلہ میں مجھ سے اتفاق ظاہر کیا ہے:۔

"مجھے پروفیسر رسول کے اتفاق ہے کہ طنز گو ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے وہ ہمدردی، زخم انصاف، فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض، حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔"

میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق ہجو گو سے ہے ملاحظہ ہو:۔

"بہرکیف ہجو گو سارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے، وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے وہ ہمدردی، زخم انصاف، فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، بغض، حقارت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلہ میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔"

میں نے ظرافت اور ہجو، ظرافت نگار اور ہجو گو میں تفریق کیا ہے۔ میں نے ہجو کو برابر SATIRE کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ہجو گو ظرافت اور طنز دونوں سے صرف نظر کرتا ہے۔ خالص ظرافت نگار اور ہجو گو میں البتہ فرق ممکن ہے اور اس فرق کو میں نے صاف طور پر ظاہر کیا ہے۔ طنز ایک آلہ ہے جسے ہجو گو استعمال کرتا ہے اس لیے طنز اور ہجو میں تفریق کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب طنز کو SATIRE کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور ہجو کو کسی مخصوص و محدود معنی میں اسی وجہ سے وہ ہجو کو ایک قدیم اور غیر مہذب صنف شاعری قرار دیتے ہیں اور طنز نگار کو مکمل ادیب سمجھتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے ظرافت، طنز اور ہجو کو ترتیب وار HUMOUR، IRONY، SATIRE کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اگر محسن صاحب یہ بات پیش نظر رکھیں تو ان کے کئی شبہات رفع ہو جائیں گے۔

اُردو شاعری میں طنز

شوکت سبزواری

طنز اور ظرافت اکثر ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں شاید اس لیے عام طور سے ان دونوں میں فرق نہیں کیا جاتا اور سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مضمون طنزیہ مکمل اور جامع نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ظرافت کا ذکر نہ ہو۔ طنز ظرافت سے بالکل الگ چیز ہے۔ دراصل بات ہے کہ اس کا ظرافت سے تعلق ہے اور یہ تعلق بہت شدید اور گہرا ہے لیکن طنز کا مفہوم کچھ اور ہے۔ ظرافت کم سے کم اس کی حقیقت میں داخل نہیں۔ طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ ایک قسم کا عملِ جراحی ہے۔ تنقید کئی طرح کی ہوتی ہے۔ طنز شدید، تیز اور بیدردانہ تنقید کی تنقید ہے۔ اسی لیے میں نے اسے ایک قسم کا عملِ جراحی کہا۔ تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں اور تنقید نگار کا فرض ہے کہ وہ جہاں بُرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں اچھے پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرے۔ تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے۔ توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ طنز میں چیز کے بُرے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں تنقید کا اعتدال قائم رکھنا اس لیے دشوار ہوتا ہے کہ یا تو چیز کے اچھے پہلو تحت الشعور یا نظر انداز ہو جاتے ہیں یا بُرے پہلو اس قدر چمکا کر پیش کیے جاتے ہیں کہ اچھے پہلو ماند پڑ جاتے ہیں اور ایک عام قاری کی نظر ان تک نہیں پہنچتی۔ طنز کا یہ رُخ ہے جو بے دردی لیے ہوئے ہے۔ طنز میں شدت اور تیزی ضروری سی ہے۔ اس کے لیے کسی قدر زہریلے ہوتے ہیں۔ طنز میں جتنی شدت ہوتی ہے اتنا ہی وہ کامیاب اور بھرپور سمجھا جاتا ہے لیکن طنز کی یہ شدت بھی بے رحمی اور تلخی ایک اچھے اور بڑے مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ طنز کی ادب میں اہمیت اس کی مقصدیت کی وجہ سے ہے اور یہی مقصدیت ہے جس کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارا کرلی جاتی ہے۔ بقول غالب لب کی شیرینی کا کرشمہ ہے کہ اس کی گالیاں کھا کے بے مزا نہیں ہوتے۔ لب کی یہ شیرینی طنز کا مقصد ہے۔ اس لحاظ سے طنز عام ادبی تنقید سے بلند ہے۔ تنقید کا مقصد ہے کسی ادب پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور ادب میں اس کی حیثیت کی تعیین، طنز کا مقصد ہے اصلاح۔ تنقید انشائیہ ہے اور طنز نہیں۔

طنز کی کئی شکلیں ہیں جن میں وہ روپ بھرتا ہے۔ طنز میں تلخی اور شدت ہے اس لیے ادب میں اس کے لیے خاص خاص سانچے بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ طنز کی کڑوی کسیلی گولیاں ان اسالیب کے لطف و چاشنی کی مدد سے حلق سے اتاری جاتی ہیں۔ مزاح ہی سب سے اچھا اور پُرلطف پیرایۂ بیان ہے جو طنز کی رُوح کے لیے مناسب ہے اور اس کے مزاج کے لیے سازگار بھی ہے اسی لیے انشاپردازوں نے طنز کے نشتروں کو ان کی ظاہری تیزی اور زہرناکی کا اثر ہلکا کرنے کے لیے ہی مزاح کے رنگ میں پیش کیا۔ مزاح طنز کے عملِ جراحی کے لیے کچھ کچھ آلۂ بے ہوشی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مزاح کے زیرِ اثر قاری پر ایک نیم غنودگی کی حالت میں خارشی کے ساتھ طنز کا نشتر اپنا کام کر جاتا ہے

مزاح کے بھی کئی درجے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا اُردو ادب سے تعلق ہے۔ استہزا، تمسخر، شوخی و ظرافت، بذلہ سنجی یا شگفتگی بھی اسی میں طنز و مزاح ان تینوں رُوپوں میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اُردو میں طنز کی ایک اور شکل بھی ہے جو نثر کی ادب میں تو ملتی ہے لیکن مغرب کے جدید ادب میں کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ اصطلاح میں اسے تعریض کہتے ہیں۔ یہ طنز کی وہ قسم ہے جس میں مزاح کو دخل نہیں۔ یہ سنجیدہ طنز ہے اور جو لطف خوش مزاجی کے لباس سے عاری ہے اس لیے اس میں کسی قدر تلخی و تلخ کھا جاتا ہے۔ پہلی قسم کا طنز براہِ راست تھا یہ بالواسطہ کہنے کا ہے۔ اُردو میں لپیٹ کر کچھ کہنا و اشاروں اشاروں میں چوٹ کر جانا تعریض ہے۔ غالب کا یہ شعر تعریض کی ایک اچھی مثال ہے ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اس میں ذوق پر چوٹ ہے۔ ایما اور اشارہ بھی طنز ہی کی قسمیں ہیں۔

اس میں تعریض طنز کی اچھی، مہذب اور کامیاب قسم ہے۔ میریڈتھ کا قول ہے کہ کامیاب ظرافت وہ ہے جو ہنسائے لیکن ساتھ ہی تلخ کر بیدار بھی کرے۔ تعریض میں یہ صفت موجود ہے۔ اس میں طنز براہِ راست نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ قاری کے دل کی گہرائی تک اُتر جاتا ہے۔ روسروں پر وار کرنا آسان ہے لیکن اپنی ذات کو اپنے فن کا نشانہ بنانا مشکل ہے۔ تعریض میں طنز کا رُخ طنز نگار کی طرف ہوتا ہے لیکن اس کی چبھن مخاطب اپنے پہلو میں محسوس کرتا ہے۔ یہ طنز مہذب اور شائستہ تو ہے ہی مؤثر اور کبھی کبھی نہیں جاتا۔

طنز ظرافت کی رو رہے۔ کہیں ظرافت ہوتی ہے لیکن طنز نہیں ہوتا۔ یہ گوارگی اور کھلنڈرا پن ہے۔ ادب میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ بقول میریڈتھ یہ ملک اور قوم کے غیر متمدن ہونے کی علامت ہے۔ اُردو میں زبردست ظرافت بھی ہے اور طنز آمیز ظرافت بھی، اگرچہ ظرافت طنز کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اُردو شاعری کا آغاز جس زمانے میں ہوا وہ سفیر تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ یہ قوم کی سیاسی پستی اور تمدنی زوال کا آخری عہد تھا۔ ایسے ماحول میں ظرافت اس میں کیسے پنپتی لیکن اس کے باوجود شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آغاز ہی سے اُردو میں خوش طبعی کی ایک دبی دبی سی لہر ملتی ہے۔ اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز دہلی میں ولی دکنی کے اثر سے ہوا لیکن ابھی تھوڑا ہی زمانہ گزرنے پایا تھا کہ وہ اس اثر سے آزاد ہو گئی۔ میر تقی کا زمانہ اُردو شاعری کا سنہرا زمانہ ہے۔ اس میں وہ دکن کے اثر سے آزاد ہوئی اور اپنے گوناگوں فطری امکانات کا احساس اس میں پیدا ہوا۔ اس سے پہلے دہلی کی شاعری صنفِ غزل میں محدود تھی۔ میر کے زمانے میں ان حدوں کو توڑ کر اس نے شعر کے دوسرے اصناف میں قدم رکھا۔ صحیح معنی میں شاعری کی زبان میر کے زمانے میں کھلی۔ غزل میں کتنی وسعت اور گہرائی ہے، یہ میر اور اس کے ہم عصر غزل گو شعرا کے کلام سے معلوم ہوا۔ میر اس دور کے بڑے شاعر تھے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ میر کے میدان سے ہٹ کر سودا، سوز اور درد نے غزل میں جو زور اختیار کی اس سے غزل کی توانائی، صحت اور فضا کی بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ میر نے درد دل جمع کر کے دیوان ترتیب دیا لیکن سودا فطرت سے شگفتہ دل اور باغ و بہار طبیعت لے کر آئے تھے غزل میں بھی انھوں نے چھبی کھلائے۔

(۲)

سودا اُردو کے پہلے طنز نگار شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ سودا کی طنزیہ شاعری کا نام تر سرمایہ ان کا ہجویہ کلام ہے۔ ویسے ہجو بھی طنزی ہے لیکن ہجو اور طنز میں ایک بنیادی فرق ہے۔ طنز صلاح و اصلاح ہے اور ہجو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا۔

سودا کے ہجویات اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزاء، تمسخر، مضحکہ، پیکر پن، گالی گفتار سبھی کچھ ہے۔ ان میں سودا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ ان کا مقصد اصلاح نہیں اس لیے ان کو طنز نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کسی کو سودا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد شاذ و نادر کو نشانہ بنایا گیا ہے یا پیر ضاحک کی خبر لی گئی ہے۔ یہ تمسخری صورتیں آتی ہیں۔ چند ہجویں ہیں جن میں شکایت روزگار یا اہل روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقہ کو ہدف طعن بنایا گیا ہے۔ ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شدید تلخ کا اور شاید سودا کو اسی کلاسیکی وجہ سے اس کو اردو کے طنز نگار شعراء میں شمار کیا گیا ہے۔

لیکن سودا فطرتاً ہنسوڑ تھے۔ ان کے یہاں ہنسنے کی اہمیت زیادہ ہے۔ ان کے فن کی روح تشکل ہے۔ طنز کے لیے جس کی جس شدت اور نظر کی جس دقت کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں کی طرح ان کی ہجویات بھی مانگے کی ہیں۔ ان میں جدت یا تازگی نہیں۔ سودا مضمون پیدا کرنا خوب جانتے تھے۔ ان کی ہجویات بے بات کی بات سہی لیکن ان میں فکر و شعور بیدار کرنے والی کیفیت نہیں۔ مرثیل گھوڑے اور شرپل ہاتھی کی انھوں نے جو ہجو لکھی ہے اس میں فن کی بلندی ہے، نادر تشبیہیں ہیں، نازک خیالی ہے، الفاظ کی دروبست ہے لیکن طنز کی نشتر اور ظرافت کی شگفتگی سے یہ خالی ہے۔ میرے خیال میں ندرت خیال کی شاید ہی اس سے بہتر کوئی مثال پیش کی جا سکے ؎

کہ وہ ڈیل اب ہوئیں کی سی گت ہے
ہوئی ہے ناتوانی اس کے در پے
کسی ہمت کا یہ بابو کہن ہے
کچھ ناقبل اسے دیوانہ پن ہے
کہیں ہیں اس کو ہاتھی یہ ہے اندھیر
اٹھ ہے خاک کا یا راکھ کا ڈھیر

نہیں ہاتھی صورت کی ہے یہ رات

یا ؎

لیکن اس کے باوجود یہ فن کی جادوگری معلوم ہوتی ہے جو کرتب دکھانے سے آگے نہیں بڑھی۔ گھوڑے کے متعلق کہتے ہیں ؎

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ روان
یا بادبان باندھو پلان کے رو اختیار

بالکل یہی بات راجہ زیت سنگھ کے ہاتھی کے بارے میں کہی گئی ہے ؎

جب بیٹھے یہ تو اٹھنا اس سے ہے دور
لگیں جب تک نہ اس کو راج و مزدور

سودا کی نوکوں جھونک شگفتگی کی جو ایک لہر ہے اس میں کہیں کہیں طنز کی آمیزش بھی ہے۔ یہ نازک اور لطیف قسم کا طنز ہے۔ میں سودا کے ان اشعار کو اس کی ہجویات کے مقابلے میں زیادہ طنزیاتی سمجھتا ہوں ان میں فکر کی روشنی اور بصیرت ہے جو طنز کی جان ہے لیکن ان اشعار کا موضوع خاص ہے اس لیے ان کا طنز محدود ہے۔ ان میں زندگی کی سی بے پایانی ہے اور نہ کائنات کی سی وسعت چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

سجدہ کیسے صنم کو میں دل کے کشت میں
کہہ اس خدا سے شیخ جو ہے سنگ و خشت میں

جی نے سجدہ کیا نہ آدم کو
شیخ کا پڑ چکا ہے بایاں پاؤں

سنگ ہے بیت الحرم کی شیخ اتنا ہے بتا
آئینہ دل کا بھی اس گھر میں بٹھلانا نہیں

کیا شکوہ کیا شکایت اپنی ہے شکل ایسی
وہ دن سے آپ ہی کو منحوس جانتے ہیں

(۳)

اُردو کا دوسرا طنز نگار شاعر نظیر اکبر آبادی ہے جس کا نام ہمارے تذکرہ نگاروں نے شعراء کی فہرست ہی سے خارج کر دیا تھا۔ نظیر غزل کے شاعر نہیں۔ غزل کے لیے دل کا خون کرنا پڑتا ہے۔ ہماری غزل کی روایت کا خالق میر ہے۔ میر جیسی غزل وہی کہہ سکتا ہے جس کی ہڈیوں تک کو تپ عشق نے گھلا دیا ہو۔ نظیر بقول نیاز فتح پوری "چٹکلے باز" تھے۔ دل کی لگن سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اُردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو خاصی بھی ہیں۔ انھیں ہنس ہنس کر مار کھانا خوب آتا ہے۔ نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا جڑا اچھا امتزاج ہے۔ اچھا اس لیے کہ اس میں تیز قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج بڑا ہی خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاق صحیح کو گوارا نہ ہو چڑے پیٹے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فنکار کی طرح اس نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔ اُردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نامحدود ہے۔

نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے۔ اس کا اجتماعی شعور بہت تھا۔ سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے۔ وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فساد کو دیکھ کر نشتر استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی نظر میں جنونانہ گہرائی ہے۔ وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے۔ انھیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں۔ وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں شاید اسی لیے فساد پسند ان کی نظر چڑھ جاتی ہے۔ زندگی کی رنگارنگی کو انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ان کی شاعری کو وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے۔ ان کے فکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر ملا کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظریں غضب کی وسعت ہے۔ نظیر کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعرا نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا۔ نظیر نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا۔ لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لیے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ ننگا کر سکتے ہیں تشہیر کر سکتے ہیں لیکن مرمٹنا مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انھیں گوارا نہیں۔

یہ کام سودا کے بعد اُردو شعراء میں انشا نے کیا اور سودا سے بڑھ چڑھ کر کیا۔ سودا اور انشا میں کئی اعتبار سے مناسبت ہے۔ دونوں کا مزاج ایک جیسا تھا۔ دونوں خوش باش لاابالی اور ہنسوڑ قسم کے انسان تھے۔ دونوں نڈر اور بے باک تھے لیکن سید انشا سفاک بننے کی زیادہ بیباک ہیں اور زبان پر انھیں قدرت بھی زیادہ ہے۔ نظر میں گہرائی اور جذبے میں گرمی انشا سے زیادہ سودا میں ہے۔ انشا کا فن لچھے داریوں کا فن ہے اور جہاں تک مدعا گوئی کا تعلق ہے سودا ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ مصحفی کی پگڑی اُچھالنے میں انشا نے کون سی کسر اُٹھا رکھی ہے۔ جلوس نکالے اور سوانگ رچائے لیکن اس کے باوجود وہ ان کو رسوا نہ کر سکے۔ انشا کی ہجو میں تو کی بلندی، پاکی اور صفائی نہیں، نعم و غصہ اور زہرناکی ہے پھبتیاں کے کہنے ہیں۔ ٹھٹھے لگے دکھانا اور انگلیاں نچانا ہے۔ انشا کی ہجویات کا طنز سے دُور کا تعلق بھی نہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کو اچھے ظرافت نگاروں میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ میاں بیتاب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ سید انشا کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو

عادت بھی خاں کی مصاحبت نے ٹھونیا۔ انشا کی شاعری پر لکھنؤ کی عام فضا اس طرح نہیں چھائی جس طرح ان کی خوش طبعی پر لکھنؤ کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ انشا کی ظرافت مخنوی ہے اور ان کی ہجو شہد میں ڈوبے ہوئے کپڑے سے آنا رنا جانتے ہیں۔ سودا اور انشا میں قریب قریب اتنا ہی فرق ہے جتنا لکھنؤ اور دہلی کے آداب میں ہے۔

انشا بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے بگاڑنے میں ماحول کو بڑا دخل ہے اور جہاں کہیں انھوں نے گرد و پیش سے آنا دہو کر داد آبی ہے کام لیا ہے وہاں ان کی بے پایاں صلاحیتیں صاف ابھر آئی ہیں۔ انشا ایک طرف علم و فضل رکھتے تھے، ادب اور زبان کے سنجیدہ مسئلوں سے انھیں دلچسپی تھی، دوسری طرف انھیں شاعری کا چسکہ تھا جس بنانے میں بیکاروں کا مشغلہ بھی جاتی تھی۔ انشا نے اپنی طبیعت کو ماحول کے مطابق ڈھالنے میں اپنے علمی ذوق اور طبعی میلان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی حامی نہیں چھوڑا اور آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کس حد تک وہ توازن قائم رکھ سکے۔ انشا کی غزلوں میں مجھے یہ توازن نظر آتا ہے۔ یہ انشا کے ذوق علمی اور شگفتہ طبعی کا بہترین آئینہ ہیں۔ ان کی فضا رنگین، شگفتہ اور تبسم خیز ہے۔ ان کی لے نرم، خوشگوار اور تمکین ریز ہے۔ میں انشا کی غزلوں کی اس دلکشی اور شگفتگی کو ان کا اصلی فن سمجھتا ہوں۔ اس میں وہ سودا سے آگے ہیں۔ آگے تو وہ ہجویات میں بھی ہیں لیکن ان میں انھوں نے اعتدال نہیں بتایا۔ فن کی حدود کا خیال نہیں رکھا اور جس طرح مدح میں وہ بھٹی تک پہنچ گئے ان کی ہجو کی حدیں بھانڈوں اور قلاشوں سے جا ملیں۔ انشا آج اپنی غزلیات اور ان کے ڈب ولہجے کی نرمی، فضا کی رنگینی اور لے کے دھیمے پن کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ان کے یہاں چٹکیاں اور گدگدیاں بھی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

گالی سہی، ادا سہی، چین جبیں سہی — یہ سب سہی پہ ایک نہیں کی نہیں سہی
کرنا نہیں کے کہنے سے ناحق برا ہوا کچھ — میری طرف کو دیکھیے میں نا نہیں سہی

چند مدت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے — چلیے پھر کعبہ بھی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

چھیڑ نے کا تو مناسب ہے کہ او روٹھنو — بات ہیں تم تو خفا ہو گئے لو او روٹھو

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں ہم کچھ جی اس کے — کیا کیجیے دروانہ اِدھر بند اُدھر بند

اجی کہتا ہوں درمازے کی کنڈی کھول دو چپکے — نہیں تو پیر اسوہے آج اور صاحب کی چوکھٹ ہے

(۴)

اُردو کا پہلا بڑا طنز نگار غالب ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر غالب نہ ہوتا تو بعض لوگوں کا یہ کہنا صحیح سمجھا جاتا کہ اُردو شاعری طنز کے نشتروں سے خالی ہے۔ غالب کی طنز کا ہجو سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو سے اپنی زبان آلودہ نہیں کی۔ اس

لحاظ سے وہ سودا اور انشا کے سلسلے میں نہیں آتے۔ غالب کے طنز و ظرافت کی بنیاد نظر و خبرہ و بصیرت و بصر پر ہے۔ غالب کے یہاں سلیقہ بڑی چیز ہے اور یہی ان کے فن کی جان ہے۔ ان کے فن کا یہ سلیقہ ان کے فکر کی روشنی سے ہے۔ اسے اگر ہم انہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ "بصد رنگ گلستاں" ہے۔

غالب کے طنز کی "معنویات" میں ایک بقول رشید احمد صدیقی "براہ راست نہیں" اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ جس پر وہ وار کرتے ہیں اسے اوّل تو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا اثر کر چکتا ہے۔ طنز کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے۔ غالب کے لفظوں میں یہ ایک ادا ہے ؎

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

غالب کے طنز میں شوخی کا رنگ ہے اور اس لحاظ سے وہ سودا اور نظیر کے طنز سے مختلف ہے لیکن اس کے یہاں طنز و شوخی میں کچھ عجیب اندرونی ہم آہنگی ہے۔ یہ امر بات ہے کہ اس ہم آہنگی میں بھی طنز غالب ہے۔ اس لحاظ سے غالب طنز نگار زیادہ اور ظریف کم ہیں۔ حالی نے غالب کے شاید شگفتہ اور باغ و بہار انداز تحریر یا ان مکاتیب کی وجہ سے جو زعفران زار ادب ہیں ان کی ظرافت کو اہمیت دی اور ان کو عجیب ان ظریف" کہا لیکن مجھے غالب کے کلام میں طنز نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لیے میں انھیں "ظریف" سے زیادہ طنز یعنی طنز نگار سمجھتا ہوں۔

غالب کا عقیدہ طنز کے بارے میں یہ ہے کہ وہ جتنا تحمل دار ہو اچھا ہے۔ ویسے تو ہر پرستی سے انھیں ہمیشہ نفرت رہی اور پیال راہوں پر چلنا انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا لیکن ان کا طنز بالکل ان کی اپنی چیز ہے اور اس میں انفرادیت بہت زیادہ نمایاں ہے۔ وہ ٹیڑھی گفتگو اور ٹیڑھی شاعری کے شاید اس لیے مؤثر ہے کہ خود گفتگو اور شاعری ٹیڑھی ہے۔ وہ بڑا ہی سادہ اور بے تکا ہے۔ سادگی فن کی ہے اور بے تکا پن فکر کی۔ تضاد کاری ہی میں غالب کی انفرادیت کا راز ہے۔ غالب کے طنز میں جھلاہٹ، زہنا کی اور تلخی نام کو نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے لب و لہجے کی تلخی سے اس کو تلخ نہیں بنایا وہ جیسے ہر صحیح اور سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی ادب والنشا کے اثر سے اس طنز کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جو خون کی پھوار بھی ہو اور تلوار کی دھار بھی۔ سوئفٹ انگریزی کا مشہور طنز نگار ہے جس کے طنز میں تیزی اور گرمی دونوں اعتدال سے زیادہ ہیں۔ تیزی، وحشت اور بربریت کا رنگ لیے ہوئے ہے اور گرمی ہیجان اور غضب تک پہنچ گئی ہے لیکن طنز کی تیزی جب حد سے گزر جاتی ہے تو اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر ہلاکت بار ہو سکتے ہیں لیکن اصلاح کار ان سے کبھی نہیں۔ غالب کا طنز شوخ و شنگ رہتے ہوئے بھی دھیما ہے۔ اس میں چابک دست نشتر زن کے ہاتھ کی صفائی، نرمی اور گداز ہے۔ غالب نے طنز کے یہ تعریض کا پیرایہ بیان اختیار کیا۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ طنز میں تلخی اور ناگواری آنے نہ پائے اور تاثیر سے پہلے مخاطب کو یہ احساس نہ ہو کہ اس پر عمل جراحی کیا گیا ہے۔ غالب کے طنزیہ انداز کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ آج ہمارے بعض نکتہ رس نقاد بھی اس چھپے ہوئے طنز کا پتہ نہ چلا سکے اور زوال کے شعروں کا رخ انھیں غالب کی طرف نظر آیا ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت بھی دیکھا چاہیے

گر خامشی سے فائدہ اخفاء حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

ہم کہے اس اوزاری پر گھمنڈ — دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

غالب کا طنز نرم ہی نہیں ہمارلچی ہے اور اس کی ہواری یہ ہے کہ اکبر کی طرح لفظوں کی اُلٹ پھیر یا بقول آل احمد سرور محاورات کی توڑ مروڑ کی سی رنگینی سے یہ پیدا نہیں ہوا بلکہ روح شعر کی طرح شعر کی نس نس میں ساری ہے۔ غالب کا فن شوخی کا فن ہے چھیڑ اور چٹکلہ بازی کا فن نہیں اس خصوصیت میں غالب اکبر الہ آبادی سے بھی ممتاز ہیں اور نظیر اکبر آبادی سے بھی۔ اکبر بھپتی پھبی کہتے ہیں اور نظیر کے یہاں چٹکلے خوب ہوتے ہیں غالب شوخ نگار ہے اور اس کی شوخی کی جان طنز ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

ابر و باراں سے آئے اگر ٹوٹ گیا — جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

اس شعر میں کتنا پاکیزہ، گہرا اور مؤثر طنز ہے اور اس کو جس سادہ و پرکار انداز میں ادا کیا گیا ہے اس کا لطف محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مومن خاں نے بھی یہی بات کہی ہے لیکن غالب کے شعر سے اسے کیا نسبت ؎

کہاں وہ اب اسیری کہاں وہ عیش قفس
کہ برق بہتر بلا رہ نشیماں کے لیے

غالب کا طنز ابہامی ہے اور اس میں زود اثر تازگی، لطف جو کچھ بھی ہے ابہام کی وجہ سے ہے۔ ابہام اور شوخی غالب کے طنز کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں۔ ایک میں وقت اور گہرائی ہے دوسرے میں رنگینی اور گیرائی۔ غالب کے موضوعات میں اتنا تنوع نہیں جتنا اکبر کے موضوعات میں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ غالب کا طنز تنگنائے غزل میں صرف ہوا جو پہلے سے جذبات محبت اور اس کی سرشارانہ کیفیتوں کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ ادھر اس کے فن میں جو ایک طرح کی نازکی اور رعنائی ہے اس کا تقاضا تھا کہ اس میں اجتماعی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں راہ نہ پائیں اور اس کو زندگی کے بڑے اور ابدی مسئلوں کے لیے وقف رکھا جائے۔ غالب کے طنز کی ابدیت فن و فکر کی ہیئت و موضوع دونوں کی وجہ سے ہے۔ انسان، خدا، مذہب، عبادت، جنت اور اس کی نعمتیں، کعبہ و خمار کی پابندی جیسے اہم مسئلے غالب کے طنز کا موضوع ہیں جن پر اس بڑے فنکار نے اپنا تدبر بیان صرف کیا۔ انسان خدا کا شاہکار ہے۔ خدا کے شاہکار کی ارزانی غالب

دیکھ سکے اور پکار اٹھے ۔

ہیں آج کچھ ذلیل کہ گل تک نہ تھی پسند ۔۔۔ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس شعر کا لب و لہجہ ہی طنزیہ نہیں بلکہ اس کا ہر لفظ طنز کی تیزابی اور تلخی لیے ہوئے ہے "گستاخیٔ فرشتہ" اور "ہماری جناب" کیسے برمحل اور بامعنی الفاظ ہیں۔ ان کی داد کچھ اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ چند شعر سُناتا چلوں ۔

دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا ۔۔۔ دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ۔۔۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ ۔۔۔ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

دور رقبہ غضب جب کوئی ہمسایہ نہ ہو ۔۔۔ پھر غلط کیا ہے کہ ہمسایہ کوئی پیدا نہ ہو

پٹکتے جاتے ہیں سر شوق کے لکھے پہ ناصح ۔۔۔ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر ۔۔۔ دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

نہ گنا ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی ۔۔۔ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

خلد میں کیجے تو دوزخ بھی ملا لیں یا رب ۔۔۔ سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

یہ اشعار یونہی روا روی میں محض یادداشت سے نقل کر دیے گئے۔ غالب کے مختصر سے دیوان میں ایسے نشتر اور بھی ہیں جن کی چبھن ہمیں پہلی ہی نظر میں محسوس ہو جاتی ہے۔

(۵)

اس اجمالی جائزے میں جن اُردو شعراء کا ذکر ہوا وہ محض ظریف اور طنز نگار نہ تھے اس کے سوا بھی بہت کچھ تھے بلکہ بہت کچھ زیادہ تھے اور ان میں سے قریب قریب ہر شاعر کی شہرت، شہرت اور ادب میں اس کا مقام طنز و ظرافت کا شرمندۂ احسان نہیں، دوسری خصوصیات کا مرہون منت ہے۔ یہ خصوصیات ان کے بقائے دوام اور شہرت عام کا سبب بنیں۔ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ اس کے پورے آٹھ سال بعد ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ نکلا جس کا مقصد اُردو میں ظرافت کو فروغ دینا تھا۔ پنچ کے مضمون نگاروں میں بڑے بڑے کوکا، اہل قلم

تامل تھے۔ الٰہ آباد کے سواسب نے نثر میں ظرافت کے پھول کھلائے۔ اکبر نے طنز و ظرافت کو فن کی حیثیت سے شعر میں برتا اور اس کے لیے قطعہ کا فارم اختیار کیا۔ اکبر کی شاعری میں ظرافت کا ایک خاص مقام ہے۔ اُردو میں اکبر کی اہمیت ظرافت کی وجہ سے ہے۔ اکبر سے پہلے ظریف بھی اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے۔ یہ میں اوپر کہیں لکھ آیا ہوں کہ طنز کی روح اس کا مقصد ہے۔ اکبر کے یہاں مقصد کی لَو بہت بڑھی ہوئی ہے۔ مقصد طنز کو بلند اور معیاری بنانے کا ضامن ہے لیکن اکبر کے یہاں وہ آتنا بڑھا کہ اس نے طنز کے جادو کو بے اثر بنا دیا۔ اکبر کا طنز اس لحاظ سے سیدھا اور براہ راست ہے۔ وہ طنز میں ایما، اشارے اور تعریض کے قائل نہیں۔ وہ سامنے سے وار کرتے ہیں۔ اکبر کے فن میں ایک طرح کی چمک اور ان کی ظرافت میں ایک قسم کی عریانی ہے۔ فن میں چمک زبان و بیان پر قدرت سے آئی۔ اُردو کے قادر الکلام شاعروں تو اور بھی ہیں لیکن نظیر اور اکبر کے درجے کو کوئی نہیں پہنچا۔ نظیر کی قدرت مشاہدے کی وسعت سے پیدا ہوئی تھی اکبر سے نظیر کی قدرت اور مشاہدے کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔ اکبر کی قدرت زبان اور گیرائی میں ہے جس کا اظہار رندانہ بیان اور لطف زبان سے ہوا ہے۔ ظرافت میں عریانی میرے خیال میں اکبر کے جنسی میلانات کی غماز نہیں بلکہ اس زمانے کی سوسائٹی کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس زمانے میں عام سیاسی پستی کا اثر اخلاق پر بھی پڑا تھا اور رشعرا، شباب، شاہد، شراب کے گرد زندگی گردش کرنے لگی تھی۔

اکبر کی ظرافت فقرہ بازی کا رنگ لیے ہوئے ہے اور غالب کے برعکس یہ فقرہ بازی روایت، لفظی اور صفت گری کی پیداوار ہے۔ اکبر لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نغمہ سنجی کا آغاز لکھنؤ کے بگڑے ہوئے مذاقِ شعری کے زیر اثر ہوا۔ سرسید کی تحریک کی مخالفت میں جب الفعول نے پرانی روش ترک کر کے طنز و ظرافت کی راہ اختیار کی تو وہ پوری طرح لکھنؤ کے اثر سے اپنے کو پاک نہ کر سکے۔ لفظوں کا کھیل اس کے بعد بھی ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ اکبر کے اشعار کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے ان کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت کا تعلق تمام تر الفاظ کی نشست اور رد و بست سے ہے۔ اکبر کی ظرافت میں زبان و بیان کی چاشنی اور مٹھاس کا چٹخارا ہے جس سے صرف اہلِ زبان ہی حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں شگفتگی یا کچھ رعنائی ہے لیکن گہرائی، گرمی اور تیزی نہیں۔ یہ ہنساتے ہنساتے لوگوں کو سوچنا سکھاتا ہے لیکن سر چڑھنے پر آمادہ کرنے اور خوابیدہ شعور کو بیدار کرنے کے جوہر سے خالی ہے اور اس کی وجہ کیا اوپر بیان کر آیا ہوں کہ اس میں اس عہد کے عام مذاق کا خیال زیادہ رکھا گیا ہے اور پڑھنے والے کو یہ محسوس کرا دیا گیا ہے کہ اس کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ اس قسم کا مذاق مجلسوں کو گرما سکتا ہے لیکن اچھے اور بلند طنز کی پہچان یہ ہے کہ وہ دلوں کو گرمائے اور خون کے دوران کو تیز کرے۔

اس لحاظ سے اکبر پوری طرح "اودھ پنچ" حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا کام ہی لوگوں کی پگڑیاں اُچھالنا اور ان کی بھدی اور بدنما تصویریں بنانا تھا۔ اکبر اس حلقے سے نہ نکل سکے اور وہ اس میں پھنس کر رہ گئے۔ ان کا طنز ظرافت سے نہ اُبھرا اور ان کی ظرافت سستی قسم کی فقرہ بازی سے آگے نہ بڑھی اس لیے اس میں ابدیت کا رنگ نہ آسکا لیکن اس کے باوجود اُردو ادب میں اکبر کے طنز و ظرافت کا ایک درجہ ہے۔ اس نے اُردو ادب کی فضا کو رنگینی اور خوشگواری دی اور زندگی سے اس کا رشتہ مضبوط کیا۔ غالب سے پہلے طنز و ظرافت کی حدیں ابتذال اور تمسخر سے ملی ہوئی تھیں۔ غالب نے اس کو فن کی لطافت اور حُسن سے آشنا کیا لیکن تنگنائے غزل میں محصور رہنے کی وجہ سے غالب اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنے طنز کا موضوع و محل نہ بنا سکے۔ اکبر نے اس کام کو انجام دیا اس لیے اکبر اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ جس طنز کا آغاز سودا سے ہوا اکبر تک پہنچتے پہنچتے وہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔

گرمی، تیزی اور تلخی، طنز کے تین عنصر ہیں۔ مقصد اس کی روح ہے۔ اکبر کے یہاں گرمی اور تیزی نہیں لیکن تلخی ہے اور یہ تلخی غالب سے زیادہ ہے۔ غالب کے یہاں تلخی پھیکی ہے۔ اکبر کے طنز کی تلخی کہیں کہیں زہرناکی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اکبر کا وہی طنز مؤثر اور کامیاب ہے جو ہلکا اور لطیف ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا مقصدیت کے غلبہ نے اس کو بھی بے اثر بنا دیا ہے۔ اکبر بڑے فن کار ہیں اور جہاں تک مہارتِ فن کا تعلق ہے وہ مغرب کے بڑے سے بڑے فن کار کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ شعر کا اپنا جذبہ ہے۔ اکبر کا جذبہ شدید قسم کا ہے۔ فن کا عمدہ سلیقہ شعاری ہے۔ اکبر سلیقہ بھی بہت اچھا رکھتے ہیں۔ اس کا آب و رنگ لطف بیان سے وابستہ ہے۔ اکبر کو اس میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ اکبر کے فن کی عظمت کیسے گھٹائی جا سکتی ہے۔ اکبر نے بقول آل احمد سرور تاریخی حقائق اور فطری طاقتوں کا مذاق اڑا کر اپنی جرأت کا ثبوت دیا۔ میں اسی جرأت رندانہ پر عظمتِ فن کی بنیاد رکھتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اکبر کا طنز ظرافت سے نہیں ابھرا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اکبر نے جن چیزوں کا مذاق اڑایا ان کو سب نے دیکھا لیکن ان میں دبا ہوا طنز بہت کم لوگوں کو نظر آیا۔ اکبر کے طنز کا نشانہ نہ تاریخی حقائق ہیں نہ فطری طاقتیں بلکہ قوم کا وہ کردار ہے جس نے اس کو "تعلیم انگریز" پر اُبھارا، وہ بے بصری ہے جس کی وجہ سے وہ مغربی تہذیب کی شمع پر پروانہ کی طرح ٹوٹ کر گری، وہ نقصِ نظر ہے جس نے اپنی ہر چیز کو حقیر و صغیر بنا کر دکھایا۔ چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

مال وہ ہے بنے جو یورپ میں　　بات وہ ہے جو پائیر میں چھپے

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر　　اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

لے سنبھال اکبر تجھ کو صاحب لوگ　　دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالبِ عزنی　　بھول جاؤں زبان بھی اپنی
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں　　سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

گریجوایٹ ہیں کھاتے ہیں اور تنخے ہیں
بنائے اپنے کو ہیں دوسروں میں ہنستے ہیں

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجیے مجھ سے
صاحب کے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

اسی نقطہ کو سامنے رکھ کر ہی میں نے عرض کیا تھا کہ اکبر پہلے ظریف ہیں، اس کے بعد ان کے طنز کا نمبر آتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ طنز نگار ہیں اور میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ ظرافت سے زیادہ طنز کی ان کے یہاں اہمیت ہے۔ اکبر نے اپنی ظرافت کی طنزیائی روح

طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

بلبل پہ نہ جاؤ حق کو سُن لو
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چُن لو

ن یہ رُوح اتنی دبی دبی اور گھٹی گھٹی ہے کہ اس کی تڑپ، گرمی اور حرکت ہر شخص کو محسوس نہیں ہوتی۔ اقبال نے میرے خیال میں سب سے پہلے س رُوح کی حرارت محسوس کی اور اوّل اوّل خود انھوں نے اس پر ظرافت کا ہلکا سا پردہ ڈالنا چاہا لیکن اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی ور یہ رُوح تڑپ کر اس پردے سے باہر نکل آئی۔

غالب کے بعد اکبر آئے لیکن اکبر کے بعد اقبال کا ظہور ہوا، شاید اس لیے اُردو میں طنز اکبر کے فن سے آگے نہ بڑھا۔ طنز کی روح نے اقبال کے یہاں حکمت، متانت اور روشن بصیرت کا روپ اختیار کر کے اچھی اور معیاری ظرافت کا گلا گھونٹ دیا ہے

ہجو گوئی کی تاریخ

قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی

اکثر اصحابِ فن میں ہم چشمک ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض میں تو منافست ہوتی ہے اور بعض میں انسانیت ہوتی ہے قسم اول کا معاملہ تو انارکلی اور دور کی نوکا چوکی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے خفیف معاملات ہوتے ہیں کہ ان کو اکثر مورخ اور نقاد کوئی بھی نظر انداز کر دیتے ہیں قسم دوم کا معاملہ طوالت پکڑ جاتا ہے۔ اول نوکا چوکی ہوتی ہے پھر ہجو بیچ، پھر ہجو قبیح، پھر سب وشتم تک نوبت پہنچ جاتی ہے ؎

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم تم سے تو ہونے لگی

بعض دفعہ ہاتھا پائی بھی ہو جاتی ہے بلکہ خون خرابے بھی ہوتے ہیں۔

ہجو گلستانِ سخن کا ایک خاردار جھاڑ ہے۔ گل کی قدر افزائی میں خار کو بڑا دخل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مکمل زبان کو ہر قسم کے الفاظ و محاورات اور نحت کے سانچہ ان کے استعمال کی ضرورت ہے۔ اگر ہجو وغیرہ نہ ہو تو زبان فحش، نجس اور غلیظ الفاظ کی تنقیص سے محروم ہو جائے۔ ذوق کی چھیڑ چھاڑ، مرزا و وزیر سے شاعر کی طبیعت میں جولانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا سودا نے ایک شاعر سے جو ان کا شاگرد رہنے آیا تھا کہا کہ ہجو لکھا کیجیے۔ اس نے کہا کہ کس کی ہجو لکھوں۔ مرزا نے کہا کہ آپ میری ہجو لکھیے میں آپ کی لکھوں گا۔ ہجو میں یہ دو صورتیں ہیں۔ ایک اصلی دوسرے فرضی۔ اصلی یہ کہ واقعی طور پر کسی سے مخالفت ہو جائے اس کی ذم لکھ جائے۔ فرضی یہ کہ طبع آزمائی کے لیے کسی فرضی شخص یا ایسی شے کی ہجو کی جائے جو جواب نہ دے سکے۔ جو جوش و خروش قسم اول میں ہوتا ہے وہ قسم دوم میں نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اساتذہ نے بھی مچھر وغیرہ کی ہجویں لکھی ہیں اور دیکھی بھی ہیں۔

ہجو سے کسی زبان کی شاعری خالی نہیں۔ عربی میں بھی ہجویں ہیں۔ آج کل ملک میں انگریزی کا بڑا رواج ہے اس لیے یہ بتانا ضرور ہے کہ انگریزی میں اول ہجو کا معیار پست تھا۔ ڈرائڈن نے نظم میں سوفسٹ نے نثر میں اس کا معیار بلند کیا۔ فارسی کے بڑے بڑے استاد نے ہجویں لکھی ہیں اور اس پر فخر و ناز کیا ہے۔ خاقانی ابو العلا گنجوی کا شاگرد تھا۔ ہجو گوئی میں بڑا مشاق تھا اور وہ اس کمال پر نازاں تھا۔ استاد پر بھی بالکہ صاف کر گیا۔ کہا ہے ؎

بینی سگ گنجہ را دریں کو ہم زہ و قفاد ہم سیہ رو

یہ نزدیک اُردو میں ہجو گوئی کے موجد امیر خسرو ہیں اور انھوں نے اس کی بنیاد ہجو ملیح یعنی ایسی ہجو پر رکھی ہے کہ جس سے نظر صدمے کا مفہوم ہو۔ لیکن اس میں ذم کا بھی پہلو ہو۔ دلی میں ایک چھوٹا ساقحبہ خانہ مشہور تھا۔ اس کا گاہک شہر کے بھنگڑوں کا مرکز تھا چونکہ بھنگ نے میں مشہور تھی۔ شہر کے دور دور محلوں سے بھنگڑ اس کے ہاں آتے تھے اس لیے تقریباً ہر وقت اس کے یہاں بھنگ گھٹتی تھی۔ اس کی شان میں خسرو فرماتے ہیں ؎

اوروں کی چوپہری باجے ہجو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے نا ہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کپڑے رکھے جس پہ نا ہیں توسل
اوروں کے جہاں سینگ ساتھ چوکے ہیں توسل

چونکہ دلی میں ہجو کا سنگ بنیاد دلی کے اُردو شاعری کے موجد اور ایک بزرگ نے رکھا۔ شاید اسی وجہ سے شاعری کی یہ قسم دلی کو بہت مرغوب ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ کا دامن ان کاشوں میں اس طرح اُلجھا ہوا ہے کہ اس کا جدا کرنا ناممکن ہے۔ دلی کے مقدسین بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہ تک نے اپنے ہم عصر شاعر آبرو پر ایک بہت فحش چوٹ کر دی تھی اور آبرو نے بھی اس کا جواب دے ڈالا تھا۔

اساتذۂ دلی کو اس قدر دلچسپی ہجو سے تھی کہ اگر کوئی اور الٹھ نہ لگا تو مجرد اور مکھی وغیرہ ہی کی ہجو لکھ ڈالی۔ امراد کو ہجو سننے کا ایسا شوق تھا کہ جب مصحفی اور انشا کی چلی جس میں نہایت فحش الفاظ استعمال کیے گئے تھے تو شہزادہ سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم ثانی فریقین سے ہجویں منگا منگا کر سنتے تھے اور انھیں انعام دیتے تھے۔ بعض دفعہ اپنی درباری عظمت کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ضاحک اور سودا اور سکندر حاضر دربار تھے۔ شہزادے نے سودا سے کہا کچھ سناؤ۔ سودا نے عرض کیا میں نے فواحش کچھ لکھا نہیں۔ سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے کچھ کہا ہے۔ شہزادہ نے کہا سناؤ۔ سودا نے سکندر کے نام سے ضاحک کی جو ہجو لکھی تھی پڑھی۔ ابھی دو تین ہی شعر پڑھے تھے کہ ضاحک اٹھ کر سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ نو شاعروں نے دربار کا کچھ خیال کیا نہ شہزادے نے اپنی شان کا خیال کیا۔ بس شاعروں کی لڑائی دیکھ دیکھ کر مزا لیتے رہے۔

جب اساتذہ دلی اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے تو یہاں بھی آکر وہی اودھم مچایا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ خواجہ میر درد کے شاگرد محشر اور جرأت کے شاگرد مہلت میں نوک جھونک ہوتے ہوتے تلوار چل گئی۔ محشر مارا گیا، مہلت فرار ہو گیا۔ کئی برس کے بعد مہلت پھر پہنچا تو محشر کے رشتہ داروں نے اس کو مار ڈالا۔ غرض اہل دلی میں نوک جھونک اور ہجو کے ۸، ۴ معرکے ہوئے۔ ان میں چھ معرکے وہ ہیں جو استاد و شاگرد میں ہوئے۔ ان میں بعض معرکے ایسے بھی ہوئے جن میں نوعیت کو اختلاف ہے اور بعض نے ان کو رسمی قرار دیا ہے لیکن ایسے صرف دو تین ہی ہیں۔ چونکہ ہجو کی بنیاد نوک جھونک سے قائم ہوتی ہے اس لیے میں ان کا یہاں ایک ہی جگہ ذکر کرتا ہوں۔ میں اس امر کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ باوجود جدوجہد کے میں اس دلچسپ مضمون کو کما حقہٗ مکمل نہ کر سکا ضرورت ہے اور امید ہے کہ تاریخ ادب اردو کے شائقین و مصنفین میں سے کوئی اہل قلم اس کی تکمیل کی کوشش کریں گے ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ہجو کی ایجاد کے متعلق تو لکھا جا چکا ہے۔ امیر خسرو کے بعد جب بارھویں صدی ہجری میں دلی میں شاعری کا چرچا بڑھا تو جعفر زٹلی نے ہجو گوئی کو ذریعہ معاش بنایا۔ یہ جس امیر کے پاس جانے کا قصد کرتا تو چند شعر اس کی مدح میں لکھتا اور چند ہجو کے۔ اگر اس نے اس کو کچھ دے دلا دیا تو مدح سنا کر چلا آیا ورنہ ہجو کو مشتہر کر دیا۔ اس نے بادشاہ اور شہزادوں کو بھی نہ چھوڑا یہاں تک کہ سلطان اورنگ زیب مرحوم کے بعد جب ان کے بیٹوں میں جنگ ہوئی تو اس نے جنگ نامہ لکھا۔ چند مہذب اشعار یہ ہیں ؎

خبر یہ فغاں ترکہ بر کشد کرد — ہمہ کار و بار پر ہشد کرد
جہاں چھے ایسا کہیں کبوت — گئے خلق کے نہ کو کا لگ بھبوت
دوئم شاہ اعظم ہر کہ سند ور — بہ سر سوے اندا خت کا پر
ہمارم پسر ڈوبنی کا جنا .....

فرخ سیر بادشاہ جب تخت نشین ہوا تو اس نے اس کا سکہ لکھا ؎

سکہ زد بر گندم و مولٹہ و مٹر
بادشاہ پنجہ .....

فرخ سیر نے اس کو قتل کر دیا۔ جعفر ایک دن سنجھ مہا سنگھ کے پاس گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کو کیا دینا چاہیے۔ جب ذرا دیر ہوئی تو جعفر نے کہا ؎

نظر مت کرو پانچ اور سات پر
مبادا کہ زور آ پڑے ..... پر

جعفر نے اپنی بیوی کی بھی ہجو لکھی ہے ؎

کھائے بہت اور کچھ نہ کرے — سلگے گھر سے لڑتی پھرے
کام کہے تو ایسا کرے — چولھے کی ہانڈی کھڈی پھرے

جعفر کا ایک شاگرد سے بگاڑ ہو گیا۔ شاگرد نے مشاعرے میں غزل پڑھی۔ اس کا مطلع یہ تھا ؎

استاد کو میدان میں کل ہم نے پچھاڑا
چھاتی پہ چڑھے کود کے اور مونچھ کو اکھاڑا

ولی دکنی نے ناصر علی دہلوی کے متعلق لکھا ؎

اچھل کر جا پڑے جوں عرصہ برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کون

ناصر علی نے جواب دیا ؎

یہ اعجاز سخن گر اڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہیں ہے گا علی کون

انشا دہلوی نے آبرو پر چوٹ کی، غالباً آبرو نے جواب نہیں دیا ؎

غزل اس طرح سے کہنی بھی آسان تجھ سوں بن آوے
جواب اب آبرو کسکہ سکے مضمون بہتر ہوں

حاتم نے ناجی کے متعلق کہا ؎

سخن میں فخر اپنا جن کیے یہ تا نہیں ناجی
اسے سمجھا ہے حاتم کس نوع اشعار کہہ کہہ کر

حاتم نے نسیم پر چوٹ کی ؎

جس دن سے کوئی یار کا حاتم مقیم ہے
بدتر اسے خزاں سے بہار نسیم ہے

نسیم نے جواب دیا۔ ؎

طلب جو سلیماں کی کچھ تو حاتم ہے
لب سوال نہ ہوئے تو ریح حاتم ہے

میر اور سودا میں چلی ؎

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف (سودا)
طرف ہونا مرا مسلسل ہے میر اس شکستہ فن میں — یونہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے (میر)
نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے — وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یا انداز کیا جانے (سودا)

سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ میر نے اس کی ہجو میں کہا ؎

دلی میں لے کے گدیاں کئی اس نے پالیاں
ہمسایوں کی بھلوں نے کئی گھائیں گالیاں

میر صاحب پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ ان کے نانا نانبائی تھے۔ اس لیے سودا نے کہا ؎

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر — کچھ شعر یاں سلگنے کچھ نان کچھ خمیر
میری کہ لب پہ آتی ہے ہر صبح قل ہو اللہ — بیٹا تو گندنا بنے اور باپ کو ثنا میر

سودا اور ضاحک میں ایسی چلی کہ تو یہ تو، ضاحک کا کلام نہیں ملتا۔ سودا نے جو کچھ لکھا ہے وہ کلیات سودا میں موجود ہے سودا کی ہجویں فحش بھی ہیں۔ ہم مہذب لوگ لکھنا چاہتے ہیں ؎

کیجیو میری ہجو تو اے بطرے نٹ
تو بھی دوں بانس سے تجھ کو اٹ

فدوی اور سودا میں ہجو بازی ہوئی۔ سودا نے کہا ؎

شاہ ہوا ہے فرد کی کیا شاعروں کو قلق — مادہ وہ زن مخلص یاروں کا مسؤلا
کرتی ماتم اوس کے گھر کا پہنچ پاوے — آؤ جو کہہ کے پوچھ بلائے سب محلا

ندرتی نے جواب دیا ؎

کچھ کٹ گئی ہے پچی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا
دم واپسیں سے وہ اڑ چلا لٹورا
بگڑوا ہے مرزا ہے
سودا اسے ہوا ہے

بقا کی تو مرزا دونوں سے چلی تھی۔ بقا نے کہا ؎

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملا — فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اور عوض کی زبان میں — دونوں کو باندھ مرنے اب کہنا ہے پورا

قائم نے بھی میر کی نقل کی تھی اور وہی سودا والا مضمون لیا تھا ؎

روٹی کے لیے کہلائے تم میر جی میر — کہیے تو بجا ہے آپ کو میر غیر
پھر میر ہوئے یہ اس ملک کے لیلے — ساگون ہی ہے کو تو یہ لوگوں میں ہمیر

نواب ظہور اللہ خاں نواب رجرأت میں چلی۔ جرأت نے کہا ؎

ظہور عشق نہ کیوں ہو کہ کل چھڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

نوا نے کہا ؎

رات کو کہنے لگے جو رو کے منہ پہ ہاتھ پھیر
قدرت حق سے لگی ہے ہاتھ اٹھے کے بٹیر

عظیم تو پہلے سودا نے ایک غزل کہی جو بحر رجز میں تھی۔ اتفاقاً دو ایک شعر بحر رمل میں ہو گئے۔ ان کا احساس نہ ہوا۔ اس پہ انشا نے ایک مخمس کہا ؎

گر تو مشاعرے میں صبا اب چلے — کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی جامے سے اپنی نہ باہر نکل چلے — پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غیب تا بہ شرق — شنشد اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

اس مشاعرے میں جنگ و جدل کی نوبت پہنچی مگر چند صلح جو اشخاص نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ انشا نے ایک یہ چال چلی کہ شاہ عالم ثانی سے چپکے لگائی کہ فلاں فلاں شعرا آپ کی غزل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بادشاہ ناراض ہو گئے اور غزل بھیجنا بند کر دی۔ اس پر مصحفی نے یہ قطعہ کہا ؎

مجلس میں جس کے چاہے جگا شعرا کا ۔۔۔ ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی خواہش ہے کہ پہنچے یہ قصیدا ۔۔۔ اکبر تیس یا شاہ جہانگیر کے آگے

لکھنؤ میں شہزادہ سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم کے دربار میں مصحفی نے غزل پڑھی، مقطع یہ تھا ؎

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

جب مصحفی چلے گئے تو شہزادے کے ایما سے انشا نے اس غزل کے اشعار کو مسخ کرنا شروع کر دیا اور تمسخر آمیز الفاظ مضامین شامل کر دیے۔ مقطع کو اس طرح مسخ کیا ؎

تھا مصحفی کا ناجو چھپانے کو پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

پس اس پر جو دونوں میں چلی ہے تو بقول آزاد وہ خاکہ اڑا کہ کبھی تہذیب نے آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ ایسے اشعار یہاں رکھنے کے قابل بھی نہیں ہیں اور ان کی نوک جھونک کی داستان بھی اس قدر طویل ہے کہ اس کے بیان کے لیے ایک رسالہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال چند مہذب اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ مصحفی نے ایک غزل میں انشا کی طرف اشارہ کیا ؎

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری ۔۔۔ ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
اک طرفہ خبط سے کام پڑا ہے مجھے کہ ٹٹے ۔۔۔ سمجھے ہے آپ کو وہ سیحائے شاعری

مشاعرے میں ایک طرح ہوئی۔ اس پر مصحفی و انشا نے غزلیں لکھیں۔ مصحفی کا مطلع تھا ؎

سر مشک ہے تیرا تو ہے کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر انشا نے کچھ اعتراضات کیے لیکن اہل نظر کا اتفاق ہے کہ انشا کے اعتراضات لچر اور فضول تھے۔ انشا نے اپنی غزل میں مصحفی کے بڑھاپے کا مذاق اڑایا ؎

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے ۔۔۔ سر جس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن
حاسد ترے کیا پنجے سے قصد جو انشا ۔۔۔ تو توڑ دے بھٹ بلعم باعور کی گردن

انشا کی غزل میں لنگور، حور، منصور، فور، مستفور، منظور، لنگور، عصفور، مخمور، مغفور، مجبور، چور، کافور، دیجور، مغرور، مغفور، بلعم باعور یہ قافیے تھے۔ مصحفی کی غزل میں کافور، حور، ماہی، عصفور، مخمور، مغفور، رنجور، مجبور قافیے تھے۔ مصحفی نے انشا کی غزل پر کئی اعتراض کیے جن کا کوئی صحیح جواب نہیں ہو سکتا۔ مصحفی نے اسی زمین میں سوال و جواب کیے۔ انشا کی

نہ نبھا سکے اور دوسری نہیں اختیار کی ؎

اچھی ہوئی ورزش سے تری ڈنڈ پیلی
ہے بازوئے خاصا جیسے فغفور کی گردن (انشا)

اعتراض مصحفی ؎

میں لفظ فغفور کہیں دیکھا ایجاد ہے تیرا یہ فغفور کی گردن

بے شک فغفور بجز باندھنا صحیح نہیں ہے۔

توڑوں گا ستم بادۂ انگور کی گردن
کہہ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن (انشا)

اعتراض مصحفی ؎

گردن کی حرامی کے لیے وضع ہے واؤ بجا ہے تم بادۂ انگور کی گردن

اے دیو سفید سحری کاش نہ توڑے
اک کتے سے ہو زشت دیکر کی گردن (انشا)

اعتراض مصحفی ؎

جو گردنیں ہیں باندی ہیں لائق کو دکھا دیں تو مجھ کو دکھا دے شب دیجور کی گردن

کیوں ساقیٔ فورنیپ کیا نشے میں ہوں
سب یوں ہی چڑھا جاتا ہے فور کی گردن (انشا)

اعتراض مصحفی ؎

ہے آدم خاکی کی بنا خاک کا پتلا گر مور کا سر ہو تو ہو فور کی گردن

انشا کے آخری شعر کے متعلق انتہائی عرض کروں گا کہ گردن کا چڑھا جانا یعنی لمبا جانا لغو اور غلط ہے۔ سید انشا نے مصحفی کی غزل پر جو اعتراض کیے ہیں ان کو ایک قطعہ میں نظم کیا ہے۔

مصحفی

دل کیونکہ پری حور کا پاس پہ پھیلے صانع نے بنائی تری بلور کی گردن

اعتراض انشا

تجویز گو درست ہو لیکن ضرور کیا حوا ہی بخوا ہی اس کو عوامی میں کھپا دیجے

مصحفی

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے مورے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اعتراضِ انشا

کیا لطف ہے کہ گردنِ کافور باندھ کر
کھلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے
ایسے بخس کثیف قوافی سے نظم میں
دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

کافور کو بخس و کثیف کہنا کس قدر لغو ہے حالانکہ خود بھی اس شعر میں باندھا ہے ؎

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم
پگھلی پڑی ہے اس کی وہ کافور کی گردن (انشا)

جوابِ مصحفی

یہ لفظ مشدد بھی درست آیا ہے تجھ سے
خم ہوتی ہے کوئی کے تو رکی گردن
ٹوٹے ہوئے پنجے کی طرح تیرے قلم سے
جاتی ہے بچک شاہِ مغفور کی گردن

انشا

ماہی کا دخل کیا ہے مقنور میں بھلا
سانڈے کی طرح آپ نہ گڑیں بلائیے
بخرے ہیں آپ ہی کے یہ آتی ہے شاعری
بس منہ ہی منہ میں گھٹی ایسے مت شرمائیے
اشعار گچھے گچھے ہیں صلعب رونی سی
لیکن ڈھکی ہی اچھی اسے بس چھپائیے

انشا نے دلی میں عظیم کے مقابلے میں ایک جلوس مرتب و مسلح کر کے نکالا تھا جس میں ایک ہاتھی پر ایک شخص ہاتھ میں ایک گڑیا اور ایک گنڈا لیے ہوئے بیٹھا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے پر مارتا اور یہ شعر پڑھتا تھا ؎

رنگ نیا لایا ہے چرخِ کہن
لڑتے ہمیں آتے ہیں مصحفی و مصحفن

مصحفی کے ساتھ بے گناہ مصحفن کی بھی اسی طرح گت بنائی جس طرح سودا نے ضاحک کی بیوی کی بنائی تھی لکھا تھا ؎

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر بجایا
گا گا کے مات ساری ہمسایوں کو جگایا

انشا کے جلوس کے جواب میں مصحفی کے دو شاگردوں گرم و منظر نے جلوس نکالنا چاہا لیکن چونکہ شہزادہ سلیمان شکوہ انشا کے طرفدار تھے ان کے ایما سے کوتوال نے اس جلوس کو روک دیا۔ انشا نے جب مشاعرہ میں مصحفی پر یہ چوٹ کی ؎

آئینہ لی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر جس کا سرخوک کا لنگور کی گردن

تو سرِ مشاعرہ مصحفی کے شاگرد منظر نے جواب دیا ؎

لنگور کا وہ قافیہ ایسا تھا کہ جیسے
باندھے دمِ لنگور میں لنگور کی گردن

یہ چوٹ اس جنتر پر تھی کہ سید انشا گلے میں ایک دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس کا ایک۔ آگے اور ایک پیچھے رہتا تھا۔ سید انشا کا لڑکا اعتبار یہ تھا کہ ایک تو وہ لوگوں کو اپنے شرف و سیادت سے مرعوب کرتے تھے کہ سید کو برا کہنا عاقبت کو خراب کرنا ہے۔ دوسرے وہ سوختگی کی وجہ سے حکام کے منہ چڑھے رہتے تھے اس اثر سے بھی لوگوں کو دباتے۔ یہی چال انھوں نے دہلی میں چلی اب لکھنؤ میں بھی یہی کیا کہ اول شہزادے سے کہا کہ مصحفی نے جو میر آپ کی طرف اشارہ کیا ہے اس پر مصحفی نے شہزادے کے حضور میں قطعہ پیش کیا اور کہا ؎

یہ افترا ہے بنایا جو اس نے انشا کا
کہ رزم و بزم میں ہے پایہ تخت کا وہ شیر
سو تم مجھے نادان نے جو شہ سے کیا
قباحت اس کی جو مجھ سے شہ اس کو دے تعزیر

اور اسی داؤں سے گرم و منظر کو دبانا چاہا اس پر منظر نے کہا ؎

مت خوف مدافعین سے تو مجھ کو ڈرائیے
وہ تو ہے کہ جس کو کوئی ڈانٹے کوئی دبائے
دہشت کی تو مرتے ہیں تو باتیں نہ بنائیے
کی جو اگر میں نے تو کیا قہر کیا ہے
نے دین مرا اس سے نہ دنیا گئی بھڑوے

میر سجاد سے بھی انشا کی چلی۔ سجاد نے جو کچھ کہا وہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔ سجاد معمار کے بیٹے تھے انشا نے اس پر طنز کیا ؎

وہ جو معمار کا اکوڑ کے تنا — میں نے چھڑی دیکھے پر نہ بنا
تب تو بنا تھا میرے دل میں ٹھنا — راج اٹھائے یہ جس بنا کی بنا
منہدم آغوش کرے ہے فنا

کوئی شاعر بیکس تھا اس نے سید انشا کے متعلق کہا ؎

ظاہر میں تو ایسے ہیں کہ ماشاء اللہ
سب کہتے ہیں ایک ہوں گے انشاء اللہ
باطن میں جو دیکھا انھیں اتنے ہیں یہ لچ
لاحول و لا قوۃ الا باللہ

میر اور مصحفی میں بھی چلی تھی۔ کچھ زیادہ تحقیق نہیں ہو سکا مصحفی نے کہا تھا ؎

آئیں تو کریں مجھ سے فن شعر میں پنجہ
سودا نہیں بیٹھے تو ہیں سودا کی جگہ میر

نواب آصف الدولہ نے اپنی غزل میں یہ مطلع کہا ؎

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

اس پر شمس النساء بیگم شرم تلمیذ مصحفی نے کہا ؎

کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں — تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ — نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

معروف دہلوی نے رنگین کی ہجو لکھی مجھے اس کے اشعار دستیاب نہیں ہوئے نہ اس معروف کے حالات معلوم ہو سکے بس اتنا پتہ چل سکا کہ یہ نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی نہیں ہیں اور کوئی شاعر ہے۔ رنگین نے کہا ؎

معروف تو سن بات یہ اس احمق کی — کیوں تو نے زباں ہجو میں اس کی تنکی
سوسن کے تری ایک کہے گا رنگین — زرگر کی جو سو تو ایک آہن گر کی
معروف کی رنگین نے سنی تقریر — تقریر کی موجب نہیں اس کی تحریر
لوگوں سے کہا اس نے کہ بچ گیا — دیوان گدڑی ہے اس کا ہے وہ فقیر

لکھنؤ والوں میں بھی معرکے ہوئے مگر بہت کم۔ آزاد نے بھی اس معاملہ میں اہل لکھنؤ کو سراہا ہے۔ لکھنؤ کے مجھے صرف سات آٹھ معرکوں کا پتہ چلا ہے ان میں نہ سانگ اور جلوس ہوئے نہ گالی گلوچ ہوئی نہ لٹھ بندی ہوئی، بس مہذب چوٹیں ہوئیں۔ ناسخ اور آتش میں چلی، ناسخ نے ایک غزل میں یہ شعر فخریہ لکھا، اس میں اپنے نام امام بخش کی رعایت رکھی ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں
شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

آتش نے اسی وقت کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاغیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

ناسخ ایک شخص کے پروردہ مشہور ہیں۔ مصرعہ ثانی میں اس طرف اشارہ ہے مگر اسی وقت ناسخ کے ایک شاگرد نے جواب دیا اور خوب دیا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

آتش نے ناسخ کی غزلوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں تو ناسخ نے کہا ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

آتش نے جواب دیا ؎

کیوں نہ دے برہمن اس مصحف کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

آتش نے ایک مشاعرے میں مشہور غزل پڑھی اس میں جابجا ناسخ کے تجرد تغول اور پردہ ہونے پر چوٹیں کی ہیں ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟
ہونا ہے تجھ کو رد جو ہنود و مگس — رتبہ کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قارون نے لٹایا خزانہ کیا

ناسخ نے چند فارسی اشعار کا ترجمہ کیا تو آتش نے کہا ؎

مضمون کا چور ہوتا ہے رسوا جہاں میں
مٹی خراب کرتی ہے مال حرام کی

ناسخ سیاہ فام تھے آتش نے کہا ؎

روسیہ دشمن کا منہ پاپوش سے کیجے نگار
جیسے سلیٹ کی پر نقطہ ہو شیر کا

ناسخ نے جواب دیا ؎

ہیں حسن ظاہری سے اگر چہ مثل ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن میرا سیاہ نہیں

اسی سلسلہ میں ناسخ کے شاگرد گوپا نے آتش پر چوٹ کی ہے ؎

یقین گل ہو جو دیکھے گیسوئے دل پر چراغ
آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ

آتش نے جواب دیا

فروغ حسن پہ کب زور زلف چلتا ہے
یہ وہ چراغ ہے کالے کے آگے جلتا ہے

آتش کے شاگرد پنڈت نسیم کشمیری کے ایک شاگرد نے کہا ؎

واللہ کہ آتش فروغ ناسخ
ٹھنڈی کر دی نسیم کشمیری نے

لکھنؤ میں ایک شاعر میر محب علی تھے سلیس تخلص کرتے تھے اور اپنے آپ کو میر انیس کا مدمقابل سمجھتے تھے۔ انیس نے ان کے متعلق کہا ؎

نواسنجیوں نے تری اے انیس — ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

سلیس نے اس شعر کی تضمین کی اور انیس کے خاندان پر الٹ دیا ؎

نہ مونس کی باتیں نہ انیس کی تضمیں — نہ لکھی انیس کی نظم ایسی سلیس
یہ سچ ہے بقول انیس اے سلیس — تو استھوں نے تری اے انیس

ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

مونس اور اقبس انیس کے بھائی تھے نفیس ان کے بیٹے تھے۔ انیس نے ایک سلام کہا اس میں یہ اشعار تھے ؎

سدا ہے فکر رزقی مآل بینوں کو — ہم آسمان سے لاتے ہیں روزینوں کو
یہ مہربان ہیں ہاتھوں پہ نصف پیسے نے — چنا ہے جامۂ سستی کی آستینوں کو

یہ قافیہ ایسا مقبول ہوا کہ واجد علی شاہ نے بھی اس کو باندھا ؎

ہمارا نفس عبادت میں ہے مجھے منظور
وضو کے وقت الٹنا ہوں آستینوں کو

اسی زمانے میں مرزا دبیر کے فرزند اوج نے سلام لکھا اور آستینوں کے قافیہ پر بہت زور دیا ؎

الٹ گیا دبیر سے پہلے قلعہ چرخ — خدا کے ہاتھ نے الٹا جو آستینوں کو
یہ دستبردِ خزاں کا بہار میں ڈر ہے — کہ غنچے ٹھنے ہیں ہاتھوں میں آستینوں کو

اس پر انیس کی طرف سے جواب ہوا ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کا پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل — اٹھا چکے ہیں زمیندار جو زمینوں کو
مزا یہ طرفہ ہے مضموں تو دستیاب نہیں — مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

اس پر دبیر کے شاگرد مشیر نے کہا ؎

جلی کٹی مرے استاد سے کہے جو کوئی — تو پھونک دوں گا مخرج ہیں جس زبینوں کو
ہزار بار سزا پائے منہ پہ چڑھتے ہیں — مشیر کیا کہوں ان احمق الذینوں کو
اسامنہ کی ہیں نوبت سلام بھی اکثر — نباہ سکتے ہیں یہ لوگ ان زمینوں کو

اور نظیر برادر دبیر نے کہا ؎

طعنہ زناں ہوتے ہیں جو کہ دبیر پہ نظیر
کیا نہیں جانتے وہ اہل زباں اتنا بھی ہیں

رشک شاگرد ناسخ نے یہ غزل کہی ؎

یار کو ہم سے کوئی لگاؤ نہیں
وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

اس پر کسی شاعر نے کہا ؎

دور سے چھیڑے دکھاؤ تس ۔۔۔ رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ تس

شاہ نصیر نے مولوی قدرت اللہ قاسم تلمیذ درد پر چوٹ کی ؎

پھر پڑھا ہم نے جو مضمون بیاض گردان
سُن کے ہو گیا چپ قاسم انوار شتاب

قاسم نے کہا ؎

واسطے انسان کے لانسانیت لازم ہے شرط ۔۔۔ میر ہو یا میرزا ہو خان ہو یا نواب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سمجھا کریں ۔۔۔ گر نہ خم تعظیم کو پہلے سر محراب ہو

صمصام الدولہ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان کو بادشاہ کے حضور میں بڑا دخل تھا۔ شاہ نصیر کسی معاملہ میں ان سے کھٹک گئے اور یہ شعر کہا ؎

اے خال رخ یار تجھے ٹیک بناتا
جا پھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

نصیر اور ان کے شاگرد ذوق میں بگاڑ ہو گیا تین شاعروں تک ایک دوسرے کی ضد پر ایسی طرحیں ہوئیں جن کا قافیہ جس بس اور ردیف تیلیاں تھیں۔ شاہ نصیر ہر مرتبہ ساتھ سترہ شعرا کا دو غزلہ پڑھتے تھے اور ان کا ہر شاگرد انہیں بیس شعر کی غزل پڑھتا تھا۔ دوسرے مشاعرے میں ذوق نے جو غزل پڑھی ان میں یہ شعر تھا ؎

چتی ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائی اس میں پاپے گھس کی تیلیاں

تیسرے مشاعرے میں گھنشام واسی عاصی شاگرد نصیر نے کہا ؎

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے ۔۔۔ قافیے میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب دل ربہر خدا ۔۔۔ یار کی چلمن میں ہوں پاپے گھس کی تیلیاں
شیخ صاحب یہ چلمن ہے کوئی بس بے ریغ ۔۔۔ باندھیے گر ہو سکے تار نفس کی تیلیاں

اس کے بعد نصیر کے بیٹے شاہ وحید الدین نے کہا ؎

گرچہ قندیل سخن کو پا لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو نے ہی اگلے بس کی تیلیاں

اس مشاعرے میں باہم کچھ گفتگو بھی ہوئی اس پر مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا سوال و جواب ہو کر کچھ بے لطفی ہو جائے۔

غالب نے دو ایک مشاعروں میں غزل نہ پڑھی تو ذوق نے کہا ؎

رکا ہو خوب تیں طبع کی روانی میں ۔۔۔ کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

غالب نے جواب دیا ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

غالب کا دیوان طبع ہو کر آیا تو عبداللہ خاں آرزو نے کہا ؎

چڑھ جو پرلی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

مرزا غالب کے دو شعروں پر ایک شاعر نے اس طرح تضمین کی کہ ہر بند میں ان پر چوٹ کی ہے ؎

دی ہے اسے توفیق سے توفیق خدا نے — جانا ہے ہر اک گچھے میں یہ شعر سنانے
گھر بھی بلا لیتا ہے دعوت کے بہانے — ایسا بھی کوئی ہے کہ جو غالب کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

یہ شخص وہ ہے کوئی اس کو پیٹ بھی جاتا — تو پیر نہ ہستی کے ہرگز فریب میں آتا
تھا کال تک تو رقیبوں کی جوتیاں کھانا — ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

جعفر دہلوی نے مرزا غالب کے متعلق کہا ؎

سب اسے جانتے ہیں وہ ہے کالی مذہب
کوئی لالچ اسے دے گا تو وہ ٹل جائے گا

مرزا غالب نے منشی سعادت علی خاں مصنف — کی ہجو لکھی ؎

اے منشی خیر و سر سخن ساز نہ ہو — عصفور ہے تو مقابل باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ — لاٹھی وہ لگے جس میں کہ آواز نہ ہو

غالب سے بادشاہ ناراض ہو گیا۔ غالب نے معذرت میں ایک قطعہ لکھا، اس میں کئی شعروں میں در پردہ وقت پر چوٹ کی

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

(یعنی میں ایسے خاندان سے نہیں ہوں جس کا ذریعۂ اعزاز صرف شاعری ہو) یہ ذوق کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک غریب آدمی شیخ محمد رمضان کے فرزند تھے۔ آزاد نے شیخ رمضان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی، مرنا فرحت اللہ بیگ کو استرا نظر آیا۔ خیر مجھے اس سے غرض نہیں، وہ شمشیر فولاد جنگ کے پسر ہوں یا مفتاح اللہ علہ کے فرزند ہوں، میں تو یہ جانتا ہوں کہ ہزاروں کی اصلاح بنا گئے۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

اس میں ذوق کے سیاہ فام ہونے پر چوٹ ہے۔ مومن شاعر بھی تھے، حکیم بھی تھے، منجم بھی تھے لیکن انھوں نے کبھی ان فنون کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ایک مرتبہ راجہ اجیت سنگھ نے ان کو ایک تھیلی ہدیہ دی، اس پر آدمی نے کہا ؎

تمھیں میں وہ مومن ممکن لیتا ہے
جو مول بن کے جو تھیلی کا دان لیتا ہے

حکیم آغا جان عیش مشہور شاعر تھے، ظفر بادشاہ کے درباری تھے۔ انھوں نے ایک سادہ لوح مُلّا کو جو تکبندی کر سکتا تھا، ہدہد تخلص کرکے بادشاہ کے نظر میں پیش کر دیا۔ بادشاہ نے کچھ آذوقہ مقرر کر دیا اور منقار جنگ خطاب دیا۔ ہدہد تک بندی کرلاتا حکیم ہی اصلاح کر دیتے۔ دوسرے درباریوں نے ہدہد کے مقابلہ پر باز لاکر چھوڑ دیا۔ ہدہد اور باز میں خوب چونچیں ہوئیں افسوس مجھے باز کا کوئی شعر نہیں ملا۔ ہدہد کی کل افشانیاں کچھ دستیاب ہوئی ہیں ؎

گر اب کے باز ری میدان میں آئے سامنے میرے
تو دم میں پر نچھ مُنھ کا بھی میرا ارادہ ہے
ارے روئے زار کیا کہتا ہے تجھ کو خلاص کی
کہ ہدہد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

کچھ دنوں کے بعد باز تو اڑ گیا یا مار لوگوں نے ایک کوا لاکر بالی میں چھوڑ دیا۔ ہدہد نے اس کے بھی خوب ٹھونگیں ماریں۔ کوا کچھ کائیں کائیں غائیں غائیں کرکے اڑ گیا ایسا غائب ہوا کہ کچھ نشان تک نہ چھوڑا۔

ہدہد نے کہا ؎

جوں آیا ہے بدل کے عدو تجھ سے لی
اس کی ہے نوں سے خانہ دری ہو گئے کی
پہلے جانا تھا ہی سب نے کہ کوا ہوگا
یہ جو معلوم کیا یہ ہے ہو گئے کی

مرزا داغ دہلوی سانولے رنگ کے آدمی تھے رام پور میں داروغۂ اصطبل مقرر ہوئے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

شہر دہلی سے آیا اک مسکیں
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

حالی پر ایک دہلوی نے اعتراض کیا تم اہل زبان نہیں ہو، پانی پتی ہو۔ حالی نے کہا ؎

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
اور آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

حالی کی ہجو میں ایک شاعر نے کہا ؎

ابتر ہوئے عملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پامال ہے

اور ؎

دلّی دلّی کیسی دلّی　　پانی پت کی بھینگی بلّی

حالی نے سب کا جواب خاموشی سے دیا۔ نو مذمت فرمایا ہے ؎

کیا پوچھتے ہو کچھ نہ کہو سب کہنے میں ہے عیب
سب کچھ کیا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حسرت موہانی نے مظہر الحق کی ہجو لکھی ؎

گو بظاہر شہر میں باطن میں لچے ل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

مجھے اور بھی چند ہجویں یاد ہیں مگر ان کے مصنف اور حالات کے متعلق مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ایک ہجو سنی ہے کہتے ہیں کہ کسی نے یہ ہجو مرزا سودا کی لکھی تھی مگر کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری اور اس میں جو مذمت آئی ہے ان کا بھی کچھ مرزا سودا سے تعلق نہیں یہ معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کوئی گمنام شاعر ہو اور اس نے سودا تخلص کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سودا نہ ہو، کوئی دوسرا شخص ہو ؎

جب چھوڑ شاعری کو سودا بنا گویّا
فیروز خاں کا سالا اور رمان خاں کا بھیّا
کیا خوب ہی الاپا کہتا تھا وہ ایسا
سر کو ہلا ہلا کر کہتی تھی اس کی مّیا
تھا تھرے تھرے تھرے تھا تھیا تھیا تھیا

ایک وکیل تھے ان کی دو خوبرو رسیا لڑکیاں تھیں وہ ان کو بھی مشاعرے میں لاتے تھے۔ کسی شاعر سے چل گئی تھی اس نے ان کی ہجو میں کہا ؎

تھکے وکیل کی وجہ معاش کیا ہوگی
نہ فکر کیجیے گھبرائیے نہ منشی جی
یہ دونوں ٹیکٹ بڑھاپے کی پچیاں ہوں گی
ابھی کھایا ہے خرچہ ملے گی پھر خرچی

ایک شاعر نے کسی کی ہجو کہی تھی اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

اتھاں ہم نے کیا اس نے لکھا ہے سو بار
سین سے صیر ژ صاد سے ثے سے اسرار

بدایوں میں ایک شاعر نے کسی کی ہجو لکھی تھی ؎

اور بھنگی اور ڈھونڈ لیتے ہیں گھر میں بیٹھے
ٹن ٹکنی سی کوئی بازار سے ٹٹو لاتے

بدایوں میں ایک شمس تھے سید نام ضیا تخلص تھا۔ کسی نے کہا ؎

اندھیرا ہوا نام اندھیری کا ضیا ہے
نادان ہے کم سن ہے بدایوں کا تلا ہے

اللہ یہ بدایونی لعنت ہے۔ بدایوں میں اکثر اپنے چھوٹوں کو اس لقب سے یاد کرتے ہیں گویا ایک پیار کا چھوٹا نام ہے۔ لوگ اس کے اور معنی اور رعایت بھی بیان کرتے ہیں۔

اور بھی ہجویں اور واقعات ہیں سب کے لیے اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ اس میں بھی بعض واقعات تصحیح و تفصیل طلب ہیں۔ ہجویں تو اکثر شاعروں نے لکھی ہیں لیکن مرزا سودا سب کے امام ہیں۔ ان کے بعد بالترتیب قائم چاندپوری مصحفی انشا اور میر ہیں۔

پیروڈی، اُردو ادب میں

- ظفر احمد صدیقی

آپ کے حلقۂ تعارف میں ایسے بہت سے اصحاب ہوں گے جو عام نظروں کو بالکل معقول اور سمجھ میں آنے والی معلوم ہوتے ہوں لیکن کوئی نظر باز ان کے لہجے کی نقیب کسی امتیازیت یا ان کے انداز کا معمولی سا بے تکا پن پالیتا ہے اور اس کی مبالغہ آمیز نقل آپ کے سامنے پیش کرتا ہے تو آپ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ یہی حال پیروڈی کا ہے۔

پیروڈی وہ صنف ظرافت ہے جس میں کسی کے طرزِ نگارش کی تقلید کرکے اس کے اسٹائل یا خیالات کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُردو میں یہ صنف ظرافت نسبتاً کمیاب ہے۔ تنقید میں بھی اس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کا کوئی ایک لفظ ہمیں ایسا نہیں ملتا جو اس کے مفہوم کو پورا پورا ادا کر سکے۔ مضحک نقالی، مجویہ تقلید یا 'خاکہ اڑانا' جیسے الفاظ سے اس کی طرف کچھ اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ الفاظ اوّل تو پیروڈی کے تمام تر مفہوم پر حاوی نہیں دوسرے ان کے مطالب اور رجحانات ذہنوں میں متعین نہیں اس لیے زیرِ نظر مضمون میں ہم انگریزی لفظ پیروڈی کے استعمال ہی کو ترجیح دیں گے۔

پیروڈی کسی ادبی تحریر یا اسٹائل کی تقلید ہوتی ہے لیکن ہر تقلید کو پیروڈی نہ کہیں گے۔ مگر کسی طرزِ نگارش کو قابلِ تعریف سمجھ کر اس کی پیروی کی جائے تو وہ پیروڈی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی ادبی نمونہ کو اچھا سمجھ کر اس کی تقلید کی کوشش کی جائے مگر نقل میں اصل کے محاسن پیدا نہ ہو سکیں اور نتیجہ مضحک ہو جائے تب بھی اس پر پیروڈی کا اطلاق نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر امین حزیں سیالکوٹی کی اقبال کے تتبع میں بعض نظمیں یا بعض اُردو مشاعروں کی غالب اور داغ وغیرہ کے رنگ کو اپنانے کی کوششیں اس دعوے کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پیروڈی کا اطلاق صحیح طور پر اس ادبی تقلید پر ہوگا جس میں مصنف کسی طرزِ نگارش یا طرزِ فکر کی کمزوریوں کو یا ان پہلوؤں کو جن کو وہ کمزوریاں سمجھتا ہے نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے پیروڈی تنقید کی ایک لطیف قسم ہے مگر بعض اعتبارات سے عام تنقید سے زیادہ مؤثر اور کارگر۔ بعض ادبی کمزوریاں اتنی باریک ہوتی ہیں کہ عام نظریں ان پر نہیں پڑتیں یا بار بار کے مشاہدے سے ان کی عادی ہو جاتی ہیں۔ پیروڈی کے آئینہ میں یہی کمزوریاں اتنی بڑی ہو کر نظر آتی ہیں کہ ان سے کسی کا نگاہ چرانا ممکن نہیں رہتا۔ پیروڈی کرنے والا ان کو اس پس منظر سے نکال کر جہاں نظریں ان کی عادی ہو گئی ہیں ایسے سلسلے میں پیش کرتا ہے جہاں ان کا بے تکا پن محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ ظرافت کی چاشنی تنقید کے کڑوے کسیلے گھونٹوں کو گوارا بنا دیتی ہے۔

اب یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیروڈی میں ظرافت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ کیوں ہم اس پر ہنسنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نامناسب ہوگا

اگر ہم یہاں ہنسی کے متعلق بعض فلسفیانہ یا نفسیاتی نظریوں کا مختصراً ذکر کر دیں۔

ہربرٹ اسپنسر کا خیال ہے کہ ہنسی ناگہانی توقع کے چھلک جانے کا نام ہے (OUTBURST OF SURPLUS ENERGY) یہی وجہ ہے کہ تندرست و توانا آدمی اکثر بات بے بات ہنسنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

بعض فلسفیوں کے نزدیک ہنسی سماجی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔ جن لوگوں کو ہم وضع قطع یا چال ڈھال وغیرہ میں روش عام سے ہٹا ہوا دیکھتے ہیں ان پر ہنس کر ان کو سماجی معیار کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"سیکڈوگل" کا نظریہ ہے کہ ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف ایک فطری مداخلت ہے۔ انسان اپنی سوشل فطرت اور جبلی ہمدردی کی وجہ سے مجبور ہے کہ دوسروں کی مصیبت اور غم سے متاثر ہو۔ اب اگر وہ ہر شخص کی معمولی پریشانی اور سراسیمگی (جیسے کیچڑ میں پھسل جانے یا کرسی سے گر پڑنے) کا اثر لینے لگے تو زندگی دشوار ہو جائے۔ اس لیے ہنسی میں اس اثر کو اڑا دیتی ہے۔

اسی سے ملتا جلتا خیال لارڈ بائرن نے اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے:۔

"AND IF I LAUGH AT ANY MORAL THING, IT'S THAT I MAY NOT WEEP."

(یعنی میں اگر کسی فانی چیز پر ہنستا ہوں تو یہ اس لیے ہے کہ کہیں میں رو نہ دوں)

نٹشے کہتا ہے کہ "صرف انسان ہی کیوں ہنستا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ہی اتنے شدید مصائب جھیلتا ہے کہ اس کو ہنسی کو ایجاد کرنا پڑا۔"

برگساں ہنسی کو زندگی کی تخلیقی قوت کا میکانکی مظاہر کے خلاف ردِ عمل قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کے منہ سے ایک بے تکی بات یا غیر متوقع ایک ہی جملہ دوسرا سنے پر ہمیں اس لیے ہنسی آتی ہے کہ ہم اس سے اس کی بجائے تخلیقی عمل کی توقع رکھتے ہیں۔

تھامس ہابز کے نزدیک ہنسی کا راز دوسروں کی کمتری کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کے تصور پر ایک فوری احساس عظمت میں پوشیدہ ہے۔ اسٹیفن لی کاک اپنی تصنیف "ظرافت اور انسانیت" میں اسی نظریہ کی تائید کرتا ہے اور ہنسی کی اصل وحشی انسان کی اپنے دشمن کو گرا ہوا دیکھ کر فتح و مسرت کی چیخ ہا۔ ہا۔ کو قرار دیتا ہے۔

ہنسی کا ایک عام فہم نظریہ یہ بھی ہے کہ جہاں دو ہم آہنگی (INCOUGRUITY) یا تضاد (MALADYUS TWENT) پر ہنسی آتی ہے۔ رندوں کے مجمع میں کوئی متقطع بزرگ آن پھنسیں یا کسی بہت لمبے آدمی کے ساتھ کوئی پست قد جا رہا ہو تو ہمیں ہنسی آجائے گی۔

ان تمام نظریوں میں کچھ نہ کچھ صداقت نظر آتی ہے لیکن کسی ایک کو ہنسی کے ہر مظاہرے کی تشریح کے لیے سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے اس مضمون میں ان کی گنجائش نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے سقم و نقص سے بحث کی جائے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان سے پیروڈی کی حقیقت پر کیا روشنی پڑتی ہے۔ زائد قوت کے چھلک جانے کا نظریہ بعض صورتوں میں خواہ صداقت رکھتا ہو لیکن اس سے اس بات کی تشریح نہیں ہوتی کہ کہیں پیروڈی ہی پر کیوں ہنسی آتی ہے۔

سیکڈوگل کا نظریہ بھی کہ ہنسی چھوٹی چھوٹی ناگواریوں کے خلاف فطرت کی مداخلت ہے پیروڈی کی تشریح میں کچھ زیادہ مددگار نہیں ثابت ہوتا۔ کھینچ تان ہی سے اس کی تاویل کرنا پڑتی ہے۔

باقی نظریے کافی حد تک پیروڈی پر چسپاں ہو جاتے ہیں اور مختلف زاویوں سے اس کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

پیروڈی اصلاح کا ایک کامیاب حربہ ہے اس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ ادبی قدروں سے انحراف کرنے والے بے راہ رو ادیبوں کو راہ پر لانے کے لیے اکثر پیروڈی کو استعمال کیا جاتا ہے یا کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہر ہنسی ایک اعلیٰ اصلاحی مقصد کی پیروڈی کا فرق ہوتا ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کی تذلیل اور تکذیبی جذبہ خود پسندی کو تسکین دیتی ہے اور پیروڈی میں ہمارے لیے یہ دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہنسی کی اکثر صورتوں میں یہ جذبہ شعوری یا غیر شعوری طور پر کام کرتا ہو لیکن ہر پیروڈی کا محرک اس کو قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کسی شاعر کے سامنے اس کے اشعار ہی کی پیروڈی پیش کیجیے۔ اگر وہ اپنے اوپر ہنس سکنے کی عالی ظرفی رکھتا ہے تو وہ خود بھی اس سے لطف اندوز ہوگا۔ حالانکہ اس میں دوسرے کی تذلیل یا خود پسندی کی تسکین کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

عدم ہم آہنگی یا تضاد کا نظریہ اگرچہ کسی گہری حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا لیکن ایک عام اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہنسی کی کوئی صورت بھی ہو اس کے پس منظر میں عدم ہم آہنگی اور تضاد کا ہونا ضروری ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ مضحک (LUDICROUS) کا اطلاق ہی اس چیز پر ہوگا جس میں کچھ بے تکا پن یا بہ الفاظ دیگر عدم ہم آہنگی پائی جائے۔ پیروڈی بھی جو ایک مضحک ادبی تقلید ہے ان ہی خصوصیات سے متصف ہوتی ہے۔ پیروڈی کرنے والے کا آرٹ ہی یہ ہے کہ وہ اس تضاد اور عدم ہم آہنگی کو جو اصل مصنف کے یہاں بہت باریک اور مبہم سی ہوتی ہے نقل کے ذریعہ سے نمایاں کر دیتا ہے۔ کبھی یہ اثر بہت پُرشکوہ الفاظ اور غیر اہم معانی کے امتزاج سے پایا جاتا ہے جیسے MOCK HEROIC POETRY میں مضحک رزمیہ شاعری میں۔ کبھی کسی نظریہ یا فلسفہ کا تضاد اس کو اور زیادہ مہمل اور بے ربط بنا کر دکھایا جاتا ہے جیسے پوپ یا برنرڈ شا کے بعض ناموں میں۔

برگساں کا ہنسی کے متعلق نظریہ اس کے تخلیقی ارتقا کے فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ اس فلسفہ کی باریکیوں میں بڑے بغیر اس کے ہنسی کے نظریہ کی تائید میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پیروڈی پر سب سے زیادہ یہی چسپاں ہوتا ہے۔ زندگی کی قوت اپنے تخلیقی کارنامے کے انسان تک پہنچنے کے بعد اپنے اظہار کی نت نئی شکلیں ڈھونڈھتی ہے ؎

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو ہیں نہیں اور ہیں تو نہیں

نقل میں اس تخلیقی رجحان کے خلاف ایک میکانکی مظاہرہ ملتا ہے اس لیے ہنسی اس میکانکی مظاہرے کے خلاف زندگی کا ردِ عمل ہے۔ اس لحاظ سے ہر نقل فی نفسہ ہمارے لیے ہنسی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ایک بہروپیا جب ہو بہو کسی کی شکل بنا کر ہمارے سامنے آتا ہے تو چاہے اس شکل میں کچھ بے تکا پن نہ ہو ہم ہنسی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص جو مختلف لہجوں کا نقل چی بہ آسانی بن جاتا ہے ہمیں ہنسا دیتا ہے شیکسپیئر کے ڈرامے (AS YOU LIKE IT) میں ہیروئن اور اس کے بھائی کا ہم شکل ہونا سامانِ ظرافت فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی تحریر میں بھی انفرادیت اور قوتِ تخلیق کا اظہار کرنے کی بجائے کسی دوسرے کے اسٹائل کی نقل پیش کرتا ہے تو اس پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ نقل میں اصل سے جتنی مشابہت ہوگی اتنی ہی وہ ہمارے لیے مضحک ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ معمولی مشابہتیں تو حقیقی زندگی میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن کسی نقل میں تقریباً سو فی صدی مشابہت ہونا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ زندگی کا تخلیقی عمل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک میکانکی مظاہرہ ہے۔ اس اصول میں ایک استثنا بھی پایا جاتا ہے۔ اکثر اوقات نقل کا مبالغہ آمیز ہونا بھی اس کو ہماری نظر میں مضحک بنا دیتا ہے حالانکہ اس

مبالغہ سے اصل سے اس کی مشابہت گم ہو جاتی ہے لیکن خود کیچ تو یہ مستثنیٰ ہمارے نظریہ کی تردید نہیں کرتا۔ مبالغہ آمیز نقل اس لیے قابل مضحک ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو واضح کر دیتی ہے کہ یہ جامہ نقل کرنے والے پر راس نہیں آرہا ہے اور یہ اشائل اس کی شخصیت کا فطری تخلیقی اظہار نہیں۔

پیروڈی کی مختلف شکلوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیروڈی کے محرکات عموماً تین قسم کے مقاصد ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ اصلاحی اور تعمیری

۲۔ تنقیدی

۳۔ تخریبی

ان ہی عنوانات کے ماتحت پیروڈی کی تمام اقسام آجاتی ہیں لیکن یہ سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہوگا کہ ان اقسام کے درمیان کوئی منقطع حد فاصل بھی ہے۔ اکثر ایک ہی پیروڈی تنقیدی اور اصلاحی یا تنقیدی اور تخریبی مقاصد کی حامل ہوتی ہے۔ کبھی اصلاحی مقصد کے ساتھ صحیح بصیرت اور نقاد نہ ہونے کی وجہ سے تخریبی پہلو آجاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ صفحات پیش کریں گے۔

پیروڈی کے لیے ایک زرخیز میدان وہ روایات اور تقدیریں فراہم کرتی ہیں جو ماحول کے بدل جانے سے اپنی افادیت کھو چکی ہیں یہ روایتیں سماجی ہوں یا ادبی پیروڈی ان کا مذاق اڑا کر ان کے ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ادب کو دیکھئے تو سروانٹیز کی تصنیف ڈان کوئگزوٹ (DON QUIXOTE DELA MANCHA) کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کو سرشار نے "خدائی فوجدار" کی شکل میں اُردو کا جامہ پہنایا تھا۔ اس ناول میں نہ صرف ایک ادیب کا نہیں بلکہ بہادری (CHIVALRY) کی ان روایات کا خاکہ اڑایا گیا ہے جن سے سولھویں سترھویں صدی کے ناول بھرے ہوئے تھے۔ اُردو میں اس قسم کی مستقل تصانیف تو نہیں ملتیں لیکن شفیق الرحمٰن کے مضامین میں کہیں کہیں یہ رنگ جھلک جاتا ہے مثلاً قصہ چہار درویش جس میں میر امن دہلوی کی باغ و بہار کا کچھ ماحول لے کر عہد حاضر کے چار نوجوان طالب علموں کو چار درویشوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا متعلقہ اس پیروڈی میں زیادہ تر تنقیدی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی پیروڈی کی ایک قسم ہمیں ملا رموزی کی نثر میں ملتی ہے۔ مولویانہ اُردو جس کے نمونے ہمیں عربی کتابوں کے ابتدائی ترجموں میں ملتے ہیں اپنے زمانے میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ رکھتی ہو لیکن زبان کی ارتقا اور صفائی میں ایک ایسا وقت آتا ضرور ہے جب اس کی اہمیت مذاق سلیم پر بار گزرنے لگتی ہے۔ معلوم نہیں ملا رموزی نے اس طرز بیان کی اصلاح کے لیے اس کو تختہ مشق بنایا یا اس کی افادیت کم اہمیت کی وجہ سے اس کو محض ایک ذریعہ تفریح کے طور پر استعمال کیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے ملا رموزی کی نثر مولویانہ اُردو کی پیروڈی پیش کرتی ہے۔ البتہ اس میں فرانت کا فقدان اور سستی ظرافت کی بہتات نظر آتی ہے۔ اگر ایک آدھ مضمون ہی اس رنگ میں لکھ کر چھوڑ دیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا لیکن ملا صاحب نے ستم یہ کیا کہ اس کو اپنے مستقل رنگ کی حیثیت سے اختیار کر لیا جیسے کوئی شخص کسی کا مزہ چڑانے کے لیے ہمیشہ کے لیے اپنے خدوخال کو مسخ کر لے۔

بعض اوقات تجدد کے ضرورت سے زیادہ تیز رفتار سے کور دکھنے یا غیر تحریکوں کی بے راہ روی کو اعتدال پر لانے کے لیے پیروڈی ایک مؤثر ذریعہ کا کام دیتی ہے۔ ادھر حالی کے دور میں ہماری اُردو کی ناہمواری اور ادب لطیف کی بے اعتدالیوں کے خلاف اچھے اچھے مضامین لکھے جو پیروڈی کا اعلیٰ نمونہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

ابھی قریبی زمانہ میں ظرافت کا کوئی تصنیف مداوا ایک نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے مشہور قدامت شاعروں کے کلام کے نمونے دے کر ان ہی کے رنگ میں اپنا کلام پیش کیا ہے۔ صاحب مداحا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر شاعر کی انفرادیت کو خصوصی طرز کو اپنی ظرافت میں لے کر اس کے رنگ کو تیز کر کے پیش کیا ہے کہ بعلمیت کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے REDUCTIVE AD ABSURDUM. لیکن مداحا کی کمزوری یہ ہے کہ اس کا موضوع کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس پر پیروڈی کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری خود مسلمہ قدروں سے بغاوت کرنے میں کبھی پیروڈی کی کوئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب اگر اس کی پیروڈی کی جائے تو اس پر بعید گی سے نئی شاعری کا دھوکہ ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادیب جنھوں نے ترقی پسند شاعری کی پیروڈی سے ابتدا کی آخر میں اپنی ترقی پسند شاعری کی صلاحیتوں پر ایمان لا کر سنجیدگی سے اسی رنگ میں کہنے لگے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض بڑے ادیب اور شاعر اپنے زمانہ سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ وہ مروجہ قدروں کے خلاف نئی اور بہتر قدریں ادب میں پیش کرتے ہیں۔ مگر اپنے زمانہ سے آگے نہ دیکھ سکنے والے صنف ان ادیبوں اور شاعروں کی روح تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے ان کو اپنی پیروڈی کا نشانہ بناتے ہیں۔ غالب، حالی اور اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر اپنے اپنے زمانوں میں اسی مذاق عام کی کج روی کا شکار رہے ہیں۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمام ادیب یا مصنف جن کی تصنیفات آج پیروڈی کو دعوت دیتی ہیں کل غالب اور اقبال کی طرح شہرت اور ہر دلعزیزی کے متوقع ہو جائیں۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ بعض اوقات پیروڈی کے تیر بے محل بھی صرف کیے جا سکتے ہیں۔

بعض اوقات کسی فنکار اخلاقی یا اصلاحی مقصد کا حامل ہونے کی بجائے پیروڈی ایک اور اہم خوش کو پورا کرتی ہے یعنی زندگی کو توازن بخشنا۔ جب ہم جذباتیت کی رو میں بہتے ہوتے ہیں اپنے رجحانات اور میلانات کے بک طرفہ پن میں کھو جاتے ہیں، اپنے خیالات اور جذبات کی شدت پسندی میں اپنے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی اور نقطۂ نگاہ کا تصور بھی نہیں کرتے۔ ایسے میں پیروڈی ہمارے جذبات کی اندھی قوت پر ضرب لگاتی ہے۔ ہمارے تعقلات کے اصنام کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ ہماری امنگوں کے مقابلہ میں نہایت ہی خوار اہم چیز پیش کر کے ہمارے نقطۂ نظر کی شدت پسندی کا مذاق اڑاتی ہے۔

فارسی میں اس قسم کی پیروڈی کی کافی مثالیں ملتی ہیں۔ شاہنامۂ فردوسی کی پیروڈی ان اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔

من آں بتم وقت رویں تم — بتاشہ بگزر گراں بشکنم
بچشم اگر جوشن جنگ را — ہزیمت دہم پشۂ لنگ را

(جعفر زٹلی)

بعید نہیں کہ "مثنوی گربہ نامہ" بھی اسی قسم کی پیروڈی ہے۔

جعفر زٹلی کی اردو شاعری میں بھی اس قسم کی پیروڈی کی جھلک ملتی ہے لیکن اس کی اخلاقی اور ذہنی سطح بہت پست ہے۔

میرا گمان ہے کہ اردو شاعری کی بعض بدنام اصناف کی ابتدا غالباً پیروڈی سے ہوئی ہوگی مثلاً "ریختی" یا "چرکینیات" بہت ممکن ہے ان شاعروں نے ابتدا پیروڈی سے کی ہو لیکن بعد کو اپنی فطرت کی کج روی کا خود شکار ہو گئے ہوں۔

زندگی کو توازن بخشنے اور مذاق عام کو اعتدال پر لانے کے ساتھ ساتھ پیروڈی خود اپنے ہدف کے لیے بعض اوقات بڑے سطح کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنی شدت آمیز تنقید سے ادیبوں کو خود نگری پر مائل کر کے ایک معتدل سطح پر لے آتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ

غالب کو طرح پیک سے ٹھا۔ نے ان کے ناقد ریسنوں سے زیادہ ان کے حامد مذاق اڑانے والوں کا ناقد ہوگا۔

اب حیات میں آزاد کی روایت ہے۔ محمد صاحب حکیم آغا جان صاحب عیش، کے اشارہ پر ہر طبلان سخن کو ٹھوکنگ بھی ہوتا تھا چنانچہ بعض مواقع پر مشاعرہ پڑھتا تھا جن کے الفاظ نہایت شستہ اور رنگین لیکن شعر بالکل بے معنی اور کہہ دیتا تھا کہ یہ غالب کے انداز میں غزل کہی ہے۔ ایک مطلع یاد ہے ؎

آن محور گردوں چہ لب آب نہیں
ماہی فلک شیشہ مہتاب نہیں

غالب کی پیروڈی کے سلسلہ کا سراغ نہیں ان کے زمانہ کے بعد کچھ ملتا ہے۔ بایوں کے ایک ظریف شاعر علی حزیں صاحب آزاد نے یہ مصرعہ کسی مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی تھی جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

اے فلک دے مجھے اب عید الطفیل فرقت — تجھ کو اے برج سموات بھروں گے
نہیں بھی آزاد کی روز بقول غالب — شاہد ہستی مطلق کی کمر دیکھیں گے

اسی طرح مخلص بنی مایونی نے ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی تھی جس کا مقطع تھا ؎

ساجد نماز ہائے طویل ہیں اشعار حزیں
یارب احسان مسلمانی بھی گویا مانہ ہوا

ان مثالوں میں پیروڈی کا رخ غالب کی ہمت ہیں بلکہ ایسا مشاعرہ کی فہم کا احتساب مقصود ہے۔

حسن اتفاق میں آپ علیحدہ یاد آتا ہے۔ فتح پور کے ایک مشاعرہ میں شاہ کے ایک مشہور ایڈیٹر اور ادیب کو صدارت کے فرائض انجام دینا تھے۔ یہ حضرت اپنی ذہین شوخی کے لیے مشہور تھے۔ ایک پرگو شاعر کو ظرافت سوجھی تو انھوں نے شہر کے تمام خوش آواز لڑکوں کو ایک ایک مہمل غزل لکھ کر دے دی۔ جب مشاعرہ شروع ہوا ایک دو غزلوں تک تو صاحب صدر نے تحمل سے کام لیا لیکن جب اس مہملیت کا سیلاب حد سے بڑھا تو ان کو باصوت پسپائی سے کام لینا پڑا۔

پیروڈی کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا تعلق کسی ادیب کے اشائل یا ظاہری پہلو ہی سے ہو۔ پیروڈی کے ذریعہ سے کسی فلسفہ طرز فکر یا نظام کے معنوی نقائص کو بھی بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" بطرس کے "کتے" اس معنوی پیروڈی کا نمونہ ہیں۔ اس قسم کو نباہنے کے لیے گہری نظر اور کافی ذوق ظرافت (SENSE OF HUMOUR) کی ضرورت ہے اس لیے ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اسٹائل کی پیروڈی چونکہ آسان ہے اس لیے اس کی مثالیں ہیں کافی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ نثر کے اسٹائل کی پیروڈی کے کامیاب نمونے ہمیں سب سے پہلے انشا کی "دریائے لطافت" میں ملتے ہیں۔ اس قابل قدر تصنیف میں مصنف نے دہلی کے مختلف محلوں اور فرقوں کی بولی کے نمونے دیے ہیں۔ اگر چہ ایک سنجیدہ علمی تصنیف کے سلسلہ میں یہ نمونے دیے گئے ہیں لیکن انشا کی ظریفانہ طبیعت نے جگہ جگہ پیروڈی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

انشاء اللہ خاں کے بعد مرزا رجب علی سرور کی فسانۂ عجائب، اور عبد الغنی دہلوی کی دہلی کے کرخنداروں کی زبان اور آغا حیدر کی "پس پردہ" والی نسوانی اردو قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کوششوں میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ پیروڈی کا رخ کس کی سمت ہے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹائل جس کی نقل

کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض اپنی اہمیت کی وجہ سے ایک سستی ظرافت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد کے شاہکار "آبِ حیات" میں ابتدائی دور کے انشا پردازوں کی نثر کے نمونے کے ایک واضح تنقیدی مقصد کی خاطر پیش کیے گئے ہیں لیکن ان میں ظرافت کا عنصر اس قدر کم ہے کہ ان پر صحیح معنی میں پیروڈی کا اطلاق ہونا مشکل ہے۔

معنی اور مظاہر کی پیروڈی کا دلچسپ امتزاج حریف لکھنوی کی بعض طویل نظموں میں نظر آتا ہے مثلاً میونسپل الکشن اور مشاعرہ۔ ان نظموں میں ایک طرف الکشن اور مشاعرے کے اداروں کی نہایت ظریفانہ مصوری کی گئی ہے، دوسری طرف ضمنی طور پر بعض اشخاص کے مخصوص طرزِ گفتگو کی پیروڈی۔ "میونسپل الکشن" کے امیدوار ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں ووٹ کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اب مجتہد صاحب آپ ہی آپ کیا فرماتے ہیں:

ووٹ دے دوں گا عوض میں آپ کو تحسین کے — اتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے
حضرتِ والا تو خود پابند ہیں آئین کے — اس سے کم اپنا ہدف ہے سدری توپین کے
ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تعمیل فرما دیجیے
ہے یہ کارِ خیر اس تعمیل فرما دیجیے

شاعری میں لہجوں اور بولیوں کی پیروڈی کے سلسلہ میں بھی آدمیت کا سہرا انشا ہی کے سر ہے۔ یہ ہمہ رنگ شاعر اپنی قادر الکلامی اور ظرافت میں کبھی جاہل ہندی عورتوں کی بولی بولتا نظر آتا ہے ؎

بھر بھر چھاجوں برست نور
دور ملیاں دسن دور

کبھی کشمیری فارسی کا یوں مذاق اڑاتا ہے ؎

کشمیری معلم کو جو اک طفل نے ناگہ — انگور کے دانے
لاکر دیے اور ان سے کہا کھائیے میرا — ہے قسم ولایت
لیجیے یہ کشمیر کے متفلح ہوں دو بولے — شاگرد سے اپنے
چل مانگ سے پیسے تیا کر نہیں لے جا — یوں میں نہیں لذت

علی جلی (تقریظی اور مقصدی) پیروڈی کی دلچسپ مثال الہ آباد کے ایک رئیس گوشاعر مرحوم کی ایک نظم سودا کے قصیدے کی تشبیب میں نظر آتی ہے۔ اس میں ایک طرف سودا کے پُرشکوہ انداز کی پیروڈی ہے دوسری طرف بعض پرانے رنگ کے محاوروں کا مذاق۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

شیدا — بیٹھی کیا تکتی ہے منہ کھولی کتاب آگے چل — وہی سودا کا قصیدہ جو پڑھایا تھا کل
سودا — اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اردی نے کیا باغ جہاں سب مسل
شیدا — اپنی پاپن کا نہیں ہندیں اب کوئی عمل — ملک اپنا ہے اُردو کھائیے پیو گنگا جل
سودا — سبط فکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک — دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزّ و جلّ
شیدا — ٹھوکے کھجیے ہیں سر پھل ہے تا توڑ والی — دیکھ کر باغ کو یوں اپنے کرم پر مت جل

سودا	؎ ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی	پوشش چھیٹ تلکار بہ ہر دشت و جبل
نسیم	؎ نسترن میں وہ دھلا گل وہ دھلا گل تھینی	پھینٹ کے کپڑے پہاڑوں کو بنا دیں بگلے
	؎ بھیجیے کاتب کے قلم سے نہ کیا ہو یہ نکل	یہ کاتب کے قلم سے نہ کیا ہو یہ نکل

فارسی اور اردو میں پیروڈی کا ایک کامیاب طریقہ رائج ہے۔ وہ یہ کہ کسی شاعر کے کسی مشہور شعر کو لے کر جزوی تصرف اور کبھی ایک مصرعے کی تبدیلی سے مضحکہ خیز نتائج پیدا کرنا۔ خاقانی کا شعر ہے ؎

پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ سلطانیست درویشی و درویشی ست سلطانی

اس پر ابوالمعانی العجم یوں تصرف کرتا ہے ؎

پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی
کہ بوزانی ست بادنجان و بادنجان بوزانی

اکبر الہ آبادی کے یہاں کہیں کہیں یہ طرز ملتا ہے مثلاً ؎

ہیں لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — نازکی اس لب نازک کی ہے غضب کام

یا حافظ کے شعر کو اس طرح پیروڈی کے سانچے میں ڈھالا ہے ؎

الا یا ایہا الطفلک بوراحت بنادایہ — کہ علم آسان نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

آپ نے ان اشعار میں ایک مشہور شعر یا مقولہ کو اس کے موزوں محل سے ہٹا کر بے محل چسپاں کیا گیا ہے اس لیے پیروڈی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ ان مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اکثر پیروڈی دوہرا لطف بھی ہو سکتی ہے یعنی نقل کسی کی کی جائے اور نشانہ کسی کو بنایا جائے یا بیک وقت کئی طرف پیروڈی کا اشارہ ہو۔ اسی قسم کی ایک دلچسپ پیروڈی جگر کے ایک نوجوان شاعر حبیب احمد صدیقی نے اپنی ایک غزل میں پیش کی تھی۔ غزل یونین کے ایک طرحی مشاعرہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ غالب کی زمین میں تھی اور غالب کے مصرعوں ہی میں پیوند لگا کر تیار کی گئی تھی۔ چند اشعار یاد داشت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ تقابل کے لیے غالب کے اشعار بھی جن کی تحریف کی گئی ہے نقل کر دیے ہیں ؎

غالب	؎ بے کاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل	جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حبیب	؎ اس مس سے شیک ہینڈ کی ہے کل کو آرزو	جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
غالب	؎ چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی	کیا فائدہ جیب کو رسوا کرے کوئی
حبیب	؎ پیسہ ہی جب نہ پاس ہو رکھنے کے واسطے	کیا فائدہ حبیب کو رسوا کرے کوئی
غالب	؎ محنت جگر سے ہے گل ہر خار شاخ گل	تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
حبیب	؎ فاقہ لگا کے اس رخ بے نور پر حبیب	تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی

ان اشعار میں شاعر کا مقصد غالب کی شخصیت کو گرانا نہیں بلکہ پیروڈی کے تفریحی امکانات کو پیش کرنا ہے لیکن کبھی کبھی اسی عمل سے کسی شاعر کے خلاف زہر ناکی کا مظاہرہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اودھ پنچ کے کسی شاعر نے اصغر مرحوم کی ایک غزل کی

پیروڈی کی وہ قسم جس میں محض تفریح مقصد نہیں بلکہ جذبۂ عناد بھی کارفرما نظر آتا ہے ؎

اصغر	رکھ نہ کسی کا بھی خیال سجدۂ گہ نماز میں	بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں
نامعلوم	رکھ نہ کسی کا بھی خیال سلسلۂ دراز میں	بلکہ پدر کو بھول جا شجرۂ خانہ ساز میں
اصغر	زلف میں کتنی جھوٹی موتی یہاں لٹکی ہوئی	دونوں نے خاک جھونک دی دیدۂ امتیاز میں
نامعلوم	زلف میں کتنی جھوٹی موتی یہاں لٹکی ہوئی	دونوں نے دھول جھونک دی دیدۂ امتیاز میں
اصغر	اس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقش پا کہوں	برق سی اک چمک گئی آئی سر نیاز میں
نامعلوم	تیرے جو اس نے نعرۂ مستانہ ایک فور نماز میں	برق سی اک چمک گئی آج سر نیاز میں

بعض اوقات تضمین کے ذریعہ سے کسی شاعر کے سنجیدہ اشعار کو پیروڈی کا رنگ دے دیا جاتا ہے۔ اس کا محرک کبھی کبھی محض تفریح جذبہ اور کبھی تعصب اور عناد ہوتا ہے۔ ہم پیروڈی کی اکثر تضمینیں اگرچہ پست اور رکیک ہوتی ہیں لیکن ان میں شخصی عناد کی تنگ نظری نہیں ہوتی مثلاً غالب کے شہرۂ شعر کی تضمین جنھوں نے ہم کی زبان سے سنی ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے ؎

برزمِ ما یاراں نے چراغے نے گلے	نے پروانۂ سوزد نے صدائے بلبلے

تعصب اور تنگ نظری پر مبنی پیروڈی کی مثال ہمیں پروفیسر ہ۔ چ۔ کے کارناموں سے پیش کرنا پڑے گی۔ اقبال کا مشہور شعر ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق	عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس کو یوں پیروڈی کا ہدف بنایا گیا ہے ؎

بیتاب و نیازل سے بے پھل کود میں عشق	کبھی بندوق میں عشق اور کبھی بارود میں عشق
	عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تذکرۂ مطلوبہ بالا سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ پیروڈی فطری طور پر ہمارے لیے غیر معمولی دلچسپی اور جاذبیت رکھتی ہے۔ یہی دلچسپی اور جاذبیت پیروڈی کرنے والے پر بڑی ادبی اور اخلاقی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔ چونکہ ہر نقل ایک حد تک مضحک اور دلچسپ ہو سکتی ہے اس لیے پیروڈی کا حربہ ادب کے مضر عناصر کے خلاف بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے اور غیر مضر عناصر کے خلاف بھی۔ اس کا صحیح فیصلہ تو وقت ہی کر سکتا ہے کہ کسی پیروڈی کا استعمال بجا تھا یا بے جا، لیکن پیروڈی کرنے والے کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ انتہائی احتیاط سے اس راہ میں قدم رکھے تاکہ ادبی ترقیوں کی راہ میں روڑا نہ ثابت ہو۔ بہرحال اگر کسی ادیب یا صاحب طرز میں صلاحیت ہے تو وہ باقی رہے گا اور اس کی پیروڈی گمنامی کے آغوش میں دفن ہو جائے گی لیکن اگر ادیب یا شاعری میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تو اس کی شہرت کا آفتاب رفتہ رفتہ غروب ہو جائے گا اور اس کے پیروڈی بھی اپنا مقصد پورا کر چکنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔

اس بحث سے یہ ظاہر ہے کہ پیروڈی کسی دیرپا یا مستقل ادبی قدروں کی حامل نہیں ہو سکتی۔ کچھ زمانہ گزرنے پر اس کو اپنی قدر و قیمت کھونا ضروری ہے۔ یا تو وہ اپنے حریف کے مقابلہ میں کام آ جاتی ہے یا حریف کو ختم کر کے خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

فارسی ادب میں طنز و مزاح

پروفیسر محمد علم الدین سالک

ایرانی عموماً ظرافت پسند ہوتا ہے وہ مزاح کو پسند کرتا اور زندگی ہنسی خوشی گزار دیتا ہے۔ ایرانیوں کی زبانی اور تہذیب بہت پرانی ہے۔ اس لیے روایات بھی کئی زمانوں کی ملی صدیوں سے چلی آتی ہیں اور کیا مجال کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو جائے۔ ہر ایرانی تجدد پسندی کے باوجود اپنی روایات پر قائم رہتا ہے اور اسی کو اپنی قومی زندگی کی اساس سمجھتا ہے۔

روایات، قومی، ملی اور پسندیدگی ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے ایران کی آزادی کو برقرار رکھا ہے۔ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ایرانی قومی طور پر محکوم ہو گئے مگر ان کا جذبۂ آزادی چھ ابھرا اور اس نے ان کو اپنا مقصوم بنا لیا۔ وہ بھی ان سے رنگ میں رنگے گئے اور ایرانی رسوم و رواج کی پیروی کرنے لگے۔ آج وہ بھی اپنے آپ کو ایرانی کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

اوپر کہا گیا ہے کہ ایرانی لحاظ و ادب کو بہت پسند کرتے ہیں اس لیے ان کے ادب میں یہ عنصر نمایاں پایا جاتا ہے۔ ظرافت مہذب مزاح کے درجہ سے گر جاتی ہے تو ہجو یا ہزل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بعض اوقات تو اس سے بھی گر کر فحش فحاشی بن کر رہ جاتی ہے۔

فارسی شاعری کا آغاز رودکی سے ہوا۔ وہ اپنے زمانے کا افضل تھا مگر افسوس کہ اس کا بیشتر سرمایہ ایام ضائع ہو چکا ہے اس لیے اس کے کلام سے مزاح، ظرافت یا ہجو کے نمونے تلاش کرنے مشکل ہیں۔

رودکی کے بعد دوسرا نامور شاعر فردوسی ہے۔ اس کے کلام کا محفوظ وہی حصہ محفوظ ہے جو شاہنامہ کا جزو بن چکا ہے۔ باقی کلام کہیں کہیں مذکور و مروی پایا جاتا ہے۔ وہ بھی چند اشعار سے زیادہ نہیں اس لیے وثوق کی ہجو یا ہزل کا سراغ لگانا بھی ناممکن ہے۔

یہ دونوں شاعر دورۂ سامانی سے تعلق رکھتے ہیں جس کے زوال پر دورۂ غزنویہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں فارسی شاعری نے نئی کروٹ لی اور عنصری، فرخی، عسجدی، منوچہری اور اسدی طوسی کے علاوہ خود اسی فردوسی جیسے نغز گو شاعر اور تاج الکلام استاد پیدا ہوئے۔ یہ ایسے اساتذۂ فن ہیں کہ آج تک ہر ہر شاعر اور ہر شاعر ان کی استادی کا لوہا مانتا ہے اور ان کے کلام کو نہایت مستند سمجھتا ہے۔

اس دور میں ابھی تک شعراء میں رشک و رقابت کے جذبات کچھ ایسے نمایاں نہ ہوئے تھے کہ اس کی وجہ سے ہجو بات کو فروغ حاصل ہوتا۔ البتہ ایک ہجو فردوسی کے نام سے منسوب کی جاتی ہے مگر جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کی کوئی ہجو نہیں کہی۔ یہ نام نہاد ہجو دراصل ان لوگوں کا کارنامہ ہے جو سلطان محمود غزنوی کو سیاسی وجوہ کی بنا پر بدنام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شاہنامہ کے مختلف مقامات سے اشعار جمع کر کے ایک ہجو مرتب کر لی جس کے اشعار کی تعداد زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔

کو توڑنے لگے۔ ناسخ نے فوراً نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس سے کہا کہ ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان صاحب کے آگے رکھ دو تاکہ اطمینان سے اپنا شوق پورا کریں۔

ان کے ایک شاگرد شاہ غلام اعظم افضل ایک دن آئے اور اسی سیٹل پائی پر بیٹھ گئے جس پر استاد بیٹھے تھے۔ پھر سیٹل پائی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے اس کو مروڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر ناسخ نے ملازم سے حقہ و منگوائی اور افضل کے سامنے رکھ کر کہنے لگے "اس سے شوق فرمایئے۔ میری سیٹل پائی اس قابل نہیں کہ آپ اس پر شق ستم کریں۔ وہ آپ کے تصور سے اسفنا ہے برباد ہو جائے گی"!

ایک مرتبہ ایک صاحب ملنے آئے۔ ناسخ اس وقت فکر سخن میں مبتلا تھے۔ مگر وہ ایسے جم کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیا۔ یہ بڑے پریشان ہوئے۔ کبھی اٹھنے لگتے۔ کبھی ان کو چھوڑ جاتے۔ مگر ان کو ذرا بھی خیال نہ آتا تھا۔ آخر جب بے حد تنگ ہوئے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو نعلین کی جگہ میں سے ایک چپلی لے کر دالان میں کھڑی ہوئی چھپکلی کی ٹٹی میں رکھ دی۔ ٹٹی ہلنی شروع ہوئی تو وہ صاحب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ناسخ نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگے آپ کو کہاں جانے دوں گا۔ اب تو ہم دونوں کو یہیں جل کر مرنا ہے۔ تم نے میرے مضمون کو خاک میں ملا دیا ہے میرے دل کو جلا کر کباب کیا ہے۔ اب جہنم ہاں ہم یہیں مل کر مرو۔

ایک شخص آ کر بیٹھے تو بیٹھے ہی رہے۔ اور فضول باتوں سے وقت ضائع کیا۔ جب کسی صورت سے بھی ان صاحب نے اٹھنے کا نام نہ لیا۔ تو ناسخ نے صندوقچہ میں سے نکاح کا قبالہ نکال کر ان صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ملازمہ سے کہا کہ جلدی سے جا کر دو روپے لے آؤ کہ گھر کا اسباب کسی اور جگہ لے جاؤں۔ مکان پر تو صاحب قبضہ کر چکے۔ یہ امت کیا دیکھ رہا ہے۔ جلدی سے بھاگ کر مزدور لا۔ کہیں مکان کے ساتھ اسباب پر بھی یہ صاحب قبضہ نہ کر لیں۔

سید انشاء اللہ خاں انشا

ایک دن انشا نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے دستار سر سے اتار کر رکھ دی تھی۔ انشا کا منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کو شرارت سوجھی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ جس پر انشا نے جلدی سے دستار سر پر رکھ لی۔ اور کہنے لگے کہ "سبحان اللہ! بھوں ہیں جو گوں سے سنا کرتے تھے کہ جو لوگ ننگے سر کھانا کھانے میں شیطان ان کو دھولیں لگایا کرتا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ بات سچ ہی تھی۔

ایک دن دربار میں بعض خاندانی شرفا کی شرافت اور نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے۔ اتنے میں سعادت علی خاں نے کہا کہ کچھ بھی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ "تقدیر کی ماریا شامت اعمال۔ بے اختیار انشاء کے منہ سے نکل گیا" حضور! بلکہ انجب" (انجب کے معنی نہایت رجیہ شریف کے بیٹے اور لونڈی زادہ کے بھی۔ سعادت علی خاں لونڈی کے پیٹ سے تھے) یہ سنتے ہی نواب لوٹ گئے۔ کہ تمام دربار سناٹے میں آ گیا اور نواب صاحب بھی دم بخود رہ گئے۔ فوراً ہی انشاء کو اپنی حماقت کا احساس ہوا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور بات کہی جا چکی تھی۔ آزاد لکھتے ہیں کہ یہی ملیحہ انشاء کے تنزل اور بالآخران کی تباہی کا باعث بنا۔

شیخ فلندر بخش جرأت اس دور کے مشہور شاعر تھے اور انشاء کے دوست تھے مگر نعمت بصارت سے محروم تھے ایک دن ان کی ملاقات کو گئے۔ دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ انشاء نے پوچھا کہ میاں کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جرأت نے جواب دیا

ایک مصرع خیال میں آیا ہے جانتا ہوں کہ طلع ہو جائے۔ انہوں نے پوچھا تو وہ مصرع کیا ہے؟ ہرأت کہنے لگے "مصرع تو بڑا ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہو میں جاؤں گا تو کاؤں نا نہیں۔ یہ مصرع لگا کر اُسے سمجھیں لوگے۔ جب انشا نے بہت زیادہ اصرار کیا تو ہرأت نے مجبور ہو کر یہ مصرع ان کو سنایا ہے۔

اس نزاکت پہ پھٹی شب دیجور کی سوجھی

انشا نے کہا کہ ایک ظرافت میرزا کی اور انہوں نے تو رات کہا ہے

اندھے کو رات سے ہیں بہت دور کی سوجھی

دونوں آدمی اچھا لکھتے ہیں اس لئے بھیتی ان میں یاں ہو کر رہ گئی۔ انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ لاٹھی لے کر انشا کو مارنے کو شاہ عالم کو دوڑ پڑا تھا۔

مرزا محمد رفیع سودا

جب سے ان کی شاعری کا چرچا ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ بادشاہ نے غزل اصلاح سے بھیجی۔ اس کی اصلاح میں دیر ہوئی تو بادشاہ نے تقاضہ کیا۔ اور پوچھا کہ مرزا ایک دن میں کتنی غزلیں بنا لیتے ہو۔ مرزا نے کہا پیر و مرشد بطبیعت حاضر ہو تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ بادشاہ ہنسنے لگے۔ واہ! ہم تو بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ مرزا نے بادشاہ کا خیال کیا کہ بیٹھ کر بنواتے ہیں۔ بے پروائی سے جواب دیا "حضور! ایسی غزلوں میں سے بو بھی ویسی ہی آتی ہے" یہ کہہ کر چلے آئے اور پھر شعر کہنے کے لئے لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے دربار میں بڑی شان سے رہتے تھے۔ مگر چونکہ اس سے بھی نہ ایک مرتبہ آصف الدولہ نشاء کو گئے۔ اور وہاں جنگل کے جنگل میں ایک شیر مارا۔ اس پر سودا نے کہا ؎

یارو یہ ابن ملجم پھر پیدا ہوا دوبارہ شیر خدا کو جس نے جنگل کے بن میں مارا

نواب نے شکایت کی کہ مرزا تم نے میں شیر خدا کا قاتل بنا دیا؟ ہنس کر کہنے لگے "حضور عالی! جو شیر آپ نے مارا وہ پیاسا ہوا تھا اسی لئے میں نے یہ کہا کہ شیر خدا کا قاتل ابن ملجم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی لقب ہے اور ابن ملجم حضرت امیر کا قاتل تھا۔ اس مذاق کلام پر سودا نے یہ دو چوپ شعر کہا۔

اشرف علی خاں فغاں

یہ صاحب اپنے زمانہ میں بذلہ سنجی اور بلیغہ گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ عظیم آباد کے رئیس راجہ شتاب رائے کے ہاں ملازم تھے۔ انہوں نے ایک روز راجہ صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا لالیاں اور جالیاں وغیرہ۔ سب حاضرین تعریف کی۔ "جگنو میاں" نامی ایک مسخرا راجہ صاحب کا بہت منہ چڑھا تھا وہ کہنے لگا کہ آپ نے غزل میں سارے قافئے باندھے رہ گئیں۔ فغاں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر راجہ صاحب نے فرمایا "فغاں صاحب! سنتے ہو جگنو میاں کیا کہہ رہے ہیں" فغاں نے کہا "مہاراج! یہ قافیہ میری نظر میں تھا۔ مگر متانت اور سنجیدگی کے خلاف تھا اس لئے میں نے چھوڑ دیا" راجہ صاحب نے

یہ بھی اصرار کیا کہ نہیں عنزہ کہو۔ جب ہر طرف سے فرمائش ہوئی تو آخر فضلی نے کہا ؎

مب دیکھ دیکھ اس کو بناتے ہیں تالیاں — مُجگنہ میاں کی دُم ہو تحقیق سیدھے راست کو

اس پر دور قہقہہ پر تمام دربار چیخ اُٹھا اور بیچارا مُجگنہ مدھم ہو کر رہ گیا۔

نواب مرزا داغ دہلوی

ایک روز داغ نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب ملنے آئے اور ان کو نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اسی وقت داغ نے علامہ بھیجا۔ علامہ نے کہا "فلاں صاحب آئے تھے، چلے گئے"۔ داغ نے کہا "علامہ، ذرا جا، ابھی راستے میں ہوں گے، وہ بھی جاتا گیا اور ان صاحب کو بلا کر لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ آپ آکر چلے کیوں گئے؟ وہ بولے "آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لئے میں چلا گیا"۔ داغ نے فوراً کہا "حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول نہیں پڑھ رہا تھا۔ جواب بھیجا"

ایک طوائف داغ کی ملازمہ تھی۔ ایک روز داغ نے اُسے کسی آدمی کے ہاتھ بلایا۔ طوائف اس وقت کسی بات پر بھری بیٹھی تھی۔ آدمی سے کہنے لگی کہ جا کر کہدے کہ میری طبیعت نہیں آئے گی۔ آدمی نے اسی طرح آکر کہدیا۔ داغ نے کہا "جا کہدے کہ داغ نے اس قرعے کا خوب لطف اٹھایا"۔ بار بار اس آدمی سے پوچھا کہ "ہاں اس نے کیا کہا تھا؟ میری طبیعت نہیں آئے گی"۔ کہنے کہتے یہ شعر تضمین کیا ؎

یہ کیا کہا کہ میری طبیعت نہیں آئے گی — کیا فقرہ آ گئے تو قضا بھی نہیں آئے گی

ایک روز داغ کے پاس عبدالحمید آزاد بیٹھے تھے۔ ان کو اتفاق سے پیاس لگی تو پانی طلب کیا۔ ایک لڑکی پانی لے کر آئی۔ اس وقت جوانی رہی تھی۔ اس سے اس طرح پیش آنے لگا۔ لڑکی بڑی شرم غصور تھی۔ اس نے پانی ٹکٹکی لگا کر آزاد کے ہاتھ میں دیتے ہی فوراً اپنے ہاتھ اٹھا لئے، اپنے سینہ پر رکھ لئے اور اندر بھاگ گئی۔ داغ نے دیکھا تو فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

بادِ صبا نے بھی نہ کیا اس کو بے حجاب — سینے پہ ہاتھ رکھ لیا سب نے شناخت کر لیا

جب داغ رام پور میں ملازم تھے تو بلب مرتبہ سیر بیا سے [illegible] ان ایام میں لکھنؤ سے مشتری نامی ایک طوائف کی بڑی دھوم تھی۔ داغ نے اپنے دلی سفر لاب بہادر حسین خاں [illegible] بادو مشتری سے ملنے چلیں۔ چنانچہ دونوں یاں پہنچے۔ مشتری نے نہایت تعظیم و تکریم سے دونوں معزز مہمانوں کی پذیرائی کی اور اس کے بعد داغ سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی۔ جس پر داغ نے یہ شعر کہا ؎

شبِ ہجراں کے جاگنے والے — سو گئے کہہ کے ہم بھی ہوتی ہے

مشتری خود شاعرہ تھی۔ داغ کا یہ شعر سُن کر سمجھ خود ہو گئی اور دیر تک سر دھنتی رہی کہ یہ شعر کیا ہے۔ پھر داغ نے کہا کہ اب اپنا کچھ کلام سنائیے۔ اس پر وہ بیاض لینے دوسرے کمرے میں گئی۔ [illegible] بیاض وہاں تھا۔ کسی آدمی کی ٹھوکر لگنے سے فرش پر گر پڑی اور سفید چاندنی جگہ جگہ سے جل گئی۔ خیر آدمی دوڑ پڑے اور انہوں نے جلدی جلدی فرش سے اٹھا لیا۔ اس کے بعد مشتری بیاض لے کر آئی تو کسی نے پوچھا "کیا ہوا؟" داغ نے بے ساختہ کہا ؎ داغ لگ گئی

داغ بہت سیر تھے۔ جب پہلے پہل دہلی سے رام پور گئے تو وہاں پہنچ کر وہ نوابی اصطبل کے داروغہ مقرر کئے گئے

جس پر کسی دل جلے نے پھبتی کہی ؎

شہر دہلی سے آیا ایک مخنّی — آتے ہی اصطبل میں داخل ہوا

پنڈت برجموہن کیفی دہلوی

۱۸۹۰ء میں کیفی لکھنؤ گئے تو وہاں ایک شعر و سخن کی مجلس میں مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا سے جو شعر و ادب کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے کسی تعارف یا تعرّف کی حاجت نہ ہوئی۔ اُن مرحوم کی طبیعت میں بھی ظرافت کا مادہ بہت تھا۔ کیفی سے کلام سنا پھر بے ساختہ کہا ؎

بلاغت، بلاغت، بلاغت، بلاغت — بلاغت، بلاغت، بلاغت، بلاغت

اس خداداد قوت کی کیفی نے خوب داد دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب محفل خوب جم رہی تھی تو حامد علی خاں نے کیفی سے کچھ سنانے کے لئے کہا۔ اس پر کیفی نے فی البدیہہ اُسی خوبی سے حامد علی خاں کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر کہا ؎

الباسی، ہوباسی، جوباسی — پیاباسی، چھباسی، ستاسی، اٹھاسی

اس پر ساری محفل لوٹ گئی اور دیر تک یہ لطیفہ تنہا محفل بنا رہا۔

کیفی اپنے اشعار میں بھی ظرافت و لطافت سے باز نہ رہتے تھے۔ ایک شعر میں یہ لطیفہ بیان کیا ؎

کل یہ شکایت اساتذہ سے کی — تو بڑھے کا نہ بھی سبب میرا بھانجا ہے کہا

کہنہ مشق ہیں زمانہ سے — کچھ مزا آئے گا کیفی شعر کا شاگرد ہیں جا"

ایک مرتبہ اُن کے لڑکے نے لڑائی کا ایک مضمون لکھا ہوا دکھایا جس کے آخر میں اپنے نام سے ایک بیت اضافہ کر دیا تھا۔ اس پر کیفی بہت ہنسے کہنے لگے "میاں جب تمھارے پوتے کا مال بوڑھے کا مال بوڑھے کا مال بازار میں ۱۰ کر دکھ دیا ہے اس کا تعلیہ نہیں بنائو گے؟"

ڈاکٹر اقبال

جب اقبال کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی اور وہ سکول میں پڑھتے تھے تو ایک دن ان کا سکول پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ ماسٹر صاحب نے پوچھا کہ "اقبال! آج دیر سے کیوں آئے؟" اقبال نے بے ساختہ جواب دیا "اقبال دیر ہی میں آتا ہے۔" (سیرت اقبال)

بچپن میں اقبال کو بٹیر بازی کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز سبق پڑھ رہے تھے۔ اور ایک بٹیر ہاتھ میں تھی۔ ان کے استاد مولوی میر حسن نے دیکھا تو فرمایا "کم بخت! تجھے ان بٹیروں کو ہر وقت ہاتھ میں رکھنے سے کیا مزا ملتا ہے؟" اقبال نے برجستہ جواب دیا "حضرت! ذرا سے ہاتھ میں رکھ کے دیکھئے۔"

نوجوانی کے ایام میں لوگوں پر لطیف چوٹیں کرنے میں اقبال بہت مشہور تھے۔ موچی دروازے میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے جو باغبانی میں شغف رکھتے تھے۔ ان کے متعلق ایک مرتبہ کہا ؎

طلاق دی تھی۔ اور تم سے کبھی طلاق پڑ ہی نہیں سکتی۔ تم سے طلاق کے معنی ہیں "آ محبت کے ساتھ مل بیٹھیں"۔ تو بے فکر ہو کر اپنی بیوی کو گھر لے آ۔ اور اگر کوئی مولوی اعتراض کرے تو صاف کہہ دیجو کہ میں نے تو تم سے طلاق دی تھی طلاق سے ہرگز نہیں دی۔"

غالب

جب مرزا غالب لکھنؤ گئے تو وہاں ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہونے لگی۔ ایک صاحب نے غالب سے کہا کہ جس موقع پر اہل دلی اپنے تئیں "ہو لتے ہیں، وہاں اہل لکھنؤ "آپ کو" کہتے ہیں۔ آپ بتلائیے کہ فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"۔ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ "میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں"۔ اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ "میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں"۔ تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے اپنی نسبت کہہ جائیں۔

ایک مرتبہ غالب ایک قصبہ میں قید ہو گئے۔ جب قید سے رہا ہو کر آئے تو کسی صاحب ایک رئیس کے ہاں کا کھانا کھا رہے تھے کسی نے آ کر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ کہنے لگے "کون بدنصیب قید سے چھوٹا ہے۔ بچے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں"۔

مرزا غالب کے پاس اکثر گمنام خط طرح طرح کی گالیوں سے بھرے ہوئے آیا کرتے تھے۔ جن میں ان کی شاعری پر اعتراض کئے جاتے تھے اور اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک روز اسی قسم کا ایک خط آیا جس میں ان کو ماں کی گالی دی گئی تھی۔ پڑھ کر کہنے لگے "اس احمق کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بیوقوف یا احمق آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں۔ کیونکہ اسے اپنی بیوی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کیونکہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ فرم ساتھ جو ۲۰ برس کے بوڑھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ بیوقوف کون ہوگا"۔

ایک دفعہ رمضان کے بعد مرزا غالب بیمار ہو گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا "پیرو مرشد ایک نہیں رکھا"۔

ایک پُرتکلف مشاعرہ سخن کی محفل میں غالب بیٹھے ہوئے میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق نے کہا "میرے خیال میں تو سودا کو میر پر ترجیح ہے" اس پر غالب نے کہا "واہ شیخ صاحب، میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں"۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کریں تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے۔ اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھو تو یزید کا۔"

حکیم رضی الدین خاں مرزا کے بڑے دوست تھے مگر ان کو آم بالکل نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر آئے اور برآمدے میں بیٹھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی میں سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ حکیم صاحب نے غالب سے کہا "دیکھئے آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں کھاتا"۔ غالب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں گدھا نہیں کھاتا"۔

ایک روز مرزا کے نہایت عزیز شاگرد میر مہدی مجروح اپنے استاد کے پاس بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے۔ مجروح اٹھ کر مرزا کے پاؤں دبانے لگے۔ مرزا نے کہا "بھئی تو سید زادہ ہے مجھے گنہگار مت کر۔" مگر مجروح نے نہ مانا اور کہنے لگے "اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پاؤں دبانے کی اجرت دے دیجئے گا۔" مرزا نے کہا "تو پھر کوئی سقا ڈھونڈ لیں۔"

جب میر صاحب پاؤں دبا چکے تو کہنے لگے "لائیے استاد! اجرت دیجئے۔" مرزا نے اس پر نور آ جواب دیا "تمہیں! اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے ہیں میں نے تمہارے پیسے دبے حساب برابر ہو گیا۔"

ایک دفعہ سید سردار تعزیب کے بعد مرزا سے ملنے آئے اور تھوڑی دیر ٹھیر کر واپس جانے لگے تو مرزا (جو) شمعدان لے کر سیب پیری کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں۔ اس پر سید صاحب کہنے لگے "قبلہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا۔" مرزا نے کہا "میں آپ کا جوتا کھانے کو شمعدان نہیں لایا۔ اس لئے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔"

۱۲۷۰ھ میں غالب نے اپنے مرنے کی تاریخ کہی "غالب مرد" اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے۔ منوہر سنگھ جتور نے کہا "حضرت انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔" مرزا نے کہا "دیکھو صاحب! ایسی فال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ مادہ بھی غلط نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔"

ایک دن حکیم رضی الدین سر نیچے کئے بیٹھا تھا۔ غالب نے دیکھا تو فرمانے لگے "میاں محمود! تمہارے بزرگوں نے تو ہم جیسے نکمے کہیں بیٹھے ہوئے۔"

غالب کی بہن بیمار ہوئیں تو یہ بیمار پرسی کے لئے گئے اور پوچھنے لگے "کیا حال ہے؟" وہ بولیں کہ "مرتی ہوں، تن کی فکر ہے۔" آپ فرمانے لگے "بہن بھلا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے۔ خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین (صدر الصدور دہلی) بیٹھے ہیں جو گواہی کر کے پکڑوا دیں گے؟"

ذوق دہلوی

ایک دفعہ ذوق عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا آتی اور بار بار ان کے سر پر بیٹھ جاتی۔ یہ اڑاتے تو وہ پھر آ کر بیٹھ جاتی۔ آخر ذوق ہنس کر کہنے لگے "اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔" حافظ وریاں ایک شاعر بھی پاس بیٹھے تھے کہنے لگے "واہ! میرے سر پر تو کبھی نہیں بیٹھتی۔" ذوق نے کہا "بیٹھے کیونکر وہ جانتی ہے کہ یہ ملا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی اھل الکہف کی سورت پڑھ کر کلواو اشربوا کی گردان کرتے ہوئے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر گردن پر چھری رکھ دے گا۔ وہ دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے۔"

شیخ امام بخش ناسخ

ایک مرتبہ کوئی صاحب ناسخ سے ملنے آئے اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی چھڑی سے زمین پر پڑے ہوئے ایک ڈھیلے

شاہنامہ ایک بہت بڑی کتاب ہے اور زمیں شاعری کا شاہکار۔ اس میں نفرت و محبت کے جذبات جا بجا ملتے ہیں۔ کئی ایسے بیت آتے ہیں جو نوابی سے نصاریٰ فی قوم کی بڑائی بیان کرتے ہوئے دوسری قوموں کی تحقیر کی ہے مثلاً قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ ندی نے جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا وہاں اہل عرب کی جو ہجو کی وہ کہتا ہے ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

یہ جذبات ایک سچے محب وطن ایرانی ہی کے ہو سکتے ہیں اور فردوسی نے ان کا اظہار بلا کم و کاست کر دیا ہے۔

دورۂ غزنویہ کی ایک اور ممتاز شخصیت شیخ الرئیس ابوعلی سینا ہیں۔ وہ فلسفہ اور طب میں بے مثال اور بے نظیر اور نہ ہی لحاظ سے آزاد خیال تھے اس واسطے علماء کا طبقہ انھیں پسند نہیں کرتا تھا۔ شیخ نے اس جماعت کے طعن و تشنیع سے تنگ آکر اپنی رباعیات میں جن کی تعداد بہت کم ہے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ وہ ایک جا میں فکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

با ہیں دو سہ نادان کہ چنان می دانند — از جہل کہ دانائے جہاں ایشان اند
خرما بکہ ایں جماعت از زیرکی — ہر کو نہ خواست کافرش می خوانند

دورۂ غزنویہ کے بعد دورۂ سلجوقی آتا ہے۔ یہ فارسی ادب کا دور زریں ہے۔ اس میں ہر صنف سخن کو فروغ حاصل ہوا۔ زبان میں وسعت اور بیان میں شیرینی بھی پیدا ہوئی۔ شاعری نے سادگی کی بجائے رنگینی اختیار کی اور شعراء نے جو قافیہ تنگی کے لیے نئے نئے میدان تلاش کیے۔ اس دور میں ہجو، شوخی اور ظرافت وغیرہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہزل اور اس سے بڑھ کر فحش نگاری بھی خوب پنپی۔ انوری، خاقانی، سوزنی خاص طور پر اس کے لیے مشہور ہیں، ویسے تو کسی شاعر کا دامن بھی اس سے پاک نہیں

مولانا شبلی کے خیال میں "انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو کی کوئی نہ بہت ہوتی تو انوری اس کا عشر عشیر نہ ہوتا" مگر مولانا کا یہ بیان بہت حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ انوری کی کلیات چھپ چکی ہے۔ اس کی ورق گردانی سے مولانا کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ اس کے ہاں کہیں کہیں ظرافت، طنز اور ہجو ملتی ہے۔ بعض ہجویں بڑی کثیف ہیں لیکن مضامین اچھوتے ہیں۔ چند ایک میں لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں کا ایک عہدہ دار بوعلی آبی تھا۔ انوری کی اس سے کسی بات پر ان بن ہو گئی۔ بوعلی کی ناک بھی نتاسب سے کسی قدر بڑی تھی اور تمام چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ انوری نے اس ناک کو ہجو کا نشانہ بنایا اور یہ رباعی کہی ؎

با بوعلی آبی ارہم بہ نشینی — شصتے بینی شش جہتش زو بینی
گر دیدہ بدیدن رخش چار کنی — چندان کہ ازو بینی بینی بینی

اس زمانہ میں شعراء کی بے حد قدر و منزلت تھی لیکن درباری رقابتوں کی وجہ سے اکثر شعراء کو تلخ زندگی بسر کرنی پڑتی تھی اور اس تلخی کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاعر بعض حالتوں میں بے حد ذلیل ہو جاتا تھا۔ اس بنا پر انوری شاعری کو خاکم بدہن کے پیشے سے بھی زیادہ ذلیل اور کثیف سمجھتا تھا اس کے دیوان میں ایک خیالی واقعہ ملتا ہے جس میں اس نے نہایت لطیف پیرایہ میں اس فنی لطیف کی اصل حقیقت کو واضح کیا ہے چنانچہ

وہ کہتا ہے ؎

یا یکے مرد کہ تا اس ہمی گفتم دوشش	تو چہ دانی کہ ز نعمت تو دلم چوں خستہ است
منعمت دیدہ شاہد دوہی دانی چیست	آں جوانیز رود وایں زپے رفتہ است
گفت از تجربہ خود وا ز ہمہ ما بہتر	زیں کہ مارا ز چنار آتش واز نے بشکستہ است
ما ز زمانے دو و رونق کار من و تو	واند اں کس کہ دمے با من و تو نشستہ است
کار زمانے مرا پایہ من معلوم ست	لاجرم کار من از بندہ تقاضا رستہ است
کہ چناں نعمت بسیار کہ تو نعمت کنی	کردہ دائم و پرداختہ پیوستہ است
یا چناں واند کہ ایں عمر عزیز ما را	ہیچ روز و شب جمال تو ہمی رستہ است
او چو واند کہ در ایں شیوہ چہ خوں ہا ریزد	کہ تمنا ز سر بیداد دراں پختہ است

انوری ہم ز تو پذیرفت کہ بر شاخ درخت
عقل واند کہ ستمہا ئے تبر از دستہ است

یعنی ایک دن میری ملاقات ہلال خور سے ہوئی۔ میں نے کہا بھائی میرا اور تیرا پیشہ جیسا کچھ ہے اس سے سب واقف ہیں مگر عجیب بات ہے کہ تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو اور میں ناکام۔ ہلال خور نے جواب دیا کہ تمہاری ناکامی کی وجہ نہیں کہ میں تم سے زیادہ باکمال ہوں بلکہ یہ ہے کہ قدر دانوں میں فرق ہے۔ میرے آقا کو ہنر کی قدر ہے اس لیے میرے کام کو فروغ حاصل ہے۔ اس کے خلاف تمہارا آقا تمہارے کام کی قدر و منزلت نہیں جانتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ تمہارا کام چلا ہوا معمول ہے۔ روز ازل سے جیسا چلا آتا ہے ویسا ہی چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی خیال ہے کہ عالم لوگوں کے کارنامے بازاری جنس ہیں جو بڑی فراوانی سے بازار میں موجود ہیں، اس علم کے بعد وہ تمہاری قدر کیوں کرے اور اسے تمہاری محنت کا احساس کیوں ہو؟

سرخس میں ایک دفعہ بارش نہ ہوئی۔ انوری نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر ابو علی آبی کی ہجو میں یہ رباعی کہی ؎

سرخس از نخ بے آبی و آبی	در بغارو ئے دارد در خرابی
ز بے آبی خلاصی یافت امسال	خدا خدا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس آبی اور بے آبی (خشک سالی) کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ اس سال اسے خشک سالی سے تو نجات مل گئی ہے مگر خدا خدا! اسے آبی (ابو علی آبی) سے بھی نجات دے۔

انوری کے زمانے میں خواجہ ابو الفتح بخل میں مشہور تھا۔ انوری نے اس کے بارے میں یہ شعر کہے ؎

خواجہ بو الفتح از کمال حرص و بخل	سیم حاصل می کند بے فائدہ
وز پئے نانے ہمی گوید زنش	رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً

اسی طرح ایک جنوانی قاری کی ہجو میں لکھتا ہے ؎

دوش بر خواب مہ چنیں دیدا	دیدش کوز است آندہ است

گفتش اے بندگیت بوده است — طبع پاک تو ازچہ پژمردہ است
گفت زیں معرکہ ہم جوشم — رونق دین ازیزدی بردہ است
آنچہ ایں زمن بہ مروی خواہد — جبرئیل آں بہ نسا آوردہ است

انوری نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے قاضی طوس سدید الدین بیہقی اور عماد الدین عمر زاوہ کانی ہروی کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

چار کس یابی کہ در ہیچ عہد — گر بہ جوئی از ثریا تا ثری
قاضی طوس و سدید بیہقی — تا چہ عماد زادہ کانی ہری

بہر حال انوری نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں شدت اور زہر کی بہت کمی ہے۔
اسی زمانے میں حکیم کرشکی ایک نہایت مشہور ہزال ہوا ہے۔ اس نے سلطان سنجر کے درباریوں کے خلاف کئی نظمیں لکھیں جن میں اکثر فحش ہیں۔ ان میں سے سب سے بے ضرر یہ رجز ذیل ہے ؎

ایا شہ شیر زن نرکان پُر دل — نسبت از فی و تا تا و کاشان
بگیا یک در خراسان بر دیدہ — بہ تازو نعمت و دولت تن آسان
شمارا پادشاہ ہفت کشور — رسانیدہ بہ بیری از نخاسان
بروز کوکبی خفتہ کہ دمہ — بے در پیش دکان رواسان
بہر شہرے زنام خوشنودان — شدہ چوں دیو از آہن ہراسان
فلک کفران نعمت ہائے سنجر — طلب کرد از ثنا ناحق شناسان
زہے درماندگان بے حمیت — زہے خربندگان ناسپاسان
کسے خود زاد و بوم و ملک و اقطاع — چنیں بیروں دہد از دست آسان

مسلم ہیں کہ چوں بیروں کشیدند
بشمشیر از..... زن تاں خراسان

قاضی حمید الدین ابو بکر اپنے زمانے کے فاضل بلیغ کے قاضی القضاۃ اور انوری کے ممدوح تھے انھوں نے ایک نہایت لطیف ہجو سلطان سنجر کے سپاہیوں کی لکھی ہے جو خراسان کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان کے آگے مارے مارے پھرتے تھے ؎

حکیم کرشکی را بخواب دیدم دوش — زباں کشادہ بمدح مبارزان سپاہ
ز راہ طعنہ و تلخ و تا خرو می گفت — نہ گزارد ہر یک حقوق نعمت شاہ
خموش زیر رکاب شما کمیت و سمند — دریغ بر برو فرق شما قبا و کلاہ
ز پیش کافر کفران نعمت آورد — گر نخفتند چہ از پیش تو بہ حیل گناہ

نہ دیدہ کرد سیاہ سیہ پوش ہنوز — کہ گشت صبح سپید شما چو شام سیاہ
زہے طہارت و جلدی گفتند — زہے جماعت و غرا الا اللہ

عمر خیام پہلا شاعر ہے جس نے ریاکاری کی مذمت کی اور رباعیات کے ذریعے شوخی اور ظرافت کو روشناس کرایا مثلاً وہ خود نما شیخ کی پردہ دری کرتا ہوا کہتا ہے ؎

اے خواجہ بیک نادرہ کامن مارا — دم در کشد و مدد کار خدا کن مارا
ما راست رویم تو کج بستمی — اے چارۂ دیدہ کن رہا کن مارا

ایک اور رباعی میں وہ کہتا ہے ؎

آباد خرابات ز مے خوردن ماست — خون دو ہزار توبہ بر گردن ماست
گر من بدمکور رحمت چو کند — آمائش رحمت ز گناہ کردن ماست

ماثیر ضلالہ رمے کہنہ بنو — وانگہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت — مے پیش بیار ہر کجا خواہی برو

یعنی ایک شخص اس خوف سے دبا ہوا ہے کہ مرنے سے بعد کیا ہوگا اور ہم کہاں جائیں گے۔ وہ خیام سے اس بارے میں سوال کرتا ہے۔ خیام کہتا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شراب ہمارے لیے لے آؤ اور تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔

عمر خیام چاہتا ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن یکساں ہو۔ وہ اسے ظریفانہ انداز میں یوں کہتا ہے ؎

زاہد بہ زن خاستہ گفتا مستی — ہر لحظہ بدام دیگرے پابستی
گفتا شنیدہ ہر آنچہ گوئی ہستم — اما تو چناں کہ می نمائی ہستی

یعنی ایک نے خاستہ عورت سے کہا کہ تو ہر گھڑی ایک نئے آشنا سے تعلق جوڑتی ہے۔ اس نے کہا اے شیخ تو جو کچھ کہتا ہے میں وہی ہوں لیکن کیا جو کچھ تو اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے کیا تو وہی ہے؟

عربی میں ایک مقولہ ہے کہ الحق مُرّ یعنی سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ عمر خیام اس سے کہتا ظریفانہ مضمون شراب کے بارے میں پیدا کرتا ہے ؎

وقتے کہ طلوع صبح ارزق باشد — باید بگفت جام مروق باشد
گوید کہ متی نتج بود در رجم سال — باید کہ بایں دلیل مے حق باشد

ایک اور مقام پر وہ ریاکاری کی مذمت یوں کرتا ہے ؎

گر مے نخوری طعنہ مزن مستاں را — گر دست دہم تو بہ کنم پیماں را
تو خرقہ بایں کہنی کن مے نخورم — صد کار کنی کہ مے غلام ہست آں را

اسی مضمون کو ایک انوکھے انداز میں یوں بیان کرتا ہے ؎

ور مسجد اگرچہ پنیسا زادہ ام — ہمچو کعبہ از بہر ما زادہ ام
سجادہ از مسجد ما در دیدیم — آں کہنہ شدہ است باز باز آدہ ام

خاقانی فارسی زبان کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ہے۔ وہ حسان العجم کہلاتا ہے۔ ہر شاعر اس کا نام ادب و احترام سے لیتا ہے۔ وہ شاعری میں ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد ہے جس نے اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی کی شادی بھی اس سے کر دی تھی۔ بعد میں حالات نے پلٹا کھایا اور استاد شاگرد میں چل گئی۔ یہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ تحفۃ العراقین میں خاقانی نے اپنے حج کے حالات لکھے ہیں لیکن وہاں بھی وہ اپنے استاد پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتا۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

جنی رنگ گنبد را در بن کوی — ہم زرد و خفا و ہم سیاہ روی

رشید الدین وطواط، خاقانی کا ہم عصر اور دوست تھا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ خاقانی نے اس کی مدح میں ایک زبردست قصیدہ لکھا جس میں اس نے کہا ؎

اگر بکوی رسیدے بجائے تحفی است — زہے رشید جواب آمدے بجائے صدا

لیکن نوعمری میں اس سے بھی اَن بن ہو گئی اور خاقانی نے اس کی بھی ہجو لکھی مگر خاقانی سے کسی کو کیا گلہ ہو سکتا ہے؟ اس کی افتادِ طبیعت ہی ایسی تھی۔ وہ خود اپنی مدح میں کہتا ہے ؎

شہنشہ حوا نویسم تہمت ناجز نہم
چادر مریم ببایم پردۂ زہرہ درم

ایک تذکرہ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ خاقانی کسی امیر کی محفل میں پہنچا۔ امیر نے اس کے شایانِ شان تکریم و تعظیم نہ کی۔ بیٹھنے کو بھی کوئی موزوں جگہ نہ دی۔ یہ بات خاقانی کو بہت ناگوار گذری، اس نے وہیں کھڑے کھڑے مندرجہ ذیل قطعہ لکھا۔ اسی محفل میں پڑھا اور چلا آیا ؎

گر ز دولت نشست خاقانی — نہ ز وارستگی نہ ترا ادب است
قل ہو اللہ کر وصفِ خالق ماست — زیر تخت یدی ابی لہب است

اسی عہد میں حکیم سنائی بہت بڑا غزال اور ہجو گو ہوا ہے۔ اس نے کابل کا بیشتر حصہ ہجو گوئی میں بسر کیا اور نہایت کثیف اور فحش ہجویں کہیں۔ آخری عمر میں وہ اس سے تائب ہوا اور کئی قصیدے لکھے جن میں وہ اپنے گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرتا اور آئندہ نیک رہنے کی دعا کرتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

چوں بر مجلس دل تن گشت پادشاہ — آمد بپیش سینہ ام از سقف سیاہ
لشکر گہ مغابت من جوق جوق بود — من ایستادہ بہر عارض بعرض گاہ
دیوے سیہ گلیم بران بود تا کند — رخوں گلیم خویش لباس دلم سیاہ
بنمود حیل خیل کہ پیش چشم من — تا در کدام حیل کنم بیشتر نگاہ

سوزنی کے ہجو کمال اصفہانی کا زمانہ آتا ہے۔ ہجو کو شاعر کے لیے لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کا ایک قطعہ ہے ؎

ہجا گفتن بہ چہ پسندیدہ نبود	مہاجا کسے کاست آں نامد
ہر آں شاعرے کو نہ باشد ہجا گو	چو شیرے کہ پنگال و دنداں ندارد
خداوندا تو پاک ما ست عدلے	کہ الا ہجو ایچ دنداں ندارد
چہ غم ہیں بود بولہب زایزد	مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
اگر ہجو نمی تو ز گفتن دہن	کہ ہرگز زیانے ایماں ندارد

اس کی کلیات میں ہجو کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔ ایک بخیل کی مذمت کرتا ہوا کہتا ہے ؎

اے ترا ہیچ گشتہ در رہ آز	ہمتو کونہ و آسیہ دراز
ہمہ دنداں ز حسرتیں ہمچوں سیر	ہمہ مغز تو پوست ہمچو پیاز
دست تو چوں دہان گرسنگاں	ہرچہ وردی نمی نیابی باز
چوں کلوخی فسردہ بری ہمہ چیز	وز تو ناید بروں مگر آواز

اسی طرح ایک مزہ قلی کی داڑھی کی ہجو میں ایک طویل نظم لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

آں ریش فلاں مزہ قلی	ریشست عظیم پاستانی

ایک مثنوی لبنان کے رئیس کی ہجو میں ہے۔ اس کے بعض بعض شعر نہایت لطیف ہیں۔ ابتدا کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

تا زبانم بکام جنبانی است	در ہجائے رئیس لبنان است
بہ رئیس آں خسیس پر تلبیس	مایۂ ظلم و سایۂ ابلیس
آنکہ نامش ز شرم پیدا نیست	در بدی ہ و دویش ہمتا نیست
آں کہ او پیشوائے وزدانست	سرور سرخیل زن بزدانست
طبع او لوم و شکل نامعلوم	صحبتش شوم و سیرتش مذموم

کمال اصفہانی نے اپنے زمانے کی ایک مشہور شخصیت ضیاء الدین کی ہجو میں ایک زبردست نظم لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

تیزے کہ مغز چرخ ز بانگش فغاں کند
تیزے کہ روزگار بدو امتحاں کند

ایک بخیل کی ہجو کتنے لطیف پیرایہ میں کہتا ہے ؎

خواجہ در ماہتاب ناں می خورد	در سرائے کہ ہیچ خلق نبود
سایۂ خویش اگر بپنداشت	کاسہ از پیش خویشتن بربود

یعنی خواجہ جاڑوں میں ایسے مقام پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے جہاں کوئی نہ ہو۔ وہ اپنے سایہ کو بھی غیر سمجھتا ہے اور اس ڈر سے کہ کوئی سے کھانے کا برتن چھپا لیتا ہے۔

کمال اصفہانی کا بڑھاپا بڑی تنگی میں گزرا۔ اس عہد کے حاکموں نے اس پر بڑی بڑی مہربانیاں کیں، شہاب الدین جس کی مدح میں اس کے کئی قصیدے ملتے ہیں اس سے ناراض ہوا اور اس پر کچھ چھاپہ کر دیا۔ ضیاء الدین جو اس کا افسر ماتحت تھا اس کو ہرانے کی دھول میں جبر و تشدد پر اتر آیا۔ جلال الدین نے اس رویہ کے خلاف احتجاج کیا اور کئی قصیدے لکھے مگر حکومت کے رویے میں فرق نہ آیا، دھولی میں زیادہ سختی ہونے لگی۔ اس کے گھر پر سپاہی متعین کر دیے گئے۔ کمال نے اب قصیدے میں درخواست کی کہ اس نارواپابندی کو اٹھا لیا جائے۔ جب اس کا بھی اثر نہ ہوا تو اس نے ایک نہایت شاندار ہجو ضیاء الدین کی لکھی جس میں اسے چوہا قرار دے کر عجیب و غریب مضمون پیدا کیے۔ ابتدائی اشعار تو ہجو کا ہیں صرف اس کا وہ حصہ نقل کرتے ہیں جس میں موش کی ہجو ہے ؎

آمدم با حدیث موش کراہ ۔ کرد خبث درون خود اظہار
خود پدید ازم از بعثل ذریہ ۔ کہ من از ماجرائے موش اظہار
گربہ روزہ دار بود آں موش ۔ ہمہ زبندہ ہمہ سبک طرار
موش چوں منتصب شود بدو سست ۔ شوخی او اثر کند ناچار
فتنہ آں بد کہ شیر داں را ۔ بشکنم پنجہ در دو پیکار
ورخیالم نہ بد کہ نخیرہ مرا ۔ قصد موشی چنیں کند افگار
بہ کجا تا موش از وبا کردد ۔ عندلیباں شوند بر تیہا
خود گرفتم کہ فارہ المسک است ۔ کہ ز غمازیش نیاید عار
ہمہ باید شکافتن سنبلش ۔ تا بروں او فتد از و اسرار
بخدا یکدو روز صحبت موش ۔ موش را کرد در جہاں دیدار
واجب الفضل او موشاں را ۔ در بوداں در و ای کعبہ قرار
برسولے کہ نعرۂ شر موش ۔ موش را کرد ہمچو بلعمیا مار
کاچکے گفتند مفسداں بغرض ۔ در ضمیر رہی نہ کرد گزار
بشنو از بندہ نکتۂ شیریں ۔ کہ خلاف است در دلم چو خار
گرچہ رندان موش بس تیز است ۔ تیز تر داں زبان من صد بار
تو بحق نائب سلیمانی ۔ حق ہر یک بجائے خود بگزار

کاو موشاں بر آسماں بردی
بجانب بلبلاں فرو نگزار

کمال کو روزمرہ کے طور پر سرکار سے خلعت ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اسے گلابی خلعت ملا۔ اس نے طیش میں آکر یہ قطعہ لکھا ۔

خلعت کاسمال خواجہ داد مرا ۔ گر سیہ بخلد بود اکثر خاک
خاک مردم خورند انستم ۔ کہ خورد مردمے برادر خاک

خواجہ با گنبد تم برابر خاک — گر بود وجہ غذائے مور خاک
آدمی را چو خاک سیر کند — کاسہ وجہ غذائے مور خاک

اس کے ابیات میں شہب ادبی کے نوجوانوں کی بھی کئی جوڑیں ملتی ہیں۔ ہم طوالت کے خوف سے انھیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

فنا کے بعد خاک ایران نے عنبہ زاکانی سے بڑھ کر بذلہ سنج پیدا نہیں کیا۔ وہ علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتا تھا اور شعر بھی خوب کہتا تھا۔ ایک معمولی خاندان سے اس کی طبیعت میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا، اس نے علوم و فنون کو ترک کر کے ہجو و ہزل گوئی کو ہمیشہ اختیار کر لیا چنانچہ وہ ایک جگہ کہتا ہے۔

نے خواجہ کہی تا بتوانی طلب علم — گاہ بر طلب رانب ہر روزہ جانی
رہ مسخرگی پیشہ کن و طلب نیاسرو — تا داد خود از ہمہ فضلا بستانی

کہی جاتا ہے کہ عنبہ دربار شاہی میں باریابی کی امید نہ پا کر تو اس نے یہ رباعی کہی ؎

در علم و ہنر مشو چو من صاحب فن — باز دہ جزیران فضولی خوار چو من
خواہی کہ شوی پیش ارباب زمن — کذاب و دروغگر و لئیم و الکزن

لیکن امر واقعی یہ کہ لوگ اس کی ہجو سے بچنا چاہتے تھے جو لوگ کے باہر کھڑا ہو کر ناقابل برداشت شور مچاتا ہے۔ صاحب خانہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کو کچھ نہ کچھ دے دیتا ہے۔ لکھنؤ کا سودا اس کا مرکز تھا۔

عنبہ زاکانی نے اپنے زمانے کے معاشرے کے خلاف طنز بھی کی ہے۔ اس کی اکثر تصنیفات میں بڑی لطیف اور بسا اوقات بڑی واضح طنزیں پائی جاتی ہیں۔ اخلاق الاشراف، ریش نامہ، تعریفات اور تصدقہ وش و نر بھی کوئی بھی اس سے خالی نہیں۔ رسالہ موش و گربہ ریاکار ناصحوں پر ایک بڑی کاری ضرب ہے۔ یہ نظر ایک سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع میں ایک پُر عزائم نگاہ اور شیر شکار کا نقشہ ہے جس کی آنکھیں کہربا کی طرح چمکیلی نہایت تیز، پاؤں بھیر جیسے، پیشانی عقاب کی سی، پشت طبل جیسا، سینہ فاتح ایسا، دانت تیز اور ابرو کمان کی مانند ہیں ؎

از فضائے فلک یکے گربہ — بود چوں اژدہا بکردار
گربہ دور بین و شیر شکار — کہربا چشم و تیز دندانا
پائے کز رعقاب پیشانی — پشت پُر طبل و پر زدستانا
لشکرش طبل و سینہ اش قاقم — ابرو قوس و تیز دندانا

بلی بھوک سے بیتاب ہوتی ہے اور ایک میکدہ کا رُخ کرتی ہے۔ ایک غم کی اڈہ میں گھات لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اتنے میں ایک چوہا نکلتا ہے۔ پھدکتا کودتا ایک غم کے دہانے پر جا بیٹھتا ہے۔ وہاں شراب پیتا ہے اور بدمست ہو کر پھنکارنے لگتا ہے کہ کہیں ہے بلی؟ میں اس کا سر کاٹ دوں اور میدان میں گھسیٹتا پھروں۔ احسان کے روز جب میں داد و دہش پہ آؤں گا تو سو بلیوں کا سر تقسیم کروں گا۔ اگر بلی میدان میں میرے مقابلے کو آئے تو وہ میرے نزدیک کوا یا ایک کبوتر ہے ؎

گفت گر بہ تا سرش بکنم — سر بہ او را بزم ببیدانا

سر صد گربہ را بخشم من — گاہ بخشش بروز احسانا
گر بود در پیش من چو سگ باشد — کر شود دُرہ بروبیدانا

اسے کیا خبر تھی کہ اس کا حریف تم کے آڑ میں اس کی ڈینگیں سُن رہا ہے۔ یکایک بلی جھپٹی، اسے پنجوں میں دبوچ لیا اور کہا ہاں اب کہاں جاؤ گے۔ چوہا اب ہوش میں آیا، بہت گڑگڑایا، کہا میں مست تھا اور مستی میں پتہ نہیں کیا کیا بک گیا، میں تو تیرا غلام ہوں، مگر بلی پر اس کی ان التجاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اسے مار کر کھا گئی۔ فارغ ہو کر وہ مسجد کی طرف روانہ ہوئی تاکہ اس گناہ سے توبہ کرے۔ وہ رو رو کر کہنے لگی ؎

یا رب الناس کہ توبہ کردم من — ندرم کوشش ما بندانا
گربہ ی گفت توبہ در مسجد — یا کبر و قدیم ہست سجانا
توبہ بخشی گناہم اے غفار — از گناہ گشتہ ام پشیمانا
در مکر و فریب باز نمود — تا بحد کہ گشت گربانا

ایک چوہا مسجد کے منبر کے نیچے بیٹھا اس کی گریہ و زاری سُن رہا تھا۔ وہ بلی کی توبہ سُن کر وہ سمجھے چوہوں کو یہ مژدہ سنانے کے لیے بھاگا

مژدہ داد بہ کربہ عابد شد — زاہد و مومن و مسلمانا

چوہے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ بلی کے پاس نذر، شیرینی، پھل، شراب کباب کے تحفے بھیجے جائیں یہ تحفے سات چوہے لے کر بلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بلی نے انھیں پاس بلایا اور موقع پا کر پانچ چوہوں کو پکڑ لیا۔ باقی ماندہ چوہے بھاگ نکلے اور یہ بُری خبر چوہوں کو سُنائی۔ ایک ہفتہ ماتم کرنے کے بعد تین لاکھ تینتیس ہزار چوہے اپنے بادشاہ کی سرکردگی میں بلیوں سے لڑنے کے لیے نکلے۔ خونریز جنگ ہوئی۔ بلیاں شکست کھا گئیں، سرغنہ بلی گرفتار ہو کر چوہوں کے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئی۔ اسے پھانسی کا حکم دیا گیا مگر بلی نے اپنے آپ کو چھڑا کر چوہوں کے بادشاہ کو مار دیا اور کچھ چوہوں کو زخمی کر دیا۔ باقی چوہے ادھر اُدھر نکل گئے۔ عبید اس قصے کو اس شعر پر ختم کرتا ہے ؎

ہست این قصہ عجیب و غریب — یادگار عبید زاکانا

عبید زاکانی کی دوسری کامیاب تصنیف نثر لطیفات ہے جس میں اس نے اس زمانے کے معاشرہ کے مطابق لوگوں کے اخلاق کا تجزیہ کیا ہے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ظریف ہی نہ تھا بلکہ اسے اپنے زمانے کے انسانوں کی اخلاقی کمزوریوں کا بھی پورا پورا علم تھا۔ اس میں سے چند نمونے درج ذیل ہیں:

فصل اوّل (متعلق دنیا و مافیہا)

الدنیا — آنجا لایبقی آفریدہ دروے نیاساید — ایسی جگہ جہاں کسی مخلوق کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہو

فصل دوم (ترک اوران کے دوست)

الیاجوج والماجوج — قوم ترکان کہ بولایتے متوجہ شوند — یاجوج ماجوج ان ترکی قبائل کو کہتے ہیں جو کسی ملک پر دھاوا کرنے جائیں یہ ہوں

فصل سوم (قاضی اور اس کی صفات)

القاضی — آنکہ ہر اہ را نظر بیں کنند — جسے تمام لوگ بُرا کہیں

فصل چہارم (شیوخ اور ان کے مریدین)

الشیخ — ابلیس — معلم الملکوت

فصل پنجم (شہ فا اور ان کی جراحات کے متعلق)

اللاذ الواغل — مایہ ابتیاں — بے باکی و شجیعی شہ فا کی تجارت کا سرمایہ ہے

فصل ششم (پیشہ ور اہل دستار)

الباز دی — آنکہ از ما نترسد — وہ مُدار وہ ہے جسے خوف خدا نہ ہو

فصل ہفتم (شراب اور اس کے لوازمہ سے بائعین)

الشراب — ماء آسنون — بے حیثیت اور اضمحلال کا سرچشمہ

فصل ہشتم (جنس زنی کے متعلق)

البلک — آنچہ صوفیاں ابوجہ آورد — جنس وہ ہے جو صوفیوں کو وجد و مسرت سے لبریز کر دے

فصل نہم (صاحب خانہ اور اس کے متعلقین)

المجد — آنکہ پرستش دنیا کند — نوجوان یا لنوا رادہ ہے جو دنیا کی داڑھی پر ہنسے

فصل دہم (مرد و عورت کی تعریف نظرت کے متعلق)

الخائن — آنکہ عشوق بسیار دارد — خائن کی تعریف یہ ہے کہ اس کے بہت سے خواستگار ہوں

عبید زاکانی لاکھ لچکڑ اور ہجو اسی سہی اس کے کلام کی بے باکی اور صلابت سفات ہیں جن کی بنا پر اس کی تصانیف خاص مطالعہ کی محتاج ہیں۔ اس کی تصانیف اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں کہ اس زمانے کے فاسد اخلاق پر وہ کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ تاتاریوں کے تسلط کے دور میں ایران کی عوامی اور خانگی زندگی پستی کے بدترین گڑھوں میں گر چکی تھی۔ اس نے اس کا تجزیہ ظریفانہ انداز میں کیا ہے تاکہ

اس کے ابنائے وطن اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کریں۔

شیخ سعدیؒ بہت بڑا مصلح قوم اور ملک ہے۔ وہ ان حدود کو پھاند کر اکثر مقامات پر آفاقی رنگ اختیار کرتا ہے۔ اس کی تصانیف خاص کر گلستان اور بوستان اس قابل ہیں کہ ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ اس میں طنز کے نشتر بھی ہیں، ظرافت کی چٹکیاں بھی اور کہیں کہیں نہایت لطیف چٹکلے اور لطیفے بھی ہیں جن کے پڑھنے سے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل جاتی ہے مثلاً استقلال اور ریاضت کے جوہر نمایاں کرنے کے لیے وہ یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں ؎

شبے با دوستم کشتی بخفت — شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت
کہ من ہا تو ہر شب بسوزم رواست — ترا گریہ و سوز بہر چراست
بگفت اے ہوادار مسکین من — برفت از برم یار شیرین من
تو یکبار ازو پیش یک شعلہ خام — من استادہ ام تا بسوزم تمام
ترا آتشِ شوق اگر پر بسوخت — مرا بیں کہ از پائے تا سر بسوخت

غیبت کی برائی بیان کرنے کے لیے سعدیؒ یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں ؎

طریقت شناسان ثابت قدم — چہل رشتہ تسبیح دارند بہم
یکے نوش بیں عیبت آغاز کرد — دو دگر بیچارہ باز کرد
کہ اے نفس اے یار شوریدہ رنگ — تو ہرگز غزا کردہ در فرنگ
بگفت از بس جاہد بیا ز خویش — ہمہ غزہا دادہ ام پائے پیش
چنیں گفت درویش صاحب نفس — ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
کہ کافر بہ پیکار شد آہنین — مسلماں زبیم زبانش بزست

یعنی چند آدمی ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی۔ ایک نیک نفس نے پوچھا کیوں یار کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔ نیک نفس نے کہا سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملے سے محفوظ رہے لیکن مسلمان آپ کی تیغ زبان سے نہ بچ سکے۔

شیخ سعدیؒ مذہبی لوگوں کی تنگ نظری پر طنز کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ ان کی طرح متعفن ہے اور نہ اس کی رحمت کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہے ؎

شنیدم کہ مستی ز تاب نبید — بہ قصورہ عابدے بر دوید
بنالید بر آستانِ کرم — کہ یارب بہ فردوس اعلیٰ برم
مرا نوش گویاں گوشش کہ بین — سگ و مسجد اے فارغ از مقعدین
چہ شائستہ گوید کہ خواجہ بہشت — ی زیبد نہ بر روئے زشت

بگفت ایں کس پیہ و نیز میست — کہ مست ست بردار از من اے خواجہ دست
عجب دارم از لطف پروردگار — کہ بامند گنہگار سے امیدوار
ترا می نہ پیرد کہ عذر پذیر — ورد تو بہ باز است و وحی و مگیر
تو خواجہ گنہ بیش عفوش عظیم

یعنی یک مست شراب لے۔ اور میرے جسم کا کپڑا کپڑا کر کے اسے خدا مجھ کو بہشت میں لے جانا۔ مؤذن نے اس کا گریبان پکڑ کر کہا ارے پلید کتے! تجھ جیسے بدکار کو بہشت کا دعوے کرتا ہے؟ مست رو پڑا اور بولا کیا آپ کو خدا کے لطف عمیم سے نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو۔ میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خدا توبہ پذیر ہے۔ مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں۔

شاہانِ شام میں ملک صالح ایک متقی بادشاہ گزرا ہے۔ ایک دن وہ بھیس بدل کر شہر کی گشت کو نکلا۔ اس نے ایک مسجد میں دو درویش بیٹھے ہوئے دیکھے۔ بہ کی ملبس سے جناب تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ آخر قیامت میں کوئی تو حاکم ہوگا۔ اگر بادشاہ لوگ جو دنیا میں عیش و عشرت کر رہے ہیں غریبوں کے ساتھ بہشت جائیں گے تو ہمیں سے نہیں اٹھائیں گا۔ بہشت ہمارا مقصد ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں بلا خارج سے دخل قبول رہتے ہیں۔ دوسرا بولا کہ اگر ملک صالح دونوں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آگیا تو میں جوتوں سے اس کا سر لہولہان کر دوں گا۔ تیسرا سائح اس کی باتیں سنتا رہا۔ دوسرے دن ان درویشوں نے اپنے حضور طلب کیا۔ ان پر عنایات کی بارش برسائی ان کی رنجوری کی وجہ پوچھی۔ ان کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ پھر مسلمانے ہوئے لہجے میں آج آپ لوگوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرنا اور نوازش سے پیش آنا ہوں۔ آپ بھی جناب کے روز مجھ پر مہربانی کیجیے اور مجھ کو بہشت میں داخل ہونے سے نہ روکیے۔ اس روایت سے شیخ سعدی یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ دولت مندوں کو غریبوں کے حال سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے اور ساتھ ہی آپ نے یہ بھی دکھایا ہے کہ آج اس جہان کو جو فوجیوں کے راج میں مصیبت کی وجہ سے امیروں کی دولت وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے وہ کس طور پر روپے پیسے کی بارش برسا کر بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حکایت کے آخری چند شعر یہ ہیں ؎

رواں بر دو کس راہ دشوار و خوار — نہ ہیبت شکست و نہ حشمت نشاند
بریشاں بسے ربد باران چو در — دو شست شاں کرد دل از دو جو در
شہنشاہ زشادی چو گل بر شکفت — بخندید و در روئے درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور و خشم — زیچارگاں روئے در ہم کشم
من امروز لرد م و در صلح باز — تو فردا مکن و ر بر دیم فراز

سعدی اپنے ہمیں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے غیبت کرنے والوں پر نہایت لطیف طنز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب مجھے نازہ زہ کے مسائل لکھایا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے فرمایا کہ روزہ میں دوپہر چڑھنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان مسائل کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ گاؤں کا رئیس جو بہت بوڑھا ہو گیا ہے وہ اس مسئلہ سے ناواقف ہے۔ رئیس نے جب یہ سنا تو مولوی صاحب کو کہلا بھیجا ؎

نہ مسواک در روزہ گفتی خطا است　　بنی آدم مردہ خوردن رواست

یعنی تم نے یہ تو بتا دیا کہ روزے میں مسواک کرنا منع ہے لیکن مردہ گوشت کھانا (غیبت کرنا) کیسے جائز ہو گیا۔
غرض سعدی کے ہاں طنز اور ظرافت کے بے شمار نمونے موجود ہیں گلستان اور بوستان سے اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔

سعدی کے بعد سلمان ساوجی، ناصر بخاری اور اس زمانے کے دیگر شعراء میں بھی طنز و ہزل پائی جاتی ہے لیکن ان سب میں کوئی خاص بات نہیں نہ اس وقت ان کے دیوان موجود ہیں اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہوئے حافظ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حافظ شیرازی کو جو مقام فارسی شاعری میں حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایران اور فارسی زبان اب تک ان کے پایہ کا شاعر پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی شاعری سحر حلال ہے۔ ان کا میدان غزل ہے۔ غزلوں ہی میں انھوں نے دنیا بھر کی باتیں کہہ دی ہیں۔ ان کے ایک معاصر خواجہ عماد فقیہ تھے۔ انھوں نے ایک بلی پال رکھی تھی جب وہ نماز پڑھنے تو بلی بھی نماز کے انداز میں ساتھ جھکتی اور سر اٹھاتی حافظ نے اس زمانے میں ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا ؎

صوفی بجلوہ آمد و آغاز ناز کرد
بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں عماد فقیہ کی ریاکاری پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز
غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

علماء سوء اور واعظین کی پردہ دری بھی حافظ کا خاص موضوع ہے جس کی ابتدا خیام نے کی سعدی نے کچھ اور فروغ دیا مگر حافظ نے اسے شراب دو آتشہ کر دیا اور بڑی دلیری، بے باکی اور آزادی سے اس ریاکار گروہ پر چوٹیں کیں مثلاً ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
نیک بشکلے وارم زدانشمند محفل باز پرس　　توبہ فرماياں چرا خود توبہ کمتر می کنند
گو ریا و طنز می دارند روز داوری　　کیں ہمہ قلب و دغا در کار داوری کنند

غلام ہمت دردکشان یک رنگم　　نہ آں گروہ کہ ارزق لباس دل سیاہ اند

مے خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب　　بہتر ز طاعتے کہ بروئے ریا کنند

ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست　　نان حلال شبہہ ز آب حرام ما

سخن شیخ و حافظ و قاضی و محتسب — چوں یک بنگری ہمہ تزویر می کنند

سوئے یاراں لا بجولیف از نظر بازو لے — زاں ہمہ حافظِ سود از دہ مدام افتاد

رہ نشد چوں ہمہ ملک و شحنہ گزید — من ہم از مہ نگارے کلبۂ چیدہ شود

لیجئے اب اگر علامہ پر نیاز کی اصطلاح رائج ہے تو ہم کسی معشوق سے دل لگا لیں تو کیا مست ٹوٹ پڑے گی یا گورنمنٹ حکومت پبلسٹی سے بند ہے۔

حافظا نے نہ رہد رہی کہ دشوش باشد — وام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

کرم نمائی نہیں است کہ واعظ دارد — وائے گر در پس امروز بود فردائے

بنگ بنشاد و ملامت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندید حقیقت رہ افسانہ زدند

واعظ شہر کہ بر منبرش می خوانند — قول مانیز ہمی است گر او آور نیست

یعنی شہر کے واعظ کو لوگ فرشتہ سمجھتے ہیں، ہم انصافاً بھی یہی ہے۔ وہ آدمی نہیں ہے (پھر وہ کیا ہے؟ فرشتہ یا شیطان؟ یہ آپ خود فیصلہ کر لیں)۔

کسی اور شاعر نے یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

آدمی از خاک و سید از فرا است — آدمیت ز سیداں دور است

ز مسجد بخانات شد و عجیب مگیر — مجلس وعظ ما راست و زمان خواہد شد

اسی مضمون کو اردو زبان کے مشہور شاعر فانی بدایونی نے یوں ادا کیا ہے ؎

مجلس وعظ تا دیر رہے گی قائم — یہ ہے مے خانہ الٰہی کے چلے آتے ہیں

محتسب خم شکست و بندہ سرش — سنگ بالسن و الجرح قصاص

پدرم روضہ رضواں بدو گندم بفروخت — ناخلف باشم اگر من بجوئے نفروشم

حافظ کے بعد فارسی شاعری میں ایک سکون سا پیدا ہو گیا۔ ان کے بعد آنے والے شاعروں کی تقلید کرتے رہے مگر حافظ جیسی بات پیدا نہ ہوئی البتہ دو شاعروں نے ہزل، ہجو اور ظرافت کے میدانوں میں خوب جولانیاں دکھائیں۔ انھوں نے تحریف کو جسے پیروڈی کہتے ہیں اپنایا اور جو کچھ کہا انھی رنگ میں کہا۔

تحریف کی ابتدا عبید زاکانی سے ہوئی۔ اس نے اپنے زمانے کے اخلاقِ فاسدہ پر فقرے کسے اور بات سے بات پیدا کی۔ عبید زاکانی کے بعد پورے صدی بھر کے آغاز میں ابو اسحاق اطعمہ شیرازی پیدا ہوا۔ اس کی شاعری کا موضوع کھانا پینا ہے۔ طعام ہی کی رعایت سے اس نے اپنا تخلص اطعمہ اختیار کیا۔ اس نے اپنی تحریفات میں نہایت اچھوتے انداز میں پہلے شعرا اور صوفیا پر چوٹیں کی ہیں۔ اس کا کلام اکثر اور مثنیہ ہمراہ است کے خلصہ کے علاوہ ایک طلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ رضا قلی ہدایت لکھتا ہے کہ وہ شاہ نعمت اللہ ولی کا مرید تھا مگر اس کے ہم عصر کمال نے ان کے کلام کی بھی تحریف کی۔ شاہ نعمت اللہ کا مشہور قطعہ ہے ؎

گوہر بحر بیکراں مائیم — گاہ بہ بحیم گاہ در یائیم
ما بہ دیں آمدیم در دنیا — کہ خدا را بہ خلق بنمائیم

اطعمہ نے اس کی تحریف یوں کی ؎

رشتۂ لاک بہ نعمت مائیم — کہ بہ بحیم یہ گاہ بفزائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ — کہ بہ ما بیچ چلیسہ بنمائیم

جب یہ بزرگ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو رشتۂ لاک بہ نعمت ہے تو اس نے جواب دیا کہ جب میں اس قابل نہیں کہ اللہ کی باتیں کروں تو پھر میں نعمت اللہ (رزق) کی باتیں کیوں نہ کروں؟

بہر حال حالات کچھ ہوں خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اطعمہ میں روحانیت کی بلندی فکر نہ تھی یا وہ صوفیاء پر چوٹیں کرنی چاہتا ہو۔ اس کے کلام میں ظرافت اور طنز کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اس نے چھبیس کے قریب شعراء کے کلام کی پیروڈی کی ہے اور ایسے ایسے کھانوں کا ذکر کیا ہے جن سے ہمارا تو کیا موجودہ دور کے ایرانیوں کا کام و دہن بھی ناآشنا ہے۔ ہم اس کے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۴۶ء میں محمد داؤد رقم کا مضمون "فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصور" ملاحظہ فرمائیں۔

فردوسی رزمیہ نگاری کا بادشاہ ہے۔ اطعمہ نے فردوسی کے اسلوب کی تحریف کرتے ہوئے ایک "جنگ نامۂ عفر و بقرا" لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

بہ نام روان بخش روزی رساں — کہ رزق آفرین ست پیش از رواں
مرتب کن قوت قبل از وجود — پیا پے دہ لقمہ از خوان جود
خورانندۂ مرغ و ماہی و نان — رساننده دست ہا در دہاں
چنانش بہ روزی دہی اہتمام — بود از سر لطف و انعام عام
کہ چوں طفل آمد ز مادر پدید
عسل در دہاں دید و روغن بہ سر

حافظ	النسہ
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را	بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را	بخشم آرد آں ترکِ شیرازی دلِ ما را
حدیثِ از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو	زنِ غیر از لباسِ اہلِ تکمل کمتر پرس
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را	کہ کس نہ کشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

آزمودم بارہا چوں عجب	قاری آں دم کہ خجت نو پوشید
ہمہ بالم گواہ عصمت اوست	ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ	بر سر قبر غنی صوف و مریع فگنید
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود	کہ زیارت کہ حاجات بداں خواہد بود

نقطہ کی تقطیع اس طرح بھی ہوسکتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم	فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم
فگندہ طائرِ سدرہ دامِ حکمت در زمین و ما	فگندہ سایۂ طوبیٰ بر آبِ کوثر اندازیم
بیا تا رونقِ عہدِ شباب از سر گیریم باز	بہ جامِ زر مے چون لالہ در ساغر اندازیم
بیا تا طرحِ نو در میکدہ بنیاد کم و خود	بہ میخانہ بیا تا دلق را بہ گرو بسپاریم
بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم	بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم

پس آں کہ نقش بندِ صنع ازو داری	بر افق ہوا ایں خامۂ مشکیں
کہ از جنس دو گیتی و آستہ	بود زیرِ شماں اسما نہ بسمہ
ازیں نقشہائے کہ ما را بزیر	بندی کشوند ایں زماں بارگیر
نہ گیرند ازیں جملہ با خویشتن	دو نونی و یکتائی و پیرہن

طغرل چنیں گفت با جبل بہ راہ
کہ آمد کنوں نوبت پائے گاہ

اسی دور میں خواجہ حصمت بخاری نے گھوڑے کی ظریفانہ تصویر کھینچی کہ کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں جدت اور لطافت کے عناصر موجود ہیں۔ نظم بڑی جاندار ہے ؎

روزے بہ بارگاہِ سلیمانِ روزگار	رفتم کہ قبلہ بہ ازاں آستاں نبود

کردم ادا بمدح و ثنائیش قصیدۂ — کاں نوح در بہ مخزن آخر نہاں نبود
اے بے کرم نمود کہ از جنس وحش و طیر — چوں او ضعیف جانورے میہماں نبود
اے کہ چوں کماں شکستہ نہ جود او — سر تا قدم بغیر پے و استخواں نبود
از بسکہ گشتہ بود ز غمخوارگی چو موم — ہیچ احتیاج قالب او را بجاں نبود
لب باکشاد و شکر کہ بدنداں نظر کنم — چیزے چو آب در تہ آتش اندراں نبود
گفتم دریں زمانہ بدد سر کہ آمدے — گفتند آں زماں کہ آدم و عالم نشاں نبود
ناگاہش از وزیدن بادے حیات شکست — بیچارہ را تحمل بار گراں نبود
چوں عاقبت براہ عدم رفت عقل گفت — ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

دو رنگ صفحہ میں ہجو کی خوب گرم بازاری رہی۔ اس دور کے بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جن کا دامن اس خار زار میں نہ الجھا ہو مگر ان کی ہجو یات الذ فحش کی سرحدیں پھاند جاتی ہیں۔ حکیم شفائی نہایت فاضل اور متین شخصیت تھے مگر وہ بھی اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں۔ البتہ ہنۂ مستحان میں آں باربد کی سرپرستی میں جو ادب پیدا ہوا اس میں فحاشی بہت کم ہے۔ سودا نے گھوڑے اور شمال کی ہجو لکھی ہے مگر کیا مجال کہ اس میں کوئی فحش بات ہو۔ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوا۔ کچھ مخلص اور غیر مخلص دوست اس کی بیمار پرسی کے لیے آئے۔ ممانعین جس انداز سے اس کی عیادت کرنے گئے اس سے عوامی کو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اس نے ایک قطعہ میں یہ سارا واقعہ بیان کرتے ہوئے ان کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ قصہ بہ ہدایت معدہ اور اکائی فت سے پاک ہے مگر اس وقت کلام سامنے نہیں۔

شیدا فتح آبادی نے ہجو گوئی اور طنز نگاری کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ اس نے قدسی کے ایک قصیدہ پر اصلاحات کیے۔ انھیں نظم میں بیان کیا اور کہیں کہیں پھبتیاں بھی کسیں مگر یہ پھبتیاں بھی ایسی ہیں کہ ان پر اخلاق کے نقطۂ نظر سے حرف گیری نہیں ہو سکتی مثلاً ؎

اے سخن سنج ہنرمند بیا تا بشنیج — نقد بہ حرف سہ یا دو بلے کمرہ کاست
نالہ در سینہ ہوا میست کہ بے قصد رود — ہر کہ از سینہ ہوا گیہ شد از جنس ہواست
عالم از وے بشود تنگ و لیکن ز ملال — خلق عالم گر از و تنگ نشینند بجاست
خود گر آخر کہ جہاں تنگ شد از نالۂ تو — کہ ز تنگی نہ از چشم نیارد نماست
نیست ترتیب وہ اصراع ہم رابطہ پدر — کہ سیاق سخن از سر و بالا بشد جداست
تنگی عالم از نالہ نہ کیمیت راست — کہ جہاں تنگ زانده شده بر و اماست
تنگی جا ز کجا تنگی اندوہ کجا — بیشتر از تن و جاں تفرقہ ہم پیداست

یہ اصلاحات قدسی کے اس شعر پر ہیں ؎

عالم از نالۂ من بے تو چناں تنگ فضاست
کہ پسند از سر آتش نتواند برخاست

طالب آملی کی ہجو میں شیدا کہتا ہے ۔

شب و روز محنت مرا طالبا — سپہ جیفہ و نیوی و رتبت است
نگر تا چہ پیش آرش یاد نیست — کہ دنیا ست مردار طالب مثال است

اس دور میں نعمت خان عالی جیسا بڑا ہزل گو پیدا ہوا ۔ وہ ہجویات و طنزیات میں بڑا بلند مقام رکھتا ہے ۔ وقائع نعمت خان عالی اس کا شاہکار ہے ۔ اس کی طنزیات میں ہجو، طنز اور قہقہات کے بڑے ذخیرے مل سکتے ہیں ۔ نعمت خان عالی پر ایک علیحدہ مضمون میں انصاف ہو سکتا ہے ۔ اس کی شخصیت عجیب و غریب اور کافی مجروح تھی ۔

نعمت خان عالی کے زمانے میں چند ہزل گو اور مراثی پیدا ہوئے ۔ ہزل و طنز کی طبیعات تخریب اور ہجو سے بھری پڑی ہے وہ لفظوں کے ذریعہ سے اپنے کلام میں طرافت پیدا کرتا ہے اور ایسا اوقات ہندی الفاظ فارسی کلام میں استعمال کر کے شعر کو زعفران زار بنا دیتا ہے ۔ جیسے ۔

کشتنی جعفر ولی در لکھنور افتادہ است
ڈلیو ڈلیو می کند اے بابت تو نبہ یار کون

یا اس کا یہ رجز ۔

منم آں رستمِ وقت روئیں تنم — زدہ پا پڑ از مشت خود بشکنم
اگر روز رن اندر آیم بہ تیر — بر آرم دمار از سد و ز تیر
کشم گرز ہشت را در کمند — عدد چند را من در آرم بہ بند
بچوشم اگر جوشن جنگ را — بہ بینت دہم پہلوے لنگ را
بہ صد حملہ بال مگس بشکنم — فطار دو صد مور بر ہم زنم
اگر بر زنم نیشب در دال بھات — فند ہیبت و خوف من در حیات
دریں دور ثانی رستم منم — بتاسا بہ گیر گراں بشکنم
بہ ہنگام خشم و تردد ملاش — کنم غرق اگشت در دال ماش
من آں شہسوارم کہ روز نبرد — بر آرم بہ یکشت از پنبہ گرد
چناں بشکنم رشتہ خام را — کہ سازم خجل رستم و سام را

من آنم کہ گر اسپ ہولاں کنم
پہل خانہ موش ویراں کنم

طنز و ظرافت کے سلسلے میں قاآنی شیرازی کا ذکر نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی ۔ وہ دورِ قاچار کا ایک نامور عالم اور ایک نادر الکلام شاعر ہے

اس کے کلام میں جو سلاست، روانی اور برجستگی ہے وہ بہت کم شعراء کو نصیب ہوئی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑا واقعہ اس اندازِ اور بے تکلفی سے کہتا ہے جیسے وہ بے تکلف دوست بیٹھے کچی باتیں کر رہے ہیں۔ "پریشان" اس نے گلستان کے جواب میں لکھی۔ اس کے مطالعہ سے اس وقت کے بگڑتے ہوئے معاشرے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس میں طنز و ظرافت کے نمونے ملتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ اس کا بیشتر حصہ فحش ہے اور اس قابل نہیں کہ اسے یہاں نقل کیا جائے۔

خاقانی نے قصاید میں جا بجا سفر کشی کی ہے۔ کہیں بہار و خزاں کے نقشے ہیں، کہیں ایرانی حمام کا ذکر ہے اور کہیں واعظوں پر چوٹیں ہیں۔ کہیں عشق و عاشقی کی بزم آرائی ہے اور کہیں دیگر واقعات بیان کیے ہیں۔ ان سب میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ظرافت کے ہلکے ہلکے چھینٹے بھی ہیں۔ اس کی ایک بڑی مشہور نظم ہے جس میں اس نے ایک بھلے بوڑھے اور بھلے لڑکے کی باہمی پُر لطف گفتگو کا چربہ اتارا ہے۔ یہ نظم خاقانی کی قادر الکلامی کا بہترین نمونہ ہے۔ اسے پڑھتے پڑھتے انسان خود بہکلانے لگتا ہے۔ وہ نظم یہ ہے۔ ؎

پیر کے لال سحر گاہ بطفلے الکن — می شنیدم کہ بدیں نوع ہمی راند سخن
کے ز زلفت مصصصبو شاشاشام تاریک — وے ز چہرت شاشاشام مصصبح روشن
تتتتر یا کیم و بے شششہد للبت — مصصبوحا تاتا تابم رر رفت از تتتن!
طفل گفتا ممی را تتو تطلیب مکن — گگلم شوز برم اے گلکتہ از زن
ممیوا ہی مشتی بکلکت بزم — کہ بچفتند ممغرت ممیان دو دہن
پیر گفتا و وداللہ کہ معلوم است ایں — کہ کہ زادم من بیچارہ ز مادر الکن
ہہفتاد و ہشتاد و سہ سال است فزوں — گگنگنگ ہ لالا لام بجز اتاق زمن
طفل گفتا تخدا را مصصصدبار بشستگہ — کہ برستم بجہاں از مل لال و ممن!

ممن ہم گگلم ممثل تو تو تو
تو تو تو ہم گگلکتگی ممثل ممن

ایران میں ہجو نگاری کا نیا انداز دورِ جدید میں پیدا ہوا۔ جدید شعراء نے سیاسیات اور ملفوظات کو موضوع بنا کر بڑی بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں۔ کہیں کہیں وہ انہی موضوعات پر ظریفانہ انداز میں معاشرے کی کمزوریوں کو زیرِ بحث لے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سید اشرف الدین نسیم شمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ جدید فارسی میں وہی مقام رکھتے ہیں جو اردو زبان میں حضرت اکبر الہ آبادی کو حاصل ہے۔ ان کے کلام میں ایک نظم "خطاب بہ فرنگیاں" ہے، اس میں وہ مسلمانوں کے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پر طنز کرتے اور فرنگیوں کی عملی زندگی سے سبق لینے کی تلقین کرتے ہیں ؎

اے فرنگی ما مسلمانیم جنت مالِ ماست!
در قیامت حور و غلماں نازِ نعمت مالِ ماست

اے فرنگی اتفاق و علم و صنعت مالِ تو — عدل و قانون و مساوات و عدالت مالِ تو
نقلِ عالمگیری و جنگ و جلادت مالِ تو — حرص و بخل و کینہ و بغض و عداوت مالِ ماست

خوا... راجہ... بجنس بجوئہ... بازنیم... مالِ ماست

اے فرنگی از شما باد آں سمارات فشنگ — افتتاح کارخانہ اختراعات فشنگ
باد او پر تخم پیر کردن آں حیوانات فشنگ — جملہ ہمچو شورہ خوعا فحش و تہمت مالِ ماست
خواب راحت عیش و عشرت نازِ نعمت مالِ ماست

گر ترا بے سیم از دریا بساحل تکذاف — گر گمی خلق خوا مانون و سیمیا فوگراف
ور نمانی بہ خور از اطلس و مخمل لحاف — سندس و استبرق از رباغ جنت مالِ ماست
خواب راحت عیش و عشرت نازِ نعمت مالِ ماست

اے فرنگی گشتی تہمتگی دریائی زتو — راہ آہن علم طے الارض تحدانی زتو
در ہوا بازو در زبلیں عکسی پیمائی زتو — در زمیں بیجا بی جہل و خلاکت مالِ ماست
انتہا راحت خواب راحت عیش و عشرت مالِ ماست

انتہا ہائے ہمہ علم و صنعت زان تو — از زمیں بر آسماں رفتن زہمت زان تو
مکتب و قانون یہ اطفال ملت زان تو — غوطہ خوردن اندریا بیشے ذلت مالِ ماست
خواب راحت راحت عیش و عشرت مالِ ماست

تشیع عبد اضاد از ما سست فعلی از ما بود — مالک از ما سہیل از ما یاقی از ما بود
بومنیفہ بوسہ یہ اقعی از ما بود — اختلاف اعتقادات جماعت مالِ ماست
خواب راحت استراحت نازِ نعمت مالِ ماست

سنجی از ما بابل از ما پطرو ما پلیون زتو — دہلی از ما صوفی از ما مکتب و قانون زتو
نوحہ و ماتم از ما شیون و بالون زتو — لہ شولہ آہ و فغاں و بازار زتو حقیقت مالِ ماست
حور و غلماں باغ رضواں بیشت و عشرت مالِ ماست

آں شنیدستم حسین کربلا جنگ نبود — شہر رواں از اصفہاں ہندوستاں افغاں کرد
در فلستان کہا دا دو چنیں شیراں دو — بیکہ کور زبل با آں شجاعت مالِ ماست
خواب راحت استراحت نازِ نعمت مالِ ماست

گرچہ دہلی و ہمسایہ مسلمانیم ما — منکر حق نہ شمردہ بیں غافل زرہ زمحشریم
مال مردم خوردن را چوں شیر مادر می خورد — باد زیراں نفلوئے رہ و ملوت مالِ ماست
باغ رضواں حور و غلماں نازِ نعمت مالِ ماست

ذیل میں میرزا غلام رضا خاں رضا قاجار کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے تحریف کے علاوہ بعض نہایت عمدہ ظریفانہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً وہ اہل ایران کی کاہلی کے بارے میں کہتا ہے ؎

اروپائی اگر از صفر شاک — روبا آسماں سپیا باطلاک

ا۔ و اگر نیست ایرانی کہ دائم — کند سیخ کباب با چس و تریاک
ز حال المحشور ایراں چہ گویم — چہ می پرسی ازیں وضع اسفناک
تو کش را بود خونابہ و دل — سنگر را بود ورثیشہ کپناک
زند بغلس بسہ از دست منعم — کند زارع فغاں از ظلم ہلاکو
فغانی از و رنش کاویاں نیست — کہ گیرد داد مظلوماں ز ضحاک
آغاثی در سرائے کشور جم — نماند از غارت دزدان چالاک
ندائے از تجسس شیخ وزاہد — چہ وقت ایں داغ رسوائی شود چاک
سخن از فضل و دانش پند کوتی — بجو مہ بے خبر از عقل و ادراک

لب از گفتار روحانی فرو بند
دہانت را بزن مہر و بکن لاف

اہل ایران میں افیون خوری کی عادت عام تھی۔ روحانی نے اس سے لاف آمادہ کی اور اپنے ظرافیانہ انداز میں کہا ہے

مرد میزار خماری ہمشیہ گاں حسنہ را — از یک دو لب شیرہ مازید فشہ مارا
او روزہ مہ کرد ول انسانہ ایسنا اصول — نرمیں بجائے افیوں تزریق سازیارا
آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است — باشیرہ مویت با الکلی مدارا
قلیان چرس بر کش آنگہ سکندری خور — تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا
من مست بودم از مے کردم بدانست قتے — اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا
از دوغ وحدت ما گر چہ ترش شدند — در عبدہ حالت آرد زندان باصفارا
چوں لبت گندہ بستی فوری بدن دورستی — کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا
مارا قضا کشانید پائے بداغ شیرہ — گر تو نمی پسندی تغیر دہ قضارا
۔ تے منعی کہ داری در خانہ چرس وافیوں — روزے تفقدی کن درویش بے نوارا
افیونیان برنا بخشندگان عمرانند — ساقی بشارتے دہ پیران پارسارا
چوں شد بشیرہ معتاد لاغر شود چو موئی — دلبر کہ در کف او موم است سنگ خارا
دوشینہ ماحسن لات تقبیم در خرابات — باشد کہ باز بینم دیدار آشنارا
رندی بہ آہ و زاری مجواند در خماری — لات الصبوح و تیوا یا ایہا السکارا
در وقت خماری کیفیت نگاری — الشفہ نا و اعلی من قبلۃ العذارا
رندی بیار گندم پنہاں نمود تریاک — در وا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
آں بار را مفشل بر دو کہ تو قیف — چوں بہر کشف قاچاق می گشت بارہا

نالۂ وشبہ و صد بار دست خوشتہ
از بہر سی روہ عالم تر بالی کدارا

اہل ایران کی جھ بلو زندگی طالب خوش رنگ خط اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

شب جدائی ست و فراق یار زبان نمی شنم — داد از دست زنم
اوست بفکر من و من فکر ملال و محنم — داد از دست زنم
ہمہ کسب تازہ من خواہد و نہ رسد و وال[2] — مدہ و ذم[3] امسال
زور نہ شکم ادبیا دیہ نقبائے پہ تنم — داد از دست زنم
ایوہ امر پارہ شدہ ہیں زن بدتر از دیو — کفش خواہد از کیو
من ہمہ جا ذن آقا و نہ حاجی جنم — داد از دست زنم
بہ گئے من ماذہ چو خود رمل روان گشتہ بر پشیں — او بفکر فرخویش
بوی بر مطبخی حسہ کہ بر لقمہ بزد — داد از دست زنم
شد مدہای باصہ بیہ ز شکلش امد و ز رنگش — رخت تو کردہ تنش
من ذا کہ ز زن باصہ بہ و ز شکنم — داد از دست زنم
امدت بہ بہ بہ طلسم تو طلسمیں بعد — یا رسیں بعد
افتش ار بہ کس لات ترا مد و زنم — داد از دست زنم
امدت اگر پول نداری و چپ ہستی زندہ — من شدم مشرمندہ
گفتش زندہ از امد لباس شد لقمہ — داد از دست زنم
مد از دست زد حوصلہ ام تنگ شدہ — کدام سنگ شدہ
میلنم پارہ ز دستش پختہ بہ بہ ہم — داد از دست زنم
گفتہ بودم کہ نگیر مرزن نا کردہ پیر — پدرم گفت بگیر
گفتم این اقد بزرگ است برائے دہنم — داد از دست زنم
خواست جواب فرستگی کہ بہ اہیش خورم — بنود سیم و زرم
وطنی گر بہ منم دور کند از وطنم — داد از دست زنم
سہ جواب کرم مہد کہ برپا کردیم — سبک و دو اگر دیم
گوئے من کند واقف افکند بریش بہم — داد از دست زنم
گشت از خانۂ ما شیون و فریاد بلند — داد و بیداد بلند
مشت زور بر دہنم آخ دہنم واخ دہنم — داد از دست زنم

---

[1] انواع و اقسام پارچہ جات [2] وضع و اسلوب [3] شکل و ترتیب

ملک الشعراء مرزا محمد تقی بہار مشہدی جدید ایران کے زبردست انقلابی شاعر ہیں۔ آپ کا دیوان ۲۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں قصاید، غزلیات، مثنویات، رباعیات و قطعات سب موجود ہیں۔ آپ نے ایک نظم "گل" (کیکٹس) کے بیان میں لکھی ہے۔ اس نظم نے زمانے کی توجہ مشہد کی صفائی کی طرف دلائی ہے نظم کا انداز پیرایہ ملاحظہ ہے اور ہر شعر بلدیہ کے لیے تیر و نشتر ہے۔

افتاد ما یم سخت بدامن بلائے گل — یارب چو ما مباد کسے مبتلائے گل
گل مشکلے شدہ است بہر معبر و طریق — گام رونگان شدہ مشکل گشائے گل
ہر گہ کہ ابر چمبہ زند در فضائے شہر — بر بام ہر سرائے بر آید لوائے گل
گل دل نمی کند بجز احسان و اہل او — اے جان اہل شہر ندانے وفائے گل
گر صد ہزار کفش بدرد پائے خلق — ہرگز نمی رسند بہ شعب عطائے گل
با خصہ اگر دوند بہ ظلمات کوچہ خلق — اسکندری خورند دریں جستجائے گل
اوّل قدم کہ بوسہ زند گل بپائے ما — رفتیم بر زمین و بہ سیم پائے گل
گل با ثقیل و درہم و کوچہ خراب و تنگ — آہ از جفائے کوچہ و داد از جفائے گل
گل ہر چہ را بہ پچر در آورد دل نکرد — صد آفریں بہ پنجۂ معجزہ نمائے گل
از گل ز بس کہ خاطر دل ما فسردہ است — گل نیز بعد ازیں نہ دہد از فضائے گل
بر روزگار خویش کنم گریہ یا دار — چوں بنگرم بکندۂ ویراں نمائے گل
از پشت نامہ شانہ و از پیش نامہ ریش — ہستند خلق یکسرہ غرق عطائے گل
امروز در قلوب و لوس از بلند و پست — آنجا کہ کجاست کہ نمائی ست جائے گل
آید اگر جماز زدہ پوشش ز انگلیند — حیراں شود ز مجلب بے منتہائے گل
گر کالای وکل تمام نگردد ازیں بلد — اہل بلد تمام بماند لائے گل

شرم آید مرد گفتی بسیار و رنہ باز
چندیں ہزار مسئلہ باشد ورائے گل

جدید شعراء میں اور بھی کئی ایسے ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر اس وقت ان کا کلام سامنے نہیں۔ اس لیے مجبوراً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ورنہ ان میں بعض بڑے کام کی چیزیں ہیں جن میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔

جدید فارسی شاعری میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ آج کل زمانے کا ایرانی اس قدر وطن پرست بن چکا ہے کہ وہ ایران ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور ایرانی عصبیت کا شکار ہو کر ایران کے قدیم مشاہیر کی عظمت کے ترانے گاتا ہے۔ قدیم ایران کے مذہبی رجحانوں کے ساتھ رشتے جوڑتا ہے۔ کہیں وہ خاکِ ایران کے عنوان پر نظم لکھتا ہے اور آوسنہ اور ایرانی آنسکلدوں کے مٹ جانے پر آنسو بہاتا ہے اور بسا اوقات اعتدال کی حد سے تجاوز کر کے عربوں کی ہجو پر اتر آتا ہے۔ مثلاً

فرخ خواسانی ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

یا رب دب، باد و دیار عرب، باد

ایں مرض شوم و مرض دور از ادب باد

[illegible]

ہم لعنت بر عذاب و عذاب و غضب باد

ما چین و عراق بہ جاے عرب افتاد

نجد و حجاز و تہامہ چو حلب باد

یہ ایران کی نوابادیاتی شاعری کا نمونہ ہے جو بڑی حد تک ہندوستان میں بھی رائج ہے۔ ان شاعروں کا یہاں اجمالاً ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس خطے میں کہ اس پر کچھ لکھا جائے۔ پھر یہ بھی معلوم ہو کہ فارسی زبان کے لہ و مزاج کی عظمت کا پتہ چل سکتا ہے۔

(انگریزی)

بروبڈنگ نیگ کا سفر

مصنفہ:- جوناتھن سوئفٹ

مترجم:- شاہد احمد دہلوی

دوسرا باب

کسان کی لڑکی کا بیان۔ مصنف کو منڈی والے شہر لیجایا جاتا

ہے اور پھر اچھالتی ہیں۔ اس کے سفر کے حالات۔

میری مالک کی ایک اٹھ کی نو سال کی تھی، یہ بچی اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار تھی، سوئی کا کام، سینا پرونا، اور اپنے بچے کے کپڑے پہنانے میں نہایت ہوشیار۔ میرے رات کو سونے کے لئے ماں بیٹی نے بچے کا ایک پالنا جوڑ جاڑ کر ٹھیک کر دیا۔ ایک الماری کے چھوٹے خانے میں اس پالنے کو رکھ دیا، اور چوہوں کے ڈر سے اس خانے کو ایک چھینکے پر رکھ دیا۔ چند نہ عرصے میں ان لوگوں کے ہاں رہا۔ میرا بستر تھا، اور جیسے جیسے میں ان کی زبان سیکھتا گیا اور اپنی ضروریات انھیں بتاتا گیا میرا بستر زیادہ آرام دہ ہوتا گیا۔ یہ کم عمر لڑکی اس قدر تیز دست تھی کہ مجھے دو ایک دفعہ کپڑے اتارتے دیکھ کر خود ہی مجھے کپڑے پہنانے اور اتارنے لگی، حالانکہ میں نے اس کام کی اسے زحمت نہیں دی تھی اور خود ہی اپنے کپڑے پہنتا اور اتارتا تھا۔ اس نے مجھے سات قمیصیں بنا کر دیں اور سوتی کپڑے کی چند اور چیزیں بھی۔ یہ کپڑا وہ باریک سے باریک دیکھ کر لائی تھی، مگر دراصل یہ بات سے بھی زیادہ موٹا تھا۔ اور میرے یہ کپڑے ایک سال اپنے ہاتھوں سے دھوئے جاتی تھی۔ ساتھ کے ساتھ وہ میری اتالیق بھی تھی اور مجھے اپنی زبان سکھایا کرتی۔ جب میں کسی چیز کی طرف اشارہ کرتا تو اس کا نام اپنی زبان میں بچے بتاتی۔ بہت تھوڑے ہی دنوں میں مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی نام لے کر مانگنے لگا۔ یہ لڑکی بڑی اچھی طبیعت کی تھی، اور چالیس فٹ سے زیادہ اس کا قد نہیں تھا، جو عمر کے لحاظ سے کم تھا۔ اس نے میرا نام گرل ڈریگ رکھا۔ گھر بھر میں میرا یہی نام پڑ گیا اور پھر ساری مملکت میں بھی یہی مشہور ہو گیا۔ اس لفظ کے معنی وہی ہیں جو لاطینی میں فانن کیولس کے، اطالوی میں ہومن سی لیٹینو کے اور انگریزی میں انسانچہ کے۔ اس ملک میں میری حفاظت بیشتر اسی لڑکی نے کی، جب تک میں وہاں رہا ہم دونوں کبھی جدا نہیں ہوئے۔ میں اسے اپنی گلم ڈل کلاچ یا چھوٹی دوا کہا کرتا تھا۔ اگر میں اس کی توجہ اور محبت کا تذکرہ اعزاز کے ساتھ نہ کروں تو میں ایک بڑی احسان ناشناسی کا خطاوار ہوں گا۔ کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ اس کا صلہ اسے دے سکتا، جس کی وہ مستحق تھی، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے بجائے میں نادانستہ طور پر اس کی بدنامی اور افسوس ناک ذریعہ بنا۔

اب پاس پڑوس میں پوچھ ہونے لگا کہ میرے آقا کو کھیت میں سے ایک عجیب جانور ملا ہے، قد و قامت میں سپلک بک کے برابر، لیکن سارے اعضا انسانوں جیسے، اور تمام کاموں میں انسانوں ہی کی نقل کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنی زبان بھی بولتا ہے، ہمارے بھی کئی لفظ سیکھ گیا ہے۔ دو پاؤں پر چلتا ہے، مسکین ہے اور ہل گیا ہے۔ چلنے سے آجاتا ہے، حکم کی تعمیل کرتا ہے، ہاتھ پاؤں بڑے سلیقہ دار ہیں، خوشنما۔ تنگ کسی جانور کی سر سے لڑکی سے زیادہ ہلکا۔ ایک کاشتکار جو قریب ہی رہتا تھا اور میرے آقا کا خاص دوست تھا اس کہانی کی تصدیق کرنے کے لئے آیا۔ مجھے نورا لاکر ایک میز پر رکھ دیا گیا، میں حسب الحکم چلتا پھرتا رہا، اپنا نمونہ سنت کر دکھایا اور اسے پھر نیا بنایا، اپنے آقا کے مہمان کی خدمت میں آداب بجالایا، اس کی زبان میں مزاج پرسی کی، اسے خوش آمدید کہا، بالکل اسی طرح جس طرح میری عمر کی دوسرے مجھے بتاتا تھا یہ شخص بڈھا تھا اور اسے دھندلا نظر آتا تھا۔ مجھے اچھی طرح دیکھنے کے لئے اس نے اپنی عینک لگائی، اس پر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور خوب ہنسا، کیونکہ اس کی آنکھیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے کسی مکرے کی دو کھڑکیوں میں سے دو پورا چاند مٹھی بھائیں مار رہے ہوں۔ میرے گھر کے لوگوں نے میری ہنسی کی وجہ کو تاڑ لیا اور لگے میرے ساتھ ہنسنے۔ اس پر کم عقلی سے وہ بڈھا خفا ہو گیا اور ساتھ بگڑ گیا۔ وہ تو اچھا خاصا آدمی تھا اور اس مضحکہ کا سزاوار تھا، اس وجہ سے بھی کہ اس نے میری بدنصیبی دیکھئے، میرے آقا کو مشورہ دیا کہ بڑے شہر میں جب بازار لگے تو وہاں میری نمائش کرے۔ گھوڑے پر وہاں جانے میں آدھ گھنٹہ لگتا تھا۔ کوئی دو سو میں میں کافاصلہ ہو گا ہمارے گھر سے۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے آقا اور اس کے دوست میں سرگوشیاں ہوئے چلی جا رہی ہیں اور کبھی کبھی میری طرف اشارہ بھی کیا جاتا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا، اور میرے اندیشوں نے مجھے سمجھا یا کہ میں نے ان کے چند الفاظ سن لئے ہیں اور سمجھ لئے ہیں۔ ایک دن پہلے کو میری بھولی دوست ظالم دل لڑکی نے میرا ماجرہ مجھ سے بیان کیا۔ اس نے اپنی بھالاکی سے پوری بات اپنی ماں سے پوچھ لی تھی۔ بچاری لڑکی نے مجھے اپنے سینے پر لٹا لیا اور مارے شرم اور رنج کے رونے لگی۔ اسے روتا کہہ کر وہ اور جاہل لوگوں سے مجھے دکھ پہنچے گا۔ وہ شاید مٹھی میں بھینچ کر میرے دم ہی نکال دیں، یا ان کے ہاتھوں میں پڑ جانے کے بعد میرا کوئی ہاتھ پاؤں ہی نہ ٹوٹ جائے۔ اس نے خوب جانچ لیا تھا کہ میں اغرنا کس قدر شرمیلا ہوں، اپنی عزت کا مجھے کتنا پاس ہے۔ اور جب کٹھیا سے گھٹیا لوگوں کے سامنے پیسے کمانے کی غرض سے مجھے تماشہ بنایا جائے گا تو میں کس قدر پیچ و تاب کھاؤں گا۔ اس نے کہا "ابی آورامی" نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گرل فرینڈ تمہارا ہو گا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے مجھ سے وہی چال چلی جو پچھلے سال چلی تھی کہ بیئر کا پیچ مجھے دینے کا وعدہ کیا مگر جب وہ خوب موٹا تازہ ہو گیا تو اسے قصائی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے متعلق اتنا پریشان نہیں تھا جتنی چھوٹی دوا میرے لئے پریشان تھی۔ مجھے ہمیشہ پکی امید رہی کہ ایک نہ ایک دن مجھے دوبارہ آزادی مل جائے گی۔ رہی یہ دقت کہ مجھے ایک عجوبہ بنا کر جگہ جگہ میری نمائش کی جائے۔ تو میں اس ملک میں بالکل اجنبی تھا، اور اگر میں کبھی انگلستان واپس پہنچ سکا تو میری اس بدنصیبی کو میری کوتاہی قرار دے کر مجھے متہم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ اگر میرے بدنصیب عقلی کا بادشاہ خود بھی ہوتا تو ان حالات میں اسے بھی اسی اذیت سے گزرنا پڑتا۔

میرے آقا نے اپنے دوست کے مشورے کے مطابق مجھے ایک بکس میں رکھا اور بازار لگنے والے دن پڑوسی شہر کو لے چلا۔ اپنے پیچھے کا بھی پرانا بیٹی میری چھوٹی دوا کو بٹھا لیا۔ بکس چاروں طرف سے بند تھا، میرے اندر جانے اور باہر نکلنے کے لئے اس میں ایک دروازہ تھا، اور برے کے چند سوراخ ہوا کے لئے تھے۔ لڑکی نے اتنی احتیاط برتی کہ اس میں اپنے بچے کا تکیہ بچھا دیا تاکہ میں اس پر پڑا رہوں۔ یہ سفر اگرچہ صرف آدھ گھنٹے کا تھا لیکن میری جوال چل گئی، کیونکہ گھوڑا ایک قدم میں کوئی چالیس فٹ نکل جاتا اور دولکی چلنے میں آسانی اونچا اچھلتا کہ اس کا

زیر جامہ اس جہاز کی طرح ہوتا ہے جو بڑے طوفان میں پھنس گیا ہو، مگر جھکولے اس سے کہیں زیادہ لگ رہے تھے۔ یہ سفر لندن سے سینٹ ایلبانز کے خاصے کم زیادہ فاصلہ تھا۔ لاستہ میں میرا آقا ایک سرائے میں اتر گیا، اس میں وہ اکثر آتا رہتا تھا۔ سرائے والے سے کچھ دیر مشورہ کرنے کے بعد اور کچھ مزدوری تیاری سے فارغ ہو کر اس نے ایک گرل تر دیا متاد کو اجرت پر اپنے ساتھ لیا۔ اکر شہر میں منادی کرتا چلے کہ ایک عجیب و غریب مخلوق میز شاہ میں کی سرائے میں دیکھی جا سکتی ہے، اس کا قد زیادہ سے سہلاک تک جتنا ہے، اس ملک کا ایک خوش و ضع جانور جس کا طول تقریباً چھ فٹ ہوتا ہے، اور اس کے سارے اعضا انسانوں جیسے ہیں۔ کئی لفظ بول سکتا ہے اور ایک سو تفریحی کرتب دکھاتا ہے۔

سرائے کے سب سے بڑے کمرے میں مجھے ایک میز پر رکھ دیا گیا جس کا رقبہ کوئی تین سو مربع فٹ ہوگا۔ میز کے قریب ایک نیچے سٹول پر میری چھوٹی دادکھڑی ہو گئی تاکہ میری حفاظت کرے اور نباتی جائے کہ میں کیا کروں۔ میرا بچوں کے سے بچنے کے لئے میرے آقا نے صرف تیس آدمیوں کو بیک وقت میں اندر آکر مجھے دیکھنے دیا۔ لڑکی کے حکم کے مطابق میں میز پر چلتا رہا۔ اس نے مجھ سے ایسے سوال پوچھے جنھیں وہ جانتی تھی کہ میں ان کی زبان میں سمجھ لوں گا، اور میں پوری آواز سے ان کے جواب دیتا رہا۔ بار بار میں تماشائیوں کی طرف دیکھتا اور آداب بجالاتا، ان کا خیر مقدم کرتا اور جو فقرے مجھے سکھائے گئے تھے ان کے سامنے کہتا۔ میں نے شراب سے بھرا ہوا ایک انگشتانہ اٹھایا، جو گلوم ڈل کلیچ نے مجھے پینے کو دیا تھا، اور تماشائیوں کا جام صحت نوش کیا۔ میں نے اپنا بیچ کھینچ لیا اور انگلستان کے نیلوار بازوں کی طرح ہاتھ دکھانے لگا۔ پھر ٹی دوا نے مجھے گلے کا ایک ٹکڑا دیا، اور میں نے اس سے بہتر سے کے کمالات دکھائے، میں نے جوانی میں انھیں سیکھا تھا۔ اس دن بارہ ٹکڑیوں کو میرا تماشہ دکھایا گیا، اور اتنی ہی بار مجھے بجوڑ ڈل کلیچ دکھانے پڑے، جن سے تنگ آکر اور تھک کر میں نیم جان ہو گیا۔ کیونکہ جنھوں نے مجھے دیکھا انھوں نے ایسے عجیب و غریب بیان دینے کہ اندر آنے کے لئے لوگ دروازے توڑے ڈال رہے تھے۔ میرے آقا نے اپنے بھلے کیلئے سوائے چھوٹی دادکے کسی اور کو مجھے چھونے نہیں دیا، اور میز کے چاروں طرف نہیں، اتنے فاصلے سے نگرانی کہ مجھ تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے لیکن ایک شریر اسکول کے لڑکے نے ایک ہیزل کی ڈنڈی میرے سر کو تاک کر ماری مگر میں بال بال بچ گیا، ورنہ وہ اس قدر زور سے آئی تھی کہ یقیناً شبہ میرا مغز بھاڑ دیتی، کیونکہ وہ چھوٹے میٹھے کھیلنے کے برابر تھی۔ مگر مجھے بڑی ملامت ہوئی یہ دیکھ کر اس شیطان کی خوب ٹھنگائی ہوئی اور اسے باہر نکال دیا گیا۔

میرے آقا نے منادی کرادی کہ اب میری نمائش اگلے ہفتہ کے دن ہوگی۔ اس وقفہ میں اس نے میرے لئے ایک زیادہ آرام دہ بکس تیار کیا، اس کی ضرورت کا اس اس نے خود بھی کر لیا تھا، کیونکہ پہلے سفر میں میں اس قدر تھک گیا تھا اور مسلسل آٹھ گھنٹے تماشائیوں کو خوش کرنے میں میرا جسم اتنا چڑچڑا ہو گیا تھا کہ مجھ سے نہ تو اپنے پیروں پر کھڑا ہوا جاتا تھا اور نہ ایک لفظ میرے منہ سے نکلتا تھا۔ تین دن میں کہیں جا کر میں سانس لینا ہوا۔ مگر گھر پر بھی مجھے آرام نہ مل سکا، کیونکہ سوسویل کے قریب بسنے والے شرفا نے میری شہرت سن کر مجھے دیکھنے میرے آقا کے گھر آنا شروع کر دیا۔ تیس آدمیوں سے کم نہیں ہوں گے جو اپنے بیوی بچے لے کر پہنچ گئے (کیونکہ ملک بہت آباد ہے) جب میرا آقا اپنے گھر پر میری نمائش کرتا تو دیکھنے والا چاہے ایک ہی خاندان ہو پورے کمرے کی قیمت اس سے وصول کر لیتا۔ لہذا کچھ عرصہ تک مجھے ہفتہ میں ایک دن بھی آرام نہیں ملا (سوائے چار شنبہ کے، جو ان کا یوم سبت ہوتا ہے) حالانکہ شہر بھی مجھے نہیں لے جایا گیا۔

میرے آقا نے یہ دیکھ کر کہ میں کس قدر نفع بخش ثابت ہو رہا ہوں طے کیا کہ مجھے مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں لے جائے۔ لہذا لمبے سفر کے لئے ضروری سامان مہیا کر لینے اور اپنے گھر کے معاملات طے کر لینے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے رخصت لی اور ۱۷ اگست ۱۷۰۳ء کو، میرے یہاں آنے کے دو مہینے بعد، ہم دارالحکومت کیلئے روانہ ہو گئے، جو مملکت کے وسط میں واقع ہے اور ہمارے گھر سے کوئی تین ہزار میل

کے کاندھے پر۔ میرے آقا نے اپنی بیٹی کو ڈولی پر بٹھا کر اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ اس نے بچی کو اپنی گود میں رکھ لیا اور کمبل کو اپنی کمر سے باندھ لیا۔ لڑکی نے اس کمبل میں چاروں طرف نرم نرم روئی کی تہہ کا دی تھی اور نیچے روئی کا گدا رکھ دیا تھا اور اوپر اپنے بچے کا بستر اکا دیا تھا۔ میرے لیے کپڑے اور ضروریات کی دوسری چیزیں ساتھ لے لی تھیں اور جہاں تک ممکن تھا میری آسائش کا انتظام کر لیا تھا۔ ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا، بس گھر کا ایک چھوکرا تھا جو ہمارے پیچھے پیچھے گھوڑے پر سامان لاد کر لا رہا تھا۔

میرے والد اور والدہ مجھے ان کے نام سے دھانے کا تھا وہ ستر میں آنے تھے، مگر شاہراہ چھوڑ کر سو ڈیڑھ سو میل اندر کسی دیہات کے رئیس کے ہاں ہی اپنی بیٹی بیاہتا، بہت کم جاتے تھے۔ وہاں سے خط آنے کی توقع ہوتی۔ ہم سانی سے سوا سو ڈیڑھ سو میل روزانہ طے کر لیتے تھے، گھل ڈل کر بھی مجھے تعلیمات سے بچانے کے لیے ماں سے شکوہ کرنے لگتی کہ گھوڑے کی دلکی نے مجھے تھکا دیا۔ میری خواہش پر مجھے اکثر میرے کمبل میں سے ہوا کھانے کے لیے نکالتی اور مجھے گلے لگا کر کرتی۔ میرے گالوں کو مضبوطی سے تھامے رہتی۔ ہم نے بارہ یا چودہ دریا عبور کیے جو پل اور ٹکا سے کہیں کہیں کم ہے اور چوڑے تھے، اور شاید ہی کوئی ندی ایسی ہو جو اتنی گہری نہیں نظر آتی جتنی ملتان کے پل کے قریب ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے سفر میں جس پیمانے کر لیے اور بچے دیہاتوں اور رئیسوں کے علاوہ اظہار کے شہروں میں بھی ہماری مہمانداری کی گئی۔

اکثر رئیسوں کے ہاں کم از کم ایک ہفتہ ہم ٹھہرتے تھے وہ اپنی زبان میں تو بڑا اکرام فرماتے تھے، میرے آقا نے خاص بازار میں رہنے کا جھگڑا لیا، جہاں سے نماز کی مسجد دور نہ تھی۔ جب ڈولی انتظار جلدی کے لیے ہیرا پور اصلیہ درج کیا۔ تین چار سو فٹ چوڑا بڑا سا کمرہ کرایہ پر لیا۔ میری اور باری کے لیے ساتھ ہی ایک ایک کوٹھڑی لی تھی۔ ایک تو خالی اور اس کے کونے سے تین فٹ اندر کی طرف تین ہی فٹ اونچا کٹہرا لگایا تاکہ میں اس سے گر نہ سکوں۔ زنانہ دس بارہ دن میں میری مالش کی جاتی۔ لوگ حیرت سے دیکھتے اور خوش ہو کر جاتے۔ میں اب ان کی زبان اچھی خاصی بولنے لگا تھا، جو کچھ سنتا اس کا ایک ایک لفظ سمجھ لیتا۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے حروف تہجی سیکھ لیے تھے اور فقرے لکھنا لکھنا۔ لیکن کہ ہم ڈولی میں بیٹھے بیٹھے کچھ پڑھ بھی لیتے تھے اور وہاں سفر فرصت کے اوقات میں بھی۔ اس کی جیب میں ایک چھوٹی سی کتاب رہتی تھی، ہمارے ہاں کے قصوں کے مجموعے کے برابر، کم عمر لڑکیوں کے لیے یہ ایک عام کتابچہ تھا جس میں ان کے مذہب کا مختصر بیان درج تھا۔ اس میں سے میں نے مجھے حروف سکھائے اور الفاظ کے معنی بتائی۔ بتی۔

(انگریزی)

للی پٹ کا سفر

مصنفہ: جوناتھن سوئفٹ

مترجمہ: شاہد احمد دہلوی

چھٹا باب

للی پٹ کے باشندوں کے متعلق، اُن کی تعلیم، قوانین، اور رسم و رواج۔ بچوں کا طریقۂ تعلیم۔ اس ملک میں مصنف کا طرزِ زندگی۔ اس کا معزز خاتون کو الزامات سے بری ثابت کرنا۔

میرا ارادہ اگرچہ یہ ہے کہ اس مملکت کا حال ایک علیحدہ کتاب میں لکھوں تاہم پڑھنے والوں کے اشتیاق کی تسکین کے لئے میں فی الحال چند عام باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہاں کے باشندوں کا قد چونکہ ہمارے چھ انچ سے کم ہی ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے جانور، پودے اور درخت بھی نہ ذکر قامت میں بھی اسی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سب سے اونچے گھوڑے اور بیل چار اور پانچ انچ کے درمیان ہوتے ہیں، بھیڑ کم و بیش ڈیڑھ انچ کی۔ ان کی غازیں تقریباً گھریلو چڑیا کے برابر ہوا اور اسی تناسب سے گھٹتے گھٹتے جب چیونٹے جانوروں پر نوبت پہنچتی تو وہ اتنے چھوٹے دکھائی دیتے کہ ان میں سے اکثر تو مجھے دکھائی بھی نہ دیتے۔ لیکن قدرت نے للی پٹ والوں کی آنکھوں کو تمام چیزوں کو مناسب شکل و صورت میں دیکھنے کی صلاحیت دے رکھی تھی۔ وہ بہت صحیح دیکھتے ہیں مگر بہت دُور تک نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی ترکیب کی چیزوں کی باریک بینی کا یہ ثبوت دیکھ کر مجھے بڑا لطف آیا۔ ایک باورچی ایک چنڈول کے پر نوچ رہا تھا اور چند دُمل اتنا بڑا بھی نہیں تھا جتنی ہماری مکھی۔ اور ایک کم عمر لڑکی کو دیکھا کہ سوئی میں دھاگہ پرو رہی ہے گو مجھے نہ تو سوئی سوجھی اور نہ دھاگہ۔ ان کے اونچے سے اونچے درخت کوئی سات فٹ کے ہوتے ہیں، بمعنی مطلب ان درختوں سے ہے جو شاہانہ باغ میں ہیں، جن کی چوٹیوں تک میرا مٹھی بند ہاتھ پہنچتا تھا۔ ترکاریاں بھی اسی تناسب سے ہیں، لیکن انھیں اب میں پڑھنے والے کے تصور پر چھوڑتا ہوں جماعلوم ان میں صدہا بوجھ تبدیل رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں لیکن اس وقت میں ان کا تفصیل بیان نہیں کروں گا۔ کہ ان کا انداز بڑا عجیب و غریب ہے کہ نہ تو بائیں سے دائیں کو ہے جیسا کہ یورپ والوں میں ہے نہ دائیں سے بائیں کو۔ جیسا کہ عرب والوں میں ہے! نہ اوپر سے نیچے کو، چینیوں کی طرح، نہ نیچے سے اوپر کو، کاسکاجیوں کی طرح۔ بلکہ آڑا، ماغذ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک، انگلستان کی خواتین کی طرح۔

یہ لوگ اپنے مُردوں کو مع کفن کے بل دفن کرتے ہیں، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جب گیارہ ہزار چاند پورے ہو جائیں گے تو سارے مُردے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ اس عرصہ میں دنیا (جو ان کے نزدیک چپٹی ہے) الٹ جائے گی، اور یوں دوبارہ اٹھائے جانے پر وہ اپنے آپ کو اپنے ہی پیروں پر کھڑا پائیں گے۔ ان میں جو پڑھے لکھے ہیں اس عقیدے کو مُحمل قرار دیتے ہیں، لیکن دفن کا کہنے کا یہ دستور اب بھی جاری ہے کیونکہ جاہلانہ روایات پختہ قائم ہیں۔

اس ملک میں چند قوانین اور رسوم بڑی عجیب ہیں۔ اور اگر میرے پیارے ملک کے دستور اور رواج سے یہ اس قدر خلاف نہ ہوتے تو ان کے حوالے دینے میں کچھ کہنے کو بھی جی چاہتا۔ فاش لن پر اسی عمدگی سے عمل بھی کیا جاتا۔ ایک حبس کا ذکر میں پہلے کر دوں گا مجرموں کے متعلق ہے۔ ریاست نے خلاف تمام جرائم کی سزا نہایت سخت دی جاتی ہے۔ لیکن عدالت میں اگر ملزم اپنی بے گناہی ثابت کر دے تو الزام لگانے والے کو وقت کے ساعت کے گھنٹے تار دیا جاتا ہے اور اسکے سامان یا زمینوں سے بے گناہ شخص کی جائز تلافی کی جاتی ہے اس کے وہ وقت لے ضائع ہونے کی، اور بے خطرے میں پڑ جانے کی، اس کی قید و بند کی تکلیفوں کی، اور ان کل اخراجات کی جو اسے اپنا بچاؤ کرنے کے لئے دینے کرنے پڑے۔ اگر نہ تلافی کم وہ جائے تو اس کا بیشتر حصہ حکومت ادا کرتی ہے۔ شہنشاہ اسے کوئی نشان عاطفہ بھی اذ راہ نوازش عطا کرتا ہے، اور سارے شہر میں اس کی بے گناہی کا اعلان کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ بے ایمانی کو جرم ہی سمجھتے ہیں، اور شاذ ایسا ہوتا ہے کہ بے ایمان کی سزا موت نہ ہو۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ادنیٰ فہم کا آدمی بھی احتیاط و ہوشیاری سے اپنا مال یا اسباب چوروں سے بچا سکتا ہے، لیکن دیانتدار شخص بے ایمان کی مکاری سے نہیں بچ سکتا۔ اور چونکہ یہ ضروری ہے کہ خرید و فروخت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے اور اعتبار پر لین دین ہوتا رہے، اگر بے ایمانی کو دوام رکھا گیا یا فریب دہی سے پیشہ پوشی کی گئی، یا اس کی سزا کو کوئی قانون نہیں بنایا گیا تو ایسا بازار ہمیشہ مارا جائے گا اور بے ایمان مزے اڑائے گا۔ مجھے یاد ہے مذہب میں نے بادشاہ سے ایک مجرم کو بچانا چاہا جس نے اپنے آقا کی رقم اڑا لی تھی، یہ رقم ایک گاہک نے دی تھی جسے لے کر ملازم بھاگ گیا، تو اس کا جرم بتلانے کے لئے میں نے کہا کہ یہ تو محض اعتبار توڑنے کی بات ہے، تو شہنشاہ نے یہ میری ایک نہایت وحشیانہ حرکت تصور فرمایا کہ اتنے بڑے جرم کا بچاؤ کر کے میں نے جرم کی شدت کو بڑھا دیا۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ میرے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا سوائے اس عام عذر کے کہ مختلف قوموں کے مختلف دستور ہوتے ہیں۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔

اگرچہ ہم جزا اور سزا کو محمود مادہ دو چولیں کہتے ہیں جن پر پوری حکومت چلتی ہے لیکن اس اصول کو میں نے عملی صورت اختیار کرتے کسی قوم میں نہیں دیکھا، سوائے ملی پٹ کی قوم کے۔ جو کوئی بھی اس امر کا کافی ثبوت مہیا کر سکتا ہے کہ اس نے نہتر چاند اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنے میں پورے کر لئے تو اسے اس کی زندگی کے معیار اور حالات کے مطابق چند مراعات حاصل ہو جاتی ہیں، اور اسے ایک مناسب رقم اس سرمایہ میں سے بھی دی جاتی ہے جو اس مد کے لئے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ساتھ کے ساتھ اسے مد اسٹل پاپ یعنی مستوری کا سفاب بھی مل جاتا ہے جو اس کے نام کے ساتھ لگ جاتا ہے، لیکن خیر طلب وراثت میں اس کی اولاد کو نہیں ملتا۔ اور ان لوگوں نے میرے یہ بتانے پر اسے حکمت عملی کا ایک بہت بڑا سقم قرار دیا کہ ہمارے قوانین میں صرف سزا ہی شامل ہیں، جزاؤں کا کوئی مذکور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عدالتوں میں انصاف کا جو بیت ہوتا ہے۔ اس کی چھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو سامنے، دو دیکھے، اور ایک ایک اِدھر اُدھر

[redacted] سے خبرداری کا اظہار مقصود ہے اس بت کے دائیں ہاتھ میں سونے کا ایک سکہ کھلا تولا ہوتا ہے اور بائیں ہاتھ میں نیام کی ہوئی تلوار۔ اس سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انصاف کی دیوی سزا سے زیادہ جزا کی طرف مائل ہے۔

کل ملازمتوں کے لئے جو لوگ انتخاب کئے جاتے ہیں ان کی قابلیت سے زیادہ ان کے حسن اخلاق کو دیکھا جاتا ہے، کیونکہ حکومت تو انسانوں کے لئے بہرحال ضروری ہے، اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کی فہم کسی کو کسی ملازمت کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ عوام کے معاملات کو قدرت نے ایسا سربستہ راز بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی جسے صرف چند اعلیٰ قابلیت کے افراد ہی سمجھ سکیں، ایسے افراد جو سیکڑوں زمانے میں بھی سے زیادہ پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صداقت، انصاف، روا داری، اور اسی طرح کے حسنات ہر شخص کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ان حسنات پر اگر عمل کیا جائے اور تجربہ اور نیک نیتی بھی اس کے ساتھ ہو تو ہر شخص اپنے ملک کی خدمت کے لئے موزوں ہو سکتا ہے، سوائے اس خدمت کے جس کے لئے تربیت خصوصی درکار ہو۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اخلاق حسنہ کے فقدان کی تلافی اعلیٰ ذہنی و بعقلی سے اس درجہ بعید ہے کہ ملازمتیں ایسے خطرناک لوگوں کے سپرد نہیں کی جا سکتیں۔ جو محض ذہنی قابلیتوں سے متصف ہوتے ہیں۔ اور کم از کم وہ غلطیاں جو نیک فطرت لوگوں سے لاعلمی میں سرزد ہو جائیں عوام کی بہبودی کے لئے اس قدر مہلک نتائج پیدا نہیں کریں گی۔ جتنی اس شخص کی حرکات پیدا کریں گی جس کے رجحانات اُسے برائیوں پر مائل کریں، اور وہ ان برائیوں کو پروان چڑھانے اور ان کا تحفظ کرنے کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہو۔

اسی طرح ربانی قوت کے تسلیم نہ کرنے والے کو بھی ملازمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ بادشاہ قوت ربانی کے نائب ہونے کا حلف اٹھاتے ہیں اس لئے ملی پٹ والے سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بے معنی بات اور کیا ہوگی کہ کوئی بادشاہ ایسے لوگوں کو ملازمتیں سونپے جو سرے سے اس حاکم ہی کو نہ مانتا ہوں جس کے احکام کی تعمیل کو وہ بادشاہ کرتا ہو۔

جو دستور میں نے بیان کئے ہیں اور آگے چل کر جن کا ذکر کروں گا ان سے میری مراد اصلی قوانین ہیں، وہ رسوا کن خرابیاں نہیں ہیں جن میں یہ لوگ انسانی پست فطرت کی وجہ سے مبتلا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ رسوں پر ناچ دکھا کر یا ہاتھوں پر کود کر یا ان کے نیچے سے نکلنے کے کرتب دکھا کر اونچی ملازمتیں حاصل کر لینا یا شاہی نوازشوں کے نمنے اور نمایاں حیثیت حاصل کر لینا، ایسی خرابیاں ہیں جنھیں موجودہ شہنشاہ کے دادا نے پہلی بار داخل ہونے دیا، اور فرقہ بندی اور دھڑا بندی نے انھیں موجودہ بلندی پر پہنچا دیا۔

احسان فراموش کو ان لوگوں میں واجب القتل سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے پڑھا ہے بعض اور ملکوں میں بھی سمجھا جاتا تھا، کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنے محسن کا بدلہ برائی سے دیتا ہے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ضرور دشمنی کرے گا کیونکہ ان کی طرف سے تو کوئی احسان کی ذمہ داری بھی اس پر نہیں ہوتی، لہٰذا ایسا شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ زندہ رہے۔

والدین اور بچوں کے فرائض کا تصور ہم سے بہت مختلف ہے۔ چونکہ نر اور مادہ کے میل کی بنیاد قدرت کے نسل کشی کے عظیم قانون پر ہے لہٰذا ملی پٹ والے سے ضروری سمجھتے ہیں کہ مرد اور عورت بھی دوسرے حیوانوں کی طرح نفسانی خواہش کی تسکین کے لئے یکجا ہوں، اور اسی قدرتی اصول کے تحت انھیں اپنے بچوں کی ماں ہونی ہے یہ اسی باعث وجہ سے قطعی گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی بچہ اپنے باپ کا اس لیے احسان مند ہو کہ وہ اس کی پیدائش کا ذمہ دار ہے یا اپنی ماں کا اس لیے احسان مانے کہ وہ اسے دنیا میں لائی۔ کیونکہ انسانی زندگی کے مصائب کے پیش نظر یہ فعل نہ تو بجائے خود مستحسن ہے اور نہ والدین ہی کا یہ منشا تھا۔ وہ تو

اپنی محبت کی پنکھڑیوں میں کچھ اور ہی سمیٹ رہتے تھے۔ ان اور ایسی ہی دلیلوں سے انھوں نے رائے قائم کی ہے کہ جب کوئی اور انتظام نہیں ہو سکتا ہو تو والدین کو ان کے بچوں کی تعلیم پر مامور کیا جائے۔ اسی وجہ سے ان کے ہر شہر میں عمرانی تجربہ خانے کھلے ہوئے ہیں جہاں تمام والدین کو ماسوائے کہ مائوں اور مزدوروں کے۔ اپنے بچوں اور بچیوں کو مہینہ پندرہ کے ہوتے ہی پالے جانے اور تعلیم پانے کیلئے جبراً بھیج دینا پڑتا ہے۔ گو یہ کہا جاتا ہے کہ اس تعلیم میں ان میں تربیت پذیری کی چند مبادیات رونما ہو جاتی ہیں۔ یہ مدرسے مختلف نوعیتوں کے ہیں، جو وہ نوں مختلف اوصاف کے مطابق برتتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسے استاد ہوتے ہیں جو بچوں کو ایسی زندگی کی تربیت دینے میں مہارت رکھتے ہیں جو ان کے والدین نے سپرد کی ہے۔ اور جو بچوں کی اپنی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق بھی۔ میں پہلے مروجہ بچہ گھروں کا مختصر ذکر کروں گا اور اس سے بعد تانا بانا گھروں کا۔

اونچے گھرانوں کے بچوں کے بچہ گھروں میں سنجیدہ اور عالم استاد احسان کے کئی کئی معاون ہوتے ہیں۔ بچوں کے لباس اور کھانے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ دیانتداری، انصاف، ہمت، حیا، علم، ادب جیسے مادہ جب لوحی، کے اصولوں کے مطابق ان کی تربیت ہوتی ہے۔ بچے کسی نہ کسی کام میں ہمیشہ مصروف رکھے جاتے ہیں، سوائے کھانے اور سونے کے اوقات کے جو بہت مختصر ہوتے ہیں، اور دو گھنٹے تفریح کے جن میں جسمانی ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔ چار سال کی عمر تک انھیں مروجہ کپڑے پہنائے جاتے ہیں، اس کے بعد وہ چاہے کتنے ہی عالی نسب کیوں نہ ہوں انھیں خود اپنے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ خادمائیں جن کی عمر ہمارے پچاس سال کی نسبت سے ہوتی ہے۔ صرف نہانے اور دھونے کے کام انجام دیتی ہیں۔ بچوں کو نوکروں سے باتیں کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی۔ تفریح کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بڑے گروہ بنا کر جاتے ہیں۔ لیکن ان کے اتالیق ہمیشہ یا تو استاد یا نائب استاد ہوتا ہے۔ اس انتظام کی وجہ سے وہ بیوقوفی اور بدی کے ان ابتدائی برے اثرات سے بچ جاتے ہیں۔ جن کے شکار ہمارے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے والدین کو سال میں صرف دو دفعہ ان سے ملنے دیا جاتا ہے۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔ آنے اور جانے پر انھیں اپنے بچوں کو پیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن ان موقع پر جو استاد ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ انھیں کھانا چوسی کرنے نہیں دیتا، نہ لاڈ پیار کی باتیں کرنے دیتا ہے، اور نہ کھلونے مٹھائیاں وغیرہ بطور تحفہ دینے دیتا ہے۔

بچے کی تعلیم اور تفریح کے اخراجات والدین ادا کرتے ہیں۔ اگر وقت پر ادا نہ کئے جائیں تو شہنشاہ کے افسر وصول کر کے دیتے ہیں معمولی حیثیت کے لوگوں مثلاً تاجروں، دوکانداروں اور دستکاروں کے بچے گھروں کا انتظام بھی تقریباً اسی ڈھنگ سے کیا جاتا ہے۔ وہ بچے جو مختلف کاروباروں کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں کارآموزی کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ مگر اونچے خاندانوں کے بچے پندرہ سال کی عمر تک تربیت پاتے رہتے ہیں، ہمارے حساب سے انھیں ایگزیکٹو ال کے سمجھنا چاہئے۔ لیکن کڑی پابندیاں آخری تین سال میں رفتہ رفتہ کم کر دی جاتی ہیں۔

لڑکیوں کے بچہ خانوں میں اور اپنے گھرانوں کی بچیوں کی تعلیم بچے ہی کی طرح ہوتی ہے، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ انھیں خادمائیں پہناتی ہیں، لیکن ہمیشہ استاد یا نائب استاد کی موجودگی میں، یہاں تک کہ خود کپڑے پہننے سیکھ لیتی ہیں، یہ عموماً پانچ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خادمائیں بچیوں کو خوفناک یا بے وقوفیوں کی کہانیاں سنا کر ان کا دل بہلایا کرتی ہیں، یا وہ حماقتیں کرتی ہیں جو ہمارے ہاں کی ملازمائیں کرتی ہیں جو سارے شہر میں انھیں گھما کر تین دفعہ کوڑے مارے جاتے ہیں، ایک سال قید رکھا جاتا ہے، اور شہر بدر کر کے عمر بھر کیلئے

ملک کے کسی دیہاتی تربیت سنٹر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں کی نوخیز لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح بزدل اور بیوقوف ہونے پر شرمندہ ہوتی ہیں، اور جسمانی آرائش کے تمام سازوسامان کو نفاست اور تھرے پن کے خلاف سمجھ کر حقارت سے دیکھتی ہیں۔ بربنائے اختلافِ صنف ہیں انسان کی تعلیم و تربیت میں کوئی بھی فرق نہیں دیکھا، سوائے اس کے کہ لڑکیوں کی ورزشیں اتنی سخت نہیں ہوتیں جتنی لڑکوں کی اور کچھ اصول و ضوابط گھریلو زندگی کے بارے میں انھیں بتائے جاتے ہیں اور ان کی تعلیم کا پھیلاؤ لڑکوں کی نسبتاً کچھ کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں بیوی کو ہمیشہ ایک معتوب اور خوشگوار ساتھی ہونا چاہئے، اس وجہ سے کہ ساحران نہیں روکتی۔ جب لڑکیاں بارہ سال کی ہو جاتی ہیں تو یہ ان کے ہاں شادی کر دینے کی عمر سمجھی جاتی ہے، اس لئے ان کے والدین یا سرپرست آکر انھیں گھر لے جاتے ہیں اور استادوں کے بہت شکر گزار ہوتے ہیں۔ اس موقع پر شاذ ایسا ہوتا ہے کہ لڑکیاں اور ان کی ہمجولیاں رو نہ پڑتی ہوں۔

اونی دوستے کی بچیوں کے بچے گھروں میں بچیوں کو ان تمام کاموں کی تربیت دی جاتی ہے جن کی صنف کے مناسب حال ہوں اور ان کے منفعد و طبقوں کے مطابق جنھیں کارآموز بنانا ہوتا ہے انھیں نو سال کی عمر میں خصت کر دیا جاتا ہے، باقی کو تیرہ سال کی عمر تک رکھا جاتا ہے۔

غریب گھرانوں والے جن کے بچے ان بچہ گھروں میں داخل ہونے میں مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے سالانہ وظیفوں کے علاوہ، جو کم سے کم ہوتے ہیں، اپنی ذاتی ماہوار آمدنی کا بھی کچھ حصہ اپنے بچے کے اخراجات کے لئے بچہ گھر کے منتظم کو پہنچاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تمام والدین کے اخراجات قانونی طور پر کم کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ کلی یہ کے باشندے سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر اور کیا ناانصافی ہوگی کہ لوگ اپنی جنسی ہوس مٹانے کے لئے بچے تو پیدا کر دیں مگر ان کی پرورش کا بوجھ عوام پر ڈال دیں۔ رہے عالی نسب لوگ، تو یہ اپنے ہر بچے کے لئے حسب حیثیت ایک مناسب رقم بطور ضمانت جمع کرا دیتے ہیں۔ ان جمع شدہ رقوم کا نہایت اچھا انتظام رکھا جاتا ہے اور انکے ساتھ بالکل صحیح انصاف برتا جاتا ہے۔

کسان اور مزدور اپنے بچوں کو اپنے گھروں پر رکھتے ہیں کیونکہ ان کا کام صرف زمین کو جوتنا اور بونا ہے، اس لئے ان کی تعلیم عوام کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن ان میں جو بڈھے اور بیمار ہوتے ہیں انھیں ہسپتالوں سے امداد ملتی ہے۔ کیونکہ بھیک مانگنا ایک ایسا پیشہ ہے جسے اس مملکت میں کوئی نہیں جانتا۔

یہاں شاید پڑھنے والوں کو خیال آئے گا اور یہ جاننے کا اشتیاق ہو گا کہ میرے گھریلو حالات کیا تھے، اور میں نے جو اس ملک میں نو مہینے اور تیرہ دن قیام کیا تو میرا طرز زندگی کیا تھا۔ بھرا دماغ چونکہ مشینوں کی طرف راغب ہے اور کچھ ضرورت کا بھی اقتضا تھا، اس لئے میں نے اپنے لئے ایک میز اور کرسی شاہی باغ کے بڑے بڑے درختوں سے خاصی آرام دہ بنالی تھی۔ میرے لئے نیچے اور میرے بستر اور میز کے لئے اوپر چھاؤنی پوش بنانے کے لئے دو سو درزنیں لگائی گئیں۔ کپڑا مضبوط اور موٹے سے موٹا مہیا کیا گیا، لیکن اسے بھی تہ در تہ رکھ کر جوڑنا پڑا کیونکہ موٹے سے موٹا کپڑا بھی ململ سے باریک تھا۔ ان کا سوتی کپڑا عموماً تین انچ عرض کا ہوتا ہے اور فالتو تین فٹ کا۔ میں زمین پر لیٹ گیا تو درزنوں نے میرا ناپ لیا۔ ایک میری گردن پر کھڑی ہو گئی اور دوسری میری ٹانگ کے بیچ میں۔ دونوں نے ایک مضبوط ڈوری سر سے پکڑ کر نانپی اور تیسری درزی نے ایک انچ لمبے رول سے ڈوری کی لمبائی ناپنی شروع کر دی۔ اس کے بعد انھوں نے میرے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے کو ناپا، بس اور کچھ نہیں۔ کیونکہ ایک حساب کے قاعدے سے کہ انگوٹھے کے دو پور برابر ہوتے ہیں۔ کلائی کے ایک پور کے

انگلیوں نے میرے لگے اور کر کا حساب لگایا، ۱۰۰ میری پرانی قمیص کی مدد سے، جس کو میں نے نمونے کے لئے ان کے سامنے زمین پر پھیلا دیا تھا، انھوں نے میری قمیص بالکل ٹھیک سی دی۔ اس کا رواج میرے کپڑے بنانے کے لئے تین سو درزی لگائے گئے، مگر انھوں نے میرا ناپ لینے کی ایک ان نرکیب نکالی۔ میں بلک کر کھڑا ہو گیا اور انھوں نے زمین سے میری گردن تک ایک سیڑھی لگا دی۔ ان میں سے ایک اس سیڑھی پر چڑھ گیا اور میرے کالر سے زمین تک۔ اس نے ماپ لی۔ اس سے میرے کوٹ کی صحیح لمبائی معلوم ہو گئی۔ لیکن اپنی کمر اور بازوؤں کا ناپ لے کر میں نے خود دے دیا۔ جب میرے کپڑے سل کر تیار ہوئے (میرے ہی گھر میں) لیے گئے کیونکہ ان کے بڑے سے بڑے گھر میں بھی یہ نہ سماتے) تو ایسے دکھائی دیئے جیسے انگلستان کی فوج نے ہزار جامہ تیار کیا ہو۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے کپڑے سب ایک ہی رنگ کے تھے۔

میرا کھانا تیار کرنے کے لئے تین سو باورچی تھے جو میرے گھر کے قریب آدھ دو جھونپڑیوں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سب مل کر میرے ہر کھانے کے لئے دو طرح کے کھانے تیار کرتے۔ میں پینتیس خدمتگاروں کو اپنی مٹھی میں اٹھا کر میز پر چھوڑ دیتا۔ کوئی سو خدمتگار نیچے فرش پر کھڑے رہتے بعض کے ہاتھوں میں گوشت کی تابیں ہوتیں اور بعض شراب کے پیپے لئے ہوتے اور بعض دوسری شرابوں کی مرتبانیں کندھوں پر لٹکائے ہوتے۔ ان سب چیزوں کو میرے خدمت گار میری خواہش کے مطابق بڑی ہوشیاری سے ڈوریوں کے ذریعے اوپر اس طرح کھینچ لیتے جیسے ہم یورپ میں کنوئیں سے بالٹی کھینچتے ہیں۔ ان کی ایک گوشت کی قاب میرا خاصہ ایک نوالہ بن جاتی، اور شراب کا ایک پیالہ ایک گھونٹ۔ ان کا بکری کا گوشت ہمارے ہاں کے گوشت کا مقابلہ نہیں کرتا۔ لیکن ان کا گائے کا گوشت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ ایک دن تو میرے سامنے اتنی بڑی آئی کہ مجھے اس کے تین نوالے کرنے پڑے، مگر یہ سالم ہوتا ہے۔ میرے ملازم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں اسے ہڈی سمیت چبا گیا، جیسے ہمارے ملک میں چنڈول کی ٹانگ کھا جاتے ہیں۔ ان کی قانین اور فیل مرغ میرا ایک ایک نوالہ بنتے، اور مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے پرندوں سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔ ان کی چھوٹی مرغیاں تو بعض بار میں اپنی چھری کے سرے پر اٹھا لیتا تھا۔

ایک دن بادشاہ سلامت نے میری زندگی کے متعلق باتیں سن کر خواہش ظاہر کی کہ خود جنفس نفیس اور بلکہ سلامت اور انہی کے خاندان کے شہزادہ سے اور شہزادیاں میرے ساتھ شریک طعام ہونے کی (انھوں نے ازراہ کرم فرمایا) مسرت حاصل کرنی چاہتے ہیں۔ جب ارادہ وہ آئے اور میں نے ان سب کو اپنی میز پر شاہی کرسیاں لگا کر بٹھا دیا۔ سب ذرا اونچے میرے بالکل سامنے تھے اور داروغہ اور ان کے محافظ کھڑے ہوئے۔ ریاستی خزانے کا داروغہ اعلیٰ علم نیپ اپنا سفید عصا لئے حسب دستور حاضر تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے کئی بار مجھے تیزی چڑھا کر دیکھا۔ میں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ معمول سے کچھ زیادہ ہی کھایا، کچھ اپنے ملک کی لاج رکھنے کے لئے اور اہل دربار کی تخصیص حاصل کرنے کے لئے بھی۔ مجھے خانگی وجوہ کی بنا، پر یقین ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی اس تشریف آوری سے علم نیپ کو اپنے آقا سے میری برائی کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ داروغہ سدا سے میرا مخفی دشمن تھا۔ مگر ظاہرا اپنی روکھی طبیعت سے کہیں بڑھ چڑھ کر مجھ سے محبت کا اظہار کرتا۔ اس نے شہنشاہ سے عرض معروض کی کہ خزانے کی حالت اچھی نہیں ہے، مجبوراً بھاری سود پر روپیہ لینا پڑ رہا ہے، خزانۂ عامرہ کی ہنڈیاں نوفیصدی نقصان پر چل رہی ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ مجھ پر اب تک ساڑھے دس لاکھ اسپرگ (ان کا سب سے بڑا سونے کا سکہ، سنہری بنگی کے برابر) خرچ ہو چکے ہیں اور بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جلد از جلد موقع ملتے ہی مجھے جواب دے دیا جائے۔

یہاں مجھے ایک نہایت اعلیٰ درجے کی خاتون کی نیک نامی کا بول بالا کرنا ہے جو بے گناہ میری وجہ سے بدنام ہوئی۔ بعض بدکردار لوگوں نے داروغۂ خزانہ کے کان بھرے کہ ان کی بیگم دیوانہ وار مجھ پر فریفتہ ہو گئی ہیں۔ داروغہ اس بات پر اپنی بیوی سے جلنے لگا۔ اور بہ افواہ کچھ عرصہ تک

دربار میں گشت کرتی رہی کہ بیگم ایک دفعہ چپکے سے میرے گھر بھی آئی ہے۔ میں نہایت سنجیدگی سے اعلان کرتا ہوں کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔ جس کی اس سے زیادہ کوئی دلیل نہیں کہ معزز بیگم مجھ سے معصومانہ تپاک اور دوستی سے پیش آتی تھیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ وہ اکثر میرے گھر آتی تھیں مگر کھلے بندوں، چھپ چھپا کر نہیں۔ اور ہمیشہ ان کے ساتھ دو تین اور خواتین ہوتی تھیں، ان میں عموماً ان کی بہن اور کم عمر بیٹی شامل ہوتی تھی اور کوئی مخصوص دوست۔ یہی طریقہ اور بھی کئی درباری خواتین کا تھا۔ اس پر بھی میں اپنے ملازموں سے گواہی دلوا سکتا ہوں کہ کسی وقت بھی کوئی ایسی سواری انھوں نے میرے دروازے پر کھڑے نہیں دیکھی جسے پہلے انھوں نے معلوم نہ کر لیا ہو۔ ایسے موقعوں پر جب کوئی ملازم مجھے کسی کی آمد کی اطلاع دیتا تو میرا یہ دستور تھا کہ فوراً دروازے پر جاتا اور آداب بجا لانے کے بعد گاڑی اور درد نوں گھوڑوں کو نہایت احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں اتارتا (کیونکہ اگر چھ گھوڑے ہوتے تو خود سواروں کو چھوڑ کر ان میں سے چار کھول لیتا) اور انھیں میز پر رکھ دیتا جس کے کنارے پر میں نے ایک جھکنے والا کٹہرا پانچ انچ اونچا لگا دیا تھا تاکہ کوئی سائیس نہ ہونے پائے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں میری میز پر چار چار گاڑیاں اور گھوڑے جمع ہو جاتے اور خوب دل چسپ سماں بندھتا۔ میں اپنی کرسی میں جھک کر اپنا چہرہ ان کی طرف بڑھا دیتا۔ جب میں ایک ٹولی سے باتیں کرنے لگتا تو کوچوان باقی گاڑیوں کو میز پر آہستگی سے چلاتے رہتے۔ میں نے اکثر دوپہریں ان سے باتیں کر کے بڑی خوش دلی سے گزاری ہیں لیکن میں داروغۂ خزانہ کو جھٹلاتا ہوں اور اس کے دو گواہوں (میں ان کے نام بتاتا ہوں، وہ اپنی سی کریں) کلسٹرل اور ڈرنکو کو بھی۔ وہ ثابت کریں کہ کبھی بھی کوئی شخص بھیس بدل کر میرے پاس آیا، سوائے ناظم لالہ دیسال کے، جیسے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، بادشاہ سلامت نے بحکم خاص بھیجا تھا۔ میری بات چھوڑیے۔ اگر اس سے ایک معزز خاتون کی عزت خطرے میں نہ پڑتی تو میں اس بات کو اتنا طول نہ دیتا۔ حالانکہ مجھے بھی اس وقت ایک ناروا ک ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ بہرحال داروغۂ خزانہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک کلم گلم ہے۔ یہ خطاب ایک درجہ نیچا ہے جیسا کہ انگلستان میں مارکوئس ڈیوک سے ایک درجہ نیچا ہوتا ہے۔ یہ البتہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملازمت کے لحاظ سے وہ مجھ سے اونچا تھا۔ ان غلط اطلاعات نے جن کا مجھے ایک ناقابلِ بیان اتفاق سے بعد میں علم ہوا، داروغۂ خزانہ فلم ناپ کو اتنا در غلایا کہ بیوی کی طرف سے اسکا منہ کچھ عرصے تک چڑھا رہا، اور میری طرف سے اور بھی زیادہ، کیونکہ بعد میں جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ اس کی بیوی نے اُسے دھوکہ نہیں دیا تو اس نے اپنی بیوی سے دل صاف کر لیا، لیکن میں اس کی نظروں سے گر گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ شہنشاہ بھی میری طرف سے بدظن ہوتا جا رہا ہے کیونکہ داروغہ اس کے بہت منہ چڑھا ہوا تھا اور شہنشاہ کو چلاتا رہتا تھا۔

دفترِ نسیمی

کینڈائڈ

مصنف:۔ والٹیر

مترجم:۔ شاہد احمد دہلوی

کینڈائڈ کے دل کی یہ انوکھی امنگ کونڈی سے شادی رچانے کی کچھ ایسی زیادہ خواہش بھی نہیں تھی۔ لیکن نواب نے انتہائی گستاخی کا جو مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کیا تھا۔ اس پر اس نے یہ طے کر لیا کہ شادی کرے گا۔ اور کیونی گوندی نے اتنے خلوص سے اس پر زور دیا تھا کہ وہ ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے پنگلوس، مارٹن، اور مقدد کاکمبو سے مشورہ کیا۔ پینگلوس نے اعلےٰ درجے کی یادداشت مرتب کی جس میں اس نے ثابت کیا کہ نواب کو اپنی بہن پر کوئی حق حاصل نہیں تھا، اور حکومت کے تمام قوانین کے مطابق وہ چاہے تو بینڈائڈ سے دو لٹھے جو تھے سے شادی کر لے۔ مارٹن کہتا تھا کہ نواب کو سمندر میں پھینک دینا چاہئے۔ کاکمبو کی رائے یہ تھی کہ سب سے اچھا یہ ہے کہ اسے فی الحال کپتان کے پاس واپس بھیج دیا جائے اور اسے کشتی کھینے والے غلاموں میں شامل کر دیا جائے۔ یہ مشورہ ٹھیک سمجھا گیا۔ بڑھیا نے اسے منظور کر لیا، اور اس کا کوئی ذکر اس کی بہن سے نہیں کیا گیا۔ غلطی سے دولت حاصل کرنے کے لئے اس توبہ کو عملی جامہ پہنایا گیا، اور یوں ایک بڑے نواب کے غرور کو ٹھیس لگانے کی مسرت انھیں حاصل ہوئی۔

یہ تصور کرنا بالکل فطری امر ہے کہ اتنی ساری مصیبتیں جھیلنے کے بعد جب کینڈائڈ کی شادی اپنی محبوبہ سے ہو گئی، فلسفی پینگلوس، فلسفی مارٹن، شائستہ مزاج کاکمبو، اور بڑھیا کے ساتھ اس کا رہنا سہنا تھا، اور خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ قدیم انداز کے ملک سے اتنے سارے ہیرے لے آیا تھا، تو دنیا بھر میں اس سے اچھی زندگی اور کوئی شخص بسر نہیں کر رہا ہوگا۔ مگر اسے یہودیوں نے ایسا دھوکہ دیا تھا کہ سوائے ایاب جھوٹے سے کھلیان کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا، اور اس کی بیوی دن بہ دن زیادہ بدشکل ہو کر چڑچڑی اور بدمزاج ہوتی جا رہی تھی۔ بڑھیا بہت کمزور اور کیونی گوندی سے بھی زیادہ بدمزاج ہو گئی تھی۔ کاکمبو جو باغبانی کرتا تھا قسطنطنیہ جا کر باغ کے پھل بیچا کرتا۔ محنت کرتے کرتے نڈھال ہو گیا اور قسمت کو کوسنے لگا تھا۔ پینگلوس اس غم میں گھلا جا رہا تھا کہ جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں سر دھننے کو گاہ کیوں نہ چکا۔ رہا مارٹن، سو اُسے یقین تھا کہ سارے جہان میں یکساں خرابی پھیلی ہوئی ہے، اس لئے وہ ہر امر سے ساری باتیں گوارہ کئے جاتا تھا۔ کینڈائڈ، مارٹن، پینگلوس کبھی کبھی مابعد الطبیعات اور اخلاقیات پر بحث مباحثہ کرتے۔ اپنے کھڑکیاں بگھر کی کھڑکیوں میں سے آفندیوں، پاشاؤں اور قاضیوں سے بھری کشتیاں گزرتے دیکھتے، جنھیں جلاوطن کر کے لمنوس یا متی لین، اور ارض روم بھیجا جاتا۔ وہ دیکھتے کہ دوسرے

قاضی، دوسرے پاشا، ایسی جلاوطن کئے جانے والوں کی آسامیوں پر آجاتے، صرف اس لئے کہ جب ان کی باری آئے تو انھیں بھی جلاوطن کر دیا جائے۔ وہ لوگوں کے لٹکے ہوئے سر دیکھتے جو باپ عالی میں پیش کئے جانے کے لئے نفاست سے جڑے جاتے۔ اس نوع کے مناظر ان کے مباحثوں میں اضافہ کرتے۔ اور جب وہ مباحثہ نہ کرتے ہوتے تو ان کی بے شغلی اس قدر عذاب جان ہوتی کہ بڑھیا ان سے اکثر کہہ بیٹھتی "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ان میں سب سے برا کیا ہے: حبشی سمندری ڈاکوؤں سے تنو بار زنا بالجبر کرانا، بلغاریوں کی قطاروں میں سے کوڑے کھاتے ہوئے بھاگنا، کوڑے کھا کر پھانسی پانا، اپنے بدن کے پرزے اڑوانا، غلاموں کے ساتھ کشتیوں میں جوتا جانا، مختصر یہ کہ جو جو عذاب ہم نے جھیلے ہیں وہ، یا یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا؟" کینڈائڈ کہتا "یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔"

بحث مباحثہ میں نئے نئے تصورات کی راہیں کھل گئیں، اور آخر میں مارٹن نے نتیجہ نکالا کہ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ یا تو خلجان کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا پھرے یا نفرت کی خندق میں ڈوبا رہے۔ کینڈائڈ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اور جیل میں پڑ گیا۔ پینگلوس نے اظہار کیا کہ "میں تو ہمیشہ شدید آلجھنوں ہی میں مبتلا رہا"۔ لیکن ایک بار یہ طے کر لینے کے بعد سارے کام حیرت انگیز طور پر ٹھیک چلتے رہتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے مفروضہ پر قائم رہا، اگرچہ یہ مفروضہ اس کے حقیقی احساسات سے قطعی مخالف تھا۔

ان کے پڑوس میں ایک بہت مشہور درویش رہتا تھا جو ترکی میں سب سے بڑا فلسفی سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب اس سے دریافت کرنے گئے۔ پینگلوس کو نمائندہ چنا گیا، اور اس نے درویش سے کہا "آقا، ہم یہ خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمیں بتائیں انسان جیسا عجیب و غریب حیوان کیوں پیدا کیا گیا تھا؟"

درویش نے کہا "تمھیں اس سے کیا؟ یہ معلوم کرنا کیا تمہارا کام ہے؟" کینڈائڈ نے کہا "لیکن میرے مخدوم باپ دنیا میں بے انتہا بدی ہے"۔ درویش بولا "یہ کس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیکی ہے یا بدی؟ جب اعلیٰ حضرت ایک جہاز مصر روانہ فرماتے ہیں تو کیا انھیں اس کی پریشانی ہوتی ہے کہ جہاز میں جو چوہیاں ہیں وہ آرام سے ہیں یا نہیں؟" پینگلوس نے پوچھا "اچھا تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ انسان کیا کرے؟" درویش نے کہا "اپنی زبان کو لگام دو۔" پینگلوس بولا "میں نے اپنے آپ سے اس مسرت کے حاصل کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ آپ سے علت و معلول، اچھی سے اچھی دنیا، بدی کے آغاز، روح کی کیفیت، پہلے سے قائم شدہ ہم آہنگی ——— یہ باتیں سن کر درویش نے دروازہ بند کر دیا اور یہ کھڑے سنتے دیکھتے رہ گئے۔

اس گفت و شنید کے دوران خبر آئی کہ دو وزیروں اور ایک مفتی کا گلا گھونٹ دیا گیا، ان کے ہمت بے دوستوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اس آفت کا شور کئی گھنٹے بتدریج بار بار۔ پینگلوس، کینڈائڈ اور مارٹن جب اپنے کھلیان کی طرف واپس چلے تو راستہ میں انھوں نے ایک اچھی صورت شکل کے بڑے میاں کو اپنے دروازے میں سنتروں کے درختوں کے ایک جھنڈ تلے ہوا کھاتے دیکھا۔ پینگلوس، جسے اتنی ہی پرجوش رہتی تھی جتنی فلسفہ کو، ان بڑے میاں سے اس مفتی کا نام پوچھنے لگا جس کا ابھی گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ بھلے آدمی نے کہا "مجھے اس واقعہ کا کوئی علم نہیں ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ عمر بھر میں مجھے ایک بھی مفتی یا ایک بھی وزیر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آپ جو کہانی سنا رہے ہیں میں نے کبھی نہیں سنی، اور سمجھتا ہوں کہ عام طور سے جو لوگ

ریاست کے معاملات میں گرفت ڈھیلی رہتے ہیں۔ بعض اوقات بڑی عبرت ناک صورت سے ہم کنار ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس کے سزاوار نہیں تھے۔ لیکن میں اپنے سر کو یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں دیتا کہ قسطنطنیہ میں کیا ہو رہا ہے۔ میں جو پھل اپنے ہاتھوں سے اس باغ میں کاشت کرتا ہوں انہیں وہاں بھیجنے پر قناعت کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے اجنبیوں کو اپنے گھر میں لاکر گھر والوں سے متعارف کرایا۔ اس کی دو بیٹیوں اور دو بیٹوں نے کئی قسم کے شربتوں سے ان کی تواضع کی جو انھوں نے خود بنائے تھے۔ ان کے علاوہ انھیں مُربّے کھلائے، تنکنے، سنگترے، لیموں، کیلے اور پستے کھلائے اور میوہ کی کالی پلاؤ جس میں بٹے ویا اور انگلستان کی بڑی مانی کی آمیزش نہیں تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد اس اچھے سلوک کی دونوں بیٹیوں نے کینڈائڈ، پینگلوس، اور مارٹن کی ڈاڑھیوں میں عطر لگایا۔

کینڈائڈ نے ترک سے کہا "آپ کی تو بہت بڑی اور زرخیز املاک ہوگی۔" ترک نے کہا "میرے پاس صرف بیس ایکڑ زمین ہے۔ اس میں میں اور میرے بچے کاشت کرتے ہیں۔ محنت ہمیں تین سب سے بڑی خرابیوں سے بچائے رکھتی ہے، بے راہ روی، بدی، احتیاج۔"

جب کینڈائڈ اپنے کھلیان کو واپس چلا تو اس نے ترک کی گفتگو پر غور کیا۔ پینگلوس اور مارٹن سے بولا "اس اچھے بوڑھے آدمی کی حالت، اُن چھ بادشاہوں پر فوقیت رکھتی ہے جن کے ساتھ کھانے کی عزت ہمیں حاصل ہوئی ہے۔" پینگلوس نے کہا "فلسفیوں کی رائے میں بادشاہت کی شان و شوکت بڑی پُرخطر ہوتی ہے۔ کیونکہ مختصراً کہتا ہوں موآبائیوں کے بادشاہ ایگلون کو ایہود نے قتل کیا۔ ابسوم کو سر کے بالوں سے لٹکایا گیا اور تین تیر اُسکے جسم میں سے پار کئے گئے۔ بیرو بوام کے بیٹے بادشاہ ناداب کو باشانے مار ڈالا۔ بادشاہ ایلہ کو زمری نے، اخازیہ کو جی ہو نے، اتھالیا کو جیہوئی عادہ نے۔ یہکونیاس اور زیدی کیاس، شاہان جوآخم قید و بند میں ڈالے گئے۔ کرووسس، استیاجیز، دارا، سائرا کیوز کے، دایونی سیس، نائی رسس، پرسیوس، ہنی بال، جغرط، ایریووستوس، سیزر، پامپی، نیرو، اوتھو، ویتیلیوس، دومی شیئن، ہنری چہارم، ایڈورڈ دوئم، ہنری ششم، رچرڈ سوئم، میری اسٹوارٹ، انگلستان کا چارلس اوّل، فرانس کے تینوں ہنریوں، اور شہنشاہ ہنری چہارم، ان سب کا جو انجام ہوا تم جانتے ہی ہو۔ اور یہ بھی تم جانتے ہو ـــــــ" "ہاں میں جانتا ہوں" کینڈائڈ نے بات کاٹ کر کہا "کہ ہمیں اپنے باغ کی سیدھ کرنی چاہئے۔" پینگلوس بولا "تم ٹھیک کہتے ہو، کیونکہ جب انسان کو جب باغ عدن میں رکھا گیا تھا تو اس لئے رکھا گیا تھا کہ باغ کی کاشت کرے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اسلئے پیدا نہیں کئے گئے کہ بے کار رہیں۔" مارٹن نے کہا "بحث مباحثہ کئے بغیر ہمیں کام کرنا چاہئے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے زندگی کو قابل برداشت بنانے کا۔"

اس چھوٹے سے معاشرہ کے تمام افراد اس مستحسن ارادے پر اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کاربند ہو گئے۔ ان کے مختصر سے قطعۂ اراضی میں بہت سی فصل ہوئی۔ کیونگوندی بڑی گھریلو عورت تھی، لیکن وہ نہایت عمدہ کھانے پکانے لگی۔ پے کیونیٹے نے سوزن کاری شروع کر دی، اور بڑھیا نے کپڑے لتے کی نگرانی اپنے ذمے لی۔ اس گروہ میں اب کوئی بیکار نہیں تھا، حروف علّت بھی نہیں، وہ بڑا اچھا بڑھئی بن گیا اور نہایت دیانتدار انسان بھی۔

دوسرا پیغمبر مس، اسے بظاہر اس کا پوشیدہ احساس تھا کہ اپنے نظریہ کی تکمیل کے لئے اسے مسلسل محنت کرنی چاہیئے اور اس کی ساری توش تدبیری اسی میں صرف ہونی چاہیئے۔ وہ اپنی دھن میں مگن رہا، اس کی فکری اور تخلیقی صلاحیتیں اس انہماک سے ایک لمحہ کے لئے بھی علیحدہ نہیں کی جاسکتی تھیں۔ جب بھی موقع ملتا وہ کینڈائڈ سے کہتا "اس احسن ترین دنیا میں تمام واقعات بطریق احسن مربوط ہیں۔ اگر سلسلۂ عظیم کی ایک کڑی بھی چھوٹ جائے تو کل کائنات کی ہم آہنگی برباد ہو جائے گی۔ اگر تم اُس حسین محل سے مس کیونی گوندی کی محبت میں بے رحم لاتیں کھا کر نہ نکلتے، اگر عدالتی تحقیقات میں تمہیں سزائے قید نہ ہوتی، اگر تم امریکہ کا بڑا حصہ پیدل طے نہ کرتے، اگر تم نواب کو اپنی تلوار بھونک کر نہ مار دیتے، اگر تمہاری وہ تمام بھیڑیں جو تم اس عمدہ ملک ایلڈوریڈو سے لائے تھے گم نہ ہو جاتیں، اور وہ کل دولت جوان پر لدی تھی ضائع نہ ہو جاتی، تو آج تم یہاں بیٹھے ترنج کا مربہ اور پستے نہ کھاتے ہوتے۔"

کینڈائڈ نے کہا "خوب بات کہی تم نے اور ہو سکتا ہے کہ سچی بھی ہو۔ مگر ہمیں اپنے باغ کی سیوا کرنی چاہیئے۔"

(فرانسیسی)

لغاتِ فلسفہ

مصنفہ ۔ وا لٹیئر

مترجمہ ۔ شاہد احمد دہلوی

مساوات

ایک کتے کا دوسرے کتے پر کیا واجب ہے اور ایک گھوڑے کو دوسرے گھوڑے کا کیا دینا ہے؟ کچھ بھی نہیں کوئی جانور اپنے جیسے جانور کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن انسان جس نے خدا سے وہ شے پائی ہے جسے شعور کہتے ہیں۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کہ دنیا میں وہ بالکل غلام ہے۔

اس دنیا در حقیقت وہ شے ہی ہوتی جیسی نہ فرض کیا جاتا ہے ہونی چاہئے۔۔۔۔ اگر انسانوں کو اس میں ہر جگہ آسانی اور یقین کے ساتھ روزی مل جایا کرتی، اور مزاج کے موافق موسم میسر آجاتا تو ظاہر ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو محکوم بنانا ناممکن ہوتا۔ اگر دنیا خوش و خرم پھلوں سے لد جاتی، اگر وہ ہوا جس پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے ہم تک امراض اور قبل از وقت موت نہ پہنچائے، اگر انسان کو ہر فی اور ہر ان کی طرح کی بسکن کی ضرورت نہ ہو، تو اس صورت میں چنگیز خانوں اور تیمور لنگوں کے پاس سوائے ان کے اپنے بچوں کے اور کوئی خدام نہ ہوں گے، اور یہ بچے بڑے بڑے عاقل و دانشمند ہوں گے اور بڑھاپے میں بڑی محبت سے ان کی خدمت کریں گے۔

قدرت کی اس یعنیت میں جس سے بے خانماں چوپائے، پرندے، اور حشرات الارض لطف اندوز ہوتے ہیں، انسان بھی اسی قدر خوش و خرم رہتے جتنے کہ یہ جانور۔ ایک کا دوسرے پر غلبہ محض ایک خیالی خوف ہوتا۔۔۔۔ ایک ایسی مہمل بات جس کا کسی کو خیال بھی نہ آتا، کیونکہ جب خدمت ہی درکار نہ ہو تو خدمتگاروں کی تلاش کیوں ہو؟

اگر کسی کے بازو اور جابر مزاج فرد کے دل میں سما جائے کہ اپنے کم طاقت پڑوسی کو زیر کرلے تو اس کی کامیابی ناممکن ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر ظلم اپنی تیاری مکمل کرلے، مظلوم دشمن پر جا پہنچے گا۔

اگر احتیاجیں ساتھ نہ لگی ہوتیں تو کل انسان ضرور برابر ہوتے۔ یہ ہلاکت ہی ہے جو نوع انسانی سے وابستہ ہے جو ایک انسان کی محکومی میں دے دیتی ہے۔ اصل شکایت عدم مساوات کی نہیں بلکہ محتاجی کی ہے۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ حضرت کہلاتا ہے تو کیا؟ اور اگر کوئی اور تقدس مآب کہلاتا ہے تو کیا؟ مگر میرے لئے یہ ناگوار ہے کہ میں کسی کا ملازم ہوں۔

ایک بڑے خاندان نے اچھی زمین کاشت کی ہے، پڑوس میں رہنے والے دو چھوٹے خاندان بنجر زمینوں پر گزر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان دو غریب خاندانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ امیر خاندان کی ملازمت کریں، یا اُسے تباہ کر دیں۔ یہ کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ دو مفلس خاندانوں میں سے ایک خاندان امیر خاندان کے پاس جاتا ہے اور روٹی کے عوض اپنی خدمات پیش کرتا ہے، دوسرا خاندان جا کر اس پر حملہ کر دیتا ہے اور مغلوب ہو جاتا ہے۔ خدمت گزار خاندان آغاز ہے خدمتگاروں اور مزدوروں کا، جو مغلوب ہو گیا آغاز ہے غلاموں کا۔

ہماری خطرناک دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ معاشرہ میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم ہونے سے روکا جائے۔ ایک امیر جو حکم دے اور دوسرا غریب، جو حکم مانے۔ اور یہ دونوں اور کئی طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اپنے فرق کے درجے ہوتے ہیں۔

"غریب ناخوش نہیں ہوتے۔ بیشتر تعداد اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے اور مسلسل محنت انھیں اپنی کیفیت پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتی۔ اور جب وہ شدت سے محسوس کرتے ہیں تو لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں، جیسے روم میں عوامی پارٹی اور مجلس حمائد میں، اور جرمنی، انگلستان اور فرانس کے دیہاتیوں میں۔ یہ ساری لڑائیاں دیر سویر ختم ہو گئیں اور انجام کار عوام غلامی میں پڑ گئے، کیونکہ بڑوں کے پاس دولت ہے، اور دولت کا سکہ ہر جگہ چلتا ہے۔ یہ کیفیت میں نے ریاست کی بیان کی ہے، کیونکہ قوموں قوموں کے درمیان صورت حال دوسری ہوتی ہے۔ وہ قوم جو لوہے کا سب سے صحیح استعمال کرتی ہے اُس قوم کو ہمیشہ دبا لے گی جس کے پاس سونا زیادہ اور ہمت کم ہو۔

ہر شخص قوت، دولت، اور عیش کا رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے، اور آرام طلبی کی زبردست خواہش بھی۔ نتیجۃً ہر شخص آرزومند ہوتا ہے کہ دوسروں کی دولت اور بیویوں اور بیٹیوں پر قابض ہو جائے، ان کا آقا بن جائے تاکہ انھیں جس طرح بھی چاہے اپنا غلام بنائے رکھے، اور کوئی کام نہ کرے، یا کم از کم کوئی ایسا کام نہ کرے جو ہر لحاظ سے دل آویز نہ ہو۔ آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایسی اطیف طبیعتیں ہوں وہاں یہ ناممکن ہے کہ انسانوں میں مساوات ہو، بالکل اُسی طرح جیسے دو واعظ یا مذہب کے استاد کہ رقابت سے باز رہ ہی نہیں سکتے۔

نسل انسانی، جیسی کچھ بھی ہو اس کی تشکیل ہوئی ہے، قائم نہیں رہ سکتی جب تک اس میں بے شمار افراد ایسے نہ ہوں جن کے پاس کوئی ملکیت نہ ہو، کیونکہ جو شخص آرام کی زندگی گزار رہا ہو اسے کیا پڑی ہے کہ اپنی زمین چھوڑ کر آپ کی زمین کاشت کرنے آجائے! اور اگر آپ کو جوتی چاہیئے تو کوئی وکیل ٹھوڑی آپ کو بنا کر دے گا۔ لہٰذا مساوات ایک ہی وقت میں سب سے نظری چیز بھی ہے اور سب سے موہوم بھی۔

اگر اختیار میں ہو تو لوگ ہر چیز کو اس کی انتہا کو پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح مساوات کو بھی حد کو پہنچا دیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں یہ اصول رکھا گیا ہے کہ کسی باشندے کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ اپنے جنم بھوم کو ترک کر دے۔ ایسے دستور کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ "یہ ملک اس درجہ تباہ حال ہے، اور یہاں کی حکومت اس قدر ناکارہ ہے کہ اسے ترک کرنے کی ہم ہر شخص کو ممانعت کرتے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں سبھی اسے چھوڑ کر نہ نکل جائیں؛ بہتر صورت حال پیدا کرو۔ اپنی رعایا میں

خواہش پیدا کرو کہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور غیر ملکیوں میں شوق پیدا ہو کہ آئیں اور تمہارے ملک میں بس جائیں۔

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ دوسروں سے اپنی برابری کے متعلق ذاتی رائے رکھے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ لاٹ پادری کا باورچی یہ طے کرے کہ اپنے آقا کو کھانا پکانے کا حکم دے۔ باورچی یہ البتہ کہہ سکتا ہے کہ "میں ایک انسان ہوں، اپنے آقا کی طرح۔ میں بھی اس کی طرح رونا ہوا پیدا ہوا تھا، اور اسی کی طرح کرب میں مروں گا، اور میرے مرنے کی رسوم بھی اسی جیسی ہوں گی۔ ہم دونوں ایک ہی طرح کے حیوانی فرائض ادا کرتے ہیں۔ اگر ترک روم پر قابض ہو جائیں اور اس وقت میں لاٹ پادری ان جہازوں اور لاٹ پادری باورچی بن جائے تو میں اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لوں گا۔" یہ بات بڑی معقول اور صحیح ہے، لیکن جب تک ترک آخر روم پر قبضہ پائے اس وقت تک تو باورچی کو اپنا فرض ادا کرنا پڑے گا، ورنہ پورا انسانی معاشرہ الٹ جائے گا۔

رہا وہ شخص جو نہ تو لاٹ پادری کا باورچی ہے اور نہ ریاست میں اُسے کوئی عہدہ ہی حاصل ہے ——— وہ شخص جس کے کوئی تعلقات نہیں ہیں اور جو اس بات سے متنفر رہتا ہے کہ سب اس سے سرپرستانہ یا حقارت سے ملتے ہیں جسے صاف دکھائی دیتا ہے کہ بہت سے اونچے درجے کے اور خطاب یافتہ لوگ علم، ذہانت، یا خوبی میں مجھ پر فوقیت نہیں رکھتے، اور جو بار باران کی ڈیوڑھیوں پر حاضری دینے سے اکتا چکا ہے ——— ایسے آدمی کو کیا کرنا چاہئے؟ اسے دور رہنا چاہئے۔

آزادی

ا : توپوں کی ایک باڑ ہمارے کانوں پر چھوڑی جاتی ہے، کیا آپ کو اس کی آزادی حاصل ہے کہ جی چاہے تو اسے سنیں اور جی نہ چاہے تو نہ سنیں؟

ب : یقیناً میں اپنے آپ کو اس کے سننے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

ا : کیا آپ اس پر رضامند ہیں کہ یہ توپیں آپ کا سر اڑا دیں، اور آپ کی بیوی اور بیٹی کے بھی، جو آپ کے ساتھ چہل قدمی کر رہی ہوں؟

ب : کیا خوب سوال ہے؟ جی نہیں، کم از کم جب تک میں اپنے صحیح ہوش و حواس میں ہوں۔ ایسی کوئی بات پسند نہیں کروں گا۔ یہ ناممکن ہے۔

ا : بہت خوب! آپ ان توپوں کی آواز ضرور سنیں گے، اور آپ یہ خواہش بھی ضرور نہیں کرتے کہ توپوں کے چھوٹنے سے آپ مر جائیں اور آپ کی بیوی اور بچی بھی مر جائے۔ آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ آپ ان کی آواز نہ سنیں، اور نہ یہ اختیار ہے کہ یہیں رہیں۔

ب : ظاہر ہے۔

ا : میں فرض کرتا ہوں کہ توپوں کی زد سے آپ تیس قدم آگے نکل گئے ہیں۔ آپ کو یہ چند قدم میرے ساتھ چلنے

کا اعتقاد حاصل تھا۔

ب: یہ بھی بالکل ظاہر ہے۔

ا: اور اگر آپ مفلوج ہوتے تو توپوں کی زد سے آپ نہیں بچ سکتے تھے۔ آپ کو ان کا شور ضرور سننا پڑتا، نوپ کا گولہ آپ کو زخمی بھی کر دیتا، اور آپ مرہمی ضرور جاتے۔

ب: اس سے زیادہ اور کیا سچ ہو سکتا ہے۔

ا: اچھا تو آپ کی آزادی پھر کس چیز سے عبارت ہے، اگر اس قوت سے نہیں جو آپ کے جسم نے حاصل کی ہے اس کام کے کرنے کی جسے قطعی ضرورت کے تحت آپ کے ارادہ نے چاہا؟

ب: آپ مجھے الجھن میں ڈال رہے ہیں۔ تو آزادی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ میں چاہوں اسے کرنے کی قوت کا نام ہے؟

ا: سر چیئے۔ اور دیکھیے کہ کیا آزادی کو کسی اور طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے؟

ب: اس لحاظ سے میرا شکاری کتا بھی اتنا ہی آزاد ہے جتنا میں۔ جب وہ خرگوش کو دیکھتا ہے تو ضرور اس کے پیچھے دوڑنے کا ارادہ کرتا ہوگا۔ بشرطیکہ اس کی ٹانگوں میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ لہٰذا کتے پر مجھے کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ آپ نے مجھے گھٹا کر جانوروں کی سطح پر پہنچا دیا۔

ا: یہ گھٹیا دلیلیں ہیں، اور وہ گھٹیا سوفسطائی کتے جنھوں نے آپ کو پڑھایا۔ آپ اپنے کتے کی طرح آزاد ہونے پر رضامند نہیں ہیں۔ کیا آپ تقریباً اسی جیسے رجحانات کے ساتھ کھاتے، سوتے، اور پیدا نہیں کرتے؟ کیا آپ ناک کے علاوہ کسی اور طرح بھی سونگھ سکتے ہیں؟ اپنے کتے سے مختلف آزادی کے مالک آپ کیوں بننا چاہتے ہیں؟

ب: مگر مجھ میں ایک روح ہے جو عقل آرائی کرتی ہے، اور میرا کتا بالکل حجت نہیں کرتا۔ اس کے دماغ میں سیدھے سادے خیالات آتے ہیں، اور میرے ذہن میں ہزاروں مابعد الطبیعاتی تصورات بھرے رہتے ہیں۔

ا: ہاں، تو آپ اس سے ہزار گنا آزاد ہیں، آپ میں اس سے ہزار گنی فکر کی قوت ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کسی اور لحاظ سے اپنے کتے سے زیادہ آزاد نہیں ہیں۔

ب: کیا! میں کیا اپنے ارادے میں آزاد ہوں؟

ا: اس کا آپ کیا مطلب سمجھ رہے ہیں؟

ب: وہی سمجھ رہا ہوں جو ساری دنیا سمجھتی ہے۔ کیا یہ روزانہ نہیں کہا جا رہا کہ ارادہ آزاد ہوتا ہے؟

ا: کہاوت تو دلیل نہیں ہوتی۔ آپ مکمل کر بیان کیجیے۔

ب: میں سمجھتا ہوں کہ میں جیسا ہوں ارادہ کرنے میں آزاد ہوں۔

ا: اجازت ہو تو عرض کروں کہ یہ مہمل بات ہے۔ آپ نہیں دیکھتے یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ میں ارادہ کروں گا

کہ ارادہ کروں! نتیجۃً آپ صرف اُن تصورات کا ارادہ کر سکتے ہیں جو آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ شادی کریں گے؟ ہاں یا نہیں؟

ب: فرض کیجیے میں جواب دیتا ہوں "نہ" یہ بتائیے وہ؟

ا: اس صورت میں آپ کا جواب اس شخص جیسا ہوگا جس نے کہا تھا "بعض کو یہ یقین ہے کہ لاٹ پادری مازرین مر گیا، بعض کو یہ یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ میں نہ اس پر یقین کرتا ہوں اور نہ اُس پر۔"

ب: اچھا تو میں شادی کروں گا۔

ا: ہاں! یہ ایک جواب ہوا۔ کیوں کریں گے آپ شادی؟

ب: یوں کہ میں ایک جواں جسم، دلکش، اعلیٰ تعلیم یافتہ، مالدار لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوں، وہ گاتی بہت اچھا ہے، اس کے والدین بڑے دیانت دار ہیں، اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اور اس کے گھر والے میرے آنے جانے سے خوش ہوتے ہیں۔

ا: ہاں اس میں دلیل ہے۔ آپ نے دیکھا کہ بغیر کسی محرک کے آپ ارادہ نہیں کر سکتے۔ میں آپ سے اعلانیہ کہتا ہوں کہ آپ شادی کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ قوت حاصل کہ آپ معاہدے پر دستخط کر دیں

ب: کیسے! میں بغیر کسی محرک کے ارادہ نہیں کر سکتا؛ تو پھر اس دوسری کہاوت کا کیا ہوگا ——— میرا ارادہ میرا سبب ہے ——— میں ارادہ پورا کرنے رہوں گا کیونکہ میں نے اس کا ارادہ کر لیا ہے۔

ا: میرے پیارے دوست! اصل ہے یہ۔ پھر تو آپ کے پاس ایک نتیجہ ہوگا بغیر سبب کے۔

ب: کیا! جب میں طلاق و جنت کھیلتا ہوں تو کیا طلاق کے بدلے جنت چننے میں میرے لئے کوئی سبب ہوتا ہے؟

ا: بے شک۔

ب: اچھا تو مہربانی سے یہ بتائیے کیا سبب ہوتا ہے؟

ا: یہ کہ طلاق کا میں جنت کا تصور آپ کے ذہن میں پیش ہوتا ہے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات ہوگی۔ اگر بعض صورتوں میں تو ہم اس لئے ارادہ کریں کہ ایک محرک موجود ہو اور بعض میں ہم ارادہ کریں بغیر محرک کے۔ جب آپ شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ ظاہر ہے کہ اس کے نمایاں سبب کا ادراک کرتے ہیں۔ آپ اس کا ادراک طلاق و جنت کے تکمیل میں نہیں کرتے، مگر سبب اس کا کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا ہے۔

ب: لہٰذا ایک بار پھر میں آزاد نہیں رہا۔

ا: آپ کا ارادہ آزاد نہیں ہے، لیکن آپ کے عمل آزاد ہیں۔ جب آپ کو عمل کی قوت حاصل ہو تو آپ آزاد ہیں کہ عمل کریں۔

ب: لیکن میں نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں بے اعتنائی کی آزادی پر ———.

لا : ۔ سب مہمل ہیں۔ بے اعتنائی کی آزادی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ ایک لفظ بے معنی ہے، جسے کسی ایسے ہی مہمل انسان نے تراشا ہے۔

محبت

یہ فطرت کی بساط پر تصور کی گل کاری ہے۔ اگر آپ محبت کا کوئی تصور قائم کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پائیں باغ میں چڑیوں کو دیکھئے، اپنی فریوں کو دیکھئے، اس سانڈ کو دیکھئے جو بچھیا پر چھوڑا جاتا ہے، اس قوی اور پرجوش گھوڑے کو دیکھئے جسے آپ کے دو سائیس گھوڑی کی جانب لے جا رہے ہیں، جو خاموشی سے اس کی منتظر ہے اور اس کے قریب آنے سے خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔ گھوڑے کی آنکھوں کی چمک دیکھئے، اس کے نتھنے کی توانائی اور بلندی دیکھئے، اس کی جست و خیز دیکھئے، گھنگھیاں کھڑی ہوئیں، تشنج آمیز سانسوں سے منہ کھلا ہوا، پھیلے ہوئے نتھنے، سانسوں میں آگ کی لپٹ، ہوا میں اڑتے ہوئے ایال کے بال، اور وہ تندی و تیزی جس سے وہ اس شے کی طرف جھپٹتا ہے جسے قدرت نے اس کے لئے تجویز کیا ہے۔ مگر اس کی سرخوشی پر آپ حسد نہ فرمائیے، بلکہ نوع انسانی کی برتری پر غور کیجئے۔ حیوانِ محض پر جو فوقیت قدرت نے فرمائی ہیں ——— قوت، حسن، سبک پن اور سرعت، ان سب کی کافی طور پر محبت میں کمی کر دی گئی ہے۔

لیکن اس درجے کے جانور بھی پائے جاتے ہیں جو جنسی تعلقات سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ مچھلیاں اس لذت سے محروم ہیں۔ پانی کی گہرائیوں میں مادہ اپنے لاکھوں انڈے چھوڑ جاتی ہے اور جو تراں پر سے گزرتا ہے جہاں بخش اصول پر کاربند ہوتا ہے۔ انڈے دینے والی مادہ سے کبھی نہیں ملتا بلکہ شاید اسے پہچان بھی نہیں سکتا۔

جنسی کرنے والے جانوروں میں بڑی تعداد ان کی ہے جو صرف ایک حس کی لذت کا ادراک کرتے ہیں۔ اور جب بھوک مٹ جاتی ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جانور اغل گہر ہونا نہیں جانتا۔ اس کا سارا جسم حساس ہوتا ہے۔ اس کے لب بالخصوص ایک ایسی لذت محسوس کرتے ہیں جو کبھی کم نہیں ہوتی، اور یہ صرف اس کی نوع کا حصہ ہے۔ پھر یہ کہ ہر موسم میں اپنے آپ کو محبت کے اعمال کے حوالے کر سکتا ہے۔ حیوانِ محض کے لئے صرف ایک محدود زمانہ ہوتا ہے۔ اگر ان اعلیٰ درجے کی فوقیتوں پر غور کریں تو آپ روچیسٹر کے رئیس کا یہ قول مان لیں گے کہ محبت دہریوں کی قوم کو خدا کی عبادت کرنے پر دمکیل سکتی ہے۔

انسانوں کو چونکہ یہ حکم و دیعت کیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی قدرت نے انھیں بخشا ہے اس کی تکمیل کریں۔ اس لئے انھوں نے عطیۂ محبت کو بھی مکمل کر لیا۔ مثلاً اپنے جسم کی دیکھ بھال، اور صحت کا خیال رکھنے سے جسم زیادہ حساس ہو جاتا ہے، لہٰذا اس کی لیکن کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے خوش گوار اور بے ہنگام جذبات بعد میں محبت کے جذبے میں داخل ہو تے ہیں، ان دھاتوں کی طرح جو سونے میں مل جاتی ہیں۔ دوستی اور تکریم اس کی امداد کو بڑھتی ہیں، جسم اور روح دونوں کے جوہر کھلتے ہیں اور نئے تقویت بخش رشتے قائم ہونے لگتے ہیں۔

ان سب پر مستزاد ذاتی محبت ان تمام بندھنوں کو کھینچ کر قریب تر کر دیتی ہے۔ مرد اپنے انتخاب پر ناز کرنے لگتے

ہیں، اور وہ بے شمار عجیب نظر آ رہا ہوں سے لڑے چلے آتے ہیں۔ اُس تصویر کے نقش و نگار بن جاتے ہیں جس کا نسخہ بنانے قدرت نے ازل سے مضبوط رکھا تھا۔

یہ ہیں وہ فوائد جو انسان کو جانوروں کے مختلف قبیلوں پر حاصل ہیں۔ لیکن اگر انسان ان لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے جن سے حیوان ناآشنا ہے تو وہ اس لئے کہ اس نے بعض وہ بے اندازہ اجنبیں اور نفرت انگیز باتیں ہیں جن کا شکار انسان ہوتا ہے مگر حیوان ان سے آزاد رہتے ہیں۔ ان میں سب سے خوفناک وہ ہے جس سے فطرت نے محبت کی۔ لذتوں اور زندگی کے سرچشموں کو مسموم کر دیا۔ اور ایک بھیانک بیماری کی صورت میں تین چوتھائی دنیا پر مسلط کر دیا۔ اس بیماری کا شکار صرف انسان ہے۔ دوسری بیماریوں کی طرح یہ بیماری افراد کا نتیجہ نہیں ہے۔ عیاشی اسے دنیا میں لانے کا سبب نہیں ہے۔ ذہنی اور جسمی، فلورا اور میسالینا پر اس بیماری کا حملہ کبھی نہیں ہوا۔ یہ ان جراثیموں سے اٹھی جہاں نوع انسانی مجموعیت میں زندگی بسر کر رہی تھی اور پرانی دنیا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

اور کوئی صورت ایسی ہو سکے جس کی رو سے قدرت پر خود اپنی تخلیق کو ذلیل کرنے، اپنے ہی منصوبے کو ناکام بنانے، اور اپنے ہی نظریوں کی مخالفت کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے تو ایسی نفرت انگیز عذاب کو پیش کیا جا سکتا ہے تو کیا پھر بھی اسی کو اچھی سے اچھی دنیا کہا جائے گا؟ اگر سیزر اور نپولین اور اگیتوی اس کو یہ بیماری کبھی نہیں ہوئی تو کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ فرانسس اول کو اس بیماری سے مرنے سے بچا لیا جاتا؟ کہا جاتا ہے کہ نہیں۔ یہی مشیتِ ایزدی تھی اور خدا کے ہر کام میں بھلائی ہوتی ہے۔ میں اس پر یقین لانا چاہتا ہوں۔ مگر بمشکل نظر آتا ہے۔

انسان

(کیا انسان بد پیدا ہوا ہے؟)

کیا یہ عملاً دیکھا نہیں گیا کہ انسان بدکیش پیدا نہیں ہوا، اور بد زائیدہ گاہیں ہے۔ اگر اس کی فطرت بد ہوتی تو وہ چلنے کے قابل ہوتے ہی بڑے بڑے جرائم اور وحشیانہ مظالم کرنے لگتا۔ پہلی دفعہ چھری ہاتھ میں آتے ہی اپنے ناخوش کرنے والے کو زخمی کر دیتا ضرور دھان بھیڑیوں اور لومڑیوں کے بچوں سے مشابہ ہوتا جو جلد از جلد کاٹنے لگتے ہیں۔

اس کے برعکس دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک۔ شیرخوارگی کے زمانے میں اس کی فطرت بھیڑ کے بچے جیسی ہوتی ہے۔ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ وہ اکثر بھیڑیا اور لومڑی بن جاتا ہے؟ کیا حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان نیک یا بد تو پیدا نہیں ہوتا لیکن تعلیم، مثال، جو حکومت اس پر مسلط ہوتی ہے ——— مختصر یہ کہ ہر قسم کے مواقع ——— اسے نیک یا بد بنا دیتے ہیں؟

شاید انسانی فطرت کچھ اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ انسان ہمیشہ بھوکے خیالات میں نہیں پلتا، اور نہ سدا سچے میلانات اسے اپنا گہوارہ بنائے رہتے ہیں۔ نہ تو ہمیشہ خوش مزاج ہوتا ہے اور نہ ہمیشہ بے رحم۔

اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ نیکی کی ترازو میں عورتوں کا پلڑا مردوں سے بھاری رہتا ہے۔ ہم سیکڑوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن پاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں صرف ایک کلائی مسٹر اہیں دکھائی دیتی ہے۔

ایسے پیشے ہیں جو روح کو مزور بے رحم بنا دیتے ہیں، مثلاً فوجی کا پیشہ، قصائی، منصف، اور داروغۂ محبس۔ اور وہ تمام

کام جن کی بنیاد دوسروں کو تکلیف پہنچانے پر ہوتی ہے۔

جس کسی نے بھی شراب خانے کی کیفیت دیکھی ہے، جس کسی نے بھی وکیلوں کو آپس میں بے تکلف باتیں کرتے دیکھا ہے اور انھیں اپنے موکلوں کی بدنصیبیوں پر خود ستائی کرتے سنا ہے، اس کی رائے انسانی فطرت کے بارے میں بہت خراب ہی ہوگی۔

وہ عورتیں جو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مسلسل لگی رہتی ہیں، ہر جگہ مردوں سے کم بے رحم ہوتی ہیں۔

طبیعات اخلاقیات میں شامل ہو کر انھیں بڑے جرائم سے باز رکھتی ہے۔ ان کے خون میں اتنی گرمی نہیں ہوتی تیز شرابیں خونخواری کو اکساتی ہیں، عورتیں ان کی نسبتاً کم عادی ہوتی ہیں۔ ایک ظاہر خلعت عورت اس کا دہ ہزاروں انصاف کے شکار ہیں۔ جنھیں پھانسی دی گئی۔ ان میں مشکل سے ہزار میں چار عورتیں ہیں۔ غالباً کہیں اور بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایشیا میں عورتوں کی دو مثالیں بھی ایسی نہیں ملتیں جنھیں برسرِ عام سزا دی گئی ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے طور طریق اور عادتوں نے مردوں کو بہت بہادر بنا دیا۔

اگر یہ حقیقت عام اور بغیر استثنیٰ کے ہوتی تو مردوں کی نوع مکڑیوں، بھیڑیوں اور خونخوار جنگلی جانوروں سے زیادہ نفرت انگیز ثابت ہوتی۔ مگر خوش قسمتی سے وہ پیشے جو دل کو سخت کر دیتے ہیں اور قابلِ نفرت جذبات سے بھر دیتے ہیں بہت ہی کم ہیں۔ یہ دیکھئے کہ دو کروڑ کی قوم میں زیادہ سے زیادہ دو لاکھ فوجی ہیں۔ گویا دو سو افراد میں ایک فوجی۔

دوسرے پیشے جو اخلاق کے لئے خطرناک ہیں تعداد میں کم ہیں۔ مزدور، دستکار، اور فن کار اس قدر اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں کہ جرائم کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کیسے لوگ ہمیشہ پائے جائیں گے اور کتابوں میں ان کی تعداد ہمیشہ بڑھا کر لکھی جائے گی مگر در اصل ان کی تعداد جتنی زیادہ بتائی جاتی ہے اتنی ہی کم ہوتی ہے۔

اگر نوعِ انسانی ابلیس کی مملکت میں ہوتی تو دنیا میں کوئی انسان باقی نہ رہتا۔ ہمیں اپنے آپ کو مطمئن کر نا چاہئے، ہم نے اچھی فطرت کے لوگ پیکنگ سے لاروشل تک ہمیشہ دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ اور سند یافتہ واعظ، اور فارغ التحصیل حضرات چاہے جو کچھ کہیں سارے ٹائیٹس، تراجن، انٹینوس اور پیئر بیلی، بڑے دیانتدار لوگ ہو گزرے ہیں۔

شادی

میری ملاقات ایک عقل اندیش سے ہوئی۔ اس نے کہا "اپنے لوگوں کو آمادہ کرو کہ جلد از جلد شادی کر لیا کریں۔ پہلے سال ان کے ٹیکس چھوڑ دو۔ اور ان کے حصے کی رقم ان لوگوں سے وصول کرو جو اتفاق کی عمر میں تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔"

"تمہارے ہاں جتنے زیادہ شادی شدہ لوگ ہوں گے اتنے ہی کم جرائم ہوں گے۔ اپنے ہاں کے جرائم کے گوشواروں کے خوف انگیز خانوں پر نظر ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ایک باپ کے مقابلے میں سو مجرد نوجوانوں کو سزائے موت ملی۔"

"شادی لوگوں کو زیادہ صابر اور زیادہ دانشمند بنا دیتی ہے۔ بچوں کا باپ اپنے بچوں کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے اسے شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ اپنے ورثہ میں شرمناکی کو چھوڑ جانے سے ڈرتا ہے۔

"اپنے فوجیوں کو شادیاں کرنے دو۔ پھر وہ فوج سے فرار نہیں ہوگا۔ جب وہ اپنے خاندان سے وابستہ ہوں گے تو اپنے ملک سے بھی وابستہ ہوں گے۔" فیلڈ شاہی شدہ فوجی عموماً آوارہ گرد ہوتا ہے اور بس، جس کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ شاہ نپولین کی ملازمت کرے یا شاہ اشرف کی!

"رومن جنگجو شادی شدہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہونہار بچوں کے لیے لڑتے تھے، اور دوسری قوموں کے بیوی بچوں کو اپنا غلام بنا لیتے تھے۔"

ایک بڑے فلاسفر نے کہا تھا کہ شریف کا عالم بھی ہنسا، اور یہ بات ہمارے مدبروں میں شاذ ہی ہوتی ہے۔ مجھ سے میری جوانی میں کہا گیا تھا کہ دیوانوں میں صرف ایک ہی اچھا دستور تھا ——— کنوار پنے سے نفرت۔ اگر وہ جھوٹی قوم شادی کرنا انسانی فطرت میں اولیت نہ دیتی ——— اگر ان میں راہبات کے لیے خانقاہیں ہوتیں ——— تو وہ یقیناً برباد ہو جاتے۔

(فارسی)

تعریفات

عبید زاکانی

فصل اوّل (متعلق دنیا و مافیہا)

الدنیا	آنجا کہ ہیچ آفریدہ در وے نیاساید	ایسی جگہ جہاں کسی مخلوق کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہو
العاقل	آنکہ بدنیا دل نپردازد	عقلمند وہ ہے جو دنیا سے علاقہ نہ رکھے۔ (یہ بیچنے والوں سے)
الکامل	آنکہ از نکبت و شادی منفعل نشود	مکمل انسان وہ ہے جو نہ رنج سے متاثر ہو نہ خوشی سے
الفکر	آنچہ ہرہم ابیفائدہ بیار کند	تیال اسے کہتے ہیں جو انسان کو خواہ مخواہ بالکل پریشان کر دے
العاقل	آنکہ عقل معاش ندارد	دانشمند (تعلیم یافتہ) وہ ہے جسے حصول معاش کا شعور تک نہ ہو نہ وہ اپنی روزی کما سکے۔
الجاہل	دولت یار	جاہل وہ ہے جو قسمت کا دھنی ہو۔

فصل دوم (ترک اور ان کے دوست)

الیاجوج والماجوج	قوم ترکان کہ بولایتے متوجہ شوند	یاجوج ماجوج ان ترکی قبائل کو کہتے ہیں جو کسی ملک پر دھاوا کرنے جا رہے ہوں۔
الزبانیہ	پیشروان ایشاں	جہنم کے غیب (فرشتوں کے لیڈر)
الغلط	نتیجۂ ایشاں	ان لوگوں کی آمدنی سے جو نتیجہ برآمد ہو وہی قسط ہے۔
العسس	آنکہ شب راہ زندہ روز از بازار یاں	کانسٹیبل وہ ہے جو رات کو لوٹ مار کرے اور دن کو دکانوں سے رشوت اور نذرانہ وصول کرے۔

فصل سوم (قاضی اور اس کے صفات)

القاضی	آنکہ ہمہ را لعنت کنند	جسے تمام لوگ برا کہیں

الوکیل	ہمیشہ باطل گرداند	وکیل وہ ہے جو بے اصل اور بے بنیاد باتوں کو سچ کر دکھائے۔
الرشوۃ	کارسازیہا رکاں	رشوت اس چیز کا نام ہے جو غریبوں اور مظلوموں کی دستگیری کرے۔
السعید	آنکہ گرد رونے قاضی نہ بیند	خوش قسمت وہ ہے جس کو قاضی یا جج کا دیدار کبھی نصیب نہ ہو۔
الطبیب	نر	ایک بے مغز اور نادان آدمی
الشاعر	طامع خود پسند	ایک حاسد اور لبیلا انسان

فصل چہارم (امیروں اور ان کے متعلقین)

الشیخ	امیر	معلم الملکوت
ابن السبیل	آباج او	اس کے متبعین
الصوفی	صفت خور	جو دوسروں کی کمائی کھائے اور خود نہ کمائے
الحلاج	آنکہ دروغ بجہ خورد	جو کعبہ کی جھوٹی قسم کھائے

فصل پنجم (رؤسا اور ان کی عادات سے متعلق)

اللاف والوضاح	مایۂ ایشاں	بے باکی و بے شرمی شرفا کی تجارت کا سرمایہ ہے۔
الہیج	وجود شاں	ہیچ و پوچ شرفا کا وجود ہے
الجہول	تواضع شاں	ان کی آداب و تہذیب بالکل بے مغز اور بے اصل ہے۔
الکرام والسخاء	سخن شاں	شرفا کی لغت کا دوسرا نام غرور و حماقت ہے
الحرص والبخل والحسد	اخلاق شاں	حسد، بغض، غرور و تکبر یہ ان کی خصوصیات ہیں۔
الابلہ	آنکہ بر ایشاں امید خیر دارد	بے وقوف وہ ہے جو ان شرفا سے بھلائی یا جلب منفعت کی امید رکھے۔

فصل ششم (پیشہ ور اور صناع)

البازاری	آنکہ از خدا نہ ترسد	دکاندار وہ ہے جسے خوف خدا نہ ہو
العطار	آنکہ ہمہ را بیمار خواہد	عطار وہ ہے جو ہر شخص کو بیمار بنانے کا متمنی ہو۔
الطبیب (ڈاکٹر)	جلاد	جلاد و قاتل
الکذاب (جھوٹا)	المنجم	نجومی
المشتی گیر (پہلوان)	تنبل	کاہل بے وقوف، سادہ لوح، آوارہ

الدلال	حرامی باز	بازار کا مستند چور
الصدیک	آنچہ از مزروعات بر مالک رسد	جو چیز زمیندار کو فصل سے نہیں ملتی وہ ایک فیصدی ہے۔
الشکایۃ	آنچہ بر مالک برسد	جو مالک کے کانوں تک پہنچتی ہے وہ شکایت ہے۔

فصل ہفتم (شراب اور اس کے لوازمہ کے بارے میں)

الشراب	مایۂ آشوب	بے چینی اور اضطراب کا چشمہ
الزوراء الشاہد والشمع والمقل	آلات آں	چہرۂ گلچہرہ، حسن پرستی، قندیل، وقابلیت سب شراب نوشی کے ذرایع ہیں۔
المجنک والعود والمزمر	سازآں	بربط و طنبورہ و چنگ و رباب وغیرہ اس کا گانا بجانا ہے۔
المحن والبستان	موضع آں	باغ و چمن شراب پینے کی مناسب جگہ ہے۔
المشوربا والکباب	اغذیۂ آں	کباب و گزک شرابیوں کی غذا ہے۔
ہادم اللذات	رمضان	خوشی و لطف کو تباہ کرنے والا رمضان۔
لیلۃ القدر	شب عید	جشن کی رات

فصل ہشتم (بھنگ نوشی کے متعلق)

البنگ	آنچہ صوفیاں را بوجد آورد	بھنگ وہ ہے جو صوفیوں کو وجد و مسرت سے لبریز کر دے۔
المدمع والکرعم والعلزبین	آنکہ بنگ و شراب باہم خورد	زندہ دل وہ ہے جو شراب اور بھنگ دونوں پیے۔
المحروم	آنکہ از ایں دو یکے نخورد	مردہ دل وہ ہے جو دونوں کو منہ نہ لگائے۔

فصل نہم (صاحب خانہ اور اس کے متعلقین)

المجرد	آنکہ بر ریش دنیا خندد	نوجوان یا کنوارا وہ ہے جو دنیا کی داڑھی پر ہنسے۔
الشقی	کد خدا	بدقسمت وہ ہے جو صاحب خانہ ہو۔
ذوالقرنین	آں کہ دو زن دارد	جس کی دو بیویاں ہوں وہ ذوالقرنین ہے۔
الشقی الاشقیاء	آنکہ بیشتر دارد	سب سے زیادہ بدقسمت وہ ہے جس کی دو سے زیادہ بیویاں ہوں۔
الباطل	کد خدائی	لایعنی اور بے کار صاحب خانہ کی زندگی۔
الضائع التلف	روزگار او مال او	ضائع ہونے والی چیز وقت اور صاحب خانہ کی دولت۔
البریشان	خاطر او	پریشان کرنے والا صاحب خانہ کا دماغ

الزاغ	سیاہ رنگ کا	کوا
الاقمر ۱	خانہ خراب	خانہ خراب
العدو خانگی	خویش	خویش
الہدہد	آدمی پدر زن دار باشد	جو داماد ہو
الضفدع	بزدل	بزدل
الخنزیر	مرد بے غیرت	مرد بے غیرت
الغربۃ الشدیدہ	فاقہ	فاقہ

مجنوں صاحب خانہ کی حیاتی

اس کے دولت کدہ کا نام ماتم سرا ہے۔	
مجھ سے دشمن اس کا تعلق الرشید	
یہ نصیب وہ جو لڑائی کی وجہ سے رنج اٹھائے۔	
حلیف۔ صاحب خانہ کا بھائی	
ریشۂ دار۔ اس کا بھائی دشمن	
افسوس کے بعد خوشی طلاق ثلاثہ سے حاصل ہوئی۔	

فصل دوم (عورت کی حقیقی فطرت کے متعلق)

الخائن	آدمی معشوق بسیار دارد	تمہارے کی تعریف یہ ہے کہ اس کے بہت سے خواستگار ہوں۔
الکذاب	آدمی بسیار دارد	بیخبری کی صفت یہ ہے کہ اس سے چاہنے والے کم ہوں۔
المستور	آدمی یک عاشق قانع باشد	پردہ باز۔ جو ایک عاشق پر قناعت کرے۔

(روسی)

ترجمہ: مظفر علی سید

کتّا اور بیل

ایوان کریلوف

کتّا اور بیل

ایک کتّا اور ایک بیل ـــــ جو ایک ہی کسان کی خدمت میں تھے ـــ ایک دن اپنی اپنی خوبیوں پر بحث کرنے لگے۔

اصحاب کمت کے ساتھی نے کہا: "کیا کہنے ہماری قوم کے! انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تمھیں زمین سے بے دخل کر دینا چاہیے۔ ہل چلانا گاڑی جوتنا ـــــ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے! اور مجھے پتہ نہیں کہ آدمی کے سوا تم میں کو نسا گن ہے! خیر میرا تمہارا تو مقابلہ ہی کیا ہے! مجھے تو آٹھ پہر میں گھڑی بھر آرام نہیں ملتا۔ دن کو ڈھور ڈنگر کی رکھوالی کرتا ہوں، اور رات کو مکان پر پہرا دیتا ہوں!"

"بالکل ٹھیک! سو فیصدی ٹھیک" بیل نے کہا۔ "آپ جو کچھ فرماتے ہیں، سراسر درست ہے، بس اتنا یاد رکھئے کہ اگر میں ہل نہ جوتوں اور گاڑی نہ چلاؤں تو آپ کاہے کی رکھوالی کریں گے اور کس چیز پر پہرا دیں گے؟"

گدھا اور بلبل

ایک گدھے کی عقامت، ایک دن، ایک بلبل سے ہو گئی۔ اس نے کہا:

"حضرتِ من! سننے میں آیا ہے کہ تم گیت گانے میں بڑی مہارت رکھتی ہو۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں گاتے ہوئے سنوں اور فیصلہ کروں کہ آیا تم واقعی اتنی ہی باکمال ہو یا محض عوام الناس کا مبالغہ ہے؟"

اس پر بلبل نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا۔ اس نے ہزار طریقوں سے لحجہ بدل بدل کر سیٹیاں بجائیں، سسکیاں بھریں اپنے گلے سے سر لگائے اور ایک گیت سے دوسرے گیت پر آئی۔ کبھی اس نے اپنی آواز کو ایسے مدھم کیا کہ دور سے بہتی ہوئی بانسری کی نرم نرم تانوں کا اثر پیدا ہوا، کبھی اس نے جنگل میں ننھے منّے سروں کی بوچھار کر دی۔ صبح کی ہر دلعزیز مغنیہ کے سامنے ہر چیز ہمہ تن گوش تھی۔ ہوائیں چلتے چلتے تھم گئیں، پنچھیوں کی جنڈلی بھی دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ حتیٰ کہ چرندے بھی گھاس پر لیٹ گئے۔ چرواہا بھی گیت کے مزے لے رہا تھا، اور سانس تک کی آواز بلند نہ ہونے دیتا تھا۔ بس سنتے سنتے کبھی کبھار چرواہے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا تھا۔

آخر کار مغنیہ خاموش ہو گئی۔ گدھے نے سر کو جھکاتے ہوئے اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا:

"گوارا ہے! سچ پوچھو تو تمہارا گانا کچھ ایسا بیزار کن بھی نہیں، افسوس کہ تم نے ہمارے مرغے کو نہیں سنا! اگر تم اس سے دو چار دن پہلے آ جاتیں تو بہت عمدہ گانے لگتا۔"

یہ فیصلہ سن کر غریب بلبل کے پروں میں حرکت ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اُسترے

ایک مرتبہ سفر کے دوران میں میری ایک صاحب سے ملاقات ہوئی اور ہم نے سرائے کے ایک ہی کمرے میں رات بسر کی۔ اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں ہمسفر کو شاید کوئی شکایت ہو گئی۔ پچھلی رات ہم دونوں خوش خوش بستروں پر دراز ہوئے تھے۔ کسی نامعلوم پریشانی کے بغیر۔ مگر اب میرے دوست کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ وہ کراہتا ہے، آہیں بھرتا ہے اور شکایت کے کلمے زبان پر لاتا ہے۔

"کیا بات ہے یار؟" میں اس سے پوچھتا ہوں "تم کہیں بیمار تو نہیں ہو؟"

"نہیں جی، بالکل نہیں" اس نے کہا "بس ذرا فیو بنا رہا ہوں!"

"واہیات! کیا اتنی سی بات تھی؟" میں حیرانی سے کہتا ہوں اور ذرا اٹھ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ عجیب و غریب آدمی، آئینے میں منہ چڑا رہا ہے، آنکھوں میں آنسو بھر رہے ہیں اور ایسے کرب کے عالم میں ہے گویا اس کی کھال کھینچی جا رہی ہو۔

جب میں نے اس کے عذاب کی وجہ معلوم کرنی تو اس سے کہا "خیر! یہ تو بتا دو ہی تھا ——— تم تو اپنے آپ کو مگھائل کرنے پر تلے ہو ذرا اپنے سامان کی طرف دیکھو! یہ اُسترے ہیں یا لکڑی چھیلنے کے رندے! ان سے بھلا کون شیو بنا سکتا ہے! بس یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو چھیل لے رکھ دو۔"

"میں جانتا ہوں!" اس نے جواب دیا "کہ میرے استرے کُند ہیں۔ یہ تو صاف نظر آتا ہے۔ مگر میں اتنا احمق بھی تو نہیں ——— قصہ یہ ہے کہ تیز دھار کا استرا میں اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ کہیں گلا نہ کٹ جائے۔"

"دوست، یقین مانو کہ کُند استرے سے تم اپنا گلا اس سے بھی پہلے کاٹ کے رکھ دو گے۔ تیز استرے کیسا تھ تم دگنی حفاظت سے شیو بنا سکتے ہو۔ بولو اتنی بات ہے کہ نئے سے پرانے کا ڈھنگ نہیں آتا ہو؟"

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں (خواہ وہ اس بات کو شرم کے مارے تسلیم نہ کریں) جو چالاک آدمیوں سے ڈرتے ہیں اور اپنے آس پاس احمقوں کا جمگھٹا لئے بیٹھے رہتے ہیں۔

عینک اور بندر

بڑھاپے میں یک بند کی نظر کمزور ہو گئی۔ اس نے انسانوں کی زبان سے سنا تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی بدقسمتی کی بات نہیں، بس اتنا ہے کہ عینک لگا لینی چاہئے چنانچہ اس نے کہیں سے دو چار عینکیں حاصل کیں۔ کبھی سر پر رکھا، کبھی دم پر باندھنے کی کوشش کی۔ کبھی سونگھا، کبھی چاٹا۔ پھر بھی کسی عینک نے اس کی بینائی میں کوئی اضافہ نہ کیا۔

"واہیات!" اس نے کہا "احمق ہیں وہ، جو آدمیوں کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ اب یہی عینک کے بارے میں انھوں نے بالکل زبلی ہانک

دعا ہے۔ اس کا تو بال بھی تلف نہیں!"

اس کے بعد، بندر نے ٹھنے اور بے زاری کی حالت میں، بیلکوں کو ایک پتھر پر اس زور سے مارا کہ سب کی سب ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ آدمی بھی کبھی کبھی ایسا ہی کرتے ہیں، کوئی چیز، کتنی بھی مفید کیوں نہ ہو، ناواقف آدمی جو اس کی قدر نہیں جانتا، ہمیشہ اس کی بربادی کرتا ہے اور اگر تھوڑا بہت اختیار بھی رکھتا ہو تو اس کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔

اوو بلاؤ

عدالت میں اوو بلاؤ کے خلاف ایک استغاثہ دائر ہوا۔ بدیں معنی کہ اس نے جو ہر کو اپنی خلاظت پسندی کے باعث رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔ شہادت کے طور پر چمگادڑ، چھڑ، چوہے اور جیسا کہ مناسب تھا، ملزم کو ایک بڑے شب میں بھاگ کر عدالت میں لایا گیا۔ جج صاحبان ذرا سے فاصلے پر، چیرت میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے گرامی بہ بھی قدیم دستاویزوں میں محفوظ ہیں۔ دو عدد گدھے چند ایک بڈھے گھوڑے، اور دو یا تین بکرے۔ آخر میں ایک عدد لومڑ کو ــــــ کے سبب کے طور پر ان میں شامل کر لیا گیا تاکہ کسی لائق ہستی کے زیر معائنہ سب کارروائی ہو ــــــ،

اب صورت حال یہ تھی کہ افواہوں کے مطابق اوو بلاؤ، لومڑ کی ضیافت کے لئے مچھلیاں فراہم کیا کرتا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو، عدالت میں جانبداری کا شائبہ نہ تھا، اور یہ بھی یاد رہے کہ اس معاملے میں اوو بلاؤ کی بدمعاشی عدالت سے مخفی نہ رہ سکتی، اور اس افواہ کے جھوٹ سچ سے کوئی فرق نہ پڑ سکتا۔ آخر فیصلہ کچھ بزرگیا گیا جس میں اوو بلاؤ کو سنگین ترین سزا دی گئی تھی یعنی دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے، اسکو دہشت میں پھنسوا کر پھانسی دے دی جائے۔

"محترم جج صاحبان" لومڑ نے اپنی تقریر کا آغاز کیا "پھانسی قدرے معمولی سی سزا ہے۔ میرے خیال میں تو ملزم کو ایسی کڑی سزا ملنی چاہیئے کہ بنی دنیا تک یاد گار رہے۔ اس غرض سے کہ آئندہ کے لئے بدمعاش ہمیشہ قانون سے خائف رہیں اور سزا کی دہشت سے لرز اٹھیں، میری ناقص رائے میں اوو بلاؤ کو دریا برد کر دینا چاہیئے۔"

"کیا کہنے، کیا کہنے" جج صاحبان نے اسے داد دی، اور یک آواز ہو کر اس کی تجویز قبول کر لی۔

چنانچہ اوو بلاؤ کو ــــــ سزا کے طور پر ــــــ دریا برد کر دیا گیا۔

ماہر تعمیرات

ایک شیر کو پنچھی پکھیروؤں سے بڑا پیار تھا، مگر یہ دیکھ کر اسے افسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑھتے پھولتے نہیں۔ ان کا طرز حیات ایسا ہے کہ وہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہتے ہیں، کچھ چوری ہو جاتے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے ادھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔

اس ناخوشگواری اور نقصان کی تلافی کے لئے شیر نے چاہا کہ ایک بڑا سا محفوظ آنگن ان کیلئے بنوائے جو ایسی مہارت سے تیار ہو کہ چور کے لئے کوئی راستہ نہ رہ جائے اور اس کے اندر جملہ ضروریات اور کافی جگہ ان کے کھیل کود کے لئے ہو۔

چنانچہ شیر کو معلوم ہوا کہ لومڑ تعمیرات کے کام میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے ذمے یہ فرض ڈالا گیا۔ عمارت شروع ہوئی اور بڑی کامیابی سے تکمیل پذیر بھی ہوئی، مگر لومڑ نے اس کام پر اپنی تمام ذہانت اور بے پناہ محنت صرف کی تھی۔ اس وسیع و عریض محل کو دیکھنے جانے پر محسوس کیا گیا کہ یہ حادثہ سے باہر ہے۔ کچھ دنوں کو جس شے کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہاں موجود تھی۔ دانا پانی اور پانی ڈالنے کے لئے بڑے بڑے پیالے بنے تھے۔ بیٹھنے کے لئے جگہ جگہ اڈے لگائے گئے تھے، گرمی سردی سے بچنے کے لئے پناہ گاہیں تعمیر کی گئی تھیں، اور کرنے کے لئے الگ تھلگ کمرے بھی تیار تھیں۔ لومڑ کی مہارت دیکھ کر اس کی عزت اور تکریم کی گئی، اسے فیاضانہ انعام سے نوازا گیا اور محل جاری کیا گیا۔ تمام پکھیرو اپنی نئی قیام گاہ میں جا اٹھ جائیں۔

مگر اس نقل کا فی سے کچھ فائدہ؟ پکھیرو دنوں کی آبادی بڑھی؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عمارت وسیع و عریض اور مضبوط تھی، دیواریں بلند اور دبیز تھیں مگر پکھیرو روز بروز کم سے کم تر ہوتے جاتے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس خرابی کا باعث کیا ہے۔ آخر شیر نے پہرہ لگانے کا حکم دیا اور بھلکوں پکڑا جاتا ہے، وہی بد معاش لومڑ! اس نے عمارت کو اس ڈھنگ سے بنایا تھا کہ کوئی دوسرا اس میں داخل ہو کر چوری نہ کر سکے، اور بڑی احتیاط سے ایک چھوٹا سا سوراخ چھوڑ دیا تھا جس کے راستے وہ خود داخل ہو سکے۔

زمیندار صاحب اور کمیرا

ایک نامہ کا ذکر ہے کہ ایک زمیندار صاحب اور ایک کمیرا اکٹھے کے راستے گاؤں کو جا رہے تھے۔ گھاس کاٹنے کا موسم تھا اور شام بھی گہری ہو رہی تھی۔ ایک اجنبی نے ان کو دیکھا کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ زمیندار صاحب کو چیخنے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا کہ ان پر جھپٹ پڑا۔ وہ زمین پر گر پڑے۔ ریچھ نے جب اس کو اتنا پٹا تو ان کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ اس کے بعد ریچھ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی اچھی سی جگہ ملے جہاں آرام سے بیٹھ کر کھانا شروع کرے۔

زمیندار صاحب نے ریچھ کے چپکے سے اپنے ملازم کو پکارا شروع کیا: "میرے دوست، میرے بھائی، مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔" کمیرے نے رحم کی سی دلاوری سے کام لے کر ریچھ کے سر پر کلہاڑے کی ضرب لگائی۔ ریچھ کی کھوپڑی دو ٹکڑے ہو گئی اور چل نقلیوں تک چلا گیا۔ ریچھ درد سے دھاڑنے لگا اور آخر کار اس کی جان نکل گئی۔ جب خطرہ دور ہوا تو زمیندار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کمیرے کو بری طرح کوسنے لگے۔ وہ غریب حیران پریشان ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"حضور، معاف کر دیجئے، مگر میں نے قصور کیا کیا ہے؟"

"نمک حرام، تو نے کیا کیا ہے؟ تم انہوں نے کس بات پر ہو؟ تم نے بندروں کی طرح ایسی لڈھپ چوٹ لگائی ہے کہ ریچھ کی کھال بالکل ضائع کر دی ہے!"

بھیڑیں اور بھیڑیے

ایک مرتبہ بھیڑوں کا سکھ چین، بھیڑیوں کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خرابی یہاں تک جا پہنچی کہ جنگل کے حاکموں نے یہ طے کیا کہ مظلوموں کو کس طرح ظالموں کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک مجلس شوریٰ بلائی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ

اس کے دکان بھی زیادہ تر بھیڑیے ہی ستے۔ مگر سب بھیڑیے بھی تو ایک سے نہیں ہوتے۔ ایسے بھیڑیے بھی ہوتے ہیں (اور ان کی مثال ہمیشہ یاد رہے گی) جو ایک گلے کے پاس سے چپ چاپ گزر جائیں ——— خصوصاً جب وہ پوری طرح سیر ہوں۔ پھر شور سے ہیں بھیڑیوں کو نشستیں کریں نہ ملیں، بھیڑوں کو بچانا ضرور سہی مگر بھیڑیوں کی نمائندگی کی سلب کرنا بھی تو غیر ضروری ہے!

خیر، ایک جنگل میں مجلس بیٹھی۔ اعضوں نے خوب سوچا، بحثیں اور تقریریں کیں، اور آخر کار ایک فرمان تیار کیا جو لفظ بہ لفظ نقل کیا جاتا ہے:

"جب بھی کوئی بھیڑیا کسی گلے کو تنگ کرے یا کسی بھیڑ کو پریشان کرنا شروع کرے تو بھیڑ کو بلا لمحاظ مراتب اجازت ہوگی کہ بھیڑیے کو گدی سے پکڑ کر قریب ترین جھنڈ میں لے جائے اور عدالت کے سامنے پیش کر دے۔"

اس قانون میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ اس کی رُو سے بھیڑیوں کو سزا سے خوفزدہ ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ پھر بہر صورت، خواہ کوئی بھیڑ مدعی ہو یا مدعا علیہ۔ بھیڑیا ہی بلا خوف خطر بھیڑ کو جنگل میں لے کے جائے گا۔

کتوں کی دوستی

باورچی خانے کی کھڑکی کے تلے بارہس اور پولکس دھوپ کھا رہے تھے۔ ہنتر تو یہ تھا کہ وہ بھی کے سامنے والے پھاٹک پر پہرا دے رہے ہوتے مگر وہ پیٹ بھر کھا چکے تھے اور پھر کہیں شریف کتے بھی دن کے وقت بھونکتے ہیں! چنانچہ وہ آپس میں ہر طرح کی گفتگو اور بحث مباحثہ کرنے لگے۔ اپنی کتوں کی سی ملازمت کے بارے میں خیر و شر کے مسئلے پر، اور آخر میں دوستی کا موضوع بھی چھڑا۔

پولکس نے کہا: "اس سے بڑی نعمت کیا ہوگی کہ دو دوست، ایک دوسرے کی صحبت میں دن گذاریں، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، ایک دوسرے کے بغیر نہ کھائیں نہ سوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوچیں کہ وہ لمحہ کب آئے گا جب وہ ایک دوسرے کو خوش کر سکیں گے، اور اپنے دوست کی خوشی لیے اپنی مسرت کو قربان کر دیں گے۔ کیوں نہ ہم تم آپس میں ایسی دوستی کا عہد کریں، میرا دعوٰی ہے کہ زندگی کا طویل وقفہ چشمیوں میں گزر جائے گا۔"

"بالکل ٹھیک ہے، ایسے ہی ہے،" بارہس نے جواب دیا۔ "یار پولکس، میں نے برسوں غور کیا ہے کہ ہم ایک ہی صحن کے کتے ہو کر آپس میں لڑے بھڑے بغیر کیوں نہیں بسر کر سکتے؟ آخر کیا وجہ ہے؟ ہمیں خدا نے ایسا مالک بھیجا ہے جو نہ تو ہمیں تنگ جگہ میں بند کرتا ہے اور نہ خاصی کنجوسی برتتا ہے۔ پھر یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ زمانے کے آغاز سے لے کر اب تک کتوں کی دوستی ضرب المثل ہے اور آدمیوں کی دوستی بھی تو ہم سے کسی طرح بہتر نہیں کہی جا سکتی؟"

"آؤ، ہم اپنے دور کے لیے ایک مثال قائم کریں؟" پولکس نے کہا۔

"لاؤ، پنجہ ملاؤ۔"

"یہ رہا۔"

فوراً ہی نئے نویلے دوستوں نے آپس میں بغل گیری اور چوما چاٹی شروع کر دی۔ جوش و خروش کی شدت میں، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک دوسرے کو کس سے تشبیہ دیں۔

"میرے راجہ بھوج!"

"میرے گھگو نیلی"

"سب جھگڑے، سب رشک، سب تنگ، سب بغض ——— آج ختم ہوئے"

بدقسمتی سے اسی حملے پر باورچی نے گھڑکی میں سے ایک ہڈی پھینکی۔ ہمارے نئے نویلے دوست پورے غیض و غضب سے اس پر پل پڑے۔

پھر بھلا ان کے معاملہ فہم مالک کا کیا بنا! راجہ بھوج اور گنگو تیلی نے ایک دوسرے کو گلے سے پکڑ لیا اور ان کے بال وا میں اڑنے لگے۔ ہٹی کر پانی کے وار بھی ان کو جدا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

دنیا ایسے دوستوں سے بھری پڑی ہے۔

باریک بیں

"غلام حیدر، تم بھی کدھر سے آ نکلے ہو؟"

"ذرا پیاگھر تک گیا تھا۔ تین گھنٹے وہیں بند کمرے کا رہا ہوں۔ میں نے وہاں کی ہر چیز دیکھی، ہر شے کا بغور مطالعہ کیا۔ میرے تجربہ کار دماغ نے اتنا سامان جمع کر لیا ہے کہ سب کو بیان کرنے کی مجھ میں نہ طاقت ہے نہ مہارت۔ قسم خدا، پیاگھر کیا ہے۔ عجائبات کا محل ہے۔ فطرت کی قوت ایجاد کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیسے کیسے پرندے اور چرندے وہاں جمع ہیں۔ کیسی کیسی مکھیاں، تتلیاں، پتنگے اور جھینگر وہاں قید کر رکھے ہیں! اور ننھے ننھے کیڑے مکوڑے، جن کو ان میں سے کوئی کے نالے سے بھی گذ سکتے ہیں؟"

"مگر یار، تم نے ہاتھی بھی دیکھا، بھلا کتنا بڑا ہوتا ہے، ضرور جب تم اس کے سامنے کھڑے ہو گے تو تمہیں محسوس ہوا ہوگا جیسے پہاڑ کے سامنے کھڑے ہو؟"

"تم وثوق سے کہتے ہو کہ واقعی ہاتھی وہاں ہے؟"

"ہاں، بالکل!"

"دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ میں نے غور سے نہیں دیکھا، کیا خبر وہاں ہو بھی یا نہیں!"

پتنگے اور تتلی

جب اک پتنگے نے بڑھ بڑھ کے بادلوں کو چھوا
تو نیچے وادی میں اک تتلی کو دی یہ صدا
"یقین مانو تمہیں دیکھنا بھی مشکل ہے
نہ جانے چیونٹی ہے، ذرہ ہے کوئی یا تل ہے
ہوائے شوق کہ جھ کو اڑائے جاتی ہے
حسد کی آگ میں تم کو جلائے جاتی ہے

حسد کی آگ میں ؛ اتنا غرور! رہ تو سہی
تمہارے بس میں ہے کیا، کھل کے مدعا کہہ تو سہی
تم آسماں کا ستارا بنی ہو تو کیا ؟
تمہارا جسم زمیں تک ہے ڈور میں جکڑا!
یہ زندگی تو مسرت سے دور ہے پیاری
نہیں بلندی پہ ناحق غرور ہے پیاری
میں تم سے پست سہی، آپ اڑ تو سکتی ہوں
جدھر بھی چاہوں اُسی وقت مڑ تو سکتی ہوں
مجھے پسند نہیں زندگی کو روگ لگاؤں
کسی کے لطف کی خاطر غلام بن جاؤں

(چینی)

آزادئ تقریر

مصنف :- لن یوتانگ

مترجم :- شاہد احمد دہلوی

چند سال ہوئے مجھ سے کہا گیا تھا کہ چینی لیگ برائے حقوقِ عوام میں آزادئ تقریر پر ایک خطبہ دوں۔ یہ ایک اہم موضوع ہے اور میں اچھی آزادی کے ساتھ اس پر تقریر کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرے والا ہے تو سب خائف ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچی آزادئ تقریر کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اپنے پڑوسیوں کے متعلق کسی کے کیا خیالات ہیں، پڑوسیوں کو بتلانے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ معاشرہ صرف اسی بنیاد پر قائم رہ سکتا ہے کہ اس میں کسی حد تک خوبصورت جھوٹ شامل ہو اور کوئی فرد اپنے خیالات کا سچا اظہار نہ کرتا ہو۔

یہ ساری جرأتی تقریر کے وجود سے پیدا ہوتی ہے۔ باسی زبان صرف انسانوں کی ہوتی ہے کیونکہ جانوروں کی آوازیں صرف جبلی ضروری بات کا اعلان ہوتی ہیں، مثلاً تکلیف، بھوک، خوف اور علمائیت کی آوازیں۔ کتے کی آواز میں طرح طرح کی ہوتی ہیں مگر سب فوری جذباتی ضروریات کو ظاہر کرتی ہیں۔ جب شیر کسی آدمی کو کھا جاتا ہے تو اطمینان سے ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے قبل جنگ کے ایک جنرل کی طرح ایک اخبار نویس کو قتل کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ "دیکھو جی، میرا اخلاقی مشن مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں تمہیں قتل کر جاؤں کیونکہ تم مجھ پر یہ چین کے خطرے میں ڈال رہے ہو۔" صرف نسلِ انسانی ہی ایسی مخلوق ہے انسانی زبان کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ہے فرق انسان اور حیوان میں۔

میں اسی وجہ سے جنرل ہوچیمن کی بڑے سے بڑا پورا اتفاق کرتا ہوں جنھوں نے ایک دفعہ جدید نصابِ تعلیم کو یہ کہہ کر غلط ٹھہرایا تھا کہ ان میں بچے سے یہ یہ باتیں کہلوائی ہیں اور خرگوش سے یہ یہ کہلوایا گیا ہے۔ یوں جانوروں کو ان باتوں سے متہم کیا گیا ہے جو وہ کہہ ہی نہیں سکتے اور حیوانوں کو اتنا ہی کج اندیش بنانے کی کوشش کی ہے۔ جتنا کہ انسان ہے۔ حکایات لقمان تمام تر دنیائے حیوانی کی صریح اہانت کرتی ہیں۔ اور اگر حیوان انھیں پڑھ سکتے تو ان کا ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہ آتا۔ انگوروں کے کھٹے تک جب لومڑی کی رسائی نہیں ہوتی تو بس وہ چل جاتی ہے۔ وہ اتنی بدمذاق نہیں ہوتی کہ انگور کھٹے ہیں کہے۔ انسان کے علاوہ کوئی حیوان اتنی گھٹیا بات نہیں کہہ سکتا۔ انیون کا شت نہ کرنے والوں سے جیکس وصول کر کے اگر کوئی لومڑی چینی کاشتکاروں کو افیون کے پودے لگانے پر مجبور کرے تو وہ اسے "کاہلی دور کرنے کا ٹیکس" نہیں کہے گی۔ اور اگر کہے گی تو وہ دیانتدار لومڑی نہیں ہوگی .....

لہٰذ انسان اور حیوان میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان باتیں کرتا ہے اور جانور آوازیں نکالتا ہے۔ برنارڈ شا نے سچ

کہا ہے کہ صرف ایک قسم کی آزادی حاصل کرنے کے لائق ہے، اور وہ ہے چوٹ کھانے پر مظلوموں کو آواز نکالنے کی آزادی، اور ان حالات کو دور کرنے کی آزادی جن سے انھیں تکلیف پہنچ رہی ہو۔ چین میں جس قسم کی آزادی کی ہمیں ضرورت ہے وہ آزادی تقریر نہیں ہے بلکہ تعلیم یعنی آزادی ہے کہ جب کسی کو تکلیف پہنچے تو وہ آواز نکال سکے۔ باتیں ہم سب کافی کر لیتے ہیں لیکن ہم میں بہت کم ایسے ہیں جو چوٹ کھانے پر آواز نکال سکیں۔ ہماری زبان اس درجہ شائستہ ہے کہ ہماری حیاتی ضروریات کا اظہار شائستہ ہی کر سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ رات کو جب بلی چیخنا شروع کرتی ہے تو اسے پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے، اور اس کی آواز ہمیشہ پُرمعنی ہوتی ہے۔ یہ بات مہینی کاشت کار کو حاصل نہیں ہے جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے گھر جا کر بکتا جھکتا ہے، اور ڈرتا ہے کہ اس کے بکنے جھکنے کو کہیں کوئی سن نہ لے۔

آزادئ تقریر کا تصور غیر ملکی ہے، کیونکہ چین میں کبھی بھی اس کا وجود نہیں رہا۔ اپنی عظیم عقل سلیم سے ہم نے بولنے کی نہیں خاموشی کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔ ہمارے ہاں کی ایک کہاوت ہے کہ "تمام بیماریاں منہ کے ذریعے اندر آتی ہیں، اسی طرح جیسے ساری خرابیاں منہ کے ذریعے باہر آتی ہیں"۔ چینی افسروں نے ہمیشہ بڑی احتیاط برتی ہے کہ "لوگوں کے منہوں پر زیادہ اور دریاؤں پر کم پشتے باندھے ہیں"۔ اور عوام نے منہ ہمیشہ مٹھی بند رکھے ہیں۔ صرف ایک کہاوت ایسی تلاش کرنے میں مجھے کامیابی ہوئی ہے جس میں ایک طرح کی آزادئ تقریر کی کچھ حمایت کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے:

انھیں سننے دو اور دھمکانے دو جو ہنسنا چاہتے ہیں اور دھمکانا چاہتے ہیں۔ میں
ایک اچھا افسر ہوں، میں ایک اچھا افسر ہوں۔

مگر اس کا مطلب وہی نہیں ہے جو آزادئ تقریر کا۔ کیونکہ یہ آزادی صرف اس حد تک ہے جس حد تک لوگوں کی ہنسی اور نفرت تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ جب تکلیف دہ ہو جائے تو "اچھا افسر" انھیں گولی سے اڑا سکتا ہے۔

لہٰذا ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ تقریر کلیتاً ایک باعث تکلیف امر ہے اور افسروں کی نگاہ میں آزادئ تقریر اس سے بھی بڑا باعث تکلیف امر۔ افسر خاموش لوگوں کو پسند کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو جو تکلیف پہنچنے پر تڑپتے ہیں نہ آواز نکالتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ادارۂ تحفظ عوام کا کوئی سراغ رساں میرے سامعین میں شریک ہے تو وہ سوچ رہا ہوگا کہ میں ایک بہت بڑی لعنت ہوں، اور سارے سامعین جو اس قدر خاموش بیٹھے ہیں، "گلدانوں کی طرح منہ بند کئے" مجھ سے کہیں بہتر شہری ہیں۔ یہ عین فطرت ہے۔

ہمیں یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ لوگوں کے لئے آزادئ تقریر کا جو مطالبہ ہم کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ افسروں کے لئے کوئی آزادی عمل نہ رہے۔ افسر بھی اپنی آزادی سے اس قدر محبت کرتے ہیں جتنی ہم اپنی آزادی سے۔ جب ہم اخباروں کیلئے آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو دراصل ہمارا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اخباروں کا منہ بند کرنے کا جو اختیار افسروں کو حاصل ہے وہ ان سے چھین لیا جائے۔ جب ہم فرد کی آزادی کا مطالبہ ایک دستوری حق قرار دے کر کرتے ہیں تو لوگوں کے سر اڑا دینے کی آزادی جو افسروں کو حاصل ہے سلب کر لینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں آزادیوں میں پرلے سرے کی ضد ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

اگر میں افسر ہوتا تو میں بھی یہی چاہتا کہ کسی دن اگر میری طبیعت مکدر ہو تو جب اور جتنے چاہوں لوگوں کے سر اڑانے کی آزادی مجھے حاصل ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میرے شہر چانگ چاؤ کے جنرل چانگ کو اس قسم کی آزادی حاصل تھی اور وہ اس لطف اندوز

ہوتے تھے۔ جب ان کی طبیعت پر بوجھ ہی ہوتی اور اسے اکسانے کی انھیں کوئی ضرورت نظر نہ آتی تو تنکدر کو دور کرنے کے لیے ایک پرچہ پر صرف دو سطریں لکھ دیتے، اور ان کا درد سر دور کرنے کے لئے ان کے سامنے کئی قیدیوں کے سر اتار دیئے جاتے۔ میں اس حقیقت کا اظہار بے خوف و خطر کر رہا ہوں، کیونکہ جنرل چانگ پی کا انتقال ہو چکا ہے۔

لہٰذا جب چینی لیگ برائے حقوق عوام نے افسروں کی آزادیوں میں کمی اور عوام کے حقوق کا تحفظ کرنے کا مطالبہ کیا تو وزیروں اور افسروں کی آنکھوں میں لیگ کھٹکنے لگی۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو سزائے دوامِ خفیہ عدالتوں میں دی جائے، لیکن لیگ نے کھلی عدالتوں میں مقدمے چلانے کا مطالبہ کیا۔ افسر یہ چاہتے تھے کہ اپنے مخالفوں کو چپکے سے پکڑ کر روئے زمین سے انھیں غائب کر دیں، مگر لیگ تار پر تار بھیجتی اور مطالبہ کرتی کہ غائب ہونے والوں کا پتہ بتایا جائے۔ جیسے جیسے لیگ اپنے پروگرام میں کامیاب ہوتی گئی اسی نسبت سے بڑی سے بڑی دہشت بنتی گئی۔

تاریخ بہت ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ منگ خاندان کے اختتام پر جب تنگ لن علماء حکومت پر نڈر ہو کر آزادانہ اعتراضات کرنے لگے تو انھیں شوئی ہو ٹی روحانی کہانی کے ۱۰۸ ڈاکوؤں سے تشبیہ دی گئی۔ عوام میں ان کا نام لینا ممنوع قرار دیا گیا۔ فوجوں کے ہاتھوں وہ مارے گئے۔ ان کے بدلے ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ سوئی چنگ تھا۔ یہ وہ گروہ تھا جس کے بارے میں ہمیشہ کہا گیا تھا کہ اس میں "پانچ شیر، پانچ چیتے، پانچ کتے، دس بیٹے، چالیس لوتنے" شامل ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ تنگ لن علماء قید کئے گئے، اغوا، مذبح دیئے گئے، اور ان کے سر آراستہ کئے گئے اور شیروں اور چیتوں اور کتوں نے بازی جیت لی۔

موجودہ کیفیت کے متعلق یہ توقع رکھنا کہ اگلے زمانے سے مختلف ہوگی۔ احمقانہ بات ہوگی۔ عوام کے حق تقریر کا مطالبہ جو بھی کرے پہلے فوجوں کی دشمنی کا بندوبست کرلے۔ چینی لیگ برائے حقوق عوام اور منگ خاندان کے تنگ لن علماء میں فرق یہ ہے کہ لیگ اصول آزادی تقریر کے لئے "ایک دستوری اصول" کی بنیاد پر لڑ رہی تھی۔ جب تنگ لن علماء نے مشہور بدمعاش غوجے اور باغی وائی چنگ جیسوں کو مزم ٹھہرایا تو اس بدنام رسماخوجے کو صرف یہ کرنا پڑا کہ شہنشاہ کے حضور ٹسوے بہائے اور علماء کو دربار سے نکلوا دے۔ بنیادی اعتبار سے صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ کسی نئے اصول کے لئے صرف اصولی طور پر لڑنے ہی سے صورتِ حال میں تبدیلی ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔

مُلّا جی اور اُن کا خلیفہ

مصنف : ڈاکٹر طٰہٰ حسین
مترجم : شیخ محمد احمد پانی پتی

"جدید عربی ادب کے معماروں میں مصر کے مشہور نابینا عالم اور مصر کے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی تحریریں فلسفیانہ رنگ لیے ہوتی ہیں اور معاشرہ کی پرخلوص نبض پر ان کا قلم طنز کے گھرے نشتر لگاتا ہے۔ انھوں نے "الایام" کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کے مشہور سلسلۂ مضامین "یادایام عشرت فانی" کی طرز پر اپنے بچپن اور زمانۂ تعلیم کے حالات بڑے پُرلطف طریقے سے بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب بظاہر ایک شخص کے ذاتی حالات پر مشتمل چند واقعات کا مجموعہ ہے لیکن دراصل اس میں اُس معاشرہ کی پوری کیفیت بیان کر دی گئی ہے جس میں سے ڈاکٹر صاحب کو گزرنا پڑا۔ اساتذہ کے اطوار اور علماء و مشائخ کے مشاغل کا حال انھوں نے جس طرح مزے لے لے کر بیان کیا ہے اس سے دو باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بلاد عربیہ کا معاشرہ ہمارے معاشرے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ دوم یہ کہ عربی کی جدید مزاح نگاری ہمارے ہاں کی مزاح نگاری کے بہت حد تک مماثل ہے۔

"یہ دکھانے کے لئے کہ عربی کے مزاحیہ ادب کے جدید رجحانات کیا ہیں، ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے مکتب کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ برسبیل تذکرہ یہ ذکر ہے کہ اگرچہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ لیکن کتاب میں ہر جگہ انھوں نے اپنے لئے "میں" یا "ہم" کی بجائے "بچہ" یا "ہمارا دوست" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لہٰذا ترجمہ میں بھی انہی الفاظ کو برقرار رکھا گیا ہے۔

مکتب کا خلیفہ بھی مؤذن کی طرح عجیب و غریب خصلتوں کا مالک تھا۔ نانے قد اور قوے کی طرح سیاہ رنگ کے اس آدمی کا بخت بھی اس کے چہرے کی طرح سیاہ تھا۔ جہاں جاتا نحوست اس کی پیشوائی کے لئے پہلے سے موجود ہوتی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا۔ ناکامی بڑھ کر قدم چومتی۔ اس کے باپ نے کئی کاریگروں کے پاس بٹھایا کہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنی گزر اوقات کا ذریعہ پیدا کرے مگر خیر سے دماغ ہی

جیسا نہ پایا تھا کہ صنعت و حرفت کی پیچیدگیوں کو سمجھ سکتا۔ اس کے بعد اُسے اس کے باپ نے کئی کارخانوں میں نوکر کرایا کر، اور کچھ نہ سہی چوکیداری کر کے اپنا پیٹ پالے مگر خود سست نے وہاں بھی پنجہ نہ چھوڑا۔ اس کے دوسرے بھائی بھی تھے جو خوب کماتے تھے مگر یہ پوستینوں کی طرح سامانوں گھر میں بیٹھا مفت کی روٹیاں توڑا کرتا تھا۔ ایک دن کہیں اس نے مکتب کے ملّا جی کو اپنا دکھڑا جا سنایا۔ ملّا جی کو مکتب کے لیے ایک نائب کی ضرورت تھی اور انھوں نے اسی کو غنیمت جانا اور اس سے کہنے لگے:۔

"تم ہمارے ہاں آجاؤ۔ میں لڑکوں کو قرآن کریم پڑھانا اور حفظ کرانا ہوں۔ تم انھیں عربی لکھنا پڑھنا سکھا دیا کرو۔ ان کا سبق سن لیا کرو اور ان کی نگرانی کیا کرو کہ کہیں وہ بیرونِ خانہ کی کھیل کود میں تو وقت ضائع نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ صبح سویرے بچوں کے آنے سے قبل مکتب کی صفائی کر دیا کرو اور عصر کے بعد مکتب کو بند کر کے تالا لگا دیا کرو۔ میں اس کے معاوضہ میں تمھیں آمدنی کا چھٹا حصّہ دے دیا کروں گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ خلیفہ کو پہلے ہی روزگار کی تلاش تھی اس نے ملّا جی کی پیش کش فوراً قبول کر لی اور قول و قرار کے بعد ملّا جی کی نیابت کے فرائض کا کام شروع کر دیا۔

دونوں ساتھ ساتھ کام تو کر رہے تھے لیکن من تو شدی من تو شدم والا حال تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو نفرت و حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن چونکہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارہ ہونا مشکل تھا اس لیے مجبوراً چاپلوسی اور خوشامد سے کام لیتے تھے۔

خلیفہ کو ملّا جی سے اس لیے نفرت تھی کہ وہ انھیں اوّل درجے کا مکّار فریبی اور جھوٹا خیال کرتا تھا۔ ملّا جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مکتب کی کُل آمدنی کا چوتھا حصّہ خلیفہ کو بطور خواہ دیا کریں گے لیکن آمدنی کا بہت سا حصّہ خلیفہ کو بتائے بغیر خود ہی ہضم کر جایا کرتے تھے بچوں کے والدین الّلہ ملّا جی کے لیے عمدہ کھانے تیار کر کے بھیجا کرتے تھے۔ ملّا جی انھیں اکیلے ہی اکیلے چٹ کر جاتے اور مغریب خلیفہ کو ان کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے تھے۔

ادھر ملّا جی کا یہ حال تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ خلیفہ کو کچا ہی چبا ڈالتے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب دوپہر کو دونوں کھانا کھانے بیٹھتے تو خلیفہ ملّا جی کے اندھے پن سے فائدہ اٹھا کر روٹیاں چُرا لیتا اور انھیں کسی دوسرے وقت مزے سے کھاتا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مزیدار یا نفیس چیز دسترخوان پہ ہوتی تو اس کا بھی بہت سا حصّہ خود ہی ہتھیا لیتا۔ ملّا جی نے اسے رکھا تو اس لیے تھا کہ وہ بچوں کی نگرانی کرے اور کھیل کود میں نہ پڑنے دے لیکن اس نے خود مکتب میں پڑھنے والے بعض بڑی عمر کے لڑکوں سے یارانہ گانٹھ رکھا تھا اور انھیں پڑھائی میں مشغول رکھنے کی بجائے ان کے ساتھ گپیں مارتا رہتا تھا۔

ملّا جی کی بے ایمانی اور ان کے نائب کی حرام خوری کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج تھے۔ اگر خلیفہ مکتب چھوڑ کر چلا جاتا تو گلیوں میں جوتیاں چٹخانے کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا اور اگر ملّا جی خلیفہ کو جواب دے دیتے تو مکتب کی دیکھ بھال اور اس کا انتظام کون کرتا یا کیونکر یہ کام اکیلے ملّا جی کے بس کا نہ تھا۔

ہمارے دوست نے جب قرآن کریم حفظ کر لیا تو ملّا جی نے اسے خلیفہ کے سپرد کر دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ وہ روزانہ چھ پارے حفظ کرنایا کرے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں پہلے خلیفہ کو سبق سنانا شروع کر دیا لیکن یہ سلسلہ تین روز سے زیادہ نہ چل سکا۔ بچہ کو پہلے ہی روز سناتے سناتے جمائیاں آنے لگیں۔ خلیفہ دو روز تک سن کر اکتا گیا۔ تیسرے روز دونوں کا بھید ایک دوسرے پر ظاہر ہو گیا۔ آخر

چوتھے روز یہ قرار پایا کہ بچہ خلیفہ کے سامنے دوزانو ہو کر خود ہی چھ پارے آہستہ آہستہ پڑھ لیا کرے اور اگر کہیں بھول جائے تو خلیفہ سے پوچھ لیا کرے۔ چنانچہ اب بچے کا روزانہ کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ صبح اٹھ کر خلیفہ کو سلام کرتا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر ہونٹوں کو اس طرح حرکت دینے لگتا جیسے قرآن کریم پڑھ رہا ہو۔ خلیفہ کو دکھانے کے لئے کبھی کبھی اس سے کوئی لفظ بھی پوچھ لیتا۔ ملا جی ظہر کی نماز سے پہلے مکتب میں آیا کرتے تھے۔ آتے ہی دو بچے کو بلاتے اور پوچھتے:۔

"تم نے آج کا سبق پڑھ لیا؟"

بچہ جواب دیتا "جی ہاں"

"کہاں سے کہاں تک پڑھا ہے؟" ملا جی دوبارہ استفسار کرتے۔

بچہ بتا دیتا کہ فلاں سورۃ سے فلاں سورۃ تک پڑھا ہے اور ملا جی مطمئن ہو کر دوسرے لڑکوں کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے۔

مکتب میں رہ کر اور ملا جی کے عادات و خصائل دیکھ کر خلیفہ نے بھی ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ پہلے تو اس نے بچے کا سبق سننے کے جھنجٹ سے نجات حاصل کی، لیکن اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے لڑکے کی حالت کا اندازہ لگا کر اس سے رشوت وصول کرنے کی ٹھانی۔ وہ وقتاً فوقتاً اسے اس قسم کی دھمکیاں دینے لگا کہ میں ملا جی سے تمہاری شکایت کروں گا اور کہوں گا کہ تمہیں فلاں سورۃ یاد نہیں رہی اور قرآن کریم کا فلاں حصہ تم بالکل بھول گئے ہو۔ ادھر حال یہ تھا کہ نگرانی ختم ہونے کی وجہ سے لڑکے کو ایک سورۃ تو کیا پورا قرآن کریم ہی بھول گیا تھا اور اس کا کوئی حصہ بھی اسے پوری طرح یاد نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی دن ملا جی نے اس کا امتحان لے لیا تو پھر اس کی خیر نہ ہوگی۔ اس ڈر کے باعث وہ ہر طرح خلیفہ کی خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اس کا منہ بند رکھنے کے لئے اسے مختلف قسم کی سوغاتیں لا کر دیا کرتا تھا۔ کبھی روٹی لا دی۔ کبھی کھجوریں لا دیں۔ کبھی اپنے جیب خرچ کے پیسے اس کے حوالے کر دیئے۔ گرمیوں کے موسم میں شربت بنانے کے لئے مصری کی ڈلیاں لا دیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو اسے دوپہر کا کھانا بھی اس ڈر سے خلیفہ کے حوالے کرنا پڑتا تھا کہ کہیں وہ ملا جی سے اس کی شکایت نہ جڑ دے۔ لیکن جو چیز مقدر میں ہو وہ تو بہر حال ہو کر ہی رہتی ہے۔

جمعرات کا دن تھا۔ ہمارے دوست نے حسب معمول خلیفہ کے سامنے بیٹھ کر سبق "یاد" کیا اور ملا جی کو بھی براہ مہربانی دلا کر کہ اس نے آج کا سبق دہرا لیا ہے۔ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ چھٹی ہونے پر سیدھا اپنے گھر جانے کی بجائے وہ دوستوں کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنے جامع مسجد میں چلا گیا۔ وہ اکثر جامع مسجد چلا جاتا اور وہاں منارہ پر چڑھ کر دور دور کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی جوتیاں مسجد کے ایک کونے میں رکھ کر منارہ پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیچے اترا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد جب جوتیاں دیکھیں تو غائب۔ مسجد کا کونا کونا چھان مارا مگر کہیں ہوتیں تو ملتیں۔ مجبوراً ننگے پیر گھر واپس آ گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی باپ نے پوچھا:۔

"جوتیاں کہاں ہیں؟"

اس نے اس خیال سے کہ اگر سچ بولوں گا تو پٹوں گا کہہ دیا:۔

"مکتب میں بھول آیا۔"

خیر بات آئی گئی ہو گئی اور بچہ اپنے سبھی بھائیوں کے پاس جا کر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اس کے باپ نے آواز دی۔
بچہ کھیل کود چھوڑ کر باپ کے پاس پہنچا تو باپ نے پوچھا۔
"آج تم نے مکتب میں کیا پڑھا؟"
لڑکے نے جواب دیا "آج میں نے آخری چھ پارے پڑھ کر قرآن کریم کا ایک دور ختم کر لیا۔"
باپ نے پوچھا "اس کا مطلب ہے کہ اب تمہیں قرآن کریم پوری طرح حفظ ہو گیا ہے؟"
لڑکے نے جواب دیا "جی ہاں"
باپ نے کہا۔
"سورہ سبا سناؤ"
مگر وہاں ایک سورہ سبا کیا وہ سارا قرآن کریم ہی بھول چکا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ باپ نے کہا۔
"اگر سورۃ سبا یاد نہیں تو سورۃ خاطر پڑھو"
وہاں بھی یہی حال تھا۔
باپ نے کہا۔
"تم تو کہتے تھے مجھے سارا قرآن زبانی یاد ہے۔ اچھا سورۃ یٰسین ہی سناؤ"
لڑکے نے یہ آیات تو سنا ہیں مگر آگے چل کر پھر زبان رک گئی۔
باپ نے کہا۔
"اچھا اب تو تم جاؤ۔ اس وقت نہیں تو کچھ نہیں کہتا۔ فی الحال تمہارے ملاجی سے نبٹ لوں گا"
چنانچہ لڑکا سر جھکائے باپ کے کمرے سے نکل کر اپنے حجرے میں آ کر مغموم و ملال ایک کونے میں بیٹھ گیا۔
مغرب کی نماز کے بعد اس کے باپ نے اسے پھر آواز دی۔ وہ اس کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ملاجی بھی تشریف فرما ہیں۔
بچہ نے اس کے کہ باپ کچھ پوچھتا ملاجی نے بچہ سے پوچھا۔
"بتاؤ کیا آج تم نے مجھے قرآن کریم کے چھ پارے نہیں سنائے تھے؟"
لڑکا ملاجی کی صریح دروغ گوئی پر حیران و ششدر رہ گیا مگر کیا کرتا۔ باپ کے سامنے ملاجی کو کس طرح جھٹلاتا۔ کہنا ہی پڑا۔
"جی ہاں سنائے تھے"
ملاجی نے پوچھا "کیا تم نے مجھے کل سورۃ سبا نہیں سنائی تھی؟"
لڑکے کو اس کا اقرار بھی کرنا پڑا۔
"تو پھر آج نہیں کیا ہوا کہ تم اپنے والد کو یہ سورۃ نہ سنا سکے؟"
لڑکا چپ۔
"اچھا اب میرے سامنے سورۃ سبا سناؤ"

نگرانی کے کہ یاد ہوتی تو باپ بھی کر کیوں نہ سناتا۔ خاموش کھڑا رہا۔

باپ نے کہا "اگر سورہ یٰسین یاد نہیں تو سورۃ سجدہ ہی سنا"

لڑکا وہ بھی نہ سنا سکا۔

یہ دیکھ کر باپ کا پارہ یکدم چڑھ گیا اور وہ ملاجی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:۔

"یہ سب کچھ تمہارا قصور ہے۔ میں اسے تمہارے پاس اس لئے بھجواتا تھا کہ تم ہر طرح اس کی نگرانی کرو گے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ مکتب میں جا کر پڑھنے لکھنے کی بجائے کھیلتا کودتا پھرتا ہے۔ اگر تم اس صحیح نگرانی کرتے تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ آج یہ ننگے پاؤں گھر واپس آیا اور میرے پوچھنے پر کہا کہ میں اپنی جوتیاں مکتب میں بھول آیا ہوں۔ جب تم ایسی معمولی باتوں کی بھی نگرانی نہیں کر سکتے تو پڑھائی کی نگرانی کیا خاک کرتے ہوگے؟"

ملاجی یہ سن کر بولے:۔

"میں خدائے پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اسے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا اور ہر طرح اس کی نگرانی کی۔ آج میں چھٹی ہونے سے ذرا پہلے مکتب سے اٹھ کر چلا آیا تھا اور بہ خیال تھا کہ آپ کا لڑکا ننگے پیر چلا آتا ہے پڑھائی کی طرف سے بھی میں نے کبھی غفلت نہیں برتی۔ میں روزانہ اس سے سبق سنتا ہوں اور جب تک یہ سبق یاد نہیں کر لیتا چھٹی نہیں دیتا"

باپ نے یہ سن کر جواب دیا:۔

"مجھے تو تمہاری ایک بات کا بھی یقین نہیں"

ملاجی کہنے لگے:۔

"اگر میں نے آپ سے آج تک ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولا ہو تو میری بیوی پر تین طلاق۔ میں آپ سے سچ سچ کہہ رہا ہوں کہ میں آپ کے لڑکے سے کچھ پارے روزانہ سنتا ہوں"

باپ نے کہا "اگر سنتے ہوتے تو یہ نوبت نہ آتی"

ملاجی نے کہا:۔

"استغفر اللہ! آپ کا یہ خیال ہے کہ آپ کے ہاں سے مجھے ماہ بماہ جو تنخواہ ملتی ہے وہ مجھے اپنی بیوی سے زیادہ عزیز ہے حالانکہ میں ابھی سے کہہ چکا ہوں کہ اگر میں نے ایک بار بھی آپ سے جھوٹ بولا ہو تو میری بیوی پر تین طلاق"

باپ نے جواب دیا:۔

"ملاجی ان باتوں کو چھوڑو۔ لڑکا کل سے تمہارے مکتب میں پڑھنے نہیں جائیگا"

یہ کہہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ملاجی نے بھی بصد حسرت و یاس اپنے گھر کی راہ لی۔ صرف لڑکا اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا۔ دنیا بھر کے خیالات اسکے ذہن سے نکل چکے تھے، اگر کوئی خیال رہ گیا تھا تو صرف یہ کہ ملاجی نے کتنی آسانی سے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔

باپ نے لڑکے کیلئے ایک اور حافظ صاحب کا انتظام کیا جو روزانہ گھر پر آکر اور لڑکے کو قرآن کریم حفظ کراتے تھے۔ عصر کے وقت ملاجی کے مکتب سے اس کے سبق ہم سبق آجاتے اور وہ ان کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتا۔ چونکہ اسے یقین تھا کہ اب اس کے

والد اسے کبھی مکتب میں نہیں بھیجیں گے۔ اس لئے ملا جی اور ان کے خلیفہ کے بارے میں اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی اور وہ ان کے مکر و فریب، حرص و طمع اور دروغ گوئی کی داستانیں بڑے مزے لے لے کر اپنے دوستوں کو سناتا تھا اور اس کے دوست بھی اس کی ماں میں ماں ملاتے تھے۔

لیکن یہ عیش و مسرت کا زمانہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا۔ کیونکہ ہمارے دوست کے مکتب سے اٹھ جانے کی وجہ ان کی آمدنی میں بہت فرق آگیا تھا۔ اس لئے انھوں نے بعض آدمیوں کے توسط سے لڑکے کے والد سے التجائیں کرنا شروع کیں کہ وہ اپنے لڑکے کو دوبارہ مکتب میں بھیجنا شروع کر دیں۔ بالآخر والد کا دل بھی نرم پڑ گیا اور انھوں نے لڑکے کو دوبارہ ملا جی کے سپرد کر دیا۔ اگر معاملہ اسی حد تک رہتا تب بھی کوئی بات نہ تھی لیکن ہوا یہ کہ اس کے بعد ہمارے دوست نے جو علم کو اکثر اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے، وہ تمام باتیں ملا جی اور خلیفہ کے سامنے دہرانی شروع کر دیں جو ہمارے دوست نے ان کی شان میں کہی تھیں۔ شرمندگی کے مارے اس کا بُرا حال ہوتا مگر کیا کر سکتا تھا۔

اس تمام واقعات سے ہمارے دوست کا اندازہ ہو گیا کہ بزرگوں کی باتوں اور قسموں پر اعتبار کرنا انتہائی نادانی اور حماقت ہے۔ اس کے علاوہ نے قسم کھائی تھی کہ ان کا لڑکا آئندہ کبھی مکتب میں پڑھنے نہ جائے گا لیکن چند ہی دنوں میں ان کی قسم ٹوٹ گئی اور لڑکا دوبارہ ملا جی کی جھڑکیاں اور گالیاں کھانے کے لیے مکتب میں آگیا۔ تقدیر نے آپ ملا جی نے فرمایا تھا کہ اگر انھوں نے زندگی میں ایک بار بھی جھوٹ بولا ہو تو ان کی بیوی پر تین طلاق معلق ہیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سریع جھوٹ ہے۔ اور تو اور اس کے ہم جولی جن کی اس کے ساتھ دانت کاٹی روٹی تھی اور جو ہر روز اس کے پاس آکر ملا جی اور خلیفہ کو ملا جیاں سنایا کرتے تھے، اب انہی ملا جی اور خلیفہ سے اس کی جعلیاں کھایا کرتے اور اسے پٹتے دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ اسے اپنے ہم جولیوں سے ہمدردی کی کچھ امید تھی لیکن اسے چڑانے میں وہ بھی دوسروں سے کم نہ تھے۔ ان حالات میں ہمارے دوست کے لئے صبر و خاموشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

(اطالوی)

سنہرا گدھا

مصنفہ:- لیوسیئس اپولیئس

مترجمہ:- شاہد احمد دہلوی

(جاری خوفوں کے ساتھ)

صبح ہوتے ہوتے ہم نے بہت سارا راستہ طے کر لیا اور جب سورج نکلا تو ہم ایک مسلمان مقام پر پہنچے۔ یہاں دیر تک ٹھہرے مسلح مشورے کرتے رہے اور آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ مجھ پر رحم بالکل نہ کیا جائے۔ انھوں نے دیوی کی مورتی میری پیٹھ پر سے اتار کر زمین پر رکھ دی، پھر میری کاٹھی اتار دی۔ مجھے ایک درخت سے باندھا اور کوڑوں، لاٹھیوں کے ڈنڈے سے مجھے اتنا سوڑا کہ میں دم توڑنے لگا۔ ان میں سے ایک یہ چاہتا تھا کہ میرے سر سے نکال کر اڑا دے کیونکہ میں نے اس کے تقدس کو رسوا کیا تھا۔ مجھ سے یوں انتقام لینا چاہتا تھا۔ مگر دوسرے پجاریوں نے اسے باز رکھا، اس وجہ سے نہیں کہ انھیں مجھ پر ترس آ رہا تھا بلکہ اس اندیشے سے کہ اگر مجھے مار ڈالا تو پھر دیوی کی مورتی کس پر لادی جائے گی؟ لہٰذا انھوں نے پھر مجھے لادا اور اپنی تلواروں کے چھلوں سے مار مار کر ہنکالتے رہے یہاں تک کہ ہم اگلے بڑے شہر میں جا پہنچے۔ وہاں کے ایک بڑے شہری نے، جو بڑا مذہبی خیال کا آدمی تھا، ہمارے جانکاہ تماشوں، اور نرسنگھے کی فوجی غناک موسیقی کا شور سنا۔ وہ ہمارا راستہ روکنے کے لئے باہر نکل آیا اور اس نے دیوی کی اقامت کے لئے بڑی عقیدت سے اپنا مسکن پیش کیا۔ دیوی کے ساتھ ہم سب گھر میں داخل ہوئے۔ دیوی کو خوش کرنے کے لئے ہر ممکن احترام کا مظاہرہ کیا گیا اور اچھی سے اچھی جینٹ چڑھائی گئی۔ مقدس وہ جگہ تھی جہاں میں سرتے مرتے بچا۔

ہمارے میزبان کے ایک دیہاتی کرایہ دار نے ایک بارہ سنگھا شکار کیا۔ اس کی ایک موٹی تازی ران تحفتہً ہمارے میزبان کو بھیجی گئی۔ باورچی شن رکھا بدار نے مطبخ کے دروازے میں بے پروائی سے اسے اتنا نیچا لٹکا دیا کہ ایک کتا منہ مار کر آیا اور ران کھینچ کر لے بھاگا۔ جب پیسیں شن نے دیکھا کہ ران غائب ہو گئی تو اس نے بری طرح رونا شروع کر دیا، کیونکہ سارا الزام اسی پر آتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے اور جب آقا کھانا طلب کرے گا تو کیا کرے گی؟ مارے خوف کے اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اس نے اپنے چھوٹے بچے کو اپنے پاس بلوایا، اسے خوب پیار کیا اور بڑی دل ریشی سے اسے رخصت کیا۔ اکلے بعد۔ ایک رسّی لی اور چاہی لگا کر خودکشی کرنے چل پڑا۔ اس کی بیوی کو اس سے بہت محبت تھی، اسے اس بھیانک ارادے کی اطلاع اتفاق سے فوراً مل گئی۔ اس نے رکابدار کے ہاتھ سے رسّی چھین لی اور بولی "میرے پیارے پیسیں شن، کیا تم بالکل ہی اندھے ہو گئے؟ اس واقعہ نے اس قدر اٹھا دیا کہ وہ دروازہ بھی نہیں نہیں سوجھتا جو غیب سے تمہارے بچ نکلنے کے لئے کھل گیا ہے؟ اس خوفناک واقعہ کے علم کے بعد اگر تم میں کچھ بھی عقل باقی رہ

گئی ہے تو میری بات مانو۔ جاؤ اور کسی خوبصورت عورت نے دیکھا ہے نا، جسے آج گھر میں لایا گیا ہے؟ اسے کسی ویرانے میں لے جا کر حلال کر ڈالو۔ پھر اس کی ایک ران کاٹ کر بوسیدہ سی مالو میں جاتی ہے۔ اسے پکا کر خوب مالو، مزیدار مسالے ڈال کر اس کی بوٹی بوٹی اور اسے شکار کا گوشت لذیذ قابل برداشت بنا دو۔

بدنصیب بہادر نے اپنی جاں بچانے کی تدبیر سن کر مارے خوشی کے پھول گیا۔ اپنی جورو کو اس نے دنیا بھر میں سب سے قابل عورت قرار دیا اور اپنا اپنی بیوی پر اعتماد تازہ کر لیا۔

وقت آ گیا تھا۔ بہادر نے چھری تیز کی۔ مسلح تھا، جان بچانے کی ترکیب مجھے کوئی سوجھتی تھی۔ مجھے اس چھری سے اپنا تھا۔ میں نے آخری فیصلہ کر لیا۔ اپنی پوری توانائی اور سرپٹ بھاگا، اور جھلکنے میں دو فلانیاں جھاڑ، انہیں بھولا میں پہلے برآمدے میں سے ڈاڑھیاں، ڈھلوانی کوفت کے بعد میں گیا جہاں حساب خمار بچاریوں کے ساتھ قربانی کا گوشت کھا رہا تھا۔ میں نے ان سے ... کر ٹرکوں کے نیچے اور چارپائیوں کے بھی نیچے انداز دیئے۔ میرے یوں بدتمیزی سے گھس آنے اور نقصان کرنے پر وہ بہت برہم ہوا۔ ایک غلام سے بولا "اس اپیل کو نکالنے والے بیہودہ جانور کو لے جاؤ اور ایسی جگہ چھوڑ کر آؤ جہاں یہ ہمارے مہمانوں کے آرام میں خلل نہ پڑے۔" اپنی جاہلی کی بدولت چھری سے گلو خلاصی پانے پر میں خوش حالگہ ہو گیا۔ مجھے لے جانے والے غلام نے مجھے بندھا ہوا چھوڑ دیا۔

میں اب بدنصیب شامل سا ہو گیا تھا۔ اس کی قسمت کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ جو کچھ اس کی قسمت میں پہلے سے لکھ دیا گیا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ تو بدلا جا سکتا ہے اور نہ ٹالا جا سکتا ہے۔ میری جس چالاکی نے مجھے فوری موت سے بچایا تھا اسی نے مجھے ایک اور ہولناک خطرے سے دوچار کر دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ گھر کا ایک اور غلام بدحواس ہو کر بھاگا ہوا کمرہ طعام میں یہ خبر لے کر پہنچا کہ گل میں کھیلنے والے بچے کے دروازے سے ایک پاگل کتا ابھی ابھی گھس آیا ہے۔ پہلے تو اس نے پالتو شکاری کتوں کو جھنجھوڑا، پھر اصطبل میں گھس کر گھوڑوں کو کاٹنے لگا، اور آخر میں غلاموں پر بھی جھپٹا۔ اس نے داروغہ اصطبل مرطولوس، ہیپلیس شن کاہلدار ہر پالیوس خلاصہ نوکاٹ کھایا۔ طبیب اپولینیوس اور کئی ان خدام خانہ کو بھی کاٹا جنھوں نے اسے گھر سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ جن جانوروں کو اس نے کاٹا ہے ان میں سے بعض میں ہائیڈرو فوبیا کی علامات بھی دکھائی دینے لگی ہیں۔

یہ خبر سن کر سب گھبرا گئے۔ دیر میرے وحشت ناک طرز عمل سے۔ میں گمان ہوا کہ مجھ میں بھی زہر سرایت کر گیا ہے جس کے ہاتھ جو ہتھیار لگا لے کر میرے مالکوں نے دیوانہ وار چیخنا شروع کر دیا "مارے مارڈالو اسے، دوسروں کی سلامتی کے لئے اسے مار ڈالو۔" حالانکہ درحقیقت میں نہیں، وہ پاگل تھے۔ غلاموں نے کسی کے ہاتھ میں نیزہ، کسی کے بھالا اور کسی کے تبر تھما دیا تھا۔ اگر میں خطرے کی بو پا کر اپنے اصطبل سے بگ ٹٹ بھاگ کر اپنے آقاؤں کے آرام کدۂ خواب میں نہ گھس جاتا تو وہ ضرور میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مجھے پکڑنے کے لئے کمرۂ خواب میں داخل ہوتے انھیں دیر لگی، اس لئے انھوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور رات بھر کے لئے ایک پہرہ دار وہاں کھڑا کر دیا۔ انھیں یقین تھا کہ جب صبح ہو گی تو مجھ سے انھیں لڑنا نہیں پڑے گا، کیونکہ باؤلے کتے کے زہر سے میں مر چکا ہوں گا۔ ہاں تو اب میں یہاں بند تھا، اکیلا اور آزاد کہ جو جی میں آئے کروں۔ قسمت کے اس عطیہ کا میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں ایک بستر پر دراز ہو گیا اور انسانوں کی طرح خوب جی بھر کر سویا، کیونکہ میں ایک مدت سے اس نعمت سے محروم تھا۔

جب میں جاگا تو دن خوب چڑھ چکا تھا۔ نیند کی راحت حاصل کرنے کے بعد میں تازہ دم ہو کر اچھل پڑا۔ باہر میرے مالک میرے متعلق بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا "مگر میرے پیارے، وہ بیچارہ جانور اس وقت تک ہلاک کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اب تک زہر خارج ہو چکا ہوگا اور جانور پھر بالکل ٹھیک ہو گیا ہوگا۔"

"ہاں جان من، اب ہیں تم سے اختلاف رائے نہیں کر سکتا۔"

انھوں نے طے کیا کہ دروازے کی ایک درز میں سے مجھے دیکھیں، اور انھوں نے دیکھا کہ میں بظاہر پہلے کی طرح بھلا چنگا آرام سے کھڑا ہوا ہوں۔ انھوں نے ہمت کر کے ارادہ کیا کہ دروازہ کھول کر مجھے زیادہ قریب سے دیکھیں۔ ان میں سے ایک نے جسے شاید غریب سے مجھے نجات دلانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں بالکل ہوں یا نہیں، ایک سیدھی سی تجویز پیش کی۔ میرے آگے تازہ پانی کا بھرا ہوا تسلہ رکھا جائے۔ اگر میں حسب معمول بے تحاشا پانی پی جاؤں تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہوگا کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اگر میں ڈر کر پیچھے ہٹ جاؤں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھ پر ابھی باؤلا پن سوار ہے۔ اس نے کہا کہ تمام متمدن ملکوں میں جانچنے کی یہی ترکیب بتائی گئی ہے اور اس نے خود عملاً بھی یہی مشاہدہ کیا تھا۔

سب نے یہ بات مان لی اور قریب کے فوارے سے ایک بڑا سا تسلہ شفاف پانی کا بھر کر میرے آگے لا رکھا۔ مگر میں اب بھی اپنے حقداروں کو غصہ طلبی سے گھور رہا تھا۔ مجھے بڑے زور کی پیاس لگ رہی تھی، سیدھا تسلے کی طرف گیا اور اپنی تھوتھنی پانی میں ڈال کر اس کا ایک ایک قطرہ پی گیا۔ ایسا کرنا کئی لحاظ سے میرے حق میں اچھا ثابت ہوا۔ پھر میں چپکا کھڑا ہو گیا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ مجھے تھپکی دیتے رہے، میرے کانوں کو سہلاتے رہے۔ میری رسی پکڑ کر مجھے چلایا پھرایا اور میرے ساتھ جو جی چاہا کیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ میرے سب ایک غلط فہمی تھی، اور میں ایک شریف جانور ہوں اور میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔

دوسرے دن، ان دونوں برے اندیشوں کے باوجود، مجھ پر دیوی اور دیوی کا ساز و سامان لاد گیا، اور بھانجھوں اور تماشوں کے شور کے ساتھ حسب معمول خیرات جمع کرنے کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ ہم چند چھوٹے دیہاتوں اور فوجی اڈوں میں سے گزر کر ایک دیہات میں پہنچے جس کے باشندوں نے بتایا کہ یہ بستی ایک مشہور قدیم شہر کے کھنڈروں پر بسائی گئی ہے۔ جو پہلی سرائے ہمیں ملی ہم وہیں ٹھہر گئے۔ رات ہم نے ایک دیہاتی کی "عیار کہانی" سنی۔ اس بیچارے کو اس کی بیوی نے بڑی بری طرح بیوقوف بنا دیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی یہ کہانی سنیں۔ ہاں تو:۔

اس شخص کی گزراں لوہار کے چھوٹے موٹے کام سے ہوتی تھی۔ اس کی بیوی کی بھی کوئی ملکیت نہیں تھی لیکن اس کی جنسی بھوک بہت مشہور تھی۔ ایک دن صبح سویرے، لوہا جب اپنے کام پر سدھارا تو اس کی بیوی کا ایک منچلا عاشق فوراً ہی گھر میں آ دھمکا اور بستر ہی میں اس سے جا چمٹا۔ لوہار کوئی قسم کا تنبہ تو تھا ہی نہیں، اتفاق سے اتنے جلدی لوٹ آیا کہ یہ دونوں ابھی گرمی محبت ہی کر رہے تھے دروازہ اندر سے مقفل پا کر خوش ہوا اور مر ملا کر بولا "میری بیوی کس قدر پارسا ہے کہ کسی کے اکیلے گھر میں گھس آنے کے اندیشے سے اس نے اس درجہ احتیاط برتی ہے!" اس کے بعد اپنے دستور کے مطابق اس نے کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو کر سیٹی بجائی تاکہ بیوی کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ عورت بڑی ہوشیار تھی، اپنے عاشق کی آغوش شوق سے نکل کر جھٹ اسے کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے بڑے سے ٹب میں چھپا دیا۔ ٹب میلا اور گلا ہوا تھا لیکن تھا بالکل خالی۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھولا اور

لتاڑنا شروع کر دیا "ارے سوئے حرامی کہیں کے، اٹھ کر چلا آیا بغلوں میں ہاتھ دیئے، اور جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں! آخر کب کام شروع کرے گا اور کب روپیہ کمائے گا۔ ارے میرا کیا حشر ہو گا، صبح سے شام تک چرخہ کاتتی ہوں، میری انگلیوں کی ہڈیاں تک گھس جاتی ہیں تب کہیں اتنا پیدا ہوتا ہے کہ دو وقت میں تیل پڑ جائے۔ اور اس کمبخت بل میں رہنا پڑتا ہے۔ کاش میں اپنی سہیلی دُلغنی ہوتی، وہ دن بھر کھاتی پیتی رہتی ہے اور جی چاہے جتنے خانھوں سے دل بہلاتی رہتی ہے۔"

لوہار کو یہ باتیں سن کر صدمہ ہوا۔ بولا "ارے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے کہ ٹھیکہ دار کو آج اپنے مقدمے کی پیشی پر جانا پڑ گیا، اس نے ہمیں کل پر ٹال دیا؟ یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں نے آج کے کھانے کا مانگا نہیں کیا۔ وہ بیگار پرانا ٹب دیکھتی ہو نا، وہ جو جہت سی جگہ کھیرے ہوئے ہے؟ میں نے ابھی ابھی ایک شخص سے اس کا پانچ درہم میں سودا کر لیا ہے بس وہ اگر امی رقم دے جائے گا اور ٹب اٹھا کر لے جائے گا۔ آؤ ذرا ہاتھ تو لگواؤ، اس ٹب کو گاہک کیلئے باہر پہنچا دیں۔"

عورت ذرا "گھرنی" اور اسے ایک ترکیب سوجھی کہ اگر لوہار کو ذرا بھی شبہ ہو تو دور رہ جائے۔ ایک زور کا ٹھٹھا لگا کر بولی "مجھے بھی کیا عجیب شوہر ملا ہے، کیا کہنا! اور سودا کرنے میں تو جواب نہیں ہے ان کا۔ گھر سے باہر جاتے ہیں اور جناب ہمارا ٹب پانچ درہم میں بیچ آتے ہیں۔ میں چاری عورت ہوں، لیکن گھر سے باہر قدم تک نہ نکالا اور ٹب کو سات درہم میں بیچ بھی چکی؟"

لوہار کی آنکھیں کھل گئیں، بولا "بھلا! کون حاجو تمہیں اتنی قیمت دے گیا؟"

بیوی بولی "ارے احمق چپ! وہ ابھی ٹب اندر ہی ہے۔ دیکھ رہا ہے غور سے کہ مضبوط بھی ہے یا نہیں۔"

عاشق نے اس کے اشارے کو فوراً پا لیا۔ اس نے سر ہلا کر کہا "دیکھو بی بی جی، تمہارا ٹب بہت پرانا ہے اور بیسیوں جگہ سے پچکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" یہ سن کر لوہار کی طرف پیٹھ کر کے بولا "جناب میں آپ کو نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں۔ مگر آپ مجھے ایک مومن سچی لگا دیں تو بہت ممنون ہوں گا۔ مجھے اسے اندر سے کھرچ کر دیکھنا ہے کہ یہ چیز میرے کام کی ہے یا نہیں۔ میرے پاس فالتو روپیہ نہیں ہے کہ پھینکتا پھروں۔ روپیہ آج کل درختوں پر تو نہیں اگتا، ہے نا؟"

چنانچہ سادہ لوح لوہار نے جلتا ہوا ایک موم بتی جلائی اور بولا "نہیں نہیں دوست، تم اس زحمت میں مت پڑو۔ تم ذرا ادھر آ کر کھڑے ہو جاؤ، میں اس ٹب کو خوب صاف کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی صدری اتاری، موم بتی لی، ٹب کو اٹھا کر اوندھا بجایا، اور اس کے اندر گھس کر صفائی کے کام میں لگ گیا۔ بیقرار عاشق نے فوراً لوہار کی بیوی کو اٹھا کر اوندھے ٹب پر اس کے شوہر کے سر کے اوپر ڈال لیا اور شوہر کا کام تمام دینے کا اشارہ کیا۔ اس موقع سے وہ بہت لطف اندوز ہوئی۔ ٹب کے کنارے سے اپنا سر ٹکا کر خلیہ جگہ اپنی انگلی رکھتی جاتی اور ہدایتیں دیتی جاتی "ہاں، پیارے، یہاں!..... اور اب یہاں.... " یہاں تک کہ دونوں کاموں سے اس نے بہ اطمینان فراغت پا لی اور لوہار کو اس کے سات درہم مل گئے، لیکن اُسے ٹب اپنی کمر پر لاد کر عاشق کے گھر پہنچانا پڑا۔

(ہسپانوی)

ڈان کوئکزوٹ

مصنف:۔ سروینٹیز

مترجم:۔ شاھد احمد دہلوی

حصۂ دوئم باب ۱۷۔ جس میں پیش کیا گیا ہے وہ نقطۂ آخریں و بلند ترین جس پر
ڈان کوئکزوٹ کی ہمت ناشنیدہ کبھی پہنچی یا کبھی پہنچ سکتی
تھی بیز شیروں کی مہم کا انجام خوش۔

نئی تازہ مہم کے پیش آنے کا کوئی احتمال تو تھا ہی نہیں لہٰذا سانچو، جیسا کہ تاریخ احتیاط سے بتاتی ہے، بھیڑوں کے گلہ بانوں سے بڑے اطمینان کے ساتھ دہی خرید رہا تھا۔ آقا نے جو اسے اچانک جلدی بلا بھیجا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دہی کا کیا کرے، اور نہ یہ سمجھ میں آیا کہ اسے کیسے جائے۔ لہٰذا اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اس نے دہی اپنی خود میں ڈال لیا؛ اور اس عمدہ ترکیب سے علم مُہم ہو کر اپنے آقا سے احکام پانے کے لئے جلدی جلدی چل پڑا۔ سورما نے کہا "سانچو، مجھے میری خود دو۔ کیونکہ یا تو مہموں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے یا وہ جو مجھے سامنے دکھائی دے رہا ہے کوئی ایسا مقابلہ ہے جس کے لئے مجھے ہتھیاروں سے کام لینا ہوگا۔ وہ تماشائی جو سواری کا سبز کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ بات سن کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ صرف ایک گاڑی ان کی طرف چلی آرہی تھی جس میں دو تین جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر اس نے سوچا کہ غالباً اس گاڑی میں بادشاہ کا کچھ خزانہ جا رہا ہے۔ اس نے اپنا قیاس ڈان کوئکزوٹ پر ظاہر کیا مگر اس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس کے تصور پر کارنامے چھائے ہوئے تھے، صرف اتنا جواب دیا "جسے پہلے معلوم ہو جائے وہ پہلے ہتھیار سجا لے۔ پوری تیاری آدھی فتح ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں، تجربہ سے میرے دو طرح کے دشمن ہیں، دکھائی دینے والے اور نہ دکھائی دینے والے۔ اور میں نہیں جانتا کہ کس طرف سے، کس وقت، اور کس شکل میں وہ مجھ پر حملہ کر دیں۔ اس سے پہلے کہ سانچو دہی پھینک دیتا۔ سورما نے اس کے ہاتھ سے خود لے کر اپنی دیکھے بھالے جلدی سے اپنے سر پر رکھ لی۔ دہی پر جو دباؤ پڑا تو اس کا پانی سورما کے چہرے اور ڈاڑھی پر بہہ کر آنے لگا۔ وہ بہت گھبرایا۔ جوش "اس کا کیا مطلب ہے سانچو؟ میرا خیال ہے کہ میری کھوپری ملائم ہو رہی ہے، یا میرا بھیجا پگھل رہا ہے، یا میری چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آرہا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یہ نتیجہ خوف کا نہیں ہے، مگر مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ یہ مہم بڑی خوفناک ہوگی۔ کچھ دنیا مجھے اسے پونچھنے کے لئے۔ پسینے کی دھاریں تو مجھے اندھا کئے دے رہی ہیں" سانچو نے کچھ نہیں کہا، ایک کپڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آقا پر بھید نہیں کھلا۔ ڈان کوئکزوٹ نے اپنا چہرہ صاف

کیا اور خود کو آئینہ میں دیکھا تو ایسی ڈراؤنی صورت نظر آئی کہ خود اس کو ٹھنڈی سرکولک رسی ہے۔ سفید ڈسے ٹڈے سے دیکھ کر اس نے انھیں اپنی ناک سے لگا کر سونگھا، اور حیران ہو کر [illegible] ہماری خاتون کی قسم! ایسے بدتمیز کینے نقوے یہ تو وہی ہے جو تو نے اس میں ڈال رکھا ہے!" "ساچو نے بڑی عاجزی سے جواب دیا "جناب عالی، اگر یہ وہی ہے تو مجھے دیجیے، میں اسے کھالوں۔" "نہیں، اب مجھے خیال آیا، [illegible] نے شیطان اسے کھانے کا کیونکر اسی نے خود ہی ڈالا ہوگا۔ کبھی ہو سکتا ہے یہ کہ میں عالی جناب کی خود کو آلودہ کروں۔ یا خدا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے پیچھے ہی جادوگیرے لگے ہیں جو مجھے اس لئے تنگ کر رہے ہیں کہ میں حضور کا پھر وہ اور صاحبی ہوں۔ اچھا، [illegible] اس لئے ڈالی ہے کہ آپ کو مجھ پر غصہ دلائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب کے ان کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔ لیجیے اپنے آقا کی صحیح قوت دیکھیے پھر وسا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ میرے پاس نہ تو وہی ہے، نہ ملائی، اور نہ ایسی کوئی اور چیز۔ اور اگر ایسی کوئی چیز ہوتی تو میں اسے فوراً اپنے پیٹ میں ڈال لیتا نہ کہ جناب والا کی خود میں۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "ہاں، اس میں کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے؟" وہ شخص جو سارا ماجرہ دیکھ رہا تھا یہ سن کر حیران ہوا۔ اور جو کچھ آگے چل کر ہوا، اس سے اسے بھی حیرانی ہوئی۔ ڈان کوئکزوٹ نے سر، منہ، ڈاڑھی اور خود کو صاف کرنے کے بعد خود پھر پہن لی، اور اپنی رکابوں میں پاؤں خوب جما کر، تلوار کھینچ کر کانی اور زیادہ قوت کا نعرہ لگایا "ہاں اب میں تیار ہوں شیطان تک سے مقابلہ کرنے کے لئے۔"

تھوڑی دور میں جنڈیاں لگی گاڑی ان کے قریب آپہنچی۔ اسے گاڑی بان ایک خچر پر بیٹھا چلا رہا تھا، اور گاڑی کے اگلے حصے میں ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ڈان کوئکزوٹ انھیں دیکھ کر سامنے جا کر ڈٹ گیا، اور بولا "کہاں جا رہے ہو تم، اے بھائیو! یہ کیسی گاڑی ہے؟ اس میں کیا ہے؟ اور یہ جنڈیاں کیسی لگی ہیں؟" گاڑی بان بولا "یہ گاڑی میری ہے، اور اس میں دو خوفناک شیر پنجرے میں اور ان کے جنڈیاں ہے بادشاہ سلامت کے لئے بطور تحفہ بھیجا ہے۔ جنڈیاں ہمارے آقا بادشاہ سلامت کی ہیں اور اندر جانے کے لئے تاکید لگی ہیں کہ گاڑی میں کچھ ہے ان کا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے تکلم سے پوچھا "کیا شیر بڑے ہیں؟" گاڑی کے اگلے رخ جو شخص بیٹھا ہوا تھا بولا "اے زیادہ سے زیادہ تک ان سے بڑے شیر کبھی میں آتے۔ میں ان کا محافظ ہوں۔ میرے پاس پنجرے میں ہے شیر ہے سکھانے بڑے کبھی نہیں رہے۔ ان میں ایک نر ہے اور ایک مادہ۔ نر پہلے پنجرے میں ہے اور پہلے میں مادہ ہے۔ آج صبح انھیں کھانا نہیں ملا، اس وقت بہت بھوکے ہیں۔ اس لئے جناب راستہ چھوڑ دیجیے کیونکہ ہمیں جلدی وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں انہیں کھانا دینا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے حقارت آمیز مسکراہٹ سے کہا "ہاں! شیر اور میرے آگے چوں کرے! اے میرے آگے یہ نر اور اسے جانور کیا حقیقت رکھتے ہیں! اور دن کو مادہ بھی اس وقت! اس تلبرک سورج کی قسم! وہ جنھوں نے انھیں یہاں بھیجا ہے انھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں شیروں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ نیچے اترآؤ، دیا نتدار دوستو۔ اور تم چونکہ ان کے محافظ ہو اس لئے تم ان کے پنجرے کھول دو اور اپنے صحرا کے وحشی درندوں کو باہر نکال دو۔ باوجود ان جادوگیروں کے جنھوں نے انھیں یہاں بھیجا ہے میں اسی کھیت میں انھیں بتا دوں گا کہ ڈان کوئکزوٹ ساکن مانچا کون ہے۔" تماشائی نے اپنے دل میں کہا "ہمارے اچھے سورما نے اب ہمیں اپنا نمونہ تو دکھا ہی دیا۔ یقیناً دیبی نے اس کی کھوپری پلپلی کر دی ہے۔ اور اس کا بھیجا نرم پڑ گیا ہے۔" ساچو نے تماشائی کے قریب آکر کہا "جناب، خدا کے لئے شیروں سے الجھنے سے میرے آقا کو باز رکھئے۔ اگر یہ الجھ گئے تو ظہیر ہم سب کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔" تماشائی نے پوچھا "تو کیا تمہارا آقا اس قدر پاگل ہے کہ

پہلے ہی اس قدر خوفناک جانوروں پر حملہ کر دے گا؟" ساچو نے کہا "پاگل نہیں ہیں، نڈر ہیں۔" تماشائی نے کہا "میں انہیں روک دوں گا یہ کہہ کر وہ ڈان کوئکزوٹ کی طرف بڑھا جو محافظ سے اصرار کر رہا تھا کہ پنجروں کے دروازے کھول دے۔ تماشائی نے کہا "جناب سورما، کوئی خطرناک کاموں میں دخل دینا چاہئے جن میں کامیابی کی کچھ امید دکھائی دیتی ہو۔ ایسے کاموں میں نہیں پڑنا چاہئے جن میں صریح ناکامی دکھائی دیتی ہو۔ کیونکہ وہ شجاعت جو تہور سے نزدیک ہو جاتی ہے۔ اس میں حمت سے زیادہ دیوانگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، جناب سورما صاحب، یہ شیر آپ پر حملہ کرنے نہیں آئے ہیں۔ یہ تو بادشاہ سلامت کو تحفتہً بھیجے جا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو روکنا یا ان کی راہ کھوٹی کرنی مناسب نہیں ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "پیارے جناب، آپ یہاں سے تشریف لے جائیے اور اپنے فریب دے کر لگالانے والے پٹیرو اور پھانس لانے والے جانوروں کی خبر گیری کیجئے۔ جو جس کام میں لگا ہوا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ یہ میرا معاملہ ہے اور میں دیکھوں گا کہ عالی نسب شیر میرے مقابلہ پر آتے ہیں یا نہیں۔" پھر محافظ کی طرف پلٹ کر کہا "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، معزز عوام الناس صاحب، اگر آپ نے پنجروں کے دروازے فوراً نہیں کھولے تو میں آپ کو اس نیزے سے اس گاڑی میں جوڑ دوں گا۔" گاڑی بان نے دیکھا کہ مسئلہ پاگل پن کا نہیں بلکہ حماقت کا ہے تو بولا "اچھے جناب، مجھ پر ترس کھا کر جانور دیکھ کر شیروں کے کھلنے سے پہلے میں اپنے خچر لے کر خطرے سے باہر نکل جاؤں۔ میرے جانور اگر مارے گئے تو میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاؤں گا، کیونکہ اس گاڑی اور ان خچروں کے علاوہ میری کمائی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے بگڑ کر کہا "ارے ڈرپوک بدبخت، کھول لے اپنے خچر اور جو تیرے جی میں آئے کر۔ مگر تو جلد دیکھ لے گا کہ تو نے یہ زحمت ناحق کی۔"

گاڑی بان نے اتر کر جلدی جلدی اپنے خچروں کو کھولا۔ اس کے بعد محافظ نے بہ آواز بلند کہا "جتنے لوگ یہاں موجود ہیں۔ سب گواہ رہیں کہ میں اپنی مرضی کے خلاف اور زبردستی کئے جانے پر شیروں کے پنجرے کھول کر شیروں کو چھوڑ رہا ہوں۔ یہ صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں، اور اعلان کرتا ہوں کہ ان جانوروں سے جو بھی نقصان ہو گا اس کے ذمہ دار یہ صاحب ہوں گے، اور میری تنخواہ اور دیگر واجبات کے بھی۔ صاحبان، براہ مہربانی میرے دروازہ کھولنے سے پہلے آپ سب اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں۔ رہا میں، تو مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ جانور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" تماشائی نے ایک بار پھر ڈان کوئکزوٹ کو مخاطب کر کے کہا "جناب والا، غور فرمائیے کہ اس میں کوئی افسوں نہیں ہے اور نہ کوئی سحر ہے، کیونکہ میں نے پنجرے کی درزوں میں سے سچ مچ کے شیر کا پنجہ دیکھا ہے اور اس کے پنجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شیر بہادر سے بھی بڑا ہے۔" ڈان کوئکزوٹ نے کہا "تیرے خوف قوا سے تجھے آدھی دنیا سے بھی بڑا دکھائیں گے۔ چلا جا ساچو، اور مجھے تنہا چھوڑ دے۔ اگر میں مارا جاؤں تو اس پرانے معاہدے کو یاد رکھیو جو مجھ میں اور تجھ میں ہوا تھا۔ ڈلسینیا کے پاس واپس چلا جائیو ——— بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔" اس کے بعد کچھ ایسی باتیں بھی کہیں جن سے اس کے ارادے کا استحکام ظاہر ہوتا تھا اور یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اب ساری دلیلیں بے اثر ثابت

ہوں گی۔ تمانشائی چاہتا تھا کہ اسے خوب دق کرے مگر مقابلے کے لئے نہ تو اس کے پاس ہتھیار تھے اور نہ زرہ۔ اور ایسے حملے ہوئے پاگل سے الجھنا دانشمندی کے خلاف تھا جو محافظ کو اب شدت سے دھمکیاں دے رہا تھا۔ لہٰذا تماشائی نے اپنی گھوڑی کو ایڑ دکھائی، ساتھ ہی محافظ نے اپنے چیتوں کو شکاری دی، اور شیروں کے کھلنے سے پہلے جتنی دور نکل سکتے تھے نکل گئے۔ ساتھ چلنے والی موت پر واہ واہ کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا شیروں کے نتیجے اس کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ وہ اپنی بدنصیبی اور اس منحوس تھرتھری کو کوسنے لگا جب اس نے آقا کی ملازمت دوبارہ قبول کی۔ لیکن اپنے آنسوؤں اور واویلا کے باوجود اپنے ایڑ لگوا آگے بڑھاتا رہا۔ کافی دیر سے دوڑتا رہا جب۔ محافظ نے جب دیکھا کہ پناہ لینے والے دور نکل گئے تو اپنی دلیلیں اور گولیاں پھر دہرانے لگا۔ [illegible] محافظ نے ان سب کا یہ جواب دیا کہ "میں نے تمام باتیں سن لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو مزید [illegible] دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو دوست

محافظ [illegible] دروازہ کھولنے لگا تو ڈان کوئکزوٹ نے دل میں سوچا کہ گھوڑے پر سوار رہ کر مقابلہ ٹھیک رہے گا یا نہیں۔ [illegible] کہ یہ حالت [illegible] کیونکہ ہو سکتا ہے روزی نٹ شیروں کو دیکھ کر ڈر جائے۔ یہ سوچ کر وہ گھوڑے پر [illegible] اپنی ڈھال [illegible] ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور حیرت ناک دلیری اور بے خوفی سے شیر کے پنجرے کے [illegible] ہاتھ [illegible] بڑے تحمل و خشوع سے اپنے دل اللہ کو سونپا اور اس کے بعد اپنی محبوبہ ڈلسینیا سے امداد چاہی۔

[illegible] کہ کر اس نے اپنا مخصوص [illegible] سے یوں پڑھتا ہے "اے نہایت عالی ہمت، زبردست، اور فاضل اظہار شیخ، ڈان کوئکزوٹ، ساکن لا مانچا، سورماؤں کے آئینے، اور اے بہادروں کے نمونے۔ تو جدید اور دوسرا ڈان مینوئل ساکن لی آں ہے ——— تو بادی سورماؤں کی۔ حوصلہ و شان۔ وہ الفاظ کہاں سے لائے جو اس عظیم معرکہ کو بیان کر سکیں؟ آنے والی نسلوں کے لئے ایسے کیسے قابل یقین بناؤں؟ وہ کونسی مدح و ستائش ہے، جو کتنی ہی مبالغہ آمیز مغالطہ کیوں نہ ہو، جو پہلے ہی تیرے حصے میں نہ آ چکی ہو؟ تو جو بن تنہا، قدم جمائے بے خوف دلیرانہ یوں کھڑا ہے کہ ہاتھ میں صرف ایک تلوار ہے، اور وہ بھی کچھ بہت تیز نہیں ہے، اور صرف ایک ڈھال اپنے بچاؤ کے لئے رکھتا ہے۔ جو نہ تو چمکدار ہے اور نہ چمکدار، تو یوں کھڑا منتظر ہے۔ ان دو خوفناک ترین شیروں کے حملہ کرنے کا جن سے زیادہ خوفناک شیر کبھی بھی محرائے بیابان میں نہیں گونجے۔ تیرے اپنے بے مثل کارنامے ہی پہلے کے بہادروں کی ستائش کریں گے، اتنے بلند موضوع کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔" یہاں پہنچ کر مصنف اپنی توصیف ختم کر لیتا ہے اور تاریخ کا سلسلہ پھر شروع کرتا ہے۔

محافظ نے دیکھا کہ ڈان کوئکزوٹ اپنی مندیر اڑا کھڑا ہے اور اگر میں شیر کو نہیں کھولتا تو اس پر غضب اور نڈر سورما کی ناراضگی سے نہیں بچ سکتا۔ لہٰذا پہلے پنجرے کا دروازہ پورا کھول دیا۔ درندہ بیٹھا ہوا تھا اور غیر معمولی قد و قامت اور بھیانک شکل کا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلا کام اس جانور نے یہ کیا کہ پنجرے کا ایک چکر کاٹا اور ایک پنجا آگے بڑھا کر انگڑائی لی۔ پھر منہ پھاڑ کر بڑے آرام سے جمائی لی، اور اس کے بعد کوئی ہاتھ بھر کی زبان باہر نکالی اور چاٹ چاٹ کر اپنا منہ دھویا۔ اس سے فارغ ہو کر پنجرے میں سے اپنا سر باہر نکالا اور دہکتے انگاروں جیسی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ منظر ایسا تھا کہ خود بے باکی بھی خوف زدہ ہو

جاتی۔ ڈان کونکزوٹ یکسوئی سے اسے دیکھتا رہا اور بے چین ہوتا رہا کہ کب وہ پنجرے میں سے چھلانگ لگائے اور کب اس سے گتھ کر شیر کے چھتڑے بکھیر دے۔ اس کی دیوانگی نے اسے بے باکی کی اس نوبت کو پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس شیر میں شرافت زیادہ اور شرور کم تھا۔ اس نے بے باکی اور آتور کے مظاہرے کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا اور ادھر اُدھر دیکھ کر پلٹ گیا اور اپنے کو لمبے ڈان کونکزوٹ کی طرف کر کے اطمینان اور خاموشی سے پھر پنجرے میں لیٹ گیا۔ یہ دیکھ کر ڈان کونکزوٹ نے محافظ کو حکم دیا کہ، اس کے دو بیک ہاتھ لگائے اور اسے غصہ دلا کر باہر نکالے۔ محافظ نے کہا "میں نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر میں نے اسے غصہ دلایا تو سب سے پہلے مجھی کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ جناب محترم سورما صاحب، جو کچھ گزر چکا ہے آپ اسی پر تکیہ کیجئے اور چلے جائیے۔ اس سے زیادہ ہمت کا مظاہرہ اور کیا ہوگا؟ قسمت کو دوبارہ مت للکاریئے۔ شیر کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے اور وہ باہر نکلنے کے لئے آزاد ہے مگر چونکہ وہ اب باہر نہیں نکلا لہٰذا اچھی ہی وقت بھی باہر نہیں نکلے گا۔ غنودگی ہمت کی مخالف نوعیت قائم ہو سکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کوئی بہادر اپنے دشمن کو للکارنے کے بعد مجبور نہیں ہوتا کہ کچھ اور بھی کرے۔ آپ نے اس کے میدان میں آنے کا انتظار بھی کیا۔ اگر دشمن مقابلہ کے لئے آگے نہیں بڑھتا تو ذلت اس کے سر پڑتی ہے اور مقابلے کی دعوت دینے والا فتح کا مستحق ہو جاتا ہے۔" ڈان کونکزوٹ نے کہا "سچ کہا تم نے۔ دروازہ بند کر دو۔ اور جو کچھ تم نے مجھے کرتے دیکھا ہے، اس کی ایک اچھی سے اچھی سند سمجھ لو۔ یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہیئے کہ تم نے شیر کے لئے دروازہ کھول دیا تھا، یہ بھی کہ میں اس کا منتظر رہا کہ وہ باہر نکلے، مگر وہ نہیں نکلا۔ میں نے پھر انتظار کیا، وہ پھر بھی نہیں نکلا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ اب مجھ پر کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے ——— سلامت، عافیت سو جاؤ! یوں نیب سے سچائی، انصاف اور حقیقی شجاعت کی حمایت ہوتی ہے۔ میں مجھ سے کہہ چکا ہوں، دروازہ بند کر دے، میں پناہ لینے والوں اور بھگوڑوں کو واپس آنے کا اشارہ دیتا ہوں، تاکہ تیرے منہ سے اس معرکہ کی تفصیل سن لیں۔"

محافظ نے دروازہ بند کر دیا، اور ڈان کونکزوٹ نے اس سوتی پٹڑے کو جس سے اپنے چہرے کا دہی صاف کیا تھا، اپنے نیزے کی نوک پر رکھا اور دور جاتے ہوئے لوگوں کو واپس آنے کا اشارہ کیا اور آوازیں دیں۔ سب سے آگے سنچو پانسا تھا اور سب ابھی چلے ہی جا رہے تھے۔ لیکن قادم قدم پر مڑ کر ادھر دیکھتے جاتے تھے کہ سانچو نے سفید کپڑے کے اشارے کو دیکھ لیا اور چلایا "ارے میرے پیا نسی لگ جائے، جو میرے آقا نے وحشی درندوں کو ہلاک نہ کر دیا ہو۔ دیکھو وہ ہمیں بلا رہے ہیں۔" سب نے رک کر دیکھا تو دیکھا کہ ڈان کونکزوٹ ہے جو واپس آنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ ان کا خوف کسی قدر کم ہوا اور وہ آہستہ آہستہ واپس چلے، یہاں تک کہ ڈان کونکزوٹ کے الفاظ انھیں صاف سنائی دینے لگے۔ جب وہ گاڑی کے قریب دوبارہ آ گئے تو ڈان کونکزوٹ نے گاڑی بان سے کہا "دوست، اب اپنے خچر پھر جوت لو اور اللہ کا نام لے کر آگے روانہ ہو جاؤ، اور ہاں سانچو، اسے اور محافظ کو دو سکے دے دو تاکہ ان کی تاخیر کی تلافی ہو جائے۔" سانچو بولا "ابھی ادا کرتا ہوں، نہایت خوشی کے ساتھ۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ شیروں کا کیا حشر ہوا؟ مر گئے یا زندہ ہیں؟" محافظ نے بڑی تفصیل کے ساتھ مناسب وقفے دے کر مقابلے کی روداد بیان کی، اور ڈان کونکزوٹ کی شجاعت کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اور بتایا کہ "انہیں دیکھتے ہی شیر مارے خوف کے بدک گیا اور پنجرے سے باہر نہیں نکلا، حالانکہ میں نے بہت دیر تک دروازہ کھلا رکھا۔ میں نے سورما سے کہا کہ شیر کو چھیڑنا اور زبردستی باہر نکالنا خدا کو ناپسند ہوگا۔ اس پر اپنی خلاف مرضی سورما نے مجھے اجازت دی کہ دروازہ دوبارہ بند کر دوں۔" ڈان کونکزوٹ نے کہا۔

ہے کہو تم کیا کہتے ہو اس کے بارے میں؟ بھلا کسی ہمت کے آگے کوئی سحر ٹھہر سکتا ہے؟ یہ ہو سکتا ہے کہ جادوگر سے مجھے میری خوش بختی سے محروم کر دیں، مگر جو حوصلہ اور دلیرانہ تصمیم مجھ سے نہیں چھین سکتے" ساچو نے سنہری سکے دے دیئے۔ گاڑی بان نے اپنے خوشامدی الفاظ نے انعام پانے پر ڈان کوئکزوٹ کا شکریہ ادا کیا، اور وعدہ کیا کہ مدین دربار میں پہنچ کر اس بہادر نائٹ معرکے کا ذکر بادشاہ سلامت سے خود کروں گا۔ "ڈان کوئکزوٹ نے کہا" اگر اتفاق سے بادشاہ سلامت دریافت فرمائیں کہ یہ معرکہ کس نے سر کیا تو کہنا شیروں کے سورما نے۔ کیونکہ میں نے طے کیا ہے کہ اب تک "مغموم شکل کا سورما" کی جو عرفیت میں نے اختیار کر رکھی تھی۔ اُسے میں آج سے بدل دوں، تبدیل کر دوں، اور اس دن سے تم تسلیم کر دو اور اس باب میں میں نے اگلے سورماؤں کے قدیم دستور کی پیروی کی ہے کہ وہ جب چاہتے تھے اپنا نام بدل دیتے تھے"

گاڑی اب آگے روانہ ہو گئی، ورڈان کوئکزوٹ، ساچو اور فرمان ڈالیگو میرانڈوی (سبز کوٹ والے تماشائی کا یہی نام تھا بھی چل پڑے۔ راہ صاحب ہمت وہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے کیونکہ ڈان کوئکزوٹ نے منفرد طرز عمل اور انداز گفتگو پر غور کرنے میں غلطاں و پیچاں تھے، اور سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص ایک سمجھدار دیوانہ ہے، اس کی دیوانگی میں بھلائی بھی شامل ہے۔ ہمارے سورما کی تاریخ کا پہلا حصہ دیکھنے کا اتفاق سے کبھی نہیں ہوا تھا، ورنہ اب جو کچھ اس نے دیکھا اُس پر اتنا متعجب نہ ہوتا۔ لیکن اسے گفتگو میں اس درجہ ذہین اور معقول، اور عمل میں اس قدر سادہ لوح، وحشی، اور خود سر دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا سمجھے۔ اس نے دل میں سوچا "بھلا اس سادہ حماقت اور کیا ہو گی کہ وہ اپنی سے بھری ہوئی خود سر یہ وھرلی اور سمجھتا یہ رہا کہ جادوگروں نے کھوپری پلپلی کر دی ہے؟ یا اس سادہ لوحی کا کوئی جواب ہو سکتا ہے کہ شیروں سے لڑنے پر تل گیا؟

ڈان کوئکزوٹ نے اس کے خیالات میں یہ کہہ کر مداخلت کی کہ "یقیناً جناب آپ مجھے بڑا اچھلو اور پاگل سمجھ رہے ہونگے۔ اور آپ کا ایسا خیال کرنا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ میرے عمل سے ظاہر بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تاہم میں اس قدر بے شعور نہیں ہوں جتنا کہ آپ کو دکھائی دیتا ہوں۔ جب کوئی اسپ سوار چمکتی ہوئی زرہ پہنے کسی دلچسپ مقابلے میں خواتین کے سامنے اپنا گھوڑا کدکاتا چلتا ہے تو بڑا شاندار منظر ہوتا ہے۔ اور وہ منظر بھی بڑا شاندار ہوتا ہے جب وسیع احاطے میں کوئی بہادر شہسوار اپنے شہزادے کی نظروں کے سامنے ایک بپھرے ہوئے بیل کو اپنے نیزے سے جوڑ کر رکھ دیتا ہے، اور ان سب سورماؤں کا منظر بھی شاندار ہوتا ہے جو فوجی یا دوسری مشقوں میں اپنی ہنرمندیوں سے تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتے اور ان میں ولولہ پیدا کرتے ہیں، اور اپنے شہزادے کے دربار کا اعزاز بڑھاتے ہیں۔ لیکن ان سب پر اس سورما کو فوقیت حاصل ہے جو صحراؤں اور ویرانوں میں، الجھے ہوئے راستوں اور جنگلوں میں، اور پہاڑوں پر پُرخطر معرکوں کی تلاش میں گھومتا ہے۔ (اس میں بے خوف و خطر کود پڑتا ہے ——— محض پرشکوہ اور غیر فانی شہرت حاصل کرنے کے لئے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی گمشدہ سورما کا کسی صحرا سے کسی بیوہ کو نجات دلانا شہر کی کسی حسینہ کو کسی درباری سورما کے داد دینے سے کہیں شریفانہ منظر ہوتا ہے۔ سورماؤں کے طرح طرح کے فرائض ہوتے ہیں۔ درباری سورما کا کام یہ ہے کہ خواتین کی خدمت کرے، شہزادے کے دربار کو بیش قیمت لباسوں سے مزین کرے، اپنے ہم نعمت دسترخوان پر غریب گھرانوں کو کھلائے پلائے، نیزہ بازی کا انتظام بانکوں کیلئے کرے، مقابلوں کا اہتمام کرے، اور اپنی عظمت، دریادلی اور سطوت کا مظاہرہ کرے اور ان سب پر مستزاد اپنے اچھے مسیحی ہونے کا ثبوت دے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنے فرائض کی ادائیگی میں پورا اترے گا۔ لیکن

گشتی سورما کا کام یہ ہے کہ دنیا کے بعید ترین گوشوں کی چھان بین کرے۔ بھیس بدل کر سپیرے، جوا بازیوں میں داخل ہو، ہر قدم پر ناممکنات سے ٹکرائے، بے برگ و گیاہ صحراؤں میں گرمیوں کے سورج کی دہکتی کرنوں کو انگیز کرے، اور جاڑے کی برفیلی ہوا اور کہر کی شدت کو گھورکر کرے۔ شیر اسے خوف نہ دلا سکیں، عفریت اسے خائف نہ کر سکیں، اور نہ اژدہے اسے ڈرا سکیں۔ کیونکہ انھیں ڈھونڈ نکالنا اور پر حملہ آور ہونا، اور ان سب کو شکست دینا اس کا مخصوص فرض ہے۔ لہٰذا جناب، چونکہ گشتی سورماؤں میں سے ایک ہونا میرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ اس لئے میرے فرائض میں جو کچھ آتا ہے میں اس کی ادائیگی سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی صورت شیروں کے معاملے میں مجھے پیش آئی، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ بڑی اندیشہ ناک بے باکی ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ، مستقلاً ایک ایسی خوبی ہے جو بزدلی اور بے باکی کے انتہائی سروں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہتر ہے کہ بہادر بزدلی کے سرے پر پہنچنے کے بجائے بے باکی کے سرے پر پہنچ جائے۔ کیونکہ جس طرح کنجوس کے مقابلے میں سخی کے لئے گشادہ دست بننا آسان ہے اسی طرح بزدل کے مقابلے میں کسی بے باک کا سچا بہادر بن جانا بہت آسان ہوتا ہے۔ یقین کیجئے جناب ڈان ڈائیگو صاحب، ہر قسم کے دشوار مرحلوں میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ بازی ایک پتہ کم سے ہارنے کے بدلے ایک پتہ بیش سے ہاری جائے۔ کیونکہ کم ہمت اور بزدل کہلوانے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بے باک کہلایا جائے۔

ڈان ڈائیگو نے جواب میں کہا "جناب ڈ ن کوکزوٹ صاحب، آپ نے جو کچھ کہا اور کیا اس میں صحیح شعور کارفرما ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر گشتی سورمائی کے اصول و ضوابط کبھی محو ہو جائیں تو حضور والا کے سینے میں جائیں گے، کیونکہ یہی ان کی حقیقی کھتی اور کھانا ہے۔ لیکن چونکہ دیہ ہو رہی ہے ہمیں ذرا قدم بڑھا کر چلنا چاہئے۔ یوں ہم سب جلدی غریب خانہ پہنچ جائیں گے۔ آپ نے ابھی اتنی محنت کی ہے، جسم کی نہ سہی، ذہن کی تو ضرور تھی۔ میرے گھر پر تھوڑی دیر آرام کر لیجئے۔ سورما نے کہا "میں آپ کی پیشکش شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں"۔ اس کے بعد وہ رفتار بڑھا کر کوئی دو بجے دوپہر کو سب ڈان ڈائیگو کے گھر پہنچے، اور ڈان کوکزوٹ نے صاحب خانہ کو "شہسوار ہی کے بہترین والا سورما" موسوم کیا۔

(ترکی)

حکایاتِ مُلّا نصرالدّین حصّہ

ایک دن کا ذکر ہے کہ وقت دوپہر کا تھا۔ پوش ڈاکو مُلّا نصرالدین کے گھر میں داخل ہوئے۔ آہٹ پانے پر مُلّا سب کچھ تاڑ گیا اور اپنی جان بچانے کے لیے جلدی سے ایک الماری میں چھپ گیا۔ ڈاکو کمرے میں پہنچے تو سب سے الماری کی طرف لپکے۔ پیٹ کھولا تو مُلّا نصرالدین کو سامنے پایا۔ اُن میں سے ایک نے کہا "مرنے کی بات نہیں۔ ہم ایک بوڑھے آدمی کو نہیں مار سکتے، باہر آجاؤ، چھپنے کی کوئی ضرورت نہیں؟

مُلّا نے جواب دیا "میں جان بچانے کے لئے نہیں چھپا ہوں۔ دراصل میں منہ دکھانے کے قابل نہیں۔ مرنے سے قبل میں آپ ایسے شریف آدمیوں کو آنے کی زحمت کو ہرگز نہیں دینا چاہتا۔ کہیے بھی کیا سوائے ویرانی کے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے منہ چھپائے کھڑا ہوں؟

مانا کہ برس پہلے مُلّا نصرالدین کی ہی کئی مشہور قول پر بیان کیا ہے اور اس دور میں اس کے لیے ایک خاص مرتبہ وہ ہے جب اسمبلی کا کوئی امیدوار دوست یا غیر ناظر کسی گھر میں قدم رکھتا ہے یا کسی جماعت کا کوئی رکن چندہ لینے کے لئے کسی دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ترکی کے ہر شعبہ زندگی میں مُلّا نصرالدین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علمی، ادبی، فنی، تہذیبی، معاشرتی، تجارتی اور سیاسی مسائل جب اُلجھ کر کانٹا بننے والی حد تک لاینحل سے نظر آتے ہیں تو اُس وقت مُلّا نصرالدین کی ایک شگفتہ مسکراہٹ سارے الجھن کو دور کر دیتی ہے۔ مُلّا نصرالدین کی پرانی باتیں آج بھی اپنی تروتازگی سے نئی شگفتگی پیدا کرتی ہیں۔

مُلّا نصرالدین کو خیالی کردار نہیں، البتہ کئی من گھڑت واقعات اس کی ذات سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ ویسے اُس کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور گزرے ہیں جو اپنے نوکھے پن کی وجہ سے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں۔ انہی واقعات نے مُلّا کو بڑی شہرت بخشی اور ترکی کی ہر محفل میں اُس کا ذکر ہونے لگا۔ مُلّا ترکی کے ایک گاؤں ہورتو میں ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ عبداللہ شاہی گاؤں میں مسجد کا امام تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے نصرالدین کو اس زمانے کے لحاظ سے اچھی تعلیم دلوائی۔ نصرالدین جوان ہو کر عالموں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس حیثیت سے مُلّا کا خطاب ملا۔

نصرالدین اپنے وقت کا واحد مُلّا تھا جو زاہد خشک اور تنگ نظر نہیں تھا۔ وہ ہر وقت ہنستا مسکراتا اور ہنسی ہنسی میں بڑی اہم اور سنجیدہ باتیں سمجھا دیا کرتا۔ اس کی مزاح و طنز سے بھرپور باتیں دل پر اثر کرتیں اور سننے والے ہنستے ہنستے زندگی کی کوئی بڑی حقیقت پر غور کرنے لگتے۔ مُلّا نصرالدین نے پند و نصائح سے ہمیشہ گریز کیا۔ اُس کا یہ نظریہ تھا کہ اس روتی بسورتی دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے

نے ضروری ہے کہ ان کی سمجھ کے مطابق بات سمجھائی جائے اور بات سمجھانے کے لئے ہنسی مذاق کو اپنا شعار بنایا جائے۔ ملا نصر الدین نے اپنے اس نظریئے کو اس حد تک عملی جامہ پہنایا کہ وہ خود جان بوجھ کر بے وقوف بنتا رہا۔ لوگ اس کی بیوقوفی پر ہنستے اور دوسرے لفظوں میں کسی اچھی بات کو تسلیم کرنے پر اپنی عقلمندی کا ثبوت دیتے۔

ملا نصر الدین کی زندگی کے پورے واقعات تو کسی کو معلوم نہیں مالبتہ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے گاؤں کا قاضی بھی تھا۔ وہ شاعر اور فلسفی تھا۔ صاف ستھرا، خوش پوش اور ہنس مکھ انسان تھا کہ بڑی سے بڑی بات بلکے پھلکے مزاحیہ انداز سے موثر پیرائے میں کہی جا سکتی ہے۔ اسکی یہ بات اس کے ایک واقعے سے یوں ظاہر ہوتی ہے کہ ایک بار وہ گاؤں سے باہر سڑک پر مزے مزے سے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں رسی کا ایک ٹکڑا تھام رکھا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے گدھا چل رہا تھا۔ چلتے چلتے گدھے کا پیٹ پر لدی ہوئی بوری میں سے مٹی کا ایک پیالہ گر گیا جو پرزے پرزے ہو گیا۔ لیکن ملا نصر الدین بغیر رکے اور بغیر پیچھے دیکھے اپنی راہ چلتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک راہ گیر نے یہ خیال کر کے کہ شاید ملا کو پیالے کے ٹوٹنے کی خبر نہیں، ٹوٹے ہوئے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ ملا نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے لیکن جب پیالہ ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا۔"

ایسے موقع پر دراصل سوائے اس کے کوئی اور چارہ بھی نہ تھا کہ بجائے اس نقصان پر رونے دھونے کے وہ اپنی رفتار جاری رکھتا۔ ملا کا یہ جواب مزاح اور طنز کے پرخچے میں ٹوکنے والے شخص کی سمجھ پر ایک کڑی تنقید ہے۔ یہ جواب دوسرے شخص کے لئے یہ معنی رکھتا ہے کہ "تم کتنے بیوقوف ہو۔ پیالہ ٹوٹ گیا تو ٹوٹ گیا اس کو جوڑا تو جا نہیں سکتا تو پھر خواہ مخواہ افسوس کرنے اور وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟"

ملا نصر الدین اپنی حاضر جوابی، خوش باشی اور زندہ دلی کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔ یوں تو وہ جسمانی طور پر ۷۶ برس تک حیات رہا اور اب وہ سوری حصار زیر زمین ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی آخری قیام گاہ ——— مزار کی پیشانی پر سے محروم ہو گیا اور وہ ناقوس رہنے لگا۔ ملا بڑا خوش تھا لیکن ایک صبح اس نے دیکھا کہ گدھا زمین پر مردہ پڑا ہے۔ گدھے کو مرا ہوا دیکھ کر ملا نے کہا "گدھے کے مرنے کا افسوس کی بات ہے کہ گدھا آخر گدھا نکلا اور اس وقت مرا ہے جب وہ فاقے رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔"

ایک دن ملا نصر الدین نہانے کے لئے گرم حمام میں پہنچا۔ معمولی سے کپڑوں میں ملبوس ملا کو حمام والوں نے معزز نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسے چٹائی پر بٹا اور میلا کچیلا تولیہ، اور لپٹنے دھونے والے صابن کا ٹھنڈا سا ٹکڑا دے کر اس غسل خانے میں بٹھا دیا جہاں نہانے دھونے کا معمول انتظام نہ تھا۔ ملا نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے حمام کے دونوں آدمیوں کو ایک ایک اشرفی انعام کے طور پر دی۔ وہ دونوں دم بخود ہو کر رہ گئے اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگے کہ ہم نے اس انسان کو پہچاننے میں بڑی غلطی کی۔ دوسری بار ملا جو آیا تو انھوں نے ملا کی بڑی خدمت کی۔ ایک نے نیا تولیہ، خوشبودار صابن اس غسل خانے میں رکھا جو خاص لوگوں کے استعمال میں آتا تھا۔ دوسرے نے ملا کے بدن کی مالش کی اور جب ملا نہا دھو کر باہر نکلا تو اس نے دونوں کی ہتھیلی پر تانبے کا ایک ایک پیسہ رکھ دیا اس پر وہ بہت حیران ہوئے۔ ملا سے کہا "جب ہم نے کوئی خدمت نہ کی تو پہلی بار ایک ایک اشرفی ملی۔ اور آج ہماری خدمت کا یہ عوض ....." ملا نے جواب دیا "اس دن تم نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی، اس کا معاوضہ نہیں آج ملا اور آج تم نے بڑی خدمت کی تو اس کا معاوضہ تمہیں اس دن پیشگی دے دیا گیا تھا۔"

ملا نصر الدین سے کسی نے پوچھا: عورت کوئی راز اپنے پیٹ میں محفوظ رکھ سکتی ہے؟
"کیوں نہیں؟"
ایک نے پوچھا: "کون سا راز؟"
ملا نے جواب دیا: "مقفل بکس، راز اپنی مرضی کا ہو۔"
اس پر ایک اور نے پوچھا: "ملا، تمہاری بیوی کیسی ہے؟"
اس نے جواب دیا: "چالیس برس کی۔"
ایک اور نے کہا: "لیکن ملا تو پچھلے برس بھی تم نے یہی الفاظ کہے تھے۔"
"ہاں کہے تھے میں اپنے الفاظ سے پھرنے والا نہیں ہوں اور آج بھی اپنے الفاظ پر کاربند ہوں۔"

ایک سبک چلے میں ایک ادیب نے تقریر کرنے کے لیے سٹیج پر آنا تو وہ بم غیرہ دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ اس کی زبان گنگ ہو گئی اور تقریر دل ہی دل میں ہوتی رہی۔ اس پر اس نے بہت سے عقیدت مندوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے اس عرصے میں وہ سنبھل جائے لیکن وہ نہ سنبھل سکا تو ڈپٹی کمشنر نے آپ کچھ تو کہئے؟
اس نے کہا: "کیا کہوں، میں تو کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔"
ڈپٹی کمشنر سٹیج کے پاس آیا اور اس سے کہا: "کیا یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ سٹیج سے فوراً نیچے اتر آؤ؟"

ایک کسان اپنے گھوڑے کی لمبی دم تراش رہا تھا کہ پاس سے ملا نصر الدین کو گزرا کسان نے ملا سے پوچھا: دیکھو کتنی دم ٹھیک رہے گی؟
ملا نے جواب دیا: "میرے بھائی تم گھوڑے کی دم چھوٹی تراشو یا بڑی وہ بعض لوگوں کے لئے بہت چھوٹی اور بعض لوگوں کے لئے بہت لمبی رہے گی۔"

ایک کسان احمد نامی ملا کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ اس نے ایک خاصا چوزہ ملا کو تحفہ دیا۔ ملا نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی اس کے رخصت ہونے کے چند روز بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے ملا سے کہا: "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے اس کی بھی تواضع کی تیسرے دن ایک اور شخص آیا اس نے کہا: "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے چوزہ ضیافت کا ثبوت دیا۔ اس کے جانے کے ایک ہفتے بعد ایک اور شخص آیا۔ اس نے کہا: "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے اسے اپنے دیوان خانے میں بٹھایا۔ "اتفاق سے وہ کھانے کا وقت تھا۔ دسترخوان بچھایا گیا تو مہمان کے سامنے ملا نے ایک بڑے کٹورے میں خالی گرم پانی پیش کرتے ہوئے کہا: "احمد کے بیٹے بڑے چوزے کے شوربے کے شوربے کا شوربہ ہے۔"

ایک دن ملا نصر الدین نے اپنے بیٹے سے کہا: "کنوئیں سے پانی کا گھڑا بھر لاؤ اور دیکھنا کہیں گھڑا نہ ٹوٹ جائے۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹے کے گال پر زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔ پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے کہا: "تم نے اپنے بیٹے کو

کیسی رہا۔ اس غریب نے گھر جانا تو ٹھیک تھا؟

مُلّا نے جواب دیا "گھر" تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں اسے سنا دیتا تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔"

ملّا نصرالدین کا ایک پڑوسی بڑا لالچی اور بے ایمان تھا۔ ایک شام ملّا نے اس سے فرائی پین (تلنے کا برتن) مانگا۔ پڑوسی نے اسے فرائی پین دے دیا۔ ملّا کو دراصل فرائی پین کی ضرورت نہ تھی، وہ اپنے پڑوسی کو ایک سبق دینا چاہتا تھا۔ پندرہ دن بعد جب اس نے اپنے پڑوسی کو اس کا فرائی پین واپس دیا تو اس کے ساتھ ایک ننھا سا فرائی پین بھی دیا۔ پڑوسی نے پوچھا "یہ کیا ہے۔"

ملّا نے جواب دیا "تمہارے فرائی پین نے بچہ دیا ہے۔"

پڑوسی بہت خوش ہوا اور ننھا فرائی پین بھی لے لیا۔

تیسرے دن ملّا نے پھر اس سے فرائی پین مانگا اور اپنے پاس ایک ماہ تک رکھا اور جب پندرہ دن اور گزر گئے تو پڑوسی خود ملّا کے پاس آیا اور اس سے اپنا فرائی پین مانگا۔ ملّا نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "تمہارا فرائی پین مر چکا ہے۔"

پڑوسی چیخ پڑا "کبھی فرائی پین بھی مر سکتا ہے، کیا بکتے ہو۔"

ملّا نے کہا "جب فرائی پین بچہ دے سکتا ہے تو مر بھی سکتا ہے۔"

(بنگالی)

ایک رات

از: پرشو رام
ترجمہ: دیپش انکر

شہر میں جگہ جگہ اغوا کرنے کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ شام کے وقت لوچن بابو کے بیٹھک خانہ میں اس موضوع پر گفتگو چھڑ گئی۔ ان کا بھانجا اُدے بولتے بولتے بالکل کانپنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ آج کی خبر سنی ہے آپ لوگوں نے؟ صرف آج پچاس بچوں کو اغوا کیا گیا ہے۔ کل اسی محلہ کی بچی کا اغوا ہوا تھا۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ جو بچے اغوا کئے گئے ہیں ان کا ٹھور ٹھکانہ کسی کو نہیں معلوم ہو سکا۔ بچے یقیناً ہوا میں اڑ کر تو نہیں جا سکتے۔ ضرور کوئی نہ کوئی گاڑی یا کوئی نہ کوئی سب بھائی ہاں ہی اور سپاہی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ وہ خاموش ہے

لوچن بابو نے پوچھا۔ اخبار والے نے کیا لکھا ہے؟

لوچن بابو کے سالا نگن نے جواب دیا۔ اخبار والے نے تو یہی لکھا ہے ــ وہ لکھتا ہے ــــ ہم جانتا چاہتے ہیں کہ اس [illegible] کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ان پر عوام کا خیال ہے کہ بالی برج کی بنیاد کو پختہ کرنے کے لئے دس ہزار بچوں کو بھینٹ چڑھایا جائے گا اور پڑوسی ملکوں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بنے دنیا ترک کر کے ان ماں ہے رہے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کس پر یقین کیا جائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام لیڈر امام جو جائیں تم حکومت سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اور کس ملک میں اتنی کثرت سے بچوں کو اغوا کیا گیا ہے؟

لوچن بابو کے بیٹے نے کچھ گھبرا کر کہا۔ کیا یوں کوان نے باپ ہی بھگ گئے ہیں ــ؟

دیکھو جی بابو نے کہا۔ باپ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں فکر کرو۔ ہم حفاظت کریں گے۔

بوڑھے کیدار مہاشے اس وقت جیب حجامت بنا رہے تھے۔ بابو نوشی میں مصروف تھے۔ انھوں نے ان سے کہا۔ کیدار مہاشے ذرا بہتر شیو سے استرا چلائیے گا!

لوچن داس: یہ جو بہت ہوشیار ہیں۔ انھیں بھلا کون پکڑ سکتا ہے؟

اُدے: غالباً محمد غنی چوں ہی کا اغوا کیا جا رہا ہے!

کیدار مہاشے نے مزاحیہ کو۔ کہتے ہوئے کہا۔ ارے بھئی اُدے تم نے کیا لکھ اپنے حساب سے۔ بھلا بتاؤ نوجوان اور بچوں میں کیا فرق ہے؟

اُدے: جوان وہ ہے جس کے جسم میں طاقت ہوتی ہے اور نوجوان یعنی جسے ینگ کہتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے معنت دیکھ کر بتاتا ہوں۔

کیدار: معنت میں نہیں ملے گا تمہیں۔ آج کل لفظوں کے معنے بدل گئے ہیں۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس کی داڑھی اور مونچھیں دونوں ہوں وہ تو بوڑھا جوان جیسے روبی ٹھاکر، پی رائے اور جس کی نہ داڑھی ہو اور نہ مونچھیں، وہ ہوا نوجوان جیسے بنکم چٹرجی، سرت چٹرجی اور میں یعنی کیدار چٹرجی؟

اُدے: اوہ میں!

کیدار: تم ان دونوں کے بیچوں بیچ ہو تم ہی پکڑے جاؤ گے۔

اُدے نے ذرا پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا "میں داڑھی رکھتا مگر بیوی نے ۔۔۔"

نگن: خبردار اُدے ۔۔۔ بیوی کا نام لیا تو کان مل دوں گا۔

اسی اثنا میں نوکر لوچن داس کے ہاتھ میں ٹیلیگرام دے کر چلا گیا۔ ٹیلیگرام پڑھنے کے بعد اس نے کہا ——

"کیدار۔ مہانتے یہ تار آپ کا ہے؟"

کیدار: مجھے تار کس نے کیا؟ ذرا سناؤ تو پڑھ کر۔

لوچن داس: کانگ مینگ

اُدے: ایں۔ کیا لکھا ہے میں آپ؟

لوچن داس: پہلے پار سے چرن گھوش نے تار دیا ہے۔ لکھا ہے کہ کارنگ لا رہا ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیجئے۔ اور چرن بابو پانچ بجے کی ٹرین سے خود آ رہے ہیں۔ مگر اس وقت تو بج چکے ہیں۔ اب آ ہی چلے۔ ان کی زبانی سارا ماجرا سن کر ہی پولیس میں رپورٹ درج کرائیں گے۔ مگر کانگ ہے کون؟

کیدار: چرن کا بڑا لڑکا۔ یہیں اسکل میں رہتا ہے اور ہر ہفتے گاؤں چلا جاتا ہے۔ ان دنوں تو کالج بھی بند ہے۔

نگن: مگر سوال یہ ہے کہ کارنگ کو، خوا کون کر سکتا ہے۔ بکواس ہے۔ بالکل جھوٹ۔

کیدار: تم جانتے ہو اُسے؟

نگن: اچھی طرح۔ میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ بڑا ہی بہادر ہے وہ تو اور۔ خوب ہوشیار بھی۔ جب دس سال کا تھا تو کہا کرتا تھا کہ لڑکیاں بھی کیا انسان ہیں ۔۔۔ سر پر بالوں کا گچھا، ادھر اُدھر سے بندھا ہوا۔ اور جب چودہ سال کا ہوا تو اس نے بالکو کو خط میں لکھا ۔۔۔ عورت کی ہمت؟ سب بکواس ہے بھائی بالکو اس دنیا میں رہنے کا کسی کو حق نہیں۔ صرف میں اور تم رہیں گے لیکن وہ سال کے بعد ہی اُس کے شوخ جوانی کی شانوں پر لٹکتی اُڑ گیا اور کارنگ نے اپنی بیاض میں لکھا ۔۔۔ عورت تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے، کٹھن اور دشوار۔

لوچن داس: یہ باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں سن کر۔ چرن بابو نے اس کی شادی کیوں نہ کر دی۔

کیدار: کتنی بار کہا چرن سے مگر بے سود۔ جب بھی میں بیاہ کا ذکر چھیڑتا وہ کہتے ۔۔۔ تعلیم مکمل کرنے دو کچھ کمانے دو پیر جمنے دو پھر دیکھا جائے گا۔ البتہ اس کے لئے لڑکی ڈھونڈی جا چکی تھی اور وہ تھی اُن ہی کے دوست رکھال سنگھ کی لڑکی۔ تیرہ چودہ سال پہلے ہی

دونوں دوستوں میں عرصے بعد ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے بعد راکھال باقاعدہ ہو گئے اور بھائی کی بیوی بھی چل بسیں۔ گھر کی ساری ذمہ داری اس کے شانوں کے کندھے پر آ گئی۔ سنا ہے وہ کہیں کے بھی تھے۔ ابھی حال ہی میں بیٹا شادی سے ہوئے ہیں۔

مگن: راکھال سکھ کی لڑکی۔۔۔ پتہ نہیں کہ تک کبھی شادی بنائیں کہ سکتا اس کے ساتھ۔ سنا ہے لڑکی بالکل وحشی ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ چرن گھوش آ پہنچے۔ ایک ہاتھ میں چھتری دوسرے ہاتھ میں بیگ۔ داڑھی کے بال کچھ پکے ہوئے اور کچھ بڑی طرح بکھر رہے تھے۔ بولے "سنو بھئی بدمعاش کہیں کا"

کیدار: پتہ چلا اس کا؟

چرن: پتہ لیا خاک چلے کا جھوٹا، ناہنجار۔

لوچن داس: چرن بابو ذرا دھیرے لیجئے۔

کیدار: قصہ بعد میں آئے گا پہلے واقعہ تو بیان کرو۔

چرن: واقعہ کیا خاک بیان کروں۔۔۔ بس یار۔ کل وہ ڈنڈے کی وجہ سے کار میں تشریف لے گئے تھے۔ وہ کمبخت مجھے ساتھ لے گیا۔ ہم سویرے سویرے ایک ایسے اجاڑ قسم کے علاقے کی دو ایک کوٹھیوں کے پاس ہی تھے۔ غلطی ہو گئی۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے جاؤ لیکن وہ چور کی گاڑی سے لوٹ آنا شام ہو گئی مگر نہ لوٹا۔ رات بھی صبح میں بدل گئی۔ اسکی بات سے سبھی کو کوئی شروع کرنے کی ہوئی۔ پر سوں ہی ہر شخص کو جیب سے سے بٹوے نکل گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی شاٹو نے کہا کہ بٹوا۔۔۔ ابے تک اپنے کئی دوستوں کے ہمراہ ٹاؤن ہال میں تقریر سننے گئے ہیں لیکن بٹوکی بھی بولی۔۔۔ بالکل جھوٹ دونوں ایکلو مفلوئی ہوٹل گئے ہیں، وہاں سے پھر سیدھا جائیں گے۔ اب ذرا اسے کہاں ڈھونڈا جائے۔

بنود: یہ بتاؤ چل کر پھر جیل پر پستان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تفریح کرنے دیجئے چلا جائے گا اپنے گھر۔ وہ کر رہا ہے تفریح کرنے اور ہمارا حال ہو گیا ہے۔ بردستی خان بٹوکر اسے لے جاؤ نکالا یہاں سے۔ چلو کیدار۔

کیدار: کہاں، کدھر؟

مگن: ایکلو مفلوئی ہوٹل ٹیلسی میں بیٹھ جائیے۔ بس دس منٹ میں دھرم تلہ پہنچ جائیں گے۔

اور چرن گھوش اور کیدار رخصت ہو گئے۔

ایکلو مفلوئی ہوٹل بتا تو چھوٹا سا مگر خوب مشہور تھا۔ یہاں ہر وقت ہوا خوروں بوڑھوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ اس وقت بھی ہنگامہ برپا ہے۔ دروازے کے پاس ہی منیجر کی سیٹ ہے۔ کبھی وہ بیٹھ کر اور کبھی کھڑا ہو کر اور ادھر ادھر دیکھتا ہے اور آواز لگاتا جاتا ہے ——— "تین نمبر ایک پلیٹ تورمہ، چھ نمبر دو پیالی چائے، چار کٹلیٹ فوراً اور پانچ نمبر میں دو اور انڈے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چرن گھوش اور کیدار ہنگامے اندر داخل ہوئے۔ کیدار نے سرگوشی کے انداز میں کہا "دیکھو ذرا ہوئے ہوئے۔ لونڈا یہیں بیٹھا کس اطمینان سے پیٹ صاف کر رہا ہے؟"

چرن گھوش نے ناک سے آواز نکالتے ہوئے کہا "یہ ہوٹل شریفوں کیلئے نہیں ہے۔ بدمعاش اور غنڈے جمع ہو گئے ہیں یہاں

اور آندھے غلیظ کھانوں پر جھپٹ رہے ہیں۔

کیدار: خاموش۔ خاموش۔ ان کا کیا قصور کھانے دو انھیں۔

مینجر: ارے آپ لوگ اب تک کھڑے ہیں۔ دیکھئے دو بجے میں جنگ خالی ہو گئی۔ جائیے بیٹھ جائیے وہاں۔

کیدار دہاڑ سے ہونٹوں میں انگلی دیتے ہوئے کہا: خاموش۔ خاموش۔

مینجر نے فوراً اب دیا: بھئی شرمانے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ یہاں تو بڑے بڑے افسران بھی بچشم تر سب ہی آتے ہیں۔ آپ بھی کھینچ کر بیٹھ جائیے۔ بچا تانے کہا: میں گے؟

کیدار: تو کیا پردہ کے پیچھے ہی بیٹھنا پڑتا ہے؟

مینجر: رہنے دو۔ کمپلیٹ کھائیں گے۔ باہر سے کوشت کا اسٹو چلچلا کر دیکھئے۔ مزہ نہ آئے تو میرا نام۔

کیدار: گوشت کھانے کا زمانہ اب کہاں؟

مینجر: تو پھر انڈے۔

چرن: نہیں کچھ نہیں چاہئے۔ چلو اس نامعقول کو۔

مینجر: جب یہاں نامعقول قسم کے لوگ نہیں آیا کرتے۔ سب شریف اور معزز لوگ ہوتے ہیں یہاں۔

کیدار: ارے بھائی چرن ایسی باتیں نہ کرو۔ بچپن کی باتیں بھول کے اپنی بھی کبھی تم بھی درخت کی شاخوں پر چڑھ کر کیا کیا کھایا کرتے تھے بچے کو کھا لینے دو پھر مرمت کرنا اس کی ابھی طرح۔ فی الحال جانے دو۔ ہونہہ اچھا ہے۔

کارٹک اور اس کے تین دوست اطمینان سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔

گوپال: میں تو اپنی زندگی آئیڈیل بنانا چاہتا ہوں ورنہ ہونہ نس بن کر رہ جائے گی۔

گھنن: مجھے تم سے اتفاق نہیں کیونکہ آئیڈیل انسان کو آئیڈیس کا غلام بنا دیتا ہے۔ میں ورائٹی یعنی زندگی کا قائل ہوں۔ کمٹ منٹ (COMMITMENT) قطعی نہیں۔ لوتھر پو نے کیا خوب کہا ہے ———

ٹو بک اینڈ چوز، پلے فاسٹ اینڈ لوز۔ ہاں بالو تمہارا بھی کوئی آئیڈیل ہے؟

چرن گھوش نے آہستہ آہستہ کہا۔ کیدار بھائی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان کا موضوع گفتگو کیا ہے؟

کیدار: بھئی تم چپ بھی رہو۔

کارٹک نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا: میں آئیڈیل یا آئیڈیل پر یقین نہیں رکھتا۔ مجھے تو ایسی لڑکی چاہئے جو بالری ڈانسر جیسی حسین، مسز چوبے کی طرح بہت دور، رمینو کا دیوی جیسی اویہ، منجلی بھابی کی نند کی مانند ہنس مکھ اور پرمذاق۔ لوٹی رائے کی طرح مغنیہ اور نیلا جیسی رقاصہ۔

کیدار نے کہا: شاباش۔ ایسا تیز طرار لڑکا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ چرن مہاشے بس اگلے مہینے میں اس کی شادی کر دو ورنہ ہاتھ سے گیا۔

چرن گھوش کو تاؤ آ گیا۔ اس نے کہا: ابے اسٹوپڈ بند کریں کا یہاں بیٹھا کیا کھا رہا ہے اور یہ سارے لونڈے۔

گھنن: جناب، کیسے فرمائیں سمجھ لیں کہ

چمپن: اس سفید چمڑے میں سے اس نے خود ہی اور اس کے ساتھ آئی ہوئی عورت نے کوئی بات نہ کی۔ میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے اندیشے پیدا ہوئے۔ کہیں ہوٹل کے مالک نے کچھ کہا تو نہیں۔ پھر میں نے جھک کر ان سے پوچھا تو نہیں پہلے ہی کسی نے انہیں کچھ کہا تو نہیں کر دیا۔ آجکل ویسے ہی انکوائری کرنے کی زیادہ باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ اس کی جسمانی حرکت بتاتی ہے ——— اور ایسے دیکھ کر کتنے اطمینان سے وہ سفید کوٹ کے ساتھ کوشش کیوں ہر مصروف ہے۔ مالک ہوٹل، منیجر، اسسٹنٹ منیجر، پورٹر سب ہی خیر خیریت پوچھ رہے ہیں۔ کیا تمہارے استاد ایسے ہوٹل میں اڈہ جما سکتے ہیں۔ مشورہ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری یار فی فارمر دار یہ باٹلو ہے اور یہ گوپال اور گھنن ——— ہے یا بے نام ہے۔

باٹلو: [illegible] اپنے باہر کی ہوئی توہین برداشت کر گیا تھا۔ اس کے دوست پیچھے سے باہر ہو گئے اور ہوٹل کے منیجر نے اسٹیشن چڑھائی۔ [illegible] ہوٹل کا مالک، کھیدار اور شیر ایرانی تھی ہے۔ اس نے سمجھانے ہونے کہا ہے دیکھئے پوری بات آپ کا رنگ کا جوتی ہے آئے کہہ سکتے ہیں [illegible] ہوٹل سے ملاوں آپ کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔

منیجر: [illegible] کو پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔

[illegible] شاید اور سمجھ آگئی ہے۔ وہم ہے تو حوالے کر کے بھجوا۔

منیجر: [illegible] ہے۔ ہلکو خفائی کیا۔

[illegible] یہ لفظ منہ پر آتے ہی کہا اور تو کتے رونے کہا "کہ وہ نہیں کیفیہ"

منیجر: ایک ہی بات ہے۔ مہاشے جی! ہوٹل میں مہذب قسم کے لوگ آتے ہیں۔ یہ ہے ایک سیکٹ ایبل ریسپانسبلٹی۔

باٹلو: [illegible]

منیجر: ٹھیک ہے آپ نہیں جانتے مہاشے جی یہ ہے بڑے بڑے لوگوں کا اینڈیزوونز

باٹلو: اندیوو۔

بار بار باٹلو کی اس مداخلت سے منیجر کو تاؤ آگیا بولا "میں بھی تم پڑھے ہو، صحیح تلفظ کیا ہے۔ مگر تمہیں بعد میں معلوم ہوگا دھوپ میں یہ بال سفید نہیں ہوئے ہیں"

باٹلو نے بھی چیخ کر کہا: "دیکھو ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ ہم تمہارے ہوٹل کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ کتے کا گوشت اور سانپ کی چربی کھلا کھلا کر تم شہریوں کو لوٹ رہے ہو۔"

سامنے ایک معمر شریف صورت اور کم گو شخص بیٹھا ہوا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو پلیٹ فارم صاف کر چکا تھا۔ باٹلو کی یہ بات سن کر وہ چونک پڑا اور بولا "حیرت ہے اسی لئے تو میں اب یہ چیزیں نہیں کھاتا۔ صرف تمباکو پر اکتفا کرتا ہوں۔"

ہوٹل کے دوسرے لوگ بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے کہا: "کتے کا گوشت؟" کسی نے کہا: "اسی لئے تو ویٹامین کی کمی ہے۔" منیجر نے سبھوں کو خاموش کرتے ہوئے کہا "دیکھئے جھوٹ اور لغو باتوں پر کان نہ دھریئے۔ کیا ہمیں خدا کا ڈر نہیں ہے۔"

کیدار مہاشے نے پہلے تو چاروں طرف دیکھا پھر کہا "بھائیو اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ویٹامین کے بارے میں دو چار

باتیں سنیے:

چند نوجوانوں نے بھوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا: "ہاں ہاں ضرور سنایئے"۔

میاں مہاشے نے کہنا شروع کیا: "دیکھئے جناب اصل غذا ویٹامین ہے۔ یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں یعنی سبھوں کو وٹامین کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر آپ وٹامین چاہتے ہیں تو کٹھل کھانا شروع کر دیجئے۔ ٹماٹر سے دلچسپی رکھنے والے بالونے تعجب سے پوچھا: "کیا کہا کٹھل؟"

کیدار: جی جناب کٹھل۔ شاعروں نے اس پھل کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ بنگال میں کٹھل ہی پھلوں کا راجہ ہے۔

شریف آدمی: کٹھل بھی کوئی پھل ہے۔ ہٹ!

کیدار: جی جناب کھا کر دیکھئے۔ وزن دو من تک ہوتا ہے۔ وٹامین سے بھرپور۔

شریف آدمی: کس کلاس کا وٹامین مہاشے۔ اے۔ بی۔ سی یا ڈی؟

کیدار: اے، بی، سی، ڈی، بی، ایل، سلائی کا کس میٹ، غرض آپ جو کہیں۔

شریف آدمی: نانسنس۔

کیدار: بھلے نہیں آیا آپ کو۔ تو پھر کچے ٹماٹر کھا کر جہنم میں جائیے۔ ہم مخلص ہوئے۔ نمکار۔ چلئے بھئی چرن۔

مینجر: جناب اور وہی کی قیمت تو چکاتے جائیے

کیدار: ایسی معلوماتی تقریر سننے کے بعد بھی پیسے مانگ رہے ہو۔ اچھا لو یہ چونی۔

کیدار مہاشے نے چرن گھوش کو ایک طرف کھینچ کر آہستہ سے کہا: "کارتک کو کرو کسی طرح تو منا چکے اب دو چار میٹھی باتیں کہہ کر اس کا دل بلا دو۔ جاؤ اسے بلا لاؤ ادھر"

چرن گھوش نے کارتک کے قریب جا کر کہا: "سنئے کھن مہینے میں تمہارا بیاہ کر رہا ہوں۔ رکھال منگھ کی لڑکی سے۔ بچپن ہی سے اس کے ساتھ تمہاری نسبت لگی ہوئی ہے۔ یاد ہے نا؟"

کارتک: میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔

چرن گھوش آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے: "دیکھتا ہوں شادی سے تو کیسے انکار کرتا ہے۔ اسٹوپڈ!"

کیدار: ارے اسے سمجھانے سے تو جیسے عقل ہی نہیں۔ ہر کل میں بھی کون شادی بیاہ کی بات کرتا ہے۔ دیکھو اب بیرکار۔ دو تو بجے کی گاڑی مل جائے گی۔ کارتک کو آج یہیں رہنے دو۔

چرن گھوش غصے میں باہر نکل گئے۔ کارتک اور اس کے تین دوستوں کے ساتھ کیدار مہاشے بھی ہوٹل سے باہر آئے۔

گھن: ہم اپنی اس بے عزتی کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے۔ کارتک تم اپنے باپ کے خلاف مقدمہ دائر کر دو ہم تمہارے گواہ دیں گے۔

میں تمہارے اس خیال سے متفق نہیں۔ باپ کے خلاف ایسا نازیبا قدم نہیں اٹھانا چاہئے۔ البتہ اخباروں میں یہ خبر چھپا دی

جائے لیکن آپ کے لئے یہ سزا کافی ہے۔

گھنن: نہیں بہتر یہ ہے کہ ہم بنوفا دیوی کے پاس چلیں۔ ان کے سامنے لڑکوں کیلئے آشرم کھولنے کی تجویز رکھیں۔

باٹلو: دیوگیاں یہ تمہاری مخالفت کریں گی کارٹک لتا کیا خیال ہے؟

کارٹک: باٹلو بارٹر۔ مارکٹ ویلیو کیا قیمت ہے؟

باٹلو: بہت زیادہ۔ اس کے مقابلے میں بنی کا تیل بہت سستا ہے دس روپیہ میں کام ہو جائیگا۔

کارٹک: مگر اس سے بہت تکلیف ہوگی۔

باٹلو: کیا ہوا اب مرنا ہی ٹھہرا

کیدار مہاشے نے کارٹک کو سمجھاتے ہوئے کہا: بیٹے کارٹک دل چھوٹا نہ کرو۔ بڑا سا باپ ہے۔ اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ باپ کی عزت خدائی عزت ہے میاں۔

گھنن: میاں کارٹک ہم رمیزا دیوی کے گھر جمعیں آشرم کھولنے کے لئے ان کا پیغام حاصل کرلیں۔

کیدار: رات زیادہ ہوگئی ہے راستے تکلیف ہوگی۔ کل دیکھا جائیگا۔

گھنن: ابھی تو سات ہی بجے ہیں۔

کیدار: اچھا تو چلو

گھنن: ماتا آپ ہمارے ساتھ کہاں جائیں گے۔

باٹلو: تو کیا ہوا ہمارے ساتھ ایک بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔

رمیزا دیوی کا ڈرائنگ روم چھوٹا سا ہے بیچ میں ایک میز ہے، اس کے چاروں طرف کئی کرسیاں ہیں اور ایک پنکھا بھی۔ ابھی یہ لوگ پہنچے ہی تھے کہ ایک نیپالی ملازمہ پر نظر پڑ گئی۔ باٹلو نے کہا ——— کیدار مہاشے آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ لیجئے اپنا کارڈ بھجوا دیجئے۔

کیدار: میرے پاس کارڈ وارڈ کہاں۔ ارے بھئی سنو۔ جاؤ رمیزا دیوی کو اطلاع کر دو کہ کیدار بابو اور چار نوجوان تشریف لائے ہیں۔

گھنن: نوجوان نہیں جوان۔

کیدار: اچھا بھئی اچھا۔ جوان ہی سہی۔

ملازمہ نے پوچھا: میم صاحب کے ساتھ۔

کیدار: ہاں ہاں رمیزا دیوی کے ساتھ۔

ملازمہ چلی گئی تو باٹلو نے کہا: دیکھئے کیدار مہاشے آپ ہمارے نیتا کے لیڈر ہیں۔ گھبرائیے گا نہیں۔

کیدار: میاں کیوں گھبرانے لگا۔

اسنے میں ریوکا دیوی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں ——— بھاری جسم، کم عمر، پاؤڈر سے لپا ہوا چہرہ۔
انھوں نے آتے ہی پوچھا "مجھے فوراً کیتی کی میٹنگ میں جانا ہے۔ ذرا جلدی اپنا مقصد بتا دیجئے۔ نوازش ہوگی۔"

باٹلو: کیدار مہاشے بتا دیجئے۔

کیدار مہاشے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "دیکھئے ریوکا دیوی جی اس لڑکے کا نام کارنک۔ شریف صورت اور نیک۔ باپ کا نام ہے چرن گھوش۔ ان کے مزاج میں تلخی اور چڑچڑاپن ہے۔ انھوں نے کارنک کو اسٹوپڈ اور بندر کہا ہے اور اسی لئے یہ لڑکے ....."

گھوش نے اپنا نوٹ بک نکالا اور دیکھتے ہوئے کہا "تین بار بندر کہا ہے، ہنری نے۔"

کیدار: ٹھیک۔ ہاں انھوں نے بارہا کہا ہے۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا۔ ریوکا دیوی جی جب ہمارے باپ دادا گالیاں دیتے تھے اور ہم مُنھ کھول کر سن لیتے تھے۔ اُس زمانے کی بات ہی کچھ اور ہے جب اسی گالیوں میں گھوڑے تُرام گاڑیاں کھینچتے تھے، لڑکے داڑھیاں رکھتے تھے، لڑکیاں چھپ چھپ کر گانے گاتی تھیں یہ باتیں اب پرانی ہوگئیں۔ باپ نے لڑکے کو اگر بندر کہہ دیا تو کیا برا کیا۔ بندر بھی تو خدا کی مخلوق ہے۔

ریوکا دیوی نے کیدار مہاشے سے پوچھا "تو جو انوں میں سینگ لگا کر آپ کہاں شامل ہو گئے؟"

کیدار مہاشے نے ذرا سوچ کر جواب دیا "آپ نہیں جانتیں۔ میں بھی تو جوانوں کا جوان ہوں۔"

یہ سن کر ریوکا دیوی خوش نہیں ہوئیں۔ کیدار مہاشے نے ذرا وضاحت کرتے ہوئے کہا "میری مثال گجراتی تاریل سے دی جا سکتی ہے ——— باہر سے پکا ہوا اور اندر سے کچا۔"

گھوش یہ سن کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے کہا "کیدار مہاشے فضول باتیں نہ کیجئے۔ میں بتاتا ہوں۔ دیکھئے ریوکا دیوی جی ہمک بوٹلی میں ہماری عزتی کی گئی ہماری خطا کچھ بھی نہیں ہم اس ذلت و رسوائی کو اور برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اس مقصد کے لئے بڑے قصور لڑکوں کا ایک آشرم بنانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو آشرم کی بنیاد پڑ جائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں ایک پیغام لکھ کر دے دیں۔"

ریوکا دیوی ٹھٹھکی دیوتک کچھ سوچتی رہیں پھر انھوں نے آواز دی "یہ شوشین، شوشین؟"

اس آواز کو سنتے ہی ایک لڑکے نے اندر داخل ہوا۔ یہ ریوکا دیوی کے سوامی ہیں ——— کمزور، دبلا، آنکھوں میں عینک، ہنس مکھ۔

ریوکا دیوی نے لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ لڑکے میرا پیغام لینا چاہتے ہیں۔"

شوشین بابو کاغذ قلم لے آئے اور ریوکا دیوی نے اپنا پیغام لکھوایا۔

کیدار مہاشے یہ پیغام پڑھ کر اچھل پڑے اور بولے "واہ بہت خوب۔ بہت خوب۔"

کیدار: ہم نے آپکا قیمتی وقت برباد کیا معاف کیجئے گا

ریوکا دیوی: نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ رچا تو میں میٹنگ میں چلی۔ نمسکار۔

ریحانہ کا دولہا بھی جب سو کر اٹھیں تو کیدار مہاشے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شوشین بابو نے کہا۔ "آپ جلدی میں تو نہیں ہیں تھوڑی دیر اور بیٹھئے۔"

کیدار: تو کیا آپ بھی کوئی پھیرا بنانا چاہتے ہیں؟

شوشین بابو نے دانت سے جھانک کر دیکھا پھر کہا۔ "پھیرا وغیرہ مہاشے میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف کام جانتا ہوں۔ ہاں بلائیے تو آپ کی گھوشالہ کو جا سکتا ہوں؟ سنیچر اتوار کی چھٹی پوچھتے گھنٹے تک رہ ایک ہاؤں پر کھڑے رہے ہیں۔ وہ ہیں میرے چچازاد بھائی!"

کیدار: اچھا!

شوشین: ہی ہاں بھی بنسی کو جانتے ہیں؟ اس مونڈے نے تنہا تین گوروں کی پٹائی کی ہے۔ وہ ہے میرا ماموں زاد بھائی!

کیدار: اچھا! آپ تو بڑے جیوٹ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اچھا ہم چلے۔ نمسکار۔

شوشین نے ذرا اٹھاتے ہوئے کہا۔ "پانچ روپے ہوں تو؟" باٹلو نے اس کی طرف ایک ادھنی پھینک دی اور سب رخصت ہو گئے۔

باجا کر کمار مانے نے کہا۔ "تو ہم شاد فتح کر آئے۔ اب جلد سے جلد روپے جمع کر کے ریحانہ دیوی کے حوالے کرنا چاہئے۔ اچھا اس میں بھلا کتنا کام باٹلو سے ملاقات ہو گی کہیں؟"

کیدار مہاشے کے چلے جانے کے بعد محفل نے کہا۔ "دس ہزار روپے فی الحال تو پچاس نوجوانوں کے قیام کا بندوبست کرنا ہے ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سونے کے کمرے، لائبریری، ٹینس کورٹ۔ ریحانہ دیوی نے کم سے کم اسٹیمیٹ دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ روپے کہاں سے آئیں گے؟"

باٹلو: میرا خیال ہے آج ہم خوب پیٹ بھر کر کھالیں ——— کل سے برت رکھ کر جگہ جگہ جلسے کریں گے، تقریریں کریں گے اور چندہ کی اپیل کریں گے۔

گھنن: کہا۔ ہے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں۔

اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ کارنک چپ چاپ باٹلو کے ساتھ ہو لیا۔ جب دونوں گھر پہنچے اور باٹلو کار تک کے لئے اوپر چلا گیا تو کارنک کہیں جا چکا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہے۔ کرشنا بابو دومنزلے پر بے خبر سو رہے ہیں۔ یکایک اُن کی آنکھوں پر روشنی پڑنے سے نیند ٹوٹ گئی اور اُن کے کانوں میں آہستہ آہستہ یہ آواز آئی۔ "خبردار جو حرکت کی اپنی جگہ سے ورنہ گولی مار دوں گا۔ الماری کی کنجی دیجئے فوراً۔"

گرشنا بابو کو یہ چور بڑا ہی ماڈرن معلوم ہوا۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "کنجی تو بیوی کے پاس ہے اور وہ چندہ نگر

اپنے بھائی کے گھر گئی ہے؟

چور: اور منی بیگ، گھڑی، انگشتری وغیرہ؟

گوبند: سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے اوپر ہی سب کچھ ہے۔ لیکن میاں چیک بک چھوڑ دینا۔ تمہارے کسی کام نہ آئے گی وہ اور چور نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف گھما گھما کر ڈریسنگ ٹیبل کی تلاشی شروع کر دی۔ یکایک وہ ٹیبل سے ٹکرا کر گر پڑا اور اس کی زبان سے اُف نکل گئی۔

گوبند بابو نے کہا: کیا ہوا؟

کوئی جواب نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُف سنائی دی۔ گوبند بابو کو شک لاحق ہوا۔ پلنگ کے پاس ہی بجلی کا سوئچ تھا۔ انھوں نے دبا کر بجلی جلا دی۔ چور میز کے اوپر بیٹھا کراہ رہا تھا۔

گوبند بابو نے پوچھا: گٹھیا کے مراض معلوم ہوتے ہو؟

چور: نہیں۔ ماہ دو ماہ بعد ایسی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اُف، آہ

گوبند: علاج کرا رہے ہو!

چور: نہیں۔

گوبند: ظلم کر رہے ہو اپنے اوپر۔ کچھ روز تک تلسی کے پتے کے رس میں کونین ملا کر کھا کر دیکھو۔ بڑا اچھا علاج ہے یہ۔ بہتر یہ ہے کہ کھٹمنڈو دن لوری یا دگھر میں جا کر گزار دو۔

چور: دیو گھر یا شری گھر؟

گوبند: ہاں ٹھیک۔ بات یہ ہے کہ بڈھا ہو گیا ہوں۔ یہ بھول گیا کہ تم چور ہو۔ تیر ڈالنے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے خود عدالتوں سے ڈر لگتا ہے۔ چور آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو گوبند بابو نے کہا: بیٹھ جاؤ اس کرسی پر۔

چور کے سر کے بال بڑے بڑے تھے، آنکھوں میں بلینک تھی، جسم پر ریشمی کرتا، پاؤں میں کینوس کے جوتے، ہاتھ میں ایک پستول اور کلائی میں گھڑی۔

گوبند: پستول کہاں سے ملا؟

چور: دو آنے میں لایا ہوں خرید کر۔

گوبند: اچھا تو یہ نقلی ہے اور تم سودیسی ڈاکو ہو؟

چور: جی۔

گوبند: باپ نہیں تمہارے؟

چور: ہاں حیات ہیں!

گوبند: تو انھوں نے نہیں نکال دیا ہے گھر سے!

چور: نہیں، میں خود گھر سے فرار ہو گیا ہوں۔

گوبند: وجہ تو ہوگی کچھ!

چور: ان کے حلم و تحمل سے فائدہ اٹھا کر آج تمام کومیں پندرہ سو روپے کا سامان ہوٹل میں پیٹ بھر خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ وہ سپاہیوں کے سامنے مخلصانہ بیٹھے تھے۔ چوراسی لاکھ روپے کی لڑکی کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں گا۔ میں نے انکار کر دیا۔

گوبند: ہاں آخری بات پر تم نے انکار کی وجہ شائستہ انداز میں بتا دی ہوگی!

چور: آپ سے دل کی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بات تو مجھ پر منکشف ہو گئی اور میرے دوست مجھے لے گئے رنڈوا بابو کے پاس بمبئی۔ وہاں سے چرا کر میرا ساتھی مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اور میں وہاں سے بھاگ آیا کچھ کر گزرنے کے لئے ——— یہ ہے میری اور اس کی قابل رحم تاریخ۔

گوبند: راکھا اس سلک کی مڑکی تمہارے جوڑ کی عورت نہیں ہے!

چور: یہ تو وہ ہی جانتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے میں نے جس لڑکی کو کبھی دیکھا تک نہیں اس کے ساتھ زندگی بھر کا سودا کیسے کر سکتا ہوں۔ سنا ہے اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ ماموں نے پرورش کی ہے اس کی۔ اور ماموں بھی اس کے بدخواہ ہیں۔ میری ہونے والی شریک زندگی کی تو اور ہی تصویر ان کی ہے ——— سفنتھیسس آف پرفکشن۔

گوبند: ذرا ہمیں بھی سنائیں وہ ہے کیسی؟

چور: سنیں گے آپ؟

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک فوٹو بک نکالا۔

گوبند: کیا ہے وہ؟

چور: یہ ہے میری ہونے والی۔ میں اپنے متفرق اثاثہ کو ملا رہا ہوں اس میں۔ سنیں گے۔

گوبند: ہاں ہاں سنائیے پہلے یہ بتاؤ لڑکی کا نام کیا ہے؟

چور: اصل نام تو میں نہیں جانتا، ویسے لوگ اسے شیلا کہہ کر پکارتے ہیں۔

گوبند: اور تمہارا نام؟

چور: لانگ لکھوٹی۔

گوبند: اچھا! لانگ کے دل کی رانی تو شیلا ہی ہو سکتی ہے۔

یکایک کسی کی چاپ سنائی دی۔ گوبند نے پکارا۔

"کون شیلا؟"

ایک جاندار بھری آواز لہراتی ہوئی آئی "اب تک آپ جاگ رہے ہیں" اور یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

چور گھبرا رہا تھا۔ گوبند بابو چور سے مخاطب ہوئے "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے ——— ٹھیک۔ تو تم سفتھیسس آف پرفکشن دیکھ چکے اب اس کی قابلیت کا بھی امتحان لے لو!

اس کے بعد گوبند بابو شیلا سے مخاطب ہوئے "موجودہ لکھنے والوں میں تمہیں سب سے زیادہ کون پسند ہے؟

شیلا: جاپانی شاعر سنجاتسو۔ اس کے اشعار پڑھ کر تو میں دم بخود رہ جاتی ہوں۔

گوبند: اچھا شیلا اب وہ ساز بجا کر سنا دو۔

اور شیلا ساز بجانے لگی۔ چوڑے آہستہ آہستہ گوبند بابو سے پوچھا "اس ساز کا نام غالباً ساشمتہ معوفی ہے۔ کیوں؟

گوبند: اُونہہ! نہیں یہ کوئی روسی ساز ہے۔ شیلا روسی ساز کی بیحد دلدادہ ہے۔

شیلا: مجھے نیند آ رہی ہے ماموں جان۔ اور ہاں آپ نے تو تعارف ہی نہیں کرایا ان سے؟

گوبند: یہ ہیں ایک صاحب چور۔ ڈاکہ ڈالنے آئے ہیں یہاں۔

شیلا اچھل پڑی اپنی جگہ سے اور بولی "چور" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں گئی اور ٹیلیفون اٹھا کر کہنے لگی ——

"ہارک ۷، ۸ — ہیلو۔ بالی گنج پولیس آفیشن؟"

گوبند: شیلا، شیلا ٹیلی فون رکھ دو۔ ذرا!

شیلا نے ٹیلی فون رکھ کر کہا "تو چور کو آپ چھوڑ دیں گے؟"

چور: نہیں وعدہ کرتا ہوں یہیں بیٹھا رہوں گا۔

گوبند: بیٹی شیلا جاؤ تم گرم گرم چائے اور چکلیٹ تیار کرو اور بازو کے کمرے میں اس کے سونے کا انتظام کر دو۔ بیچارہ اتنی رات کو کہاں جائیگا۔

اور شیلا فوراً چلی گئی۔

گوبند: کیوں کارتک شیلا پسند آئی۔

کارتک: اِکس کیوزمٹ

گوبند: تمہاری سنتھسس آف پرفکشن سے یہ ملتی جلتی ہے؟

کارتک: یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ لیکن بابا کیا کہیں گے۔ یہ شیلا تو ان کی شیلا سے مختلف ہے۔

گوبند: ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میری یہ شیلا جب سے بال جابگی نوکاؤں کی گوری ہنسی ہوں گھونگھٹ سے سلام کرے گی! باورچی خانہ میں گھر بھر کا کھانا تیار کرے گی۔ اور اگر تم اُسے بڑے سے بڑے کلب میں لے جاؤ تو وہ ماڈرن ڈانس کے لئے فوراً تیار ہو جائے گی۔

کارتک: واہ!

گوبند: ڈر گئے کیا؟

کارتک: بالکل نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔

(ہندی)

ہم لکھنؤ گئے

گوپال ویاس
ترجمہ: ظفر ادیب

جب ہم نے آزاد ہوتی لکھنؤ دیکھا جائے۔ بیلے کی انگلیاں اور موتیوں کی پسیاں جیسی لکھنؤ کی لڑکیاں ہی نہیں کھنٹو جانے کو نہیں للچا رہی تھیں بلکہ سفید آم، سبز کھیتے اور لکھنوی کے ڈلوں جیسے خربوزے کی گول گول چکنی چکنی ٹٹیاں بھی ہمارے منہ میں پانی بھر رہی تھیں۔

ان دنوں بھی ایسی بات آئی تھی کہ جو ملتا لکھنؤ کی تعریف کرتا۔ کوئی چھٹے منزل کی بات کرتا تو کوئی امام باڑہ کی۔ کوئی حضرت گنج کی چہل پہل بیان کرتا تو کوئی چوک خاص کی ہما ہمی۔ کسی کو وہاں کی بولی پیاری لگتی تو کوئی وہاں کے کھانوں میں پڑنے والے مصالحے کی کوالیوں پر کچھار رہتا۔ کوئی وہاں کی شیروانی و عامل تھا تو کوئی خاص خاص [illegible] کوئی وہاں کے عطر پر قربان تھا تو کوئی سرمے پر۔ کوئی وہاں کی شرافت کو سراہتا تو کوئی مغلائی۔ ہم نے بھی سوچا اگر سب کی چیزوں میں سے ایک بار لکھنؤ دیکھ ہی لیا جائے۔

وہاں ہمارے [illegible] پاس تھی جانے کے بارہ سال سے اوپر انھیں وہاں رہتے ہوئے ہو گئے تھے۔ ہمارے دوست تھے اس لئے ظاہر ہے تو سنے ہی جا سکتے تھے۔ ایک زمانے سے لکھنؤ میں رہتے تھے اس لئے ہمارا یہ خیال بے جا نہ تھا کہ لکھنؤ نے ان کی شرافت میں کچھ اضافہ ہی کیا ہوگا۔ کمی بارہ کھنٹو آنے کو لوگ ٹیلے تھے۔ اس بار ہم نے پہل کی، لکھنؤ ——— جانے کی ہم اس تاریخ کو اس گاڑی سے لکھنؤ آ رہے ہیں۔

ماڑی لکھنؤ پہنچی، سٹیشن دیکھ کر طبیعت کھل گئی۔ ماڑی رکی، ہمارا خیال تھا کہ شاید کوئی ہوتا ہے، دوست ہمارے ہونے ہیں لینے کے لئے آئے ہوں گے، لیکن ماڑی سے اتر کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ پہلے تو سوچ کہیں، ہمیں بہت عجیب سا محسوس ہوا، دوست پر غصہ بھی آیا، مگر سوچا شاید چٹھی نہ ملی ہو یا کسی ضروری کام سے رہ گئے ہوں، کوئی بات نہیں، آپس میں ظاہر داری کیا؟ معمولی سا سامان تھا رکشا میں ڈالا اور دوست کے گھر کی طرف چل دیئے۔

رکشا والا شریف تھا، شہر لکھنؤ کا تھا، ہونا ہی چاہئے، اس نے کئی سڑکیں پار کیں، کئی موڑ کاٹے اور کئی گلیاں پھرا ڈالیں تو پھر عرض ایک کھنٹے میں ہمیں دوست کے مکان پر پہنچا ہی دیا۔ عمارت کو دیکھ کر اب ہم اسے ٹھیک مزدوری نہ دیں یہ کیسے ہو سکتا تھا، خیر ہم مزدوری تو اسے دے دی لیکن دوست کے مکان کا بند دروازہ کیسے کھلوایا جائے۔ یہ بڑا مسئلہ ہمارے سامنے تھا، لکھنؤ کا معاملہ تھا، ذرا شرافت سے ہی کام لینا چاہئے۔ ہم نے انگلی سے دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن کسی نے نہ سنا۔ ہلکی سی دستک دی کوئی آہٹ نہ ہوئی، ذرا زور سے دروازے کی زنجیر بجائی کسی کی بھنک نہ آئی۔ لاچار ہو کر آواز لگانی پڑی "اے بھائی صاحب"۔

ایک دو تین جب ہمارے گلے سے نکل کر ساتویں بار آواز محلے میں گونج گئی تو اندر سے ایک باریک لیکن تیکھی آواز جیسے بگڑے

ہوئے بارہ مونیو کے ساتھ اس کو کسی نے دھوکنی دے دی" دیکھنا، موہن! یہ باہر کون چیخ رہا ہے۔ ان کے روز کے آنے والوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔"

ایسا محسوس ہوا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں ہیں اور ہمیں کسی نے جیتے جی ہی گھڑی میں باندھ کر قطب مینار سے نیچے پھینک دیا ہے، ہو گئی لکھنؤ کی سیر۔۔۔ سوچا تو یہ تھا کہ چلیں، اپنی "لی" کو۔۔۔ یہاں تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔

بھابی دل شروع سے ہی وہمی ہے، کسی ایک بات پر اگر جمے رہتے اور ایک خیال سے کام کیا ہوتا تو آج ہم نہ جانے کہاں پہنچے ہوتے۔ بات کے ایک پہلو کے آنے ہی وہ دوسرا دل میں کر دیتی ہیں بیٹھے لگتا ہے، ہم نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے دوست نے اپنی بیوی کو ہمارے آنے کی اطلاع نہ دی ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوستوں کا بوریا بستر گول کرنے والی عورت ہمارے دوست کی بیوی ہو، گھر میں کوئی کرایہ دار بھی تو ہو سکتا ہے۔ ہم سانس روکے ہوئے دروازے پر کھڑے رہے، سوچا کہ پوری بات معلوم کر لینا ہی ٹھیک ہے۔ قیاس یہ کیا ہے موہن نے دروازہ کھولا اور دھیمی سی آواز میں کہا "بھائی گھر پر نہیں ہیں۔"

ہم نے بتایا "دلی سے آئے ہیں اور تھکے سے تار لگتے ہیں یہ سامان اندر رکھوا دو۔"

لڑکا با اخلاق تھا، اس نے ہمیں جھک کر نمستے کی اور اٹیچی اٹھا کر اندر لے چلا، گھر میں کاپسز ہوتا ہی کتنا ہے، ہم نے اسے "اٹھا کر لندھے پڑے" لیا، اور دونوں چیزوں کو ایک کونے میں جما کر بیٹھک میں ایک آرام کرسی پر جم گئے، سوچنے لگے۔۔۔ "آج کیا دیکھا جائے، چڑیا گھر یا قطب صاحب؟"

موہن بولا "تاؤ جی شربت پیو گے یا چائے؟" بچہ بڑا پیارا تھا، ہماری شکایت دور ہو گئی۔

"چائے تو گرمی میں ہم پیتے نہیں" ہم نے کہا۔

ہم نے قمیض اتار کر ایک کھونٹی پر ٹانگ دی، پنکھا تیز کیا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر شربت کا انتظار کرنے لگے، ہمارا خیال تھا کہ ہمارے دوست کی بیوی شربت لے کر خود ہی آئیں گی اور ہمیں چونکہ سفر میں اور گھر میں "تکلیف" ہوتی ہے اس پر بیٹھی لکھنؤ کی زبان میں کچھ ایسی باتیں کریں گی کہ ہماری ساری شکایت دور ہو جائے گی، لیکن یہ کیا؟ بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے ہمیں ایسا محسوس ہوا، کہ موہن کچھ سسکیاں بھر رہا ہے، پہلی ہماری عادت کسی پر ائے کیا اپنے گھر میں بھی کسی کی سوتی دھاگا لینے کی نہیں ہے مگر ہمارے کان اس لمحہ کھنچ ہی تو گئے، ہم نے سناٹے کے کو سخت کسمسا کر کہا ہے "مرے، کیسے بیٹھا آیا ہے، بیٹھک میں؟ تاؤ جی! ایسے تاؤ بھی تو یہاں: ان میں تیس آتے ہیں، ہیں بھی گئی ہوں کہ کسی کے یہاں کبھی پانی پیئے۔ کہ سب میری ہی بچاتی پر مونگ دلنے آجاتے ہیں، جا، فلنگے میں پانی پڑا ہے، لوٹے میں بھر کر دے آ، اور دیکھ، یہ پنکھا کیسے فر فر کر رہا ہے، ہلکا کر اسے۔۔۔"

لڑکا پانی لے کر ہوا تو اس کا پانی اتر گیا تھا، وہ تو اندر سے لوٹ آیا، مگر ہمارے بھولے پر اتنی ہی جان ابھی تک نہیں لوٹی تھی، پانی کا لوٹا تو ہم نے پکڑ لیا، مگر یہ نیم، بلا ہوا پانی گلے سے نیچے نہ اتر سکا، ہم نے سوچا۔۔۔ بس اب یہاں سے چل ہی دینا چاہیئے حالانکہ جیویاں سبھی کی کم و بیش ایک سی ہی ہوتی ہیں، ہم تو اپنی کو ہی کہتے تھکتے مگر بہ تو اس سے بھی زور دار نکلی، ہم نے واپسی کا ارادہ کیا مگر دوست کا خیال آیا، وہ ضرور برا مانیں گے۔ پھر سوچا کہ شہر کا معاملہ ہے دوست ہمیشہ ہی ملتا رہے ہیں، بیچاری، وہ پریشان رہتی ہو گی، ٹھیک بھی تو ہے، انہیں میری، اور بھوشنی کی لڑکپن کی دوستی کا پتہ بھی کیا، ان لوگوں کی شادی کے بعد میں آیا بھی تو پہلی بار ہوں۔ دوست کے آتے ہی سب ٹھیک ہو جائیگا۔

آدھ گھنٹے کے بعد ہمارے دوست آئے تو سنجیدہ سے، کچھ بجھے ہوئے۔ کچھ بھی ہو لڑکپن کی دوستی کا مزا کچھ اور ہی ہے، بولے "اماں تم نے تو کوئی خبر ہی نہیں دی؟"

خفگی کی بات ہی تو کہہ لیجئے مجھے ہمیں ملال کرنے سے جی، تب ہی تو ——— ورنہ تو خفگی اور بھروسہ ساتھ کہاں ہو سکتا ہے؟

دوست دل میں ہنسے تھے، بولے "ہوں ——— مائی میں آپ کو بھی بلا رہا ہوں!"

ہمارے دوست کے دل پر کچھ اور بوجھ سا آ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں۔ پوچھا "بچوں کیا ہوا، جی ——"

بولے "کچھ نہیں، انکی بہن بھی یہاں مکھنو میں رہتی ہیں طبیعت ذرا علیل ہے، انکی ——— وہ فرما دیں جانا چاہتی تھیں میں سوچتا تھا ———"

"ہاں، ہاں سوچنے کی اس میں کیا بات ہے ہم نے کہا" میں بولے "نے دو، نہا دھو کر میں ریل میں ہی لیا ہوں، کھانا باہر کہیں کھا لیں گے"

ہمارے دوست فرمانے لگے "کبھی کبھی ہاتھ کھانے میں بھی بڑا لطف آتا ہے بھئی ساتھ والوں کے ساتھ ——— بولے "صرف ایک وقت کے کھانے کی ہی تو بات ہے"

خیر وہ وقت تو ہوٹل میں خوشی خوشی کٹ گیا، مگر بعد کے تین دن ہمارے بڑا مار مار کر کاٹے، وہ ہم ہی جانتے ہیں، نہ جانے مرہن پیچارا ان دنوں کتنی بار پٹا، نہ جانے ہمارے بھوشی بھائی کتنی بار غصے میں آئے اور کھسیائے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، کیا بتائیں، کبھی دیا سلائی مانگنے پر مرہن کی ماں کا بھک "تیتر" بھی ہاتھ دھونے کے لئے تولیہ نکالنے پر ان کا کلیجہ نکل پڑتا، کبھی وہ شوہر کو "انتیں" کبھی بیٹے کو ——— جب ان دونوں میں سے کوئی رہ گیا تو ان کی جھنجھلاہٹ باورچی خانے کے برتنوں پر اترتی، ہمارا حال یہ کہ ہم کبھی دال میں سے مرچ نکالنے تو کبھی ساگ بھاجی میں سے کنکر ——— بستروں میں سے کبھی دری غائب ہو جاتی تو کبھی چادر، غسل خانے میں کبھی صابن ندارد ہوتا تو کبھی تیل ——— کبھی بالٹی نہ ہوتی تو کبھی لوٹا، نہ ہوتا لیکن واہ رے ہم! ہماری بیوی میں نا حق اتنا مزاج کہتی ہے، ہماری برداشت تو ان دنوں جگ جگ میں کو بھی مات کر گئی تھی، ہم نے وہ حالت اختیار کر لی، کہ یہ چھوٹی موٹی باتیں ہم پر اسی طرح اثر نہیں کرتیں جیسے برسات میں مسلا دھار مینہوں کے تھپڑوں سے پہاڑوں کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

کوئی ایک بات ہو تو کہیں، تین دن ہم سر کو جلاتے وہیں باہر کھاتے پیتے تو ہمارے دوست کی بیوی گھر پر ہی رہتیں اور کبھی قدر میان میں بھی ساتھیں، لیکن جب ہم گھر میں ہی رہتے تو ان کا دل ایک دم گھر سے فرنٹ ہو جاتا، تو اکثر انھیں کوئی باہر کا کام آ نکلتا، تب پانی کیلئے، پان کیلئے، ایش ٹرے اور اگالدان کیلئے موہنی اور ان کے باپ ہی نہیں ہمیں بھی ہاتھ پاؤں ہلانے پڑ جاتے تھے۔

تین دن تو ہمارے دوست ہمارے قابو میں رہے لیکن چوتھا دن آتے آتے وہ بھی حوصلہ چھوڑ بیٹھے، یا تو ان کی بیوی نے انھیں بھرا ہو یا خود ہی انھیں عقل آ گئی ہو کہ صبح ہی انھوں نے بیٹھک میں ٹنگے میرے کپڑوں کو اٹھا کر میرے اٹیچی پر پھینک دیا، بولے "اس طرح یہ پھینکے کئے ٹھیک نہیں لگتے؟"

ہم پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، تو میری بار بار پان کھانے کی عادت پڑ چکی تھی، ہم نے سوچا کہ یہ تو حضرت کی پرانی عادتیں ہیں لیکن جب دوپہر کو کھانے میں میرے ساتھ وہ صرف دو روٹیاں کھا کر ہی اٹھ گئے تو پہلی بار میرا ماتھا ٹھنکا ——— معاملہ جیسا ہم سمجھتے تھے ویسا نہیں، بہت گمبھیر ہے، شام کو آئے تو کسی بات پر اپنی بیوی سے اس قدر الجھ پڑے کہ مجھے شک ہوا، کہیں ہاتھا پائی نہ ہو جائے، میں نے ادھر کان لگائے، اور معلوم کرنا چاہا آخر بات کیا ہے؟ جو کچھ سنا اس کا نچوڑ یہ ہے،

"تو میں کیا کروں، یہ کمبخت تو ملتا ہی نہیں"

"وہ ملتا نہیں یا تم ٹالتے نہیں، تمھیں کیا، بھگتنا تو مجھے پڑتا ہے"

"تو بھائی جان! بتائیں کیا کروں؟"

میں بتاؤں! پھینک دو اُس بے حس کی اینٹی باہر! مزا! ایسا جم گیا ہے جیسے اس کے باپ کا گھر ہو"

لکھنؤ کی ہماری مہمان داری اب علائیگس پر پہنچ گئی تھی، نہ جانے کیوں تلسی داس کی یہ چوپائی (رباعی) ہمیں یاد آئی،

"آگے سے بہری رگھورائی"

ہم نے اپنا سامان ٹنگی میں ٹھونسا، بستر لپیٹا، کپڑے پہنے اور ہمارے دوست اندر سے آئے تو ہم نے اُن سے کہا "اچھا بھائی اب چلتے"

ہمارے دوست کے دل میں کیا تھا یہ تو وہی جانتے ہوں گے، مگر بظاہر انھوں نے یہی کہا "ارے ابھی سے"

ہم نے اپنے دل میں سوچا ـــــ بس اتنی ہی یادگار کافی ہے لکھنؤ کی ـــ لیکن ہم نے یہی کہا "چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اب چلنا ہی چاہیئے"

ہمارے دوست نے لمبی سانس لی، جس کا ایک مطلب جدائی کا غم تھا اور دوسرا مطلب تھا چلو پاپ کٹے۔ ہم نے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، جو مل گئی وہی ریل پکڑ لی، جس درجے کا ملا ٹکٹ خرید لیا جہاں ملی جگہ ـــ وہاں بیٹھ گئے۔ جب گاڑی نے سیٹی بجائی اور جب سچ مچ وہ چل پڑی تو اس کے پہیوں کی دُھن کے ساتھ میرے دل میں بھی یہ کہا دوست گونج اٹھی،

"جان بچی اور لاکھوں پائے"

ہندی دوہے

بے نفسی اور فنا فی اللہ کی منزل ہے تو بڑی مشکل سے طے ہوتی ہے لیکن اس کے لیے یہ بات ذلت سے کم نہیں کہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہے۔ ساتھ ہی وہ ذاتی وقار کو قائم رکھنے کے لیے دوسروں کی تذلیل کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھیں دو فطری قوتوں کے باعث انسان میں بڑی عجیب و غریب قسم کی خصلتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا ہم پلہ سمجھتا ہے تو دوسرا اپنے کو اور زیادہ حقیر سمجھتا ہے۔ اس باہمی تنازعہ و شاعرانہ تخیلات میں کیوں اور کیا کہا گیا ہے۔

سونا سنار سے کہتا ہے تو کم میری ذات ہمارے تن کو بھی تپنا ہمارے ساتھ
لاکھ سے ہم لال ہیں اور لاکھ سے ہیرو رنگ لے یا منہ جب سے پھیوٹ تلے نیچ کے سنگ

سونا سنار سے کہتا ہے کہ میری ذات اعلیٰ ہے (اور کیا غضب ہے) کہ لاکھ کی بھی ہمارے ساتھ تولی جاتی ہے۔
اس عنصر پر بھی برافروختہ ہو کر کہتا ہے کہ "لاکھوں سے ہم لال ہیں اور ہمارا رنگ بھی لال ہے (ہمارا) منہ تو فالتو اس وقت ہوا کہ ذلیل کے ساتھ تولا گیا۔

شاہی درباروں میں امراء و رؤسا کے دوست احباب میں اور سلطنت کے عہدہ داروں میں بالعموم اپنی لوگوں کو اپنی قدر و منزلت کے لئے رہتے زیادہ فکرمند پائی جاتی ہے۔ جو سچا اور ایماندار محنتی جفاکش اور عقلمند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جعلساز، ریاکار، فریبی اور منہ چڑھے لوگ کسی طرح اپنے حاکم کو محکوم کر لیتے ہیں جس طرح کہ نفسیات انسانی کو تسخیر کرتی ہیں۔ آجکل بھی وہی لوگ زیادہ تر معتوبین میں شمار کئے جاتے ہیں جو صداقت، خلوص، سچائی اور نیک چلنی سے خدمات انجام دیتے ہیں اور جو ذرا جھوٹ موٹ باتیں بنا لیتے ہیں خوشامد کرتے ہیں انہیں گھر بیٹھے دھن دولت عزت آبرو سب ہی میسر ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

ماپنے کو تو ہیں بھیجے، بھیجے نے بھگ چیائے
کلی کلی کو رس بھرے، ادیر بیٹھ بکائے

سچے آدمی کی قدر بہت کم ہوتی ہے بھیجے (یعنی لفاظی کی بدولت) قابل اعتنا و تصور کئے جاتے ہیں۔ دودھ (اس وقت فروخت ہوتا ہے جبکہ وہ) کلی کلی پھر تلے ہے اور شراب (شراب خانہ ہی پر) بکتی ہے۔

جیسے سہناک سبل کے، کوئی نہیں سہائے
پون جگاوت آگ کو، دیپہی دیت بجھائے

سب ہی طاقتوروں کے مددگار ہوتے ہیں۔ کمزور کی کوئی بھی اعانت نہیں کرتا۔ ہوا آگ کو بھڑکاتی ہے اور چراغ کو بجھا دیتی ہے۔

خرّاٹے کس طرح بند کئے گئے

[ذیل کا مضمون اخبار وطنی ہند لاہور مورخہ ۱۸ نومبر ۱۸۹۹ء جلد ۱۰ نمبر ۶ سے لیا گیا ہے۔]

یہ ہفتہ وار اخبار ۱۸۸۸ء میں مولوی محمد علی چشتی مرحوم نے مطبع خدا داد لاہور سے جاری کیا تھا اور ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک سات سال کے وقفہ کے علاوہ ۱۹۰۵ء تک برابر اپنی پُرزور تحریروں سے ملک میں ہنگامے برپا کرتا رہا۔ مولوی محمد علی چشتی فارسی، اُردو اور پنجابی تینوں زبانوں کے بے پناہ شاعر تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ اپنی آخری عمر میں ڈائریکٹر پنجاب کے ایڈووکیٹ، پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن اور خان بہادر بھی ہو گئے تھے۔ وکالت میں خوب نام پیدا کیا، بہت کمایا لیکن خوب اڑایا یہاں تک کہ کوڑی کفن کے لیے نہ رکھی۔

مولوی صاحب بنیادی طور پر صوفی تھے مگر فطرتاً شوخ اور ظریف۔ ان کی ظرافت کا کمال اس مضمون میں ملاحظہ فرمائیے]

۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء کا تذکرہ ہے۔ مسٹر بنجمن کے ہمراہ جن کو میں اردو و فارسی پڑھایا کرتا تھا، مجھے سیر کشمیر کا اتفاق ہوا۔ صاحب موصوف کو سیر و شکار کا خاص شوق تھا اور وہ ماہ اکتوبر کے آخیر تک کشمیر ہی میں قیام پذیر رہے۔ کیونکہ سری نگر میں بوجہ رونق افروزی لارڈ لینسڈاؤن صاحب بہادر سابق گورنر جنرل مشیر ہند خاص رونق تھی۔ صاحب بہادر کا ارادہ بھی کشمیر میں زیادہ قیام فرمانے کا تھا اور مجھے کسی خاص خانگی ضرورت کی وجہ سے صاحب بہادر کو وہیں چھوڑ کر سری نگر سے واپس آنا پڑا۔

بارہ مُولا سے آگے چل کر تقریباً نصف رستہ میں گڑھی کا پڑاؤ ہے جہاں شب باش ہونا پڑتا ہے اور مقام گڑھی میں ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ یہ وہی ڈاک بنگلہ ہے جہاں انگریز مسافروں کے ہاتھ سے ہندوستانی مسافروں کے پٹ جانے کی خبریں اخباروں میں گشت کرتی رہی ہیں۔ یہ مقام ہندوستانی مسافروں کے لیے خالی از خطرہ نہیں۔ کیونکہ آئی جاتی دفعہ صاحبان یورپین اس ڈاک بنگلہ میں کثرت کے ساتھ ترستے ہیں اور ہندوستانی مسافر کو مجبوراً نکالنا پڑتا ہے اور جب وہ ذرا ٹتے تو اس کا لازمی علاج بھی عمل میں آتا ہے۔

جب میں اس ڈاک بنگلہ میں پہنچا تو مجھے ایک سو طرف کے چھوٹے کمرہ کی طرف خانساماں نے راہ نمائی کی اور وہیں پر میں اپنا اسباب رکھ کر باہر آمد میں ٹہلنے لگا۔ اتنے میں ایک نوجوان شخص کو ٹانگہ سے اُترتے ہوئے میں نے دیکھا جس پر افغانی دستار اور کلاہ تھی۔ گلے میں کوٹ اور نیچے پاجامہ (افغانی تنبان) تھا۔ یہ شخص فصیح اُردو میں گفتگو کرتا تھا اور کسی طرح کا افغانی لہجہ اس کی آواز میں نہ پایا جاتا تھا۔

آتے ہی خانساماں سے اس نے مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

جوان: کوئی کمرہ خالی ہے؟

خانساماں: جی ہاں! ہے تو سہی یہ صاحب (یہ کہتی طرف اشارہ کرکے) اُترے ہوئے ہیں۔ باقی سب کمرے خالی ہیں مگر ان میں بہت سے صاحب رات آنے والے ہیں۔

جوان: دیکھو بھی یہ تو اعداد و شمار بتلانے سے تو وہ آہ و زاری کر رہے ہیں ان میں صاف لکھا ہے کہ جو مسافر پہلے آئے وہ جس کمرہ کو خالی پائے اس میں اپنا بستر لے لے تم مجھے کمرہ میں داخل ہونے سے روک نہیں سکتے۔

خانساماں: سرکار! آپ کسی کو نہیں دیکھتے ہیں جلدی کے لیے عرض کرتے ہیں۔ پیچھے اگر دنگا فساد ہوا تو حضور جانیں۔

جوان: اچھا بھائی ہم تو سمجھے تھے کہ تم تو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ سن کر جوان کی حس بی جرأت اور بڑھ گئی اور یہ کہتا ہوا کہ کسی جنگلی میں نہیں آیا حالانکہ لباس اور وضع سے انگریزی تعلیم یافتہ ابھی معلوم ہوتا تھا۔ خانساماں سے جواب دیتا تھا کہ کوہ پیما ایک اندر گھس گیا۔ آپ کے باہر ہی ایک نہایت موٹا ڈنڈا جو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم بیس سیر کا تھا اور جس سے بڑھ کر موٹا ڈنڈا میں نے نہیں دیکھا ہے موجود تھا۔ ان کی اس وحشت ناک حرکت سے میں نے خیال کیا کہ شاید پیچھے لٹھ لیے لٹھ لیے چلتے ہیں۔ غرضکہ جوان مذکور سے چند خانساماں نے التجا کی کہ پچھلے جانب کی طرف جو ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اس میں وہ اپنا اسباب رکھ دے تاکہ اس نے نکلنے نہ پائے اور بڑھ کر اپنا اسباب اسی بڑے کمرے میں رکھوا دیا جو خانساماں کے بنگلہ میں سب سے زیادہ وسیع ہے اور دریا کی طرف واقع ہے اور یہ خانساماں بہت پروانچ ہے اور صاحب کے پاس اپنے لڑکے کو بھیجا کہ آپ دریا کے کنارے کنارے پیچھے آئیں دوڑ کر چلا گیا کہ جلدی سے اوجھل ہو گیا۔ جاتی دفعہ خانساماں کو حکم دے گیا کہ اپنے اسلامی برتنوں میں میرے لیے پلاؤ اور قورمہ اور بھنا ہوا مرغ تیار رکھنا

اسے میں سارے موٹی موٹی ٹانگوں کی کھلبلاہٹ شروع ہوئی اور بیسیوں بہتیرے چھوٹا ٹانگے احاطہ ڈاک بنگلہ کے اندر داخل ہوئے اور ان میں سے کل اسی لڈیاں اور آٹھ لوہر سٹیلیں اُترے اور بنگلہ کے احاطہ میں پہنچتے ہی ایک شور و غل سنائی دیا۔ خانساماں کو جمعہ کی شروع کیا کہ تمام کمرے خالی پڑے ہیں۔ کہے گئے اور بیسیوں نے ان میں بستر اتار لیا ہے اور ایک دو سب کو کمروں سے نکال دو۔ غرضیکہ جھاں ہر گیا جب خانساماں نے اس حکم کی تعمیل میں ذرا تذبذب کیا تو وہ صاحب بہادر خود آگے بڑھے اور سب سے پہلے اس جوان شخص کے نور سے کہا کہ جھٹ پٹ اسباب نکالو۔ غرضکہ تمام زور و شور کا ہوا کیا اور وہ بیچارا آٹھ منٹ کے عرصہ میں واپس آگر بیان کیا کہ اس کے مالک صاحب ابھی ناؤ شام چڑھنے میں کنارِ دریا پر مصروف ہیں اور تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ صاحب بہادروں نے دھمکایا کہ "ڈیم مالک! جلدی اسباب نکالو۔ اس نے کہا یہ حضور ابھی ابھی چلے آتے ہیں۔"

غرضکہ ادھر پانچ سات منٹ کی مہلت تخلیہ کمرہ کے لیے دے کر صاحب بہادروں کی یورش میرے کمرہ پر ہوئی اور بڑا لال سرخ چہرہ کرکے فرمایا کہ "ول! تم جلدی اپنا اسباب نکالو" میں انگریزوں کے تیور دیکھ کر چلانے کا عزم سے عادی ہوں اس لیے یہ سمجھ کر کہ ذرا چھیڑ کی گئی تو ابھی ڈگ سے تواضع کی جائے گی۔ دست بستہ عرض کیا کہ "بہت اچھا غریب نواز! کمترین کو جس کمرہ میں حکم ہو چلا جائے" اس پر حکم صادر ہوا کہ "ول تم دیکھتا ہے کمرہ کوئی خالی نہیں۔ تم شاگرد پیشہ والی کوٹھری میں چلا جاؤ۔" "بہت اچھا حضور!" کہہ کر میں اپنا اسباب اور بستہ

سدھارنے لگا۔ میرا اندازہ محمد رمضان ایسا سٹپٹایا کہ اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ اسباب کے باندھنے میں بیسیوں غلطیاں کر رہا تھا۔
اتنے میں دیکھا کہ دور سے وہی جوان سوٹ چلاتا آ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ حضرت کے ہوش و حواس اس زبردست جماعت کو دیکھ کر
رخصت ہو جائیں گے۔ وہ یہاں تشریف لا کر کرسی ہو جائے گی اور تمام سٹی پٹی بھول جائے گی مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جوان مذکور ایک ہاتھ میں وہی سوٹا
جس کو تمام دنیا کے سوٹوں کا سرورِ اعلیٰ سمجھنا چاہیے) سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے سنتیں کچھ پڑھتے ہوئے ایک عجیب
متانت اور وقار کی چال سے چلے آتے ہیں اور چہرہ سے ایسا استغنا برس رہا ہے کہ گویا کچھ پروا ہی نہیں۔ جوان یہ کہ رعب اس جنگلیوں اور ریڈی صاحبان
کے مجمع کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جوان کا رعب اس مجمع پر چھا جانے کے آثار ان کے چہروں اور بدنوں سے نمایاں تھے۔ یا تو اس مجمع نے
حریری میں سنورے ہوئے قل چار کھا تھا اور سب ہی کتنے تھے وردی والے کلک ہم آؤٹ (یعنی ہم اسے لائیں مار کر کرہ سے نکال دیں گے) یا جب جوان مذکور
اس پہنچا تو کیپ کی جرأت ہی اس سے بات کرنے کی نہ ہوئی۔ جوان نے اہلِ مجمع میں سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ اسی معمولی بے پروائی
کے ساتھ مجمع مذکور کے پاس سے کترا کر سیدھا اپنے کمرہ کی رُخ کو چل دیا۔
اتنے میں اہلِ مجمع میں سے ایک صاحب بہادر نے (جو بعد میں معلوم ہوا کہ فوجی کرنیل تھے) پیچھے سے جوان مذکور کو آواز دی کہ
"او بابو! جس پر اس نوجوان نے پیچھے مڑ کر انگریزی میں کہا کہ "میری توہین مت کیجیے۔ میں بابو نہیں ہوں" اور اتنا کہہ کر اپنے کمرہ کے اندر داخل
ہو لیا۔ اہلِ مجمع کے چہرے رو پڑ گئے اور میں اپنے اسباب کو اٹھا کر سائکل و بیسکل کے مکانات کی طرف بھاگنے کو تھا کہ نوجوان مذکور کا ملازم مجھے
بلا لے گیا اور نوجوان نے میرا حال سن کر کہا کہ "آپ ہرگز اس طرف نہ جائیے یہیں کمرہ حاضر ہے اور یہیں قیام فرمائیے"۔ میں نے خوشی اس
درخواست کو منظور کر لی، اور چونکہ اس جوان سے کوئی تعارف نہ تھا اور اس نے مجھ سے دریافت نہیں کیا تھا کہ میں کون ہوں، خود مزید حالات
سے بے تعلق رہ کر زبان کو بند رکھا اور جو حیرت مجھے اس جوان کی زبان سے ایک مخلص بامحاورہ انگریزی فقرہ بالکل انگریزی لہجہ میں سن کر ہوئی تھی
اس کو بھی مخفی رکھا۔
اتنے میں خانساماں اس نوجوان کا کھانا پکا کر میز پر لایا جس میں نوجوان مذکور نے مجھے شامل کیا۔ اس وقت کے وقت میں سخت
حیران لگی ہوئی تھی۔ نہ کی تعطیل، خشکہ اس دن کے پلاؤ اور قورمہ اور بھنے ہوئے مرغ اور انڈوں اور چاٹنے کا ذائقہ کوئی بیسے ہی دل سے
پوچھے۔ انگریزوں کی صحبت میں کثرت سے رہنے کے باعث جس قدر سخت چیز کے چبانے کی مجھے عادت ہو گئی ہے اس سے تو میرا ہاضمہ اور
سب طرح سے راحت تکلف کی تھی۔
ابھی ہم لوگ کھانے سے فارغ نہ ہونے پائے تھے کہ لوریہیں مجمع مذکور میں سے ایک صاحب بہادر (جو بعد میں معلوم ہوا کہ ممالک مغربی
میں سے ایک ضلع کے کلکٹر تھے) کمرہ کے اندر تشریف لائے۔ جوان مذکور اسی طرح کرسی پر بیٹھے ہوئے کھانے میں مصروف رہا۔ میں اپنی
طبیعت سے مجبور ہو کر دفعتاً کھانا کھاتے کھڑا ہو گیا۔ اب جوان اور کلکٹر صاحب کی گفتگو جو انگریزی میں ہوئی قابلِ شنید تھی۔
صاحب کلکٹر: میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے کھانا کھاتے میں مداخلت کی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم آٹھ لوریوں میں ہیں جن کے
علاوہ نزدیکی خیموں اور دروس ریڈی صاحبان ہمارے ساتھ ہیں۔ ایک فوجی لفٹیننٹ جو سخت بیمار ہو گیا ہے وہ بھی ہمارا رفیقِ سفر ہے۔
پس آپ کی مہربانی ہو گی اگر ہماری خاطر آپ اس کمرہ کو خالی کر دیں۔
جوان: مجھے آپ کی تکلیف کا افسوس ہے مگر آپ مجھے کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کمرہ خالی کر کے خود کہاں رات بسر کروں؟

صاحب کلکٹر: آپ یا تو شاگرد پیشہ والے مکان میں چلے جائیں یا برآمدہ میں گزارہ کریں۔

جوان: شاگرد پیشہ والے مکان میں جا کر رہنا تو میرے فیلنگ کے ویسا ہی خلاف ہے جیسا کہ آپ کے فیلنگ کے خلاف ہے۔ باقی رہی برآمدہ کی رہائش سو آپ دیکھ لیجیے کہ میرے جسم کا کونسٹیٹیوشن ایسا مضبوط نہیں اور میں ایک اہلِ قلم شخص ہوں۔ میرے خیال میں یہ دوسرا مضبوط فوجی افسر جو کہ ہسپتالی معرکوں کے ذاتی تجربہ کار ہوں گے رات کے اس سرد موسم کی سختی کا نسبت میرے زیادہ دلیری سے مقابلہ کر سکیں گے۔

صاحب کلکٹر: تو آپ کوئی تجویز نہیں کر سکتے؟

جوان: ہاں مجھے افسوس ہے اپنی ناگوار جواب ماس کم بخت موقع پر دے سکتا ہوں جبکہ میں اور آپ یکساں عالم مسافرت میں ہیں۔

صاحب کلکٹر: تو پھر آپ اس کا کوئی چارہ بتائیں۔

جوان: میرے پاس تو کوئی چارہ سوائے افسوس کے نہیں اور بجز زبانی ہمدردی کے اور کیا کر سکتا ہوں خصوصاً جبکہ حتی الاعتدال سے بڑھی ہوئی ہو۔ زبانی ہمدردی صحت اور جان کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔

صاحب کلکٹر: مجھے آپ سے ایسا روکھا پھیکا جواب سننے کی توقع نہ تھی۔ اگر آپ کے ساتھ آپ کے خاندان کی عورتیں ہوتیں تو میں تو یہ تکلیف اٹھانے میں مائل نہ ہوتا اور اگر آپ کا کوئی بیمار رفیق ہوتا تو میں اس کے لیے ہر قسم کی سہولت کا سامان پیدا کرتا۔

جوان: مگر لیڈی صاحبان اور بیمار لفٹیننٹ صاحب کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔

صاحب کلکٹر: وہ کس طرح؟

جوان: لیڈی صاحبان کی رہائش کے لیے کافی کمرے موجود ہیں۔ ایک ایک کمرہ میں دو دو لیڈیاں آرام فرما سکتی ہیں اور لفٹیننٹ صاحب کو آپ میرے کمرہ میں آرام کرنے کے لیے بھیج سکتے ہیں۔

صاحب کلکٹر: (کسی قدر ہنس کر) بہت اچھا صاحب! میں آپ کا بھی غنیمت سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج میں اس قدر ہمدردی ہے کہ آپ ایک بیمار کو اپنے کمرہ میں پناہ دیتے ہیں۔ میں لفٹیننٹ کو ابھی یہاں بھیج دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں لفٹیننٹ صاحب (جو واقعی بیمار معلوم ہوتے تھے) ہمارے کمرہ میں داخل ہوئے اور ایک کونے پر دراز ہو گئے۔ اب صرف ایک کوچ باقی تھی جس پر جوان مذکور نے مجھے لٹا دیا اور خود فرش پر ایک طرف بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ میں فرش پر لیٹنے کا عادی ہوں مگر جوان مذکور نے ایک نہ سنی اور یہ کہہ کر کہ آپ مہمان عزیز ہیں خود فرش پر ہی گزارہ کیا۔

ہم دونوں کو لحاف اوڑھ کر لیٹے ہوئے صرف پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ صاحب بہادر کی چارپائی سے "خرر، خرر، خرر" کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ صاحب بہادر کے خراٹوں کی آواز تھی جو پہلے دھیمی سُر سے شروع ہوئی مگر بعد میں "خرر ڈڑ، خرر ڈڑ، خرر ڈڑ" کے ایسے پُر زور آواز سے لگنے شروع ہوئے کہ الامان والحفیظ! ابتلا سا بالکل یہی معلوم ہوتا تھا کہ ریلوے ورکشاپ کا انجن چل رہا ہے۔ اب میرے جوان ساتھی کی حالت قابلِ دید تھی۔ گو میں بھی خراٹوں کی آواز سے گھبرا گیا تھا مگر ہمارا نوجوان مسافر تو اپنے لحاف میں عجیب اضطراب اور گھبراہٹ کی حالت میں معلوم ہوتا تھا۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، کبھی سر جھکا لیتا تھا، کبھی پھر لیٹ جاتا تھا، غرضکہ میں نے سوچا حضرت خوب پھنسے۔ اچھے قابو آئے۔ اب ساری تیزی و طراری بھول گئے۔ لحاف سے سر نکال کر اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔ پہلے تو

بڑی مال سے باہم گفتگو ہوئی اور پھر باہم ہماری قیل و قال بھی شروع ہو گئی ؛

جوان : حضرت! اس کم بخت کے شر انگیزوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔

بندہ : واللہ طبیعت کا برا حال ہے۔ ابھی سے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج کی نیند حرام ہے۔

جوان : اوہ! تو اب یاد آیا۔ میں نے آج رات نماز عشاء نہیں پڑھی اور جناب باری سے یہ اسی بات کی سزا تجویز ہوئی ہے کہ جس نیند کی خاطر میں نے آج رات کی نماز اور وظیفہ کو چھوڑ دیا اسی نیند سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ مجھے میں تو نماز اور وظیفے کے لیے اٹھتا ہوں۔

اس کے بعد جوان مذکور نے اٹھ کر ایک گوشہ کی طرف وضو کیا اور نماز عشا سے فارغ ہو کر بعد ازاں ذکر لا الہ الا اللہ کا کرنا شروع کیا۔ یہ جوان اپنی گردن کو دائیں طرف لے جا کر لا الہ تو کسی قدر آہستہ آواز سے کہتا تھا مگر الا اللہ اس زور و شور کے ساتھ نعرہ مار کر کہتا تھا کہ تمام کمرہ گونج اٹھتا تھا۔ یعنی کہ پہلے دو تین مرتبہ تو میں بھی ڈرا اٹھا۔ اللہ اکبر! نعرہ کیا تھا ایک شیر نیستاں یاد آ گیا۔ جوان مذکور نے ابھی دس بارہ ہی نعرے مارے ہوں گے کہ لفٹیننٹ صاحب تو ڈر کر جاگ اٹھے اور ڈراؤنی کی بلا سے گھبرائی ہوئی مگر ان کی خونخوار آنکھیں اور جوشِ غضب سے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھے ایک اور بلائے عظیم سے سابقہ کا اندیشہ ہوا۔ لفٹیننٹ صاحب اپنی کوچ پر بیٹھ گئے اور جوان کو آوازیں دینی شروع کیں مگر وہ میرا شیر ہوا پر زور کڑک کے ساتھ قبلہ رُو بالکل منہ چھپا اور محو ہو کر الا اللہ الا اللہ کیے جاتا تھا۔ جو حالت ہم دونوں پر لفٹیننٹ صاحب کے غصہ ناکوں سے گذری تھی یعنی جس طرح جوان مذکور ان کے خراٹوں سے تنگ ہو کر کبھی لیٹ جاتا تھا کبھی کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی اٹھ بیٹھتا تھا وہی مصیبت اب لفٹیننٹ صاحب کو پیش آئی کہ وہ بیچارے عجیب مصیبت میں گرفتار تھے اور کبھی تنگ ہو کر جوان مذکور کو پکارنا بھی شروع کر دیتے تھے جس کے جواب میں سوائے الا اللہ کے پُر زور نعرہ کے اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ لفٹیننٹ صاحب مزے میں بڑبڑا کر شاید کچھ بھلا بھلا کہتے تھے اور مجھے ان کے پُر رعب چہرہ سے ایسا خوف معلوم ہوتا تھا کہ میں وہم سا وہم کر بالکل خاموش پڑا ہوا تھا اور ایسی وضع بنائی تھی کہ گویا مست خواب راحت میں پڑا ہوں۔ کچھ عرصہ کے بعد جوان مذکور نے اپنے نعروں میں وقفہ کیا اور منہ میں آہستہ سے کچھ پڑھ کر صاحب بہادر کی طرف مخاطب ہوا۔ اس وقت یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی :

جوان : آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے ؟

لفٹیننٹ صاحب : یہ آپ کیا کر رہے ہیں ؟

جوان : میں خدا کی عبادت کر رہا ہوں۔

لفٹیننٹ صاحب : یہ کس قسم کی عبادت ہے ؟

جوان : یہ ہمارے مذہب کے مطابق ہے۔

لفٹیننٹ صاحب : آپ جواب کیوں نہیں دیتے تھے ؟

جوان : ہمارے مذہب کے مطابق عبادت میں بولنا منع ہے اور اب بھی آپ کے بولنے کے باعث میری مذہبی رسم میں مداخلت ہوئی۔ اب مجھے نہ بلائیے گا میں کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔

لفٹیننٹ صاحب (حیران اور پریشان ہو کر) : یہ آپ کی عبادت کب تک جاری رہے گی ؟

کچھ بہت عرصہ نہیں صرف دو گھنٹہ اور عبادت کروں گا۔ بعد ازاں دو تین گھنٹہ سو کر پھر صبح کے وقت ایک آدھ گھنٹہ اسی طرح عبادت کروں گا۔

لفٹیننٹ صاحب : آخر جوان ورخصت کرو (چپراسی کو ساری بات آپ کی عبادت کے باعث جاگنا پڑے گا۔

جوان : نہیں یہ ساتھ آپ کے جاگنے کی ضرورت نہیں۔ آپ شوق سے آرام فرمائیے اور اب مجھے نہ بلائیے گا۔

اس کے ساتھ ہی اسی سیکنڈ اور اسی فوج میں جوان مذکور نے پھر کھنے زور کے ساتھ الا اللہ کے نعرے شروع کر دیے۔ الا اللہ اور الا اللہ اس زور کے ساتھ کہ گھنٹے۔ سنتے ہی رہا تھا۔ مجھے تو اس لیے تھا کہ کہیں ڈاک بنگلہ ہی نہ گر پڑے۔

ابھی ہمارے جوان دوست کو بیٹھے ہوئے دس منٹ ہی نہیں گذرے تھے کہ لفٹیننٹ صاحب سخت گھبرائے ہوئے کوچ سے اٹھے اور پہلے کچھ عرصہ میں بڑبڑاتے رہنے کے بعد ہمارا سامان اور بستر اٹھوا دیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ وہ دن میں موجود تھا جو ہاتھ آیا وہ اٹھوا دیا۔ صاحب بہادر نے خود اپنی چارپائی اور بستر کو کمرے سے اٹھایا اور باہر لے جا کر برآمدہ میں دراز ہو گئے۔

صاحب بہادر تو یوں رخصت ہوئے اور جوان بہادر نے کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد فارغ ہو کر دعا مانگی اور چارپائی کو کمرے سے نکلوا دیا۔ بعد ازاں لالٹین لے کر دو تین لالٹینوں اندر سے دکانداروں اور خانساماں کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت کی میری کیفیت کچھ نہ پوچھیے کہ ہنسی سے کھانا کھا رہے تھے اور ہنسی سے ہی پڑھ رہے تھے۔ جو جوان مذکور ابھی حالت غافل و بے خبری کی میں تھا اور بے لب پتلیوں اس کی نہیں اور معقول اور نفیس صورت اور بنائے ہوئے تھا۔ مجھے اور بھی سخت ہنسی آئی تھی کہ یہ ایسے ظریف شخص ہے اور اپنے مزاج کے عجب خالو رفعا ہے کہ لوگوں کو تبسم سے بھی آشنا نہیں ہونے دیتا بلا الا ماشاء اللہ سے پوچھ رہا ہے کہ آخر آپ اس قدر ہنسنے کیوں چلے جاتے ہیں؟"

مجھے اس شخص کی جو بات، بیداری، حاضر جوابی اور ظرافت مزاجی نے ایسا فریفتہ کر لیا تھا کہ اتنی بے تکلفی کے بعد میں نے اس کے نام اور کام دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بندہ و سامان کا ایک معروف و مشہور شخص ہے۔ جس سے کہ میری ظاہری ملاقات بالکل غائبانہ اس کے حالات سے واقف تھا اور اس نے علی وجہ التفصیل ان باتوں کو پڑھ کر بالخصوص اس وجہ سے میں اس کا سخت مخالف تھا کہ وہ ہماری قوم کے نئے اور ترقی حاصل کرنے والے نوجوان حضرت سرسید احمد خان صاحب بہادر مرحوم کی بے جا مخالفت کرتا رہا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ جس شخص کے ساتھ میری اس قدر غائبانہ مخالفت تھی اس کے ساتھ اور اسے اختیاری کی حالت میں بے حد دل پر عجیب طرح سے قبضہ کر لیا اس وقت نہ سرسید مرحوم کے بارے میں میں نے وہ کچھ نہ کہا اور اس سے کیا نہ اس شخص کو میں نے اپنی رائے میں ایسا بندہ آزاد اور اپنے خیال میں ایسا متعصب اور ضدی پایا کہ زیادہ عرصہ بھی اس کی رائے میں دخل نہ آیا اور نہ وہ اتنا مجھے سرسید کا مخالف بنانا چاہتا تھا مگر اس مرحوم کی قومی خدمات کا جو نقش بیٹھا ہوا ہے وہ تمام دنیا کی مخالفت اور کسی قسم کے دلائل پیش کرنے پر بھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتا اور رہتے دم تک محو نہیں ہو سکتا۔ (گستاخی معاف یہ تو ابو جہل والی مثل ہے۔ اڈیٹر)

علاوہ بریں یہ ہے کہ کچھ عرصہ کی فٹنگر کے بعد ہمارے آرام لیا اور خراٹوں کی بلند سے ملتجی پاکر مزے سے میٹھی نیند کے مزے لوٹنے لگے۔ ٹانگوں نے وہاں سے روانہ ہونا تھا اور ہمارے لوگ سو برس سے تیار ہوئے اور اٹیچی بند ہو گئے۔ بستر بال کر باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ رات والی تمام روئیداد پانی ڈانٹنگ روم کھانے کے کمرے میں موجود ہے اور ان سے بلند صدائیں بات چیت کی سنائی دیتی ہیں۔ نوجوان مذکور اور بندہ دروازہ کان لگا کر سنا تو جوان مذکور کو خوب سلواتیں پڑ رہی تھیں۔ مجمع کے صاحب بہادر مع لفٹیننٹ صاحب کے جن کو رات کے وقت برآمدہ سردی نے سخت پریشان کر رکھا تھا اٹھ رہے تھے اور جس شخص کے باعث یہ تکلیف ان کو نصیب ہوئی اس کو صلواتیں سنانے سے وہ

کیونکر باز رہ سکتے تھے؟ کوئی مائت ہیتا تھا اور کوئی کیکیا کر رہ جاتا تھا۔ گفتگو پُر از غضب تھی۔ اس وقت میں نے اپنے جوان ساتھی کے چہرہ اور قیافہ کو غور سے تاڑا تو اس ساری گفتگو کو سن کر نہ تو اس کے چہرہ پر جوش و غضب کے آثار نمایاں ہوئے اور نہ کوئی ڈر یا خوف یا سہم کے نشان پائے جاتے تھے۔ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ کسی خاص حرکت کا مرتکب ہی نہیں ہوا اور بڑے مزے سے اسی وقت مجھ سے کہا کہ "آؤ چلو بھی اندر چل کر چائے پئیں۔" میں پہلے تو اندر جانے سے جھجکا کیونکہ میری طبیعت میں احتیاط بہت ہے مگر بعد میں جوان مذکور نے اس زور سے پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ گھسیٹا کہ میں اس کے ساتھ ہی کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرہ کے اندر ہمارے داخل ہوتے ہی سب حاضرین پر عالم خاموشی طاری ہو گیا۔ ایک دفعہ تو گنگناہٹوں سے سب نے ہماری طرف دیکھا مگر ہماری طرف سے پھر کر آپس ہی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میز کے گرد جو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں معمولی ہوا کرسیوں پر صاحبان بیٹھے تھے اور آرام کرسیوں پر لیڈی صاحبان تشریف فرما تھیں۔ شراب کی بوتلیں میز پر موجود تھیں اور ہر ایک کے آگے گلاس اور چائے کے پیالے، بسکٹ اور انڈے ہوئے انڈے وغیرہ موجود تھے۔ شراب نائب نے ان کو کسی قدر گرما رکھا تھا اور سب کے سب کچھ سرور کے عالم میں تھے۔

اب ہمارے ہیرو کی کیفیت سنیے کہ میز کے ایک کونے کی طرف کمال بے پروائی اور اطمینان سے کرسی پر ٹوٹ گئے اور اپنے قریب دوسری کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور طرفہ حرکت یہ کی کہ وہ اپنا سوٹوں کا باوا آدم بھی میز پر اپنے سامنے رکھ دیا۔ یہ سب کو دیکھ کر بعض لیڈی صاحبان مسکرائیں۔ جوان مذکور نے خانساماں کو حکم دیا کہ چائے کی دو پیالیاں اور چار انڈے ہوئے انڈے اور کچھ بسکٹ لائے۔ سب چیزیں اسی وقت میز پر موجود ہوئیں اور ہم دونوں کھانے میں مشغول ہوئے۔

اس وقت تو سب کا رخ سے نیرنگ تھی اور کمرہ میں سناٹے کا عالم تھا کہ اچانک اس وقت سے ایک ہنگامہ شروع ہوا۔ رات والے لفٹیننٹ صاحب کی طرف میں نے دیکھا تو ان کے چہرے سے خون ٹپکا پڑتا تھا۔ دیگر فوجی کرنیلوں اور میجروں کے چہرہ سے بھی آتشگی کے آثار نمایاں تھے۔ لیڈی صاحبان اس نوجوان کی حرکات کو حیرت اور استعجاب سے دیکھ رہی تھیں مگر یہ شیر اسی طرح ڈٹا ہوا بسکٹ اور چائے اڑانے میں مشغول تھا۔ کسی کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا تھا کہ "کیوں حضرت! اس وقت چائے نے خوب مزا دیا ہے؟"

میں مارے ڈر کے سہما ہوا تھا اور مجھے یہ اندیشہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گھڑی دو میں مُرلیا بجا جائے گی۔ میں جوان مذکور کی کسی بات کا جواب نہ دیتا تھا۔ صرف آہستہ سے ہوں ہوں خاں کر کے ٹال دیتا تھا۔ اتنے میں میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور ایک دفعہ ہی رات والے لفٹیننٹ صاحب نے آنکھیں لال پیلی کر کے بڑے جوشِ غضب کے ساتھ جوان مذکور کی طرف مخاطب ہو کر اس کو سخت ڈانٹ بتائی اس وقت انگریزی میں دونوں کا جو کچھ مکالمہ ہوا اس کو بیان کرتا ہوں:

لفٹیننٹ صاحب (دانت پیس کر): تم بڑے گستاخ ہو۔

جوان (بڑے صبر، تحمل اور وقار کے ساتھ): کیوں؟ کیا مجھ سے کوئی گستاخانہ حرکت سرزد ہوئی ہے؟

لفٹیننٹ صاحب (کھسیا کر): تم نے یہ ٹوٹا کیوں میز پر رکھ دیا ہے؟

جوان (اسی طرح بڑے وقار سے): معاف فرمائیے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو اس ٹوٹے کی صورت دیکھنے سے ایسا خوف

معلوم ہوتا ہے اور مجھے حکم کی تعمیل کرنا ہوں (ڈنڈا میز سے اٹھا کر) مجھے رکھ دیا، آپ تسلی رکھیے کہ یہ ڈنڈا بغیر اشد اور قانونی ضرورت کے کبھی استعمال نہیں کیا جائے گا۔

لفٹیننٹ صاحب: تم نے رات بھی مجھے سخت تکلیف دی اور تمام رات مجھے سردی میں مارا۔

جوان (اس بیہودہ کا چہرہ بنا کر بڑی سادگی سے): میں نے نہ آپ کو (پانی ڈالنے والے ریزرو نر) کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ آپ نے خود ہی ہماری مصاحبت کو پسند نہ فرمایا اور خود جوش کرکے اٹھ کر باہر تشریف لے گئے جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اس وقت اپنی عبادت میں مشغول تھا اور دل نہ ٹکتا تھا ورنہ میں خود آپ کو باہر جانے سے روکتا۔

لفٹیننٹ صاحب: تو یہ تمہاری عبادت تھی ایسی نوع عبادت کا فائدہ کیا ہے؟

جوان (اسی سادہ و تقل اور سادگی سے چائے پیتے ہوئے): ہماری عبادت کا اور کچھ فائدہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ آپ بھی مسلمہ ارلیس کے کہ اگر کوئی خراٹے مار کر اپنے ساتھیوں کو بیدار کرے اور ان کی نیند حرام کر دے تو ایسے شخص کے بانکوں سے ٹھکائی خود نصیب ہو جاتی ہے۔

جوان مذکور کے یہ سادہ سے جواب میں ایک لطیف سین نظر آیا۔ ایک لیڈی صاحبہ جو آرام چیئر کی پر تشریف فرما تھیں ..... (واضح ہو کہ اس کمپنی میں معلوم ہوا کہ وہ اسی لفٹیننٹ صاحب کی زوجہ محترمہ تھیں) اس فقرہ کے سنتے ہی دفعتاً آرام چیئر کی سے لے تاشا کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور مارے ہنسی کے ایسی بیتاب ہوئیں کہ چاہتے تھی پیالی جوان کے ہاتھ میں تھی ان کے کپڑوں پر گر گئی۔ اب تک یہ لیڈی صاحبہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے ہیں نہیں آتی تھی۔ نہ تو قہقہہ مارا نہ ہنسی ہی آتی تھی۔ خلاصہ کان کی ہنسی کا سلسلہ بند ہونے میں نہ آتا تھا۔ کئی منٹ تک ان کی ہنسی کا یہ عالم رہا اور جب وہ ذرا تھمتی تھیں تو صرف ایک آدھ سیکنڈ کا پھر وہی ان کے اسی قہقہے کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لفٹیننٹ صاحب تو ان کے قہقہوں سے چڑنے جاتے تھے مگر وہ دوسرے بولین اور لیڈی صاحبان حیران و متعجب ہو کر میم صاحبہ کے منہ کی طرف دیکھنے تھے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ بڑی دیر کے بعد میم صاحبہ نے ہنسی سے دم لیا اور اس وقت اپنے شوہر جناب لفٹیننٹ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "ولیم! معلوم ہوتا ہے تم نے اس بیچارے جنٹلمین کو بھی اپنے خراٹوں سے تنگ کیا اور اس نے اپنی مخلصی کی چالاکی عبادت کو بنایا"۔ مخلصہ حاضرین کو میم صاحبہ نے اپنے شوہر کے خراٹے مارنے کا سارا قصہ سنایا اور فرمایا کہ "بعض اوقات میں بھی سخت تنگ ہو جایا کرتی ہوں"۔

حاضرین کو ہمارے جوان ہیرو کی عجیب و غریب عبادت اور اس عبادت کی وجہ سے تنگ ہو کر کمرہ چھوڑ جانے کا قصہ تو لفٹیننٹ صاحب خود سنا چکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس مسز پریم صاحبہ کے حاشیے نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اب فرمائیے کون نہ ڈٹ ہنسے نہ سام یورین اور لیڈی صاحبان کا مارے ہنسی کے برا حال تھا سب کے سب دہرا قہقہہ بن گئے اور بالاتفاق یہی کہتے تھے کہ عجب زندہ دل شخص ہے اور عجیب ترکیب سوجھی۔ حاضرین کے فقروں نے لفٹیننٹ صاحب کو اور بھی کھسیانا کر دیا۔ اس وقت تمام جنٹلمین اور لیڈیاں ہمارے نوجوان ہیرو کی طرف مخاطب تھیں مگر دل بے خودی اور اپنے جذبات پر قادر الاختیاری کہ اس شخص کے لبوں پر مسکراہٹ بھی نمودار نہ ہوئی اور بڑی متانت سے مختلف سوالات کا جواب دیتا جاتا تھا۔ بالخصوص صاحب کلکٹر بہادر اور لفٹیننٹ صاحب کی میم صاحبہ تو اس شخص کی گفتگو پر ایسے شیدا معلوم ہوتے تھے کہ علانیہ عش عش کر رہے تھے۔ اس موقع پر یہ سیمیں اور انگریزوں کے باہمی میل جول پر بولین پارٹی اور اس جوان

کے بابی ہو گفتگو ہوئی وہ بڑی دلچسپ اور لطیف تھی مگر اس کے لکھنے کے لیے اس طویل مضمون میں گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

یہی گپ شپ جاری تھی کہ سواری کے تانگے آن موجود ہوئے۔ وقت وداعگی آن پہنچا۔ ہم سب لوگ گرہ سے باہر نکلے اور اس وقت ہمارے ہیرو کو جس قدر رائی تا ہمالیہ پر تاثر ہوتا تھا۔ کل جنٹلمین اور لیڈیاں اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے کھڑی تھیں۔ سارا مجمع یک زبان ہو کر اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا سب نے یہی خواہش ظاہر کی کہ پھر کوئی موقع ملاقات کا ملے اور یکے بعد دیگرے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کر کے رخصت ہوئے۔

اب ہمارے لفٹیننٹ صاحب کی سُنیے کہ وہ سخت کھسیانا چہرہ بنائے ہوئے ایک طرف کو منہ کر کے ہمارے پاس سے گذر کر تانگے میں جا بیٹھے ——— مگر بل بے بے خوفی! ہمارے نوجوان ہیرو نے ان کا تعاقب کیا اور تانگہ کے پاس جا کر ان سے بڑے عاجزانہ انداز کے ساتھ مؤدب وضع سے سامنے کھڑے ہو کر لفٹیننٹ صاحب کو انگریزی میں کہا کہ "اگر میری کوئی حرکت آپ کی ناراضی کا موجب ہوئی ہو تو بڑے ادب کے ساتھ اور کمال عجز کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوں۔ آیئے اب سب رنجشوں کو دور کر کے باہم مصافحہ کر لیں۔" اس فقرہ پر لفٹیننٹ صاحب اور بھی جھلائے اور سخت کھسیانے ہو کر کمال غصہ کی حالت میں درشتی کے ساتھ فرمایا: "میں تم سے ہاتھ نہیں ملاتا ہم جنٹلمین نہیں ہو۔"

اتنے میں تانگہ والے نے گھوڑوں کو چابک لگایا اور دیکھتے دیکھتے تانگے وہاں سے کافور ہو گئے۔ ہم دونوں بھی اپنے تانگوں میں سوار ہوئے اور وہاں سے چل دیے۔

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اگر یہ کوئی ناول یا قصہ ہوتا تو ناظرین کو ہمارے جوان ہیرو کا نام معلوم کرنے کے لیے بہت بیتابی نہ ہوتی۔ مگر چونکہ یہ اصل واقعہ ہے اور تمام حالات راست راست بلا کم و کاست لکھے ہیں اس لیے ناظرین ضرور اس جوان کا نام معلوم کرنا چاہتے ہوں گے۔ پس اب میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ناظرین کو زیادہ کبیدہ خاطری کی حالت میں رکھوں اور بلا تامل کھول کر بتا دیتا ہوں کہ اس مضمون کے ہیرو اسی رفیع الدرجہ کے اڈیٹر ہمارے مولوی یا مسٹر محرم علی چشتی ہیں اور یہ سب انہی کی حرکات تھیں جن کا تذکرہ اس مضمون میں درج ہے جس سے ناظرین قیاس فرما سکیں گے کہ جہاں ایک طرف آپ کے مزاج میں کمال درجہ کی ظرافت ہے اسی طرح دوسری طرف آپ ظرافت میں بھی اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہیں۔ غرضکہ ایک عجیب طرفہ معجون شخص ہیں۔

پنجاب پنچ

مولوی فتح الدین بسمل پنجابی اخبار نویسوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے، وہ نہایت ذکی اور ذہین تھے سان کے والد مولوی جان محمد بھی لاہور میں ایک مشہور عالم گزرے ہیں۔ پنجاب کے اکثر مسلمان اور سکھ رؤسا نے ان سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

بسمل نے ۱۸۷۵ء میں "اخباروں کے قبلہ گاہ" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جس کا ضمیمہ "پنجاب پنچ" کے نام سے شائع ہوتا تھا یہ غالباً پنجاب کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا۔ اس کا دفتر لاہور میں دہلی دروازہ کے اندر مسجد وزیر خاں کے متصل واقع تھا۔ مطبع کا نام بھی قبلۃ المطابع تھا۔ قبلہ گاہ کا ایک اشتہار ملاحظہ فرمائیے:

تشریف شریف کو وہ لانے لائے
پھر منہ نے بھی وہ۔ منہ بے پائے پائے
کیا موسمی ہے بسمل خوش میں بسمل
اخباروں کے قبلہ گاہ آئے آئے

اخبار کے اغراض و مقاصد ان دھنواں دھار الفاظ میں ظاہر کئے جاتے تھے:-

"اخبار ایک سچی شہادت کا نام ہے اور ملک کی خدمت کرنا اس کا کام ہے منصب میں رعایا کا سفیر ہے اور قدر و منزلت میں گورنمنٹ کا مشیر یا تعبیر کبھی فریادی ہو کر ارباب کے ساتھ گورنمنٹ کو پکارتا ہے، اور کبھی ناصح بن کر اچھی طرح رعایا کو سمجھاتا ہے۔ ہمیشہ بہبود ملک کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اپنی عادل گورنمنٹ کا ہر حالت میں دم بھرتا ہے۔ جمیع کمالات سے اپنے آپ کو ایسا بناتا ہے کہ جام جم اور آئینہ سکندر میں بھی نہ سماتا ہے۔ شائقان اخبار کو مستطاد لوح محفوظ ہے اور طالبان مسرت کو مرقع محفوظ۔ اللہ اللہ مشتاقان دیدار کو کوہ طور ہے اور عباد زہاد کو جلوۂ نور دو جہان کے واسطے دو عین ہے اور یار یک بینوں کو واسطے خود عین ہے۔ جب کبھی کاملوں کو اپنے علم سے آزماتا ہے، اپنے آپ کو بھی ان کا ثانی سی پاتا ہے۔ سبحان اللہ کل کائنات کے سارے رنگ اس میں چھپا دیئے سکھاں تک، بیان کئے جائیں کہ اس کے اوصاف کیا ہیں، عرضیکہ خلاصہ کائنات ہے اور پسندیدۂ موجودات ہے"

پنجاب پنچ میں ظریفانہ مضامین اور شیروں کے علاوہ کارٹون بھی اچھی خاصی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ مذاق عام طور پر پھکڑ، عامیانہ اور زیادہ تر ذاتیات پر مشتمل ہوتا تھا۔

تبسم شاعر بھی تھے اور ظرافت کے نظم و نثر مضامین برابر لکھتے رہتے تھے۔ اس عہد کی ظرافت میں ان کو درجہ کمال حاصل تھا۔ ان کا مزاحیہ کلام انجمن پنجاب کے رسالہ گلدستہ سخن میں بھی اکثر منقل ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے ۱۸۸۸ء میں بعارضہ قلب انتقال کیا۔ وفات کے وقت ان کے فرزند منشی دین محمد کی عمر صرف چار برس کی تھی۔ اس لئے اخبار کا تمام کاروبار ان کے چچا مولوی فیروز الدین نے سنبھالا جو اس وقت خود بھی اخبار شیر ہند کے مالک تھے اور اب اپنی یادگار ایک بہت بڑا ادارہ فیروز سنز کے نام سے چھوڑ گئے ہیں۔

منشی دین محمد نے تعلیم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۲ء میں پنجاب پنچ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا مگر چونکہ اچھے اور قیمتی خیز مضامین لکھنے والے بہت کم تھے اس لئے نہ صرف ظریفانہ رنگ ہی اڑا دیا بلکہ اخبار کا نام بھی بدل کر صدائے ہند رکھ دیا جو اب میونسپل گزٹ ہو کر ان کی وفات تک چھپتا رہا۔

مولوی فتح الدین تبسم کی ایک ظریفانہ سیاسی نظم رسالہ گلدستہ سخن لاہور مارچ ۱۸۸۸ء سے لے کر یہاں پیش کی جاتی ہے یہ غالباً اس زمانے کی جنگ افغانستان کے وقت لکھی گئی تھی ؎

کابل پر سر پیکار ہیں لو اور سنو
ان کے اب مرنے کے آثار ہیں لو اور سنو

جن کے صدقے سے پلے اور رہے تھے برسے
ان سے بھی لڑنے کو تیار ہیں، لو اور سنو

شاہ قیصر تو در کنار نہ مصالح موجود
سونٹھ کی گانٹھ پہ عطار ہیں لو اور سنو

دو قدم گو نہیں چل سکتے مگر اس پر بھی
جنگ میں چلنے کو تیار ہیں لو اور سنو

ہم زنے مولوی تھے آج طفیل سرکار
پنچ ہیں صاحب اخبار ہیں، لو اور سنو

جیب میں نافے پڑے رہتے ہیں بیل کے مدام
آج ہم غیرت تاتار ہیں، لو اور سنو

ہم بھی اخبار جاری کریں گے

ابو محمد سید جمال الدین

"ہم بھی جاری کریں گے!"
"ارے میاں کیا جاری کرو گے؟"
"جی جناب ہم بھی جاری کریں گے۔"
"بھلا کچھ معلوم تو ہو کیا جاری کرو گے؟"
"ابھی ہم جاری کریں گے۔"
"الٰہی تیری پناہ! کچھ کہو گے بھی کیا جاری کرو گے؟ کیا بل تو نہیں جاری کرو گے؟"

یہ مضمون اخبار "وکیل" لاہور مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۳۴ء جلد چہارم نمبر ۱۳ سے لیا گیا ہے۔ اس کے لکھنے والے ابو محمد سید جمال الدین ڈاکٹر شفاخانہ نصیبہ کھوری ضلع سارن ہیں۔

اخبار وکیل لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا دفتر ہیرا منڈی میں تھا۔ یہ ہمارے عہد کے مشہور اہلِ علم اور ماہر تعلیم مرحوم ابوالکلام محمد یٰسین ایم اے ایم او ایل کے والد مولوی فضل الدین مرحوم نے یکم جون ۱۹۰۹ء کو جاری کیا تھا۔ اس کے بارہ صفحے ہوتے تھے سالانہ چندہ ۲۶ روپے تھا۔ قیمت سرکار اور ریاست سے ۲۰ روپے اور عام شائقین سے بعد رو پے سہ محصول ڈاک لی جاتی تھی۔

پرچہ کی روش نام سے ظاہر ہے نظم و نثر کے تمام مضامین ظریفانہ ہوتے تھے۔ ایک آدھ کارٹون بھی ہوتا تھا۔ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس اخبار کا عنوان ترغیب دہ ہوتا تھا:

"یہ ظریف اخبار ملک کے سیاسی گلدستہ ظرافت ہے اور آئینہ فطرت اسی کا نام ہے۔ ایک نکتہ چیں جماعت ملک کی سامنے ختم کرتا ہے اور بغیر بجا بجا کر دکھایا اور گورنمنٹ کی دوستی کا دم بھرتا ہے کبھی بانتیجہ لوگوں نے رہایا کو وجد دلاتا ہے اور ظریفانہ انداز سے گورنمنٹ اور ملک دونوں کو جگاتا ہے۔ نئے روپ بھر کر ملک کے سامنے آتا ہے اور ہر ایک فقرے میں اتنے پتے کی کہہ جاتا ہے۔ حروف و دوات کا استعمال نہیں کرتا، خوشامدانہ مبالغہ آمیز مضامین نہیں بھرتا، اردو زبان کو چکانے والا لفظ زبانی تلوار سے مخدوش نہیں کرتا بلکہ مضمون کو تصویر کے لباس میں لاتا ہے جس میں سینکڑوں آرٹیکلوں کا مزا آتا ہے۔"

مولوی فضل الدین مرحوم ایک ہفتہ وار اخبار وکالت بھی نکالتے تھے جو نہایت سنجیدہ اور متین پرچہ تھا وہ بھی دہلی ہی سے شائع ہوتا تھا۔

"رائل گورنمنٹ یا ایسٹ انڈیا کمپنی کو مبارک ہو مگر ہم بھی جاری کریں گے۔"

"تو کیا کوئی کاغذ کا کارخانہ جاری کرو گے؟"

"یہ تو ان بڑی توندوالوں کا کام ہے جن کی توند اُردو کی دال کھا کھا کر اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ دھوتی کھسکتی جاتی ہے لیکن ہم بھی جاری کریں گے۔"

"پھر کیا کوئی نہر جاری کرو گے؟"

"یہ ان ظالم حکام کا حصہ ہے جو مظلوموں کی آنکھ سے ایک کیا ہزاروں نہریں جاری کرتے ہیں۔ لیکن اس جانب بھی ضرور جاری کریں گے۔"

"آہا معلوم ہوا آپ شاید کوئی جہاز جاری کریں گے۔"

"آپ بھی کیا ساون کے اندھے ہیں جو خشکی میں جہاز چلواتے ہیں اور جن جہازوں کی نسبت آپ فرماتے ہیں ہندوستان میں ان کی اب حاجت بھی نہیں رہی۔ سینکڑوں روشنی والے بے غیرتوں نے اہل یورپ کی دیکھا دیکھی دن دہاڑے ..... کے جہاز چلانے شروع کر دیے ہے مگر یار ہم بھی ضرور جاری کریں گے۔"

"اے حضرت! اب جلد بتلائیے کیا جاری کرو گے؟"

"اب بتلا ہی دوں۔ تو سنیے بندۂ درگاہ ایک پھڑکتا ہوا ظریف اخبار جاری کریں گے۔ کیوں یار ہے نا سہل سا تو طریقہ ارتی اسانسہ ہلکے کی کل جاری کر دی ہزاروں روپیہ کی اخبار فروشی کرنے لگے۔ اس میں بڑا نفع ہے اور معزز پیشہ۔"

"اخبار نہیں، بڑے کا سر جاری کرو گے۔ اخبار جاری کرنا کیا خالہ جی کا گھر ہے۔ کر چکے اخبار جاری۔"

"ابجی ہٹ کے مٹرو۔ ہم اخبار جاری کریں گے اور بیچ کھیت جاری کریں گے۔ تمہری چھوٹی آنکھ سے دیکھو آئے دن سینکڑوں کنڈھا ناتراش اخبار جاری کرتے ہیں۔ پھر ہم ہی کیا کیڑے پڑ گئے ہیں!"

"آپ اخبار تو جاری کریں گے مگر یہ تو فرمائیے کس منشا اور غرض کے واسطے؟"

"آپ بھی پورے جانگلو ہی رہے۔ ارے میاں جس واسطے تمام اخبار جاری ہوتے ہیں اسی واسطے ہم بھی جاری کریں گے قومی ہمدردی، ملکی بہبودی اور رفاہِ عام کے کاموں میں امداد پہنچانے کے واسطے ہمارا اخبار بھی جاری ہوگا۔ کیونکہ تمام اخبارات اجلاس کے وقت یہی ظاہر کرتے ہیں۔ پھر چاہے کریں اس کے برعکس۔ چنانچہ ہمارے اخبار کا اشتہار بھی آپ آنکھ بند کر کے اور کان کھول کر دیکھ لینا، سوا الفاظ قومی ترقی اور ملکی بہبودی وغیرہ کے دوسرا لفظ اگر اشتہار بھر میں دیکھنے میں آجائے تو مفت اخبار دیں۔ کوڑی قیمت نہ لیں۔"

"ان لن ترانیوں کو تو رہنے دو۔ پہلے یہ تو فرمائیے کہ قومی ترقی اور ملکی بہبودی کے واسطے کس قسم کے مضامین لکھنے جائیں گے۔"

"آپ کیا میرا امتحان لیتے ہیں؟ مجھے آپ نے اڈیٹر نہیں کوئی لاٹھ کا الو تصور فرمایا ہے۔ ہم تو اپنے اخبار کا پہلا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں پر (خواہ منفیہ خلائق ہوں خواہ مضر) برابر نکتہ چینی کرے اور بخت و درشت ناگوار الفاظ سے پیش آئے۔ اس میں اخبار کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ لوگ بہادر، منہ پھٹ، نڈر و بیباک اخبار کہہ کر بڑی خوشی سے

خمیدہ لئے ہیں۔ یہ سراسر ظلم ہے کہ ریاستوں کی تعریف لکھنا مبتدی وھدی سے پیٹ پالنا، خوشامدانہ مضامین سے اخبار سیاہ کرنا (جیسا کہ بعض خوشامدی اخباروں کا دستور ہے) پھر دیکھیے تو علیہ الرحمۃ کی کیسی بارش ہوتی ہے اور ریاستوں سے خلعت و انعامات کی کیونکر بوچھاڑ پڑتی ہے اور مزا یہ کہ ان میں ہر لگے بندھے ٹکڑے اور ٹکسالی چھپ کھا آئے۔ آخر سیاہی کاغذ، کاپی نویس وغیرہ کی تو ہر قسم کے اخبار میں برابر ضرورت پڑتی ہے۔ پھر اس میں کسی قدر ایمان کا غذ شریک ہے تو اس کا جانا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایمان ہر قسم کی آمادی کا جانی دشمن ہے۔ اسی کی بدولت ہم سے اور بڑی بڑی قوی رکھنے والوں سے ہر روز کی ٹوٹوں میں اور دنا فعل مل ہوا کرتی ہے اگر ہم کو اس ایمان کا خیال ہوتا تو ہم بھی لب کے ستارہ بند یکدست انسان ہو گئے ہوتے۔"

"ہے لعنت ہمارے اس اخبار جاری کرنے پر جس سے کوئی قومی ترقی اور ملکی ہمدردی ہے۔ اسی اخبار کے جاری کرنے کا وہ شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ملکی و قومی ہمدردی نہیں گورنمنٹ پر بیجا اعتراضات جمانے اور ریاستوں کی جھوٹی تعریفیں اور بے جا طرفداری کرنے سے ہوا کرتی ہے۔"

"اگر تم پڑھے لکھے ہو تو بتلاؤ کہ کس قسم کے مضامین لکھنے سے یہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے؟"

"میں کچھ گورنمنٹ فاضل تو ہوں نہیں جو سارا کام چھوڑ کر مضمون نگاری کی تعمیل (تعلیم) دوں۔ البتہ قومی ترقی اور ملک کی بہبودی کے واسطے چند عنوان بتلائے دیتا ہوں۔ تم اپنی لیاقت کے مطابق اس پر مضامین لکھتے رہنا۔ میں پہلے میں تم کو بتلائے دیتا ہوں کہ اخبار نویس کو گورنمنٹ کی رائے اور تجویز پر بہت غور کر کے لکھنے زبان کرنا چاہیے۔ اگر گورنمنٹ کی تجویز قوم کے حق میں مفید معلوم ہو تو پہلے دل سے گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور جو قوم کے حق میں مضر ہو تو نیاز مندی سے شائستہ اور عمدہ لباس میں مودبانہ طریق سے نکتہ چینی اور رائے زنی شوق سے کرے۔ ناملائم اور بیجا الفاظ، اُجڈ اور گستاخانہ طریق سے واویلا مچانا پھرے۔ لیکن سب سے پہلے اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کے واسطے مضامین لکھنا مقدم سمجھے۔ اب اپنے بھائی ہونے والے اخبار کے واسطے تھوڑے سے عنوان تو شن تو۔ پھر ان پر مضامین لکھنا:

(۱) قومی اتفاق کی ضرورت (۲) قوم میں اتفاق اور اتحاد کیونکر بڑھ سکتا ہے (۳) ضرورت علم (۴) فوائد علم (۵) کون سے علوم حاصل کرنے چاہئیں (۶) کس طرح علم حاصل کیا جاتا ہے (۷) زراعت کی ترقی کی تدابیر (۸) تجارت کے فائدے (۹) عبارت کو نکمیوں پر بیوں ترجیح ہے (۱۰) پیشوں کو ذلیل نہ جانو (۱۱) ہر قسم کی دستکاری کو ترقی دینے کی تدابیر (۱۲) اولاد کو تندرست رکھنے کی تدابیر سیکھنا کب واجب ہے (۱۳) بچوں کو وہ کون لباس ہیں جو بیماری سے روکتے ہیں اور موٹے ہوتے ہیں (۱۴) فوائد مقبول اور ملکی غذا کے بچوں کی پرورش میں (۱۵) تعلیم اولاد کی مقدم ہے (۱۶) کس طرح تعلیم دی جائے جس میں بچہ تعلیم کو شغل کھیل کے شوق سے سیکھے (۱۷) بچوں سے بہت مشقت اور محنت لینے کے نقصانات (۱۸) وہ کون کھیل ہیں جن سے بچوں کے اعضا درست یا سیدھے و مضبوط ہوں (۱۹) زیور پہنا کر بچوں کو باہر نکالنے کی مذمت (۲۰) بچوں اور جوانوں کو بدصحبت زیادہ اثر کرتی ہے (۲۱) بچوں سے شیریں کلامی اور تہذیب سے برتاؤ کرنے کے فوائد (۲۲) صبح اٹھنے کے فوائد (۲۳) چھوٹی عمر میں شادی کرنے کی مذمت (۲۴) استاد اور والدین سے ادب سے پیش آنا سعادت ہے (۲۵) شادیوں اور تقریبوں میں اسراف برا ہے (۲۶) نیک صحبت کے فوائد (۲۷) لہو و لعب باج سنگ کی مذمت (۲۸) عورتوں کو بقدر ضرورت تعلیم ضروری ہے (۲۹) بیوہ کی

دوسری شادی کرنا بُرا ہے (۳۰) رفاہِ عام کے کاموں کو خاص طور پر ترجیح ہے (۳۱) حُقّہ، تمباکو، چرٹ سے آلاتِ تنفس کو بہت نقصان ہوتا ہے (۳۲) مے نوشی کی خرابیاں (۳۳) مدک چانڈو کی مذمت (۳۴) بُرے پیشیوں کی مذمت (۳۵) بھیک مانگنے کی مذمت (۳۶) حاکم کی نافرمانی بُری ہوتی ہے (۳۷) فحش و پھکڑ کی مذمت (۳۸) ہمسایہ سے سلوک (۳۹) دوستوں سے مروت (۴۰) جھوٹ کی مذمت (۴۱) غیبت کی مذمت (۴۲) مذمتِ حسد (۴۳) مذمتِ تعصب (۴۴) ذات اور نسب پر فخر کرنا بُرا ہے (۴۵) خورد کی مذمت (۴۶) ظلم کی مذمت (۴۷) سود کھانا حرام ہے (۴۸) سُستی اور کاہلی کی مذمت (۴۹) جدلیں کا ادب (مجھولوں پر شفقت ضروری ہے (۵۰) پیٹ بھرنے کی بُرائی (۵۱) حوصلہ مندی کی تعریف (۵۲) فضول کاموں میں عمر برباد کرنے کی مذمت (۵۳) نیم حکیموں سے علاج کرانے کی مذمت (۵۴) میاں کے بیوی پر اور بیوی کے میاں پر کیا حقوق ہیں (۵۵) نوکروں غلاموں ماتحتوں پر سختی کرنا بُرا ہے۔"

"بس کرو، بس کرو۔ ابھی سننے کو بھی ہو، بس کرو۔ ہم سے ایسے پاٹھ نہیں پڑھے جائیں گے۔ تم نے تو ایک طرف سے دنیا بھر کے علوم و معلومات و تجربہ کاری کی باتیں بتلانا شروع کیں۔ ایک آدمی قاموسِ ملک کی باتیں ہو بھلا جان سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے حاصل کرنے کے واسطے تو عمرِ نوح بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ بس جناب ایسی اڈیٹری اور اخبار نویسی کو ہمارا دُور ہی سے سلام ہے۔ آج سے کبھی اخبار جاری کرنے کا نام بھی لیا تو جو سات چوروں کی سزا (جو نہ برابر ہیں ایک مضمون چور کے) وہ ہماری سزا۔"

"اچھا اب ہم تم کو ایک ذرا سی بات بتلائے دیتے ہیں۔ اگر اس پر عامل ہو گئے تو تمھارے برابر روئے زمین پر کوئی اڈیٹر نہ ہوگا۔"

"اے سبحان اللہ! کیوں نہ ہو۔ ہو تو تم ہمارے لنگوٹیا یار۔ تم کو ہماری ہمدردی کا خیال نہ ہوگا تو کس کو ہوگا۔ لے اب جلدی سے مکھے ہاتھوں بتلا دو تو ابھی جاتے ہی پہلے اخبار جاری کروں پیچھے کھانا کھاؤں۔"

"اچھا بہت خوب یاد رکھو کہ جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھا کرو تو آیت ذرّانی فآ لتکم الرسول فخذوہ و مانھکم عنہ فانتھوا کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ کیونکہ بس رسول معصومؐ کا استناد خود علّام الغیوب ہوا اس کی پند و نصائح میں دینی و دنیاوی فوائد کس درجہ پر ہوں گے۔ کیا مجال ہے کسی بشر کی جو آپ کے مضامین پر نکتہ چینی کرے یا کوئی عاقل مخالفت کا دم مارے۔"

"اچھا تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ پہلے میں کسی محدث سے احکامِ رسولِ معصوم اسکیدھ آؤں۔ پھر اخبار جاری کروں گا جب تک دیگر اخبار نویسوں پر لازم ہے ہمارے قائم مقام اسی قسم کے مضامین لکھیں اور دل کھول کر گالیاں دیں لیکن کہیں بدتمیزی یا مفسدہ آمیز مضامین یا آپس میں جوتی پیزار کر بیٹھے (جیسا کہ آج کل مراد آباد کے اخباروں کا حال ہے) تو آگر ایک ایک اخبار نویس کی وہ درگت کروں گا کہ توبہ ہی بھلی ہے ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

مُلکی مخبر

دُور کی بات

احمد علیخاں عاصی

یہ مضمون اخبار ملکی مخبر یعنی پولیٹیکل سپاہی سے لیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں لاہور کے مطبع دہلی پنچ جاری ہوا تھا۔

مولوی احمد علی خاں صاحب عاصی بریلی کے رہنے والے تھے ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت سے اس وقت کے تقریباً تمام پنچ اخبارات مالا مال نظر آتے ہیں۔ کتاب شاہد ظرافت میں ان کے بہت سے ظریفانہ مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں ؎

بہ سمت جلوہ ہائے معانی کی سیر کر
گھر نگٹ الٹ دیا ہے عروس خیال کا

میرے مکٹ دھاری نسی والے سانورے کنھیا ملکی سپاہی! خدا تجھ کو عوض ایں جانب کو برج کی پریم گوپیاں نصیب کرے۔ کیوں یار! یہ سن کر دونی کی طرح جل بھن تو ضرور رہی گئے ہو گے۔ تو ہمیں اپنے دلربا انداز کی قسم سچ کہنا روکھی پھیکی جلتی عورت پر ایں جانب نے بھی کیسی نکھری ہوئی شوخ ہے چین طبیعت پائی ہے ؎

دیکھے جو نظر بھر کے یہ کیا منہ ہے کسی کا
آئینہ خورشید میں پرتو ہے اسی کا

غور سے دیکھیے تو نگاہ یار سے زیادہ تیز برق سے بڑھ کر بے چین، بتان سنگدل سے کہیں شوخ دلدار کی ذی افہم، رمز شناس شعلہ مزاج اک ذرا مسکرا کر چھیڑ دے پیچ نگاہیں سے رگ جاں میں دو چار چٹکیاں لے اتنی شوخ طبعی سے دل میں گدگدی پیدا کرے، اس وقت اس عاصی کی رنگ آمیزیاں اور گل افشانیاں دیکھیے ؎

نالہ بے چھیڑے ہوئے غیر کے پیدا نہ ہوا
میں لبے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا

خیر یہ تو یاروں کی چھیڑ چھاڑ، کہنے سننے کی باتیں ہیں مطلب کی سنئے۔ آج جو ایں جانب کی دلفریب طبیعت نکتہ مضمون میں ولی عاشق کی طرح بے چین ہو کر ہاتھ سے نکل گئی تو اور ہو ہو۔ عالم خیال سے گزر کر عجب شان و شکوہ کے ساتھ شش جہت کے جلوے دکھتی جا لی

وہاں پہنچی جہاں فرشتہ خاں کی عقل کو بھی رسائی نہیں۔ اسے عائشہ! اس اپنی ناکامی جستجو کے قربان۔ زلیخا تلاش کے صدقے۔ ایک دم میں تمام عالم ارواح چھان مارا۔ فرشتہ پیکر بن کر خوب ملاء اعلیٰ کے سیر سپاٹے کیے۔ گاؤ زمین پر سوار ہو کر نہ کی خبر لی۔ ارمان بن کر دل عاشق میں راہ کی۔ سر سے پاؤں تک چشموں کی آنکھوں میں گھر گیا۔ سبزوں میں شادابی، پانی میں روانی کی کیفیت دکھائی۔ پردہ محل میں برنگ بوئے نہاں ہو کر گشت بیجا کی بہاریں لوٹیں۔ زاہد کے ہمراہ دائرہ تسبیح کی طرح ہزاروں حرم کے چکر کاٹے، دیر میں زنار، برہمن بن کر تیوں کے گلے پڑے۔ غرض ہر رنگ میں بھیس بدل کر دیکھا بھالا، تلاش کی، جب کہیں ہزار بات کی ایک بات ہاتھ آئی ؎

کوئی صورت ہو مجھے چھپ کر تماشا دیکھنا
میں بھی گویا رنگ محفل تھا کہ ہر محفل میں تھا

اب آپ ہماری خوشامد کیجئے اور کچھ دے کر پوچھئے تو وہ بات بتائیں۔

کیا خوب اگر خوشامد ہی کرتے تو کسی بے حجاب ہرجائی کو گھر میں نہ ڈال لیتے۔ یہ برسات کے موسم میں جھوم جھوم کے اودی اودی گھٹائیں آتی ہیں لپٹا کے مزے نہ اڑاتے۔ اور سفید یار بہانہ دینے لینے کا نام آیا اور آنکھوں سے خون اترا۔ بخیر عالم تجوری، مصر، کابل، مسقط ان برما تاز رہے۔

(بھولے بن کر) کچھ وہاں اندیشہ تو نہیں ہے۔

ہیں! بجز جان و مال کے وہاں اندیشہ ہی کیا تھا۔ سب جہیں جان رعایا مطیع فرمانبردار۔ جو ہے کاکھشکانہ بلی کا غم۔

واہ صحت واہ یہ کسی اخبار نویس نئے کے لونڈے کو دم دیجئے۔ ایں جانب کی آنکھوں پر عالم بین عینک لگی ہوئی ہے۔ پولیٹکل اور سوشیل حالات جہاں کے کہئے کہہ چلیں۔

چہ خوش! اس لیے چوڑے دعوے پر آپ دو ہی ایک چٹکتی ہوئی باتیں ارشاد فرمائیے۔

سنئے! پہلی دور اندیشی ریاست رامپور کی نیابت ہمارے نئے نواب صاحب کی تعین مزاجی سے درمیان نواب حامد علی خاں اور جنرل اعظم الدین خاں کے گل بازی کا رنگ دکھا رہی ہے۔ نتیجہ دونوں شخصوں کی بددلی ریاست کی خرابی۔

دوسری انجام بینی فی الحال ہماری سرکار جو قرضہ لیتی ہے شاید کسی وقت میں کشمیر کے مالا مال خزانے سے ادا کیا جائے جس پر آج کل انگریزی اخباروں نے تاک لگائی ہے۔

تیسری نادک خیالی ہم نہیں کہتے کہ روس کسی وقت میں ہندوستان آئے یا نہ آئے۔ دلیپ سنگھ کا معاون و مددگار بنے یا بنے مگر ان دونوں خبروں کے گرم و ٹھنڈے ہو جانے سے ہماری گورنمنٹ ایک پر اثر نتیجہ ضرور نکال لیتی ہے۔ وہ یہ کہ کمال رعایائے ہند کی مختلف طبیعتوں کی جانچ پڑتال ہو جاتی ہے۔

راقم

صورت لفظ خموشی سخن آرائی ہے
یہ زبانی جو مری ہے وہی گویائی ہے

اور کہو۔

اور کیا خاک کہیں۔ واقعہ دل پاک کر گیا۔ دلی کے چڑا سی کم بخت بھی کیا نایاب بے مروت، خود غرض ہوتے ہیں کہ بندہ نہیں العالم کا کام ہو خاطر تواضع کرو۔ مگر کیسے اُڑ کے تانگے کی طرح اینٹھے ہی جاتے ہیں۔ دُور سے جہاں بنگلہ پر کسی بھلے مانس کو آتے دیکھا اور دھوتی جھیکی صورت بنائی ملے کی۔ آنکھیں پھیریں۔ اگر اس وقت ان سے ہاتھ ملایا کچھ دے لے دیا تو پھر کیا تھا کسی بھی بیٹے کو مرحوم، علاج بھی نہ آوے اور نہ صاحب حاضری پر میں ملنے نہ دے۔ بڑا صاحب آگیا ہے میم صاحب چھٹی مانگتی ہے۔ یہ بات وہ بات اس وقت نہیں مل سکتے۔ میں مجبور اسامد میں پکار لگا دیتے۔ اور جملہ شرفاء طاعون کے ٹھنڈی ٹھنڈی لہراتی ہوا کھانے گھر چلے آتے۔ کہاں گئے تھے۔ کہیں نہیں اور اگر قسمت جاگی، نصیبا پلٹا۔ صاحب کی ملاقات ہو گئی۔ تو بے بیا خدائی مل گئی کئی ہزار فیٹ سے غرشی سلام کیا۔ منھ پر انداز کی طرح پیچھے گئے۔ آگے جو کھڑے کھڑے گٹ پٹ بات چیت ہو گئی۔ اسے بھی چلتی لے میں لینے جایئے۔

صاحب دل۔ رئیس! حضور کے اقبال سے سب خیر صلاح ہے۔

صاحب۔ شہر میں لوگ کیا بھاؤ ہے؟

رئیس۔ صاحب وہ ہسپتال میں لے بہت صبح نہار منہ جا کر دیکھا میرے دل سے ہزار درجہ صاف ہے ذرا انسانیت کی بُو نہیں آتی۔

صاحب۔ اچھا رخصت۔

اے، اللہ حمد ہے اس ملاقات کے، اور قربان اس گفتگو کے۔ بھی چوتھی گریم تنخواہ من چوتھی سرایہ۔ اب جو لوٹ کر آئے تو دستیاب سے الگ۔ پاجامہ سے باہر بیٹھے بقال۔ ٹوکر چاکر، ماما اسیل، بجھ بجھ میں لگے لمبیاں بھرنے آج صاحب سے پچاس گھنٹہ برابر بات چیت رہی۔ صاحب نے یہ کہا۔ میں نے یہ کہا۔ اس کا ذکر آیا۔ اس کا ذکر آیا۔ اس کی سفارش کی۔ اس کا تنسل کرایا۔ بھلا یہ تو کہو بھولے پر کیا بیتی

ہم بھی گھر بیٹھے ہوا باندھتے ہیں

اور کہو

قسم ہے جناب امیر کی اور نہ پوچھیے بس

کوفہ کا نمونہ یہ پریلی ہے شریفہ

یہاں محرم میں آٹھویں تاریخ تک وہ پھڑکتے ہوئے دھوم دھامی رام لیلائے میلے ہوئے مزے گھٹے۔ آتشبازیاں چھوٹیں جشن اٹھے کہ واہی واہ۔ نویں کو راجگدی کو توالی کے قریب ہو کر بڑے زور شور سے نکلا۔ تعزیہ داروں کو اس بات سے ایسا الم ہوتا کہ اس وقت تک سناٹا دلی۔ آج تک وہی سوز و گداز ہے۔ گھروں میں تعزیے لئے بیٹھے ماتم کر رہے ہیں۔ یا حسین۔ اگر چالیسویں تک بھی تعزیے نہ ٹھنڈے ہوئے تو پھر کربلا کا سامنا ہے۔

اور کہو۔

اور کیا کہیں۔ لوگ کہتے ہیں روس اور ہماری سرکار کی صلح ہو گئی۔ لڑائی جھگڑے سے جان بچی۔ مضمر قواعد کی اصلی منشا کو سمجھنے والے ہی سمجھیں گے۔ مگر ہم تو خیال کرتے ہیں کہ بیٹھے کے پوتے۔ جاڑے بخار کی آڈیں یہ بھیا روس ہی ٹھنڈی گرمیاں کر رہے۔ ہائے ہائے کیا تڑپ تڑپ کر گولی چل رہی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹروں کے امیر کابل سے بھی ہزار درجہ زیادہ پتے پھینک رہے ہیں۔ لوگ ہیں کہ آنکھ بند کئے کفن پہنے سر پٹ دوڑ کر چلے جا رہے ہیں۔ ہم تو توام کے ساتھ جان دینے میں کر شان سمجھتے ہیں ورنہ ہم بھی دلیٹروں میں داخل ہونے کی درخواست لئے

مُلّا دوپیازہ

آج سے پون صدی پیشتر لاہور میں اچھے اخباروں کے ساتھ ساتھ بعض گمنام قسم کے ظریفانہ اخبار 'مُلّا دوپیازہ'، 'جعفر زٹلی' پاشا خاں اور رفیق ہندوستان وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے جن میں نہایت فحش مضامین چھاپا کرتے تھے۔ یہ اخبار بالعموم ذاتیات اور وہ بھی تنقیصی معاملات سے بھرے ہوتے تھے ایک طرف تو اخبار کے معاونوں میں میر ناظم حسین ناظم لکھنوی، حکیم غلام نبی، ڈپٹی برکت علی اور سرسید احمد خاں کے حامیوں کی اچھی خاصی ایک جماعت تھی، لیکن دوسری طرف تنہا مولوی محرم علی چشتی تھے جو تقیید احمدی کی اشاعت اور جسٹس سید امیر علی کے ساتھ مل کر ۱۸۸۵ء میں پنجاب محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی وجہ سے سرسید کے مذہبی عقائد اور سیاسی مسلک کے خلاف ہو گئے تھے۔ مولوی محرم علی چشتی زبردست اہل قلم تھے۔ ان کے قلم میں صف شکن طاقت تھی۔ وہ اخبار کوہ نور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اور اپنا اخبار رفیق ہند بھی شائع کرتے تھے، لیکن وہ ایٹ کا جواب پتھر "مُلّا دوپیازہ" ہی کے ذریعے دیا کرتے تھے۔

مُلّا دوپیازہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ گلزار محمدی پریس سے باہتمام حکیم الدین مالک و میجر چھپتا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا، اور ۱۸۹۶ء تک رہا۔ اس کی طنز و ظرافت اور ہجو و ہزل کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

(محمد عبداللہ قریشی)

نو دولت "میاں برما"

تماشا خوب ہی دیکھا تری قدرت نمائی کا
چھپر کھٹ پا گیا ہے سونے والا چارپائی کا
دو شالا اوڑھتا ہے اوڑھنے والا رضائی کا
لگاتا ہے خیالِ خام اب لونڈا قصائی کا
شہانہ ٹھاٹھ باندھا ہے چلن بھولا گدائی کا
بگڑ بیٹھا رزالہ دم لگا بھرنے خدائی کا

(مُلّا دوپیازہ، ۲۳ اگست ۱۸۹۶ء)

میر ناظم حسین ناظم لکھنوی نے ایک زور دار ہجو لکھی جسے چشتی صاحب نے تضمین کر کے ان کی پگڑی انہیں کے سر باندھ دی ؎

عجب آکے منڈلی ملی ہے یہ ساری — کوئی ہے غضب زن کوئی چور بھاری
ہے نتھی کا بچہ تو نی رامدھاری — مشیر اس کے کجر ہیں اور ڈوم ڈھاری
میں لکھوں نہ کیوں ایسی صحبت پہ لعنت

چلے جی کو اب پیر نیچر کے نائب — بہت چوہے کھا کر ہے بلی بھی تائب
ہوئے گو کہ گرگ کہن یہاں سے غائب — مدد تو جو مانگے تو وہیں ولئے صائب
تری ایسی لنگڑی حمایت پہ لعنت

تجھے حامیوں نے کیا غرق یکسر — دکھاتا ہے تو ان کی شیخی پہ تن کر
اگر مجھ سے پوچھے تو اے نطفۂ خر — کہوں گا دل و جاں کو یک دل سمجھ کر
ترے حامیوں کی حمایت پہ لعنت

بھرن لو سے گو کہ مجلس تو رکھے — مگر ہاں بچاری کو خلق سے مارے
وہ روتی ہوئی تجھ کو اس طرح کوسے — جو ہیں ٹوٹی اب کر یہاں گھر میں اس کے
انہوں پر بھی لعنت ہے لعنت پہ لعنت

ترشنی کا سب مال کھا پی کے بھیجا — دیا قرض خواہوں کو مطلق نہ پیسا
وہ پنڈت تری جان کو اب ہے روتا — قرض ایوں، ڈگریوں کا تقاضا
جو لے کر نہ دے اس دیانت پہ لعنت

بھلائی جو جوڑے پاپ تو نے برکت — نظر آگئی تیری ساری اصالت
اور اس پر تو بنتا ہے سید کی عزت — تو لعنت کے قابل ہی ہے فی الحقیقت
حقیقت میں تیری حقیقت پہ لعنت

راقم
کس لئے فوج عدو پر نہ ہو افتادنی
سب مضامیں میں کرتا ہوں ہیں یکبادنی

طاؤ پیلنہ لاہور یکم ستمبر ۱۸۹۶ء

لاہور پنچ

دُکھڑا

سمجھے وحشی جو ہمیں اور کہے کالا ہم کو
کس طرح اس سے کہو ربط ہو پیدا ہم کو

وحشی و غیر مہذب ہر جب اپنا القاب
اُلفت و اُنس ہو پھر تم سے بھلا کیا ہم کو

پہلے پڑھے ہی پہ موقوف ہے تہذیب اگر
تو مہذب کبھی ممکن نہیں ہونا ہم کو

بس نہ لو اتنی شیخت کی ذرا شہ ماؤ
یاد ہے خوب تمہارا بھی زمانا ہم کو

ڈھانکا تم کو پتوں سے مگر بھول گئے
نیم وحشی تمہیں زیبا نہیں کہنا ہم کو

کون سے پتروں کے لال تھے کیئے تو سہی
گر ہو انصاف دعائیں دو ہمیشہ ہم کو

جن کی نسبت سے پلوان ہی کریں نام دھرو،
ہائے افسوس کسی سے نہیں کہنا ہم کو

ہم نے ہی نمکو سکھائے، یہ کرشمے، یہ ناز
اپنے سے آپ ہے جو کچھ کہ ہے شکرا ہم کو

بنے دولت سے ہماری اول اور مارکوئس
اور حقارت سے ہو پھر دیکھنے کیا کیا ہم کو

زر دیا، ملک دیا، جان سے بھی حاضر ہیں،
پھر بھی خاطر میں نہیں لاتے تم اصلا ہم کو

سہنے کیا کیا نہ وفا تم کو جتائی پر حیف :
تم نے جانا نہیں اک روز بھی اپنا ہم کو

تم کرو تیز ہمارے لئے ہر روز چھری
اور ہر لطف و عنایت کی تمنا ہم کو

ٹکس کا غبن و تخفیف کا دشنہ ہے ہے
سخت مشکل کہ پڑی جان بچانا ہم کو

کس کی تعلیم بھلا اور کہاں کی تہذیب ؟
خاک میں تھا فقط اس عجب ملانا ہم کو

عہد و پیماں پہ نہ ہوں خوش تو کریں کیا ناچار
کچھ تو ہاں چاہیئے جینے کا سہارا ہم کو

کاش ہم پر نہ کھلے آپ کی پیماں شکنی :
ورنہ دشوار ہے پھر وعدہ پہ جینا ہم کو

سیدھے سادے ہیں ہم اور راستی ہے ہم کو پسند
چال فقرہ یہ تمہارا نہیں بھاتا ہم کو

گر یہی آپ کے وعدے کی کمندیں ہیں رسا
جلد کابل بھی ہے پہنتا نظر آتا ہم کو

مر کھپ کر ہو گئے کانا نہیں جینے کی اب آس
ٹکس اور قحط نہیاں تک ہے پچھاڑا ہم کو

دیکھنا پہنچے نہ سیلاب کہیں تا انگیشٹ — آگیا اپنے اگر حال پہ رونا ہم کو
کاٹے گھوڑے کا اگر پہ وہ اٹھا دو دُرخ سے — دوڑ پھر تم کو پکارا ہو تمہارا ہم کو

ان کر نفرت پہ ہمیں انس، محال ست محال
حضرتِ ناخ یہ قول آپ کا بھایا ہم کو

(۱۸۷۶ء)

جالندھر پنچ

ہندوستان کا نیلام

اجی حضرت کچھ آپ کو بھی خبر ہے ؟

کیا ہے ؟

کیا آپ سوئے ہیں ؟ امیر کابل تو ہندوستان کا نیلام کر رہے ہیں۔ جب بڑی ٹوپیوں والے نیلام میں آ گئے تو ہم کس شمار اور کس قطار میں ہیں ؟

شہ و۔ شہ و۔ خیر تو ہے ! یہ خبر آپ نے کیسی سنائی۔ کہاں کا نیلام ؟

ارے بھائی ! امیر کابل یان دنوں حلوائی کی دوکان پر دادا جی کا فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ تو انگریزوں کو اپنا ناز و انداز دکھاتے ہیں اور انگریزان کی یہ چال ڈھال دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے۔

اجی امیر کابل تو انگریزوں کے ناز پروردہ اور وظیفہ خواروں میں سے ہیں، ان کا وہ کیا کر سکتے ہیں ؟ بہت کریں گے تو اپنے وظیفے سے ہاتھ اٹھا لیں گے۔

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب انگریزی خواں جاکٹ پتلون پہنے، پھندنے دار ٹوپی لیے، انگریزوں کی نقل بنائے تہذیب کی چال چلتے آ نکلے۔ مائی ڈیئر مائی ڈیئر کہتے ہوئے بوڈ بوڈ کرنے لگے۔ اور جیب سے انہوں نے ایک پرچہ نکالا اور پڑھا کہ امیر کابل انگریزوں سے ۱۲ کروڑ روپیہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ روپیہ مجھ کو دو میں روس نحوس کے مقابلہ میں خرچ کروں گا۔ ان سے لڑوں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ امیر صاحب فرماتے ہیں کہ روس ہم کو ۱۲ کروڑ طلائی سکہ اور کچھ ملک جلم تک دینے کو تیار ہے۔ اب گویا سمجھنا چاہیئے کہ امیر صاحب ہندوستان کا نیلام کر رہے ہیں۔ اگر انگریزوں نے زیادہ بولی لگائی تو ان کے ہاتھ ہندوستان چھوٹ جائے گا۔ نہیں روس کے ہاتھ چھوٹے گا۔

مگر یاد رہے ہندوستان ہے۔ اس کا یکایک چھوٹنا محالات سے سمجھنا چاہیئے اور فی الحال ہند کی قوت علم و تہذیب میں وہ چند بلکہ بہت چند ہے۔ جب کوئی اس کے رگڑے میں آوے گا تو اس وقت آپ دیکھیں گے کیا روس کیا افغانستان اس کے آگے پانی بھرنے جائے گا۔

(۱۸۸۵ء)

بنارس پنچ

پندنامہ

چار چیزوں کو چار چیزیں ضرور ہیں:- کالوں کو دولت، گوروں کو روپیہ، حکومت، روم کو نصرت، روس کو ہمت
چار چیزیں چار چیزوں کے بے روق ہیں:- پانوں بے بوٹ، سر بے ہیٹ (انگریزی لمبی ٹوپی) جسم بے کوٹ پتلون، منہ بے چرٹ
چار چیزیں ہندوستان کی تبرک ہیں:- گرانی، خشک سالی، تکلیف اور ٹیکس۔
چار چیزیں سب نیک بختی ہیں:- چندہ دینا چوں بکرنا، ہاں میں ہاں ملانا، دیوالہ نکالنا۔
چار چیزیں سب پر بستی ہیں:- راست گوئی، صاف دلی، کالا رنگ، اطاعت۔
چار چیزیں محال ہیں:- سول سروس کا عہدہ، دیسی ریاستوں میں خوش انتظامی، انگریزوں میں میل جول، ہندو ستانیوں سے بے وفائی
چار چیزیں آب حیات ہیں:- مدک، چنڈو، افیون، شراب۔
چار چیزیں مرجب ذلت و خفت ہیں:- اولاد کو پیار نہ کرنے کے تعلیم میں ہلاک کرنا، بیواؤں کی شادی، اولاد کا چھپٹن میں نہ بیاہنا۔
چار چیزیں مخصوص چار چیزوں کے لیئے ہیں:- پڑھنا نوکری کے واسطے، اتفاق ولایت کے لیئے، اتفاق ہند کے واسطے، ذلت کی تکمیل ہندؤں کے واسطے۔
چار چیزیں بے فائدہ ہیں:- اخباروں کی خریداری، کتابوں کی سیر، حال کی طرز تعلیم، گورنمنٹ سے التجا۔
چار چیزیں ہندوستان کے لیے مخصوص ہیں:- جاہلی، کاہلی، غلامی، بے پروائی۔
چار چیزیں برائے نام ہیں:- نئی روشنی، روسیوں کی جوانمردی، انگلینڈ کی دوستی، حکام کی خوشنودی۔
چار چیزیں بانکل بے معنی ہیں:- شکر گذاری، دربار دہلی کے خطاب، لارڈ لٹن کی اسپیچ، روسی سردار۔
چار چیزیں چار جگہ کم ہیں:- بادلوں میں پانی، ہندوستان میں غلہ، گورنمنٹ ہند میں رعایا کی رعایت، روس کی شجاعت۔
چار چیزوں کو زوال نہیں:- حکام کی خود رائی کو، ہمارے مصائب کو، ہر شورت کے بازار کو۔ پنچ اخبار کو
(۱۸۷۵ء)

آگرہ پنچ

کملائی ہوئی ظرافت

شوخ بے چین

پھول مرجھائے ہوئے ہیں عید کے قابل کب ہیں
آنکھ پڑتی ہے انھیں پر جو کھلے ہوتے ہیں

دنیا کی نعمت ہو اور خواجہ آگرہ پنچ۔ ہم ہوں اور ظرافت کا لہلہاتا ہوا خوشنما باغ۔ دلفریب نہر ہو اور موتی سا آب رواں بکھری ہوئی چاندنی ہو اور کوئی ماہ پیکر، خوش گلو، طرب ہو اور یہ پھڑکتی ہوئی غزل ؎

ایسے غارتگر سے یارب دیکھئے کیسے بنے — سیکڑوں برباد کر ڈالے ہوں تب نے گھر بنے
تیرے آگے بھی نہ جو کے جو ستمگر ظلم سے — مجھ سے اُس سے کس طرح اے واہ محشر بنے
اور تو کچھ بھی نہ آئے شیوہ ہائے دلبری — چٹکیاں لے لے کے دل میں آپ بھی دلبر بنے
ناز ہوں گے کیسے کیسے خاک ہونے پر مجھے — میری مٹی سے اگر دو چار بھی ساغر بنے

تاج گنج کے مجاور ملا آگرہ پنچ صاحب: قسم آپ کے مضحکہ آمیز تقویٰ کی۔ آج جواں، جانب کی نظر "امتزاج فی الکلام کا ملیح فی الطعام" پر پڑی تو جی بھر آیا کہ جاسے کچھ ہو تم بھی کسی پرانی نانگہ کی قبر کے دو چار ڈھیلے ملاجی کی نظر کر کے اس مردار کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔ واللہ اس ذکر سے تو آپ کا بھی ہاتھ بھر کا نفس مردہ جی اٹھا ہوگا۔ خیر یہ تو دل لگی تھی۔ اب ظرافت کی تجہیز ہاتھ سے رکھ کر یاروں کا پھڑکتا ہوا "دل لگا" سنئے:۔

بہت سے بھڑوے پنچ جن کو پولیٹکل اور شوشل خبروں کا ویران گنج کہنا چاہئے اس مثل کے مصداق ہو رہے ہیں۔ گھر میں دھولکی نہیں اور نام نوبت رائے۔ قورمہ لاہور بڑا شہر۔ یہ پنچ کیسے جن میں پیٹ پیٹے ظرافت کا تو ذکر ہی کیا خبروں کا انتخاب بھی بھوسڑ کے بالوں کی طرح سراسر الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم چلا کر کہتے ہیں کہ وہ مہربانی فرما کر یا تو پنچ کے نام کو استعفا دیدیں یا اپنے ویران کانوں کو دلفریب ظرافت سے پر خانہ بنائیں۔

5- جو شکل نظر آئے تصویر نظر آئے

معجز پنچوں کو مضمون کا ہیڈنگ تک لکھنا نہیں آتا۔ اعلیٰ نامہ نگاروں کو بھونڈے الفاظ کیسا تھ پکار بیٹھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ پنچ کے نامہ نگار ایک آزادہ خو، نازک مزاج، بے چین طبیعت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو چلبلے چانٹوں کا خطاب دینا گویا ان کی پیاری وقعت کو بٹہ لگانا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ایسے دل شکن الفاظ سے اپنے چلبلے قلم کو روکیں گے 8

ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

بعض بھائے یار نئے شوقین نامہ نگار زندہ دل مگر سے فاضل بوٹن لگا کر شہیدوں میں ملنے والے اپنے خیالات کی کند چھری سے مضمون ظرافت ناگوا کاٹتے ہیں اور نتیجہ سے خالی بے سود مضامین مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتے والے الفاظ جو انکیں ظرافت کی حد سے گزر کر پھکڑ کے بازار میں لے چڑھے کہ یہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ نام آوری کے شوق میں بے سوچے کچھ دھر گھسیٹتے ہیں۔ ناجائی اپنی ظرافت سے گورنمنٹ کو ہنسا کر قوم کی اصلاح۔ ٹیک کی بہبودی کی درخواست کرو اور نوعمر آزاد طبع دیسی بھائیوں کو دل لگی دل لگی میں بُرے کاموں کا بدنتیجہ دکھا کر اچھی باتوں کا شوق دلاؤ اور اپنے ظریفانہ دلفریب لٹریچر سے اس طرح دل رال کر راہ پر لاؤ ؎

جو مجھ سے گریزاں تھا مل اس کو میں گھر اپنے
باتوں میں لگا یا تقدیر اسے کہتے ہیں

بعض نہ جان بڑی دم کے انسان بن کی گھٹیا طبیعت کند ذہن جدت کے پاس ایجاد کے قریب کبھی خواب میں پھٹکنے نہیں پاتی یا دوں کے پرانے مضامین لکھے بچے ہیڈنگ لوٹ پھیر الٹ پلٹ کر اپنے نام سے اسی طرز سے اخباروں میں لکھ مارتے ہیں کہ ہم بھی پانچویں سواروں میں مل کر شور غل نگاروں میں داخل ہو جائیں۔ آئندہ اپنی کم ہمتی کا صدقہ یا دوں کے حال پر رحم فرمائیں اور یہ سمجھ لیں ؎

جھوٹی جتا ئے جو کوئی دے بہار کیا

راقم

انکو کیا جو دل نے کسی کی نگاہ کا
سینہ میں ایک شور اٹھا واہ واہ کا

دکن پنچ

ہندی اور مغربی ناٹکوں کی امتیازی خصوصیات

ڈاکٹر ایچ جگناتھ پرشاد۔ ایچ۔ ایم۔ بی
(وکیل ہائی کورٹ و ایڈیٹر دکن پنچ حیدرآباد دکن)

عموماً ہندو ناٹکوں میں کچھ حصہ نثر اور کچھ حصہ نظم کا ہوتا ہے اور سنسکرت و پراکرت زبانیں مخلوط ہوتی ہیں۔ ہندو ناٹکوں کی زبان بھی بہت شستہ ہوتی ہے۔

خاص طور پر قابل ذکر بات اور امتیازی خصوصیت یہ ہیں کہ ان میں زنا کاری کا جو یورپی ناٹکوں کا ماسٹر پیس ہے۔ شاذ و نادر ہی ذکر ہوتا ہے بعض ناٹکوں میں حسن و عشق کی رنگینیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن عشق کا نتیجہ لازمی طور پر باکیزانہ ہوتا ہے دوسرے کی بیوی سے تعلق پیدا کرنا اس زمانہ میں بہت بڑا پاپ اور اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔

یورپی ڈراموں کی طرح ہمارے ناٹکوں میں بھی طوائف کا عنصر موجود ہے۔ لیکن ہندی طوائف میں وہ عریانی نہیں ہوتی جو یورپی طوائف کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے سوا اس وقت ہندوؤں میں طوائف وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے یونان میں ہیٹرا اور اپنی اعلےٰ تعلیم و قابلیت کے لحاظ سے ان کا درجہ یورپی طوائف سے بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ تفریحی دل بستگیوں کے علاوہ یہ بہت اطمینان کی بھی سردار تھیں۔

ہندو ناٹکوں میں البتہ واقعات خرق عادت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خود دیوتا اور دیویاں ان میں شریک ہوتی ہیں اور جب کسی محل وقوع پر کوئی مصیبت اور مشکل آپڑتی ہے تو دیوتا ہی ان مشکلات کو آسان کرتے ہیں۔

اختصار کے لحاظ سے بھی ہندو ناٹک کسی طرح کم نہیں ہیں ان میں کلیات کی طرف زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جزئیات پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اگرچہ بعض محققین کی رائے ہے کہ ہندو ناٹک یونانی سے ماخوذ ہے۔ لیکن واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

ہندوؤں میں ایکٹروں کا درجہ اس وقت بہت اونچا سمجھا جاتا تھا اور ایکٹ بھی نہایت مہذب طریقہ پر کیا جاتا تھا۔ ناٹک کے مصنفین تو نہایت ہی بلند پایہ اور بلند خیال ہوا کرتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات بادشاہ خود ڈرامے لکھتے تھے چنانچہ مٹک کے گارڈی کا سنسکرت ڈراموں میں ایک بہترین ڈرامہ ہے۔ اس کا مصنف شودرک نگدہ کا بادشاہ ہے۔

یوں تو ہندو ناٹکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان کی فہرست بھی مرتب کرنا مشکل امر ہے ہم صرف بعض مشہور و معروف ناٹکوں پر

انکشاف کرتے ہیں۔

کالیداس کے ڈراموں میں شکنتلا دوشنت کمار و سنبھو و کبیر الحدشی شکنتلا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان سب میں شکنتلا زیادہ تر شہرہ و مقبول ہے۔ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا ہے۔ خود فرانسیسی میں کئی تراجم موجود ہیں۔ اس ناٹک نے یورپ میں عام مقبولیت حاصل کی۔ گیوٹے اور نامور جرمن جیسے قابل ڈرامانسٹ نے اس پر رشک عشق کیا۔ اس ناٹک کے بند و مصنفین کے اوصاف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس میں سادگی ہے اور دوسرے مغربی ناٹکوں کی طرح اس میں مبالغہ آمیزیاں نہیں ہیں۔ طرز بیان دلکش اور کہانی دلچسپ و دل کو لگنے والی ہے۔

اس کے بعد پراکرت ناٹکوں میں ابھیجنان شکنتل من بھنتہ ساوتری۔ سیتہ وتی۔ دیوایانا۔ اشویا پربلاد۔ مالوگنی مترہ۔ رامدا اس وغیرہ وغیرہ سب ناٹک ایسے ہیں کہ جو اخلاق عفت و وفاداری اور فرمانبرداری کے احساسات و جذبات سے سرا پا لبریز ہیں آج کل کے بعد و یورپی ناٹکوں کی طرح اس میں عشق یا ترغیب خلاق باتوں کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ جو کوئی بھی انسان خواہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، ان ناٹکوں کے دیکھنے سے ایک گونہ اخلاقی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ بر خلاف اس کے یوروپی ناٹکوں اور سینماؤں کے دیکھنے سے آجکل ہمارے ملک کے نوجوان، عورتوں اور مردوں کے عادات اور اطوار پر جیسا کچھ ناگفتہ بہ اثر پڑ رہا ہے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

اگرچہ ڈرامہ کے فن میں یورپ نے قابل قدر اضافہ کیا ہے اور حسیات و نفسیات کی دلچسپ ترجمانی کی ہے۔ لیکن حسن و محبت کو اس قدر نازیبا پیرایہ میں ظاہر کیا ہے کہ بجائے کسی مفید درس عمل کے مطالعہ کرنے والی نگاہوں اور مشاہدہ کرنے والے دماغوں کو شہوانی جذبات کے چٹخارے پہنچانے ہیں جن کے اثرات سے نوجوانوں کا محفوظ رہنا محالات سے ہے۔ لیکن ہندی ڈراموں میں حسن و عشق کی تفسیر ضرور کی گئی ہے مگر ایسے مہذب پیرایہ میں کہ حظ نفس کے بعد حصول خودداری اور تحفظ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بعض ہندو ڈراموں میں مشکل کے وقت غیبی امدادات تو قوتوں یعنی دیوتاؤں وغیرہ کی جبراً وقت امداد دکھائی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اس کو مبالغہ خیال کریں لیکن اس کو مبالغہ خیال کرنے کے بعد بھی خدا ترسی اور ہمدردی انسانی کا سبق ضرور ملتا ہے۔

یہاں ہم نے ان چند ہندو ناٹکوں کے نام صرف بطور نمونہ پیش کئے ہیں اور اگر ہم اپنی ناٹکوں کی تفصیل بتلانا چاہیں تو ہر ایک ناٹک کی جزئی تفصیل بھی ایک دفتر ہو جائے گی اس لئے ہم بخوف طوالت صرف اجمالی تشریح پر ہی اکتفا کرتے ہوئے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

کچھ اودھ پنچ کے بارے میں

پنڈت برج نرائن چکبست

ہندوستان کے جس جس گوشہ میں اُردو زبان کا نغمہ سُنائی دیتا ہے وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان اودھ پنچ کے ذکر خیر سے آشنا نہ ہوں۔ اودھ پنچ نے تیس چھتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے بدولت اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اُس کی پُرانی جلدوں کے گرد غریباں میں اکثر ایسے اہلِ کمال دفن ہیں جن کے قلم کی دھمک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔

جس وقت اودھ پنچ نے دنیا میں جنم لیا اس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں پہلے پہل سرکاری جانب سے ہندوستان کی بے زبان رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نے زبان اور ظرافت کے چہرہ سے نقاب اٹھائی۔ اس چالیس سال کے عرصہ میں اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے مثلاً لاہور میں اخبار عام اور کوہ نور کا دور تھا یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے۔ دہلی میں اشرف الاخبار کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ سے جاری تھا کشف الاخبار بمبئی اور جریدہ روزگار مدراس میں اردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ کارنامہ اور اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ کارنامہ کا کام تمام ہو گیا[1] اودھ اخبار ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوئے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی جب تھا۔ ان کے علاوہ اودھ پنچ کی اشاعت کے قبل بہت سے اردو اخبار اپنی پیدائش اور موت کی منزلیں طے کر چکے تھے مگر قابلِ غور یہ بات ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ بجز لارنس گزٹ کے جو پیرائے سے شائع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی عام طور سے ان اخباروں کا نہ کوئی خاص پولٹیکل یا سوشل مسلک تھا نہ کسی مستقل دستور العمل کے پابند تھے۔ اُردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اودھ پنچ اور ہندوستانی پہلے دو اخبار ہیں جنھوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ ہندوستانی کا اودھ پنچ کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولٹیکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا اس نے اخبار کو بھی اپنی ذات کی طرح پولٹیکل خدمت کے لیے

---

[1] ان اخباروں کے اکثر حالات منشی بال مکند گپتا مرحوم کے اُردو اخباروں کے تذکرہ سے اخذ کیے گئے ہیں جو بھارت متر اور زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

وقعت کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا مگر پولیٹکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل سوشل اور پولیٹکل مسلک تھا۔ اس صوبہ میں ہندوستانی کانگرس کا چراغ جلا جاتا ہے مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہاں اودھ پنچ کی بجلی چمک پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی زد سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہنچا۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً اٹین پنچ، بمبئی پنچ، بانکے پوپ وغیرہ اس کی تقلید میں نکلے مگر وہ دنیا کی نظروں میں کھٹک کر ہی کم از کم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اردو زبان پر عرصہ تک چلتا رہا اور اس طوفانی زمانہ میں جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور میں آئیں ان پر نظر ڈالنے سے اردو ظریفی کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی۔ محکمہ قوسین کے مناقی سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و مسخرہ میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو زبان کے حاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے۔ اردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش نعرے ہیں محض روزمرہ کی باتیں ہیں مگر طبیعت کی شوخی متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور میا ختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے۔ ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر ..... جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر ہنستے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ تحور بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجۂ اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے معنا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاق سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں۔ ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابل معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اس زمانہ کی ہوا کھائے ہوئے تھے جب مذاق و بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا، اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے اور یہی دنیا کا دستور ہے۔ لیکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج بھدا سمجھتے ہیں وہ آئندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سولہویں کاغذی پھولوں کے گچھے نہ تھا ایسے پھولوں سے آراستہ کیا جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ سے پہلے رجب علی سرور کے طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع و بناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اس زمانے میں جو اردو اخبار جاری تھے ان کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف سرشار

احمد علی صاحب شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، بابو جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کمنڈوی، حضرت اکبر سمیت بہت سے اکبریا گ کے نام ہیں۔ ان لوگوں کے نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرز نو کے موجد ہی نہیں ہیں، بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں۔ ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ نثر کے نامور نگاروں میں طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور نیز زبان کی چستگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورہ کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلہ میں چوکھا ہے۔ احمد علی صاحب شوق کے مضامین میں ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و محاورہ تحقیقات کا خاص لطف ہے۔ حضرت کمنڈوی مرحوم کی عبارت خاص طور سے دلکش ہے۔ نگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے۔ ہجر کا رنگ خاص یہ ہے کہ ان کی ظرافت بمقابلہ اوروں کے بدمذاقی اور طعن و تشنیع کے کانٹوں سے زیادہ پاک ہے۔ برق کی عبارت میں ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے مگر زبان نہایت صاف اور ستھری ہے۔ آزاد کا قلم نواب زادوں کی بے فکری، عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں مشاق ہے۔ منشی سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے۔ مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور لطیفوں کے ذخیرے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے گفتگو کر رہا ہے۔ عبارت اکثر مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعاروں سے گرانبار نظر آتی ہے مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کا جی اچاٹ نہیں ہوتا۔ ظریفانہ نظم کے میدان میں حضرت اکبر سب سے دس قدم آگے ہیں۔ طبیعت کی خداداد شوخی اکثر زبان کی صفائی سے بازی لے جاتی ہے مگر عموماً سوشل پرابلم اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبر نے نظم کیے ہیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ ان کا سیاہ ظرافت بھی اوروں کے مقابلہ میں لطیف تر ہے۔

اودھ پنچ کی محفل انہی پُرمذاق اور فوراً طبیعتوں سے آراستہ تھی اور اب بھی اگر کوئی شخص اُردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے لنڈوروں کی زیارت اس کے لیے ضروری ہے۔ اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا، دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پُرمذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم، چہلم، عید، شب برات، ہولی، دیوالی، بسنت کے جلسے، میر بانچ کے لطیفے، رقص و سرود کی محفلیں، مشاعرے، عدالت کی روبکاریاں، مرغ بازی، بٹیربازی کے جنگامے، انگلش کے معرکے ایسے مشغلے تھے جو ہفتہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کی طبیعتوں کے لیے تازیانہ کا کام دیتے تھے۔ سانی نامے، بہتر بارہ ماسے، دوہے، لٹھر بیان، غزلیں، رباعیاں وغیرہ نظم کرنے میں اس کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون لوکل علیہ الرحمۃ کے عنوان سے لکھتے تھے جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔

زندہ دلی کی یہ تمام تصویریں اودھ پنچ کے بوسیدہ مرقع میں موجود ہیں۔ گلدستہ پنچ کی دو جلدوں میں ان کا پورا نقشہ آ جانا اتنا ہی مشکل ہے جیسے کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا مگر زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے جو کچھ ہو سکا اسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور لطیفوں کے علاوہ اودھ پنچ میں شاعری اور مصنوعی زبان کے متعلق اکثر ایسے زبردست ٹکڑے چھپے جو مہینوں اور سالوں تک قائم رہے اور جن کی وجہ سے اُردو دان سوسائٹی میں عرصہ تک چہل پہل قائم رہی۔

پہلے مرقع کا تعلق فسانۂ آزاد سے ہے۔ سرشار مرحوم ابتدا میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے اور اس کے گہوارہ کے عہد پیشتر والوں میں تھے۔ جس رنگ کا اودھ پنچ عاشق تھا اسی رنگ میں وہ بھی ڈوبے ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمانہ کے جس انقلاب نے دنیا کو اودھ پنچ کی صورت دکھائی اسی نے سرشار کی طبیعت کو بھی پیدا کیا۔

اودھ پنچ کے ایک سال بعد فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے سرشار نے یہ سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا ورنہ فسانۂ آزاد کا دربار بھی اودھ پنچ ہی کے چشمہ سے جاری ہوتا کیونکہ دونوں کا مذاق تحریر یکساں ہے اور دونوں ایک ہی باغ کے دو پھول معلوم ہوتے ہیں مگر اودھ پنچ نے اودھ اخبار کو نیا اخبار کا خطاب دے رکھا تھا اور اس کے حال پر اودھ پنچ کے ظریفوں کی خاص عنایت تھی۔ جب سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے تو کچھ دن تک تو ذاتی مراسم کا پردہ قائم رہا لیکن رفتہ رفتہ طرفین سے طبیعتیں بے قابو ہونی گئیں اور آخر کار فسانۂ آزاد پر اعتراضات شائع ہونے لگے۔ اودھ پنچ کا فسانۂ آزاد پر خاص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگمات کی زبان اس میں لکھی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں ہے بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے۔ اس قسم کے اعتراضات کے وہ ٹکڑے جو عرصہ تک اودھ پنچ کے بادلوں سے برسا کیے اور ظرافت کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ ان اعتراضات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ضرور درست ہیں مگر زیادہ تر طباعی پر مبنی ہیں۔

اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمہ میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ جب یہ مقدمہ شائع ہوا تو اس بحث نے اودھ پنچ کی بارود کے لیے چنگاری کا کام کیا۔ اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور خطابی شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔

اختلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی تھیں ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا تھا جس کا لازمی منشا اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعراء کی توہین ہو۔ ان خیالات کا دلوں میں اثر تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ بھی مدت تک جاری رہا۔ جس عنوان سے اودھ پنچ کے شہسواروں نے پانی پت[1] کے میدان میں طرارے بھرے ہیں وہ بعض صورتوں میں قابل اعتراض ضرور ہے مگر نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہ تھی۔

تیسرے ہنگامہ کی رو نیں داغ کی شاعری سے ہے۔ اودھ پنچ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی اس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اودھ پنچ کے ظریفوں کے دل میں لکھنؤ اور دہلی کی قدیم رقابت کا زخم

---

[1] اودھ پنچ میں کلام حالی پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اس کے عنوان میں مندرجۂ ذیل شعر حالی کے وطن کی مناسبت سے لکھا جاتا تھا۔

ابتر ہوا ہے گلوں سے حالی کا حال ہے　　میداں پانی پت کی طرح پائمال ہے　　(مؤلف)

ہرا تھا اور دوسرے جانب داغ کے شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بد مذاقی کا خمیازہ غریب استاد کو اٹھانا پڑا اور ادھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصہ تک اڑا کیں جن کا رُخ داغ کی شاعری کے علاوہ اس کے سب نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنؤ کے مشہور فسانہ نویس مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شائع کیے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے نسیم کا نام محض فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان اور محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارہ کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آگئیں اور اودھ پنچ کی بجھتی ہوئی آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہنچی۔ گلزار نسیم کا قصہ تو درکنار رہا مولانا شرر کی زبان دانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے اور عرصہ تک نظم و نثر کی پھلجھڑیاں چھٹتی رہیں۔ یہ سلسلہ بھی سال بھر بعد ختم ہوا۔ اس بحث کے غیر لطیف حصہ کے علاوہ نفس مضمون کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں اکثر زبان و محاورہ کی تحقیقات کا خاص لطف موجود ہے۔ ان مباحثوں کے علاوہ اکثر دوسرے اخباروں سے بھی اودھ پنچ کی نوک جھونک ہوتی رہی۔ ان میں اودھ اخبار اور طوطی ہند پر اس کی خاص توجہ رہی۔ زبان و شاعری کی اصلاح کے علاوہ اودھ پنچ کی پولیٹیکل خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ اودھ پنچ ابتدا سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگریس کے پہلے جو پولیٹیکل معرکہ آرائیاں پیش آئیں ان میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ الحاق اودھ انکم ٹیکس، البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر ایسے مضامین لکھے جن کا آج شائع کرنا موجودہ قوانین کے جکڑ بند کو دیکھتے ہوئے مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس نے مالیان ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ ان کی غفلت و عیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی قومی محبت کے وسیع دائرہ میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں کی آمد کی خوشی میں اودھ پنچ عید اور شب برات کے استقبال سے کم سرگرمی نہیں ظاہر کرتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانہ میں اس کا پرچہ سُرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا تھا اور رنگین مزاج مارنگاروں کے ساقی نامہ اور ترانے وغیرہ ہفتوں تک چھپا کرتے تھے۔ اودھ پنچ ہندو مسلمانوں کے قومی اتفاق کا ہمیشہ سے معین تھا اور اگر دونوں قوموں میں کوئی نزاعی امر پیش ہوتا تھا تو اسے ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس چونکہ قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہٰذا یہ بھی اس پولیٹیکل تحریک کا دل و جان سے مددگار تھا۔ اس صوبہ میں منشی سجاد حسین مرحوم کانگریس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دھکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قائم رہے۔ ابتدا میں جب سرسید مرحوم نے اپنی زبان و قلم کے جادو سے اہل اسلام کا دل کانگرس کی طرف سے پھیر دیا تھا اس وقت سوائے اودھ پنچ کے کوئی اسلامی اخبار ایسا نہ تھا جو علیگڈھ کے پولیٹیکل پیمبر کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔ ۱۸۸۸ء میں جب مسٹر آکلنڈ کالون سرسید مرحوم اور مفت کے گنہگار راجہ شیو پرشاد کانگرس کا طبقہ الٹنے کی فکر میں تھے،

اس وقت ہندوستانی کے نمائندہ اور پنڈت جودھیا ناتھ ہرجوم کی رسوا دھار تقریروں کے علاوہ اودھ پنچ کی شمشیر برہنہ اس قومی تحریک کی تائید میں اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں جب کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا تو شہر کے چند سن رسیدہ بزرگوں نے اس کی مخالفت کا غلغلہ بلند کیا۔ اس مخالفت کی تہ میں ہندوستانی اور اینگلو انڈین سوسائٹی میں پندونصائح کے دفتر کھل گئے لیکن ان واعظانہ فہمائشوں کے مقابلہ میں وہ مضمون زیادہ کارگر ہوا جو اودھ پنچ میں "انڈے سے نکلے والی چیل چلا ماڑ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اکثر مزاح ایسے ہوتے ہیں جو بحث و منطق کے کڑوے گھونٹ نہیں قبول کرتے لیکن مگر ظرافت کی چاشنی سے راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اس موقع کے پولیٹکل بحث و تحریک میں اس صدمت کا انجام دینے والا اودھ پنچ تھا۔ قومی اور قومی رسم و رواج کی اصلاح کے بارے میں اودھ پنچ کا طریقہ بالکل کی رفتار سے الگ تھا۔ اس نے محض علی گڑھ تحریک یا پولیٹکل ملک کی مخالفت نہیں کی بلکہ سرسید مرحوم کے نورانی دماغ سے جو مذہبی اصلاح کی شعاعیں نکلیں ان پر خاک ڈالنے کی بھی کوشش کی۔ علی گڈھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دے کر اس کے بانی کو "پیر تجر" کا خطاب دیا اور "تجر مذہب" کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا اسی طرح پردہ کی اصلاح اور تعلیم نسواں وغیرہ کے متعلق جو تحریک اہل اسلام میں مغربی تہذیب کے اثر سے پیدا ہوئی تھی اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ پردہ کی رسم کی تائید میں حضرت اکبر کا ذیل کا قطعہ نہاں ہے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اسے پڑھ کر اصلاح پسند لوگ اپنے دانت پیسا کریں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ لطیف ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ میں مشکل سے ملے گا۔ کاش کہ یہ خداداد جوہر اصلاح و رفاہ کی کوشش میں صرف ہوتا۔

اودھ پنچ کی ترقی و ضعف کا راز بہت کچھ اس کے ایڈیٹر کی ذات سے وابستہ ہے۔ منشی سجاد حسین کا مزاج عجب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں بھی کسی نے ان کے چہرہ پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی ہماری کے زمانہ میں اگر کوئی مزاج پوچھتا تھا تو کہتے تھے کہ زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کا حال اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی۔ دوا و علاج سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض اس لیے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ مرنا کہتے تھے اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور رہتے تھے۔ دنیا کے ہر وارد و ما وارد کے پہلو ان کی باہوں میں خود بخود کھنچے لگتے تھے اور ان کی پہلوانی طبیعت کو بلا لحاظ قوم و ملت بیتاب کر دیتے تھے۔ غیر کا ذکر نہیں ان کے دلی دوستوں اور عزیزوں کو اکثر ان کی بذلہ سنجی کا مزا چکھنا پڑا ہے۔ دوستوں کی محبت اور قدرشناسی کی بدولت انھیں ابتدا ہی میں اتنے ذہین اور طباع نامہ نگار مل گئے جو ایک وقت میں شاید کسی دوسرے اخبار کو کم نصیب ہوئے ہوں گے۔ یہ لوگ محض اودھ پنچ کے نامہ نگار نہ تھے بلکہ اس کے جاں نثاروں میں تھے۔ اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے اور کسی دوسرے اخبار میں لکھنا کسر شان سمجھتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد یہ رنگ قائم نہ رہا بقول شاعر ؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس!
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگاروں کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا۔ سنجیدہ ظریف اور

تجربے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا۔ جوانی کی بے فکری دوسرے نامہ نگاروں کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے۔ جو کچھ رہی سہی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس ٹوٹی ہوئی حالت میں بھی اودھ پنچ کا نام چمکتا تھا اور جب کبھی کوئی مضمون اس کے اڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا تو اس کی دھوم ہو جاتی تھی۔ علاوہ اس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوق، نواب سید محمد آزاد اور حضرت اکبر کے نظم و نثر کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی حمیت و غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بند ہوتا ہوا دیکھیں مگر واقف کار جانتے ہیں کہ آخر دس بارہ سال میں اودھ پنچ میں سوائے خسارہ کے کوئی نفع کی مد نہ تھی۔ منشی صاحب موصوف نے ایک خط منشی بالمکند گپتا مرحوم کو لکھا تھا جو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:۔

"مکرمی السلیم

خط پہنچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ رہ ہاتھوں سے اس لیے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ رہ ایک بھروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منہ سے بول سکتا ہوں۔ کچھ نوکر ہمت کر کے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار بستر گور ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ انبار صرف اس لیے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں ع

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو۔ ہاں گذشتہ زمانہ میں کچھ تھا۔"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل اڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ضعیف جسم میں خون کے دس بیس قطرے ضرور تھے مگر گرہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ باوضع اڈیٹر کی باوجود لب گور ہونے کے یہ تمنا ضرور تھی کہ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور وہ ایک پرانے دوستوں کی محبت شریک حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا اڈیٹر نا شکیبا کا محتاج رہ کر دنیا سے سدھارتا۔ غرضیکہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اس وقت اردو زبان میں بہت سے قابل قدر اخبار ہو چکے ہیں مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے اور زمانہ کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہے گی۔ مگر اردو زبان کی تاریخ میں یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدر دانوں کے دلوں سے آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں مگر اس کے تذکرہ سے سخن فہموں کی محفل خالی نہیں ؎

پھر گئے آنکھوں میں مشتاق گذشتہ فرصتیں
دور جام مے میں اکثر کو خمیر جم ہوا

اودھ پنچ

اکبر الہ آبادی

اے گوہر خزینِ ظرافت — وے جوہر معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر — تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت — عنوانِ صحیفۂ بلاغت
خلّاقِ معانیٔ طرب خیز — کشّافِ رموزِ عشرت انگیز
ہادیٔ ادیب و دانش آموز — گوہر افشاں و کوہر اندوز
زینت دہِ شاہدِ تکلم — آئینۂ خندہ و تبسم
سرچشمۂ قول و وعظ و گفتار — گنجینۂ وعظ و پند و اسرار
اے نخبہ وہ زبانِ اردو — وے افسرِ وہ نشانِ اردو
رنگینی میں غیرتِ گلستاں — شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ — محبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ
دن رات یہی ہیں اب تو چرچے — پڑ جاتے ہیں دل کو اس کے پیچے
ہے خلق خدا قتیل اس کی — حاسد کا حسد دلیل اس کی
معقول مزاح ہے تو یہ ہے — شرعاً جو مباح ہے تو یہ ہے
ہر چند کہ رجز بیشتر ہے — گو فقرہ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گھلا ہے — یہ آبِ حیات میں بجھا ہے
وہ شربتِ حفظِ عقل و ایماں — یہ مُردہ دلوں کو ہے رگِ جاں
بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں — نکہت ہے تو ایسی دل لگی میں
ہر کس کہ بدید گفت خوب است — باللہ مفرحِ القلوب است
رندوں کی زباں میں پند و نخوت — سبحان اللہ واہ واہ

اکبر الہ آبادی

ہر چند کہ طرز پنچ لندن
لیکن وہ نقش پا تو لیں ہے

ماشاء اللہ یہ نقش ثانی
وہ پیر معمہ و کہن سال

وہ اک گل صد بہار دیدہ
مولود سعید مرید طبع

لطف شاہد اوہ ہے اس سے
اک نور ہے مہر لکھنؤ کا

وہ سرد برنگ آتش گل
بحث مضمون میں وہ اگر پنچ

واں بازوئے تار ست بنیاد
کیا خامۂ زبان معنی

اٹھنے میں نگاہ چشم جادو
مفتاح خزینۂ التصور

کہنا اسے شمع کب روا ہے
وہ چہرہ نمائے بزم صورت

ہر چند کہ سرمہ در گلو ہے
رعنا و لطیف و شوخ و بیباک

مشاطۂ شاہد معانی
پیچیدگیوں میں حرف زن ہے

آزادی کا فخر اسے اگر ہے
یعنی کہ وہ مطلق العناں ہے

واں طبع کو زور لا تخف ہے
زنجیر خرد کی پائے بندی

تا نظم حسود بد کیش
کوتہ نظران پست فطرت

وہاں شاخ شجر پہ ہے نرانہ

بے شبہ ہے دلپسند و پر فن
نسبت اس سے اسے نہیں ہے

بہتر ہے بصورت و معانی
یہ خیر سے نونہال اقبال

یہ غنچۂ تازہ نو دمیدہ
عیسیٰ دم و گوہر یم طبع

روشن نام اوہ ہے اس سے
اختر ہے سپہر لکھنؤ کا

یہ گرم بیان آہ بلبل!
یہ جل نکات میں ہے سر پنچ

یہاں خامۂ تیزۂ چمن زاد
کیا ذکر زباں کہ جان معنی

چلنے میں حریف تیغ ابرو
نقاش بگیرۂ التصور

اوصاف میں شمع سے سوا ہے
یہ پردہ بر افگن حقیقت

تاہم سر گرم گفتگو ہے
سر گرم و حریف و چست و چالاک

بانی بنائے خوش بیانی
شانہ کش گیسوئے سخن ہے

یہاں فخر اس سے یا وہ تر ہے
بے قید ہر ایک سو رواں ہے

دقت نوجو ہے وہ اس طرف ہے
با قاعدہ شرح دردمندی

ہر گام پہ مشق دام و پیش
سر گرم شرارت و عداوت

یہاں دیدۂ دام آشیانہ

کیونکر نہ ہو اداے اعجاز
کی میرو وہ عالم اک قفس میں
در یا قطرے میں موجزن ہے
ہے نوکِ سناں پہ نقش پرواز
شعلوں کے ہجوم میں سمندر
کیا کثرتِ خار سے خطر ہے
ہندی کا کلب ہے یہاں ناسف
ہے وہ کلامِ وہی تکلی
یوسف سخن ہے
ہیں بہارِ معنی
ہر نقطہ ہے گنجینہ بصیرت
صرصر کے جو رستے ہری ہے
آپ اپنے فروغ کا سبب ہے
وہ مہ فلک سے متصل ہے
در یوزہ گری ہے اس کی اوقات
بن سے آسیب کا ہنا کھٹکا
غالب نہ اثر ہیں اسم اس کا
ہوتے نہ جو رشکِ وہ جبیں
شیشے اک اور بکت خوب
لاتا ہوں دلیلِ شاعرانہ
منہ کے اندر زباں جڑی ہے
بتیس تو ان سخت طبیعت
ہیں مثلِ سفید دیو بیباک
حد سے جو بڑھے زبان گفتار
پہلو میں جو ان کے ہمنشیں ہو
کتنا ہی ہو وہ ملائم و نرم
لوہے کے چنے کہاں سے لائیں

کھولے ہیں قفس میں بال پرواز
پھر دیکھیے تو اسی قفس میں
غنچے میں بہار صد چمن ہے
رقصاں دمِ تیغ پر بصد ناز
امواج میں ماہیِ قوی پر
یاں دوشِ نسیم پر سفر ہے
یوسف نداں میں بھی ہے یوسف
شوکت ہے وہی وہی تعلی
پھیلی ہوئی بوئے پیرہن ہے
ہر نقطہ ہے پردہ دارِ معنی
ہر حرف ہے کاشفِ حقیقت
یہ شاخ خزاں میں بھی ہری ہے
محتاج برنگ ماہ کب ہے
یہاں روشنیِ دماغ و دل ہے
وہاں قطب صفت ثبات دن رات
ان دلبروں نے خوب سر کو پٹکا
ٹوٹا نہ کبھی طلسم اس کا
حسادِ بھی صاد کہتے بالعین
آزادیِ گفتگو ہے مہیب
دیکھیو قدرت کا کارخانہ
دانتوں کے حصار میں پڑی ہے
استادہ ہیں مائلِ افیت
طامع جابر حریص سفاک
دوڑیں اسے کاٹنے یہ خونخوار
وہ نوکِ خلال سے حذر ہیں ہو
دانا پستا ہے ان میں آکر
سختی کا انھیں مزا چکھائیں

اس قید میں جبکہ یہ زباں ہے
آزادیٔ گفتگو کہاں ہے

بار یک ہے نکتہ اے دل
لازم ہے سمجھ لیں اس سے عاقل

مرضی تھی خدا کے جسم و جاں کی
محدود ہوں شوخیاں زباں کی

دل میں جو آئے بک نہ جاؤ
ہشیار چلو بہک نہ جاؤ

دریا ہے خیال موجزن ہے
وقف بزدان و اہرمن ہے

ہے شارع عام حق و باطل
ناظر اس کی ہے فکر عاقل

گذرے جو خیال بد بلا کد
باز آئے خود سے بس کرو رد

باطل پہ نہ جاؤ حق کو سمجھ لو
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو

خاموش بس اے زبان خامہ
منظور نظر ہے شرم نامہ

ہر چند یہ عالم سخن ہے
یہاں فیض ازل نہ یا فگن ہے

ہر گوشے میں وسعت فلک ہے
ہر ذرے میں مہر کی چمک ہے

ہر گام پہ ہیں چمن ہزاروں
اک ایک میں گل سخن ہزاروں

ہر برگ گل سخن میں سو رنگ
ہر رنگ میں لاکھ لاکھ نیرنگ

نیرنگ ایسے کہ عقل حیراں
حیرت ایسی کہ نور عرفاں!

ہر سمت ہزار میکدے ہیں
ہر ایک میں لاکھ خم بھرے ہیں!

ہر خم میں شراب ارغوانی
یعنی رنگینیٔ معانی!

یک قطرہ سے طبع ہو جو ممتاز
سینہ بن جائے مخزن راز

وہ راز کہ دل ہو محو مستی
مائل ہو سوئے سخن پرستی!

ہو طول جو سلسلہ سخن کا
ہمسر ہو زلف پرشکن کا

پر طول بیاں سے فائدہ کیا
اس صرف زباں سے فائدہ کیا

بس بس اب روک لے زباں کو
کافی ہے اشارہ نکتہ داں کو

ہو کر آمادہ جان و دل سے
زمزمہ دعا زبان و دل سے

جب تک ہے رباعی عنصر
تحقیق نقش لوح خاطر

جب تک کہ یہ نظم ہیئت ہستی
موزوں ہے برائے خود پرستی

جب تک ہے مسدس جواب
برہان مشارق و مغارب

جب تک کہ ہے مربع کا طبیعہ
انفاس کا ہر نفس وظیفہ

یہ پرچۂ دلفریب و زیبا
ہو مونس جان تا شکیبا

ہر رنگ میں انتخاب نکلے — ہر جا سے میں لاجواب نکلے
ہو سوز دل و یگانہ و غیر — بن جائے چراغ کعبہ و دیر
جب تک کہ اثر ہے کاف و نوں کا — مفتوں ہو ہر ایک اس فسوں کا
پروانہ اسے چراغ سمجھے — بلبل دیکھے تو باغ سمجھے
خورشید کا نور میں ظرف ہو — ذرّوں کی کشش اسی طرف ہو
اے حافظ و خیالی اودھ پنچ — خوشحال رہیں عاشق اودھ پنچ
اپنی اپنی مراد پائیں — دیکھیں جب دل کو شاد پائیں
ہر مشتری بلند فطرت — پائے دور قمر میں رفعت
محتاج ہو سیم کا نہ زر کا — مورد ہو بلندیٔ نظر کا
احباب جو اس کے ہیں معاون — عالی منشان نیک باطن
ظرّاف و مصنف لطائف — طبّاع و مصوّر کو الف
سرسبز ہوں گلشن جہاں میں — خرّم پھریں باغ و بوستاں میں
لگیں طبعی سے گل کھلانے — چشمہ بدبیں کو خون رلائیں
پیدا ہوں وہ گوہر مضامین — دریائے ہو لب پہ شور تحسیں

بے ساختہ بول اٹھیں سخن ور
اللہ ری طبع و فکر اکبر

(اودھ پنچ ۱۴ مئی ۱۸۷۸ء)

اودھ پنچ کا ایک شمارہ

(جنوری ۱۸۷۸ء)

۱۸۷۷

یہ پرچہ ۱۸۷۷ء میں نکلا تھا۔ صفحہ ۲۶۵ سے لیکر صفحہ ۲۸۰ تک
اس کا ایک پورا شمارہ (ٹائیٹل سمیت) حرف بہ حرف پیش کیا جا رہا ہے
اقتباسات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ معلوم کر سکیں کہ پرچہ حیثیت
مجموعی کیسا تھا۔ اسی لئے ایک پورا شمارہ من و عن پیش کیا جا رہا ہے
پرچے کا سائز ۱۲" × ۹½"، سطریں ۳۵، کالم تین اور صفحے
آٹھ ہوتے تھے۔

اشتہار

ادارہ ہذا ہر ہفتہ کو شائع ہوتا ہے۔ ۲۔ خطوط مضامین وغیرہ ہمارے ہفتہ وار کے ساتھ کی تعداد سے بڑھائی جائے گی۔ ۳۔ اطلاع ترقی ایک ہفتہ قبل اخبار میں دی جائے گی۔ ۴۔ مہینہ وار کا ۱۵ اپریل ۱۹۳۷ء کو شائع ہوگا۔ ۵۔ مضمون بھیجنے کا پتہ ۔ ۔ ۔

مضامین سالِ نو مرسلۂ مضمون نگاران

یکے ہمی رود و دیگرے ہمی آید

اے لو صاحب میاں ۱۳۷۷ھ بھی سوتے جمعہ نمٹ گیا۔ سال بھر خوب کوڑے کیے، قمیں گانٹھیں، گلے کاٹے، بارہ مہینے کے اندر اندر کھوا سے سینکڑوں کو پھنسے دیکھا لئے، نگاہوں کے کاؤں صاف کر دیے، شہر کے شہر بنا کر دیے، کبھی بولا، بوند بھر پانی کو ترسایا، کہیں قحط کی آگ لگے کسی کا گھر بار جلایا، کسی کو قرضدار کیا، کسی کو فاقہ بندھوا دی، کسی کو خطاب دلوا دیا، کسی کی خشک مفرد کرائی، کسی کو مٹی کا فراب بنایا، کبھی دق کو روفی دی کبھی کھرے کو۔ روم و روس میں خدا چلوا دی، سرحد پر اک محشر فتن کرا دی اور پھر جہاں کے تیکنا ملکہ سب کھرے رہے۔

اٹھارہ سو چھبیس بھائیوں میں سب سے نمبر اول۔ جتنے سنہ گئے ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، نہ نام لیوا نہ پانی دیوا۔ سنہ آں، والا، نا شاد و نامراد۔ یہ نہ سلامتی سے بیسیوں یادگار بھی ایسے چھوڑ گئے کہ باید و شاید۔ حساب قیصر ہند الحاج اورنگ روم و روس، موضع کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے۔ اب ان کے بھائی صاحب سنہ اٹھارہ سو اٹھہتر عیسوی کی آمد آمد ہے۔ ان کا وزن بھی دیکھتا ہے کس پلہ پر جاتے ہیں۔ ہم لوگوں سے کچھ پتہ تو دیتا ہے۔

سنہ ۔ ل

زباں گھس گئی اپنی دن گنتے گنتے — بڑی آہ دکھلائی حضرت سلامت
بھلے کو حضور اب بھی تشریف لاتے — مبارک مبارک سلامت سلامت

السلام علیک یا سنۃ الثمانیۃ و ثمنین یا مرحبا لکم یا ایہا الاثمنی الذین۔ پیر مقدم ؎

روانی منظر چشم من آشیانہ تست — کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

دل مسند تست و دیدہ فرش۔ خوش آمدی، صفا آوردی ؎

آنکھ بلیوں سے چل کے نہ تو نے دکھلیے — مرشد کہا تھا آیئے تشریف لایئے

آ ا ا ا ا ا ا۔ آیئے آیئے، قدم رنجہ فرمایئے بڑی راہ دکھلائی، بعد مدت سواری آئی۔ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں، ہانسوں میں کنوئیں اور کرتل میں پانس ڈال دیئے۔ بارے بڑی مشکلوں سے خدا خدا کر کے جب اللہ پیر مناسے تب جمال باکمال نظر آیا اور قدم مبارک دیکھنے میں آئے۔ پناہ تیری، ہر لحظہ خیر، براہ اور ہر ساعت دروازے پر نگاہ تھی۔ دن گنتے گنتے گھڑیاں شمار کرتے تھے۔ سینکڑوں جگہ فالیں کھلوائیں، ہزاروں گردنا لے لکھوائے، درگاہ میں چوکی بھری، امام باڑہ میں چہل قمری کی، مسجدوں میں چرخ جلوائے، گرجوں میں گھنٹے بجائے، مندروں شوالوں میں نک گھسنی کی۔ سری ٹیک کو گرے، بھیاں بھوائی میں لے کر مارتے پھرے۔ اب اللہ میاں کے طفیل، رحم مولا مشکل کشا کا، کھڑا دونا، حضرت عباس کی حاضری پر بیڑا کے کونڈے، سید احمد کبیر کی کاسے، شیخ سدو کا بکرا، پیر پٹھیلے کا مرغا، شاہ عبدالحق کا توشہ، بی تربت پھرت کی پوڑیا، کشتی کی صفنگ، بی آسا کا سہ سرد کا حلیدا، دریا ڈوبری کا طبق، خواجہ خضر کا بیڑا، آذین قبیل اور بھی وغیرہ وغیرہ منتیں مرادیں مانیں کہ خدا نے یہ گھڑی دکھلائی، سنہ مانگی مراد پائی۔ لیجیے تا شے سر فے۔ تترا تترا تجیم تجیم، تترا تترا تجیم تجیم، نوبت خانے بھنگا، جھنگا، ڈوبنگ ڈوبنگ، ادھر نربدا فرنا، دھنو تو دھنو تو، ساتھوں ساتھ انگریزی باجے والے، پل پل پیا کو جائے ری۔ نندیا تا تا ری ری ری ری رم تا ری ری ری ری ری

رقعہاں تہنیتیں، بھائی بھگینتا کا نوٹ: لال ایک سال مل کر بڑے اونچے سُروں میں مبارکباد ۔

دھوم سے آیا ہے ساون مبارک باشد ۔ خوش ہیں سب بہنے کے کنگال مبارک باشد
ہو گئے چھ ماہ کے لفظ سوا کے اجو رہوئے ۔ بڈیوں پر ہے فقط کھال مبارک باشد
سن سنہ کی بدولت ہوئی پہنہ یا گنجی ۔ پھر نئے سر سے تجھے بال مبارک باشد
پانی سب ناخنِ علی سلطنتِ شتری کی طرح ۔ جیتے برسے ہی اوڑا کال مبارک باشد
کچھ غضب سے ہیں سمدھیانے دھڑا دھڑ بنیے ۔ اپنے منہ نوچیں گے لعنان مبارک باشد
نئے والا لوئی بڑا سے تو چیا جائے ۔ خوب مجلسوں میں بیٹھے رال مبارک باشد
سال بھر رنج اٹھائے ہیں الٰہی توبہ ۔ اب تو غارت ہوا چنڈال مبارک باشد
پانچ سیر دودھ پلا چاہے مارے ۔ منہ بہسہ شکل کیسا لال مبارک باشد

خیر یہ بات وہ بات، گذشتہ صلوات آئندہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تسلیم تسلیم۔ کہیے مزاج بہارک، مزاج شریف، مزاج مقدس بہت مزاج اچھا۔ الحمد للہ۔ آپ کی عنایت، نوازش، مہربانی۔ وغیرہ کرتا ہوں۔ سب طرح تیز ہے۔ اپنے مزاج کی کیفیت بیان فرمائیے شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے لیکن مہوری در بہ کو جو در ہے فضیت ہے۔ آپ کا سر بجائے قدموں کے تھوٹ کہوں کو کسی اور کی آنکھیں پھوٹیں آپ کو زندہ دیکھنا چاہا آنکھیں پھوٹیں۔ اس کی امید بھی کسی حلال خور کو ہوگی، ان کو تارے نظر آتے تھے۔ اے ہے پھر خیال آگیا، لحول ولا قوۃ سات قرآن درمیان۔ نادعلیا مظہر العجائب۔۔۔ الخ۔۔۔ ہاتھ لائیے۔ کہیے تصور سے کلیجے میں پنکھے لگ گئے۔ دل ہے یا گھنٹہ گھڑی۔ اے نوج جو دیا میں آنکھ پھڑکنے لگی۔ نیا ساں آخر ہے کیا، کچھ فرمائیے۔ توبہ ذکر کس کا ہے اور آپ اس قدر ڈرے ہوئے کیوں ہیں، ان کا نام تو لیجیے، وہ ایسے کون حضرت ہیں۔ ارے رے رے۔ خدا بچائے۔ اس نشانے کا نام کریں لے۔ سات سمندر پار اس کا منہ کالا ہی رہے۔ لی نعوذ باللہ من ہا۔۔۔ الخ۔۔۔ پھر وہی بندہ نواز نام تو لیجیے۔ نہیں نہیں صاحب معاف کیجیے۔ میں تو ہزار برس تک نام نہ لوں گا چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ اچھا اشارے کنایے میں کسی نہ کسی طرح کہیے تو سہی۔ اچھا سمجھ جائیے۔ ع مرغ مرغ۔ اب اور آفت میں جان پڑی۔ بقول شخصے ؎

شامت کی ماران سے کیا خیر کا گلہ ۔ انداز گفتگو نہیں تیور بدل گئے

آنکھ اٹھا کے جو دیکھا تو ایک ہورٹ سراپا ناک ہی ناک سیدا۔ نہایت رنجیدہ چہیں برجبیں آئیں غیر باشد۔ آپ ناخوش ہوئے۔ جی نہیں میں کیوں خفا ہونے لگا۔ لیکن خوشی کا بھی کوئی مقام نہیں۔ یہ بھی کا نام آپ لیتے ہیں اور اس قدر تعریفیں بیان کیں وہ حضرت میرے بڑے بھائی صاحب ہیں اور آپ کا کیا بگاڑا جو اس قدر آپ آزردہ ہیں فبلہ بندہ خدا تخواستہ میرا کیا بگاڑا۔ ان تمام دنیا کی حیثیت بگاڑ دی بقصیر معاف بزرانہ مانیگا۔ آپ کے بھائی صاحب بڑے قصاقی تھے بلکہ چنگیز خاں کہیے تو بجا ہے۔ خدا بچائے اک سرے سے بھاڑ و پھیر دی، صفایا جول دیا۔ قیامت برپا کی۔ ایک بات ہو تو کہوں روم و روس کی لڑائی۔ ہندوستان پر چڑھائی، پھر ایک جگہ نہیں، عالمگیر۔ ملک آئین ہیں مکس کی آفت، غرب اودھ پر الحاق کی مصیبت، لکھنؤ میں نیوں کے مارے ناک میں دم۔ ہر بار دلی یا کانپور والی دُرد سا کرنے کو جی چاہتا تھا چلتے چلتے جب دُم باقی رہ گئی تھی اور بالکل جانبار تھے تو ہزاروں بچے معصوم بیگناہ جنت جتلا کی معرفت چھٹ کر گئے اور سائس ڈکار بھی نہ لی، دُ

اگر کوئی مضمون یا چاک ٹوٹ پوٹ کے بچ لی گیا تو صورت بگاڑی۔ منہ کیا بھڑکا چھتا ہو گیا۔ بس یہی نا؟ اب آپ کہہ چکے۔ للہ اللہ یہ آپ کے نزدیک کچھ بات ہی نہ ہوئی۔ کیا چپکے سے بس کہہ دیا اور کیا طومار نوح آجاتا تو آپ جانتے یا حضرت اسرافیل کا صور پھونکنا تو خوش ہوتے یہ نہیں جہاں اس قدر برائیاں تھیں کوئی اچھی بات بھی تھی۔ اچھی بات کی ایک ہی کہی۔ کوئی آپ ہی بیان کیجیے۔ میں نے تو نہیں دیکھا مگر کانوں سنا ہے یہ دربار قیصری کی خوشی کیا کم تھی۔ میرے ذہن ناقص میں جتنی باتیں ہوئیں وہ اس خوشی کے آگے کچھ نہیں۔ واہ وا وہ بھی کچھ ان کا احسان نہیں اوّل تو وہ جشن کے دم سے شروع ہوا تھا۔ دوسرے ایک دن تھوڑا سا برائے نام ہنس لیے پھر سال بھر برابر رونا پیٹنا رہا۔ ہاں یہ شکر کا مقام ہے کہ خدا نے جان بچائی۔ خیر اب ان باتوں سے کیا، میں اور زیادہ تو کہہ نہیں سکتا لیکن اگر منظور خدا ہے تو یہ ناچیز آپ کو ایسا راضی کرے کہ نہایت خوش ہو جیے اور بہت دنوں کو یاد کیجیے۔ اللہ ہے۔ بہ بیت تو لے ڈھب ہے۔ ابھی سے آپ فرمائیے ہیں کہ ایسا راضی کروں گا کہ بھول جائے گفتگو وہ علی ہے۔ لیکن خیر خدا نے مایرگ است۔ چناں نماند و چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند۔

ستم ظریف!

گلدستہ

بہار آئی ہے پھولے پھلے ہیں نخل و شجر ہیں نہال
ہرے ہیں سبزے سے جنگل کلوں سے گلشن لال

چمن کو پھول مبارک ہوں پھول کو خوشبو
اودھ کو تخت، اودھ تخت کو یہ دور اقبال

مزا عجب ہے کچھ اس پر ہے میں کہ صورت طفل
جوان و پیر کے منہ سے ٹپک رہی ہے رال

برسبیل تعبیر نرالی ہے سج، نرالی دھج
خدا گواہ نیا سکہ ہے نئی چال

یہ بولی چال جدا ہے یہ چال ڈھال جدا
جدا سخن کی روش ہے جدا یہ طرز مقال

ہیں لوگ بھرے ہنسے یورپ قبیل و شمال پر اس کے
کہ جس طرح کسی صوفی کو آئے بزم میں حال

معاندین نے پٹکا بہت سر اس کے لیے
مگر تراش خراش اس کی پائیں یہ تھا مجال

کہاں یہ فوق سما اور کہاں وہ تخت ثریٰ
کہا براتی نئی اودھ کیا خود سر بال؟

ہے ابتدا ہی میں اس کے بس انتہا کا مزا
خدا کی شان مہ نو میں حسن بدر کمال!

ہوا شیوع زمانے میں جس برس اس کا
عجب سعید تھا الحق وہ سال فرخ فال

اودھ کے چیف کمشنر کا بڑھ گیا عہدہ
کہ لفٹیننٹ گورنر ہوئے ہیں وہ امسال

ہوئی ترقی فرماں روائے انگلستان
خطاب قیصری پایا بدولت و اقبال

جو ہندیوں کو ہوئی اس خطاب کی شادی
زبان ناطقہ اس کے بیان میں ہے لال

ہزاروں راہ میں کھوٹے کروڑوں نذر دیے
امید یہ تھی فزوں ہوگا اپنا جاہ و جلال

مگر نبابی ہی حاصل و خرچ جتنے کیے
گنوا کے ہاتھ سے مال آپ ہو گئے پامال

کسی امیر کو فوج توپ کی سلامی ملی
دیا کسی کو فقط اک خطاب ہی پٹال

پلٹ کے واں سے ہمت خاں پھانکتے آئے
یہ سمجھے تب کہ نہ اچھا ہوا کچھ اس کا مآل!

خوش جو آنکھ کھلی بیخ شاخہا تھے نہاں
برات ڈھونڈتے پھرتے تھے سب یہ تھا احوال

یہ وقت کا تھا تقاضا کہ سالِ قیصریہ
ہوا ہلِ ہند کے خاطر سدہ وہ عیش کا سال

مگر غضب ہوا لینے کے پڑ گئے دینے
ہزاروں آفتیں لقبیں اس جلوس کے دنبال

اس کے بعد سے باہم یہ کچھ فساد ہوا
کہ روم و روس کے مٹی ہے جو نہیں ہیں وال

تمام ہند میں ۔ پا ہر ولی اک آفت سی
اودھ میں ملتو باراں تو ہیڈ راس میں کال

خطاب دیتے ہی ملتی کسیا اودھ کو اُدھر
ذرا نہ سوچے کیا پہلے چومے کا ٹا گال!

سُنا ۔ ہے اس کی ہوئی ہے اپیل لندن میں
بقول شخصے مگر یاں گھڑی میں ہے گھڑیال!

خدایا فضل کرم اپنا کیجیو ہم پر
عجیب نہج میں ہے جان پھنس گئی فی الحال!

اُٹھی دور جہاں سے ہو حکمت عملی
یہ وہ بلا ہے کہ جو کھینچتی ہے بال کی کھال

جہاں میں اپنے اودھ پنچ کو سلامت رکھ
اس آفتاب پہ آئے نہ تا بہ حشر زوال

زمانے میں رہیں اس کے عدو ہمیشہ تنگ
جہاں میں اس کے معاون رہیں سدا خوشحال

ت ۔ ن ۔ ہجر

سالِ نو، اودھ پنچ

بادۂ احمر لا دے ساقی
اب تو پھول پلا دے ساقی

پھول نہ ہو تو ٹھرا لا دے
خم کو اٹھا کر منہ سے لگا دے

ہو جو نہ ٹھرا تاڑی دے دے
سیندھی لا کے پھاڑی دے دے

سیندھی میں بھی ہو جو ہانا
لانا لانا بنگ ہی لانا

سبزی پی کر خوب بنے گی
دیکھنا کیسی کاڑھی چھنے گی

سبز قدموں سے کام پڑا ہے
ہند میں اک کہرام پڑا ہے

اس میں بھی ہو جو تھوڑی بیت
دینا دینا طرّہ دینا

پھینٹے دے کر ہم کو نہ دم دے
بیٹ پٹ بھر کر ایک چلم دے

کابل سے ہم گزک منگائیں
جا کے بخارا دھونیں اڑائیں

کشن کوٹی دینا مشک کا دینا
لانا چھینٹا مدک کا دینا

فکر نہ کر تو اس کی اُس کی
افیوں کی اک ڈبیہ دے چسکی

دیکھ تو ہم نے کیا کیا مانا
پھر بھی ہم سے آنکھیں چرانا

نخرا ہے تیرا ساقیِ میرٹھا
نشا جاوے دام نہ مانگ
چار جوپائے آٹھ اُڑائے
جام پہ جام پلائے جا
مانگے تو کہہ دیں صاف نہیں ہم
من میں دھیرج دھرنا ساقی
جس دم پائے دے دے دام
باتوں کا تیری فرق بڑا ہے
کیا کیا سوانگ نکالے لائے
روم و روس لڑایا ہم نے
دیکھے سب نے قلم کے جوبن
حال نظام کا سارا چھاپا
شاہِ اودھ کا رنگ جمایا
کہہ ہم جو نہ دل بہلاتے
جان ہی لیتی فاقہ مستی
چھاپے پر چھا اُڑتی خاک
کلوں سے کہتے جائیے تو لوں
پیچ سے ملک کو پاٹا ہم نے
ناؤ لگی وہ پتلے پار
ہاں سنئے رنگیں ساقی لانا
نشہ لبی سے رندہیں ترسے
شرع شراب اور دودی گھٹائیں
گڑگڑ بادل پڑپڑ بوندیں
نکلے صدا ہر خاکے سے
برسیں گے برساتیں گے
مجموم کے آئے ابر بہاری
پھول کھلیں جب بلبل چہکے

ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا
پاس نہیں ہے بھوتی بھانگ
خالی ہاتھوں گھر کو آئے
دام کا ذکر نہ لائیے جا
مسرف ہیں صراف نہیں ہم
پیچ کے دام بھی ہیں کچھ باقی
کھری مجوری چوکھا کام
رندوں سے اب کی پالا پڑا ہے
کیا کیا باغ سبز دکھائے
رنچھ کا ناچ نچایا ہم نے
بجلی چمکی اور تڑ دکھن
کابل پر بھی مارا چھاپا
توڑ بتایا جوڑ بنایا
اب تک ہوش ہیں کس کو پاتے
پانی کے بدلے خاک برستی!
خاقہ سے منہ پر رہتی ناک
چل بے چرخے چرخ چوں
سال مزے میں کاٹا ہم نے
مارا غوطہ پتلے پار
سال بھرے کی باقی لانا
اوبلے مٹکا ہتھیا برسے
گرم پیالہ ٹھنڈی ہوائیں
خاک پہ برسیں جھڑ جھڑ بوندیں
برسو رام جھڑاکے سے
پنیے مونڈ کٹائیں گے"
باغ پہ برسے باری باری
دل بھی اچھلیں رہ رہ کے

کیا نکھرا سا رہا گلشن — نہر بھری ہے گردن گردن!
چھے چھکیں لے کے بلائیں — مالنیں زباں سے برگ دعائیں
جب تک گلشن ہرا بھرا ہے — عارضِ گل سب بھرا بھرا ہے
دل ہو شگفتہ چین ہو بر جا — خوش رہیں یا رب راجا پرجا

قیصر ہند جشن جم جم!
رعایا میں ان کے براجیں ہم

اللہ اللہ۔ آج منگل کا دن حضرت پنچ کا دوسرا جلوس ہے یا اودھ پنچ اور اودھ کو جنگل میں منگل۔ یہ جنوری کی پہلی مصرعت قیصر ہند کی خاص الخاص نظر کردہ تاریخ ہے باکتاب روزگار کا ٹائٹل پیج۔ یہ محض اتفاق ہے یا حضرت پنچ کا اقبال، زمانے کے لاکھوں ورق دفتر کے دفتر الٹ جائیے ایسے ذہانتی لطیفے کہیں ہاتھ لگتے ہیں۔ ہمارے آج ہزاروں ٹوٹکوں کے بعد یہاں مشہد صاحب اصل خیبر (نہیں نہیں مشہد) سے سدھارے۔ اب مشہد کی نئی کھیپ، نیا مال، نیا دن، روم روس کی ہشت پشت، انگلینڈ کا سوئٹ کا ناس، جرمن کی روباہ بازی، سربیہ، رومانیہ کی کورنگی، فرانس کے بگڑے دل کا ماٹ، خان کابل کی گیدڑ بھبکی اقوام سرحد کی گوشمالی کو انگریزی لوہا، الحاق اودھ کی مٹی چھری، لیجسلیٹو کونسل کی پچر سنسنہ اوسس یار کے نئے گھن والی لوکل گورنمنٹ، ریاست نظام کی شکر بجلی، انتی روشنی والوں کی قومی ہمدردی نئے سال کی خطبہ، جدید اخباروں کی ایجی ٹیشن ہے ؎

دیکھئے پاتے ہیں کیسا فیض بتوں سے مشتاق
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

سال رفتہ روس کی پچ شائقین اخبارات کو لاکھ اپنی طرف کھینچے لئی منگ مشہد اودھ پنچ کے برمحل لطیفوں، غضب کی فوج بیانیوں خوشامدیوں کی سلے دے، امرتسر کے اطمینان میں آزادہ بیانی، کورنمنٹ کی واجبی تکتہ چینی نے اس پر بھی سینکڑوں کو اپنا مطیع کر ہی لیا۔

ہمارے چند باز شہر کے بے تکے نواب جن کو اخبار کے نام سے بخار آتا تھا الٹی کاوم لکھ نے لگے۔

مشہد اودھ پنچ بعض بھی لوگوں پر بھی آمد کر دیں گے کہ دیکھو شوخ بیانی یوں بھکڑ مٹش سے خالی ہو سکتی ہے۔ استعاروں تشبیہوں کا لطف تصویر کھینچ دینے سے اس طرح دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہمارے بریلی سے نام پر دو ہی چھڑوں میں رشوت کا یوں استیصال ہو جاتا ہے۔ مسرف نوجوان لوگ یوں رنڈی کی سستی سے دست بردار ہو جاتے ہیں، گو ہٹ دھرم سحر بیانی کا تو اب بھی مانی گئے ہیں مگر صاف صاف اعتراف میں جو شرمائیں ذرا جھجکتا ہے تو خیر اس سال وہ بھی لو۔

مشہد اودھ پنچ اپنے پچھے یکرنگ حالی و مماثل نامہ نگاروں کے تہ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے اعلیٰ درجے کے مضامین کے پل باندھ دیئے، نہیں تو پورا اخبار (اور پھر پنچ سا) لکھنا ایک متنفس سے کیونکر ممکن تھا خصوصاً ہمارے عنایت فرما۔ ن لکھنوی کی لفاظی۔ ت۔ ن ہجر کی جادو طرازی، آپچ اور سلاست، ح الہ آبادی کے مہذب مزاح اور عالی دماغی، پنجاب پنچ کی رکاوت و خوش طبعی، بمبئی پنچ کی مضمون آفرینی، اور کلکتہ پنچ کی ظرافت، ج۔ ن کی چلبلی تقریر بجلی کی نوک جھوک ہمارے لوکل ستم ظریف مضمون نگار صاحب کی وقوع گوئی، مضحکہ کی بھر بیانی، آتش زبانی، مخمور صاحب مہاور کی لطیفہ بازی، لاہور پنچ کے سماں باندھ دینے والے فقرے، دہلی پنچ کی بولیاں ٹھولیاں، پنچ کا سکہ بٹھا دینے میں یادگار رہیں۔

عذر رہا لاکھ جلدی کی مگر وقت کی کھڑاک سے اخبار نکلنے میں ایک دن کی دیر ہو گئی۔ ہمارے ناظرین از راہ عنایت معاف فرمائیں۔

کرسمس

کرسمس ڈے کی دھوم دھام، گرجا کا اہتمام، زیبہ حاجات کی گرانی، ٹوپیوں کی ارزانی۔ کیک بسکٹ کی طیاری، بنگلہ کوٹھیوں کی گلکاری، انگریزی بانسری کا بجانا، ٹنبورکا ٹرجانا۔ لباس و زیور کی آرائش، تکلفات کی افزائش قابل دید ہے۔ انگریزوں کا بڑا دن نئی روشنی والوں کی انگریزی عید ہے۔ صاحب لوگوں کے تکلفات جو کچھ ہوں مزہب اور بجا ہیں مگر ہمارے گڑے نیکر کو ہمارا حال کچھ نہ پوچھیے۔ ہیرا لال ہیرا! اڈر آؤ۔ کل بڑا دن ہے۔ چائے کا کیا ہت پڑا ہوگیا ہے۔ تھی گرسے بورسی جوس کر کے پیندے میں چوڑ لگا دے۔ ویل جھکیو، وہ کالا بوٹ ہمارا لے جاؤ، بہت سک ہوگیا ہے۔ بچارے سے بولو بیدلگا دے، اوس کا ایڑی بالکل گر گیا ہے درست دے۔ وہ کالا کوٹ الپاکہ والا جو مسٹر بیلے کے مرنے کے بعد ہم نیلام میں لیا تھا اور وہ لال ٹوپی جو سر کے تیل سے کالا ہوگیا ہے جسے مسٹر سیڈ ریڈ نے جوتا پونچھ کر پھینک دیا تھا اور ہم نے دھو بولا کر کہ کچھ ڈاتما نکال رکھوا اور رات کو کسی بچے سے دو رنگی چورالاؤ اور وہاں بجایا سکو تو بہو سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مشلی سے ہمارا سلام کہلوا دیے آؤ۔ ہمارا کھانے کا سیج جس پر مکھیاں بیٹھا رہتا ہے کوئی چپیڑا لے کر کچھ پانچھ دو۔ مل ہمارا دوست لوگ سب جمع ہوگا۔

ہیرا الہی وہ چھیل چکنیا، بال کانٹے سے درست ہے کہ ماشاء اللہ۔ پچاس برس کا سن، دبلا پتلا، بدن میں حفظ ہڈی چمڑا، سر کے زری زری بال، بھوں سہری کی قطع، آنکھوں میں کیچڑ، داڑھی کے بال کچھ: رکچھ کالے، پھیلا ہوا منہ جیسے چھوٹا تہاب، میلی خوئی لگائے ایک مرزئی جس میں جیٹھوؤں کے سوا روئی کا ذکر نہیں۔ ہلدی، صابن کے جامجا دھبے۔ ایک میلا لنڈ صافی کا ملگجا لونگیہ کے عوض کندھے پر پڑا، پھٹا جوتا پہنے ہزار کو صبا ہوا۔ وہی ہیرا، وہی خدمت گاری، وہی تو ہچی وہی مشکیں، ٹرٹراتا ہوا پھٹا جاتا ہے اور چپکے چپکے کہتا جاتا ہے یہاں کے نہ بیچ نہ کرسی، ایک ٹوٹی میز اور سڑے گلے چار مڑھے، دو رکابیاں، دو کانے کوٹ پتلون نیلام سے گھر بیچیے۔ مگر پاس نہیں انگریج بننے پر گس کرتے ہیں۔

غرضکہ ہر شخص یہ خیال خویش تجھے وارد۔ یہ حضرات بھی عجیب طرح لسر کر رہے ہیں۔ بقول شخصے کہ ؎

گئے دونوں جہان سے واسطے ستم نہ ادھر کے ہوئے
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے نہ اُدھر کے ہوئے

ستم ظریف

الف بائے پنج

ا انگلینڈ کے سُن رہے بھائی — روشس نے کی ٹرک پہ چڑھائی
کابل ہندوستان بھڑاوا — ڈانڈا لیے جو اکی دھاوا

مایا مایا ہے مان جائت ہے سب کرتے
جھٹ مکر برتے جو کوئی ہو کوئی داکا ہوئے

ب بیتا اک بات سناؤں — لیوں ظلمات لشور بچاؤں
مانت ناہیں شیر علی — حکمت عملی کچھ نہ چلی

صوبہ ہندوستان کا ہے کابل قندھار
جو کوئی پہنچا دے وہاں تک دا کے ہیں بل دار

ث ثابت ہوتا ہے لائے سفیر — وا کی بھی ناسنس ہمیر
سب سے کہت ہے کہ وہ ہمارو — کل سرحد پر مچا فساد

بولو ابا توپ پر آن پرت ہر آن
کابل لڑکے دیکھ چکے ہیں وہ سارے افغان

ش شابت ہوتا ہے ایسا — جان بچائے دے کر پیسا
دشمن کو بھی دوست بناتے — زور گھٹانے کو لڑوانے

جو چاہو سو ہم سے اوپر لڑو روس سے جائے
فوج ہماری گک کرے گی یہ کو دیکھا تے

ج جو صاحب جو مجھے دان میں — دن کا ہے کو کیسے بن میں
اوں کا بدلا کیسے ملے ہے — جو نے ہے وہ کا دل ملے ہے

بگڑا باگھ نہ مانے چھکاری مت دیو
پھر ڈوا ایسی کڈھب جگہ گھر کا رستہ لیو

ح حکومت جو فوج نے کینی — پک پاچھے ہو جیسے ہینی!
کس کے سر پر تھرپی جائے — بنا لڑے کیسے ہٹ آئے

دھمکی دینے آئے تھے سو دھمکن لاگی توپ
گولے ٹوپی مار بہتیں در پگڑی گھٹا ٹوپ

خ خوف اور بڑا یہ بھائی — جن کے برتے رار مچائی
وہ سب دن او نہیں کا بھریں — ایسا ہو تے نہ واند کریں

پکا پھوڑا چھیڑیے تو چھیڑا نا ہیں جائے
یہ روڑھ کا موہے دن رین ہیا نہ پھر ٹے آئے

د دیا جو کچھ سب کھویا — دانا ڈالا کیا بس بویا
دیا خزانہ کر تنخواہ — دیا میگزین برائے سپاہ

جیسا کیا سو آگے آیا اب کا ہے پچھتاؤ
جو من کا کیتے بھیاوا کا کو سبھاؤ

ذ ذلت یہ کیسی ہوگی — جو کی جو ہو جیسے بھوگی
بھیک نہ مانگے مانگے حصہ — میل کیے ہو جھگڑا قصہ

جن کے کارن بھرن بھرے کیا انہیں سے میل
دیکھ سکھی ان تلوں مان تنک نہ نکسا تیل

رخصت ہوا آئے سفید ۔۔۔ لگے بڑھاوے فوج امید
اب بن لڑے نہیں چھٹکارا ۔۔۔ کیسی کریے ٹن بچپارا

اپنی سی سب کر دیکھی کرم لکھے کی ہوئے
کپٹی سے نہا کرے گرہ سے اپنی کھوئے

زنار کے آئے سفید ۔۔۔ اوس سے پتیائے ہیں امیر
دیکھیں رہے وہ کیا بُت ۔۔۔ کیسے کھائے عرصی کُتا

خیرا اور بچارا دیکھو کیا جو کچھ برتاؤ
پھر کابل نہ ہار ہیں جو مانگو سر پاؤ

سچ اک بات بتاؤں ۔۔۔ تجھ کو صاف جو دل سے پاؤں
چھوڑ قلات اپنا گھر رہو ۔۔۔ ڈوبی نیا اس گن کھیوو

ناتم سے کچھ چھیڑ ہونا ہو کچھ بگاڑ
بسے بسائے گھر کا کوڈ ایسے دیت اُجاڑ

شرارت جو کوہ کری ۔۔۔ تمری حد مان پاؤں دھری
وہ کا جانو موڑ پرانا ۔۔۔ چاہت ہے وہ ڈھول لگانا

ایسے کی جس چاہیے ویسی نکتا ہوئے
پاؤں کاہاڑی مار کے گھر میں بیٹھا روئے

صبر سے نکلے کام ۔۔۔ جلدی کہ کیوں ہو بدنام
پہلے اون کے سانکلی توڑو ۔۔۔ جو کچھ کہیں نہ منہ کو موڑو

اون کے سب کو اپنا کرو اپنی لو پھر جیت
مانو گر ہمرا کہا ہر اک سے راکھو پیت

راقم: شاعر

بے تکے آنکھ مُند پتے دون کی لینے لگے
طفلِ مکتب بے الف پڑھ کے سبق دینے لگے

دوسرا سبق

یا اوستادا ہمیں میدان ہمیں چوگان ہمیں گوے (ا) شامت ہے پٹھے کی شامت ہے اے ربجا (شائش پٹھے شائش مرحبا)
پڑھنا پٹھانا چولھے بھاڑ میں جائے۔ ہماری بات چیت ہی سیکھو تو بن جاؤ ہاں سر باللہ (بسم اللہ)

(ش) کو منا علم سکھیے؟

(ا) علم مجلس!

(ش) علم مجلس کے معنی مطلب فرمایئے۔

(ا) ہاں یہ بات کی دیکھیے ایک ہی سبق میں دو آنکھوں کی چار ہو گئیں یعنی مسئلے بگھارنے لگے۔ سنو علم مجلس کے اصطلاحی معنی کتاب خوشامد کی چوتھے باب قلوپترہ کی دوسری فصل لاجا لوجی میں یوں لکھے ہیں کہ ——— جیسا دیس ویسا بھیس۔

(ش) ہمہ یہ بھی نہ سمجھے۔

(ا) ہر رنگ میں پانی۔

(ش) آگ لگے تمھاری باتوں میں خلاصہ مطلب کیا ہوا؟

(ا) ارے جس صحبت میں جا ستے واں میں ہاں ملانے۔ حق ہو یا ناحق! بات کی تائید ضرور کرے والا تو چوڑا رہے۔ سب کی چلیں بھرے چاہے کوئی چار کھوٹی بھی سناتے بُرا نہ مانے۔ بھلائی اپنی چاہے تو بے عزتی کو غنیمت جانے کیونکہ عزت چیز کیا ہے کہ پیش مرداں بیاید پھر نفع سے مطلب نقصان کا ہے کا۔ اگر اس نصیحت پر عمل کیا تو دیکھنا پیٹ پھول کے مٹکا ہو جائے گا۔ یاد کرو گے اور ایا نداری تو کہیں پھٹکنے نہ پائے۔ ایسا بغل میں دبا لیے جیسے بندریا اپنے بچے کو چھاتی سے لگاتی ہے۔ پھر موقع محل دیکھے تو جھوٹا حلف بھی اٹھالے کچھ ثواب عذاب نہیں۔ مقتضائے وقت کہا جائے گا یا دروغ مصلحت آمیز یہ ... الخ بن جائے گا۔

(ش) کیوں مسند جھوٹ اچھا کہ سچ؟

(ا) جھوٹ اچھا جھوٹ۔ خدا کی نہ بلوائے اور ایں جانب کا شیوہ تو قدیم الایام سے (یعنی پشت ہا پشت) یہی چلا آتا ہے اور خوب ہی پھلا پھلا (بلکہ پھولا ہے) دیکھو رویئے باتیں یاد رکھو ایک تو مثل مشہور ہے جھوٹے کے آگے سچا رو مرے۔ دوسرے یہی بات سعد اللہ آہیں سب کے من سے اُترے رہیں۔ بھائی اللہ بچائے سچ بول کے گردن کون کٹوائے۔

(ش) بھلا حضرت تو آپ آزمودہ کار ہیں کچھ اس کے فائدے اور بھی بیان فرمایئے۔

(ا) بچشم سر آنکھوں سے دیکھ لیے پانی اور گھنٹوں گھنٹوں دلدل میں ایک ادنی سا فائدہ یہ کیا کم ہے کہ اب ہم سچ بھی بولیں تو کوئی یقین نہیں لاتا۔ باقی اور بھی ازیں قبیل وغیرہ وغیرہ۔ واہ تو آپ بھی بعضے بے اٹکل اخبار نویس نکلے۔

(ش) اب ایک بہت بڑی بات ہم پر پوچھتے ہیں۔ حاکم محکوم میں کیا فرق ہے؟

(ا) پوچھ بس یہی بات تھی۔ یہ کیا بڑی بات ہے بس اتنا فرق ہے جیسے زمین و آسمان یا لکھنؤ سے لندن یا نینی تال سے دکن حیدر آباد۔

(ش) ذرا ٹھہریئے اور خدا حکومت دے تو کرے۔

(ا) اس کا جواب زار روس سے پوچھ کے دون کا ہان زبردستی وہیں دھونکڑیا خود رائی بے پروائی، سخن پروری جنگ آزمائی ناپرسائی غفلت ہزار طرح کی سیاست (یعنی جزو ریاست مارے اور رونے نہ دے۔ سر بازار جسے پائے کملی ڈال کے لوٹ لے) اور یہی شمس و روزبان رہے۔ کس کا سر اپنے آگوے مار دوں۔ یہ وہ زمانہ جس کا گلا گھونٹو وہی آنکھیں نکالتا ہے۔ زبردست کی راہ سر پہ۔

(ش) بھلا مکوم کی کیا تعریف ہے؟

(ا) جیسے کتے بار کتے کے گلے میں رسی باندھ کے کھینچا لیے جاتا ہے یہ صفت پیدا کرے۔ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست کا مضمون۔ لاکھ طرح کی سختی ہو چوں نہ کرے۔ گو بات چاہے کیسی ہی بری ہو یا بیجا بہت افسب بہت مناسب، بہت بجا۔ ہر تکلیف پر شکر ہے، ہر مصیبت پر احسان ہے تیرا کچھ مصلحت ہوگی جس کل بٹھائے بیٹھے۔ جو ناچی نچائے نا چے چار باتیں سن کے غم کھائے۔ خطا بے خطا تقصیر ہوتی، قصور وار ہوں، عوض کو حق نا حق ابتدائی کا قرار اپنے ہی سر دھرے لیکن یہ سب چاپلوسی دھکے یا زمانہ سازی سے ہو۔ دل میں گھر کرکے پانچوں مال اپنے کرلے، وقت پر صاف الگ اور خیانت، بددیانتی، کاہلی، مجہولی کا مرچوری حرام خوری، کام بگاڑ دینے کی ٹھکر پاس تک ارتی سے ماشہ تک ندارد لیکن ہو پڑا شرط ہے۔ باقی اور مطالب آئندہ تم آپ سمجھ جاؤ گے تھوڑا پڑھا لو۔

(ش) خفا نہ ہو جیسے بڑا نانا ہے تو ایک بات کہوں۔

(ا) ہم تو بڑے کے باپ کو نہیں مانتے۔ شوق سے تم ہزار باتیں کہو۔

(ش) میں چاہتا ہوں چھوٹے چھوٹے جملے مختصر طور پر تڑاق پڑاق بیان کروں۔

(ا) واہ بھلا چوہرنی اور دوہرنی سے تو کم نہ ہوگا۔ مجھ سے کہو تو اشارہ میں سمجھا دوں۔

(ش) ہاں اوستاد! یہ بات۔ بھلا سال کون سا اچھا؟

(ا) سن صفر جس میں وہ ایکٹ جاری ہوا۔

(ش) اور مہینہ کون مبارک ہے؟

(ا) بونڈ کا مہینہ!

(ش) اچھا دن کون متبرک ہے؟

(ا) ہفت شنبہ!

(ش) ہائیں۔ یہ کوئی دن نہیں۔

(ا) ہو بہو ہو بہو بھائی جسے بڑا دن کہتے ہیں۔

(ش) تم کون گھڑی؟

(ا) چودھری (بنیوں کا) جس کا کہیں ٹھل پڑا نہیں۔

(ش) دنیا حاصل ہونے کی ترکیب؟

(ا) دین سے کنارہ کشی۔

(ش) صحیح ہیرا رگوں سا ہے؟

(ا) لوگ تو کہتے ہیں چوری۔ ہمارے نزدیک بھاگتے بھوت کی لنگوٹی۔ رشوت بھی غنیمت ہے۔

(ش) روشنی کون اچھی؟

(ا) ظاہر ہے یہی نئی روشنی۔ پرانی چیزوں کو بیکار رہے۔
(ش) سفر کرے تو کدھر جائے؟
(ا) سیدھا الندن کی طرف۔
(ش) فصل کون سی اچھی؟
(ا) خشک سالی میں ہیضہ وبا۔
(ش) تھوڑا قرآن درمیان کیا لے وعدہ کا نام لیا ہے۔ خدا نہ کرے۔
(ا) آخر بچے ہوئے۔ بات کی تہ کو نہ پہنچے۔ یہ حوس صدی انیسویں زمانہ دجال کی آمد آمد ناب تو خروج کر چکے۔ تخفیف کی پکار سب باتوں پر طاقتوں کی گرانی صاحب نے وہ ڈرایا ہے اور شاید دو ہزار پڑ گئی کہ کٹنے کا نام نہیں لیتیں اس میں جہاں تک کی بہ مصلحت سے خالی نہیں اور مسلمانوں کو خس کم جہاں پاک
(ش) بھلا آدمی کہاں بنتا ہے؟
(ا) لیٹی میں
(ش) لیٹی چیز ہی درد
(ا) جو اس ہمارے دعوی لاٹھی کیا ہے یہ سچ ہو کہ زمین و آسمان کے قلابے ملائیں۔
(ش) پھر وہاں تو فی کیونکر بنایا جاتا ہے؟
(ا) اس میں کچھ مدد خارجی ہے ایک نہ ایک طرح سے ضرور بنایا جاتا ہے۔ پھر کبھی کہہ دیں گے۔
(ش) اور دعا کہاں قبول ہوتی ہے؟
(ا) یہ نہ پوچھو جو زبان سے غائب نکلا ہوا۔ دعا کا قبول ہونا ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک کہیں نہیں قبول ہوتی۔
(ش) اچھا دنیا میں لاحاصل کون کام ہے۔
(ا) سچی اخبار نویسی اور عمدہ نمونہ کاری۔ کس نے سنا کہ بھلا کون ہو۔
(ش) واہ استاد واہ اللہ تمہارے دانت گھیا میں چنے سل مٹھائی ہے۔ ایسی خوش فراقہ کہ دیکھی نہ سنی پیراہی لگتا ہے دو چار نمونے اور۔
(ا) بس بس بہت کچھ یہ اتو ہی نہیں لگتا۔ اب کتاب بغل میں دباؤ اور چلتے بنے تو آمد طبیعت لگی تو پھر کبھی۔

تاریخ بر قیاس

۲۳ دسمبر الندن۔ بوجہ سرد ہوا اور برف کے جنوب بلگیریا کی جنگی کارروائیاں بند ہیں۔
افواج سرویا نے پیشنگ گلیوا کو فتح کر لیا۔ دوسری افواج سرویا روسیوں کے ساتھ مل گئیں اور رومن کی جانب بڑھتی جاتی ہیں۔ روسیوں نے مقام اولی کو فتح کر لیا اور اپنی افواج ارزرون اور مر میں جمع کر رہے ہیں۔ آرمینیا میں سردی کی شدت ہے۔
۲۴ دسمبر الندن۔ سلیمان پاشا نے قلعہ جات دوار بعد الاصلاح میں فوج داخل کی ہے اور باقاعدہ فوج کو وہ اڈریانوپل میں جمع کیے ہے۔

یقین ہے کہ گورنمنٹ سلطان نے اخیر وقت تک جنگ کرنے کا ارادہ اختیار کیا ہے۔
شہنشاہ روس مع شہزادہ گرینڈ ڈیوک کانسٹینٹائن مس برگ میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ روسی افواج کا معاملہ کر رہے ہیں۔

انگلستان ان عہد ناموں کو جواب میں امن میں رکھے گا اور یورپ کے ملکوں کو مساوی رکھے گا اور روس کو نہ بڑھنے دے گا اور اس کا روائی میں اس کو فرانس اور اٹلی سے اعانت ملے گا۔

۲۵ دسمبر۔ شہنشاہ روس نے کہا ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور مجھ کو امید ہے کہ جو کام روس نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کو جنگ و جدال میں پورا کرے گا۔

وزیر اعظم ٹرکی نے ایک وکیل سے ملاقات کی جو کہ مسلمانان ہند وستان کی جانب سے وہاں گیا ہے۔

سرویا نے باتری پر ناکامی سے حملہ کیا۔ ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ فوج نیشن نے ارادہ کیا تھا کہ بلند مقامات کمپنی پر قبضہ کر لے لیکن اس میں ناکامی ہوئی۔

فوج کشی جواکی

۲۴ دسمبر۔ شیر گھاسہ۔ فوج کل دوسری پہاڑی پر دشتونی گھاٹی ہوتی ہوئی روانہ ہوگی۔ یہ دو کالم ہو کر روانہ ہوگی۔ اول بریگیڈ توزیسکان کی نہل جانب ہوگا اور دوسرا زیکان کی نہل ڈوونڈ۔ دو سو پچاس آدمی فیل بریگیڈ اور ایک سو تیسویں ہندوستانی پلٹن کو حکم دیا گیا ہے کہ فوراً یہاں آویں۔ تار برقی کا تار تعمیر کئے کاٹ دیا ہے۔ جواکی پشتونی میں جمع ہو رہے ہیں۔ رات کو لشکر پر گولیاں منیم چلاتا ہے۔

۲۶ دسمبر شیر گھاسہ۔ ایک فوج سے کل گرد آوری ہوئی تھی۔ کچھ مخالفت نہیں ظاہر کی گئی۔ ایک جواکی مارا گیا۔ فوج لوری میں کل جمع ہوگی اور پشتونی پر حملہ کو نا بعض ہوگی۔ یہ حملہ بشراکت فوج جنرل کنبر صاحب کے کیا جائے گا۔ یہ فوج ہمارے شریک پشتونی میں ہوگی مدھم خراب معلوم ہوتا ہے۔

۲۶ دسمبر شیر گھاسہ۔ تیئیس ہندوستانی پلٹن خوشحال گڈھ سے اور ۷۰ مف پہاڑی کوہاٹ سے آج مقام زکی باغ کو جاوے گی۔

۲۶ دسمبر کلکتہ۔ کوئی انکم ٹیکس جاری نہ ہوگا مگر آمدنی کی تنقی اس طور پر کی گئی ہے کہ درجہ والیسس ٹیکس تجارت اور پیشہ پر لگایا جاوے اور سالگذاری کسی قدر ممالک غربی و شمالی اور پنجاب میں بڑھائی جائے گی۔

فوج کشی ناگا

۲۶ دسمبر۔ جوہاٹ۔ جب سے موزما کو لے لیا ہے اس وقت سے ناگوں نے نہایت ستا رکھا ہے۔ روڈ کا بیوں کو روکا اور لوٹ لیا۔ روکا نسٹیبلوں کو مار ڈالا۔ وہ چاہتے ہیں آمد و رفت روک دیں اور جو فوج بھیجی گئی تھوڑی ذاردی جاتی ہے اور زمانہ بھی مخالف ظاہر کرتے ہیں۔ ایک سو آدمی نتالیسویں پلٹن سے طلب ہوئے ہیں جو دیر وگڈھ میں ہے۔ چیف کمشنر آسام مقام کوہاٹ میں داخل ہوئے۔ امید ہے کہ یہ ناگا کے پہاڑوں کو جاویں گے جب کہ وہاں اس ہو جائے گا۔ مقام اوکھا میں سب تندرست ہیں۔

۲۶ دسمبر جو رات۔ انگلی نا گا سزا کے جن گاؤں کو جلا دیا تھا ان کے جلا ٹھرا گروہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سڑک بند کر دی ہے اور پل کو توڑ ڈالا ہے اور آمد و رفت دریا اور فوج اور مشین کے ذریعہ کی ہے۔

کانسٹبل کو ہوڈاک بے جا تھا۔ ڈالا۔ دوسرے کو زخمی کیا۔ ایک اور گروہ ان لوگوں کا درمیان ساگئن اور میران کے ظاہر ہوا ہے انھوں نے ایک اور کانسٹبل نوبر جھی ستہ مارڈالا اور ڈاک والے کو زخمی کیا اور انھوں نے بوریا لٹھ کو دھمکی دی جو ایک اسامی موضع میان تپہ اور اسیل گوڑ گھاٹ سے ہے اور یہ بھی بیان ہے کہ ساگئن کو دھمکی دی ہے۔

انیر ڈاک جو ساگئن سے آئی وہ زیر کانسٹبلوں کے آئی تھی۔ کاک پرسیں کے لوگوں کی ٹولہ گھاٹ میں داخل ہوئی اور ایک حصہ نمبر ۴۳ پلٹن کا دربرگڈھ سے آنے والا ہے۔

فوج کشی جوا کی

ایک تار برقی جو کوہاٹ سے مورخہ ۲۲ دسمبر کی آئی اس میں لکھا ہے کہ جوا کیوں کے پاس سے ۲۲ اور ۲۳ ماہ حال کو قاصد آئے اور جو درخواست ان کی سابق میں تھی اسی کو ظاہر کیا یعنی کچھ رئیسوں کو اجازت ملی کہ وہ جا کر اپنے جوگوں کے لوگوں کو لشکر میں لاویں مگر ان سے کہا گیا کہ یہ بات غیر ممکن ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ اور قاصد نہ آوے جب تک کہ جرگے کے لوگ اس کے ساتھ نہ ہوں۔ شبر گھاسہ سے مورخہ ۲۳ ماہ حال کو کسی قدر گولیاں ۲ ماہ حال کو جوا کیوں نے اس بکشٹ پر چلائیں جو پہاڑی پر تھا۔

مطبع سنا بہادر واقع لکھنؤ محلہ گولہ گنج میں محمد سجاد حسین کے اہتمام سے چھپا

اودھ پنچ کے شاعر

بسنت نامہ دھوم دھامی

ستم ظریف

آئی ہے دھوم دھام سے کیا ہی بسنت — پرتاں سکھے رنگ ہے ہاں جلوہ گر بسنت
نرگس کے مارے پھائی ہے چہروں پہ زردئی — کھنڈ کو زرد پیڑ سے مانگی مگر بسنت
سب جی سے بات ڈھا کے ہیں دیتی پت ہیں — کھائی بھرتی ہے ٹوکریاں یار بدر بسنت
کھیتوں ہی نا پتا ہے یہاں بس کو راگ رنگ — دیکھی سنی نہ ایسی کبھی اپنی بسنت
ملتی نہ کانوں کسی کو ہری خبر — کس مست کو سپیلی گئی آئی ادھر بسنت
حسرت سے بالیوں کی طرف دیکھتی ہے خلق — گنگال دانہ زد سے کچھ اب کی مگر بسنت
اللہ یا راد دکھائے گیہوں کی بکل — آیا نہ پیرے وہ سے ہوا وجہ انگر بسنت
کہتے ہیں سب کہ آئی گیہوں کا ٹھنے کی فصل — شاباش کیا سنائی ہے اچھی خبر بسنت
ہلدی کی اک گرہ نہیں پتے وہ رنگ ہے — نفرت ہے بھیکے پیلے ہم سے مگر بسنت

اے سچ کہا بھیلی پر سرسوں جمائی ہے؟
بس فصل میں بھی تم نے مسخرائی مگر بسنت

رُباعیاں

ترجمان ناتھ تجر

حضرت اودھ پنچ صاحب! جوں کہنے کو تو رباعیات عمر خیام زبان زد خاص و عام ہیں مگر جناب ہماری رباعیوں میں انہوں کے نوادر ہیں۔ واللہ وہ چاشنی ہے کہ زبان نہ ٹوٹے لے اس بکواس سے کیا حاصل اوس ذائقہ کا پھل ہی مزا تو چکھیے۔ بہت بہتر ہے

پیالہ دو کہ جو کوئی مفت سے پوچھے — تھا ب بانی میں لے لگا لے بوتل سے
ہو مدعا نظر جو آب کوثر کا مزا — ہر چھینٹے کے بعد اک گنڈیری چوسے

قصیدۂ مکرر

میٹی میٹی نرگسِ نیمے سے مجھ لے — دیا فرمی ستک نہ ہم سے چھوٹے
گھر ار بچے بلا سے لیکن اے آبر — افیون چانڈو مدک نہ ہم سے چھوٹے

(اودھ پنچ ۱۸ دسمبر ۱۸۸۶ء)

غزل

ترکھان ناتھ ہجر

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کاوکاو لینے لگا ناخنی — آپ تغافل لالہ کاری ہے
اک نہ جھٹکے سے پھٹکے بیٹھے ہیں — واہ کیسا واقعہ نگاری ہے
کیا لکھیں دل نہ جب شگفتہ ہو — آفت جاں امیدواری ہے
کوئی بیٹھے نہ آ کے وقتہ میں — ناوری مکھ اب پہ جاری ہے
کیا کریں اب بجار سے اپٹس — مانت دن سفل آوزاری ہے
مار سے کثیف اور ٹلکس کے پیچ — رو چکے سب ہماری باری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر — محشرستان بے قراری ہے
جلوہ پھر وعض ناز کرتا ہے — روز بازار جاں سپاری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سدا شہواری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — گرم بازارِ فوجداری ہے
شہر کا شہر ہو گئے سرسبز — کیسا ہی گوہر کی آبداری ہے
مفت کا مال کرتی ہے تحصیل — بس یہی اک وفا شعاری ہے
ہر کرانی سے ناک میں دم ہے — اب نہ وہ اشرفی نہ ساری ہے
پھر وہی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
دیکھیے فیصلہ یہ کب تک ہو — حضرتِ دل کی روبکاری ہے
اک نہ اک دن یہ ہوگا پردہ فاش — اس کا خمیازہ شرمساری ہے

تھوڑے تھوڑے پراونٹ کی چوری
واہ کیا خوب پردہ داری ہے

(اودھ پنچ ۱۹ جنوری ۱۸۸۸ء)

غزل

ابوالکمال سید محمد علی اُمید الہ آبادی

آج کل ہے کچھ سنیچر پاؤں میں — سفت کا رہتا ہے چکر پاؤں میں
سینکڑوں خارِ یسلیں ٹوٹ کر — رہ گئے ہیں نالی شتر پاؤں میں
رشتۂ تہذیب کو تو آج کل — باندھے پھرتے ہیں چھچھوندر پاؤں میں
بدگمانی تو ہے جب باندھے پھریں — جوروؤں کو اپنی ٹوہر پاؤں میں
عشق میں اک آسماں رفتار کے — آگیا ہے سر کا چکر پاؤں میں

ہجر میں ان کے ستم یاد رہے
کاٹتے ہیں سب کو پھر پاؤں میں

الانسان ضاحک

یہ مرحوم اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے ۱۹۰۵ء میں جب کسی انگریز حاکم اعلیٰ نے ہندوستانیوں پر جھوٹ کا الزام لگایا، اور اکبر الہ آبادی نے اس سے متاثر ہو کر یہ بامی کہی ؎

بے ڈھب ہے جھوٹ سچ کی چھڑی بحث ہند میں
سچ کہتے ہیں جو جھوٹ ہوں کہتے تو رو سیاہ
کیسے ہی ہم ہوں آپ تو ہیں ہم پہ حکمراں
جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ

تو الانسان ضاحک نے یہ نظم لکھی ؎

جھوٹا ہمیں بتاتے ہیں سالانہ بزم میں — کیونکر کہیں کہ جھوٹ کا الزام جھوٹ ہے
وہ صبح کو بتائیں اگر شام راست ہے — اور ہم بتائیں شام کو گر شام جھوٹ ہے
وہ کہہ رہے ہیں ہند میں تکلیف کچھ نہیں — ہم کہہ رہے ہیں ہند میں آرام جھوٹ ہے
آتی نہ تھی سوتے سوتے نظر شکل ہند کی — پوچھا جو میں نے نام کہا نام جھوٹ ہے
انعام پاتے ہیں جو ہمارے گریجوایٹ — انعام اسے نہ سمجھو سب انعام جھوٹ ہے
مفلس ہوں گرچہ عمدۂ آلام میں اسیر — افلاس جھوٹ عمدۂ آلام جھوٹ ہے
تصویر میں ہے ان کی اگر آم رس بھرا — یاں شاخ میں لگا بھی ہو گر آم جھوٹ ہے
بندہ خدا وہاں ہے یہاں بندۂ خدا — دیں سچ راست ہے اسلام جھوٹ ہے

ناول ڈرامے سچ ہیں کہ یورپ میں ہیں چھپے — مطبوع ہند قصۂ گلفام جھوٹ ہے
لکھتے ہیں وہ جو آنکھ کو بادام جھوٹ ہے — کہتے ہیں ہم جو آنکھ کو بادام جھوٹ ہے
گردش کا اپنی گردشِ ایام ہے سبب — گو وہ کہیں کہ گردشِ ایام جھوٹ ہے

دربار جب کہ آگیا سب عیب آگئے
آخر تھوٹ نیست سرانجام جھوٹ ہے

اسی طرح جس وقت فصیح الملک نواب مرزا داغ کا انتقال ہوا تو الانس ان ضاحک کی پہلی نوع ضیعیت نہ ہوگی اور نواب نے یہ قطعہ ارشاد فرمایا۔

یارس جمیر آئے اجل نے مٹا دیا
گویا کہ داغ صفحۂ ہستی پہ داغ تھے
تھے باعثِ نشاط کبھی مورثِ صداع
بلبل تھے ناچ گھر کے کلب گھر میں زاغ تھے
گھبرائے تھے ولایتی چکر کی سیر سے
مخمورِ حسنِ کیفیتِ بام باغ تھے
محفل میں ان کی پورٹ نہ ورکی نہ شامپین
سیندھی کے موتیا کی فقط کچھ ایاغ تھے
شائستہ لیڈیوں کا نہ مطلق تھا واں نشاں
ہاں تھے تو مولیوں کے پتے تھے سراغ تھے
باتوں میں چرچے تھے طبیعت میں شوخیاں
روشن خیال تھے نہ وہ عالی دماغ تھے
کس نے کہا کہ تھے وہ کسی روشنی کے لیمپ
وہ تو الہ دین کے طلسمی چراغ تھے

غزل

پیٹنٹ

ڈیرونج! اُردو شاعری پر ڈا اعتراض ہے کہ شاعر کے خیالات حدت کا مادہ نہیں۔ اعتراض کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اب ایک شق پر بحث کریں گے۔ شاعروں نے صرف چند اصطلاحات لسانی لے لیے ہیں جن کا فراق اور وصال میں دکھڑا رویا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کیا خدا نے کوئی عضو بیکار بنایا ہے یا کوئی عضو ایسا بنایا ہے جو اس شق کو محسوس نہ کرے جو سر سے پیر تک مخلوط ہوتا ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ صرف دل و جگر آنکھ سینہ پر ہی کا نگار سلسلہ ہے اور باقی اعضا جو شاید مادۂ عشق قبول کرنے اور متاثر ہونے میں ان سے زیادہ قابلیت رکھتے ہوں چھوڑ دیے جائیں۔ ہماری رائے میں سب کو رجہ بہ رجہ اور رتبہ بہ رتبہ پیار کرنا چاہیے۔ اس عمل درآمد کے بعد ہمارے شاعری کے اسکول والوں سے بھی صلح ہو جائے گی۔ بہرصورت ایک نئی غزل اس نئی طرز میں ہونی چاہیے۔ یہ مشتے نمونہ از خروارے لکھنا چاہیے۔ راستہ ہم نے بتا دیا ہے اب شاعران نگیں بیان طبع آزمائیاں کریں اور اس طرز جدید کو آسمان پر اڑا لے جائیں۔ حق ایجاد بنام موجد بحق پیٹنٹ ہے۔ اتباع و تقلید کی اجازت عام ہے۔

معدہ میں آگ عشق کی بدستور جلتی ہے — پھیپھڑوں کی دھونکنی مرے سینہ میں چلتی ہے
گردوں نے دلِ عشق میں آفت مچائی ہے — تلی غم فراق میں ہاتھوں میں ملتی ہے
چھینک آئی ہم نے شکر خدا کا ادا کیا — اس راستے سے ناک کی حسرت نکلتی ہے
کروٹ بدل رہے ہیں شب ہجر یار میں — آنتوں میں زور شور سے بندوق چلتی ہے
تارے گنا کیا ہوں پڑا ہجر میں شب فراق — اتنی دبی کہ ریڑھ کی ہڈی اچھلتی ہے
دانتوں کا دستہ رس نہ ہوا گر کشش یار تک — سچ ہے کہ نصیب کی کب دال گلتی ہے
شیرو شکر تھیں عشق میں یہ بھی بلا ہوئیں — لو آج پسلیوں میں بھی تلوار چلتی ہے
تصویر یار ہم نے لگائی دماغ میں — کچھ کچھ شبیہ فراق طبیعت بہلتی ہے

برسات آئی پھر وہی گڑبڑ مزاج ہے
پھر پیٹ میں فساد ہے پھر اف نکلتی ہے

رنگ میں بھنگ

اصغر

(سید اصغر علی نام تھا۔ شاہ پور ضلع فتح پور کے رہنے والے تھے۔ بذلہ سنج شاعر تھے۔ اودھ کی سابق میں کلرکی کرتے تھے۔ کلام میں شوخی اور ظرافت کا لطیف امتزاج ہوتا تھا)

یہ محرم میں ہولی کا تہوار
ہنسی صورت ہے اور دل بیمار
گر پڑے تھک کے پردہ ہائے چشم
جب نہ آیا ستم شعار عیار
لگ گئی آنکھ موت آ پہنچی
ہو گئی خواب مشترک بیمار
روح قالب سے سیخ کر نکلی
[illegible]

نظر آیا بہت بڑا میدان
عرصۂ حشر جس کا باج گزار
کوہِ آتش فشاں وہیں بالکل
دھوپ سے تیز مہرِ آتشبار
ایک بڈھا ضعیف ریشا میل
نظر آیا بہ صورتِ غمخوار
پیٹ میں آنت تھی نہ منہ میں دانت
جھرّیاں جسم میں پڑی تھیں ہزار
ضعفِ پیری سے تھک گیا تھا مگر
سر پہ جنساں تھا صورتِ معیار
پائے ماندن نہ جائے رفتن تھی
تھی عجب مخمصے میں جانِ نزار
کچھ ہراس اور کچھ بڑھی ہمت
بڑھ کے دو اک قدم ہوا دوچار
پڑھ گیا چند آیتِ قرآں
کر کے دم دوم میں لایا جسم زار
دل میں آیا خیال ڈر کیسا ہے
تم بھی تو آدمی ہو ہمت دار
حضرتِ خضر سبز پوش ہیں یہ
یا ہیں درویشِ کامل و دیندار
پھر یہ آیا خیال ڈر کے ساتھ
ہو نہ انساں یہ کوئی آدم خوار
ایک ہی لقمہ میں نگل جائے
مجھ کو حلوا سمجھ کے لذت دار
بھیجا لاحول کہہ کے بسم اللہ
دل میں ڈھارس بندھی چلا ناچار
پہنچا اک دم میں اس فقیر کے پاس
نہ بھی آنکھوں سے اس کی سالتِ نور

میں نے پوچھا کہ کون ہو کیا ہو
اپنا مجھ کو بتا تو نام و دیار

کس کے تیرِ نگاہ کے گھائل ہو
کس کی چشمِ سیہ کے ہو بیمار

بولا وہ مرد نیک خوش اسلوب
حال کیا پوچھتے ہو تم اے یار

تیغِ ابرو کا میں نہیں گھائل
نہ سہی ورد و وش کا عاشقِ زار

انقلابِ فلک کا مارا ہوں
دل پہ اٹھی ہے در و کی دیوار

لوگ سب سو رہے ہیں غفلت سے
ان کے افعال پر ہوں میں خنداں

فرطِ غم سے جو کھل گئیں آنکھیں
مٹ گیا سب طلسم کا گھر بار

وہی کنجِ قفس وہی فریاد
بسترِ غم ہے اور اصغر زار

اودھ پنچ کے لطیفے

ایک بنئے پر بے ایمانی، دغا بازی کی بدولت صاحب مجسٹریٹ کے حکم سے بید پڑے۔ یار دوستوں نے لالہ جی سے ہمدردی کے کلمات تاسف کہنا شروع کئے تو لالہ صاحب نے فرمایا جی نہیں کوئی بڑی بات نہیں میں ایسی پیٹھ پیچھے کی باتوں پر خیال بھی نہیں کرتا۔

س: ذرا بتانا سورج پچھم میں کیوں ڈوبتا ہے اور پورب سے کیوں نکلتا ہے؟

ج: یہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ تم سے پوچھوں گا بتا دے گا

س: اسی لئے تو میں آپ سے پوچھتا ہوں۔

ایک شخص نے کسی سے پوچھا کہ تم نے اتنی کم عمر عورت سے کیوں شادی کی؟ اس نے جواب دیا سنا نہیں عذاب میں تو مجھ سے جتنے اسی قدر اچھا۔

ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ عورتوں کے پیٹ بھی کوئی بات ہضم کر سکتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں صرف ایک بات یعنی اپنی عمر۔

ایک شریف نے کسی حکیم سے پوچھا کہ اس دماغ روشن سے دماغ کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچتا۔ حکیم نے جواب دیا ہرگز نہیں۔ کیونکہ جن کے کچھ بھی دماغ ہے وہ اس سے لگتے ہی نہیں۔

متبرک مبارکی

مبارک وہ کالے جو ستائے جاتے ہیں۔ کیونکہ آسمان کی راست، انہیں کے واسطے ہے۔ مبارک وہ جو سول سروس کے لئے نہیں ہیں کیونکہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی مبارک وہ جو قحط کے بھوکے پیاسے ہیں کیونکہ پادریوں کی بدولت عیسیٰ مذہب

شرف ہوں گے۔ مبارک وہ جو سنگ دل ہیں کیونکہ بعض خوشامدی اخبار رحم مل کمیں گے۔ مبارک وہ جو راست بازی کے لئے جھکائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سچائی کے چرخ مضبوط ہو جائے گی۔ (۱۱ ستمبر ۱۸۷۷ء)

ایک دلایت سے تازہ وارد انگریز کے سامنے ایک گائے کی چوری کا مقدمہ پیش ہوا۔ صاحب بہادر کا اجلاس سے فارغ ہونے پر قضا صاحب بہادر گائے کا نام سن کر گھبرائے اور کہا کہ گائے عدالت میں حاضر کیا جائے۔ اہل عملہ اور فریقین نے عذر کیا کہ گائے کو قصبے پر ہیں آسکتی۔ آپ چلے چل کر ملاحظہ فرمائیں۔ جب صاحب پہنچے گئے اور گائے کو دیکھا تو فرمایا "او کالا لوگ ہم کو بہت کھراب (خراب) کرتا ہے۔ ہم نے گائے پکا تا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ بیل کا نیم ہے۔

مصرب لقمان نے باوجود علم و ہنر کے کوئی مکان نہیں بنایا۔ ایک عقیدتمند نے جاں بخش تعلیم ہوئے۔ ملک الموت نے پوچھا کہ باوجود اس بڑی زندگی کے آپ نے مکان کیوں نہیں بنایا؟ آپ نے جواب دیا کہ جس کی تاک میں آپ ایسے رہیں اس کو مکان بنانے کی کیا سوجھتی ہے۔ (ا۔ ج۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۷۰ء)

حضرت اور مرچ صاحب! سال عیسوی اگرچہ بہت سست رہتا ہے مگر میں اس کو سست رہت خشک کہتا ہوں۔ کیونکہ نمی کا تو کہیں نام ہی نہیں۔ بجز جھٹی میں سمان نباہی ہے۔ خوشۂ درخت بے آبی سے صورت ریگ ماہی ہے۔ چوپاروں کا درخت دامن کو لپیٹے ہوئے خشک کی طرح کھڑا ہے۔ سبزہ سموم جانستان سے مسموم ہو کر تزع میں پڑا ہے۔ دانۂ گندم صلی موجودگی سے داد جان کو بہشت سے نکالا تھا۔ اب اس کی عدم موجودگی، دنکی اولاد کو پھر وہاں پہنچا رہی ہے (۱۶ اکتوبر ۱۸۷۰ء)

ایک صاحب نے اپنے شائستہ و تعلیم یافتہ لڑکے کی تعریف میں فرمایا کہ "حضت ماشا اللہ یہ لڑکا نوٹ ہے جہاں پہنچا دیجیے لایا"۔ ایک صاحب خوشامدی بیٹھے تھے بول اٹھے کہ "بجا ہے پیرو مرشد اگر کوئی دختر نیک اختر ہوتی تو چشم بد دور وہ بھی بل آف ایکسچینج ہوتی۔ (ا۔ ج۔ ۸ جنوری ۱۸۷۸ء)

ذرا بتلانا تو سہی کہ انگریزی حمام زیر بار کیوں ہے اور ہندوستانی حمام فارغ البال کیوں ہے، وہ تو بول خود بار بردار ہے۔ مال بردار (۵ جون ۱۸۷۷ء)

زبان نہ جاننے کی خرابی

ایک ہندوستانی نے شیخی میں آکر ایک موقع پر جہاں خاصا مان نہ ملتا تھا کہہ دیا کہ میں خاصا مان گرمی جانتا ہوں۔ ایک صاحب بہادر نے اس کو نوکر رکھ لیا اور دن ہی روز فرمایا کہ انڈے کا بیل کر لاؤ۔ یہ بیچارہ کیا جانے کہ بیل انگریزی میں اُبالنے کو کہتے ہیں۔ اس نے جانا

صاحب بہادر فرماتے ہیں اس کا بیل بنا لاؤ۔ اب یہ حیران ہوا۔ کبھی صاحب بہادر کے چہرے کو دیکھتا کہ کچھ پی تو نہیں گئے۔ اور کبھی اپنی طرف دیکھتا کہ میری سماعت میں تو فرق نہیں آگیا۔ بڑی دیر تک کھڑا ہوا سوچتا اور صاحب بہادر کو تکتا رہا۔ آخر کار ناچار ہو کر کہہ دیا کہ "صاحب! میں حضرت عیسیٰ نہیں ہوں جو انڈے کا بیل بنا دوں کسی اور کربلا بیٹھئے خانہ ساماں گری دیں جانتا ہوں مگر معجزہ کوئی اور جانتا ہوگا۔

بارہ بجے سے چوکیدار حلوائی کی جوڑ میں سو رہا تھا۔ گل کاشتا اپنی قسمت کو رو رہا تھا کہ ایک خوش وضع رنگین طبع شاعرہ نے اپنے شوہر سے میٹھی میٹھی باتیں اور دلربائی کی ادائیں شروع کیں۔

میاں ہم نے ایک غزل کہی ہے مگر سر ٹیک مارا مطلع نہیں موزوں ہوتا۔ لگے باتوں ہی مطلع نہیں کہہ دیتے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

بہتے ہیں مدام آنکھوں سے یہاں خون کے دریا ۔۔۔ یہ کام تو ہرگز پئے قلزم سے نہ ہوگا

اتفاق سے چور چپکے چپکے بیٹھا باتوں سے سن رہا تھا اور طرہ یہ کہ چور بھی شاعر اور حاضر جواب۔ فوراً ایک شاعر کے یہاں چوری کی۔ سوچتے ہی دیر ہوئی تھی کہ مطلع باندھے مسلسلتان کھڑا ہوا۔ اب قیامت کا سامنا ہے۔ بولیں تو مشکلیں کسی جائیں۔ چپ رہیں تو ذہن کند ہو جائے۔ آخر رہا گیا ایک دفعہ یہ آواز بلند بول ہی تو اٹھے کہ ؎

کہ دا کوئی یوں گھر میں تیرے دھم سے نہ ہوگا ۔۔۔ جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

(از "ناقد سرشار" اودھ پنچ ۱۵ مارچ ۱۸۷۸ء)

ایک دن صاحب کو حاذق سازنما کو ہی شیرہ ڈالنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بیٹھنے کے پاس گئے اور کہنے لگے "بے شیراع ہے شیراع؟" میں اپنے مخرج سے کچھ نہ نکلا، بعض کے ساتھ خارج ہوا دنیا کھڑا گیا اور ہنسنے لگا "صاحب! اتنا گاڑھا منیو تو نہیں ہے جس کا نام ہی مشکل سے نکلے۔

ایک شخص نے اپنے لڑکے سے پوچھا کہ تم مکتب میں کون سی کتاب پڑھتے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا قرآن۔ پوچھا کون سی سورت؟ کہا لا اقسم بہذا البلد۔ یہ سورۃ کی ابتدائی آیت ہے۔ باپ نے کہا آگے پڑھو۔ صاحبزادے کو اور کچھ یاد نہ تھا۔ فرمانے لگے "والدی بلا ولد۔ (اور میرا باپ جو کہ ماں ولد ہے) والد محترم جھلائے اور کہنے لگے اپنی جاں کی قسم ہے گھر میں تیرا سا چہ پیدا ہوا ہے۔ لا ولد ہی کہنا چاہئے۔

پروفیسر: کیوں بھئی بیرا! صاحب خانہ تشریف رکھتے ہیں؟

بیرا: حضور وہ تو نہیں ہیں۔

پروفیسر: اور یہ کھڑکی سے جھلک کس کی دکھائی دی؟

بیرا: وہ نہیں ہیں ان کا سایہ ہے۔

پروفیسر: اُفوہ! میری عقل روز بروز کمبی ہوتی جا رہی ہے۔ سائے کو آدمی سمجھنے لگا۔

جج :- تو تم نے اپنے شوہر کے سر پر کرسی دے ماری اور وہ ٹوٹ گئی ؟
ملزمہ :- مگر میرا ارادہ نہ تھا۔
جج :- یعنی تمہاری نیت حملہ کرنے کی نہ تھی ؟
ملزمہ :- میری نیت کرسی توڑنے کی نہ تھی۔

ایک صاحب کو ضعیف شادی کی تلاش تھی اتفاق سے ایک بی صاحبہ مل گئیں۔ انہوں نے بھیجا پیام دے دیا۔ اب آپس میں لڑائی کی بحث چھڑی :-

بی بی :- سنئے صاحب۔ میں اپنے بیکے بالوں کے ساتھ نہ زیبا ہوں گی آپ کو حق منع کرنے کا نہ ہوگا۔
میاں :- منظور!
بی بی :- بیٹھے بٹھائے جوتی بھرا نیوں کھانے کی عادت ہے۔
میاں :- کچھ مضائقہ نہیں۔
بی بی :- سینا پرونا بالکل نہیں جانتی۔
میاں :- آپ ہی ننگی پھریئے گا۔
بی بی :- کھانا پکانے کی عادت نہیں۔ نکوڑا جو ملے میں سر کون دے۔
میاں :- خیر تو فاقہ کرنے میں ابدا آپ ہی کو ہوگی۔
بی بی :- بھئی میرا مجاز (مزاج) بھی ذری جل کوکڑا ہے۔
میاں :- بی وہ تو اپنے نہیں آپ ہی کھولتی۔
بی بی :- کسی کسی وقت جو خفقان ہوتا ہے تو میہ سپاٹے کو چلی جاتی ہوں۔
میاں :- خدا کا ملک وسیع ہے۔ آپ کی ٹانگ لنگڑی نہیں۔
بی بی :- شعر کہنے کی بھی لت ہے۔ رات کو اکثر مشاعرے میں شرکت کرتی ہوں۔
میاں :- عیب نہیں شعر گوئی تو ہنر ہے۔
بی بی :- ہاں سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ جھوٹ بھی بولتی ہوں۔
میاں :- تو میرا سلام۔ یہ مصیبت برداشت کرنے کے قابل نہیں۔

کسی بخیل سے بہادر کی تعریف پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ بہادر وہ ہے جو غیر کے منہ سے نوالہ چبانے کی آواز سنے اور نہ مرے۔

ک

صاحب کا کتا مر گیا۔ خانساماں رونے لگا۔

صاحب: ۔ دل خانساماں تو بہت کتا کو بہت پیار رتا تھا؟

خانساماں: ۔ حضور جب کچھ نہ پہنچے تو پانی تو پر میں تھا۔ کی بیاں پیالے زبان سے چاٹ کے صاف کر دیتے تھے۔ میں دھونے دھلانے کی مصیبت سے بچ جاتا تھا۔ ہائے اللہ! اب کون برتن صاف کرے گا۔

اسکندریہ کے ایک باغ میں علی ابراہیم خاں صاحب کسی درخت کے نیچے پڑے سو رہے تھے۔ بچے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ نیند کم بخت ہے کی بھی ہے۔ موش نہ رہا تھا۔ اتنے میں ایک چوہا آیا۔ اس سے بوتلوں کی ڈاٹ سے طلائی دانتوں کی جھلک جو دیکھی تو منہ میں پانی بھر آیا۔ آہستہ سے ہونٹ کے شیبی غائب کر دی۔ پہلی دو چلی لاحول ولا قوۃ۔ خاں صاحب کو جب ہوش آیا۔ ٹھنڈی ہوا کی جھونکی سے نکلے ملنے بڑھی۔ بھی موتوں۔ سے خالی پھٹا آیا۔ بوٹے مسوڑھے چوہا بیٹھے گھر آئے۔

ایک بنیا عمل کالا رہا آنکھوں سے جو کس کچھ ڈنڈی نزاد کے بھروسے ہیا آیا کہ کسی کنوئیں میں دھرو دھکا۔ اتفاق سے کوئی انیوانی صاحب بھی اب میں اوپر نیچے۔ دیکھ سکھے ڈوبتا دیکھ۔ غوطے سے اس کنوئیں کے اندر۔ بنیا گھبرایا کہ ارے تو لوں۔ انہوں نے کہا ابے تو کون۔ اس نے کہا بنیا۔ آپ نے کہا تو لاحول ولا قوۃ ۔ ۔ ۔ (۳۰ اپریل ۱۸۷۸ء)

ایک ۔ ۔ ۔ گورے دل پر ہاتھ سے چل گئی وہ جب تک چوتڑے سے اینٹ اکھاڑے میاں سپاہی نے اڑنگے پر لاٹھی سے مارا چاروں شانے چت۔ ۔ ۔ پٹ بھائی پر چڑھ بیٹھے۔ اب حضرت برکھ بانے ہوئے تو کیا کہتے ہیں۔ اتنا اس وقت تو نہیں۔ آئے دو ابل والی۔ تو سہی ماری نقل بنوا کے گدھے پر سوار کر دوں۔"

میاں سپاہی۔ بھی بولی یہ کیا موقوف۔ اسی وقت ہماری ران کے نیچے گدھا موجود ہے۔" (۲۶ مارچ ۱۸۷۸ء)

مرزا صاحب نے شاگرد کو ڈانٹ کر کہا تھا "ل" نکالنے کو کہا تھا۔ بانس اسے بار بار کہا کرو۔ یہ بھول گیا۔ بہت تیسے استاد کی ایسی تیسی۔

ایک کچہری کے منشی بھی سن رہے تھے۔ سمجھے کہ انشا۔ اللہ شاید کوئی بہت ہی عمدہ انشا ہے۔ پھر بھی انشا میں مہارت کم ہے۔ جھٹ مطبع نولکشور کا بنوریں وغیرہ اسپیل روانہ کر دیں کہ ایک جلد انشاء اللہ کی جلد بھیجئے۔

لالہ جی کی ڈاڑھی میں سفید بال نکالنے لگے۔ ایک پرانے رفیق مدت کے بعد جو ملے تو کہا "بھائی تمہارے تو سفید بال ہو چلے۔ حضرت فرماتے ہیں "جی مضائقہ نہیں۔ دل تو ویسا ہی سیاہ ہے۔"

کسی شاعر کا سالا مر گیا۔ اس نے تاریخ وفات کہی ؎

سیاں مجھ جو ذاکر حق تھے — رات دن ذکر حق رٹا کرتے

گریۂ موت نے جو آ دابا — کچھ نہ بولے سکائے "ٹے ٹے ٹے"

بتج ہی ۔ تین بار = ۱۲۳۰ھ

صاحبنامہ

روس "سنا کانفرنس مین کہدینا کہ مین طب سے راضی ہون۔ اور بہت خوش ہون نہیں تو پھر ہے اور تم ہو"

"منقول از فن"

پولیٹکل شطرنج

اشرح کیفیت تو الگ صفحہ پر دی گئی ہے یہاں صرف اسقدر بتا دینا کافی ہے کہ سیاہ بازی روسیہ کی اور سفید بازی انگلینڈ کی ہے۔ اور چال روس کی ہے

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ساہوکار قرضہ داس

فتح ہے لمبی تھیلی والے کی!

انڈے بچے والی چیل چلہاڑ

مفتی سجاد حسین

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے چہرے کی رونق بڑھانے خرامان خرامان نسلیف لائیں اور بلی انیٹی صاحبہ چپ شاہ کی باگ نہ پکڑیں۔ بنی سنہ ہیں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی تو یہ کہیئے۔ بولیں اور بڑی کھیت بولیں اس طرح بولیں جیسے ارہر کے کھیت میں ایندیت بٹیر بلکہ گابھا بھاٹے کے فصل مچھا کے سارا شہر سر پر اٹھا لے جس میں یہاں سے لندن تک تو خیر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ انٹی بھائی ہیں چنانچہ یوں تو عرصے سے سٹرچیٹ جلسے کرتے تھے اور بعض حضرات اپنے تئیں ایک حق ادا کرتے تھے یا مستقل بننے کی کوشش کرتے تھے مگر جب دیکھا کانگریس کا اجلاس ہے ہی آپ یہاں اور لفٹیننٹ گورنر بہار بھی شہ میں تشریف فرما ہیں، اُدھر حضور وائسرائے بھی دربار فرمانے والے ہیں۔ چھٹی سرکس بھی تماشے کر رہا ہے، الغرض پلیگ بھی تماشے کرنے آئی ہے۔ ان حضرات کو مثل عاضہ متعدی پنج پنج چھوٹی بڑی بیماری ہیجان میں آ ہی گیا اور ایک بار آنکھ بند کر کے کہا کہ "اظلم الزمان" انڈین کانگریس کا انتہا دے ہی دیا۔ کس کی رہی اور کس کی رہ جائے گی۔ وقت گذرا جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ خلاصہ اشتہار ملاحظہ ہو:

"بجانب مسلمانان شہر لکھنؤ۔ تاریخ ۳ نومبر ۱۸۹۹ء بمقام باغ کانگریس کا جلسہ سالانہ لکھنؤ میں ہونے والا ہے اس میں کچھ تجویزیں قرار دی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ وہ کل باشندگان شہر کے ہیں .... حالانکہ اس شہر کے قریب قریب کل باشندے چہ مسلمان ابتدا ہی سے کانگریس کی مخالفت کرتے ہیں لہٰذا تدارک بے پر لازم ہے، جس کے لیے ایک بڑا جلسہ بجانب مسلمانان لکھنؤ بتاریخ مذکور نو بجے انوار کے دن مکان انجمن رفاہ عام قرار دیا گیا ہے لہٰذا استدعا ہے کہ وقت مقررہ پر تمام حضرات اہل اسلام اس جلسے میں مع اعزا و اقربا و احباب و متعلقین کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ بنیں۔"

یوں تو اشتہار کی کئی باتیں ایسی ہیں جن میں اکثر ..... گفتگو ہے مگر ایک بات اس بیان مندرجہ میں کو بہ پوچھا ہے کہ متعلقین کو بہ تکلیف دی گئی ہے اس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اپنے اپنے بھائیوں سے کچھ بعید نہ سمجھیے کہ بغیروں کی طرح مع متعلقین جمع ہوں آ وجود ہوں۔ کیا معنی کہ جب اعزا و اقربا و احباب کے علاوہ متعلقین کو بھی بلوا آپ نے فرمایا ہے اور یہ بھی فاضل المشتہر خصہ یعنی

خان بہادر نظیر حسین خاں صاحب کلیم، نواب اخگر صاحب، مرزا عباس علی خاں صاحب بکریڑی، حکیم محمد رضا خاں بہادر، شیخ علی عباس صاحب کبیل جاتے ہوئے کہ مقطعین بل گھر کی یعنی گھر کے لوگوں، یعنی بڑوں کی والدہ یعنی اے بی یعنی بیگم خاتم صاحبہ یعنی جوروجی یعنی زوجہ مظہر اللہ پانچ بھائی آنکھیں اور پانچ علی، وس فتہ ہر ہی الی یوم الوقات بل لعبد الملمات کو کہتے ہیں تو ان ذات شریف کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کوئی گھر باقی نہ رہی اس طرح مقطعین سڑاں گھوڑ دوڑ کے علاوہ میں اکثر اتفاق ہوتا ہے اس طرح یہاں ہی آنکھیں گلاور یہ بھی دور نہ سمجھے کہ تب سایا گھر لیوں شریک ہوگا تو اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا۔ جو اصیں پیش قدمتیں، نیز خوارچہ جس سے ابھی شیکہ لگا ہوگا اور دانہ ابھرنے میادات نکلنے کی وجہ سے چڑچڑا ہوگا۔ پھر اس کا وہ رہ، پانا، جھجھنا، چیخنا، آنا، جھوجھو، مع برا دلرصاحبی اس کے علاوہ بکری کا بچہ جو ہر گوش اور ہر چوتھے طبلے کا خیرہ جو بہ یزکم کرتا ہے اور خاص اس صلعت سے آنے کا کہ رپولنے والے کی لوریاں یاد کرلے ماد جی نکلنے کا ہلا آنا، ہمساجزادے، لطفو، تفضیل کا بالا، ہ الینڈی کنے کا بلا، چھوٹی ساجزادی کا گلہری کا بچہ باقی گھر خاص، ساتھ ہی گھوڑوں کی ایک مرغی کا پانچ پیروں کے قبیلے، حکیم صاحبہ کا پاندان یعنی سب کچھ دان آفتابہ آبخورہ گلدان، طشت، ملدانی، ڈھکنا، پانی کی صراحی، کچھ نے کا ڈبیہ، بچے کے پوتڑے نہالچے، لحاف، توشک، سلاسنی سے سب کچھ ہوا چاہیں، یعنی موسم ہوا چاہیے اس کا کہ سامان کیا کیا ہے اور وہاں بڑی بات تو یہی جاتی ہے یعنی ان سب کا کرایہ کون دے گا۔ بی صاحبہ تو خیر ان کے لگیں گی کہ بہت بڑی کوٹھی ہوگی۔ وہ ہے اگر یہ کرنا نہ دینا چڑانو مقطعین کیا معنی متعلقین کے متعلقین یعنی تو ہر ان اور ہر دو اور بھی کہ بہت ہے۔ طبلے ہیں گے۔ پھر اگر مع اولاد اور احباب و متعلقین کے بلانا چاہتے ہیں تو پہلے حبلے کی جانب سے سوا لیوں کا بندوبست ہونا چاہیے تو پھر اللہ نے چاہا تو کل دھرنے کی جگہ نہ ملے گی۔ اپنی بھاتی جو اہل کان اپنا اپنا کھٹلا ہے وہ موجود جلسہ ہوں گے۔ طاعون والے جلسہ میں تو دکانیں بند تھیں اس دفعہ چھ لطے تک گھروں میں نہ گھر ہوں تب کہ سند مل جائے اسناد نعالی۔ ایک بات شہر صاحبان بھول گئے متعلقاتین کو تو طلب کیا مگر رنڈیوں، خانگیوں کا کہیں ٹھکانہ نہ کیا جو اب لیا یعنی ساری دنیا کے متعلقین ہونے کا بیشبہ اٹھائے ہوئے ہیں اور معاملہ فہمی کا یہ حال ہے کہ بی بدن چوڑھا ان، غیرہ وغیرہ کا تجزیہ ذاتی لوخال اپنی بازوں کو کیا بڑے بڑوں تک کو ہوگا پس ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لینا یعنی ہوائیں اور نہ دور جانیں۔ اس کے کیا معنی کہ جہاں ٹھیہاں پاگلیاں ڈوبیاں ہوں وہاں چوپلے نہ ہوں۔ واللہ اپنی وہنی، تو چاہ رمان کی بات ہے۔ رسالہ تو انھی سے پڑتا ہے۔ اگر اس تقریب میں انھیں نہ بوچھا تو ہتوں سے برادری نرک ہوجائے گی اور شادی بیاہ جو یا نچ کا نلوں کے جلسوں میں کوئی رنڈی منڈی ایک نہ آئے گی اور سفر والیوں کو جو شکایت ہوگی وہ ناک پر جدا جدا سمجھ لیں۔ ان کی پیشوائی گو فرسٹ بھی اندرونی قوت رکھتی ہے ان کا سکہ دلوں پر چلتا ہے، ان کے طبلے کی تھاپ مانک مٹی تو سارنگی ہنری ماٹی مجیرے گلزم گن سے زیادہ توڑ رکھتے ہیں اور بی صاحبہ تو پوری ڈائنامیٹ، تارپیڈو ہی ہیں۔ ان کے توڑ کا کیا پوچھنا بلکہ سچ پوچھو تو یہ لوگ سُرنگ ہیں جن سے اکثر خاندان کے خاندان اڑ گئے۔ پس ان کی زد سے ضرور بچنا چاہیے۔

ساتھ میں لے کے اپنے یاروں کو
مینڈکی بھی چلی مداروں کو

کھلے خط و سربستہ مضامین

منشی سید محمد سجاد حسین مرحوم (ایڈیٹر اودھ پنچ)

(۱)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن صاحب مدظلہ العمرہ!

عاشقِ خیر نصیب شما باد۔ اپنے زمانے میں جبکہ جاہلوں طرف سے سرائے نہ وسماء، ہر ملک سے ہر مذہب و ملت کے لوگ چلے آرہے ہیں تمہارے حق میں اس سے بڑھ کر نامصب دنیا میں شاید ہی کوئی اور رہا ہوگی۔

تم دانا و واقف ہو گے اور اگر نہیں تو اب کان پھٹ پھٹا کر سن لو کہ یہ تمہارا بوڑھا ماں انٹ، تجربہ کار زمانہ دیدہ فلسفی حکیم، مورخ، پولیٹیشن اور خدا جانے کیا کیا دوست ایسا تا ایک خیال اور نا منصف نہیں کہ محض نسلی ہٹ دھرمی، اقتدار دیکھ کر تمہارے ہاتھ میں ایک طرفہ رائے قائم کرے اور اس کے دوسرے پہلو کی طرف سے آنکھ اور ارادہ اپنی وزنی اور سیاہ پٹی سے آنکھیں بالکل بند کر لے۔ آج کل ہزاروں دوست ہیں تو لاکھوں تمہارے دشمن۔ ہم اچھا کہتے ہیں تو بیس برا بھی جبکہ یہ سب ہوا کے رُخ اپنا ہمراز رائے چلاتے: انصاف کا لحن ہرگز کام میں نہیں لاتے لیکن یہ تمہارا دین ملک، ملک کا سچا بے ریا، بیکا، سولہ آنے ٹوپل، دوست خیر خواہ، جاں نثار اودھ پنچ ان عیوب سے ایسا دور ہے جیسا روس ایران یا سندوستان کی نمک حرامی سے۔ یہ مصلحت وقت دسترس انجام کار سب باتوں پر غور کرتا اور تمہاری ذمہ داریوں، فرائض منصبی، مشکلات عہدہ کو خوب جانتا تو چاہتا ہے بیشک تم کو چند آدمیوں نے بنا لیا ہے مگر واقع ہے دو صورتوں میں بنایا جاتا ہے:

اوّل: جب واقعی اس میں صفت بنائے جانے کی پائی جاتی ہو اور کھلی باز نہ پنے ڈھب کا اسے پاتے ہوں۔

دوسرے اگرچہ وہ فی الحقیقت اس قابل نہ ہو مگر اتفاقاً کچھ حرکات سکنات یا معاملات کی ظاہری صورت ایسی ہو جائے کہ لوگوں کو غلط فہمی واقع ہو۔

بہر نوع دل لگی بازوں، دور سے تماشا دیکھنے والوں کا الو کہیں نہیں گیا۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ اور میں تمہارے

اعمال ماسبق و حال پر انصافانہ غور کرتا ہوں کہ سکتا ہوں کہ تم بچارے درحقیقت ایسے برگز نہیں جیسا تم کو آج کل لوگ خیال کرتے ہیں۔

مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ تم بن گئے اور خوب بن گئے بخت و اتفاق کو کوئی ڈوریلی روک سکتا ہے گو یہ آہن مگر اب خوبصورتی کا ٹوٹا پھوٹا تھا سے ہی سہی اور سچ بھی یہ ہے کہ اس کے مستحق بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمھاری نارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی۔ فاقہ و فلاح، آرائش و زیبائش، ظاہری ٹیپ ٹاپ، اور پری میس پوت کے واسطے تمھاری ذات مخصوص ہے مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم جیسے ہندوستانی جوت سے۔ تم پولیکل رسترخوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمتگار ہو۔ پکا پکایا کھانا تیار مانڈی تو خوبی سے چن سکتے ہو مگر مانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکاتن کے پھول۔ تم نہیں جانتے کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون مصالحہ کیونکر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز سے کاوٹ آتی ہے، پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں، نارن پالیسی کا مزہ اور قبض کیونکر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے، کہتے ہیں جو کوئی چھچھوندر مارڈالتا ہے اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو مگر اب یہ ضرب المثل ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی اور کابار سب تیار کرے۔ پھر دسترخوان لگانے اور حاضر خدمتگار بلا لیے جاؤ تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کام تمھارے سپرد ہوں۔ یہ خدمت کچھ کنسرو ٹیوٹی خوب جانتے ہیں لیکن ہر دست کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ اس دفعہ کی الٹ پھیر میں تمھارا تو وہی حال ہوا ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کھانا تیار نہ رسامان درست مگر دعوت (جنگ) کی وہ دھوم دھام کہ عالم گونج رہا ہے۔ دناخواندہ مہمان ہیں کہ چلے آتے ہیں بلکہ ایک آدھ تو آستین ہاتھ دھوئے قرار واقعی ہنھے مارنے پر مستعد ہیں۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو تمھارا قصور نہیں۔ جن لوگوں نے اس دفعہ تم کو بلایا اور وہ نہ سمجھے کہ کھانا تو اس دفعہ رکابداروں نے ہنوز تیار نہیں کیا۔ ہم ان کو باورچی خانے سے کیوں نکالے دیتے ہیں۔ اب عین وقت پر کون ہتھیلی پر سرسوں جمانے آتا ہے۔

اشارہ کنایہ بطرف صاف صاف یہ ہے کہ آجکل تمھارے واسطے بڑے بڑے افکار آموجود ہیں گو خزانہ و فوج دونوں ہر طرف سے اطمینان ہے مگر مجدد شیطان مارتا نہیں پریشان تو ضرور کرتا ہے۔ خیر اس کی نوبت خدا نہ لائے۔ فی الحال اہل الرائیوں نے تم کو اور بھی بوکھلا رکھا ہے جو ہے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی اٹھاتا ہے مگر صلاح کی صلاحیت ایک میں نہیں۔ سب اپنے دل کی آرزو پیش کرتے ہیں اور تم جانو صلاح و آرزو میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لحاظ سے میں اپنے دست و قلم کو تکلیف دیتا اور تمھاری دماغ خراشی کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو فارن معاملات آج کل کیسے پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ مصر اور وسط ایشیا کے معاملات تو

کھمبے۔ دو بڑے ستون ہیں جو مجمعہ مسجد کی طرح دوری سے سربلند کیے کھڑے ہیں۔ باقی ٹرکی کا تمدن، فوج کی حفاظت میں، امیر کی تماشبینی پر ہما میں کشیدگی، مغربی افریقہ میں جرمن کی بہبودگی، یہ سب امور اگرچہ فرداً فرداً خفیف ہیں مگر بہ ہیئت مجموعی اطمینانِ خاطر کے دشمن جانی ہیں۔ بہانہ ملے تو میں صاف کہوں کہ اکثر یہ وقتیں تمھاری قوم کے غلط قیاسات اور تقرضات سے پیدا ہیں۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی وہ اکثر غلط نکلی۔ چنانچہ مصر کا معاملہ لیجیے تم بغاوت کو قومی نہیں شخصی سمجھے مگر دیکھا۔ ایک عربی گیا مہدی سودانی (یا سوڈانی) آیا۔ اس کو زیر کرو دیکھو کل ہی عثمان دغا کو جو ہے۔ عثمان کو بھگا دو یا گرفتار کرو دوسرے کوئی ان کے بھائی بند بلاسے بر ہما پیدا۔ پھر آج تک خیال کرو کتنی تختیں پاشیں، کتنی شکستیں دیں۔ باغیوں کو کیسے کیسے کنویں جھکائے لیکن بارہ برس بعد کہنے کی دم وہی ٹیڑھی۔ جب دیکھا مصر کا قوام وہی بگڑا ہوا۔ کوئی بادشاہ ہو، صاحب تخت و تاج ہو اس کو زیر کیا، تخت و تاج لے لیا، دارالسلطنت پر قبضہ کیا۔ یہاں سب ایک سرے سے لنگوٹی بند؛ خانہ بدوش۔ ادھر سے بھاگے اُدھر ہوئے، اُدھر سے آئے اِدھر ہو رہے۔ بھلا ایسوں سے الجھنا اپنی بات کھونا نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر کسی حصّہ ملک کو ان کے حوالے کر بھی دیا تب بھی مطلب حاصل نہ ہوگا۔ کیا وجہ کہ مہدی ملک مانگتا ہے نہ سلطنت اس کو تو تجدید اسلام کا خبط ہے۔ ادھر اطمینان ہوا کہ مکے اور ٹرکی پر چڑھا۔

وسط ایشیا میں تمھاری کارروائی چنداں قابل اعتراض نہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اچھا یا بُرا کیا کہا جاوے۔ باقی اس کابل سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ بلاشبہ تم کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ اس کی وہی مثل "کچھ نہ کرنا بھی بُرائی کرنا ہے" جہاں تک تمھارا بس رہا ہاتھ پاؤں نہ ہلائے مگر اب تو روس محوس کے سر چڑھ کر شیطان چڑھا۔ اب تو وہ خواہ مخواہ افغانیوں کو بچاتا ہے۔

چونکہ یہ مضمون طویل ہے اور میں سمجھتا ہوں تم کو بھی آج کل کام کی کثرت ہے میں اس خط کو ناتمام چھوڑتا ہوں۔ اس بحث کو دوسرے خط میں لکھ کر ان سب کے علاج بتاؤں گا۔ تم گھبرانا نہیں۔ دیکھو اوسان نہ جانے پائیں۔ گرنیول ایسے وقت میں کام کا آدمی ہے۔ ڈفرن کی مدتعلی قابل صاد۔ زیادہ عمرت دراز باد۔

(۲)

بنام مسٹر گلیڈسٹن

مولوی گلیڈسٹن صاحب طول عمرہٗ!

دعائے صحت و عمرت میں اپنے پہلے خط میں وعدہ کر چکا تھا کہ دوسرے ہفتے اپنے خیالات روشن سے تم کو مستفیض کروں گا۔ تم سمجھ کہ پولیٹکل معاملات پر منحصر نہیں عموماً ہر کام میں ایفائے وعدہ و راستی تقریر پر بہتری زمانہ جو ہر انسانی تصور کی جاتی ہے لہٰذا زیادہ زحمت کش انتظار نہیں رکھتا اور مخاطب کرتا ہوں:

میں نے اپنا سلسلۂ سخن اوس دفعہ وسط ایشیا تک پہنچ کر چھوڑا تھا۔ وہ نام ہے کہ جس نے بہتوں کے

ہی چھیڑا دیے ہیں۔ اس سے نہ اپنی ہاف کوئی اشارہ نہ سمجھنا میرا دستور ہے کہ ہر کس و ناکس سے پتے کی دل لگی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے اکثر اپنے ہی دانت کھٹے ہو جاتا ہے اور مجھے سردست تخصیص (قومی) ملکی سب مصلحتوں سے قطع کو بدل کرنا منظور نہیں۔ کیا وجہ ایک قوم یونہی صورتاً میرتاً بچھیا کے باوا تھے۔ اس پر آج کل کی چرکٹھنیں نے اور بھی کولھو کا بیل بنا دیا ہے۔ بہ استثنا خاطر قوم ہو ہی رہے ہو۔ اگر ووٹ آف کریڈٹ کی ٹھنڈائی تو یقینی قوم سے ہنسی خوشی رخصت ہو۔ ہاں لیجسلیٹو میں تیتیے سے غباری کرنا شروع کر دو گے۔ دل کی بازوں کا کیا بگڑے گا۔ ہماری کارسلطنت میں خلل کا اندیشہ ہے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ مجھ لو کہ آج تم نے استعفا داخل کیا اور کل روسی ہر آب پر قابض۔ وہ لوگ بڑے فائدہ پسند اور بیباک موقع شناس ہیں۔ تم وقت گزر جانے کے بعد گدی کی طرف چوٹی جھٹکتے ہو وہ دو قدم آگے سے اس کی پیشانی والے چار بال اس پھرتی اور چالاکی اور استواری سے پکڑتے ہیں جیسے ہمارے مسٹر ٹیپو کا ٹور یا نازک بدن زوجہ مجھو بے جھوٹے، جب وہ شخص از راہ غرور و عشوہ کسی دن اس کے واسطے نہانا نہیں چاہتی۔

اچھا اب عصر سے چلو۔ واقعی اگر تم میں کچھ انصاف و شرم و کا نشس ہے تو تمہارا دل ہی جانتا ہوگا کہ اس را سی پینسل نے کیا کیا گل کھلائے اور زمانہ تاریخ میں کیا کیا سفاکیاں کرائی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ چھوٹی چیز سے ہی سہولت کی وجہ سے تو بہت تخفیف کی ہوتی ہے مگر موقع اور موقع کی بدولت بڑے بڑے کارنگل اور پھوڑوں سے کو نے سبقت لے جاتی ہے مصر بچارے خود کچھ نہیں اس کی سوزنائیں پاور یعنی سلطان کچھ تو اپنے ہاتھوں اور کچھ نوکروں، دفادار رعیتوں کی بدولت ہندستان قابل خوف و خطر نہیں لگر یہ بھی معلوم رہے کہ تمہاری یورپین طاقتیں سب مصر کے ساتھ ملی ہیں حصہ بخرہ لگانے کو موجود ہیں۔ وہاں یورپ کی ناک پہنچ کر تم چاہو کہ کوئی ایشیائی کارروائی بے مل و خش کر جاؤ یہ محال ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم کو اپنے زمانہ طفولیت کا قصہ یاد ہے کہ ایک دفعہ ہمارے دوستوں میں کشتوا لڑا تھا تم جانو جہاں کشتوا لڑتا ہے۔ کٹے کٹوے چوٹا نے یونہی ہاتھ کی صفائی دکھانے کو باناری لونڈے لاٹھی بھی اور گدا بھی درٹھی اور دھیلی لکڑیاں بڑھائے رہا کرتے ہیں۔ ایک صاحب اس بلا کے جلد باز اور عجلت پسند تھے کہ جب تک دوسری طرف تھپ کے آپ انہیں کنکیوں سے اُلجھ جائیں۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے۔ اچھے اچھے سُدھ کنکیوے اور نفیس ماتھا سب اسی میں صرف ہو گیا ہے اور جب اُدھر کا سر پر تڑ بڑایا تو حضرت ہاتھ لگانے کی جگہ ڈھونڈنے لگے، پس مصر کی کارروائی بہت کچھ اس سے مشابہ ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ یہ ساری گل افشانیاں تمہاری ہی جودت طبع کا نتیجہ نہیں۔ یہ قضیہ بھی گزشتہ وزارت نے نزکہ چھیڑا ہے اور تم بچارے کے سر پڑا لیکن یہ بھی تو سمجھ لو آخر قوم نے ایسی ہی ایسی خرابیوں کی درستی کے واسطے تو تم کو تخلد ان وزارت دلوایا اور تم نے قبول کیا۔

علاوہ اس کے بہت سی بے عنوانیاں تو خاص تمہارے ہی صدقے میں واقع ہوئیں۔ بھلا جنرل کارڈن کو بھیج کر تم خاموش ہو رہے۔ پھر اس بچارے کی خبر بھی نہ لی۔ آخر مروا ڈالا اس سے تمہاری کتنی بدنامی ہوئی۔ اب یہی

دیکھ کر تو سر چیمبرلسٹن وسطایشیا میں بھلا رہے ہیں۔ دیکھو جتنا تمہارا فرقہ کمست وخون سے محترز تھا اسی قدر اب باعث ہوا ہے۔

خیر تو دامستان پارینہ ہے۔ اب مطلب کی یہ بات ہے کہ کرنا کیا چاہیے۔ خداوند کریم تم کو عقل اور ناصحان مشفق کی بات پر توجہ دے تو سب کچھ درست ہو جائے۔

اس امر کا تصفیہ کہ آیا مقصد مہم حاصل ہوا کہ نہیں تو میرے نزدیک کوئی نہیں کر سکتا۔ اپنی جب کوئی مقصد ہو تب تو دیکھا جائے۔ وہاں سرے سے تنزل اور مہم کا روائی تھی۔ مقصد بھی اسی طرح پورے ہوتے ہے پس اب استفسار ہی کس بات کا کرنا لازم آتا ہے۔ اب تم اپنی فوج ٹھکانے ٹھکانے بھیجاؤ۔ ٹرکی کو اول تو اس لائق نہ رکھا، دوسرے اگر کسی حکمت عملی سے، یا ہو گے کہ اس کی فوج، ہاں بھجوا دو کہ وہ بھی حیران پریشان ہو۔ تی پھرے تو یہ سمجھ لو کہ تم وہی غلطی پھر کرو گے جو اس فتنہ عظیم کی بنا ہے۔

شاید تم اپنی جبلی اقصی سے اس پلیٹ جملے کو فوراً نہ سمجھ گے مگر مجھے سر دست صراحت منظور نہیں۔ مناسب ہوا تو پھر کبھی بتا دوں گا۔

اب رہی کوئی اور یورپین طاقت خانہ خود طلبی تو اب تو ہر اروالوں کے ساتھ یہ حال ہے ؎

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

ہاں ایک اٹلی ہے، سو میرے نزدیک جیسا فتنہ چہ بیدار عقلاء کے نزدیک کچھ نہ سہی مگر حال میں فرانس نے تم کو زک فاش دی۔ فرانسیسی اخبار بند کروا کر مصر سے معذرت کرانا آزاد پسند شاہی کے خلاف تھا مگر تم سے ہم کو اول روز وزارت سے ایسی ہی امیدیں تھیں۔ وزارت سابق میں تم امریکہ والوں سے کہا ہو۔ جنیوا میں چونہ چلتے پر زے جمع ہوئے اور تمہارے معذرت کرانا پڑا۔

وزارت حال پر آنے سے کچھ روز پہلے تم نے سلطنت آسٹریا کو سخت سست کہا تھا۔ منسٹری نصیب ہونے پر تمہاری پہلی حرکت، کا تاوان دینا پڑا۔

سالہا کہ نکوست از بہارش پیداست

پس تم نے تو بار پا شاہ سے معذرت کرالی تو کون سی بات کی۔ ہم نے اپنی ٹوپی اتار لی اس کو اور کیا کہا چاہیے۔

لیکن حال کی پیچیدگیوں کو دیکھتے تم نے کمال حلم اور بردباری کی۔ اس پر میرا اصرار ہے۔ میں اس کارروائی کا مخالف نہیں۔ واقعی ایسا ہی چاہیے تھا۔ کاش خدا تمہاری ایسی ہی موقع شناس عقل رکھے۔ جس دھن اور ڈھب پر ہو اسی پر قائم رہو

(۳)

بنام مسٹر گلیڈ اسٹن

مولوی گلیڈ اسٹن طول عمرہ!

آج کل زمانہ ایسی جلد جلد کروٹیں بدل رہا ہے اور تم بھی اس کے ساتھ وہ قلابازیاں کھا رہے ہو کہ معلوم نہیں اس تغیر کے پہنچتے پہنچتے تمہیں ہڑپ کون کون جدید گل کھلیں اور کون انوکھے شگوفے سر بلند کریں۔ اسی جہت سے میری دعا یہ ہے کہ تم چیٹ پٹ اور سخن لو اور اپنا راستہ پکڑو۔ باقی اتفاقات کا چکر تو کسی کے روکے رک نہیں سکتا جو جس کام کے واسطے بنا ہے جب ملت موقع پائے گا اپنی علت غائی پوری کرے گا۔

تم سمجھ رہے ہو عثمان دیفا زار روس اور اس کے ارکان سلطنت، ارسٹل جرنیل، علی خانوف، کروف بے وقوف جن کی بے ایمانی پر زوف آخر عالم اسباب میں جھگڑے فساد، قتل و غارت ہی کے واسطے آئے ہیں کہ میری آپ کی طرح علوم، فنون، حکمت، فلسفہ، تہذیب، ترقی کے واسطے جان کھپانے، کوشش کرنے۔ یہ مانا کہ تم نے درگذر کے معاملہ محفوظ کیا مگر حوالہ زمانہ کی سی دراز دستی یہ سلسلہ ختم ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ پس جو بات کرو، مانے کے موافق ہو۔ نہ پٹے ط ہیں سب تقصیریں لکھ دی ہے کہ اگر تم مصر کے جھگڑے کو یوں چھوڑ جاؤ گے تو بڑی خطا کی۔ جن کا کچھ بس نہ تھا ہیں نے ان کی قلعی بھی کھول دی۔ پس اب سوا اس کے کوئی صورت ہی نہیں باقی کہ مصر میں اگر ویسو پالیسی یعنی فنا فی کی حکمت عملی بالکل ترک کی جائے۔ مہدی و عثمان دیفا وغیرہ کی عداوت سینہ بے کینہ سے آزاد ہو۔ اب جس قدر قبض و تصرف ہیں ہے اس پر ایک دفعہ آیۃ الکرسی پڑھ کر پھینک دی جاوے اور اسی طرح اس کی محافظت کی جاوے جیسے ترکی اپنی ساری بھول پیٹ کے نیچے چھپائے رہتی ہے۔ اگر حملہ کرو تو دفاعی، مقابلہ کرو تو محافظتی۔ ساری فوج بلا لینا اور ملک کو اس سے تہ بتر کر کے چھوڑ دینا یہ کس خدا نے بتایا اور کس انجان نے سکھایا ہے۔ اب لازم ہے سب افواج دو تہائی مناسب محفوظ پر جمع رکھو کہ مصر والوں کے کام بھی لا سکو اور سرحد ہندوستان کے جھگڑے میں بھی لا سکو۔

اب رہا روس کا جھگڑا، اس کی کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی کے ساتھ حسن عقیدت ہوا کرتا ہے کسی کو اپنے کسی دوست سے ایسی امید ہوتی ہے کہ مرا۔ برخلاف ترصہ حرکات دیکھتا جاتا ہے مگر عقیدت نہیں جاتی۔ کوئی بزرگوار اپنی زوجہ محترمہ کی جانب سے وہ حسن ظن (ظن نہیں) رکھتے ہیں کہ آیت حدیث غلط ہے

حکم جور و جی بر از حکم خدا است
آنچہ جور و جی بفرماید رواست

کسی کو کسی حکیم طبیب ڈاکٹر پر وہ اعتقاد ہوتا ہے کہ مریض حضرت قلم کا ریتے وسناں کر رہے۔ خدا گنج کی نوابادی کو ہر روز ہزاروں کا چالان بھیج رہے ہیں مگر یہاں سے جائے دوراں حضرت ہی ہیں۔ کسی کو کسی وکیل صاحب پر اطمینان ہے

کہ مسلمانوں سے اس قدر دور جیسے الگ بیٹھا ہے مگر یہاں سارے عالم کا قانون انہی کی نوک زبان پر ہے۔ بعض کو کسی شاعر پر عقیدہ ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا مل کر بھی اس پر ملامت کناں ہے مگر آپ کو وہی کلام مرغوب و مطبوع پس اسی طرح سمجھ لو تم کو بھی روس کے ساتھ حسن عقیدت ہے۔ تمہارا دل و دماغ اتنا وسیع ہی نہیں کہ روس کی چالاکیاں اور فریب کے دفتر کا ایک حرف بھی اس میں سما سکے۔ تم بیچارے اس کے فتنہ و فساد کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ تم میں فرہودیت کا وہ جوش ہے کہ تم جان نہیں سکتے۔ ان سلطنت، صولت و شوکت شہنشاہی، شکوہ و شان قیصری کیا ہے۔ پھر اس کی کمی بیشی کا اندازہ تم کو کیا خاک بتھرل سکتا ہے۔

الغرض اس حسن عقیدت نے تم کو گمنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ علاوہ اس کے دو حماقتیں تمہاری قوم سے ایسی ہوئی ہیں کہ مدتوں تک ان کا اثر بد تم کو سہنا پڑے گا۔ اوّل تو مختلف تعصبات مذہبی، فاتو پرستی، تنگ نظری کی بدولت تمہاری دونوں پارٹیوں نے سلطنت ٹرکی کو ایسا ضعیف اور نحیف کر دیا کہ روس کے ساتھ کلہ بکلہ لڑنے والا کوئی نہیں رہا۔ یونان کی بادشاہت نئے سرے سے قائم ہو گئی۔ کہ سنڈم میں اسلامی سلطنت خلل انداز تھی وہ قوت ہیں کہ ہوتی یگر یہ بھی سمجھ لو تم نے ایک دوست کے ساتھ گھاٹ کے وقت پر آنائی کاٹی، سلطنت دشمنی کے خلاف کیا۔ یہ تمہاری کوتاہ فہمی ہے کہ دنیا کی بادشاہت کو مذہبی سلطنت سمجھتے ہو۔ اگر مذہب کو بادشاہت میں ایسا دخل ہوتا تو سارے پیغمبر اور اولیا درشی اور منی بادشاہت ہی کرتے۔ تم نے ایک طرف مذہبی تعصبات پر قطع اطرایا اور دوسری طرف مذہبی عناد و عداوت کو ڈھیل دیا۔ حال کی جنگ روم و روس میں اگرچہ کنسرویٹو پارٹی برسر حکومت تھی اور جو امر فروگذاشت ہوا اس کا عتاب تو اب اس کی گردن پر۔ مگر انصافاً کہو کہ تم اس پالیسی میں کیسے شریک غالب رہے۔ جھوٹ یا سچ جو کچھ وہ کرنے والے تھے تم نے ہفتہ ہفتہ بھر میں دو دو لمبے چوڑے رسالے شائع کر کے ان کو باز رکھا۔ بگیریا کے مظالم رکھنے کو تو آپ کا قلم خونیں رقم رواں دواں تھا مگر اب فرمایئے بارہ سو افغان سرحد پر کٹ گیا۔ آپ کی کمیشن کی توہین ہوئی۔ اس کے ساتھ کے لوگ بے جنگی فصل سے کھیت رہے۔ جاڑے پالے کے مارے ٹھنڈے ٹھنڈے ملک عدم کا راستہ ناپنے لگے۔ مصر اور سوڈان اور خرطوم میں انسانوں کی قربانی کرا ڈالی۔ اس پر جو رنج طبع صرف نہیں ہوتی۔ ؎

بس گرسنہ خفتہ و کس ندانست کہ کیست
بس جان بہ لب آمد کہ بروکس نہ گریست

المختصر روس کو غلبہ نصیب ہوا۔ پھر اس کا نتیجہ کھلا ہی رکھا ہے کہ وسط ایشیا میں کارروائی کرنے کو اب سلطان کو اپنی طرف ملا تو لیا اور جدا رکھو تو کیا۔ اب تو روس ذرا ذرا سی بات پر ان کو دھمکا کر اپنی طرف سازش پہ مجبور کر سکتا ہے۔ بہت رعایت کی نیوٹرل رہنے دیا۔ اس حماقت کا خمیازہ تمہاری حیات میں کیا بعد تک انگلستان کو بھگتنا پڑے گا۔ تمہاری قوم جس قدر ٹرکی سے مغائرت کرتی جائے گی اسی قدر غرور لایعنی اور تنخر فضول کے ثمرے اٹھائے گی۔

دوسری عطا یہ ہوئی کہ جب معلوم تھا کہ افغانستان پر ہم قبضہ نہیں رکھ سکتے۔ اس میں آمدنی نہ صنائع۔ قوم پر دشش پائیتی ہے۔ تجارت چل سکتی ہے تو پھر شیر علی خان سے روٹھنا اور کابل قندھار فتح کرنا سراسر فضول تھا۔ اس میں اتنی بات ہوئی کہ فوج شریک نہ تھے۔ لیکن آمد و رسد پہنچانے کی خدمت تمھارے ہی سپرد ہوئی۔ اس میں تم نے اپنی حماقت صرف کی یعنی سارے کارروائی کا لعدم کر دی حالانکہ قندھار پر قبضہ رکھنا لازم تھا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب روس نے قدم بڑھایا اور تمھارے کمیشن کی سخت توہین کی۔ میں اس جگہ اس سے بحث نہ کروں گا کہ تم سے اس بارے میں کیا غلطیاں ہوئیں مگر اس قدر ضرور کہوں گا کہ جو چال تم چلے وہ بری چلے۔ اگر کوئی اچھی سوچے بھی تو انجام خوش اسلوبی نہ ہو سکتا۔ کمیشن سرحدی کی تجویز ایسی معقول تھی کہ بایدو شاید مگر وہی دم کی کسر رہ گئی جس کا اعادہ فضول ہے۔

اب رہا بقیہ پنجہ یہ دمر دھکیل و چرانی بعدہ جوتا لتی کا معاملہ ٹھہرا ہے۔ اس کی نسبت بھی کچھ نہ کہوں گا جو ہونا تھا ہو گیا۔ قدرے اشارات پر عمل نہ کیا۔ تمھاری قوم اور تمھارا خدا اپنے سمجھ لے گا۔ اب واقعی انگریز عظمت و شجاعت کی نظر میں گر گیا۔ سر پیٹر لمسڈن سا افسر کمیشن روس کے چالاک اور چلتے پرزے

"اور وہی خانوف سے مقابلے میں دوسرا خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اب ؎

قرن ہا باید کہ تا یک لمسڈن از بطن مادر آید

صاحب خیر شود یا نہ برگ ڈپلومیٹ

نہ یعنی صاحب نہیں بلکہ یہی سر جو آج کل مصر کے مختار ملی میناروں اور وسط ایشیا کے لق و دق بیابانوں میں ہم آپ ٹکرا رہے ہیں اور یہ یعنی پیٹنے والا آرملاست فاعل ہے یعنی پھینا، ٹین یا دن آواز توپ و بندوق۔ پس مطلب یہ کہ ایسا سر پیٹنے والا کہ لمس کرنے سے دل سے چھوٹ جاتا ہے۔ آدمی کاہے کو چاندی کی بارود ہے۔ ٹھیکی کا تار پیڈو ہے مگر افسوس تمھاری کاہلی سے روس نے اس کو محض آتشبازی بنایا۔ کمیشن سمیت بے چارہ ہچکچا کر رہ گیا اور اب اگر پھٹا بھی تو کمیشن سے مستعفی ہو کر، بد کے گوسنے کی طرح سیدھا اپنے گھر کی طرف راہی ہوا۔ اب اس سکھڑ بھلائی کو تہ کر رکھیے اور سارے کمیشن کو بلا لیجیے۔ لندن ہو یا ڈنمارک بلجیم کا روائی کیجیے۔ اس کے بعد جب قضیہ وین برسر زمین فیصل کرنے کی نوبت آئے تو اپنا کمیشن سینٹ پطرس برگ سے نہیت کمیشن روس بھیجیے کیونکہ پولیٹکل معاملات ایک طرف یوں بھی دو شخص جب کسی جگہ اس طرح ملنے کا بندوبست کرتے ہیں کہ ایک طرف سے ایک دوسری طرف سے دوسرا چل کر مقام پر پہنچے تو وقت سے خالی نہیں ہوتا۔

اب رہی شاہ ڈنمارک کی تالتی۔ یہ سچ ہے کہ تالت صاحب کی ایک بیٹی زار روس کو ایک پرنس آف ویلس کو بیاہی ہیں۔ دونوں سلطنتوں سے قرابت قریبہ ہے مگر تم اس قدر زور سمجھ لو کہ گو وہ بادشاہ اعزاز میں قدیم ہے مگر بادشاہت اور ملک گیری سے بالکل محروم ہے وہ ایسے بادشاہ کے واسطے تمھارا سا

، زیر بہت مناسب تھا۔ اس نے اپنا ہی ملک چیزوں وغیرہ میں دے دلا کر مختصر کر رکھا ہے۔ وہ ملک گیری اور ملک داری کی لذت سے بالکل ناواقف ہے) اس کے علاوہ میں پوچھتا ہوں اس کی نظروں میں روس اور انگلستان کو جو قرابت کیوں برابر ہونے لگے۔ ہاں تم کسی جدید منطق سے ثابت کر دو کہ جس طرح شمشاد روس کو ایک بیٹی بیاہی ہے اسی طرح ہماری قیصر ہند ملکہ معظمہ کو دوسری تو البتہ میں بھی برابر سمجھوں ورنہ بادشاہوں میں ایسی باتوں کو مانیں تو زار روس ہی کیوں انگریزوں کو ستائیں۔

تمہاری کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روس جس حصّہ ملک پر قابض ہو گیا ہے وہ بہ رضامندی امیر کابل اس کے رہے گا۔ آئندہ کا وعدہ لے لیا جائے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم مغالطات میں مبتلا ہو کر مقصد اصلی کو اس طرح سنٹے سے نکل جانے دیتے ہو جیسے چوہے دان سے چوہا یا ہاتھ سے زندہ مچھلی۔ امیر تو وہ ویران حصّہ ملک جو بہ قبضہ روس آیا ۳۰ مارچ کو بیع کر چکے اور تم سے دام بھی راولپنڈی میں وصول کر چکے ان کو پروا ہی کیا۔ تم نے جس مصلحت سے افغانستان کو دو طیف دیے تھے نہ کیے اس کا نتیجہ ہے کہ روس کو بڑھنے دیتے ہو۔ اگر روس کو بڑھنے دیتے ہو تو پنجدہ، جلال آباد، قطع، پناہ، راڈیرہ جات پر فوج جما کر منتظر روس بیٹھو۔ پھر امیر کی اعانت کی ضرورت نہ وظیفوں کی حاجت اور اگر ہمسائگی روس نہیں چاہتے تو ایک چپہ زمین نہ لینے دو باہر (جس پر وہ کوئی دن میں آیا ہی چاہتا ہے، روس کے سر مڑھو اور قندھار پر خود قبضہ کرو۔ جی چاہے دام دونوں کے اپنے خوانے سے دیتا۔ روس بیچارہ مفلس ہے ——— سب لینا دینا چھوڑ کر اکیلے مہر پہ رقم مچرا ہوئی۔

اگرچہ جانتا ہوں تم میری باتوں کو کہ سمجھتے ہو مگر اتنا بھید بتاؤں کا کہ یہ سامان تیاری افواج جاری کیے اس کی مدد ملت پارلیمنٹ روپیہ دے گی اور روس دبے گا، افاغنہ ایران اور بخارا نہ بچائیں گے وحشی اقوام عبرت کی نظر سے دیکھیں گے۔

چونکہ یہ آخیر خط تھا کسی قدر طویل ہو گیا ہے۔ اب مجھے اور شاگردوں کو تعلیم دینا ہے۔ تم کو چند کے کوئی خط نہ لکھوں گا۔

مکرر ایں کہ ان تمہ معاملات کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے خرخشے ہیں وہ بھی اس درستی کے ساتھ خود درست ہو جائیں گے۔

(۴)

بنام ملکۂ وکٹوریہ (قیصر ہند)

ملکۂ اسکندر حشم دامت ظلہا!

اگرچہ تمہارے ملک و حشم کے آئین و قوانین ملکداری رفتہ رفتہ ایسے ڈھرے پر آ رہے ہیں کہ حاکم وقت

کو انتظام مہمات میں خود سری و خود رائی کے نتائج رہوا۔ پہ سواری کی نوبت نہیں آتی اور محض زمانہ کی ہوا، قوم کی نبض دیکھ کر اپنی رفتار مطابق کر لیتا ہوتی ہے۔ مملکت ایک ٹرین ہے جس کا انجن پالیمنٹ۔ چند چلنے پرزوں کی قوت اور کام سے واقف ہونا مباحث ملکی کی سردی گرمی سے ریلوں کی سلنڈر کی رفتار پر نظر رکھنا اور ٹرین چلانا صرف کاریست کو ذاسیتہ حاکمہ زیبا ہے اور باقی دنیا کے سے بکھیڑے جھمجھٹ پارلیمنٹ کے۔ اور وزراء کے حوالے بگر پھر بھی بندہ بشہ بگھوارۂ عالم کے نشیب و فراز زمانے کی سردی گرمی وماخ پر تو کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کرتی ہے۔ چونکہ میرے علم و یقین میں تم بھی انسان اشرف المخلوقات ہو لہٰذا تم کو بھی ایسے خوشوں سے معرّا و مبرّا نہیں پاتا اور ضرورت یہ لکھنا ہوں کہ بعد تعلیم و تلقین گلبۂ اسلمی چند کلمات تمہارے گوش ہوش تک پہنچا دوں۔

آج کل معاملات کا قوام بہت کچھ بگڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر تعارہ اور اولوالعزمی کی جانشی اندازۂ اعتدال سے بڑھ کر علاوت مکداری میں زیادہ تیزی رکھائے تو چنداں ناگوار نہیں گذرتا۔ کیا وجہ کہ وہ تو ایک باطنی بنگ ہے جو کبھی کبھی ٹھوٹ کر اثر پیدا کرتی اور موجیں دکھاتی ہے مگر صلح اور امن کی حالت متعدد شہرت بذوری مستمل ادنی سی کمی تیزی میں بگڑ جاتا اور خدا جانے کیسی الٹی پٹی تاثیرات پیدا کیا کرتا ہے جب کوئی فعل درجۂ اولیٰ سے گزر کر متعدی ہو جاتا ہے تو ایک شخص کی ذات تک محدود نہیں رہتا ممکن ہے کہ بہت سے اور کا وقوع ایک کو ناپسند ہو مگر ضرور نہیں کہ ہر ایک بھی اسی قدر کراہت کرے۔ پس انسان لاکھ چاہے نہ چاہے طوعاً و کرہاً بہت سے افعال اسی وجہ سے کرتا ہے تم بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو بسب سے اہم اور ضروری کام عموماً حاکموں اور خصوصاً تمہارے واسطے زمانے اور قوم کی رضا پر نظر رکھنا ہے۔

زمانے کا چلن آج کل پر کیا منحصر ہے، ہمیشہ آگے کی جانب رہا ہے چستی اور سستی عارضی امور ہیں مگر میل اور رجحان اسی جانب ہے۔

قدم وقت بیشتر باشد

گاہے ماہے وقفہ یا لحظہ زیادہ تیزی اور سرعت کے ساتھ رواں ہونے کو ہوا کرتا ہے۔ جیسے آندھی آنے سے پہلے ہوا میں سکون کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح جب عالم اسباب میں تولید واقعات کمی پر ہو تو سمجھنا چاہیے کہ مادہ گھنی اس دفعہ بڑے بڑے گھن گرج جھول نکالنے والی ہے عقلمند اور انجام بین ہر وقت چوکنا اور ہر کام کے واسطے مستعد رہا کرتے ہیں۔ تم بھی ایسی ہی ہو مگر اتنی کسر ہے کہ تمہاری قوم کثرت کامیابی اور خوب سامان سے اس قدر مغرور اور متکبر ہو گئی ہے کہ اب بلا خوض و فکر اور دہنے بائیں دیکھے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ہر چیز کو اعلیٰ اور افضل سمجھتی ہے اس سے علاوہ دیگر نتائج کے یہ نقصان ہوتا ہے کہ وقت پر چند ایسے امور ناپسندیدہ و ناطبوع سے سامنا ہو جاتا ہے کہ جن سے طبیعت میل کھانی ہے نہ گوارا کر سکتی ہے۔

عالی ہمتی اور بلند خیالی اور کارہائے سترگ کرنے کے واسطے خفیف سی لاپرائی اور بلند نظری دبی تمدست انجام دیتی ہے جو ماگیر کو لاٹھی یا چھڑی۔

مگر کون کہہ سکتا ہے کہ بہرام گھاٹ کے پورے مٹھے کی لاٹھی موجب زحمت نہ ہوگی۔

ترقی ہو یا تنزل دراصل دونوں ایک اور ایک ہی دو ہیں۔ صرف نام کا فرق ہے۔ گیند کو دیکھو اور بتاؤ اس میں سے کس مقام کو اونچا اور کس کو نیچا کہہ سکتے ہو اسی طرح زمانے کو چکر یا دائرہ یا چرخ جو چاہو کہو۔ دنیا کے سب اقوام دواں دواں ہے۔ یہ محض ہماری فہم ہے کہ مختلف نام پیدا کرتی ہے۔

حیات و ممات، صحت و عارضۂ ترقی و تنزل چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔ تمہاری قوم تہذیب اور ترقی کے زینے کو طے کر چکی اب اس کو سنبھلنا چاہیے اور بہت پھونک پھونک قدم رکھنا لازم ہے۔ سارا یورپ اپنے واسطے ایک طوفانِ عظیم بنا رہا ہے۔ تمہارا ملک اس سے قبل کئی قدرتی فصل اور مفاسدت کے باعث بہت سی آفات میں شریک یورپ نہ ہو سکا۔ اب عنایت خدا سے تمہاری وہ سلطنت ہے جس پر آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ اب ہر جگہ کی سرد و گرم ہوا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کرے گی۔ اگر تمہاری قوم عقیل ہے تو اس کو لازم ہے کہ

اگر خواہی سلامت بر کنار رہ

پر عمل کر کے پھونک پھونک کر قدم رکھے۔

بہرحال فقد باقتدار پولیٹکل معاملہ سے ننگ۔ مجھے پسند ہے نگاہ استعجاب کی بہم ضروری۔ افعال لازمی اس کے بہت اچھے ہوتے ہیں متعدی میں بوجہ تکبر و فروتنی اور لاپرواہی کبھی وہ نگاہ استعجاب خفیف و تحقیر معاملہ گرگوں ہو جاتا ہے۔

ایک اور امر جو تمہاری توجہ خاص کا محتاج ہے یہ ہے کہ یورپ کے ساتھ سالمہ تمہارے انگلستان میں مذہب کے خیالی باغ و بوستان کے ہرے بھرے سبزہ و شاداب تناور درخت سموم علم نظری و ظاہری کے جھونکوں سے جڑ سے اکھڑ اکھڑ کر گرتے ہیں۔ صرف تھوڑے سے لنڈ منڈ تنے اپنی سخت جانی سے بچ رہے ہیں سو وہ بھی امروز و فردا میں کوچ کرتے نظر آتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم ظاہری، صوری و معنوی طور سے تو بہرہ آزاد ہو کر بادشاہی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتی۔ جس نے حاکم حقیقی کی اطاعت کا بوجھ سر سے پھینک دیا وہ حاکم مجازی کو پہلے سلام کرنے لگا۔ مذہب اب مرد ظاہری مراسم اور آرائش و نمائش کے واسطے رہ گیا ہے اس کے اصلی تصدق و یقین سے مدت ہوئی کہ ناآشنائی ہو چکی ہے۔ اگر کچھ ہے تو نقد کس کی بندوضعداری خلقی اور نیچرل دنیا پر نمایاں کسی کے روکے نہیں رک سکتی۔ آگ، پانی اور ہوا کسی کی مذہب سے اپنی قوت نہیں کر سکتے مگر ان کی قوتوں سے کارخانہ بنانے والے حکماء اور عقلاء کا کام ہے۔

المختصر اسی طرح اور بھی پند امور ہیں جن کو دوسرے خط میں لکھوں گا۔ اب تم جاؤ نارروس کو خط بھیجو میں بھی کانپور کی سیر کو جاتا ہوں۔

(۵)

بنام ملکہ وکٹوریہ (قیصر ہند)

ملکۂ سکندر حشم دامت ظلہا!

میں نے اپنے پہلے خط میں دوسرے کا وعدہ کیا تھا۔ اسی جہت سے اب مجھے ساری دنیا کے بکھیڑوں

اور تم کو اپنی پارلیمنٹ کے جلسوں اور زبان کے اتحاد سے امید کم ہے مگر ایفائے وعدہ کرتا ہوں۔

مسٹر ہیلے نے پیش کیا افتتاحی خطبہ وزارت کا ہے۔ جو کچھ ہوا اور ہونے اور کلیٹ اسٹن نے کیا وہ تو ہو چکا اس کا ذکر نہیں کیا وہ تو تحریر ہی میں ہے مگر اس سے مطلب یہ کہ کو بجز مورخانہ تحریر کے اور کسی لائق نہیں سمجھتا تم نے سالیسری کو وزارت دی۔ اس کا بھی رنج نہیں آخر تو پارٹی کرنی ہی تھی۔ کسی وٹیو وقاب ایلسلے۔ اور ہے بکا ہو رہا ہے کہ کوئی گنتا کا نہیں۔ لیکن ہی انجمن ہی کا نے یا ہے اب نظر تعمق سے یا نظر کیجیے تو ایسے وقت کا ذور ہتا جانا عقلیم باتوں کا ان میں شمولیت بھی شامل ہے۔ جو ان ہو باد شاہوں کی ذات کے واسطے مالی نیک نہیں۔

[illegible] ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں بجائے خود زیرک آدمی ہیں مگر کرتی اور دشمنت کوئی اور بدذہنی مانع ترقی ہے۔

معاملات ہندوستان میں خاص توجہ کے قابل ہیں اور میں اسے ہیں لکھی اس لی۔ آج تک تمہارے لیکچر اور پارلیمنٹ میں جس قدر توجہ ہوئی ہے وہ بالکل ناکافی ہے اور لاپرواہی سے بھلو۔ کچھ تو آزادی اور شورہ بیگی تو کی ہے اور اعزاز فخر میں محفوظ رکھنے والے ہندوستان ہی ہے۔ اگر ذرا ہوا کا رخ بتاتا ہے تو ایک ہفتہ سے کی خواہ کے بارے میں قوم کی [illegible] ہندوستان کے جگر سے ہی جو ہندوستانی [illegible]

بھلا پھر تو۔ یہ کہ یہ اولوالعزم کو جہاں زمانے نے کسی قابل بھی وسعت دی اس نے اسی طرف رخ کیا۔ ملاہ میں اگر یہ ہیں ہیں کا باشندہ نہیں مگر در اصل ہیں کا رہنے والا ہوں۔ ازل سے اس ملک کی خوبیاں مجھ پر اس طرح [illegible] ہوں میں آج کل زار روس [illegible] ہے ہوا کا رخ ہندوستان ہی کی طرف ہے۔ اگر [illegible] تعصب کو [illegible] آپس کی فوج کشی کے وہی ارادے [illegible] عنوان سے ہوتے جس کے جام سے تمہاری قوم آج کل پست ہے اور آخر اس کا نتیجہ جو ہوا اس سے ہیرا یا عکندر ہیں کا دل آگاہ ہے اور تھا۔ جب تک ہندوستان انگلستان کا ضمیمہ و ڈسٹرکٹ بنا رہے گا پارلیمنٹ انگلستان میں اس کا گنبد بھرا ہوگا۔ ووٹوں کا اوٹی سے ادنی گورا ہندوستان میں ووٹ ہاتھ کرجانا زمانے کا تب تک ہندوستان ہندوستان نہ ہوگا۔ لاکھ روپیہ کی بات ہم کو یاد رکھنا چاہیے لارڈ شے کی ترقی ذاتی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک اس کی ذات میں فرق نہ آئے۔ آم تب تک ہی آم ہے جب تک اصلی نہیں بنایا گیا ہے۔ بس اسی طرح ہندوستان اسی وقت تک ہندوستان ہے جب تک ہندوستان کی ذات میں خلل نہیں آیا۔

تہذیب اور ترقی صدق اور راستی کے جانی دشمن ہیں مگر کیسے جیسے مار آستین۔ حکما کہتے ہیں کہ نیکی کو کسی حیلہ سے عمل میں لانا نیکی نہیں اور اسی کو امیشیائی شاعروں کہہ گیا ہے ؎

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ ..... ست ہے

اصلی نیل وہ ہے جو از خود بلا ارادہ سرزد ہو۔ پس مذہب و دستی ہر گز طمع اور نمائش کی آلائش سے پاک نہیں ہوتی تم مہذب لوگ کے جو لمبے چوڑے عہد نامے اقوام نے اسٹامپ پیپر سے اپنے وعدے کو آراستہ و پیراستہ کرتے ہو جس اس ہرمنہ و سانپ سبزہ رنگ، ملیح و لرزا مشوق کی طرح ہو جو انگریزی صابون سے عارضی پاسفا کو دھو کر آنکھوں کے چوندے سیاہ کر ڈالتی ہے۔

پس نتیجہ سخن یہ ہے کہ آج کل کسی کی دوستی اور عہد پر اعتماد نہ کرو عہد نامے چاک کر دو اقرار توڑ دو، دوستی دشمنی کرنے کے واسطے ہوتی ہے۔ انگریزی مثل ٹرسٹ ان گاڈ اینڈ کیپ یور پوڈر ڈرائی (خدا پر بھروسہ کرو اور بارود خشک رکھو) پھل لرد اور دیکھو جنگ گاہ عالم میں کیا تماشہ ہوتا ہے۔

اس انسان میں انحطاط متضاد ہے ممکن نہیں کہ ایک کو اور دوسرا نیا دہ نہ ہو۔ بنی نوع انسان کے بعض افراد کو مصدوم کا ہے۔ کلیڈ اسٹن اور آرد ملیب فوم نے تمدن صالح اور طاقت اصلی بہت کچھ شنوائی نہ دوں اور ہمارے میں نکال ڈالی ہے۔

مثل مشہور ہے آپ کا جہاج۔ تمہاری قوم بڑی خود غرض اور خود طلب ہے تم سے تو چاہتی ہے کہ خدمت لے مگر تمہاری خدمت پر چون و چرا کرتی ہے۔ پس بلسفیت آنحوی تم کو کہتا ہوں اگر اس پر عمل کیا تمہارا بڑا فائدہ ہوگا ورنہ گاڈ اسٹن کی طرح، اس نان سے جس اس کان سے اڑا دیا تو فرمانا تو تمہارا کام ہے۔ اپنے تاج کے نہایت وفادار اور جاں نثار کو پہلے اس تکیب سے جدا کرو کہ تم اس قوم کی طرف سے کوئی عہدہ چھوڑ دو جس کو عہدہ چھوڑنے اور رنگ زیب سے دوستی کے واسطے لیا اور کانٹے بچھا کر مستقیا اس کیا اور نہ اپنے جان کو بچا سکا؟ اس نے بعد ایک بڑا کانٹا نان ہوا، اور اس میں وہ جواہر لگا کر کسی اپنی اولاد کے سر رکھا۔ ہر فرد بشر اندازہ کرتا۔

الکنایۃ ابلغ من التصریح

(۶)

بنام مہاراجہ کشمیر

مہاراجہ صاحب!

آج کل جو یورپ عالم میں وہ لیتاج، عصر کائنات میں وہ بدیع ہے کہ ہر متفس صناع پند و اندرز نظر آتا ہے مگر تم جانور پر ری نگاہ ہو۔ تو ازل سے آج تک کبھی نچلی پڑی ہی نہیں اور خاص کر سیب محل اور موقع دیکھا ہے۔ اپنے مذہب میں آئی پرچھائیں سا فت اور گناہ دونوں بتبال کیا ہے۔ اس واسطے آج تمہی سے لگا لگاتا ہوں تمہاری اہلیت اور معقولیت جو تم میں حد سے زیادہ ہے شاید بھڑک مٹا کر اس بڑھے خوانٹ کی دو باتیں سنتے دے۔

یہ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ ایسے باپوں کا مرنا جو اولاد کو دولت ثروت، ریاست سلطنت چھوڑ جانے والے ہوں دنیا میں چنداں رنج و تاسف نہیں پیدا کرتا۔ بعض جگہ تو ادھر مرنے والے باپ کی نعش پڑی ہوتی تھی اور ادھر

سلاحیارہ بلند اقبال بخت تخت نشینی مناتے ہوتے تھے۔ ایک جلد باز بیٹے نے بوڑھے باپ کو اسی بات پر مار ڈالا کہ تو تو مرے گا نہیں، ہم بوڑھے ہوتے جاتے ہیں یکطفیل ریاست کب اٹھائیں گے۔ پس اب نہ تو میری سلطانی ہے اور نہ فادیا تمہارا اول باپ کا غم منانے کو چاہتا ہوگا یعنی ماضی ماضی۔ اب ریاست کا جھگڑا، حکمرانی کا بکھیڑا تمہارے لیے کیا کم ہے۔

تم نے جو کچھ گدی پر بیٹھتے ہی رفاہ و فلاح کے احکام جاری کیے اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رعیت کے مسائل ہوتے ہیں جبکہ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آج کل کی سلطنت کے موافق بہبود و دستور اور بلا یعنی تکلیف دہ مراسم کی قدر اسی قدر تمہارے ذہن میں ہے جتنی ہونا چاہیے۔ بات تو اچھی ہے بشرطیکہ تمہارے دماغ سے نکلی ہو۔

تمہارا ملک زرخیزی، نفاست، میوہ جات، لطافت، موسم، خوبی آب و ہوا میں عرب المثل بگرسا تھی اس کے بدانتظامی و بدحالی میں شہرۂ آفاق ہیں۔ تمہارے خوشامدیوں نے اگر انگریزی یا اور ہندوستانی عملداری کی تدبیں پیش کرکے تیچ آنکھ اور پرانٹھوادی، عوق نجالت رومال خوشامد سے پونچھ دیا تو اس سے نہ شال بافوں نے گاڑھی کمائی کا پورا ابورہ پایا نہ مغلوک اور کنگال مسلمان خوشحال ہوئے۔

آج کل کی تہذیب کی کنجی یہ شکل ہے:

"ہاتھ پاؤں بچائیے اور موذی کو مرنے دیجئے"

جب تک اس پر عمل ہے مزے سے ڈل میں عیش مناؤ، گل صوغ میں جشن اڑاؤ۔ کس نے پرسہ کہ بھیا کون ہو۔ سرحد کا جھگڑا کچھ ملی کو بیدرد جا میں نہیں رکھتا، سارے ہندوستان اور انگلستان اور افغانستان میں بلکہ کودمچاتا پھرتا ہے۔ ہندوؤں میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں وہ جانتے ہو کس قدر ظلم کرتا پھرتا ہے۔ بازار میں جدھر رُخ کیا، دکاندار کی جان، کاڑی پچھاڑی تڑا کر نو دو گیارہ ہو گئی۔ پس اسی طرح سمجھ لو علتہ العلل نے روس کو بھی سانڈ دیا ہے۔ اس کے علاوہ نوش میں گزنیش گلستان شادی میں خار غم، شیرینی الفت میں چاشنی شکایت، بہار ثبات میں خزان موت، نگاہ میں بھنگ، قلیل میں غلیل نہ ہو تو لطف کیا آئے۔ قدر و منزلت کیا معلوم ہو۔ قدر عافیت کسے واندکہ بہ مصیبتے گرفتار آید۔ صاحب توبۃ النصوح کا قول ہے اگر مرنا نہ ہوتا تو لوگ درختوں سے گر کر، کنوؤں میں پھاند کر جان دیتے۔ سرکس، محض تماشائیوں کی توجہ میں تحریک پیدا کرنے کے واسطے سہواً و عمداً گھوڑوں پر سے گر پڑتے اور دوڑتے ہی میں اچک جاتے ہیں یہ سب کیا ہے۔ بندھی ٹکی دشعداری، سلاست روی کی چالوں میں چہل پہل پیدا کرنا ہے تاکہ دلچسپی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ روس ادھر سے آئے گا نہ آئے گا مگر تم یہ سمجھ لو۔ ٹیکے کا ڈر شیر کا پانی کرتا ہے۔ علاوہ اس کے ناؤ میں خاک اڑانے یا پانی گندلے کا بہانہ تو باسانی مل سکتا ہے۔

آج کل رزیڈنٹ کا تقرر بہتوں کو چکر میں ڈالے ہے۔ تمہاری جو حالت نہ ہو وہ کم ہے۔ برعمل

کارروائی کرنے والے نوگھات کے منتظر ہی رہتے ہیں۔ والیان ملک کچھ آئے دن تو مرتے ہی نہیں۔ غالباً بوڑھا گرم ہے پٹیا جائے مگر تم کو میں ایک گُر بتائے دیتا ہوں۔ تم سب کرنا مگر اوسان نہ کھونا۔ قیام ریزیڈنٹ منظور کرنا مگر سمجھ کے۔

جو حماقت عقل سے نادانی جان بوجھ کر ہو وہ حماقت و نادانی نہیں ؎

من نگویم کہ ایں ممکن آں کن
مصلحت بین و کار آساں کن

اب میں تم سے رخصت ہوتا اور تم کو انگریزوں کے سپرد کرتا ہوں۔ جو پتے کی تھیں نے بتا دیے ہیں اور باقی مفصل مشورے تمھارے ابا جان کو اور مدبر نے سا ابا سانی دیے ہیں۔ اُن پر غور اور عمل کرو گے لطف اٹھاؤ گے ورنہ ما غیر شما بسلامت ع

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(۷)

بنام حضور نظام دکن

ڈیر!

یہ تو مجھے معلوم ہے آپ نے اوروں کے نام خط دیکھ کر کسی قدر رشک کھایا ہوگا مگر تم جانو یہ پرانا خرانٹ ناصح بہت کچھ دنیا دیکھے ہوئے ضرورتوں اور حاجتوں کو خوب پہچانتا ہے۔ جیسی مصلحت وقت دیکھتا ہے کارروائی کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تم کو میرے نصائح کی سخت حاجت اور بے انتہا ضرورت ہے اور آج سے نہیں جب سے تمھارے وزیر باتدبیر سر سالار جنگ اس جہان سے سدھارے اور بقول بازاری عوام کے ع

گل گئے گلشن گئے جگ میں دھنوے رہ گئے

کا معاملہ ہوا یا جب سے تخت ریاست نصیب ہوا مگر تم جانتے ہو عذر معذرت اور سگھڑ بھلائی کا میدان سلامتی سے اس قدر وسیع ہے کہ عمداً پہلوتہی کیجیے۔ نادانستہ غفلت کی، پیچیے کچھ نہ کچھ پیش ہی ہو سکتی ہے اس لیے اگر میں یہ صحیح اور واقعی بات کہوں کہ مجھے پہلے تمھاری طبیعت اور لیاقت اور عقل کا حال دریافت ہونا مقدم تھا تو کچھ بے جا نہ ہوگی۔ چنانچہ اتنے عرصے کی نگرانی سے یہ مقصد پورا ہو گیا۔

انسانی خوبیوں اور بدیوں کے اعتبار سے اگر میں تم کو شریف اور انسانیت کا معدن کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا بلکہ بعض اوقات اپنی طبع وسیع و خلقت گنجائش طلب سے تمھاری انسانیت حیوانیت تک بھی پہنچ جاتی ہے لیکن میں اس کو کبھی بشریت قرار دیتا اور تم کو مستوجب الزام نہیں سمجھتا۔ کیا وجہ کہ الزام اسامان

لوگوں کی بہت بہت صحبت کے اثر سے تو کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے خصوصاً ایسی حالت میں جب ہر طرح کوشش کی جائے کہ نمائش کی جگہ صرف انفعالیہ ہی ترقی پذیر ہے۔ اب بجز اس کے اور چارہ کار نہیں کہ تمام کیفیت حالات عالیہ کو گزاری ہل کو مابین مداخل و مصارف خزانہ بغیر عینک کے دیکھو اور پھر جس بات پر دل کا اطمینان ہو جائے اس پر عمل کرو۔ قدر انتخاب دیوان ہیں ہر ایک ذاتی خوبی کو کام میں لائے۔ قدر دانی ریاست حصول مسرت افزائی سب کچھ کر گذرے و واقعی تک حلول، وفاو رضیر خواہ عقیدہ عالی و بالغ دیوان کے متعلق جو سب واکیا مگر ہے۔

نہی دستار فضیلت را چنیں بود از سر کاہل
کہ بر فرق ادب جیوان شتر بی آید سکندر را

[illegible] جو بعض اوقات سوء ادبی کی سزا تک پہنچ جاتی ہے سب خاک پر ملا دیتی ہے۔ قدر تو [illegible] کہ کر رہے۔ آگے بھیجا کرے گا والیا پائے گا شش ماہ رہے لکھائے پوت [illegible] دربار میں جاتے [illegible] یوں ہے کہ ایک مطلب [illegible] بادشاہ بھی اس کو مانتے اور بہت معزز جملے لکھے [illegible] اپنے اپنے اور کی [illegible] وزارت موروثی کرنے کے واسطے مناسب سمجھا کہ ہمارا لڑکا جہاں جہاں [illegible] ریاست ہی میں حاضر دربار کیا جائے کہ تو غالب ہے بعد میرے بیٹے آقا اور مرشد کے دونوں کو وقت نہ پڑے [illegible] ریاست بھی ملاقات نہاں ان ہر ایک کر رہتے تھے کہ سلامتی سے صاحبزادے پورے صاحبزادے ہی تھے۔ باپ تو ریاست سے وزیر تھے، صاحبزادے اگلوں کے بادشاہ دیکھے۔ ہم وزیر پر ندیر نے طبیعت انسانی کی نزاہت پذیری پر خیال کر کے خیال کیا کہ کچھ نہ کچھ رہے بیٹے ہی سیکھ جائیں گے۔ آگے کام چل نکلے گا۔ چنانچہ ایک روز کس مسئلہ کا سمجھ کر کے خود تو دربار نہ گئے مگر صاحبزادے کو بھیج دیا اور چلتے وقت امور ذیل البطور ہدایت نامہ پڑھا دیے:

اول پہلے بادشاہ اور پھر ولی عہد کو نہایت ادب اور محبت سے سلام کرنا! کیونکہ وہ ہمارے بڑے خواجہ اور چھوٹے خواجہ ہیں۔

دوسرے۔ چونکہ تم وزیر کے بیٹے ہو کسی ایسے ویسے مقام پر نہ بیٹھ جانا۔ جب بادشاہ اشارہ کریں کسی اونچی جگہ پر بیٹھنا۔

تیسرے۔ اگر کوئی بات بادشاہ پوچھیں تو نہایت نرم اور میٹھی باتیں کرنا۔

اب سنیے حضرت داخل دربار ہو کر کیونکر نصائح آبائی و تعلیمات پدری کو صرف کرتے ہیں کہ پہلے جا کے کے ساتھ ہی بآواز بلند پکارے: بڑے کھرجنیا تھکا (مجھے) سلام اور چھوٹے کھرجنیا تو ہوگا (مجھے بھی) سلام۔ بیٹھنے کا اشارہ پا کر آپ لگے بلند مقام ڈھونڈھنے۔ آخر ایک گوشے میں سامانِ روشنی کے واسطے ڈیوٹ کی قطع کی چینر لگی ہوئی تھی آپ اچک کر اس پر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے محض اپنے لائق وزیر کی قدر افزائی کے خیال سے مزاج پوچھا، جواب ملا "روئی ریشم، سمور ناقہ"۔

دریافت کیا کہ کیا مشغلہ رہتا ہے۔ ارشاد ہوا۔ "یہی لڈو، پچیرا، برفی"۔
اب تو بادشاہ سے نہ رہا گیا، حکم دیا اس مردود مجنون کو نکال دو دربار سے۔ گھر پہنچ کر والد بزرگوار نے پوچھا کہ بیٹا کیا گذری تو آپ فرماتے ہیں۔ "ابھی بھی جائیے آپا۔ آپ نے کس دیوانے کے پاس مجھے بھیجا تھا جو جو آپ نے سکھایا سب کمال احتیاط سے عمل کیا مگر بادشاہ ہیں کہ کسی طرح خوش ہی نہیں ہوتے۔ پہلے تو ہم نے دونوں کو سلام کیا۔ آپ نے خواجہ کہا تھا ہم نے مارے محبت کے "کھوجنیا" کہا۔ بیٹھنے کو کوئی اونچی جگہ ملتی نہیں۔ ایک چوکی بھی ملتی اس پہ بادشاہ خود بیٹھے تھے، زیادہ گنجائش نہ تھی۔ آخرکار بعد تلاش ایک کونے میں ٹوٹے سب سے بلند رکھی تھی میں اس پر اچک گیا۔ مزاج پوچھا، میں نے کہا روئی، ریشم، سوت، اقاقیا سے پڑھ کر کون چیز نرم ہوگی۔ وہی بولے نے بتایا مشغلہ پوچھا لڈو، پچیرا، برفی کہا۔ اس پہ بادشاہ بہت خفا ہوئے۔ آپ ہی فرمائیے اس سے بیٹھی کون سے ہو سکتی ہے۔
وزیر نے سر پیٹ لیا اور کہا۔ واقعی کہا ہے پوت درباں نہیں جانے "تیرہ سخن ہے تم نے بھی ملا مرلیا اور باوجود مخالفت بٹھایا۔ مزاج پوچھا مشغلہ دریافت کیا۔ بعد جو ہو چکا آ کے جو جیسے نکلے ویسا کہہ۔
اولاد میں اکثر جسمانی و نفسانی تاثیرات آبائی ہوتی ہیں مگر کبھی کبھی نہیں بھی ہوتیں۔ ملکداری اور ریاست کے امور مشترک کی انجام دہی کے واسطے جا بجا بادشاہ تک بدل جاتے ہیں۔ وزیروں کو کون پوچھتا ہے۔
اس موقع پر پہنچ کر یہ بھی گوش گذار کرنا ضرور ہے کہ جو کچھ کرنا اپنے بھروسے پر کرنا۔ قدیم فریق پیرانہ سالی اور جڑھاپے کے مارے سست تدبیر ہو رہا ہے۔ سوچا بہت ہے کہ کچھ نہیں سکتا۔ ٹراک کے گھوڑے کی طرح ہیں سر دیئے پراتے کام نہیں دے سکتے۔
دنیا میں ریاست کے واسطے فوکر چاکر ہوتے ہیں مگر تھوڑے عرصے سے ریاست نوکری چاکری کے واسطے ہو گئی ہے۔ دو چار چلتے پرزوں کی، بدولت انہی کے پھیر بدل سے معاملات نہیں چلتی۔ احکام کی خوبی و بدی، ریاست کی بہبود و فلاح پر کیونکر نظر ہو سکتی ہے۔ انقلاب میں نفع ذاتی و صفائی حاصل کرنے والے لڑے دن ریاست کا تختہ "انتظامی الٹا کرتے ہیں، ان کو دور رخ جنت سے کام نہیں۔ اپنے علاوے مانڈے سے مطلب ہے گھوڑ دوڑ تفریح امراء ورؤسا کے واسطے مردانہ کھیل ہے مگر دیکھی "بوقت فرصت"۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے بعض لوگ گھوڑوں کی سوداگری کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ اور بھی بار بار انتظام بدلنے کی ہوگی۔ خیر ہر دست اور کچھ نہیں۔ اس تجارت پر محصول چنگی تو تم بھی قائم کر دو۔
اور بھی چند مضامین دوسرے قابل تحریر ہیں۔ انشاء اللہ دوسرے خط میں لکھے جائیں گے۔

(۸)

بنام نظام دکن

ڈیرا

میں اپنے پہلے خط میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ تم کو اپنے ہی دل سے استفتاء کرنا چاہیے۔ اس سے یہ نہ خیال کرو

کہ کوئی مشخص نسخہ کے لائق تمہاری قلمرو میں باقی نہیں رہا۔ نہیں، ہیں اور متعدد ہیں مگر ان کو پہچاننا اور ان کی مناسبت طبیعت کے لحاظ سے رائے لینا اور اس رائے کو میزان عقل میں تولنا تمہارا کام ہے۔ دیکھو تمہارے وزیر مرحوم نے کیسے کیسے متضاد صفات کے حضرات مختلف اقطاع ہندوستان سے جمع کیے تھے مگر ہر ایک سے کام وہی لیتا تھا جس میں اس کی لیاقت ہوتی تھی۔ یہ کچھ جس قدر تیز چست، چالاک گھوڑا ہوگا، اسی قدر سوار کو اور بھی ہوشیار چاہیے ہوگا۔ میں تم کو ایک ایسا فقیروں کا بتاتا ہوں۔ گو بہ آسانی اور بغت میسر آنے کی وجہ سے تم قدر نہ کرو مگر سمجھ لو کہ کشور کا کارساز ہمہ امور، حصول مقصد کے واسطے منتہ ہے تو یہی اور خزانۂ ترقی کے لیے کلید ہے تو یہی یعنی جب غور کر لیا کہ یہ امر ہماری ذات وصفات کے واسطے مفید ہے اور اس کو تکمیل تک پہنچانا ضروری، تو پھر ہر وقت، ہر لحظہ، ہر جگہ اس کا خیال رکھنا فرض ہے اسی کا نام رحمن ہے۔ جب تک اس میں پکے نہ ہو گے ہرگز ہرگز منصور و حاصل نہ ہو گا۔ تمہارے وزیر کو بہبود و ترقی ملک کی بہت سی دھنیں تھیں جن میں وہ سوتے جاگتے ہر ساعت مستغرق رہتے تھے۔ تم جانو دنیا میں بجز ایک کے نقصان کے دوسرے کا فائدہ نہیں ہوتا۔ پس وہ فکریں ہی اسی طرح کی تھیں کہ جہاں تم کو اور تمہارے ملک کو فائدہ پہنچاتیں وہاں دوسروں کا نقصان بھی کرتیں۔ پس اب ان حضرات نے موقع اور گھات پا کر ایسے ایسے کام کیے کہ تمہارے ملک کو فائدہ پہنچا اور دوسروں کا نقصان بھی کر گئے

نہ کو توجہ چاہیے۔ پرانے اور قدیم طریقے نے تمہارے خزانے کو سپاہیوں کی جیب میں ڈالا نہ تمہارے صندوقوں میں رکھا بلکہ اکثر مجمداروں کے پیٹ کی لپیٹ میں ابھارا۔ اس کا انتظام بہ لطائف الحیل نہایت سہولت سے کرنا چاہیے۔ کیا وجہ کہ ؎

درشتی و نرمی ہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

اور بھی چند امور باقی ہیں۔ اگر فرصت ہوئی تو تیسرے خط میں گوش گذار کیے جائیں گے۔

(۹)

بنام نظام دکن

حضرتا!

میں نے جو آپ کے نام خطوں کی بھرمار شروع کر دی ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ کچھ دنوں یاد کیجیے جس قدر کم توجہی کی شکایت تھی غالباً وہ رفع ہو گئی ہوگی اور کچھ کچھ آنکھیں کھلی ہوں گی کہ اب تک ہم نے کیا کیا اور کیا کرنے کو باقی ہے۔ لیکن مشکلات و معاملات موجودہ کا جو سفینہ ایسا مضطرب الحال بنائے ہے کہ آپ کو مشکل سے آگے پیچھے نظر پھیرنے دیتا ہے۔ خیر یہ تو امور اتفاقی ہیں۔ چارہ ہی کیا ہے۔ اگر اتنا ہی خیال ہے جتنا میرے خیال میں ہے وہی بہت ہے ع

عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است

آدمی کی تلاش عالمگیر اور سعادت علی خاں کو عمر بھر رہی اور ہمیشہ پہیلیاں بجھایا کیے کہ وہ کیا ہے کہ بہت ہے اور پھر نہیں یعنی انسان مگر خدا کی عنایت سے کوئی نہ ملا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس وقت کوئی بھی انسان نہ تھا بلکہ بات یہ تھی کہ ان کی طبیعت اور مزاج کے موافق کوئی نہ مل سکا۔ اس پر کوئی کام ان کا رک رہا نہ انتظام ملکی۔ ایک نے سلطنت کی شاخیں انتظام کی مختیاں دھر تک پہنچا دیں۔ دوسرے نے ایک جدید ریاست کی بنا ایسی قائم کی کہ سلطنت کی حالت نصیب ہوئی۔ پس اسی طرح کام چلانے کے واسطے تم بھی رکے نہ رہو۔ کسی نہ کسی طرح چھکڑا چلا جائے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔

سعادت علی خان کوئی نائب نہ مقرر کرتا تھا۔ اگر لوگ پوچھتے یہی جواب دیتا کہ وہ ریاست ہی ایسی کیا ہے جس کے واسطے نائب کی حاجت ہو۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے ہاں معاملہ بالعکس ہے ریاست اور اس کی آمدنی سے شاید محض اسی وجہ سے ترقی نہیں کی جاتی کہ وہ نیابت ہی کیا ہے جس کے واسطے ریاست بڑھائی جائے۔ خیر اس میں اور دیگر امور میں کلیہ یاد رکھو کہ وزارت ریاست کے واسطے ہے نہ ریاست وزارت کے لیے۔ عاشق و معشوق کے خطوط کیسی احتیاط سے کیوں نہ بند ہوں ضرور تاڑ لیے جاتے ہیں، وہ ان کا وزن،

وہ چاروں طرف سے نئی نویلی دلہن کی طرح سمٹا سمٹایا، گھسا ٹھلس بند ہونا، وہ گوند کی چار چار تہیں، وہ سیکڑوں تخمنے کاغذ اور لمبے چوڑے مضامین، ارمانوں، آرزوؤں، حسرتوں کے جمِ غفیر سے پیت اور رنگ لفافے کے گوشے، سطرِ معشوق فوٹیر کے سینہ و بازو کی طرح، بھرے اور بھرے بھرے، وہ اعلیٰ درجے کا کاغذ، وہ انتہا کی خوشخطی، وہ خوشبوؤں میں بسا ہونا، وہ بند کرنے کی جگہ پر آکسفورڈ کی ہلکی سُرخی، وہ، ہم پر خانہ، وہ دوسروں پر طلاق، یہ سب محبت الفت، شکوہ و شکایت، راز بتانے، لب اور پان خوردہ کی شیرینی ظاہر کرتے ہیں، مشاق اور نظر باز ع

خط کا مضمون نہ پڑھیے پر لفافہ دیکھ کر

پس ہندوستانی رئیسوں کے ساتھ گورنمنٹ انگریزی کی مراسلہ بازی، وہ رزیڈنٹ کا آنا جانا، وہ مراسلہ لانا، وہ تخلیے میں سی سی سہ گوشیاں، وہ اخباروں میں اہتمام جو کچھ ظاہر کرتا ہے اس بوڑھے خراٹے پر آئینہ ہے۔ ہاں (سر ہلا کر) اچھا تو ہے۔ تمھاری خاطر کس کو منظور نہیں خصوصاً جب قرنا راضی بھی نہ کرو۔ امور نا گوار زبان تک نہ لاؤ۔ شرقی کے جاننے والے کو سمجھ لینا چاہیے اگر برابر چلا ہی جائیگا تو ایک دن مغرب میں آنکلے گا۔

"اگر در خانہ کس مست یک حرف بس ست"

تمھارے راہ الہام کے آپ ہٹے بھائی گھوڑ دوڑ میں (جو تمھارا خاص مشغلہ ہے) اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور خود بازی جیتے۔ ان کو اور تم کو مبارک۔ اگر حیدر آباد کی مدار المہامی میں صرف شہسواری درکار ہوتی تو پھر کیا تھا، ترقی و تنزل۔ استحقاق کے واسطے حاکم کی توجہ یا کم توجہی کے ساتھ امورِ انتظامی لازمی ہیں۔ پس یہ بھی انہی امورِ انتظامی سے ہے۔

مجھ کو تو تم جانو ہندوستانی نہ دکنی، پارسی نہ مدراسی، انگریزی نہ ارمنی۔ میں تو باشندۂ دنیا ہوں میری نظر وسیع ہے سب یکساں، پس یہی صلاح و مشورت میں کسی کی جنبہ داری کو دخل نہیں ہو سکتا۔ فی الحال ہندوستانیوں کو انگریزی کا چڑھاؤ اتار یاست کو ہندولا بنانے ہے۔ تم کو لازم ہے سب میں اپنا مطلب مقدم رکھو۔ نہ وہ افراط کہ ادھر سے کوئی بھی بال کترا فیر جو وے۔ جھاڑن کا کوٹ پتلون پہن، کھڑے گھاٹ نیچری بن، سید صاحب چاپلوسی کی ٹوپی کے چادر گھاٹ جا، نڑا اور آنکھ بند کر تمھارے یہاں سے تنخواہ، عہدہ، جگہ، کام سب بگٹٹ چلا آتا ہے بلکہ اسٹیشن پر ریل سے تو دم نیچے رکھا نہیں کہ تنخواہ جیش قرار نے نذر دکھائی۔ عہدے نے سلامی، ناری اور ترقی کی چوکڑی پر یہ جا وہ جا۔

اور نہ یہ مناسب و مصلحت ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ ہندوستانی نکالے جائیں۔ ایک آغا صاحب ولایت سے ہندوستان تشریف لائے۔ ایک دوست نے پھلینہ سے کھلائے۔ ہندوستان کا یہ میوہ آپ کو بہت لذیذ معلوم ہوا۔ پوچھا کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اُمرکو آنجانے چلے تو برا مہربانی ہو۔ دوست صاحب نے ایک پھلینہ سے کے درخت کے نیچے جا کر دکھا دیا کہ یہاں ٹپکے ہوئے سیاہ سیاہ یہ بہت سے پڑے ہوتے ہیں جتنے کھاسکے جائیں کھاؤ۔ آغا صاحب لگے ذوق شوق سے کھانے، اتفاق سے پھلینہ کڑوے

کے ساتھ ہیں کئی بھونرے بھی مرے پڑے تھے۔ آپ ایک آدھ وہ بھی پکھ گئے۔ وہ جب دانت کے نیچے پہنچا تو کڑاہٹ معلوم ہوئی۔ آخر صاحب فرماتے کیا ہیں "تم چاہے چُگ رہے چاہے نگر رہے کال کالا ہم ایک نہیں چھوڑنے کا"۔ بس کچھ ضرور نہیں ہندوستانی ہندوستانی ایک نہ چھوڑے۔ ہاں افراط تفریط ہر شخص کے نزدیک معیوب ہے۔

خیر یہ تو ہو چکا۔ ایک ضروری اور اہم ضروری بات لکھ کر میں یہ خط ختم کرتا اور کسی دوسری طرف رُخ کرتا ہوں۔

مُنہ مثل مشہور ہے جہان ہے تو جہان ہے اگر اپنی طبیعت درست مزاج صحیح ہے تو ریاست، سلطنت، عیش عشرت، شراب کباب، سیر تماشے سب کا لطف ہے۔ بھلا معشوقانِ پری تمثال و مہ وشانِ خوش خصال، ناے و نوش، مستی و بے ہوشی وغیرہ کی مزا دے گا "جب پڑے پڑے سر پہ ہما سایہ کرے" اور مرکپوری کے مرکبات کے محتاج نہ کا طبرا بلا رہے ہیں۔ تاج پُر زر، لباس مکلف کیا اس پہرے پر بھلا معلوم ہوگا جس کو فسادِ خون نے تپ سے اس طرح بگاڑا جیسے گلفام اور بے نظیر کو اندر سبھا اور مثنوی میر حسن کے مصور نے ان امور کا اثر اعصاب پر اور اعصاب کا اثر دماغ اور تجسم لطیف، احساس، تخیل، ارادہ وغیرہ) کے افعال پر جو کچھ پڑتا ہے طب و حکمت گواہ ہیں۔ واجد علی شاہ باوجود حلیم و رحیم ہونے کے انتزاعِ سلطنت کی خبر سُن کر رونے لگے۔ اس کی وجہ علی نقی خان اور لارڈ ڈلہوزی سے پوچھو۔

شاید فسادِ خون میں شہزادہ جمشید کی مثال پیش کروں مگر اتنا بھی سمجھ لو کہ یورپین طرزِ تعلیم و خیالات، وسعتِ معلومات اور کمندی جذبات و انساڈ وہاں ایسی ہے۔ اس پر بھی دیکھ لو فسادِ خون کو افسادِ عالم اسباب میں کس قدر دخل ہے جو بات اس کے دماغ سے نکلتی ہے دنیا میں فتنہ و ہنگامہ پیدا کرتی ہے۔

اب میں قلم کو رخصت کرتا اور سید بلگرامی کو سونپتا ہوں۔

نشہ کی ترنگ

پنڈت تربھون ناتھ ہجر

مہاگرآتما ستی کراغیم　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے جناب اوہ پنچ صاحب! واللہ ہے اہل مکتب میں کیا ہی خوش ہوا ہے کہ قسم ہے جناب امیر علیہ السلام کی یہی بارہا دل چاہتا تھا کہ اللہ رکھے ستّے مرزا کو ایک دم چھاتی سے چمٹا لوں کروں۔ بخدا کسی نے سچ کہا ہے گنجم تاثیر صحبت کا اثر۔ باپ پت پر پایت گھوڑا کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ پھر آخر اچھے مرزا ہی کے تو صاحبزادے ہیں، ماشاء اللہ سے وہ بلا کی طبیعت پائی ہے کہ حضت کیا عرض کروں مجھے رہ رہ کے یہی خیال آتا ہے کہ یہ دن سن۔ نام خدا اٹھتی جوانی ہنوز مسیں بھی اچھی طرح نہیں بھیگی ہیں اور یہ فکر آسمان چیا خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ پیاری طبیعت پائی ہے کہ سبحان اللہ بجدہ باوجود صدہا نوکروں کے اچھے مرزا اپنے ہاتھ سے چلم بھر کر دیتے ہیں اور پھر میں اس چلم کی کیا تعریف کروں جس میں تمباکو اور پھر مزا یہ کہ چاروں کی کیفیت زبانی ایک جیلا دوسرا موجود، یہ کشش نہ ہو تو گھونٹ دھوئیں کی یہ لطافت کہ ہو الاوّل و ہو الآخر۔ ہائے لال لال سچے کوئلوں کو اس ترکیب سے چنے ہیں کہ مخبر باقلیدس کی ہیں شکل سے چاہیے بڑا لیجیے اگر سرمو فرق ہو تو ہاتھ قلم کر ڈالیے۔ ایک حقہ ہی نہیں چانڈو کا قوام وہ چڑھیا تیار کرتے ہیں کہ بس اور کیا کہوں ہاتھ چومیے، اور پھر بھی ان کی سی محنت کوئی کر تو لے، جناب سید الشہدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ افیون کو بانات کے ٹکڑے میں کم سے کم دو سو مرتبہ تو مقطر کرتے ہیں اس وقت اس کی رنگت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہو بہو خون کبوتر، جو باس حقے والے واللہ ہے ایک مرتبہ نگاہ بھر کے دیکھ لیجیے، دو دن تک چسکی کی حاجت نہ ہو اور پھر یں آپ سے کہاں وہ ان کی تمباکو کی پٹ ڈال دنیا ستم ہی برپا کر دیتی ہے۔ کیا مجال کہ کہیں چھینٹا پڑ کے تو۔ ایک دم میں طبیعت باغ باغ ہو جاتے۔ خیر یہ تو ان کے باغیں ہاتھ کا کھیل ہے، موزونی طبع تو ان کے حقے میں پڑی ہے، ادھر آپ نے شعر پڑھا اور ادھر جواب لیجیے۔ اور تو اور شیخ سعدی کے کلام کی تضمیع کر ڈالی اور پھر کیسے کیسے مصرعے چسپاں کیے ہیں کہ جن کا جواب نہیں۔ اعجاز کیسے تو بکا ہے۔ حضت آپ پسند کریں یا نہ کریں ہماری امت والوں نے تو یہ دل میں ٹھان لیا ہے کہ اب کریا کے عوض یہی اشعار بچوں کو پڑھایا کریں گے جس سے دنیا و عقبیٰ دونوں ہاتھ لگیں۔ حضت فرماتے ہیں کہ ؎

مرے ساقی چانڈو کا چھینٹا پلا　　کہ ہستم اسیر کمند ہوا

مزا کر کرا ہو گیا ہے چرس
ندارد غیر از تو فریاد رس

خوش از چاندماری و گرگ آشتی
وزیں قوم تریاک باز آشتی

مکن ہاں مئے تلخ را کیمیاست
کہ افیوں ہمہ زہر را دواست

اگر چہ ٹھگ بازی نوکر اختیار
شود خلق دنیا ترا دوست دار

بہ افیونیوں کی کر خم نہیں
نہد شاخ پر میوہ سر بہ زمیں

کہ خم ہوئی رہ گیا معزز پوست
تواضع زگردن فرازاں نکوست

مک کش لگائے اگر دم بہ دم
زند سونا و شعلہ در آب و گل

ادھر ناؤ ٹھہ لگاؤ نہ دم
کہ ناگہ شود سر بہ سر کالعدم

جوانیں پیے سے بھی آدمی
نہ زہد نہ مردم بجز مردمی

میاں تجربہ پانک میں آٹھوں پہر
بہ غفلت بسر عمر در وے بسر

دو دو چونچیں

ترجمون ناتھ تجر

افیونیوں کے وکیل۔ ؎ مردماں کو چھینٹۂ چانڈو کشند
اولش اللہ و آخرہ بوکشند

ذات شریف۔ بھئی واللہ ہمیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ام السکرات بی افیون لوگوں کو اولیاء اللہ بنا دیتی ہے۔ چلکی بجاتے ہی کمان کو پہنچا دیتی ہے۔ اے لو یہ مسئلہ آج حل ہوا ؏
یار در خانہ و من گرد جہاں می گردم!
روزہ، نماز، عبادت، ریاضت یہ سب مذہبی ڈھکوسلے نکلے۔ لاحول ولا قوۃ۔ مفت میں اتنی عمر رائیگاں ہوئی۔ لیکن ہاں یہ تو فرمائیے کچھ ولی بننے میں کسر تو نہیں رہ جاتی؟"

وکیل۔ آپ بھی پھر کہیں لگے کریں کچھ یوں جان بوجھ کے تنکے بنے جاتے ہو۔ اماں تیرہ صدی میں بھی اولیاء بننا کیا کچھ کرامات ہے؟ لگے کے الائچی دانے لو، ٹونگتے ٹونگتے میرآغا کے چانڈو خانے پہنچو، جو سا ہیر پسند آئے منہ میں لگاؤ، لیٹ کر یا اکڑوں بیٹھ کر اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو کرتے ہوئے چھینٹے اڑاؤ۔ پھر آئینہ لے کر اپنی صورت کا معائنہ کرو، دیکھو تو آناً فاناً میں کیسی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔ علم و بردباری بشرہ سے کس طرح چھلکنے لگتی ہے۔ نفس کشی کے واسطے تو یہ اکسیر اعظم ہے۔

ذات شریف۔ یہ تو آپ نے سب سچ کہا، مگر اس میں پینک کی بڑی بدنصیبی لگی ہے، جب دیکھئے تب غین۔

وکیل۔ افسوس ؎ آگاہ نہ تب دروں را نشنید چو زنی رگ جنوں را
آپ بھی نرے عقل کے دشمن ہی نکلے۔ مرد خدا جسے تم پینک سمجھتے ہو وہ فی الحقیقت پینک نہیں، مراقبہ ہے، گو ظاہر میں آنکھیں بند ہوتی ہیں مگر وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدۂ نور الٰہی کرتے ہیں۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو اچھا مقیاسا اٹھا کر دیکھ لو، دیکھو تو اس میں کیا لکھا ہے۔
کہ بچشمان دل مبین جز دوست
ہر چہ بینی بہ الحق مظہر اوست!

ذات شریف۔ حضت! آپ کا فرمانا برحق ہے، مگر یہ تو فرمائیے، کہ ایک کتاب والا کہتا ہے ؎
کاہش و افزائش ایں نشہ با یک دیگر ست میخور و افیوں تر اچند داں کہ افیوں میخوری!

آخر اس کا کیا جواب ہے؟

وکیل۔ کاہش تن تو مین جو ہر عاشقی ہے۔ اسیاں فرق میں گھل گھل کے پوست و استخوان رہ جائے تو اپنے حساب تلمذ فتح کر لیا۔

ذات شریف۔ یہ تو کچھ پہیلی سی آپ نے کہی۔ واللہ ہے مطلق سمجھ میں نہیں آئی

وکیل۔ ہائے کیسی پھٹر عقل ہے ارے میاں جہاں سر کو کے کانٹا ہوئے، سمجھئے کہ طلبی کا پروانہ آیا ہی چاہتا ہے۔ اب دیکھیں وصل کیونکر حاصل نہیں ہوتا؟

ذات شریف۔ ہاں ہاں۔ پھر یہ کیجئے۔

وکیل۔ اب آپ کو بھی لازم ہے کہ بہت نہیں صبح و شام دو چمچے بسم اللہ کر کے پی لیا کیجئے، پھر دیکھئے کیسے عقل کے جوہر کھلتے ہیں۔ لو دور کیوں جاؤ، ان چیلیوں کو دیکھو کیسے آفت کے پرکالے ہیں کہ ریل ان کے ہاں سے نکلی، تار بجلی ان کے ہاں سے نکلی، دخانی کشتی ان کے ہاں سے نکلی، سب سلطنتیں روم و روس کی لڑائی دیکھ کے کانپ رہی ہیں اور فغفور کو دیکھئے، قطب از جا نہ جنبید۔ بے ملال رعشہ بیٹھا ہوا مزے اڑا رہا ہے۔ نے غم خویش نے غم کالا۔

ذات شریف۔ ذہن و ذکا کے علاوہ قوت اختراعی بھی آجاتی ہے۔ انشاء اللہ معلومات میں بھی دست گاہ کامل بہم پہنچ جاتی ہے

وکیل۔ خیر یہ تو قابلیت اور علمیت کی قلمی کھلی۔ اب یہ فرمایئے کہ متعلق فنون سے اور کون فائدے متصور ہیں نہیں، اس بکواس سے کیا حاصل۔ صرف وہ تین دن ذرا فائدہ لے لو، پھر جا ہے چھوڑ دینا، اور اس کا فائدہ کچھ ایسا تو ہے نہیں کہ چرن کیسی پانی ہو کہ میں بیان کر جاؤں، وہ خود اپنے جوہر دکھانے کی کسی کے کہنے کی کیا حاجت ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔

ذات شریف۔ حضت دھرمی کی ہانڈی بھی لی جاتی ہے تو ٹھونک بجا کر لی جاتی ہے، یہ تو پھر ولی ہوتا ہے۔ ہر پہلو دیکھ بھال کے ولایت اختیار کریں گے۔ بھلا کچھ تعریف تو کیجئے۔

وکیل۔ لے تم بھی کیا یاد کرو گے، قواعد فنون کے سند کا لب لباب بتائے دیتے ہیں۔

(۱) بڑے بڑے مرتاض اور عابد یاد الٰہی میں شب بیداری کرتے کرتے اونگھ جاتے ہیں، مگر ہمارے جتھے کے لوگ رات کو سونا حرام سمجھتے ہیں۔ جب دیکھئے مراقبہ میں غرق، دریائے محبت میں غوطے لے رہے ہیں۔ اوہو ہو ہو!

(۲) جس کو دیکھئے خندہ رو ہنستا بھی ہے ہنساتا بھی ہے۔ باور نہ آئے تو عفرائی رنگت شاہد ہے۔

(۳) حلم و بردباری، سلیم الطبعی، عجز و انکساری تو گویا خاص ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتا ہے۔ نفس کش اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ اناث سے سر کی جوئیں دکھاتے۔ مگر ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

(۴) سب سے افضل یہ صفت ہے کہ تعزیرات ہند کی کوئی دفعہ ان پر فضل الٰہی سے عائد نہیں ہو سکتی۔ ہاتھا پائی جانتے ہی نہیں سخت کلامی سیکھی ہی نہیں، بے ادبی اور گستاخی کے پاس نہیں پھٹکتے۔ جھوٹ کا نام نہیں جانتے۔ آپ جھک کر لیجئے گا، وہ قدر فی خمیدہ کمر ہیں۔ آپ ہی ملاحظہ کیجئے کہ کیا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کم خور اتنے بڑے کہ کیسا ہی قحط پڑ جائے ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ چھتانک آدھ پاؤ رات دن میں کھا لیا، نہیں تو کچھ اس کی بھی پروا نہیں۔

(۶) داستان گو ایسے جیتے کہ چھ مہینے گذر گئے امیر حمزہ نے ملکہ مہر نگار کی خواب گاہ کا ابھی پردہ ہی اٹھایا ہے۔
(۷) لے اور سب کچھ جانے دیجئے خیر خواہ سرکار کتنے بڑے ہیں کہ سولہ روپے سیر اور ہمیں روپے سیر چھپا چھپ چھپا چھپ دیئے جاتے ہیں۔ کبھی دریغ نہیں کرتے۔ ان سے بڑھ کے مالگذار سرکار کا کوئی ہو تو لے۔
(۸) شیر افگن، شیر بنی کے حاشیہ دار۔ گھوڑے پر بھی سوار ہوں گے تو مینی پوٹی لپیٹ۔ بھئی اب جی گھبرا گیا۔ لو جہاں آنے لگیں سلام شد ہو گیا۔ اچھا چہ کہی بیان کردیں گے۔ مصرعہ

تا کجا شرح کنم طاقت گویائی نیست

ذات شریف۔ آخ تھو! کھا کھا کے اور گلا صاف کر کے ختم ہوئی بس رام کہانی۔ اس بوتلے پر تتا پانی۔ لے چلو ہٹو ہوا کھاؤ ہم اور تمہارے چھینٹوں میں آئیں۔ قدرت خدا کی الیون وکیون تو نہیں ہاں

رباعی

ور نہ بسبب من اگر شوی بادہ پرست
پرزا نکہ بری بجانب الیون دست!
نے مرد زنی، نہ مردہ نے زندہ
نے خفتہ، نہ بیدار نہ ہشیار، نہ مست!

وکیل۔ (نہایت بیتاب کھا کر) مصرعہ

ہم تو مرشد تھے، تم ولی نکلے!

واللہ ہے، منہ سے تو بھلے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ بھی بڑے ذات شریف ہیں۔

ذات شریف۔ مصرعہ ——— لا ہاتھ ادھر دے کہ بہت دور کی سوجھی۔

(اودھ پنچ۔ ۴ ستمبر ۱۸۸۷ء)

ہو گیا زندگی سے جی بیزار

وقنا ربنا عذاب النار

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

توبہ سوتہ فلاپلا وہ ہائی ہائی چوتھائی۔ واویلا ندبہ یا واغیاث وغیرہ وغیرہ۔ بانبھ کان پکڑ کر اوٹھا بیٹھی بعد ملاحظہ نظر ثانی پھر توبہ کر بند سے اس گندے روزگار سے۔ کیا کہیے اور کیا نہ کہیے۔ آج تک ہم سا لغو پونے پانچ کروڑ برس ہوئے اس عذاب النار کا طلب گھر کے بچا ہی ہیں آیا۔ بعضے عذاب النار کے یہی معنی لیتے ہیں کہ آگ کہتے ہیں۔ ہو تیرے ملا اُل آخوذ بے نار، دوزخ جو ہمارے معزز مولانا سے نعرفی کے بقول یونہی سا ایک روڑ پن کا ڈراوے دھکاوے کا آلہ ہے۔ ماں بیٹے ہیں۔ اکثر پیٹ مر جگلگ بیٹ کی آگ یعنی بھوک پیاس کا عذاب سمجھے ہوئے ہیں، بعضے سپاہی پیشہ لڑنے مرنے سو یہ میدان داری کے آدمی ہندوق کی نلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرضکہ اپنے اپنے خیالی پلاؤ کون ایسا ہے جو نہیں پکاتا۔ خاص مطلب کی بات وہی ہے جو ایک ہر گزیدہ من رسیدہ گرم و سرد چشیدہ پہنچے ہوئے اللہ والے بزرگ نے مرتے وقت چپکے سے کہی تھی کہ بیشک نار سے مراد عورت ہی عذاب وہ ہے کہ جس سے پناہ مانگنی چاہیے بلکہ پناہ بھی مانگے نہیں ملتی۔ غرض یہ کہ چھٹکارا ہی نہیں۔ بھاگے سے بھی جان نہیں بچ سکتی۔ اب ضرور ہوا کہ میں تھوڑا تھوڑا ساذکر بھی کر دوں، پورا مرقع اتارنے میں تو کم سے کم کوئی سو لاکھ جزو کی کتاب ہو۔ ہاں دو ایک جملے پتے نشان کے طور پر وہ بھی لب دباب کہہ دوں گا۔ ہاں لے اب پڑھیے کیا۔ (وقنا ربنا عذاب النار) اسے حضرت پہلی قسم پڑھیا معاملہ چنیدہ جو دعائی عشقی کا درجہ، ہیوی شمع پر جیسے پروانہ، میاں جیسے چاند کے گرد چکور، انتہا کے پینگ بڑھے ہوئے اخلاقی بیل جول ساری نباہ داری کی باتیں، ات گت سانجھ دنیاوی سب کام بند، یہاں بے صرف محض گھر بہ حوالات کا، امجال دیا ندان کے باہر قدم نکالیں۔ دوست آشنا حق علاقاتی سب کو استعفا۔ نوکری چاکری کا تو ذکر ہی کیا بلاشبہ کھرے کھلے سے بھی زیادہ ہوبیار تجارت گھر کی چاردیواری میں تو ممکن نہیں۔ بے دسنہ غیب یا کیا جانے کے کام کہیں کر چلے، کھائیں کس کے گھر سے، اونات بسری کیونکر ہو، لاکھ امیر سہی بیٹھے بٹھائے تو کنوئیں خالی ہو جاتے ہیں۔ خرچوں پر چوں کو آئے نو کہاں سے آئے۔ گھر سے باہر جانا، سفر کرنا بغیر سارا بندوبست کل آلہ ساتھ لیے ممکن نہیں۔ پھر کچے بچے چینگا پوتی ماما، اصل دائی کھلائی آئے گئے ملا کے تین چار کوڑی آدمی اور ایک دوسرے سے ایسا متعلق جیسے چمڑے سے ناک۔ مصارف دن دونی رات چوگنی ماشاء اللہ ہونے والے کی آنکھوں میں ناک روز بروز ترقی پر روزمرہ میں بجائے کی کیفیت ہو یا جہاں سے جو کچھ ملا جھونک دیا آخر تابکجا۔ مجبوری کو لا تم پاؤں پھیلانا چاہو۔ گھر سے باہر قدم نکالنا تھا کہ آفت آگئی۔ بس ہو چکا خوب دیکھا اب وہ ہماری بات کہاں صورت سے نفرت ہے۔ رسیاں توڑا۔ تڑ ہیں۔ اسے صاحب وہ نہیں کہتے کہ

چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ، کوئی کسی کا سدا سے ایک سی بات نہ راس تل ہے۔ اب کی یہی کیفیت یہی نگاہ تھی۔ اسے مشکل کشا کی قسم وہ آنکھ ہی نہیں۔ گھڑی بھر کو گھر میں آتے ہیں تو رسیاں توڑتے ہیں۔ گند سے تولا کرتے ہیں۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر باہر اُٹھ جاؤں، سب نظر بچے کہ ہوا ہوں۔ توبہ ہے ہم سے تو گھوڑی کمبخت اچھی۔ جب دیکھو کہو تو اس کے گرد پھرتا ہے۔ چونچ سے کھجاتا جاتا ہے، جو بن دیکھتا ہے، اور تو اور اپنے پیٹ کا دانہ اس کے منہ میں اگل آپ چبانہ بھوکا رہتا ہے۔ پھر یہ ایک پالہ انخلاص ہی نہیں بچے پالنے تنکے چونچ میں اٹھا لانے کے۔ بچے میں گھر بناتے، انڈے سیا کرے۔ بچوں کو پھراتے، کبھو زمی دانا باہر نکلی اور خوش دل یہ اپنی زبان میں بلاتا ہے۔ زبان تو ہے نہیں کہ سکے مطلب یہ کہ تو کیوں تکلیف کرتی ہے، ہیں چین سے بیٹھی رہو اور مزا یہ کہ وہ قطامہ اُدھر رُخ نہیں کرتی، بھاگتی ہے، دس دھکے کھو تو نامدو رآمد میں ایک دھر شاید یہ بھی چونچ سے چونچ ملا دیتی ہے۔ اور بڑی بڑائی اِدھر کی اُدھر لاتی اتراتی دھمکاتی پھرتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کتان مرتبہ میں نے خود کہا کہ کیوں صاحب مجھے قاب سب کہیں کا آنا جانا اٹھنا بیٹھنا چھوڑ ہی دیا دن رات گھر میں کھونٹے سے لگے بیٹھے رہتے ہو، گھڑی بھر کو ٹانگیں سیدھی کر لیا کرو۔ اسی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا، ٹہل ٹلی چلا کرتی ہے تو حضور فرماتے تھے کہ صاحب تمہیں باہر نہ جانہیں سکتیں اب تمہارے دیکھے بغیر چین کیونکر آئے۔ میں کہتا ہوں کہ گھڑی بھر میں تو میرا دل اُلٹ جاتا ہے، نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے، کچھ بن پڑتا ہے۔ چلیے صاحب وہی تم ہیں کہ چڑے کے کھیاں مار رہے ہیں پورے نوبجے میاں سدھارے تھے یقین ہے بارہ بجے کو آتے ہوں گے۔ اس بندۂ خدا نے پھر کر نہ وٹ ہی نہیں لی یہ بھی نہیں معلوم کہ مرتی ہے یا جیتی ہے اس پر کیا بنی اس نے کچھ کھایا پیا یا ہمارے لفظ میں یونہی بھوکی پیاسی کنڈا ہوتی ہے بکلے آگ۔ سچ کہتے ہیں مردوے اور طوطے کی ایک ذات ہے۔ جوی ہے وہ بے مروت آج کے سوا لعنت اللہ ہے، ان کا رستہ دیکھیے اور بلا کوں مرے۔ میں تو اپنے بیار سے دیدوں کی قسم کل سے نو بجے بجے سوتے سے کھاپی گن جو کے بیٹھوں گی۔ پھر یہ بھی میری ناحق کی بات سنے، ماں سمان ہیں تیرا کھان انھیں اس کی پروا ہی کیا ہے وہ نہیں معلوم کہاں کہاں کون کون سی نعمتیں کھا کے سوکھوں پر بنا دو دینے ہوں گے۔ مگر آج تو ہو ذوف ہے۔ ایسی باتوں پر یہ جب ہی تک ہے کہ دوسرا خیال نہ کرے جان کے انجان بنا رہے، کچھ کہا آنکھوں سے دیکھے اور ٹال دے نہیں تو ذرا سے میں آدمی کو آئے ٹالا کا بھاؤ معلوم ہو جاتا ہے۔ دن کو تارے نظر آتے ہیں۔

عورت اگر ضد ہی پر آجائے تو مردوے کو ناک چنے چبوا دے اور میرے ہاتھ میں وہ چٹیا دی ہے کہ ابھی کہو تو کل سے نگنی کا ناچ نچا دوں، کچھ بنائے نہ بنے آنکھوں سے دیکھیں اور کرم کر مر جلا کریں۔ ایک ادنیٰ سی بات کل سوار ہو کے بھاجی کے بہانے سے چھوٹی پھوپی کے یہاں جاؤں اور پندرہ دن کا غوطہ مار دوں، سواری پر سواری جائے اور خالی پھر آئے یوں اکیلے پڑے مکھیاں مارا کریں۔ پھر آپ سے آپ دوڑی تو پھٹکار رہے میری باتوں پڑا سے لوہی سیدھی سمجھ کے ننھی بھولی باتیں کرنے لگی یہ نہیں جانتی کہ گھر والے کا ایک گھر نگر سے کے سو گھر۔ وہ تو خود اللہ غریب ناتے ہوں گے کہ کہیں یہ دفع دھان کھل کھیلوں، رات بات بھر غائب رہوں۔ فوج آگ لگے ایسے خاوند کو جو روکو یہ لکھیے ہیں پیپ پڑ گئی آئے دن کی سوئی سو اس گھر داری کو لوکا سات پھیروں کا پھر نس نگوڑی جان جلنے ہی کی ہو گئی۔ سب سے بڑی مصیبت جھوٹ ہو یا سچ اُلفت محبت کا نام سہی اب بدگمانی بھی لازم و ملزم بلکہ ضروریات شعر میں سے کہنا چاہیے۔ لیکن نہ اتنی بے تکی نفرت خیز کہ جس سے جی متلائے دل

تے آنے لگے، یہاں سیکھا سیکھ پڑوس کی کہیں کسی دوست آشنا کے یہاں گئے وہاں کا سرا نکلا۔ حق ناحق کی تو بھی قسمتی ہوتی ہے۔ قرآن کا آپ قصیدہ کنٹھا ایک ہے شامت کی مار کسی دوست نے بلوایا یا کہیں سے کوئی ملازم عدم گاہ رقعہ لے کر آیا، چلیے صاحب ہوا تیاں بدلی گئیں باچھیں پھڑکنے لگیں اللہ اللہ شکر الحمد للہ چلو اچھا ہوا یہ کوئی نئی ملاقاتی بڑے گہرے دوست پیدا ہوتے ان کا حکم اٹھی دیر بھی گھر والے ہیں بیٹھنے کا نہیں۔ پھر تازی تازی دوستی ہے ملاقات کے معنی بھی یہی ہیں جب تک ملاقاتی دوسرے کی ہاں نگلیں ڈالے ایک جگہ نہ بیٹھا رہے وہ ملاقات ہی کیا۔ ہم نے تو یہی دیکھا سُنا کہ جہاں کسی سے رسم و راہ دوستی آشنائی ہوئی وہاں فوراً گھر بار تج دیا، جورو بچوں کو استعفا دے انہی کے دروازے پر دھونی رما بیٹھے، لکیر کے فقیر ہو گئے۔ اگلے وقت کی وہ مثل سنی تھی کہ شادی مبارک نوکری نداردیہاں الٹی گنگا ہی۔ ہے دوستی مبارک گھر والی نا رہے بلکہ جورو جاتا بال بچے سب برخاست

ماما اور بھتیجی انانوا جاکے ان آدمی صاحب سے اتنا تو پوچھ آکہ بھائی کہاں بلایا ہے کیا کام ہے کچھ خیریت تو ہے بھلا اگر تھوڑی سی دیر رہ جاتے تو کچھ قیامت تو نہیں خط چاہے کہ ساہی ضروری بلکہ دوسرے کسی شخص کا خط یہاں کے پتے سے آیا ہے پھر کچھ ہی کہوں نہ ہو بغیر کھولے اور پڑھ لیے چین کہاں سب سے بڑھ کے شامت کی مار اگر کہیں میرے پیارے دوست (تمہید بہ حال کا فقرہ) یا جان من خدا بہت یاد کسی بے اصل خانماں خراب نے لکھ دیا اور بمطابق اقرس ہوی صاحبہ معظمہ آیا تو میں کہاں کے تلے لیے پل گئے۔ بہت بڑی بڑی موٹی جلدوں کے قرآن سات سات تلے اوپر۔ لکھ کے اٹھتے ہیں کہ یہ خط کسی عزیز کا ہے ہمیں نام تو دیکھو۔ نام کو کیا دیکھیں اول تو بنا کے اٹھ گھور دیکھ دیا دوسرے کیا مردانے نام زنانیوں کے نہیں ہوتے ہیں صاحب علی جان امیر صاحب وزیر صاحب پیارے صاحب حیدر صاحب ایک ہو تو کہا جائے۔ باقی جب قلم ہاتھ میں ہے تو گو سرخاں یا نور رشید کا صاحب نور رشید حسن نہیں ہوتا بلکہ اس قوم کے تو یہی پیارے پیارے نسخے مشہور نام ہوتے ہیں۔ اب لڑائی کیا لینے جانا ہے آٹھ آٹھ دن تک ہنڈیا چولھا اوندھا پڑا ہے۔ یہ ہزار دفعہ بڑی منت خوشامد سے جب سعی سفارش ہوئی تو اس خانہ جنگی سے نجات ملی غرض کہ آئے دن کی تو تو میں میں۔ پھر ہانڈی کا سا ابال ایک مورچہ ہو چکا تھا کہ دوسرا قلعہ دھنے لگا آج کیا ہے داسن میں پیک کا دھبہ کیوں لگا ہے۔ کل یہ گھوریاں کہاں چباتی لگیں کہ ہونٹوں پر لگوٹا جم گیا۔ بھینی جان عطر کیوں نہ لگائے ہوں اب تو گلاب کیوڑے کے حوض میں غوطے لگتے ہیں۔ بالوں میں کنگھی نہ کرے اور نہائے نہیں تو جوئیں بھنے لگیں۔ کپڑے گرمی میں دو مرتبہ دن نہ اتارو تو پسینے کی بو سے ناک نہ دی جائے۔ پناہ بذات خدا اب سُنیے خدا راس لائے یہ کھار یہ چکن پٹ بغیر کہیں لگن لگے تو بری نہیں۔ ماشاء اللہ جب دیکھو جیسے ہولی چالے کی دلہن، پٹیاں بنتی ہیں، گلوری سے منہ کبھی خالی نہیں آئینہ تو سامنے سے سرکتا ہی نہیں، فنیلیں سونگھ کے ازار بھولوں کی خوشبو آتی ہے اور ابٹنا کہاں ملا گرما ماتھوں بھی بیٹھے تھے یہ تو اب جوبن کھلتے جاتے ہیں۔ جناب امیر کی قسم میں اگر قرآن کا جامہ پہن کے آؤں تو نہ ماؤں، کچھ نہ کچھ دال ہی میں کالا ضرور ہے۔ نیند کسی دن شام سے آتی تھی کبھی دو دو بجے تک آنکھ نہیں لگتی۔ ٹھنڈی سانس اکثر اوقات بلا ضرورت بھی نکل جاتی ہے۔ شعر کا پڑھنا اور اس کے مضامین کا مختلف ہونا کچھ اختیاری بات نہیں اور نہ کچھ ایسی قباحت ہے بجوک یہ کچھ ضرور نہیں کہ ایک سی رہے اور ایک ہی وقت اشتہا ہوا کرے۔ سوتے میں آدمی بدخواب بھی ہوتا ہے، بہتا بھی ہے۔ مشکوک مزاج کو اکثر مٹھی پر نالی کی پھینٹ سے بھی بغیر نہائے چارہ نہیں، نماز بڑے بڑے نمازیوں کی ایک کیا دو دو چار چار وقت کی قضا ہو جاتی ہے۔ آنکھیں مخمور و نرم اجلا

نقوش ۔۔۔

البرٹ ہال

منشی جوالا پرشاد برق

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زریں ہمہ در گردن خرے بینم

لو سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک چھلاوہ تھا جو چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یکا یک بلائے آسمانی پھٹ پڑی۔ ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی۔ پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا اس کی پیدائش پر کیا کیا ناز تھے۔ اس کے والدین نے اسے کیسے کیسے لاڈ سے پالا۔ بچپن میں کیسی کیسی دانشت کی۔ رات کو رات دن کو دن نہ سمجھا مگر دشمنوں کی نظر کھا گئی سوتیلی ماں کے پالے پڑا۔ ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ ہماری امیدوں کا خون ہو گیا۔

فوج اندوہ والم ٹوٹ پڑی دھوکے میں
آرزوئیں ہوئیں سب قتل پڑا ارمان کیا

کلیجہ دھک سے ہو اکیسی کچھ دل پر چوٹ لگی۔ رپن کا زمانہ۔ ہم تو خوشیاں مناتے تھے بلیں بجاتے مست پڑے ہوئے تھے آخر کو پالا ہمارے ہی ہاتھ رہے گا۔ مگر یکایک پردہ غفلت جو آنکھوں سے اٹھا تو بھونچال ہو گیا۔ ان اینگلو انڈین سے خدا سمجھے عین موسم بہار میں ہمارا آشیانہ فوج کھسوٹ کے بھینک دیا "کہ بخت کشکار ڈٹ" نے نحوس شکل دکھائی۔ سخن سازوں نے ملکۂ معظمہ کے پروکلیمیشن کے الفاظ میں نئے نئے معنی پہنائے پیارے رپن کو مجبور کیا۔ وہ بھی بڑے پھنسے۔ کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑا۔ ممبران کونسل کے نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔ آخرش وہ بھی انہی کے ساتھ سر ہلانے لگے۔

جا کر قفس میں عاشق صیاد ہو گیا — بلبل کا حال قابل فریاد ہو گیا
انصاف اُلٹے استرے سے مونڈا گیا — بغاوت نے نقارہ فتح کا دھڑم بجا دیا
سچ ہے حرام زادے کی رسی دراز ہے — پیارے رپن کو ہم کیا کریں
بیش بالائی تو نازم چہ بصلح و چہ بجنگ — کہ بہر حال باندازِ کمانِ آمدہ

اختیار ملا مگر برائے نام چوری کی بچ بلا کی طرح پیچھے لگی مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندیو دشمنوں سے سبق تو کچھ کھو کے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس!

اگر ہم بھی گورنمنٹ ہاؤس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے۔ فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا۔ مگر شر ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو سچے خیر خواہ سرکار ہیں۔ مگر اسّے سال بھر کی محنت کھاری کنوئیں میں ڈوب گئی۔ کیا کیا خیالی قلعے بنائے تھے مگر "کنکا روڈٹ" کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا۔ جن پر ہمیں بھروسہ تھا، جو ہماری خیر خواہی کا دم بھرتے تھے وہی خفا ہو گئے۔ وقت پر نکل کھڑے ہوئے۔ کاندھا ٹال دیا۔ گویا ہم بیچوں بیچ سمندر میں ایک ٹاپو پر اترے تھے۔ کھانا پکایا، دسترخوان بچھایا۔ جیسے ہی کھانے کو ہاتھ بڑھایا کہ دفعتاً جزیرہ ہلنے لگا اور دم کے دم میں سب غڑاپ سے سمندر میں۔ افوہ دھوکہ ہوا تھا۔ وہ جزیرہ نہ تھا، وہیل مچھلی کی پیٹھ تھی۔ خیر۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

بہار

جوالا پرشاد برق

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی — کس ناز سے ہے بہار آئی
کم سن - الھڑ حسین - البیلی — چوتھی کی دولھن نئی نویلی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن — اوشا کو پل اوبھار کے دن
کہنا پھولوں کا زیب تن کر — دھانی جوڑا ایسا پہن کر
گھونگٹ اک ناز سے نکالے — سہرا پھولوں کا منہ پہ ڈالے
ہریالی بنی دلہن میں آئی — اک سبز پری دلہن میں آئی
اوتری گلشن میں جب سواری — سورج نے آرتی اوتاری
گل نے زر گل کیا نچھاور — صدقے ہوئی عندلیب اوڑ کر
شبنم بھر لائی کورے کورے — شربت سے گلاب کے سکورے
خورشید نے آئینہ دکھایا — کرنوں نے سورپھل ملایا
نہریں ہر پھر کے لائیں پانی — سبزے نے بچھایا فرش دھانی
خوشیاں اشجار نے منائیں — میووں کی ڈالیاں لگائیں
غنچوں نے چٹکیاں لی بلائیں — بلبل نے چہک کی دیں دعائیں
مرغان چمن نے گیت گائے — ہر رنگ کے زمزمے سنائے
پتڑیوں نے گا کے دل لبھایا — موروں نے ناچ کر رجھایا
بدلی پھولوں نے اپنی وردی — اودی - زنگاری - لاجوردی
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی — کوئل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی — آئی آئی بہار آئی
سن گونج جو ہیں فصل گل کی پانی — سردی گھبرائی سٹ پٹائی

گردش سے دنوں کے بے خبر تھی
معزولی کی اپنی پاتے ہی چھاؤں
رنگ اوڑ لیا پہلے جو جما تھا
بیچاری کی کوکھ اوجڑ گئی ہے
کوٹے پہ گھٹا ہے عز کی چھائی
پھوٹی قسمت پہ روتی ہے برف
رنگت ارض و سما کی بدلی
اطراف جہاں میں مچ گئی عید
چرخ چارم پہ ہے نمایاں
چلتی ہے ہوا اوسی کے دم سے
نیچر کو شعاعیں پالتی ہیں
کرنوں نے گڑی جڑوں میں گھس کر
شاخوں میں جڑوں سے چڑھ کے پہونچیں
سجنے لگیں باغ و بوستاں کو
فیروزی - صندلی - گلابی
لاکھی - نارنجی - ارغوانی
کاؤری - کاکریزی - لاہی
عنابی - زعفرانی
ہر اک کا جدا ہے رنگ و روغن
سایہ بھی ہے اوسمیں روشنی بھی
سبزے کا ابھار کیوں نہ بھائے
اور آنکھوں کو فرحت دینے والے

مطلق نہ بسنت کی خبر تھی
اوتر کو کھسک چلی دبے پاؤں
گھر مٹ گیا جو بنا ہوا تھا
پالے پر اوس پڑ گئی ہے
چہرے پہ ہے چھوٹتی ہوائی
ہنستی کھل کھل کے کھوتی ہے برف
صورت سیرت ہوا کی بدلی
پہونچا خط استوا پہ خورشید
فیاض زماں - مسیح دوراں
ہے نشو و نما اوسی کے دم سے
ہر چیز میں جان ڈالتی ہیں
پیدا کیے یہ نمو کے جوہر
دوڑیں پتوں میں بڑھ کے پہونچیں
رنگنے لگیں تختۂ جہاں کو
خاکی - عنابی - سرخ - آبی
طوسی - خشخاشی - آسمانی
بادامی - سیاہ - زرد - کاہی
ماشی - زنگاری سبز دھانی
پر سبز پہ ہے بلا کا جوبن
گرمی سے ملی جلی ہے سردی
ہر فصل بہار کیوں نہ بھائے
اور دل کو سرور دینے والے

گنگا کے دل میں تیرتی پھرتی ہے ڈونگا کیا
ساری مفت ہے جوبن تجھ سے
اقتدری نمو کی کارسازی
بادِ صبا کی چلی چوسن سن
سینوں میں ہوئی امنگ پیدا

ہر پتہ ہری بھری ہے تجھ سے
تجھی کاشن کو روح تازی
اُبھرا ہر شاخ گل کا جوبن
نئی کلیاں ہوئیں ہویدا

چھیڑا جو صبا نے کسمسائیں
کچھ کچھ دبے ہونٹوں مسکرائیں

پھر گل پہ نسیم نے کھلایا
بڑھ کر پہلو میں گدگدایا

سب پاسے ہنسی کے کھلکھلائیں
پھولے نہ وہ جامے میں سمائیں

باچھیں گئیں کھل خوشی کے مارے
دم پھول گیا ہنسی کے مارے

خوشبو درج دہن سے نکلی
اترائی ہوئی چمن سے نکلی

کچھ ایسی دماغ میں سمائی
شاخ گل کو ہوا بتائی

اٹھلاتی ہوئی چلی ادا سے
چٹکیاں کرتی ہوئی ہوا سے

گھوڑے پہ سوار تھی ہوا کے
جھونکے گئے بن اوڑن کھٹولے

ہر موج نسیم تھی معنبر
خوشبو سے جہان ہوا معطر

پیارا پیارا سماں جو دیکھا
خلقت کو شادماں جو دیکھا

گھر سے اپنے کسان نکلے
بوڑھے بالے جوان نکلے

تاروں کی چھاؤں مزا اندھیرے
کھیتوں میں پہونچ گئے سویرے

گوڑی جوتی زمیں نمائی
نیچے کی زمین اوپر آئی۔

بوجت کے بیڑہاں لگائیں
کچھ لوگوں نے چرخیاں لگائیں

پرسے پانی کسی نے کھینچا
بعضوں نے ڈھیکلی سے سینچا

برہا کوئی سنبھالتا ہے
نالی کوئی نکالتا ہے

مل جل کے دہاتیں ہیں گاتی
کھرپی بیلے کھیت میں رچاتی

کھیتی پہ نثار ہونے والے
وہ جوتنے والے بونے والے

فارغ ہوئے آج جوت بو کر
پلٹے گھر ہاتھ پاؤں دھو کر

پانی کھیتوں میں بھر چکے وہ
جو کچھ کرنا تھا کر چکے وہ

اس کام سے گو ہوئے وہ آزاد
اب فکر ہے فصل ہو نہ برباد

آفت سے اوسے خدا بچائے
امید پہ پانی پھر نہ جائے

بیچین ہیں سخت سہمے تردد
ہر دم کمبخت ہے تردد

دھڑکا ہے پڑا پڑے نہ افتاد
کھٹکا ہے ہوا کرے نہ برباد

دل میں ہیں یہ وسوسے سمائے
گروی گیہوں میں لگ نہ جائے

پتھر نہ پڑیں کہ کھیت نہوں گرد
پالا نہ پڑے کہ پیڑ ہوں زرد

پچھوا سے نہ ساری فصل کھو جائے
گیہوں پتلا نہ گرکے ہو جائے

پیڑوں پہ ٹڈیاں نہ چھا جائیں
چوہوں کے کاٹنے کا ڈر ہے
کھیتوں میں بیج سڑ نہ جائے
دل ٹوٹ گیا پھٹے جو بادل
پالا جو پڑا تو دل ہوا سرد
خورشید تلے سے ہو ہویدا
برہم نہ مزاج آب و گل ہو
بادل برسا دے ابر نیساں
شبنم بدہ جا تو ڈالیوں میں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آؤ
گھبرا نہ کسان ہے خدا ساتھ
دنیا کا رفیق تو ہے دہقان
مفلس، قلاش، بھولے محتاج
سب کا تو نے ہے پیٹ پالا
تیری فیاضیاں ہیں مشہور
یارب برسا دے ابر رحمت
نیت میں ہو پھل جناب باری
ٹھنڈے بھو کے چلیں خدایا
ہاں جوش نمو بڑھے الٰہی
پودے جو نہال ہوں تو بن جائے
اے رحمت حق ہو جوش ور
سرگاڑھی ہے کسان کی ساتھی
دکھلا یا دعا نے یہ نتیجا

نکلا تیزی سے گھر انور
کرنوں کی ادھر بڑھی شرارت
خلزم کی بدن میں لگ گئی آگ
اک جوش میں آیا بحر دھار

ہر سمت گرو نہ کھیت کھا جائے
دیمک کے چاٹنے کا ڈر ہے
کھیتی پر اوس پڑ نہ جائے
جی چھوٹ گیا ہے جو بادل
سرسوں نہ جمی تو منہ ہوا زرد
نیچر میں کر امتزاج پیدا
حدت کرنوں کی معتدل ہو
والے موتی سے روئے دہقان
موتی سے پروئے بالیوں میں
اودی اودی گھٹائیں چھاؤ
اللہ کے ہیں بڑے بڑے ہاتھ
عالم کا شفیق تو ہے دہقان
زردار، امیر، صاحب تاج
تیرا ہو جہان میں بول بالا
کیونکر نہ ہو تجھ پہ ہند مغرور
لگ جائے ٹھکانے اسکی محنت
محنت ہو سو پھل جناب باری
شاخیں پھولیں پھلیں خدایا
یہ بیل منڈھے چڑھے الٰہی
دہقان خوش حال ہوں تو بن جائے
اے رحمت حق ہو جوش ور

ہاتھ کر یہ کرم کے ساتھی
آنسوؤں سے فلک کا دل پسیجا
حدت سے بھڑک اٹھا سمندر
پانی کی ادھر بڑھی حرارت
منہ پہ غصے سے آگیا جھاگ
دل بادلوں کے پھٹ گئے سوا دھا

چھایا بڑھ کر فلک پہ مارا — چھا نشا دل کا بحر سارا
خورشید کو بادلوں نے گھیرا — عالم میں چھا گیا اندھیرا
کرنوں سے ہوا لطیف ہو کر — چلنے لگی بن کے بادِ صرصر
بادل ڈرتے ہوا سے بھاگے — باتیں کرتے ہوا سے بھاگے
میدانوں میں بڑھ کے آ گئے وہ — کہساروں پہ چڑھ کے چھا گئے وہ
ٹکرائے پہاڑ سے کہیں پر — جھلا کے برس پڑے وہیں پر
اونچی نیچی پہاڑیوں پر — دھاریں گرتی ہیں لوٹ کھا کر
چشمے کہیں زور کر رہے ہیں — نالے کہیں شور کر رہے ہیں
نہریں اٹھلاتی جا رہی ہیں — لہریں موجیں اڑا رہی ہیں
سبزے سے ہرا ہے دامنِ کوہ — پھولوں سے بھرا ہے دامن کوہ
تختہ ہے چمن کا یا پہاڑی — گلدستہ پھولوں کا یا کہ جھاڑی
سبزے کا پہاڑ پر یہ انداز — جیسے چہرے پہ سبزہ آغاز
گھاٹی پھولوں سے رشکِ گلزار — دامن پہ درخت سلسلہ وار
معشوقۂ سبز رنگ ہے گھاس — ہر پھول میں ہے دولھن کی بو باس
بیلیں ہیں پڑی ہوئی شجر پر — بندھن واری بندی ہے در پر
چرتے ہیں ہرن پرے جمائے — پھرتے ہیں کنڈیاں اوٹھائے
مستی میں ٹہلیاں کر رہے ہیں — میداں میں طرے بھر رہے ہیں
کھوہوں میں چھپے ہوئے ہیں رہ رو — دنیا بھولی ہوئی خدا یاد
چپ بیٹھے ہیں دھونیاں رمائے — اللہ سے اپنے لو لگائے
جل پیتے ہیں کھا کے جنگلی پھل — جنگل میں منار ہے ہیں منگل
پھل پھول پہ کرتے ہیں قناعت — تنہائی میں کرتے ہیں عبادت
صانع کی دیکھتے ہیں صنعت — اللہ کی دیکھتے ہیں قدرت
ہر شے سے عیاں ہے نور اوس کا — ہر رنگ میں ہے ظہور اوس کا
افلاک و زمین۔ نجوم و حیواں — دھات اور نبات۔ جن و انساں
جھیلیں۔ دریا۔ پہاڑ۔ چشمے — اوس کی قدرت کے ہیں کرشمے
رعنائیِ چمن سروں میں گاڑ — توحید کے زمزمے سناڑ
نہر و پھر پھر کے ہو عبادت — پھر فوّر گر کے ہو عبادت

سر سبزے کو نم کرا دشمن تو — جھک جا او شاخِ بارور تو
مرغانِ چمن چہک او غنچو تم — گلہائے چمن مہک او غنچو تم
بلبل کی زباں پہ قال آئے — پتی پتی کو حال آئے
قدرت کے ہتھکنڈے ہیں نرالے — دیکھیں آنکھوں سے آنکھوں والے
تازہ کیا جسم و جاں کو اوس نے — سرسبز کیا جہان کو اوس نے
ہے رشکِ جناں ہر ایک گلشن — ہر پیڑ پہ ہے بلا کا جوبن
رُک رُک کے نسیم چل رہی ہے — سبزے پہ ہوا مچل رہی ہے
گیہوں کے کھیت دھانی دھانی — تختے سرسوں کے زعفرانی
ایسی کھیتوں میں کچھ تو اودی — کچھ سرمئی اور کچھ کبودی
ٹیسو سے ہے لال لال جنگل — منہ پر ہے ملے گلال جنگل
آتے ہی بسنت مدد پہ آئیں — شاخیں آموں کی بور لائیں
کوئل کو کی تو آئے بادل — سر پر گلشن کے چھائے بادل
اوپر چھائی ہوئی گھٹا ہے — نیچے پریوں کا جمگھٹا ہے
نسلیں نکھری ہوئی ہیں سب کی — زلفیں بکھری ہوئی ہیں سب کی
سحر انکھڑیوں میں زبان میں جادو — فقروں میں فسوں بیان میں جادو
مستانی ادا۔ نشیلی آنکھیں — تیکھی چتون۔ رسیلی آنکھیں
بانکی وہ چبھب وہ تر چھی چتون — شوخی۔ طراری۔ چلبلا پن
جو ہے وہی کھیلتی ہے ہنس کر — اک ایک ڈھکیلتی ہے ہنس کر
انداز سے آرہی ہے کوئی — منہ پھیر کے جا رہی ہے کوئی
ہنستی پھرتی ہے کوئی تنتی — جوڑا پہنے ہوئے بسنتی
کوئی کرتی ہے چھیڑ خانی — دکھلا کے کسی کو کچھ نشانی
کوئی پڑی آہ کر رہی ہے — کوئی کھڑی واہ کر رہی ہے
کلیاں چن چن کے توڑتی ہیں — آپس میں شگوفے چھوڑتی ہیں
کھل کھیلی ہیں راگ لا رہی ہیں — مل مل کے بسنت گا رہی ہیں
دنیا تو بہار سے ہے مسرور — ہے برق کا سوز دل بدستور
واں دشت و چمن ہرے بھرے ہیں — یاں داغ کہن ہرے ہوئے ہیں

گل بے رخ یار خوش نباشد
بے یار بہار خوش نباشد

رتن ناتھ سرشار

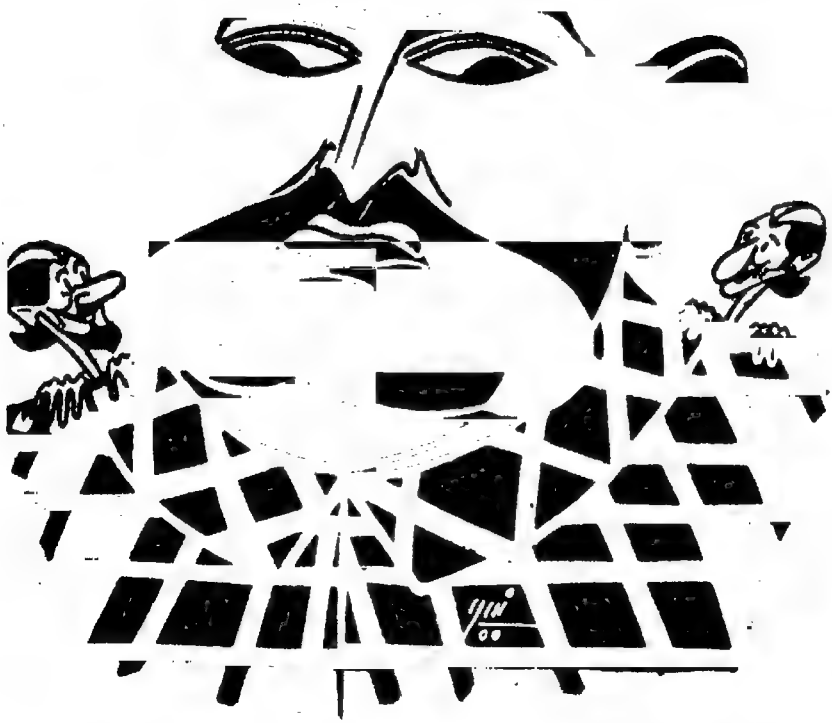

کیا یہی ہے لن ترانی آپ کی

دیکھ لی بس خوش بیانی آپ کی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

ہم :- اودھ پنچ ہیں ؟ ذرا ادھر تو آؤ۔ تمہیں واللہ ایک بات سُنتے جاؤ۔ خدا کی قسم وہ لطیفہ سناؤں کہ ہنستے ہنستے لوٹ کبوتر ہو جائیے۔

اودھ پنچ :- تو بھئی ہم سے کے ہی کھنکھلا کے ہنسے دیتے ہیں (ہاہا ہا۔ خ خ خ خ خ خ)

ہم :- یار اس کی سند نہیں۔ آخر علت کیا ہے۔

اودھ پنچ :- واہ وا۔ علت کیا ہے اور سنئے صاحب۔ نار روس کا حال سُنتا ہے۔ پرنس بسمارک کی ملاقات کرنا ہے۔ ڈزریلی صاحب کی خبر لانی ہے۔ رویس کی خیر منانی ہے۔ کیا آپ کی طرح لونڈے پڑھانے ہیں۔

ہم :- واللہ کیا کمی ہے۔ لانا ہاتھ کیوں بچ کہنا کس چکے سے ہاتھ لیا ہے۔ کیا سر و دست سوجھی ہے۔ در دتم ہاتھ نہ لگتے۔

اودھ پنچ :- اے لاحول۔ ہاتھ دے کے مہنے پیپل پایا اچپا کو کیا کہتے ہو ؟

ہم :- ایک ضلع میں ایک بید م کے ولایتی کا بیٹے بیٹھے شوق چرایا کہ اردو پڑھیں۔ سوچے کہ ہرشل نے علم ہیئات میں اپنی تخلیق انبق کا سکہ بٹھادیا۔ نیوٹن نے ریاضی میں کوس لمن الملک بجایا۔ کلمبس نے دنیائے جدید کا پتہ لگایا۔ آؤ ہم اردو کے پڑھنے میں ایسی بات پیدا کریں کہ شیطان سے زیادہ مشہور ہو جائیں۔ سوچتے سوچتے آخر ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ بہت دور کی سوجھی۔ سوچے کہ الف بے تے بیٹھے بیٹھے کون رٹے۔ یہ پرانا فیشن ہے۔ آؤ پہلے گالیاں سیکھیں۔ اس سے دو فائدے۔ ایک کہ ثمہ وکار۔ ایک تو گالیاں سیکھ جائیں گے زبان دان کہلائیں گے۔ دوسرے ہم دلائتی آدمی لفٹینوں پر پڑھ پڑھ کے منہ لگائیں گے۔ اونہیں کی زبان میں انکو صلواتیں سنائیں گے۔

اودھ پنچ :- بارک اللہ۔ دلائتی اور لفٹینی کی ایک ہی ہوئی۔

ہم :- خیر صاحب۔ یہ سوچ کر حضرت نے ایک مولوی بنا کو بلایا۔ اور اپنا مافی الضمیر کہہ سُنایا۔ وہ بے چارے چکرائے۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ صاحب گالیاں سکھانا جانا کام نہیں۔ فرخ آباد جائیے۔ پیر مجھڑی کی بیعت کیجئے۔ یا بھٹیاریوں سے قاعدہ کرائیے۔ یہیں آزمائیے۔ ایسی نوکری سے ہم درگزرے۔ صاحب بیمار بہت بگڑے۔ سیدھے سے ٹیڑھے اور بیٹھے سے اوندھے ہو گئے (قتل کے اوندھے) طیش کھا کر فرمایا کہ دل میں افسوس آتا ہے۔ ہم گالیاں نہیں جانتا اور وائر (وہ) سب کے پہلے ہم کو گالی دیتا۔ آخر ہی (گنگھ کو خدا

پنجہ نہیں دیتا) کہتے ہوئے اسی پیدم کے یہاں سے نوک پلک جاتے۔ صاحب بہادر اس مولوی کو کوڑ مغز سمجھے اور کسی چپڑاسی اور خانساماں کو بھیجتے کہ ان کو گالیاں لکھوا لائے۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے زیادہ نا فہم بیٹھے۔ صاحب ہمارے ایک مرتبہ موضع حماقت پور پرگنہ خرآباد میں تشریف لے گئے۔ رات کو دس بجے جب اپنے کام سے فراغت پائی تو یاد الٰہی کے عوض گالیاں یاد آئیں۔ فوراً باآواز بلند گالیاں یاد کرنے لگے۔ خانساماں خیمے سے دور تھا۔ سئیس سے پوچھا۔ کاہے پر گو پدر بو مر گو سارا رات نیز کت (بے وقت) کاہے بلائے ہے۔ اور سنے گھر بکر کمار چپائی مار چپائی مار۔ بو مر گا تا ہیں۔ صاحب کچھ پڑھت ہیں۔ خانساماں فوراً خیمے کے پاس گیا۔ ہا ہا۔ یہ صاحب کو کیا گیا۔ ابھی تو اچھے بھلے چنگے تھے۔ گرمی پڑھ گئی یا پاگل ہو گئے۔

پانی اٹھا کر لے گیا۔ پکھا کیا جب صاحب فراغت کر رہے ہیں۔ تمہارے وقت کی شناسائی۔ نئے دھن میں سر دھن رہے ہیں۔

سوئر کا بچہ - مرغی والا

حرام زادہ - کتوں خانسالا

اے سبحان اللہ۔ کیا موزوں طبع ہے۔ یہاں بھی قافیے کا قافیہ تنگ کیا۔

خانساماں :- صاحب یہ آپ ہی آپ کس کو گالیاں دے رہے ہیں۔

صاحب :- ول باگ جاؤ۔ آج ہمارا پلا سبک ہے۔

بجا ہے پیر و مرشد۔ وہ سرا سبق اس دن ہوگا جب حضور کی چپت گاہ سے بیٹے پر تیغ کھنچے جائیں گے۔ نصد کھولی جائے گی۔ تو گویا سب کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اور فاضل حضور رتب ہی ہوں گے جب پاگل خانے میں زنجیر کھڑکھڑائیں گے۔ آپ کا علم دنیا سے زالا ہے کہ بسم اللہ ہی سے لوہے کے پنجے چباتا ہے۔

:- ز ز ز۔ بھئی ز ز ز اچھی بٹی

بحمد اللہ کہ یہ ولایتی صاحب کسی ضلع کے جج شریف یا جج نہیں۔ ورنہ عدل و انصاف پر خوب گالیوں کا چھڑا چلتا ہے۔ ہم کہتے آمدہ لکھتے اہل۔ سرکار نے یہ اچھی قید کر دی کہ کام یورپین سے تک اردو کا امتحان نہ دے لیں ترقی نہ پا سکیں۔

اودھ پنچ ۱۴ اگست ۱۸۸۰ء

سرشار

طالبِ نظارہ ام پرن برافگن زرخ

پیشِ صفِ راستاں شعبدہ بازی مکن

ایک پُرفضا اور ترہت افزا باغ میں ایک رند شاہد باز مے رنگ دیواں سنا رہے تھے۔ اور گرد گلرخانِ سیم بدن خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ اور احباب بذلہ سنج مرغانِ سرخ بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہچہا رہے تھے کہ دفعتاً مجمعِ احباب سے ایک خوش ادا اور خوش گلو نے بڑی رسیلی اور رسیلی آواز سے تان لگانی شروع کی کہ

تمی جھانکی جھبر کی ڈیرہ مورے بارے بلم

او ہو ہو۔ یہاں شورش کی روح اس وقت وجد کر رہی ہوگی۔ واہ اوستاد کیا کہنے ہیں۔ ہاں ذرا اونچے سروں میں۔ واللہ کیا گلے بازی ہے۔ یہ گلا ہے یا سہ رو اس کا چکارہ۔ اس کے بعد حضرت کھلے بند فالودیا مفنون آویزۂ گوشِ ساسعین ہوا۔ ہم بھی نظر سے اوجھل بیٹھے تھے جیسے بوزرگل یا سہ رو دیل یا سیم نوبہار یا شمیم طرۂ مشکبار۔ ہم نے اس دلکش مضمون کو اپنے مذاق کے موافق پاکر غلغلۂ واہ واہ بلند کیا واہ بھئی کھلے بند تم تو چھپے رستم نکلے، ہمیں خط کے ذریعے سے اپنے نام نہیں بتا دیئے، لیکن حضرت دہل پر تنگ نہ بھیجئے گا کہ اس صنگی میں آٹا گیلا ہو جائے۔

ہندوستان کی شادی جیسے گوڑیا گڈے کا بیاہ۔ اے سبحان اللہ۔ دولہن جلندھر میں دولھا پشاور میں اور بھوزی پھر گئی۔ مرد و کارم نگر میں، عورت الوپ نگر میں اور نکاح ہو گیا۔ ؎

خانۂ ملنے در چین است و کشتی در فرنگ

دولہن بیچاری کی کیا طاقت کہ زبان تو ہلا سکے۔ راضی رضا۔ ماں باپ نے جس کے ساتھ چاہا بیاہ دیا۔ جس کنوئیں میں چاہا دھکیل دیا۔

لکھنؤ میں ایک باوضع خوش باش تربیت عالی خاندان معالی دودمان خواجہ صاحب کی دختر پری پیکر سب مایہ خدا سیانی ہوئی تو بیٹھے اونچے اونچے گھروں سے پیغام آنے لگے۔ آخر ایک رئیس غیب لعلنین، شریف الجانبین کے صاحبزادے سے نسبت قرار پائی۔ خواجہ صاحب کی دختر رشک قمر، چندے آفتاب چندے مہتاب ؎

اگر دیدے رخ آں حور سیمیں ۔۔۔ خلیل بت بشکل میگشت آذر

دو چار نوعمر مجولیاں چپل کرنے لگیں۔ اے بہن مبارک۔ اللہ کرے لعل بلدہ دروازے پر شہنائی بجے، شہر کھڑیں سے سسرال جاؤ۔ ہم نے بھی اوٹی سی خبر پائی ہے۔

وہ مسکرادیں۔

تو لجاتی کیوں ہو۔ اللہ سب کو یہ دن نصیب کرے۔ ہم تو آج حضرت عباس کی حاضری کریں گے۔ بہن! خاتون جنت کی قسم یاد رکھنا۔ ؎

میاں توصیف دیکھنے کے لائق ہیں۔ ابھی نام خدا ئیں صلیبی ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑا اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

دولہن بیچاری شرمائی جاتی تھی۔ کسی کو منہ نہیں میں تھ رکھنا۔ ہنسو بھی۔ اللہ سوں بھی۔ یہ دل لگی نہیں جاتی۔ گرد دل ہی دل میں کھل جاتی تھیں۔ غرض کہ خدا خدا کر کے میں شادی ہوئی۔ جب چاندنی سے سبزے میں کھیت کیا تو مشاطگان چابک دست نے اس سہ نفا کو سوار منگا کر کے بارات عید کرنے میں بھیجا۔ خوب ہنسے ؎

برقع زعارض برفگن یک صبحدم تا جاوداں
گرد و فراش صبح را خورشید تاباں در بغل

کہتے ہوئے نقاب زریں ہوا اٹھایا تو زنگار کا نقطہ پایا۔ نگاہ پھسل جاتی تھی۔ دولہن نے جو زدوہ نگاہ حضرت پر نظر ڈالی تو اللہ ہی اللہ۔ ادھر دولہن کا وہ نور عالم افروز، ادھر میاں کالے بھجنگ مشکل کے روز، ادھر مسیت بشاش، ادھر سینہ پاش پاش، ادھر چہرہ گلنار، ادھر آنکھیں اشک بار، ادھر سینہ داغ داغ، ادھر کلیجے پر داغ، ادھر عرش بریں پر داغ، ادھر خوشا بلبل و ایاغ۔ ادھر زنانہ خوشی و ظیفہ زبان، ادھر آہ و فغاں۔ علیٰ ہذا باغ ہم تفص کر دند۔

بے جھجھ چاند کو گہن لگ گیا۔ شانچ صندلی پر پارسیہ کا قبضہ ہوا۔ ہائے اگر ایجاب و قبول کا نمونہ ہی ہوتا تو کس مزے سے دولہا دولہن میں گذرتی۔ اور طرہ یہ کہ بیوی پڑھی لکھی، زیبت یافتہ، خوش فکر، نکتہ سنج میاں مذاق باز، پر تخلیق، بذلہ سنج، لکھے پڑھے نام محمد فاضل۔ الحمد للہ بے کہتے تو ٹوپا، منہ خیر صلاح۔

یا حضرت! ذرا غور تو کیجئے۔ یہ شادی ہے یا رنج و الم کی خانہ آبادی۔ دولہا دولہن کی رضامندی مقدم ہے۔ یہ نہیں کہ والدین نے چاہا جس کے کھونٹے باندھ دیا۔ روز رنج و الم کی افزائش۔ تمام عمر کی کاہش۔ بات بات میں تکرار۔ آئے دن ہوتی بیزار۔ ایسی شادی پر خدا کی سنوار۔

جی ہاں یہ تو ہم نے بھی سنا ہے کہ یورپ میں کبھی کبھی بڑا امتحان لیا جاتا ہے۔ بھیا یہ تو اس حال میں کہو جب ہم ان کی سی بے تکلفی پیدا کر لیں، اور اچھا اگر اس بھانکی جھونکی میں بھی ننگ و ناموس کا خیال نہیں رہتا تو قطعہ مافسد وقع مالکہ پر عمل کیجئے۔ اس قدر آنا دی در متعلق العنانی کیوں دیجئے۔ چلئے فراغت ہوئی۔ جاما معلب حاصل۔ اور یہ تو بات ہی نرالی ہے کہ گذرہ بروزہ اگرچہ گذرہ لیکن ایجاد بندہ۔

اورنج، ۱۲ مارچ ۱۸۸۶ء

جنگی پتنگ کا میدان

کہو سا کا اور ہیچ! کبھی جنگی پتنگ بھی لڑائے ہیں؟

یہ جنگی پتنگ کیسے؟ گول، دوپنا، ڈیڑھ گنا، خوبوزیا، شعر بنیا، جھنڈی دار، لوتیا، مانگ دار، پھیڑیا، بگلا، دوپا سنے تھے۔ یہ جنگی پتنگ کہاں ایجاد ہوئے؟

ا۔ بھیا، اوائل سرد مانے پیچھے بھائے۔ کل کھلا کہ سلطان روم سے جنگی لڑکوں کا میدان ہو دیا۔ اس تکلی کا تو کیا پتا تھا کہ

روم سی سلطنت رفیعہ سے ٹکر لیتا۔ مگر روسیوں کی شہ جو پائی تو جنگ پر چڑھ گیا۔ مدد مانگ کر لیا کرنے لگا۔ ترکی فوج نے دم کے دم میں اس کی ترکی تمام کر دی۔ ایسا پٹایا کہ پتا توڑ۔ میدان چھوڑ، رشتہ شجاعت توڑ، جنیت سے تاتا جو ٹوٹک دم بھاگا۔ وہ کاٹا لڑانے والا پتنگ کی رٹھائی کیا جانے۔ روس نے جو دیکھا کہ پالا روم کے ہاتھ ہے تو بگڑے کا ہاتھ بٹایا۔ فوراً پہنچ چلا۔ عیسائی سلطنتوں نے آزاد کرانے کے حیلے شرعی سے جھٹ میدان بدلیا اور میدان کارزار میں دو چڑھا۔ اوچکا اور منہ کے بل گرا۔ گرا اور پھر سنبھلا اور پھر بڑھا۔ بڑھا اور پھر گھٹا۔ گھٹا اور پھر ٹوٹا۔ ٹوٹا اور پھر پٹا۔ پٹا اور پھر ٹوٹا۔ اب تو ایسا جم گیا کہ خدا ہی بٹائے تو بٹے۔ طرفین سے خوب خوب چوٹیں چھپکیں۔ بڑے بڑے جغادری پتنگ باز ہیں۔ مدی گھسیٹ ہیں خوب مشاق ہیں۔ اپنے گھر سے چھپکا پیٹے پر سے اس زناٹے سے کھینچے گئے کہ عرشیانی کا پتنگ کھٹ سے لگ۔ وہ کاٹا۔ اور جو کہیں کنے تھے گئے تو خالی ڈور ہاتھ میں۔ کلیجا ہوا ہو گیا۔ ارے کر کے رہ گئے۔ روسی لنڈورا لڑانے میں طاق ہیں۔ چپے دست سے ڈور کو بڑھاتے جاتے ہیں اور غنیم کے میدان میں جا کر پیچ لڑاتے ہیں۔ دونوں نے خوب خوب پیچ کاٹے۔ مگر روسیوں نے آج کل پٹائے بہت۔ تھوڑے دنوں سے کچھ ایسی ہوا بندھی ہے کہ ترکوں کی جیت کا چراغ گل ہو گیا۔ مگر ہے یہ نیم مزور چہ می شود یونان نے چاہا تھا روس کی طرف ہو رہے مگر انگلستان نے للکارا کہ کیوں بچارا کٹا۔ پیٹا ہے۔ پیٹا۔ جرمنی اور آسٹریا بھی روس کی شراکت کو کے تپلی ڈور سے روم کے چھکے چھڑانے پر آمادہ تھے۔ لیکن پیٹے کے خیال سے جب ہو رہے۔ بحری میدان میں بھی خوب مایی جال پھیکے۔ کبھی انہوں نے غوطہ دیا، کبھی ان لوگوں نے دبکیں پالا کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

اودھ پنچ، ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء

لکھیم پور کھیری

لکھیم پور کھیری کے شمال کی جانب کے مشرق کے مغرب کے دائیں کونے کے بائیں طرف ایک بڑا ثاق دق جنگل ہے کھیری۔

ایک صاحب کو کہ عرصۂ دراز سے محکمہ آبکاری کے تحم میں پڑے تھے۔ شوق چرایا کہ شکار کھیلیں۔ جب جنگل میں جا رہے۔ چھپٹے وقت کسی نائی کا بھائی بانچے چڑھائے، جو تیاں ہاتھ میں دبائے۔ ننگے دار ٹپل سر پر جمائے، بجیا لٹکائے سامنے سے آ رہا تھا صاحب ہاورنے پوچھا ول ٹم کون ہے۔ حضور میں شکار ا ہو بو تو دل ٹم ہمارے ساتھ چلے جم کو شکار کھلاؤ۔ خداوند یہاں جنگل میں کیا شکار کھیلئے گا۔ دل اسی جھاڑی میں۔ واہ حضور اس میں تو کانٹے ہیں گے یہاں امامت کے مشوق کو ڈھونڈیئے جو پریوں میں چھپ رہے تھے۔ تو کا ہونے دیجئے۔ گجر دم ایک سے ایک قبول صورت — بھیجئے۔ کس وقت شکار کیا۔ اب شام ہونے کو آئی ہے۔ مجھے تین کوس اور چلنا ہے۔ سلام۔ دل سلام نہیں نہیں۔ تم بولا کر یہاں سے تین کوس پیتا ہے۔ ہم چلنا مانگتا ہے۔ ہاتھی لاؤ۔ تب تو چپراسی نے بڑھ کر کہا کہ بجو ریو سار بیر سکار پتر یا کا بھائی ہے۔ صاحب مسکرا دیئے۔ اتنے میں رن مکھنی جو جنگل جنگل ہرنوں کا شکار کرتے پھرتے ہیں عین وقت پر پہنچ گئے۔ نوٹ بک کے جال میں پنسل کے ہاتھ سے اس خبر کو ایسا پھانسا کہ جکڑ گئی۔ نذر رہے۔

رتن ناتھ لکھنوی۔ اودھ پنچ، ۲۰ نومبر ۱۸۷۷ء

کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی
خوشامد سب کے کرتے ہیں جس سے جیسی بن آئی

اکبر الہ آبادی

ہٹو بچو۔ سنبھل بیٹھو مجھ کو۔ ہم آتے ہیں۔ ہم آتے ہیں۔

ہاں۔ ہاں۔ یا اللہ! اے عفت آپ ہیں کون!

ایں! ہم ہیں کون؟ ہم ہیں۔ ہم!

توبہ! ارے یہاں خدا کے لئے کچھ کہہ گئے بھی آخر ہو کون! بتا ہی دیں۔ ہم ہیں۔ بخیال ولد دماغ ولد نیچر ولد قل ہو اللہ احد اللہ الصمد ..... الی آخرہ۔

واہ وا۔ واہ وا۔ یہ تو آپ نے اپنے نام کے ساتھ اپنا نسب نامہ بھی پڑھ سنایا یہ تو فرمایئے یہاں نہ کوئی کمیٹی نہ سوسائٹی نہ لکچر نہ آرگنائزر۔ نہ چندہ نہ لاٹری۔ آپ زور شور سے جو تشریف لائے ہیں اس کا کیا باعث؟

آہا ہا! اس کا باعث کچھ نہ پوچھئے ؎

چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے!
رت بدلتی ہے کوئی دن میں ہوا پھرتی ہے

ادھر ادھر ادھر بدلیاں۔ نیلم پری بنی ہوئی کہ چند سے آرہی ہیں ادھر ہری ہری پتیاں معشوق سبز پوش کی طرح اپنی جوبن دکھا رہی ہیں۔ آپ جلیئے۔ ہم ایک جوہر مجرد۔ کلیاں میں آگئے۔ کمیٹی چھوڑ محفل رنداں میں آنکلے۔

جناب یہ سب سہی۔ مگر کچھ بات اور بھی ہے ورنہ ؎

ایک سے ایک ہے تماشا رنگ
دیدنی ہے جہاں زنگا رنگ

ہزار رنگ بدلے کبھی آپ نما نخالۂ دماغ سے نہ نکلے۔ اب کیا تھا کہ آپ نے اس دھوم دھام سے پر پرواز کھولے ہیں؟

سچ بتا دوں؟

مناسب تو یہی ہے!

بھئی سچ تو یہ۔ یہ ڈاکٹر آف لٹریچر کو بغیر کئے اول درجہ صدر اعلیٰ کر دے (ولایتی یعنی صدر اعلیٰ کے مرادیں۔

وہ منیں کو بگڑا گویا مرثیہ خوان اور بگڑا وکیل عدالت ہے) ایکٹ پابندی اشتہارات کی ترمیم کی کس عمدگی سے رائے دی ہے کہ جی پھڑک گیا۔ پیچ پر پہنچے تو ہم کو جلا دیا۔ میرے حق میں تو مسیحائی کی۔ سقف دماغ میں سو کھے مکڑی کی طرح ہزار جال پھیلا تا مگر ایک مگس مضمون ہاتھ نہ آتی تھی۔ اب تو وہ خرگس میں پھنساؤں کہ ہزار قحط پڑے میرے راتب میں خلل نہ پڑے۔ اس وقت طبیعت ایسی حاضر ہے کہ جو مضمون فرمایئے بے تکلف موزوں کردوں۔

اگر یہ ہے تو اپنی سرکار ابد قرار کی شان میں ایک رباعی دعائیہ کہنا ضرور ہے۔

بہت خوب۔ اے حضرت! یہ تو خود ہمارا فرمن ہے۔ نذر نہ مضمون ہاتھ آیا ہے تو ادائے نکس واجب ہے۔ اچھا سنیئے۔

پہلا وزن

قیصر ہند کو اللہ سلامت رکھے　　دشمنوں کو بدتر سلامت رکھے
حاسدوں کو غم حسرت کی نشانی کردے　　پیچ کو عشرت و راحت کی علامت رکھے

آمین۔ آمین۔ آمین۔

اے سبحان اللہ! خوب ارشاد کیا ہے۔ مجھ کے واسطے علامت کس قدر موزوں ہے۔

آداب بجا لاتا ہوں۔ بندگیاں ادا چاہتا ہوں۔

کیا خوب آداب نہ ہوا دولتیاں ہوئیں
جی یہ تو سی طبع کی رعایت ہے

اچھا یہ بندگیوں کا ادا چھا تا چر معنی دار د۔ بندگیاں نہ ہوئیں میخوار کی پگڑی ہوئی۔

جی یہ بادۂ مضمون کی مناسبت ہے۔

خیل ہیں تو آپ ہی ہیں۔ بھلا جواب دینے میں کب رکھے گا۔ خیر اب زمانہ سابق کی کچھ برائی اور اس عہد کی کچھ تعریف فرمائیے۔ پیچ بات کہنے میں کیا عذر ہے۔ وہ بھی لیجئے۔

دوسرا وزن

ہوتے تھے آگے ہند میں مجنوں بادشاہ　　کرتے تھے بے خطا بھی بہت خوں بادشاہ
اے پیچ میرا عہد عجب عہد رامن ہے　　یعنی ہے اس زمانے میں قانون بادشاہ

پیچ پر ـــــــ!

ہاں ہاں۔ بس آگے نہ بڑھئے گا۔ صرف شعر کہلا لیجئے۔

یوں ہے تو خیر۔

خیر کیسی! خون جگر کھا کر نظم کروں۔ آپ ایک خیر میں خاتمہ بالخیر کئے دیتے ہیں۔ اے حضرت! تعریف کیجئے۔

اچھی زبردستی کی تعریف ہے۔ اچھا صاحب۔ واہ وا۔ ماشاء اللہ۔

تسلیم جاری کرتا ہوں۔

یہ کیا؟
قانون کی رعایت۔
اسی رعایت نے آپ کو مجنوں بنا کر دو قانیوں کا زبردستی خون کرایا۔
اچھا، فواح بند کو سرکار نے یورپ بھیج کر جو عزت افزائی کی ہے اس کی نسبت بھی کچھ ارشاد ہو۔
یہ تو آپ نے میرے دل کی کہی سا اچھا سنیئے۔

تیسرا وزن

انگلش کی حد سے ماورا تک — ہندی لشکر جو بڑھ گئے ہیں
کہتے ہیں یہ ہنس کے ہندوانے — کالے گوروں پہ چڑھ گئے ہیں

بہت خوب۔ سبحان اللہ۔
آداب عرض کرتا ہوں (رعایت ظاہر ہے)
خیر یہ تو سب کچھ ہوا۔ اب شہر ملکت کی تعریف میں بھی کچھ ارشاد ہو جائے۔
حضور۔ حضور۔ وہ تو ہمارا دارالسلطنت ہی ہے۔ الہ آباد رکھے۔ اچھا سنیئے۔

چوتھا وزن

نائب سلطان عالم کی جہاں درگاہ ہے — حاکمان داد گر کا خیمہ و خرگاہ ہے
تاجروں کا کیوں نہ ہو اطراف یورپ سے ورود — جانتے ہیں سب کہ ملکہ بھی بندگاہ ہے

اے سبحان اللہ۔
تسلیم کو واتا ہوں۔
یہ کیا؟
بندرگاہ کی رعایت۔ اے حضرت! اب فرمائش نہ کیجئے گا۔ دیوانہ نکلا چاہتا ہے۔ اس وقت رخصت ہوتا ہوں۔ آپ بھی سمجھ لیجئے گا۔ کہ بوسے کی بھوت کی لنگوٹی ہے۔ چلتے چلاتے ایک وزن اور عرض کئے دیتا ہوں۔

پانچواں وزن

سُر سُر سُر سُر سُر سُر ٹک
سُر سُر سُر سُر سُر سُر ٹک

میاں خیال صاحب اس قدر جھک مار کے۔ فوجکہ ہو گئے وہ گئے پھر وہی سکوت۔ وہی سناٹا ؎

شمع کے گل ہوتے ہی پروانے بھی ہو گئے
دفعتاً گیا تھا میاں انجمن کیا ہو گیا

اودھ پنچ ۱۲ اگست ۱۸۷۷ء

مسٹر اوورچ صاحب۔ آپ کو عالم بالا کی پولیٹکل باتیں بتا دوں، وہاں کے انتظامات کی خبر سنا دوں تب تو آپ اپنے کارسپانڈنٹ کی بلند پروازی کے قائل ہوں گے یا نہیں۔ لیجئے مجھ سے سنیئے۔ عرش بریں پر ایک کمیٹی ہوئی۔ حضرت جبریل نے طوفان سنہ آئندہ کا بجٹ پیش کیا۔ بہت دیر تک بحث رہی۔ بالآخر سال بھر کے لیے حضرت میکائیل تخفیف میں در آئے۔ حقیقت میں ایسے فرشتہ کا مامور بہ خدمت ہونا جس کے ایک بال کو سات سمندر نہ تر کر سکیں۔ خالی از مصارف کثیرہ نہ تھا۔ خصوصاً ایسے وقت میں کہ کوہ ہند و کش سے لے کر جبل اسود تک رسد کی ضرورت ہے۔ بعدہ سنہ گذشتہ کے عالم ارواح کی آمدنی کا بجٹ پیش ہوا۔ حضرت عزرائیل کی گزرانی ایک مستی کے ساتھ پاس ہو گئی۔ لہٰذا علاوہ قسط اور وبا اور امراض معمول کے فرشتہ جنگ روم و روس ان کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ کہیں آپ یہ فقرہ برتیز کریں کہ عالم بالا کی مجریٰ میں شہاب ثاقب سے کیونکر بچے۔ جناب یہ بات دور بین لگانے والوں سے پوچھئے۔ میں نے مرتبہ میں یہ حالات دریافت کئے ہیں۔ آپ کے کارسپانڈنٹ۔ کے خیال کو ہر محکمہ میں حاضری کی اجازت ہے۔

اودھ پنچ۔ ۴ ستمبر ۱۸۷۶ء

سسرال کی گالی کا بُرا مانے سو بھڑوا

والی صاحب فوج سفیر متعینہ لندن روس جب پورٹسماؤتھ میں گرینڈ ڈیوک نکلس کی ملاقات کو گئے تو نکلس نے وہ بے اعتنائی برتی کہ ان کی ساری کاٹھیائی حکمت عملی کے بعد رو میں جم کر رہ گئی۔ نہایت انقباض کے ساتھ نکلس صاحب منہ پھیر کر بولے بھی تو یہ کہ "کم بخت جاسوس جو دوستوں کا بھیس بدل کر آتے ہیں اور بھی بدتر ہیں۔" اس تو ہین کی شکایت جلسہ وزرائے انگلستان تک پہنچی۔ گمان کیا بلکہ یقین تھا کہ کوئی سخت تہدید منجانب انگلستان عمل میں آئے گی۔ لیکن سارے جھگڑے کا تصفیہ مضمون ذیل تحریروں سے ہو گیا۔ وہ اصل تحریریں ہم کو نہیں ملیں مگر فرانسیسی والوں کے قیاس کے مطابق اون مراسلات کا مفہوم یہ ہے۔ لارڈ ڈربی بنام ڈیوک نکلس "کہیں بھائی جان! ذلیل کرتے ہو۔ ہم نے کبھی کان دم ہلائی۔ یہ اہانت کے کوڑے چہ معنی دارد؟"

ڈیوک نکلس "لڑکی بیاہ کے کیا ہم اب اس پھیڑ جھاڑ سے بھی گئے؟"

مخاطبہ لارڈ ڈربی "والی صاحب سے سسرال کی گالی کا برا مانے سو بھڑوا۔"

اودھ پنچ ۵ ستمبر ۱۸۷۶ء

ایک نادان خوش اعتقاد کسان کی دُعا

اے میرے اچھے خدا میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ تیرا کوئی ساجھی نہیں مجھ پر کرم کر۔ بڑھے ہوئے ملا کہتے ہیں کہ تو قوی ہے قدیر

ہے۔ محیط ہے میں ان پیچیدار باتوں کو کچھ نہیں سمجھ سکتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ تو لاٹ صاحب سے بھی بڑا ہے۔ عام لوگ کہتے ہیں کہ تو ہر ذرہ عالم کا منتظم ہے۔ میں اپنے چھوٹے سے، اور کمزور خیال کو اتنے چکر دے سکتا کہ ہر ذرہ پر نظر دوڑا کر تیری قدرت کی کارروائیوں کا مشاہدہ کروں مگر یہ جانتا ہوں کہ حاکم بند و بست نے بغیر تیری مرضی کے مجھ پر جمع نہیں بڑھائی۔ اے میرے داتا مجھ پر رحم کر جب تو ہر ذرہ کا منتظم ہے تو میرے کھیتوں میں بہت سا غلہ کیوں نہیں پیدا ہوتا کہ اس کو بیچ کر جو باقی بچے اس سے بال بچوں کو پالوں۔ اے اللہ تو ہر جگہ ہے مگر شاید اس موضع میں تو نے گزر نہیں کیا اور اگر گذر کیا تو میری ابتری حالت کو دیکھ کر مجھ کو اپنا بندہ نہ سمجھا اور اگر بندہ سمجھا تو گنہگار پایا۔ اس وجہ سے مجھ پر جمع بڑھوا دی اے اللہ میرا گناہ معاف کر وہ گناہ کچھ بہت بڑا نہیں ہے۔ میں نے تیل والے صاحب کی ایک بھینس چرائی تھی مگر اس کے لیے دو مہینے کی قید بھی بھگت لی اس نے میرے کھیت کا نقصان کیا تھا میں نے اس کو باندھ رکھا تھا اس کے سوا اور کوئی گناہ بھی نہیں کیا نہ کسی کی زمین دبائی نہ مال چھین لیا یا خدا اب مجھ پر اپنا فضل کر اور میری اس دعا کو بدلی کے لفافہ میں لپیٹ کر تیز ترین بجلی کے ہاتھ صاحب لوگوں کے پاس بھیج دے اور حکم دے دے کہ مہنگی بہر غریب کسانوں پر مالگذاری کے واسطے ذرا سختی نہ کریں۔

ویسح۔ الہ آباد

خمارستان کا ڈنر[1]

(نواب) سیّد محمد آزاد

مع روئیداد حاضرینِ نکبت قرین

مسٹر پینک الدولہ ——— چیرمین
چُسکی الملک ——— گورنر صوبہ پاک آباد
مسز اخمار بیگ ——— راقم فوجدگرٹ
میر مہر وخا ——— منڈا لین یا نگ کانگ
سیّد ما نبوجنگ ——— کمانڈر انچیف افواج فغفوریہ
دھوان دھار خا ——— انسپکٹر جنرل چانڈو خانجات

مسٹر پینک الدولہ - حضرات! میں اپنے بچّے درجے کی خوش نصیبی اور افتخار کا باعث اس کو سمجھتا ہوں کہ آج میرے نصیب یہ عزت بخشی نہایت ہوئی کہ میں آپ صاحبوں سے اپنے اس شاہنشاہ آفتاب نسب، عادل الانصاف گستر رفعت ذی شوکت اور پر ہیبت کے جام صحت و تندرستی کے پینے کی استدعا کرتا ہوں کہ جس کے عہد انصاف مہد میں ہم لوگ کالی ناگن کرتے تکلّف نکل جاتے ہیں اور وہ بد ذات اور نقتہ گر ہم لوگوں کو ڈسنے اور آزار پہنچانے کی ہمّت نہیں کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اس وقت اس عالی قدر بادشاہ کا جام صحت ہے کہ جس کی رعیت سے بڑھ کر کسی کی رعیت منکسر المزاج، نرم طبیعت اور تہذیب یافتہ نہیں ہے اور جسکی نیک نیتی اور پاک باطنی کی برکت سے افیون کی ایسی مفید نفس کش اور مفرح چیز ہم لوگوں کے استعمال میں ہے کہ جس نے ساری دنیا کے لوگوں سے زیادہ آرام اور تسکین اور راحت اور بے غلش طور سے زندگی بسر کرنے کا سامان ہم لوگوں کے واسطے مہیا کر دیا ہے۔ اور جسکی بدولت انگریزوں نے ہم لوگوں کی جیب کا علاقہ پیدا پایا ہے (چیرس) یا اسی متبرک چیز کی برکت ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے آج تک بجز اس کی ملاقی رنگت کے خون کی رنگت نہیں

---

[1] یہ عنوان ہے "خمارستان کے تہذیب یافتہ مدیروں کی تجارت کے جلسے کا سالانہ ڈنر"

کسی نواب میں نہیں دیکھی ہے امدیسی کی کہ اس سے ہمارے کان بجز ساحر نواز آواز بانو کے قرب وجد کی جیسی انگیز اور سینہ تک اور طاقت سوز آواز سے آشنا نہیں (چیرس) یہ اسی پری کا جلوہ ہے جس کا تصور دو پہلے دن تک ہم لوگوں کو آنکھ نہیں کھولنے دیتا ہے لو یہ اسی ہوکا عشوہ ہے کہ جس نے ہم کو ساری دنیا کی شیطانی اور نفسانی لذتوں ہوسوں اور خواہشوں سے بے نیاز کر دیا ہے یہ پھر دل کا مادہ ہماری قوم میں اسی کا خاص علیہ بھگ کر نکلے کے بہادرانہ طور سے لڑتے مرنے کا تذکرہ سن کر وہ دو دن تک ہم لوگوں کے جوش بپا رہتے ہیں یا دیسی کی کشش ہوائی بھری کی قوت ہے کہ ہمارے ہم وطن پٹاخے کی آواز پر دست بقبضہ ہو جاتے ہیں۔ (چیرس)

ہم لوگوں کا عہدہ بریج تو ورشہ ہم ہو کا ایجادی مادہ ہے کہ جس کا اصغر دل غصہ کے خطہ کو جلا دے اور تعلیم پھر کر خاک میں ملتے ہمارے مدک کا پھیلنا ہم وطن کے لیے بسٹر لیوز کا گولا ہے اور کون آج تک اس کی چوٹ کھا کر سنبھلا ہے (چیرس)

ہم لوگوں کا خیالی جنگی جہاز ایرا ہے کہ جو ہمارے پین کے سمندر سے ایک منٹ میں بحر اسود کی موجوں پر برق کی طرح چمکنے لگتا ہے اور ہماری پینک کی گاڑی ایسی ہے کہ جو ایک گھنٹہ میں ہزاروں سمندروں اور لاکھوں پہاڑوں کو طے کرتی ہے۔

اب ہمارے ملک میں بھی انجن کی کاشتکاری سرکاری طور سے جاری ہو گئی ہے۔ کیونکہ ہمارا سارا ملک اس کا محتاج ہے اور اب وہ زمانہ مسرت نشان قریب ہے کہ ہم لوگوں کا کروڑوں روپیہ ہمارے ہی ملک میں رہے گا اور ہم لوگ مالوا اور بہار کے بار عظیم سے واقعی طور سے سبکدوش ہو جائیں گے (چیرس)

علم تجارت ابھی ایسی ترقی کا رہے ملک میں جس المی اور توجہ سلطانی سے ہے کہ جس کا ذکر نا گفتہ بہ ہے۔ تہذیب و علم بھی ان دونوں اوقات پر ہے کہ یورپ والے بھی جس کا رشک کرتے ہیں۔ اور ایسے کامل پروفیسر نگ ہماری یونیورسٹی میں ہیں کہ جو برسوں مراقبہ میں بیٹھے ہیں اور ستارہ اوج کا حال دریافت فرماتے ہیں۔ خلاصہ کلام ہر قسم کی ترقیوں سے ہمارا ملک پین اور ممالک مقبوضہ فلپینیہ مالا مال ہے اور ہر جہت اور ہر طرح سے بایا مرفہ الحال ہے۔

اب ہم جاہ حشمت سلطانی کو نوش جان کرتے ہیں۔ (چیرس) بینڈ بجنے لگا ؎

کھو دیا حسن مدک نے ستم ایجادوں کا
اڑ گیا رنگ دھواں بن کے پریزادوں کا

مرزا عمار بیگ ۔ راقم فوجو گزٹ، ہز ایکسلینسی جنٹلمین اینڈ لیڈیز، ہماری قسمت میں آج ایسا مشکل سبق پڑا ہے کہ جس کے ہم حاشا اپنے کو قابل تصور نہیں کرتے ہیں اور کبھی ہم کو اس کی امید نہیں کہ ہم اپنی آج کی اس عظیم خدمت کو بہ طرح سے اور نیک طور سے انجام دے کر سرخرو اس سے نکل جائیں گے۔ ہماری دلی مسرت اور بڑی عزت کی یہ بات ہے کہ ہمارے سپرد اس جلیل القدر مہمان کا ٹوسٹ ہوا ہے جو آج اتنے بڑے صوبے کا گورنر ہے اور جس کی قلم کی نوک پر ہم لوگوں کے اقبال و ادبار کا دارومدار ہے۔ ہم کو فقط اس کی مسرت نہیں ہے کہ میرے سپرد ایسے عالی جاہ اور بے مثل عہدہ دار کا ٹوسٹ ہوا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ قلبی شادمانی بھی ہم ہے کہ میں اپنی خوش قسمتی سے گورنر موصوف کا ذاتی دوست بھی ہوں اور اکثر ہم نے ہر کین میں اپنی ولایت کی چراگاہوں میں ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سور کے خوشنما اور خوش رفتار اور نیک اطوار بچوں کو چرایا تھا جب کہ ہم اور وہ سمندر گشتی میں ڈوبے ہوئے تھے اس وقت اس ایوان رفیع الشان کے دیکھنے اور عام لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش ہونے کا تصور تک ہم کو نہیں تھا۔ ہمارے

صرف وہ دوست کی ذاتی صفتوں کا بیان کرنا یہاں تفصیل حاصل ہے کیونکہ آپ اگ بھی ان کے ذاتی دوست ہیں۔ اور انکے خلق وسیع، سلیم الطبعی تحمل، مہمان نوازی، سچ دوستی، نیک نفسی کا مزا چکھے ہوئے ہیں اس لئے ضرور ہے کہ میں ان کی قدرت انتظامی، ملکی، اور اس کے معرکہ جلیل کی طرف رجوع کروں اور مشتے از خروارے آپ لوگوں کو سناؤں۔ جو لطائف اور رونق کہ سررشتہ آبکاری کی ان کے زمانہ حکومت میں ہوئی ہے ایسا آج تک کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اور صرف شراب افیون کی آمدنی کو ترقی دینے سے اس قلیل عرصہ میں تہذیب اور علم ایسا شائع ہوا ہے کہ ہر کوچہ و بازار میں شراب خانے اور مدک خانے کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے دیکھنے سے ایک غیبت آدمی کی آنکھوں کو بڑا آرام ملتا ہے۔ منجملہ کی تمغہ گولی کو مصلحت ملکی اور خزانہ خالی کے خیال سے حکمت عملی کی معدی میں ملا کر اس چالاکی سے انہوں نے نیٹو لوگوں کو کھلا دیا ہے کہ جس طرح لوگوں کو وہ اسے تمغہ شہد ملا کر کھلا دیتے ہیں۔ کب پکین اور کھٹن میں اس لطف کے ساتھ منجملہ جاری ہوا تھا۔ اس وقت کا ایسا اثر لوگوں پر ہوا ہے کہ ہزاروں آدمی روزانہ خون تھوک تھوک کر اس خاکستان کو گلستان بنا رہے ہیں۔ یہ انہیں کا گرامی کونسل اور قانون خانہ ہے کہ جس نے ہم لوگوں کو اس جنگلی ملک میں ایسا حافظ صحت اور سرپرست اطوار اخلاقی قانون عطا کیا ہے اور یہ ہماری فوج کے ولایتی لچے ہیں کہ جن کے طفیل میں خاکستان کے اکثر شہروں اور کیمپوں کے نوجوان اکثر دن کی تائید سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ گو اس سے بظاہر چین کے دوا کے تاجروں کا نقصان معلوم ہوتا ہے مگر غور کرنے سے وہ نقصان خفیف اس عام فائدۂ عظیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

یہی ہمارے عالی مرتبہ دوست کے اعلیٰ درجہ کی سرگرمی اور عرق ریزی پر دال ہے کہ ضلع خواب کے کسی لوگوں کی زبان تک اس سے آشنا ہوئی اور انہوں نے بھی مغربی تہذیب کا مزا چکھا۔ چیف کمشنر خرابہ کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے دم کو ان کو بستانی لکھوں میں مرضع کیا گیا ہے۔ تب سے یکسو سے بیس آدمی آگے سے زیادہ قحط کی سختی اور خوف کم کرنے کے لئے دار البقاء میں نشین کرتے جاتے ہیں

اس کا کامل یقین ہے کہ میرے جلیل القدر دوست بعد انقضائے ایام خدمت گورنری اس ملک مفتوحہ کی کہ جب کہ سرسبزی اور کامیابی کا ہار گلے میں ڈال کر اپنے وطن کو تشریف لے جائیں گے تو وہاں بھی اپنے ملک کے لیے پارلیمنٹ پیکین میں بڑا بڑا کام کریں گے اور ہم گورنمنٹ کی تحویل میں جتنے اعلیٰ درجے کے تمغے اور خطاب ہیں، یہ سب لے لیں گے۔

حافظ نے نے بڑے تپاک سے گورنر کا ٹوسٹ پیا اور مینڈ بجنے لگا ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی کہ بر آسمان نیز نہ پرداختی

زاد دھ پنچ، ۱۹ فروری ۱۸۷۶ء

لفظ: ہندوستانی بی بی

نواب سید محمد آزاد

اپنے شوہر کی عاشق، شیدا اور فدائی۔ اپنے بچوں کی اتا کھلائی اور دائی محفت کی دیوتا محبت کی تصویر مروت کی اوتار، انسانی زندگی کی تازگی کے لیے جہاں نواز اور فرحت آثار ہوتے ہمارے گھر کی رونق گھر کی زینت گھر کا بھرم عورتوں اور بچوں سلیقہ کے لیے ہمیشہ رواں ہمیشہ شاداب اور ہمیشہ بہار ہمیشہ کرم محصت کے سرمایا، عزت و محبت گلستان کی ہزار داستان، بلبل بچی قناعت، اسلامیانہ صبر اور درویشانہ توکل کے صاف اور خوش رنگ بادۂ گل رنگ کے مینا کی تقطر، خالص اور بے لوث دینداری کا محفوظ گنجینہ، محصت محفت اور مروت کا قومی دفینہ، بالخلقت وہ سروں کی وقف خدمت و چارہ سازی، بالطبع مریضوں کے لیے سرگرم جہاں نوازی، وہ غنچہ کہ ہوائے محبت خالص کے چلنے پر جس کی شگفتگی کا دار و مدار ہے، وہ سرسبز اور بارور شجر جو اپنے سایۂ عنایت و محبت کے جاگزینوں پر بغیر کسی قسم کی خصوصیت اور قید کے ہر فصل میں ایک رنگ سے رحمت بار ہے۔ وہ سپاہی معرکۂ زندگی میں صبر و قناعت جس کی آبدار تلوار ہے۔ وہ منتظم جزرسی پیشین بینی اور دانشتہ آید بکار کے اصول پر جس کا ہر کاروبار ہے۔ زندگی کے طوفان بلاخیز اور مصیبت سامان میں مردوں کی لوفانی طبیعت کے لیے لنگر کا کام دینے والی، ان کی ہر واقعی اور مصنوعی مصیبت اور رنج میں اظہار خواہش ہمدردی و چارہ جوئی میں سب سے پہلے ہونے کے قبل پاک محبت اور صاف ہمدردی کا دریا، وفا اور غم تراش لبریز جام دینے والی، اپنے گھر کے بچوں پر رات بھر اپنی صحت سے بے پروا ہو قطع نظر کر کے پروانہ وار نثار ہونے والی، رونے ٹھنڈی لڑکوں کی پرانا اور پرشور و شر آواز کی فطرتی ہنگوتی کے بجنے پر رات بھر میں دس دس بار بیدار ہونے والی، وہ انسان، اولاد کی تمنا جس کی سب سے بڑی حاجت ہے، بے اولادی جس کے لیے سخت آفت اور قیامت ہے وہ صحت بار نسیم عنبر شمیم جس کے چلنے سے متعصب دشمنوں کی تنگ خیالی کا تیرہ و تار زندان ہو ہندوستانی کے لیے روضۂ رضوان ہے وہ مسیح الزمان جس کے شفا خانہ محبت و ہمدردی کی بھوں کا محتاج ہر پیر و جوان ہے۔ وہ قومی یا قومی کان جس میں ہزاروں لعل بے بہا نہاں رہتے ہیں وہ عمان رحمت نشان جس سے اخلاقی خوبی اور نسوانی نیکی کے سینکڑوں

چشمے ہر مکان میں بہتے ہیں۔ شہروں کی جمعیت خاطر اور طمانیت کے اوصاف کا خوبصورت اور مضبوط شیرازہ۔ ان کے چہرہ خوشحالی کا خوش رنگ خوشبو اور حسن افزا غازہ۔ وہ نیک کار بندہ شہر کی اطاعت جس کی بہت بڑی عبادت۔ وہ نیک سرشت انسان رحم دلی اور ہمدردی انسانی جس کی جبلی عادت، شہر کی وفا نبرداری جس کے خیال میں پرستش میں شامل جس کے نزدیک دیوتاؤں اور شہروں میں صرف ایک ہلکا سا امتیازی پردہ حائل۔ ایک عالم کی مصیبت پر رونے کو فطرتی طور سے جس کا دل ہر وقت تیار رہے۔ وہ متوالی جو متوالے شہر کی نمک پر صدقے قربان اور نثار ہے۔ ہزاروں شام غربت میں صبح امید کی سجدہ ریزی، وہ خاکسار شہروں کے لیے ہر طرح کی بلندیٔ اور بداطواروں کے لیے ایک قسم کی ہلکی پرہیزی۔ ہر گھر کی باعث زینت آبادی، سلطنت خانہ داری میں انسداد و زدی کی سنداد غیر محسوس دل پسند اور پُر اثر دوستانہ اور فرمان پذیرانہ اداؤں سے اکثر شریف النفس میاں کو در پردہ اپنا غلام بنا تی ہے۔ دل جوئی اور مزاج شناسی کے دروازے سے ان کی شمع قبول تک پہنچ کر اپنے ہر مطلب کا پیام سناتی ہے۔ ہنس اور ہنسا نے والوں کے بے تمیزانہ اور نظامانہ نکتہ چینیوں سے جس کا دل چور ہے۔ اپنے ہنسنے والوں کی خاطر بات جس کو ہر حال میں بدل منظور ہے محل میں بے محل محل کے محل کہنے پر خود رائیگیز مسرت کی اداد کھانے والی باوجود صحیح المزاج ہونے کے جلدی سے صاحب اولاد ہونے کے پُر فنون تمنا میں بیسیوں جاہلوں کی مضر اور صحت سوز دعائیں بے دھڑک کھانے والی، میاں کی بدمزاجیوں کے کاکل پر پیچ و خم کے سلجھانے کا خوبصورت شانہ، روان خانہ، جان خانہ، اہل خانہ۔ وہ قیدی نواز جبار جس کے الفت کا محسوس ہتھکڑی اور بیڑی کی قید و بند سے ہمیشہ آزاد ہے وہ مجنون پرور لیلیٰ جس کے پاگل خانہ کا دیوانہ آزاد سے بیزار اور اپنے پُر فساد و نفسانی خواہشوں سے ہمیشہ معروف جہاد ہے، وہ باغیرت جس کو اپنے شوہر کے گھر سے مر کر نکلنے پر نازو نازنین ہر مصنوعی نازنخرے سے بڑی محتشم نیاز ہے۔ اپنے عزیزوں کی پیاری، اپنے ماں باپ کی دلاری، دنیا کو یہاں کے حق جنت الفردوس بنانے والی بہشتی ناری لڑکپن کی تماشا جوانی کی محبوبہ اور بڑھاپے کی اتا ہے۔ انسانی زندگی سند آسائش کا خطی مرقع ہے۔ سوت کے خیال سے بیوی سے زیادہ ڈرنے والی محاب میں اس کے تصور سے خیالی طور سے لڑنے جھگڑنے والی، وہ عجیب الخلقت عورت نمبر ۱ اور بہنی ال کی صحبت بار آب و ہوا جس کو بہت ضرر کرتی ہے۔ ایک پرانے بے مروت اور غلط جھلانے میں جو آسائش اور بڑی نازش سے ستر اور اسی برس کی عمر تک ہنسا شی بشاش زندگی بسر کرتی ہے۔ سن تمیز میں بھی قبیلہ خانے اور گھر کی جس کو طفی تمیز نہیں بجز اس کے اپنے عزیزوں کے غیر دلگیر عزیز مصر بھی ہو تو اس کو عزیز نہیں۔ باہر کے نوکروں سے کچھ نہ کچھ عناد کا رکھنا جس کا قدیم شعار ہے نہ پہنے ہر رنگ اور ہر طرح سے جس کا دل اپنی دائی ماں کا بدل طرفدار ہے۔ مرد احباب کے ساتھ بے تکلف پہاڑوں اور جزیروں کی دوروں پر دور تک کھانے کا ذوق رکھنے والی کہ جس کے ہوش اڑتے ہیں، محل سرا سے باہر نکلتے نکلتے بے جا اور غیر ضروری شرم سے جس کے پاؤں زمین میں دو دو گز گڑتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس میں جانے کا نام سن کر فوراً اضطراب سے مرغ بسمل کی طرح پھڑکنے لگتی ہے۔ غیر مرد کی چارپائی کے تصور سے لوگر فار جغلی دیار کھوڑی کی طرح بہت خوفناک انداز سے بھڑکتی ہے۔ رسائی اور صلاحیت سے جنگلی مرغوں کو فرط نادانی سے اخلاقی فرخندہ فرجام دام کا وازین کر جس کو پھنسانا نہیں آتا۔ اپنی دلربا اداؤں طبعی قوتوں اور خداداد صفتوں کے حسن استعمال سے جس کو بیگانہ کو خویش اور دشمن کو دوست بنانا نہیں آتا۔ باوجود عمومی اخلاقی علالت اور مشہور بے سروسامانی، عالم کے بھی سو بیماروں کے جی میں بہت آسانی سے بھی ایک انار بننے پر بخت انکا دشوہر کے ولی دلایتی ہم سفر دوست ملے اتنگ دم

ہیں کھڑے کھڑے ذرا سا ہاتھ ہلانے کی بات سننے پر جیکے جانے کے لیے قیامت خیز نگاہ اور بے انتہا اصرار۔ وہ جانماز تکیہ جس پر آج بڑے بڑے لوگوں کی آسائش امارت اور سخاوت کا تکیہ ہے وہ زندہ سلامتی کی کل جس کے ذریعہ سے ہزاروں چاک دامن گریباں افلاس میں منبسط بخیہ ہے۔ وہ دشمنی غیر جوہر سردی سرپلے مار اور دلکش آواز بھی جس پر چابک کی طرح پڑتی ہے وہ ناک نداء موم کی گڑیا غیر مرد کی نگاہ محبت و عنایت بھی جس کے بدن میں نشتر کانٹے کے گڑتی ہے۔ وہ چراغ محبت و شرافت جس کی تو رانی حیا سے بعض بدنصیب روشن خیال حکیموں نے اپنی آسائش اور عافیت کے کاشانے کو دائمی طور پر پُر نور ہونے دینا محض بے سود جانا، وہ آب دار اور آبرہ دار شرافت و عفت کہ جس کو مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے سرتاج نے اپنے سماج ازدواجی میں بہزار تمنا و خواہش پرونا اپنے اور اپنے فرزند حال اور مستقبل کے نوجوان تو سے کے حق میں ہر طرح سے محمود جانا۔

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پُوچھا چاہیئے

احمد علی شوقؔ

آخر یہ عشق ہے کون جانور۔ پرند ہے یا چرند۔ رہتا کس دیس میں ہے، کھانا کیا ہے، پیتا کیا ہے۔ بس ذرا سی بات کے سمجھنے کے برابر بات، جس کے واسطے کامل کی تلاش۔ کشف نہیں، کرامات نہیں، مراقبہ نہیں، سماع نہیں، حال و قال نہیں، مسئلہ تجدد امثال نہیں ؎

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی پوچھے ہم سے
خضر کی جانیں غریب اگلے زمانے والے

اللہ اللہ آپ ہیں اودھ پنچ کے نامہ نگار۔ چشم بد دور آپ سے جلسہ کے اس معمّے کا حل کرنے والا کون۔ علاّمہ نابغہ شکاک صوفی جاہل، پنڈت برلسٹے نام، شعرا بے اعتبار، ایک آپ کی ذات ہے باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ بندہ پرور سُنیے اگلے زمانے والے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے سیدھے سادے آدمی تھے، جو بی میں آیا کہہ گذرے جو سمجھ میں آیا لیا، نہ حجت نہ دلیل۔ یہ عقل جو اس زمانے والوں کو اللہ نے دی ہے پہلے اس کی چھاؤں بھی نہ تھی۔ نہ یہ طریقہ تعلیم، نہ یہ تہذیب، نہ یہ اچھ، نہ یہ ایجادیں، نہ یہ رفتار نہ گفتار، نہ یہ لباس، نہ قیاس، اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا اسی عشق کے معاملے میں دیکھ لیجیے متقدمین نے کیسی منہ کی کھائی، ہزار عقل کے گھوڑے بگ ٹٹ دوڑائے لیکن منزل مقصود کو نہ پہنچے۔ صرف دو قسمیں قائم کیں، ایک مجازی دوسری حقیقی، بھلا عشق بازاری، عشق خانگی، عشق ازدواجی ان کا بھی کہیں ذکر ہے؟ خاک نہیں۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیے، لمبی چوڑی عقل والے ان کی تحقیق پر کیوں نہ غور کریں۔ مجازی اور حقیقی کی تفصیل میری دانست میں فضول ہے۔ ان سے تو تمام پرانی کتابیں بھری پڑی ہیں، رہیں نو ایجاد قسمیں ان کا سمجھانا کون بڑی بات ہے چٹکی بجاتے سمجھائے دیتا ہوں۔ عشق ایک قسم کا ولولہ ہے جو آیام شباب میں ظاہر ہوتا ہے اور جو ایک جنس کو جو کرنا ہے طرف دوسری کے۔ بازاری میں یا مے فسبتی تصور فرمائیے۔ چونکہ عشق بازار سے تعلق ہے اس لحاظ سے عشق بازاری نام رکھا گیا۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

قسم اوّل

تھوڑا سا دن باقی رہا اور لپ جھپ، نہا دھو کنگھی سے بال سنوار، ٹیڑھی ٹوپی، بنارسی رومال، رنگین کھنسا پہن اگلوری بنا

پر قصے چوک میں جا نکلے۔ کبھی اس کمرے پہ نگاہ کبھی اس نقشے پہ، باچھیں کھلی ہوئیں، مونچھیں تین بالشت، اس کمرے سے نکلوٹ اس کمرے سے نگاہ بانیاں۔ کوئی ہنس دی اور یہ ریلہ ہلکی ہو گئے۔ کسی نے جھوٹوں اشارہ کیا اور یہ دائیں بائیں دیکھ کھٹ سے زینے پر۔ آئیے نواب صاحب! حضور کیا کہنا، حضور ایسے، حضور ویسے۔ وہ ٹیڑھے کہ بڑے بڑے استادوں کے چھکے چھٹ گئے۔ وہ کلکوا لڑایا کہ لوگ بتی بول گئے۔ طبلہ بجانے میں ماشاء اللہ ہاتھ ایسا تیار جیسے ریل کا انجن، گھڑی کا پرزہ۔ ادھر حضرت نے گلوری کھائی ادھر عزت آئی۔ بھئی رنڈی کے پان یوں مفت کیا کھا جائیں لٹو نہ رنگڑی والے کو اشارہ کیا اس نے جیب سے نکالے اور ناکہ جی کے حوالے کیے۔ بھڑووں نے دیکھا اچھی سونے کی چڑیا پھنسی، ساز ملا مجرے کا رنگ جمایا، بوتل چھڑانا مشکل، دو چار جو گرہ ہیں لگے وہیں چڑھا دیے۔ ہاتھ جھلاتے رخصت ہوئے۔ یار دوستوں میں لن ترانیاں اڑانے لگے۔ بڑے مرزا آج تو بی ..... نے وہ خاطر داریاں کیں کہ واللہ ہے بندۂ بے زر بنا لیا۔ بھئی کیا خلیق لوگ ہیں۔ جب ادھر سے ہو نکلے بے دو چار گلوریاں کھائے چلنا محال ہو گیا۔

قسمِ دوم (عشقِ بازاری)

اس کے واسطے صرف چار ٹکے پیسوں کی ضرورت ہے۔ مٹھی میں دبا بازار کی سیر کیاں بھریں، ہانپتے کانپتے جا پہنچے، چڑیلیں نظر پڑیں، آنکھیں ملائیں، باتیں چمکائیں۔ دو چار جوتیاں، دس بیس گالیاں کھائیں، ٹکے حوالے کیے۔ یہ تو عشقِ بازاری ہوا، اب عشقِ خانگی کا ماجرا سنیے۔ یہ بھی دو قسموں پر منقسم ہے۔ اوّل بلانا دوسرے خود جانا۔

قسمِ اوّل (عشقِ خانگی)

یہ بڑے آدمیوں کے حصے میں ہے۔ ایں بڑے آدمی کیا۔ یہی دراز قد، نہیں نہیں بھیا روپے والے کو بڑا آدمی کہتے ہیں۔ اب قسمِ اوّل کی تعریف سنیے، دس بیس روپے کے خرچ میں اونچی سے اونچی ..... کیوں نہ ہو، گھڑ گھڑ گھڑ دروازے پر موجود۔ پری نے جلوہ دکھایا، حور نے حجاب فاصل اٹھایا، چودھویں کا چاند نکل آیا بے تکلف برطرف

آنچل رُخ سے جو ہٹ گیا ہے
پردہ غیرت کا چھٹ گیا ہے

یہ بات، وہ بات، لٹیا پسند، خاصدان پسند، گھڑی پسند، اگالدان پسند آناً فاناً گھر کا تعلیقہ کر لیا۔ فرمائشیں مزید برآں لیکن یہ چاندنی چار ہی دن کی ہے۔ ادھر میاں کا دیوالہ نکلا ادھر ع

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

پر عمل کیا گیا۔

قسمِ دوم (عشقِ خانگی)

دو روپیہ کمر میں باندھ چل کھڑے ہوئے۔ یہ گھر دیکھا وہ گھر دیکھا آخر ایک مکان میں سبزے کی روشنی

حسبِ معمول ——— حضرت غوث خلاف جو پلنگ پر دراز ہوئے۔ خانم صاحب کو پیاس کی شدت، دوسرے مکان کا دروازہ کھلا ہوا۔ پانی پینے کو اٹھیں اور غڑاپ سے اسی دروازے میں۔ یہاں ہیں کہ امیدوار بودہ بدا نندیا الٰہی زمین کھا گئی یا آسمان۔ اتنے میں دو تین منٹ ہانپتے کانپتے باز آ دھمکے۔ اسے ہے قیامت نازل ہوئی، اوسان خطا ہو گئے۔ پیٹ میں سانس سمانی مشکل پڑ گئی۔ دو چار ڈگ بھاگا، ٹاسانگال باہر کیا۔ جی ہی جی میں کچھ تانے اپنا سا منہ لیے ٹپے گاتے چلے آتے ہیں۔ بہت تیرے کی۔

یہ عشقِ خانگی ہوا، عشقِ ازدواجی، اس کے مزے کچھ نرالے ہی ہیں۔ یہ عشق خود ہی مہذب ہے اس کی تفصیل سنیے۔ ایک مہذب مرد کا ایک مہذب عورت کو عقد کے لیے دیکھنا بھالنا۔ اب اگر یہ نہیں بن دیکھے بھالے عقد کر لیا اور دونوں میں نہ بنی۔ شادی عذاب جان، جورو اجیرن۔ زندہ درگور ہوئے۔ اس سے عقلا نے عقد سے پہلے کچھ دنوں امتحان لازمی ٹھہرایا۔ پھر ہے چاہا کیا، چاہا کھٹ سے الگ ہو رہے۔ تم اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ اسے عشقِ ازدواجی کہتے ہیں اور اس پر اپنا بھی صاد ہے۔

نمایش گاہ

احمد علی شوق

ابر نیساں کو تسلیم نے پانی پانی کر دیا　　موتیوں سے دامن کاغذ لبالب بھر دیا
واہ ری رنگیں بیانی تو نے کیا باندھی ہوا　　نوعروسانِ سخن کو پھولوں کا زیور دیا
اے ادھیڑ آپنے بہ رگ جاں عدو　　حرف لکھتے ہی ہیں اس کے ہاتھ میں نشتر دیا
نیا انصاف ہے بازارِ سخن کی بانگی　　اس کو کیا سوجھی کہ اس نے اوجھلی میں سر دیا
ہم کو بھی کھینچ کر نقشہ نمائش گاہ ہے　　تحفۂ اہلِ پیش کہہ کے آگرہ دھر دیا

لطافت کی کان ظرافت کی جان مسٹر اور مولوی صاحب! یا فضل زمانہ کیا کہہ گئے ہیں بدل رہا ہے۔ جیسی کیسی تقلا زبان کھا رہا ہے جو بات ہے وہ الٹا فی ہے۔ ان نئے نئے ڈھکوسلوں سے بچی اٹکا گیا۔ ستم ظریفیوں کی مٹی مٹی چھریاں کام کر گئیں۔ چین کا کوسوں پتا نہیں۔ تا رام لکھنؤ میں باش ہی لے نہیں ملتا۔ سال کا سال سڑے کے سر کیا۔ دنیا پر امید قائم پر عمل کئے ہوئے۔ آس لگائے۔ زندگی کے دن بھرتے رہے سوا دھر کے پتھروں کی مار مارنے اور بھی دل سرد کر دیا۔ فصل انیہ کا بیج گن گن کر مارا گیا آندھی کا سنہ کالا کر آئے دن اس پر خاک اڑایا کرتی ہے ؎

ہر سمت سے ہے ہجوم ظلمات　　جو دن ہے وہ پہلی گور کی رات

ایک تو یونہی حال پتلا ہو رہا ہے۔ اس پر طرّہ سُنئے کبھی کالی گھٹا چھائی ہے۔ گھن گرج بادل گرجنے میں۔ جھاجھم مینہ برستا ہے کبھی سرد ہوا چھیتے ہی ٹھنڈا کئے دیتی ہے۔ بدن یخ ہوا جاتا ہے۔ کبھی دن جھلسائے دیتی ہے۔ آفتاب آنکھیں نکال نکال کر گرمیاں دکھاتا ہے۔ دھوپ کے مارے لہو پڑی جمی جاتی ہے۔ سر کا پسینا قدموں کو آتا ہے۔ یا تو گلی گلی دو پہچھے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا ایسا سناٹا ہے جیسے اس بیس میں آدمی ہی نہیں بستے۔ سناٹوں کی وہ گشت کہ اینٹ سے اینٹ بج رہی ہے۔ جس کو دیکھئے بدن میں سکت نہیں ضعف کے مارے آنکھیں یوں بند جیسے جیلوں کے دروازے۔ ہندی بھائی بعد لے بھائے دربارِ الٰہی سے بے بہری کا تمغا پا چکے ہیں۔ اگر کسی نے ایڈی میڈی اونٹ پٹانگ چار لکیریں کھینچ لیں، بھیجے بھیا بڑے دستکار ہیں۔ باچھیں کھل گئیں۔ اپنے حسابوں مانی ہنرا ور پر چھایا مارا، لگ بھگ یہ ہے جہاں وہ کھ نہیں وہاں رنڈرو کھ۔ خوشامدی ملو پتو کے آدمی۔ خراب کن بہتیرے، انہیں کیا عیب میں چنگی ڈالی جا لو الگ کھڑیں۔ کسی کا گھر جلے تاپنے کو موجود۔ ان خوندوں کی دل سوزی جھوٹے کوؤں کی آگ ہے۔ شہر نے کا نام نہیں جانتے۔ کڑی پڑی آڑے آنے والا کوئی نہیں ؎

کس را نہ بینم روئے غم جز سایہ در پہلوئے خود　　آنم چو بینم سوئے او گردانم از من روئے خود

ارے مان یہ تو سب ہوا۔ کوئی ڈھنڈورا کچھ پکار رہا ہے (کان لگا کر) ہاں بھئی (کھڑکی سے سر نکال کر) کیوں بھئی یہ ڈھنڈورا ہے کا ہے؟

عجوبہ نمائش گاہ کا!

واہ وا۔ گھر بیٹھے خنزلے۔ یہاں تو دانگتے کو پیٹنے کا بہانہ، مفت گشتی کا عارضہ۔ بھئی ہزار کام چھوڑ اس جلسے میں ضرور جائیں گے۔ چاہے چاند کا وقت ٹھنا ہو جائے، دن تاریخ پوچھ یا کچھ چار دن آگے سے کر کس بیٹھے۔ گھڑی گھڑی پاڑ ہو گئی۔ سوتے جاگتے اسی کا دھیان بندھا ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کی لو لگی ہے۔

پارے خدا خدا کر کے وہ دن آیا، ارے بھئے سویرے ہی سے نکھ سکھی سرمے سے لیس ہو، جامدانی کا انگرکھا ڈانٹ، کریپ کی دوپلڑی نکہ دار ٹوپی ٹیڑھی رکھ ٹاٹ باٹی جوتا پہن، کڑی کمان کا سا تیز نمائش گاہ کے پھاٹک پر پہنچے۔ ابھی قدم ڈگمگے نہیں بابا تھا کہ پہرے والوں نے ڈانٹ بتائی۔ الٰہی خیر۔ بھوچکے ہو رہے۔ زمین نے قدم پکڑے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہرچند آج کل کے خوشامدیوں سے کچھ بڑھ چڑھ کر وسنا دی۔ وہ سب کے سب فرعون بے سامان ہوا کے گھوڑوں پر سوار کس کی سنتے ہیں۔ لاچاری درجے ضالعت کا سبب پوچھا۔

میاں تم تو بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو۔ ذرا ہوش سنبھالو۔ عقل کے ناخن لو۔ پہلے آدمی بن آؤ پھر اس پھاٹک کے اندر قدم دھرنا۔

بھائی جان آدمی کیسے بنتے ہیں؟

ماشاء اللہ! اتنے دنوں دلی میں رہے۔ بھاڑ جھونکا کئے۔ اچکن ایسی، کوٹ ایسا، پاجامہ ایسا، بوٹ ایسا۔

تھرہ رہ سیٹیں برجان ورد وش۔ سوائے بغلیں جھانکنے کے کچھ بن نہ پڑا۔ گم صم الٹے پاؤں گھر کا راستہ لیا۔ جی میں آیا۔ اد نہہ مارو الگ کرو۔ کس کی نمائش گاہ۔ اپنی ایسی تیسی میں جائے کپڑے ویڑے کہاں خریدتے پھروگے۔ اتنا بچے گا۔ بٹیر کھائیں گے۔ مرغوں کے کام آئے گا۔ چاند کے دم ادھیں گے۔ چرایا ہوا شوق بھلا کب مانتا ہے۔ ایک بل چین نہ آیا۔ بے کل ہو گئے۔ سنگے سر بنا رعنہ۔ بگ ٹٹ۔ مسٹر جوان کی کوٹھی میں پہنچے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ منہ مانگے داموں جو کچھ لینا دینا تھا وہ لے دے۔ آدھیت کا جامہ پہن۔ تڑاق پٹاق کنڈے جوڑ۔ پھر اسی پھاٹک پر۔ اب کس کے منہ میں دانت ہیں جو ٹانٹے۔ کھٹ پٹ۔ کھٹ پٹ آگے بڑھے۔ گردن نیچی کئے اپنی راہ چلے گئے۔ اس دفعہ پھر اسی اپھاٹک کے سب ہمارے کوٹ پتلون بوٹ کی چمک دمک دیکھ کر دم بخود ہو گئے۔ غرضکہ یہ پہلا وہ پہلا بھرے جلسے میں گھٹ پٹ۔ ہاں تو اٹی گنگا بہتی دیکھتے ہی بجھ گیا۔ دھنہ گھنڈے ہو گئے۔ ہم اس دھن میں آئے تھے کہ بندادین کا ناچ، مجید کی گلے بازیاں ہوں گی۔ حواس باختہ مالے کی تن بھنیں بھی نہیں۔ خیر ایک حد تک شدنی تھی۔ ہو گئی۔ اس میں کھیا بانکا کا ہے کا۔ جو تقدیر سے اتر گیا تھا۔ اس کو بھاڑ میں جھونک چکے۔ آگے کو کان ہو گئے۔ بہتا پانی بہہ جائے۔ ٹھہرا پانی رہ جائے۔ بیتے جی تو کوڑی کوڑی دانت سے پکڑیں گے۔

گذشتہ راصلوٰۃ کہہ کر جی کو کھایا بھایا۔ ادھر آئے ادھر گئے۔ یہ چیز دیکھی وہ چیز دیکھی، ارے بھئے اب تو آنکھیں کھل گئیں۔ جس دوکان پر جا پڑے آنکھیں کر رہ گئے۔ چین کی دستکاریاں، انوکھے گڑھت کے مال۔ یورپ کے نفیس نفیس تجارتی اسباب۔ خصوصاً انگلستان کے صنائع نہ دیدنہ شنیدہ۔ واقعہ ہے ہمارا جینا بازار اور کی گرد کو نہ پہنچے۔ ساری خدائی کا تماشہ کھڑے کھڑے ان آنکھوں سے دیکھا لیکن دیکھنا ہی دیکھنا ہاتھ لگا۔ ٹکا پاس نہیں جو کسی دوکاندار سے بات کریں۔ چاندو مارک میں توڑے کے توڑے بھد نکلنا یاد کر کے

کلیجے میں آگ لگی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپک پڑے۔ چھاتی پر سانپ لوٹ گیا۔ ع

سودن وسد شدہ قسمت مایا قسمت

اب یہ سوسدل میں سلایا کہ یونہی خالی ہاتھ کیا منہ لے کر گھر بھی جائیں گے۔ بیگم صاحبہ مارے طعنوں کے اودھیڑ دیں گی۔ یار آشنا جن سے دانت کاٹی روٹی ہے، مصاحب جو ہماری ناک کے بال ہیں بے نقط اور کھیاں سنائیں گے۔ ہرچند وہاں جوشے تھی وہ چوٹلی ہی کی تھی — لیکن ہمارے کس مصرف کی۔ بے مہمت چیز جی تلے نہیں سماتیں۔ اپنی کامآمد چیز ڈھونڈتے ڈھونڈتے پانوں ہاری ماں گئے۔ قوتِ مقاربول گئی۔ آخر ایک گوشے میں دق کے سایہ کا ہوی زنا نے چھلے اور مکھڑے کی بنی ہوئی تیزیوں کی چند کا بکیں بہت خوبصورت نظر پڑیں۔ جاہ سے ہم۔ قسمت کے دھنی کیا کہنا۔ وہ وہ کا مذار اپنے ہی دیس کے جان پہچان نکلے۔ اب کیا پوچھتے ہو۔ پانچوں گھی میں۔ کلیجہ باغوں بڑھ گیا۔ ملک ملک کے بعد دو کا ہمارا دس پر دم دھاگے کا جال ڈالا۔ چھلے کا ملک دو دن کے وعدے پر قرض لے کر سونچیوں پر تا دو دیتے گھر میں آئے۔ بابے خدا نے سرخرو کیا بات کی بات رہ گئی۔ نہیں تو لاکھ کا ٹیکہ جارے ماتھے پر پڑا تھا۔

اودھ پنچ - ۱۱ جون ۱۸۷۶ء

یہ تماشا دیکھئے

حضرت اودھ پنچ صاحب۔ یہ جلوہ نمی شبرات ایسی مسئلی میں اور چلے کو جلانے آئی۔ کہا کہیں کس کا سر اپنے آگے لے ماریں آتشبازی و آتش بازی تو خاک نہیں۔ جی سنبھالئے کہ گروشی تقدیر کا چکر۔ دو دن سر کی چرخی۔ داغ جگر کی مہتاب، آہ آتش فشاں کی ہوائی۔ ٹپ ٹپ جلتے ہوئے آنسوؤں کی پھلجھڑی، ہچکیوں کے پٹاخے موجود ہیں۔ رہا حلوا۔ سو یہاں فاقوں نے یوں ہی حلوا نکال رکھا ہے۔ اوس پر ستم ظریفیں کی میٹھی چھریوں نے اور بھی زندگی تلخ کر دی۔ حلوا اس کا۔ چولھے بھاڑ میں جائے مگر یار ایک میٹھی کھیر ہے جو ہمارے ہی چندم خورندم تک ہوتا تو بلا سے اپنا جی مارتے، لوے گھونٹ پی کے جیٹھ رہتے۔ آخر مُردوں کی روحیں جو حلوے کی چاٹ میں منہ کھولے بیٹھے ہوں گے۔ یونہیں سنو کیہ کر رہ جائیں گے۔ اس کی کیا تدبیر کی جائے۔ ہم بتائیں۔ سردست حلوائی کی دوکان دادا جی کا فاتحہ۔ یہی مثل پوری کرو۔ آگے کو جب کچھ اتنی بڑھے گا دیکھا جائے گا۔ بھئی واہ۔ ہم بھی کیا مروآدمی ہیں۔ کہاں تو شبراتی سنانے آئے تھے۔ کہاں یہ دکھڑا نکالا۔ لے سنئے سنئے۔ شبراتی ؎

شبرات آئی پڑاتے ہوں پٹاخے رات بھر — لوگوں کی سر پر چھوٹیں دھڑاد دھڑمات بھر

کچھ نہیں افلاس میں ملتا تو دل ناخوش نہ جائے — سر منڈا کر پیٹئے اس کو تڑا تڑ رات بھر

اودھ پنچ - ۱۳ اگست ۱۸۷۶ء

تہذیبِ قیس

عبدالغفور شہباز

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے
لکھوایا نام نجد کے انگلش سکول میں

اے بی کے بعد پڑھنے لگا ایسی ریڈریں
تعلیمِ عشق معاشی ہے جی کے اصول میں

پنٹامیٹر میں دیکھتا تھا انبساط کو
پاتا تھا انقباض فعولن فعول میں

از بر تھے یوکلڈ کے تھیورم پرابلم
اقلیمِ حافظہ تھی گرامر کے رول میں

تھا تکیۂ کلام کی صورت زبان پر
کیا جانے کیا مزا تھا بھرا ٹیم فول میں

القصہ انٹرنس ہوا پھر ہوا ایف اے
بی اے ایم اے کے پاس بھی آئے حصول میں

ہمت بڑھی کہ کیجئے بیرسٹری بھی پاس
رہ کر عرب میں وحشیوں کے ہوں شمول میں

لندن گیا تو اوک میں پانی لگا مزا
حاصل تھا وہ جو نجد کے بن کی ببول میں

آئی نظر جو اوک کی کرسی پہ ایک مس
کھٹمل کی طرح عشق گھسا دل کی چول میں

بال اس کے سر پہ صاف شعاعیں تھیں مہر کی
ریشم کو جو شمار کریں جنسِ اول میں

پھل سیب نے لگائے تھے قامت کی شاخ میں
رنگت بھری تھی روزنِ عارض کے پھول میں

دیکھا جو یہ بجا نہ رہے قیس کے حواس
لگتی نہیں ہے دیر بلا کے نزول میں

مجنوں کو دھن کہ جلد پیوں وہ کی وصال
میری پڑی تذبذب ردّ و قبول میں

میری کے کورٹ شپ کا بڑھا تازہ ذوق و شوق
لیلیٰ کا عشق کہنہ ملا خاک دھول میں

شہباز ہے کلام کا اکبر کے یہ جواب
لیکن بڑا ہے فرق فروع و اصول میں

قانونِ قسمت

ہم نے پوچھا یہ اپنی قسمت سے
دور کیوں ہم سے گنج مطلب ہیں

کالی رنگت ہے کیا محل اس میں
کالی رنگت سے گو ہیں شب ہیں

شب ہی کو ہے سدا چمکتا چاند
شب ہی کو جگمگاتے کوکب ہیں

کالی رنگت سے گیسوئے جاناں
دیلۃ القدر سے مخاطب ہیں

کالی رنگت سے گیسوئے خمدار
تیغ و خنجر ہیں جنت عقرب ہیں

کالی رنگت سے تلیاں دو نو
چشم کے آسمان پہ کوکب ہیں

رنگ کے زیب سے مسی کاجل
راحت چشم و زینت لب ہیں

کس طرح دیں جگہ نہ آنکھوں میں
فائدے کھل کے مجرب ہیں

زیب دیتا ہے نون پہ کالا سوٹ
متفق اس پہ کل مہذب ہیں

ہجر اسود کے مذہبی بوسے
بوسۂ لعل سے بھی اعذب ہیں

پاک کعبے کے کالے کالے غلاف
سرمۂ چشم دین و مذہب ہیں

گوری رنگت ہے گر سبب اس کا
ہم میں بھی کالے کم نہیں سب ہیں

رنگ ابیض سدا نہیں مطبوع
ورنہ کیوں داڑھیاں مخضب ہیں

ڈرتے ہیں داغ برص سے یوں لوگ
جیسے میر و عمر کے معذب ہیں

شکل سے سنکھیا شکر کی ایکا . .
جتنے ابیض ہیں کب سب اطیب ہیں

فرض کر لیں سفید کو گر دن
دن بھی خالی کسوف سے کب ہیں

پتلیاں گر سپید ہو جائیں
ہر قدم پر قدم مذبذب ہیں

رشتہ مندوں میں خوں اگر ہو سفید
لاکھ اقرب ہوں پھر بھی عقرب ہیں

رنگ نقرہ بُرا ہے گھوڑوں میں
اس پہ شاہد صفات مرکب ہیں

اجلے سے ہے سہا گنیں بیزار
لیونکہ رنگیں سہاگنیں سب ہیں

سچ بتا ان پہ کیوں تو ریجھی ہے
ہم سے عزرے ترے یہ کیوں اب ہیں

بولی قسمت فضول سب تقریر
ایسی باتیں نظر میں یاں کب ہیں

کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے آنے کے اور ہی ڈھب ہیں

معذرت انگریزی

ایک مرغے نے یہ مرغی سے کہا — لوٹتی ہے خاک پر کیوں بے تمیز
ہنس کے مرغی نے دیا اس کو جواب — جسم پر ملتی ہوں پوڈر اے عزیز
بولا مرغا ہے یہ پوڈر کیسا بلا — بولی مرغی ہے یہ اک فیشن کی چیز
پوچھا مرغے نے کہ ہے فیشن یہ کیا — بولی مرغی بچۂ کمفرٹ و ایز
ڈانٹا مرغے نے کہ انگریزی نہ بول — بولی مرغی تیرے سر میں ہے ڈیز
مرغا جھنجھلایا کہ پھر پھر پھر وہی — مرغی بولی چپ بھی رہ اے بدتمیز
وہ زباں جو ہے زبانوں کی کوئین — بولی وہ ہے جس کی ہر بولی کنیز
چھوٹ سکتی ہے چھڑائے سے کہیں — جب تلک ہے کوٹ پتلون اور کمیز
جذا شہباز کا حسنِ کلام — مرحبا باغِ فصاحت کی بریز

پادری ولیم نے احمد سے کہا — لو پڑھو انجیل سے سیکھو تمیز
بولا احمد اس کی اب حاجت نہیں — پڑھ چکا ہوں میں تو صاحب مٹریز

حضرت رمضان کا فوٹو

دو ہفتے سے گھر میں مرے وارد رمضان ہیں — بھلے یہ کچھ ایسے ہیں کہ سب ان سے بجاں ہیں
ہے شام مہینوں ہی میں جا کر کہیں آتی — سنتے کہیں برسوں ہی میں مغرب کی اذاں ہیں
مسجد میں ہیں ترتیل و قرأت کے وہ جھگڑے — آمین کی جا مقتدی کہتے الاماں ہیں
ہوتی ہی نہیں تم کسی طرح سے رکعت — مغرب پہ تراویح کے یاروں کے گماں ہیں
مغرب ہی چلی جاتی ہے مغرب سے عشا تک — سن لیتے کبھی اس میں ہی مرغوں کی اذاں ہیں

مسجد سے جو آئے تو پھرے گھر سے خدا کے
الفاظ ہیں جو شکر کے سب ورد زباں ہیں

ایڈیٹر چاند کے نام

سید ممتاز حسین

[محترم و معظم جناب منشی کنہیا لال صاحب!]

تسلیم۔ اودھ پنچ کا بار تنہا اپنی گردن پر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں عام چور ہو گیا۔ پھر بھی دو چار ورق کا مضمون لکھنا پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے برابر نہ تھا۔ جو تمہیں حکم سے گردن تابی کرتا۔ اور بہانہ ڈھونڈھتا مگر دو قسم کی بیماریوں نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ ایک ملیریا بخار جس نے تمام ڈیل پر کرم فرمایا۔ دوسرے اسفل جسم کے بعض دوہرے ثمر نما تولید مثل پر آمادہ ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں مردوں کو تولید کی زحمت یا عسر والادت کی ابتدا سے کب واسطہ پڑتا ہے؟ پھر تولید بھی کس کی۔ اوندھے پھوڑے کی تین چار ہفتے اس مخصوص اور موذی بیماری نے ضائع کئے۔ خدا خدا کر کے اب تفرق اتصال ہوا ہے۔ اس حالت میں چاند کے لئے مضمون بہت مشکل ہے۔ عذر لنگ نہیں عذر صحیح قبول فرمایئے۔

مجھے جب اس کا علم ہوا کہ آپ نے میرا نام اہل قلم کی فہرست میں لکھ لیا تو بہت تعجب ہوا۔ آج تک سینکڑوں مضمون قدیم اور جدید نظم و نثر لکھنے والوں کے متعلق ماہواری رسالوں اور اخباری کاغذوں میں شائع ہوئے ان میں کہیں میرا ذکر یا میرا نام نہیں۔ اور ہے بھی تو اعتراضات کی ہتھکڑیوں بیڑیوں میں مقید ہے۔ خدمت اردو معلی کا خلعت و دسروں کے جسم کی زینت نظر آتا ہے اب آپ ہی فرمایئے کہ ایک تو میں ادیب نہیں۔ دوسرے بیمار۔ تیسرے متروک الدنیا چوتھے اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ نالائقی کا خلعت جو برادری نے عنایت کیا ہے اسے نامنظور کر دوں اور زبردستی کہوں کہ میرا شمار کاملین روزگار میں ہونا چاہئے۔ پانچویں سب سے بڑا عذر یہ کہ ڈرپوک ہوں یعنی مرد میدان مقابلہ و مسابقت نہیں۔ پھر بھلا کیا سمجھ کے مضمون نگاری کی بانگی دکھاؤں۔ جناب میرا دور ہی سے سلام ہے۔

میں ان لوگوں کا حشر کتب تاریخ میں دیکھ چکا ہوں جن کو جہل مرکب کی بیماری نے شکل کابوسی کی طرح بوجھا اور اپنے پرائے کے سامنے بے جانی بوجھی بات میں دخل دے کے ذلیل ہوئے:۔

(۱) اسحٰق بن ابراہیم موصلی کہا نبو جلید سے قدما کے بعض شعر پڑھے۔ اسحٰق نے پوچھا "تمہیں بھی اس کلام میں کوئی حسن یا مزہ بھی معلوم ہوتا ہے؟" جلید ہ نے جواب دیا "نہیں"۔ اسحٰق نے ناک بھوں چڑھا کے کہا "تو پھر کیوں گدھے کی طرح بوجھ اٹھائے پھرتے ہو؟"

ممکن ہے کہ میری بے مزہ عبارت دیکھ کے آپ سے یہی سوال ہو کہ جناب منشی صاحب آخر اس شخص کے ٹوٹے پھوٹے جملوں اور بے ربط عبارت میں کیا لال لگے ہیں جو آپ نے خواہ مخواہ اچھا بھلا کاغذ دی بناڈالا! اے حضرت اس سے تو بہتر تھا کہ ملا فلاں

جناب فلاں، مسٹر فلاں۔ پر فیسر فلاں سے مضمون لکھنے کی درخواست کی ہوتی جو پیدائشی ادیب و ظریف ہیں اور جن کے رشحات قلم کے زیر بار احسان آج ہندوستان بھر کے میگزین ہیں۔

(۲) بنی یتیم (قبیلہ) کا ایک شخص ابو نواس فرزدق مشہور شاعر عرب کے پاس آیا اور کہا "میں نے ایک شعر کہا ہے سن لیجئے" فرزدق نے شعر سنا اور چند لمحہ کے بعد کہا "سنو بھائی شعر کو ایک سو سالہ اونٹ فرض کرو جس کے جسد اکی تقسیم یوں ہوئی کہ امرؤالقیس کے حصے میں تو سر آیا۔ عمر بن کلثوم نے کوہان پایا عبید بن الابرص نے ران پر قناعت کی۔ اعشیٰ کو سرین ملی زہیر نے تھکے ہتیا ئے طرفہ کے ہاتھ عبدنگا نابغتان (نابغہ جعدی و نابغہ ذبیانی) پہلو اور پسلیاں لے بھاگے۔ میں سب کے آخر میں پہنچا۔ تو ائم (پنڈلیاں) اور ٹانگیں اور پیٹ کا مالک بنا۔ اوچھڑی بچی اس نے پکا کے کھائی مگر نہ بچی تو زمین دیکھی اور دکھائی۔ میاں تمہارا شاعری وہی ہزار کے پیٹ سے نکلا ہوا قصیدہ ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب! مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں کوئی مستقل مضمون لکھوں تو وہ اگلوں۔ کے پیٹ کا فضلہ سمجھا جائیگا۔ ابھی تک لوگوں نے بھائے خود یہ طے کیا ہے کہ پرانے اور ہر پچ کے ماخوذات جدید اور ہر پچ کے حیات کا سبب ہیں۔ اجی وہ وقت ہی اور تھا۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ وہ لوگ ہی اور تھے۔

(۳) ایک شاعر صاحب نے اپنے برادر مکرم سے فرمایا کہ میں شاعر ہو گیا ہوں سنا آپ نے؟ انھوں نے ارشاد کیا بھائی یہ کوچہ پر خطر ہے۔ نیا نگر ہے ناتوسمجھی۔ شاعر صاحب مستعد ہوئے۔ ابھی یہی ایک شعر پڑھا تھا ؎

هل تعرفون الدار بالقطنينا ابكين انا فاحزنيسنينا .

کیا تم اس گھر کو جانتے ہو جو قطنین میں ہے اور اس نے مجھے رولایا اور رنجیدہ کیا) فوراً ہی کی ناعقل برادر سے جملکے بھائی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "بے مردود اگر تو نے دوسرا شعر پڑھا تو خدا کی قسم تجھے کنویں میں دھکیل دوں گا۔"

ایڈیٹر صاحب۔ مجھ بے بضاعت فروما یہ کا مضمون دیکھ کے مبادا چاند کے خریداروں میں سے کوئی کنویں میں دھکیلنے پر آمادہ ہو جائے۔

(۴) ابن صباح کی کنیز جس کا نام برحان تھا۔ ابن صباح کے مہمان نبان کے سامنے گانے بیٹھی ؎

إن نفسي رسول نفسي اليها
ونفسي جعلت نفسي رسولاً

(میرا نفس خود میرے نفس کا مشوقہ کی طرف پیامبر ہے۔ اپنے نفس کے لئے میں نے اپنے نفس کو پیامبر بنایا ہے) نبان نے برحان کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہا "چپ اب تو سارے گھر میں فس فس پھس پھس کی آواز گونجنے لگی"

منشی صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ چاند میں میرا سر اڑا دیا مضمون دیکھ کے لوگ چاند کے منہ پر ہاتھ نہ رکھیں۔

(۵) ایک شاعر صاحب شعر پڑھ رہے تھے دوسرے نے تعریف کی "واہ صاحب! کیا شکر ہے جیسی مٹھاس نہیں"

حضرت بیمار ہوں۔ بیماری میں ٹھٹھول کسے سوجھتی ہے کڑوی دوائیں پیتے پیتے زبان تلخ ہو گئی۔ سو کے ٹھٹھے۔ یا زہر خند اور ہزل مضحکہ کی شکر ایک ہی ہیں۔ تاریخ میں بڑے اور بے معنے مضمون کے شائع صدہا درج ہیں۔ مگر سب سے بڑا یہ واقعہ ہے کہ محمد بن حسن النصیبی کے سامنے ابو

کو شاعری کا شوق ہوا۔ مگر وہ صرف شاعری کی تہمت اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ محاسن شعر یا معنویت کی پروا انہیں نہ تھی۔ ایک دن باپ سے کہنے لگے "ابا۔ ابا۔ میں نے شاعری شروع کر دی۔ باپ نے جواب دیا کہ سناؤ صاحبزادے اس پر پہلے کہ اگر شعر آپ کو پسند آیا تو ایک لونڈی یا ایک غلام انعام میں ملے گا۔ باوا نے ہامی بھری کہ ایک نہیں دو لونڈیاں ملیں گی۔ اب تو صاحبزادے کے دل کھول کے پر کٹی اڑانے لگے۔ حصنی کو غصہ آگیا اور کہنے لگا۔ خدا کی قسم ایسے اشعار کا صلہ لونڈی ہے نہ غلام۔ مگر سردست میں تیری ماں کو تین طلاقیں دیتا ہوں۔ جس نے ایسا بیوقوف لڑکا جنا

بہرکیف جناب ایڈیٹر صاحب میں عذر خواہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے نظم و نثر میں بچیوں کے ساتھ کھول کرنے پر مجبور نہ فرمائیں گے۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ مجھے کوئی دعویٰ یا سلیقہ انشا پردازی میں نہیں۔ میں نے تو "چند دیں شکر بائے اکن" کے طور پر یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ زیادہ نیاز۔

نیازمند
ممتاز
(ایڈیٹر اودھ پنچ)

منطق آرا بیگم بنام مسٹر چرچل

حکیم ممتاز حسین عثمانی

"قیمت ہوئے کباب صدائے زر ناب"

بیٹا چرچل، تم واقعی بہت چرب چپڑے بدمزاج جلد باز بچھلے اکل کھرے۔ روکھے سوکھے۔ پھیکے بدمزہ۔ نمک چڑچڑے۔ بھڑ بھڑیے لوپلی۔ خود غرض۔ تن پرور۔ پھوہڑ بد دماغ۔ پیٹ کے ہلکے۔ خود پسند۔ یاوہ گو ہو۔ ہا بیٹا بری بات! تمھیں بڑے بڑے پولیٹیکل دماغوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو یہ عادتیں تم نے نہ چھوڑیں تو اللہ جانتا ہے پولیٹکل میدان میں تمھیں کبھی "ڈریتی" کا مرتبہ حاصل نہ ہوگا۔

صاف صاف دل کی بات کہہ دینا اگلے زمانے میں تعریف کے قابل تھا۔ اب تو جتنی کینڈ کی بات کہی جائے اتنی ہی تعریف کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ صاف صاف کہنے میں بھی تہذیب کا آنچل ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے بھلا بتاؤ تو سہی تم نے کیا سمجھ کے بڑے میاں (گاندھی) کو "نیم برہنہ باغی فقیر" کے الفاظ سے یاد کیا۔

مردوں کے واسطے "نیم برہنہ" یعنی آدھے ڈیل سے ننگا ہونا کوئی عیب نہیں۔ یورپ میں تو آج کل تہذیب نے اتنی ترقی کی ہے کہ عورتیں بھی جامے سے باہر پڑی پھرتی ہیں چنانچہ اب تک ڈیل پر نظر نہیں آتا جتنی چھپانے کی چیز ہیں ہیں۔ سب ایڈیٹر، کھلے بندوں اور دھڑلے سے دکھا رہی ہیں۔ بڑے بڑے میدان انھیں ننگے دھڑنگوں کے واسطے خاص کر دیئے گئے ہیں جن میں اکیلی عورتیں ہی نہیں ساتھ میں مرد بھی ننگے چلتے پھرتے ہیں اور قانون انھیں روک نہیں سکتا۔ گاندھی غریب تو پھر بھی لنگوٹی باندھے رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ابھی وہ آدھے دھڑ سے ننگے نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے تم انھیں کہہ جاتے ہو۔

رہا یہ کہ وہ باغی ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ نمک بنانا بغاوت نہیں۔ شراب کی بکری موقوف کروانا بغاوت نہیں چرخا کاتنا بغاوت نہیں۔ کھدر کی چادر اوڑھنا بغاوت نہیں۔ بھلا کس کتاب میں بغاوت کے یہ معنی لکھے ہیں۔ دو باتوں کا جواب ہوا۔ تیسری بات کا جواب سنو۔ کہ مرید پیر والوں کا ایمان ہے روپیہ۔ روپیہ پاس ہو تو پاجی پن بھی ہنر ہے وہ سو شریفوں کا ایک شریف۔ ہزار شریفوں کے سر اس کے سامنے جھک جاتے ہیں ؎

مرا زر بدہ کفش بر سر بزن

بھی اگر روپیہ مارے تو نادار شریف عفیف بہو بیٹی اس کی کنیز بننے کو موجود۔ برخلاف اس کے ایشیا والوں کے نزدیک۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ بقول بیا فیسبی کے دانت پر چھپلیں نہ ہو مگر آدمیت ہو۔ مفلس نادار ہو مگر پڑھی اور نسل کا شریف ہو کنگال قلاش ہو مگر حیادار ہو۔

دنیا میں آج بھی لنگوٹی باندھنے والے فقیروں کے آگے بڑے بڑے ہفت ہزاری سر ٹیک کرتے ہیں۔ ایک بوریے پر آسن جمانیوالے کے سامنے لاکھوں ہفت ہزاری ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں وہ خود کسی کے دروازے پر نہیں جاتا مگر اس کی مسند سی پر شاہ و گدا تک حاضری دیتے ہیں شاعروں نے اسی کی مدح کی ہے ؎

سمجھنے والے کیا قدر زر و گوہر سمجھتے ہیں
اسے مٹی سمجھتے ہیں اسے پتھر سمجھتے ہیں

دنیا ایسے ہونے پر فخر کیا جاتا ہے ؎

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریے پر بیٹھے ہیں قالین کو ٹھوکر مار کے

عورتیں مثل کہتی ہیں "پھٹے پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان" ؎

زندگی ترک سوال مدعاست
آبرو چوں رفت شد آب بقاست

آن پر جان قربان کرنے والے ہزاروں بندگانِ خدا اب بھی موجود ہیں جو فاقہ کرتے کرتے مر گئے مگر ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلایا۔ میں نے تمہاری فقر پر اخباری کاغذوں میں دیکھی۔ ارے مردِ خدا سے ڈر کہیں تو جلی کھوں علی تشنے (تشنیع) سے باز آیا ہوتا۔ تو نے سونیا ڈاہ کو مات کر دیا۔ ابھی رنگولنٹ نے کچھ دیا نہ ہندوستان والوں نے کچھ پایا مگر واویلہ دامصیباہ کا شور مچ گیا ——— "انگلستان کے حقوق کا تحفظ" ایک معمہ ہے اور اسی چیستان کے حل کرنے میں نصف خزانۂ ہند ہر سال صرف ہوتا رہے گا۔ خبر نہیں کہ ایسی حالت میں تمہیں اپنے قومی حرمان کا خیال ہی کیوں پیدا ہوا۔ اس وقت جو معاملہ درپیش ہے اس کی توضیح اس حکایت سے ہوتی ہے۔

دود کباب

یکے روستا از پدر کردہ قہر — سیاحت کناں از دہ آمد بشہر
ز بس آں پسر چیز ہا دید دید — بدنداں سر انگشت حیرت گزید
چو سرگشتہ از پیچ رہ خستہ بود — بہ بازار رفت و زمانے غنود
در ینجا یکے کرد دود کباب — پدیدار شد و روستا یا شتاب
برآورد زانبان خود قرص نان — بر دوش بیاورد و مخمور و ازاں
ز نانِ جگر دادہ چوں می جوید — مگر سر انگشت خود می گزید
کبابی دُوں ابہش دید چوں — سرا سیمہ از در کہ آمد بروں
گریباں دے سخت گرفت و گفت — کہ دود کباب اے پسر بیست مفت
رہ دی متاعم۔ بر زد او دہ ثمن — بگو پس چہ شد قیمت دود من؟

غلام کبابی بہ بہتش فرستود — بگفتا متاع کہ بردم چہ بود؟
نمی شود م ارمی زود و شد — نبا شد مگر وہ وجد و ہوا!
نمودند قصہ آغاز جنگ — ز پیکار شاں رہگذر گفت تنگ
دو جاہل، آرام بائے و ہو — نمودند بایک دگر گفتگو
سر کار شاں بر تراضع کشید — دراں بین بہلول انجا رسید
بر عزت نمودند او را حکم — بدہقاں بگفتا کہ منماستم
بدہ قیمت دود و بخش آنگہ برو — کہ منواں خوری مال مردم بہ بو!
زدے پول بگرفت و چنداں شمرد — کہ دل از کبابی صدایش بر برد
برد ہقانی آں پولہا دلنمود — بگفت ایں صدا قیمت دود بود
چہ خطے کہ بردی ز دادِ پول — کند جائے دود کبابش قبول
مشامت بمعطر زدہ دو کبت — شدہ پس مندی فایں فضا کامیاب
بہ بردی اگر دود وایں پول ہم — شمردن نگر دید کم
چو دود کبابی است گفت او سمن — کہ در نزد جاہل نہ دارد ثمن

بدیں رسم سلطانیہ از قدیم
کہ تہمند قیمت بگفت حکیم

لوگ فارسی زبان سے کم واقف ہیں لہٰذا خلاصہ ترجمہ اس کا لکھے دیتی ہوں کہ ایک صاحبزادے امام باڑے سے روٹھ کے گھر سے نکل گئے۔ کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ دیہات سے شہر میں جو پہنچے تو ہر چیز نئی معلوم ہوئی۔ جو چیز دیکھی بھوچکے رہ گئے کہ ایا ہایہ کیا ہے دارہ پھرتے پھرتے ایک کبابی کی دکان تک پہنچے۔ بھنے ہوئے گوشت کی چرا ہند مسلمان کو بہت بھاتی ہے۔ مرزا قتیل جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے کہا کرتے۔ تھے "ایں بوئے کباب رونے مرا مسلمان خواہد کرد"۔ صاحبزادے کے پاس دام تھے مگر کنجوس تھے کباب کا دھواں غنیمت سمجھ کے وہیں بیٹھ گئے اور روٹی نکالی۔ ایک نوالہ توڑا سیخ کباب پر جھکے ناک سے دھواں پیا لگا اور نوالہ منہ میں رکھ لیا۔ القصہ دھوئیں سے لگا لگا کے روٹی ختم کی۔ کبابی نے جو دھوئیں کی پوری مفت لٹتے دیکھی بہت جھلایا دود غضب کا خ دماغ سے پایا ہوا ایک کے کنوارے لونڈے کی پگڑی اتار لی اور کہا "سیدھی طرح دھوئیں کے دام ڈھیلے کر دا بھی میں خیر ہے ورنہ کو فتہ بنا کے رکھ دوں گا۔ صاحبزادے منت کرنے لگے کہ بھائی تمہارا کیا نقصان ہوا آخر یہ دھواں ہوا میں مل کے اڑ ہی تو جاتا۔ کسی بندہ خدا کا جلا ہوگیا تو کیا برائی ہوئی۔ مگر لالچی کبابی کے پیچھے ایک بے وقوف چڑھا ہوا تھا وہ کیوں چھوڑتا۔ اتفاقاً اُدھر سے حضرت بہلول دانا تشریف لا رہے تھے پاکل مؤرخ دیوانہ کہتے ہیں چلے آتے تھے۔ دونوں نے بہلول کو پنچ مقرر کیا۔ طرفین کی روداد سن کے بہلول نے دہقان بچے سے کہا "جب تم نے دھوئیں پر تصرف کیا ہے تو قیمت ادا کرو"۔ پنچ مقرر کرنے کے بعد تسلیم حجت کا محل نہ تھا۔ ناچار ہمیانی کا منہ کھولنا پڑا۔ بہلول نے روپیہ اپنے ہاتھ میں لیے اور کبابی کے کان تک لے جا کے کھنکھنانا شروع کیا۔ لکھن کھن کھنانا نانا کبابی سمجھا کہ یہ کاروبار ہے کھنکار سے پھولوں نہ سمایا کہ واہ اللہ دے اور بندہ لے ہاں صاحب روپیہ کی صدا ایسی ہوتی ہے لوگ بنک گھر میں جا کے سنا کرتے ہیں۔ چنانچہ

ایک مفلس فقیر کا ذکر ہے کہ وہ پہلی مرتبہ بھیک مانگنے گیا۔ بہت سے چغہ پہنے والے انگریز اعلیٰ درجہ کی وردیاں پہنے فوٹ اور فقدے کے جوہاں سے نکلے تو اس نے چپراسی سے پوچھا یہ کیوں جی یہ لوگ کہیں کے بادشاہ ہیں۔ دیکھو تو کیسی عمدہ پوشاکیں ہیں اور کنارہ وپیران کے پاس ہے؟ چپراسی نے جواب دیا تم بھی نرے بے وقوف ہو اجی یہ سلطانی غلام (نوکر) ہیں تنخواہ پر لیفٹے گئے ہیں۔

مفلس فقیر نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہنے لگا دیکھ لے میرے مالک غلاموں کی پرورش یوں کرتے ہیں اگر تجھے بندہ پروری کی گھات معلوم نہیں تو بادشاہوں سے سیکھ لے۔

جب لوگوں میں روپیہ کی گھنٹی خوب بج چکی تو بہلول نے دکان بچنے کو اس کے روپے پلٹا دیئے "بوصاحبزادے اپنا مال تم نے اس کے دھوئیں سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے تمہارے مال کی کھنکار سے دل خوش کیا جیسا مال ویسی قیمت۔ ما بغیر شما بسلامت۔ نہ کباب کے دھوئیں سے اس کے کبابوں کو نقصان پہونچا نہ جھنکار کی آواز نے تمہارے مال میں کمی کی۔ کہو میاں کبابی "دود کباب" کے دام پائے؟

یہاں چوہیل! کوئل بینہ کا نفرنس میں۔ "دود کباب" کی قیمت "ہی" کا معاملہ درپیش تھا۔ ہندوستانی دہقان نواب ملکی اُدھم سے جوان کے مقاصد کیلئے مضر ہے۔ ناخوش ہو کے لندن گئے اور وہاں کبابی کی دکان سے دھواں اٹھتے دیکھا مرغیوں کی طرح پیسوں کی چیوں سے سونے کے ٹکڑے نکالے اور پیٹ بھر کے چلے آئے قیمت اس دود کباب کی کانگریس والوں سے مانگی جاتی ہے کانگریس پولیٹیکل بہلول۔ دوراست کرا زصدائے زر کامل العیار قیمتش بدہ "بالفضل خرلوا"

ادھر بیت بازی ہو رہی ہے۔

چکڑ گنجی کے ہندوستانی شریک ؎

من بادگر داں ایں الات بشم — می فدائے حلقہ چشمات[1] بشم
گر کسے می بردی روزانہ زر مرا — می اقرباں ہمیں حالات بشم
بلکہ یا ہی حسی روز افزوں تو — می توانم مخلص فردات بشم
چوں ہر عضو تو یک خاصیت است — می فدائے جملہ اعضلت بشم
صد ہزار اما ست در یک دو تو — صد قدمی کدام امانت بشم
شاہ کے پیش بازی کنگریس کی ذات — بلت شد سن چو ان بخواہم بات بشم
ہزارائے دیدہ ہی با با مگر — چند باید نوکر با بات بشم
بسکہ یا الوات دیدم دلبراں — مصلحت گوید کہ من ہم گات بشم
عاشقی را بیں کہ بعد ایں ہمہ — تازہ می خواہم کہ خاطر خواہ بشم

کانگریسی اہل ملک ؎

تشدد پسند ہندوستانی۔

حکومت ہند اور اس کی پالیسی کہتی ہے ؎

مصلحت کے خار ہیں جنہیں دیکھنے والی نگاہیں کہتی ہیں کہ اس بیت بازی اور غزل خوانی کا نتیجہ اور اس حکایت کا نتیجہ یکساں ہوگا۔

کہتے ہیں کہ ایک میاں نے شادی کی۔ جورو ذری کا بل مٹی جھاڑو بہار والے کھلتی مٹی۔ میاں نے اپنی ماں سے کہا "اماں تم جھاڑو دو میں تمہارے لئے ریکہ کر ستھرائی لے لوں گا کہ بائیں پیر سے ہو تے تم زحمت اٹھاتی ہو۔" لاؤ میں جھاڑو دے دوں۔ شاید اس بہانے سے جورو بیگم اپنی ذرہ گرانمائیت پر متنبہ ہو اور وہ چیت بیلا اماں نے جھاڑو والتھیں لی۔ صاحبزادے نے شوہر پر عمل کیا۔ دلھن بیگم تھیں پالاک اس نے غور نہ فیصلہ جتا دیا کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک روز اماں جھاڑو ایک روز تم دو۔ بس۔

راقم: مستملی آرا بیگم

---

[1] صحف بشم ۔ چشمات کا موقوف ۱۲ ہے کانگریسی منظر کے کامیر خطاب بہ مسٹر رامزے لکھ تصرف ہے "ملاحت" سے بدل گئی مگر یہاں "لات" مذ "لٹھ" یا "لاٹھی" کا سمجھنا چاہیے ۱۲۔

فتنہ و عطر فتنہ

عقیل احمد جعفری

بے خزاں، بے غم بہار رہیا　　مقولہ از "ریاض" بازگشا

وہ لوگ جنہوں نے ریاض کو صرف سُنا ہے، دیکھا نہیں ہے ریاض کی شخصیت کی جاذبیت کا راز ان کی تصور پرستی میں مضمر سمجھتے ہوں گے۔ انھوں نے کاش ریاض کی وہ تصویر بھی دیکھی ہوتی جو خود ریاض نے اپنے ایک شعر میں یوں کھینچی ہے ؎

"بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں!"

نوساختہ توطرۂ نوایجاد، نہرے ٹین کی زنبار اوڑھنی جس پر لفظ "ریاض" مسلسلے کے کام سے نمایاں طور پر کڑھا ہوا، بڑی اور کھڑی سی مونچھیں کبھی بل کھائی ہوئی کبھی تنی ہوئی ایک ڈنڈ کتی اینچ جس کی توصیف میں خود کہا ہے ؎

چوڑیاں جتنی تھیں چھوٹی ہو گئیں
میری مونچھیں ان کی چوٹی ہو گئیں!

یہ ہے ریاض کی وہ تصویر جس پر ایک زمانے میں ایک زمانے کی نگاہیں پڑ رہی تھیں ؎

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس لوک کا جوان ہے کس آن بان کا

فتنہ، آہ چھوٹا سا وہ ریاض کا انبار جو بذاتی کی تنگدستی اور پختگی کی تہیدستی اور تخیل کی جدت، ندرت اور زاکت کی گرد پھیلی ہوئی ڈھیر تھا۔ ہلکے نیلے سے رنگے ہوئے اور کٹے ہوئے ورق کی یاد دلاتی کل، پاکیزہ نستعلیق خط، حسین سیاہی، مارٹن ڈیسپ ایچ، منتخب اشعار اور چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے اولی سیاسی ظرافانہ مضامین ——— یہ تھا فتنہ ——— یہ تھا فتنہ کہ "پیارے یار" جو دل سے زبان پر آگیا، جو دماغ نے قلم کے سپرد کر دیا۔ کوئی "فتنہ" کو فتنہ کہے یا قیامت مگر میں تو اسے ریاض کی رنگین زندگی کا ایک خوشنما رنگ سمجھتا ہوں اور بس ؎

"فتنہ" کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا؟

رسالہ گل کدے سے فصلی مضامین ہر فصل و موسم کے اعتبار سے جدید اور دلچسپ، وہ ہلکی ہلکی مذہبی چوٹیں، وہ رندانہ مزاحیہ تضحیکیں، وہ نثر شاعرانہ،

وہ نظم ناتمام، وہ عنوان کی جدت، وہ شیرینی کی لطافت اور وہ زبان کی نزاکت کہ بقول
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

وہ نازک خیالیاں اور وہ لطفوں کے اُلٹے پھیر سے شاعرانہ کی گرفتاریاں۔

اور شیخیے "فتنہ" کی پیشانی پر بھی ہوا کرتی تھیں مگر صرف وہ شیرینیں جن میں کوئی نہ کوئی ظرافت کا پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔

حسرت موہانی اسی "فتنہ" کی نسبت "اردوئے معلیٰ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"کوہ نور" فتنہ مارچ ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ حضرت ریاض کی شوخ مزاجی اور برق طبعی نے "فتنہ" نام پر کیا اور "کل فصیح فتنۃ" کی سُرخی حسب حال اس کا عنوان تجویز کی۔ وقت کی نوشحالی سے علیگڑھ جیسا شاندار اور نامور نگار، ظرافت کو نگار و غیرہ ہم اچھے اچھے لکھنے والے اس کے معاون بنے۔"

حضرت ریاض کا یہ دعویٰ تھا کہ اس وضع اور اس رنگ ڈھنگ کا رسالہ زمین پر کوئی اور پرچہ موجود نہیں ہے۔ اگرچہ بعد میں ایک بورپین افسر سے چربہ "فتنہ" کا عاشق تھا یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک زمانے میں ایک پرچہ اسی تقطیع کا فرانس میں بھی موجود تھا مگر رنگ کے لحاظ سے "فتنہ" پھر بھی لاثانی ٹھہرا۔

ابتدا میں صرف فتنہ ہی شائع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر نثر کے شوخ اور چلبلے مضامین ہوا کرتے تھے مگر کئی سال کے بعد اس کے ساتھ ایک ضمیمہ نظم کا بھی نکلنے لگا جس میں اُردو زبان کے نامور شاعروں سے چوٹی کے اشعار چھانٹ کر درج کیے جاتے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے اس کا نام "سطر فتنہ" رکھا گیا اور حضرت ریاض کا شعر ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پہلی پھڑک الٰہی نظر انتخاب کی

زیب عنوان "سطر فتنہ" ہونے کی وجہ سے تمام رسالے ادب میں ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا۔ "فتنہ" کی ابتدائی جلدوں میں ایسے ایسے لطیف مضامین ملتے ہیں جن کو پڑھ کر طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ مثلاً ذکر ہے کہ مدیر "صلائے عام" دہلی نے ایک خط میں ایڈیٹر "فتنہ" کو لکھا تھا کہ اگر ولایت میں ایسے لکھنے والے ہوں جیسے "فتنہ" میں ہوتے ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ سیکرٹری آف اسٹیٹ ہو کے رہیں۔"

"فتنہ" کے متعلق "سید الاخبار" کی توقیع رائے معلوم کرنے کے بعد اب آپ سے "فتنہ" کی تعریف خود "فتنہ" کی زبان سے سنیں:

"فتنہ عالم کے اس بوٹے سے خدا اور چھنڈنے سے ٹریل پر کہیں فتنہ نامتوں کی نظر نہ لگ جائے۔ ایک تو ماشاء اللہ حسن خداداد، تو کم کا جوان، اس پر جوش نالہ اس پر گلے میں ملائی، سونے مول کا جڑاؤ کنٹھا، سنہرے لفظوں کا نازک نازک زیر و زبر، بیس السطر تھوٹے چھوٹے پھولوں کے ہار اللہ رے بہار، اللہ رے بہار، ہزار تھپی صدقے کہ دو جب بھی جی نہ بھرے۔"

اس "چند تصویر بتاں" اور "چند حسینوں کے خطوط" والے مرقع کی کوئی تصویر کیا آپ دیکھنا پسند نہ کریں گے؟

"قہر نگار" "شوخ نگار" اور "سیاں رمضانی" ——— وہ میاں رمضانی جن کا ایک مضمون دیکھ کر مرزا صاحب اچھل پڑے:

"اُردو اخبار دیکھنے کا اگر کوئی نتیجہ نہیں تو یہی "فتنہ" میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہے کہ

قت کی محنت ٹھکانے لگ جاتی ہے۔

تارک الصوم سے مخاطب ہو کر جو باتیں یہاں رضا نے کی ہیں اُردو لٹریچر کے حق میں
عمدہ نمونوں میں سمجھیے۔ مجھے فرصت ہوئی تو ایسے پاکیزہ خیالات کے جمع کرنے میں
بہت محنت کروں گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ملک کے اہلِ کمال
اُردو میں کیا کیا فیاضیاں دکھا سکتے ہیں ——— قصور ہے تو زمانے کا کہ اس کے انعام
دینے والے بھی نہیں ملتے۔"

وغیرہ کے چھوٹے اور اچھوتے مضامین کے ساتھ ایک اور مضمون نگار کا نام بھی "فتنہ" کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ حضرت ریاض کا اصلی کمال یہ تو ہے ہی کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ انشا پردازی میں ایک طرزِ خاص کے بانی تھے لیکن ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف ایک نیا طرز ہی نظم و نثر میں نہیں نکالا بلکہ اس کو ایک "اسکول" کی حیثیت دے کے چند اپنے رنگ کے لکھنے والے بھی پیدا کر دیے۔

ریاض الاخبار

اے عندلیب رنگ ہمارا اڑا نہیں
تقلید میں بھی تار ہے ایجاد کا مزا

ریاض الاخبار نے اپنے ہاں وہ جوہر دکھائے ہیں جو علی درجے کی نمود حاصل کی ہے، وہ اس لائق ہے کہ زمانے کو اس پر ناز ہو۔ شاید پرستار پیکن سے اس کی قدر پوچھیے اور جو ہوس مذاق کے نکھارے ہوئے ہیں ان کے دل ٹٹولیے، روشنیوں نے ہر چند ابھی نیرنگیاں نہیں لی ہیں پھر بھی ہلکے ہلکے نیلے سایے نظر آرہے ہیں۔ پکچر نے ابھی پچھتر ہوا نہ کھائی ہیں ڈولا ہے پھر بھی کس ناز سے گردن اٹھا رہی ہے۔۔۔۔ سامان وہ فراہم ہوئے کہ ملاؤس میں کے رقص کے عوض اس کے ورق بھلے معلوم ہوتے ہیں۔۔۔ کہیں شوخ رنگ نے نگاہ لگا دی ہے۔ اس کی پرستش کرنے لگے جنھیں پولیٹیکل مضامین کی چاٹ تھی وہ اس پر مرمٹے۔ ناول کی شہرت کا وہ شور ہوا کہ بچہ بچہ اس کی مدح سرائی کر رہا ہے۔

اس پرچے کی خواہش ہے کہ اپنی حالت کو اپنے حوصلے کے موافق سنبھالے۔ وہ بات پیدا کرے کہ ملک کو اس کے وجود سے فخر حاصل ہو۔

ریاض الاخبار ۱۸۷۳ء

حسنِ سررہ گزر

۱۔ زرّیں کالم

ریاض الاخبار نے نادہندہ خریدارانِ اخبار کے خلاف بطور پروٹسٹ ایک یہ جدت کی تھی کہ ایسے حضرات کے نام مدت انتظار گزر جانے کے بعد سیاہ حاشیے میں بڑے بڑے حرفوں سے شائع کرتا تھا۔ اس کے برعکس خوش معاملہ خریداروں اور معطیوں کو زرّیں کالم میں جگہ دیتا تھا ـــــ عنوانِ بالا کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"دنیا میں وہ حضرات بھی ہیں جن کے نام خاص کالم کے نذر کیے جاتے ہیں اور کچھ اثر نہیں ہوتا یا ساتھ ہی

بعض ایسے بھی ہیں جو اشخاص مندرجۂ مراسلہ کالم کی تیغ قتال کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نام جس کالم میں درج ہوں اس کو زرّیں کالم سے تعبیر کرنا مناسب ہے ؎

کام آتی ہے مسیحوں کے کسی کی بیری
جو مجھے دیں مرے اللہ خدا نے پائیں

جو لوگ اخباری دنیا سے باعتبار دیسی مذاق کے واقف ہیں وہ زرّیں کالم کی حیثیت کو بہت ہی نگاہ قدر سے دیکھیں گے ہم نے آئندہ کے لیے پسند کیا ہے کہ خاص کالم کی تزئین سیاہ کالم سے کر دیں اور وہ سیاہ کالم زرّیں کالم کے دوش بدوش رہے کہ ..... قدمے فاصلہ دارد کا مضمون صادق آئے۔

۲۔ ذیل کی خبر ہرگز قابلِ اعتبار نہیں

اخبار "نغمۂ ہند" میں ایک ہفتہ وار خبر شائع ہوئی۔ ریاض الاخبار تعلقات کی بنا پر اس خبر کو اپنے اخبار میں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن عزائی دلچسپ لگی کہ بے شائع کیے بھی نہ رہا گیا۔ آخر اس دلچسپ اور معنی خیز سند رجہ بالا سُرخی کے ذیل میں وہ خبر شائع کر ہی دی۔

"نواب بہاول پور، راولپنڈی کے اضافی دربار میں حسب دستور گزٹ بھر کا اور کھا ما اور مرصع سر پیچ باندھ کر تشریف لائے۔ لاکھوں روپے کے سونے کے زیور اور جواہر لدے ہوئے، انگریز افسر نواب صاحب کو جب امیر کے ڈیرے میں لے گیا تو نواب کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ امیر نے کہا السلام علیکم۔ جواب ندارد۔ امیر نے پوچھا "حالت انتظام مملکت شما چیست" ——— جواب میں خاموشی۔

امیر نے فرمایا "نواب چہ گونہ و چہ حال داری و تزا چہ شد" ——— وہی سکوت

الغرض امیر جھلا گئے اور بہ آواز بلند کہا:

"ایں بے چارہ را راہ گزارید کہ با طفلاں یا زناں بازی و ملاعبت نماید یا بگورے و چوگاں مشغول شود"

نواب صاحب بہ زبانِ حال شکریہ ادا کرتے ہوئے جیسے سے نکل آئے ؎

اگر نقشِ مقصود ہمہ ازیں جنس اند
مخواہ دیدۂ بینا خنک تنِ اعمیٰ"

۳۔ تازہ ایجاد

اسپین میں اور اس کی وجہ سے کیوبا میں بلکہ یورپ کے کل کیتھولک گرجا گھروں میں عبادت کے ساتھ سیر و تفریح کے بھی موقعے ملتے ہیں۔ آپین کی خصوصیت میں ایک خاص کمال یہ ہے کہ وہ اپنی پچکیوں کے ذریعے سے عام جلسوں میں اپنے دوستوں سے باتیں کر لیتی ہیں ——— ایک صاحب حال میں کیوبا گئے تھے وہ بیان کرتے ہیں ——— میں گرجا گیا میرے ہمراہ میرے ایک دوست بھی تھے انھوں نے مجھ کو کچھ حال پنکھیا کے ذریعے سے اظہار مدعا کی ترکیب کا سمجھایا۔

وہ کہتے ہیں ہم بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک نوجوان خوش پوشاک، خوب صورت لیڈی گرجا میں آئی۔ پہلے تو اس نے مجھ عبادت کی اس کے بعد چاروں طرف اس طرح، کھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کرتی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی پنکھیا کو پورا کھولا۔ میرے دوست نے یہ بتایا اس کے یہ معنی ہوتے کہ اس نے اپنے مطلوب کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے پنکھیا کو آدھا بند کر دیا، اس کے یہ معنے ہوتے کہ آؤ مجھ سے ملو۔ پھر اس نے بند پنکھیا کے بالائی نصف حصے پر چار انگلیاں رکھیں مطلب یہ کہ ساڑھے چار بجے۔ پھر یکایک اس نے پنکھیا گرادی، اس کے معنی مجھ کو یہ بتاتے گئے کہ میں اس وقت تنہا ہوں گی۔

ریاض الاخبار: - پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنا قدیم سے ہے، افسانوں میں بھی اس کا ذکر ہے، حرم سرا میں بھی۔ جہاں تک پھولوں کے رنگ سے معنی تعبیر کرنے کا تعلق ہے یہ ایجاد عربوں کی جدت طرازیوں کی یادگار معلوم ہوتی ہے اور جہاں سے یہ چیزیں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اسپینیوں کی بدمذاقی ہے۔

بیل کی سرگزشت

ریاض خیرآبادی

بیل بن کر کس مصیبت میں پھنسے ہم ناتواں،
سرگزشت اپنی بیاں کس سے کریں ہم جاں ہار

دُودھ میں ماں کے ہوئے ہر قوم کے بھائی شریک
بھائی بن کر بھی نہ یہ سمجھے کہ میں ہوں شیر خوار

رکھ کے بھوکا ہم کو اپنا پیٹ سب بھرتے رہے
کہہ کے ماتا دھو کے دیتے تھے اسے بھی بار بار

اس کو آتی تھی محبت منہ ہمارا دیکھ کر
چاٹتی تھی پیار سے کس طرح وہ الفت شعار

دودھ اُترے ماں کا دو منہ ہم نے مارے اس لیے
ورنہ یہ منہ تھا ہمارا دودھ کرتے زہر مار

ہم بدھے رہتے تھے تھن کے پاس ماں کے پاؤں سے
منہ کے بدلے ہاں کھلی رہتی تھی چشم انتظار

دُور تھا منہ سے ہمارے تھن بھی طرفِ شیر بھی
اور طرف شیر سے باہر نہ جاتی کوئی دھار

ساتھ ماں کے جب چلے منہ پر چڑھی جاتی ضرور
اب ترس آتا ہے کس کو لاکھ ہم ہوں بے قرار

آنکھ پر سب کے چڑھے جب کچھ نکالے ہاتھ پاؤں
سینگ بھی آنے نہ پائے ہو گئے نظروں میں خار

نوجوانی رنگ بھی لائی تو کس آفت کا رنگ
کیا کہیں اپنی خزاں ہم کیا کہیں اپنی بہار

ایک آفت جوتنے کو ہل میں ہم جوتے گئے
ہر طرف ہل چل گئے کیا ہو گئے وہ سبزہ زار

کھینچنا وہ ہل جو چلتے ہوں زمیں کو پھاڑ کر
گو زمیں پتھر سے بھی ہو سخت ایسے نوک دار

ایک حالت پر گذر جانے لگے دو دو پہر
ماں کے تھن کا دودھ آیا ہونٹ پر اُف رے فشار

آگیا بھاری جُوا گاڑی کا گردن پر مجھی
ہم نے گو میدان جیتے پھر سمجھے اپنی ہار

ہم نے کیسے کیسے پھکڑے کھینچے دل میں بھینچے
بوجھ ہم نے یوں اٹھایا جس طرح عصیاں کا بار

کھانے پینے کا نہ کوئی وقت تھا آرام تھا
ٹھوکریں کھا کھا کے گرنا اور چلنا بار بار

موسم گرما میں دن کی دھوپ کیسی سخت و تیز
موسم سرما میں شب کی اوس کیسی ناگوار

ہم اگر تھک کر کبھی بیٹھے تو منہ چلتا رہا
تھا ہماری زندگانی پر جگالی کا مدار

خون سوکھے دیکھ کر کھانے کو ہیں خشک گھاس
جس کو پی کر خون پانی ہو وہ آب ناگوار

جیتے جی گویا بھرا جاتا تھا بھوسا کھال میں
سوکھے ڈھٹھل بھوک کی شدت میں کرنا زہر مار

پگھلے چربی جس سے کولہو میں کھلی اس تیل کی
وہ بھی قسمت سے مہینے میں کبھی دو چار بار

دانہ بن جاتیں تو بن جاتیں بدن کی پھنسیاں
اس کا بدلہ بھی بھگتنا ہم کو تا روز شمار

آندھی آئے پانی برسے ہم کو چلنا رات دن
ساتھ دے تو اس طرح دے گردش لیل و نہار

ہائے وہ سوجے ہوئے پھوٹے ہوئے کاندھے کا زخم
بوجھ بھاری سخت منزل اونچی نیچی رہگزار

بے سکت پالنگ لاغر ناتواں زار و نحیف
بھوکے پیاسے زخم خوردہ سینہ ریش و دلفگار

رفتہ رفتہ دے دیا طاقت نے بھی بالکل جواب
بیٹھ کر اٹھنا ہوا مشکل ہمیں انجام کار

جان بچنے کے ذریعے جس قدر تھے سب مٹے
رحم کے قابل نہیں اب بھی ہمارا حال زار

باندھ کر بیچ ہے کھلائے کون بوڑھے بیل کو
کون پالے ہم کو اس حالت میں اے پروردگار

وقت نازک ہے مرے آنر جان دو بھر حال غیر
سر بزاب قصاب پہنچے لے کے چھریاں اور کٹار

بات کہتے کر دئے ہر عضو کے ٹکڑے جدا
قیمہ قیمہ کر دیا بے دریوں سے جسم زار

ریشے ریشے پر ہمارے دانت تھا ہر ایک کا
آدمی کیا چیل کوّے ٹوٹے ہم پر بے شمار

حصے بخرے ہو گئے کچھ بٹ گیا کچھ لٹ گیا
گوشت اپنا تکّے بوٹی ہو گیا انجام کار

کھال باقی رہ گئی تھی اس کے نقارے منڈھے
شامتِ اعمال سے پڑتی ہے اب اس پر بھی مار

ایک ناکردہ گنہ کا حال یہ ہے اے ریاض
وہ بھی اک بے عقل بے بس بے زباں بے اختیار

دیکھئے ہوتا ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا حشر
دیکھئے پاتے ہیں کیا پاداش ہم سے زشت کار

چٹکیاں اور گدگدیاں

ریاض خیرآبادی

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

ہماری اس آرزو میں ہمارے سید احمد خاں بہادر بھی شریک ہیں شاید اوپر کے دل سے۔ اخبار والوں نے کعبہ پہنچا دینے کا کو وقیعہ اٹھا ہی نہیں رکھا تھا ؎

وہ تو کہتے بچ گئے فصل بہار آنیکو تھی

کسی نے کسی طرح جھوٹ سچ اول کر بیچارے سید نے اپنا دامن چھڑایا۔

ہمارے بُرے بھلے سید کو لوگ یہیں پڑا رہنے دیں تو بہتر ہے اور اس بُرے وقت میں بہتیرے کام اس سے نکلتے رہتے ہیں ہمیں تو معتقدین سید سے سید ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ ہزار چیڑ بھاڑ پر اس سے نہ ہو سکا کہ مزم حج کی خبر شہر لکھنے پر اپنی زبان سے تردید کرتے کہا تو یہی کہا مزم معظم ہے جب ڈبا جاتے ـــــ مگر معتقدین کے قوماگ ہی ٹک گئی۔ ایک نئے بگڑے ہوئے میاں وضعدار ہیں کئی فاتوں میں آپ ایک مضمون بہت کیا مگر واہی واطراف بیت اللہ کے نام پر آپ اس طرح جامہ سے باہر ہوئے گویا شیطان نے انگلی دکھا دی۔ ان کو جب ضرورت ہوگی تو علیگڑھ سر جھکا دیگا ؎

کسی کا دل پاک ہے سنگ اسود
بڑھو کہہ کے لبیک یا سید احمد

ہمارے نزدیک اخبار والوں نے غلطی کی جو یہ لکھا۔ الفاظ میں تغیر و تبدل ہوتا تو اچھے رہتے انہیں لکھنا چاہئے تھا کہ سید صاحب خدا کے گھر جانے والے ہیں۔ اس صورت میں کوئی تردید نہ کرتا۔

دور سے کعبہ کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

سید صاحب کے ایک عقیدت مند کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب حج کو نہ جائیں گے۔ ان عقیدت مند کا نام ؟

ہے جو سکریٹریٹ گورنمنٹ پنجاب میں ہیں۔

ان کو اور سید صاحب کو لوگ سمجھتے کہ ایک ہی خاک کے چند ذرے ہیں جو سمٹ کر دو قالبوں میں کم و بیش جا بسے ہیں۔

عقیدت مند صاحب پہلے اڈیٹر خادم سے بچتے ہیں اور وہ تیرہ خیال جو درد دل کی طرح داغ میں مٹے ہوئے تھے کچھ ظاہر کئے ہیں سید صاحب کے عزم حج کے متعلق آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

"وہ اس قابل نہیں جو مکہ معظمہ کے مصائب اٹھا سکیں۔ انہیں دس پانچ قدم چلنا مشکل ہے۔ پھر جانکیہ بیت اللہ: اونٹ کی سواری الحج بیت اللہ کے گرومنگ وطرنگ پر سہرہ سرطاق کز ناہیت دشوار ہے"۔

اونٹ کی سواری گرپا گدھے کی سواری سے گری ہوئی ہے۔ سچ ہے ماں کے پیٹ سے جو کوٹ پتلون پہنے نکلے ہوں ان کو فنک وطرنگ ہونا یا تہ بند صافہ کیوں نہ دشوار ہو

صاحب کشف الاخبار نے براہ راست سید صاحب سے دریافت کیا تھا۔ جواب ملا:

اس فریضہ اہم کے ادا کرنے کا مشل اور مسلمانوں کے میرا بھی مصمم ارادہ ہے لیکن بعد عیدالفطر غلط۔

اخباروں کی نیک فال کا شکر گذار ہوں۔

مبارک بود فال مرغ نرون
نہ مرغ نرون بلکہ شہ مرغ نرون

ہماری خاک بھی کیا فتنہ انگیز
بنے سات آسماں دو گز زمیں کے

ہمارے سرسید کو حاجت کی فکر ہو یا نہ ہو اپنے گور گڑھے کی بھی فکر ہے؟ اگر نہیں ہے تو ہم ان کو مرد آہن ہی نہ تسلیم کریں گے اور اگر ہے تو ہمیں بتائیں انہوں نے اب تک کیا کیا۔

ہم ان کے خیر اندیش ہیں۔ چاہتے ہیں جس طرح مدرسۃ العلوم کی بابت ان کی محنت ٹھکانے لگی مٹی بھی ٹھکانے لگے۔ بے وقوف ایسے الفاظ کو فال بد سمجھیں۔ ہم ایسوں کا جواب دیا نہیں چاہتے۔ گور گڑھے کی فکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدانخواستہ سرسید کو مرنے کا قصد کریں یا ہماری طرف سے تقاضہ سمجھیں خدا ان کی عمر میں اس قدر برکت عطا فرمائے جتنی اپنے فرشتہ خاص کی عمر میں برکت عطا فرما چکا ہے۔

یہ ہماری محض خیر اندیشی ہے کہ جو بات ان کو نہیں سوجھتی وہ ہم سجھائے دیتے ہیں۔ ہم نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ صرف اپنی مٹی برباد ہونے ہی کی فکر نہیں کرتے بلکہ مرنے سے پہلے اپنے دائمی رہنے کی جگہ پسند کرتے ہیں۔ کبھی باغ میں۔ کبھی کسی بزرگ کے پائیں مزار بھی گھر ہی میں۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے جانشین نامزد کرتے ہیں۔ یہ تو سرسید بھی کر چکے۔ باقی ہے تو وہی بات جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ علیگڑھ کی سرزمین نے ان کے لئے بے طرح کشش دکھائی ہے ورنہ لندن جا کر ان کا واپس آنا

یعنی ہے ——— چلتے ہی اس نے ان کو بزعم خویش خدا نخواستہ مرنے پر دوگونہ کی کیوں ٹھہرائے گی مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ علیگڑھ میں کس جگہ کی زمین ——— یہ کچھ ہم لوگ تو ہیں نہیں جن کے لئے کہنا پڑے ۔

ہم فکیشوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ
حسرت پکارتی ہے کوٹھی کہاں کی ہے

ان کی مبارک لاش کے لئے تو ہر طرف سے زمین فوراً ہی خصوصاً جب پہلے سے تعفن دہ ہو ہو گا۔ مرنے پر اس کش مکش کو اٹھا رکھنا عقل انجام بین کے خلاف ہے ۔ یہ بات سمجھا تو ہم نے دی اب سوچ کر اس کا تصفیہ کرنا سرسید کا کام ہے جن کو ابھی تک اس کی خبر نہیں ہے

کعبہ کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے
مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

لیکن قیاس تو یہی ہے کہ گورنمنٹ کی کوشش ان کے لئے اچھی طرح ثابت کی ہے اور جہاں انسان شب کو رہتا ہے وہیں نیند بھی خوب آتی ہے مگر یقیناً وہ اسے پسند نہ کریں گے ۔ یہ حضرت والا دشمنان مدرسۃ العلوم ہیں جب پسند کریں گے تو مدرسۃ العلوم کی زمین کو ۔

اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہو گا کہ مقبرہ کے لئے بہت کچھ عمارت متعلقہ مقبرہ کی ضرورت نہ پڑے گی کسی کمرہ میں اگر زمین دوز پسند کر لی تو مقبرہ کی چار دیواری اور گنبد کا بھی جھگڑا گیا۔ اور اگر علاحدہ جگہ لی تو مقبرہ کی عمارت سے مدرسۃ العلوم کی نو دو اور بھی چرت جائے گی ۔

نیز وہ بیرونی زمین کو پسند کریں یا اندرونی زمین کو ۔ چھوٹے سے احاطہ میں بیرونی سرو نما کچھ مٹی کا نشان نظر آئے یا زمین دوز قبر پر سبزہ لہرائے یہ ہو جب ہی کہ جب پہلے سے تجویز ہو اور یہ تجویز بھی کسی قانون کی دفعہ سے متعلق کر دی جائے تاکہ اسی اکھاڑے کے پہلوان مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو وقت پر اڑنگا لگانے کا موقع نہ ملے ۔

اس وقت بات کی ہو موافق ہے ۔ کثرت رائے سے جو کچھ کرنا ہو کر لیا جائے وہ جانشین کے اکھاڑ دینے کو تو جو کے نہیں بعد کو گڑے مردے اکھاڑنے کے لئے بھی دریغ نہ کریں گے ۔ انہیں کب تاب آئے گی کہ مرنے کے بعد سرسید مدرسۃ العلوم کی زمین پر دائمی قبضہ کریں ۔ وائف سکرٹری ہونے کے لئے تو موت نے وقت محدود کر دیا تھا اس کے لئے تو یہ اعتقاد سرسید قیامت بھی نہیں ۔

ریشِ مومن

لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیانِ ملک بھی آئے تھے ۔ وزیر عباس علی مرحوم انجینیر دیکھنے فن فوٹوگرافر کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے چند معتمد رفیقین و روسائے شہر تشریف فرما تھے ۔

منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی — کہ ایک رئیس باختیار معہ مختصر اشاف کے مرغ زریں بنے آتے نظر آئے۔ طلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لئے یہ عجلت بڑھے۔ دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی بشکل مشین چہرہ [illegible] ب تاک۔ نہ سلام میں تو دسبقت۔ نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا لعنتیں لعنت و پھٹکار کی بار بار بحکرار۔ اس طرح مقام [illegible] ست تک تشریف لائے اور باوصف تیز گوئی اجواز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار و کردار دیکھ میں فرق نہ آیا۔ مزاج پرسی کی جرأت کون کرسکتا [illegible]۔ وہ البتہ خفا ہے درشت اور زبان فرمائے جاتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی تو ایک مسی رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب [illegible] ادب عرض کیا کہ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہمنوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسلامی مظہر مگر [illegible] دیکھے داڑھی صاف۔ مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں۔ نہ مصافحہ و معانقہ نہ سلام علیک کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار — سلسلہ ٹوٹنے [illegible] ن صاحب نے عرض کیا برافروختگی کا سبب تو معلوم ہوگیا مگر حضور نے اس کی علت دریافت نہ فرمائی۔ یہ ادب عرض کرتا ہوں سننے [illegible] سے پہلے داڑھی اور سب مسلمانان لکھنؤ بھی ریش کے ساتھ رکھا دیں آپ ہی کے متعلق تھے۔ ایک روز میں خط [illegible] ہا تھا۔ آئینے پر نظر گئی۔ اطلاع پر اطلاع کہ محدود اور امام باڑوں کے منہدم کئے جانے کی آرہی تھی۔ دفعتاً معلوم ہوا کہ نواب آصف الدولہ [illegible] شہید امام باڑہ، بڑا اس کی وسیع اور حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی۔ نہ روک تھام کی قوت تھی نہ انتظام کی۔ میں نے مستقل ہو کر [illegible] ش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہیں اور یہ خیر سنیں تو اسے صاف کر دے ؎

وضع رندانہ سے ریش رہے صاف یہ ش
فحوت کی تعبیر ہے اس وقت مسلمان ہونا

فتنہ اور عطرِ فتنہ کے مضمون نگار

(۱)

ہم کو سے بتاں میں تھے ماہِ رمضاں آیا
صد شکر کہ سستی میں مجھے نہ کہاں آیا

ہم وہ طریقے بتائیں گے کہ روزہ تو ہو مگر معلوم نہ ہو۔

کھلے ہوئے صحن میں اُجلا فرش اور اس سے لطیف چھٹکی ہوئی چاندنی، جھکا ہوا آسمان اور اس میں اُبھرا ہوا چاند، پھیکے پھیکے ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ دھوپ کسی شمار قطار میں نہیں۔

دسترخوان پر گاؤ تکیے ادھر اُدھر دس پانچ کرسیاں، دو ایک کوچ، چھوٹا سا چمن زار اور اس میں ہرے بھرے شجرِ گل بس اتنے کہ ہوا کی ہلکی سنک بھی ہوئے گل کو لے اُڑے۔

یہ بھی تکلف میں داخل ہو تو ہرا بھرا سبزہ وہ بھی نہ ہو تو ہری بھری دوب، اس کے نہ کے لیے تو وضو کا پانی بھی بہت ہے نہ کہ جب تو چہ ہو تو ہمت پھیل کر جگہ لے سکتی ہے۔

یہ سامان بھی نہ ہو تو جھاڑ دار درختوں کی ہلتی جلتی شاخیں اپنے نازک ہاتھوں سے ہوا کی موجوں کو پنکھا جھل رہی ہوں اتنے میں بھی روزہ وصول ہے۔

دس پانچ احباب ہوں، کوئی دسترخوان پر تکیے کے سہارے کوئی کوچ پر کوئی کرسی پر۔ بوٹے سے قد والوں کی طرح صراحیوں کی قطار ہو، ان پر کاغذی آبخورے اور یہ سب اس سوندھی مٹی کے جس سے ہم پار ساوضع زندوں کا تعمیر ہوا ہے۔ ہوا پانی کو ہم سے زیادہ سرد کر رہی ہو۔ ہار، پھول، عطر، پان نوچہاں، شمک، کلی بقول امیر ؎

ساقیا پھول سے کیا کام کلی پیتے ہیں

دو گھونٹ پانی پی کر گلوری منہ میں دبا لے دو چار کش کھینچ کر ابر بہار بن جانے والے دھوئیں کو آسمان کی طرف لہرا دیا۔ رنگ بھیت ہے کہ جما ہوا ہے پھر اس طرح کہ گنبد مسجد سے نکل کر تراویح خواں بھی اسی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں مختلف ذکر اذکار ہنسی قہقہے بے تکلف

صحت کسی نے زائو بدلا کسی نے کروٹ۔ ہوا کی سنک خواب فروشیں لائی کبھی توڑ
مردم دیدہ یہ چلائے کہ باہر باہر
کسی دوست نے زانو تھپک دیا کہ نیند کا فور۔

ماہ مبارک کی راتیں وہ پاک صحبت نہ چوڑیوں کی کھنکار، نہ چھم چھم، نہ چھپ چھپ، خدا کی یاد نہیں فرصت کبھی نہیں، کبھی کسی رات باتوں میں کٹی یا آنکھوں میں، شجرہ و جمر مجدے میں جھکے تو کبھی شب قدر نہ جھکے تو بھی شب قدر۔ نور کی راتیں نور کے لئے چار چھ گھڑی رات ہی سے "سحر" کی ٹھیراوی کچھ دیر یہ شغل رہا، اس سے فراغت پائی کہ تلاوت و نماز فجر کی طرف جھکے ٹھنڈے ٹھنڈے آٹھ نو بجے دن تک اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر جو سونے کی ٹھہرائی تو پھر کون کروٹ لیتا ہے۔ آب وضو کے چھینٹوں سے ظہر کے وقت آنکھ کھلی بھی تو چند منٹ کے لیے، فعل کے سجدوں کے ساتھ پھر رخصت ہوئے۔ پانچ پہر کے جاگے ہوئے، کبھی دھوپ، کبھی گرمی، کبھی بھوک، کبھی پیاس، نیند تو سولی پر آتی ہے، غرض کہ خوب سوئے اور جی بھر کے سوئے اٹھے تو دو چار گھڑی دن رہے۔ نہائے دھوئے، وضو کیا نماز پڑھی، کل گشت کی چمن زاروں میں ٹھہراوی۔ ادھر کا دن ہی کہتا، اللہ اکبر کے ساتھ افطار اور افطار کے ساتھ اماسے فرض ——— پھر وہی رنگ صحبت، کھانے پینے کا لطف، حقے پان کے مزے ؎

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

یہ رہی ٹھنڈی ٹھنڈی راتوں کو خواب غفلت میں منائع کرنا ہمارے مشرب میں گناہ ہے نہ کہ رمضان المبارک میں۔ جن کو ٹھنڈی رات نہ ملی نہ دن ہی کو بنام کنندہ صوم ہیں۔ روزے ہیں اور دھوپ، گرمی، بھوک، پیاس کی شکایت کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ اے توبہ! بھی کوئی رونے ہیں، دن رات محو عبادت نہ رہے لیکن اس شکایت سے تو بچے۔ راقم ؎

مفتی یہ کہے لاکھ کہ روزہ نہیں جاتا
میں بھول کے بھی پی نہیں سکتا رمضان میں

"رمضانی" از "بھوپر"

۲- ہمارا خواب اور جلسۂ کانگرس

سوئی، نسان کو لٹی ہے، پھولوں کی گجینی یا کسی کافر کی چوٹی کی یاد دلا رہی ہے۔ شمع کی سنہری لو پر پتنگوں کا جھرمٹ ہے، کھیتے میں ٹیس زیادہ ہے، دل میں پھڑک ہے، آنکھوں میں بول کا جنگل اگا ہے، دروازے پر ٹکٹکی بندھی ہے۔ ہارمونیم چھیڑ رہا ہوں کسی کی یاد میں لب پر یہ ترانہ ہے ؎

تم وہ ہو کہ سو بار اگر حشر بپا ہو — وعدہ نہ وفا ہو نہ وفا ہو وفا ہو
ہم جسد کیے آنکھ تصور میں پڑے ہیں — ایسے میں جو چھم سے کوئی آجائے تو کیا ہو
ہے شام ہی سے لگی صبح شب وصل کا عالم — قربان ان آنکھوں کے جن آنکھوں میں حیا ہو

کیا سلام دیا ہے تجھے کیا جام دیا ہے	ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو
کر دی ہوئی ہر یاد دلاتے ہوں کسی کو	منہ پھیر رہے ہوتے کوئی ہیں کوس رہا ہو
کیا بیر ہیں یارب بہ مسیحان جہاں بھی	ان پر جو کوئی جان دے حسرت کی سوا ہو

لاکھوں ہی جوانوں میں ریاض ایک جواں ہے
کہ بخت حسینو! اسے چاہو اسے چاہو

مسہری، گجرے اور پھولوں سے لدی ہے۔ ابھی تک کسی کے چم چم چین چین کی آوازیں کانوں میں نہیں آئی۔ طبیعت زیادہ گھبرائی تو کمرے لیٹ رہا۔ نیند کو تو جاگتا رہا مگر محبوب کی نیند بن کر آیا اور پلک جھپک لگی۔

زمانہ کل تو نے دکھائے وہ آفتاب لب گور خ پارہ یاقوت، بنفشی مونچھوں کی لڑی، آنکھیں چڑھی ہوئی نشہ جوانی میں چور، گدرایا ہوا جوبن، پائنچے اٹھائے ہوئے انگلیوں سے ساغر گوئی کرتا آیا۔ گنگنے والوں کے لیے ع

ناگاہ نہ در آمد جاناں ندیدہ

کیا کہوں کس طرح کمرے پر اتھا رہا۔ میرے چھیڑ کر خوب ہی بھگایا۔ ابھی ع

رکا کہ رات میں ساقی صراحی سے لا

ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ باہر کواڑا کھڑکانے کی آواز آئی۔ چپکے گیدڑ صاحب چلیے اب ہمجولیاں آگئی ہیں اب چلنے کا وقت ہے۔ آفتاب محشر میرا منہ تکنے لگا۔ کھڑا ہوا۔ دو قدم پر ایک عمدہ کمرہ آراستہ دیکھا۔ کرسیوں پر تھوڑی تھوڑی عمر کی حسین گل پوش دلہنیاں بیٹھی ہیں۔ ان حاجب کو بھی سب نے دیکھ کر ایسی ہنگامہ دی۔ سب کے سب ان سے تعلیم کا اشارہ۔ تھا مستعلیق چال ڈھال، پاکیزہ خیالات، ایک مہذب اور نہیں لیا۔ ہی جو سب سے نمایاں اٹھتی ہوئی پائنچے چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "میری پیاری بہنو! میں چاہتی ہوں کہ آج کانگریس کی مخالفت میں کچھ دیر باتیں ہوں۔ دو ایک کانگریس والیوں نے تائید کی۔ کہا "ضرور ضرور" اتنا ہی میں اس کا مونہ کی بھنا چکا۔ ہے "تائید کے ساتھ کارروائی شروع ہوئی۔

دھانی دوپٹے والی بیگم:۔ میری آنکھ کی روشنی کلیجے کا گچھا، دل کی مراد سب بہنو! میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ بنگالی کوّے سوتے کیا کرنے والے ہیں۔ ہماری بہنیں ماں عکلہ راکشوریہ کے آگے بڑھ کر وکالت کرنے والے ہیں۔ وہ باتیں چاہتے ہیں کہ گدھوں کو سن کر تپ آئے

(قہقہہ) ہمیں سے ہے کہتی خوشی کی بات ہے کہ ہم جنس کی مخالفت ہے ——

اطلسی پاجامے والی بیگم:۔ میرا خیال تھا آپ ہی سے مٹنا جلنا ہے اگر انگریز ہندوستانیوں کو ہتھیار دے دیں تو دن رات لہو لہان ہونے کی نوبت پہنچے۔ یہ نکموں بڑے مردوے ایسے کلیجے کے ہوتے ہیں کہ خون خرابا کرتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری غریب ہنود پر روز اللہ بچائے تلوار اٹھایا کریں گے۔ پھر لڑکورے گھر میں ایسے جو گھر کا رہنا کیا۔ دور پار چڑھائی جان پھر سے نکل جائے۔ نانا بانا!

بڑی موہاف والی بیگم:۔ میری پیاری بہنو! اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ کالے کوّے امتحان مقابلہ جھٹک جھٹکا کر پاس بھی کر لیں تو ہمارے بٹیرا اور مرغ لڑانے والے مردوے کیونکر ان سے بازی لے جائیں گے۔ اس وقت بنگالنیں کو لھا پھر کا پھڑکا کر

ہم کو نام رکھیں گی اور ہم سر نہ اٹھا سکیں گے اس لیے میں کبھی نہ لکھوں گی کہ امتحان مقابلہ ہو کر رہے۔ اس میں چاہے کیسا ہی ہنر پرتا ہو کانفرنس ہو ہماری آنکھوں پر ایسے پردے پڑے ہیں کہ یہ دقتیں سہ لیں اور فائدہ بھی گننا بگی بار سے بچنا نا تھا چار پاس ہو گئے بڑے بڑے مدرسے پاگئے تو بجھاڑو پھرے ملک کو کیا سرسبزی ہوئی یہ ملک میں کیا ہوں برساویں گے ان کے شگون کے لیے سارا ملک کیوں اپنی ناک کٹوانے بیٹھے۔ اتنی سی بات کے لیے ہم اپنی ولایتی بہنوں سے دشمنی ٹھانیں۔ ہماری پنڈا کی لوک کو کیا پڑی ہے۔

افشاں جبیں بیگم:۔ تاروں بھری رات ہے، گورو جی ہوں صاف جی سے کہتی ہوں کہ مجھے رہنا گوں سے کیونکہ سوارت ہو جاتا ہے اس روپے سے جو پتنگ میں اڑے ہے چوک کی کسبیاں لے جاتیں نکوڑی گھر کا سنبھالنا اس کر دیں وہ اچھا یا سرکار کا بھلا ہو وہ اچھا۔ خدا کی مار ان مردوں پر جو ناری سرکا۔ کو روپے دیتے جبیں۔

بسنتی پوشاک والی بیگم:۔ سنو میری چہیتی بہنو! اس میں شک نہیں کہ یہ ہنگامی سرکا۔ سے ہم کو زر و زیور کرانے والے ہیں جو قبیل پر رسوں جھانا چاہتے ہیں، ان کی آنکھوں میں سرسوں پھول رہی ہے۔ اب رات زیادہ گئی آئندہ تاریخ بڑے جلسے کے لیے مقرر ہو۔ لفظ ہی میں نے چاہا کہ دو ایک سے کچھ باتیں کروں کہ ایک نے سینے کا زمزمہ دیا۔ آنکھ کھل گئی۔

راقم: رات کا خواب الٰہی توبہ
(حکیم بہ تبسم مرحوم)

۳۔ "مرزا فنش"

اُلٹے، ٹہلے، چلے پھرے، واہیات میں خضاب کیا، بالوں میں تیل ڈال کنگھی کی۔ کپڑے بدلے تسبیح زمزم ڈالے میں لی یا اللہ یا خدا کی جوتی سوت سب سے بھاری گنگدول دزبان روفوں نا واقف، عطر لگا "چا۔ باغ"۔ رومال کندھے پر ڈالا، نسیان کی چھڑی بطور تبرک ہاتھ میں لی۔ پہلے پہنچے حکیم برہم کے دوا خانے میں۔ شیشی اٹھا کر جیب میں رکھ کر خیال خوشی میں مسرور پہنچے کہاں سرائے لچھتہ میں اور نگوائی وہاں مرزا جی کمپنی کے یہاں سے ولایتی، اس کے بعد عاقبت بہ خیر!

نظم

اب ہند میں کیا رہا ہے بھائی — فریاد ہے ہند وہ دہائی
وہ مصر، اس باغ کے تھے اک گل — شاگرد تھے ہند کے جزو گل
اک پھول اسی چراغ کے تھے — اک بوند اسی ایاغ کے تھے
سقراط سے لے کے تا بقراط — طفل مکتب تھے اہل یوناں
آگے اس کے زمیں سے تا بہ مہ — سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ
گیتائی کے بھی خدا تھے ہندی — اس کشتی کے ناخدا تھے ہندی

رامائن میں دکھائے وہ ڈھنگ	ہومر کا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ!
رنگت عشق کی بھی ہے پھیکی	سبحان اللہ ——— والیکی
کالی داس آہ خیالِ بیش	سرمایۂ ناز آفرینش
مشہورِ جہاں کتاب اس کی	مقبولِ زماں کتاب اس کی
جھنڈے پیرک کے بھی گڑے تھے	یونانی جیب میں پڑے تھے
تشریح کے بادشا تھے ہندی	تشخیص کے بھی خدا تھے ہندی
وہ ہائے حبس کو ہو جان پل کا	دیکھے وہ فلسفہ "کپل" کا

وہ علم و نفس اب ڈوبیا
جو کچھ سیکھا تھا سب وہ کھویا

اس نظم پر "فتنہ" کا نوٹ بھی قابلِ دید ہے:-

"نظم کیا ہے ایک تصویر ہے" دلی جذبات" کی۔ ہمارے دوست کو گمان فضول باتوں سے نیا وہ دلچسپی دلفگی کبھی کبھی حبِ وطن کے جوش کا بھی "جواب" آجاتا ہے۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ "نثار ہندوستان کی تعلیم تاریخ کے بھی ماہر ہیں، اور تاصر دنیا کے ابتدائی حالات بھی ان پر آئینہ ہیں۔

"پدرم سلطان بود" کی مثالیں بھی اس نظم سے ملتی ہیں افسوس ہے "سپوت" کچھ نہ کر سکے۔ اس کا مرثیہ جہاں تک پڑھا جائے کم ہے"

۴۔ ایک نئے انداز کی غزل

باغِ عالم کی روش پر جلوہ گر ہیں گل کے گل	جان کر خونِ بطِ مے پی رہے ہیں مل کے گل
رشک کے قلزم میں کیا شے ہے صراطِ مستقیم	نالۂ شب گیرِ عاشق توڑ دیں گے پل کے پل
سخت مشکل جان نکلی ہے بتِ سفاک سے	قتل پر عشاق کے پتھر گئی قاتل کی تل
باغ ہے صحنِ چمن ہے شیشہ و ساقی و جام	جی میں آتا ہے پئیں اے جان تجھ سے مل کے مل

دشمنوں کی بات پر ہرگز نہ جا تو اے نثار
رستم و سہراب کے مرقد سے سن جا جل کے جل

بے نام مضمون نگار

۱۔ چانڈو خانے کی گپ

ایک افیونی:۔ بڑا آیا تھا ہاں سے ہمارے پٹھے سے لڑنے۔ کیا مارا ہے۔

دوسرا:۔ یہ روسیہ بڑا حرام زادہ ہے۔ اس کو پانی پت کے میدان میں بھی کوئی تیس تیس برس ہوئے ولگے والی پٹھن نے خوب پٹا تھا۔

تیسرا:۔ افغانہ ہی وہ ذات شریف ہے جو بڑے بڑے جہاز لے کر کابل قندھار پر آئے تھے اور ہمارے لاٹ صاحب نے سب جہاز چھین لیے تھے۔

چوتھا:۔ مگر آج ہم نے میلے میں پنیر (پانیر) کا بچہ دیکھا تھا اس میں لکھا تھا کہ روسیہ کے بہت سے جہاز آرتھر روڈ (آرتھر پورٹ) پر پڑے ہوئے ہیں۔

پانچواں:۔ پانیر کا بچہ کیا وہی اسے یہاں وہی "صلح کل" "گورکھ پورہ والا"۔

پہلا:۔ اچھا تو کیا وہاں کوئی بڑا بھاری دریا ہے؟

دوسرا:۔ آرتھر پورہ ہی ناجس پر نواب شجاع الدولہ نے ایک بڑی بھاری مسجد بنائی تھی۔

راقم "افیونی"۔

۲۔ ایسے بھی ہوتے ہیں

قرض دار ہیں لیکن چہرے پر شکن نہیں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ کتنوں کی جیب مارے بیٹھے ہیں مگر خرچ سب اُسی سے ہیں۔ افغانی خوراک گوشت، شراب اور آرائشی چیزوں کے لیے وقف ہے۔ دھوبی بھنگی وغیرہ کی تنخواہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ بزاز بنیے کا حساب الگ ہے [illegible] آنا ہے کئی سال کی قیمت باقی ہے آئندہ ناظرین کے منظر ہیں لیتا سرے کر دیتا۔

۳۔ الف، لام

[illegible]

پابندی رہی۔ پنجاب میں اصلاح رکھی گئی اب میں نے نیا قاعدہ ایجاد کیا ہے میرے قاعدے کے مطابق الف لام آخر میں آیا کرے گا مثلاً چند الفاظ پیش کرتا ہوں۔ بھوپال، بٹھال، کوٹھوال، جنجال، تھوکھال، مہال، وبال، بال، لال، کلال، قال، سال، حلال، انھیال، دوھیال، سسرال، سال، دلال، خود جال۔

راقم: سیفے ازال موڈھ

۴۔ بیکاری کے مشغلے

چھتری کھولی اور بغل میں دبا کر کھڑکی کے کھولی۔ کتابیں ادھر سے اُدھر کر دیں۔ قاعدہ نکال لیا اور بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ فتح پور تک آرتھر یہ طباعیاں کرنے لگے کسی کا روپیہ ایک دھیلا چوری کر لیا، اللہ کرکے سے برآمد سے میں کھڑا ہوا، پھول لے کملوں کی زیب و زینت دی، سراہیں گشت کرنے لگی دوست سے ملنے چلے گئے۔ اگلا پچھلا حساب دیکھ ڈالا کسی اخبار کا نمونہ طلب کر لیا، زبان اردو پر چست کرنے لگے، پیشوں، فکر کرنے کو بھی وہاں سے بازار کا نرخ دریافت کر آئے، شاہجہاں بازار میں ذوق واشتیاق کرنے لگے آئینے لے کر مونچھ کے سفید بال چننے لگے، دو یک اڑا کر زمانہ ہونے دوسروں کے بگڑے میں پروفیسر بن گئے۔ بیٹھے اٹھے بیٹھے اور چل دیئے۔

۵۔ دیوتاؤں کا استھان

کہا جاتا تھا اس سرمیں طلسم نظر آتا ہے۔ کہاں قدر کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ استھر فارسی اور پاستر مونیوں کے پوچھنے سے کیا گیا ہے۔ یاقوت، لعل، پکھراج، بیرے، لعل، مرجان، فیروزے دیواروں پر جڑے ہیں عجیب پچی کاری ہے۔ جنت کا نشان اگر دنیا میں دیکھنا ہو تو اس سرمیں جا کر لامائے اعظم کا محل دیکھ لو۔ محل کے پیچھے نہریں جاری ہیں۔ دودھ اور شہد کی وہ افراط ہے کہ کہتے کو تو لے بھی نہیں پوچھتے مگر جب کرنل ٹیٹ اور جنرل ہنڈ ایلنڈ پہنچے تو کھانا بھی نصیب نہیں ہوا۔ بلی تو شاید دودھ کی مٹھوں سے ایک آدھ میں منہ ڈال لیتی مگر ہنڈ ایلنڈ کا فوجی قدمان دریا بوش میں آیا تو ایک بت صاحب بچہ پر سادھ لے کر ناشتہ ہوتے تو خیر فاقی بھگا کیا۔ دیوتاؤں کے شہر میں کھانا پانی نہ ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دیوتاؤں کو کھانے پانی سے کیا واسطہ، سنا ہے کہ ہاروں کی کوئی چیز نہ چھوئے گی نہ کسی چیز پر دوا لگے گی جیسی گئی تھی ویسی ہی واپس آئے گی۔ فوج کی ورزش مقصود تھی وہ ہو گئی اور لارڈ کرزن فاتح تبت بن گئے۔

راقم: سونے کا ورق

۶۔ رشتے داریوں کا ایک حرف

مہربانی کر کے کوئی صاحب اس کا جواب دے سکتے ہوں تو عرض کریں کہ مندرجہ ذیل رشتے داریوں میں حروف ابجد کا حرف ب پہلے کیوں آتا ہے مثلاً باپ، بابا، بھائی، بیٹا، بھانجا، بھتیجا، بہن، بہنوئی، بہو، بھاوج، بیوی ——— اور چچا چچی، خالہ خالو، ماموں ممانی، پھپھا پھپھی اس سے کیوں علیحدہ رکھے گئے؟

راقم: واہ بے

چراغ حسن
سفینہ طیبہ

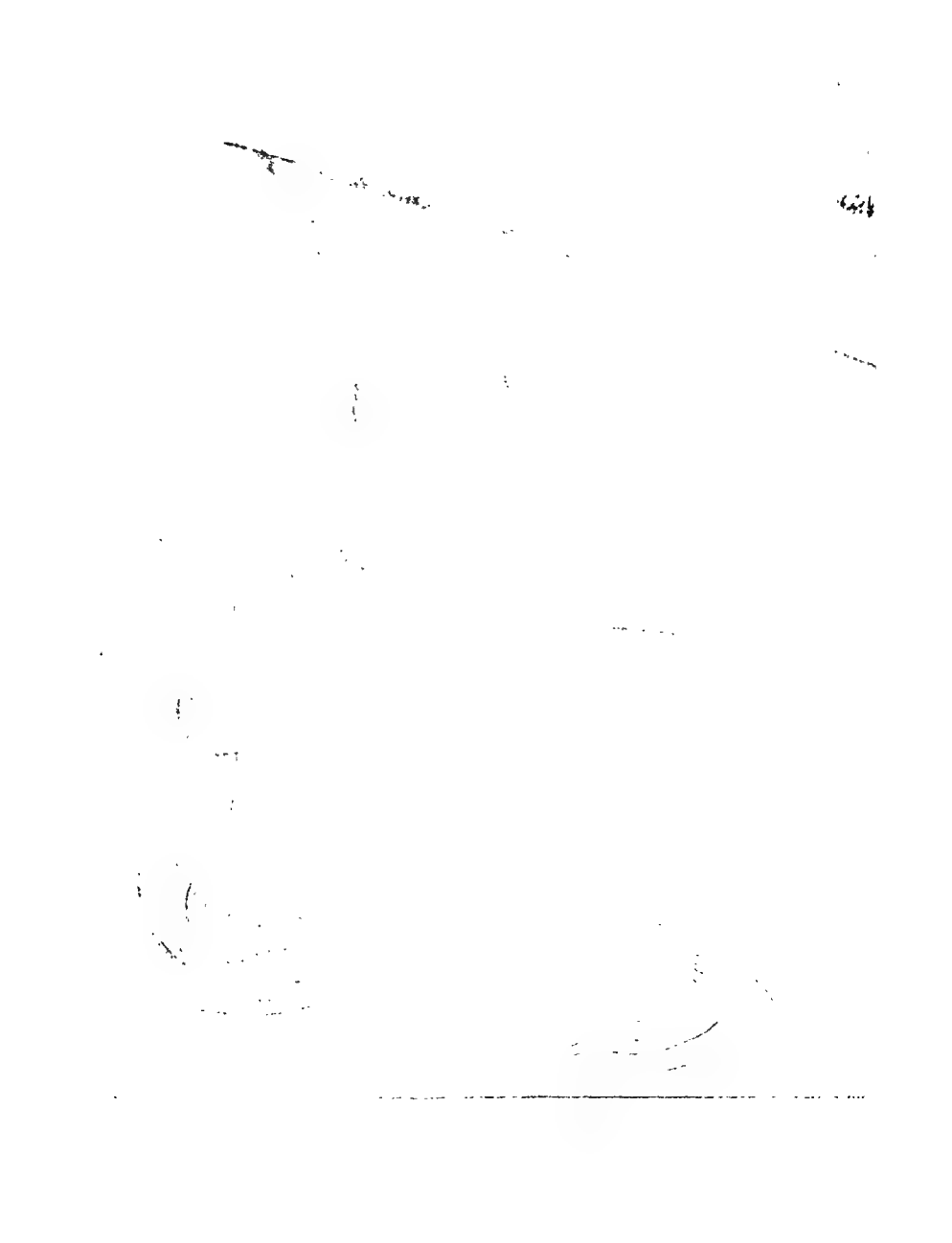

شیرازہ

یوں تو زندہ دلان لاہور نے وقتاً فوقتاً کئی ظریفانہ اخبار نکالے مگر شیرازہ خاص اہتمام سے نکلا اور اچھے حلقوں میں بہت مقبول ہوا لوگ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک ادبی اور دلکش رنگ روزنامہ اخبار تھا جو موازنا چراغ حسن حسرت نے سندباد جہازی کے فرضی نام سے دسمبر ۱۹۳۶ء میں لاہور سے جاری کیا تھا حسرت ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ اخبار نویس بھی تھے اور واجبی نثر بھی۔ وہ سہج زبان لکھنے پر خاص قدرت رکھتے تھے۔ ان کا انداز تحریر بیحد شگفتہ رنگین اور دلچسپ ہوتا تھا۔ ادبی صحافتی زندگی کا آغاز کلکتہ سے ہوا جہاں وہ عبدالباری دینا جموری، استقلال اور پیغام میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور کچھ عرصہ وکیل کے فرضی ناموں سے فکاہی کالم لکھے جن کی شہرت اتنی تھی کہ لاہور کھینچ لائی جہاں وہ پہلے زمیندار میں اس کے بعد پھول اور تہذیب نسواں میں احسان، زمیندار، احسان، شہباز، نیشنل کانگرس، فوجی اخبار، امروز اور نوائے وقت وغیرہ روزناموں کے اداروں سے منسلک رہے اور مزاح نویسی میں خوب نام پیدا کیا۔

شیرازہ بہت جلد پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس میں مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب کے حوادث و افکار اور سندباد جہازی کے اشارات فاضل کے کارٹون ہوتے تھے۔ اس نے اپنے گرد و پیش بہت اچھے لکھنے والے جمع کئے جن میں حفیظ ہوشیارپوری، محمود نظامی، شفیق جالندھری، میراجی، عطاء اللہ سجاد، محمد فاضل کرسن چندر، کنہیالال کپور، محمد ندیم قاسمی، ہری علیگ، حاجی لق لق، ضمیر جعفری، عاشق محمد غوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چراغ حسن حسرت کی کتب مطالعات (جعفریہ پنجاب جدید) کا سلسلہ بھی پہلے پہل اسی میں شروع ہوا جس میں انھوں نے اپنے زمانے میں پنجاب کی بعض مشہور سیاسی شخصیتوں اور عورتوں کا خاکہ اڑایا ہے۔ سیاسی شخصیتوں کی بڑھاہر حنید اور اہم، نذیر لیلپوری کے بعض چھپے ہوئے مضحکہ پہلوؤں کو نمایاں کر کے دکھانے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔

اس سلسلے میں ان کے سمت مضامین بھی شیرازہ میں چھپے تھے مرد مم دیدہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کیلے کا چھلکا، دو ڈاکٹر اور اقبال نامہ بھی اسی پرچے کی یادگاریں ہیں۔

جدید جغرافیہ پنجاب (تیسرا باب)

پہاڑ۔ دریا۔ نہریں وغیرہ

سندباد جہازی

پنجاب کی قدرتی تقسیم کے تذکرہ میں ہم مختصر طور پر پنجاب کے بڑے بڑے کوہستانی سلسلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جسے صفحۂ سکندری کہتے ہیں اتحادی سطح مرتفع میں پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں یہاں آخال تکہ سکندری واقع ہے وہاں زمانہ قبل از تاریخ میں بہ طرف بحر میدان اور بحیرستان پھیلے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں میلوں تک روئیدگی کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ پھر زمین کے مدوجزر طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پہاڑوں کے ایک عظیم الشان سلسلہ نے اس کی جگہ لے لی۔ ماہرین علم طبقات الارض کا خیال ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ کوہستانی سلسلہ پھر غائب ہو جائے گا اور جہاں آج یہ پہاڑ کھڑے ہیں وہاں کف دست میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن بعض اتحادی محققین اس کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سدِ سکندری سنگ خارا کی چٹانوں کا مستحکم پہاڑ ہے جسے زمین کے اندرونی قوتیں لاکھوں برس تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں۔ سدِ سکندری کی سب سے اونچی چوٹی سکندر ماؤنٹ ہے جو اس سلسلہ کوہ کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ اس پر ہمیشہ برف بھی رہتی ہے جو دور دور سے نظر آتی ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اس کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ہیں جن کے برفانی غلاف دور سے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے ان چوٹیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خیال عام ہے کہ اگر خدانخواستہ ان پہاڑوں پر برف نہ رہے تو پنجاب کے دیہات خشک سالی کی وجہ سے ویران ہو جائیں۔

ہر مذہب و ملت کے لوگ سکندر ماؤنٹ پہ جانا حق جانتے ہیں۔ چنانچہ ہر سال ہو کار کہتے ہیں کہ کیلاش پربت کی طرح یہ پہاڑ بھی مقدس ہے کیونکہ یہاں بدھ تک شری ساعد کر نے گیا تھا اور شری گاندھی جی مہاراج بھی اسے اشیرواد دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب مچھیوں نے اسے اپنر شٹ کر دیا ہے۔

منوہر پربت

یہ چوٹی اتحادی سطح مرتفع کے حصہ میں ہندو بھا کی ترائی کے پاس واقع ہے۔ یہ بالکل اکیلا پہاڑ ہے اور اس کے صرف بعض حصوں میں تھوڑی تھوڑی زیر روئیدگی پائی جاتی ہے۔ اسے لاکھی پربت بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے دامن میں اگلے وقتوں کے خزانے

دفن ہیں۔ نیچے ساہوکار کہتے ہیں کہ بوہنی کے وقت منوہر پرت کا نام لیا جائے تو بیوپار میں بڑا نفع ہوتا ہے۔

کوہِ خضر

کسی وقت جب آسمان صاف ہو سکندر مونٹ پر نظر ڈالو تمھیں اس سے کسی قدر دیر روپ کی طرف ہٹ کے ایک اور چوٹی نظر آنے لگی جس کے برفانی عمامہ کے ساتھ ساتھ سیاہی سی دکھائی دیتی ہے۔ اس برفانی چوٹی کو کوہِ خضر کہتے ہیں اور اس کے پاس جو سیاہی نظر آتی ہے وہ اصل میں جنگلات ہیں۔ اگرچہ اونچائی میں یہ سکندر مونٹ سے چھوٹی ہے مگر اس کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور بڑے بڑے کوہ پیما اس کا بھید نہیں پا سکے۔

مجیٹھہ پہاڑ

سدِ سکندری کی یہ اونچی چوٹی اکالی جنگلات کے سر پہ کھڑی سنتری کی طرح پہرہ دے رہی ہے۔ سندر بن کا مشہور جنگل اس چوٹی پر واقع ہے۔ اس پر برف بھی پڑتی ہے مگر زیادہ دیر نہیں رہتی۔ اس کی ڈھلوانوں پر کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے۔

میاں کا ٹیلا

یہ چوٹی بہت نیچی ہے۔ اس لیے اس تک پہنچنا آسان ہے۔ پنانچہ کالجوں اور اسکولوں کے کھلنڈرے کئی مرتبہ اس تک پہنچ چکے ہیں۔ پھر بھی ہر انسان کا کام نہیں کہ اس پر قدم رکھ سکے کیونکہ جو لوگ یہاں تک پہنچتے ہیں وہ لوٹتے وقت راستہ بھول جاتے ہیں۔ اس پر برف کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خشک گھاٹیاں اور خوفناک چٹانیں بڑے غرور سے سر اٹھائے کھڑی ہیں جنھیں دیکھ کر انسان کو آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ پھر بھی جن لوگوں کو معلومات بڑھانے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کا شوق ہے وہ جوں توں کر کے یہاں جا ہی پہنچتے ہیں۔

کوہِ چھوٹو رام

یہ پہاڑ اگرچہ سدِ سکندری سے بہت دور مشرق کی طرف ہٹ کے واقع ہے اور بظاہر اتحادی سلسلۂ کوہ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے تاہم جغرافیہ کے عالموں کا خیال ہے کہ کوہِ چھوٹو رام اصل میں ستو سکندری کی ہی شاخ ہے کیونکہ نباتی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے یہ اتحادی سلسلۂ کوہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کہتے ہیں اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک کے وہ نظر آتے ہیں۔

اتحادی سلسلۂ کوہ کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے بڑے پہاڑ ہیں۔ ذیل میں مختصر طور پہ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کوہِ شہاب الدین

سدِ سکندری کی مشرق کی جانب یہ عظیم الشان پہاڑ کھڑا ہے۔ اس میں گندھک کی کانیں کثرت سے ہیں اس لیے اس کی رنگت

سیاہی مائل ہے۔ اس کے بعض حصوں میں تھوڑی سی زیر و زبر بھی پائی جاتی ہے لیکن اکثر حصے بالکل لاٹھ سے نظر آتے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس پہاڑ سے کبھی لاوہ کا سیلاب نکلے گا جو اتحادی سطح مرتفع کو بھاگ کر بھسم کر دے گا لیکن جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی اندرونی حرارت ختم ہو چکی ہے اور اب اتحادی سطح مرتفع کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔

کوہ مدوٹ

مشہور پہاڑ ہے جو اتحادی سطح مرتفع سے وادی لیگ تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پہاڑ میں سونے کی کانیں ہیں چنانچہ جو برساتی نالے اس سے بہ نکلتے ہیں ان کے ریت میں سونے کے ذرات پائے جاتے ہیں۔ اس پہاڑ کی پیداوار سے اتحادی سطح مرتفع اور وادی لیگ دونوں کے باشندے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

منظفر کوہ

یہ بھی تودہ برفانی پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں سید سکندری سے ملا ہوا تھا لیکن بعد کے ارضیاتی تغیروں نے سید سکندری کو آہستہ آہستہ کاٹ کر مظفر کوہ سے الگ کر دیا۔ اگرچہ یہ پہاڑ اتحادی سطح مرتفع میں شامل ہے لیکن اس میں اور سید سکندری میں کئی دریا اور وہاں حائل ہیں اور یہ سید سکندری سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتا ہے۔

اشترا کی جوالا مکھی

آتش فشاں پہاڑوں کا مشہور سلسلہ ہے۔ کبھی اس سے برابر کئی کئی ہفتے تک آگ کے شعلے بلند ہوتے رہتے ہیں اور کبھی مدت تک افسردگی چھائی رہتی ہے۔

کانگچنجنگا سلسلۂ کوہ

اس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ سنتر پڑا اور بھار کو پربت۔ ان دونوں کا ذکر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر چکے ہیں۔

درّے

درّہ دولتانہ

سید سکندری کا مشہور درّہ ہے جو دولتانہ جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے اسی درّہ میں واقع ہے۔ بہت کشادہ درّہ ہے اس لیے اسے اتحادی سطح مرتفع اور دوسرے علاقوں کے درمیان آمد و رفت اور رسل و رسائل کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس درّہ سے ہر سو میں بکثرت قافلے اشیاء کے انبار اور سینما کے ظرف گزرتے نظر آتے ہیں۔ سید سکندری اور کوہ شہاب الدین کے درمیان بھی یہی درّہ واقع بنا ہوا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر محققوں کا خیال تھا کہ درّہ دولتانہ دراصل کوہ شہاب الدین میں واقع ہے لیکن جدید تحقیق سے اس بات کی

یہ درہ مری سے مسلم لیگ کی وادی اس درے کے قریب سے شروع ہوتی ہے۔

درہ میر

یہ بھی سرحد سکندری کا مقبول عام درہ ہے۔ بہت سا مال تجارت جو دریا سوات کو جاتا ہے اسی درہ کے راستہ سے گذرتا ہے۔ پنجاب کی پلٹنوں کے جو کارواں جاتے ہیں ان کا راستہ بھی یہی ہے۔

درۂ جہان یا درۂ شاہنواز

سرحد سکندری کا مشہور درہ ہے جو سیاں کے ٹیلے میں درہ میر کے عین بالمقابل واقع ہے۔

درۂ خضفر

ایک نیچا درہ ہے جس کے دونوں طرف پرہیبت اور سنگلاخ چٹانیں کھڑی ہوئی گئی ہیں۔ یہ درہ بہت پرپیچ ہے اور درہ دیکھنے سے دادی لیگ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے لیکن قریب جاؤ تو وادی لیگ سے بہت دور سرحد سکندری کی چٹانوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔

آبل ڈنڈی

یہ درہ مجیٹھہ پہاڑیں واقع ہے۔ اکالی جنگلات اور سندر بن کی بہت سی پیداوار اسی درہ کے راستے باہر بھیجی جاتی ہے۔ یہ درہ اونچے اونچے اور گنجان درختوں سے گھرا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے درے ہیں جن کا حال بڑی بڑی کتابوں میں لکھا ہے۔ بھارگو پربت اور سنت پڑاہیں بھی بہت سے چھوٹے بڑے درے ہیں جن میں زیادہ آمد و رفت تو نہیں ہوتی البتہ وہ تجارتی مقاصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

جھیلیں

آبل دوتا:

یہ نیلے پانی کی بہت بڑی جھیل ہے۔ یہ کوہ شہاب الدین اور سرحد سکندری کے درمیان واقع ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اب آہستہ آہستہ اس کا پانی کھارا ہوتا جاتا ہے۔ بظاہر اس کی سطح بالکل ساکن نظر آتی ہے اور اس کے نیلگوں پانی پر مرغابیاں اور دوسرے آبی پرندے تیرتے پھرتے ہیں لیکن یہ جھیل بہت گہری ہے اور جھیل ولر کی طرح اس میں کشتی رانی بہت خطرناک ہے چنانچہ ہر سال اس میں بہت سی کشتیاں اور ڈونگے غرق ہو جاتے ہیں۔

دریا

دریائے ظفر علی خان

پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے جو ہمیشہ اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس دریا کی ہولناک موجیں ایک طرف ستھ سکندری سے جا ٹکراتی تھیں اور دوسری طرف قادیان کے ٹیلوں تک جا پہنچتی تھیں اور جب اس میں طغیانی آتی تھی تو اتحادی سطح مرتفع کے باشندے الامان والحفیظ پکارتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں جا چھپتے تھے۔ لیکن اب اتحادی انجینیروں نے اس کے دونوں کناروں پر مضبوط بند باندھ دیا ہے اور اس پر ماہ کے کنٹ سے ایک عظیم الشان پل تعمیر کیا ہے جسے عہد جدید کی انجینیری کا عظیم الشان کارنامہ کہنا چاہیے۔ پہلے اس سے آبپاشی بالکل نہیں ہو سکتی تھی لیکن اب اس سے اتحادی سطح مرتفع کی اراضی کو سیراب کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ اس میں اکثر مقامات پر نظر ناک چھانیں ہیں۔ کئی جگہ آبشار بھی ہیں اس لیے اس میں زیادہ دور تک جہاز رانی نہیں ہو سکتی۔

کسی کو یقین نہیں کہ دریائے ظفر علی خان ہمیشہ اس حالت میں رہے گا۔ کیا عجب اس میں پھر کبھی بڑے زور کی طغیانی آئے اور اس کی موجیں بند اور پل کو بہا کر لے جائیں۔ ابھی چند سال ہوئے اس دریا میں بڑا زبردست سیلاب آیا تھا جس نے اتحادی کا ہستان کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ دریائے ظفر علی خان پہلے ستھ سکندری سے ٹکراتا، ملاوی ٹیگ سے پہلو بچاتا بیجوڑا کانگریس میں ڈیلٹا بنا کے گرتا تھا اب اتحادی سطح مرتفع اور ملاوی ٹیگ کو سیراب کرتا ہوا بحیرۂ ٹیگ میں جا گرتا ہے۔

دریائے ظفر علی خان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دریا اور ندی نالے آ ملتے ہیں جن میں دریائے اختر علی خان بہت مشہور ہے۔ یہ دریا اصل میں دریائے ظفر علی خان کی ہی ایک شاخ ہے جو کرم آباد سے کچھ دور آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان سے الگ ہو جاتا ہے اور بیدانی علاقے میں بڑے زور سے بہتا ہوا سکندر رمونٹ کے مقام پر پھر دریائے ظفر علی خان سے آ ملتا ہے۔ یہ دریا اپنے ساتھ بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکندر رمونٹ سے آگے بڑھ کر دریائے ظفر علی خان کا پانی بہت گدلا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ندی نالے مٹی بہا کے لاتے ہیں اور دریائے ظفر علی خان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ اگر عمل اسی طرح جاری رہا تو دریائے ظفر علی خان ایک دن ایک وسیع دلدل بن کے رہ جائے گا۔ ان دونوں دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اسے دوآبہ زمینہار کہتے ہیں۔

دریائے سالک و دریائے مہر

یہ دونوں دریا پہلے دریائے ظفر علی خان کے معاون تھے لیکن ۱۹۲۷ء میں ایک زلزلہ آیا تھا جس نے ان کی گذرگاہ تبدیل کر دی۔ دریائے سالک کا پاٹ زیادہ ہے اور دریائے مہر اگرچہ عرض میں اس سے کم ہے لیکن زیادہ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ لمبائی میں بھی اس سے زیادہ ہے۔ ان دونوں دریاؤں میں نہ کہیں چٹانیں ہیں نہ آبشار، دونوں خاموشی سے اپنے مقررہ راستہ پر بہتے چلے

لہ بھرا اگر بھر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔

جاتے ہیں لیکن تنہا بھرا ادھر اُدھر نہیں ہوتے۔ دریائے سالک میں سارا سارا سال کشتیاں چلتی رہتی ہیں اور لوگ خوشی لگاتے اور موتی نکال لاتے ہیں۔ لیکن اکثر غوطہ خوروں اور شناوروں کو دریائے قہر کی طرف رُخ کرنے کی کبھی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں دریا بہتے ہوئے سکندر پوائنٹ کے قریب آپس میں مل جاتے ہیں اور دریائے انقلاب کہلاتے ہیں۔ ان کے درمیان جو سرسبز اور زرخیز علاقہ ہے اسے دوآبہ مہر ساگر یا دوآبہ مہر سالک کہتے ہیں۔ اکثر لوگ اس دوآبہ کو دوآبۂ انقلاب بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں دریا انتہائی جنوبی مرتفع کے شمالی حصہ سے نکلتے ہیں اور ریلوے انجینئر کے قریب جا کر ملتے ہیں۔

دریائے نورا

چشمۂ نور سے جو کشمیری بازار سے شمال کی جانب واقع ہے نکلتا ہے۔ یہاں کے ٹیلے کے پاس سے گذرتا ہوا مٹی کے ساتھ ساتھ کی روڈ، نورنامہ کلاں، قصہ شاہ بہرام اور بہت سی چھوٹی بڑی وری کناہیں بہا لاتا ہے۔ کہتے ہیں سکندریہ کا کتب خانہ اسی دریا میں غرق ہوا تھا۔ یہ دریا کچھ ایسا گدلا ہے کہ نہیں لیکن کتابوں کی گھلی ہوئی سیاہی کے باعث اس کا پانی بہت تاریک نظر آتا ہے اور اکثر لوگ غلطی سے اسے بہت گہرا سمجھ لیتے ہیں۔ پہلے اس میں جہاز چلا کرتے تھے لیکن اب صرف اسکولوں کے طالب علم اور مدرس کبھی کبھی کتابوں کی تلاش میں اس کے تاریک سینہ پر کشتیاں اور ڈونگے دوڑاتے نظر آجاتے ہیں۔ اس دریا میں مچھلیاں نہیں ہوتیں، صرف کتابیں ملتی ہیں اس لیے بیچارے مدرس اسے اللہ کا بہت بڑا انعام اور احسان سمجھتے ہیں اور اس کے طاس کو احسان کہتے ہیں۔ بہت چھوٹا دریا ہے۔ جتنا لمبا ہے اتنا ہی چوڑا بھی ہے۔ پہلے علیج لیگ میں گرتا تھا، اب اس علیج سے کچھ دور شمال کی جانب صحرائے کالاری کے ریت میں غائب ہو جاتا ہے۔ علمائے جغرافیہ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ اسے دریا کہنا چاہیے یا جھیل۔

دریائے کرشنا

ہندو سبھا کی ترائی سے مین شمال کی طرف آریہ سماج کی گھاٹیاں ہیں جن سے دریائے کرشنا نکلتا ہے۔ یہ دریا کچھ دور تک بھارگو پربت اور ست پٹا کے درمیان میں سے ہو کر پتھروں سے سر ٹکراتا شور مچاتا گذرتا ہے۔ یہاں اس کا پاٹ بہت کم اور گہرائی بہت زیادہ ہے۔ اس کوہستانی علاقے سے نکل کر جب یہ میدانی علاقے میں پہنچتا ہے تو اس کا پاٹ زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا بہت بڑا دریا ہے اور ان پانچ دریاؤں میں سے ہے جن کی وجہ سے اس صوبے کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یہ ہندو سبھا کی ترائی کے ساتھ ساتھ کانگریس کے کوہستانی علاقوں کو بھی سیراب کرتا ہے لیکن اس کے بالائی حصہ میں پٹانیں کثرت سے ہیں اس لیے یہاں جہازرانی نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس کا زیریں حصہ جہازرانی کے لیے بہت موزوں ہے۔ دریائے کرشنا کا طاس بہت زرخیز ہے اس کے بالائی حصہ کو پرکاش اور زیریں حصہ کو

لہ فردوسی نے محمود غزنوی کے متعلق کہا تھا ؎

نجستہ در گہ محمود نابلی دریاست — چہ گونہ دریا کہ آں را کرانہ پیدا نیست
چہ خوطہا زدم و اندریں ندیدم دُر — گناہ قسمت ما بود گناہ دریا نیست

پتاب کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ دریا بہت مقدس ہے چنانچہ دور دور سے لوگ اس میں اشنان کرنے آتے ہیں اور اس کا پانی بوتلوں میں بند کر کے لے جاتے ہیں۔ اس میں بہت چھوٹے چھوٹے دریا اور ندیاں آملتی ہیں۔

وینہ رندی، اس دریا کی ایک مشہور شاخ کا نام ہے۔ یہ ندی بہت سبک خرام ہے اور سرو، صنوبر و چیڑ کے سرسبز پیڑوں پر اونچے ٹیلوں پر بہتی گیت گاتی چلی جاتی ہے۔ اس کا پانی بہت شیریں اور ٹھنڈا ہے اور اس کے کنارے کافی دور تک سبزہ زار پھیلتا چلا گیا ہے۔ پہلے اکثر شوقین لوگ صبح و شام وینہ رندی کے کنارے آکر اس سبزہ زار اور آب رواں کا لطف اٹھاتے، چہچہاتے اڑتے ہوئے پرندوں کا نظارہ کرتے تھے۔ لیکن اب اس کے کنارے خاردار جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ہیں اور خاص خاص لوگوں کے سوا کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں دریائے کرشنا جنوب کی طرف بہہ کر خلیج بنگال میں گرتا ہے۔

دریائے خورسند

یہ دریا آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر کچھ دور دریائے کرشنا کے متوازی بہتا ہے۔ کانگریسی سلسلہ کوہ کے قریب پہنچ کر یہ بھاگیرتھی اور ست پڑا دونوں سے پہلو بچاتا ہوا دریائے پرمانند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی نرائی کو زرخیز بنانے میں اس دریا کا بڑا حصہ ہے۔ مسول نازبانی کے برسم میں جب اونچے پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور ہمستانی ندی نالے بہہ نکلتے ہیں تو اس دریا میں طغیانی آجاتی ہے اور اس کی موجیں کانگری کوہستان کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اس کا پاٹ اچھا خاصا ہے لیکن زیادہ گہرا نہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک اس دریا کو بھی تقدس حاصل ہے۔ اس دریا کے طاس کے بھی رقبے ہیں۔ بالائی رقبے کو آریہ گزٹ، اور زیریں رقبے کو ملاپ کہتے ہیں۔ اس میں ہمیشہ جہاز رانی ہوتی رہتی ہے۔ یہ دریا جنوب کی طرف بہتا ہوا خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔

دریائے پرمانند

آریہ سماج کی گھاٹیوں سے نکل کر اکالی سنگلات کے پاس سے بہتا ہوا مغرب کی طرف ہو لیتا ہے اور دریائے خورسند کے متوازی بہنے لگتا ہے۔ ہندو سبھا کی نرائی میں یہ دریا کچھ اس زور سے بہتا ہے کہ آس پاس کی زمین کو زیر آب کر دیتا ہے چنانچہ اس عمل کی وجہ سے اس علاقے میں جا بجا وسیع دلدلیں پیدا ہو گئی ہیں جہاں مچھر بڑی کثرت سے پرورش پاتے اور ہندو فیور پھیلاتے ہیں یہ بہت ہی خطرناک قسم کا بخار ہے جس نے پنجاب میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔

دریائے پرمانند کے دونوں کناروں پر بہت دور تک چٹیل پہاڑیوں اور دہشت ناک بیابانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ان پہاڑیوں پر جو تھوڑی بہت زراعت ہوتی ہے مفوق کی برسات میں مینہ کا پانی اسے بہالے جاتا ہے۔ اس عمل کو آب بردی یا پن کٹ (EROSION) کہتے ہیں۔ پنجاب کی زرخیزی کو پن کٹ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ نارنگ سر اور زیریں رنگ جو مشہور گرم چشمے ہیں اسی دریا کے کنارے واقع ہیں۔

کہتے ہیں زمانۂ قبل تاریخ میں دریائے پرمانند کانگریسی سلسلہ کوہ میں سے بہتا ہوا کالے پانی میں جا گرتا تھا۔ پھر کچھ ایسے انقلابات ہوئے کہ یہ ہندو سبھا کی نرائی میں سے بہتا ہوا خلیج سرکار کے گدلے پانی میں جا گرنے لگا۔ اس دریا کے طاس کو ہندو کہتے ہیں۔

دریائے حبیب

اس دریا کا منبع ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جغرافیہ والوں کا خیال ہے کہ سدِ سکندری اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے بعض نامعلوم حصوں کی تحقیق کرنے کے لیے جو مہمیں بھیجی جاری ہیں انھیں اگر اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو دریائے حبیب کا منبع بھی معلوم ہو جائے گا۔ کسی زمانے میں یہ دریا مسلم لیگ کی وادی کو سیراب کرتا تھا لیکن اب اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے اور اخباری کاہستان اور کانگرسی سلسلہ کوہ کے درمیان بہتا ہے۔ بٹالین دریا ہے خصوصاً جب یہ سکندر مونٹ کی مہیب[1] چٹانوں سے ٹکراتا اور آبشار بناتا ہوا بہتا ہے تو بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اس میں جگہ جگہ گرداب پڑتے ہیں۔ اس کی موجیں کف آلود نظر آتی ہیں۔ میدانی علاقے میں بھی پہنچ کر اس کی تیزی میں فرق نہیں آتا اور یہ اپنے زور میں کنارے کے علاقے سے بہت سی مٹی بہا لاتا ہے۔ اس کے دہانے کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ بحیرۂ کانگرس میں یا اس کے قریب کے کسی سمندر میں گرتا ہے لیکن ابھی تک یہ بات تحقیق طلب ہے۔

دریائے ویرا

روایت ہے کہ یہ دریا شری سوامی گنیش دت جی مہاراج کی جٹا سے نکلتا ہے اور بھارت ورش کے سناتن دھرمی نساری کو پوتر بناتا ہے اس لیے پرانے خیال کے ہندو اس دریا کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ کسی زمانے میں ست پڑا کے ساتھ ساتھ بہتا تھا اب بھارگو پربت کے پاس سے گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ریت میں سونے چاندی کے ذرات ملتے ہیں۔ ہندوؤں کے دوسرے مقدس دریاؤں کی طرح یہ بھی غیر زراعت پیشہ دریا ہے یعنی اس کے کنارے زراعت کے بجائے صرف نئی بیوپار ہوتا ہے۔

دریائے مرتضیٰ[2]

پہلے ترکی میں بہتا تھا۔ پھر افغانستان میں بہنے لگا۔ اب مستقل طور پر ہندوستان آگیا ہے۔ اس دریا اور اس کے معاون دریاؤں نے کسی زمانے میں وہ زرخیز علاقہ بنایا تھا جسے احسان کہتے ہیں۔ اب اس دریا کا طاس شاہباز کہلاتا ہے۔ چڑیا راس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔ دریائے مرتضیٰ خلیج لیگ میں گرتا ہے۔

کانگرسی ندی نالے

بھارگو پربت اور ست پڑا سے بھی برسات کے موسم میں اکثر ندی نالے نکلتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی ندیوں میں نیشنل کانگرس ندی

---

[1] سلیمان ساوجی نے دجلہ کی روانی دیکھ کر کہا تھا ؎

دجلہ را اسال رفتارے عجب مستانہ ایست — پائے در زنجیر کف برلب مگر دیوانہ ایست

یہ شعر دریائے حبیب پر بھی صادق آتا ہے۔

[2] دریائے مرتضیٰ ترکی کا مشہور دریا ہے۔ اس کے کنارے ترکوں نے یونانیوں کو زبردست شکست دی تھی۔

بہت مشہور ہے بوست پٹا سے ایک زمانے میں یہ نکلتی تھی۔ یہ گدلے پانی کی ایک لمبی ندی تھی جس میں بہت سی نالیوں اور موریوں کا پانی بھی آملتا تھا۔ بہرحال یہ صرف برساتی ندی تھی اور اب خشک پڑی ہے۔

پارس ندی بھی بوست پٹا سے نکلتی ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی ندی ہے لیکن اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف و شفاف ہوتا ہے۔

دریائے سول

جسے دریائے ابیض اور عام لوگوں کی بولی میں گورا دریا بھی کہتے ہیں۔ شمال کے ایک نامعلوم خطے سے نکلتا ہے اور جنوب کی طرف تیزی سے بہتا ہوا لیلیٰ سرکار میں جا نکلتا ہے۔ اس کی سطح بظاہر ہموار معلوم ہوتی ہے۔ پانی صاف و شفاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے گورا دریا کہتے ہیں لیکن اس کے اندر بہت سی خوفناک چٹانیں ہیں۔ پہلے قواس کا پانی بہت میٹھا معلوم ہوتا تھا لیکن اب اس کی رنگت کسی قدر سیاہی مائل ہوتی جاتی ہے۔ برسات نے اس کے بالائی حصے سے ایک نہر نکالی ہے جسے جوئے نو یا نہر پرسول کہتے ہیں۔ اس نہر کے پانی کی کثیر مقدار کو خاص آب میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ نور دریا نور ہیڈ بھی اصل میں اسی نہر کی فیاضی کا کرشمہ ہے جس کے پانی سے پنجاب کا بہت علاقہ سیراب ہوتا ہے۔ جو دریا خشک ہونے لگتے ہیں انھیں بھی اسی ذخیرہ آب سے پانی مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ نہر اصل میں پانی کے لیے صرف سول کی ہی مرہون منت نہیں بلکہ جھیل دوقانہ سے جو سرکاری ندی نالے یہ نکلتے ہیں۔ ان کا پانی بھی اسی میں آملتا ہے اور سرکاری مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دریائے سول بدیسی دیس میں بدیسی گیت گاتا ہوا بہتا ہے اور دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اس دریا کی بہار دیکھنا ہو تو سکند برونٹ پر کھڑے ہو کر دیکھیے۔

دریائے کالی

ہندو مہاسبھا کی پہاڑیوں سے کچھ آگے ایک بہت بڑا چشمہ ہے جسے "کالی ناگ" کہتے ہیں۔ یہ دریا اسی چشمے سے نکلتا اور ہندو سبھا کی نمائی اور کانگریسی سلسلہ کوہستان سے ٹٹی اور سنگریزے بہا لاتا ہے۔ یہ دریا نہ بہت تیز رفتار ہے نہ زیادہ آہستہ خرام۔ تاہم وسیع ہے کہ اور کچھ معلوم نہ ہو تو اس کا پاٹ اتنا چھوٹا ہے کہ تھوڑے سے خرچ میں پل بن سکے۔ نہ اتنا زیادہ گہرا ہے کہ تہ کا کچھ حال معلوم نہ ہو، نہ اتنا کم گہرا کہ جہاز بھی نہ چل سکیں۔ طغیانی کے زمانے میں آس پاس کے علاقہ کو اس طرح زیر آب نہیں کرتا کہ بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہو اور جہاں سے بیس میٹ کر اتنا چھوٹا بھی نہیں رہ جاتا کہ پایاب نظر آئے۔ غرض یہ دریا اپنی میانہ روی اور اعتدال کے لیے مشہور ہے۔ کانگریسی سلسلہ کوہ اور ہندو سبھا کی تراوی دروں کے باشندے اس پر اپنا حق جتاتے ہیں مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دریا کس علاقہ کے زیادہ رقبہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا گیت دیسی ہے مگر گیت کی دھن بدیسی۔ اس کا طاس جسے "ٹریبیوٹن" کہتے ہیں بہت زرخیز ہے۔

دریاؤں کے سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پنجاب کے دریاؤں سے کام لینے کے لیے اب جگہ جگہ بند باندھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بند دریائے ظفر علی خان میں باندھے گئے ہیں۔ کیونکہ طغیانی کے زمانہ میں یہ دریا بہت خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ لیکن جب سے اس دریا کے بندوں میں سیمنٹ استعمال کیا گیا ہے اس سے زیادہ خطرہ نہیں رہا۔

سوالات

۱۔ بتاؤ کرہ شہاب ثاقب میں کی اندرونی حرارت کیوں ختم ہو گئی ہے؟
۲۔ سکندر سونٹ اور مظفر کرہ کا مقابلہ کرو۔
۳۔ بتاؤ کرہ چھر ڈرام پر کھڑے ہو کر ایک سے دو کیوں نظر آتے ہیں؟
۴۔ حاتم طائی کے قصے میں اگر تم نے کوہ ندا کا حال پڑھا ہے تو بتاؤ کہ کیا یہاں کے ٹیلے کو کوہ ندا کہنا صحیح ہے؟
۵۔ بتاؤ دریائے ظفر علی خاں آخر کہاں سے نکلتا ہے اور کہاں گرتا ہے؟
۶۔ بتاؤ وہ کون کون سے آلات ہیں جن سے دریائے تمر کی گہرائی ناپی جا سکتی ہے۔ کیا تم ہاتھ سے اس دریا کی گہرائی معلوم کر سکتے ہو؟
۷۔ دریائے نور کا کون کون سی کتابیں پہالاتا ہے؟
۸۔ کیا تم نے کبھی وریہ، رندی دیکھی ہے؟ اگر دیکھی ہے تو اس کے متعلق اپنے تجربات بیان کرو۔
۹۔ ہند و ظہیر کہاں کہاں ہوتا ہے اور گورا پانی کسے کہتے ہیں؟

منکہ ایک .....

خاندانی معتبر نائی ہوں،

عبدالمجید سالک

جہاناں! میں ایک معتبر نائی ہوں، میرے دادا بادشاہی نائی تھے۔ کنور نونہال سنگھ کی شادی شام سنگھ اٹاری والے کے ہاں میرے ہی دادا نے کرائی تھی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ سنا ہے کہ جب میرے دادا اٹاری سے شاد بامراد ہو کر واپس لوٹے ہیں تو مہاراج ان کی پیشوائی کے لیے قلعہ کے حضوری دروازے تک چل کر آئے تھے۔ اور دادا پر انعام و اکرام کا وہ مینہ برسایا تھا کہ کھاتے کھاتے تین پشتیں گذر گئیں اور اب بھی مولا کی مہربانی سے بیس بیگھہ زمین کا مالک ہوں۔ کھانے پینے کی کمی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے گذران اچھی ہے۔ لیکن دکھتا ہوں کہ میرے بعد یہ خاندانی معتبری چلتی نظر نہیں آتی۔ زمانہ کا رنگ بدل گیا۔ طور طریقے بدل گئے۔ پرانے زمانے کے بھانوں کی یاد آتی ہے تو کلیجے پر اُسترا چل جاتا ہے، زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ یار دوست سمجھاتے ہیں میاں ہوش کے ناخن لو۔ تم کس چکر میں پڑ گئے۔ جس طرح زمانے نے پرانے طریقوں کر موڈھ کے صفا چٹ کر دیا۔ اسی طرح آج کل کے فیشن بھی صاف ہو جائیں گے لیکن جہاناں! ذرا یہ اندھیر تو دیکھو کہ ہم لوگوں کا کوئی کام بھی ہمارے ہاتھ میں نہ رہا، ہمارے زمانے میں حجامت بناتے تھے تو نائی کہتے تھے تو نائی زخموں پر مرہم لگاتے تھے۔ تو نائی پھنسیاں اور سینگی لگاتے تھے تو نائی، شادی بیاہ میں کھانا پکاتے تھے تو نائی اور برکے لیے کنیا اور کنیا کے لیے بر ڈھونڈتے تھے تو نائی، لیکن آج کل یہ کیا قیامت آئی کہ ہم لوگوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اور کل کے لونڈے چھابڑیاں میں مگروں کی ڈالڈا مال مونڈ مونڈ کر اپنے آپ کو نائی کہتے ہیں اور چار چار آنے جوڑ لیتے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دھڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی ہم لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ فقہ موچی سے، اللہ بخشے بڑا کاریگر تھا، خاص کر کسوت بنانے میں تو سنا ہے ولایت تک مشہور تھا۔ اس سے کسوت سلوالی اور جب وہ لایا تو اللہ دین تیلی کے ہاں دے آئے۔ اس نے پندرہ پندرہ دن کڑوے تیل میں ڈبو کر رکھی۔ اس کے بعد اللہ تمہارا بھلا کرے، ایسے پونچھ پانچھ کے صاف کیا، چار استرے دو قینچیاں، ایک نہیرنا، ایک مہندی دھمہ لگانے کی کھُرپی اور ایک کٹوری، یہ سب چیزیں پاس میں رکھیں اور سالہا سال کے لیے بے فکر ہو گئے۔ اب جو تم دیکھو تو آج کے نائی کینچی۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ ماں ڈینی باپ کلنگ ولایت کے چار چار روپلے کے استرے اور صابن اور پھٹکری اور وہ آٹھ سا جسے پوڈر کہتے ہیں لیے پھرتے ہیں، جیسے کوئی نسخہ تیار کریں گے اور پھر ایک حجامت میں پورا ایک مکمل غارت کر دیتے ہیں۔ ہاتھ کی صفائی کا نام نشان نہیں، لوگوں کا ذکر تو کیا کیجیے مجھ مرد سیاہ کا ایک واقعہ سنیے۔ فالہ جیسوتی سرن کے پتاسر گواش ہو گئے۔ بیٹوں، پوتوں اور رشتہ داروں کا ہجوم ہو گیا۔ لالہ جی نے مجھے بلا کر کہا، "علیا، جو پرتھا کی چھت تھی، وہ پرسوں ہو گئی۔ ذرا جلدی سے بھدرن کر دو، اس سے فارغ ہو جاؤں تو بیسیوں کام اور پڑے ہیں

بس میاں اللہ دے اور بندہ لے، میں نے کوراُسترا جو ہاتھ میں لیا تو پچیس آدمیوں کو آدھ گھنٹے میں مونڈ کے رکھ دیا فقط

جہاناں نے پانچ روپے چہرہ شاہی میری ہتھیلی پر رکھ دیئے اور کہا علیا تم جیسے ساہوکار تو ہزاروں ہوں گے پر تجھ جیسا نائی چار کھونٹ میں نہ

سے گا۔

اب حالت یہ ہے کہ نہ کوئی سر گھٹاتا ہے نہ پٹے رکھتا ہے نہ ڈاڑھی کا خط بناتا ہے جسے دیکھو ماتھے پر بالوں کا ایک مٹھا سا لیے پھرتا ہے اور سر کے پچھلے حصے میں صفاچٹ میدان۔ بال ہیں کہ گاؤدم۔ آگے زیادہ پیچھے کم۔ پہلے خال خال لڑکے بالے ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ اب جسے دیکھو ہر بالو ٹھا، مرنجیں مرنج چٹے کرائے بیٹھا ہے جیسے ابھی باپ مرا ہے۔ نا صاحب ہم سے تو ایسی جماتیں نہیں نہ بھلا آباد رکھے اپنے سرا لیوں اور چودھریوں کو جو پرانی وضع نباہے جا رہے ہیں۔ اور ای کے ساتھ ہماری بھی نبھتی چلی آتی ہے۔ ہم لوگوں کا ختنہ کیا کہ تھے ذرا سی فلک سیر کھلا دی۔ بچہ ننھا غنیل ہو گیا۔ بچیا ڈاڑھی بچہ ہائے اور ایک اشارے میں ختنہ کر، چولھے کی جلی ہوئی سنی سے خون بند کر، راکھ کی پوٹلی پیٹ تلگر بند ھوا دیا اور بچے کو کھیلنا پھرنا ہے۔ اب یہ کام ڈاکٹروں کے سپرد ہو گیا ہے نہیں کیا معلوم ختنہ کس کو کہتے ہیں۔ ذرا باپ نے کیا نہ دا دلے۔ انگریزوں کے پڑھائے ہوئے، اور انگریزوں میں ختنہ کا رواج نہیں جبھی تو ہم نے دیکھا ہے کہ ان سے ختنہ کرا کر بچے مہینوں بستر پر ایڑیاں رگڑتا ہے اور ڈاکٹر مارے دواؤں کے بے چارے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کنوئیں میں ڈالنے کی دوا سے دھوؤ، یہ چیر پھاڑ کو وہ چیز لگاؤ سوس بدوپے روئی اور مرہم پٹی میں علت ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے کا ختم اچھا نہیں ہوتا اور پھر ہمیں کو بلانا پڑتا ہے۔ ہم لوگ زہری سے زہری بچھوؤں کا علاج دم کے دم میں کر لیا کرتے تھے۔ زنگاری سے ہم کا چھا ہاچھا کیا ریا چلو چھٹی ہوئی۔ اب دو بیسی مرتے کا جب پھوڑا اچھا ہو جائے گا، مدروزانہ دھونے کا کھڑاگ۔ نہ باندھنے کا فضیہ۔ یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اچھے اچھے عقل شناس والے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ڈاکٹروں کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ دھڑا دھڑ روپیہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ روزانہ درد سے پیچتے چلاتے بھی ہیں۔ چیرے بھی دلواتے ہیں۔ مدت تک پھوڑا بھی اچھا نہیں ہوتا، لیکن ڈاکٹر کا جادو ایسا سر پہ سوار ہے کہ اس کا دامن نہیں چھوڑتے پر نہیں چھوڑتے۔

جھانو! یہ تو حجام نائیوں کے کام تھے۔ اب بھی نائی یہی کچھ کر رہے ہیں، لیکن ہم خاندانی معتبر نائی ان ٹکے ٹکے کے نائیوں سے بہت اونچا مرتبہ رکھتے تھے۔ غریب آدمی تو شادی بیاہ میں کیا خرچ کرے گا اور مہمانوں کو کیا کھلائے گا۔ ہم کھاتے پیتے ججمانوں کے ہاں شادیوں پر کھانا پکاتے تھے۔ بس چار گھڑی پہلے کہہ دیجئے اور پانسو آدمیوں کا کھانا تیار لیجئے۔ پھر ہم خود غرض بھی نہ تھے۔ دوسرے کا گھر پھونک کر تماشہ نہ دیکھتے تھے۔ آج کل کے فلک حرام نائیوں کی طرح جا دل اور گھی اور پستہ اور بادام اور گوشت ہڑا کر چپکے سے اپنے گھروں کو نہیں بھجوا دیتے تھے۔ بلکہ اپنے ججمانوں کی بھی کفایت اور پردہ داری کرتے تھے۔ پلاؤ پکایا اس کی بوٹیاں الگ نکال لیں، کچھ گھی بھی بچا لیا۔ اور دہی، بوٹیاں اور گھی، قیمے اور سالن میں ڈال کر دو سالن مہمانوں کے آگے رکھ دیئے۔ بس پھر کیا تھا ججمان عش عش کر گیا۔

اب پچھلے دنوں کا ایک قصہ سنئے۔ ایک نئے فیشن کے گھر میں شادی تھی۔ میں تو اپنے ججمانوں کے سوا کسی دوسرے کے جاتا نہیں، لیکن ایک ججمان ہی نے سفارش کی، میں چلا گیا۔ بابو صاحب نے حکم دے دیا کہ نائی جو سامان اور مصالحہ مانگے، اسے دے دیا جائے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق مالک کی خیر خواہی اور بچت کے خیال سے وہی بیسیوں پیسے یہاں بھی کیا۔ پھر کیا ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بابو صاحب غصے میں بھرے ہوئے چولھوں کے پاس آئے اور مجھے ہزار ہا بے نقط سنا ڈالیں۔ کم بخت، خاندانی نائی بنا پھرتا ہے پلاؤ اور سالن لے لیا اور پلاؤ میں گھی نہیں، سالن میں لذت نہیں، برادری کے لوگ کہا کہیں گے کہ کس فاقوں مرے گھر میں دعوت کھانے گئے۔ کم بخت تو نے تو میری ناک کٹوا دی؟ اب میں ہوں کہ شرمسار کھڑا ہوں۔ یا الٰہی کیسی برباد گنہ لازم، سالن اور سالہ میں خود نہیں کھا گیا۔ گھر نہیں لے گیا، بچا ہوا یہیں رکھا ہے اور یہ بابو صاحب ہیں کہ شکر گذار ہونے کی جگہ الٹا میری جان کو آ رہے

ہیں۔ اس دن سے کانوں کو ہاتھ لگا کر فیشن کے گھلاوں میں جا کر جھانکوں گا بھی نہیں۔ مجھے اپنے ڈھنگ کے جھمکے ہی کافی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں دولت مندوں کے ہاں "نا" سننے سے عاجز ہوں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خاندانی نائی ہوں۔ میرے بزرگ بادشاہوں کے نائی تھے۔ اب نہ بادشاہی رہی نہ نائی رہ گئے۔ آج کل لوگ شادی بیاہوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں، ان کی حیثیت مجھے خوب معلوم ہے میرے گاؤں کے سارے ہی چودھری لالہ پکوڑی شاہ کے قرض دار ہیں۔ چودھری اپنے گھر کو آگ لگا کر تاپیں تو تاپیں، مجھ سے تو نہیں ہوتا کہ قرض لیئے ہوئے دو پیسے کو بے دردی سے خرچ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مجھے کفایت ہو سکتی ہے وہاں پیسے کچھ بغیر کر دیتا ہوں۔ باقی پکانے کو پلاؤ، بریانی، متنجن، خرمعفر، قورمہ، روغن جوش، ہر قسم کا سالن، مچھلی، مرغ، غیرہ غیرہ ہر چیز پکا سکتا ہوں بلکہ انگریزی شوربا نہیں پکا سکتا، میٹھے ٹکڑے نہیں پکا سکتا، سویٹین بنانی نہیں آتی۔ یہ چیزیں نہ ہمارے دادا کے وقت میں تھیں نہ کسی نے ہمیں کھائیں نہ خدا ایسا موقع لائے۔

ایک زمانہ تھا بڑے بڑے امیر لوگ اپنے خاندانی معتبریوں کو اپنا ماندوار سمجھتے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے سے زیادہ نازک معاملہ اور کیا ہوگا۔ لڑکے کے لیئے لڑکی والوں کے ہاں پیغام لے کر جانا اور لڑکی کے لیئے لڑکا تلاش کرنا، پھر لڑکے لڑکی کی شکل صورت، مزاج، سبھاؤ، ماں باپ کی حیثیت اور طبیعت کے متعلق ٹھیک ٹھیک معلومات فراہم کرنا اور ہم پہنچانا، پسند کی صورت میں شادی کی شرطوں کا فیصلہ کرنا، تاریخ مقرر کرنا، غرض یہ سارے کام خاندان کے معتبر نائی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ ہزاروں کا زیور، کپڑا صندوق میں بند کر کے نائی کے حوالے کر دیا جاتا اور کیا مجال کہ ایک سوئی بھی ادھر سے ادھر ہو جائے۔ اسی لئے تو معتبر کا لفظ نائی کے ساتھ ایسا لگا ہے کہ چسپاں ہو کے رہ گیا ہے۔ آج کل کے ٹٹ پونجئے نائی بھی ہیں جن کا سارا نائی پن صابن لگا کر ڈاڑھیاں مونڈنے ہی تک محدود ہے۔ ذرا کسی ایسے نائی کے ہاتھ کسی دوست کے پاس دیا سلائی کی ایک ڈبیہ ہی بھیج کر دیکھئے۔ رستے ہی میں بیچ کر اس پیسے کا پان نہ کھا جائے تو میرا نام علیا نہیں کچھ اور رکھ دیجئے۔

صرف شادی بیاہ ہی پر موقوف نہیں، عام پیغام رسانی بھی ہمارے سپرد ہوتی تھی۔ بڑے بڑے معزز آدمی اپنی بیٹیوں کو نسرال سے بلانا چاہتے اور گھر کا کوئی آدمی فارغ نہ ہوتا تو یہ کام بھی معتبر نائی ہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اسی اعتبار کی وجہ سے ہم لوگوں کی عزت کاڈھانچا تھا۔ ہندو بھی راجہ اور مسلمان خلیفہ کہتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک راجہ کے بیٹے اور ایک نائی کے لڑکے میں بحث ہو گئی۔ راجہ کا بیٹا کہتا تھا کہ میرا باپ بڑا ہے، نائی کا لڑکا دھونی کرتا تھا کہ میرے باپ کا مرتبہ تیرے باپ سے بھی اونچا ہے۔ راجہ کے بیٹے نے کہا تو نے دیکھا نہیں ساری دنیا میرے باپ کے آگے سر جھکاتی ہے، نائی کے بیٹے نے برجستہ جواب دیا کہ تو نے دیکھا نہیں کہ تیرا باپ جب حجامت بنواتا ہے تو میرے باپ کے آگے سر جھکا کر بیٹھتا ہے۔ لیکن زمانے کا الٹ پھیر دیکھو، اب یہ بات بھی جاتی رہی۔ حجامت بنوانے والا کرسی پر بیٹھتا ہے۔ سامنے طباق سا آئینہ دیوار سے لگا ہے اور نائی اس کے دائیں بائیں بلائیں لیتا پھرتا ہے۔ اب تو وہ سر جھکانے کا معاملہ بھی نہ رہا۔ غرض کس کس چیز کو روؤں۔ بھائی! دل چکا پھوڑا ہو رہا ہے۔ ہم کو اپنے حال کی طرف متوجہ دیکھا تو دو باتیں کر لیں، پرانی شان نہ رہی، پرانی آن نہ رہی، پرانی باتیں نہ رہیں۔ اگلے دن تو سہی، اگلی راتیں نہ دیں، لیکن آج کل کے زمانے کے اناڑی پن کو دیکھتا ہوں۔ آج کل کے نائیوں کی نااہلی اور بد دیانتی کو دیکھتا ہوں تو دل فخر سے بھر جاتا ہے اور گردن اونچی کر کے کہتا ہوں کہ آخر میں ایک خاندانی معتبر نائی ہوں۔ نائی تو اور بھی ہوں گے، لیکن میرے خاندانی اور معتبر ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟

سالک صاحب سے پہلی ملاقات

باری

ہمارے محلہ میں "خلافت کمیٹی" کا دفتر تھا۔ ہم اسکول میں جاتے ہوئے اس دفتر کے پاس سے گزرتے۔ سفید کھدر میں ملبوس چند لیڈر یہاں ہر وقت موجود رہتے۔ ہمارے خیال میں یہ لوگ دنیا کے سب سے بڑے انسان تھے۔ ہم میں سے بعض کی یہ خواہش تھی کہ خدا ان لیڈروں میں سے ایک دن اسکول جاتے ہوئے "خلافت کمیٹی" کے دفتر کے باہر ہجوم کو دیکھ کر ہم سب بچوں کو آخر ہار جاری کیا ہے۔ ایک بوڑھے رضاکار سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "غور منٹ نے مولوی زمانہ کے افکار و حوادث کو گرفتار کر لیا ہے۔" وقت ہوتا تنگ تھا، ہم تیزی سے اسکول کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک سیاست زدہ ہم مکتب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ حکومت نے مولانا سالک کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس بے چارے کا یہ کہنا تھا کہ سب اس پر ٹوٹ پڑے اور یک زبان ہو کر چلائے "جھوٹ بول رہے ہو۔ انگریزوں نے افکار و حوادث کو گرفتار کیا ہے نہ کہ مولانا سالک کو۔" اسکول کی عمارت قریب تھی اس لیے بات ختم ہو گئی۔ واپسی پر ہماری ایک نیسر سے درجہ کے لیڈر سے ملاقات ہوئی اس نے ہمیں بتایا کہ "زمیندار" کے فلاں کالم کا عنوان "افکار و حوادث" ہے اور مولانا سالک اس کالم میں انگریزوں سے مذاق کرتے تھے اس لیے حکومت نے انھیں گرفتار کر لیا ہے۔

یہ تھا سالک صاحب سے پہلی تربیتی غائبانہ تعارف!

——— زمانہ بدل گیا۔ حالات کی رفتار میں نمایاں تغیر رونما ہوا۔ پنجاب کی صحافت میں انقلاب پیدا ہوا۔ سالک صاحب نے اپنا "افکار و حوادث" جاری کر دیا۔ "افکار و حوادث" کا مطالعہ کبھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا اس لیے بارہا یہ خیال پیدا ہوا کہ سالک صاحب سے ملاقات کی جائے۔ لیکن حالات نے اتنی مہلت نہ دی کہ ہندوستان کے اس مایۂ ناز ادیب سے چند باتیں کر سکوں۔

گردشِ زمانہ نے راقم الحروف کو رنگون پہنچا دیا۔ ایک سال تک "مجاہدانہ زندگی" بسر کرنے کے بعد لاہور واپس آیا۔ چند دنوں کا قصہ ہے کہ وقار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آوارہ گردی کے لیے وقار صاحب سے زیادہ موزوں رفیق ملا۔ میں نہیں مل سکتا۔

"چلو بھئی سالک کے ہاں چلیں۔"

"میری ان سے ملاقات نہیں۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھا۔ تو پھر مالک صاحب کو بلائیں۔" وقار نے کہا۔

یہ دونوں نئے راستہ میں پروگرام بنا لیا۔ "انقلاب" کے دفتر میں پہنچ کر وقار صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "آپ کا اسم گرامی ماجون ابراہیم ہے۔ فساد ستوبھا میں آپ کی ساری جائداد تباہ و برباد ہو چکی ہے۔"

سالک صاحب نے محلصانہ انداز میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ایک مصیبت زدہ سوداگر کی طرح نہایت گرمجوشی سے سالک صاحب سے مصافحہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔" سالک صاحب نے کہا۔

میں سالک صاحب کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں طرف وقار صاحب تھے۔ سالک صاحب نے نہایت ہمدردانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں مظلومیت کی تصویر بنا ہوا خاموش بیٹھا تھا۔ سالک صاحب نے چاہا کہ وہ مجھ سے بات چیت کریں۔ لیکن میں نے بدستور یہ ظاہر کیا کہ ان کے فقروں میں معنی پیدا ہوا کہ وقار صاحب سے دریافت تو کریں کہ بیچارہ سوداگر اردو بول جانتا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے سالک صاحب کے ان الفاظ کو اس انداز سے سنا کہ گویا کچھ نہیں سمجھ رہا۔

"آپ اردو سمجھتے ہیں کیا؟" سالک صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے وقار صاحب سے دریافت کیا۔

"بہت کم۔" وقار صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

سالک صاحب اور وقار صاحب نے اب پنجابی میں گفتگو شروع کی۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں بیچارہ سوداگر اپنی واستانِ تباہی کا تذکرہ غیروں کی زبان سے سن کر بے نیازانہ نہ جانے۔

"وقار صاحب! آخر آپ پنجاب کیوں چلے آئے۔ یہاں ان کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ انفرادی مدد سے ان کی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ بہتر ہے کہ انھیں کسی اسلامی انجمن کے سپرد کر دیا جائے۔"

"سالک صاحب! یہ بیچارے تو روٹی کو ترستے ہیں۔ اجتماعی اعانت کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔ سردست آپ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کیجیے۔" وقار نے جواب دیا۔

میرے لیے اب ہنسی ضبط کرنا بہت دشوار تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا:

"راستہ میں مولوی غلام رسول ملا۔ میرے کو پانچ روپیہ دیا۔ اچھا مسلمان ہے۔ اب آپ ——"

سالک صاحب کی حالت اب قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ وہ میرے سامنے ایثار اور ہمدردی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ وہ میری تباہی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ میں حیران رہ گیا کہ دوسروں کو ہنسانے والا سالک اپنے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل لیے ہوئے ہے۔

سالک صاحب نے کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھا اور دفتری کے حوالے کر دیا۔ دو منٹ تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ دفتری ایک روپیہ میز پر رکھ کر چلتا بنا۔

سالک صاحب نے وقار کی طرف روپیہ بڑھاتے ہوئے کہا: "ان سے کہیے کہ یہ حقیر رقم قبول کریں۔ کل انشاءاللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔"

وقار صاحب نے روپیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے بھی زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔۔۔ ساکت صاحب حیران تھے کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

"مجھے ہاری کہتے ہیں۔"

یہ تھی ساکت صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اس عجیب و غریب تعارف کے بعد اسلام اور اشتراکیت، یورپی سیاسیات اور کانگرسی وزارتوں پر گھنٹوں بحث ہوتی رہی۔ یہ تعارف اپنی نوعیت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر "بیہودہ" ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ساکت صاحب سے ایک ہی ملاقات میں مخلصانہ اور محبانہ روابط قائم ہو گئے۔ چند ابتدائی ملاقاتوں میں جو وقت صرف ہونا تھا وہ بچ گیا۔ دوسرا نتیجہ جو اس ملاقات سے نکلا وہ یہ تھا کہ مولانا ساکت کی انسانی ہمدردی، شرافت اور مسافر نوازی نے مجھے ساکت کا گرویدہ بنا دیا۔

عاشق جالندھری

محمود نظامی

یہ سعادت بھی جالندھر کے حصے میں آئی تھی کہ جہاں اس کی مردم خیز خاک سے فردوسیٔ اسلام پیدا ہوئے وہاں ابوالمعظم میاں محمد صاحب عاشق کی مٹی بھی یہیں سے خمیر حاصل ہوا۔ بہت کم لوگ ان کے کلام سے واقف ہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں جب کہ اردو ادب کے نمکین اور رنگین مطالعہ پر بہت زور دیا جا رہا ہے ان کی جلیل القدر شاعری اس امر کی مستحق تھی کہ کوئی صاحب نظر ان کے کلام کی صحیح حیثیت سے لوگوں کو روشناس کراتا۔ گو میرا یہ منصب نہیں کہ میں ان کے افکار و اشعار کے متعلق کوئی سیر حاصل تبصرہ کروں لیکن آج کی صحبت میں آپ کی خدمت میں ان کے کلام کے چند موتی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تعجب کسی صاحب ذوق کو اس میں دلچسپی کا سامان نظر آ جائے اور وہ اس عالی مرتبت جلیل القدر شاعر کے جلیل القدر رادبی کارنامے کو تعلیم یافتہ طبقہ سے روشناس کرا کے ادب اردو کی قرار واقعی دیرپا اور بہتر خدمت انجام دے سکے۔

عاشق جالندھری بستی غزال جالندھر کے رہنے والے ہیں چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو حضرت عاشق کہاں کے ہیں
بستی غزال میں رہتے ہیں بستی غزال کے ہیں

ان کے نزدیک شاعری پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ان کی طبیعت کا ذوق ہے جو شعروں میں اپنے معنی اور نزاکت بیان کرتا ہے ورنہ عام زندگی میں وہ اردلی کے عہدے پر فائز ہیں جس کے ساتھ ساتھ پہلوانی کا بھی شوق ہے۔ اپنی پہلوانی کے متعلق ارشاد کرتے ہیں ؎

خوش ہو کے کہتے ہیں وہ مرنے اوچیچ پر — معشوق ہم جو ہیں تو اسی پہلوان کے ہیں

اپنے اردلی ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اچھی کہی کہ عشق کا مگدر اٹھائیے!
بندہ تو اردلی ہے فقط پہلوان نہیں

یہاں پہلوان ہونے سے جو انکار ہے وہ ہماری تہذیب کے مطابق انکسار کیا ہے ورنہ ان کی شاعری سے ان کی پہلوانی کسی طرح کم نہیں۔ آپ کی شکل و شمائل اور عادات و خصائل کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ ہیں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شعرائے اردو

میں غرضیکہ فرماتے ہیں چنانچہ آپ کا رنگ جناب داغ سے ملتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ بیک وقت ہوتے ہیں اور اس خصوصیت میں استاد ذوق سے کسی طرح کم نہیں۔ پہلوانی میں آپ اپنے زمانے کے ناسخ ہیں، مزاج آتشی کا پایا ہے، بدماغی میں میر کے ہمسر ہیں اور سلسلے میں سودا فی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور خصوصیت جو فانیؔ شاہ آبد کے سوا کسی استاد کو نصیب نہیں ہوئی وہ آپ میں موجود ہے اور وہ یہ کہ آپ بفضل تعالیٰ واحد العین ہیں اور اس روایت سے سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں ؎

اک آنکھ ہے عروسِ عدم سے مری دوچار
اک آنکھ وقف ہے ترے دیدار کے لیے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں عشق میں کھل جاتی ہیں آنکھیں عاشق
میں تو کانا ہی رہا یار پہ شیدا ہو کر

ایک اور مقطع ہے ؎

گو کسی کام کا ہونا نہیں بھیجا معشوق
کانے عاشق کو ملے مفت تو مہنگا کیا ہے

ایک اور مقطع سنیے ؎

قیس و فرہاد نے عاشق کو نہ مانا مرشد
عقل کے اندھوں نے کچھ قدر نہ کانے کی

میرے خیال میں عاشق کی شاعری کے متعلق کوئی رائے دینے سے پیشتر میں آپ کی خدمت میں ان کی ایک غزل سنا دوں، فرماتے ہیں ؎

فائقہ چکھ کے وہ کہنے لگا بالائی کا
کاش میں چھو کر اسے ہوتا کسی حلوائی کا

پیٹ پھولا ہے ہوا سے بُتِ ہرجائی کا
کیا کرے دائی یہاں کام نہیں دائی کا

اونٹ جب بیٹھتا ہے جنگل میں جمائی لے کر
یاد آجاتا ہے نقشہ تری انگڑائی کا

باتوں باتوں میں اڑا لے گیا اور زار تمام
آج اس شوخ نے سر مونڈ لیا نائی کا

میری بوسیدہ لنگوٹی پہ وہ کیوں ہنستے ہیں
جن کی پستون میں پیوند ہے نکٹائی کا

دو ہی دن چلتے ہیں معشوق جو بازاری ہیں
اے خدا بھیج مجھے کوئی حسیں سائی کا

ایک اور غزل سن لیجیے تاکہ آپ کو رباعی قائم کرنے میں دقت نہ ہو ؎

کچھ تو آزار محبت کی دوا دو مجھ کو
خود نہیں مٹتے تو لعنت سے مٹا دو مجھ کو

یاں لنگوٹی بھی نہیں اور وہ مجھ کہتا ہے
سوٹ انگلینڈ سے دو چار منگا دو مجھ کو

دیکھو ترساؤ نہ یوں شربتِ دیدار سے تم
گر پیالہ نہیں ملتے سے پلا دو مجھ کو

کھٹکھٹایا مرا دیوانہ جو اغیار نے رات
ڈر کے وہ بولے کہ بھیجے میں چھپا دو مجھ کو

اس کلام سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ انھوں نے ایسے الفاظ و خیالات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے جن کو شعراء

اضافی اور بازاری بھرتی کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ یہ عموماً روش شاعری سے میل نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے عام شعراء ان کو سوقیانہ سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں اور شعر میں ان کو شامل کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ عاشق نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ و خیالات کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور بتایا کہ کھلا دیا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکیں۔ شاید آپ میں سے کوئی صاحب عاشق پر الزام لگائیں کہ وہ عموماً قسم کے شاعر ہیں جو اپنے غیر مہذب اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے ہیں مگر جو چیز ان کی خامی اور نقص سمجھی جائے گی وہی میری رائے میں فی الحقیقت ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ کیونکہ ان کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور رجحانات اور انسانی اصل چال کو خود ان ہی کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں اور روزمرہ کے معاملات کا سچا فوٹو حسن و حسن کھینچ دیتے ہیں اسی وجہ سے ان کا بیان ہمیشہ دلچسپ اور نیچرل رہتا ہے اور تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

شیخ اندھے سے جو ٹکرایا تو اندھے نے کہا
ہیں تو اندھا تھا ہی بھڑوے تو بھی اندھا ہو گیا

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اندھے کے انداز تکلم کو کس قدر نیچرل انداز میں پیش کیا ہے۔

مشرقی شاعری میں عاشق کے دل کی حیثیت خاکوٹین پن یا گھڑی سے زائد نہیں جسے وہ جیب میں ڈالے پھرتے ہیں اور حسب ضرورت کبھی کسی کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں کبھی میز پر ڈال دیتے ہیں کبھی کہتے ہیں ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کبھی پھیری والوں کی طرح اس جنس بے مایہ کو گلی کوچوں میں سودا پکارتے پھرتے ہیں۔ جلال لکھنوی کہتے ہیں ؎

جلد دل کا فیصلہ کچھ ہو چکے
لے چکو سودا یہ جتنے گو چکے

خیر یہ تو خواجۂ فروش تھے جو سالم دل کے "سٹاکسٹ" تھے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دل کو کاٹ کاٹ کر ٹکڑوں کی صورت میں فروخت کر دیتے ہیں۔ عظیمت کہتے ہیں ؏

کہ من سی پارۂ دل می فروشم

اور آپ نے خواجۂ فروش کی یہ صدا بھی سنی ہوگی ؏

من قاشش فروش دل صد پارۂ خویشم

ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاہک سے سودا نہیں بنتا۔ قیمت پر تکرار شروع ہو جاتی ہے اور خواجۂ فروش اپنا مال اٹھا دوسری گلی میں "نازہ دل ٹکے سیر" کی صدا بلند کرتا ہے۔ ذوق کہتے ہیں ؎

مال جب اپنا بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

کبھی کبھی یہ چیز جیب سے گر کر کھو بھی جاتی ہے اور آتے جاتے کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ بیچارے مرزا غالب کا دل تو

آستین ان کی جیب کے کسی پھٹے ہوئے گوشے سے باہر نکلا تھا اور ان کو شکایت کرنا پڑتی تھی کہ ؎

کہتے ہیں نہ دیں گے دل اگر ہم نے پڑا پایا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عشقی عاشق کا دل ایک ایسی چیز ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عہد بہ عہد جیب و تحفہ کے طور پر دیا جا سکتا ہے۔ "چھاتی" میں ڈال کر گلی کوچوں میں لیجا جا سکتا ہے۔ جیب کٹتی ہوئی ہو تو گر بھی سکتا ہے اور اگر الٹا فی گیرے گھات میں ہوں تو جیب کو کتر کر اسے صاف اڑایا بھی جا سکتا ہے۔ اسی خوف سے عاشق جالندھری اپنا دل رومال کے ایک کونے میں مضبوطی سے باندھ کر رکھتے تھے مگر ایک مرتبہ ایک ایسی محفل میں چلے گئے جہاں پر رنے باتوں میں لگا ان کا دل صاف غائب کر دیا۔ اب اس کو رومال کی ضرورت ہوئی اور ہاتھ جیب میں ڈالا تو کیسہ خالی! سر پیٹ کر اپنے محبوب سے کہتے ہیں ؎

تم نہیں تو کوئی ہے جس نے چرایا میرا دل
کوئی تو آخر اٹھکا اس بھری محفل میں ہے

مگر وہ بزرگوار بھی گرگ باراں دیدہ تھے، ایسے سانحے کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے چنانچہ عاشق کہتے ہیں ؎

جانتا ہے کہ یہاں کون تلاشی لے گا؟
دل مرا یار نے سینے میں چھپا رکھا ہے

حسن کہیں ہو کسی شکل میں ہو انسان کا دل اس کی طرف ایک اضطراری کشش سے کھنچتا ہے۔ عاشق جالندھری کے دل میں تو حسن و لطافت کی دنیا آباد ہے۔ جب اس کی نظریں قدرت کی چمن آرائی پر پڑتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں حسن کا نشہ سا چڑھ جاتا ہے اور وہ عالم مستی میں مخمور ہو کر قدرت کے ان دل افروز مظاہر کی قدر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہر جگہ رہتا ہوں میں محسن کا شیدا ہو کر
کہیں آتو کہیں نقشہ کہیں خیرا ہو کر

عاشق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب میں حسن کے ظاہری لوازم اور مہینہ خواص تلاش کرے۔ اس کی نسبت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ یہی سنگ و ملال ہیرے جواہر تک کی تمام فیوض منافع ہیں کیونکہ خود لسان الغیب خواجہ حافظ شیراز کی فرماتے ہیں ؎

جمال شخص نہ چشم است و زلف و عارض و خال
ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداری است

رند لکھنوی کہتے ہیں ؎

نہ عارض نہ زلف و دو تا دیکھتے ہیں
خدا جانے ہم تم میں کیا دیکھتے ہیں

اسی طرح جب انسان کا دل کسی شے پر فریفتہ ہوتا ہے تو اس کے لیے عقل و خرد کے مجہول دائرے میں مقید رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کا تجربہ ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عاشق جالندھری بھی عشق پر زور نہیں رکھتے اور ان کا دل کائنات کے ہر اس قدرے سے وابستہ ہو جاتا ہے جس میں ان کے لیے ذرہ بھر بھی کشش کا سامان موجود ہے۔ انھیں اگر بچے سے محبت ہے تو بوڑھے سے بھی عشق ہے۔ اگر پھینگے سے الفت ہے تو گینڈے سے بھی پیار ہے۔ اگر وہ یہ کہتے ہیں ؎

آ جا سُلا کے اپنے نواسوں کو جلد تم
ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہوں انتظار میں

تو یہ بھی کہتے ہیں ؎

کیا نہیں ہوتے کبھی ہاتھ برس کے معشوق
آئینہ لے کے تو دیکھو ابھی بگڑا نیا ہے

ممکن ہے آخری شعر پر آپ یہ اعتراض جڑ دیں کہ یہ خلافِ حقیقت واقعہ ہے مگر شاید آپ حافظ کا یہ شعر بھول چکے ہیں ؎

آں دل نہ رم نمود ے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے مُرشد بہ یک نگاہے

عاشق ایک صاحب دل شاعر ایک جانباز عاشق ہے جو اپنے محبوب کا در کسی حالت میں نہیں چھوڑتا۔ فرماتے ہیں ؎

کیا خبر تھی مجھے دل دینے سے پہلے یار ب
یار کا عکسِ رخ جا ئے گا لقمہ ہو کر

اس شعر میں بالکل میرؔ کا یاس و حرماں ہے۔ وہی درد و سوز ہے وہی انداز و تڑپ ہے۔ اگر یہی شعر میرؔ کی زبان سے نکلتا تو اس کے نشتروں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اسی جذبہ وفا شعاری کے ماتحت اپنی ایک اور کیفیت کا ذکر کرتے ہیں ؎

وائے قسمت ناتمام وعدہ اس تھا رہ گئے پڑے
میرے گھر تک آتے آتے یار گنجا ہو گیا

عاشق جالندھری کا جذبۂ عشق و وارفتگی اس قدر بسیط ہے کہ اسے اپنے محبوب ہی کی ذات میں تجلیاتِ حسن کا پرتو نظر نہیں آتا بلکہ اس کے نزدیک ہر وہ شے جو اس کے محبوب سے تعلق ہے حسن و دلکشی کی آماجگاہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اس عشوہ گر کی بھینس کے انداز دیکھ کر
قربان اونٹ اور تصدق گدھا ہوا

عاشق جالندھری کا رنگ اس قدر جدید ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں پرانی روش کو یکسر قلم زد کر دیا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ سُنیے:۔

(۱) یہ پرانی طرز کے عشق کے معاملات کے برعکس اپنے اشعار میں جدید روشنی کے عشق کا حال قلمبند کرتے ہیں ؎

گر کوئی پوچھے تو اپنا باپ ہی کہنا مجھے — بات یہ میں نے ہے ان کو خوب سمجھائی ہوئی
پہلے دشمن کو پھر ان کے باپ کو راضی کیا — جب کہیں جا کر مری ان سے شناسائی ہوئی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

غیر سے کہنے لگے وہ دیکھ کر میری شبیہ — یہ ہمارے آنریری باپ کی تصویر ہے

(۲) ہمارے شعرا کی ایک بہت پرانی روش یہ تھی کہ وہ رقیب سے ہمیشہ خائف رہتے اور حوروں کی طرح اس کے حق میں بددعائیں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے مگر حاشق جالندھری رقیب سے ڈرتا تو درکنار اُلٹا اس سے جرأت پیدا کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ گو رقابت کے سلسلے میں انھیں اپنی زندگی کے بہت سے تلخ تجربات اٹھانا پڑے جیسے ؎

کی تھی خبر رقیب نے مجسٹریٹ سے بھی
ان کو بلا کے جیل میں جانا پڑا مجھے

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

سر کرائیں تو سہی آپ عدو کا ننگا — میں بھی دیکھوں ہے کہ کیسے پاؤں میں جوتا کیسا

اور سنیے ؎

رقیبوں کو انھی کے گھر پہ جا کر ڈانٹ آتا ہوں — سمجھتا ہوں کہ یہ چھے نہ نکلیں گے کبھی بل سے

(۳) غزل کی ایک مذموم روش صیاد و صیاد کے معاملات کا تذکرہ تھا۔ اس میں شاعر اپنے تئیں پرندہ بنا کر پنجرے میں ڈالتا تھا پھر چڑیا کی جان کو سو سو صلواتیں سناتا تھا۔ آخر کار ان بچوں کو یاد کرتا کہ جاں بحق ہو جاتا تھا جنھیں گرفتاری سے قبل اس نے گھونسلے کے اندر اپنے انڈوں سے نکالا تھا۔ حاشق کہتے ہیں کہ قفس کے گوشے میں منتقل ہونے کے لیے اپنے تئیں پرندہ کیوں متصور کرنے دو کیا انسان کو پنجرے کے اندر بند نہیں کیا جا سکتا چنانچہ وہ صیاد اور جال سے ڈرنے کی بجائے تجویز کرتے ہیں ؎

جو مجھے ہم کسی پنجرے کی زینت — دو بالاشان ہوتی چڑیا گھر کی

اسے مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

آہ سونا پڑا ہے چڑیا گھر — اس کی رونق بڑھائے گا اب کون؟

(۴) محبوب کے لباس کے متعلق ہمارے شعرا کی جو روایات ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں۔ اس کی کوکلاہی اور خوش پوشی کی کیفیت کا رونا ہر جگہ نظر آتا ہے بلکہ اس کی آرائش و زیبائش کا تذکرہ بھی عام رہتا ہے۔ خواجہ آتش ؎

وہ ہیں مصروف آرائش نہ دھوکا کھائیو اے دل
ارے بجلی بھی ہوتی ہے پری اوروں کے زیور میں

اسی طرح غالب کہتے ہیں ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب ہیں

مگر چونکہ حاشق جالندھری کے محبوب کو اپنے باطنی اور ظاہری حُسن کی وجہ سے ظاہری لباس کی ضرورت نہیں اس لیے انھوں نے سرے ہی سے اس کا فیصلہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سادگی دیکھیے کوئی اگر مرے جلاد کی
ہے خطِ تن پر لنگوٹی ہاتھ میں شمشیر ہے

(۵) پرانے زمانے میں اگر کوئی شخص کسی کو سمجھانا بجھانا تو دوسرا دوستداری کے خیال سے یہ خاموشی نام اس کی تلقین کو

سن لیتا۔ ہمارے شاعر بھی پیارے ناصح کی بہات کو سننے کے لیے تیار ہو جاتے مگر عاشق چاندھری کے نزدیک چونکہ محبت دو دلوں کا ایسا معاملہ ہے جس میں کسی تیسرے کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں اس لیے وہ غالب کے برعکس "دیدۂ دل فرشِ راہ" کرنے کی بجائے الٹا حضرت ناصح کو فرش کر نا پسند کرتے ہیں ؎

بے دھڑک محفلِ رنداں میں جو آیا ناصح　　بہر تعظیم اٹھا بانس کا ڈنڈا کیسا

اس پر بھی جب ناصح کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہوتا تو وہ اس کے ساتھ عملی مذاق تک سے نہیں چوکتے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

کیا تھی اسے خبر کہ ہے لوٹے میں شہد بھا　　ناصح کا حال وقتِ طہارت تو دیکھیے

(۶) یہ تو تھی غزل کے پرانے مضامین میں تبدیلی اب مصنوعی تبدیلی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں کمان و تیر، نخچیر و شیر کا ذکر بھی اکثر آتا ہے یہ ایسے تشبیہات ہیں جن سے نازو ادا مراد ہوتی ہے اور یہ تشبیہات و استعارات ہمارے شعرا کے دماغوں پر اس قدر مستولی تھے کہ خود غالب چلا اٹھا ؎

مطلبِ ناز و غمزہ گر گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مگر عاشق نے خنجر، ناز و تیر، شیر ادا کے مقبول استعارات کو چھوڑ کر اپنے لیے نئی راہ نکالی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اداسے ناز کی گھوڑی اگر نہیں سرکش
نگاہِ شوق کا ٹٹو بھی بدلگام نہیں

آخر میں ان کی دو غزلوں کے چند شعر سن لیجیے ؎

آپ مجھ سے جو ہیں کسی شے پر　　یہ لگوٹی ہے لونگیہ تو نہیں
تیرے ابا کی کیا مجھے پروا　　تیرا ابا مرا خدا تو نہیں
خود سمجھ جائے گا ہماری بات　　شیخ انسان ہے مگر دانا تو نہیں

کالکا کا ہو کہ ڈیرہ دُون کا　　ہر حسیں پیاسا ہے میرے خُون کا
خود تو وہ چلتے ہے بھوپال کو　　لے دیا مجھ کو ٹکٹ رنگون کا
اس قدر ہے گرمیٔ عشق بُتاں　　ہے دسمبر پر بھی دھوکا جُون کا
دم بدم کہتا ہوں ان سے حالِ دل　　قافیہ ہے تنگ ٹیلیفون کا

اگر شیطان مر جائے

عطاء اللہ سجاد

میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ زمانہ مردہ پرست واقع ہوا ہے جب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے اس کے خلاف سزاروں زبانیں زہر اگلتی ہیں۔ وہ اپنی بدکاریوں، غداریوں اور بے ایمانیوں کے لئے انگشت نما رہتا ہے دیانت اور امانت کی صداقت اور عدم صداقت کا امتحان نہ کیا جائے، لیکن موت اس کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے مخالفین جب یہ سنتے ہیں کہ وہ دنیا کی فضا میں سانس لے چکا ہے۔ تو اُن کا لب و لہجہ فوراً بدل جاتا ہے اور وہی شخص جو کچھ عرصہ سے پہلے ان کی نظر میں دنیا جہان کی برائیوں کا منبع ہوتا ہے رفتہ رفتہ حسن اخلاق اور دیانت و امانت کا دلکش پیکر بن جاتا ہے۔ اس دلچسپ تمثیل کا ایک پہلو یہ ہے کہ مرنے والا خود اس مدحت سرائی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور شاید اس کے دشمن دل ہی دل میں کہتے ہوں "وہ ایک ایسے جہان میں پہنچ گیا ہے جہاں ہماری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے ہمیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے منہ سے اپنی تعریفیں سُن کر غرور سے سر بلند کر سکے۔"

آپ اور آپ کے دوست کسی شخص کو تمام عمر حد درجہ کا بخیل اور کنجوس مشہور کرتے رہیں گے۔ لیکن جب وہ موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ تو آپ ہی میں سے کوئی شخص کہہ اُٹھے گا "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔" دوسرے صاحب فلسفیانہ انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہیں گے "بھائی وہ آدمی بڑا دانا تھا، شہدوں کی طرح دولت لٹاتا نہیں تھا۔ اس کا اصول تھا کہ دولت کی نمائش کرنا فضولوں کا کام ہے۔" تیسرے صاحب کہتے ہیں "لوگ کہتے ہیں وہ دل کا بڑا سخی تھا۔ آج تک کوئی سائل در دولت سے واپس نہیں گیا۔" اور اس موقع پر وہ اپنی طبابت سے فائدہ اٹھا کر مرحوم کی سخاوت کے دو تین قصے رنجالا گھڑ دیتے ہیں۔ اور لوگ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا اپنا بہترین انسان کھو چکی ہے۔

محلہ کے مولوی صاحب تمام عمر کسی آدمی کو کرسٹان بے ایمان اور دوزخی کہتے رہیں۔ اُن کی زبان اس کے خلاف سالہا سال تک تکفیر اگلتی رہے۔ لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو مولوی صاحب خود اُسے غسل دیتے ہیں۔ اُسے کفناتے ہیں اور اس کے بعد اپنے مقتدیوں کے سامنے بہیئوں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ واللہ کیا مسلمان تھا۔ موت کے بعد چہرے پر جلال اور انوار کی بارش ہوتی رہی۔ مرتے وقت زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مجھ سے کہا مولوی صاحب میرے کلمے کے گواہ رہیو" سیاسی لیڈر اپنے مخالفین سے ہمیشہ لفظی جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ اُسے ملک کا غدار اور ملت کا دشمن بتاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو ایک عظیم الشان جلسہ جس میں انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے بہنقد کیا جاتا ہے۔ جس میں مرحوم کی بڑی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ پسماندگان کے لئے سبیل کی دعا مانگی جاتی ہے اور عوام کو بتایا جاتا ہے کہ قومی میت

کا ایک بہت بڑا ستون گر پڑا۔

انہیں حقائق کے پیش نظر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر شیطان آج مر جائے تو دنیا والوں کا تدیہ کیا ہو۔ شیطان ہی ایک ایسی ہستی ہے جسے خدا اس کے فرشتوں اور کائنات انسانی نے ہمیشہ ملعون و منضوب قرار دیا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کے لغات میں جس قدر ملامت کے الفاظ ہیں وہ تمام شیطان پر صرف کئے جاتے ہیں لیکن شیطان اگر آج فنا کا جام پی لے تو اس کے متعلق دنیا کا نقطۂ نظر یقیناً بدل جائے گا۔ آج جس قدر بیانیاں شیطان کے سر تھوپی جا رہی ہیں۔ تقریباً اس سے دگنی نیکیوں کا سہرا اس کی لاش پر باندھا جائے گا۔ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک ایک جوش پھیل جائے گا اور بڑے بڑے اخبار نویس، شاعر، فلسفی، عالم اور سیاسی لیڈر شیطان کو خراج تحسین ادا کریں گے۔ عوام ایک دوسرے سے اس کی صفات بیان کریں گے "اجی کیسا دل گردے والا تھا۔ خدا اور اس کے سارے فرشتوں کے مقابلے میں آخر تک ڈٹا رہا۔ وہ تو عزرائیل نے موقع پا کر دبوچ لیا ورنہ یوں مر سکتا تھا۔

"آدم کو سجدہ کرنے کی بات ہی کیا تھی۔ اتنی سی بات پر خدا سے بگڑ گئی۔ وہ دن اور یہ دن یہ خدا کی مخالفت سے باز نہیں آیا"

ایک فلسفی اخبار کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے فرمائیں گے:۔

"دنیا کی ایک ایسی قوت سے محروم ہو گئی ہے جس نے کائنات کا توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔ شیطان کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے آدم کو جنت کی بے عمل اور بے کیف زندگی سے نکال کر اسے حیات کی لذتوں اور رنگینیوں سے روشناس کرایا۔ اس کی موت سے زندگی پھر تاریکیوں کا گہوارہ بن جائے گی اگر ہم نے شیطان کی روح کو برقرار زندہ رکھا تو مجھے ڈر ہے کہ دنیا ہنگاموں سے خالی ہو جائے گی اور ہم جمود اور بے حسی کے اس جال میں گرفتار ہو جائیں گے جس سے ابتدائے آفرینش میں حضرت شیطان نے ہمیں نجات دلائی تھی"۔

ایک اخبار نویس اس کی موت پر یوں تبصرہ کریں گے:۔

"حضرت عزرائیل سے ہمیں ذاتی تعارف حاصل تھا اور ان کی موت کی خبر تاریں کو پہنچاتے وقت ہمارا دل غم سے نگار ہو رہا ہے وہ دنیا کے سب سے پہلے اخبار نویس تھے اور پروپیگنڈا کا فن ان کی طبعی کامرانوں سے تھا۔ انہوں نے حوا کو بہکا کر آدم اور حوا کے خلاف جو کامیاب پروپیگنڈا کیا اس کا نتیجہ آج آپ کو اور ہمیں اس وسیع و عریض کائنات کی صورت میں نظر آ رہا ہے حضرت عزرائیل کی تمام عمر ادھر سے ادھر پروپیگنڈا کرتے گزری وہ اخبار نویسوں کے لئے منبع الہام تھے اور ان کی وفات صحافتی برادری کے لئے ایک حادثہ جانکاہ کی حیثیت رکھتی ہے"۔

بذلہ سنج شاعر اس پر دلسوز نظمیں لکھیں گے اور تو اور علما کے طبقے میں بھی کھلبلی مچ جائے گی وہ کہیں گے:۔

"شیطان گمراہ کن ہے میں اس بات کا مرتے دم تک پرچار کرتا رہوں گا کہ ہم کفر کے فتووں کے لئے اس کی طرف سے ہمیشہ چوکنا رہے لیکن اس کی موت سے ہم بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اس کی موت نے ہمیں ایک طریقہ سکھا دیا ہے۔ وہ مر چکا ہے اب ہمیں اس کی موت کی بھی تکفیر کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی مواد نہیں ہے"۔

سیاسی لیڈروں کو یہ خیال ستائے گا کہ شیطان کی موت سے سیاست کا بازار سرد پڑ جائے گا اور اس بات کا اثر لازمی طور پر ہماری اقتصادی حالت پر ہوگا۔ دنیا کے سنگھٹ کٹیٹر اس بات پر افسوس کریں گے کہ اب جنگ کے لیے بہانہ تراشنے کا فن نہیں سکھائے گا۔ وہ حسرت سے اپنے آلات حرب پر نظر کریں گے اور کہتے "شیطان ہوتا تو کر کٹ ہو جاتیں گے۔ البتہ فرشتے ضرور اس خبر پر مسرور ہوں گے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہیں گے "اچھا ہوا مر گیا۔ کم بخت نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اب جب تک خدا کوئی نیا شیطان نہیں بناتا ہم چین کریں گے" اور جبرائیل پکار اٹھے گا "خاموش رہو۔ وہ ہم سب کا استاد تھا"۔

درباری شاعر

محمد فاضل

پچھلے دنوں مالک صاحب نے افکار و حوادث میں اور بعض دوستوں نے شیرازہ میں ایسے شعراء کا تذکرہ کیا تھا جو اپنی شگفتہ مزاجی اور سنجیدہ طبعی کے باعث اپنے ہاں کی علمی و ادبی محفلوں کی جان ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تذکرے ادب کے لئے بڑے مفید اور پژمردہ دماغوں کے لئے حقیقی راحت کا سبب ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست کی معرفت اسی قسم کے ایک بزرگ کے مختصر حالات مجھ تک پہنچے ہیں۔ جو قارئین شیرازہ کی خدمت میں پیش ہیں۔

آپ کا نام کرم دین اور وطن مالوف چکوال ہے، درباری شاعر تخلص فرماتے ہیں اور بزعم خود صرف شاہانہ دربار دں میں ہی اپنا کلام پڑھنا اپنی شان کے شایان سمجھتے ہیں مگر افسوس کہ ایسے قدر دان و درباران کو میسر نہیں۔ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ میرا کلام سمجھنے والے لوگ آئندہ پیدا کر پیدا ہوں گے۔ شاہ جارج پنجم آنجہانی کی سلور جوبلی پر قصیدے اور نظم لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور "درباری شاعر" ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ کبھی زمانہ میں مدرس بھی رہے اور حکمت سے بھی شغف ہے۔ بخار اور کھانسی کی مجرب گولیوں کے علاوہ چکوال اور جہلم کے گرد و نواح کے طلبہ کو "معجون شاعری" بھی عنایت فرماتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی روانی طبع سے مجبور ہو کر اپنے اس ذوق جمیل کے صلہ میں میری ہجو طبع بھی رقم فرما دیں۔

جہاں ایسے نادر روزگار شاعر ہوتے ہیں وہاں قدر دان بھی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی قدر کرتے ہوئے بزم ادب چکوال نے "عدیم المثال" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ آپ کو اس خطاب سے خوش ہیں، مگر ہر نئے آدمی سے اپنا تعارف اپنے آپ کو "اقبال ثانی" کہہ کر کراتے ہیں۔

چودھری فضل حق صاحب نفیری بی اے ایل۔ ایل بی سب جج خانیوال جب چکوال میں تھے تو ان کی علم دوستی اور شاعر نوازی کے باعث چکوال کو بھی "ثمر و شاعری" کا زکام ہو گیا تھا۔ ان ہی کے ایما پر ہمارے درباری شاعر نے "گلزار درباری" کے نام سے اپنا کلام طبع کرایا۔ چودھری زکار اللہ صاحب بسمل ایم اے اور محمد غالب صاحب مشتاق صحرائی نے دیباچے لکھے۔ چودھری فضل حق صاحب نے بھی بتقریب عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور استاد کرم دین کا ان کے ہم مشرب و دیگر شعراء سے بالعموم اور استاد امام دین گجراتی سے بالخصوص موازنہ کیا۔ درباری شاعر خود فخریہ فرمایا کرتے ہیں کہ "میں امام دین کا استاد ہوں کیونکہ اس کا کلام (اس زمانہ کے کم علم لوگوں کے لئے) بے معنی ہوتا ہے اور میں ان کی قیود سے باہر نہیں ہوتا۔ مگر میں ان دونوں الجھنوں سے آزاد ہوں۔ وجہ یہ کہ امام دین کے کلام کی طرح میرے

کہہ کر کچھ ٹالنا اس زمانہ میں کوئی ہے نہیں باقی سلا اوتان کا سوال سر نظیر اکبر آبادی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ؎

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بیل کے لئے دشوار ہے

افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے مجھے گلزار دربار[1] دستیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ ہر طرح کا توشۂ کلام پیش کیا جاتا۔ جس قدر اس کا کلام مجھ تک پہنچا ہے وہ ذیل میں درج خدمت کرتا ہوں۔

شاہ عالم ثانی آبجانی کی سطوت جبروتی پر جو "شاہنامہ" نظم لکھی تھی اس کا مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

اے باد فلک ذرا کھا کے پلک یہ مختصر سی تو کر ذکر شاہ کی داستان کا
دہرا دے قصہ تو ماضی حال مستقبل مرثی مضمون سرع کی گردان کا

یوں تو یہ نظم اپنی روایتی شان رکھتی ہے اور اپنے بحر کی طرح طویل تھی۔ افسوس ہے کہ میرا حافظہ اس کو محفوظ نہ رکھ سکا مگر ایک شعر اور سن لیجئے۔ جس میں شاہ عالم ثانی کو خطاب کیا ہے اور شاہان سلف سے ان کا مقابلہ کیا ہے فرماتے ہیں۔ ؎

تیری شان ہے سب سے بالا تو ہے سب سے نرالا وہ ہیں ماضی تو ہے استقبال
کیا ہے مرثیہ اس جگہ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان کا

ایک دفعہ چکوال میں مشاعرہ ہوا۔ مصرع طرح تھا "خود پرستی خدا پرستی ہے"۔ چکوال کے شعراء نے اپنی اپنی طبع آزمائی۔ مگر میدان بالا خر ہمارے درباری شاعر کے ہاتھ میں رہا۔ ایک لمبی غزل لکھی جس میں سے صرف تین شعر مجھے یاد ہیں ؎

آ ما مہنگا ہے کتنا سستی ہے — خود پرستی خدا پرستی ہے
چین مجھ کو نہیں ملا ہمدم — ظلم کی کیا یہ بستی ہے
شاعر دربار کو دیدی امید میں — دیکھنے کو پر نظر ترستی ہے

جناب عدم کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

دگرگوں اس قدر اب دل کی حالت ہوتی جاتی ہے
مری ہر سانس روداد محبت ہوتی جاتی ہے

یاران چکوال نے عدم کی یہ غزل جھوم جھوم کر درباری شاعر صاحب کو سنائی۔ آپ بھلا کب برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے سامنے ایک کمسن شاعر کی تعریف کر کے ان کے سینے پر مونگ دلی جائے فوراً ایک غزل لکھ دی جس کا مطلع حاضر ہیں ؎

محبت جس کے ساتھ چاہے دنیا میں نباہتی ہے — مری ہر آہ دل جوئے حسرت[1] ہوتی جاتی ہے
عشق میں اپنی ہستی کا کچھ بھی نہیں پتہ باقی — خدایا اس کو ہیں کھاتا ہوں یہ مجھ کو کھاتی ہے
جہاں میں سچ مشاعرہ دربار پر ناز کرتا ہے — کہ اس کی ہر سانس روداد محبت ہوتی جاتی ہے

---

[1] حسرت صاحب والد ہیں۔

پنجابی میں "جھر جھر کرنا" قریباً چھڑنا منہ اور بڑی بات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ "جھر جھر کرنا" میں زیادہ ابتذال پایا جاتا ہے جہاں سے درباری شاعر کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال سوجھا کہ یہ شاعر جو "پیغمبر پاک" کی تعریف میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ حقیقتاً "پیغمبر پاک" کی تعریف سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے اور یوں بھی جھر جھر کرتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی آپ نے شاعروں کے اس جھر جھر کرنے کو نظم کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک مسدس کی ابتدا کی جس میں "جھر جھر" کو نہایت خوبی سے نباہ گئے۔ فرماتے ہیں:۔

وہ بڑی شان والا مقام تخت اوپر پر پر پر پر
محمد رسول اللہ سرور در در در در در
علی حیدر کرار شکن خیبر بر بر بر بر بر
حسین شہر یثرب تر تر تر تر تر تر
شاعر درباری کوئی تعریف ان کی کر سکتا ہے
مفت کی کرتے ہیں سب جھر جھر جھر جھر

الغرض استاد کریم دین المخلص بہ "شاعر درباری یا درباری شاعر" نام و پہچان میں غلیظ ہے ایسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمیں حیات ہیں۔ اس لئے ان کی خدمت میں میرا مخلصانہ سلام پہنچے۔

اُستاد بوٹے خاں گلزار کا حال

خضر تمیمی

آل انڈیا ریڈیو نے کچھ عرصے سے اُردو ادب کی مستند کتابوں پر پیروڈی
کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خضر تمیمی نے آبِ حیات کی پیروڈی لکھی جو ڈائرکٹر آل انڈیا
کی اجازت سے شائع کی جاتی ہے۔

جس وقت وہ صاحب کمال ادب کی گاڑی میں ایجاد کے گھوڑے کو جوت کر عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے سخن کے ہر موڑ سے "بچ جاؤ" "بچ جاؤ" کی آوازیں بلند کیں۔ عقیدہ تو یہ تھا اس کے گھوڑے کا داد دنا جسے آبِ حیات میں بھگویا گیا۔ اب ایک ایسے استاد فن کی پیروی کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس پر نظمِ اُردو کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ جی ہی جی چاہتا ہے۔ کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ کیونکہ اس شعر کے پیچھے کے گھوڑے۔ کا بھی رونگٹا روگٹا بیکار نہ تھا۔ اس واسطے میں لکھوں گا۔ اور سب کچھ لکھوں گا۔ ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

یہ بھنڈے خاں پرچم کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے تیس سال تک سنٹرل ماڈل سکول کی ٹول ماسٹری کے اکھاڑے کو اپنی جسمانی ورزشوں کے علاوہ دماغی کاوشوں سے بھی اندر کا اکھاڑا بنائے رکھا۔ ان دنوں ٹیچرز ٹریننگ کالج میں نارمل اور ایس وی کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں جن کے طلبا کو استاد پرچم مرحوم اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس لئے زبان کی آبیاری کے لئے وہ اپنے اشعار کو کہنہ مشق اور زندان معنوی شاعر کے ہوتے ہیں مشتاقانِ سخن میں اس طرح سے تقسیم فرماتے تھے۔ کہ بیس تیس پرچے اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں بھر کر ہر شام سنٹرل ٹریننگ کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو جاتے۔ جو ہر سخن کے پرکھنے والے ہوتے درجوں کھلتے اور خاطر خواہ انعام دے کر مختلف پرچے لے جاتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ وہ ماہ کے بعد پرچہ دینے کی بجائے آپ شاگردوں سے خود شعر کہلواتے۔ اور انہیں سُن سُن کر خوش ہوتے۔

لطیفہ: ۱۔ پرچم مرحوم سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ زبان کی ترویج کا سیدھا طریقہ ہے۔ کیونکہ اوّل اوّل ریڈیو سخن جب ان شاعر پاروں کو مشاعرے میں پڑھتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے قدر دانوں کے حلقے میں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت سے جانا جا رہا ہے۔ ایک شاعر کی ہستی مسلّم ہو چکنے کے بعد اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئے۔ وہ پڑھا استادِ سخن اس بات کو خوب جانتا تھا اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے بتدریج ہیری سٹرکوٹی شروع کر دے گا۔ اس میں نکتہ یہ تھا۔ کہ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا۔ وہ بھی ہونا ہا اس فن شریف کو "جزو لیست از پیغمبری" اختیار کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ اور کیا زمانہ تھا۔ یہ سب انہی باکمالوں کا صدقہ ہے۔

کرنا ڈی کے سوا مدتوں میں نوّے مدتس شاعر ہیں اور باقی دس بھی تخلص کے سوا نہیں ہے

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اُستاد بوٹے خاں کلکتار کی والدہ کے بچپنے ہی اُن کے والد نے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ سے دو ماہ بعد پیدا ہوئے تھے۔ یہ مرحوم کو نئی دلہن سے زیادہ محبت تھی۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت غفلت برتی گئی۔ ان کی والدہ نے چنگڑ محلہ میں ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہ ضعیفہ وہیں قناعت کی چادر اوڑھے گزران کر رہی تھی۔ اور بوٹے خاں بھی کبھی ٹریننگ کالج کی سڑک والی دیوار پر بیٹھ کر اپنے والد بزرگوار کے احکام اور ماں کی خوری تمبیل کے منظوم و نثری سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ سچی میں ان کی والدہ نمیں بھینچ گئی تھی۔ یہ جھولے میں پڑے رو رہے تھے کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور ان کے ہاں سے ایک روٹی لے کر چلتا بنا۔ انہوں نے اپنی توتلی زبان میں کتے کی آمد اور روٹی کی گم شدگی کی داستان کو ایسے دلاویز طریقے سے ادا کیا کہ ماں کو روٹی کھونے کا غم بھلا دیا۔ اور انہوں نے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اپنے خاوند کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پیشین گوئی کی کہ اس موئے سے یہ بچہ ہزار درجے اچھا شاعر ہوگا۔ استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی والدہ کی دعا کا اثر تھا۔

وحیدی سند ذکر مستند نشانی بزرگوں کی ہیں، فرماتے ہیں کہ میں نے خود بوٹے خاں کی والدہ سے جب اس واقعہ کی صحت کے متعلق دریافت کیا۔ تو انہوں نے یاد کر کے اس کی تصدیق کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت بوٹے خاں کی عمر برس دن سے کچھ کم تھی، بھنڈے خاں مرحوم مرحوم اپنی ایک آواز کے ساتھ سینگڑوں گروؤں کا جھکنا دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے نکاح ثانی کر لیا۔ وحیدی صاحب لکھتے ہیں کہ نکاح ثانی سے تین ماہ چیتر انہیں محمد تنیم میں اکلاگر پڑھنے بھی مل گیا تھا۔ اس لئے آئندہ فراغت کے پیش نظر انہوں نے بیاہ کیا۔ اگرچہ باپ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ لیکن ان کے شاگردان تعلیمی کہ اکثر ان میں سے شاگردان معنوی بھی تھے۔ پر شناسا ہیں کہ ان میں سے بعض نے بڑے خاں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر گلے کا تعویذ بنائے پھرتے تھے۔ اور جس سے جو کچھ بن پڑتا تھا۔ اپنے استاد زادے کی خدمت سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ان شاگردوں میں فخر کاظرہ دستار منشی بیوں بخش اجمل مرحوم کو ملا۔ جنہوں نے ہمت کر کے ایک جمعۃ الوداع کو شاہی مسجد لاہور میں بیٹھ کر لے بوٹے خاں کے لئے ایک گھوڑا اور ٹانگا خریدا۔ جس سے یہ دونوں ماں بیٹا فراغت سے کنڈان کرنے لگے۔ اس وقت استاد مرحوم کی عمر نمیں برس کی تھی۔ آپ نے چالیس سال کی فرتک لاہور میں کوچوانی کی۔ دردی میں انتیاز اور بقائے دوام کا تمغہ لگایا۔ اور نقارۂ فخر کی اس آواز کو نہ سنی دبا سکتا کہ ایک مرتبہ بھی تانوں شکنی کے سلسلے میں ان کا چالان نہیں ہوا۔

استاد کا معمول تھا کہ صبح چار بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے شام سے رات کے نو بجے تک ٹانگا چلاتے تھے، اور باقی وقت مشق سخن کی نذر کرتے تھے۔ بارہ بجے سے تین بجے تک دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے۔ وہ انہیں ایک کھارے کی گلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی مجلس کا یہ عالم تھا کہ چنگڑ محلہ والے مکان کی بیٹھک میں ایک تختا لگا ہوا تھا۔ آپ کی ضعیفہ ماں ہمیشہ کمیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی۔ اور استاد کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کے گھر میں گنگا موجود ہے۔ ایک دن اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے نوکر اور کچھ نہ تھا۔ اجمل مرحوم کا پاؤں ان سے کھا تو استاد نے کہا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ پونی نلکے سے پاؤں نے ٹکر لی ہے تو فرمانے لگے کہ یہاں نلکا بھی ہے؟

انہوں نے بعض کی "حضرت اسی لئے تو آپ کو یہاں لائے ہیں کہ ہر وقت پانی فنا رہے"۔ ان کے پاس پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے بڑے سلقے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے اسالہ میں تو اس باغ کی آبیاری میں ایسا لگا ہوں کہ اُن کے نکلنے کی خبر ہی نہیں" یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔ کیا عجوبیت ہے۔ کئی برس گذر جائیں دانہ تلیں بزار اگر کرتے دیں۔ اور یہ چتونہ ہو کہ گھر میں تلکہ موجود ہے۔ خیر ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انہوں نے دنیا کے نکلنے کی طرف نہ دیکھا۔ اور خدا نے ان کے کلام میں وہ روانی دی کہ آج پانی بھی اس کے آگے پانی بھرتا ہے۔

ایک دفعہ لاہور میں موٹر جیسی بائیچ ہوئیں اسٹیشن سے ہائی کورٹ تک پہنچ پائے گا یہ تھا۔ راستے میں جو اُترے اکثر ٹوٹے بشمار قابو سخن نئی چیز پر ٹوٹ پڑے۔ جی کہ انتی میں سالم ٹانگے کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ میرے دہ متو! وہ زمانہ عجب زمانہ تھا جبکہ سویرے گھوڑے کا یہ خرچ کہ جو پیسے کا گڑ ادھائی آنے کا آٹا اور تین آنے کا دانہ دوسرے تیسرے دن صالحہ۔ دوپہر کو ڈنر کے طور پر ہوا جارہ۔ شام کو پھر چھ آنے کا دانہ گویا ایک روپیہ یومیہ اکیلے گھوڑے کا خرچ۔ اس پر خانگی اخراجات مستزاد۔ اس دوران میں ایک دفعہ استاد مرحوم پر وہ وقت نا تھے سے گزر گئے۔ بعض شناس ماں نے کہ بیٹے کی حیثیت سے وہ ی طرز تعلقی۔ زبانِ طعن سے ان کی ہمت کے سمند کو تازیانہ دیا کہ "تجھے تانگہ چلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا"۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ دوسرے دن ان کی والدہ کو اپنے میکے کا لاشاہ کا لے جانا تھا۔ یہ راستہ اور حبیس جل کر گاڑی کے اس ڈبے میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک کونے میں اس کی ماں پڑی تھی۔ انہوں نے سنانت کے ساتھ جیب سے ایک شیشی نکالی اور بلند آواز سے پکارے۔ صاحبان! ہمارے کارخانے کی دواؤں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے خوب زور شور سے منقولے پڑھنے اور شور مچنے شروع کر دیئے۔ پھر انہوں نے ایک بڑیا نکالی۔ جس میں وہ ایک ایک سوانت پر کھا انڈ پیش گئی تھی۔ اس کی دو دو گولیاں آپ نے گاڑی میں مفت بانٹنا شروع کیں۔ جو آتا الفریہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر ان کی بات کا یقین کر لیتا۔ یہ انہیں گولیاں پھانکتے تھے۔ پھر ان سے پیسے کمانے تھے جن دوستوں سے راز کہ رکھا تھا۔ انہوں نے ان کی والدہ کو خبر کی۔ اس ماں کی مامتا نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو فی الحقیقت ادھنیوں، دھیلوں، پیسوں اور لوڑیوں کے ڈھیر ان کی جیب میں کھنکھنا رہے ہیں۔ اس تفریح طبع پر الیاقت ہر فنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ ماں بیٹے کو محض وبال دوش نہ سمجھے اور نہ کو جوانی کا پابند جانے۔ جس لوہے میں جائے گا کچھ اچھا ہی بے نکلے گا۔

نازک مزاجی۔ نقل۔ ایک دن آپ نے کسی سوچی سے اپنا بوٹ جو بزرگوں کی نشانی تھی گھٹایا۔ اس نے معمول سے زیادہ مجھنے دھاگے کے ساتھ سیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس کوئی اور جوڑا نہ تھا۔ جناچہ مجبوراً اسی کو پہننا پڑا لیکن قدراً ہی پاؤں میں درد ہونے لگ گیا۔ فرماتے تھے کہ میں نے کبھی باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن رینالڈ کے سارے ناول اور منظوم پیر رائجھا کے قصے کی تمام جزئیات گویا ان کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس پر تعجب نہیں۔ تانگے چلاتے وقت گھوڑے پر فی البدیہہ مسلوم قصہ آتارتے تھے۔ تو مجھے حیرت نہیں۔ سواری کے ساتھ کرائے کا تصفیہ بھی نظم میں کرتے تھے۔ مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے۔ یہ سب اس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ وہ نوشادر کا ایک استعمال بھی جانتے تھے۔ جس سے بڑے بڑے علمی گمران کے مرید ہوتے تھے۔

وہ وہ دوہنے میں ایسی صفائی و چستی برتتے تھے کہ اکثر گوجر اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔ بعض جولاہوں کو ان کے فن میں قابلیت خداداد سے انہوں نے ایسی ایسی اصلاحیں دی ہیں، جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ نیل کی تجارت کے اسرار وہ جانتے تھے۔ حکمت کی گتھیاں وہ سلجھاتے تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ انسان کو دنیا بھر کے علوم سے واقفیت رکھنی چاہیئے۔ وہ اس دنیا کو ایک دلچسپ چیز سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں ؎

گلزار بست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ۔۔۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آپ کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ایک وفعہ اوائل عمر میں گھوڑے اور تانگے کا شغل اختیار کیا تھا۔ پھر ہمیشہ اس مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا کئے۔ ذرا دیکھنا۔ کس قدر گرم مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

گھوڑے کو کوڑا جو مارا وہ شوخ اگر آ گیا ۔۔۔ اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آ گیا

استاد مرحوم کی عمر بتیس سال کی تھی جب آپ نے اپنی مشہور آفاق کتاب "گھوڑے کے جنسی تعفنات" تصنیف فرمائی۔ آپ نے علم نفسیات پر یہ کتاب لکھتے ہوئے اس میں گھوڑے کی دماغی عقلی اور جسمانی حرکات پر ایک بیباکانہ بحث کیا ہے جس کا جواب نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس کے جس قدر خیالات بلند ہیں اتنے ہی زبان تعریف سے بالا ہے۔

لطیفہ ۔ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ لاہور میں جوبلی کے جشن پر ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا جس میں یوپی تک کے نامور شاعر شریک ہو رہے تھے۔ استاد گلزار مرحوم نے بھی شاگردوں کے اصرار پر ایک غزل لکھی۔ مطلع تھا ؎

نہ سرکس کا ہنڈی کا نہ بیوپار کا گھوڑا ۔۔۔ لڑے گا آج دو دو ٹکریں گلزار کا گھوڑا

جون بخش اجل فرماتے تھے کہ اس کے صدمہ سے جب وہ اپنے تانگے پر سوار ہو کر مشاعرے کو چلے تو ہر دو ڈنڈے کے قریب گھوڑا بدکا اور ان کے تانگے کی سیٹ نکل گئی۔ اجل۔ مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے جوان ہو کر استاد سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ کو پہلے سے ہی اس کا علم تھا؟ تو آہستہ سے فرمایا کہ میں بیٹھے بیٹھے کبھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں الہامات تھے یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حسن اتفاق تھا جو لطیف طبع کے لئے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

اے گلزار اگرچہ ہم کو آپ سے کوئی نسبت نہیں ۔۔۔ لیکن کچھ کاتا رہے ہیں ہم بھی چرخے میں اب کے تیر نہیں!

گھر پہنچے تو ان کی عفیفہ بیوی اور صغیر فرماں دونوں برس پڑیں۔ کہ ہم غریب آدمی ہیں دو ٹکے کی اوقات کے شاعروں کی طرح خاک چھانتا کوئی نہیں دیتا بیٹھ۔ اس پر بی اماں نے جھاڑو اور بیوی نے جوتوں سے اپنے حال میں مگن لجھنے کی تائید کی۔ اور وہ شرافت کا پتلا صبر و استقلال۔ سب ان تمام مصائب و صعوبتوں کو برداشت کر گیا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ اتفاق سے مرزا یگانہ چنگیزی جو خود صاحب دیوان اور ان کے جلیل القدر شاگردوں میں سے تھے مشاعرہ کے بعد پھر ان کے گھر پر موجود تھے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد انہوں نے اس مطلع کو پڑھا اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہو گیا؟ زبان سے نکلتا ہے وہ بعد میں ہو جاتا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے فرمایا کہ میں ادھر ہی کا فیضان ہے۔

اخیر میں استاد نے تانگا چلانا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی چنبا حجاب رات کے پردے میں قمار بازی کے ذریعے قسمت آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انہیں کے پاس رہتے۔ کسی کے جیتنے پر قصیدہ اور ہارنے پر مرثیہ لکھتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ مرد وہ ہے جسے معمولی ضروریات زندگی بھی میسر نہ ہوں اور وہ ان کے لئے تگ و دو میں مصروف رہے۔

ایک روز شاہ محمد غوث کے تکیے سے باہر رات بسر کی۔ آپ ابھی سو ہی رہے تھے کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور صبح ہوتے ہوتے وہ استاد یگانہ جس کے بعد سب ہیچ گزا میدانیں کا یہ یگانہ بالکلام ہندوستان میں پیدا ہونے کی وجہ سے پاس والے راکھ کے ڈھیر کی طرح خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ افسوس اتنے شاگردوں کے ہوتے ہوئے کسی بے حیا کو اتنی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ اس کی تعریف دو بول کہتا ؎

یوں مریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے ۔۔۔ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

جہاں رمضان رہتا تھا

مولانا اختر شیرانی ایڈیٹر رومان کی نظم "یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ پچھلے دنوں ایک صحبت میں مرحومہ کے تین عقیدت مند یعنی جناب خضر تمیمی، عزیزم عطاء اللہ صحاد اور راقم الحروف جمع ہو گئے اور باتوں باتوں میں اس نظم کا ذکر آگیا۔ مولوی خضر تمیمی کی جان پہچان کے لوگوں میں میاں رمضان ایک بزرگوار تھے جو ریحانہ کے تذکرہ میں انھیں بے اختیار وہ یاد آگئے اور چند منٹوں میں یہ سانچے کی نظم ڈھل گئی۔ خدا کرے کہ اختر کی "ریحانہ" کے طفیل ہمارا "رمضان" بھی زندگیٔ جاوید حاصل کرے۔

(سندباد جہازی)

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

وہ اس کوچے کا لمبردار تھا آزاد رہتا تھا

بہت مسرور رہتا تھا بہت دلشاد رہتا تھا

بسانِ قیس عامر صورتِ فرہاد رہتا تھا

جو اس کو یاد رکھتا تھا وہ اس کو یاد رہتا تھا

اور اس حالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا

یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی چھپر تلے دن رات اس کی چار پائی تھی
یہی دو چار کپڑے تھے اور اک میلی رضائی تھی
وہ اس دنیا کا مالک تھا یہی اس کی خدائی تھی
اور اس کوچہ کے چوڑی سے اس کی آشنائی تھی
کبھی وہ اور کبھی یہ اس کے گھر مہمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

اسی کوچے میں آوارہ دھواں ہے اس کے حقے کا
فضا کا ذرہ ذرہ نوحہ خواں ہے اس کے حقے کا
مگر دھندلا سا خاکہ کہکشاں ہے اس کے حقے کا
ابھی ٹوٹا ہوا نیچہ نشاں ہے اس کے حقے کا
وہ حقہ جس کے دم سے اس کو طمانیان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

ہے سرمہ بیدلوں کی آنکھ کا اس کا غبار اب تک
اٹھائے پھر رہے ہیں بیلچے کچھ خاکسار اب تک
یہاں چلتا ہے لنگڑا کر ہوا کا رہوار اب تک
جھکا دیتے ہیں سر تیمور سے عالی وقار اب تک
یہیں کہتے ہیں پہلے اس سے ایم اے خاں رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

(شیرازہ ۱۶ دسمبر ۱۹۳۶ء)

ماڈرن غزل

حاجی لق لق

کیا ان کو حال دل سنانے سے فائدہ؟
ہوگا تو ہوگا نوٹ دکھانے سے فائدہ

نوکِ مژہ جو دل میں چبھی دل پھڑک اٹھا
کچھ تو ہوا ہے ٹیکہ کرانے سے فائدہ

دل گم ہے اپنا چور کا لیکن پتہ نہیں
عاشق کو کیا پولیس کے تھانے سے فائدہ؟

معلوم ہے دکھاتے ہیں وہ ہم کو سبز باغ
لارنس باغ شام کو جانے سے فائدہ؟

اب بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ میرے بزرگ ہو
کچھ بھی ہوا نہ شیو کرانے سے فائدہ

جو نیچے جیب کے ہے مری جاں اسے چرا
عاشق کا فاؤنٹین چرانے سے فائدہ؟

لق لق زمانہ ہم سے اٹھاتا ہے فائدے
ہم نے نہ کچھ اٹھایا زمانے سے فائدہ

ماڈرن غزل

ضمیر جعفری

غریب خانہ ہمیشہ سے جیل خانہ ہے
مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے

الٰہی خیر! دلِ زار و ناتواں کی خیر
کہ آج ان کا ہر انداز ہٹلرانہ ہے

نہ جاں کی خیر نہ قلب و جگر سلامت ہیں
وزارت رخِ دلدار کا زمانہ ہے

ترا وصال میسر ہو نقد جاں کے عوض؟
بڑی بلند تری "شرحِ آبیانہ" ہے

بمالِ دوست کی جا پان دوستی تو بدا
مثالِ چین مگو عشق "خدویانہ" ہے

ہے مدعائے حقیقی تو دیدِ ساقی کی
شرابخانے پہ کمپنگ تو اک بہانہ ہے

تم آج کیوں پہ گورنر سے بن کے بیٹھے ہو
کہو کہو مری جاں کس کو آزمانا ہے

دلوں کا فرش بچھا ہے جدھر نگاہ کرو
تمہارا گھر بھی دلوں کا کباڑخانہ ہے

نہ دیکھ آہ مجھے اے نگاہِ یار نہ دیکھ
کہ آج تیرا ہر اقدام "جارحانہ" ہے

مجھے ضمیر خدا کے کرم سے کیا نہ ملا
مزاجِ گرم، طبیعت بھی شاعرانہ ہے

چل راوی کے پار

عاشق محمد غوری

چل راوی کے پار
سجنیا
چل راوی کے پار
نہ میں بابو نہ ہیں منشی، جاگ اٹھی ہے قسمت تیری
میں ہوں نمبردار
سجنیا
چل راوی کے پار

ریشم کا لے سر پہ دوپٹہ کھدر کا ہو تیرا کرتہ
اور اُونی شلوار
سجنیا
چل راوی کے پار
رہ میں ملا گر پھولوں والا میں تجھ کو اس سے لے دوں گا
پیسے کے دو ہار
سجنیا
چل راوی کے پار
روکھی سوکھی روٹی کھا کر لیٹ رہیں پیپل کے نیچے
پریم کی ہو جے کار
سجنیا
چل راوی کے پار
سو جائے گر قسمت اپنی یعنی پالیں ہم کو مجی
پھر جو کرے کرتار
سجنیا — چل راوی کے پار

حصّة نثر

غالب

(۱) مرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک کے نام

میری جان!

کیوں اولاد میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ سے لگا، اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات واعتقادات کو سلامت و قوی دے۔ یہاں خدا سے بھی ترقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی ہو گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا خیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں۔ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا انشا پرداز اور فارسی داں ہوں۔ آج دو روز تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملعد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرامگاہ" و "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ ظلِ سبحانی جانتا تھا، "مغفرمقر" اور "بادیہ زادیہ" مخاطب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے تجارد یہ ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں" ابھی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کہیے! اوغلان صاحب، آپ سلجوقی اور ہم آسیائی ہیں، یہ کیا بے مروتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُس کو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے نہ اب گندھی سے طلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

(۲) میر سرفراز حسین کے نام

شعوبیاں سرفراز حسین! ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا، وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے ؎

لیتے در شکر آب است روبا دارد

چھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے۔ مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں، شاید دو میرے صفحہ کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے۔ یا رب سرنامہ میرے نام کا، آغاز و تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا تذکرہ۔ یہ کیا بہر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت قلم نہ کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا اور ماتھے

غالب

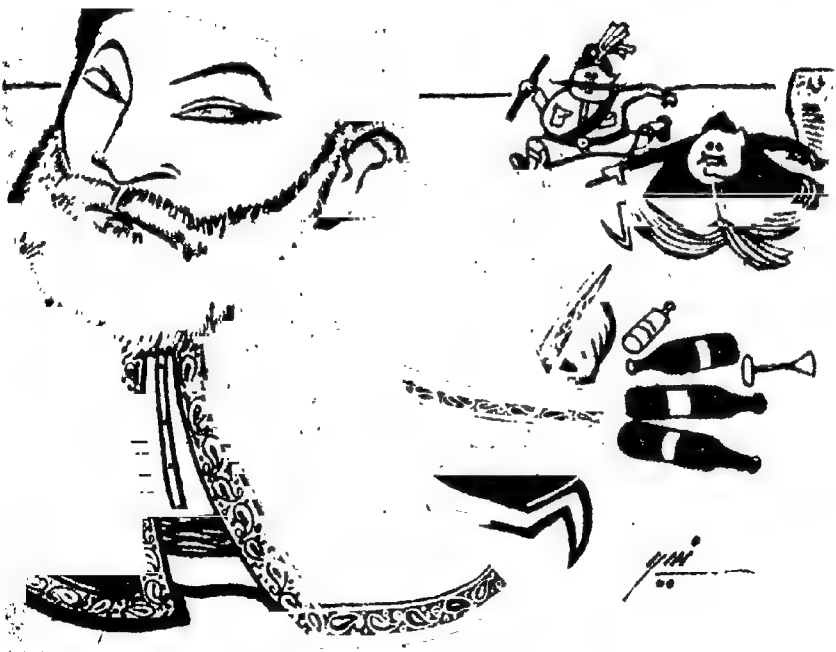

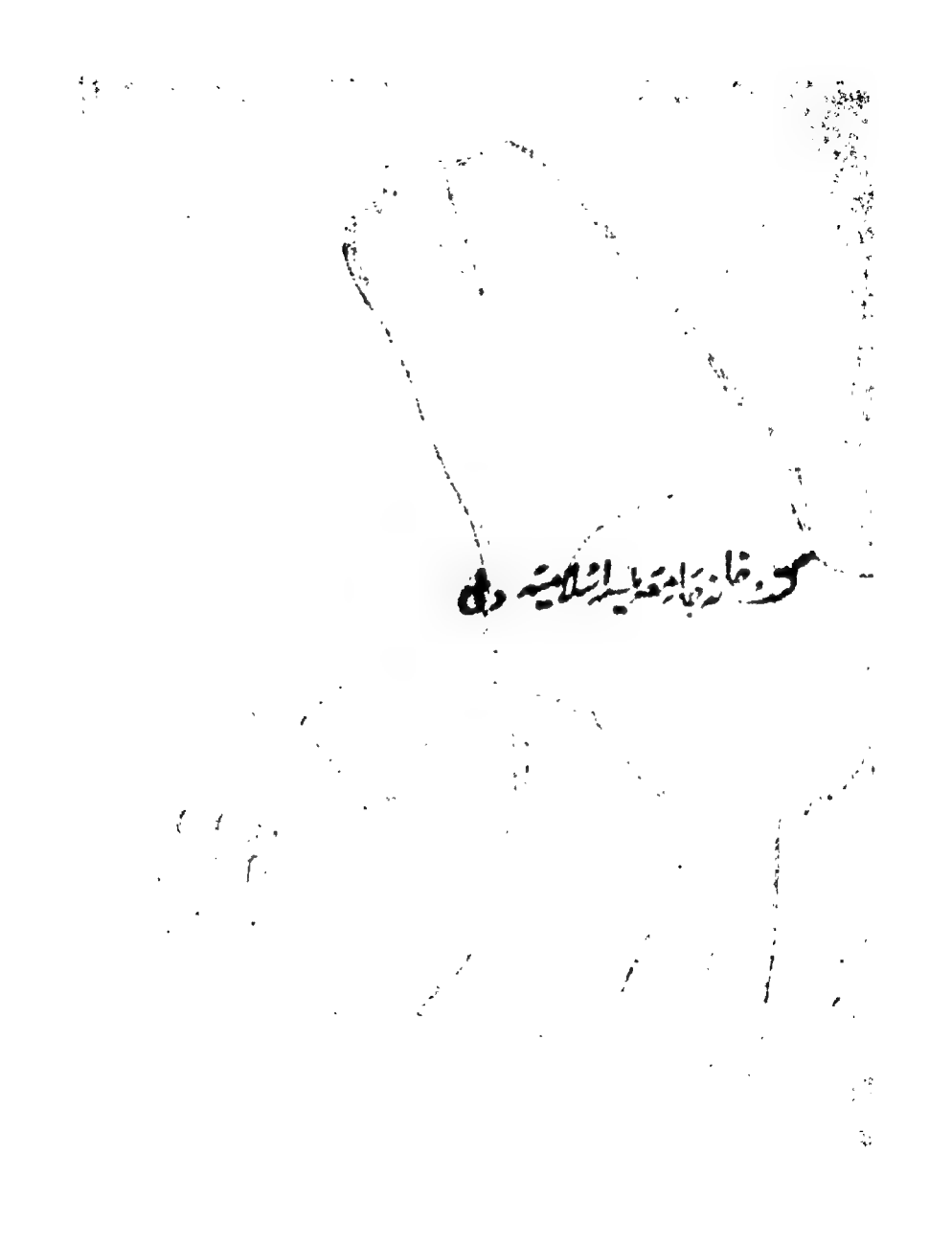

پھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سُنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سُنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میرا دونوں ہنیں اور چچا بھائی جہاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے؟ اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ و اخلاص؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے، توضیح بتعیین نام لکھو۔

---

(۳) منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

بھائی!

یہ پیام و پیما خافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو رسولوں و نامہ لوٹوں اور بولیوں پر بھی کچھ اس باب میں لکھتے کیونکہ یا اور سیما دو مہم شریف ہیں۔ جو شاید کی تاثیر سے تعلق رکھتے وہ کیونکر اور جو اسماء سے متعلق ہو وہ سیمیا۔

جہاں خم سیمیا نخورد گئے
دل سوئے کیمیا نیا ورد م

شعر یاد تھی ہو گیا۔ یہ نہ سمجھا کہ دو کاسے گھسے جو لکھ گئے ہیں، وہ کیا ہے۔ کیا آگے آدمی احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟ ملا نوزانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زنان و زنانہ لکھا ہوگا۔

---

(۴) مرزا تفتہ

حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کہی شعر نکالے ہیں لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بیمن وہ حال ہے کہ ایک مرتبہ ہر سب کا یا بھی کا درخت اگ جائے خدا تم کو سلامت رکھے، دکان بے رونق کسے خریدار ہو۔

---

(۵) مرزا تفتہ

لاحول ولا قوۃ اس ملعون نے بسبب زوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے ہزار ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

---

(۶) میر احمد حسین میکش کے نام

بھائی میکش!

آفرین، ہزار آفرین۔ تاریخ سنے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خط سے کس مزے کے ہوں گے جن کی تاریخ ایسی ہے۔

دیکھیو صاحب ؎

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی؟ اس کی تعریف کے خرے کھائیں گے، اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ مجھ سے مطلب ہے کہ ناحق قم دین محمد غریب کو دو پاؤ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرے لے کر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بفرض محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے تازہ سے بہتر، بارہ سے بہتر ۱۸۵۶ء

علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام

میری جان!

محی پنجشنبہ پنجشنبہ آٹھ، بھو نو، ہفتہ دس اتوار گیارہ یہ ایک شرہ برہم زدن مینہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمہارے خط کا جواب ضرور، لو لکھتے جاؤ۔ مرزا شمشاد علی بیگ کو تمہارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی میت پر کیا مرثیہ ہے مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ مٹھو کا موسم نہیں انگاری کی مہم ہو جائے، بس!

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین طرحی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو رنڈیاں گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور باقی شعر کسی اُلو کے۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر تھرا اس سے قرض لیا اُدھر دوڑ ساری مل کو مارا، ادھر خوب چندھین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر اک کے پاس فشنگ ٹھری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مگس نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ دلی کا خرچ پھپھی کے سر۔ ہاں ہر کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے بھیج دیا۔ اب میرا ۱۳۰ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے ماہ پور کے قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سُود ماہ بماہ لیا چاہے، مگل میں قسط اس کو دینی پڑے، اکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سُود جُدا، مگل جُدا، بی بی جُدا، بچے جُدا، شاگرد پیشہ جُدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ، تنگ کیا گزارا مشکل ہو گیا، روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش سمجھ کو بہ ترک

چاشت کا گوشت آدھا رات کو شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا، روزہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تو بدستور شراب کب کم ہوگی؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پئیں گے تو کس طرح پیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ دو مہینے پورا نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے وجہ تقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق میں تیرہ چودہ کی تبدیلی رات کی شراب جاری ہو گئی گوشت پورا آنے لگا۔

چونکہ بھائی صاحب نے وجہ توقی اور بحالی پوچھی، ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور ہمزہ خاں کو بعد سلام کہنا چاہیے

اسے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دیکھا ہم کو یوں بلاتے ہیں۔ دریہ کے فتویٰ اور روٹھوں کو پڑھا کہ مولوی مشہور ہوا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مار آیا۔ سب اور عرفا کے کلام سے حقیقت تقرب و مدت وجود کو اپنے دل نشین کرا آیا اور رہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو فرقہ مسلموں کو اہل الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ معذرخواہ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مذہب کا عامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ قطع نبوت کا طبع امامت اور ریاست زمانی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی علیہ السلام

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب اور اپنے کو حامی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن بنانا ہوگا اور میں دوزخ کی آگ کو تیز کروں گا۔ اگر شرکیہ و شکیہ نہیں تو مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ مگر مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کرو گے اور کفار حنی نہ کہو گے تو ناجائز قرار دینے کو گناہ جانو گے تو البتہ قہر کو پاؤ گے اور کہو گے کہاں یاد ہے جن روندوں میں تم علاؤالدین خاں کو گلستان بوستان پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپاچے مارے ہیں، نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں، علاؤالدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھایا۔ تم نے چشم پُر آب میرے پاس آتے ہیں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں، تم نے بے جا کیا، آئندہ ہرگز ایسی حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ منتخب نشین طفل سے گزر کر پیر پختہ سال کے واعظ بنے۔ تم نے کئی محفلوں میں ایک شعر حافظ کا سنا کہا ہے: چوں پیر شدی حافظ..... الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظر کا وقف حافظ کے دیوان سے وہ پند سرد نہیں ہے۔ مجموعہ شرمندگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں ؎

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را — تا بنگری صفائے مے لعل فام را

شراب بانگ خوردن صد مرجبیان ہیں — خلاف مذہب آناں حلال ایناں ہیں

ترسم کہ چون فتد نبرد رہ زباز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما

ساقی بگو وظیفہ حافظ زباده دار — کاشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی

میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں، تمھاری بھوجی کہتی ہیں: ہائے دلی! ہائے سری ——— دیوان خانہ کا حال تو اس سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، نقصانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت پچھلی ہے۔ ابر دو گھنٹہ برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک، اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ میز کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اٹھائے مرمت میں یہ بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تو سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے کہو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی بھوجی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو اللہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا بھوجی کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمھارے اس کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک مرمت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالب

مورخہ یکشنبہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء

(نوٹ) اس خط کے مضمون سے ظاہر ہے کہ حاجی خان نے نواب علاؤالدین خاں کے خط میں مرزا غالب کو لکھوایا ہوگا کہ اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو۔ ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و سیہ مستی در عہد شباب اولیٰ

غالب نے جواب میں اسی پر طنز کی ہے۔

بحث و تکرار

سر سید احمد خاں

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی گھڑی گو نیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا ہونٹ اکھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے غراہٹ کی صدا آتی ہے پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور خفیف آواز کے ساتھ دانت کٹکٹے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں اس ہاتھا پائی کے عالم میں اور اُس کی ٹانگ اُس کی کمر میں، اُس کا کان اُس کے منہ میں اور اُس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں اس لئے اس کو نا اور اُس نے اس کو بھاڑ کر بھبوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نا مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ ٹھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے نتھنے پھول جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں۔ ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں خفیف خفیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ جھلا اُس کی گردن۔ اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں پتا ڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو خراٹے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں خوشی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں توں تکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور تاک پڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی ندرکتوں کی مجلس کا اکثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اُس کے پرکھنے کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ اور اگر سچ

پڑھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی ٹھیک ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہیئے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنو۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدبات چیت کہتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز۔ لفظ۔ لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ بہت سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا شاید مجھے دھوکہ ہوا ہو یا میں غلط سمجھا کہو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جبکہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثہ کو آنے مت دو کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو جلد ختم کر دو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہموطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثہ اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خط و کتابت

اگر ہم اپنی قوم کے طریقہ خط و کتابت کی درستی پر بھی کچھ لکھیں تو شاید نامناسب نہ ہوگا جس طرح ہماری قوم میں اور بہت سی فضول لغویات شامل ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں جو ہماری سمجھ میں مذہب اسلام کی بگڑے اور پراثر باتوں کو بے اثر اور کھیل بنا دیتی ہیں

جب ہم کسی خط کو پڑھتے ہیں تو اس میں ایک بہت لمبا چوڑا القاب اور آداب پاتے ہیں ان دونوں میں صرف شاعرانہ الفاظ ثنا و صفت مکتوب الیہ کے ہوتے ہیں جو درحقیقت مکتوب الیہ میں نہیں ہیں۔ حالانکہ القاب میں یا تو بیگانہ وار (اگر مکتوب الیہ بیگانہ ہے) کوا ایسا لفظ ہونا چاہیے جو خطاب کا مشعر اور مخاطب کرنے کے لئے کافی ہو۔ یا اس ولی تعلق یا ادب کو ظاہر کرتا ہو جو درحقیقت کاتب کو مکتوب الیہ سے ہو۔

آداب معلوم نہیں کیا لغو چیز ہے۔ ایشیا کے امراء اور بادشاہ ہمیشہ اس خیال میں تھے کہ جو ہم سے کمتر ہیں وہ بمنزلہ ہمارے غلاموں کے ہیں اور بدبختی سے وہ لوگ بھی اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے اور ہر قسم اور ہر موقع کی ملاقاتوں اور بات چیت میں دونوں اس

خیال کو کبھی بھلاتے نہ تھے۔ اس سبب سے آپس کی تحریروں میں بھی وہ رسم جاری ہوئی جو خطوط کتابت کے لئے زیبا نہیں ہے۔ فضول دے معنے وقت ضائع ہونے کے سوا آداب کے فضول کی رعایت دلی مطالب علی الخصوص اُس زور یا جوش سے جو دل میں ہے ادا نہیں ہو سکتے۔ قوم کے دل میں جو ایک خلوصانہ انفعال پڑا ہوا ہے وہ دور نہیں ہو سکتا یہ ہمکو امید ہے کہ ہمارے اس آرٹیکل کے پڑھنے دلے ادب میں اور خطوط میں جو آداب لکھا جاتا ہے۔ اور نیز ادب میں اور خلاصانہ انفعال میں جو فرق ہے اُس کو فوراً انداز نہ کریں گے۔

اُس کے بعد نہایت شوق و ذوق سے اشتیاق ملاقات لکھا جاتا ہے اور خلوص عقیدت و محبت جتائی جاتی ہے جس کا ایک لفظ بھی صحیح اور واقعی نہیں ہوتا۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو اُس کو مقدمہ مطالب بنانے سے کیا مطلب ہے۔ اس رسم نے ایسا رواج پایا ہے کہ دوست و دشمن دونوں کے خطوط کی طرز تحریر میں کچھ فرق و امتیاز نہیں رہا ہے۔ خط پڑھنے سے جو الفاظ محبت یا اشتیاق اُس میں لکھے ہیں اُن کا کچھ بھی اثر دل پر نہیں ہوتا بلکہ ایک معمولی تحریر سمجھی جاتی ہے۔ جو دوست و دشمن سب کو لکھی جاتی ہے خود پڑھنے والا جانتا ہے کہ میں بھی اس سے زیادہ چکنے چپڑے الفاظ لوگوں کو لکھتا ہوں جن کا کچھ بھی اثر میرے دل میں نہیں ہے۔ ان رسموں نے خط و کتابت کا جو سب سے بڑا نتیجہ ہے اور حالت و مفارقت میں محبت و اخلاص کے ازدیاد کا ذریعہ ہے۔ اُس کو بالکل خاک میں ملا دیا ہے۔

ہماری قوم کے مقدس لوگوں نے ان فضول تحریرات میں ایک اور مذہبی طرہ لگایا ہے۔ کوئی خط بسم اللہ الرحمن الرحیم سے خالی نہیں ہوتا۔ بہت سے بزرگ اپنے خطوط کے عنوان پر محمداً "حامداً" مصلیاً" مسلماً" لکھتے ہیں۔ لفافوں پر انشاء اللہ تعالیٰ، بعونہ تعالیٰ، تیرہ و کمال کرمہ" تحریر فرماتے ہیں اور جن بزرگوں کا مذاق علی اعمال کی طرف مائل ہے وہ لفافہ پر جوابہ قسم بھی لکھ دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان الفاظ کی تحریر سے ہمارا خط ضرور مکتوب الیہ تک پہنچے گا۔ مگر کثرت دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی کچھ بھی تاثیر نہیں ہوتی ڈاک کے جن اکثر خطا اڑا ہی لے جاتے ہیں جو اس سے بھی ادنیٰ خیال کے لوگ ہیں وہ لفافوں پر جو ہر قسم کی دعائیں لکھ دیتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا اُس کے خط کو کھول کر نہ پڑھ لے۔

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک رسمی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقا اور تعبد سنت پر چلنے کا کام ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اسی قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت اور خاصیت ان کے دل میں نہیں رہی۔ جو خوف اس کے کہ اسلام کی باتوں سے اُن کے دل میں نیکی خضوع اور خشوع پیدا ہو سختی اور قساوت پیدا ہوتی ہے۔

وہ بسم اللہ خط پر لکھتے ہیں تمہارے سے پوچھو کہ لکھتے وقت اُس پاک کلام اور مقدس الفاظ کے معانی اور مطالب کا کچھ بھی خیال اور دھیان تمہارے دل میں آتا ہے جس طرح اور لفظ شوقیہ و سخت و سست قلم سے نکلے جاتے ہیں اُسی طرح بے خیال بسم اللہ بھی لکھ دی جاتی ہے۔ میں نے غلط کہا۔ شاید اگر کسی محبوب کو خط لکھا جاتا ہو تو الفاظ شوقیہ و محبت کا کچھ اثر دل میں معلوم ہوتا ہو تا۔ کسی کو سخت سست لکھنے میں بھی دل میں کچھ اثر قصہ کا پیدا ہوتا ہو گا مگر بسم اللہ لکھنے وقت خدا کا دھیان بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے بڑے بڑے شخصوں کو دیکھا ہے کہ شطرنج کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور خط پر جاہداً لکھ رہے ہیں۔ جے۔ الف لکھا تھا کہ بولے وہ پیادہ مرا۔ وہ پیادہ مرا۔ جیم۔ دال لکھی اور کہا وہ کشت۔ اتنے میں الف لکھا اور بولے وہ مات۔ غور کرو کہ اس طرح پر مذہبی مقدس الفاظ کا برتاؤ کیا۔

کچھ دل میں لیکن یہ پیدا کر سکتا ہے۔

ہم نے دیسا ہی دیکھا ہے کہ خدمت گار حاضر ہے ہیں، کاپیاں دے رہے ہیں اور قلم سے خط کے سرے پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً لکھ رہے ہیں۔ ایک کاپی پر بسم اللہ اور دوسری پر حامداً اور تیسری پر مصلیاً لکھا جا رہا ہے۔

ہم نے ایسے خط بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حامداً و مصلیاً لکھے دیکھے ہیں جن میں تمام دنیاوی خرخشات بھرے ہوئے ہیں اُن کاموں کے کہنے کے حکم اور مطالعہ میں مندرج جواباً۔ اخلاقاً شرعاً ممنوع و حرام ہیں بھیجنے خط کا یہ فقرہ بھی یاد ہے کہ از دیگر حالات ہم مطلع فرمایند لفظ دیگر کی تشریح ہم نہ کریں گے صرف مولوی کا یہ شعر پڑھ دیں گے ؎

خویشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

پھر کیا ایسی سنت تھہری بجا لانے سے کچھ ایمان و اسلام کی برکت دل میں پیدا ہو سکتی ہے

شاید یہ کہا جائے کہ یہ تو رسمِ مشرقیوں کا حال ہوا۔ بزرگ و مقدس لوگوں کا لکھنا اس طرح پر نہیں ہے۔ خیر یہ بات صحیح ہو مگر تجربہ سے۔ مشاہدہ سے۔ عقل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب مذہب کی مقدس باتوں کو دنیاوی باتوں میں ملا دیا جاتا ہے اور بطور مذہبی تقدس کے اُس کو نہیں برتا جاتا تو اُن کی کچھ عظمت اور اُن کا کچھ اثر دل میں نہیں رہتا۔ انصاف سے کہو کہ وہ لوگ جو رات دن تسبیح ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں اور جہاں بیٹھتے ہیں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ دو باتیں کیں اللہ اللہ کہہ کر دانے اِدھر کے اُدھر کر دیئے۔ تین لغویات منہ سے نکالیں اللّٰھُمَّ صَلِّ پڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ انگلیوں کو وہ مشق ہو گئی کہ وہ کچھ پڑھیں یا نہ پڑھیں یہ دانے اِدھر کے اُدھر کرتی چلی جاتی ہیں۔ کیا ایسے برتاؤ سے خدا کے نام کی عظمت اور برکت دل میں رہتی ہے کیا اسی حالت میں خدا کا نام سنتے ہی خضوع و خشوع دل میں پیدا ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ ایسے برتاؤ سے خدا کا نام لینا اور کسی کو بدذات کہنا دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ نہ اس کا کچھ اثر ہوتا ہے نہ اس کا۔

ہر کام میں خدا سے مدد چاہنا اور اُس کی طرف رجوع کرنا نہایت عمدہ مسئلہ ایمان و اخلاق کا ہے۔ مگر یہ ایک فعل قلبی ہے جس کے ساتھ ممکن ہے کہ زبان بھی شریک ہو۔ مگر صرف قلم سے لفافے کے سرے پر انشاء اللہ لکھ دینا چہ معنی دارد۔ نہایت عمدہ بات ہے کہ خط کے پہنچنے میں بھی خدا پر بھروسہ کرو۔ اُس سے مدد چاہو۔ مگر لفافہ پر انشاء اللہ کی پٹی بانٹنے سے کیا مطلب ہے۔

میرے ایک دوست نے (جو اس قسم کے رسمیات کے نہایت پابند اور پرانے فیشن اور پرانے خیالات پر نہایت مستحکم ہیں) مجھ سے کہا کہ درحقیقت ایمان کی بات تو یہی ہے کہ جس طرح ہم خط پر مشفق مہربانی ایک رسم کے موافق لکھتے ہیں اسی طرح انشاء اللہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ جس طرح شہر کا نام لکھا پتہ لکھا۔ اسی طرح انشاء اللہ بھی لکھ دیا۔ پس اب غور کرنے کی بات ہے کہ کیا ایسی صورتوں میں اسلام کی برکتیں نصیب ہو سکتی ہیں؟ یہ اسلام کے کام ہی نہیں ہیں۔ یہ تو مثل اندر رسمی باتوں کے رسمی کام ہیں۔ غیر مذہب کے لوگ جب ہمارے خطوں کے لفافے دیکھتے ہیں ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اچھا مذہب ہے جو یہ خیال بتلاتا ہے کہ ایسے لفظوں کے لکھنے

سے متعلق نہیں ہوتا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ صاحب مذہب تو ہنستے نہیں مگر کھنے والے ہنستے ہیں۔

بعض دوست ہم سے کہتے ہیں مگر یہ سب صحیح مگر مسلمانوں کے خطوط پر ایسے الفاظ ہونے مسلمانی کی نشانی ہے مگر نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں کہ جناب ہم ہندوؤں کی طرح خط کے ماتھے پر تشقہ لگاکر اور گلے میں زنار ڈال کر مسلمانی چھپوانا نہیں چاہتے۔ اگر دل کی آنکھیں اندھی ہیں تو خط پر بسم اللہ کا تشقہ دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔

جناب رسول خدا صلعم نے اپنے فرامین پر بسم اللہ لکھی ہو پھر کیا وہ نامے نہیں مضامین کے تھے اور انہیں مقاصد کے تھے جن مقاصد و مطالب میں تم اپنی روزانہ خط و کتابت کرتے ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے خطوط پر بسم اللہ لکھنی سنت سمجھتا ہو تو نہایت بے ادب و گستاخ ہے اور کچھ بھی تعدد و شرائط سنت کی نہیں جانتا۔ اسی بات کو تو ہم روتے ہیں کہ مسلمان مذہب کو مذہب کی طرح نہیں برتتے بلکہ اس کا کھیل بنا لیتے ہیں۔

یہودیوں کا بھی یہی حال تھا کہ محض ظاہری باتوں کو انہوں نے یہودیت سمجھ لی تھی اور اُن کے ہاں علماء و فقہا جو رائی اور توہین کہلاتے تھے صرف ظاہری باتوں پر چلتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ہاں دو فرقے قائم کئے تھے ایک صدوقی جیسے سنیوں میں اہل حدیث اور دوسرا فریسی جیسے شیعوں میں اخباری، دوسرا فریسی۔ جیسے سنیوں میں فقہی اور شیعوں میں اصولی یہ دونوں فرقے ذرا ذرا سی باتوں پر بحث کرتے تھے۔ اور اسی کو کمال دینداری جانتے تھے۔ اس بات کی بڑی احتیاط کرتے تھے کہ کہیں اس قدر انگشت یعنی چھری سے تین رگڑوں میں ذبح نہ ہو۔ اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ آیا گلا کس سے کٹا۔ توریت کے بے طہارت چھونے اور بے لوبان جلائے کھولنے میں بہت احتیاط ہوتی تھی مگر اس بات کی کہ اس میں لکھا کیا ہے کچھ پروا نہ تھی۔ مکان پر مراسلوں پر بچاتی پر آیات توریت کے حروف مقطعات کا نقش لگانا بہت بڑا ایمان اور اعتقاد کا کام سمجھتے تھے۔ مگر جو بدی سینہ میں بھری ہوتی تھی اُس کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ یہی حال بعینہٖ ہمارے زمانے کے متقدس لوگوں کا ہے۔

گول عمامہ، برج کی صورت کا عمامہ، عرب والوں کے عمامہ کی طرح کا عمامہ سر پر باندھے شملہ کئی انگل کا چھوٹے اُس کی تحقیق کئے اور شملہ گدی کے پیچھے شملۂ ریش مبارک ٹھوڑی پر سے نکلتا ہوا۔ قمیص مستون پہنے اُس پر صدری عربی لگائے اور اس پر عبا لئے کمر دائی جس کو جبہ کہتے ہیں۔ حسرتوانی منسوب بہ کیخسرو کا فرہاد شاہ فارس لکھا ہے زیب تن کئے مسجد یا خانقاہ یا کسی مدرسہ اسلامی میں تشریف رکھتے ہیں۔ بعضے نہایت سادہ لوح دیانتوں کا سا لباس اپنی سادگی اور محض للہیت اور خالص بے تکلفی جتانے کو پہنے ہوئے پھرتے ہیں۔ مگر پوچھو تو سہی کہ تمہارے دل بھی کسی لباس پر تکلف یا طبوس سادہ سے آراستہ ہیں بجز اس کے کہ مسواک اتنی لمبی ہو۔ اور ڈاڑھی بن گئی۔ پائجامہ اتنا اونچا ہو اور کرتا اتنا نیچا۔ اور کچھ نہیں۔ اور اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ سب ثواب اور جو کچھ دوسرا کرے وہ سب عذاب قل ائخذتم عند اللہ عھدا فلن یخلف اللہ عھدہ ام تقولون علی اللہ مالا تعلمون

ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم کو شائستہ ہونا چاہئے دنیا کے کاموں کو دنیا کی طرح اور دین کے کاموں کو دین کی طرح برتنا چاہئے دونوں کو خلط ملط کر دینا اور مذہبی باتوں کو دنیاوی باتوں میں گڈمڈ کر کے غیر مذہب والوں کو ہنسواتا نہیں چاہئے۔ دنیاوی باتوں سے تمسخر اور ہنسی اور جنسیت اللہ کے نام کا ادب کرنا ہے۔ لفافے پر انشاء اللہ کی چڑیا نہ بنانی فاصل خدا پر بھروسہ کرنا ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان

ابن الوقت

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی

ڈپٹی نذیر احمد

نوبل صاحب۔ میں نے آپ کے لئے نوکری حاصل کرنے میں جان بوجھ کر خود کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ میں نے خدمت طلب ہندوستانیوں کو اکثر انگریزوں کی مدارات کا شاکی پایا۔ اور اگر آپ نوکری کی خواہش کریں گے تو میں پیروی کی کوشش کرنے کو موجود ہوں

ابن الوقت۔ میں آپ سے بارہا عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگ پشت بہ پشت سے شاہی سرکاروں کے متوسل ہیں۔ ان سرکاروں کی مدارات کا یہ رنگ تھا کہ جھوٹی بڑی ہر قسم کی خدمتیں موروثی۔ یہ کتنے اطمینان کی بات تھی کہ سارے ملازم نہ صرف اپنی بلکہ اسلاف کی معاش سے بھی بے فکر تھے۔ میں واقعات کے طور پر ان سرکاروں کے دستور اور قاعدے سے کچھ بیان کرتا ہوں۔ آپ اُن کو درست نادرست، واجب ناواجب جو چاہیں سمجھیں۔ جو ملنے، معطلی، موقوفی کا نام بھی سارے قلعے میں کبھی کسی نے نہیں سُنا۔ داد و دہش انعام واکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ تیموری نسل نے کبھی روپے کو روپیہ سمجھا ہی نہیں۔ شاہی تنخواہیں اولاد، اولاد کی اولاد پر تقسیم ہوتے ہوتے بعض کے حصے میں صرف پیسے رہ گئے تھے۔ اور کبھی دو دو ڈھائی ڈھائی برس میں ملے تو ملے ورنہ اکثر تنخواہیں محض برائے نام تبرک کی طرح۔ صرف سرکار کی داد و دہش پر نوکروں کا گزر تھا۔ مگر وہ پیسے لوگوں کو ایسے عزیز تھے کہ مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور دہلی کی نقل مشہور ہے کہ قلعے سے ڈھائی یا تین روپے اُن کی تنخواہ کے بھی تھے۔ خواجہ محبوب علی خاں نے تصنیف کا قلم جاری کیا تو مفتی صاحب کا نام بھی زمرۂ ملازمان شاہی سے کاٹ دیا۔ مفتی صاحب تو مفتی صاحب، ایسے تین تین روپلی کی ان کے خدمت گاروں کو بھی پروا نہ تھی۔ مگر مفتی صاحب نے جب سُنا تو دہائی دیتے ہوئے حضور تک پہنچے اور آخر اپنی تنخواہ بحال کرا کر ٹلے۔ غرض قلعے کی سرکاروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ایسا تھا جیسے ماں باپ کا اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ تو صاحب میں تو ایسی سرکاروں میں رہا ہوں اور میں خود اپنے تئیں انگریزی نوکری کے قابل نہیں سمجھتا۔

میرے نسبتی بھائی ڈپٹی ہیں۔ برس دن ہوا نصحت لے کر انہی دنوں حج کو گئے تھے۔ اب آج کل میں آنے والے ہیں۔ مزاج کے ہیں تیز۔ کسی حاکم سے اُن کی نہیں بنتی اور برس میں دو دو بار نہیں تو بچارے ہر برس ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی آئے ہیں اور اپنے حالات بیان کیا کرتے ہیں۔ اُن سے میں قیاس کرتا ہوں کہ واقعی میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں نوکر ہونا مشکل ہے۔ میں نے اپنے بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا کہ کہئے۔ کچھ آپ نے سرمایہ بھی جمع کیا؟ تو کہنے لگے۔ اجی اللہ فقہ کرو۔ کیسا سرمایہ۔ خدا جانے کیسے کیسے کتر بیونت کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی۔ لیا دھیڑے ڈالتی ہے۔ خدا کا فضل ہے۔ میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے۔ بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے۔

ہیں۔ حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور بھی تو ڈپٹی ہیں! از جانی جنبد، برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب۔ خدا جانے، لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ حکام کو راضی رکھوں۔ مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے اور لوگ میرے انام سن کر پکار اٹھتے ہیں۔ اچھی! وہ ڈاکو ڈپٹی کلکٹر۔

میں۔ آپ نے اصل سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہ کر سکتا کہ شاید آپ رشوت لیتے ہوں گے۔

بھائی صاحب بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنگ مزاج آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا۔ میں میں تو سنہ تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں۔ اور آپ کے فرمانے سے بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔

بھائی صاحب۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی۔ انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے؟ ٹور یا دورے میں گئے تو رسد یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی۔ یا شکار کو نکلے تو ہاتھی کے ہاتھی وغیرہ۔ یا خاص خاص لوگوں سے شاذ و نادر تحفہ تحائف۔ سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا۔ رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں۔ اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے ہیں۔ اور صاحب کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ اور شاید کوئی میم والا صاحب ہندوستانی میم ہونے کفایت شعار جز رس۔ اور اس کے دھیلے انڈا اور آنے مرغی کے دام کاٹ دیئے۔ اور لکڑی گھاس مفت کہ یہ چیزیں تحصیلدار، تھانہ دار دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں۔ اور کتنے ہی دام کیوں نہ دیں۔ اصلی مالکوں کو کوڑی ملنے والی نہیں تو ہاں اس کا بھی عجب نہیں مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی۔ مگر اُن کے حصے کی بلکہ اُس سے بھی بہت زیادہ ان کے اردلی، خدمت گار، شاگرد پیشہ، بیٹی کے سلسلے مرتے ہیں۔ اور صاحب کی آنکھ، کان، زبان بلکہ ہندو بلکہ کچھ کہو، بڑی لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص میری طرح ان ہم زادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا، تو کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو۔ اختیارات، حکومت، تنخواہ سب کچھ ہے مگر عزت نہیں۔ اور میں چاہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کر کر کے راضی کر سکتا ہوں، مگر مجھ کو اُن کے نام کی کچھ ایسی چڑ سی آ پڑی ہے کہ دو ہری دو ہری سواریاں ملتا ہوں۔ خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدد ہیں۔ مکان کا کرایہ، اخبار، کھانا، کپڑا، میرا سارا خرچ میرے پنشن سے چلا جاتا ہے۔ سال میں سیکڑوں روپے تو ہسپتال، مدرسے اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے۔ یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں۔ لیکن ڈالیوں اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی لڈو چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں۔ مگر یہ مجبوری دفع ضرورت کے لئے کہ ایسا نہ ہو برا سمجھا جاؤں، یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں چغلی کھانے کا موقع ملے۔ مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے جنہوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنہوں نے مجھ پر احسان کئے ہیں، اُن کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ نہ ورسم نہیں رکھی کہ

جب ہمہ نسی، اتحتی کا تعلق رہا ملتا رہا جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں کہ آخر زبردستی ٹھیل کر، دھکیل کر اپنے تئیں لے جاؤں گا۔ تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو، لوئیں چلتی ہوں۔ مند دستانی ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو۔ اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔ گھڈ جنٹ اسسٹنٹ کی تو ڈیوڑھی پار کا میں ہیں۔ اگر پوزیشن ڈپٹی کلکٹر سے بھی بڑھ گیا ہے (اور بڑھنے کو رتبہ کہاں، تو احاطے کے باہر تو ضرور۔ اور احاطے میں شیطان کی انتڑی کہ جیسے پرلے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں، ویسا ہی صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے لڑکی نذر کرآئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ فٹس دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پوٹی نہیں تو دل کی کپکپی کا بستنے کو بھاگ کے۔ بس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چھکو تھان کر دی ہیں، تو باورچی خانے یا مصلیں میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے دم لیا۔ اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگی تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے داڑھی مونچھ کو سنوارا آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جمالیا چپنے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدب متقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے، خدمتگار درباری کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی سے تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ قصداً ادھر ادھر ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے۔ کرسی نہیں ہونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو، لوٹنے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اندر کی لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا۔ ادھر کو رُخ بھی نہ کیا۔ خیر کوئی آدھ گھنٹے اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہو کہ دو گھنٹے، اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چپٹی لیے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا۔ کیوں جھلا کر کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی نوچواری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آپڑے۔ چار و ناچار چپٹا ہٹا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہو، اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ ملاقات تو شاید ہی ہو۔ لیکن آپ بیٹھئے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں یہ کہہ کر وہ پھر اندر کو جانے لگا، تو آخر زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں، اپنے سر پر؟ تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، ٹکیہ اور ایک بازو فدارد گویا بید کی تباہی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد سے جب جب کوئی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے۔ اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کیا بھروسہ۔ اتنی محنت کر کر

خارج کی جائے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے اور صبر کر۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی۔ تب تو اپنا سامنہ لے کر چپراسی سے کہتے ہوئے اُٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا میں دوبارہ آپ کی اطلاع کر چکا ہوں، کچھ بولے نہیں اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی نکر دکھنا۔ خرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطلق ملاقات نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر اُن کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں، اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پیچھے اُن کو خبر ہوئی چپراسی نے شاید یہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ جن سامنے کے دروازے سے آیا، درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا ہتے عرصے میں ایک بار بھی اُن کی نظر نہ پڑی ہو گی، ضرور پڑی ہو گی۔ خیر! آخر آپ ہی سر اُٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب اقبال بالادست ہو کر اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل کی کرسی پر جو دوسری طرف تھی۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھٹنے پاؤں میں ایک دوسرے کے گھڑکیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا۔ لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کمنے کو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوڑ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہے قسم لے لو۔ تم خدا کے بندے یوقین مانو بس ڈنڈے پر الگ ٹھلگ جیسے اڈے پر کلدم۔ کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ خداوند! سررشتہ دار صاحب میں منتظر ہوں۔ کہ صاحب مجھ کو پوچھیں تو جواب دوں، اور سررشتہ دار مردود، آگے آگے آپ، پیچھے پیچھے ہتھ قلدان لئے ہوئے چپراسی آ ہی گھسا۔ سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں ڈل صاحب گرمی بہت!

میں، اگر دن جھنجھلا کر، ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں۔ اور دل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا۔ ارے ظالم! مجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندہ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملی ہے۔ ناظم پر ہی جفاتی سے خس کو بند بھی دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان۔ جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے۔ اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے۔ کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا بھن رہا ہے۔ لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کروں۔ میں سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی؟ کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئیں یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہتے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں۔ اب سررشتہ دار سے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے۔ اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں نے جب سررشتہ دار کا کاغذ پھیلا لگا۔ صاحب کا منہ دیکھنے، تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں۔ "آپ کچ کی" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں بس تو صرف سلام کے لیے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا۔ بائبل جو شتا کسی کو سوئے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مزے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات کے بالمزہ اور بے مزہ ہونے کا بہت وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی۔

تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھا دَجھلے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت سب کچھ دو ہی منٹ میں ہو بھا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا خدا گواہ ہے۔ صرف ماتھا ٹیکنا۔ وہ بھی اپنے سر کا بھلا اتارنے کے لئے۔ صاحب مجھ سے چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا اُلٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا، تو مجھ کو کچھ شکایت نہ تھی۔ مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں جو ذرا سی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی یہ کایا کی ایسی لمبی چوڑی تبدیل ہو رہی ہے۔ گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا۔ ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے ہوا ہا! میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں، یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لئے مجھ پر تعینات ہیں۔ بہرچند کہتا ہوں مکان پر تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ عید قریب ہے، اس میں سمجھ لینا۔ بے حیا چپکا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ذرا ترش رو ہو کر کہا کہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی بے اعتباری سے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بجس پر بیٹھ لے۔ اتنے میں جمعدار نے بِل اور پرچہ کا غذ نکال میرے ہاتھ میں دیا کہ حضور ملاحظہ کر لیں۔ رقعہ لکھ دیں جیب میں قلم اُٹھاتا تھا، بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ کر دیتے تھے۔ پہلے فرداً دیکھیے کہ آپ کیا لکھتے ہیں۔ اسی کش مکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی کھچی تک جا پہنچا۔ سانس پٹ کھسوے کھڑا ہی تھا۔ ایک کہار مدن پر پاؤں رکھ کر غریب بگھی کے اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا، اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ کر پڑیا بنا اور دیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پڑیا اٹھائی۔ ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً جت ہی پکڑے ہوں گے مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی اوہیڑ بن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی اب یہ لوگ تمام شہر میں اس مارڈھنڈ کو پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے رونی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھایا کہ عزت ایک اضافی شے ہے۔ مجھے اپنے، تو ان وشمال پر نظر کرنی چاہیے ان کے ساتھ بھی تو نہیں ہیں کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے تو حضور مجلس میں سب بیٹھتے ہیں۔ وہاں شوخی کی کیا شرم۔ اسی حیص بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں بلکٹر کے برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا منہ مارے سے گاڑیوں کے سہارے سے پھسل پھسل کر بیٹھے۔ گھر میں سے بان آگئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیے۔ جوں ہی مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے اللہ اکبر! ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی۔ کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔ دوسرے صاحب آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا آج کسی کی دال نہیں گلتی۔ تیسرے صاحب مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آچکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے اصلاح مشورے میں دیر لگی۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے خدا کے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔

سائمن کمیشن اور ہندوستان

محمد علی جوہر

بھائیو! یہ گلا تو میں نے بھانسی کے لئے رکھ چھوڑا تھا، مگر آپ مجھے شور مچا کر مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے تقریر میں آواز بلند کرکے یادنی پھاڑ ڈالوں۔ میرا گلا پڑ گیا ہے، میں کوئی طویل تقریر اگر کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا، لیکن مجھے اس کی ضرورت ہے بھی نہیں اس لیئے کہ مولانا حسرت موہانی خود ہی کہہ چکے ہیں کہ وہ کمیشن کے ساتھ تعاون کے خلاف ہیں، لیکن وہ ہی چیزیں ہو سکتی ہیں، یا اس کے ساتھ تعاون، یا عدم تعاون، کوئی تیسری چیز نہیں ہو سکتی۔ (اور عدم تعاون ہی کا نام مقاطعہ ہے جسے حسرت صاحب مقاطعہ کرنا چاہتے ہیں) لیکن مجھے تعجب ہے کہ وہ مقاطعہ کرانے کے لیے سر محمد شفیع اور حسن نظامی کے پاس گئے۔ (قہقہہ) لیکن آپ حضرات حسرت صاحب سے مایوس نہ ہوں یہ یقینی نہیں ہے کہ وہ بھی سر محمد شفیع یا حسن نظامی جیسے ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنا جیسا کر لیں، اور ان سے اگر مقاطعہ کرا کے ایک متوازی حکومت ہندوستان میں قائم کرائیں (قہقہہ)

ایک بزرگ تھے جن کو سماع سے بہت شوق تھا، ایک دوسرے بزرگ کو سماع سے نفرت تھی۔ جب ایک دن وہ اپنے درست کئے، مجلس سنجی تو محفل سماع قائم تھی، یہ دیکھتے ہی انہوں نے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا جس پر صاحب خانہ نے کہا کہ ذرا آنکھیں بند کر لیجئے تھوڑی دیر بعد نہ داد! آنکھیں کھول لیجئے اور بتائیے کہ آپ نے کیا دیکھا؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے دیکھا رسول اللہ (صلعم) آپ کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس پر صاحب خانہ نے کہا کہ "رسول اللہ (صلعم) بھلا محفل سماع میں تشریف لانے، اگر آنحضور اس کو جائز نہ سمجھتے؟" اس پر دوسرے بزرگ نے فرمایا کہ کیا سلام منع ہی کرنے کو تشریف لائے ہوں" (قہقہہ) امید ہے کہ مولانا حسرت موہانی بھی لاہور اور درگاہ صابریہ، محمد شفیع اور حسن نظامی کو اپنی حرکات سے باز آنے کے لیئے ہی کہنے کو جاتے ہوں (زور کا قہقہہ) ان کو ہم سے کیوں شکایت ہے کہ ہم مالوی جی اور لالہ رنجیت رائے وغیرہ سے مقاطعت کرتے ہیں۔ مالوی جی نے تو اختلاف ترک کر ہی دیا اور کانگرس میں مقاطعت کی تائید کی۔ ہمیں امید ہے کہ لالہ جی اور ہندو صاحبھا کے لیڈر بھی اسی طرح کانگرس کے فیصلوں کا اتباع کرنے لگیں گے۔ جب حسرت صاحب سر محمد شفیع اور حسن نظامی سے مایوس نہیں تو ہم بی لالہ جی سے مایوس نہیں۔ (قہقہہ)۔

تعجب ہے کہ حسرت صاحب کو تعمیری کام کا اس قدر شوق ہو گیا ہے اور تخریبی کام سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ اس وقت ان کے علاوہ مولانا آزاد بھی موجود ہیں۔ میں ان دونوں صاحبوں کو یاد دلاتا ہوں کہ ۱۹۱۴ء میں ایک دن یہ دونوں صاحب میرے پاس تشریف لائے تھے۔ اور چونکہ میں صاحب فراش تھا میں نے اپنے نانہ تکان میں انہیں بلا لیا تھا۔ اس وقت یہ ایک تخریبی کام کے

مجھ سے کہہ رہے تھے اور میرا تعمیری کام پر اصرار تھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ تعمیری کام کرنے والا کوئی نہ کوئی پیدا ہو ہی جائے گا لیکن ہمیں اس کا انتظار نہ کرنا چاہیئے اور جو خواب عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اسے بلا تامل گرا ہی دینا چاہیئے اور جب تک کہ خواب عمارت گرا نہ دی جائے گی، اس کی جگہ عمدہ عمارت کیسے بنائی جا سکے گی؟

حضرت صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ ترک موالات کی تحریک میں ہم لوگوں نے تعمیری کام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم نے گورنمنٹ کے کالجوں کو خالی کرانا چاہا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دیوبند وغیرہ مختلف مقامات پر کھولے بھی، یہ ہمارا قصور نہ تھا، ان میں طالب علم بڑی تعداد میں اب تک شامل نہیں ہوتے ہیں یا اہل ملک ان کے لیئے سرمایہ فراہم نہیں کرتے۔ پھر بھی بحمداللہ جامعہ ملیہ اعلیٰ پیمانہ پر دہلی میں اور دیوبند میں دو پیمانے قائم ہیں۔

تخریبی کام میں سب سے زیادہ پرجوش خود حضرت صاحب ہی تھے، لیکن ان تک نے کانپور میں ایک اسلامی مدرسہ کو از سر نو ترتیب دی تھی۔ اور بحمداللہ وہ مدرسہ بھی قائم ہے۔

اب بھی ہم کمیشن سے مقاطعہ کی آپ کو فہمائش نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہم نے ہندو مسلمانوں کی مصالحت کا تعمیری کام بھی شروع کر دیا ہے اور ابھی خاصی کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ لیکن حضرت صاحب جو ہمیشہ تخریبی کام ہی کرتے رہے ہیں تعمیری کام سے آگاہ معلوم نہیں ہوتے۔ مکان ایک ساتھ ہی ڈائنامیٹ سے اڑایا جا سکتا ہے، لیکن کوئی مکان ایک دن میں تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ تعمیری کام میں پہلے بنیاد کھودی جاتی ہے، جو زمین کی سطح پر نظر نہیں آیا کرتی، ہم نے پہلے وہ بنیاد رکھی، پھر اس پر روڑے رکھنا شروع کیئے۔ پہلے ۲۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو دہلی میں مسلمانوں نے وہ تجاویز مرتب کیں، جن کی حضرت صاحب خود میرٹھ اور پشاور میں تائید کر چکے ہیں۔ اور وہی ان کے مؤید نہیں ہیں، بلکہ ان کے نئے دوست سر محمد شفیع بھی ۲۰ مارچ کے جلسے میں موجود تھے اور ان کے الہ آبادی اعزا اور احباب کے کامل اتفاق سے جو جلسہ میں موجود تھے۔ دہلی کی تجاویز منظور ہوئی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ سر محمد شفیع کا کہنا تھا کہ یہ سب تجاویز خود انہی کی پیش کردہ ہیں، اور وہ اپنے زمانۂ وزارت میں انہیں ایک یادداشت کی شکل میں تحریر فرما چکے ہیں۔ ان تجاویز کو مرتب کرنے کے بعد ہم آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سامنے گئے اور بمبئی میں اس نے بھی قبول کیا۔ اندور کے قبول کرنے والوں میں ہندو مہاسبھا کے لیڈر مسٹر جیکر، مسٹر کیلکر اور ایک بڑی حد تک ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر مُنجے بھی تھے، اور لالہ جپت رائے بھی فرماتے ہیں کہ وہ یورپ جانے سے پہلے ان تجاویز سے موافقت کا اپنے دوستوں کے سامنے اظہار کر چکے تھے۔ اور انہیں نے دوستوں کو بھی انہیں قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ دوسرا تا تیسرا مہینہ تنازعات کے منطق شملہ کانفرنس میں، افسوس ہے کہ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا لیکن حضرت صاحب جانتے ہیں کہ ہم نے جد وجہد کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ جب ہندو مہاسبھا والوں نے ہم سے مصالحت نہ کی تو ہم نے ان ہندوؤں کی طرف رجوع کیا جو کانگرس میں شریک تھے۔ اور الحمدللہ کلکتہ میں ہم کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ تیسرا دور اتحاد جو ہم نے چڑھایا اس کے بعد ہم دہلی آ گئے اور وہاں تمام تنازعات کا فیصلہ ہو گیا۔ اور باوجود بہت سے اختلافات کے جن پر رات کے ڈھائی بجے تک بحث ہوتی رہی، کانگرس نے بھاری ہی تجویز کو تسلیم اور قبول کیا۔ اور مالوی جی کی رسمیں نہ منظور ہوئیں۔ اس بحث میں ایک مسلمان کو بھی حصہ لینا پڑا۔ خود ہندوؤں کو ہندو مخالفین کا جواب دینا پڑا۔ یہ چوتھا دور اتحاد تھا جو ہم نے چڑھایا۔ اس کے بعد خود مالوی جی نے جو یقیناً ہندو مہاسبھا کے سب سے بڑے ممتاز اور بااثر لیڈر ہیں، ہماری تائید کی کانگریس کی مجلس عاملہ کی جو اس کانگریس کے فیصلہ کی سارے ہندوستان

سے تعمیل کرانے کی کوشش کرے گی، شامل ہو گئے۔ یہ پانچواں روا تھا جو چڑھایا گیا۔ کیا یہ تعمیری کام نہیں ہے؟

۹- فروری کو دہلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ وہی تعمیری کام کرنا شروع کرے گی جس پر آج حسرت صاحب اس طرح مگر ہیں، یعنی ہندوستان کا دستور اساسی بنانا شروع کیا جائے گا۔

۱۱ فروری کو اور انجمنوں کی کمیٹیاں بھی شریک کی جائیں گی۔ اور اس کے بعد ہر پرچ میں پورے ملک کا ایک کنونشن دہلی میں منعقد کیا جائے گا۔ اس میں ہر ملت، ہر جماعت، ہر سیاسی فرقہ کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ سب آئیں اور ہندوستان کا دستور اساسی تیار کریں۔ کیا یہ تعمیری کام نہیں ہے؟ اور کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی تعمیری کام ہو سکتا ہے؟

لیکن سوال یہ ہے کہ ۳ فروری کو جس دن کمیشن کے منحوس قدم ہندوستان کی سرزمین پر رکھے جائیں گے، اس دن کیا کیا جائیگا؟ کیا اس سے پہلے کوئی کامل مفاہمت ممکن ہے؟ اگر اس سے پہلے ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے، لیکن اس کے ہونے تک ہم ان خیالات کے اظہار کو ملتوی نہیں کر سکتے جو کمیشن کے متعلق ہمارے دل میں موجزن ہیں۔ ہماری غیرت و حمیت کا بھی تقاضہ ہے کہ ہم کمیشن کو ہندوستان آنے سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کم از کم اتنا تو کریں جس کے کرنے کی یقیناً ہم میں طاقت ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے اس دن صرف ان کے دو کانداروں کی دکانیں کھلی رہیں۔ اور سر بنا ہندوستانی کی دکان بند ہو۔

حسرت صاحب چاہتے ہیں کہ کمیشن کو ایک ڈاکخانہ بنایا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دستور اساسی کے تیار ہونے تک جسے حسرت صاحب کمیشن کے ممبروں کے پاس بھیجنے کے لیے ہم سے کہتے ہیں، ہم ایک پوسٹ کارڈ اس ڈاک خانے میں ڈال دیں جس میں لکھا ہو کہ ہم تمہارا تحفہ قبول نہیں کر سکتے۔ یہ پوسٹ کارڈ صرف ۳ فروری کی ہڑتال ہی ہو سکتی ہے۔

کمیشن کے متعلق مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہم کو چوری سے اتنی شکایت نہیں ہے جتنی سچ سے ہے۔ اگر چوری ہندوستانی نہیں ہے۔ بلکہ ایک غیر ملک انگلستان اور اس کا پارلیمنٹ اور اس کا کابینہ وزارت ہے۔ ہر شخص کو اپنے گھر کے انتظام کرنے کا فطرتی حق ہے، غیر تو غیر کوئی غیرت مند اپنے حقیقی بھائی کو اس بنا پر اپنے بیوی بچوں کا انتظام سپرد نہیں کر دیتا کہ اس کا بھائی اپنے بال بچوں کا انتظام اس سے اچھا کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسا بے غیرت اس جلسے میں موجود ہے جو اپنی بیوی اپنے بچوں کو بھائی کے حوالے کر دے تو بولے۔ یہی حال ملکوں کی حکومت کا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ انگلستان میں ہر محکمہ کا انتظام مساوی طور پر عمدہ نہیں، بعض محکموں کا انتظام جرمنی میں اچھا ہے۔ بعضوں کا فرانس میں اور بعض کا روس میں اور بعض کا امریکہ میں۔ لیکن کیا انگلستان کا کوئی محکمہ اس بنا پر کسی دوسرے ملک کی حکومت کے سپرد کر دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کا انتظام انگلستان کی حکومت سے بہتر کرے گی؟

ابھی حکیم سید وزیر حسن صاحب کا گلا خشک ہو گیا تھا، اور کتنے ہی لوگ اس وقت چلا رہے تھے کہ ہم نہیں سنتے ہم نہیں سنتے، اور عفت کے مارے ان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا، کیا حکیم صاحب اس کو گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے کسی دوست یا دشمن ان کے گلے کو تر کر دیتا؟ ہرگز نہیں، اپنا گلا اپنے ہی تھوک سے تر ہوتا ہے، کوئی دوسروں سے اپنے منہ میں پانی نہیں بھگواتا۔ ہم کس طرح غیروں کو اجازت دے سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کی حکومت کا دستور اساسی وہ تیار کریں اور ہم پر وہ حکومت کرتے رہیں؟

اب مجھے صرف دو لفظ اور کہنا ہیں، ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی پر خود قابض رہے، اور اس کو خود خرچ کرے، پھر بھی اگر وہ کمزور ہوتا ہے تو ڈاکو اس کی پونجی کو اس سے چھین سکتے ہیں اور جب تک وہ کمزور رہے گا، وہ اپنی پونجی پر قابض نہ ہو سکیگا۔ دنیا میں ہزاروں ڈاکے پڑتے ہیں اور خود ہمارے ہندوستان میں ان کی کوئی کمی نہیں لیکن کیا کبھی ڈاکوؤں نے بھی کوئی کمیشن بٹھا کر اس امر کی تحقیقات کرنے کے لیئے بھیجا ہے کہ جس ضعیف و ناتواں کی پونجی انھوں نے لوٹی ہے، وہ اب اس قدر قوی ہو گیا ہے کہ وہ اپنی پونجی ان سے دوبارہ لے سکے؟ ایک ملک والوں کا دوسرے ملک والوں پر قبضہ کر کے اس ملک والوں پر حکومت کرنا یقیناً ایک مقتدر ڈاکو کا ایک کمزور شخص کی پونجی پر ڈاکہ ڈالنا ہے، جب تک وہ قوی نہ ہو سکے گا، اپنی پونجی اس سے دوبارہ نہیں لے سکیگا۔

ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس قدر قوی نہیں کہ ڈاکو سے اپنی پونجی چھڑا سکیں، اس کے لیئے کسی کمیشن کے بھیجنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر تم ہم سے پوچھتے ہو کہ یہ پونجی ہے کس کی، اس کا حقدار کون ہے تو ہمارا صاف جواب ہے کہ وہ ہماری ہے اور صرف ہم ہی اس کے حقدار ہیں۔ اگر ہم ڈاکو کو اپنے گھر سے نہیں نکال سکتے تو کیا ضرورت ہے اس کی کہ جس کوٹھری میں ہم خود بیٹھے ہیں، اس کا دروازہ بھی کھول دیں، تاکہ ڈاکوؤں کا ایک کمیشن ہماری قوت کی آزمائش کرے اور اس کا امتحان لے۔ کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ اس کوٹھری کا دروازہ بند کیا جائے اور یہی انشاءاللہ ۳۰ ذوری کو سارا ہندوستان کریگا۔

حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک

سعیدی انصاری

سرسید کی "بزم ادب" بچے کھچے پرانے لائق پرستش بزرگوں کی گویا آخری محفل تھی۔ اب ان اصحاب کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے جنھوں نے جا بجا یا نقشہ بھی بچھلے پہر کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ان میں سے ہر فرد اپنے دائرہ کا مالک تھا اور مستقل ہستی رکھتا تھا۔ آج وقار الملک اور محسن الملک کی یادگار میں چند سطریں لکھنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

یہ بات عجب لگنے کے لائق نہیں ہے کہ جہاں تک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے یہ دونوں گویا ان کے دست و بازو تھے۔ سرسید کے ساتھ محسن الملک کی نوک جھونک، ادبی رازونیاز جس کا ایک خاکہ مراسلات و لچھپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور محسن کستانہ شواہد مرحوم "تہذیب الاخلاق" کے سیزدہ سالہ فائل میں بکثرت ملیں گے، فتوحات ادبیہ کا بہترین سرمایہ ہیں جن پر مستقلاً اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ میرے موضوع کے صفحات محدودہ میں ان کے پھیلاؤ نے کی گنجائش نہیں۔ یہاں صرف چشم سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہوگی۔

بہرحال کسی کس کو یاد کروں۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، حالی و شبلی وغیرہ وغیرہ سبھی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہو گئی۔ "سرسید کی "بزم ادب" ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضائع نہ کی ہوتی اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی ان کو رہی ہے اور جس کے آثار "معارف" کے نقش اول میں باذاہ موجود ہیں، وہ اقساط و یادداشتوں کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہایت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اس کی پاکیزہ سوانح میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علی گڑھ کی یہ آخری بزم ادب ہمارے لئے دیر تک کیلئے سبق خیز رہتی۔

غیر ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیئے۔ سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی باثر شخصیت خاموش تعریف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی۔ شبلی نے "مولویت" علیگڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاق تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے الماموں کا

دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید کے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافت ادبی کا پتہ دیتا ہے اسی طرح حالی کی پیچیدہ شاعری خیالات کے لحاظ سے سرسید کے فیض صحبت کی ممنون ہے۔ ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روش جدید نے پروفیسر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی ان کے نتائج فکر سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جو کہ تاریخی حیثیت سے کم سے کم ادبیت کا شرف حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سرسید اور جو قتاسہ صرف مربیانہ تھا۔ اس لئے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اس کی کسر ات بھی بمشکل ہاتھ آئیں گی۔

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور مستانہ دل دوماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے۔ "چشمک" کا گزر نہیں۔ ایک واقعہ دلچسپ پل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے لکھتا ہوں۔ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ نذیر احمد مالکیچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوش محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "مولوی" سے پہلے کی مشق سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔

حالی بھی آزاد کی استادی کا دم بھرتے تھے۔ ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو "آبحیات" اور "نیرنگ خیال" پر حالی نے لکھی ہے اور جس میں ممنونیہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعت فکر کا نقش اولین اور اگلی ادبیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ حالی لکھتے ہیں "نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ بعض لٹریچر کے رقبہ حاصل جو عرض بڑھ گیا، لیکن جس کا رقبہ تناسخ جہاں تھا وہیں رہا۔ یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی۔ نیرنگ خیال میں کچھ داد دی ہے کیونکہ آزاد کے قلم نے سب سے پہلے اپنی جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ جس سے اردو اب تک بالکل خالی تھا۔"

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "آزاد اردو کے معنی کا بیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اعلیٰ معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔" تاہم ایک ہلکی سی چشمک ہے۔

ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو یا جوگی معلوم ہوتا تھا، وہ خود نشہ میں چور تھا، ایک عورت صاحب جمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھر آتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک فرد کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا، یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے آتا تھا۔ اسلئے بدمست بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔"

"تزک جہانگیری" کی ریویو میں شبلی فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے۔ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آنے کا جو گلدستہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب تزک جہانگیری سے ہے" اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا ہے تاقدانہ

اور سخن گستریہ ہے۔ یعنی بے مزہ چٹکلے کی ایک خوبصورت مثال ہے جو عنقریب زیر بحث کے تحت میں آسکتی ہے۔

"شعر العجم" جس زمانہ میں لکھی جارہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف مرحوم پر نگاہ رکھیے گا جو رطوبت شتر کینہ نکلنے والی ہے وہ مجھے میرا مطلب "سخندان فارس" سے ہے۔ ایک دو مہینے کو لکھتے ہیں:۔

"آزاد کا سخن دان پارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ۔ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے"

مجھے تحریر فرماتے ہیں "آزاد کی کتاب آئی" بہانا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم دھرا دھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو ہی معلوم ہوتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ بیکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا بارھویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا یونہی سرسری پھر لگا کر نکل گیا۔

میں نے لکھا، میری غرض سخن دان فارس سے نہیں بلکہ آزاد کے "تذکرۂ شعرا" سے تھی۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں "میں آزاد کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا، مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا"

یہ جزئیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلے گا کہ شطریج کی اصطلاح میں بساط ارب کے یہ شاطر مہرے آپس میں کس طرح گتھے ہوئے تھے۔

نذیر احمد بھی تنقیص پسند نہیں تھے۔ ان کی لے دے زیادہ تر سرسید پر رہتی تھی لیکن اس طرح کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا۔ طبیعت میں منقولہ رنگ غالب تھا۔ اس لئے شروع شروع سرسید کے اجتہادات سے ان کو کھٹک سی تھی جو رفتہ رفتہ گئی، اور اس طرح گئی کہ سرسید کے عقیدت کیشوں یا حمایتیوں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ فراخ دلی جس کے شواہد ان کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے، سرسید تک محدود نہ تھی اوروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ایک آدھ واقعہ اشتہاداً لیجیے۔

علیگڑھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے۔ اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور روادار لوگ آکر جمع ہوئے ہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی کے سلسلہ میں ایک آواز یوں گویا ہوتی ہے "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی اب تو ایسا جھول گیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ لیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں" اسی فقروں کا نکلنا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علیگڑھ آئے تھے ہزاروں نگاہوں کے فقلۂ شماعی بنے ہوئے تھے۔ اور میدان کی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گیا۔

اسی طرح نذیر احمد لکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سنایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:۔

"جس طرح پچھلے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے، اسی طرح میری نظم گویا نداے عام ہے کہ میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے۔ اور میں اپنی پنڈلیوں

ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں"

مطلقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ فوقیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے۔

اب میں نفس مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں، یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے۔ اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں "چشمک" کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں، معارف میں تذکرۂ حالی و شبلی کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ ان خطوں میں حالی، شبلی کو اس خلوص حسن اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام کھلتے ہیں وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے۔ اخلاص کی آخری حد ہے، خطوط میں ملتا ہے تو کہتے ہیں:-

"اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے درود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا"

جس خط کو دیکھئے درد محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑوں کا حصہ ہوتی ہے۔ لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ شبلی کے پاؤں کا ماتھا پیٹی آتا ہے تو گھر اکرام کے فرزند رشید یعنی حامد شبلی سے شیرہ عافیت دریافت کرتے ہیں اور باوصف اس کے کہ آنکھ نے جواب دے دیا ہے۔ قویٰ میں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڑھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ الندوہ میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں، اس لئے ایک رباعی موزوں کر کے بھیجتے ہیں کہ الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دے دیجئے گا۔

سیرۃ النعمان جب شائع ہوئی تو حالی نے اس پر ریویو لکھا، فرماتے ہیں "انھوں نے (یعنی شبلی) نے اپنی ہر ایک اپنی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے۔ سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں"

کتاب کی ترتیب، اصول استنباط اور طرز استناد کے لحاظ سے شبلی کو حالی نے "فاضل یورپ" محقق اور اگر وہ مغرور کہیں تو نقاد اور شاعر" کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دکھایا ہے کہ "جس طرح محسن تناسب اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے، اس طریقہ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں"

شبلی "رسم دہلی" پر جذبۂ بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:-

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کہاں سے کودیں، شراب و دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خواجۂ چشم ساقی بھی مدہوش ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرے ہوئے ہیں"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے سبکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی چشمک کا اب بھی پتہ نہیں۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں، اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی بے اعتدالی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی ہے جو آنکھیں

روشنی کی حامل ہوتی ہیں اور کوتاہ یکی گماں گذرتی ہے، اسی طرح نفس انسانی کا رخ روشنی اس کے دوسرے رخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے اس لئے بیرونی اغلاط تصریحات سے کم نہیں ہیں، بہر حال اظہار خلوص کی حد ہو چکی۔ کچھ اصل موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجئے۔

حیات جاوید میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں "اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سرسید ۲۰ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں"

حالی کہتے ہیں کہ اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل مفہوم ظاہر کرنا ہے" حالی نے ایک ایک اعتراض کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی نے اعتراضات کا زیادہ تر حصہ خود سرسید کے بیانات سے اخذ کیا ہے "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت فیصلہ اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا اور پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا، لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے۔ اب یہ دیکھئے شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے کیا حال ہے۔ شبلی نے ابھی المامون (نظم) لکھی ہے یا لکھی ہے لیکن کھٹنے سے پہلے "حیات سعدی" پیش نظر ہے، ایک جگہ یہ لکھتے ہیں:

"ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا۔ اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی جب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ ان کا یہ چمن کہاں تک قائم رہا؟"

سوانح مولانا روم میں شبلی یوں اظہار خیال کرتے ہیں "تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو سنوارا بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا تاہم لوگوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں۔ اس لئے مذاق حال کے موافق وہ نمونہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے"

اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا رویہ سخن حیات سعدی یا یادگار غالب کی طرف ہے تو "چشمک" کی نہایت بیّن مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر

"موازنہ انیس و دبیر" میں ایک کافی مدلل "شعر العجم" میں اختیار نہیں کیا گیا؛ کلیات خسرو میں کی تہذیب و ترتیب جدید طرز پر آج کل کے معرکۂ ادبی میں پیش پیش ہے اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں، حاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے، کہاں تک واقعہ نگاری کے خلاف "مذاق حال" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے؟

چشمک کی دوسری مثال لیجئے:۔

تذکرہ گلشن بے خار کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں:۔ "مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں مرزا نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن جو کچھ ان کے نزدیک شعر نے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ آتش کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا، یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں اور اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور رفیق ہو سکتی ہے؟"

اس طرح بعد کو دسا چہ گلزار نسیم کے حاشیہ ذیل میں لکھ دیا گیا ہے۔ شبلی نے لائق چلبلت کو لکھا تھا کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے"

میں اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے نکلی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے۔ ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے جس طرح بھی ہو سکی ہے کہ کسی مکالمہ (مذہبی) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔ "یعنی چشمک" کے "براہیم ابن" کے مقدمات میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ ان کے طرز کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کے تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے، لیکن اگر یہ فعلی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ "نجا" لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

یہاں تک تو یہ چشمک کی نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ کلامیاں خلاف شکر میں اب ذرا قوی تر شواہد لیجئے۔ مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو کے سلسلہ میں شبلی فرماتے ہیں:۔

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے۔ یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی لیکن یہ اس زمانے کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے؟"

اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقہ سے بالکل آشنا نہ تھے۔ آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اہل طرح محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں پھر جہاں کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیا جاتا ہے جس سے ذاصل مداح کو قوت دینی مقصود ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے، اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے"

ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی، یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے اور اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے، لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابل اعتراض بلکہ خطرناک ہے۔ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خدائی ہے جو واقعہ نگاری سے بمراحل دور ہے۔"

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ شبلی کا روئے سخن کس کی طرف ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمری سے مراد کس کا مقصود کہا ہے؟ مشیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی، لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اس کا جواب صفحات زیر تحریر میں مل جائے گا لیکن جلدی نہ کیجئے اور لیجئے ماسٹر رحمی کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں ہی گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُرفریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپاتا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے، اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے؟

ابھی اور لیجئے۔ موازنہ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:۔

"ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعوئ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں، لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے، وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ وپے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں، ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور سلسلہ بہ سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔"

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے، اس کے اہم نتائج سے کون انکار کر سکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے

جی تک اظہار خیال پر ایک نقاب پڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ نقاب اس قدر ہلکی ہے کہ باریک تاروں سے چھن چھن کر "چلمن" کی شوخیاں آپ کے روبرو پردہ دری کو اکسانیں کی، لیکن ذرا ٹھہر جیئے اس کا سحر عریانی دیکھنے کے لائق ہے۔ یعنی اس وقت تک تصریحات کی جگہ صرف اشارات و کنایات تھے۔ اب صاف صاف سنیئے۔ شبلی کہتے ہیں:۔

"حیات جاوید میں مولانا (حالی) نے سید صاحب کی ایک رُخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے سے تنگ خیالی اور بدنیتی ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعوی کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہرحال حیات جاوید کو محض مدلل مداحی سمجھتا ہوں؟"

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں:۔

"اختلاف آراء بھی کیا چیز ہے۔ حیات جاوید کو میں واقعات نہیں سمجھتا بلکہ کتاب مناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ خیر والناس فیما یعشقون مذاھب"

یہاں دو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کا پُر فریب طریقہ سوانح نگاری "جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی خیانت اور تدلیس ہے" اور کس بے باری سے پہنچنے کے ساتھ رواج دیا گیا ہے۔ دراصل حالی کی ایجاد ہے یا شبلی کی تصنیفات اسی دائرہ میں آجاتی ہیں۔ تاریخی تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے جس پر مولانا نے روشنی ڈالی ہوتی تو دنیائے ادب کے لئے ایک جدید انکشاف ہوتا۔

اسی طرح حالی کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے "موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی" لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس وقت دقیقہ رسی اور جوش انتقاد کا شکریہ! لیکن ایک نکتہ دان یہ سوال کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں، کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (لائف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں، وہ اکثروں کے دائرہ نظر میں ہوں گی، لیکن افسوس ہے کہ حیات جاوید کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں۔ یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں یکجا اقوام جرائم پیشہ" یا "باب الاشرار" کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا غیر مفروری خاکہ اڑایا گیا ہو۔

ایک دوسرے معاصر مضامین کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ بہ لحاظ فن حالی کے جس انتقاد کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں؟ اس کا جواب مجھے خوف ہے خیر امید افزا نہ ہوگا۔ کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عظمت خود ملک کے سب سے بڑے مورخ کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔

بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات جاوید کے لئے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک

شبلی نے ایک شریف انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی اور آخر نے فی ہو کر لکھی اور یہ اپنے سے سادہ چار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہ قطعی ہے کہ حیات جاوید کا مرکز فرشتہ نہیں تھا، انسان تھا، لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنہیں انسانی کمزوری سمجھئے غالب تھے، یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا، در اصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے، اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیصی پہلو اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح تذکرہ کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے۔ جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہ ہوگا اور جسے شبلی کی علمی نفسیت (سائیکالوجی) سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط و خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں حائل نہیں ہوئی۔ شبلی نے الطاف کبھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی اور یہ امر بلا اختلاف انسان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوفات معلوم ہے، اسلئے قطع نظر دوستدار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کر لیجئے تو سرسید اور ان کے رفقائے کار کچھ کہا ہو یا نہ ہو مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ در اصل سرسید کے اختراعی دماغ، دراوی کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ عدم اعتراف در اصل لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی۔ میں یہاں بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ عقائد کو جو جذباتی چیز ہیں۔ معقولات سے جھڑانا جس پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے در اصل کہاں تک اگر اضافہ ہیں جو فلسفی چیز کا مصداق ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائے گا وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہمدرد کے ساتھ شبلی کو اس قدر "چشمک" کیوں ہے؟ کیا یہ جامع جنیات شخصیت شبلی کے ناموران اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ جس طرح ایک خوبصورت عورت، دوسری پر کالہ آتش ہو سکتی ہیں، در اصل جذبۂ اشتراک اس کی تہ میں ہے۔ ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق الف نہیں لکھ دی بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا، لیکن کیا شعر العجم کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہئے؟ اس کا جواب آئندہ چل کر تاریخ دے گی۔ یہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے۔ اس لئے سردست اس لعف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ کے ساتھ جو ایک ذہنی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت اس موازنہ کو جائز نہ رکھے گی۔ اس حیات جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھئے جو ابتدائی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں آج کل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی خواہ کتنی شائستہ سوسائٹی میں موازنہ و مصاف کو جائز نہیں رکھتیں، لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگوں کا فنی تجزیہ ایک سخن گسترانہ فرض ہے، جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، اس لئے چشمک کے وہ عقدہائے سربستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق شبلی کا پہلو کچھ دبتا ہوا سا ہے، کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اپنے محترم کرم فرما معترضین بالطبیعت ہو رہا ہے جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں "چلمن" جس کے متعدد نظائر جہاں تک گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں، وراثت طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے، ایک زاویہ مسلمی کا نوجوان سید الطائفہ جسے آگے چل کر نظام اودنی کا، ایک قوی تر عضو تناسلی کے مسئلے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے:۔

"مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں" جس قلم نے مرقۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو وہ الفاظ، اجتہاد، ترجمہ قرآن کا مہمل اور متروک لیکن سنجیدہ کی عبارت، مناسبت کلام اور ثقاہت بیان کہاں سے لائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں کے ۔ کان دین کی تبلیغ کے لئے سنجیدگی چاہئے، شوخ اور ظریفانہ عبارت اور سنجیدہ معاملات موزوں نہیں"

یہ مولوی نذیر احمد کون؟ وہی جن کا تعلیمی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے۔ آہا۔ آقائے اردو علامہ نذیر احمد۔ ایل ایل ڈی جو ملک میں السنہ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا، جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت معروف بھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے، جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق ہو گا، جس کی بدولت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لئے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے، پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"مستی نکالتیاں اور یار مرتیاں چھپ کر"

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایک مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے۔ نذیر احمد نے مرقۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کے لئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے جب ہمارے لائق ادب بزرگوں میں بیشتروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لئے تھے رہی ان کی ظرافت جو انہی کا حصہ ہے اور جسے آپ کھانے میں نمک سمجھئے اور میں تو پورے کے پورے قاسم کہوں گا جو نئی تخلیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت کی دلیل ہے۔

صرف ایک مثال اور لیجئے۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں نذیر احمد اپنے فصیح لکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے وہ ایک وقت تھا عربی لٹریچر کے جوبن پر ایک بہار آ رہی تھی۔ لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی شغل مذاق شعری سے خالی نہ تھا۔ یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، جس بھی عرب کو بیٹی بولی پر ناز تھا۔ انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا عجم یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کی جائے مگڑھ ہوتی جیسے فصاحت سے عاری تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی۔ بس مزور تھا کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے جو داؤ ان کو خوب رواں تھا یعنی فصاحت، قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسید، محسن الملک، سید امیر علی اور حالی و شبلی تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے۔"

یہی ملاحظت ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے اور یہی تعریف ہیں جن کے لحاظ سے ایک ادیب کو بڑے سے بڑے علمی اور سوانح پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔

یہ بات تھی جس نے کسی زمانے میں حمید کیا دوکی کے صحافی کو نذیر احمد کا شیدائی بنا دیا تھا۔ سر سالار جنگ والی اعلیٰحضرت دکن پر ہیں فائق خاکوں کا دور چل رہا ہے۔ چہروں کا تنوں کی دھیمی موسیقیت میں دفعتہً سرکاری ڈاک آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ مارشاد ہوتا ہے نذیر احمد کی کوئی مراسلت بکر تو فوراً پیش کی جائے۔ ایک منٹ کے بعد جمیل الطبع میز بان شام کے باقر میں ایک کاغذ ہوتا ہے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑتی ہے اور چہرے پر وہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے متبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہتے۔ جو ذوق کے مخاطب ادب کا یہ وہ تمغہ تر تھا جس نے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی۔ لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پہننے لگا ہے جسے ہم اٹھا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بے نمکی ملاحظہ سابقہ کے لحاظ سے کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ ادب چاہتا ہے ان کا کمال انشا پردازی غیر ستائشی جنبش لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کہنا ہے۔ یعنی حالی کے ساتھ شبلی کی چشمک کے جو شواہد پیش کئے گئے ہیں ان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلی کو حالی سے خلوص نہیں تھا۔ شبلی حالی کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ دعا کرتے تھے کہ جب تک مراد تحریری نہ ہو میں ایک قلم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی وقیع روش بصیرت ایسی نگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں خود بین بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔"

پانی پت کے واقعہ کے بعد شبلی کو حالی نے دفعۃً جوش میں جو بات لکھ کر بھیجی تھی اور جس کا ذکر اوپر کر چکا ہے۔ شبلی النعمانی میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی کے عنوان سے یوں رقمطراز ہیں:۔

"مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے۔ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا تنگ گلی فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیاز مندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

بہر حال "چشمک" جو کچھ بھی ادبی حیثیت سے تھی۔ اس کے تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے خوشگوار تھے جتنے باوصف اختلاف و مخالفت کے مقصد کے اخلاص سے باہر ہو کر ہوتے ہیں۔ ان چند سطروں میں خصائص نفسی کے مختلف رخ ضمناً سامنے آگئے ہیں، ورنہ میری غایت محض ضبط اور بعض احباب کی دعائی تقریظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حیثیت سے اردو لٹریچر میں غالباً یہ ایک نیا مضمون ہے۔

شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں

محفوظ علی بدایونی

۱۸ رمضان ۱۳۳۲ھ

اظہارِ تعدس مقصود ہو تو گنہگار اور اعلان تورع منظور ہو تو خطاوار۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے مدت العمر میں شاید ہی کبھی چھپ چھپ کر اور کنسوئیاں لے کر عورتوں کی گفتگو سننے کا اتفاق ہوا ہو، اور اگر شاذ و نادر کبھی ہوا بھی ہو تو یقیناً پہلا موقع ہے کہ وہ چھوڑ اکھنی پاپی عورتوں اور وہ بھی اونچے درجہ کی خاتونوں کی باتیں، اور وہ بھی ذاتی اور خاندانی گھریلو کے کرتے سنا اور سننے کے بعد بھی نہیں کہ اس کان سنا اس کان اڑا دیا بلکہ قلمبند بھی کر لیا۔ اور قلمبند بھی کر لیا تو قلمدان میں بند نہ کیا بلکہ اب ڈھنڈھورا پیٹنے بیٹھا ہوں۔

تمہاری اس بھری بستی میں مشکل سے کوئی سمجھدار متنفس ایسا نکلے گا جو شیخ سماء اللہ صاحب کو جانتا بلکہ اچھی طرح پہچانتا نہ ہو اور ایسا شخص تو اس سے بھی زیادہ مشکل سے ملے گا۔ جسے شیخ صاحب سے دوستی یا دشمنی، محبت یا عداوت کا اچھا یا برا تعلق نہ ہو۔ مگر آفریں ہے شیخ صاحب کو کہ انہیں نہ دوستوں کی دوستی کی پروا، نہ دشمنوں کی دشمنی کا کھٹکا۔ وہ اپنے حال میں مست اور اپنے خیال میں محو ہیں، اور اپنی شانِ رفعت نشان کے اعتبار سے اعلیٰ اولیٰ دوست دشمن سب پر چھائے ہوئے ہیں۔ دھندلا تو سینکڑوں ہزاروں دیکھے سنے، مگر دھندلاہٹ کی بھی اس شخص نے حد کر دی کہ جو بات جس وقت پہلے دن کی تھی، بھلا اس کا وقت ٹل تو جائے اور جس ترتیب اور جس سلسلے شروع کی تھی بھلا اس میں فرق پڑ تو جائے۔ سیر کا جو وقت پہلے دن مقرر ہو چکا ہے، آندھی آئے مینہ آئے، اولے پڑیں، لُو چلے، اس میں تبدیلی قیامت ہی آجائے تو کیسے، ورنہ کیا امکان، نرجایا آگیا مگر وہی خم و چم، وہی آن و شان قائم ہے۔ وہی البیلی چال کہ جب چلتے ہیں دوستوں کے سر پر اور دشمنوں کے جگر پر پاؤں دھرتے جھجکتے جھجکتے ہی چلتے ہیں۔

عنبر خاتون کے ساتھ ان کی شادی کا واقعہ میری، بلکہ مجھ سے زیادہ عمر والوں کی یاد سے بہت پہلے کا ہے۔ جس طرح یہ سچی بات ہے کہ شیخ صاحب ذات کے ساونچے، اور بہت اونچوں سے اونچے ہیں، اسی طرح یہ بھی سچی بات ہے کہ بیوی ذات میں اُن سے نیچی اور بہت گری ہوئی اور حد درجہ کی گری ہوئی لی۔ لیکن اونچی ذات والی بیوی خدائی بھر میں ملنی ممکن نہ تھی۔ بیوی کی ذات اگر گری ہے تو میاں ہی کی ذات سے گری ہوئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں بیگموں اور خاتونوں کو عنبر خاتون سے وہی نسبت ہے جو چھاچھ کو دودھ سے اور بھوسی کو گیہوں سے۔

جن پانچ عورتوں کی گفتگو کے باہمی کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ انہیں شیخ سماء اللہ صاحب کی صاحبزادیاں ہیں جو انہیں عنبر خاتون

کے بعض سے ہیں۔ یا بچوں باپ کے سایۂ عاطفت اور ماں کے آغوشِ محبت میں پل بڑھ کر ماشاء اللہ مرتب ہو چکی ہیں۔ اور اب اپنے اپنے گھروں کی مالک ہیں۔

مجھے تو خود اعتراف ہے کہ اشخاص کی عمر اشیاء کی مقدار اور اجسام کے فاصلہ کا اندازہ کرنے میں مجھ سے ہمیشہ غلطی ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ مقدار اور فاصلے اور جسم میں عمروں کی عمر کا اندازہ ہمیشہ ٹھیک ٹھیک کر لیتے ہیں، عورت ذات کی عمر کے اندازے میں وہ تک اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس لیئے میں ان خاتونوں کی عمریں بقید سال و ماہ و روز نہیں لکھ سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ قیاس و تخمین سے کچھ کم زیادہ لکھ دیتا، لیکن کمی میں تو مضائقہ نہیں دلور مضائقہ کیسا، اُن خاتونوں کی ناگواری کا باعث ہوتا۔ اگر خدانخواستہ بندہ بشر ہے، کہیں زیادتی ہو جاتی تو قیامت ہی آجاتی، یعنی، انہیں مجھ سے سخت کی شکایت بلکہ عداوت پیدا ہو جاتی۔ سب مرد جانتے ہیں کہ جو باتیں عورتوں کو ایسی ناگوار ہوتی ہیں کہ نہ برداشت ہو سکیں نہ معاف، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی عمر کا تخمینہ بڑھا کر کیا جائے۔ اس لیے زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے یہ امر قطعی خلاف مصلحت ہے کہ جس صنف میں آج کل اقتراحیات (سفیسٹیکیٹ) جیسی بہاوران در کیچ ٹکن پیدا ہونے لگی ہیں، اس کے پانچ افراد کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنالوں۔ آخر میرے مکان میں بھی تو دو بچے، روشندان، چوکھٹ، کواڑ، چھپر کھپریل، خدا کے فضل سے سبھی کچھ ہیں۔ بیٹھے بٹھائے بھلی چنگلی جان کو فکر مول لے میری بلا۔

یہ پان کھائے، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں میں مسی اور ہاتھوں میں مہندی لگائے، ڈھیلا ڈھالا کرتہ پاجامہ پہنے، ہلکا پھلکا دوپٹہ اوڑھے، قطب کے پیشہ کیئے بیٹھی ہیں، آسیہ بیگم ہیں۔ جو عمر و تجربہ کے اعتبار سے، چال ڈھال کے اعتبار سے، شکل و صورت کے اعتبار سے قد و قامت کے اعتبار سے سب میں بڑی ہیں۔ اور اسی لیے سب بہنیں انہیں بڑی آپا کہتی تھیں۔ قیافہ شناس ہے کہ بچپن اور جوانی کے دور میں عیش و آرام اور سرت و اطمینان سے گذرے ہیں۔ تیسرا پن یعنی بڑھاپا آیا تو آلام و افکار کو ساتھ لایا جنہوں نے کلیجہ تھوڑے تھوڑے کر دیا مگر ضبط کہتا ہے کہ خبردار جو ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔ چنانچہ آفرین ہے اس کوہ وقار کو کہ چھاتی کے کواڑ بند کیئے دل میں حسرتیں، منہ میں گنگا جمنی بھرے بیٹھی ہے، مجال کیا جو دل کا راز جہان کو بتائے۔ آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ پر جو سیاہ فام خاتون آدھی ساڑی باندھے اور آدھی اوڑھے سر کے جھلے اور اینٹھے ہوئے بالوں میں کوڑیوں اور جھٹے موتیوں کی لڑیاں لٹکائے گلے میں کربا کے دانوں کی مالائیں، ہاتھوں میں عاج کی چوڑیاں اٹھا پاؤں میں چلیں پہنے بیٹھی ہیں، اور جو سب سے زیادہ مفلوک الحال اور شکستہ بال معلوم ہوتی ہیں، افریٰ خانم ہیں جنہیں آسیہ بیگم تو لونڈی افریٰ کہتی ہیں مگر باقی اور بہنیں سالوں آپا کہہ کر پکارتی ہیں۔ افریٰ خانم کے داہنے ہاتھ کو جو دھار بدار سایہ پہنے، اُپ اوڑھے، عینک لگائے ناک بھوں چڑھائے، سب سے زیادہ تیز یا مغرور یقیناً سب سے زیادہ متمول، الگ تھلگ بیٹھی، بلکہ بیٹھی ہیں یہ امری خانم ہیں جنہیں آسیہ بیگم تو امری اور باقی بہنیں منجھی باجی کہہ کر پکارتی ہیں۔ آسیہ بیگم اور افریٰ خانم کے سامنے اور امری خانم کی طرف منہ کیئے جو نیم مشرقی نیم مغربی وضع بنائے لنگے پاؤں ساڑی باندھے چھوٹا کوٹ پہنے، کالر لگائے، اُپ اوڑھے بیٹھی ہیں، یہ پرلکس نہند نام زنگی کافور "حسینہ بیگم" ہیں۔ جنہیں آسیہ بیگم اور امری خانم تو "حسینہ" کہتی ہیں، باقی سب بہنیں "دریائی بہن" دریائی بہن کہہ کر پکارتی ہیں۔ چاروں بہنیں تو میٹھی ہوتی ہیں، لیکن پانچویں، جو غالباً کیا، یقیناً، سب سے چھوٹی ہیں۔ آسیہ بیگم کے داہنے ہاتھ سے کچھ فاصلے پر مغرب کی جانب آفریٰ خانم کی پیٹھ پیچھے کھڑی ہوئی ہیں جو کسی مثل لیتی ہیں کبھی مٹھ جاتی ہیں۔ ان کا قد چھوٹا ہے، مگر جسم گداز اور گٹھا ہوا۔ منہ میں سگریٹ، آنکھوں میں گلابی ڈورے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے جو اکثر تبسم سے ترقی کر جاتی ہے۔ ان کی وضع قطع تو امری خانم کی ہے، مگر مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ "امری خانم" تو تین خانم ہیں

یا معزز و مدبر، شکن و برادر اور سرکہ جیسی، یا ہمہ و بے ہمہ الگ تھلگ سی بیٹھی یا لیٹی ہیں۔ بخلاف اس کے یہ تیز و طرار اور شوخ و چالاک بیبیاں ایک پلڑ قرار نہیں۔ سب سے ملی جلتی، یا ملنی چاہتی ہیں۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اس میل جول، بول چال، شوخی طراری میں تعلی، تفوق اور تخوت، انانیت کا جلگ بھی خاصا جھک نظر آتا ہے۔ ان کا کام شاید اس وجہ سے کہ ان کے پاس روپیہ بہت ہے یا شاید اس وجہ سے کہ ان کا رنگ نہایت سپید ہے، روپا بیگم ہے اور سب انہیں روپا، روپا کہتی ہیں۔ حسینہ البتہ کبھی کبھی چھوٹی بھنو "کہتی ہیں۔

اتنا لکھنے پایا تھا کہ ایک صاحب تشریف لے آئے خاکسار جو اتوار کے باتوں میں مشغول برخوردار . . . . . طول عمرہ جو اسکول کی ابتدائی جماعت میں پڑھتا ہے، اپنی اردو کی کتاب لے کر آ بیٹھا۔ آپ جانیے چھ سات برس کی عقل کی بساط ہی کیا، اب جو یا یا اچھا کاغذ اور اچھا قلم تو شرارت کہو یا نا سمجھی صفحے کے بیچوں بیچ میں مندرجہ ذیل لکھ ڈالیں

"ایشیا سب سے بڑا براعظم ہے۔ افریقہ ایشیا سے مغرب کی طرف ہے، اسے تاریک براعظم کہتے ہیں۔ امریکہ ۱۴۹۲ء میں دریافت ہوا، اس لیے نئی دنیا کہلاتا ہے اوسٹریلیا ایشیا سے جنوب و مشرق میں واقع ہے، یورپ سب سے چھوٹا براعظم ہے۔"

آئندہ کے لیے تو تنبیہ کر دی گئی، مگر خیال ہوا کہ بچے کی طرح مضمون نگاری کے میدان میں اس کا وار خالی نہ جانا چاہیے لہذا بچے کی تحریر بجنسہ شامل مضمون رہنے دی جس کے لیے ناظرین سے سماعی طلبی کے بعد پھر سلسلۂ سخن شروع کیا جاتا ہے

روپا: "بڑی آپا سلام"

آسیہ: جیتی رہو۔ ٹھنڈی سہاگن۔ دعا دینے کو تو دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ مگر درخواست سے پہلے ہی منظوری کا اثر دیکھ رہی ہوں۔ خود نہانا تو کوئی بات نہیں تم تو دودھ سے دوسروں تک کو نہلا رہی ہو۔ ماشاءاللہ وہ کشت ہے کہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہو ہو کر ایران عراق کے گھر بیچ رہا ہے۔ پوتوں کی یہ کیفیت کہ دیسی برآمد مایوس ہو رہی ہے تمہاری سگی بہن پھر کر بچوں کو ہر سنوں تو مجھ خالہ پر تف ہے، اپنے گھر کا تو ذکر کیا دوسروں کے گھروں میں ایسے پھل رہے ہیں جیسے کردی تو شری۔

روپا: یہ سب آپ بزرگوں کی دعا کا اثر ہے۔

آسیہ: کہو من برطہ، فرسہ، سلفہ، المو کہاں تک نام لوں سب بچے بچے اچھے ہیں؟

روپا: جی ہاں سب اچھے ہیں۔

آسیہ: برطہ تو بیچارہ بڑا گوبھ ہے، فرسہ بانکا چھیلا ہے۔ شام ہوئی نہیں کہ وہ خط بنا۔ مونچھیں چڑھا، ٹیڑھی ٹوپی رکھ بازار کی سیر کو نکلا۔ سلفہ نامعقول ہے، لمبا چوڑا، بھاری بھرکم۔ الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی۔ مگر سستی ہوں گھنا ہے۔ المو کو میں نے عرصہ سے دیکھا نہیں۔ پچھلی دفعہ جب تم لے کر آئی تھیں، تب تو جاشر یہ اور چلبلا بچہ تھا، مگر اٹھان ماشاءاللہ اچھی تھی۔ ہونہار اور چونچال ایسا تھا کہ . . . کو بھلا دے

روپا: جی ہاں، اب تو بڑا ہو گیا ہے بھگڑالو بہت ہے۔ بھائیوں کو چین نہیں لینے دیتا۔ آپ نے برطہ، فرسہ، سلفہ کو ایسا بھلایا ہے کہ ہر وقت آپ ہی کے پاس بنے رہتے ہیں۔ میں بھتیرا بلاتی پچکارتی مگر آپ کا گھر انہیں ایسا بھایا ہے کہ ہٹنے اور ٹلنے کا نام نہ

نہیں لیتے

آسیہ : خلا کیسا، آنکھوں سکھ، کلیجے ٹھنڈک، ماں اور خالہ میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ سناتیں کہ ماں مرے ماسی جیئے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ تمہارے یہاں کا سا عیش آرام بھلا غریب کے گھر کہاں؟

روپا : آپا، بڑا نا شکرا تو کہوں۔

آسیہ : شرق سے کہو، بڑھوں کے اچھا بڑا ماننے کی پروا جوان نہیں کیا کرتے

روپا : آپ کے گھر میں اس قدر غربت نہیں جس قدر کہ بے تمیزی، پھوہڑ پن اور گھنونا پن ہے۔ کسی کو کھانے کا سلیقہ نہیں، پہننے کی تمیز نہیں، انتظام کی عقل نہیں۔

آسیہ : (آہ بھر کر) ہاں بہن سچ کہا، خدا کی شان! کبھی ہم بھی آس پڑوس میں تیوتالے اور تمیز والے سمجھے جاتے تھے۔ سینا پرونا ہم جانتے تھے، کھانا پکانا ہم جانتے تھے، گھر صاف ستھرا رکھنا ہم جانتے تھے۔ آج پھوہڑ ہم بے تمیز ہم گندے ہم، گھر نے ہم، گھر اس کی وجہ جانی ہو۔ تایا پیسا مت آئی، گیا پیسا مت گئی۔ گاڑھے میں وام تو سب کریں سلام۔

روپا : تو اب آپ کے وام کہاں گئے؟

امری : (آہستہ بھوں چڑھا کر) کس نے کھا لیئے؟

حسینہ : (منہ بنا کر) کس نے چرا لیے؟

آسیہ : (آہ بھر کر) کہاں گئے؟ کس نے کھا لیے؟ کس نے چرا لیے؟ کیا جواب دوں؟ بیٹیو! دکھے جی کو درد کھانے سے کیا فائدہ؟ امری : اپنی تو ہم کہتے ہیں، پاک رہ بیباک رہ۔ نہ ہمیں بڑی کی بھی سے غرض نہ چھوٹی کی دولت سے مطلب۔ نہ اودھو کا لینا نہ مادھو کا دینا۔ اگر کبھی کبھار کچھ لیتے ہیں تو کچھ دے کر ہی لیتے ہیں۔ ویسے لینے کا ہمیں حق کیا ہے۔

آسیہ : اے امری میں کچھ کہتی ہوں۔ میں نے تو لینے کا ہمیشہ گن مانا، دینے کا کبھی احسان نہیں جتایا، مگر منہ پر آئی بات اب جو کہلائی ہو تو کہتی ہوں۔ دیئے کھولنے اور لیں شرمیاں، دیا لوہا اور لیا سونا۔ میرے گھر سے آگ لائیں، تام دھڑا سندر۔

حسینہ : بیویو، اپنی تو ہم کہتے ہیں۔ ہم ناشکرے نہیں۔ کھا کے مکرے تو نمک حرام نکلے۔ ہم تو نئی باجی اور چھوٹی بھنو کو جانتے ہیں، انھیں کا جھوٹن کھاتے اور انھیں کا اترن پہنتے ہیں۔ اب سے پہلے تو ہمارے گھر میں بھوتی بھانگ بھی نہ تھی۔ جب سے انہوں نے خبر دی ہے چولھے پر توا اور گھڑے پر کٹورا ہے۔ ان کے بچے آئے تو گھر کا گلزار ہو گیا۔

آسیہ : بیویو، مجھے بحث کرنا منظور نہیں۔ اڑی اڑی بات طاق بیٹھے، میل کا بیل، سوئی کا بھالا، بات کا بتنگڑ بن جائے اچھے بڑے ہو جائیں اس لیے جو تم کہتی ہو سچ ہے۔

روپا : کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پیچھے سے دونوں توپوں کی گھن گرج کی آواز سنائی دی۔ سب نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو آگ کے شعلے بھبھیں سوا پایہ دیکھ کر یہ کہتی ہوئی گھر کو بھاگی "ہے ہے جوان مرا لمو بھائیوں سے لڑ پڑا۔"

آسیہ : بہن گھبرانا نہیں۔ اللہ تیرے گھر میں ٹھنڈ سیلک رکھے۔ میں بھنو کو ابھی بھیجتی ہوں، اور ہاں چنو سے بھی کہتی ہوں کہ وہ بنے کو لے کر جلد پہنچے۔ راقم

دیگر از خویشتن خبر نہ تکلف برطرف ایں قدر دانم کہ غالب نام بادا شتم

حدیث الغاشیہ

مولانا ابوالکلام آزاد

دورِ حاضر کی فریبانہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا؟ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین ہی طریقہ پسند کیجیے کہ نہ پورا موروثی اور نہ پورا اسلامی، نہ پورا کانگریسی اور نہ پورا لیگی اختیار کیجیے۔ اب امید واروں کو دونوں کو رام کیجیے۔ ایک ہی طرف کیوں بیٹھیے۔ جب دونوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے تو خیر کیجیے ہی کے کیوں ہو۔ پھیئے جب تک سے بھی رکھ رکھاؤ ہو سکے (یعنی ایک ہاتھ میں ترنگا اور دوسرے ہاتھ میں چھ ناخنہ لیگی ایک اقلیم ایمان سے ملائیے اور وہ سراپا وقت و مصالحہ نفاق، یعنی ایک ہاتھ میں "جام جمی" اور دوسرے میں "مینائے سرخ"

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق!
ہر ہوسنائے کہ نداند جام و سنداں باختن

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲ : ۴۲)

ممشوقِ ما بشیوۂ ہر کس برابر است
با ما شراب خوردہ و با او نماز کرد

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا (۴ : ۱۵۰)

(بعض باتوں میں راہِ ایمان اختیار کریں گے اور بعض میں راہِ کفر۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری راہ اختیار کر لیں)

حقیقت یہ ہے کہ اس "جمع الضدین" کی راہ نہایت درجہ مشکل ہے۔ ایک ہاتھ میں جامِ باطل پر مستی رکھیے اور دوسرے میں سندانِ حق پر چوٹ اور دونوں کو باہم زور و زور سے ٹکرائیے مگر شرط یہ ہے کہ باطل کے جام بلوریں میں بال تک نہ آنے دیں اور سندانِ حق پر کبھی ہاتھ سے الگ نہ ہوئے

ہر ہوسنائے کہ نداند جام و سنداں باختن

اوروں کی خیر نہیں مگر اپنی کمزوری کا تو ہمیں صاف صاف اعتراف ہے۔ اس شعبدہ بازانہ چابکدستی کی مشق کے لیے بڑی بڑی فاطمیتہ کی ضرورت ہے۔ یہ مقاماتِ عالیہ ہم نہتی دستانِ کمال کو بھی حاصل نہیں ہوئے۔

"اتنے میں خبر آئی کہ (ہزار) کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی جوڑے ایک طرف اور ان نقرئی چھڑیوں کا ٹوٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیے اس نادک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔"

ابو الكلام

چشم اگر ایں است و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسکین دی۔ الحمد للہ یہ تدبر و تردد اتفاق سے کہ چھ گھنٹے کے بعد خدا کے مجرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا چونکہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا قیامت ہوگی کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو سلق کی جگہ معدوں سے۔

مگر افسوس کہ دوسرے روز ہماری طبع سلیم پر ایک انقلاب عظیم واقع ہوا الجمن کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے۔ نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں الجھنے کے لیے تیار ہیں کہ "شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے"۔

حوالیان خلوت نے "صحبت نیم شبی" کی مجلس خاص کے مزے لوٹے لیکن اس بادہ گسار دانہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیے کہ صبح کی مجلس عام کو بھی سرشاری اور بے خودی سے محروم نہ رکھا جائے کیونکہ رہ ورسم سے نکل کر جو کچھ گزری اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں لے سکتا اور کیوں لے لیکن اس میں شک نہیں کہ بارہ دری کے اندر تو سبھی مست تھے ؎

بے خود اس دور میں ہیں سب ساقیا
ان دنوں کیا شراب سستی ہے

لیکن ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی آب دوست نے پلاؤ تو در لوق ایسی ہی شے جس کا رنگ مہ بھی مائل اور نظروں کے لیے ولولہ انگیز تھا لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا کیونکہ ہم نے ۸ بجے ہی کو دیکھا کہ شام ہر نے ہوئے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور چہرے اکثر بے حال تھے۔ بارہ دری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیان آزادی ملے جن سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا لیکن وہ رندانہ شان مطلب بھی نہ بتلا سکے! جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے بھی تو نعرہ مستانہ میں حصہ لیا تھا تو ہنسا کی۔ ان کے سر میں خارش شروع ہو گئی حالانکہ اب اٹھ کی جگہ سر نہیں بلکہ پیشانی تھی۔ ع

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

وہاں تو سب دم بخود رہے لیکن ڈیپوٹیشن کی شرکت کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو حل نہ کیا جا سکتا۔ ہم نے سنا ہے کہ بقیہ تمام دن اسی معرکہ آرائی میں صرف ہوا ع

پھر بعد از انفعال اب اور ہی بھگدڑ نکل آیا

بزرگان پنجاب نے خود اپنا بستر لپیٹا کہ ہماری خاتم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور صحبت نیم شبی کی کسی کو خبر نہیں دی گئی اور تو تمام محبوبوں کی قائم مقامی کا کامل لحاظ رکھا گیا تھا! سنا ہے کہ جناب (راجو صاحب) اسٹیشن روڈ سے ہوتے گئے کہ خدا کے لیے اور جو بھی آئے کچھ مگر روٹھ کر تو نہ جائیے ع

تم ہی بچے کہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

خیر یہ تو اس شبِ وصل کی شام تھی، اس کے ذکر کو کہیں جانے دیجیے کیونکہ اصل لطف عقد تو اس کے بعد آتا ہے جب کہ زمانِ بادہ گساری سے "مجلۂ عیش" آراستہ کیا اور "مشکبار" بھی کیا گیا کہ ایک شریک یہاں کی قسمت خفتہ کو مژدۂ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا ؎

وقت آں نیست کہ در حجرہ بخوابی تنہا

ذکرِ عیش بہ از عیش بود ؎

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

پیشتر تصور سے کام لیجیے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں۔ لیلائے شب کی زلف کرسے گذر چکی ہے۔ ایک کنجِ خلوت میں صحبتِ بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم ساز شعلوں کی ؎

وحشی شراب ہے بیٹھے ہیں جا بجا ساقی!

قبل اس کے کہ آپ کسی "مدعی رہ نوردِ الزام دیں" آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی "دست" کی توبہ نے لغزش کھائی اور اس جامِ عہد فراموش کو منہ سے لگا لے یا بقول کسی کے "دستِ طلاقی" نے پیش کیا تھا تو انصاف کیجیے آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے؟ اور یہ تو وہ مقام ہے کہ ارادت و عبادت کے قدم بھی ڈگمگا گئے تھے ؎

ساقیا مرہونِ احسانِ عالمِ جوانی! ست!

خود صحبت آرایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی "پُراسرار" صحبتیں! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گذر رہے ہیں؟ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاملو، کمنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان دلفگار کو زمرۂ رندانِ عزیمت، پھر مثل سے پرستی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں؟

مست بر بستر من افتد و زندان دانند
حالتِ مست کہ بر بستر ہشیار افتند

اب اُدھر کی سُنیے۔ یہاں تو شب زندہ داران بادہ گساری "صبحِ خمار" کی اعضا شکنیوں میں کروٹیں بدل رہے تھے اور اُدھر صبح کاذب ہی سے اجلاس کا ہال تماشائیوں سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصولِ مقصد کے لیے جو "ہنگامہ" کیا گیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہال کے منتظمین کی طرف سے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا اور یہاں تک ہمیں بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آج اسٹیج پر پردے سے جو پتلیاں نکلنے والی تھیں، وہ تھیٹر کے آموختہ یاد کیے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے سے زیادہ نہ تھیں اس لیے ضرور تھا کہ "باصطلاحِ عوام" اس "تماشہ گھر" کے لیے ٹکٹ بھی مقرر کیا جائے۔ لیکن اس پر طرہ یہ تھا کہ ٹکٹ کے لیے پہلے تو شور مچا گئی کہ صبح آٹھ بجے سے پہلے لے لیے جائیں، حالانکہ جاڑوں میں آٹھ بجے تک رات کی کہر سے فضا بھی صاف نہیں ہوتی۔ پھر ٹکٹ کے لیے تھیٹر کے صدر دروازے پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جو لوگ وہاں پہنچے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے یہاں جائیے۔ راجہ صاحب کے ہاں سے صدا اٹھتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں اسی طرف پچھلے پاؤں پھریے!

یاں سے جاں ہوا ں سے یہاں حکم ہوا قتل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے رہے بستر اپنا

اس سے غالباً مقصود اصلی یہ تھا کہ ان مشکلات کی وجہ سے آزاد خیال طبقے کی محفل جمع نہ ہو سکے۔ یہ بھی خبر اڑی تھی کہ ایک جماعت قتل کے لیے باہر سے طبقے پر بلائی گئی ہے۔ ایک جماعت ماوی ہے کہ پولیس کی قوت سے بھی کام لینے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن صبح کو یہ ان تمام انتظامات کے عمل میں لانے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب ملتفق ہو گئے تھے کہ جب نجمیں باہم صلح کر لی ہے تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف؟ (ناظم پاشا) جب ساتھ مل گیا تھا تو (کامل پاشا) بے فکر ہو گیا تھا کہ کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ فوج کی اصلی قوت ان کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو لیکن اس وقت تو منہ رہے۔

بہر حال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا اور اس تماشے کا ایک ہی ایکٹ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہمارے عشوہ زا دوست باہر نکلے اور رندلیوشن پیش کیا۔ وہ بیٹھے تو مجید (سید حسن) بگڑ کر اٹھے اور تائید کی ع

یکے بد زدی دل رفت و پردہ دار یکے

اب نہ ۲۶ کے جھرک تھے اور نہ مویدہ ؎

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پہ اختیار
نہ سہی کر لیا سہی آخر بنا لیا

۲۶ء کی سہ پہر کو ہمارے دوست کا مزاج بہت گرم تھا۔ ان کی تقریر اتنی پرجوش تھی کہ اس کی لپیٹ میں ہم کو بھی ناگوار گذری اور ان سے کان میں کہا کہ خدا را ذرا لب و لہجہ نرم کیجیے۔ علی الخصوص یہ بات بھی کچھ اچھی نظر نہیں آئی کہ سارا زور "جوش محمد" اور "مسلمین اللہ" کے طبع پر وہ صرف کر رہے تھے اور تقریر صرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر شخصی ارادت ظاہر کرنے میں جاری تھی۔ حالانکہ بہتر تھا کہ بغیر تشخص و تعین کے وہ سب کچھ کہتے۔ ہم کو اعتراف ہے کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اس وقت قابل تعریف ضبط و تحمل سے کام لیا اور اپنی تقریر میں ایک لفظ بھی نہیں کہا کہ جلسہ ان کا مخالف تھا مگر غصہ تو وہ تھے ہے کہ موقع شناسی کی ہمت ہی کب دیتا ہے؛ لیکن آج ان کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ برسوں جن لوگوں نے ان کے جوش سے استفادہ سے اپنی انگیٹھیاں روشن کی تھیں آج ان کو آغاز تقریر ہی سے جمائیاں آنے لگیں۔ برسوں ہمارے دوست کے ہاتھ میں شامپین کے جام تھے۔ آج انھوں نے چاہا کہ ٹھنڈے پانی ہی کو واٹر گلاس میں بھر بھر کر تقسیم دیں۔ سوڈا بھی نہیں۔

ہم نے تقریر کا پہلا لفظ ہی چکھ کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے احباب سے کہہ دیا تھا کہ آج یا تو صرف پانی ہے یا پانی اس قدر ملا دیا ہے کہ مزا اور ذائقہ دونوں کا پتہ نہیں۔ ؎

مرا اے مے فروش آں بے خودی نیست
مگر در بادہ آب کردہ باشی

سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پر خدا کے لیے اعتماد کیجیے لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ

قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی گو اچھی علامت ہو۔ ع قسم جس سے کھائیے سچی پھر بھی ضرورت کیا ہے کھانے کی!

ہمارے دوست کو معلوم نہیں ہے کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ قسموں اور عہد و پیمان میں نہیں ہے بلکہ کسی اور ہی چیز میں ہے سچا اعتماد پیدا کرنے والے نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دوسروں سے لی ہیں اس نکتے کو (خانخاناں) نے سمجھا تھا ؎

بکشش مستی و صاحب حد بیکار ست　　نگاہِ اہلِ محبت تمام سرگذ ست

قبل اس کے کہ کوئی کچھ کہے خود ان ہی نے ڈپٹی شپ کی تجویز کو ساری چپک تک سے تعبیر کیا اور پھر وانشہ اباللہ جب ایا نہم کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیا یہ اس کا ثبوت نہ تھا کہ خود ان کا ضمیر بھی اس وقت حالم اضطراب میں تھا۔ اس لیے خود ہی اپنے سے کھلتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں وصاف معلوم ہوتا تھا کہ آج جو کچھ زبان سے نکل رہا ہے اس سے ہمارے دوست کو خود بھی حیا آرہی ہے ؎

میں اپنی پلشم شوق کو الزام خاک دوں　　تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں؟

رزولیشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے بجائے نے ہوش و حواس کھو دیے تھے جن نوجوانوں نے پرسوں بازی گلابازی سرگرمی تقریر میں دکھائی تھی آج ان کی گرج اس ہنگامے کے پیا کرنے میں کام آگئی۔ جتنے جتنے گلا پھٹ بیٹھ جاتا تھا مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہہ رہا تھا۔ آواز اُگلنے اُگلتے مرد کھ جانے تھے مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلغاری محاصرہ کی پلٹنیں اس بیکاری سے کچھ اُکتا سی گئی تھیں۔ اب انھوں نے ایک گھنٹے کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لیے بارہ دری کے اسٹیج کو "ہائر تھین سرکس" کا تماشا گاہ فرض کر لیا اور لگے بے تحاشہ قلابازیاں کھانے ؎

دل از تمکیں شود بے ذوق زنہار　　گہے طفلی شود مستانہ مے رقص

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سُرخ، گردن کی رگیں اُبھری ہوئیں، گلے شدت شور و ہنگامے سے پڑے ہوئے، ہاتھ میں پھٹتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں کو اضطراب رقص سے قرار نہیں۔ منہ سے کف اُڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لیے آپس میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی رومال نکال کر منہ پونچھنے اور پھر کف اُڑانے میں تعطیل جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا اور نہ اس کی رعایت ملحوظ رکھنے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشِ تواجد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لیے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چپو لگا کر گھومتا تھا۔

یہ ایک رقص مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا اگر (سرہنری اور نگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پُرجوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔

آسان اُردو

ڈاکٹر عبدالحق

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چلی تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا۔ یہ عذر تو ایک لطیفہ ہے لیکن عام شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ سچ مچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اس کا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے۔ آج مجھے بھی آسان لکھنے کی اتنا کرنی پڑی ہے خدا کرے اس کا نتیجہ بھی عرب مرلو نکلے۔

یہ واقعہ ہمارے لیے سبق آموز ہے اس کا ذکر میں نے اس لیے کیا تھا کہ اردو کے اس نئے دور میں پھر ویسے ہی آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہماری زبان پر ایک اور وقت بھی ایسا ہی آیا تھا۔ اس بدعت کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جدت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے مشکل اور ثقیل فارسی عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیئے تھے کہ عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے مٹیٹ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیئے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقاہت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لیے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب علم میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا "صدر پر انصاب نوازل ہے"۔ آپ سمجھے کیا کہا۔ مزاج (جس کی زبان سب سمجھتے اور عام فہم ہوتی ہے) وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی فارسی لفظ لکھنے شروع کر دیئے جو کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں مثالیں پیش کر کے آپ کی سمع خراشی کرنا نہیں چاہتا اس طالب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا اس کے گھٹنے میں درد تھا۔ حکیم صاحب نے معائنہ کے بعد کہا۔

حقیقت کا منھ کھلوا دیا۔ وہ بیچارہ ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اب کے حکیم صاحب نے زور دار ڈانٹ کر کہا حقیقت کا منھ کھلوا دو۔ وہ ناک نہ سمجھا اور اسی طرح منھ اٹھائے دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم قمر سے جو ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا کہ یہ کیسا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔ جو وہ تو یک گوار تھا، آپ معاف فرمائیں گے اگر میں اس تقریر سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو اس کا مطلب سمجھے۔ اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے "جبڑا کھلوا دو" تو کیا ان کی شان میں جھٹے پڑ جاتے اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آجاتا؟ مگر نہیں وہ مطلب کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو

عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اگر عام بول چال میں یہ باتیں کہیں تو شان کہاں رہی۔

یہی حال مولویوں کا ہے۔ وہ اپنی تقریر و خطابت میں موٹے موٹے عربی یا فارسی کے لفظ اور جملے کے جملے مزے لے لے کر بڑے تکلف سے بولتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ جانتے ہوں کہ سننے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نہیں سمجھتے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ گو نہ سمجھے ہوں لیکن دل میں سب قائل ہیں کہ یہ بڑا مولوی اور بہت بڑا عالم ہے۔ مرعوب کرنے کا یہ بہت اچھا گُر ہے۔

سرسید احمد خاں نے جہاں اور بہت سی بدعتوں کو توڑا مجلسوں کے ایک یہ بھی ہے۔ مگر سید کی سادہ نویسی مشہور ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہ لکھا کرتے تھے میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے اور انھوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انھوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض وقت انھیں سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال میں وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ سرسید کے بیان مثل رہے ہیں۔ اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کس نکتہ میں ہیں۔ فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر لکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے بھی اس پر لکھا ہے۔ انھوں نے کیا لکھا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ یہ جی ان کو کیا پڑی تھی کہ ایسا پیرایہ اختیار کرتے۔

سرسید کہتے تھے۔ اس لئے تاکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھ سکیں گے اس کی نسبت سے اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرایہ میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل زبان ہو تو اصل مقصد فوت ہو جائیگا اور سے منبولیت حاصل نہ ہوگی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے دیوں کا نام نہیں سنتے جو عام طور پر مقبول ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزت انھیں کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کئے ہیں۔

ہم آسان اس لئے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان ہے۔ بہت مشکل ہے۔ اول تو لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ جمالے ذہن میں اسقدر صاف اور روشن ہو اور اس کا ہر پہلو اسقدر سجا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہی ہمارے ذہن میں مبہم ہوتا ہے تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل لفظ اور پیچیدہ طرز بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کونسا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے۔ لفظ میں بڑی قوت ہے۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ بعض وقت اچھے اچھے دیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے۔ دوسرا آتا ہے اسے بھی ہٹا دیتا ہے تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ غرض سی دبدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا ہو۔ اس گُر سے واقف ہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب اپھر پیچ اور سیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ہے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی ہوئی ہے کہ بڑے اور پرشکوہ لفظوں میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لئے پرشکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور شخصیت جتانے کے لئے بھی۔ لیکن ٹھاٹ اور دل نشینی کے لئے آسان اور چھوٹے لفظ ہی کام آتے ہیں۔ بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت ہوتی ہے۔

ایک بار مولانا حالی کے پاس ایسی تحریر آئی جس میں بہت سے مشکل اور دقیق لفظ تھے اور عبارت بھی پیچیدہ تھی فرمانے لگے کہ لوگ جیسے لاتے

AB
ABCD=
EFGHI=
'KLMN=
PQRS=
YW=

یں ہے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ جو لکھنے میں زبان کے سوا آدمی چہرہ اور ہاتھ کے مشابہ اور چہرے کے تیور سے بھی کام لیتا ہے۔ لکھنے میں یہ میسر نہیں اس لئے وہ تحقیق اظہار پر کمیت و جدت سے اس کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ لیکن لکھنے زبان پر قدرت نہ اور لفظ کا صحیح استعمال معلوم ہو تو وہ گفتگو سے زیادہ تحریر میں مؤثر پیدا کر سکتا ہے۔

مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا۔ جس کا میں اشارتاً ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" فی صاف پر نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد انھوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا پیسے کے لئے بدل "شتر اف" ایڈیٹر کے لئے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کی ما ہوا اور غیر مانوس ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا یعنی "احمد المکنی بر ابی الکلام الہندی"۔ لاحول ولا قوۃ۔ یار دو ہے یا اردو دشمنی سے زیادہ سے زیادہ اردو نما عربی یا عربی نما اردو کہہ سکتے ہیں۔ نقائی یا تنقید لسانی کی نظرت میں ہے۔ بعض اخبار والے اور دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اڑے اور عجیب و غریب واہی تباہی الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دیں۔ ایک ان کے مقلد اخبار کے ایڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح شروع کیا۔

"بعد از انقضائے دہور و سرور ایام و شہور" اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا تھا لیکن یہ ہوا پن زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ عجیب چلنے والی نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے نہ چلی۔

الفاظ کا جادو

عبدالماجد دریابادی

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی سرائے میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعث توہین، لیکن کسی ہوٹل میں قیام کرنا بھی باعث شرم نہیں، حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ سرا مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور ہوٹل مغربی ہے، انگریزی ہے، وغائق ہے۔ کوئی اگر یہ کہہ دے کہ سرائے خاں بھٹیارے سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اُس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں، لیکن خاں ہوٹل کے منیجر سے آپ کا ٹھاٹ ربط ضبط ہے، اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ سرا کے بھٹیارے اور ہوٹل کے منیجر کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں؛ کسی مدرسہ میں آپ مدرس ہیں تو بس کچھ معمولی ہی سے، لیکن کسی کالج میں اگر آپ لکچرار یا پروفیسر ہیں تو معزز ہیں۔ صاحب وجاہت ہیں، حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے مدرس اور پروفیسر بالکل ایک چیز ہیں۔

ندوہ کے دارالاقامہ میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی دارالاقامہ کا نام جب آپ شبلی ہوٹل سمجھتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے۔ مدرسہ میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ بے قیمت ہیں، لیکن اگر آپ کا تعلق کسی کالج سے ہے تو آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟ اب ہر مدرسہ طبیہ اسکول ہے اور مدرسہ تکمیل الطب اور مدرسہ مطبع الطب اب تکمیل الطب کالج اور مطبع الطب کالج ہیں۔ مدرسہ طبیہ دباجیہ کا زمانہ گیا۔ اب اس کا صحیح نام طبیہ دباجیہ کالج ہے۔ بھی درسگاہوں کو چھوڑیئے خود دینی مدرس گاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن لگے جب زبانوں پر مدرسہ چشمہ رحمت کا تذکرہ تھا۔ اب وہ چشمہ رحمت کالج ہے اور وہاں کے صدر مدرس "پرنسپل" صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ کے سب سے بڑے استاد کو صدر مدرس ذرا کہہ کر تو دیکھئے، فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب صدر مدرسی کا نہیں پرنسپل کا ہے۔

کوئی آپ سے کہے کہ آپ گلی میں کھڑے ہو کے گلی ڈنڈا کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما جائیں گے، لیکن جب آپ کرکٹ یا فٹ بال یا ہاکی کا میچ کھلے میدان میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے، تو اُس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے نہ چھوٹوں سے! جنڈے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑے گئے تو آپ اپنے کو کسی کے سامنے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے لیکن جب آپ کے شہر میں باکسنگ (مکے بازی)، کا مقابلہ ہو گا یا ہیوی ویٹ چیمپین آجائیں گے تو ان کے کمالات کا تماشہ دیکھنا روشن خیالی میں داخل! کہیں پوری رہس یا نوٹنکی دیکھنے کھڑے ہو جایئے تو خود آپ کی ثقاہت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجئے کہ ڈراما جیسے فن شریف کی شرافت وعظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے!

پہنچیں کہ کسی پیاؤ، کسی سائنڈہ، کسی ٹھاٹری سے آگاہ کی شناسائی ہوگئی ہے تو اُس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف اپنے ہم عصروں کے سامنے بھی کچھ تجنیب کرہی کرتے ہیں، لیکن چارلی چاپلن اور ہری پکفرڈ کے کمالات فن اور آرٹ کی جتنی داد دی جائے جب دیکھئے مصوری محفلوں میں بازرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اجتہادات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد دی چلی جائے گی! ٹٹوں کا بیشہ بھی بھلا کوئی عورت کا پیشہ ہے اور خواہ مخواہ آپ سے کسی نوٹ یا ٹھنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی تلاطیاں کھانے والے جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو نہ آپ ان سے منہ میں گھرلتے ہیں نہ ان سے تعلقات بڑھانے میں!

جوتے یا جواریوں سے خاطر ہے، ہماری شرافت کو کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اُس کی جان ایک کردیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں ہمیں دعوت نہ دیجئے۔ ہمارے لئے علین عورت بن جاتی ہے اور بڑے بڑے شریف، معزز، معزز ہونے کی بازی لگاتے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے تھکتے ہیں کسی کباڑیئے کی دوکان پر دو ان پر مول قول کرنا عام عورت کی شرافت کے لیے باعث ننگ لیکن مال روڈ پر پیک ایلی کی کوٹھی پر گشت لگانے میں کوئی ہتک ہے یا شرم، اسے کہ پیک ایلی جیسا لوں کباڑیئے عشق کی بازی میں اکثر اوقات ہی ہیں!

چوک دروازہ آہن آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خرید کے تو جانے والوں کی نظریں بچا کر، لیکن ہمت کیجئے میں دلیر لوگ کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر بلا تکلف روک کے اور کیک پیسٹری کی خریداری بنفس نفیس بے جھجک فرمائیے اس لئے کہ دلیر لوگ صوفی کہلاتے ہیں!

نظیر آباد کے چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ خاص خریدنا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی ہوئی دوکان پر پہنچ کر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق! کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر "بیسٹران" پر جائے تو ہی عار الفخر میں تبدیل ہوجائے! "نائی بے چارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اُس کے اُسترے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کو ناگوار افرا سکتے ہیں، لیکن وہی نائی جب اپنے کو ہیئر ڈریسر (HAIR DRESSER) کہلانے لگے، اطالوی حجام کی دوکان پر ہیئر کٹنگ سیلون کا سائن بورڈ لگا دے، تو وہی ناگوار آپ کے لئے بطیب خاطر گوارا و پسندیدہ بن جائے۔

عالم کا پیادہ جب تک "پیدل" کا ہمزاد ہے حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر "بیاف" کہہ کر پکارا جائے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بعد نہیں بلکہ "بیاف صاحب" ہے، کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوسکتا ہے کہ آپ کے خدمتگار بھی وہی ذلیل اگر کسی (BATA) کا نام کہلائے گے، تو صاحب کی حالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے۔ اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا (BATA) کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل عزت، نسبتی کا سا ہو کہ کوئی بھائی بڑے سے بڑا ہو، آپ کی نظر میں محض حقیر ہے لیکن وہی بنیا اگر کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے، تو دیکھئے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کسی رئیس کا مصاحب آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت سے کچھ، خوشامدا چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے لیکن صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری اقدسے۔ ڈی۔ سی کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں وسعت و مستعدی رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! انجمایت کا نام آیا، اور آپ کے ذہن نے قصائیوں اور کنجڑوں، نائیوں اور دھوبیوں، اور دوسری نیچ قوموں کا تصور شروع کردیا لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور میونسپل بورڈ کے الفاظ سنے گئے اور آپ کا ذہن، ان فرنگی پنچایتوں کی بلندی پر رشک کرنے لگا۔

کوئی مولوی غریب اگر حالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے، تو فی ہے، کودن ہے، کندہ ناتراش ہے۔

محض لٹاتا ہے، لیکن اگر کسی ایڈورکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے لفافے آتے ہیں۔ تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔ فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام، آج محال ہے کہ کوئی زبان پر لاسکے۔ لیکن لنڈن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات، ناولوں کے نام سے، سرخ رسمائی کے، قلموں کے نام سے، سنسنی خیز نمبروں کے نام سے زینت بخش دفتروں کے نام سے صاعقہ افزا ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ماہ ہر ہفتہ اور ہر روز صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و دلجمعی کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا روشن خیالی کی دلیل اور تہذیب و تعلیم یافتگی کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ تو باغبانی کا پیشہ اختیار کیجئے تو آپ اُسے گالی سمجھیں لیکن مکینیکل انجینیری کے جملہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ "جراح" کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ کس درجہ پست ہے، لیکن سرجن کے نام لینے سے اُس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے۔ حلاج اور جرّاح کے جملہ سے آپ کے خیال میں کیسی دانی، لیکن کیمیا دیکھنے والے اگر شکار شناسی کے بھی ذکیٔ ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ ہرگز! ہاتھ میں لئے اور مزدور کے سر پر گٹھڑی اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت یقیناً نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر ٹیکسٹائل کے بڑے بڑے کارخانے دار ہیں تو یہی معززین بلند میں بزرگوں کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حسن عقلمندی و وہم پرستی لیکن فلاں اداره کے ساتھ میں فاؤنڈرس ڈے یا یوم تاسیس دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہان روشن خیالی۔

کلکٹر کے چپراسی یا پولیس کی چوکیداری کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی کا ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے۔ کسی ڈانسنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں کے سامنے ریڈیو ہے بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں بیگم صاحبہ کے نغموں سے لطف اٹھائیں گے! اعلیٰ علم، یکسر جس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کرلے گی، پوری بیباکی سے آپ اُس کے چرچے بڑے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لئے یہ بھی کافی ہی نہیں کافی سے زائد ہیں۔ اپنی ذہانت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں فرنگیت کا کتنا دماغی رعب ہم پر اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے۔ معنی و مفہوم متحد ہوتے ہیں لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے واسطہ سے "صاحب" کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں اُن کے دیسی مترادفات سے زیادہ کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ ہیبت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لی ہے! انگلوں نے ہیبت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کرلئے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا، نہ ہلاکو سے۔ نہ دارا سے نہ سکندر سے۔ یہ شرف مخصوص صرف اسی دو یا چوجی کے لئے اُٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ فتح کرلئے جاتے ہیں۔ اور ہاتھوں ہیروں کے علاوہ عقلوں، دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خطِ غلامی لکھا لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غریب حکومتوں کے پاس، جزیرہ ٹمبر جس دقیع، ہنر و عیب کا معیارلے دے کے اس بنیا پر رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی پسند التفات کا مصرف ہے۔ عزت بھی صاحب کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ اور دنیا بھی وہیں کی بخشش۔ اب نہ ہندو، ہندو ہے، نہ مسلمان مسلمان۔ سب رعایائے سرکار۔ اب مسلمان نہ زید ہے نہ عمر، نہ بکر۔ اور ہندو نہ رام ہے نہ کرشن، نہ گرینڈ، بلکہ سب کے سب چھوٹے چھوٹے "صاحب دین"۔

اسماء نکرہ اور الفاظ عمومی کو بھی چھوڑ دیجئے۔ قیامت یہ ہے کہ اعلام اسامہ فرنگ یورپ "زندگی کی دیا سے محفوظ نہیں تمیاں کلو" نی پ نے اپنے ہاں جب دیکھا کہ بانی بی کرتے پایا لیکن مسٹر بلیک (BLACK) آپ کے شہر کے سوسر بھی میں "کلو اعظم" آپ کے محلے ہی میں رہتا ہے لیکن پروفیسر بلیکی" (BLACKIE) یونیورسٹی ایک ممتاز پروفیسر ہیں "لالہ گھ سی رام" بیچارے سے تو بنی باوس کی عمری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے لیکن بریگیڈیر جنرل ہے (HAY) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں "ہاں وضاحتی اور میاں شبراتی کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن مسٹر ے ((MAY) اور ڈاکٹر فرائڈے (FRIDAY) پارلیمنٹ کے ممبر ہیں "مٹھو" کہاں "لالہ طوطا" کو کار اپنی ہی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں لیکن سر جان "پارٹرج" (PARTRIDGE) آپ کے عدیہ کے گورنر تھے۔ مسٹر کاک (COCK) اس وقت تک آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں اور سوان (SWAN) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں "آپ کی ماما کا لالا کا شیرا بے چارہ اب تک چپراسی کی جگہ کی امید واری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (BULL) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے۔ مسٹر لیمب (LAMB) اور مسٹر کڈ (KID) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور سپرنٹنڈنٹ مجسٹریٹ ہیں۔ "دریا دستگھ" غریب کو نی جھلاری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سر جان لیک (LAKE) دیکھتے دیکھتے بی آئی آر کے ایجنٹ ہو گئے۔ "لالہ" کو باری مل کے بجائے عوائض نویسی کا کام بھی نہ چلا جسٹس اسمتھ (SMITH) ہائی کورٹ الہ آباد پہنچ گئے "بیچ بچاؤ" کی زندگی فوربانی کرتے کرتے ختم ہو گئی "سر چارلس وڈ" (WOOD) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں "جنگی گھسیارہ بے چارہ عمر بھر گھاس ہی چھیلا کیا۔ سر جان فارسٹر (FARLSTER) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کونسل جنرل ہو گئے۔

خدا حافظ

قاضی عبدالغفار

۱۹ تاریخ کی صبح کو بمبئی چھوٹا سا قافلہ سمندر کے ساحل پر احباب واعزا سے رخصت ہو رہا تھا۔ بمبئی کے اور باہر کے بہت سے احباب جمع تھے، اور وہ تماشہ بھی ہو رہا تھا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان پھولوں کو یکجا وزن کر سکوں جو میں نے اپنی عمر میں دیکھے یا استعمال کیے ہیں، تب بھی ان کا مجموعی وزن ان ہاروں اور گلدستوں سے یقیناً کم ہوگا جو ۱۹ کی صبح کو میرے جسم پر لادے گئے تھے۔ گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ اتنے کہ بلا مبالغہ دم گھٹ رہا تھا، ہاتھوں میں گل دستے دیئے جا رہے تھے اتنے کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ مجھ پر سادہ لوح مسلمانوں کی عقیدت و محبت برس رہی تھی، اور خدا جانتا ہے کہ عقل سلیم مجھے ملامت کر رہی تھی۔ نفس ایک بچتہ کار ڈاکو کی طرح جو کسی بڑے مہاجن کی دولت لوٹ کر خوش ہو رہا ہو، چاہتا تھا کہ میں اس کے تمام تر احساس حیوانی میں غرق ہو جاؤں۔ مجھ سے داد چاہتا تھا کہ ذرا دیکھنا بمبئی کے یہ کچے پکے اور کردہ پتی تجھے کس طرح جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں، دیکھ تو وہ تیرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں، وہ تیری تو صیف میں رطب اللسان ہیں تو ان کی نظر میں ایک رفیع و اعلیٰ انسان ہے۔ لے بے وقوف۔ آ میرے ساتھ چلا چل۔ تیرے لیے دنیا میں اس سے بڑی نعمت کیا ہے کہ تجھ سے بہتر انسان بھی تیری تعریف کریں۔ ..... اس طرح ان سادہ لوح مسلمانوں کے منوں پھول ضائع ہو رہے تھے۔ ..... وہ ہار جو شب کی بیخودی میں مسل کر دہ گئے ہوں، وہ پھول جو اول شام کی بدمستیوں میں کچل گئے ہوں، وہ رٹیاں جو محبت سے گوندتی گئی ہوں اور بے پروائی سے توڑ ڈالی گئی ہوں، ان سب میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے۔ بدمستی ہوتی ہے، بے خودی ہوتی ہے، کیف گناہ ہوتا ہے مگر دھوکہ اور فریب نہیں ہوتا۔ آج جو پھول گلے میں پہنائے جا رہے تھے، ان میں خلوص ہی نہیں، فریب بھی تھا پہننے والے کی خود فریبی اور پہنانے والے کی توہین بھی تھی۔ پجاری جب مندر میں اپنی مورتیوں میں پھول چڑھاتا ہے، تو وہ پھول اس کے انکسار عبودیت کا مظہر ہوتے ہیں، معبودیت کے علاوہ اس سے اس کا نفس عقلہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اب کو قومی زندگی کے چشموں کا پانی گندہ ہو گیا ہے، موجودہ ہنگامہ میں ظاہر پرستوں نے جوش بلی کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ جب سے پھول ہوں، بہت سے ہار ہوں، اونچی آوازیں ہوں، تکبیر کے نعرے ہوں، جلوس کے ہنگامے ہوں اور تقریروں کے دریا بہیں، گویا کہ قومی جذبہ کا فرض عین ادا ہو گیا!

قومیت کا یہ سمجھ تخیل قوموں کی زندگی کا سرمایہ ہے، وہی انسان کے تمدن کو روم و یونان و فینیو اور اتلی کے عہد بکر و فریب اور دور کیوں جائیں خود ہندوستان میں حکومت مغلیہ کے عہد آخر کی تاریکیوں اور گمراہیوں میں گرا تا ہے۔ آج ہندوستان کی قومیت کا تخیل قرآن کی الوہیت اور وید کی روحانیت کی ایک بوسیدہ تصویر ہے، وہ اس قدر پست ہے کہ اب کسی ذرا سے قومی کام کے لئے انگلستان کا سفر بھی ضروری

صد تسبیحہ و تقدیر قرار پاتا ہے۔ گویا کہ جہاد کا بہترین محل یہی ہے جس کا کوئی ہندوستانی اقدام کر سکتا ہے، وہ پھل، وہ ہار، وہ قصیدے، وہ ستائش گر، وہ اجتماع، محبت و عقیدت کی وہ نمائش سب کچھ مل گیا۔ صرف اس لئے کہ کسی شخص نے تین ہفتہ انگلستان میں رہ کر دو چار ملاقاتیں کر لیں، دس بیس تقریریں لکھ دیں اور چند تقریروں میں اسلامی مسائل کے گھوڑے دوڑا دیئے جب تخیل کی پستی کا یہ عالم ہو اور نظر اس قدر محدود ہو کہ پانی کے ایک چھوٹے سے بلبلے پر تیرنے والے عشرت محل میں چند روز سفر کرنا اور چند روز انگلستان و پیرس کی تہذیب و تمدن کی مینا کاریوں سے متمتع ہونا بھی ایک مجاہدہ قرار پائے تو جان لیجئے کہ اس قوم کا مرض پرانا ہے، اور اب علاج محض گریٔ سحن سے نہ ہوگا۔ کچھ آج نہیں، میرے دل میں یہ خیال اکثر آیا ہے کہ آخر یہ تماشے کب تک ہوں گے۔ تماشہ گاہ میں ہر شب کو تاج الملوک بکاؤلی کے سرہانے پہنچ جاتا ہے، لیکن صبح کو جب تماشہ ختم ہوتا تو اس تاج الملوک نے بھی بات کے روغن کو گرم پانی سے دھو ڈالا اور بکاؤلی کی نرگس شہلا کا سرمہ بھی بہہ گیا۔ اس پر نصیب برافگنم کے تماشہ گاہ میں شب و روز یہ تماشے ہو رہے ہیں۔ لمبی تانیں، بلند آوازیں، بہت سے خوبصورت ہار اور گلدستے، پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جلوس قوم کی بیداری کی روشن دلیلیں یہ ہیں: خدمت و مخدومیت کا تخیل وہ تاج الملوک ہے جس نے بکاؤلی کو محض خواب میں دیکھ لیا ہو اور ایک کاغذ کا پھول بنا کر دکھاتا پھرتا ہے کہ یہی میرا گل مراد ہے!

پندرہ دن کے اس بحری سفر کی نوعیت یوں تو وہی تھی جو ہر ایسے سفر کی ہوا کرتی ہے۔ صبح سے شام تک جہازوں کا چلتا رہنا، معدہ کا ہندوستانی ریلوں کے تھرڈ کلاس کی طرح لاوا اگلنا، سمندر کی صحت بخش ہوا میں انتہائی شدت، راستہ میں ملنے والے جہازوں کا نظارہ، کبھی کوئی جزیرہ نظر آ جائے تو اس کا تماشہ، سمندر میں کم یا زیادہ تلاطم ہو تو اپنے کمروں میں پڑا رہنا اور زندگی کا ایک گونہ بے لطف ہو جانا۔ موسم اچھا ہو تو جہاز کے عرشے پر تفریح و ورزش، دو چار ہمسفروں کے ساتھ چہل قدمی اور گپ، جہاز کے قفقہ کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نئی نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے یا پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرے۔ جب کبھی پہلا بحری سفر شروع ہوتا ہے تو ہمیشہ بڑے بڑے ارادے جہاز پر ساتھ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ قوی خیال ہوتا ہے کہ سفرنامہ اور روزنامچہ ضرور ہی لکھا جائے گا۔ وہ ایک بڑی مفصل اور دلچسپ کتاب ہوگی جو ہندوستان واپس آ کر شائع کی جائے گی، اور اگر دل میں ارمان زیادہ ہیں تو اس ذریعہ سے اپنی شخصیت کا اچھا خاصہ اشتہار بھی دیا جا سکیگا اور اگر مفلس ہیں تو کتاب کو فروخت کر کے خالی جیب پر بھی کچھ احسان کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ارادے تو سب کچھ ہوتے ہیں، اور جہاز پر پہنچ کر پہلا خیال میرا بھی یہی تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ مگر اس کی تکمیل صرف اتنی ہی ہوئی کہ کبھی کبھی ایک دو صفحے لکھے اور ان کو واپسی کے وقت تک نہ دیکھا! اب ان صفحات کو دیکھنے بیٹھا تو وہ پرزے بھی یاد آئے۔ جہاز کی زندگی دلچسپیوں سے خالی نہ تھی، لیکن ان دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کالا آدمی والی اہلیت نہیں رکھتا۔ پانی پر تیرنے والا عشرت محل جس کو عہد جدید کی اصطلاح میں "جہاز" اور "کشتی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے "سرو خانۂ شناور" اور "حسن رہ گزر" کے تمام دروح پرور کرشموں سے بھرا ہوتا ہے۔

غالب مغفور نے اس جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کو دیکھا ہوتا تو ان کی "گوشیہ" سطح سمندر کی لہروں پر فضاں نظر آتی۔ میں جب صبح سے شام تک جہاز کے ہر گوشے میں وہ خود آرائیاں دیکھتا تھا، تو نظر چرا کر گردن جھکا لیتا تھا۔ گویا کہ مظاہرہ میں ہوں۔ ایک دوست تو اپنے عہد جاہلیت کو یاد کر کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ یوں بھی فرماتے تھے کہ

عید ہوئی ذوق و مے شام کر!

اگر "لفنیات" کا کوئی مسقراض جہازوں پر سفر کرے اور وہ طریقہ مقناطیسیت سے متاثر ہونے والے تمام جذبات کو بمبئی کے ساحل پر چھوڑ آئے تو وہ اس بار بردار فوجی "میں اپنی لطیفیت کے لیے ایک وسیع میدان پائے گا۔ اس ہاتھی کی لاش جس پر ریشم کے ہزاروں تھان اور جواہرات کی سینکڑوں بوریاں لدی ہوئی ہوں۔ ہمارا جہاز ہزار ہا میل کا سفر طے کرتا ہے اور بمبئی سے لے کر عدن و سویز و پورٹ سعید و ساحل فرانس و انگلستان تک یہ گراں مایہ امانت پہنچا دیتا ہے۔ کرشموں اور تعجبوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد بھی بجلی کی مدد سے روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا جاتا ہے مگر پھر بھی عرشہ کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں۔ جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے مانند سفید جسم جھلک چکیں اور بکھرے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کس قدر عزیز ہوتا ہے۔ شب کے مسترخوان پر جہاز کی سلاد پونچی سفید کنکال، باریک کپڑے، خوبصورت بال، دلچسپ جواہرات ان سب کی ڈھیریاں لگی رہتی ہیں۔ ہر کرسی پر ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے اور اس دکان پر ہر قسم کی جنس بھی ہوتی ہے۔ ایک نیک بخت کو روز دیکھتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے کھلے ہوئے سینے کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں، مگر وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ ان کے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ پس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا کہ وہ اس ٹکڑے کو اٹھا لے اور ان کے سڈول شانوں پر ڈال دے۔ ایک دوسری بیگم صاحبہ میرے سامنے ہی ایک میز پر تشریف رکھا کرتی تھیں۔ ان کی نازک پاپوشں کا تکمہ بار بار کھل جانے کا عادی مجرم تھا، مگر جب وہ کھلتا تھا تو ہمراہیوں کا اضطراب قابل دید ہوتا تھا۔ ہر شخص دوڑ تا تھا کہ پہلے یہ تکمہ میں لگا دوں۔ ایک دن ایک عجوزۂ سمندری کے پاؤں میں موچ آ گئی۔ حادثہ اوپر کے عرشہ میں پیش آیا تھا۔ کوئی صورت نہ تھی کہ ان کو اس ہال کرے تک پہنچایا جاتا۔ آخر چند مجاہدوں میں سے ایک نے جرأت مردانہ کا اقدام کیا اور گود میں اٹھا کر اس بار عزیز کو نیچے پہنچا دیا۔

اس جزیرہ گاہ میں چند پارسی اور یہودی خواتین بھی تھیں۔ جن کو اپنی یورپین بہنوں سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ دن بھر اور رات کو بھی گیارہ بارہ بجے تک ان خواتین کا پرشور ہجوم عرشے پر رہا کرتا تھا۔ شاید دنیا میں بمبئی کے پارسی بھائیوں سے زیادہ کسی قوم کو اس قدر چیخ چیخ کر بات کرنے والی خواتین نصیب نہیں، جنہیں صرف آواز ہی کا فضل نہیں ہے۔ کبھی کبھی بعض بہنوں کی وضع قطع گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی ہے، ان کا لباس چیختا ہے، ان کی نگاہیں چیختی ہیں، ان کے موزوں کی باریکی اور جوتوں کی نزاکت چیختی ہے۔ ان کی ساریوں کا رنگ چیختا ہے، جنہیں لطیف کا پیغام بازاروں کے حامیانہ چیخا پکار سے اکثر سننے والے اور دیکھنے والے کے لئے بہت زیادہ دل دوز اور دردناک ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عورت چیخ نہیں سکتی شعر کہہ نہیں سکتا۔ بول سکتا ہے، تصویر چیختی نہیں مسکراتی ہے یا بسورتی ہے، اور اگر اس کا رنگ روغن چیخنے لگے تو پھر وہ نظر فریب نہیں۔ بعض اوقات، ان پارسی بہنوں کا ادعائے شاعرانہ نسوانیت میری نظریں ان کو اس شعریت سے بہت دور پھینک دیتا تھا جو عورت کا صحیح مفہوم ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ نسوانیت اس قدر بلند آہنگ ہو سکتی ہے یا عورت اس طرح اپنے دل اور نقاد سے بچا سکتی ہے۔ بہرحال اس قسم کی خود نمائی سے تنگ خوب آشنا ہوئی۔ وہ خود نمائی بے عیب اور بے لوث نہ تھی۔ تاہم اس میں یہ شعریت کو کیسر فنا کر دینے والا طوفان بھی نہ تھا۔

اسی جہاز میں ایک ہندوستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی بھی انگلستان جا رہی تھیں۔ اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔ میں گو کہ اپنے وجود کو جہاز کی اس دنیا سے دور پاتا تھا، تاہم دن میں ہر وقعہ جب رانی صاحبہ پر نظر پڑتی تھی، تو تجمل کا ایک عجیب ہیولیٰ پیش نظر ہو جاتا تھا۔ ایک طرف یورپین تمدن و معاشرت کے تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھتا

تھا و چنچل ہوئی، ناظرین میری اس اصطلاح سے درگذر فرمائیں۔ نسوانیت سے اُکتایا اور بعض اوقات جھنجلایا کرتا تھا، اور دوسری طرف ہندوستان کی ایک عورت اور لڑکی پر نظر جاتی تھی جو اس فریب نظر میں گھری ہوئی تھیں تاہم اس سے دور تھیں۔ بے پردہ تھیں مگر پردہ میں تھیں بے نقاب نہیں مگر نقاب میں تھیں۔ حیا کا مفہوم اگر کچھ ہے تو اب بھی ہندوستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے۔ از راہ تعصب نہیں کہتا۔ یورپ کے بہت سے اوصاف کا معترف ہوں۔ مگر یہ جوہر تہذیب و تمدن ان بازاروں میں بہت کمیاب ہے۔ جب اس ہنگامہ میں رانی کو دیکھتا تھا تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا جس کی ایک جھلک بھی یورپ کے مبصرین نفسیات نہیں دیکھتے۔ وہ محض فریب نظر کے مجنوں ہیں۔ ایک شب عرشہ پر ناچ ہو رہا تھا۔ رانی صاحبہ بھی ایک گوشہ میں اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی محفل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا سوچتا تھا کہ یورپین نسوانیت کی یہ تصویریں جن پر دنیا بھر کے فنون لطیفہ صرف ہوتے ہیں، انسان کے محسوسات عالیہ سے کیوں دور رہتی ہیں؟ یورپ کی عورت شب کے لباس میں جو اس کے لئے زیب و زینت کا مقتضی ہے۔ گردن سینے کے انتہائی حدود تک کھلی ہوئی، بازو شانوں سے اور ٹخنے پنڈلی، مرد کے اعلیٰ تخیل کو مس کرنے کی بجائے درحقیقت اس کی مادیت کو متحرک کرتی ہے اور ایک دنیا ہے کہ اس سحر کاری پر مٹی ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی عورت تعلیم و تمدن و معاشرت میں چاہے اپنی یورپین بہن سے دو قدم آگے بڑھ جائے، وہ اپنے لباس میں آداب محجاب و حیا کی پوری پابندی نہ کرتی ہو۔ لیکن آنکھ میں غرور نسوانیت۔ وہ تمکین حیا پھر بھی ملحوظ رکھتی ہے جس کا وجود یورپ میں عالم لور پر نظر نہیں آتا۔ تعصب نسل و مذہب سے قطع نظر میں نے تو یورپین اور ایشیا کی عورت کی تصویروں کو جب دیکھا، غلب نے گواہی دی کہ آنکھ اگر روح کا آئینہ ہے تو اس ذریعہ سے کالی عورت کی اعلیٰ روحانیت صاف نظر آسکتی ہے۔ ایک روز میم صاحبہ کو (غالباً فرانسیسی تھیں) ہر روز دیکھتا تھا کہ وہ دن میں دو دفعہ لباس تبدیل فرما کر تشریف لاتی تھیں۔ ہر شام کو ان کے لباس میں جدت طرازیوں کا گونا گوں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بے چاری زن میں شوکت علی صاحب سے کم نہ ہوں گی۔ جسم نازک پر لباس فاخرہ کا ٹانکا اپنے میں تاب مقاومت نہ پاکر، اس کشمکش سے تنگ آکر جو جسم کی ہر حرکت سے اس کے اندر پیدا ہوتی تھی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانکتا تھا۔ بہت جسمانی ماشاء اللہ ایسی تھی کہ ہم سے (اکثر بعض رشک کریں۔ اس دبیز جسم نے نسوانیت کی لطافت و نزاکت کو بالکل دبا لیا تھا، تاہم وہ جب شب کے نہایت باریک کپڑے سے بہن کر نکلتی تھیں تو از راہ غائبت انکسار اپنے کو پری سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ قدم اٹھاتی تھیں تو نظر ہر طرف دوڑتی ہوتی تھی کہ کسی نے دیکھا یا نہیں۔ موٹی گھریلو بیسکٹی تھی مگر ہر بھی لچکائی جاتی تھی، پنڈلیوں پر چڑھنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ بھی ایک ادا ہے۔ لیکن جسم نازنین کا وزن لکڑی کے فرش کو تھرا دیتا تھا

یہ تو حال تھا لیکن نظر فریبیوں کے زخم نصیب یہاں بھی حاضر تھے۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہے؟ نسوانیت کا کیسا ادنیٰ تخیل ہے؟ غور نسوانیت کی کیسی بھدی تصویر ہے؟ وہ عزیز نسوانیت جس کا سارا سرمایہ جسم کی سفید کھال، خوشبودار پوڈر، اور باریک ریشم ہو، یقین جانیئے کہ اس نسوانیت کی روح گم ہو گئی ہے۔ یہ کاغذ کی جاپانی قندیلیں ہیں جن کے اندر موم کی بتی گل ہو چکی ہے اور خالی قندیلیں ہوا میں جھول رہی ہیں لیکن کم نظر روشنی کے طالب نہیں، بلکہ قندیل کا کاغذ خوبصورت چاہتے ہیں۔

فریب حسن اور خود بینی کے ان فنون کا ذرا کالی رانی سے مقابلہ کیجئے۔ وجود دلست ہیں شاید تمام یورپین بہنوں سے زیادہ بہ ہوگی۔ ثروت جاہ دنیا کے لحاظ سے اس کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ تعلیم و تہذیب و تمدن و معاشرت میں وہ لندن و پیرس کے بہترین فنونوں کے دوش بدوش تھی، تاہم چشم حقیقت بیں گواہی دیتی ہے کہ وہ سب سے مختلف، الگ، دور اور بلند تھی۔ دن کا اکثر حصہ عرشہ پر گذارتا تھا۔ بار بار ان کالی ماں بیٹیوں پر نظر جاتی تھی اور قلب پکار اٹھتا تھا کہ اگر قوموں کی کامیاب زندگی کے لیے عورتوں کی فطرت عالی اور خصائص حسنہ کی شرط لازمی ہے تو پھر میری قوم کا مستقبل ان کالی عورتوں کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ وہ کچھ ہی ہو جائیں، مگر ان کی فطرت آلودہ نہیں۔

چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ

نیاز فتحپوری

دنیا میں سانپ اور مولوی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قسموں کی انتہا نہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے اور مولوی خواہ مخواہ کاٹ کھاتا ہے کہ ؎

ہر کرا جامہ مولوی بینی
در و مش صد ہزار مار انگار

مسجد کے ملّا سے لے کر مہاب و سنبر کے واعظ تک، نماز جنازہ پڑھانے والے مولوی سے لے کر اس مولانا تک جو بیضاوی و بخاری کا درس دیتا ہے ایک چیز الّا ماشاء اللہ سب میں مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ان کے ظاہر و باطن کا تضاد ہے یعنی جس مولوی کا ظاہر جتنا زیادہ خوشنما ہے اتنا ہی زیادہ اس کا باطن مکروہ ہے۔

ایک مولوی کی ہیئت وضعی "جس میں اس کا بے نکا عمامۂ الجھی ہوئی زلف و گاہے تا گوش و گاہے تا بنا گوش لاپتا پریشانی داڑھی، زمین دوز بردت سیاہ، داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتہ، نیم ساقی پاجامہ اور غیر واجب شدہ منتعفن چمڑے کا جوتا مع جرابِ بیسج و جزبہ بے رومال اور ناسدانی" کے سب کچھ شامل ہے ایک ایسی پیٹنٹ وضع ہے جس کو دیکھنے کے بعد گویا ہر شخص کا فطری فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس وضع والے کو مولوی سمجھے اور بحیثیت مولوی ہونے کے اس وضع کا اختیار کرنے والا تو گویا منجانب اللہ اس پر مامور ہی ہوا ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں قوم اور پلاؤ مہیا ہو سکتا ہے وہاں اپنا سلسلہ ارشاد ہدایت دراز کرے۔ اس میں بھلا کسی کو اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔

مولوی کی اوّلین قسم جو از قسم مولویت کی سب سے پہلی کڑی تھی اور جو مکتبوں کی بوریوں پر نظر آتی تھی اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے مگر ان کے کارنامے مولویت کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے ہمیشہ اہمیت رکھیں گے۔ "موجودہ مولوی" اسی "گزشتہ مولوی" کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور وہ شخص جو "نفسیاتِ مولویت" سے بحث کرنا چاہے گا اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس قوم کے ابتداء ظہور سے آغاز کرے۔ علمی و اصولی حیثیت سے آپ اس پر غور کرنے کی اہمیت کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں۔

مثلاً میرے محلہ میں بہت زمانہ ہوا ایک مولوی کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر محلہ کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کی ایک مولویائن تھیں اور چند درچند بچے جن کو اگر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصہ زینہ بن جاتا۔ رئیس کے یہاں ان کو صرف پانچ روپیہ آ

ور لعنا ملتا تھا لیکن ان کی دیگر فتوحات کی صورتیں مختلف تھیں۔ عید بقر عید، شبرات میں عیدیاں، بقر عیدیاں وغیرہ پاس خاطر عزیز سلمہ کو کپڑا، طعام و مصول کرنا تو خیر ایک جائز معمول تھا ہی، لیکن اس کے علاوہ اور بھی مختلف ترکیبوں سے کام لیتے تھے اور اس باب میں وہ ایک مخترع و موجد کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ان کے موٹے لوہے کے ٹرنک میں آگے پیچھے نیچے اوپر تقریباً ایک درجن جیبیں تھیں۔ یہ جیبیں مختلف وسعت کی تھیں اور ان کا رنگ بھی مختلف تھا۔ کوئی سرخ تھی اور کوئی زرد، کوئی سفید تھی اور کوئی سبزی مائل۔ جب کوئی ضیافت ہاتھ آ جاتی تھی کہ جب وہ گھر سے آئے تو کوئی نہ کوئی چیز لیتا آئے۔ پھر اگر کوئی سرخ لایا تو سرخ رنگ کی جیب میں ڈال دی، کسی نے جو کی گرہ پیش کی تو زرد رنگ کی جیب میں رکھ لی، کوئی آٹا لایا تو سفید جیب کی نذر ہو گیا اور سبزیاں سبز جیب میں چلی گئیں۔ ایک جیب چمڑے کی بھی تھی جس کا راز ایک دن اتفاق سے یوں کھل گیا کہ ایک مسلمان تیلی کا لڑکا کچھ تیل کپڑے میں لایا اور انھوں نے آنکھ بچا کر اسی جیب میں تیل کو انڈیل لیا۔ الغرض شام کو جب وہ گھر جاتے تو سولہ یا سترہ اور ملازادوں کے لیے بخل کی اچھی خاصی دکان بن کر جاتے تھے۔

ایک معمولی شخص کے لیے بظاہر یہ واقعہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن ایک ماہر نفسیات غور کرے گا کہ ایسے معلم سے شاگردوں میں کیا ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ آگے چل کر کس قسم کے "افراد قوم" بننے کی اہلیت رکھ سکتے ہیں۔

بہر حال اشکی یہ مخلوق نواب مفقود ہو گئی ہے لیکن اسی کی اولاد یا تلامذہ کے سلسلہ میں جو مولوی پائے جاتے ہیں ان کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو عربی مدارس میں لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو وعظ و تبلیغ کے ساتھ لوگوں کو مرید بھی کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد مسلمانوں کے قائد و رہنما بن گئے ہیں۔

اوّل الذکر قسم بظاہر گوشہ نشین اور بے ضرر قسم معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی حیثیت نشیمنی حقیقتاً ایک مستقل ہنگامہ محفل ہوتی ہے جس میں یہ ایک مرغ کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ مچھیوں کی، رہی بے ضرری سو اس کا حال اس سے عیاں ہے کہ اگر نگاہ بین ہو تو ہی ہے جس کے طلبہ مسجدوں میں رہ کر محلہ والوں کی خیرات اور سویرہ کی روٹیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں تو اخلاقی تربیت اور علو ہمتی کی حلوہ اور اگر کوئی قومی مدرسہ ہے جس میں دار الاقامہ کے اصول پر طلبہ کے رہنے کا انتظام ہے تو وہاں کا نصاب وہی فرسودہ و قدیم ہے جو انسان کو آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جس کی تکمیل کے بعد وہ سوائے "ذان دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اوّل الذکر قسم کے مولویوں میں جو افراد زیادہ ذہین ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دوسری قسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ شروع کر کے "مشاہیخانہ" حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ عالم، زیادہ خوشحال، زیادہ کامیاب و رنگین ہے۔ ایسا مولوی سب سے پہلے بنگال و برما کے سیاہ قریوں میں اپنی "مشنی سخن" شروع کرتا ہے اور جاہل مسلمانوں کو تھوڑی روپیہ میں گھڑے ہوئے اسلام و مذہب و پانچ مذہب کے متعلق سنا کر اوّل اوّل "ملا دینی" کا نبیا دینی اسرائیل" کا وعظ کرتا ہے اور جب وہ بحیثیت ملا ظاہر ایک عالم ہونے کے "یکے از انبیاء بنی اسرائیل" کی طرح قائم کر لیتا ہے تو "مرا و علانیہ" مرشد ہادی بن کر اپنے عقیدت مندوں اور مریدوں کے سر جھکوا دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح کم از کم ۳۰ مرید اس کو حاصل ہو جائیں کہ اگر ایک روپیہ سالانہ بھی ہر ایک مرید سے وصول کیا جائے (جو نہایت معمولی بات ہے) تو دو روپیہ روز کا اوسط پڑ جاتا ہے۔ یہ طبقہ

نہایت "خوش خور" "خوش پوشاک" ہوتا ہے، اگر کبھی ایسے قریہ میں پہنچ جاتا ہے جہاں تمام ضروری چیزیں اس کے "ذوقِ تکلم" کو پورا کرنے والی مل سکتی ہیں تو پھر اس کے دستر خوان کا پروگرام یہ ہوتا ہے:

صبح کا ناشتہ: نماز کے بعد ہی کشمیری چائے سیر بھر دودھ ڈلوا کر پیتا ہے، پھر اس کے ساتھ ایک چھٹانک پستے ہوئے بادام آدھا پاؤ قند، دو پراٹھے تین اُبلے ہوئے انڈے چار کباب۔

دوپہر کا کھانا:۔ مرغ کا قورمہ، مرغ پلاؤ، بریانی، پسندے، باقرخانی، مزعفر، ملائی۔

سہ پہر کا کھانا:۔ سادہ پراٹھے اور تازہ پھل۔

شب کا کھانا:۔ وہی جو دوپہر کا، مگر شامی کباب اور بھنی ہوئی مچھلی کے ساتھ۔

اگر مولانا کسی ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ اشیاء فراہم نہیں ہو سکتیں اور ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ کا نام لے کر کہنا ہو گی تو پھر کہہ دیتے ہیں کہ "مزاج مبارک" کا چلہ کھینچ رکھا ہے اس لیے سوائے دودھ بادامی کے کچھ نہیں کھا سکتا۔

مولانا کی پوشاک بھی ہمیشہ دورہ ہی کے زمانہ میں تیار ہوتی ہے۔ عاموں کی تو خیر کمی نہیں کیونکہ ہر نیا مرید جب کچھ نذر اور ٹھکائی لاتا ہے تو وہ ایک نیا عمامہ بھی پیش کرتا ہے، جو بعد کو گھر پہنچ کر نہایت کے وہ پٹے اور بنارسیوں کے کرتوں کے کام آتا ہے، لیکن یوں بھی قمیص، اچکن، تہمد اور رانبند کے لیے طرح طرح کے موٹی اور نفیس کپڑے تحفۃً آتے رہتے ہیں اور جو مولانا "ہوشیار" ہیں وہ صرف اسی غرض سے جولاہوں اور کپڑے کی تجارت کرنے والوں کو مرید بناتے ہیں۔ مولانا کے وعظ "تلقین" جہاں تک تعلق ہے یہ سب خدا کی شان جلالی سے وابستہ ہوتی ہے۔ خدا ایسا قہار ہے، ایسا جبار ہے۔ اس نے جہنم کا دہانہ کیسا بنایا ہے۔ وہاں اژدہوں سے تو سوا لاکھ ہے۔ اس طرح آگ میں جلاتا ہے، نکراں وہ جس کی شفاعت رسول اللہ کر دیں یا کوئی پیر، گویا خدا کا نہایت ہی وجیہ اپنے وقت کا چہیتا بلا کو ہے اور مولانا اس کے وزیر باندبیر! ان کی ملفوظات کا بڑا حصہ خود اپنے ہی کرامات و خوارق عادات سے متعلق ہوتا ہے کہ فلاں مقام پہ اس طرح ایک مرتے ہوئے شخص کو اچھا کر دیا۔ امسال باران پر یوں پانی برسا دیا۔ فلاں کے دل کا حال اس طرح بتا دیا۔ بتات کے بادشاہ کو طلب کر کے فلاں کے سر سے آسیب کو یوں دور کرا دیا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا کو ذوقِ موسیقی بھی ہے تو شب کے اوّل حصہ میں قوالی اور اس کے ساتھ حال قال کی چند بزرگانہ حرکات بھی دکھائی جاتی ہیں ورنہ شام ہوتے ہی مولانا کا جائے قیام مردوں کے لیے "ممنوع الدخل" ہو جاتا ہے اور صرف عورتوں کی ہدایت کے لیے دفتر کھلا جاتا ہے۔ یہ پر مسا سب نرم قالین پر زرنگیں کے سہارے دراز ہو جاتے ہیں۔ عورتیں ڈرتی ہوئی سہمی ہوئی آتی ہیں اور مولانا کا وہ جسم جو متقوی اور فہمی خدا سے خوب نرم اور پرگوشت بنا ہوا ہے رانبے لگتی ہیں۔ مولانا تھوڑی دیر اس لذت سے سرشار ہونے کے بعد دوسرے کمرہ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو تعلیم و تلقین نصوصی کے لیے طلب فرماتے ہیں۔ پھر چونکہ وہ مقام بلند ہے جو پیر صاحب کی اصطلاح میں "قاب قوسین او ادنیٰ" سے کم نہیں اس لیے یہاں کے راز اوّل تو بہت کم ظاہر ہوتے ہیں اور جو کبھی ہو گئے تو فوراً "کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَانٍ" اور "اللہ جمیل و یحب الجمال" کا وظیفہ بتا دیا جاتا ہے اور جاہل مرید خوشی کے ساتھ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو آلۂ تفریح بنانے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔

تیسری قسم مولوی کی وہ مولانا ہے جو ملک کے اونچے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی کارگاہ قائم کرتا ہے تاکہ ملک کا سیاسی مائنڈ ویسا تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک اصلاح ملک و قوم کا تعلق ہے ان کا کارنامہ بالکل صفحۂ سادہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس حد تک تخریب و فساد متعلق ہے اس طبقہ کا وجود اس درجہ خطرناک ہے کہ شاید ہم فتنی کہہ کر اس کی اہمیت کو پوری طرح ظاہر کر سکیں۔

یہ مولانا کھدر پوش ہوتا ہے، ولیسی چیزوں کا عاشق، وطنی اشیاء سے متعلق، حریت و آزادی کا علمبردار، غلامی و استبداد کا دشمن اور یتیموں کا والی غریبوں کا ملجا" سبھی کچھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کے کھدر پوش سینہ کے اندر اتنا موٹا اور نکروہ قسم کا نفس ہوتا ہے کہ شاید ہی غریب فرعون کو نصیب ہوا ہو۔ اس کے نام مقالات حریت، اس کی نام شعلہ بیانیاں اس کی جملہ سوراج پرستیاں صرف کتب جاہ سے متعلق ہوتی ہیں اور اس کا مقصود ان نام نہاد کوششوں سے سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ ریل کے اونچے اونچے درجوں میں سفر کرے۔ وداع کے وقت لوگوں کا ہجوم اس کو اسٹیشن تک پہنچانے جائے، جہاں پہنچے وہاں رسم مشایعت کے لیے ایک جماعت موجود ہو گئے ہیں ہار پڑے ہوئے جائیں اس کی موٹر کو نوجوانان ہند دھکیل کر لے جائیں۔ جلوس کے ساتھ جب وہ بانادروں کی طرف سے نکلے تو ایک غرور نا انکسار کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے جھک جھک کر لوگوں کا سلام قبول کرتا جائے اور جائے قیام پر ہر طرف زائرین کی آمد و رفت سے میلہ سا لگا رہے۔

یہ اپنے آپ کو سیاسیات کا ماہر، نظام عالم کا "امین خانہ" اور گردش ارضی کا محور سمجھتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو نظم دنیا درہم برہم ہو جائے اور قومیت کا بیڑا غرق۔ اس قسم کا مولانا بہت کم خطرہ میں پڑتا ہے اور اگر کبھی پڑ جاتا ہے تو صرف تجارتی اصول کی بنا پر کہ آئندہ اس کے کاروبار کی رونق اس سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ سوائے اپنے کسی کی رائے کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں خدا نے صرف اسی کو ذی عقل و ہوش بنایا ہے اور خلیفۃ اللہ فی الارض اسی کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ جلسوں میں ہمیشہ دیر کر کے پہنچتا ہے تاکہ جس وقت وہ پہنچے تو سارا مجمع جو اس کا منتظر ہے گردن اٹھا اٹھا کر اس کو دیکھنے لگے۔ وہ چمکتی کاروں پر سوار ہو کر جاتا ہے، اونچی جگہ مسندوں اور زرکار کرسیوں پر اپنا دامن عبا درا و کرتا ہے۔ وہ دوران جلسہ میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ کر لوگوں کو ہدایت فرماتا ہے گویا وہ اس ساری جماعت کا فرمانروا ہے۔ اس مسنین کا گورنر اسپرنگ ہے جس پر پرزوں کی ہاضا بطہ گردش قائم ہے۔ مولانا کی آوازوں سے اس کا سیروں خون بڑھتا ہے۔ دست بوسی سے اس کے جذبات قیادت میں برقی رو دوڑ جاتی ہے اور جس وقت وہ اسٹیج پر جا کر تالیوں کی آواز سنتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ خدا عبارت ہے صرف اسی کی ذات سے، یہ حال ہے اس کی پبلک زندگی کا، نجی زندگی کے اندر وہ کیا ہے؟ اپنے متعلقین کے ساتھ اس کا کیسا برتاؤ ہے؟ لوگوں کے حقوق وہ کیونکر ادا کرتا ہے؟ اس کا حال اس کی غریب بیوی سے پوچھیے جو ایک کنیز سے بدتر حیثیت رکھتی ہے۔ بچوں، خادموں اور اس کے اعزہ سے دریافت کیجیے کہ یہ اپنے آپ کو "خدا کا بیٹا" کہنے والا کس طرح کا باپ، کس قسم کا آقا اور کس انداز کا انسان ہے۔ اس کا مذہب حقیقی خود پرستی، اس کا دین و ایمان سراسر کبر و غرور اور اس کی ذات از سر تا پا یادگار ہے ان فراعنہ کی جن کا حال تو کتابوں میں نظر کو نظر آ جاتا ہے لیکن صورت اب تک کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس قدر تمہید کے بعد مجھ کو اصل مدعا کی طرف آنا چاہیے جو عنوان سے ظاہر ہے میرے تجربات مولویوں کے متعلق

اس قدر وسیع ہیں کہ اگر چاہوں تو برسوں تک اس سلسلہ کو قائم رکھ سکتا ہوں، لیکن اس وقت میں اپنا بالکل حال کا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو اپنی نوعیت سے کم لطف نہیں ہے۔

۵ جولائی کو میں ہندوستانی اکادمی کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڈھ اسٹیشن پر پہنچ کر میں جس درجہ میں داخل ہوا۔ وہاں پہلے سے ایک ہندو خاتون کونہ میں بیٹھی ہوئی تھی جس سے ایک مرد (جو غالباً اس کا خوش نصیب شوہر ہوگا) باتیں کر رہا تھا۔

یہ عورت جسے ایک نوجوان لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا، بہت قبول صورت، حد درجہ مہذب اور نہایت خوش ادا اور اپنی نزاکت کے لحاظ سے بالکل ایک سفید فاختہ یا کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رنگ کی گندمی چمک اس کے خدوخال کی کشمیریت اس کی آنکھوں کی شیلی کیفیت، اس کے لبوں کی میگنی، اس کے جسم کی لچکیلی نزاکت، یہ سب باتیں اس کی خوش سلیقگی، متانت و سنجیدگی کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر رہی تھیں کہ ہر شخص کو اس سے متاثر ہونا چاہیے اور غلط ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن ایسی صورتوں میں میرا فلسفہ صرف یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ پر غور کرتا ہوں اور صبر کر لیتا ہوں۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں مقابل کی بیچ پر بالکل اس کے سامنے اور بہت قریب ہو کر بیٹھ جاتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا صرف احترام نسوانی کے خیال سے کہ ممکن ہے اسے کچھ تکلیف ہو اور وہ آزادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک مولانا مع اپنی نامہ خصوصیات ظاہری کے سامنے ہاتھ میں طہارت کا لوٹا لیے ہوئے اور بائیں ہاتھ میں بستر اجام بدستے وسوئے بدست اندر داخل ہوئے اور بیک نگاہ گاڑی کا جائزہ لے کر بلا پس وپیش اپنا سامان انھوں نے اسی جگہ قائم کر دیا جس کو میں نے فضا چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پہلے ہی ان کی وضع و صورت اور اس ناشائستہ حرکت سے یقین ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی مولانا ہے۔ لیکن اتفاق سے اسی درجہ میں ایک وکیل صاحب ان کے شناسا اور مل گئے اور انھوں نے مولانا کے لفظ سے خطاب کر کے اور بھی توثیق ثبت کر دی۔

مولانا کی عمر ۶۰ سے متجاوز ہوگی لیکن صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی اور مصنوعی دانتوں کی تاب اور داڑھی کا خضاب جو ہر چند ہلکا سا ہو گیا تھا بتا رہا تھا کہ ہنوز زعم جوانی موجود ہے۔ تمام اعضا صحیح و سالم تھے، البتہ داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا کچھ بڑھا اور مفلوج سا تھا غالباً عمل جراحی کا نتیجہ تھا کیونکہ ہاتھ پر ایک بڑا نشان اس کا پایا جاتا تھا۔

مولانا کو اس قدر اپنے سے قریب دیکھ کر اس خاتون نے آنچل کی اوٹ سے نیچے ہی نیچے بہت غور سے دیکھا اور نہایت مخفی تبسم کے ساتھ اس نے شوہر کو اور شوہر نے اسے دیکھا اور دونوں پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے اپنی نشست کا اندازہ اس طرح قائم کیا کہ چہرہ اسی طرف رہے اور اس کے ماتھے کی سرخ بندی جو بیر بہوٹی کی طرح دہک رہی تھی نگاہ سے اوجھل نہ ہو۔ جب وہ اپنے نشانہ و ہدف کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو انھوں نے چاہا کہ کسی طرح اس کے شوہر سے بے تکلفی پیدا کر کے اپنے آپ پر گلہبنی جمال کو حلال کریں لیکن یہ قسمتی سے ایک صاحب جوان کے شناسا تھے الف لیلہ کے کم گو حجام سے کم باتونی نہ تھے اور انھوں نے جو مولانا سے مخاطب

شروع کی تو پھر اس کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔ ہر چند مولانا کی چین پیشانی کی عبوست اور کبھی کبھی انجار لے کر اس کے مقاصد کو شش کر رہا تھا کہ وہ کسی کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے اور ان کی توجہ و مراقبہ کو صدمہ پہنچ رہا ہے لیکن وکیل صاحب جو اپنی پہنائی اور ذہانت کے لحاظ سے ابتدا الہلال کی خدمت معلوم ہوتے تھے، اس غریب مولانا کے آزار کو نہ سمجھ سکے اور برابر ان کی کیسوئی خیال و نگاہ میں حارج رہتے لیکن یا وصف اس کے مولانا نے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہدف کو فراموش نہیں کیا اور اپنے کسی لمحہ سے ہیر کو انھوں نے پکار جانے نہیں دیا۔ وہ باتیں کرتے تھے مگر نگاہ کا سمت نہ بدلتا تھا۔ وہ وکیل صاحب کے سوالوں کا جواب دیتے تھے مگر ہر جواب کے دوران میں اس "سرمایۂ جان" کو بھی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ وہ کوشش کرتے کہ اپنے ہاتھ کی معیوب دکھی انگلیوں کو چھپا لیتے تھے کہ مبادا وہ خاتون اس عیب کو دیکھ لے۔ وہ آواز میں ایک خاص نغمہ کا لوچ پیدا کر کے گفتگو کرتے تھے، وہ اپنے فقرہ میں جھنکار سی پیدا کرنے کی بھی فرماتے تھے، وہ اپنی خوش دلی، قابلیت، جاہ و ثروت، دولت و امارت کا ثبوت دینے کے لیے کبھی کبھی لطائف بھی گھڑتے، فارسی کے اشعار بھی پڑھتے، بڑے بڑے لوگوں کے نام اور ان سے اپنے تعلقات کو بھی ضمناً ظاہر کرتے جاتے تھے اور سب سے زیادہ تو راس پر دے رہے تھے کہ "یا مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام" کہہ کر جس وقت مولانا نے اس عورت کو دیکھا تو اس کو بھی نہیں دیکھا، ان کی آنکھیں اور میں بھی ان دونوں کے دیکھنے کو دیکھ رہا تھا اور آخر کار عجب تماشا تھا، کوئی اجتماع سے نہیں تو اس طرح کہ دونوں نے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو دیکھا مگر یہ منظر پیدا کر رہے تھے کہ مولانا اپنی جگہ مست تھے، وہ خاتون محجوب۔ الغرض مولانا کے تمام لاشعوری تیور اس کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ انھی لوگوں میں سے ہیں جو ع

این کار دلِ پاکبازے کارِ آگہاں کند

جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ مولانا کی خوش طبعی اب کافی طور پر بڑھ گئی ہے اور انھیں وثوق کامل ہو گیا ہے کہ سامعین درجہ میں صرف انھی کی ذات اکیلی ہے جس پر وہ خاتون مائل ہو سکتی (ہو سکتی کیا ہو ہی گئی) ہے تو میں سنبھلا اور میں نے آگے بڑھ کر بہ ادب عرض کیا کہ "اگر جناب اجازت دیں تو چند مسائل حضور سے دریافت کروں جو اسی وقت میرے ذہن میں آئے ہیں"۔

وہ یہ سن کر ذرا چونک پڑے اور بولے "ہاں ہاں کہیے، یہ لوگ اسی لیے ہیں"۔ اور یہ کہہ کر خاص بندا کے ساتھ اس طرف دیکھ لیا۔

میں نے عرض کیا کہ "مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ جناب صرف عالم ہی نہیں ہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی ہیں جیسا کہ آپ کی شوخ بیانی سے ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنا پر مجھے یہ دریافت کرنے کی جرأت ہوئی ہے کہ کیا "غنا، خانہ ہمسایہ" اور "حسن مطلع" سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ محض شاعرانہ ادعا ہے یا واقعی کوئی شرعی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے؟"

یہ سن کر ان کے چہرے پر پہلے ایک ہلکی سی سُرخی عتاب کی اور پھر زردی عجاب کی نمودار ہوئی اور پہلو بدل کر بولے کہ آپ کو مجھ سے مذاق کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟"

میں نے کہا کہ "بندہ نواز میں آپ سے مذاق کر سکتا ہوں؟ میں تو واقعی آپ سے سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں کیونکہ بسا اوقات مجھ حضر میں ایسا ہوتا ہے کہ نگاہ مجبوراً اٹھ جاتی ہے اور میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے آخر کار کانپ اٹھتا ہوں کہ کہیں آخرت

میں بازپرس نہ ہو۔"

مولانا نے مجھ پر خشمگیں نگاہ سے دیکھا اور بولے کہ "یہ صورت تو عذاب سے ڈرنے والوں کی نہیں ہوتی، داڑھی ہنڈی ہوئی، مونچھ بڑھی ہوئی اور پیشانی سجدے سے کورے نشان سے خالی۔"

میں نے کہا "بجا ارشاد ہوا میں اپنی صورت کا سب سے زیادہ شناسا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عذاب سے ڈرنے والی صورت کیسی ہوتی ہے، سامنے ہی موجود ہے صراحت کی ضرورت نہیں لیکن میں تو آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، آپ کو اس کا جواب عالم دین ہونے کی حیثیت سے دینا چاہیے، عام اس سے کہ میری داڑھی منڈی ہوئی ہے یا خضاب سے رنگی ہوئی، میرے دانت اصلی ہیں یا مصنوعی، میری انگلیاں سیدھی ہیں یا ٹیڑھی، میری عمر آپ ہونے کی ہے یا شوہر بننے کی۔"

یہ سننے کے بعد مولانا کا غصہ ضبط سے باہر ہو گیا اور وہ آستین چڑھا کر بولے کہ "تم مجھ سے مخول کرتے ہو، یاد رکھو میں بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش بھی ہوں۔"

میں نے عرض کیا کہ "میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔"

اس تقلید کی تاب وہ کیا لاسکتے تھے، بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے لیکن وکیل صاحب نے اٹھ کر ان کو پکڑ لیا اور سارا درجہ مخاطب ہو کر ان کو سمجھانے لگا کہ "جانے دیجیے آپ بزرگ ہیں اپنی طرف خیال کیجیے" اور "چھوڑیں وچھوڑیں" میں نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا اور جب چند منٹ کے بعد سکون ہوا تو میں پھر ان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ "مولانا اگر غصہ فرو ہو گیا ہو تو عرض کروں کہ میرے سوال کا جواب مرحمت ہو۔"

یہ سن کر سارے درجہ والے تو تحیر ہنس ہی پڑے تھے وہ خود بھی مسکرانے لگے اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

مولانا بولے کہ "خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑیے، میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا کہ "یہ بات شرعی مسئلہ ہے اور آپ کو بتانا پڑے گا۔"

وکیل صاحب خوش مزاج انسان تھے، انھوں نے کہا کہ "مولانا کیا ہرج ہے آپ کیوں نہیں بتا دیتے؟"

مولانا بولے کہ "آپ نہیں سمجھتے یہ مجھے بے وقوف بناتے ہیں ورنہ کیا یہ خود نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ یہ پوچھ رہے ہیں محض شاعرانہ بات ہے اور شرح....."

میں نے کہا "نہیں مولانا واللہ ایسا نہیں ہے، مجھے اس وقت تک تو صرف گمان ہی تھا لیکن آج یقین ہو گیا کہ غلغلۂ خانہ ہمسایہ جائز ہو یا ناجائز لیکن "حسن رنگ زدے" سے لطف اٹھانا قطعاً جائز ہے۔"

مولانا بولے "یہ کیونکر آپ کو یقین ہو گیا؟"

یہ سن کر میں ہنس پڑا اور دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

مولانا غصہ میں اٹھے اور لوٹا لے کر منہ بناتے ہوئے بیت الخلا چلے گئے۔ ایک اسٹیشن درمیان میں باقی تھا کہ وہ باہر آئے اور جب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا کہ "تشبہ کسی قوم کے ساتھ ایک شخص کو اسی قوم میں داخل کر دیتا ہے اس لیے اگر ہمارے ہاں کی عورتیں بھی سرخ بندی کا استعمال کریں تو وہ ہندو ہو جائیں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

مولانا نے فرمایا: "بیشک بیندی کا استعمال ہماری عورتوں کو نہ کرنا چاہیے۔"
میں نے عرض کیا: "لیکن مولانا! یہ تو آپ نے بھی دیکھا کہ ہے بڑی پیاری چیز اور خاص کر گلوسے رنگ پر تو قیامت ہی جچتی ہے۔"
مولانا نے کہا: "حقیقت یہ ہے کہ تم ہو کوئی بڑے بدمعاش۔"
اتنے میں پریاگ اسٹیشن آگیا جہاں مجھے اترنا تھا۔ مولانا بدستور بیٹھے رہے اور میں اتر پڑا لیکن نیچے پلیٹ فارم پر جا کر میں نے ان سے کہا کہ "مولانا خدا کے لیے صرف ایک بات کان میں سن لیجیے۔" مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کھڑکی کے پاس آکر اپنے کان قریب کیے تو میں نے عرض کیا کہ "مولانا اس میں شک نہیں کہ چیز اچھی ہے کیا لائے ہے؟"
یہ سن کر انھوں نے میری گوشمالی کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں الگ ہٹ گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔
اکاڈمی کا دفتر پریاگ اسٹیشن سے صرف دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور اس دس منٹ کے راستے میں جس خیال نے میرے دماغ کو گھیرے رکھا وہ مولانا کا واقعہ تھا بلکہ غالب کا یہ شعر تھا جسے میں گنگنا تا رہا تھا ؎

اگر بہ دل نہ خلد آنچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

سجاد حیدر یلدرم

اور کوئی ظلم ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالت زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے دھتنے کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرائے میں دہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا اور جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت تھا، مگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں کہ صدائے اس فقیر کا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بہ لفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہئے یہ تھی:

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لیے مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ میں آفت کا مارا سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کا محتاج ہوں، اور اپنی یہ مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں، اے خدا کے بندو! میری سنو۔ میں غریب الوطن ہوں۔"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اُن کے فقرے کا اثر ہوا ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اپنے سے اچھا پایا۔ یہ سچ ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے۔ وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں۔ وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے میں رات دن اسی فکر میں گزارتا ہوں اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا۔ کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں نے اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جیسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں" میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں۔ اس کا کوئی دوست نہیں"۔ اگر یہ سچ ہے تو اُسے مبارکباد دینی چاہیے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا اپنے مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے

...ش نصیب شخص! یہیں تو تجھ سے بچھڑ گیا لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا واقعی میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں ...ن سے ملے؟ میں جو ہر پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دوں؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں مگر خبر نہیں کہ مجھے دوسا بھی وقت ...سے گا کہ میں بیٹھے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں۔ یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اُسے سوچ سکوں۔ ...نتیجان صاحب سے پندرہ پیسے جا سکتا ہے؟ اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا اور یہ نہ کہے گا۔

"جانی جان، دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔" کیا اُس کے احباب ...ب بے دوست اسے دھوتوں اور جیسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اُسے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں، مگر یار دوستوں ...مع ہے جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہہ رہے ہیں، اور وہ سننے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس ...ے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جاتی جسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور ...اور ہوٹل کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا؟ اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا؟ گمان سب باتوں ...ہ آنا وہ ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہنا کتا ہے اور میں بیچ دنیا رہوں۔ یا اللہ! کیا اس بات پر بھی شکریہ ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ ...نی نعمت چاہتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں۔ بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ اُن سے ...کتا ہے مگر میں دوستوں کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں اور میرے خیر طلب ہیں۔ ...لی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا، اور ہو جاتا ہے مجھے نقصان۔ چاہے مجھ پر نفرین کی جائے مگر میں یہ کہے بغیر ...ں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ نہیں ثابت کر سکا کہ احباب کا رابطہ جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کبھی ...ہ ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا میں کچھ کام کرنا ہے، اور باتوں ہی باتوں میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا ...ہ ہے۔ اس سے میرے دل پر کتنا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے ایک دوست، جو مرزا ہیں جنہیں میں بطرز بڑیا دوست کہتا ہوں یہ نہایت قوی ہیں، اور میری ان کی دوستی نہایت ...ے دیرینہ لطفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نہ بیٹھ نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ ...تے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں، کوئی آیا ہے۔ قیامت نہیں ہے۔ اُن کے ...ے مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجود یکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں، تو وہ ...چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ نوکر کی طرف مخاطب ہو کر "خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ تمہاری ...ا تو یہ! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا۔ آتے ہی انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا ...ں اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

"ابا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا مت بند کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس ...لجھڑا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ...ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت اور یافت کرنی

تھی۔ خدا حافظ" یہ کہہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دباتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا، اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اب وہ کہاں! اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک حد سے زیادہ نہیں رہتے۔ تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم انہیں چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اور لیجیے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب بیلی روڈ پر اپنی کی نگر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں۔ جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہارا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ محمد تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا فضولی ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر نے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں۔ ہاں بڑا خراب موسم ہے میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آگیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے"۔ اگر پالکس یا فٹ بیچ کے متعلق گفتگو کرتا ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں"۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں، تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں لگتی؟" کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں سوائے اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعریف، اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دستور کے میں شاکر صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر چننے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امراء کے شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں شریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے، یہ کہہ کے "شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا دیکھو، میری خوشی کرو"۔

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایڈیٹر "معارف" سے مل کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصے میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خان صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ جہاں میں کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی کام شروع کر دینا۔ دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں۔ دریا پر

محل واشنگٹن کھیلیں گے جو وہاں سے ڈیڑھ پر ہوگا۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ جلال الدین صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا تھا وہیں ٹھٹک کر اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم اخیر سینکڑوں جیلے حوالوں سے اُس وقت تو میں بچ گیا اور میرے بیزار بھی میری بیوہ سے نہ کہہ سکے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا جس عقلمندی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے کتنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں، تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت چمچتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد۔ جا بجا ایک مخمل جلد کی کتاب میں، مگر کھنچے کے لیے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں، اور جو چیزیں کہ ضروریات کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا دستمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی) میرے پرس خیالات کو تبتری کے ساتھ تفس کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان مرغان خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں، ان کی اس حکایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب سے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لئے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن تن تن تنقنا۔ چھن چھن تن تن تن۔ میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔ یہ کیا ہے؟ اوہ! اب میں سمجھا۔ میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں۔

"اس کی گلی سے آئے کیوں نسیم زلف لائے کیوں، مجھ کو باس سے ہے امید، آ مجھ کو صبا سے ہے امید، ہم سے صبا کو کیا غرض؟"

"اوہو! سبحان اللہ! کیا غزل چھڑی ہے! اسے ترک سوار نواح عرب شراب نکری پہنچا دینا۔ کس رنگ میں ہے وہ حبیب مرا مجھ دا کی بھیرباں لالہ دینا" بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہو گئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

"اے میرے خیالات! تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو میرے دماغ میں پھر "آؤ" کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا۔ خیالوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا۔ ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں، اتنا ہی اس کی مشکلات کا

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا" ..... ریگ دریا کے نمدار نہیں کر سکتے" پھر نہیں۔ ایسا معمولی تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ تھا کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتا بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ

اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہت بدنام لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے گلہ، صبا کو کیا غرض؟"

مجروح کو صبا کے نام نے دماغ ہی جلا کر دیا۔ اگر وہ آتی اور نکہت بدنام بھی لاتی، تو یہ معلوم کیا ہوتا۔ بہرحال مجھے وہ فقرہ درست کرنا چاہئے۔ مشکلات کے بجائے کچھ اور ہونا چاہئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر چند غور و فکر کرتے ہیں اتنا ہی ان بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پرکرنے لئے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟ یہ کیا؟

"جوہر کی قدر آپ کہاں جھوں پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟" یہ کیا مہمل فقرہ ہوا لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔ آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے؟" یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب کے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی ان سے ملنے آیا ہے۔ مصروفیت میں انہیں یہی کہہ گیا۔

ہاں تو فاٹک کے فقرہ درست کرنا چاہیے۔ "اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوتی ہے اور بظاہر....."

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں، شبن، سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو، تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔"

بادلِ نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ صاحب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ شبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری بہن، بہنوئی، ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دیکھا یا جاؤں کہ یا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا، جسے میزبان لے جاں ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کر دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ فقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہزار وقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا:

"ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دنیا (گو وہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لیے اپنے تئیں....."

دروازے پر پھر دستک۔ "کیا ہے؟" "بھائی"

دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے۔ ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے اور اپنی کاوشوں کو کوششوں سے موجودہ....."

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔"

"اوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں۔ میں پھر کھاؤں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔"

"اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے۔ یہی وہ فوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسا کر کے خطرات سے بچانے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ....."

"دستک۔ کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں، اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا۔"

"اچھا شیخ۔ لو ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر میں کھانے کے لیے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں: "چہرے پر تھکن محسوس ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھیے میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟"

سوائے اس کے کہ آمنا و صدقنا کہوں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے جس چیز سے مجھے رغبت نہیں، وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں: "مسہر پر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ تم دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو۔"

واپس آتے ہیں اگر تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں، اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب خیالات کہاں؟ سر اوپر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔۔

"زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ۔"

اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے مربوط کیا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔ "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" اس پر بس ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اٹھ کر میز پر گیا۔ اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک۔

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔ سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں۔ قبل فقرہ میزبان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے۔ "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے۔ میں سچی بات کہوں تو کہ کچھ بھی نہیں لکھا۔" تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
مجھے یقین ہوا تجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آتے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی رہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصے اور رنج میں آ کر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو اطلاع کر کے واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ

دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُن کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں اُن احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے ہیں۔ میں اُن کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک صاحب جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جو مجھ سے ملتے ہی کہتے ہیں میاں عرصے سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری دعوت کروں۔ مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست آتے ہیں۔ وہ آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے یا اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں۔ وہ جب آتے ہیں۔ اپنی ہی کہے جاتے ہیں میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں۔ مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں ؎

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کر دوں۔ دروازے پر ایک گاڑی آ کے رُکی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے لگا کیونکہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا اس لئے اس کے شکریے میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں۔ اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں جب آتے ہیں۔ مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو بڑا حاذق ہے یا کوئی عجیب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

"آیئے آیئے۔ مزاج عالی۔ بہت دن بعد تشریف لائے۔"

کم اِن مائی ڈیئر ۱۹۱۶ء

خواجہ حسن نظامی

(۱)

ویل کم، ہو ہو۔ مائی ڈیئر ۱۹۱۶ء اندر آیئے، کیک چکھئے، کم مقاس کی چاء پیجئے، انگیٹھی گرم ہے ہاتھ سینکئے۔ ناک کو تو سردی نہیں لگتی۔ خشکی معلوم ہو تو اس کو بھی گرما لیجئے۔ مگر ہاں، آپ کی ناک ہے بھی یا نہیں؟ ۱۹۱۵ء کے تو نہ تھی۔ اہل جرمنی نے دندہ خلافیاں، عہد شکنیاں کر کر کے بچارے کی ناک کاٹ لی تھی۔

بھائی، میرے گھر میں بریک فاسٹ کا تو کچھ انتظام نہیں ہے، تیرہ تیزی کی گھونگنیاں کھا کھا کر دن کاٹتا ہوں، تمہارے لیے ایک خانصاماں سے کیک کا ایک ٹکڑا اور ٹھنڈی پھیکی چاء کی پیالی مانگ لایا تھا۔ چہ کند بے نوا ہمیں دارد۔ صبر کر کے اسی کو نوش کرلو، زیادہ حرص ہو تو میدان جنگ میں جاؤ، وہاں سب کچھ ملے گا۔

ذرا سنا، خدا نے کہا تھا میں خود زمانہ اور وقت ہوں، کیا تم بھی خدا ہو؟ کیونکہ تم بھی ٹائم اور وقت ہو، مگر خدا بدلا نہیں کرتا اور تم بارہ مہینے میں بدل جاتے ہو، لہذا معلوم ہوا کہ تم خدا نہیں ہو، پس جب تم خدا نہیں ہو، تو لاؤ، میرا کیک پھیر دو اور چاء کی پیالی بھی واپس دو۔

ہاں یاد آیا، میں تو مشرقی ہوں اور مشرق والے دے کر واپس نہیں لیا کرتے، اچھا خیر، کھالو، نگل لو، تھوک لو، تمہیں کس نے بلایا تھا؟ ملن سنان میں تیز مہمان۔ آؤ بھگت کرتا تو اپنے محرم کی کرتا جو لاڈلا ہے، ہجری سنہ کا پہلا پیغام لے کر آتا ہے۔ تم سے مجھے کیا غرض تم کو پادری صاحب کے ہاں جانا چاہیئے تھا۔

لاحول ولاقوۃ۔ معاف کیجئے گا جناب، بھوک مفلسی میں انسان کی عقل قابو میں نہیں رہتی۔ آپ ہمارے بادشاہ کی نشانی ہیں۔ ہر دفتر میں آپ ہی کا سکہ چلتا ہے۔ ہماری قوم تو آپ سے اس قدر محبت رکھتی ہے کہ ہر شخص دیوار پر آنکھوں کے سامنے آپ ہی کو لٹکاتا ہے۔

جنوری کی قسم میں تمہارا تابعدار ہوں، وفا شعار خادم ہوں، تمہارا کیا کہنا۔ بڑے اچھے ہو، کیسے گرم گرم کوٹ لاتے ہو۔ تمہارے آنے کی خبر سن کر ایک مہینہ پہلے خیرات بانٹنے والے مجھ کو لحاف بنوا دیتے ہیں، اور لحاف کے اندر مجھ کو ایسا آرام ملتا ہے جیسا کچھوہ کو اپنے خول میں۔

میری عادت خوشامد کرنے کی نہیں ہے، پر آج تو میں تمہاری خوشامد کروں گا اور کہو تو تمہارے بوٹ بھی صاف کرنے میں عذر نہ ہوگا۔ لیکن یہ وعدہ کرو کہ تم ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء کی خونریزی کو بند کرا دو گے۔

میاں مجھے اس لڑائی سے تو کچھ تکلیف نہیں، دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے مجھے اس سے کیا غرض؟ البتہ یہ بے آرامی ہے کہ سوئیاں اور رنگ بہت مہنگا ہو گیا ہے، جانتے ہو کہ میں مدرسی دھیلے کا آدمی ہوں، سوئیاں سستی تھیں تو اپنی گدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا۔ اب یہ دونوں اس قدر گراں ہیں کہ میں نہ سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ، اور نہیں میلا کچیلا پیتھڑے لگائے پھرتا ہوں۔

اگر تم لڑائی بند نہ کراؤ تو یہ دونوں چیزیں تو سستی کرا دو۔ پیس میں تو فقط اتنا چاہتا ہوں۔ مجھے نہ خطاب چاہئے نہ کونسل کی ممبری، میں تو روکھی روٹی پیٹ بھر کر اور کنوئیں کا پانی اور تن کا موٹا جھوٹا کپڑا چاہتا ہوں۔ کنوئیں کا پانی اس واسطے کہ نل کا پانی برسے کئے مدت آتا ہے۔ اور لوہا آج کل توپ میں، بندوق میں، گولے میں، گولیوں میں، آدمی کا خون بہتا ہے، اور میں خون خرابے سے بہت ڈرتا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ لوہے کا پانی کہیں مجھ میں بھی نہ وہ نسا کا اثر نہ آجائے۔

---

(۲)

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ۔ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں، جو وہ مجھ کو دکھا دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر و لیم کی برابری کرتا تھا۔ اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکا دوں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحاتِ مکہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا؟" اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ، بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے، بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی، خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

یہ ہیتھی لوجیز سنیاسی ہیں" سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو، جھینگر کی یہ بات سُن کر مجھ کو غصہ آیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے، بگڑ گئے، لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسل خانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا لے چار سے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی ہیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطبے کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعہ تو ہزاروں آئیں گے خدا سلامتی دے۔ نماز پڑھ کر جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بے چارہ غریب تھا، خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو امریکہ کے کوڈ پتی راک فیلر کے شریک ہم ہو گئے؟

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا، جی دکھایا تھا، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ بورپئے کے نیچے آب خورہ کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا یہ قافلوں کے لئے صور ہے، اور قافلوں کے لیے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا، جی سے گذر گیا اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا موسیقی داں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدانِ جنگ میں ہے، ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا۔

ہاں تو "جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس تو کل شعار فاقہ مست کو بچانا ولیٹ سنٹ ایبے یا ..... کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر اب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں، کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہو ؎

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے　　قیصر کا پہارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو چلا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

گھریلو مشاعرہ

تاجور نجیب آبادی

ابھی سو رہے ہو
کیوں؟ کیا تم نے کچھ کہا تھا؟
نہیں اب کچھ کہنا چاہتی ہوں۔
تو کہنے سے پہلے ہی ہم کیوں کر سن لیتے اور کیا سن لیتے؟

اچھا اب سن لو!
سناؤ۔ کیا سنانا چاہتی ہو۔
دیکھنا! آپ نے سنا ہے لاہور میں ہزاروں سینما ہیں۔ وہی نا جنھیں ہمارے ہاں بائسکوپ کہتے ہیں۔ ہیں نا؟
ہزاروں تو پورے صوبے میں بھی نہ ہوں گے۔
ہزاروں نہ سہی۔ سینکڑوں ہیں تو کھلم کھلا ہی نہیں۔
انہیں تو اس میں بھی کلام ہے۔
پھر وہی کٹ حجتی۔ میں نے کوئی پیٹ بھروں کی مردم شماری کی ہے؟
سینماؤں کی مردم شماری کی جبھی ایک ہی کہی۔ آدمیوں کی مردم شماری ہوتی آئی تھی۔ سینماؤں کی مردم شماری تمھیں سے سنی ہے۔
خیر تم سے کوئی بات کرے۔
ٹھکانے کی بات تو ہم سے ہر وقت کی جا سکتی ہے۔
تو میں خدا نہ کرے بے ٹھکانے بات کیا کرتی ہوں۔ کوئی میرے دشمن پاگل تو نہیں۔
نہیں تم تو نہیں۔ اکثر بیویاں پے پتے ہی بات کیا کرتی ہیں۔
اور شوہر؟
شوہر کمبختوں کو بات کرنے کی مہلت ہی کب دی جاتی ہے۔
انھیں بات کرنے کی مہلت ہی کون نہیں دیتا؟

وہی ہمی کی باتھوں کا آغاز و انجام اوّل واحد سے وابستہ رہتا ہے۔

یعنی بیوی۔

چوکی ماڑھ میں تنکا۔

یہ محاورہ اسی دن کے لئے یاد کیا تھا؟

نہیں بلکہ اس کا استعمال ایسے ہی موقعے پر کیا جاتا ہے۔

تو ہم چور ٹھہرے اور تم ساہ؟

تم چور نہ ہم ساہ۔ محاورات تو دراصل استعارات ہوتے ہیں۔

کسی کو کوئی گالی دے کر کہہ دینا کہ گالی تو استعارہ ہوا کرتی ہے۔

تعلیم یافتہ لوگ استعاروں ہی میں گالیاں دیا کرتے ہیں۔

کسی دن میرے سر پر ٹھہر رسید کر کے اسے بھی استعارہ بنا دینا۔

ٹھہر بازی بھی ایک قسم کا استعارہ ہی ہے مگر ذرا جلی قسم کا استعارہ ہے۔

تو ان جلی اور خفی استعاروں کی مشق کے لئے میں ہی رہ گئی ہوں؟

اپنی سہیلیوں پر ان استعاروں کی مشق تم بھی کر سکتی ہو۔

جانی! سہیلیوں نے کیا قصور کیا ہے کہ انھیں تختۂ مشق بناؤں۔ میں تو یہ استعارے تم پر مشق کرنا چاہتی ہوں۔

مشق سے بلکہ پہلے ان استعاروں کو ہم سے سیکھ لو۔ ہمارا ادارہ "تعلیم تم جانتی ہو" ڈائرکٹ میتھڈ" کے اصول پر ہوتا ہے۔

تو بادی نے جلی استعارے کی عملی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی تم اگر اس قابل رہیں کہ ہم پر اس کا تجربہ کر سکو تو ضرور کر لینا۔

تم نے اس ٹھوڑے استعارے کی عملی تعلیم کس سے لی تھی؟

اپنے مرحوم استادوں سے۔

پھر تمہارا سر کیونکر سلامت رہ گیا؟

ہمارے سر کے گنگا جمنی بالوں میں جو یہ ٹیڑھی ترچھی شاہراہیں نکلتی ہیں اسی تعلیم کی یادگاریں ہیں۔

تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ شاہراہیں میرے سر میں بھی قائم کی جائیں۔

سر کی یہ شاہراہیں باغ جنت پر ختم ہوتی ہیں۔ تم نے ساہو گاکا ستاد کی ماربدن کے جس حصے پر پڑ جاتی ہے، اس پر آتش نمرود نمودار ہو جاتی ہے۔

بس معاف رکھو۔ مجھے اس رستے سے جنت پہنچنا منظور نہیں۔ تمہیں کو اس شاہراہ سے وہاں پہنچنا مبارک رہے۔

یہ تو کچھ بات نہ ہوئی۔ ہم اس شاہراہ سے جنت ضرور پہنچیں گے مگر تم جنت کے راستے سے گزر کر جہنم رسید ہو گئیں تو تمہیں جنت سونی نظر آئے گی۔

سونی نظر آئے یا آباد۔ میں تمہارے ساتھ جنت جانا بھی نہیں چاہتی۔

اور کہاں جانا چاہتی ہو۔
جہاں خدا لے جائے۔
خدا کو کیا غرض کہ میرے تمہارے درمیان جائی ہو؟
شاعر کا بحران کیوں ہونے لگا؟ مت پڑھا کرو بات بے بات شعر۔ مجھے یہ کلموئی شاعری چڑ ہو گئی ہے۔ قرآن میں جبھی تو شاعروں کو گمراہ بتایا گیا ہے مولانا حالی ان نٹے شاعروں سے تنگ آ کے یہی فرماتے ہیں کہ ؎

گنہ گار تو بخشے جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

شاعری کا بحران متعدی ہوتا ہے۔ دیکھو تم بھی اس میں مبتلا نظر آتی ہو۔
مجھ سے سنتر پرے دور۔ فوج میں شاعر ہوں۔ تمھیں کو یہ بیماری مبارک ہو۔
آخر تم ایک شاعر کی بیوی تو ہو۔ کہہ دو نہیں ہوں۔
ہاں ہاں میں کسی شاعر واعر کی بیوی نہیں شاعر بھی کوئی آدمی ہوتا ہے۔
ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم شاعر ہیں اور نکاح کے رجسٹر میں لکھا ہے کہ تم ہماری بیوی ہو اور شاعر تمہارے خیال میں آدمی نہیں ہوا کرتا تو نتیجہ یہ نکلا کہ تم کسی آدمی کی بیوی نہیں ہو۔
میں کسی کی بھی بیوی نہیں مت کہا کرو مجھے بیوی۔
تمہارا خدا بھلا کرے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ نان نفقہ۔ مہر وہر یہ سب آئے گئے ہوئے۔ اب ہم ہیں اور ہماری تنخواہ۔ اپنی بھوک کھانا اور اپنی نیند سونا یہی تو ہم چاہتے تھے۔

جی ـــــ کیوں نہیں چاہتے تھے۔ بس ایک تم۔ ایک تمہارا چاہنا۔ باقی جھوٹا کل سنسار میں اور میری تنخواہ کیا کہنے تمہارے اور تمہاری تنخواہ کے تنخواہ تمہاری کہاں سے آئی۔ میاں ۲۵۔ پلی پاتے تھے۔ میرا آنا ایسا بھتاور ہوا کہ اب ڈیڑھ سو مل رہے ہیں۔ بس اپنے پچیس نکال کے باقی سوا سو سیدھی طرح میرے میکے بھیج دیا کرو۔ رہا میرا سوا لاکھ روپے کا مہر اس کی جلد فکر کرو۔ رہے تمہارے بچے انھیں سنبھالو۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ ہاوڑا کسپریس کل صبح مجھے میرے گھر پہنچا دے گی۔ پھر بیٹھے شاعری بھگارتے رہنا۔
بچے ہم سنبھالیں؟ یہ کیوں؟ تمھیں ان سے کچھ واسطہ نہیں؟
کیا خدا نہ کرے میں انھیں جہیز میں لے کر آئی تھی؟
تو کیا ہم شادی کے جوڑے کے ساتھ لے کے گئے تھے؟
مجھے نہیں معلوم لے کے گئے تھے یا نہیں۔ مجھ سے مت بولو۔ جبھی تو نانی اماں کہا کرتی ہیں کہ یہ مردوے نگوڑے نہ

ہوتے تو دنیا بہشت نظر آتی انھیں ہستیوں نے اسے جہنم بنا دیا۔

اللہ بخشے ہمارے دادا میاں بھی فرمایا کرتے تھے کہ عورت آدمی کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لئے اس کا مزاج ٹیڑھا۔ مزاج ٹیڑھا۔ فطرت ٹیڑھی یہ خود ٹیڑھی ہے۔ اس کا ٹیڑھا پن کسی صورت نہیں جا سکتا۔ یہ جب سے دنیا میں آئی ہے جینے والوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ بس اس کے ٹیڑھے پن کا ایک ہی علاج ہے۔

کیا ہے وہ علاج؟ میں بھی تو سنوں! دیکھوں تو وہ تمھارے بہشتی بزرگ عورت کے ٹیڑھے پن کا کیا علاج بتا گئے ہیں۔

یہ پھر بتائیں گے۔ وہ بچ چکے ہیں۔ چوکیدار بول رہے ہیں۔ سونے بھی دو گی یا نہیں۔ اس مشاعرے کو ختم کرنے کا اعلان کرو۔!

قرض و مقروض

سلطان حیدر جوش

ضرورت کے وقت ایک حاجت مند کو نقد یا جنس جو کچھ بہ عہدۂ واپسی کچھ مدت کے لئے دیا جائے قرض کہا جاتا ہے! قرض کی دو قسمیں ہیں داد و ستد کے نقطۂ نظر سے، اور کاروباری اصول پر، جو کچھ دیا جائے قرض ہے لیکن امداد کے خیال سے اور محبت کے اصول پر، جو کچھ دیا جائے مقراض ہے!

اگر آپ کسی دوست کو قرض دیتے ہیں تو دو ہرا خطرہ پیدا کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں - روپیہ کھو دینے کا خطرہ، اور دوست کھو دینے کا خطرہ! بنا نوے فی صدی دونوں ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم" نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے!

اگر آپ دوست پر تقاضا نہ کریں جب وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے شرمائے گا! اور اگر کریں تو گویا ہمیشہ کے لئے اُسے کھو دیا۔ تقاضے کا نام آتے ہی وہ چراغ پا ہو جائے گا! ایک دوست کی امداد آپ شوق سے کریں مگر اسی قدر رقم کے ساتھ اُسے ممنون بنائیں جس کے ضائع ہو جانے کا آپ کو بھی احساس نہ ہو؛ آپ دوست کی مدد کر سکتے ہیں مگر للّٰہ قرض نہ دیجئے! آپ کی زبان پر اس رقم کا نام آیا کہ اس کو صدمہ ہوا۔ قرض لینے والے اکثر رقیق القلب ہوا کرتے ہیں - آپ گویا اسے قرض دے کر اسے کشمکش میں مبتلا کر دیتے ہیں، اُسے اپنی نگاہ میں ذلیل کر دیتے ہیں! اور وہ فطرتاً اس کو محسوس کرتا ہے! اگر آپ تقاضائے شدید کو کام میں لائیں گے تو یقینی دیکھئے آپ اس کی مستقل عزت کریں گے!!

ایک دوست قرض لے کر آپ کا ممنون منت ہو سکتا ہے مگر محض اس شرط پر کہ آپ اس کی واپسی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں! اگر آپ وہ رقم کسی طرح واپس پا لیتے ہیں تو اس کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ آپ نے کوئی احسان کیا تھا وہ اس کو احسان سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے! جو کوئی دوست کو قرض دے کر ادائی کی امید رکھتا ہے ایک ایسی حماقت کرتا ہے جس کو کوئی مستند فعل مناسب ثابت نہیں کر سکتی!

واقعہ یہ ہے کہ ایک قرضدار دوست اگر کبھی شاذ و نادر، دوست کی رقم بوجہ اس نے عین اعتبار ہی میں قرض دی تھی واپس کرتا ہے تو [illegible] کا متمنی ہوتا ہے کہ قرض دینے والا دوست اس ادائگی پر خاص طور سے اس کا ممنون ہو! فی الحقیقت دوست کو قرض دینا [illegible] ہی ہے! مقراض ہے!

قرض صرف وہی ہے جو بازاری اصول پر دیا جائے! داد و ستد کی تجارت اسی وقت بار آور ہوتی ہے جب قرض ۵ سے ۱۰ فی صدی سود تک شرح پر دیا جائے اور ضمانت میں رقم قرض سے پندرہ گنی مالیت آڑ میں رکھ لی جائے! اس اصول پر

طرح بنانے والے اندھے رہتے ہیں تو ہر قسم کی عزت اور خطابات پاتے ہیں اور مرتے ہیں تو اپنے بچوں کے مرنے میں سونے کا چمچہ لے جاتے ہیں! اس اصول کے خلاف عمل کرنے والے زندگی بھر خاک چھانتے پھرتے ہیں اور مرتے وقت اُن کے گور و کفن کے لیے چندے کی ضرورت ہوتی ہے!

عام طور پر قرض لینے والے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو قرض لے کر ادا کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے، اور ایک وہ جو کیسے ہی اچھے ارادے رکھتے ہوں ادا نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ ایک ادا نہیں کرتے اور ایک ادا نہیں کر سکتے۔ غضب یہ ہے کہ تمام قرض لینے والے ذہنی تعلب اور زود رنج ہوتے ہیں کسی کے دل دکھنے سے قہر الٰہی کا احتمال علیحدہ رہا!

تیسری قسم قرض لینے والوں کی ایک اور بھی بتائی جاتی ہے۔ یہ حضرات قرض لینے کو ایک نہایت معزز و آرام دہ پیشہ سمجھتے ہیں معمولاً تو اس وجہ سے بڑے بڑے صاحب قرض دینے کے وقت "آداب صاحب" سے خطاب کرتے ہیں اور آرام دہ اس وجہ سے کہ بغیر کسی کی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ کسی خدمت کی ذلت گوارا کرنی پڑتی ہے۔ دلال اگر زندہ ہیں تو ہر طرح کا آرام گھر بیٹھے نصیب ہے! کہا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ روزانہ کے خدا دے کھانے کو بلا جائے کے لیے لوگوں کے طور پر پڑھا کرتے ہیں!

قرض لینے کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب انسان اپنی حاجتوں کو اپنے مال یا اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا نہیں کر سکتا! ظاہر ہے کہ کسی کا حاجتمند ہونا دو چیز کی وجہ سے ہے، جس کو خدا حاجت مند بنانا یاد رکھنا چاہتا ہے اس کی مدد اور لوگوں یعنی اس کو حاجت مند نہ رہنے دینے کی کوشش کرنا! ایک فعل عبث ہے اور ایک حد تک شقاوت! بزرگوں کا کہنا ہے "گو یا حاجت مند کو ہمدردی کے تحفظ نگاہ سے یا امداد کے طور پر قرض دینا سوئے تسلیم گناہ ہے تو نہ ہی گناہ بھی ہے، البتہ کاروباری اصول پر المضاعف ہو جانے والے سود کے ساتھ قرض دینا منشائے قدرت کے موافق ہے کیونکہ اس طرح جس تباہی میں تدست کے لگنا چاہی ہے وہ جلد سے جلد آجائے گی! اب فیصلہ عالم اسباب کے موافق کاربند ہونا چاہتے ہیں یا خلاف! غالباً حماقت کو آپ حماقت ہی سمجھتے ہوں گے۔

ایک مہاجن نے قرض دینے کا رنگ مجھے عرصہ ہوا کہ نہایت پسند آیا تھا، وہ رؤسا اور متمول حضرات کو حد فیصدی سود پر قرض دیتا تھا اور ہر مرتبہ قرض دینے کے وقت اپنے پہلے قرضے کا حساب بیباق کر لیتا تھا، مثلاً اس نے ایک نواب صاحب کو دس ہزار قرض دیئے تھے، دو بارہ اطلاع نواب صاحب کو قرض لیتے وقت اپنا کہ گذشتہ قرضہ مع سود ملا کر ۱۵ ہزار روپیہ وصول لے کر پانچ ہزار نقد اور دینے اور بیس ہزار کا نسک اسی شرح پر لکھوا لیا! دو تین دفعہ کے تبادلہ میں ہر بار کچھ نہ کچھ نقد رقم نہایت خوش دھانگی کے ساتھ سوچتے سوچتے ایک لاکھ بن جاتی ہے! قرض دینے کا یہ طریقہ بہترین طریقہ ہے اور تاریخ بھی ایسے قرضے کا وجود ثابت کرتی ہے، دنیا کی کوئی مدت دراز سے یورپ اسی اصول پر قرضہ دیتا چلا آیا ہے نتیجہ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو کسی مصری صاحب قلم سے دریافت کر لیجئے، ہمیں بھی بتائیے گا کوئی نجات نہیں بشرطیکہ سنسر صاحب دفیوضہ اجازت دیدیں۔

مختصر یہ کہ قرض اگر تقاضائے فطرت کالی خار رکھ کر دیا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کاروبار کے اصول پر دیا جائے تو اس کو قرض کہا جائیگا ورنہ اور کچھ! اور کچھ میں مقراض محبت بھی شامل ہے اور حماقت محض بھی!

اس میں شک نہیں کہ کسی دوست کے ساتھ نہایت تدبر کے ساتھ سلسلہ ارتباط قطع کرنا ہو تو بہترین ترکیب یہ ہے کہ اس کو کچھ نقد قرض دیدی جائے۔ "القرض مقراض المحبت" میں ہمارے زمانے والوں کو شبہ تھا اور نہ موجودہ زمانہ والوں کو ہے!

مالدار کو قرض دینا اور کچھ فیصدی سود کی شرح پر دکانداری و ذہانت ہے، مفلس کو قرض دینا ابلہی و حماقت ہے، اور دوست کو قرض دینا مقراض محبت ہے!!

اجتہاد و تحقیق

سجاد انصاری

جہلا کی گمراہیاں ایک طرف، ان کے کسی انداز پر تبصرہ کرنا ہی حماقت ہے۔ قابل غور تو اس طبقہ کی زندگی ہے جس نے ادعائے علم و فن کی بدمستیوں میں حسن و قبح کا بھی ہوش کھو دیا۔ دنیا کا خیال ہے کہ ارباب علم کی بے راہ روی عبرت انگیز ہوتی ہے۔ میں اس سے متفق نہیں، ارباب بصیرت کبھی ممنون عبرت نہیں ہوتے۔ ان کا مقدس ترین فرض یہ ہے کہ جس واقعہ کو عوام عبرت آموز قرار دیں، وہ اس کو ایک نئے بنیاد تفتیش میں گم کر دیا کریں۔ حاملان علم و فن کی گمراہیوں سے عبرت نہیں تفریح حاصل کرنا چاہیئے۔ ان کی زندگی کی ہر لغزش مضحکہ خیز ہوتی ہے لیکن اس تمسخر سے صحیح معنوں میں مسرور ہونے کے لیئے مخصوص دل و دماغ چاہئیں۔ بے وقوف کبھی صحیح طور پر ہنس نہیں سکتا، دنیا کی تضحیک صرف وہ بلند نظر انسان کر سکتا ہے جو عالی حوصلگی اور عالی ظرفی کے ساتھ دنیا کے حقائق سے بھی آشنا ہو۔ حقیقت آشنا صرف وہ نظر ہے جو ایک بے نیاز تبسم کے ساتھ کائنات کے ہر واقعے کو ٹھکرا دے۔ چشم گریاں اور نگاہ عبرت اندوز دل و دماغ کی محرومیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میرا مفہوم یہ ہے کہ میں مدعیان تحقیق کی لغزشوں پر اس لیئے تبصرہ نہیں کر رہا ہوں کہ دوسروں کو عبرت ہو، میں ایسا تنگ نظر نہیں کہ لوگوں کو تلقین عبرت کروں۔ مجھے صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کرنا ہے جنہوں نے کائنات عالم کو ایک حد تک مضحکہ انگیز بنا دیا ہے۔ اگر کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ ان اشارات پر تبسم ہو سکے، اسے چاہیئے کہ مصروف ماتم ہو جائے۔ دنیا پر نہیں خود اپنی بصیرت پر کہ فطرت نے اسے ذوق تبسم سے محروم رکھا۔ میرا مخاطب وہ کج نظر اور کم فہم نہیں جو دنیا کے ہر واقعہ پر رونا چاہتا ہے۔ اگر کسی کو ماتم کرنا ہے اس کے لیئے ہزاروں مشاغل ہیں اور ہزاروں مرثیے۔ جوان صالح، زاہد خشک، حسن پارسا، فریب تصوف، غرضکہ اس طرح کے تمام مرثیے عبرت انگیز بھی ہیں اور لائق ماتم بھی۔ لیکن ایک صحیح انسان ان پر ہنستا ہے البتہ حشر و نشر کے مراحل پر ان بدنصیبوں کو ضرور ماتم کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی دنیا کو خدا کے لیئے نہیں بلکہ محض اس لیئے غیر دلچسپ بنا دیا ہے کہ عقبیٰ میں تمام مسرتیں بنائی اذیتوں کی جزا میں مل جائیں گی۔ ان کی دنیا اور عقبیٰ دونوں عبرت خیز اور ماتم انگیز ہیں۔

یہ بے بسی اس کے لیے باعث شرم ہو جاتی ہے۔ اسے مجبوراً کسی نہ کسی طرف اپنے قوائے فکر کو متوجہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے کہ دنیا پر اس کی جہالت اور بے چارگی کا راز افشا نہ ہو، وہ لامحالہ عالم نامعلوم کے موضوعات کو ذاتی طور پر ممنون تحقیق کرتا ہے۔ نتائج معلوم ژولیدہ بیانی، کج فہمی، بے راہ روی، نادانیاں، حماقتیں، جہل مرکب، نہ منزل کا پتہ، نہ جادۂ منزل کا ہوش، دماغ کے سامنے کوئی راستہ

نہیں، دل میں کوئی آرزو نہیں، الفاظ کا تانا بانا کوئی مقصد ہے نہ مفہوم ان تمام عقدہ ہائے تخیل اور افکار لایعنی کا نام فلسفہ رکھا گیا ہے۔ سیکل اور کیٹ کے لیے یہ سوالات سربستہ ہرزہ سرائی ہو گئے۔ انسان جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا وہ ہمیشہ کے لیے بھول گیا۔ اس کے سامنے وہ مراحل آ گئے جن کو اگر ارباب قضا و قدر بھی حل کرنا چاہیں تو کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسان نے اپنے ادعائے تحقیق میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق وہ مکالمات پیدا کر دیئے جن کو دراصل مذہب و خدا سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن فلسفہ نادان ہے کہ معمائے کائنات حل ہو گیا۔ اور ارباب علم و فن متبحر کہ ان کی عقدہ کشائی نے دنیا کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔ خدا نے بنی آدم دل پیدا کیے، مگر ارباب تحقیق نے بالتامل ان کی ترکیب کر دی۔ انہوں نے یہ امتیاز قائم کر دیا کہ پیامبر جملا کی تشفی کے لیے ہیں اور حاملان علم و اجتہاد ارباب نظر کے لیے۔ جہل مرکب قتل کرنے لگا۔ انسان نے ارباب حل و عقد کو شکست دیدی، اور یہی نہیں نظام عالم اور حیات انسانی کی لطافتیں بھی ہمیشہ کے لیے برباد کر دیں۔ دنیا کی دل آویزی اس کے رموز میں مضمر ہے۔ نظام کائنات دلفریب اس لئے ہے کہ وہ ایک معمہ ہے جس کی حقیقتیں افشا نہیں کی جا سکتیں۔ انسان حقائق کائنات کا متحمل نہیں ہو سکتا جس وقت کائنات کے رموز منکشف ہوں گے۔ شیرازہ عالم بکھر جائے گا۔ قیامت اسی وقت آئے گی جب انسان پر اس کی انسانیت کا راز افشا ہو جائے گا۔ یہ مسلہ حقیقت ہے، تاہم مضطرب اور بے خود غلط انسان طلسم کائنات کو توڑنا چاہتا ہے، اسے اس سے بھی تشفی نہیں ہوتی کہ وہ ایک ہیولائے سفلی ہے جس کا خاکہ بہشت کی فضائے لطیف میں تیار کیا گیا تھا۔ حیات انسانی کی رنگینیاں اسے مسرور نہیں کر سکتیں۔ مشرقی روحانی فضا سے مانوس ہے۔ اس کا فلسفہ اگر کسی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسی عالم قدس کی طرف جس کی رنگینیوں کے پرتو سے یہ دنیا معمور ہے۔ یونانی فلسفہ نے اسے حسن مطلق کا عکس ایک پرتو قرار دیا۔ دوسرے نے اس کو اور اس کے خداوندوں کو مضحکہ اعتماد کرنا چاہا، لیکن مغرب وہ کبھی نہ ہو سکا وہ کبھی نہیں، اس لیے اس کا فلسفہ بھی اسفل کی طرف آتا ہے۔ ڈارون مع اپنی امتحان پرستیوں کے موجد علم و فن میں نمودار ہو گیا، اور کائنات روحانی و مثالی رنگینیوں سے محروم ہو گئی۔ مجھے حیرت تو مغرب کی ذکاوت، ذہانت اور کشافت تخیل پر ہے۔ انھیں انبساط و مسرت اس قصور سے نہ ہوئی کہ ان کے اجسام خاکی کی پرورش فردوس بریں کی اس فضا نے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو مرغوب و جامع بنائے ہوئے ہیں۔ دنیا باوجود اپنی تمام بہشت آفرینیوں کے اس فضا کے ایک ذرہ کی بھی وسعت نہیں رکھتی۔ معرفی دل و دماغ کو اگر تشفی ہوتی ہے تو اس قدر سے کہ انسان حقیقتاً ہیولائے ارتقائی ہے جس کی پرورش کنار فردوس میں نہیں بلکہ آغوش زمینی میں ہوئی تھی۔ حقیقت انسانی سے مغرب روگردی تھی حقیقت ہیولی نے اسے مطمئن کر دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ واقعتاً نظریۂ ارتقا صحیح ہے یا غلط۔ تمثیلات اور توہمات بھی صحیح یا غلط نہیں ہو اکرتے۔ ان کے لیے صرف لطافت و کثافت کا امتیاز ممکن ہے۔ اس حیثیت سے مغربی تحقیق و اجتہاد کی حقیقت مسلم ہے۔ ان کے لیے یہ تصور لطیف نہ تھا کہ انسان عالم لاہوتی کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ صرف اس حقیقت سے مطمئن ہیں کہ وہ تخلیق زمینیت میں مضمر ہیں۔

اگر کسی حکیم نے خدا اور اس کے مظاہر کو بھی ممنون احسان کرنا چاہا، اسی تحقیق کو خضر راہ قرار دیا جس کے ذریعے ہر بنیادی مسئلے پر ردو قدح کی جاتی ہے۔ ڈیکارٹ اور برکلے حقیقت خداوندی کی طرف متوجہ بھی ہوئے تو اسی جہل مرکب کے ساتھ۔ یقین کی جگہ پر علم طنانیت نے حاصل کر لی۔ واہمی اطمینان معیار حقیقت ٹھہرا۔ یہاں بھی ہرزہ سرائیوں کا وہی انداز ہے جو دوسرے علماء کے انکار و الحاد کے مباحث میں نمایاں ہے۔ لطف و انبساط، سکون و مسرت یقین و اطمینان فنا ہو گئے۔

مغرب کی گمراہیاں لازمی تھیں، ان کے پیغمبر کی تعلیم و تلقین موجودہ تمدن کی وسعتوں کی کفالت نہیں کر سکتی تھی۔ انسان کے ہر وعظ و پند کی مستقل ترکیب تھی جس کی رہنمائی سے وہ گمراہیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ انجیل اپنے حقائق سے معرا ہو چکی تھی، اقوال و افعال، نقل و حرکت کی کوئی یادگار نہ تھی۔ ان کے لیے سوائے ان کی ذاتی کاوشوں کے سکون و اطمینان کی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن مشرق اور بالخصوص عالم اسلامی .....

معترضہ جملے

میاں عبدالعزیز

۱۵ جولائی

وہ خدائے قدیر جس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا مگر بجلی کا پنکھا چلتا ہے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کیا ایجاد کا کلہ میرے قلم سے نکلا! اصل بات یہ ہے کہ جب مسافر والی اونچی کوٹھی کی خس کی ٹٹیوں کا وہاں کی مفقود الانتشر میں تعرف سوڈے کا، صبح شام کی چہل پہل اور روزانہ "غالب شاہی" کا خیال آتا ہے تو جی جل جاتا ہے۔ اور سوچتا ہوں کہ کیا میرے ہی گھر پر اللہ میاں کا زور چلتا ہے کہ پہروں گزر جائیں اور پتا نہ ہلے۔ بچے ہیں کہ گرمی سے بلبلا رہے ہیں۔ بیوی چھاپہ بنکھے بند نکلے ڈاروں کی تصویری کا زندہ ثبوت بن گئی ہے۔ خود پسینے میں ڈوبا جاتا ہوں مگر اللہ صاحب کی طلسم میں غریب کی شنوائی نہیں، نیز نئے سرے سے مضمون شروع کرتا ہوں)۔

وہ مازق ازلی جس کے ادنیٰ اشارے سے سمندر کی تہ میں پتھر کے کیڑے کو مقررہ قوت لایموت برابر ملتی ہے اور جس کی مرضی سے چیونٹیاں میری کھانڈ اور چوہے میری روٹی کا برقہ کرتے ہیں (استغفر اللہ، پھر وہی بات۔ ذات باری اور چوہوں کی اعانت! اصل بات یہ ہے کہ کل جو اس کوٹھی میں جا نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چار فٹ دو انچ کے ٹکڑے وہاں کے کنول کی نذر ہوئے، اور خانساماں نے کمبخت لگے جوئے ٹوسٹ تھنز کو معمولی دربادلی سے دے دیے کہ حیران ہوا کہ اس جگہ چیونٹیوں اور چوہوں کی الٰہی فوج کیوں حملہ آور نہیں ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آگیا کہ فرش پکے ہیں اللہ صاحب کی سفر جینا پلٹن کی انجینیری ان کے آگے عاجز ہے۔ مگر یہ عقدہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ کوٹھی میں تو صرف تھنز کا درجہ کتوں سے ذرا کم رہا مگر میرے گھر میں چوہے پہلے اور میں پیچھے! خیر اس الجھن سے کیا فائدہ! مضمون پھر شروع کرتا ہوں)

وہ حافظ حقیقی جس کی آسمانوں کی منور کتاب ازبر ہے، مگر جسے بچے کی بھی کے اندھیرے کا کچھ پتہ نہیں (معاذ اللہ، پھر وہی بیہودہ بات! اصل بات یہ ہے کہ یہ اونچی کوٹھی، ایک مشہور بہی کا ایک ورق ہے۔ کسی زمانے میں ایک نواب صاحب نے یا نسوکا تاجہ معاشقہ، وہ کسی دھم سے پانچ ہزار درج ہوا، اور پھر بڑھتے بڑھتے یہ کوٹھی اور ایک گاؤں ہضم کر گیا۔ اللہ صاحب کی بجی میں کچھ اس قسم کی ڈگریاں ہوتی ہیں، مگر مجھے اس سے کیا؟ میں تو ایک چشم پارسا کی فرمائش کی تعمیل میں مضمون لکھنے بیٹھا تھا۔ انہوں نے چلتے چلتے خیال ظاہر کیا کہ مسلمان خواتین کے ایک بہترین نمونہ کا نقشہ باندھا جائے۔ کہاں ایک بہترین مسلم بیوی کا تعین کامل کہاں یہ میرا میساختہ نیم پختہ کفر! پھر شروع کرتا ہوں)۔

وہ مسبب الاسباب جس نے اپنی حکمت کاملہ سے مگر مچھوں کی خاطر سمندروں کو بے شمار کمزور و ناتواں مچھلیوں سے بھر دیا ہے، جس کے لازوال خزانوں میں سے ہر قبیل کو کبھی نہ کبھی کبوتر اور ہر سانپ کو کہیں نہ کہیں چھچھوندک میسر ہو جاتا ہے، مگر جس کے ہاں میرے لئے صرف مکھیوں اور مچھروں کی پلٹنیں ہیں اور وہ بھی میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ مجھے کھانے کے لئے ..... (پھر بیوی حمیدہ دہنی! اصل بات یہ ہے کہ جب ہر شام کو فرشتہ نگہبان ملازم اس اونچی کوٹھی کے وسیع صحن میں شب نیوں اور مسہریوں کی قطار کھڑی کرتے ہیں، اور پائنتی کی طرف بجلی کے پنکھوں کی لمبی لگاتے ہیں تو یہ حسرت سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ وہاں پھر جھوکے مریں گے مگر میرا خون آ کر چوس لیں گے۔ مگر یہ تو ۔ وزی ہوتا ہے مجھے جلدی سے اپنا مضمون شروع کرنا چاہئے)۔

وہ احکم الحاکمین جس نے صاحب ضلع کے اوپر پلاٹ اور لاٹ کے اوپر بادشاہ اور بادشاہ کے اوپر اپنے آپ کو اور اپنے اوپر ہزاروں کو حکمران مقرر کیا ہے (لعنت بکار شیطان! پھر وہی بے تکا پن! اصل بات یہ ہے کہ اونچی کوٹھی والے مجھ سے ساتھ والی دو گز زمین خریدنا چاہتے تھے اور قیمت بھی اچھی دیتے تھے۔ مگر میں نے انکار کیا۔ جب غریدہ کے متعلق وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تو انہوں نے پٹواری کے ذریعہ سے جبراً قبضہ کرا کے وہ زمین اپنے احاطہ میں مفت شامل کرالی۔ نتا فشلی تک مقدمہ کیا۔ اجمیر شریف سے خاک لا کر اس زمین پر چھانی، دنا گنج بخش سے پانی لا کر چھڑکا، ختم قرآن اس موقعہ پر کرایا مگر وہ نافشل زمین نہ کلام پاک غرضیکہ کوئی بھی اس پٹواری کے "کن فیکون" کے آگے دم نہ مار سکا۔ مگر یہ سب کچھ تو ہو چکا۔ مجھے مضمون شروع کرنا چاہئے)۔

حمیدہ :- ابا! آداب۔ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

میں :- کچھ نہیں!

حمیدہ :- میں دیکھوں؟

(بغیر میری اجازت کے حمیدہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور جوں جوں پڑھتی جاتی ہے ناک بھوں چڑھاتی جاتی ہے)

حمیدہ :- (ختم کر کے) ابا آپ کا خط روز بروز بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میں تو اس قدر آپ کہتے ہیں، خود کیوں صاف صاف نہیں لکھتے؟ اور یہ مضمون تو کچھ اچھا نہیں۔

میں :- اچھا کہ بُرا، تم اب جاؤ مجھے لکھنے دو۔

حمیدہ :- اچھے ابا! خفا نہ ہو جیئے یہ بتائیے کہ وہ کون بیوی ہیں جنہوں نے بہترین مسلمان خاتون کا تذکرہ آپ سے طلب کیا؟

میں :- حمیدہ وقت ضائع نہ کرو مجھے کام کرنے دو۔

حمیدہ :- (یہ میری ۱۶۵۰ سالہ نعمت ہے جس کا عشر عشیر بھی اس اونچی کوٹھی کو میسر نہیں اور جس کے ہوتے باوجود غربت کے دنیا میرے لئے ہزاروں جنتوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ حمیدہ کی شرارت کے مقابلے میں جنت کی نقاہت الامان و خوقربان ہے) بھلا آپ اور مجھ سے غصہ! بتائیے وہ بیوی کون ہیں؟

میں :- کیوں پوچھتی ہو؟

حمیدہ :- ضرور کوئی مولوی کی بیوی ہوں گی، کیونکہ آپ کی کل ذہانت کا نزول رہے ہے؟

میں :- یہ تو بڑی بھدی دلیل ہے۔ کیا کوئی آزاد منش بیوی یہ خیال نہیں کر سکتی کہ معلوم تو کریں کہ مردوں کی نظر میں بہترین مسلم بیوی کے خیالات کیا ہونے چاہئیں؟

حمیدہ :- یہ اچھی رہی! خیالات پر کسی کا کیا بس ہے۔ سوال تو معلومات کا ہے، اور میں سمجھتی ہوں کہ جس بیوی کو آزادی کی ہوا چھو بھی گئی ہے۔ وہ یقیناً جانتی ہے کہ جو بیوی دل سے مسلم ہو وہی بہترین ہے۔ اس لئے وہ کبھی ایسا سوال نہ کرے گی، وہ خود سوچ لے گی کہ مختلف بہترین ہستیوں میں اتنا فرق ضرور ہوگا کہ مختلف حالات میں ان کا باطنی حسن الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ اماں ہی بہترین مسلم بیوی کا اچھا خاصا نمونہ ہیں۔ میں کسی پارٹی میں کسی بیوی کے چہرہ پر وہ اطمینان اور مسرت کی جھلک نہیں دیکھی جو اماں کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے جب وہ رشیدہ کا منہ دھلواتے وقت خود کلمہ پڑھتی ہیں اور رشیدہ تتلا تتلا کر "محمد رسول اللہ" کہتی ہے۔ اس قسم کی بشاشت تو کسی انگریز مس کے چہرے پر بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ تب بھی نہیں دیکھی جب مس جینک ہارسٹے ٹینس کا سٹ جیت گئیں۔

میں :- کبھی ایک وقت بشاش ہونے سے انسان بہترین انسان تھوڑا ہی بن سکتا ہے۔

حمیدہ :- ابا آپ تو غضب کرتے ہیں۔ تو کیا انسان محلوں میں رہنے سے بہترین انسان بن جاتا ہے؟ یہ تو دل کی بات ہے۔ میرے خیال میں تو جو شخص، چاہے اس کے حالات کیسے ہی ہوں، اپنی طرف سے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو، نتیجہ چاہے اس کے موافق ہو کہ مخالف، وہ بہترین انسان ہے۔

میں :- کہتی تو ٹھیک ہو۔

حمیدہ :- آپ تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں بے عقل ہوں۔

میں :- کب و کب؟

حمیدہ :- نہیں کبھی نہیں۔ یونہی آپ سے اپنی تعریف سننے کو جی چاہتا تھا۔ لیجئے اب جاتی ہوں۔ تھنے کو روٹی کھلا دوں۔

حمیدہ گئی تو میں نے اس کی اور اپنی اوپر والی گفتگو قلم بند کر لی۔ جس قدر غور کرتا ہوں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بہترین زندگی کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ مفید ہونے کی پوری کوشش کی جائے۔ مگر مانے گا کون؟ حمیدہ کی فطرتی راستی کی روشنی نے کس آسانی سے درس صفائی سے میرے پراگندہ تخیل کی تاریکی کو دور کیا ہے مگر چڑیل نے مضمون برباد کر دیا۔ میرے پیش نظر وہ خارجی اسباب تھے جو سے انسان ہم چشموں کی نگاہوں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس گڑبڑ نے ایک ذرا سے جملے سے یعنی یہ کہ دل کی بات ہے، اسے مکمل نفسیات کر دیا۔ پھر شروع کرتا ہوں۔

وہ نورانی حوتیوں کا ہار جس کا نام زندگی ہے اور جس کے پرکھنے والے جوہری خدا اب ایشیا میں پیدا نہیں کرتا کیونکہ یہاں سے لوگوں کو مرنے اور مرنے کے قصوں سے نہ فرصت ہوگی نہ وہ زندگی کا خیال کریں گے (خدا کو چھوڑ کر اب ایشیا کا پیچھا میں نے کیا)

مجھے کچھ ہونا نہیں گیا، اصل بات یہ ہے کہ ایک ناقتا ہی تواتر سے تنگ آگیا ہوں۔ یہاں سوائے اس کے اور کچھ کام ہی نہیں کہ فلاں جگہ بھی بھا عقیقے کی دعوت ہے، دوسری جگہ شادی کے متعلق دلیمہ کی دعوت ہے۔ اور تیسری جگہ مرگ کے متعلق چالیسویں کی دعوت ہے۔ پیدائش، بیاہ، موت اور ساتھ ساتھ رونگ سوگ کچھ ایسا تانا بندھا ہے کہ کسی کو اور کسی کام کے لئے فرصت ہی ہی نہیں مگر مجھے اس سے کیا، میں تو صاف ہی اس سعید کا لے کیبل کا جلا ہا ہوں کہ خواہ مخواہ خرماؤں، پھر شروع کرتا ہوں،

وہ خانم سلیمانی جس کا نام کامیابی ہے اور جو سلطان صلاح الدین کے بعد مسلمانوں سے گم ہوئی، اور سمندر میں سے یورپین اقوام کے ہاتھ ایسی آئی کہ اب کبھی نہ نکلے گی (مبشت۔ یہ میں کیا لکھ گیا، میں کہاں کا ولی ہوں کہ پیشین گوئی کروں اور جو مجھے پیشین گوئی ہی کرنی تھی تو استخارے کے ذریعہ کرتا کہ زید بکر سے پہلے مرے گا یا عمر کے ہاں لڑکا ہوگا، یا زلزلہ آئے گا یا طاعون پھیلے گا۔ جب میری کامیابی سے صورت آشنائی تک بھی نہیں تھا اس کے متعلق اس قدر وثوق کس قدر لغو ہے) اور کیا پتا ہے کہ کامیابی پر پہنچ کے مرکھپ ہوتے ہوتے جاپان جا نکلے اور پھر وہاں سے چین کا چکر لگاتی ہوئی واپس لوٹ جائے؟ اصل بات یہ ہے کہ کبھی بھی تھا خیار میں نہیں پڑھا کہ میرے نام دس فلاکھ کی لاٹری نکلی ہے۔ جب دیکھو یہی ہوتا ہے کہ مسٹر ڈیم فول کو دس ہزار پونڈ آئے۔ مس گلاب کے چہل کو بیس ہزار پونڈ منتیاب ہوئے۔ مسٹر گوگ کو اس کے چچا دس لاکھ پونڈ چھوڑ گئے۔ بوڑھیا مس بھیڑ اپنے کتے کے لئے ہزار پونڈ چھوڑ گئیں۔ مسٹر تھپر انداز نے دو کروڑ ہسپتال کی نذر کئے۔ کاش میں ہسپتال ہی ہوتا!

بیگم :- اوہو! آپ تو مضمون نگاری کی دھن میں ہیں اور لکھیں کیا لکھا ہے؟ (بیزار جانت پڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور مسکراتی جاتی ہیں)

میں :- کیوں کیا لکھا ہے؟

بیگم :- یہ تو میں نہیں کہتی کہ محض لفاظی ہے، زندگی کے دو پہلوؤں کی اچھی تصویر ہے۔ مگر حمیدہ والی تعریف جس کے آپ اس قدر مداح معلوم ہوتے ہیں وہ تو غلط ہے۔

میں :- (عالمانہ غرور کے ساتھ) ہرگز نہیں۔ ایسی صحیح تعریف تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔ شاید کسی وقت گفتگو میں میں نے وہ فقرہ استعمال کیا ہوگا اور حمیدہ کو یاد رہ گیا۔ میری بینا کا حافظہ بہت اچھا ہے۔

بیگم :- آپ کا فقرہ ہو کہ حمیدہ کا۔ تعریف قطعاً غلط ہے کم از کم اسلامی نقطۂ خیال سے۔

میں :- تو تم ذرا اسلامی تعریف بیان کر دو۔

بیگم :- صرف ایک جملہ ایزاد کرنے کی ضرورت ہے۔

میں :- وہ کیا؟

بیگم :- جو شخص چاہے اس کے حالات کیسے ہی ہوں اپنی طرف سے ہر حال میں خالص خدا کی خوشی کے لئے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو اور نتیجہ سے مطلقاً بے نیاز ہو وہ بہترین مسلمان ہے۔

میں :- خدا کی خوشی کا کیا معیار ہے؟

بیگم :- سبحان اللہ! کیا سوال ہے؟ خدا کی خوشی وہ ہے جس میں مخلوق کی بہتری ہو۔ بیماری نہ ہو، مفلسی نہ ہو، خوب عیش و عشرت ہو مگر

حق الوسع سب کے لئے آسانی ہو، اور خدا کی خوشی کیا ہے!

میں :- اور نماز روزہ ؟

بیگم :- مجھ سے جو پوچھتے ہو تمہیں بتاؤ کہ نماز روزہ آخر کیا ہیں ؟

میں :- عبادت -

بیگم :- اور بچوں کو اچھی طرح پالنا، صاف رہنا، ان کی گھر والوں کی، ہمسایوں کی خدمت کر کے خوش رہنا یہ کیا ہیں، کیا یہ عبادت نہیں ؟

میں :- عبادت تو ہیں -

بیگم پھر کیا جس کو نماز روزہ میں خوشی ہو وہ نہ کرے جس کو اور کسی قسم کی عبادت میں خوشی ہو وہ وہ کرے۔ مجبور کرنے کا یا جو ایک خاص قسم کی عبادت نہ کرے اُسے متہم کرنے کا کسی کو کیا حق ہے ؟ شرط تو صرف یہ ہے کہ نیت یہ ہو کہ مقصود خالص خدا کی خوشی ہے ؟

میں :- تم تو معتزلہ ہو -

بیگم :- معتزلہ و معتزلہ تو میں جانتی نہیں مگر بات ٹھیک کہتی ہوں۔ اسلام رسوم کا نام تھوڑا ہی ہے۔ عرف ایک قلبی کیفیت ہے، غیر مسلموں کو دنیا کے دکھ درد بے چین بناتے ہیں اور ان کے پاس کوئی علیدہ ایسی نہیں جس سے وہ اس زنداں سے نکل سکیں۔ زندگی ایک تازیانہ ہے جو بار بار انہیں مجروح کرتا ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کو بجائے تازیانہ کے سواری کا گھوڑا سمجھو۔ خوب اس سے کام لو۔ اگر اتفاق یہ آپڑا ہے کہ تمہارا گھوڑا دوڑ والا نہیں بلکہ تانگے والا ہے تو اس سے ملول نہ ہو، جن کے پاس گھوڑا دوڑ کے اسپ تازی ہیں ان کی طرف نہ نگاہ حسد نہ دیکھو قلبی کیفیت یہ رکھو کہ ہمارے لئے سوال یہ نہیں کہ ہمیں مجروح با جدرنگ یا پست قامت گھوڑا کیوں ملا۔ بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ کچھ اچھے سے اچھا کام ہم اسی سے لے سکیں وہ پوری کوشش سے لیں۔ تم ہر وقت عرف نام کے مسلمان ہو، اصل میں زہد و جاہ کے حوالے ہو، تجھی تو یہ ٹھاٹھ والا اونچی کوٹھی ہر وقت تمہیں کھٹکتی ہے۔ میں تو روز ان کے لئے بھی دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں بہت دے اور وہ خوش رہیں۔

میں :- تو کیا تم دعا کی قائل ہو ؟

بیگم :- کیا جہالت کا سوال ہے!

میں :- کیوں ؟

بیگم :- دعا میں اس لئے تھوڑا مانگتی ہوں کہ اللہ کبھی میرے کہنے سے مجبور ہو جائے گا۔ صرف اس لئے مانگتی ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ مخلوق کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کا بھلا چاہیں اور یہی خدا کی خوشی ہے۔ بلا سے دعا کا اثر ہو کہ نہ ہو۔ میرا اپنا دل تو رنگ آ تو جاتا ہے۔

میں :- واللہ باللہ اگر کوئی مولوی تمہاری منطق سن لے تو ابھی ڈبل کفر کا فتویٰ تم پر عائد ہو جائے۔

خیر مگر میں تو ان مولوی صاحب کے لئے بھی دعا ہی کر دوں گی مگر ساتھ ہی یہ بھی دعا کروں گی کہ یا اللہ اب تو ترکی کی طرح ہندستان میں بھی کوئی ایسی تدبیر ہو کہ مولویوں کے وعظ اسی طرح نیر اعظم بوں بھی طرح مسکرات کی فروخت۔

بچارے مولوی اوہ و بیات داڑھی سے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اور تو ہم ہے کہ صلواتیں سناتی ہے۔ ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہارے قول و فعل میں کس قدر فرق ہے تم نبی تو پردہ کی مخالف پر مگر خود کس قدر سخت پردہ کرتی ہو اسلام کو تھی کیفیت بتاتی ہو مگر بچوں کو نماز کی تاکید۔

اس میں قول و فعل کے فرق کی کیا بات ہے۔ کیا فیشن کے لئے آدمی کچھ نہیں کرتا فی الحال مروجہ فیشن یہی ہے جو میرا ہے، کم از کم میری جماعت کا۔ پھر تم نے مجھے بحث میں کھسیٹا۔ اسلام میں کم از کم میرے اسلام میں بحث منع ہے۔ کیونکہ بحث ایک فضول ہے اور ہر مومن کو تھوسے پرہیز ہے۔ اب کھانے کے لئے آؤ۔ تمہارے لئے بہت اچھی سی چیزیں تلوں گی۔

بیگم تو چلی میں مگر میں نے ان کی گفتگو بھی لکھ لی۔ سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک ان کی منطق بھی درست تھی تو کیا میرے گھر کی صحیح مرد م شماری یہ ہے کہ دو بہترین مسلمان خاتون اور ایک جہالت کا پتلا مرد؟

اور کیا اکثر مسلمان گھروں کے اندر اداسی کے لگ بھگ ہیں؟ کوئی تعجب نہیں جو یہ درست نکلے۔

کاہلی

علی عباس حسینی

کہتے ہیں کہ دو کاہل ایک گولر کے درخت کے نیچے پڑے تھے۔ ادھر سے ایک سوار گذرا۔ ایک کاہل نے اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر کہا "بھیا سوار، مہربانی کر کے ذرا گھوڑے سے اتر پڑو اور یہ جو گولر میرے سینے پر پڑا ہے اسے اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دو"۔ دوسرے نے فریاد کی "ارے میاں سوار، اس کی باتوں میں نہ آنا یہ بڑا کاہل ہے۔ اس سے اتنا نہ ہو سکا کہ دست سوال کو منہ تک لانا چاہا اور اسے دشکار دیتا۔ پہلے نے کہا "اختصار سے منہ کو کیا ہوا تھا، وہ آخر کیوں نہ کھلا؟" دوسرا بولا "واہ! تمہارے ہوتے میں اپنا منہ کیوں ہو کھاتا!" پہلا جھٹ بول اٹھا "تو اللہ کا پارہ نیک بندہ سوار تو موجود ہی ہے، میں تو گولر کیوں اٹھاؤں؟" سوار نے کہا "تم دونوں پر خدا کی مار!" اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہ ہنستا آگے بڑھ گیا۔

آپ بھی شاید یہ کہانی سن کر ہنس دیں گے مگر ذرا ہنسی روک کر ایک کام کاج کی بھی روئداد آج سن لیجئے۔ میرے ایک دوست ایک سیٹھ سے ملنے لکھنؤ سے بمبئی گئے۔ کسی قومی معاملے میں مشورہ بھی کرنا تھا اور ان کی جیب خلی کرنے کا دل میں منصوبہ بھی تھا۔ آمد کی اطلاع پہلے سے تھی۔ وکٹوریہ ٹرمینس پر موٹر موجود تھا۔ مگر جو پہنچے تو نو بج رہے تھے۔ میز بان ناشتے کی میز پر ملے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے "آپ آگئے، آرام کیجئے۔ غسل جمعانا ہے، شام کو ملئے گا" اور چار کپ پیالی جلدی جلدی مترک ایک دو تین۔ انھوں نے نہایا دھویا کپڑے بدلے، ناشتہ کیا، اخبار پڑھے، کھایا، چاپی، لیٹے بیٹھے سوئے۔ شام کے چھ بجے سے انتظار شروع ہوا۔ سات بجے، آٹھ بجے، نو بجے۔ نوکر نے کھانا میز پر لگا دیا۔ وہ بھی بیٹھے ہی زہر مار کیا۔ اور دس بجے سو رہے۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی تیار ہو کر کھانے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے میزبان صاحب بھی تشریف لائے۔ صاحب سلامت کرتے ہی جلدی جلدی اخباروں پر نظر ڈالی۔ کوئی خبر ایسی پڑھی کہ چار کا گھونٹ ایک نالی کی جگہ دوسری نالی میں اتر گیا۔ کھانستے کھانستے آنکھیں نکل پڑی ہیں مگر بولے تو اتنا بولے کہ "گاڑی ایکسی ڈینٹ ہو گئی ہے، جلدی جلدی ہو جائے" مہمان نے پیچھا چھوٹنے کی خوشی میں ٹھنڈی سانس بھری، "اچھا" کہا تو بولے "معافی چاہتا ہوں!" اور پھر وہی پہلے دن والا پروگرام دہرایا گیا۔ مگر آج انھوں نے بھی دل میں ٹھان لی کہ چاہے ساری رات گذر جائے مگر سیٹھ سے واپسی پر باتیں کر کے رہوں گا۔ دس بجے وہ چلتے۔ ہاتھ پاؤں اور کپڑوں میں جگہ جگہ بوٹ لگے دیتے۔ چال ڈھال میں وہ تھکن جیسے چالیس کی جگہ اسی برس کے بوڑھے ہوں۔ مہمان کی ہمت نہ پڑی کہ اس تھکے ہارے میزبان سے تقاضا کریں۔ سوچے، مگر یہ طے کر کے کہ کل اس کام کی کل کا بیچا کر دوں گا۔ دن بھر میں کہیں نہ کہیں دو باتیں کرنے کا موقع نکل ہی آئے گا۔

چوتھے یا تیسرے دن جب سیٹھ حسب معمول جلدی جلدی ناشتہ کر کے جیبیں ٹٹولتے اپنی وکٹوریہ میں بیٹھنے لگے تو یہ بھی ساتھ والی سیٹ پر اچک کر بیٹھ گئے۔ سیٹھ نے زبان سے کہا "ساتھ چلئے گا، اچھا!" اور مختلف جیبوں میں سے نوٹ بکیں نکال کر ہر ایک میں کچھ لکھنے، کچھ

جوڑنے گھٹانے لگے۔ گاڑی تھوڑی دیر میں ایک بلند عمارت کے سامنے رکی۔ سیٹھ نے مہمان سے کہا "آؤ" اور وہ جلدی جلدی میز سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ عمارت تھی پانچ منزل کی اور سیٹھ کا دفتر تھا آخری منزل پر۔ کوئی لفٹ یا الیویٹر نہیں کہ اس کے پنجرے میں بیٹھے کو بند کر کے بٹن دبا کر دفتر تک اڑا دیا کرتے ہیں۔ یہاں تو اس تطب مینار کی سیڑھیاں ایک ایک کر کے خود ہی گننا پڑتی۔ میرے اوسان تھے اوپر کے رہیں۔ دوسری ہی منزل تک پہنچتے پہنچتے چوبی گھلنے لگی اور پانچویں منزل تک پہنچتے پہنچتے تو ان کا وس پاؤنڈ وزن پانی بن کر بہہ گیا۔ بلائے سیٹھ کے دفتر میں پہنچے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں دو طرف دو بڑے بڑے رجسٹروں پر جھکے کچھ لکھ پڑھ رہے تھے۔ سیٹھ ان کے بیچ میں سے گزر کر ایک پہلے سے بھی مختصر کمرے میں پہنچے۔ وہاں ایک بڑی سی میز کے گرد چار کرسیاں تھیں اور دیوار والے رُخ پر صدر میں سیٹھ کی کرسی۔ میز پر ایک درجن کے قریب ٹیلیفون رکھے تھے ان میں سے دو کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میرے دوست تو ایک کرسی پر گر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے مگر سیٹھ نے جلدی سے دونوں ریسیور اٹھائے۔ اب کبھی ایک سے باتیں کرتے ہیں، کبھی دوسرے سے، پھر انھوں نے دونوں ریسیور رکھ کر کئی ٹیلیفون پر کئی نمبر جلدی جلدی حلقہ گھما کر ملائے۔ اب ایک سے دو فقرے کہتے ہیں، ریسیور میز پر رکھ دیتے ہیں۔ دوسرے سے دو لفظ کہتے ہیں۔ ریسیور میز پر رکھ دیتے ہیں، تیسرے سے کچھ باتیں کرتے ہیں، ریسیور میز پر رکھ دیتے ہیں، پنسل اٹھا لیتے ہیں، کبھی دوسرا، کبھی تیسرا، اور اس درمیان میں سامنے رکھے ہوئے چھوٹے پیڈ سے چٹیں پھاڑتے جاتے ہیں، ان پر کچھ لکھتے جاتے ہیں اور الگ رکھتے جاتے ہیں۔ اسی درمیان میں کئی دفعہ کلرک آئے۔ کاغذوں پر دستخط کرا لے گئے، حساب دکھا گئے۔ احکام لے گئے۔ دو گھنٹے یہی کام جاری رہا۔ ٹیلیفون کی کرکر سنتے سنتے میرے دوست کے کان پک گئے، دم اُلجھنے لگا وہ اکتا کر بھاگنے ہی والے تھے کہ دفعتہً سیٹھ اٹھے "ساتھ چلے گا؟" پوچھتے باہر روانہ ہو گئے۔ یہ انھیں سے باتیں کرتے نیچے آئے تھے نہ چلتے تو کیا کرتے۔ پھر سیڑھی سے اترنے میں چار و ناچار پانچ سیر وزن گھٹایا، نیچے آئے، وکٹوریہ میں بیٹھے، چلے قبل اس کے کہ یہ کچھ کہیں سیٹھ نے جیبوں میں ٹھنسی ہوئی سلپیں جلدی جلدی نکالیں اور انھیں ترتیب دینا شروع کیا۔ چند ہی منٹ میں گاڑی کرائی اور جلدی سے اتر پڑے۔ یہ بھی اترنے لگے تو بولے "نہیں، تم بیٹھے؟" اور لپکتے ہوئے ایک کارخانے کے اندر۔ آدھ گھنٹہ بعد پلٹے گاڑی چلی، کاغذات پر کچھ لکھا، کچھ جوڑا، کچھ گھٹایا۔ گاڑی روکی اتر پڑے، پھر ایک عمارت کے اندر۔ جلد ہی پلٹے۔ گاڑی پھر چلی، پھر کاغذ نکال لئے گئے۔ پھر رکی، پھر اترے، غرض یہ اترنا چڑھنا گھنٹوں جاری رہا۔ دفعتہً جیب سے گھڑی نکالی، بولے "پونے ۲" اور ایک رستوران کے سامنے گاڑی روک کر اتر کر اس میں گھس گئے۔ مرغ، کباب، پلاؤ، قورمہ، انڈے، چپاتیاں، پوریاں، پراٹھے، کھیر، شاہی ٹکڑے سب کچھ منگوا لیا۔ مہمان نے "نہ مری خورد" سمجھ کر سب ٹھونسا، سیٹھ کے ایک توس کے ساتھ ایک انڈا کھایا، ایک پیالی چائے لیکن اس درمیان میں بھی نوٹ بکوں، ڈائریوں اور چٹوں پر جوڑنا گھٹانا جاری رہا۔ ان سے کوئی بات نہ کی۔ ابھی شاہی ٹکڑوں کا پہلا لقمہ منہ تک پہنچا ہی تھا کہ سیٹھ ایک بار گی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ "اوہ، بڑا دیر لگایا! بل بھی نہ مانگا، میز پر دس دس کے دو نوٹ پھینک دیئے اور چل دیئے۔ ان کو بھی جھوٹا سا منہ بھاگنا پڑا۔ اب پھر وہی چرخا چلا۔ گاڑی چلتی رکتی، وہ اترتے، کسی عمارت میں گھستے، وہاں سے لپکے ہوئے آتے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی کاغذات دیکھنے لگتے۔ جانے بجے بجنے مہمان کی طبیعت اوبھ گئی۔ انھوں نے سیٹھ کی غیبت میں گاڑی بان سے پوچھ لیا "یہ کیا کام کرتے ہیں؟" معلوم ہوا کہ بروکر (دلال) ہیں۔ ہر طرح کے گودام میں جاتے ہیں۔ غلہ، روئی، لکڑی، کوئلہ وہاں اگر کہیں کسی ملی تو اس پر بیٹھے نہیں تو زمین ہی پر بیٹھ کر سودا پٹایا، چلے آئے۔ اسی میں کپڑے بھی میلے ہو گئے

ہی صورت نکلتی۔ اسی طرح ہر روز ہی کا کھیل ہوتا جاتی ہے۔ شام کے قریب دفتر کی طرف پیٹھ پھیرے دوست زینوں پر چڑھنے اترنے کے خیال ہی سے کانپ جاتے۔ اس لئے جب بیٹھے دفتر کے سامنے اترنے لگے تو عنایت نے معافی مانگ کر کہا "میں گھر جاؤں گا" بیٹھے نے مسکرا کر پوچھا "تھک گئے؟" انھوں نے سر پکڑ کر ہامی بھری۔ وہ بولے "ابھی ہم دس بجے تک کام کریں گے! انھوں نے دانت کچکچا کر کہا "سچ؟" اور جب دکھتے دل نے گھر پر چھوڑا تو اسی طرح اپنے پر فقرہ کسا "خیر سے بدھو گھر کو آئے!"

آپ نے دونوں کہانیاں سن لیں۔ اب آپ ہی انصاف سے بتلائیے کہ ان دونوں زندگیوں میں قابل ترجیح و پسند کون سی ہے؟ کابلی والی زندگی یا یہ کام کاجی کل؟ اگر آپ ذرا سا بھی غور کریں گے تو میری طرح آپ بھی یہی کہیں گے کہ کابلی دنیا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کابلی کو برا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صفت کسی میں اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک وہ حد درجہ کا قانع، درجہ اعلیٰ کا قناعت کے بارے میں چلتے پھرتے پیکر گوشے ہیں سب ہی تر زبان ہیں۔ ساگ ستو جو خدا نے اپنے کرم سے دیا کھا لیا، موٹا جھوٹا جو کچھ پہننے کو ملا پہن لیا۔ جھونپڑا ہو اگر کچی جو ملی، پڑ گد کا سایہ ہو کہ لاکھ قلعہ، جہاں پڑ رہنے کی جگہ مل پڑے۔ نہ کسی کو بینک بلنس کی تاب چھینی، نہ کسی کو بنگلہ و موٹر اس کے ہتھے کی بڑی اپکی اور نہ کسی کو ملازم اس کی تلاش پر کھڑے ہو کر اپنے کو اچکا کیا۔ کسی نے ایک گال پر طمانچہ مارا اس کی عشق تازہ کے لئے دوسرا گال بھی بڑھا دیا۔ کسی نے ہماری آدھی روٹی بھی چھین لی، ہم نے کھیسے نکال کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ کسی نے دھکیل کر ہمیں گرا دیا، ہم نے شکر بجا لائے کہ سر اٹھا کر چلنے کے گناہ سے بچے۔ یہ فراغتی، یہ عالی ظرفی، یہ بلند نظری، یہ استغنا، یہ انکسار، یہ ایثار، بغیر کابلی کے کہاں نصیب؟

خدا تو دیکھئے ہم اس چوٹی کی عمر میں کتنا بے کار وقت ضائع کرتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی چیخنے لگتے ہیں ہائے کہاں!" یعنی وہی خدا کے لئے بے صبری، حلق و زبان کی حرکت پیہم، یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ دودھ مل گیا، چلو پیٹ بھر گیا، دنیا کی نگاہوں سے بخت ہو کر سو رہے، یا انگوٹھا چوسنے لگے۔ پھر بھی ہر دو تین گھنٹے پر پھیپھڑوں کو مضبوط کرنے کی ورزش جاری ہوتی رہتی ہے۔ ذرا بڑے ہوئے بس اب چرخی بن گئے، دوڑتے ہیں، گرتے ہیں، چوٹیں کھاتے ہیں، گھٹنوں سے، منہ سے دھل دھل خون بہہ رہا ہے، مگر کہیں نہیں بیٹھا جاتا۔ یہ توڑا، وہ پھوڑا، اس کو نوچا اس کو کھسوٹا، جو چیز پائی منہ میں رکھ لی، مزہ چلتا ہے، پیٹ چلتا ہے، مگر ہم ہیں کہ کسی طرح نہیں رکتے۔ اے لیجئے، اسی رواداری میں اسکول کالجوں میں پہنچے۔ اب کیا ہے، دانت دن حرکت، انجن بڑی حرکت۔ آنکھ چلتی ہے، زبان چلتی ہے، دماغ چلتا ہے، ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، غرض اچھلنے میں دوسروں کو اچھالتے ہیں۔ بس ہر وقت وہ قطع کہ لوگ کہیں "ناچ کھلاڑی دھنا دھن: ناچ کھلاڑی دھنا دھن!" اس منزل کو جیسے ہی پار کیا، یاروں نے معاش کا جوا کندھے پر رکھ دیا۔ دن رات تیلی کے بیل کی طرح کولھو پیستے رہو!

اے میاں یہ سب کس لئے؟ کھانے کی کاڈ کاڈ! کھاؤ گے تو اتنا ہی جتنا پیٹ میں سمائے گا، اور پہنو گے تو یہی جسم سے گرمی سردی سے بچ سکو۔ اتنے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا کیا معنی؟ آرام سے ایک جگہ لیٹو۔ گود کبھی دیکھی تمہارے سینے پر چمکے گا ہی اور کوئی نہ کوئی مرد خدا پیدل یا سوار ایسا بھی آجائے گا کہ اسے اٹھا کر تمہارے منہ میں بھی رکھ دے۔ اور اگر وہ نہ بھی آیا تو وہ جانے جو مسبب الاسباب ہے، جس نے رزق بہم پہنچانے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ اور نہ خیر سے گاڈ تو ہیں ہی گاڈا، کہ مر جائیں گے؟ تو کون سی انوکھی مصیبت آجائے گی، کون سی نئی بات ہو جائے گی۔ یہی تو ہوتا

ہی ہے۔ اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے! کھلونے کو اس سے کیا مطلب کہ اس سے کیونکر کھیلا گیا! نہ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے بنایا کیوں اور نہ اسے یہ معلوم کہ اسے توڑا کیوں؟ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

اچھا صاحب، کاہلی اب بھی بری ہے، تو ایک بات اور سن لیجئے۔ مگر خفا نہ ہوئیے گا۔ سرسید اور اقبال کی پیچ میں نہ آئیے گا۔ ان کے نزدیک تو زندگی ہی رواں دواں نہیں، مقصد زندگی بھی روانی دوانی ہے! لیکن آپ انصاف سے بتایئے کہ آپ نے کسی بڑے فلسفی مفکر یا مصنف کو رواں دواں دیکھا یا سنا ہے؟ اجی جناب! میاں سقراط اسی حرکت و عمل کے قائل تھے۔ جب دیکھئے ایتھنز کے چوک میں بیکار بیٹھے ہیں اور ہر ایک سے دست و گریبان ہیں۔ نتیجہ کیا ہوا؟ ہلہ! ساری عمر میں ایک کتاب بھی نہ لکھ سکے اور آخر جام زہر پی کر جان دینی پڑی۔ ان کے برعکس افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو لیجئے۔ کبھی دونوں نے مل کر پانی نہ پیا۔ ہر وقت بیٹھے سوچا کئے۔ ایک نے ایسی "جمہوریت" لکھی کہ نہ کالاں نے سنی، نہ آنکھوں نے دیکھی۔ دوسرے نے مختلف علوم کا وہ باغ لگایا کہ تمام عمر اس کی سیر کیجئے اور طبیعت سیر نہ ہو۔

خود اپنے رشیوں، منیوں، سنتوں، سنیاسیوں کو لے لیجئے۔ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ، دھیان گیان میں بیٹھے رہے، مگر ہمارے لئے وہ ایسی تبرکات چھوڑ گئے کہ انسانی عقلیں ہمیشہ ان پر عش عش کریں گی۔ ہماری اپنشد، ہماری پران، ہماری برہمن، ہماری شاستریں، الغرض "بے کاروں" کی دماغی اپج کا نتیجہ ہیں۔ ویدانت کا فلسفہ یا تصوف کا طریقہ اسی طرح جم کر بیٹھنے اور ڈوبے رہنے اور دنیا اور اس کی "مایا" سے الگ ہو کر سوچنے کا نتیجہ ہیں۔

ذرا آج کل کے ہنگاموں کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ کالے کو گورا کھائے جا رہا ہے، پیلے کو سرخ اپنے رنگ میں ڈوب دے رہا ہے۔ ایشیا کے لئے یورپ پر تسمہ پا بنا ہے۔ یورپ کی گردن میں امریکہ کا غلاف ہے۔ ہر وقت گرم اور ٹھنڈی لڑائیاں جاری ہیں۔ بھائی بھائی میں اختلاف ہے۔ باپ بیٹے میں مقابلہ ہے۔ آمام حرام، نیند حرام! بس ایک دوڑ ہے، مسابقہ ہے مجاہدہ ہے، مقاتلہ ہے کہ ہر پر پلا جا رہا ہے۔ ایٹم بم بن رہے ہیں، ہائیڈروجن بم تیار ہو رہے ہیں۔ زہریلے گیس انبار کئے جا رہے ہیں۔ بیماریاں پھیلانے والے، چیلنا پڑ ولیم چھڑکنے والے گولے بھرے جا رہے ہیں۔ نئی نئی بندوقیں، نئی نئی رائفلیں، نئی نئی مشین گنیں، نئی نئی آب دوز کشتیاں، بنائی اور ڈھالی جا رہی ہیں۔ بمبار، جٹ ہوائی جہازوں کی پرواز و تاخت کی آزمائش و پیمائش کی جا رہی ہے۔ اور یہ سب اس لئے کہ بقول نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن "انسان کی نہیں، موت کی فتح ہو"؟

آخر اس آفت، اس ہنگامہ، اس اپنے ہاتھوں اٹھائی ہوئی قیامت کا اصلی سبب کیا ہے؟ صرف یہی کہ انسان نے غلط طور پر کام کو سراہا اور کاہلی کو ذلیل و خوار سمجھا۔ کاش ساری دنیا، اس صفت عالیہ کی اہمیت کو سمجھتی اور اسے، پنا لیتی؛ پھر کیا ہوتا؟ ہر ایک اپنی اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا ہے۔ نہ سرمایہ داری ہے، نہ مزدوری، نہ جھگڑا نہ لڑائی، نہ صنعت کی بک بک، نہ خواہ مخواہ کی جھک جھک، نہ کچہریاں، نہ دیوانیاں، نہ تقریریں، نہ اسپیچیں، نہ الکشن نہ ووٹنگ، نہ اسمبلی نہ کونسل، نہ ممبر نہ وزیر، نہ خوشامد نہ چاپلوسی، نہ انصاف نہ ناانصافی، نہ موکل نہ وکیل، نہ استاد نہ طالب علم، نہ کتابیں نہ پبلشر، نہ مطبع نہ مزدور، نہ انقلاب اور نہ انقلاب

زہد و باد کے نعرے!

ہم ہوتے اور جیتے ہی جنت کی ہوائیں ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

کسے را با کسے کارے نہ باشد!

مگر آپ اس پر بھی کابلی کو برا کہنے پر مصر ہیں تو آپ کو اختیار ہے۔ ہماری تو مجال نہیں کہ ہم اس کے خلاف زبان کھول سکیں ہمیں تو ایک دن اس کا سامنا کرنا ہے جس نے ازل و ابد کے لامتناہی طول میں صرف ایک بار "کُن" سوچا تھا اور جب سے اپنی خودی میں ڈوبا پڑا ہے۔ ہمیں تو اب جنتی بننے کی لگن ہے۔ ہمارے لئے تو وہ دن عید کے جب ہم یہ کہنے لگے کہ ؎

میر ہمیں پیر تم، کابلی اللہ رے!

نام خدا ہو جواں، کچھ تو کیا چاہئے!

ہم نہیں سپٹے

تمکین کاظمی

کہتے ہیں "شرع کو شرم نہیں" جب ہی تو اشرف علی صاحب تبلہ نے بہشتی زیور میں نہایت صفائی کے ساتھ ایسی باتیں لکھ دیں کہ جاہل پڑھ کر لوگ بگڑ گئے جنھوں نے اس کا نام رکھ دیا "اشرفی کوک شاستر" اگر ذرا غور کیجئے تو آپ قانون کو بھی بے شرم پائیں گے۔ کبھی کبھی فحش اور بے شرمی کی چیزیں آپ کو "تعزیرات" اور "ضابطہ فوجداری" میں نظر آتی ہیں۔ مسلمانو پڑھو اور عبرت کرو۔

مگر ایک نکتہ سن لیجئے شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ یہ کہ قانون پیشہ حضرات بھی بے شرم قانون پڑھ کر ذرا سے بے شرم ہو جاتے ہیں آپ پوچھیں گے کیسے۔ سنئے جو "روح طرافت" کی "ارواح لطیفہ" "اودھ کو تار" کے برش "انگوٹھی کی مصیبت کے بانی" "شریر بیوی" کے مشوہر "تفویض" کے مفوضہ وکیل "حضرت کرمی مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ال ال بی ہیں۔ یا تو طالب علمی کے زمانہ میں ایسے "سعادت آثار" "جوان صالح" تھے! بس قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے اور "پردہ" کے متعلق "آیات قرآنیہ" ڈھونڈا کرتے تھے مگر جب سے انھوں نے ال ال بی میں قدم رکھا ذرا بے شرم ہو گئے ہیں اور ایسی ہی بے شرمی کے مضامین لکھنے لگے ہیں۔ مگر غضب خدا کا اب تو اس بے شرمی کی انتہا کر دی کہ سب لوگوں کو دعوت دے دی کہ میاں آؤ اپنے پٹنے کی داستان سناؤ۔ بھلا کون سا شریف آدمی اپنی ایسی داستان سنانے کا جو شرم ناک ہو اور اس سے اس کی کسرِ شان ہو جائے، مگر واقعہ یہ ہے کہ دوستی بری بلا ہے، بھیا مولوی نے مشتے نمونہ کہ کر دو ایک واقعات اپنے پٹنے کے لکھ دیئے، اور مجھ پر آفت نازل کر دی "سرپنچ" کے سامنے کے لئے لکھو۔ اس نادری حکم کی تعمیل میں اپنی بے عزتی ہی کی داستان شروع کرتا ہوں۔

تو جناب خدا آپ کو نیکی دے، ہم ذرا بچپن ہی سے نہایت غریب متین اور نہایت سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ راستہ چلتوں کو چھیڑنے والوں کو، سبزی ترکاری والیوں کو ستا ستا کر ذرا عادت سی ہو گئی تھی اس لئے ہم نے ہر ایک کو ستانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک دفعہ والدہ ماجدہ کو بھی دق کیا۔ اس المناک واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ والد مرحوم شاہجہانپور کے تحصیلدار تھے وہاں "شہرہ آفاق مذہبی جس کے پجاری مہاراج" کا جی بابا" ہیں جنہیں گھوڑوں کا بہت شوق ہے۔ ہم نے دورے پر جاتے ہوئے ان سے ایک گھوڑی لی نہایت کم سن اور پورے قد کی بڑی مضبوط اور تیز رفتی مانگ لی اور اپنے دورے پر اسی گھوڑی کو ساتھ رکھا۔ والد مرحوم کیونکہ گھوڑے کی سواری اچھی طرح نہیں کر سکتے تھے۔ معلوم نہیں ایک دفعہ آپ کیا سوچی کیمپ رخاست کرکے چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ تم ٹٹو پر بیٹھ جاؤ میں تمہاری گھوڑی پر سوار ہوں گا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی۔ ہم نے کہا بھی کہ قبلہ گھوڑی بہت تیز ہے۔ منہ زور ہے۔ شریر ہے "بک" کرتی ہے "اچھلتی

ہے۔ لڑکے نے سنا ہوگا۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ گھوڑی جلد کو پٹخنی کی ضرور۔ اس لئے ہم نے محض اس خیال سے کہ گھوڑی قابو زمین پر اطمینان اور دام کے ساتھ پہنچ جائیں "ہتنگ" کے بگل بجوسوئے "کھل دیئے۔ سائیس نے ایک لات کی رکاب تھام لی اور حضرت نے گھوڑی پر سوار ہو کر باگ ٹھیک کی اور گھوڑی آہستہ سے چل۔ چند قدم چلنے کے بعد نہایت اطمینان سے الف ہوگئی۔ اور حضرتی در کاب گھوڑی کی پیٹھ سے مرین سے ہوتے ہوئے زمین پر آگئے۔ سائیس نے دوڑ کر سنبھالا ہم بھی پہنچ کر پوچھنے لگے کہ ہوا کیا۔ مگر وہ بھی آفرین ہے والدہ والد تھے۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک شاعرانہ سی فرما کر یک لفظ میں یہ سب حالات سنا دیں۔ ہم نے کہا کہ سائیس کی غلطی تھی اس نے تنگ نہیں لگایا تھا۔ مگر وہ کہہ چکے تھے۔

بات گزر گئی مگر اس دن سے پھر کبھی حضرت نے دقتہ ہماری گھوڑی پر سواری کرنی چاہی اور نہ کسی بڑی گھوڑی پر سوار ہوئے۔ بازی باری ایش یا باہم بازی اس کو کہتے ہیں۔

دوسرے شرم ناک واقعہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک بڑے میاں جو نظم بیت دفتر بے قاعدہ کے ملازم تھے اور جاڑے محلہ کے رہنے والے تھے۔ جاڑے سر ہو گئے۔ تمہارے نانا جو خضاب استعمال کرتے تھے اس کا نسخہ لاؤ۔ ہم نے نانی اماں سے نسخہ پوچھا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اماں جان بھی اس نسخہ سے واقف نہ تھیں۔ بڑے میاں سے کہا کہ "حضت" وہ نسخہ کسی کو بھی معلوم نہیں، مگر وہ جاڑا مانگتے ہی رہے۔ آخر میں تھک کر ہم نے ایک ترکیب حکیم بابا میاں سے بال اٹانے کا پوڈر مانگ لائے۔ اس میں چھپیل کا تیل اور آرا ملی روشنائی ملا کر خضاب بنا دیا۔ اور شیشی بڑے میاں کے حوالے کر دی کہ حضت یہی خضاب ہے جو نانا لگایا کرتے تھے۔ آپ پہلے ایک دفعہ اس خضاب کو استعمال فرمائیے۔ اگر پسند ہو تو میں اس کے اجزا لکھ دوں گا۔ بڑے میاں نے ترکیب استعمال پوچھی اور دعائیں دیتے رخصت ہو گئے۔

معلوم نہیں رات بھر انہیں نیند آئی یا نہیں مگر صبح صبح خوشی خوشی اٹھ کر پاؤ بھر بہی سفید بیگلے کی ڈاڑھی کو خضاب لگایا اور جوڑوں لو خوب ملتے رہے۔ جب سوکھ ہونے لگی تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور ضروریات سے فارغ ہو کر مسجد پہنچے۔ مسجد کے صحن میں حوض تھا۔ وہیں بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ بڑے میاں نے حوض ہی پر بیٹھ کر ڈاڑھی کو خوب گھس گھس کر دھونا شروع کیا۔ دیر تک ملنے کے بعد مرچ دھویا تو گچھے کے گچھے ہاتھ میں آ گئے۔ پہلے گال صاف ہو گئے پھر ٹھوڑی صاف ہو گئی۔ ادھر ادھر چند بال لگے رہے اور بس۔ نماز وضو کر کے تیار ہو چکے تھے مگر حضرت کی ڈاڑھی مذہ خضاب ہو گئی۔ اور آپ نے کندھے سے رومال اتار کر اوڑھ لیا اور ایسے خانہ نشین ہوئے کہ چار مہینے تک قدم باہر نہیں رکھا۔ چوتھے مہینے جب ذرا بال آگئے تو کٹا کٹا کے کہیں ٹھونٹھنا شروع کیا۔ بھلا ہم ایسے اچھے آدمی کہاں جو انہیں مل جاتے۔ مدت تک ڈھونڈتے پھرتے رہے۔ ایک دن اتفاق سے ہم دار الشفا کی سڑک پر سائیکل سوار تھے اس لئے بیٹھے کے سڑک پر سے ایک پتھر اٹھا کر پھینک مارا مگر ہمارا اقبال دیکھئے کہ پتھر ہمارے موٹھے کو چھتا ہوا نکل گیا اور سیدھے جا کر پولیس مانسٹیبل کی پیشانی پر پڑا جو تھانے کے سامنے پہرہ دے رہا تھا۔ غریب کانسٹیبل پتے تو پتھر کی زد میں آ کر چکرا گیا۔ پھر سنبھل کر سر سے بہتے ہوئے لہو کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا آگے بڑھا اور بڑے میاں کو دھر لیا۔ دو دن تک بڑے میاں پولیس کی حراست میں رہے۔ تیسرے روز ضمانت ملی۔ اس دن کے بعد سے بڑے میاں نے ہمیں راستے میں دیکھا بھی تو منہ پھیر لیا۔

لوگوں کی ڈاڑھیاں اس طرح اڑا دینا اچھا نہیں ہوتا ہے۔ مگر آپ ہی کہئے کہ ایک بڈھا خواہ مخواہ سرخ ہو جائے کہ خضاب کا نسخہ اور

دراں حالیکہ نہ تو آپ کو نسخہ معلوم ہوا اور نہ کوشش کے باوجود معلوم ہو سکے۔ اور پھر آپ انکار کریں تو وہ جھوٹ سمجھے اور اصرار کرتا جائے تو آپ کس طرح پیچھا چھڑائیں گے۔ اسی لئے ہم نے بڑے میاں کی ڈاڑھی اڑا دی تاکہ نہ رہے ڈاڑھی نہ لگے خضاب۔ اسی لئے قوم تیسر نے کہا ہے ؎

کاٹ کر جڑ پھینک دو غل تشنا کی امیر

تیسرا تکلیف دہ واقعہ یہ ہے۔ فتنش بندیہ سلسلہ کے اندھے فقیروں کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ ایک اندھا بڈھا فقیر ہاتھ میں لمبی لکڑی اور ہاتھ میں تیل شمع لئے آدھی رات کو ہمارے دروازے پر سوال کیا کرتا تھا۔ کتے جس کو عموماً بھونک کر ڈرایا کرتے تھے۔ یہ تین ہمنے کتے کی آواز نکالنے کی بہت مشق کی اور جب فقیر آیا تو گھر کے سامنے کھڑے ہو کر بھونکنا شروع کیا۔ مگر جناب یہ اندھے صفت کے بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ کتا دو پاؤں کا ہے۔ چنانچہ نہایت تیزی کے ساتھ ایسی زور سے لکڑی رسید کی کہ ہم بلبلا اُٹھے اور کئی روز تک ہماری پسلی میں درد رہا۔ اندھے کی لاٹھی سے خدا بچائے۔

ایک مولوی صاحب جن کا نام لکھوں تو فوجداری ہو جائے گی ہمارے والد کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ اور حیدرآباد کے مشہور عالم اور فاضل تھے مگر ہم سے بہت خفا رہتے تھے۔ ہمیشہ ہمیں بُرا کہتے تھے۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں کبھی نہ آئی کیونکہ وہ ذہانت اور گوناں ذیل تھے۔ اس لئے ہم ان کو مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کی شکایت والد مرحوم اور استاد مرحوم سے کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہماری کسی شرارت پر ایک بڑی مجلس میں انہوں نے گالیاں دے دیں، ہم خاموش ہو رہے مگر موقعہ کی تاک میں تھے۔ گلزار حوض کے حوض کی نکڑ پر ایک کتابوں کی دوکان تھی۔ جس کا نام یا تو حمید مارکیٹ ڈپو تھا یا دکن بک ڈپو۔ بہر حال بک ڈپو نام ضرور تھا، اور ساری کی سب سے پہلی دوکان حیدرآباد میں قائم ہوئی تھی جس میں "شوکین" بھی تھے۔ اسی بک ڈپو کے چبوترے پر کرسی ڈال کر ہمارے مولوی جی پڑھایا کرتے تھے۔ موسم کے دن تھے تیسری چوتھی تاریخ تھی، چاند خوب تھا۔ مولوی جی کو بک ڈپو میں بٹھا دیکھ کر چندے آگ لگ گئی۔ مسالحہ بھی مکسال سے موافق تھا اور اسی کے پاس ایک لالٹین کی دوکان تھی جو پوری کھڑکی بنایا کرتا تھا۔ ہم نے وہاں جا کر کھڑکی کے اس حصہ پر ہاتھ صاف کیا جو جل جل کر سیاہ ہو گیا تھا اور جس پر خوب سی کالک لگ گئی تھی۔ جب تمام ہاتھ کالا ہو گیا۔ ہم نے دستی سے ہاتھ ڈھک کر ایک ڈپو کا رخ کیا اور چبوترے پر چڑھ کر مولوی جی کے پیچھے جا کر سر پر سے ہاتھ پھیرا کہ ان کے کالے منہ کو خوب کالا کر دیا اور بھاگ کر مجمع میں مل گئے۔ پہلے تو مولوی جی نے ہمیں پکڑنے کی کوشش کی اور دوکان سے کود کر ہمارے پیچھے بھاگنے لگے۔ مگر جب منہ کی کالک دیکھ کر لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کئے تب کیس بک ڈپو کے برابر کی دوکان پر جا کر اس کے آئینہ میں اپنا روسیاہ دیکھا اور بیچ تاب کھا کر رہ گئے۔ اس کی شکایت مولوی نے والد سے کی۔ مگر جاما مذاق اتنا "ڈیسنٹ" تھا کہ میں نے سنا اس نے داد دی۔ مگر اس کے باوجود روز روسیاہ مولوی نے ہمیں "انفلو گچ" کے پل پر گرفتار کر لیا اور چار پھٹے لگانے اس زور سے رسید کئے کہ اب تک اس کا مزہ یاد ہے۔ گال ہی تو سوجے گئے۔

ضلع عثمان آباد میں ایک عہدہ دار تھے جو آج کل ایک بڑے عہدے پر ہیں۔ ان کے پاس ایک بڑا صاف چوڑات کا رومال تھا اور شیروانی پہن کر اس کے اوپر سے سوٹ کوٹ "صدریہ" پہنا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نے اسکول کے لڑکوں کو دکھا کر پکارا "اسکوٹ" بس لڑکوں نے بھی اس کا نام واسکوٹ رکھ دیا۔ اسے معلوم ہی ہو گیا کہ نام ہم ہی نے رکھا ان لڑکوں کو سکھایا ہے۔ حضور بندگان عالی کی سالگرہ مبارک کا جلسہ تھا اور ہم سینئر طالب علم ہونے کی وجہ سے انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ یہ معجزا اسکوں کے کپڑا دیدیا

تماشہ دیکھنے لگا۔ ہم کسی کام کے لئے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور قریب ہی واسکوٹ بھی تھا۔ وہ ایک لڑکوں نے واسکوٹ واسکوٹ چیخنا شروع کیا۔ بچے کم سن تھے اس مخرجے نے ان کو چھوڑ دیا اور سیدھے ہمارے سر پر آدھمکا۔ وہ چار چانٹے رسید کر دیئے۔ برائی عہدہ پر طالب علمی کا زمانہ تھا۔ دونوں ہم بفضلہ تعالیٰ خاصے کھلنڈرے۔ تیسرے چانٹے پر اسے کو طیش پر لا کر دے بیٹھے اور اتنے گھونسے رسید کئے کہ میاں واسکوٹ بلبلا اُٹھے۔ غنیمت گزری کہ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ بڑھا واسکوٹ نہ جانے جیتا یا مرجاتا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ والدہ وغیرہ خالہ کے گھر مہمان گئی تھیں گھر پر صرف ملازمین تھے۔ اور ہم یار دوستوں نے ایک فلم سید صاحب مالک پکچرز کو دیکھا اور چار دیا۔ بہت بھائی۔ جس روز ڈوستے رہے کہ کہیں خون کے قے اور پاخانے نہ شروع ہو جائیں۔ کیونکہ عام طور سے مشہور ہے کہ سید صاحب کا بکرا ذبح کر کے کھانے والا مر جاتا ہے۔ مگر ہم لوگ ان میں کوئی ایک سید تھے اور مکان بھی ہمارا تھا اور ہم صحیح النسب سید تھے۔ اس لئے کچھ نہ ہوا۔ دو شیخ اور ایک پٹھان کھانے والوں میں شریک تھے۔ مگر نہ تو ان کی نکسیر پھوٹی نہ ہیضہ آئی۔ بکرا اڑا کر جو ہڑ لگا تو ہم لوگوں نے باضابطہ چوریاں شروع کیں۔ ایک دفعہ ایک دوست کے مکان سے وہ اصیل مرغ اڑا لائے جو ہمارے دوست کے والد نے بڑی محنت کر کے پالے تھے۔ ان کو کھایا تو بڑا مزا آیا۔ دوسرے روز کوٹھے کے دروازے کے پاس ایک دوکان والے نے کئی اصیل مرغ پال رکھے تھے۔ ان میں سے دو اڑا لائے۔ اور انہیں بھی چٹنی کر دیا۔ ہماری ماما کو ٹٹولیں رہتی تھی، معلوم نہیں اس نے کہہ دیا، یا دوکاندار خود تاک میں تھا۔ تیسرے دن میں موقعہ واردات پر اس نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ ہم نے مرغ چھوڑ کر اس سے لڑائی شروع کر دیا۔ مار پیٹ، صورت کسی کی بھی نظر نہیں آتی تھی مگر دیر تک خاصی کشتی ہوتی رہی۔ دوکاندار آدمی تھا خاصا تنومند اور جوان، دو تین گھونسے ہمیں ایسے رسید کئے کہ مزا آگیا۔ ہمارے ساتھی بڑے ہوشیار تھے وہ فوراً چلے گئے تھے اور مسجد کے پاس کھڑے رہ کر ہمارا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے بڑی دقت سے پیچھا چھڑایا اور فرار پر قرار کیا۔ قمیض اور واسکوٹ تو پارہ پارہ ہو گئی تھی، مگر سید احمد بھی جھول گیا تھا اور تھنے پر ایسی پٹ آئی تھی کہ کئی روز تک چلنے کے قابل نہیں رہے۔ اس دن سے ہم نے چوری کر کے کھانا چھوڑ دیا۔ اگر اس دوکاندار سے نہ پٹتے تو شہر بھر کے اصیل مرغ ہضم کر جاتے۔ خیر اچھا ہی ہوا ورنہ چوری کی عادت ہو جاتی۔

کوٹلہ عالی جاہ میں ایک "الاؤ" ہے جسے "خونی الاؤ" کہتے۔ یہاں مجرم میں عجیب و غریب کرتب کئے جاتے ہیں۔ کسی شخص کا سر پشت میں رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی کے گلے میں تلوار آر پار نظر آتی ہے کسی کا نصف جسم نظر آتا ہے۔ یہ الاؤ عوام میں خوب مقبول ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم بھی تماشہ دیکھنے گئے۔ الاؤ کے سامنے ایک دوست کا کوٹھا تھا۔ اس پر بیٹھ کر تماشہ دیکھ رہے تھے کہ ایک امیر کے صاحبزادے الاؤ دیکھنے کے لئے ہاتھی پر بیٹھ کر آئے اور ہمارے کوٹھے کے سامنے ہاتھی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے لہوات سے کہا بھی کہ میاں ذرا ہاتھی کو آگے بڑھالو مگر نہ مہربان اور باور کیجئے جن جن ناموں کے ساتھ "بان" آتا ہے وہ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ اس فیل بان نے سنا ہی نہیں۔ ہم نے بھی ایک ترکیب سوچی اور گھر میں جا کر چولھے کے پاس سے ہنڈیا اٹھا لایا اور پھر اوپر سے کھچڑی میں۔ ادھر ادھر بھروا دیا اور ایک طرف کا نذر لگایا، اسے لئے باہر نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہاتھی کی آنکھ میں مرچ جھونک دیں گے وہ خود بھاگ جائے گا۔ مگر جب ہم اس کے گھر کے دروازے سے نکلے تو میاں ہاتھی لید فرما رہے تھے۔ جب وہ فراغت حاصل کر چکے تو ہمیں خیال ہوا کہ اب لون سوٹ کے قریب جا کر مرچ اچھالے۔ لاؤ ہمیں جھونک دو۔ چنانچہ چٹکی کو ایک طرف منہ لگا کر جو جھانکا تو ساری مرچ اڑ کر مصاحب میں جا رہی۔ مگر اوپر جو صاحب زادے بیٹھے ہوئے تھے ان کے خدمت گار نے ہمیں مرچ انگنی"

کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ شاید ان سو شمعوں نے آتش بازی کی تھی جو بوڑھے ہی میں لگی ہوئی تھی۔ اس خدمت گار نے ایک آتش بازی کا بڑا سا انار لے کر اس زور سے پھینکا مارا کہ باوجود ہمارے پیشتر اجازت لینے کے ہماری پیٹھ پر آگرا اور ہم دوڑ کر گھوڑے پر چڑھ گئے۔ ابھی ہم نے گھوڑے کی رسّی بھی نہیں ہلائی تھی کہ ہاتھی صاحب نے بڑھ کر ایک دھکا سے مارا کہ گھوڑا شروع کیا اور عماحت نے آنکس مار مار کر اس کا سر ملک لوہان کر دیا۔ غریب ہاتھی نے چنگھاڑتے ہوئے دوڑنا شروع کیا اور ہمارے سر سے بلا دفع ہو گئی۔ معلوم نہیں اس ہاتھی نے کہاں پنچ کر دم لیا اور ان صاحب زادوں کا کیا حال ہوا کہ دوسرے اور تیسرے روز ہم نے۔ شیر دکن:۔ صحیفہ۔ شمار گزشتہ تیسویں اخبار دیکھے مگر اس واقعہ کی تفصیل یا ان صاحب زادوں کو ضرر پہنچنے کی خبر کسی کو نہ ملی تھی۔

۷۳ء میں ہماری ایک عزیزہ مہمانی صاحب اپنی اور اپنے صاحب زادوں کے گلبرگہ شریف تشریف لائی تھیں۔ جب وہ گلبرگہ سے حیدرآباد کو واپس تشریف لے جانے لگیں تو ہم انہیں پہنچانے اسٹیشن گئے۔ بات کا وقت تھا۔ زنانے ڈبے میں صرف دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں، ہمارے بھائی نے قلی سے سامان رکھوا دیا اور پھر زنانے کو سمجھا کر خود دروازے کے سامنے جا کر پر تو پر پاندان رکھنے لگا۔ ڈبے میں پہلے صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ایک بچاری بڑی بی تھیں جس کی سفید پوشی ہوگی کا اظہار کر رہی تھی اور دوسری کوئی بڑی عمر کی عورت تھی۔ بھائی کے اندر چلانے پر اس غریب بڑھیا نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر اس عورت نے اندر سے بس ڈپٹ ہی سمجھا دیا۔ سیکڑوں صلواتیں سنانے لگی۔ بھائی تو خیر پاندان رکھ کر اتر آیا۔ مگر اس عورت کا چیخنا چلانا ہوا میں سنے ڈبے کے باہر ہی کھڑے ہو کر سمجھا یا کہ بائی! وہ لوگا تھا اس سے پردہ ہی کیا ہے۔ تمہیں گھورنے تھوڑی ہی آیا تھا پاندان رکھ کر چلا گیا بس اتنا سنتے ہی اس حرافہ نے مجھے گالیاں دینا شروع کیں۔ اور وہ گالیاں شروع کیں کہ میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ بیچارہ ہم نے صبر کیا، اور گاڑی کے سیٹی دینے کا انتظار میں پلیٹ فارم ختم ہو رہا تھا اس لئے ہم نے اس بے وہ کار روائی کو ختم کرنے کی جلدی سے کودنا چاہا مگر اس حرافہ نے ایک نعرہ بلند کیا کہ ہماری ٹوپی سر سے اڑ گئی اور ہم بدحواسی میں کود پڑے۔ شاہ آباد اسٹیشن پہنچ کر گاڑی رکی تو ان مترجم نے اپنے اغوا کنندہ ساتھی کو بلا کر قصہ سنایا اور انہوں نے پولیس کو متوجہ کرنا چاہا مگر پولیس نے ان کو ہدایت کی کہ وہ گلبرگہ اسٹیشن کی پولیس کو مخاطب کریں۔ چونکہ وہ حضرت خود اس حوادث کو کھلی سے اخبار کے نامہ نگار تھے اس لئے انہوں نے بھی کچھ زیادہ حیرات نہیں کی اور بعد کو معلوم ہوا کہ اس حرافہ نے بوزات کی بند دھتی مگر کسی مسلمان کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔ ساڑی اسٹیشن تک برابر یہ گالیاں دیں۔ اور گھڑی گھڑی یہ کہتی تھی کہ سکنڈ کلاس کے ڈبے میں ایسا۔ گویا اس کے نزدیک سیکنڈ کلاس میں اس کا امکان تعجب انگیز تھا۔ گو ہمارا یہ حرکت نہایت بیہودہ تھی کیونکہ اس ڈبے میں ہماری بیگم صاحبہ (جو عقریب ہم سے منسوب ہونے والی تھیں) بھی بیٹھی ہوئی تھیں، اور دوسری امر، ابھی تک کسی نے اس حرکت کو دیکھا نہیں تھا مگر اس سب نے سنی۔ گو یہ سخت بیہودگی تھی مگر اس سے زیادہ لطیف اور کوئی انتقام ہی کیا ہو سکتا تھا۔ ان گالیوں کا مزا اب بھی یاد ہے۔ اور اس لطیف انتقام کی لذت بھی۔

ان میں دو تین واقعات آپ کو سعدہ اور خدا رکیک نظر آئیں گے مگر میری سے میں نے صرف واقعات لکھ دیئے ہیں۔ ان میں رنگ آمیزی نہیں کی، اس لئے کوئی علت میں آپ چاہیں جو کہیں۔

حال کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے مگر اس کی تفصیل مضمون کو اور طویل کر دے گی، اس لئے اسے کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

مگر حضرات ان واقعات کو ذرا اپنی ہی حد تک محفوظ رکھنا۔ مجھ پر لوازمین زندگی کے اپنے تم اس کا چرچا نہ کیجئے گا

میں ایک میاں ہوں

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی تیرے گھر کے اُن دیوں پر قدر مختلف انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں، جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، انھی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوتے میں قیمہ ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن وہ بندگ جی کو دیتا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے ہمارے گھر میں مرزا صاحب کبوتر باز کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوّے، گدھ، لگڑ کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز کبھی لمبی بھرتی ہے کبھی چھوٹی بھرتی۔ ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کم بخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ اس بیوی کے باعثِ اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے۔ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے اندر آ جاؤ۔ ہم نے کہا نہیں آتے، تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے

رعب میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد ہے؟ ہم نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دو ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا،

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے بکتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چھت سے لے کر امرکیتک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے لیکن اگلے ہفتے کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کمر آمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میرے طبیعت میں نیوٹیت اور ملاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہ ہر ایک لگا سکتے ہیں جن کے گھر اشنان زر دستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً لہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکٹو شوہر کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے، سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو آنکھ میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے کہ "تو ری چھل بل ہے نیاری ....." اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔ لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی "بہن میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں؟" میں نے کہا اور کیا!

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کیے یعنی اب بیشک دوست آئیں، بیشک اودھم مچائیں، میں بیشک کھاؤں، بیشک جب چاہوں اٹھوں، بیشک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا،

"روشن آرا جلدی کرو، نہیں گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

سانحہ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کر چکا تو کہنے لگی "خط ضرور لکھتے رہیے۔"

میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی!"

کھانا وقت پر کھا لیجیے اور وہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور اس کی بھی بتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک ہموت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا تہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا راستہ اختیار کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں، چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گروہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے نعرے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا، سگریٹ سلگا دیا، ہلکی سیٹ پر پھیل دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف چلا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی:

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حمام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے۔ بس لیانا، کہیں ہفتے کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور!"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچا۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی، تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم پھرکیاں لے رہا تھا اس سے پوچھا:

"کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا: "حضور! آپ جانتے ہیں اس وقت جلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا [illegible] سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھا کہ بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے "تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا: "لیٹیا"

کہنے لگے: "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پر جمائی۔ جمائی پر جمائی حتیٰ کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا: "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا، مردود کہیں کا۔ سارا دن برباد ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بیہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر شیشری میں رکھ دیا اور پھر انگھنے لگا۔

گیارہ بجے احمد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا: "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا: "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش دنت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں بیٹھے بیٹھے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا، وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سوئی گنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بے تاب ہو گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نامعلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا، وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ۔

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ حوصلہ بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ احمد سے کہہ دیا گیا کہ صاحب اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں، اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس ناغا

بطرس

گھبرائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ دیر ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ بنوا کر جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معمولی طریقے سے بغیر قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتا اڑانے لگے اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھنٹا طلا کر گا رہا ہے، کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے، کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو ول وھیا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سبھی نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آجائے گی" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ولیا کھیل ہے سلطنتوں کے سلطنتوں کے"۔

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "لنگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے" کوئی کہے "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو جوتے کھائے"۔ دوسرے نے کہا "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے"۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو غذی ایک لمبوتری گوکار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور بھاسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے"۔ سبھی نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی"۔ ہمایوں خصوصاً پیشانی سے اپنے چہرے کو میش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بہروپی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھولا کہ باورچی خانے کر چل دیے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئیں۔ منہ سے برقعہ اٹھا تو روشن آرا۔

دم بخود ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا، زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی..... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود از حد شریف واقع ہوا ہوں جہاں تک میں بھی ہوں مجھ سے بہتر یہاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری مسز ال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دستوں نے مجھے مرسوا کیا ہے اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر

آنے دوں گا۔ سامنے ڈالیے یا حجام کے اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

سمجھ میں آیا؟"

"جی ہاں!"

"تو جائیے، چلے جائیے۔"

"ناظرین تماشہ دور۔"

"بھاگ جائیے۔"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا، آپ دیکھیے تو سہی۔

بہادر شاہ
اور
پھول والوں کی سیر

فرحت اللہ بیگ

سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

"رعیت چو بیخ است سلطان درخت ۔۔۔ درخت است بیسر باشد از بیخ سخت"

یہ جملہ ہی کی مصنوعی تھی کہ دلی کا سرسبز بادشاہ اب چمن اگرچہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا اور فلاکت کی بجلیوں اور باد مخالف کے جھونکوں سے سلطنتِ مغلیہ کی شوکت و اقتدار کے بڑے بڑے تنے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پھر بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اس برائے نام بادشاہ کو تخت سے اتار کر دلی کو اپنی سلطنت میں شریک کر لے۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ جاٹوں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ انگریزوں کا زور بڑھ رہا تھا مگر دلی کا بادشاہ دلی کا بادشاہ ہی رہا۔ اور جب تک دلی بالکل تباہ نہ ہو لی اُس وقت تک کوئی نہ کوئی تخت پر بیٹھنے والا آتا رہا۔ دلی کے رزیڈنٹ نے بہت کچھ چاہا کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی کر دے۔ گورنر جنرل نے بڑی کوشش کی کہ شاہی خاندان کو قلعہ میں منتقل کر کے قلعہ پر قبضہ کر لے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے بہت زور مارا کہ دلی کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر ورڈزورتھ نے اس پر کسی نہ کسی طرح عمل نہ ہونے دیا۔ وہ جانتے تھے کہ دلی کا بادشاہ کیا ہے اور اس کے اثرات کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے مہاجنے ہوتے۔ فوجوں نے بہت کچھ جوش و خروش دکھایا۔ مگر انگلستان کے جامنیدہ بڈھوں کے سامنے کچھ نہ چل سکی جب بورڈ میں پڑتا ہلکر کھڑے ہو کر کہا۔

"عزیزو! میں پچاس سال ہندوستان میں رہا ہوں۔ میں وہاں کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ دلی کا قلعہ کیا ہے۔ اس کی بنیادیں اگر ایک طرف کابل تک گئی ہے تو دوسری طرف آسام تک۔ ایک جانب آسام تک ہے تو دوسری طرف کاٹھیاواڑ تک۔ اگر تم نے ہاتھ لگایا تو وہ زلزلہ آئے گا کہ سارا ہندوستان ہل جائے گا یہ برائے نام بادشاہت جس طرح چل رہی ہے اسی طرح چلنے دو۔"

آخر بورڈ میں بڈھے جیتے اور جوان ہارے۔ دلی کے بادشاہ کا اقتدار ضرور کم ہو گیا۔ مگر جو عقیدت رعایا کو بادشاہ سے تھی اُس میں ذرہ برابر فرق نہ آیا اور جو محبت بادشاہ کو رعایا سے تھی وہ جیسی کی ویسی رہی۔ رعایا کی وہ کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں اور بادشاہ کا وہ کونسا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو۔ بات یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے تھے کہ جو ہم میں وہ یہ ہیں اور جو یہ ہیں وہ ہم ہیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کے قتل کے واقعہ پر نظر ڈالو۔ دیکھو کہ ہندو مورخ اور قوم کبھی بادشاہ سے کسی محبت تھی اور خود بادشاہ اس محبت کی کیسی قدر کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کو فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ جہاں سن پاتے کہ کوئی فقیر آیا ہوا ہے اُس کو بلا لیتے۔ نہ آتا تو خود جاتے۔ اُس سے ملتے بہت کچھ دیتے دلاتے اور فقیر نوازی کو توشۂ آخرت سمجھتے۔ غازی الدین خاں اس زمانہ میں دلی کا وزیر تھا۔ خدا جانے اس کو بادشاہ سے کیوں دلی نفرت تھی۔ تعلقہ میں تو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ دھوکے سے بادشاہ کو مارنے کا جال پھیلایا تعلقہ میں مشہور کر دیا کہ پرانے کوٹلہ میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ بڑے صاحب کرامات ہیں۔ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ مگر وہ کہیں خود جاتے ہیں نہ کسی کو آنے دیتے ہیں۔ ادھر بادشاہ کو ملنے کا شوق ہوا۔ اُدھر لوگوں نے شاہ صاحب کی کرامتوں کے اور پُل باندھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن بادشاہ تن تنہا قلعہ سے نکل کر کوٹلہ پہنچے۔ ادھر اُدھر کھنڈروں میں تلاش کی۔ یہاں تو پہلے ہی سے دشمن لگے ہوئے تھے۔ چاندنک حرامیوں نے ایک برج میں سے نکل کر بادشاہ کو شہید کر دیا۔ اور لاش چھپا کی ریتی میں پھینک دی۔ خدا کی قدرت دیکھو ادھر سے ایک برہمنی رام کنور آ رہی تھی۔ اُس نے جو لاش پڑی دیکھی تو ذرا ٹھٹکی۔ بھنگنے کا ارادہ کیا۔ پھر ذرا غور کیا تو کیا دیکھتی ہے کہ یہ تو بادشاہ سلامت کی لاش ہے۔ رات بھر اس بے کس شہید کا سرہانے پر بیٹھی روتی رہی۔ صبح جنازہ کے اشنان کو لوگ آئے انہوں نے بھی لاش کو دیکھ کر پہچانا۔ تمام شہر میں کھلبلی پڑ گئی۔ اس بے کس شہید کی لاش دفن ہوئی۔ شاہ عالم ثانی بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے رام کنور کو بلایا بہت کچھ انعام و اکرام دیا اور اس برہمن کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ تھوڑے دنوں میں سنوں کا تہوار آیا۔ بھائی کے لئے بہن مرتجن کی راکھی لے کر پہنچی۔ بادشاہ نے خوشی خوشی راکھی بندھوائی۔ بہن کو جوڑا دیا۔ اس کے رشتہ داروں کو خلعت دیئے۔ پھر راکھی بندھن کی رسم قلعہ کی رسموں میں شریک ہو گئی جب تک قلعہ آباد رہا۔ اس برہمنی کے خاندان اور قلعہ والوں میں بھائی چارہ رہا۔ ہر سال راکھیاں آتیں۔ بادشاہ اور شہزادیوں کے باندھی جاتیں۔ جوڑے دیئے جاتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جب بادشاہ سے قلعہ چھوٹا۔

پھول والوں کی سیر بھی اسی محبت باہمی کا نتیجہ تھی۔ ہوا یہ کہ اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدین ظفر بڑے بیٹے تھے مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی۔ مرزا جہانگیر کو بادشاہ بہت چاہتے تھے۔ اور کہوں نہ چاہتے۔ مرزا کی والدہ نواب ممتاز محل کا قلعہ میں زور تھا۔ بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے ریزیڈنسی میں کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولی عہد ہو جائیں۔ اس زمانہ میں دلی کے ریزیڈنٹ سیٹن صاحب تھے۔ ایسا بادشاہ پرست انگریز ہی ہندوستان میں کوئی آیا ہو تو آیا ہو۔ اکبر شاہ کی وہ بڑی ہی عزت کرتے تھے جیسی خود اپنے بادشاہ کی کرتے تھے۔ فرنگی آداب مجرا کا سے آداب بجا لاتے کرسی دی جاتی تو بادشاہ کے سامنے کبھی نہ بیٹھتے۔ گفتگو میں آداب شاہی ملحوظ رکھتے۔ بادشاہ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ غرض سب کچھ کرتے تھے مگر اس بات پر راضی نہ ہوتے تھے کہ مرزا جہانگیر ولی عہد ہوں۔ بظاہر اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ سلسلہ تخت نشینی کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتے تھے اور دوسری یہ تھی کہ وہ مرزا جہانگیر کے عادات و اطوار سے مطمئن نہ تھے۔

مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے۔ اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا۔ ایک دن سر دربار مرزا جہانگیر نے سٹین صاحب کو تُو تُو مَیں مَیں کہہ دیا۔ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے۔ تھوڑے دنوں بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دی جاتی۔ قید ہو کر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا۔ منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی سہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت اور سٹین صاحب

کی شرافت دیکھئے کہ انہی کی سفارش پر صاحب عالم اس قید سے رہا ہوئے۔ دلی گئے۔ بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی۔ عجب پھر کے تمام ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلہ لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی وہ تو اس میں خواجہ صاحب کے لئے ایک چھپروں کا چھجا بھی لٹکا دیا۔ سراج الدین بہادر ولی عہد سلطنت نے لکھا کہ گذرتا۔

فرطِ الطاف و کرم کی ہے یہ سب اس کے جھلک — کہ وہ ظاہر ہے فلک اور ہے باطن میں ٹھک
اس تماشہ کی نہ کیوں دھوم ہو خلقت میں تمام — آفتابی سے تجلی جس کے ہے خورشید خلک

یہ بنا اس شہِ اکبر کی بدولت پہلا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں بادۂ دل — واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشمِ انجم ہو نہ اس سیر پہ کیوں کر مائل — سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم عالی منزل

جس کے دیوان کا رکھے ہاہ سے نسبت دعا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زمیں تا خلک — ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہے رعیت سے شہنشاہ تلک — زعفران زار ہے اک عام سے درگاہ تلک

دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پہلا

بادشاہ کو یہ میلہ بہت پسند آیا۔ دلی والوں سے پوچھا کہ اگر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلہ ہوا کرے تو کیسا؟ مسلمان رمضان شریف پر پنکھا چڑھائیں۔ ہندو لوگ ماہی پر چڑھائیں۔ مسلمانوں کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں۔ میلہ ہائے میلہ ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا کیسی اور پوچھ پوچھ۔ دلی والے راضی ہو گئے۔ لیجئے پھول کی سیر کی بنیاد پڑ گئی۔ بادشاہ سلامت خود قطب جاتے وہاں رہتے۔ شہزادے میلہ میں شریک ہوتے۔ بڑھتے بڑھتے میلہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں یہ قافیہ چلا۔

قطب کو چلا میرا اکبر ہٹیلا — یہ رستہ میں جنگل نہ ملتا ہے نہ ٹیلا

بہادر شاہ کے زمانہ میں تو اس کا وہ زور ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس زمانہ میں پھول والوں کی سیر کیسی ہوتی تھی تو ذرا آنکھیں بند کیجئے۔ میں دکھائے دیتا ہوں:۔

۱۲۶۴ھ کا ساون بھی مقطب کا ساون تھا۔ پانی برستا ہی نہ تھا۔ یا برسا تو ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ بڈھا بڈھا پندرہ دن برسنے سے نہ آج کھلتا ہے۔ کل اندر پانی کا یہ حال ہے کہ دھائیں دھائیں یکساں برسے چلا جاتا ہے۔ جمنا بڑھ کر نگمبود گھاٹ تک آگئی کیدھا میں سے پانی ہو کر شہر میں گھس آیا۔ چاندنی چوک کی نہر پل کر کناروں سے نکل گئی۔ بیچارے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا تو ذکر ہی نہیں بڑی بڑی حویلیوں میں بول گئیں۔ اڑاڑا دھم کی آوازیں پہلی آرہی ہیں۔ اس مکان کی چھت بیٹھی اس کا پاکھا گرا۔ شاید ہی کوئی مکان رہا ہو جس کی کم سے کم چھت نہ گری ہو۔ غریب غربا گھر چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جامع مسجد کے نیچے سامان کا ڈھیر ہو گیا۔ کسی نے پلنگ پر سے دری ڈال چھوٹی سی کوٹھڑی بنالی۔ کسی نے چھپر کھٹ کے گرد چادر گھیر، عورتوں کے لئے جگہ نکال لی۔ غرض ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ دو سال پہلے بھی ڈھائی ڈھوئی میہ برسا تھا۔ مگر یہ تو کچھ اور ہی رنگ تھا جیسے اپنی مصیبت میں بھلا تھے۔ بھٹیارے

اپنے حال میں مرحوم آخر میں تو کہاں رہیں اور کھائیں تو کیا کھائیں۔

دلّی میں بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ سارا انتظام کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ بھلا کمپنی کو کیا غرض پڑی تھی جو ان غریب شہر والوں کی خبر لے۔ شہزادے جائیں، اور اُن کا کام جانے۔ خیر بادشاہ سلامت کو خبر ہوتی۔ بیچارے کے جو کچھ اختیار میں تھا وہ کیا۔ سارے سرکاری مکان کھدوا دیئے۔ کوٹ قاسم کی مال گنا ری انہی دنوں میں آئی تھی وہ سب کی سب اس مصیبت مارن رعیت پر خرچ کر دی۔ مسلمانوں کو دونوں وقت کھانا پہنچایا۔ ہندوؤں کو خلّہ دیا۔ رچھپالنے کو جگہ دی۔ غرض یہ مصیبت کے دن بھی کسی نہ کسی طرح گذر گئے۔ سولھویں دن خدا پانی نے دم لیا۔ ابر چھٹا۔ سورج کا کونڈا کھانی دیا۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ دو چار دن مکانوں کی مرمت اور حالت کی درستی میں لگے۔ اس کے بعد پھر دلّی کو میلہ کی سوجھی۔

بھلا جمنا ایسی بھرپور چلے اور دلّی والے پیچھے بیٹھے رہیں۔ ڈھنڈورا پٹ گیا کہ کل تیراکی کا میلہ ہے صبح ہی سے قلعہ کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ آٹھ نو بجے تک تو یہ حالت ہوئی کہ شہر خالی ہو گیا۔ آباد ہو گیا۔ پنڈاریوں کا چھپّر، بساطیوں، سوداگروں غرض ہر قسم کے سوداگروں کی دکانیں تک گئیں۔ جھلکی[1] میں منگل ہو گیا۔ بادشاہ سلامت بھی نکل ثمن برج[2] میں آ بیٹھے۔ شہزادوں کے لیے دیوان خاص کے صحن میں فرش ہو گیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کے لیے موتی محل خاص محل اور اسد برج[3] کی جالیوں کے سامنے مسندیں بچھ گئیں۔ تیراکوں کے استاد اپنے اپنے شاگردوں کو لے جمنا میں اُترے اور تیراکی کے کمال دکھانے شروع کئے۔ کوئی چت تیرا تو اس طرح گویا تختہ بہا چلا آتا ہے۔ کسی نے کھڑی ماری تو ایسے اچھلے کہ گھٹنے تک پانی سے باہر نکل آیا۔ کوئی ہے کہ گٹھڑی بنا بہا چلا جاتا ہے۔ کوئی شیر کے ہاتھ مارتا چڑھا اور پر سید ھا چڑھ رہا ہے۔ ادھر تیراکی ہو رہی تھی اُدھر قلعہ والوں اور شہر والوں میں کھلونے بازی شروع ہوئی۔ تکلیں لڑیں تو ایسی کہ چکراتی چکراتی مقبرہ[4] سے آگے نکل گئیں۔ پتنگ اڑے تو ایسے کہ سارا آسمان کلغیوں سے چھپ گیا۔ غرض یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ دو دن پہلے اس شہر میں آفت بپا تھی۔ شام ہوتے ہوتے میلہ بچھڑنا شروع ہوا۔ رات کے نو دس بجے میلہ پھر وہی جنگل کا منگل ہو گیا۔ ہاں دونوں اور آنجوروں کے ڈھیر پکیوں کے نشان اور پھلکوں کے انبار یہ ضرور بتاتے تھے کہ یہاں کوئی بڑا شہر تھا جو دم بھر میں بسا اور دم بھر میں غائب ہو گیا۔

ساون ختم ہوا۔ بھادوں لگا۔ جھڑیوں کا زمانہ گیا۔ پھوار کا زمانہ آیا۔ دلّی والوں کے دلوں میں پھر گدگدی شروع ہوئی۔ قطب کا سبزہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ پھول والوں کی سیر کی سوجھی۔ شہر فارد بلی[5] میں سے دو ہندو اور دو مسلمان مال جوتی پہنچے۔ اطلاع کرائی باریابی ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد عرضِ مطلب زبان پر لائے۔ کہا پیر و مرشد! پھول والوں کی سیر کا زمانہ آگیا ہے۔ بھنڈا اور شمسی تالاب بھر کر کٹورہ ہو گئے ہیں۔ کوئی تاریخ مقرر فرما دی جائے۔ اگر جہاں پناہ بھی تشریف لائیں تو زہے نصیب"۔ بادشاہ نے فرمایا "ہاں

---

[1] جھلکی ریتی کے برابر جھاؤ کا جو جنگل ہے اُس کو میلہ کہتے ہیں۔

[2] قلعہ میں تسبیح خانہ سے ملا ہوا یہ ایک ہشت پہل برج ہے۔ نام تو اس کا شمس البرج لیکن دلّی والے اس کو ثمن برج کہتے ہیں۔

[3] مقبرہ سے مراد ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ عمارت دلّی سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

[4] دلّی کے قلعہ کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہتے تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا شعر ہے ؎

میری تنخواہ لوٹی ان شیروں نے حویلی میں
دہائی ہے بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے

اللہ ملک ہے جو تمہاری خوشی ۱۵ تاریخ مقرر کر دو۔ ہمارا آنا۔ تو جہاں تم وہاں ہم کیوں نہ آئیں گے۔ تاریخ مقرر ہونا تھا کہ شاہی روشن چوکی و شہنائی نواز چاندی کی لگیری ہاتھ میں لئے حاضر ہوئی۔ لگیری پر شادیانہ بجایا۔ لیجئے سیر کی ۱۵ تاریخ پکی ہو گئی۔ سارے شہر میں لگیری پھر گئی کہ پندرھویں کو پھولوں والوں کی سیر ہے۔ لوگوں نے تیاریاں شروع کیں۔ بادشاہ سلامت دربار خاص سے اٹھ کر تسبیح خانہ میں گئے ہی تھے کہ تمام بیگمات اور شہزادیاں جمع ہونی شروع ہو گئیں۔ ایک آتیں سلام کر کے بیٹھ جاتیں۔ دوسری آتیں بیٹھ جاتیں۔ تھوڑی دیر میں سارا قلعہ تسبیح خانہ میں جمع ہو گیا لیکن سب کی منہ سے چپ ہیں۔ کچھ نگاہیں صاف کہہ رہی ہیں کہ قطب چلیئے۔ بادشاہ سلامت بھی سمجھ گئے۔ فرمایا۔

"اماں[1] میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ سیر کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ آج دس ہے۔ پندرہ کو سیر ہے۔ اچھا ہوگا کہ سب سے پہلے ہم چلے چلیں۔ بعد میں گئے تو شہر والوں کو تکلیف ہوگی۔ دو تین دن قطب کا لطف اٹھا لو اور پھر قطب والوں کے سپرد کر دو۔ لو جا چلنے کی تیاری کرو۔ انشاء اللہ کل سویرے سویرے روانہ ہوں گے۔ اور ہاں بیگم[2] ارا۔ تم ہماری سواری کا بندوبست کر دو۔ کوتوال سے کہہ دو تعلقدار سے کہہ دو حکیم صاحب[3] میں خود کہہ دوں گا۔ صبح سویرے نکل گئے تو سلطان جی ہوتے ہوئے شام تک انشاء اللہ قطب پہنچ جائیں گے۔" یہ سب لوگ تو اتنا سننے کے لیے جمع ہی ہوئے تھے۔ ایک ایک اٹھ مجرا کر رخصت ہوا۔ سامان بندھنے لگا۔ سامان بندھتا اور داروغہ توشکی کے پاس پہنچ جاتا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ بیسیوں پیٹیاں۔ سینکڑوں بوقچہ۔ ہزاروں گٹھریاں۔ لاکھوں پڑیاں غرض اقسام اقسام کا سامان جمع ہو گیا۔ کچھ چھکڑوں میں لادا گیا۔ کچھ اونٹوں پر چڑھایا گیا۔ کچھ فلکوں[4] میں رکھا گیا۔ کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا قافلہ ہوگا کہ سامان چلنا شروع ہوا۔ خدا خدا کر کے کہیں دو بجے اس لمبی دوری کا ناتا ختم ہوا۔ اس وقت کہیں جا کر بچارے داروغہ کو دم لینے کی فرصت ملی۔ ابھی پوری طرح دم نہ لیا تھا کہ اداروغگی نے حکم پہنچایا کہ حضرت جہاں پناہ کا ارشاد ہوا ہے کہ توشک خانہ شاہی ابھی روانہ ہو جنگلی محل میں تیام ہوگا۔ اس لئے تکیوں، سرا پردوں اور شامیانوں کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں شہر والے اگر یہ سامان طلب کریں تو دے دیا جائے۔ دوسرے حکم کا انتظار کیا جائے۔ اور حکیم صاحب کے ذریعہ سے شہر کے لوگوں کو اس حکم کی اطلاع کرا دی جائے۔ حکم پہنچا تھا کہ داروغہ صاحب پھر کمر باندھ، اپنے پیش دستوں کو لے کر سرکاری سامان باندھنے کی فکر میں لگ گئے۔ یہاں انتظام والے تو اپنی مصیبت میں گرفتار تھے اور وہاں قلعہ والوں کی یہ حالت تھی کہ گویا شادی رچی ہوئی ہے چوڑی والیاں بیٹھی دھانی چوڑیاں پہنا رہی ہیں۔ رنگ ریزنیں سُرخ دوپٹے رنگ رہی ہیں۔ کہیں مہندی پس رہی ہے۔ کہیں کڑاہیاں نکالی جا رہی ہیں کہاں کا کھانا اور کہاں کا سونتا۔ اسی گڑبڑ میں رات کے بارہ بج دیئے۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ سواری کا چلّہ ہوا۔ قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے نوبت خانہ سے ملا ہوا جو میدان ہے اُس میں سواریاں آنے لگیں۔ اتائیں۔ مغلانیاں۔ خواصیں[5] چھوکریاں، لونڈیاں، بیگمیں[6] سوار ہونا شروع

---

[1] خواتین شاہان دہلی اپنی معتمن "اماں" کا لفظ استعمال کرتے تھے جن معنی میں آج کل بھی کا لفظ بولتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری اردو کا یہ خیال تھا کہ یہ لفظ شاید "اے میاں" کا مخفف ہے۔ چنانچہ اب بھی دہلی میں اے میاں کو مختصر کر کے اماں بولا جاتا ہے۔ ان کے اس خیال کو پیش نظر رکھ کر میں نے دلی کے شہزادوں سے اس کی کھوج تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت اس لفظ کو اپنے اصلی یعنی "ماں" کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کا استعمال حیدرآباد دکن میں اب بھی عام طور سے ہوتا ہے۔

[2] مرزا دارا بخت ولیعہد سلطنت تھے۔ [3] محترم الدولہ عمدۃ الحکماء معتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد حسن اللہ خاں ثابت جنگ بہادر وزیر اعظم تھے۔ ان ہی کی نصیحت نے بچارے بادشاہ کو رنگون دکھایا۔ [4] اونٹ گاڑی کو پہلے فلکم کہتے تھے۔ پھر یہ لفظ بند گھوڑا گاڑی کے لئے بھی بولا جانے لگا۔ [5] اس زمانہ میں بیگمات شاہی محلوں کی معاصلہ کو خواص کہتے تھے۔ دوسرے معتقدوں سے بڑی ہوتی تھیں۔ [6] نو خرید لونڈیاں سرپتیں کہلاتی تھیں۔ سرپہ عربی میں لونڈی کو کہتے ہیں۔

برقیں۔ بہار کسوں۔ گجموبروں اور بہلیوں میں وہ تھسا تھس ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ ساچقوں اور ساچقوں میں پہلے تو اثاث سامان بھرا۔ اوپر سے بھی دو دو تین تین بچھ کریاں اور مامائیں ٹھنس گئیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔ بیل لگائے گئے اور یہ قافلہ قطب کو روانہ ہوا۔ مشعلی مشعلیں اور تیل کی کپیاں ہاتھوں میں لئے ساتھ ہوئے۔ یہ فوج قلعہ کے باہر نہ ہوں گے کہ بیگمات اور شہزادیوں کی رتھیں ڈولیاں نیچے۔ میانے پالکیاں چرچے۔ چڈ دل اور سکھ پال موتی محل کے برابر آ گئے۔ شاہزادہ ولیعہد بہادر بھی باہر نکل آئے۔ دلہن کے سہاگنوں نے بند کئے رتھوں اور گرجنوں نے تماشبین کھینچ لیں جو بیگم یا شہزادی باہر آتیں ان کو دیکھ کر ان کے درجہ کی سواری تک سب سواری کے ساتھ ایک فتحاتی اور ایک ارد۔ بیگن مقرر ہو جاتی۔ یعنی سواتین بچے ہوں گے کہ پہلی رتھ روانہ ہوئی۔ آگے آگے رتھیں، ان کے پیچھے دوسری سواریاں۔ سب کے آخر میں نواب زینت محل کا سکھپال۔ لاہوری دروازہ پر سواری پہنچی تھی کہ کپتان ڈگلس قلعدار نے اطلاع دی۔ دروازہ کے باہر سے دو گولہ توپ کا ایک پرا آگے ہو یا اور ایک پیچھے۔ شہزادیوں کی سواری کے ادھر ادھر تھانیاں مردانہ لباس پہنے کھڑکی دار پگڑیاں باندھے۔ سانگا ہتھیار سجائے ساتھ ہو لیں۔ بیگمات کی سواریوں کو رکابوں کی پیشوں نے بیچ میں لیا۔ ان کا جی مردانہ فوجی لباس۔ گورے گورے چہرے شگفتہ بدن کا طیں پڑی ہوئیں، سر پر بھڑکیلا سا عمامہ۔ اس میں سفید پروں کی اونچی کلغی۔ ماتھے میں چھوٹی چھوٹی بریاں۔ پشت پر ترکش۔ شانہ پر کمان۔ پہلو میں تلوار۔ اب ہیں پیش قبض۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کی فوج دلی میں گھس آئی ہے۔ نواب زینت محل کی سواری کا جلوہ ٹھاٹ تھا۔ آگے آگے دو جمشیں گھوڑے والے بال۔ ان پر سرخ پڑیاں، پڑیوں میں سفید منقش۔ کے چھندنے موٹے موٹے جھومر۔ لال لال دیدے۔ سرخ گونٹ کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ گھوڑوں پر سوار۔ ہاتھوں میں پتلی پتلی چھ ہیں۔ سامنے گھوڑوں کی پیشت پر نہایت سے منڈے ہوئے ڈنکے۔ ایک چوب مارتی۔ دوسری پکارتی۔ ادب سے نگاہ روبرو حضرت بادشاہ بیگم سلامت سکھپال کے دونوں طرف دو دو چھڑیں۔ ایک کے ہاتھ میں مورچھل دوسرے کے ہاتھ میں چنور۔ ہر ہر قدم پر بسم اللہ بسم اللہ کہتی چلی آتی تھیں۔ سب سے پیچھے اردلی بیگنیوں کی پیشیں۔ مردانہ لباس پہنے ہتھیا۔ لگائے اپنی بنی ساتھ تھیں۔ گھوڑے گھوڑے خاصہ پر مشعلچیں۔ کسی کے ہاتھ میں مشعل اور کسی کسی کے ہاتھ میں دو شاخہ کسی کے ہاتھ میں پنج شاخہ سواری کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ یہ جلوس والی دروازہ تک نوبتی سلسلہ سے گیا۔ دروازہ کے باہر نکل کر تھیں تو ترکمان دروازہ کی طرف سے ہوتی ہوئیں قطب کی سڑک پر پڑیں اور دوسری سواریں دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گئیں۔

کوئی چار بجے ہوں گے کہ بادشاہ سلامت بیدار ہوئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر گڑگڑا شربت پی کر معدہ صاف کیا۔

۱؎ دولہا بھائی کسوں اور بہلیوں کے سامنے بانس باندھ کر اور سوت کا جال بنا کر جو جھگا نکال لیتے ہیں اس کو ساگی اور اسی طرح پیچھے گھاس وغیرہ بھرنے کو جو بھوسی بنا لیتے ہیں اس کو ماچی کہتے ہیں۔

۲؎ ۳؎ ۴؎ ۵؎ آدمی پالکی کو نیم کہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے بڑی میانہ ہے۔ چوپلہ بھی پالکی کی وضع کے ہوتے ہیں۔ گلمان کی شکل بجائے مستطیل کے چوکور ہوتی ہے۔

۶؎ نواب زینت محل خاندان شاہی سے نہ تھیں۔ نواب علی قلیخاں کے خاندان میں نواب شمشیر الدولہ کی لڑکی سے بادشاہ نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ خدا کی قدرت سے اولاد نرینہ ہوئی جو اس بخت نام رکھا گیا۔ انہی کی دلجوئی کے جھگڑوں نے تعلقہ میں تفرقہ ڈالا۔ بیگم کی محبت میں بادشاہ ایسے گرفتار تھے کہ جو وہ چاہتیں بادشاہ کہتے آخر باغی خاندان نے رنگون بھیج دیا۔ یہ بیگم جب نقلیں ڈنکا لال کے ساتھ ہوتا اسی لئے ان کو ڈنکے والی کہا جاتا تھا۔ قلعہ میں کم رہتی تھیں۔ حالی کوٹھی پر رہا کرتی تھیں۔ غدر کے بعد وہ محل پیارے والوں کو ملا۔ اب وہ بھی ٹھکانے لگ گیا۔ ۷؎ بہادر شاہ مرحوم کا دستور تھا کہ صبح اٹھتے ہی گڑگڑا باقی حاضر لگے سونپا

خانساماں نے یا توتی کی سرمہ پیالی پیش کی۔ محمد توکر نے توتی نوش جان کی اور فرمایا۔ اماں سب لوگ سدھارے۔" غرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے سب انتظام ہو گیا۔ میر ترک[1] حاضر ہیں۔ کہا اور شاد ہو تا ہے۔" فرمایا اچھا بسم اللہ کرو۔ یہ حکم ہونا تھا کہ بگل بجا۔ دلیر بہادر کمر کسے تمام جھام۔ مرزا شاہ رخ کے لئے تخت رواں۔ مرزا فخرو کے لئے ہوج اور خود بادشاہ سلامت کے لئے ہوادار و روان خاص میں آ بیٹھے۔ باقی سب شاہزادے اور سلاطین گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ ادھر بادشاہ سلامت نے باہر نکل ہودا میں قدم رکھا اور اُدھر چوبدار نے آواز لگائی "ادب سے تعظیم سے" کہار بکاعدہ۔ حضرت بادشاہ سلامت شہزادوں نے تکیہ درمیان سے نکال سلامی دی۔ دوسرے لوگ جھک کر آداب بجا لائے۔ بادشاہ سلامت کے بعد دیگرے بہادر۔ مرزا شاہ رخ اور مرزا فخرو سوار ہوئے۔ ہودار کے پیچھے ایک خواصی نے چتر شاہی کھولا۔ دوسرے نے سورج مکھی لی اور یہ جلوس آہستہ آہستہ قلعہ کے دہلی دروازہ کی طرف چلا۔ دروازہ کے باہر پہلے سے فوج کی مثل بندی ہوئی تھی۔ سب سے آگے نشان کا ہاتھی اس پر شاہی پرچم۔ اس کے پیچھے نقارہ کے اونٹ۔ اونٹوں کے بعد ترک[2] سواروں کا رسالہ۔ رسالے کے بعد روشن چوکی کے تخت۔ تختوں کے پیچھے میر ترک۔ اس کے بعد سلاطین زادوں کی سواریاں۔ شہزادوں کے گھوڑے۔ مرزا فخرو کا ہوچہ۔ مرزا شاہ رخ کا تخت رواں۔ مرزا فارغ بخت کا تام جھام۔ ان کے پیچھے دور باش[3] اور دور باش کے پیچھے بادشاہ سلامت کا ہوادار۔ ہوادار کے پیچھے فوج کا پرا۔ آخر میں قلعہ کے آگے پاگ۔ چہرہ بنگاہ۔ ترک[4] نے کنارے کنارے سنگینوں کی قطاریں۔ غرض قلعہ[5] کے دلی دروازہ سے جو شہل بندی تو پرانے کوٹلہ پر جا کر ختم ہوئی۔ سواری قلعہ کے دروازہ سے نکلی ہی تھی کہ شہدوں نے غل مچایا۔ حضرت پیر و مرشد سہارا حق بھی مل جائے۔ خدا تعالیٰ عمر و اقبال میں ترقی کرے۔ آمین۔ اور صدہا سال یہ سایہ دلی والوں کے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔ خدا شہزادوں کے شہزادوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔ میسّر آ رہی ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ ہم بھی جہاں پناہ کے عہد قدیں سیر کی بہار دیکھ لیں۔ بادشاہ سلامت نے اشارہ کیا۔ خواصی نے مٹھیاں بھر بھر کر روپے ہوا دار پر سے نچھاور کئے۔ پھر کیا تھا۔ روپوں کے ساتھ شہدے ترک پر بچھ گئے۔ کسی نے ہاتھ پھیلائے۔ کسی نے جھولی پھیلائی۔ سواری چلنی مشکل ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک یہی ہنگامہ رہا۔ جب دل بھر کر روپے لوٹ چکے۔ تو شہدے دعائیں دیتے رخصت ہوئے۔ اور ہوادار آگے بڑھا۔ لوگوں کو پہلے ہی سے خبر ہو گئی تھی کہ آج پچھلی رات کو سواری مبارک قطب جائے گی۔ رات کے بارہ ہی بجے سے خاص بازار سے لگا فیض بازار درشہر کے دلی دروازہ تک خلقت کا ہجوم تھا۔ بازاروں میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ چھتوں اور کمروں پر ہزاروں جوبن

---

[1] یہ صحیح سا بقہ شرارت بھی کہ توں کا قوں نکال دیتے تھے۔ اس طرح کل رطوبات فاسدہ خارج ہو کر معدہ صاف ہو جاتا۔

[2] قلعہ میں میر ترک کا بڑا درجہ تھا۔ دربار اور مجلس کا انتظام اور لوگوں کو باریاب کرنے کی خدمت انہی کے سپرد تھی۔ ایک یہی شخص تھے جن کو دربار میں ہر جگہ سے کھڑے ہونے کی اجازت تھی۔ خواہ کسی نے آداب شاہی میں اونچ نیچ کی ادھر انہوں نے کھٹ سے جریب ہاتھ پر ماری۔ یہ خدمت سعادت خاں رئیس کے خاندان میں ہلت تک رہی۔

[3] دلی کی فوج انگریزی لباس اور انگریزی ہتھیاروں سے آراستہ تھی اس کو ترک سوار کہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ترکوں کا بھی یہی فوجی لباس تھا۔

[4] دور باش ایک نوع عزت رئیس شہر ہوتا تھا جس پر برچھیاں لگی ہوتی تھیں۔ یہ سواری کے آگے رہتا تھا کہ کوئی بادشاہ پر حملہ نہ کرے۔

[5] قلعہ کے دروازے میں لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ۔ شہر پناہ کے دروازوں کے بھی یہی نام ہیں۔ لاہوری دروازہ کھاری باؤلی کے کنارہ پر تھا وہ زمین کے برابر کر دیا گیا۔ ہاں دلی دروازہ موجود ہے۔ فیض بازار کے سرے پر ہے۔ دراصل میں سے ہو کر پرانے قلعہ کو سڑک گئی ہے۔

بیٹھی جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے بادشاہ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ وقت کم تھا اس لئے بازاروں میں آئینہ بندی تو نہیں ہوتی تھی۔ ہاں بعض بعض مکانوں کے دروازے۔ کمروں کے دروازوں کا صرف دو کواڑیں سجا کر روشنی کر دی تھی۔ جلوس آہستہ آہستہ ان سڑکوں پر سے گذرا۔ ایک سناٹے کا عالم تھا مگر ہر شخص کے بشرہ اور آنکھوں سے جوش ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ سلامت بھی اس جوش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک جبری سی آن اور آنکھوں سے خود بخود تفوق ٹپکا کر جھاروں پر پہنچ آئے۔ کیا خبر تھی کہ نہ پھر نہ گزریں گے کہ اسی سڑک پر سے گزرنا ہوگا۔ مگر کس حالت میں۔ دلی دلے تباہ ہوں گے۔ کوٹوں کی مار سے مقامات مسمار ہوں گے۔ اور بے گناہوں کے خون سے زمین رنگین ہوگی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد اسی سڑک سے پھر شہر میں پھر داخل ہونا ہوگا۔ مگر کس حالت میں کہ خود قید ہوں گے۔ چاروں طرف جنگلی پہرہ ہوگا۔ بیٹیوں، بھائیوں اور عزیزوں کی لاشیں میدانوں میں بے گور و کفن پڑی ہوں گی محل ویران ہوں گے اور محل والیاں خدا جانے کہاں ہوں گی اور کس حالت میں ہوں گی۔

غرض سواری مبارک ان سڑکوں پر سے گزر کر دلی دروازہ پہنچی۔ محافظوں نے سلامی دی اور جلوس سلطان جی[1] کی سڑک پر پڑ لیا جو زندہ سواریاں پہلے سے روانہ ہو کر یہاں ٹھہری ہوئی تھیں وہ بھی جلوس کے آخر میں شریک ہو گئیں۔ کہاروں نے یہاں سے ذرا قدم تیز کر دئے۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے سواری پرانے قلعہ پہنچ گئی۔ شیر شاہ کی مسجد کے سامنے ہودار رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے مسجد میں نماز پڑھی، وظیفہ پڑھا۔ کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ قیام کر کے یہاں سے سواری بڑھی اور ابھی دن پوری طرح نہ نکلا تھا کہ ہمایوں کے مقبرہ پہنچ گئی۔ مقبرہ میں پردہ ہو گیا سواریاں اتریں۔ باہر کے دروازہ سے بادشاہ سلامت کا ہودار کہاریوں نے سنبھال لیا۔ اور مقبرہ کے دروازہ پر جا لگایا۔ سامنے کے صحن میں پہلے سے فرش ہو گیا تھا۔ مسند بچھی ہوئی تھی۔ بادشاہ سلامت مسند پر جا بیٹھے، وظیفہ ختم کیا۔ مقبرہ کے اندر گئے۔ خاندان شاہی کے سینکڑوں لوگ اس مقبرہ کے تہ خانوں میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ہر ایک کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی۔ شاہزادے ساتھ تھے۔ سب کو ایک ایک قبر دکھاتے جاتے اُن کے کارنامے سناتے۔ اپنی اور ان کی حالت کا مقابلہ کرتے اور بے اختیار رو دیتے۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر پھر ہودار میں سوار ہوئے۔ اور جس ترتیب سے یہ قافلہ آیا تھا اسی ترتیب سے آگے بڑھا۔ درگاہ شریف قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ دلی والوں کو خاص اس درگاہ سے جو عقیدت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم اور کسی ملت کا آدمی نہیں جو اس چوکھٹ پر سر نہ جھکاتا ہو۔ اور کوئی بدنصیب ہی ہوگا جو یہاں سے نامراد جاتا ہو۔ پردہ کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا۔ ہودار باؤلی پر رکھا گیا۔ بادشاہ سلامت نے اُتر کر وضو کیا۔ شاہزادوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ شاہزادیوں کے لئے باؤلی کے طاقوں کے سامنے اوٹ لگ گئے تھے۔ کسی نے وضو کیا۔ کسی نے غسل کیا۔ کوئی پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ بادشاہ سلامت وضو کر کے ہودار میں آ بیٹھے۔ اردابیگنی نے عرض کی جہاں پناہ باؤلی میں تیرنے کے لئے خادموں کے لڑکے آئے ہیں۔ کیا حکم ہوتا ہے؟ فرمایا "ہاں ہاں بلاؤ۔" وہ حقداریں۔ اپنا حق لینے آئے ہیں۔ کیوں نہ ملے گا۔ ضرور ملے گا۔ "حکم ہونا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ برس کے بیس پچیس لڑکے اندر آئے۔ مچلا کھائے اچھلنا چاہی اور گنبد پر چڑھ گئے۔ بیشتر ہمیں پر سے بیگمات اور شاہزادیوں نے روپے پھینکنے شروع کئے۔ ادھر روپیہ گرا اور ادھر کوئی نہ کوئی لڑکا گنبد پر سے کودا۔ ڈبکی لگائی اور روپیہ نکال لایا۔ تھوڑی دیر تک یہی تماشا ہوتا رہا۔ اس کے

---

[1] حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں۔ اُن کا مزار مبارک دلی دروازہ سے ۳ میل پر ہمایوں کے مقبرہ کے بالکل سامنے ہے۔

[2] آخر میں بہادر شاہ مرحوم کا دل ایسا رقیق ہو گیا تھا کہ بات بات پر آنسو نکل آتے تھے۔

بعد سب کے سب درگاہ شریف میں گئے۔ پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ وہاں سے حضرت سلطان جی کے مزار پر آئے۔ بادشاہ سلامت تو فاتحہ پڑھ گئے۔ عورتوں نے گنبد شریف کے دروازے پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ کسی نے نذر نیاز پکا کر دعا مانگی۔ کسی نے چوکھٹ کی مٹی لے کر منہ پر ملی۔ کسی نے تو دیا کر دل ہی دل میں تلاوت شروع کی۔ کسی نے مجمعے کے کٹورے کا قصہ شروع کیا کہ دیکھنا بابا یہ کٹورہ سونے کا ہے۔ بڑا بھاری ہے۔ کئی سیر کا ہوگا۔ یہ سامنے جو تسبیح خانہ ہے اس میں بھی ایک ایسا ہی کٹورہ لٹکا ہوا تھا۔ داداجان کے زمانہ میں ایک بڑھیا مصیبت کی ماری درگاہ شریف میں آئی اور عرض کی کہ یا حضرت سات بیٹیاں ہیں۔ کھانے کو پیسہ پاس نہیں۔ یہ پہاڑ بیٹیوں کر اٹھیں گے۔ آپ ہی مشکل آسان کیجئے۔ وہاں سے اُٹھ، جو تسبیح خانہ میں آئی تو کٹورہ گنبد سے آتا اس کی گود میں آگرا۔ خوشی خوشی گھر آئی، بڑی دھوم دھام سے بیٹیوں کی شادیاں رچائیں۔ مزے سے ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دتی کے امیر تھے ان کو جو یہ خبر ہوئی تو انہوں نے بھی درگاہ شریف میں جا کر دعا مانگی۔ وہاں سے اس مسجد میں آئے بڑی دیر تک کٹورے کو دیکھتے رہے۔ کٹورہ وہاں تھا وہیں رہا۔ جل گئے۔ مزدوروں کو بلوا پہاڑ باندھی۔ جتنی پہاڑ اونچی ہوتی کٹورہ اور اونچا ہوتا جاتا۔ پہاڑ گنبد کی چھت تک پہنچی تو کٹورا غائب ہو گیا۔ ادھر پہاڑ تھلی اور ادھر کٹورا اپنی جگہ پر آ موجود ہوا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ کٹورہ تو گیا ملا پہاڑ باندھنے کا خرچ سفت گلے پڑا۔"

بادشاہ سلامت فاتحہ سے فارغ ہو کر درگاہ شریف سے باہر آئے۔ جگمگ شاہ بادشاہ کے مزار مزار جہانگیر مرزا[1] نیلی اور جہاں آرا بیگم[2] کی قبروں پر گئے فاتحہ پڑھی۔ یہاں سے پھر بادلی پر آئے۔ خدمتوں کو انعام دیئے۔ بھنگیوں کو خیرات تقسیم کی اور وہاں سے نکل منصور کے مقبرہ کی سیر بھی شریک پر ہوئے۔ یہاں دو ڈھائی گھنٹہ آرام کیا۔ خاصہ تناول فرمایا۔ کوئی چار بجے یہاں سے روانہ ہو کر شام ہوتے ہوتے قطب پہنچ گئے جنگلی محل اور مرزا بابر[3] کی کوٹھی پہلے سے اکراستہ تھی۔ جو سواریاں سیدھی قطب آئی تھیں انہوں نے سب سامان قریب سے جا دیا تھا۔ خاصا تیار تھا۔ دن بھر کے سب تھکے ماندے تھے۔ کھانا، نماز پڑھ ایسے سوئے کہ جب چار بجے کی نوبت بجی، اس وقت کہیں جا کر آنکھ کھلی۔

جنگلی محل اب تو واقعی جنگلی محل ہے۔ ہاں کسی زمانہ میں بڑا عمدہ محل تھا۔ پہلے ہی کچھ کم بڑا نہ تھا۔ بہادر شاہ نے دیوانِ خاص، دیوانِ عام، خاص محل اور باب ظفر بنوا کر اس کو اور بڑا کر دیا۔ دروازہ کیا ہے خود ایک چھوٹا سا محل ہے۔ سرتا پا سنگِ سُرخ کا ہے۔ سنگ پر سنگ مرمر کی پٹیاں جا بجا پچی کاری کے کام اس کی رونق کو دوبالا کر رہی ہیں۔ دروازہ کی بلندی کوئی ۱۷ گز ہے۔ پہلو میں، شیر صیوں کا چکر دار زینہ ہے۔ غرب کے عین اوپر شاہی بارہ دری ہے۔ یہیں سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت دریا کے پار کے مکھوں کا تماشا دیکھتے تھے۔ دروازہ سے ملا ہوا درگاہ شریف کا دروازہ ہے

---

[1] مرزا اسحاق محمد بیگ شہزادے بیدرمن کی دختر سے بچوں والوں کی سیر قائم ہوئی۔ واپس آنے کے بعد اچھو رہنے لگے۔ اچھالہ آباد بھیج دیئے گئے۔ لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نواب ممتاز محل نے ان کی لاش الہ آباد سے دلی منگوائی اور سلطان جی میں ایک نہایت خوبصورت سنگِ مرمر کا مجمر بنوا دفن کر دیا۔

[2] مرزا نیل شاہ عالم ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ انتقال کے بعد اُن کو بھی مرزا جہانگیر کے مجمر میں دفن کیا گیا۔

[3] جہاں آرا بیگم شاہ جہاں بادشاہ غازی کی بیٹی تھیں۔ حضرت سلطان المشائخ سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کا مزار درگاہ کے پائینتی ایک سنگِ مرمر کے مجمر میں ہے سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبہ کا شعر پڑھ کر فاتحہ کا ثواب ہے ؎

غیر سبزہ نہ روید کسے مزار مرا ۔۔۔ کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

[4] مرزا اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ اُن کی ایک بڑی کوٹھی انگریزی وضع کی اب تک قطب موجود ہے۔ اس کا ایک دروازہ قدم درگاہ شریف میں ہے۔ دوسرا جنگلی محل میں اور تیسرا جنگلی میں جھرنے کی طرف نکلتا ہے۔

جھرنے سے پگھلے اُٹھ کر اِدھر آتے۔ پہلے دن ہوگ مایا جی کا پکھا اُٹھتا۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا۔ درگاہ شریف کا پکھا تو برابر والے دروازہ سے مزار شریف پر چلا جاتا۔ لوگ مایا جی کا پکھا شاہی دروازہ کے سامنے کچھ دیر رکتا۔ اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا مندر چلا جاتا۔ باب ظفر کے اندر لاحد دیکھنے کے قابل ہے۔ ٹیڑھے چھاتک سے لگا کر اندر محل تک سات ڈیوڑھیاں ہیں۔ پھر ہر ڈیوڑھی پر پہرہ دھلنے کے لئے سہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ پھاٹک پر تو دو گلہ پلٹن کا پہرہ تھا۔ اندر کی ڈیوڑھیوں پر ترکنوں[1] خاصی خیرتی[2] اور ارد بیگنیوں[3]۔ خدمتوں اور گرمخوں کی نشست ہوتی۔ بھلا کیا مجال کہ محل میں پرندہ تو پر مار جائے۔ پھاٹک سے گھستے ہی الٹی طرف پہلی ڈیوڑھی کے پاس سے نقار خانہ جاتا تھا۔ غرض اس محل میں اتنی گنجائش تھی کہ سارا قلعہ اس میں سما جاتا اور پھر بھی جگہ رہتی۔ باب مرزا لے اور زنانے سب مکانات لوٹ پھوٹ کر برابر ہو گئے۔ ایک باب ظفر رہ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس محل کا یہ دروازہ ہے وہ محل کیا ہوگا۔ بادشاہ کی کسی ہوئی تاریخ دروازہ کی دیوار پر کندہ ہے

این در عالی چو شد محرم بنا حسب المراد
گفت دل سال بنا۔ باب ظفر پائندہ باد

سنہ جلوس ۱۲۶۴ھ

زمانہ کے ہاتھوں، اس دولتہ کا بھی وہی حشر ہوا جو شہر کے محلوں کا ہوا۔ وہ تو کہو ملکہ آثار قدیمہ نے اس کو اپنی نگرانی میں لے کر سنبھال لیا ہے ورنہ توسیع کی تو بت بھی آ ہی چکی تھی کہ محل میں پھل پھل شروع ہو گئی۔ منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل، ناشتہ کر سب شہزادے شاہزادیاں بادشاہ سلامت کے سلام کو آئیں۔ مطلب یہ تھا کہ چلئے۔ یہاں بیٹھے تھوڑی آئے ہیں جہاں پناہ بھی دیکھ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ سب کا سلام لیا۔ دعائیں دیں۔ ان سب کا مطلب سمجھ گئے۔ فرمایا "کہو۔ اماں کہاں کا ارادہ ہے۔ جھرنے کا یا قطب صاحب کی لاٹھ کا؟" سب نے عرض کی۔ "پیر و مرشد۔ پہلے جھرنے تشریف لے چلئے۔ ابر آیا ہوا ہے۔ اس وقت جھرنے پر بہار ہوگی۔" فرمایا "اچھا" بیگمات کو پردہ کرانے کا حکم دیا گیا۔ دو گلہ پلٹن کے سپاہیوں نے ناکہ بندی کر دی۔ اردا بیگنیوں، خاصہ خیرتیوں نے راستہ کا انتظام کیا۔ شہزادیں اور گرمخیں بیگمات اور شاہزادیوں کے ہمراہ ہوئیں۔ ماماؤں۔ اصیلوں، خواصوں اور سرتیوں کا غول کا غول نکلا۔ اور سیدھا جھرنے کا رخ کیا۔ شاہزادیوں نے پہلے درگاہ شریف میں حاضری دی۔ وہاں سے مزار

---

[1] آخر زمانہ میں ترکستان، بھیش اور کرجستان سے عورتوں کی آمد ہو گئی تھی پہلے سے جو خاندان دلی میں بس گئے تھے انہیں میں سے یہ پلٹنیں بھرتی جاتیں۔ لباس ان سب کا مردوں کا سا ہوتا تھا۔ یہ سب مردانہ کرتب جانتی تھیں۔ ان کا کام زنانہ میں پہرہ دینا تھا۔

[2] خاصہ خیلیاں پہرہ دینے اور حکم حکام پہنچانے پر مقرر تھیں۔ ان کے لباس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان عورتوں کو شادی کرنا ممنوع تھا۔

[3] اردا بیگنیاں بھی محل کا انتظام کرتیں اور شاہی حکم احکام پہنچاتیں تھیں۔ ان کا صرف مردانہ لباس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ نام بھی مردوں کے سے رکھتے تھے۔ گفتگو بھی مردوں کی طرح کھڑی کھڑی زبان میں کرتی تھیں۔ تو عورتیں مگر شکل صورت وضع قطع چال ڈھال سے بالکل مرد معلوم ہوتی تھیں دلی میں ان کو بڑ بیگنیاں کہتے تھے۔ بیچارہ نظیر اردو میں ایسی لڑکیوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑی شریر اور دنگئی ہوں۔ اور جن پر عموماً یہ شعر صادق آتا ہو ؎

لڑکی وہ آنکھوں میں جو کھیلے ۔۔۔ نہ کہ لونڈھوں میں جا کے ڈھٹ پیلے

بارش کی کثرت میں سے ہو کر جھیل میں نکل گئیں پہلے جہاز پر چڑھا کر دم لیا۔ شمسی تالاب کا لطف اٹھایا۔ میلوں تک پانی ہی پانی تھا۔ بیچ بیچ میں آگئی تھی۔ یہ عالم دیکھ کے بستوں کے بستوں میں آیا کہ کود پڑیں۔ پھر خیال آیا کہ یا شاہ سلامت سے اجازت لئے بغیر پانی میں اُترنا طیف نہیں چنگل ہو رہیں۔ حضوری دیوان طلب کر کے سب کے سب اولیاء مسجد پہنچے۔ مصلوں پر تھیں پڑھیں اتنے میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آگئی۔ شاہزادے سات تھے وہ آگے آگے سوار ہوئی پہلی، پیچھے پیچھے جورؤں کا یہ قافل روانہ ہوا۔ اولیاء مسجد سے تھوڑا دور ہی تھا۔ تھوڑی دیر میں سب کے سب وہاں پہنچ گئے

جس نے پہلے زنانہ کا جھرنا نہیں دیکھا اس نے دلی میں کچھ خاک نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کوکسی نے بہشت کا ایک کونہ کاٹ کر دلی میں جوڑ دیا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ یہ بنا کس نے بنائے تھا اور کیا کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے شمسی تالاب کا بند باندھ کر اس کا پانی نو لکھی نالہ میں ڈالا تھا اور اس نالہ کو تغلق آباد کے نالوں سے ملا دیا تھا۔ تاکہ قلعہ میں پانی کی قلت نہ ہو۔ تغلق آباد ویران ہو گیا۔ نالہ ٹوٹ گیا۔ تالاب کا پانی جھنگل میں بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر نشانہ میں نواب غازی الدین فیروز جنگ بہادر نے شمسی تالاب کے بند کے سامنے سوئمبر بنوائے۔ نہریں نکالیں۔ فوارے لگائے اور اس ٹکڑے کو بہشت کا نمونہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں بارہ دریاں۔ دالان اور مکانات بن گئے۔ چار دیواری کھنچ گئی۔ درخت بڑھ کر جھرنے پر چھا گئے اور تھوڑے دنوں میں یہ جگہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ بند سے سوتوں کی شکل میں پانی جھر جھر کر یہاں آتا تھا۔ اسی لئے اس مقام کا نام جھرنا ہو گیا۔ بند سے ملا ہوا جو سہ دری دالان ہے وہی جھرنے کی جان ہے۔ دالان کی چھت اندر سے کھوکھلی ہے۔ بند کا پانی پہلے چھت میں آتا ہے چھت میں فلیتوں پھوڑ دی ہیں۔ درزوں میں سے پانی اس طرح گرتا ہے گویا دالان میں مینہ برس رہا ہے۔ دالان کے سامنے کی جو دیوار ہے اس میں پانی نکلنے کے لئے سینکڑوں طاق بنے ہوئے ہیں۔ پرنالوں کے سامنے پانی کی چادر گرتی ہے بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یا تو پانی میں ٹانکے لگا دی ہے یا سوت بچھل بچھل کر برس رہا ہے۔ چھت کی منڈیر کے نیچے سوا پرنالے میں سے ہو کر پانی چھجہ پر آتا ہے۔ چھجہ کے نیچے ایک بڑا حوض ہے پرنالوں کا پانی چھجہ پر پھیل کر اس زور سے حوض میں گرتا ہے گویا دھواں دھار بارش ہو رہی ہے۔ حوض کے سامنے ۸ گز لمبی چوڑی اور گز بھر گہری ایک نہر ہے۔ حوض کا پانی اُبل کر اس نہر میں آتا ہے جہاں نہر ختم ہوئی ہے وہاں سلامی کے پتھر دے کر ایک چادر بنا دی ہے۔ اس سلامی کے پتھروں پر ایسی اچھی نفیس کاری کی ہے کہ پانی کے بہنے سے چادر پر پھلیاں سی اٹھتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس چادر

---

۱ شمسی تالاب کے کنارے جہاز کی شکل کی ایک بہت بڑی اور خوبصورت عمارت قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ اس عمارت کو جہاز کہتے ہیں۔

۲ اسی تالاب کے بیچ میں ایک چھوٹا سا کھوکھلا بڑی برج ہے۔ اور برج کے نیچے ایک سنگ خارا پر گھوڑے کے سم کا نشان ہے۔ اس سم کے متعلق عجیب و غریب تصوریں ہیں۔ عام طور پر اس کو براق کا سم کہتے ہیں۔ کنارے سے گرچہ اتنی دور ہے کہ وہاں تک جاتے جاتے اچھے اچھے تیراکوں کے دم ٹوٹ جاتے ہیں

۳ ایک چھوٹی سی مسجد شمسی تالاب کے کنارے پر ہے جس میں دو مقبرے ہیں کہتے ہیں کہ ان مقبروں پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہما نماز پڑھا کرتے تھے۔

۴ مہرولی کو قطب کہتے ہیں یہ دلی سے گیارہ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں یہاں خاصی رونق ہو گئی تھی۔ وہ قطب کے حاشیہ جمنا۔ جہاں تک دریا یا دریا کی سواری قطب چلی۔ کہا کرتے تھے کہ یہ سارے قطب جانے کا قطب ہے۔

۵ نواب غازی الدین فیروز جنگ شاہانِ دہلی کے وزیر آصف جاہ اول کے فرزند تھے۔ یہ وہ غازی الدین فیروز جنگ نہیں ہیں جنہوں نے عالمگیر ثانی کو کوٹلہ میں شہید کر دیا تھا۔

کے نیچے شمال اور جنوب سے دونوں کے پانی اوپان ملے ہیں۔ آگے چل کر یہ پانی پھر تین نہروں میں بٹ جاتا ہے۔ بڑی نہر بارہ دری کے منڈوے کے دونوں طرف سے چار دیواری کے باہر نکل جاتی ہیں۔

محمد شاہ کے زمانہ سے لگا کر بہادر شاہ تک شاید ہی کوئی ولی کا بادشاہ ہوگا جس نے پھر نا میں کوئی عمارت نہ بنوائی ہو۔

خود محمد شاہ نے تو بڑی نہر کے اوپر بارہ دری کا منڈوا بنوایا۔ شاہ عالم ثانی نے جنوب کی طرف پکی درہ دالان لگا۔ اکبر شاہ ثانی نے شمال کی جانب دو پہلو دالان تعمیر کیا۔ بیچ میں جو جگہ رہی تھی اس میں بہادر شاہ نے سنگ سُرخ کی بارہ دری بنوا کر پھرنا کی عمارتوں کو مکمل کر دیا۔

پھرنا کے قریب ہی دو پتھر ہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک "پھسلتا پتھر" دوسرے "امریاں"۔ پھسلتا پتھر محمد شاہ بادشاہ کی عبث پسند طبیعت کی یادگار ہے۔ یہ پتھر کوئی سوا چھ گز لمبا اور پانچ گز چوڑا ہے۔ اور پھرنا کی مشرقی دیوار سے ملا کر اس کو ذرا اٹھا ہوا کاڑ دیا ہے۔ یہ پتھر اس بلا کا چکنا ہے کہ ذرا کوئی بیٹھا اور پھسلا۔ پھول والوں کی سیر میں لوگوں کا اس پر چڑھنا اور پھسلنا ایک تماشہ ہوتا ہے۔ اسی پتھر کے استعارہ سے ذوق نے یہ شعر کہا ہے ؎

میں کہاں سنگِ دریا سے مل جاؤں گا　　کیا وہ پتھر ہے پھسلتا کہ پھسل جاؤں گا

بارہ دری کے منڈوے سے ملا ہوا پھرنا کا دوسرا دروازہ ہے اور اُس کے باہر امریاں۔ آموں کے درخت تو ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے درختوں پر کچھ اور ہی بہار ہے۔ پھرنا کے پانی سے بارہ مہینے سرسبز رہتے ہیں اور اتنے گھنے ہو گئے ہیں کہ آسمان بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ ادھر ان کی سبزی اُدھر نیچے گھاس کی سبزی۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان سبز مخمل کے بن گئے ہیں۔ پھرنے میں چاروں کا گنا۔ نور کا اچھلتا پانی کہنا اگر مبالغہ ہے تو امریوں میں موروں کی جھنکار پپیہے کی پکار اور کوئل کی کوکو تو "دو سو گوش" ہے۔ علاوہ ان چھرنا ایک عجیب چیز تھا کہ ہر موسم میں ایک نیا لطف دکھاتا تھا اور ہر شے کی ایک لذت بخشتا تھا۔ اب اُس کی بھی بہار گئی۔ شمسی تالاب کٹ پھٹ کر حوض بن گیا۔ بند اس سے دُور جا پڑا۔ پانی کا راستا موقوف ہوا۔ نہریں خشک ہو گئیں۔ حوض ملبے سے اٹ گئے۔ درخت سوکھ سوکھ کر کٹ گئے۔ پھسلتا پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ ہاں عمارتیں کھڑی رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں میں ان کا بھی وقت آگے گا۔ اس کے بعد پھرنے اور امریوں کا بس نام ہی نام رہ جائے گا۔ ؎ ہے:

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تو ہاں بادشاہ سلامت کے پھرنے پہنچتے ہی خلاصیوں نے شاہی پنگورا کھڑا کر اس میں مسند بچھا دی۔ ہوادار پنگورے کے پاس جا لگا۔ بادشاہ اترا۔ اُس میں جا بیٹھے۔ دو خواصیں مورچھل لے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے آہستہ آہستہ پنگورے کو ہلانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد بادشاہ سلامت نے فرمایا "کہو اماں کیا ارادہ ہے۔ اب تیرتے[1] ہو تا ہے یا جھولا جھولتا[2]؟"

اچھا پھرنا میں رہو کچھ امریوں میں چلو۔ یہاں کا بھی لطف اُٹھاؤ۔ وہاں کا بھی مزہ دیکھ لو۔ ہم تو امریوں میں جاتے ہیں۔ یہ کہہ بادشاہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے بارہ دری کے دروازہ سے امریوں میں آ گئے۔ یہاں پہلے سے انتظام ہو گیا تھا۔ ایک طرف بادشاہ سلامت ر

---

[1] اس بارہ دری کی چھت نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹیاں لگا کر پھروں کی سیلیں چوڑھادی ہیں۔ پھول کھلنے سے ساری چھت ڈھک جاتی ہے۔

[2] قلعہ میں شاہزادے اور شاہزادیاں دونوں کو مردانہ فن سکھائے جاتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہو گا جس کو تیز تکوار رندوق چلانا، سوار ہونا اور تیرنا آتا ہو۔ ہمایوں بادشاہ کے زمانہ سے یہ خاندان پانی کا عاشق ہے۔ قلعہ ہی دیکھو آدھا قلعہ حوضوں اور نہروں نے گھیر لیا ہے۔

بادشاہ بیگم کے محفت کھچ گئے تھے۔ دوسری طرف شاہزادیوں کے لئے درمن۔ چاندنی اور قالینوں کے فرش کر کے تکیے لگا دیئے گئے تھے۔ درختوں میں قمقمے جھومنے لگ گئے تھے۔ پہلے بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے۔ اس کے بعد سب سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ انتظار تھا کہ اب حکم ہو اور اب جھومروں پر جائیں۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ "واہ جی واہ! خالی جھومرا کیسا۔ کرخائی پڑھاؤ۔ جھومتے جاؤ۔ کھاتے جاؤ۔" تاج محل نے عرض کی "جہاں پناہ! ہم پہلے ہی سے یہ انتظام کر کے آئے ہیں۔ حکم کی دیر ہے۔ ابھی سب کچھ ہوتے جاتا ہے۔" یہ کہہ کر نوکروں کی طرف دیکھا۔ وہ تو حکم کی منتظر ہی تھیں۔ فوراً سی دریں میں میزیں کرخائیاں آگئیں۔ درختوں کی جڑوں میں چولہے لگ گئے۔ کسی کسی بیگم کے سامنے انگیٹھی آگئی۔ اب ہے کہ کوئی توبیٹھا بیسن چھید رہا ہے۔ کوئی گلگلوں کے آٹے میں کھانڈ دے سہا ہے۔ کوئی سہال اور اندرسے تلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ کوئی اندرسہ کی گولیوں کا سامان نکال رہا ہے۔ کوئی پھاج پر کھجوریں بنا رہا ہے۔ غرض تھوڑی دیر میں خاصہ بازار سا لگ گیا۔ جب سامان سے میز سج گئے تو ہر ایک نے بڑھ بڑھ کر بادشاہ سلامت سے عرض کی کہ حکم ہو تو کرخائی میں گلگلا پڑے۔" فرمایا۔ "نہیں۔ اماں، ابھی نہیں۔ جھولوں پر لوگ بیٹھ لیں اس وقت پکوان شروع ہو۔" یہ کہہ کر نواب زینت محل اور نواب تاج محل کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ تاج محل تو ایسی خوبصورت نہ تھی۔ ہاں زینت محل کی کچھ پوچھ۔ جب نیول عمرت پائی تھی۔ شہر بھر میں ایک تھیں۔ ان کی جامہ زیبی اور حسن کی تعریف ہی سن کر بادشاہ نے اُن سے شادی کی تھی۔ رنگت ایسی گورا و سفید تھی جیسے گلاب کی چتی۔ یا شہاب اور صیدہ۔ گلابی چہرہ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی ستوان ناک۔ بال بھنوں بالکل نہ تھیں۔ اس کی کمی کو سرمہ کی بھر پور کیا جاتا۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں۔ سرخ تاروں بھرا لگار دوپٹہ۔ جسم پر سرخ انگیا کرتی۔ بادامی گلی کا سبز زربفت کا پائجامہ۔ دوجوتی کی گھنگھرو دار جوتی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا سرمہ۔ دانتوں میں مسی۔ ہونٹوں پر لالی۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ پرستان کی پری اکھریوں میں اُتر آئی ہے۔ زینت محل نے۔ تاج محل کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا تاج محل نے زینت محل کو بُرے بُرے دیدوں سے گھورا۔ حکم سے لاچار تھیں۔ بادشاہ سلامت کے سامنے جو جھولا تھا اس کے لال سبز ریشم کے رسے اور گنگا جمنی پٹریاں تھیں۔ دونوں اُٹھ اس میں جا بیٹھیں۔ زینت محل نے ہاتھوں جوڑے۔ تاج محل نے جھونٹے لینے شروع کئے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ "واہ جی واہ۔ ایسا سوتا جھولا ہم کو تو پسند نہیں۔ بی ترمحی[1] خانم، وردلدار کو بلاؤ۔ بھلا بیگمات جھولیں اور یہ دونوں بھنجرا میں گھسی رہیں۔" یہ سنتے ہی دو ادھیڑ عمر کی خواجہ سرا جا دونوں کو بھنجرا میں سے پکڑ لائیں۔ دونوں بیچاریاں گھبرائی ہوئی تھیں۔ سارے کپڑے شنہا لبور تھے۔ پہلے تو سامنے آتے ذرا جھجکیں مگر جب بادشاہ سلامت نے تو فرمایا "آؤ۔ تمہاری ہی بہادری ہے۔" تو اُس وقت ذرا ہمت بڑھی۔ کپڑے جھاڑتی ہوئی دونوں جھولے کے اِدھر اُدھر کھڑی ہو گئیں۔ اور شہزادیاں آواز دینے لگیں۔ اِدھر انہوں نے تار شروع کیا اور اُدھر کرخائی میں گلگلہ پڑا۔ ترمحی خانم اور دلدار تو خیر رنڈیاں تھیں۔ تاج محل ڈومنی تھیں۔ مگر

---

[1] نواب تاج محل کا خطاب ہے۔ ممتاز ور تھا۔ ممتی تو ڈومنی مگر جب سے بادشاہ نے اس کو محل میں داخل کیا تھا اس وقت سے بادشاہ اس کی مٹھی میں آ گئے تھے۔ بغیر اس کے حکم کے قلعہ میں پتہ تک نہیں ہل سکتا تھا۔ آخر نواب زینت محل نے اس کا کفر توڑا۔ قلعہ سے نکالی گئی اور ایسی نکالی گئی کہ پھر قلعہ کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

[2] یہ نہیں جانتا کہ اس لفظ کی کیا اصلیت ہے۔ ترمحی کے معنی بڑھے مزہ والی ہے لفظے سے اس کا منہ ذرا پھر گیا تھا جو اصلیری کچھ میں آئی ہے میں نے لکھ دیا۔ جناب کی کچھ میں آئے وہ پڑھ لیجئے۔ ترمحی خانم غضب کی گانے والی تھی۔ تان رس خاں بھی اس سے ذرا کنیاتے تھے۔ آخر اسی سے لڑ کر محل سے بادشاہ کی غزلیں حضور سے ہی گاتی تھی۔ دلدار اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں ڈیرہ دار رنڈیاں تھیں۔ بڑی بہن کی نواسی دوبئی جان اور چھوٹی بہن کی نواسی کالی جان دہلی کی مشہور طوائفیں گزری ہیں۔

شہزادیوں کی آوازیں بھی رس میں کچھ کم نہ تھیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ سے شاید یہی کوئی محل والی ہو گی جو گانا نہ جانتی ہو۔ تان رس خاں ایسی لئے لوگ تھے۔ تاج محل اسی لئے محل میں آئیں پلی تھی خانم اور دلدار کی اسی نوٹنکی سے بادشاہ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ اب جھولے کے ساتھ گانا شروع ہوا:۔

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

ربن امرتسری۔ تال کا رے۔ مرا بھیجنا رے۔ بادل کا رے۔ بوندیاں پڑیں پھنیاں پھنیاں

جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں

رسکھی جھولیں۔ دو ہی جھولائیں چار رہ گئیں۔ جھولا جھلیاں۔ جھولا کن ڈارو رے امریاں

وہ نوبت لگے۔ وہ رسیلی آوازیں، وہ اونچی تانیں۔ وہ وقت کی راگنی۔ وہ سہانا وقت۔ پتہ پتے اور بوٹی بوٹی سے۔ جھولا کن ڈارو۔ رے امریاں۔ کی آواز آرہی تھی۔ مور درختوں سے اُتر جوش میں آ۔ سامنے ناچنے لگے۔ درختوں سے جانور چہکنے لگے پپیہے کی پیہو پیہو اور کوئل کی کوکو سے سارا جنگل گونج اٹھا۔ غرض ایسا سماں بندھا کہ ایک دفعہ ہی فرشتے سے جنہ کا بھیجنا آیا۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا "ڈرو نہیں۔ اہل دوا۔ قطب میں جنتے ہو۔ بھاگتے ہو۔ بھاگوں کا بھیجنا ہے ابھی برسا ابھی نکل گیا۔ ہاں بی۔ دلدار۔ کوئی اور چیز ہو جائے اور ہاں تم سب ایک ہی بھولے کو کیوں گھیرے کھڑے ہو۔ دوسرے بھولوں پر جاؤ۔ کاؤ کاؤ کھاؤ پیو۔ کچھ لطف اُٹھاؤ۔" یہ سننا تھا کہ بھولوں کی طرف سب دوڑ پڑے۔ دو چار جھولوں پر تو پہلوں نے قبضہ کر لیا باقی رہ گئے اُن پر منڈلیاں ہو بیٹھیں جب ذرا یہاں چھیڑ ہوئی تو دلدار نے دوسری چیز شروع کی۔

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں ہو گن تیرے ساتھ

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا بجائے۔ بین بانسری۔ جوگیا بجائے۔ بین بانسری۔ جوگن گائے ہے ملار

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی۔ جوگیا نے چھائی۔ جنگل جھونپڑی۔ جوگن نے چھایا ہے پدیس

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے جوگیا نے پہنے۔ لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے

اب کیا پوچھتے ہو گرم گرم پکوان آرہا ہے۔ کھا رہے ہیں۔ جھولا جھول رہے ہیں۔ کوئی نذرسے کی گولیاں منہ میں دبائے ہے۔ کسی کے منہ میں سہال کا ٹکڑا ہے۔ کسی کے حلق میں بیسن کی پھلکی پھنس گئی ہے۔ سانس رکا جاتا ہے۔ مگر طار ہے کہ پھیل رہا ہے۔ بیٹھ برس کر نکل گیا۔ پھر بھی پانی کی بوندیں درختوں میں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ ادھر بوند گڑھی میں گری۔ ترتل اُڑا۔ اور ادھر کسی نہ کسی کے منہ سے "اوئی" نکل کسی کے ہاتھ پر پھینٹا پڑا، تو کسی کے منہ پر کوئی تو اوئی تو ہے۔ کہہ کر رہ گئی۔ کوئی کلا سہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسروں نے چھیڑ کر کہہ دیا کہ "واہ بوا۔ نیچ کوئی ایسا نازک بن جاتے۔ چھینٹا پڑتا ہی ہے۔ یوں کڑھائی چھوڑ کر کوئی نہیں اٹھ کھڑا ہوتا۔"

بیگن کے جھولے پر کچھ اور ہی مزا تھا۔ پکوان کی سب سے زیادہ کھپت یہیں تھی۔ دو جھولے تو لڑکوں کے قبضہ میں تھے باقی

یہ لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ لڑکے تو جھولے میں کھڑے ہو۔ وہ لمبے لمبے پینگ بڑھا رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہاں لڑکیاں جھولوں میں بیٹھی چھوٹی چھوٹی پینگیں بڑھا رہی تھیں۔ پاؤں جوڑے جھول رہی تھیں۔ وہ لمبے سُر ملا چیخ رہا تھا کہ واہ جی واہ۔ کسی کی جان کھو جاتی تھی، کسی کی کھو جاتی تھی، کسی کی کھو جاتی تھی کہ تو بولا بس اُتر لو۔ بہت جھول چکیں۔ اب ہماری باری ہے۔ لیکن گانے کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ گیت بھی نئے نئے مزے کا تھا۔ مذکر تانیثے

ماں۔ آٹو جو میں گھلے دھرے	ماں، میں نہیں کھاتی میری ماں
ماں۔ تتا پانی بھرا دھرا	ماں میں نہیں نہاتی میری ماں
ماں۔ وہانی جوڑا سلا دھرا	ماں میں نہیں پہنتی میری ماں
ماں۔ بھائی بھاوج ملی کھڑے	ماں میں نہیں ملتی میری ماں

مؤنث، بھوپا، پھوپی سے الٹا ماؤں اور سوتیلی ماؤں تک۔ سب ملنے کو کھڑے ہیں۔ مگر وہ کسی سے ملنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر ان اس پر تو کی تھی کہ۔

ماں۔ صاحبی ڈولا لئے کھڑا	ماں، میں نہیں جاتی میری ماں

یہاں قریب جو سایا تھا اور وہاں بھی پہنچا اور ہی ہار تھی۔ ادھر بادشاہ سلامت پھر نانے نکل، مریوں میں آئے اور ادھر شہزادیاں نے لوٹ کر بند کر ڈھیلے پائجامے آتار تنگ پائجامے پہن۔ دھم سے جھولنا میں غوطہ مارا۔ کوئی ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ کوئی تیر رہی ہے۔ کوئی کمر کمر پانی میں کھڑی چیخ رہی ہے۔ بچے اعمال نہروں میں کھڑے اوہ دھم مچا رہے ہیں۔ کچھ حوض کے سہ دری والان میں کھڑی نہا رہی ہیں۔ کچھ پھسلن پتھر سے پھسل رہی ہیں۔ چیخ کر کر کے تھا بڑیاں لگا رہی ہیں۔ بچیوں کی لت پت ہوتی ہیں حوض میں آکر کود پڑتی ہیں۔ نہانے والیاں غل مچاتی ہیں کہ کنکلہ۔ ساں پانی گدلا کر دیا۔ ظالم ہر ایک اپنے اپنے ملک میں ایسا مست تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ اتنے میں پہرہ لگا کہ حضرت ہمال پناہ، نظر کے باغ تشریف لے جا رہے ہیں۔ اب کیا تھا۔ سب نے پانی میں سے نکل تحیت پٹ کپڑے بدلے۔ بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر نہروں میں سے نکالا۔ یہ ادھر ان کے کپڑے پہنے ہیں اور اُدھر وہ دھم سے پھر نہر میں کود گئے۔ بڑی مشکل سے بچوں کو پکڑ پکڑ کپڑے بدلوا، بچوں کے دروازے سے نکل گئے۔ سب کے سب وہاں سے نکل امریوں میں آئے۔ قصور اہت مجھ لا مجھ نا۔ یکوان کھایا اور نظر کے باغ کا راستہ لیا۔

نانا کا باغ مجھ بات سے قریب ہی ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کے نظر و زرافوں نے بنوایا تھا۔ امریوں کے سامنے ہی اس کا بڑا دروازہ ہے۔ دروازہ پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

پئے تاریخ سالش گفت ہاتف	خدایا ایں چہ باغ است باللہ مبارک

باغ کے گرد پختہ چہار دیواری ہے۔ اندر چاروں طرف مستطیل سُرخ کی چار بارہ دریاں ہیں۔ بیچ میں ایک بڑی خوبصورت عالیشان بارہ دری ہے۔ بارہ دری کے چاروں طرف حوض ہیں۔ ان حوضوں میں کئی کئی فوارے ہیں۔ جب نانا کا پانی اس باغ میں آتا ہے۔ ان چاروں حوضوں سے یہ فوارے چھوٹتے ہیں۔ تھوڑی دور نہر کی اور دوسرے حوض میں گر گئی۔ اس سے نکلی تیسرے حوض میں جا گری۔ اسی طرح حوضوں میں سے یہ نہر ہوتی ہوئی اور سامنے کی بارہ دریوں کے گرد گھوم کر باہر نکل جاتی ہیں۔ ان نہروں کی وجہ سے باغ کے چار حصے ہو گئے ہیں۔ نہروں کے دونوں کنارے چلنے پھرنے کے لئے پختہ روشیں ہیں۔ اس کے بعد گھاس کے قطعے ہیں۔ اور ان قطعوں سے ملی ہوئی پھولوں کی کیاریاں اور کیاریوں کے بعد گھنے سایہ دار درخت۔ شروع بھادوں تھا۔ آم کے درختوں پر بہار تھی۔ گوندنی کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بھلا بغیر اجازت کے کون

ہاتھ نہ سکتا تھا۔ ڈھ تے ڈر تے بادشاہ سلامت سے اجازت چاہی۔ اجازت ملی تھی کہ سب کے سب درختوں پر ٹوٹ پڑے۔ آدھے گھنٹے آدھے پھینکے۔ گٹھلیاں چلیں۔ چھلکے چلے۔ تھوڑی دیر میں ننگے کپڑے عجیب شان کے ہو گئے۔ بارہ دری کے حوضوں میں پھر سب جا کر نہائے۔ کپڑے بدلے۔ خاصہ پر آ کر بیٹھے۔ مگر کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا۔ پکوان اور آموں سے پیٹ بھر چکے تھے۔ منہ جھوٹا لئے کو بیٹھ گئے تھے ذرا سی دیر میں دستر خوان پڑھ گیا۔ اس کے بعد مقبرے میں اور وہی آموں کے درخت۔ شام تک کئی کئی جوڑے بدل گئے۔ غرض کہ سارے کا سارا دن اسی بھگدڑ میں گزر گیا۔ امراؤں اور باغ کے مالی میں گزر گیا۔ شام کو بھگدڑ محل میں آن کر وہ ملبی تانی کہ سب کی خبر لائے۔

دوسرے دن قطب صاحب کی لاٹھ۔ حلائی دروازے[1]۔ امام ضامن کے مقبرے نیم کی چٹنگی[2]۔ ڈھائی بجے بیٹھے نیم اور بارہ بادشاہوں کی قبروں کا پھیرا رہا۔ تیسرے روز پہلی تاریخ چل رہی تھی۔ بکاؤلی کے قلعہ۔ جمالی کمالی کے مزار اور مدرسہ[3] یا باغ کی سیر کی۔ غرض تین دن میں سارا قطب چھان مارا۔ تھک کر رہ گئے۔ پھرتے پھرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ جب کہیں جا کر قفس سے چھٹے۔ چودھویں تاریخ بھی آ گئی تھی۔ صرف بھگلی محل اور مرزا بابر کی کوٹھی قلعہ والوں کے پاس رہی۔ باقی سارے قطب پر دلی والوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

دلی والے سیر کا انتظام تو پورے سال کرتے رہتے ہیں۔ ہاں تاریخ مقرر ہونے کے بعد اس میں ذرا تیزی آ جاتی ہے۔ ادھر تاریخ مقرر ہوئی اور ادھر کاریگروں (کارخانہ داروں) کے ہاں پڑی۔ حسب مقدور سب نے اس میں چندہ دیا۔ یہ تو قطب میں کھانے پینے کا ذکر ہو گیا۔ اب رہے دوسرے ضروری[4]۔ تو وہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ جی چاہے اٹھاؤ جی چاہے نہ اٹھاؤ۔ تیرہ تاریخ سے دلی خالی ہونی شروع ہوئی۔ اندھیری لدھاڑ سے لگا قطب تک دکانیں لگ گئیں۔ امیروں کی پالکیاں جا رہی ہیں۔ رنڈیوں کی ٹھیلیں نکل رہی ہیں۔ ایک ایک رتھ ایسی کہ نظر لگے۔ مخمل کی پوٹی۔ اس پر زردوزی کے پھول، اوپر سنہری کلس۔ اطلس کے چندوے۔ لاکھ جتن کی ڈوریاں۔ سفید براق پہیے۔ ان پر رنگین بیل بوٹے ناگوری بیل۔ ان پر زردوزی کام کی جھولیں۔ گلے میں چاندی کے گھنگرو۔ سینگوں پر سنگوٹیاں۔ ریشم کی ناتھیں۔ ساز بناؤ سنگار کئے رتھ بیان بیٹھی ہیں، ایک رتھ آگے نکل گئی۔ دلی کے شرفا گھوڑوں پر سوار۔ مخمل کے کارچوبی زین پوش بلیس ٹمی ہوئی لگامیں۔ کنگا جمنی گہنا پہنے ہوئے گھوڑے رنگی اور گندھی ہوئی ایالیں۔ ریشمی باگ ڈور رقابے، سائیس۔ ان کے صاف شفاف کپڑے۔ چھوٹی چھوٹی سرخ پگڑیاں، ایک ہاتھ میں باگ ڈور دوسرے میں چابک۔ سوار ہیں کہ نشہ سواری کے انداز دکھاتے چلے جا رہے ہیں۔ غریبوں کا کچھ عجیب رنگ ہے۔ صرف ایک تہمت[5] بندھی ہے نہ سر پر

---

[1] یہ دروازہ سلطان علاؤالدین کا بنوایا ہوا ہے۔ لاٹھ کے بالکل پاس ہے اور خلجی عمارتوں میں لاجواب سمجھا جاتا ہے۔

[2] مہرولی میں شمال کی طرف کوئی میل بھر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا پتھر پہاڑی چٹان پر رکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جب بھیم کو اس طرح ملتا ہے کہ اب نیچے جا پڑے گا

[3] چٹنگی کے قریب ہی ایک بزرگ کے مزار پر یہ درخت ہے۔ کہتے ہیں اسے شہزادی کی بیٹی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی تھی اس کی قبر پر بھی اس پر نیم کا سایہ ہے۔ نیم کے درخت کا جو حصہ بزرگ کے مزار پر ہے اس کے پتے میٹھے اور جو حصہ راجہ کی لڑکی کی قبر پر ہے اس کے پتے کڑوے ہیں۔

[4] یہ پچھلے بادشاہوں کی قبریں ایک کھلے چبوترے پر بنی ہوئی ہیں۔

[5] اولیاء مسجد کے سامنے چالیس شہیدوں کے مزار ہیں کہتے ہیں کہ یہ کسی طرح گنتی میں نہیں آتے۔ بے ترتیبی کی وجہ سے جھول چوک ہو جاتی ہے۔

[6] پہلی تاریخ چل رہی ہے کہ ایک ویران عمارت ہے۔ سنتے ہیں رات کے وقت اس میں سے گانے کی آوازیں آتی ہیں۔

[7] اندھیریا باغ قطب کی جان ہے۔ جھیل تالاب کے جنوبی کنارہ پر اس خوبصورتی سے لگایا ہے کہ دور سے گھرے ابر کا دھوکا ہوتا ہے۔ گھنا ایسا ہے کہ دن کو بھی مشعل سے اس کے پتوں پر پہنچتی ہے۔ مگر شاہ بادشاہ نے اس باغ میں دنیا کے جو مزے اٹھائے ہیں وہ کسی بادشاہ کے خواب و خیال میں (باقی صفحہ کے حاشیہ پر)

ہے نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ ہاں ایک چھوٹا سا شکار پر اوندھا سرپٹ اُڑے جا رہا ہے۔ اب یہ نہ پوچھ کہ اس ملکے میں کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سیر کا سارا ذخیرہ اسی ملکے میں ہے۔ تختہ تختہ کپڑے ہیں۔ لیس دار کارچوبی ٹوپی ہے۔ میرس سلیم شاہی جوتی ہے۔ روپے ہیں، پیسے ہیں، سمجھنا ہے۔ غرض سب ہی کچھ بھرا ہے۔ ملکے میں اس طرح رکھا ہے کہ بھیگ نہ جائے۔ ترکیب اچھی نکالی ہے۔ سامان کا سامان بچا اور ملکہ قطب میں کام آیا۔

تیرھویں کی صبح سے جو یہ لیمپ لگی تو کہیں چودھویں کی شام کو جا کر ختم ہوئی۔ ساری دلی خالی ہو گئی۔ شاید ہی کوئی گھر ہوگا جس میں مرد یا بچہ رہ گیا ہو۔ اب دیکھا تو ہم نے دلی میں سیر سناٹا۔ سیری مشکی نکل گئیں۔ ہاتھوں کی سیر کی۔ جھولے ڈالے۔ کڑھائیاں چڑھائیں۔ دم کھائے۔ حوضوں میں نہائیں۔ غرض دل کے پورے ارمان نکال لئے۔ شاہی حکم تھا کہ جس سرکاری باغ میں دلی والیاں جانا چاہیں۔ تو جانے دو۔ پردہ نگاہ دو۔ باغ پہرے لگا دو۔ کہ مرد اندر نہ جا سکے۔ آگے یہ جائیں اور باغ جائے۔ انہوں نے جی دو دو روز میں سارے باغوں کو انڈورا کر دیا۔ آموں کی گٹھلیوں کے چھلکوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ دن میں کئی کئی دفعہ اٹھائے جاتے۔ اور پھر وہی پہاڑ کے پہاڑ لگ جاتے۔

سیاحوں نے پہلے تو قطب میں اپنے لئے کوٹھے تلاش کئے۔ بھلا قطب میں ٹھہرنے کے لئے جگہ کی کیا کمی تھی۔ سرکاری ڈیرے تھے ہی مکانات تھے۔ پرانے کھنڈر تھے۔ اُمراء تو اپنے مکانوں میں جا ٹھیرے۔ روپیہ پیسے والوں نے ٹرک کے دونوں طرف جو کوٹھے تھے دو دو روپے لئے۔ جو بار کچھ توڑ دیں اور سرکاری مکانات میں جا پڑے۔ کچھ بھرنے میں جا ٹھیرے کچھ ناظر کے باغ میں اُتر گئے۔ لیکن جن کو قطب کا شوق تھا انہوں نے آسمان کے نیچے ڈیرا کیا۔ جیٹھ برسنتا ہے برسنے دو۔ وہیں قطب کی بہار ہے۔

مہرولی کے بازار کی کچھ نہ پوچھو۔ اس سرے سے اُس سرے تک سارا آئینہ بند تھا۔ دنیا بھر کے سودے والوں کی دکانیں لگ گئی تھیں۔ میرے مٹھائیاں اور کھلونوں سے بازار پٹا پڑا تھا۔ ایک طرف حلوائیوں کے ہاں پوریاں کچوریاں، ہیوڑیاں۔ سہالی اور اندرسے تلے جا رہے تھے۔ دوسری طرف کبابوں پراٹھوں۔ بریانی۔ مزعفر اور متنجن کی خوشبو سے سارا بازار پڑا مہک رہا تھا۔ گاہک ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ لیا۔ کھایا۔ پیتے وہیں پھینک آگے بڑھے۔ جیوارن کی دوکان پر پہنچے۔ بی جیوارن ہیں کہ بالوں میں تیل ڈالے کنگھی کئے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے۔ دانتوں میں مسی ملے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھی پان بنا رہی ہیں۔ دیسی پان لال لال صافیوں میں بیٹھے۔ سامنے دھرے ہیں۔ پان بن رہے ہیں۔ مذاق ہو رہا ہے۔ یار لوگوں نے پان لئے خود کھائے۔ دوسروں کو کھلائے۔ پیک تھوکی۔ آگے بڑھے۔ پھول والوں کی دوکانوں سے گجرے لئے۔ ہار لئے۔ ڈالے ساقی کے پاس ٹھیرے۔ دو دو تختہ کے مارے ایک دو پیسے دیئے۔ تختہ تم بڑھایا۔ ساقی کا رنگ ہی آج کچھ بنا ہے۔ تختہ کیا ہے ایک ہی ہے۔ کرنی گز بھر اور چار پھٹے اُس پر تانی بڑی چلم کو ڈیڑھ ہاتھ کا آئے۔ نئے ہے کہ یہاں سے وہاں تک چلی گئی ہے۔ نئے کو بچھانے کے لئے دی کھڑکیاں دے لکھی ہیں نئے پر فرش پڑھا ہے۔ اور مونڈھا اور چنبیلی کی لڑیاں لٹکی ہیں۔ گھونڈیوں کے اوپر روشنی کے چھوٹے چھوٹے گلاس لگے ہیں ساقی خود بھی سفید کپڑے پہنے سبز بنارسی سیلہ باندھے۔ لال پٹکا پیٹے۔ کھڑے تختہ چلا رہے ہیں۔ کوٹھے والوں کو بلا ناجو تو لے۔ سیدھی کرا دی

[illegible] بھی نہیں آ سکتے۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ خیر جو تھا سو تھا۔ اچھی گزر گئے۔ بہادر شاہ کے بیٹے مرزا شاہ رخ کا مزار باغ سے

بیچ میں ایک چبوترہ پر بنا ہوا ہے۔ اب یہ باغ کسی قدر چھدا ہو گیا ہے۔

لطف تو نہ ہے۔ اس سے تھہ ہوا۔ پھر تمت بن گیا۔ شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے ؎

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کے لگر　　خود لگے کہنے کہ پہلے حاشیہ پر تمت باندھ کر

انہوں نے بھی رو کش کھینچ لئے۔ ادھر کسی نے ہنسل پر چونچ رکھے اور انہوں نے شعر پڑھنے شروع کئے

حقہ جو ہے حضورِ معلّٰی کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

شام ہوتے ہوتے بازار اتنا بھرا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ تھالی بھیکر تو سڑکوں پر چلاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد ہی بھیڑ نے سے نفیری کی آواز آئی۔ پیسے پنکھا اُٹھا۔ سب ہر شخص ہے کہ بھرتا کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ جا رہے ہیں۔ کچھ واپس آ رہے ہیں۔ ریلے پر ریلا ٹوٹ رہا ہے۔ جو فاداد قسم والے ہیں وہ ان جھٹکوں کو سینہ اور پشت پر سہہ رہے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہیں وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں کہ آرے بھئی جانے بھی دو۔ کون اس بلا میں پڑے۔ آگے چل کر پنکھا دیکھ لیں گے۔"

پنکھا بھیڑ سے اُٹھا۔ شمس ۱۳ سے جوتا ہوا مہربلی کی سڑک پر آیا۔ یہاں پہلے ہی سے مشعلیں۔ لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں، فانوس اور دیوار گیریاں جل چکی تھیں۔ روشنی ایسی تھی گویا دن نکلا ہوا ہے۔ اب پنکھے کا جلوس بازار میں سے گذرنا شروع ہوا۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے اور پہلی پنکھے کے ہوئے سبز کرتے۔ بیس لگی ہوئی گول لال ٹوپیاں۔ کسی کے گلے میں ڈھول۔ کسی کے گلے میں تاشہ ہاتھوں میں چوب ہیں۔ ڈھول دھماں دھماں کرتا اس طرح گذرا کہ سب کے کان گھٹ کر دیئے۔ ان کے پیچھے دو جھنڈے زرد لفت کے چھریرے۔ بنفشی کے چھوٹے کلابتو کی ڈوریاں۔ جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لال ٹینیں۔ ایک لال ٹینی کے سرے پر سبز ہلال۔ دوسرے پر روپہلی چکر۔ ان کے بعد شرفا ملتی کو نوں کا گھوڑا۔ اردلی میں پولیس والوں کا رسالہ۔ اُن کے پیچھے نوبت خانے کا تخت۔ تخت کیا ہے خاصی بارہ دری ہے۔ تخت کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کر۔ اور پر کھپچیوں کا گنبد بنا۔ کپڑا منڈھ دیا لگا۔ کاغذوں کے پھولوں سے سجا۔ دروں میں گیندنی پردے ڈال۔ ڈوریوں سے کس دیئے۔ نوبت والے اندر جا بیٹھے۔ تخت کو کہاروں کو اٹھایا۔ دریہ خاصہ مکان کا سا ہلوں کے ساتھ چلنے لگا۔ نوبت خانہ کے پیچھے دلی کے اکھاڑے ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک ایک استاد۔ بیس بیس پچیس پچیس شاگرد بنے ہوئے تیار۔ جم۔ چوڑے چوڑے سینے۔ بھرے بھرے ڈنڈ۔ پھرن ہوئی مچھلیاں۔ بنلی پتلی کمریں۔ جسم پر شعشہ جانگئے۔ مچھ میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ۔ کوئی بینٹی کا چکر باندھ رہا ہے۔ کوئی لیزم ہلا رہا ہے۔ کوئی تلوار کے ہاتھ نکال رہا ہے کہیں پھری گتکا سے تعلیم جمع رہا ہے۔ کہیں بانک اور بنوٹ کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ غرض دور تک اکھاڑے ہی اکھاڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلی کے سقے سفید براق کپڑے پہنے۔ لال کمادے کی انگیاں کمر سے پیٹے سبز سیلے سروں پر باندھے۔ ہاتھوں میں مجھلے تجلے پیتل کے کمڑے لئے نفیری اور جوڑی کے ساتھ کمورروں کی آواز ملاتے پہنے آ رہے تھے۔ نفیری والوں کے بعد ڈنڈے والوں کی سنگینیں تھیں۔ ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے پندرہ بیس کا حلقہ۔ بیچ میں طلبہ سارنگی والے۔ تال سُر پر ڈنڈوں کی کھٹاکھٹ عجیب مزا دے رہی تھی۔ ان کے پیچھے تخت رواں۔ تختوں پر رنڈیاں بھاری بھاری پٹھوانیں پہنے۔ کارچوبی دوپٹے اوڑھے۔ پاؤں میں گھنگرو باندھے چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ ان کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا رسالہ۔ سُرخ بانات کی وردیاں، اُن میں سفید بانات کے کف اور کالر، شانوں پر فولادی جال، پاؤں میں کالی برجیس، ٹخنے کے اوپر چمڑے کے اونچے بوٹ، سر پر سُرخ مزرّا سے۔ ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے لئے گھوڑوں کی کنوتیاں ملائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ سواروں کے پیچھے شاہی روشن چوکی اور سیاہ زیں

ل (PATENTLEATHER) کو دلی میں ملک کہتے ہیں۔

ملازمان۔ سب کے صاف ستھرے کپڑے کارچوبی ٹوپیاں۔ مداخل کئے ہوئے نیچے چولی کے انگرکھے ایک بڑے یا تجامے۔ سلیم شاہی جوتیاں۔ ان کے کھیر بلٹی کی چار قطاریں۔ کم خواب گرد سے گوسے لٹکے سر پر دھانی منڈاسے۔ منڈاسوں پر چھوٹی چھوٹی کلغیاں۔ سبز اطلس کے کوٹ۔ سفید اطلس کی کسی ہوئی پھنسیں سیاہ پٹڑے کے انگریزی جوتے، ہاتھوں میں سبز چھریوں کے چھوٹے چھوٹے نیزے۔ بڑی آن بان سے قدم سے چل رہے ہیں۔ ان کے پیچھے ولی کے شرفاء اور عمائد کا ہجوم۔ نیچی نیچی قبائیں اور پھندنے۔ ہندوؤں کے سروں پر چھوٹی چھوٹی گندی پگڑیاں۔ مسلمانوں کے سروں پر زعفرانی عمامے اور چوگوشیہ ٹوپیاں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگ کی چھڑیاں۔ بشاش بشاش چہرے۔ گلے میں پھولوں کے گجرے۔ ہاتھوں میں موسمی کی لڑیاں۔ موسم کا لطف اٹھاتے۔ میلہ کی رونق بڑھاتے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ ان کے بعد شاہی شہنائی نوازوں کا گروہ۔ شہنائی کے کمال دکھاتا۔ موسم کی چیزیں بجاتا تو کبھی اپنے کمال کے مزے اٹھاتا، پنکھے کے ساتھ ساتھ ہے۔ سب سے آخر میں پنکھا اور پنکھے کے پیچھے پھولوں والوں کا غول۔

بھلا اس جلوس کو دیکھ اور پنکھے کو کھجور پانس کی کھپچیوں کا بڑا سا پنکھا بنا بیچ چوراہے آئینے لگا چھوں سے سجا ایک لمبے رنگین بانس پر لٹکا دیا تھا۔ یہ پنکھا نہ تھا بلکہ جوش محبت اور والہانہ عقیدت کا نشان تھا جس نے بچے بوڑھے، بڑوں، بچوں، ہندو، مسلمانوں، اعزہ، امراء خواص ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ ہر خود بادشاہ کو قلعہ سے نکال ہمرولی میں لے آیا تھا یہ پنکھا نہ تھا۔ بلکہ عقیدت اور محبت کے مظاہروں کا مرکز تھا۔ اور ہمرولی نہ تھی۔ بلکہ قلعی تھا جس میں خود بادشاہ شمع تھے اور رعایا ان کے پروانے۔

غرض خلقت کا یہ ہجوم پھولا پھلا جس کے پنکھے جھلتا۔ آہستہ آہستہ ہمرولی کی سڑک پر سے گزرا۔ باجہ والے اور لفنگری والے ہر کوہ کے سامنے ٹھیرتے۔ ایک آدھ چیز سناتے۔ انعام لیتے اور آگے بڑھتے۔ بڑھتے بڑھتے یہ جلوس شاہی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ بادشاہ وقت اوپر کی بارہ دری میں برآمد ہوئے۔ بیگمات کے لئے چلمنیں پڑ گئیں۔ اب ساری بھیڑ سمٹ سمٹا کر باب ظفر کے سامنے آگئی۔ یہ جا ٹھہر کے سامنے بڑا کھلا میدان تھا۔ یہاں باجہ والوں نے اپنے کمال دکھائے۔ اکھاڑے والوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ سقوں نے کٹورے بجائے۔ ٹھٹھے والوں نے اپنے ہاتھ دکھائے۔ رنڈیوں نے اپنا ناچ دکھایا۔ سب کو حسب مراتب انعام ملا۔ کسی کو صلا ملا۔ کسی کو دوشالا ملا۔ کسی کو شال ملی۔ کسی کو کڑے ملے۔ اتنے میں پنکھا بھی سامنے آگیا۔ شہر کے شرفاء اور امراء بجا بجا لائے۔ اوپر سے سارے مجمع پر گلاب پاشوں سے گلاب اور کیوڑہ چھڑکا گیا۔ جھلا دیا۔ سے توضیع کی گئی۔ بادشاہ کے اشارہ کرتے ہی ولی عہد بہادر نیچے اُتر آئے۔ لوگوں کے گلے میں پھولوں کے گجرے ڈال کر تہنیت کیا۔ یہاں سے سلاطین زادے اور شہزادے بھی جلوس کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ پنکھا جوگ مایا جی پہنچ گیا یہ مندر قطب صاحب کی لاٹھ سے کوئی دو ڈھائی سو قدم پر ہے۔ بڑی لمبی چوڑی دیواری ہے۔ کوٹوں پر برجیاں ہیں۔ احاطہ کے اندر ۲۰-۲۲ عمارتیں اور بیچ میں دیوی کا استھان ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی کشن جی کی بہن تھیں یہ بچپن ہی کر الوپ ہو گئیں۔ اور یہاں آن پڑیں۔ جب پنکھا نے مندر جا دیا۔ مندر زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ پھول والوں کی سیر شروع ہوئی تو اکبر شاہ ثانی کے ایما سے لالہ سیڈومل نے نیا

شرفاء دلی کے لڑکوں اور کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی یہ فوج بادشاہ نے بنائی تھی۔ جتنے تولڑکے مگر خدمت میں بلائے کے نیچے سب ڈھیر ہو گئے۔ ان کے قصے دلی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے ہماری ہوئی فوج تھی شاید اس لئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔

دلی کا شاہی رنگ سبز تھا۔

مندر بنوایا۔ رفتہ رفتہ اور عمارتیں بھی اندر بن گئیں۔ اب یہ خاصی آباد جگہ ہو گئی ہے۔ اس مندر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر پنکھا یا چپلی نہیں جا سکتی۔

کوئی ایک بجے لوگ پنکھا چڑھا کر واپس ہوئے۔ دوسرے دن درگاہ شریف کا پنکھا بھی اسی دھوم دھام سے اٹھا۔ باب خلد کے سامنے اکٹھا ہوا۔ بعض معاصروں نے کوشش کی کہ بادشاہ سلامت کو بھی پنکھے کے ساتھ درگاہ شریف میں کسی نہ کسی طرح لے چلیں۔ مگر بادشاہ کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوتے۔ کہا "اماں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب میں جوگ مایا بی کے پنکھے کے ساتھ نہیں گیا تو اب اس پنکھے کے ساتھ کیسے جاؤں۔ تمہارے بھائی کیا خیال کریں گے۔ مسلمان تھا۔ مسلمانوں کے پنکھے میں شریک ہو گیا۔ ہم کو خبر نہ ہوئی۔ اس لئے جھروکوں سے نیچے بھی نہیں آیا۔ تا۔ اماں، نا جیسا ایک کے ساتھ کرنا ویسا دوسرے کے ساتھ کرنا۔ شہزادے پہلے بھی گئے تھے اب بھی جائیں گے۔ آتشبازی میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے ہیں وہاں ہم بھی چلیں گے۔"

خیر درگاہ شریف تو قریب ہی تھی۔ لوگ دس بجے پنکھا چڑھا کر فارغ ہو گئے اور یہاں سے نکل سیدھے شمسی تالاب پہنچے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ سلامت کی سواری بھی آ گئی۔ بیگمات کے لئے جہاز پہلے ہی پڑ گئیں۔ اور اندر جا بیٹھیں۔ بادشاہ سلامت نے مہتابی پر جلوس کیا۔ معاصبوں اور دہلی کے اکثر امراء و فرماء کو اوپر بلا لیا گیا۔ سارے سیلانی تالاب کے کنارے جم گئے۔ تالاب میں سینکڑوں کشتیاں، بجرے اور نوڈونے پہلے ہی سے پڑ گئے تھے۔ آدھ دن شاہی آتش باز سوار ہو کر ایک طرف چلے گئے باقی میں دہلی کے آتشباز اور شوقین بیٹھ کر دوسری طرف گئے۔ بادشاہ سلامت کا آنا تھا کہ دونوں پارٹیاں مقابلہ کو تیار ہو گئیں۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ جہاز پر مہتابی چھٹی۔ مہتابی کا چھٹنا تھا کہ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے غبارے چھوڑے

لہ میں نے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ بادشاہ کو آتش بازی کا بڑا شوق تھا۔ آتش باز نوکر تھے۔ کوئی میلہ نہ تھا جس میں قلعہ سے آتش بازی نہ جاتی ہو۔ دہلی والوں سے مقابلے ہوتے تھے۔ ان مقابلوں کے دو بڑے میدان تھے ایک شمسی تالاب۔ دوسرے سید حسن رسول نما کا حوض۔ پھول کی سیر میں تو اب آتشبازی نہیں چھٹتی۔ ہاں سید حسن رسول نما میں اب بھی خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ ان بزرگوں کے بیان کی تائید اب ایک کتاب سے بھی ہو گئی۔ اب حال میں مسٹر ایڈورڈ روزنے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اور دہلی کے بڈھوں بڈھوں سے پوچھ پوچھ کر خود سے پہلے کے حالات جمع کئے ہیں۔ اس میں بادشاہ کے اس شوق کا بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ دہلی والوں میں کیا تعلقات تھے اور کس طرح ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ صاحب لکھتے ہیں کہ جس بڈھے سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو یا مسلمان اس کی آنکھ ڈبڈبا آئی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا قصہ بیان کر رہا ہے۔ بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی ۱۹۱۵ء میں ڈبلیو ایڈورڈ سنز ایڈیٹڈ کیمبرج نے چھاپی ہے اور ساڑھے سات روپے قیمت ہے۔

لہ یہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی ہے۔ آپ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ سلطان شمس الدین التمش کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ آپ کا وصال قوالی میں اس شعر پر ہوا ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر است

دہلی کے بادشاہوں نے آپ کے مزار کے گرد سنگ مرمر کی جالیاں، فرش اور دروازے بنوائے۔ دیواروں پر کاشانی ٹائلوں کا کام کرایا۔ آس پاس مسجدیں اور مجرے تعمیر کرائے۔ خود مزار شریف تو کچی تھی کا ہے۔ ہاں آس پاس دوسروں کی قبروں کے پکے زیادہ تر سنگ مرمر

گئے۔ صدف اسی دیر میں آسمان پر ستاروں، چاند اور سورج نکل آئے۔ ان سے فراغت ہوئی تو جگنو آتشبازی کا منیجر آیا۔ ہوائیاں۔ پھلجھڑیاں[1] اور پٹاخے[2] لے گئے۔ ہوائیوں کی شمالی سائیں۔ پھلجھڑیوں کی خانیں خانیں۔ ٹھوؤں کی دھمائیں دھمائیں۔ چھتوں کی زمائیں زمائیں اور قلموں کی سائیں سائیں سے بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ٹیمی جنگ ہو رہی ہے۔ ادھر آسمان پر مقابلہ ہو رہا تھا، ادھر پانی پر آتشبازی کے بجرے چھوٹے۔ بجرے کیا تھے چھوٹے چھوٹے جہاز تھے۔ توپوں کی جنگ مہتابیاں اور چھچھوندریں۔ لوگوں کی جنگ چکر اور چھتے۔ مستولوں کی جگہ انار۔ آدمیوں کی جگہ۔ مٹی کے سپاہی۔ پیٹ میں بارود۔ ناف میں چھچھوندر[3]۔ اس سرے سے اُس سرے تک شعلہ کا سلسلہ۔ ادھر سے دوستی والوں کے بجرے گئے۔ اُدھر سے قلعہ والوں کے۔ درمیانے تالاب میں پہنچ کر دونوں دھوں دھار چلنے لگی سمندروں کی لڑائی کا مزا آگیا۔ آتشبازی کی چمک سے سارا تالاب اور کنارے روشن ہو جاتے تھے۔ اور پانی میں روشنی کے عکس کشتیوں کے سائے۔ آتشبازوں کے ننگے جسم۔ کناروں پر مخلوق کے ہجوم اُن کے خفیف آتشبازی کے شعلوں سے ان کے زرد زرد چہروں اور اوپر دھوؤں کے بادلوں نے ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی ہمتا بیاں۔ آتشبازیوں۔ اناروں۔ سہروں۔ جائی جوئیوں۔ جست بھیدیوں[4]۔ رنجیشوں کا مقابلہ شروع ہوا۔ اور یہ آہستہ آہستہ دونوں طرف کی کشتیاں سمٹ کر بالکل سامنے آگئیں۔ یہاں استادوں نے اپنے ہنر کے کمال دکھلائے۔ فسری چھوڑی دانی کو لوٹ کر صد سو دفعہ اُٹھے اور رہ رہ کر سانس لے۔ بتاش۔ انار ایسے کہ کئی کئی گز اونچے جائیں اور پھر نکلی پھول بن۔ اور پھر یہ مزا کہ نیچے پھچھو[5] کیا مجال جو چوکے گئے۔ بڑے انار جو اُٹھے تو جہاز سے اونچے نکل گئے۔ بس معلوم ہوتا تھا کہ سر کے اوپر تھوں کو آگ لگا کر کشتیوں میں

---

[1] یہ سب نقشے علیحدہ علیحدہ مرد کے لئے ہیں۔ ایک طرف سنگ مرمر کی مسجد تھی ہے اور اس کے پہلو میں آخری بادشاہ دہلی کے مزار پر چراغ میں شاہ عالم ثانی کا ہے۔ اور اس کے ایک طرف اکبر بادشاہ ثانی کی قبر۔ ایک پہلو خالی تھا اس میں بہادر شاہ نے اپنا سرہانہ بنوایا تھا۔ کہیں ٹھاکر مرنے کے بعد باپ دادا کے پہلو میں جا پڑیں۔ یہ کیا معلوم تھا کہ وہاں قبر بننے کی جہاں بزرگوں کا پہلو تو کوئی نام پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔

[2] دلی والوں نے آتشبازی کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک جنگی دوسرے کارخانہ۔ ان دونوں کا مطلب آگے آپ خود سمجھ جائیں گے۔

[3] بڑے بڑی انار کو دلی میں ہوائی کہتے ہیں۔

[4] موٹے کاغذ یا بانسوں کی پتلی پتلی پٹریوں پر آتشیں پیٹ اوپر سے جھلی چڑھا اور اندر خوب خشونس ٹھونس کے بارود بھر کر چھکڑ سا بنایا جاتا ہے۔ اس کا چلانا دانتی پر کا ہے۔ بارود کو آگ دے۔ اُس کو ٹانا شروع کیا۔ جب زور پکڑ گیا تو چھلا کر دیا چکڑے کر دور پھینک دیا۔ اب بانس کی یہ آدھ گز لمبی پوری خالی خانہ کر اس زور سے جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اگر پھینکنے میں کہیں ہاتھ نچا رہ گیا اور یہ پوری تماشائیوں میں گھس گئی تو کچھ کر قیامت آگئی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا منہ جھلس گیا۔ کسی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ غرض یہ آتشبازی کیا ہے ایک بلا ہے۔

[5] مٹی کے چھوٹے چھوٹے اور ہلکے گولے بناتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ ایک طرف چھید کیا اور بارود بھر دی۔ چھید میں چھوٹی سی چھچھوندر لگا دی۔ بھاتے وقت چھچھوندر میں آگ لگا۔ شرکو اوپر پھینکا۔ اندر کی بارود نے آگ لی اور لٹو بیٹھا۔ اس زور کی آواز ہوتی ہے جیسے توپ چل گئی۔

[6] نوشادر کو دلی والے خشک کہتے ہیں۔ یہ چیز ایسی عام ہے کہ کسی نوٹ کی ضرورت نہیں۔

[7] اس چھچھوندر کو قلم کہتے ہیں۔ اس کی بارود اتنی تیز ہوتی ہے کہ زمین پر لوٹنا جانتی ہی نہیں۔ پانی کی چوٹ کھا کر بھی اٹھتی ہے تو بھیں بھیں کرتی دنیا اڑ جاتی ہے۔

کھڑا کر دیا ہے۔ اوپر ان میں سے رنگ برنگی پھول جھڑ رہے ہیں۔ دم آشا کہ ختم ہوتا ہی نہ جانیں کمال یہ کہ پڑے پر دھیمے دھیمے آتشبازی کی روشنی سے تو یہ نظر آتا تھا کہ سارے کا سارا پانی سونے کا ہو گیا ہے اور اس کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے تالاب میں آتشیں باغ لگا دیا ہے۔

ناخن دو بجے کے قریب آتشبازی ختم ہوئی۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے مثال و رشالے، مندیلیں اور سلے تقسیم ہوئے۔ کہیں تین بجے جا کر لوگوں کو فرصت ہوئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا پڑے۔ بادشاہ سلامت کی سواری رات ہی کو قطب سے نکل گئی۔ اور دوشنبہ چراغ دلی ہوتی ہوئی تیسرے پہر تک دہلی آ گئی۔ دوسرے دن لوگوں نے صبح ہی صبح اٹھ کر میرے مٹھائیاں پھاٹے۔ چھلکے اور کھلونے خود بخود ٹھنڈے ٹھنڈے نکل اپنے گھروں کا راستہ لیا۔ شام تک ہر ولی مسلمان اور دہلی آباد ہو گئی۔

دیکھا یارو آپ نے پھول والوں کی سیر کا مزا۔ اور اب کی کیا پوچھتے ہو خدا رہا۔ دہلی تباہ ہو گئی۔ بادشاہ رنگون پہنچے۔ بندھی ٹوٹ گئی۔ تنخواہیں بھی گئیں۔ بندھی اب بھی ہے مگر وہ محبت کا بندھن تھا۔ یہ تو لون کا بندھن ہے۔ خدا کچھ بات ہوتی اور چل جیا عدالت میں۔ بس یہ ہے کہ پھول والوں کی سیر رعایا کی عقیدت اور بادشاہ کی محبت کا مظاہرہ تھی۔ بادشاہ کے بعد بھی چلی۔ مگر مرکز اور ایک ہستی نہ ہونے سے رفتہ رفتہ گھٹتی گئی۔ اب پانچ چھ برس سے بالکل نہیں۔ اگر کہیں لیل و نہار میں اور دلوں کی کدورت کا بھی حال۔ ہا تو ہمیشہ کے لئے اس کو بند ہی سمجھو۔

اب ہم نشیں میں رو دُو کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے بکھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

مضمون ختم ہو گیا۔ چھپنے کے بعد ہر شخص کے دل میں خیال پیدا ہوا ہو گا کہ یہ واقعات ہیں یا کوئی من گھڑت قصہ۔ اس کے متعلق یہ چند باتوں کی وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس مضمون میں جس قدر تاریخی واقعات ہیں، کتابوں کے نقشے ہیں ان کی صحت میں تو کسی کو شک ہی نہیں سکتا۔ البتہ بقیہ واقعات کے متعلق دل میں وگدا پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ بچپنے اور ادھیڑوں کے واقعات کا حال میں نے ان بڑھیوں سے سنا ہے جو ان جلسوں میں شریک تھیں۔ اس زمانہ کی سیر دیکھنے والے اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔ وہ میرے ایک ایک حرف کی تائید کریں گے جلوس کی تصویر خود میں نے اپنے معتوری کے استاد کے ہاں دیکھی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ ان واقعات کو ملا کر ربط بھر دیا ہے۔ اب رہی گفتگو۔ تو وہ البتہ میرے خیال کا نتیجہ ہے۔ لیکن جو تعلقات اور محبت رعایا اور بادشاہ میں تھی اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس گفتگو کو بھی مبالغہ آمیز نہیں کہا جا سکتا۔ مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈروز کی کتاب "ذکا اللہ دہلوی اٹھ کر دیکھو" معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں نے اس بارے میں لکھا ہے وہ یقیناً ہے یا غلط۔ مسٹر اینڈروز میرے استاد تھے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ کس طرح بڈھے بڈھوں سے مل کر انہوں نے خدا سے پیار کے حالات دریافت کئے ہیں۔ اور خود ان پر اس تحقیقات کا کیا اثر ہوا ہے۔

لہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پرانی دہلی میں ہے۔ قطب سے ۵ میل اور دہلی سے کوئی ۵ میل۔ آپ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ ہیں اور دہلی سے آپ کو چراغ دہلی کا خطاب ملا تھا۔ جہاں آپ کا مزار ہے اس بستی کو اسی خطاب کی وجہ سے چراغ دہلی یا دوشنبہ چراغ دہلی کہنے لگے ہیں۔

لہ پھول والوں کی سیر کی دو ہی سواریاں تھیں۔ ایک پر اٹھے دوسرے چھلے۔ آتے اور گھر گھر بٹتے۔

اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۲۶۰ھ کا انتخاب کیوں کیا گیا اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے ۱۲۶۰ھ تک بہادر شاہ کی زندگی بہت پُرامن اور امن و امان سے گزری۔ اس کے سال جلوس سے اس بیچارے پر پے در پے مصیبتیں آنی شروع ہوئیں۔ ۱۲ بخت رشید کا انتقال ہوا مرزا شاہ رُخ مرزے مرزا فخرو جیل بسے۔ خود بادشاہ کو ڈبو دیا گیا۔ جوان بخت کی ولی عہدی کے بکھیڑے پڑے۔ قصہ مختصر یہ کہ مدتتک ان مصیبتوں نے بیچارے بڈھے بادشاہ کو بٹھا دیا اسی خیال سے میں نے وہ آخری سال لیا ہے جب بادشاہ ان تمام فکروں اور مصیبتوں سے آزاد تھے۔

بہرحال یہ بڈھوں کی دو بیت تھی جو میں نے آپ تک پہنچا دی۔ اب چاہے آپ اس کو قبول کریں یا نہ کریں۔

ارہر کا کھیت

رشید احمد صدیقی

"وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سلسلے منصبی فرائض، ہیجانی حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی تیز تند اور چیز جواب "رقص پروانہ" اور "برفشانی شمع" سے زیادہ گرمی محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صدا بلند ہے بار گشت میں جو ثانیاً سب سے پہلے کسی آدم کبیر الصورت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھیں۔ ہائڈ پارک کی خوش نما یا اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں لیکن ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واقعہ پر منتج ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز بنکھرسٹ کی پیشرو گذر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی آبادی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں ہوتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک فضلے کی حاجت کرتا ہے اور وہ سرا نان کو آپریشن۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا رکھوالا کھر آلود ہو کر کھیلنے گاتا ہے، گئے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے لگے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلے پر غور کر رہے ہیں یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور راحت ملے گی۔ ان کے مقابلے میں دن کی محنت ہر حیثیت سے دلآویز تھی اور دوسرے دن کی مشقت خوش آیند۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے، کسان کی بیوی، اس کے بچے بچیاں اور اس کا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لیے اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کے لیے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں، غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آج کل کے روشن خیال یہاں بیویوں سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں تو مسرور ہی!

لیکن وہ دیکھیے گا، گاؤں کے قریب والے کنویں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک بیل کا کھوکھلا پرانا درخت ہے، جیسے کوئی گمنام سالی دکٹوریہ کہ اس نے اپنا نام جس پر ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے جنگ عظیم کے اختتام پر پورے کے بعض فرمانروائے قسمت شاہِ زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ عورتوں کی کچھ تعداد جمع ہوئی۔ یہاں کچھ دیر تک ہیڈ نگ کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں، پُرشباب لیکن بے ملکنوں کی جگت پر ہنستیں، پاؤں پٹکتے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی اور بوڑھیاں کو دعوت ندید و عتاب دیتی ہوئی کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں، گالیاں دے رہی تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اسے میں ایک اور گروہ آ پہنچا، نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی و طراری سے اور بوڑھیوں نے کوسنے، گالیاں دکھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اب ہری قطاریں ایک دوسرے کے پیچھے یہ جمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ جمیں کو تولتے ہوئے نوجوان عورتیں اونچی آواز میں ہلکی سی چیخ اور جذبۂ قہقہہ کے ساتھ بیٹھتی جاتیں۔ بوڑھیوں کا فرض ڈگمگاتا تو زیبا اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسمی پاس کا ٹکا، لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت کی بیان سنتی۔ یہ ہم چلتے چلتے ایک تاریک ناقابلِ گذار، اندیشہ ناک اور خاردار سدّہ میں کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی تہذیب کے قلعے تھے۔

برسوں گذرے ہیں اسی دشت کی سیاحی میں
لیکن بعض نقاط جس کا شاید نام لینے سے گھبراتا ہوں ——— ارہر کا کھیت!

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے ہم چورن یاد رکھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا، انتظام اور تعزیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے مچھلے یا معلوم پتے سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کا "آرام جاں" اور "مونس قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لیے افغان و خیزاں یہاں تک پہنچا ہے اور کسی سے وعدۂ دیدار کے مرید کا قول و قرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے اور ۔۔۔ کسی کا "دھا کھو گیا ہے وہ بھی بھٹکتا ہوا پہنچا ہے۔ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کسی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں ماسکو ریڈیا جشن "نقاب پوشی" کیا تھا جس پر پورپ والے ناز کرتے ہیں اور کم رو ہنستے ہیں یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لیے موزوں ہے۔ مہابھارت اور ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں، ایسا مسئلہ ہے جس پر تاک بھوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور لگانا زیادہ ضروری ہے۔ ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانے میں اور ورنہ جیل خانے میں۔ جیل خانہ کا راستہ کھڑکا ارہر کے کھیت ہی سے گذرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گذرتے ہیں اور موٹر بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اس کے نوجوانوں نے اسراف شباب کے لیے شفاخانوں کو جیل خانوں پر ترجیح دی۔

زندگی کے آثار، اپریشن ہال کے مقابلے زیادہ جیل خانہ کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفاخانہ سے زندگی اور جیل خانہ سے موت گھبراتی ہے۔

شباب و مفلسی کا اجتماع آتشاہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتظار "وصل یار" اور "آمد یار" ہے دوسرے کا "دل تسکین دہ ہوش" ہے دوسرے کا؟

لیکن سسٹم فریفی ہندوستان کے مطالعہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتظام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بھولے سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے غیر ملتی ہے۔ کسی پچھڑے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا انبا کلا مرسنا۔

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمینیا اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حق و ناحق ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک حضوباتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کے لیے اس نے چوپائی اور اپالو تعمیر کیا ہے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے آج چوپائی اور اپالو دیا بڑھ جائیں تو وہ جلد سے جلد کوئی اور چوپائی اور اپالو تعمیر کرے گا۔ کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر اپالو اور چوپائی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر! چوپائی اور اپالو کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور سخن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں، جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے، دار و فہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے، پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے، رکھیا کے بچہ کیوں نہیں پیدا ہوتا اور رکھیا کو مل کیسے ٹھہرا، ایک نے کہا بھری گاتے کے بچھیا ہوگی دوسری بولی پھلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھڑا ہوگا۔ اس پر اختلاف آرا ہوا اور ہندوستانی

بیڈوں کی طرح دونوں بھولی گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

اندھیرے میں گالی گلوچ موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں اور دوسری کا ہاتھ، لعوق مفطان بعنت پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہوگیا۔ دونوں یک لخت اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ منیا کے لڑکے مکندیا کا کھیل تھا، مدتوں سے مکندیا کو ہائے دہل کو سنا، یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا، مکندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اقوال میں سے کسی کے اوپر جا گرا، دونوں چیخ پڑیں، منیا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ خشک ہمارت کا خیال رہا نہ تجاست کا، ایک غوغا طاری ہوا، بھگدڑ مچ گئی، کمپنیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد، عورتیں، بچے، گیدڑ، بھیڑیں، مدیر مرغی، بھولا، بن بلاؤ ——— گویا آبادی میں بم گرا۔

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں بحیثیت مجموعی کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والوں کے لیے اتنا ہی بصیرت افروز اور مجرب ہے جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والے کو ایک لاکھ برس قدیم آبنائی گینڈے کا ڈھانچا ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اس گذر جانے والے کو مخاطب کرنا اور بلا جھجک کرنا اس سے اظہار خلوص یا پرسش کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گذرا اور ہم نے مجھے حق بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آماوہ نقص امن ہیئے گویا اُردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لیے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک ہنستی گذرا اور ہم نے تمامی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا۔ کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہوگئی ہوگی۔ اس نے نہایت انکسار اور تشکرانہ انداز میں حامی بھری۔ ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آگیا، بولا میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہوگیا۔ (خوانچہ کے اندر جو ابھی سبزی بیچا ہوا تھا کچھ ٹوٹے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے۔ یہ لیجیے پریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی نے معلمین کے لیے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت، خوانچہ والے اور "پریلی کے تازہ امرود" کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے "حاجی بلغ العلیٰ" کچھ گنگناتے ہوئے اس طرح پھٹتے ہوئے نکلے گویا کلی اور دارجی کے علاوہ ہی عالم تمام سلفتہ دام خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلیٰ" اور فارسی "جریب رسیونی" ہے کچھ لوگ "سابقی دیوانہ ہمدرد" اور حال "ادا الجمو" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خشت الپنا پر" پر زور لگاتے رہے ان دنوں "نوائے مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنوں کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے۔ جلدی سناؤ جلدی۔ میں نے کہا کیا۔ فرمایا کوئی اچھا سا شعر ہیں نے کہا سنیے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لمحہ سے گزرنے ٹل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی!

گردن جھکا کر "بجلوہ ریزی" تکلم و "بہ پرفشانی" ریشیں اپنے سکوت کا ثبوت دیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتائیے تو مضمون لکھوں، فرمایا "ارہر کا کھیت"۔

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ سخن فہمی کی داد دوں؟ کس کو حاجی صاحب نے جناب "مکرمانہ" کے سر سے اٹھا کر مولانا کا تعین پر ڈال دیا۔ میں نے سہولت کی خاطر ان "قسمہا" بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان کے نام و نشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ مجھے امید ہے نیاز صاحب باب الاستفسار کے جس نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے مجھے اندیشہ ہے کہ باب الاستفسار اور جعفر زٹلی میں بھی کرانا کا تعین کے مانند مجھ سے کچھ غلط بیانی سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا کون نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنائیے گا؟ کہنے لگے جی نہیں وائس چانسلر صاحب نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنائیے گا ؎

تا کہ زور بازوے تیغ زن باقیست　　بگیر تیغ کہ آں حسرت کمن باقیست

فرمایا یہ کیا، میں نے کہا یہ یہ ہے ؎

من آں علم و ہنر را با پرکاہے نمی گیرم　　کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا "ارے میاں یہ سب تو ہوا اب کیا ہو۔ اچھا تم لے کلاس میں بیٹھ جاؤ، ذرا تمہارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا۔ فرمایا "اسلام علیکم!

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار۔

(۲) اگر عنوان برا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔

(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار۔

(۴) اگر کل برا ہے تو ناظرین ذمہ دار۔

خط و کتابت و ترسیل زر میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

الشذری

مرزا عظیم بیگ چغتائی

اگر ہمارے منہ سے نکل گیا کہ بھئی برار کے معاملہ میں انگریزوں نے حق و انصاف کے گلے پر چھری پھیر دی تو حضرت اس کے یہ معنی کہ ہر وقت برار کے پتھروں سے ہمارا سر پھوڑ جائے۔

(۱)

"یار یہ برا کیسے واپس ملے؟" یہ ایک سوال تھا جو بھائی شذری نے شاید صبح ناشتہ سے پہلے پہلے سترہ مرتبہ مجھ سے کیا۔

"دیکھو جی! میں نے تنگ آکر کہا" تم نے جو ہماری جان زیادہ کھائی اور یہ برار کا برا پھر ہمارے کانوں میں چلایا تو یاد رکھو مجھ سے کوئی

"نہ ہوگا؟ آپ خود خیال کیجیے کہ برار کے جھگڑوں کو نہ تو ہم سمجھیں نہ بوجھیں۔ رہ گیا انگریز دل پر غم و غصہ کا اظہار کرنا سو وہ کر چکے اور پھر بار بار

"کہہ چکے مگر اب کان ہیں کہ کھائے جا رہے ہیں۔ کہو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد کیا اگر حضرت عیسیٰ بھی آجائیں تو قوم انگریز تو نہ ماننے سے

"رہی۔ اچھی گرہ بندھ کر دے سا اور برار نہ دے مگر مصیبت در اصل اور تھی۔ وہ یہ کہ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں برار کی واپسی

"کی فکر سی کو ہوئی تو بس دو کو، ایک تو خود حضرت اقدس والا علی یعنی برار کے مالک کو اور دوسرے بھائی شذری کو۔ میری دانست میں

"تو اس بھائی شذری برار کے رہنے والے ہوتے یا نہ سہی یہ کم از کم انھوں نے برار کو دیکھا ہی ہوتا تو نہ معلوم کیا غضب کرتے۔

"غصہ لگے نہ ہوا میں (یعنی برار کا مالک) کچھ روز تک تو نقشے بنتے رہے اور یہاں دیکھنا پڑا اور بار بار دیکھنا پڑا کہ برار کا صوبہ مل کر

"سطح سے آسمنے کتنی ہو جائے گی۔ یہاں تک غنیمت تھا مگر صورت حال اب یہ پہنچی کہ علی گڈھ کے ایک بورڈنگ کے کمرہ میں بیٹھ کر

"برار کی واپسی کی کوشش ہونے لگی۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے صوبہ کی اتنے سے کمرہ میں بیٹھ کر جو واپسی کی کوشش کی جائے تو کیسی

"ہے ایسی کرے کی، رقبہ جمادات و حیوانات وغیرہ جو سلامت رہ جائے۔ کہے باشد اگر اس نے بھائی شذری کے خیال

"کے مطابق ذرا بھی ان کی رائے سے اختلاف کیا اور یہ ظاہر کیا کہ برار واپس نہیں ملے گا یا جد نہیں مل جائے گا تو بھائی شذری

"نے اس سے یہ سوچ کر جھگڑنا شروع کر دیا کہ یہ اوّل درجہ کا بدمعاش ہے اور ہو نہ ہو برار اسی کی جیب میں ہے اور ابھی ابھی یہیں

"ہیں اس سے دھروا لو مشتے نمونہ ..... ایک روز کا ذکر ہے کہ پھر برار کا قصہ درپیش تھا۔ چائے پی جا رہی تھی۔ ایک اور

صاحب بھی شریک تھے اور انھوں نے نہایت ہی متانت سے چائے کی پیالی میں تنکر ڈالتے ہوئے کہا "مشکل ہے برار کا واپس ملنا"

تو یوں کہیے۔" بھائی شندری نے کچھ بدک کر کہا۔" وہ کیسے۔ ذرا مجھے بھی تو بتائیے کہ آخر کیسے انگریز ہمارا حضور نظام کا نہیں صوبہ ہضم کریں گے۔" یہ کہیے۔" انھوں نے کہا ہضمہ کا یہ حال ہے کہ مصر اور قبرص ہضم نہیں کر سکے بلکہ پی گئے تو یہ بتا، کون تیز ہے۔" تن بدن میں بھائی شندری کے آگ ہی تو لگ گئی۔ دانت پیس کر اور منہ ٹیڑھا کر کے بولے "نہیں دیں گے نہیں دیں گے۔ ابھی ان کے تو دیں گے باپ ——— آپ ہیں گے آپ لیں گے؟" انھوں نے مسکرا کر کہا "جی آپ روک مجھے گا ..... آپ کا بس چلے تو روک ہی لیجیے گا۔"

"مذاق نہ شد حضرت! یہ مصر کا حلوا نہیں ہے یہ ہمارا حلق ہیں سے نکال لیا جائے گا حلق میں سے۔" بھائی شندری نے ہاتھ سے نکالنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا)

"اخاہ ———" وہ بولے "یہ کہیے یوں کہیے اب معلوم ہوا کہ حضور بھی کچھ ہلکے حیدرآباد سے معلوم ہوتا ہے پا گئے اور لگے ہیں پر بھبھنے۔"

ان کا یہ کہنا تھا کہ بس شندری آگ بگولہ ہو گئے۔ اوّل تو انھوں نے ان نام لوگوں کو ملاحیاں سنائیں جو حیدرآباد کے نمائندہ ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حق بجانب اور مستحق ہیں، اور پھر اس کے بعد انھوں نے وہ کہا یعنی یہ کہ ہمارا ان کی ہیبت میں ہے لے دے کر اک نتیجہ اس کا سوا ہے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ بات بڑھی اور پینی کے برتنوں کے لیے میز چھوٹی ثابت ہوئی۔ ہیں ہیں کہ کے بیچ بچاؤ کیا۔

آپ کہیں گے کہ تعلیم کے علمبردار، تہذیب یافتہ کالج کے طالب علم اور یہ ——— تو حضرت یہ زر زمین کے جھگڑے دراصل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کے چوتھے روز کا لطیفہ سنیے۔

(۲)

چودھری صاحب کہنے لگے "یار مرزا دیکھیے یہ حیدرآبادی کس قدر ملک کے غدار اور دشمن ہیں" یہ کہہ کر وہ تین حیدرآبادیوں کے قصے دکھائے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بھائی شندری غیر طور پر اس کی تحریک کر رہے تھے کہ تمام کالج کے لڑکے گروہ اور ہڑتال کی صورت میں واپسی برار کے معاملہ میں کالج کی تحریک کا جامہ پہنائیں اور سخت قسم کی ایجی ٹیشن پیدا کر کے ایک چٹپٹا سا جلسہ کر کے دھر لیں، تمام وائسرائے وغیرہ کو تار پہ تار تار پہ تار۔ اس تحریک سے حیدرآبادیوں نے اور دراصل ہر اس نے جس کے سر میں سر تھا کر دیں لینے سے انکار کر دیا اور دوں کو تو ٹالا بھائی شندری نے جنہیں میں مگر حیدرآبادیوں سے الجھ پڑے۔

دیر تک بڑبڑاتے رہے اور تجویز یہ تھی کہ ایک ورکنگ کمیٹی بنے اور لوگ جمع ہو کر تدبیریں کریں اور دستور ہے کہ ویسے کوئی جمع نہیں ہوتا۔ یعنی چائے بغیر۔ چنانچہ شام کے لیے بھائی شندری اس کا انتظام کر رہے تھے اور جناب اسی وجہ سے بھی مجبوراً برار کی واپسی کا خوش آیند اور خوش کن تذکرہ کم از کم آج کے لیے سننے کو تیار تھا۔

حیدرآبادیوں کے خلاف جب بخار نکال چکے تو میری طرح سے ٹھاٹھیوں اور پھلوں وغیرہ کی فہرست بنی کہ کتنی کون سی چیز لے ظاہر ہے کہ برار کی واپسی کے سلسلہ میں جب یہ تیاریاں ہوں تو بچے ولی سے کیوں نہ دو ایک پڑوسی بھی اس قومی خدمت میں حصہ لیں۔

غرض دو تین حضرات کے مشورہ سے کھانے پینے کی چیزیں تیار ہوئیں۔ بیرے کو بلا کر دو نوٹ دس دس روپیہ کے دیئے گئے کہ بازار سے سب چیزیں لا کر رکھ لینا۔ جب ہم کار کی سیر سے واپس آئیں تو سب موجود ہو۔

"کوئی چیز رہ تو نہیں گئی؟" ایک آخری نظر فہرست پر ڈالتے ہوئے چچا بھائی شندری نے بیرے کی طرف بڑھا دیا۔

"اصل چیز تو رہ ہی گئی۔" ایک صاحب نے پرچہ دیکھ کر کہا "واہ واہ" اور یہ کہہ کر قلم لے کر اس فہرست میں اضافہ کر دیا۔

"یعنی پانچ روپیہ کا بار اور بھی آئے گا۔"

بھائی شندری نے دیکھا اور اس مذاق پر خندہ فرمایا۔ قلم کی طرف بھائی شندری نے ہاتھ بڑھایا اور جب انھوں نے نہ دیا تو مسکرا کر ہاتھ جھٹک کر بولے:

"لاؤ جی قلم ادھر کاٹ دیں۔"

دوسرے صاحب بولے "واللہ کاٹ دو کاٹ دو ورنہ عجب نہیں یہ لے آئے۔"

اس پر اور تفریح رہی اور مذاق ہی مذاق میں پرچہ اسی طرح بیرے کو دے دیا گیا۔

"کیا فائدہ۔" بھائی شندری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے ہی اوّل نمبر کا گدھا ہے چکما تا پھرے گا پیسا خواہ مخواہ۔"

مگر پیسا چلا گیا۔ مذاق تو مذاق ہی ہے انہیں روپے سے اوپر کا سودا تو ویسے تھا۔ یہ پانچ روپیہ کا بار موقع اور مناسبت کے لحاظ سے منگایا جا رہا تھا۔ (سچ مچ نہیں)

(۳)

"برار آجائے قبضہ میں ..... ن ..... ن - ن - ن ..... وہاں بھی می می ہونیری شاہی" یہ مصرعہ اللہ کے فضل سے اکثر ہمارے کورے سے گونجتا رہتا تھا، رات کو، دوپہر کو، صبح و شام غرض وقت بے وقت یہ مصرعہ الاپا جاتا تھا۔ پھر نہانے میں تو اس کا الاپنا اس قدر لازمی تھا کہ بیان سے باہر، بدن پر تیزی سے صابن کیا بلکہ یہ کہیے کہ بھائی شندری یہی مصرعہ مل مل کے نہایا کرتے تھے۔ اس مصرعہ نے کیا یہ سر چھوٹوں کی تھی۔ ایک روز بھائی شندری نے جماہی لیتے ہیں اس مصرعہ کو بھی شروع کر دیا اوّل تو جماہی میں منہ پھاڑا ہوا مشکل سے کوئی جماہی اس مصرعہ کے بغیر لی جاتی تھی، پھر اس پر انگڑائی بھائی شندری کی شیریں نہیں بلکہ نمکین آواز کا وہ آفریں ترنم "نتیجہ یہ کہ" برار آجائے" تو صاف سنائی دیا اور اس کے بعد کا بقیہ حصہ جماہی کے تیز و تند طوفان اور حلقوم کے خوفناک بے ہنگام میں انگڑائی کی کھینچا تانی میں قلابازیاں کھاتا کچھ اس طرح ادا ہوا کہ واقعی معلوم ہو کہ کوئی کتا نہایت ہی کامیابی کے ساتھ خود تان سین سے درس لے رہا ہے۔ آپ جانیے کہ اچھے گانے والوں کے پڑوسی عموماً دشمن ہوتے ہیں۔ لہٰذا بابر والے کمرہ سے ایک پنجاب کی طرف کا موذی جس کے شاید معدہ کے بجائے بھی بھیڑہ تھا اس زور سے گرج کر بولا،

"مرکتے ..... ے ..... ا"

کوئی اور بڑے زور سے برآمدے سے پکارا "باندھو" جماہی کے سلسلہ میں بھائی شندری نے ایک انگڑائی بھی لی تھی۔ وہیں کے وہیں ہاتھ چھوڑ دیے اور ایک "ہڑپ" کے ساتھ منہ بند کر کے بولے "یہ کون ——— ؟" ..... مگر سناٹا ——— تیزی سے

باہر گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بحث و مباحثہ، قہقہوں کا شور برابر والے کمرے سے کچھ اس طرح بلند ہوا کہ جیسے معلوم ہو کہ دھما اور لٹھا ئی اور ہنسی مذاق سب کچھ مصنفین کے ایک وقت ایک ہی جگہ ہو رہا ہے۔

میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ طرفہ بحث بھائی شنذری نے چھیڑ رکھی ہے۔ وہ یہ کہ تاجدار دکن کی سخت توہین کی گئی۔ محض اس وجہ سے کہ مصرعہ خود حضرت واقف حال علی کی زود طبع کا نتیجہ ہے۔ ادھر سے یہ عذر تھا کہ یہ حضرت دکن کا کلام ہے اگر آپ خود اللہ میاں کا کلام اس طرح سے "روٹیں گے" تو ہم آپ کو بغیر بند ہوئے نہیں مانیں گے۔ کیوں؟ مبادا کہ آپ کاٹ کھائیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحث کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ صرف ایک اور وہ یہ کہ مخالفین بضد ہو جائیں اس بات پر کہ کسی طرح بھی بھائی شنذری ہمارے واپس نہ لے سکیں۔ مگر کسی نے کہا اور خوب کہا کہ ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

وہاں اکیلے دوکیلے پیمبری حضرت موسیٰ کو مل گئی تو کیا ہوا یہاں بھی تو اس سے کم واقعہ نہیں پیش آیا۔ یعنی یہ کہ ہیرا بازار سے ہیرا لے آیا اور وہ بھی قرض!

(۴)

میرے سید بھائی شنذری نے ایک اور کام کیا تھا وہ یہ کہ چند با اثر دوستوں کو علاوہ تحریری دعوت ناموں کے زبانی بھی دعوت دے آئیں۔ چنانچہ آخری گھنٹہ جو کالج کا ختم ہوا تو بھائی شنذری تو چلے کمرے کی طرف اور میں چلا اپنے کام پر۔ وہاں سے پھرتا ہوا واپس لوٹا پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں حشر ہے اور ہیرا کمرہ شاید ہیرلڈ۔ لڑکے کالج کے بجائے اپنے کمروں پر واپس جانے کے ہیرے کرے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ میں بھی دوڑا، ایک شور و غل ہنسی مذاق میں معلوم ہوا کہ بازار سے ہیرا برا لے آیا ہے۔ کمرہ کے دروازے پر پہنچا ہوں بھیڑ کو چیر کر تو تصدیق ہو گئی۔ ایک پورا صوبہ کا صوبہ اور وہ بھی ایک کمرے میں آ جائے تو کیا ہو!

میں کمرہ میں گھسا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کونہ میں ایک بڑے بھاری بورے میں برار رکھا ہے اور میرے کو بھائی شنذری ہاکی اسٹک سے بجا رہے ہیں۔ جوں توں کر کے ہیرے کو چھڑایا۔ وہ بھاگا غریب کمرے سے نکل کر۔

مگر انصاف سے دیکھیے اس غریب کی کیا خطا۔ ایک دفعہ نہیں کوئی دس مرتبہ پٹ چکا تھا اس بنا پر کہ جو چیزیں منگائی گئی تھیں ان میں سے کوئی چیز وام نہ ہونے کی وجہ سے نہ لا سکا۔ حکم تھا کہ لا دو کہیں سے، بازار گیا ایک سے نہیں بلکہ کئی آدمیوں سے پوچھ پوچھا یا اور سب نے کہا کہ ہاں ٹھیک تو ہے پانچ روپیہ کا برادہ منگوایا ہے۔ کیونکہ آپ یقین کریں کہ جس پرخط شکستہ میں لفظ برار اس طرح لکھا تھا "برادہ" یعنی بار کے آخری حرف "ر" والی کا دھوکہ ہوتا تھا اور آخری ڈیش ہ یعنی "ہ" یہ حرف "ہ" کا۔ چنانچہ جس طرح بھی اور جہاں سے بھی غریب سے بن پڑا پورے پونے تین روپیہ کا برادہ لیتا آیا اس سے زائد کہیں مل ہی نہ سکا ورنہ مار تو بڑی بلا ہے وہ پورے پانچ روپیہ کا لاتا۔

اس کے بعد کیا ہوا یہ کالج کے لڑکے ہی جانتے ہیں۔ جلسہ کا رنگ کیسا رہا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو اس معاملہ پر ہنستا منہ اور دوسری طرف سب کا یہ حال کہ لفظ برار کے ذہن میں آتے ہی بجائے صوبہ برار کے مُراد سے کا زبردست اور برا نقشوں کے سامنے پھر جاتا۔ نہایت ہی ناکامیاب ہیجنگ رہی۔ خیال یہ تھا کہ ورلنگ کیبنٹ مرتب ہو گی مگر نالائقوں نے پیٹ بھر کر عمدہ چیزیں کھانے کے بجائے یہ زیادہ پسند کیا کہ باہر جا کر پیٹ بھر کر ہنسیں کچھ نے یہ کوشش کی کہ ہنسی سے سیر ہو کر چہرہ کو سنجیدہ بنا کر واپس کمرے میں آئے مگر قدم رکھتے ہی پھر ہنسی نے غلبہ کیا اور پھر واپس۔ قصہ مختصر نہ تو ورکنگ کیبنٹ بنی اور نہ کچھ کام ہو سکا۔ ہاں دو چار سنجیدہ اصحاب سے اور بھائی شندری کی ٹھن گئی مگر ہمیں ان حادثات سے بھائی شندری کے ارادہ میں کمی ہونے والی تھی ہرگز نہیں بلکہ ج

صحنِ ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا

نتیجہ یہ کہ بھائی شندری کامیابی سے نزدیک تر آ گئے .....

سودیشی ریل

شوکت تھانوی

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر بندے سے ملازم نے کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو کبھی صنف ہے کہ ہاں سا چاہے جو حال بھی ہو بیمار ہوں کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ تھکا ماندا اور صراحیاں ایک دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ بھائی ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پہ گاڑھے کی گاندھی کیپ، داڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا، اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رخ تخت کی طرف۔ کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی کی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں، ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے، اس ایک بات یہ تھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اتنا زور لگن اور مجمع کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں کبھی نظم میں کبھی نثر میں کبھی ہنس کر کبھی رو کر کبھی ادھر مڑ کر، کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے:

"بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں ——— تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ بنیں ——— سرگرمیاں ——— اب تیار ہو جاؤ ——— ہوشیار رہو ——— کہ تم کو ——— ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے ——— اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے ——— (دوسری طرف گھوم گئے) خواب غفلت سے بیداری کا وقت ——— یہ ہے ——— اور وہاں تم ——— برٹش گورنمنٹ ——— سوراج سودیشی ——— چرخہ ——— کھدر ——— (تقریر کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹے میں ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق تھے کہ بھٹیارے خود دھکے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے دکان پر سے ٹھنڈے کا نچا لیا صراحیاں لئے پر لاہیں اور گھر پہنچ گئے۔ اسباب بندھا، کھانا کھایا، تھکے بھرا، آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاط شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

کچھ کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے۔ نہ بدیشی گارڈ ہوتا نہ فارن ڈرائیور، نہ مسافر انٹرین کا سیلون درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے چاہے ٹھرڈ میں بیٹھتے چاہے فرسٹ میں، ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ خود فرسٹ میں بیٹھتے اور اگر بزدن کو ٹھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ——— ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایک دم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں اور پھولوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ہلاتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گذر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا کہ "کیا سو رہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟" ہم نے پھر بڑا حیران ہو کر پھول کر کہا "سوراج؟" جواب ملا "ہاں سوراج سوراج!" ہم نے اپنے دل میں کہا کہ "واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج ملا ان لوگوں کو! ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔" پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر معمولی تھوڑی ہیں، ان کو ملا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر اتنا کمال ہوا کہ سوراج مل گیا۔ دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا۔ حالانکہ ابھی تک ہمارے حواس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دور ہوا اور بالکل آزادانہ و خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیے یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں اور ہم نے تو یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جب سے پہلا حملہ اسٹیشن پہنچ کر ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

"بابو جی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے "ایک بات سنو یہ یا یول ٹرین؟"

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا "جناب مجھے تین روپے ہوئے،

لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا:

"جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنہ تو کرایہ ہے آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیے ہے کانپور کا سیکنڈ کلاس۔"

بابو جی نے ذرا ترش رُو ہو کر جواب دیا:

"جناب والا! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیے مگر اسی کے تین روپے ہوتے کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجیے ورنہ جانے دیجیے۔"

میں: "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا؟"

بابو: "کل کی بات کل کے ساتھ، آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے۔"

میں: "یہ کہیے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجیے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

بابو: "لائیے۔ روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجیے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ و کٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی:

"سنیے تو جناب، ٹھہریے تو جناب، دیکھیے تو جناب، اچھا دو روپے دے دیجیے، آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ آنہ دیجیے ——— اب وہ بھی نہ دیجیے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے، لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔"

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو واہ رے کٹ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا "ایک روپیہ دیں گے، ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو۔"

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر اللہ کمال کیا انھوں نے کہ گردن ٹیڑھی کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے "لائیے صاحب لائیے، بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے۔"

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر "درجہ دوم کا پیسہ" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے۔ ہم نے ٹکٹ کو اِدھر سے دیکھا اُدھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی زود افتاد شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور تبسم ہو کر کہنے لگے:

"جناب والا! رات کو سوراجیہ ملی ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب، آپ تو سفر کیجیے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

شوکت تھانوی

باجو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر تاریخ ہے نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انھوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل نامعلوم ہوتا تھا کہ کوئی یا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا اٹھا پاند حکر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی گھڑیاں مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے قصبے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا تیلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں۔ مشکل تمام ایک قلی ملا لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا اس نے ہمیں چبھتی ہوئی جواب دیا:

"اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟"

ہم معاف کیجیے گا غلطی ہوئی" کہہ کر پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے۔ پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہوگا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کھینچ کھانچ کر اس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک صاحب بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینے سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو دوسرے ڈبہ میں تشریف فرما تھے۔ لیکن انھوں نے صرف یہ جواب دیا کہ "باقی تو بتا ہمکا نا ہیں معلوم" یہ خالص سودیشی ریل کے کنڈکٹر کے معزز پیسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوتے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چل جائے گی۔ ہمیں اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف" ہم نے گھبرا کر پوچھا:

"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟"

جواب ملا کہ "جب گاڑی لگ جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے"

ہم نے پھر پوچھا "لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا"

جواب ملا کہ ہو جایا کرے جب تک ریل نہ لگ جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل چھوڑ دی جائے؟

اب ہم بالکل راضی بہ رضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دعا تھی، اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ غرضیکہ کبھی اپنے ڈبہ میں جھانک کر کبھی لوٹے میں پانی ڈال کر کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حدِ نظر تک ٹٹولتے ہوئے کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گاڑی کی سوئی ہلی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بہ آواز بلند چیخنا شروع کیا "بیٹھنے والے مسافر بیٹھ گاڑی چھوٹتی ہے"

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہمارا عقل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لیے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی معمولی شخص نہ تھا بلکہ وہی اے۔ ٹمنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے۔ بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن مٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے ان سے ہم نے فاخرانہ کہا "ارے سیکنڈ کلاس ہے" اس پر سیکنڈ کلاس ہے بھائی سیکنڈ کلاس ہے۔ مگر انھوں نے ایک دہقانی اور یہی کہتے رہے "ہم جانت ہے ڈیڑھ ٹکا ہے، ہم مکس دیا ہے۔" خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پیسنجر فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً انہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے عرض کر دیا جس کا جواب انھوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا "بیٹھے جاؤ سب ہندوستانی برابر ہیں، سب بھائی ہیں، سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں کوئی کسی سے بڑا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جاؤ سب کو برابر کا سمجھو، جاؤ تشریف رکھیے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی"۔ ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ دیکھتے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے، وہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو بیٹھے کرنا چاہا کہ کھڑے کھڑے سفر ہوگا یا غسل خانہ میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پیسنجر فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ گاڑی بھی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دس منٹ نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آجائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے سفر کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا، گاڑی چھوٹتی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں وہ کون ساوقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگایا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیے جنھوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سن سن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیرپا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے مخرج جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف بھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔

ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں، میرا کیا قصور ہے۔

دو گھنٹہ سے ملتوفائر مین کو نکل لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا۔ دو چار پیسے کہ زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتا پیسے پیر اکیا قصور ہے۔"

گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کونکل کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بُری بات ہے کہ وہ بغیر کونکل کے چل ہی نہیں سکتا جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کونکل بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو فوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے مگر یہ آنا بھی نہیں دے سکتا۔ اب رہا یہ کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک ایندھن کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد ملتوفائر مین کونکل کی گٹھڑی لیے یہ کہتا ہوا آ پہنچا:

"آدھی رات کو کونکل منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر آٹا، ساکونکلہ تھا وہ بھی منگل کا نام ایک سو تیرہ آنہ میں طے ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ نام گنتے چل گئے کونکل وغیرہ دن سے منگا لیا کرو۔"

ڈرائیور نے جلدی سے کونکل ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی، گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا "روکو۔ روکو" گارڈ صاحب دیکھتے "گاڑی روکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی وہ فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب ڈرائیور سے جھلا چلا کر پوچھنا شروع کیا: "ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا" ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا: "لے لیا تھا ——— لے لیا تھا ——— گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا: "اچھا تو پھر ڈرو گاڑی ہیں سیٹی بجاتا ہوں" دھواں پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ پیسنجر ہے یا ایکسپریس، اس لیے کہ اس سے زیادہ تیز شاید خود نہ چل لیتے اور اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ عمر سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک ساتھی سفر سے پوچھا: "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس" وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے "غصہ تھم بہانا رار" بھڑک کر فرمانے لگے: "میاں خدا کا شکر کرو کہ یہ گاڑی ہی ہے تم میل ایکسپریس لیے پھرتے ہو" ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر جھنجھلانا شروع کیا کہ:

"جب تک میں نے مگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون سا تھا؟"

ڈرائیور: "جب آپ نے گاڑی آتے دیکھا تھی تو مگنل کیوں نہیں دیا؟"

اسٹیشن ماسٹر: "ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر آتی۔"

ڈرائیور: "دیکھیے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجیے، نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے جیسے ہم ان ہی کے نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے خوب کیا گاڑی لائے۔ اب اس عہدہ پر تو ہزار مرتبہ

دیں گے، دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر: "دیکھیے گارڈ صاحب منع کر لیجیے اس کو، کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں ہیں چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیتا ہوں۔"

گارڈ: "جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو، باتیں باتیں یہ کیا کرتے ہو، اماں تم ہی ہٹ جاؤ، بھائی تم ہی ہٹ جاؤ، ارے اسے چھوڑو بھی، ہٹو بھی، سنو تو سہی، ارے یار سنو تو۔"

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنا شروع کر دیے اور تمام مسافر یہ تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ بسنتی نام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور بجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بیچارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آکر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:

"گارڈ صاحب! اے گارڈ صاحب! اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پر آ رہی ہے غضب ہو گیا۔"

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کر دیا:

"مسافرو جلدی اترو، جلدی اترو، گاڑی ٹکراتی ہے، گاڑی ٹکراتی ہے جلدی اترو۔"

سب مسافر گھبرا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی بس کا ڈبہ چور ہو گیا۔ تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پر آ پڑا۔ میں ایک دم سے چونک پڑا۔ خفگی نے میرے منہ پر آ کر گرمی تھی۔ غصہ جل چکا تھا آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس لیے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

لندھن کا عنبابی دربار

ملّا رموزی

اے میلاد کی غزلوں پر رونے والو!

کیا تم نے سُنا ہے کہ مسیلمہ ایک دربار بڑی شان والا منعقد ہوا ہے شہر لندھن کے خاص واسطے رسم تاجپوشی بادشاہ کے مگر یہ کہ یہ ہے بے خبری تمھاری اے بے خبری حد سے گذری ہوئی پہ سبب اس کے کہ نہیں ہیں تعلیم پائے ہوئے بیچ ہندوستان کے مگر اوپر ایک سو کے چند۔

پس بیچ جس قوم کے ہوں لکھے پڑھے کہ وہ یا بھرتی ہوں گے بیچ فوج کے یا ملازمت کریں گے وہ ایسے ٹھیکیداروں کی کہ بنائی ہوئی عمارتیں ان کی نہیں زندہ رہتی ہیں مگر مسیلمہ ایک سال مگر یہ کہ اصل بے وقوف ہیں وہ جو بنواتے ہیں عمارتیں ایسے ٹھیکیداروں سے بے ہنر اور بے ایمان سے۔

پس جب سلسلہ کلام ہمارے کا پہنچا اوپر اس جگہ کے تو مشرف لائیں ہوئی نمبر ۲ ہماری سالمہ مہربانی بہت کے اور فرمایا کہ اے شوہر میرے ورا ذکر کرے خدا عمر اور تندرستی آپ کی اور مسٹر لائڈ جارج شاگرد خدیم آپ کے کی کیا ہوگیا ہے آپ کو کہ اوپر ٹھیکہ داروں اس زمانہ کے کے غصہ ہو رہے ہیں آپ درآں حالیکہ جانتے ہیں آپ کہ بیچ اس زمانہ ہذا کے نہیں ہوتے تعلیم یافتہ مگر علم والے جبکہ بیچ زمانہ طالب علمی کے پڑھائے جاتے ہیں مضامین کثرت سے تا دماغ خراب ہو جائے طالب علم ہندوستانی پس خواہ مخواہ کہ بیچ ایک وقت کے پڑھتے ہیں دس مضامین اور بولہ کتابیں تو کیا خاک باخبر اور صاحب کمال ہوں گے وہ بیچ اب فن کے، پس جب یہ حال ہو نصاب تعلیم کا تو کیونکر محنتی اور جانکاش ہوں نوجوان اس زمانہ ہذا کے، راستہ بتا دے اللہ ملانوں کو اسے راستہ اجمیر شریف کا اگر نہیں ہوتی دلچسپی ان کو معاملوں سیاسی سے اور ترک کرا دے اللہ عادت حفظ نوشتی کی ملانوں پنجاب کے سے اور محفوظ رکھے اللہ باشندوں چین اور ارکان جمعیۃ اقوام کو افیون اور گانجے سے کہ تحقیق محال ہے یہ کہ بھر بادشاہوں ہیلا سلاسی حبشہ کے کہ تحقیق ہے یہ مقولہ حکیموں ایران کے کا واسطے ایسوں کے کہ کہا ہے ؎

"جو کہ شمشیر مارتا ہے مگر سانڈھنی اسکے کرتے ہیں"

پس داد دیجیے ترجمہ اس مصرعہ کے کی مجھ کو! اے شوہر میرے! پھر فرمایا کہ تحقیق ہو جھگڑا کرو سالمہ شیعوں اور سُنیوں لکھنؤ شریف لے ہوا ہے اعظم گھاٹ سے اوپر اس کے کہ تحقیق مسلمان رہ گئے ہیں اب بیچ دنیا کے خاص واسطے تباہی کے بہ سبب بیچ تعلیمات

مذہب اپنے کے، پس جس نے کہ زوری اختیار کی اصول مذہبی اپنے سے وہ رانڈا جاتے گا اے بھٹکے گا وہ بھی گمراہ ہوگا صرف سے اچھی اور کامیاب زندگی کے گمراے عجیب وہ گھڑی محبت کی بڑھانے والی کہ جب تشریف لائیں بیوی نمبر ۲ ہماری سالہ محبت ایسی کے کہ نثار ہوں اس پر شہر گلگتہ اور مدہی اور باتیں کیں انھوں نے اسے باتیں اوپر والی تو کہا ہم نے کہ اے بیوی نمبر ۲ ہماری تحقیق ربا ہوں اوپر وفاداری تیری کے چالیس خوانے اور قربان ہوں اوپر وفاداری ہماری کے چالیس اونٹ طرابلس کے گمراے عجیب اطراس کہ لڑے تھے کبھی واسطے حفاظت اس کی کے حضرت شیخ سنوسی رحمت خدا کی اوپر ان کے مگر عجب کہ آج قابض ہے ملک اٹلی اوپر طرابلس کے بہ سبب حقہ نوشی اور باہمی عداوت مسلمانوں کی کے جو ہے بہ سبب جہالت کے، پس بیچ جس شہر کے ہوں مقدمہ بازیاں بھی ہوں سڑکیں خراب اور گلیاں گندی جس شہر کی مان تو اور جان تو اے عزیز بیوی ہماری کہ نہیں منہ فراغت کا دیکھیں گے باشندے اس شہر کے، بھی جہاں طلاق لیتی ہوں عورتیں زیادہ اور طلاق دیتے ہوں مرد زیادہ اور شادیاں ہوتی ہوں بے مرضی معلوم کیے دلہنوں کی، تو تحقیق آوارگی اور افلاس بڑھے گا بیچ ایسے شہروں کے، بھی باشندے جس ملک اور شہر کے بیٹھے رہتے ہوں اوپر دکانوں کے بیکار تو قسمہ ہے امرت دھارا اور سوڈا واٹر کی کہ نیلام ہوگا جلد وہ شہر بہ سبب آوارگی باشندوں اپنے کی کے، بھی اسی طرح جب جمع شوق لوگوں کا واسطے قوالی اور گانے کے، بھی بڑھ جائے شوق خریداری زیور کا بیچ عورتوں کے اور بوڑھے ہونے لگیں لوگ بیچ عمر ۴۰ سال کے تو مت گمان لے جا کہ راستہ کامیابی کا پاتیں گے وہ کیونکہ بالبتہ تحقیق آیا ہے بیچ کتابوں بڑی کے یہ کہ باشندے جس ملک کے قناعت اختیار کرتے ہوں اوپر وال روٹی کے تحقیق ہیں وہ مارے ہوئے سستی اور جہالت کے، پس چاہیے راستبانا ان کو طرف تعلیم کے، مگر اے عجب وہ بڈ قوم کے کہ نہیں ہے لیاقت اندر ان کے لیڈری کی، مگر یہ گذر رہبر کرتے ہیں وہ اوپر لیڈری کے، مگر بالکے تو کہ ہیں وہ تاجر قوم کے اور مال تجارت ان کا ہے قوم بے وقوف۔

پس اما بعد، جب سلسلہ کلام کا اوپر اس جگہ کے پہنچا تو طعن وطنز کیا ہم نے اوپر ان ایڈیٹروں اخباروں اُردو کے کہ جو بیٹھے ہیں گوئی کر رہے ہیں برسوں سے عالمگیر جنگ کی، خاص کی گئی جنگ ہسپانیہ کہ کہتے تھے وہ کہ تحقیق جنگ ہسپانیہ سے ہوگی شروع لڑائی بڑی مگر نہ ہوئی وہ موافق دلایل ہم ملا رموزی صاحب کے تو تحقیق سنہ ان کا فوت ہوگیا، پھر کہا ہم نے کہ درازکرے اللہ بالوں سر تیرے کے کو اے بیوی نمبر ۲ ہماری اور توفیق زیادہ وفاداری سے دے تجھ کو واسطے ہمارے کہ تحقیق اوپر فقط وفاداری تیری کے ہو رہی ہے شاعری ہماری، اگرچہ بہت دن گذرے کہ نہ غزل کہی اوپر ہندوستان کے سر مائیکل اوڈوائر نے بھی نہیں چھوڑتے پھچھاڑ دیا نہیں کا مولانا ظفر علی خاں ہمیشہ ہو جیسا اخبار "زمیندار" ان کا کہ تحقیق ذریعہ اس اخبار تذکرہ کیے گئے کے پہلا شوق سیاست کا بیچ مسلمانوں بے خبر کے، مرغ بازی سکھا دے اللہ سوئیمی کو اور کبوتر بازی ہر مٹیلر کو بدلے شوق جنگلی ان کے کے، بھی توفیق دے اللہ بجلی والوں کو تا بمبلغ چار پنکھے بجلی کے دیں وہ واسطے دولت خانہ ہمارے کے بیچ اس زمانہ کمی سخت کے، نا سکیں ہم لکھنا مضامین عمدہ کا موافق حق محدگی ان کی کے، مگر بات کاٹی ہماری بیوی نمبر ایک ہماری نے اور کہا کہ اے شوہر میرے اور بیوی نمبر ۲ اپنی کے ہرگز گمان مت لے جاؤ اوپر مسلمانوں کے کہ قدر پہچانیں گے وہ آپ کی اور دیں گے وہ پنکھا بجلی کا آپ کو مگر یہ کہ ساتھ قوت بازو اپنے کے لاؤ تم، تو آفرین بہت کہی ہم نے اوپر خودداری بیوی نمبر ایک اپنی کی کے اور کہا کہ تحقیق عورتیں جس گھرانے کی ہوں گی خوددار تو تحقیق محفوظ رکھے گا اللہ اس گھرانے کو فضولیوں مغربی تمدن کی سے، مگر

عجیب بے وقوف وہ عورتیں کہ ہو کر کم آمدنی خرچ کرتی ہیں وہ زیادہ اور پر لباس قیمتی اپنے کے بھی اور پر لباس قیمتی اولاد اپنی کے بھی اور پر تفریح سینما کے بھی اور پر گھانے لذیذ کے بے خبر تنگدستی اور قرضداری سے پس مثل تو کان دھر نہیں حکمت کی اے عورت اگر ہے تو عقل کی رکھنے والی کہ جو قوم کہ جاہل رکھے گی وہ عورتوں اپنی کو اور آزادی دے گی وہ قبل تعلیم کے، اے آزادی نامعقول تو خانہ تلاشی لے گی ایسے گھر افیوں کی پولیس بغیر وارنٹ کے کیونکہ موافق قول حکیم پزرجمہر کے رہ ان دنیا شادی یعنی طرافین کے مفید ہے اور دیسی لباس مفید ہے واسطے عورتوں ہندوستان کی کے بھی اختیار کرنا گھریلو صنعت کا مفید ہے بھی اور عورتی تعلیم و تربیت کا ہونا ایسا ہی ہے گویا کہ تو کہ بیچ بخارِ سخت کے ہذیان بک رہا ہے مریض بخار کا بھی اسی طرح نہ فائدہ دیں گے تو رسالے ادبی اردو کے کہ تحقیق بجز ہفوات و اہیات کے نہیں ہوتا اصل ادب بیچ ان کے مگر غزلیں مہمل اور افسانے اخلاق کے جلانے والے پس قسم ہے غزلوں رُلانے والی کی کہ حوالات میں بھیجے جائیں گے وہ شوہر نامہ کے لیے پردا رہتے ہیں وہ بیویاں اپنی سے بہ سبب نارضی اپنی کے بھی تکالیف پہنچاتے ہیں وہ بیویں اپنی کو بھی اسی طرح موڈرن ڈرامے تیار بتائے جائیں گے دن حشر کے وہ شوہر جو زیادہ رہتے ہیں بیچ گھر خسر اپنے کے، محفوظ رکھے اللہ ہر ہندوستانی کو غضب لاجواب اور سسرال اپنی سے اور پاک کرے اللہ اسے رہائی دے اللہ بہ نشوں خلاف شرع سے عورتوں اس زمانہ بد اکی کو کیونکہ شریک ہونا مسلمانوں کا بیچ کانگریس کے بغیر بصیرت سیاسی کے برابر ہے نہ شریک ہونے ان کے سے دور رکھے اللہ ہم کو اور بیوی نمبر ایک ہماری کو اعلاسول سے جس لے تو کو نسلوں کے سے اور گولیاں کو نہیں کی کھلانا رہے اللہ تعالیٰ خشک و اعظوں اور جاہل ریلاد خوانوں کو کہ تحقیق وجود ان کا بخار اور مراق ہے بیچ حق قوم مسلمانوں کی کے اور شوق دے اللہ ہند و مسلمانوں، دنیا نامہ کو اتحاد و اتفاق کا، بھی طاعون پھیلا دے اللہ بیچ لیڈروں کے تاکہ ہو جائے مقدار لیڈروں کی کہ کثرت لیڈروں کی سبب ہے تباہی قوم کا۔

پس بعد اس گفتگو کے مصروف ہو گئے ہم اور بیوی نمبر ہم ہماری بیچ تصاویر در بالندھن کے اب کیا کیا اشارے ہمارے جھٹلاؤ گے؟

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

کنہیا لال کپور

(دورِ جدید کے شعراء کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م۔ ن۔ راشد، میراجی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رفیق احمد خوگر، راجہ مہدی علی خاں، پروفیسر غبغبا احمد غبغبا، بکا جہیت ورما، مہابلی مگگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل و صورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں "دیوانِ عالب" کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں)

غالب : حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ بڑی مدت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر : یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب : رہنے بھی دیجیے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر : تشریف رکھیے گا۔ کہیے جنت میں خوب گذرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ——

غالب (مسکرا کر) : بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر : تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد، اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ۔ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.....

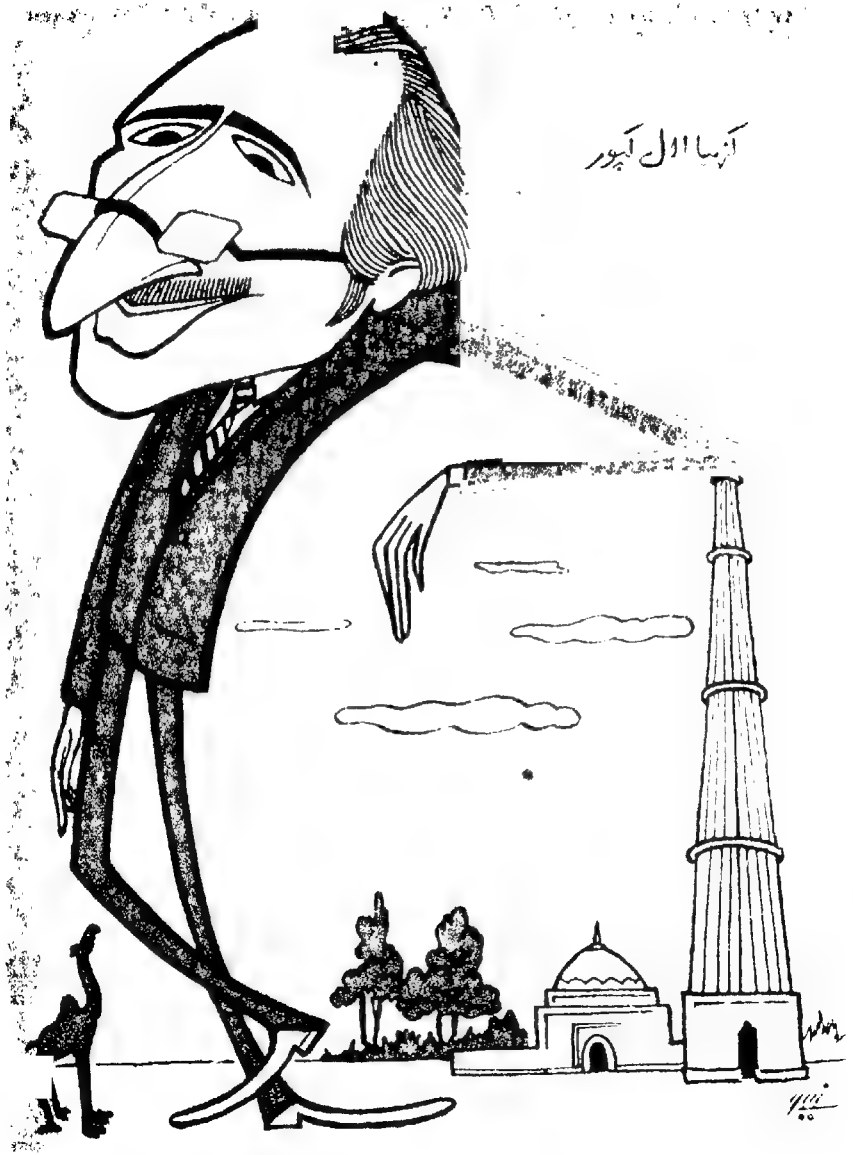
کرشنا لال کپور

تیسرا شاعر (بات کاٹ کر): سُنا جیے اقبال کا کیا حال ہے؟

غالب : وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث ہے

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر : میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر : میں کرسیٔ صدارت کے لیے م۔ ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م۔ن ارشد : میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے۔ میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب : بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سُنا دیں گے۔

م۔ن ارشد : معاف کیجیے گا مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کبھی کے سامنے نہیں جاشے گی۔ شمع کی بجائے یہاں پچاس ٹیبل لیمپ ہے اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب : بہت اچھا صاحب تو غزل سنیے گا۔

باقی شعرا : ارشاد!

غالب : عرض کیا ہے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر سامان کی جانب دیکھتے ہیں)

اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر : معاف کیجیے مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب : بے معنی؟

ہیرا جی : دیکھیے نا مرزا آپ فرماتے ہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص : میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی

پھر بھی تو کہ خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے بھری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے نہیں
میرا مطلب ہے محبت سے نہیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب : یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیراجی : جنوں یا جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔
غالب : ہاں ہاں بڑے شوق سے۔
ہیراجی : عرض کیا ہے ؎

جنوں ہوا، جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا، وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق تھا
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا۔ جنوں ہوا

غالب (ہنسی کو روکتے ہوئے) : سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔
مسن ارشد : اب مرزا، غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔
غالب : میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ: اگستانی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالب: کس طرح؟

عبدالحی نگاہ: ؎

عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے تمہارے عشق نے
تجھ کو نکما کر دیا

اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے
کرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا

غالب (طنزاً): بہت خوب، بھئی شعب کر دیا۔

غیظ احمد غیظ: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا ؎

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا

غالب : واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ن ارشد : اب ڈاکٹر زبان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص : اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں آپ جدید شاعری کی نزاکتوں کو سنگ میل۔ اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م۔ن ارشد : توبہ! توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ" عرض کیا ہے ؎

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیب کی اُلفت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تا کہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گذر جانے پر
بھر بجھ درد و دام نکل جاتا ہے

ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظر سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیرا جی یہ کہتے ہوئے تالی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں ایلیٹی، لجوت اور روح تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کے عامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب : ارشد صاحب معاف کیجیے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے

عبظ احمد عبیظ : یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ ن ارشد: مثلاً میرے ایک دوست نے اس شعر کو لیجیے ؎

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گذر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب (شعر کو دہرا کر) : صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن ارشد : اجی چھوڑیئے اس طرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر میرا اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر فرمان حسین خانقاص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خانقاص : میری نظم کا عنوان ہے "عشق" ؎ عرض کیا ہے ؎

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ ـــــ عشق
عشق ہے پیغام موت!

غالب : بھئی یہ کیا مذاق ہے نظم پڑھیے مشاعرے میں نثر کا کیا کام

ڈاکٹر خانقاص (جھنجلا کر) : تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں

غالب : میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم، نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص : مرزا صاحب! یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی غلامی کی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعتِ تخیل، تازگیٔ افکار اور ندرتِ فکر سے ہے۔

غالب : رفعتِ تخیل کیا خوب، کیا پرواز ہے ؎

میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے بول رو کر کہا

ڈاکٹر خالص (چڑ کر) : عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب : مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر : اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے اس کے علاوہ دورِ جدید کی روح، انقلاب، کشمکش، تحقیق، تجسس، تعقل پرستی اور جدوجہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو ٹھیکرے نے بھی اپنی کتاب ونیتی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو ہمارے دور کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ن الرشد : خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو، ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل، شیریں، فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوعِ سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سایے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گذرے گی، اجداد پہ کیا گذری ہے

یہ جسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ مہدعلی خاں: بہت خوب ۔ "یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے" ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا، موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ مہدعلی خاں: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ سُنیئے عرض کیا ہے ۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہ قاف کو
دیکھنا — آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو اٹھکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خدوخال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اُف ہماری نعرشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا

یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے ہیں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو حوریں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا، بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غبیط سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غبیط: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیراجی: تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غبیط: آپ کی مرضی، تو وہی سن لیجیے۔ عنوان ہے "لگائی" ؎

فون پھر آیا دلِ زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، اترنے لگا مچھروں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرو و چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک جوکیدار
گل کر و دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غبیط بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن ارشد: حضرات! میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے فلک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد (سرگوشی کے انداز میں ہیراجی سے): کیوں اس سے۔

م۔ن ارشد: اب ہیراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

ہیراجی : میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"۔
غالب : بینگن؟
ہیراجی : جی بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حق ار نہیں؟
غالب : معاف کیجیے گا، نظم پڑھیے۔
ہیراجی : عرض کیا ہے ؎

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں نم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تو
کرشن کنہیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے داد دی جاتی ہے۔ بعض شعرا یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ یہ بھی جدید شاعری ہیراجی کا ہی حصہ ہے)

م۔ن ارشد: اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔
بکرماجیت ورما: میں نے حسب معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔
غالب (حیران ہو کر): شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے؟
بکرماجیت ورما: مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیے گئے تھے۔ وہ جدید کے شعرا نے انھیں ایک قابل عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔
غالب : جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراسی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما: پہلا گیت ہے "برہن کا سندیس" عرض کیا ہے ؎

اڑجا ایں بدیس رسے کوے اڑجا دیس بدیس
سُن کر تیری کائیں کائیں

غالب: خوب سُن کر تیری کائیں کائیں

بکرماجیت ورما: عرض کیا ہے ؎ سُن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پر دیس رے کوے اڑجا دیس بدیس

م۔ن الرشید: بھئی کیا اچھوتا خیال ہے پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا۔ وہ بھی مرزا کو سُنا دیجیے۔

بکرماجیت ورما: سُنیے بلا بند ہے ؎ بول کبوتر بول
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول عنڈر غوں بول ـــ کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (یک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرماجیت ورما: اب دوسرا بند سُنیے ؎ بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے ملنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول۔ کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا (یک زبان ہو کر): بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس شور و غل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

غسلیات

کرشن چندر

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، جھینگے، کھڑبال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی ہر صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلاّ اٹھتا ہے تو بقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ اس آبی زمانے کی رسمی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ جس کے نام سے ڈاروں کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی رسمیں متروک ہو چکیں۔ مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میرے بہت سے احباب جو اس قابل تفریق رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں اور کچھ بددل ہو بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے۔ انسان بدستور ان میں نہاتے اور کھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنور پائے جاتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسلخانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ ہر ۲۰ ہزار افراد کے لئے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمہ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتہ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑنے سے پہلے دنوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پیدا ہونے کے لئے بہت سی وجہیں ہیں۔ انہیں بہ تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانہ میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ نہانا ایک انفرادی فعل ہے، اور فسطائیت یا اکیسویں صدی کا ہر وہ مقبول عمومی فلسفہ انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں

کی بیمارہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کثیف پر نہاتے نہاتے ایک پورہیئے کا دوسرے پورہیئے سے کہنا "ارے یار، تو نے تو نیا ہی ٹیوبوری ڈھا خیال کیجئے کتنا یتیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے خودداری بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کتنے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ———

صبح چار بجے کون نہاتا ہے ——— پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے ——— ملکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے ——— پروفیسر، کالج کا لڑکا۔

دس بجے ——— صاحب بہادر، لیڈر۔

بارہ بجے ——— منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے، اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ، پون گھنٹہ صرف کرتے تھے، تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو "کر لئے" "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تمام مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض رائج الاعتقاد ہندو سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے "آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو، آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ، واہ، اس نہانے میں کیا مزہ تھا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں بدن صاف رہتا ہے، درجی ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا، میں خود اپنی پچیس سالہ بھرپور باقی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا وہ گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے اسے بھی غلط

کہنا چاہئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑ جاتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے سب کے سب "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ کنڑی کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انھیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے چونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے۔ جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کھانی کپڑے پھٹے بنیں سوٹ تار ہوتا۔ کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا اللہ اس جسد خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی، بانکی اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی سورج کروں دل میں کڑھتا رہتا "ہونہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے تھپڑے چپی ہے اگر وہ مجھے مل جائے تو کیا ہی اچھا ہوتا"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم تقریباً متروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ پرچھکھ پانی میں تحلیل ہونے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں مگرمچھ بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال ابھارا کہ اسے ضرور نہانا چاہئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب مگرمچھ دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے۔ دریا پر گئی اور نہا کر گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی، اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بیتاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی ہے گی، اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی، طمانچوں کا گمان تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جہان کچ ہو کٹنے، اور بیویاں ہوائیں بن گئیں، اور جب مگرمچھوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے ریگ ریگ کر آئے اور ساتوں بھائیوں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں، "اسے میں نہ دوں گا، اسے میں نہ دوں گا، یہ میری ہے، یہ میری ہے؟"

نتیجہ: نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے، تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے طبیا میٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جانا چاہئے مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے۔ بغیر پروگرام کے آجکل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لیجئے ہاتھوں وہ بھی سنئے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اُسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۴۰۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کئے جائیں:۔

"بر گاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ..... جو غریب شخص بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا اُسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا ———

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے دیوار کا سہارا پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "باجو جی، غسلخانے میں پانی دیر سے دھرا ہے، آپ جلدی نہالیں، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" میں قلم چھوڑ کر باز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف بھاگ گیا۔

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

تزکِ نادری عرف سیاحت نامہ ہند

رقمزدہ :۔ اعلیٰحضرت جناب فلک جاہ شاہ سابق شہنشاہ سابق ایران شیر شیر ابن شیر مسمی بہ مرحوم مغفور وغیرہ وغیرہ

شفیق الرحمٰن

پیش لفظ عرف کرنا مرتب اس تزک کا ہمارا

آج جو اتفاق سے پرانی پستین کو جھاڑا تو متعدد اشیاء کے ساتھ ہمارے خود نوشتہ اوراقِ کرم خوردہ بھی زمین پر گر پڑے جنہیں ہم نے وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ پڑھا تو حیران رہ گئے۔ ہر چہ کہ سیاحتِ ہند کے بعد معترضین نے ہم پر جو طرح طرح کی افترا پردازی کی ہے کہیں نہ اس کے جواب میں یہ اوراق پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ہم مقامی مؤرخین کی لگام بندی فرما چکے تھے تاہم غیر ملکی پریس نے واویلا مچا کر تو غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ رخ دکھا کر کیوں نہ معترضین کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیں۔ پھر ہمیشہ سے لوگوں کو گلہ بھی رہا ہے کہ تاریخ غلط پیش کی گئی ہے، تبھی تاریخ کی غیر جانب دار اور مستند کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ ہم ہندوستان محض حملے کی غرض سے ہرگز نہیں گئے، دراصل ہمیں اپنی دور افتادہ پھوپھی محترمہ سے ملاقات مقصود تھی۔ حملے کا خیال ہمیں راستے میں آیا۔ تختِ طاؤس اور کوہِ نور پر ہم نے زبردستی ہرگز نہیں ہتھیایا۔ عزیزی محمد شاہ عرف رنگیلے میاں نے بصد منت و سماجت ہمارے سامان میں یہ چیزیں بندھوا دیں اور قتلِ عام و قتلِ عام کس مسخرے نے کرایا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا لاٹھی چارج تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اہلِ ہند نحیف و نزار ہونے کی وجہ سے اس کی تاب نہ لا سکے۔ سنا ہے ہمارے تسلط کو لوگوں نے طرح طرح کی کہانیوں گھڑ لی ہیں، مثلاً شاہ منش، خیالِ ما با صورتِ نادر گرفت۔ ہمارے دل کو خصوصاً اس مثل سے سخت صدمہ پہنچا ہے یعنی اگر اس نادر سے ہم ہیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ نادر کوئی اور شخص تھا، اگر ہمیں علم ہوتا کہ ہماری سیاحت کے بعد اس قدر غل غپاڑہ مچے گا تو واللہ کبھی ہند کا رخ نہ کرتے اور اگر رخ کرتے بھی تو پہنچ جاتا تو وہاں سے کبھی نہ لوٹتے۔

واسیے کابل سے ناچاقی

مدت سے ارادہ تھا کہ واسیے کابل کی گوشمالی کریں، وجہ لگاتار بلا کسی وجہ ہمارے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ جب ہم نے خط لکھ کر آپ کو خواہ مخواہ پروپیگنڈے کی وجہ پوچھی تو واسیے بھی زیادہ زہر اگلنے لگا۔ چنانچہ موسم کو مناسب پا کر حملہ آور ہوئے۔ غالباً ان لوگوں کو ہماری قوت کا غلط اندازہ تھا۔ ہم نے دریائے سندھ کو جگہ جگہ سے کاٹ کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

دریائے جمنا نہایت خوشنما دریا ہے۔ فرمانروا خاں معروض ہوا کہ شاہانِ سلف کا رواج رہا ہے کہ حملہ کرتے وقت جمنا پار اترتے میں آئے تیر کر عبور کرتے تھے۔ اس کے کہنے پر ہاتھی سے ہم نے بھی چھلانگ لگا دی اور شاہانِ سلف میں شامل ہوتے ہوتے بال بال بچے کنارے کی طرف آنے کی کوشش کی ہم پوستین کو چھوڑتے تھے لیکن پوستین ہمیں نہ چھوڑتی تھی بمشکل میں باہر نکالا گیا، جس سے پشیمان ہوئے نیت کیا کہ جب تک تیرا کی کے ماہر نہ ہو جائیں پانی پر قدم نہ رکھیں گے۔

شہباز خاں کو خطاب کا عطیہ

مقامی باغ میں چند آم دکھائی دیے۔ یہاں کا آم ایرانی آم سے بڑا اور بہتر ہوتا ہے۔ آموں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ چلا۔ شام کو ہماری قیام گاہ کے پاس لمبیرا لیتا اور رات بھر راہ ہو لیتا۔ ہم نے فرمانبردار خاں سے پوچھا کہ یہ جوڑا کیا چاہتا ہے۔ وہ بولا کہ کنارے کنارے اور یہیں واپس جانے کو کہتا ہے۔ ہم بے حد خفا ہوئے اور فرمانبردار خاں کو پاپوش مبارک سے زدوکوب کر کے سرفراز فرمایا۔ ساتھ ہی شہباز خاں کی رائے دریافت کی۔ وہ جاں نثار معروض ہوا کہ فال نیک ہے۔ آم جیسا منحوس پرندہ بھی ہم سے بلند طالع شہنشاہ کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہے، ہم اس جواب پر خوش ہوئے اور رنگ حلافی کی قدر کرتے ہوئے اس کو آم شناس کے لقب سے نوازا اور اپنے ہم جنسوں میں اس کی عزت افزائی فرمائی۔

سیاحتِ ہند کا ارادہ

کابل فوج کے ساتھ ہماری جنگ خاصی رہی۔ یہ ان خاص خصوصیات کی حامل تھی جنھوں نے تاتار شاہی جنگوں کو اس قلیل عرصے میں اس قدر حیرت انگیز شہرت بخشی۔ اب ماشاء اللہ تاتار شاہی حکم تاتاری شہزادے تھے اور تاتاری حکومت سے بچے کی زبان پر ہیں۔ والیِ کابل اپنے کیے پر نادم تھا۔ اس نے غداری کا حلف اتنی مرتبہ اٹھایا کہ ہم نے تنگ آ کر منع فرما دیا۔

شہباز خاں آم شناس ہر روز ملک ہندوستان کی خبریں سناتا کہ کابل سے ہر جمعات کثیر تعداد میں ہندو بھیجے جاتے ہیں اور اس کے بدلے تجار ہینگ، لہنگ، چرس و دیگر نفریحات لاتے ہیں۔ ہم نے اس ذکر میں دلچسپی لی تو آم شناس بھی چست ہو گیا اس نے ہمیں پھپھی محترمہ کی یاد دلاوی جو غالباً ہند میں مقیم تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم نے اپنی پھپھی کا محض ذکر ہی سنا تھا، نہ کبھی انھیں دیکھا تھا نہ شرف ملاقات بخشا تھا۔ مگر مناخ فرمانبردار خاں کا خیال تھا کہ ہماری کوئی پھپھی تھیں ہی نہیں۔ خیر چونکہ کابل کی مہم اندازے کے خلاف بہت جلد ختم ہو گئی، سوچا یہ بیکار وقت کیوں نہ سیاحتِ ہند میں صرف کیا جائے۔

ہمیں بتایا گیا کہ تلہ آوروں کی سہولت کے لیے اہلِ ہند نے دو راستے صاف کروا رکھے ہیں:۔

براہ افغانستان : خیبر ایجنسی ——— پشاور ——— لاہور ——— پانی پت

براہ بلوچستان : سمہ سٹہ ——— بھٹنڈہ ——— دلی

ہم نے پہلا راستہ پسند فرمایا کیونکہ بلوچستان کے راستے میں جیکب آباد پڑتا ہے جو دنیا کے گرم ترین مقاموں میں سے ہے۔

کابل سے کوچ ——— چار گھڑی گزرنے پر کابل سے کوچ کیا گیا۔ عمائدینِ شہر فصیل تک بلکہ وہ نہر تک چھوڑنے آئے جانے نہ دیتے

تھے۔ وہ اپنے کابل مفارقت کا سوچ کر روتا تھا اور ہمارے ہمراہ سیاحت ہند میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ رونا پیٹنا دکھاوے کا ہے، یہ لوگ بڑے کائیاں ہیں۔ ہمارے رخصت ہوتے ہی پراپیگنڈہ دوبارہ شروع کر دیں گے اور پھر اہل ہند پر مہمان نوازی کا زیادہ بوجھ ڈالنا قرین مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسے سمجھایا کہ جب ہم سیاحت ہند سے واپس لوٹ آئیں تب اس کا جانا زیادہ موزوں ہوگا وہ پھر بھی روتا تھا۔ اسے از راہ غریب پروری ایک ریشمی رومال آنسو پونچھنے کے لیے مرحمت فرمایا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

اس منزل سے کوچ کر کے درۂ خیبر میں پہنچے۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ یکہ، یونانی، محمود غزنوی اور روہیلے ناجی سیلاح بھی اسی راستے سے گذرے تھے۔ ہم نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں بہتری سمجھی۔ اس درّے میں پرند، چرند، ورنہ انسان بلکہ سارا دن سارا رات تک نظر نہیں آتی۔ خداوند باری تعالیٰ کی کیا قدرت بیان کی جائے۔

مغل فوجداروں نے پشاور سے کچھ دور سے اگر سعادت دو آسان بوسی حاصل کی اور مشورہ دیا کہ ہمارا واپس چلا جانا بہتر ہوگا کیونکہ اس موسم میں سیاحت لطف نہیں دیتی۔ اس نے دو سو مہر طلائی نذر اور ایک مرصع گھوڑا بطور پیش کش گذرانا، ہم نے بھی بدلہ دوست ایک دینار عنایت کر کے ٹالا۔ پشاور سے آگے شیر ملا۔ پہلی دفعہ دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ بندگان درگاہ تو بھاگ گئے ہم اپنی جگہ کھڑے رہے۔ ہم کو کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ ایک گربہ کی مثال ہوتا ہے انتہائی نفاست پسند اور بزرگوار قسم کا جانور ہے۔ کچھ دیر ہمیں دیکھنے کے بعد اس درجہ مرعوب ہوا کہ بھاگ نکلا۔ اگلے روز ہمیں کسی نے بتایا کہ وہ شیر نہیں تھا بلکہ وہ بلی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب!

سفر کا حال

دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ سید بابا یہ جو یزید یوسفی آستان بوسی کی سعادت کے متمنی تھے، جب بلایا تو دیکھا کہ فقط ایک آدمی تھا۔ ہم نے از راہ تلطف اسے گلے سے لگایا اور پیار سے تھپتھپایا، وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے فوراً اٹھا کر باہر لے گئے، لکھنؤ سنگھایا گیا، بالش کی گئی۔ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ نذریں جو پیش کرنے والا تھا لے کر روپوش ہوا۔ ہم نے ہلکاروں کو اس کے پیچھے دوڑایا کہ اگر خود نہیں آتا تو نذریں تو بھجوا دے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

قلعے کا فوجدار ہماری سواری کے لیے ایک عجیب و غریب چوپایہ لایا جسے دالتی کہتے ہیں۔ نہایت پُر شوکت قبیل جسیم جانور کا۔ وہ دانت ہوتے ہیں جو صرف دکھانے کے لیے ہیں ناک جس کو سونڈ کہا جاتا ہے زمین کو چھوتی ہے۔ دالتی پر چڑھ کر آدمی دور سے گھروں کے اندر سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے سواری کا قصد کیا اور باگ دالتی میں لینی چاہی، وہ بولا اس کی لگام نہیں ہوتی قدیمی طریقہ بیٹھنا ہے۔ ہم نے ایسے بے لگام جانور پر سواری سے انکار کر دیا۔

طفیلہ

سندھ کے علاقے سے وضو آیا کہ وہاں کے عمائدین بے تاب ہیں کہ ہم ان کو سرفراز فرمائیں۔ ساتھ ہی ایک مشہور خانقاہ کی گدی کی پیشکش بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس ملک میں عجیب دستور ہے۔ کوئی ٹھگ چند ہتھکنڈے سے دکھا کر بھولے بھالے انسانوں کو رام کر لیتا ہے۔ یہ شخص پیر کہلاتا ہے اور معتقدین مرید کہلاتے ہیں۔ مرید اپنی آمدنی کا ایک حصہ پیر کو باقاعدگی کے ساتھ نذر

کہتے ہیں۔ پیر کوئی خاص کام نہیں کرتا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کاغذ کے پرزوں پر کچھ لکھ دیتا ہے جنھیں تعویذ کہتے ہیں۔ یہ تعویذ بوڑھوں کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے اور اولاد کے سر پر ستوں کا انتقال ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطیفہ سن کر ہم بہت ہنسے کہ کسی نے کیا لمبے پر کی اڑائی ہے۔

لیکن جب آقو شناس نے چار پیروں کو ہماری ملاقات کے لیے لایا تو ہمیں محسوس ہوا کہ لطیفہ دوسروں پر نہیں ہم پر ہوا ہے۔ پیروں کی زندگی کی طرح طرح کی دلچسپیاں اور ان گنت مشغلے۔ ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اپنی گزشتہ زندگی پر بڑا افسوس ہوا کہ ناحق خراب ہوتے پھرے۔ اگر پہلے سے پتہ ہوتا تو سیدھے ہندوستان آکر پیر بن جاتے اور مزے لوٹتے۔

ایسا سنہری موقع ملنے پر ہم نے خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور دوند کے ہمراہ چلنے کا قصد ظاہر کیا لیکن آقو شناس نے راستے ہی کہ سندھ کے سیاسی حالات ہمیشہ کچھ ایسے ہی رہتے ہیں چنانچہ اس تجویز کو التوا میں رکھا۔ اگر خدانخواستہ شہنشاہی کا یہ آنہ رہی تو ضرور بضرور پیر بن جائیں گے اور دل کی ساری امنگیں پوری کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز!

اختر شماری

کل رات اختر شماری کی، دو سو پچاسی تارے گنے ہوں گے کہ نیند آگئی، باقی بشرط زندگی کل گنیں گے۔

شتر غمزے

مقامی قلعدار کی دعوت پر اس کے ساتھ گئے اور شتر غمزے ملاحظہ فرمائے۔ محظوظ ہوئے۔ کیونکہ ایران میں یہ چیز نہیں ہوتی اور اس ملک میں عام ہے۔

ایک مفید رسم

جہلم کے قریب ایک قلعدار نے ہم پر دھاوا بول دیا اور پکڑ کر سے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ارادہ تھا کہ اس کو اسی طرح محصور چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں لیکن آقو شناس مصر ہوا کہ نہیں یہاں ٹھہرنا مناسب ہے۔ ہم نے فرمایا کہ اسے زبردستی قدم رکھے تو دلی پہنچنے میں دیر لگے گی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ غضب سے آگ نہ لگا دیں۔ اس روز ہمیں نزلہ سا تھا اور قصد کشتی جھلانا کا ہرگز نہ تھا۔ آقو شناس کے اصرار پر دو دن تک قیام کیا لیکن کچھ نہ ہوا۔ تنگ آکر ہم نے پوچھا کہ کوئی ایسی تجویز نہیں ہو سکتی کہ یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ آقو شناس چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک ہندی سپاہی تھا۔ آقو شناس کے کہنے پر ہم نے سپاہی کو پانچ سو طلائی مہریں دیں۔ ابھی ایک گھنٹہ نہ گذرا ہوگا کہ قلعے کے دروازے کھل گئے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔

ہندیں یہ ایک نہایت مفید رسم ہے۔ جب کٹھن وقت آن پڑے یا مشکل آسان نہ ہو تو متعلقہ لوگوں کو ایک رقم یا نعم البدل پیش کیا جاتا ہے۔ تحفے کی مقدار اور پیش کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں لیکن مقصد ایک ہے ——— اسے یہاں رشوت کہتے ہیں کس قدر زود اثر اور کارآمد نسخہ ہے۔ اگر لاکھوں کے اٹکے ہوئے کام ہزار پانچ سو سے سنور جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ رشوت دینے دلانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس عمل سے کرنسی حرکت میں رہتی ہے۔ ہم واپس ایران جا کر اس رسم کو مروج کرائیں گے۔

ہمیں بتایا گیا کہ کچھ مہریں سپاہی نے اپنے استعمال کے لیے خود رکھ لی تھیں، باقی کوتوال کو دیں جس نے اپنا حصہ رکھ کر بقیہ بقیہ علمدار کے حوالے کی۔ علمدار نے سنتریوں کو خوش کر کے دروازے کھلوا دیے۔ واقعی یہ ملک عجوبۂ روزگار ہے!

گوجرانوالے میں قیام

شیخ بوٹا شہر پوری ایک ایرانی النسل درویش ہیں جو بڑے فاضل ریاضت کار، بارک نفس، متوکل اور گزشتہ شین ہیں۔ گوجرانوالے میں ان سے مل کر معرفت اور روحان کی باتیں ہوتی رہیں۔ فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا بنا جائے۔ کچھ شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی پیر نہ ہوں۔ تحقیقات کرنے پر شبہ درست نکلا۔ آپ بڑے رنگیلے پیر ہیں، پنجاب سے وادیٔ کاغذ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں کیونکہ وہ علاقہ زیادہ زرخیز ہے۔ دیر تک ان سے خفیہ باتیں ہوتی رہیں جنھیں سینہ بسینہ رکھنے کا ارادہ ہے۔ یہ ملاقات کیا تھی گویا تجدید عہد شباب تھی۔

ہما۔ اسنجیدہ ہو جانا

گلستان بیکانیر سے ایلچی دربار دولت پر حاضر ہوا۔ پتہ چلا کہ چلیپے مشتاقان دیدار راہ دیکھ رہے ہیں۔ تربوزوں کا موسم بھی ہے ارادہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے چلے چلیں مگر آگرہ شناس کو حسب معمول شبہ ہوا کہ یہ کوئی چال ہے۔ بیکانیر تو وہی صحرا ہے جس میں نرپالی ہے۔ وہ نیدگی۔ یہ لوگ ہمیں صحرا میں چھوڑ کر بھوک پیاس سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

آنکھوں میں خون اُتر آیا اور ہر چیز سُرخ نظر آنے لگی۔ فوراً ایلچی کو بلوا کر اُلٹا لٹکوایا، جب بکا کہ واقعی یہ چال تھی تو کھلوا کر سیدھا کیا اس حادثے نے ہمارا موڈ خراب کر دیا۔ سوچا کہ اہل ہند سے اچھے سلوک کی توقع کرنا حماقت ہے۔ کیوں نہ کسی بہانے اس ملک پر حملہ کر کے ان کی گوشمالی کریں۔ فرمانبردار خاں کو حکم دیا کہ حملے کی چند وجوہات سوچے۔ اس نے یہ فہرست پیش کی۔

۱۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے جنگی چالوں کی ایک کتاب "رہنمائے حملہ آوران ہند" لکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہندی گویے نزانوں کو "نادر نادھیم" سے شروع کر کے ہماری توہین کرتے ہیں۔

۳۔ تاریخ میں اس سے پہلے ایران نے ہند پر باقاعدہ حملہ نہیں کیا۔

۴۔ ہند پر حملہ ہوئے کافی عرصہ گذر چکا ہے۔

۵۔ یوں بھی ان دنوں ہند پر حملے کا رواج عام ہے۔

ایسی بے معنی وجوہات معروض ہونے پر ہمیں غصہ آیا۔ ایک بھی بات خدا لگتی نہ تھی۔ قصد ہوا کہ فرمانبردار خاں سے وہی پرانا سلوک کریں۔ دیکھا تو وہ کبھی کا غائب ہو چکا تھا۔ ہم نے خود ان سے بہتر وجوہات سوچنے کی دیر تک کوشش کی جب کامیابی نہ ہوئی تو خوش ہو کر فرمانبردار خاں کو بحال فرمایا۔

شاہدرے میں آمد آمد

شاہدرہ کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں، چال ڈھال سب لڑکوں کی سی تھی، نام بھی عبداللطیف تھا

روانہ تھا۔ ہم نے پیش کاروں کو حکم دیا کہ اس کے باپ سے مل کر تحقیق کریں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللطیف لڑکا ہی تھا اور کسی متعالی کالج میں پڑھتا تھا۔ خدا جانے ہم کو یہ کیسے خیال آیا کہ وہ لڑکی ہے۔

لاہور پہنچے ہی تھے کہ صوبیدار لاہور کے گورنیلا دستوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہی جدید جنگی طریقوں سے ناواقف تھے اور صوبیدار موصوف نہ صرف ہفت ہزاری تھا بلکہ گوریلا لڑائی کا ماہر تھا۔ ہم نے بھی فوراً چوڑیا گھر سے سارے گورے پلٹن نکال کر سدھائے، گھمسان کا رن پڑا، گوریلے پر ٹوٹ پڑا اور سپاہی تماشہ دیکھتے رہے۔ دشمن نے ڈرائی کا رخ بدلا، صوبیدار ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور ہم اسے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے قریب سے کئی کتراتی گذر جاتیں، اگر مجوسی کا یہ عالم تھا کہ گھیرے میں لینے کی کوشش میں صوبیدار فوج سمیت جملہ جا پہنچا اور ہم خیرہ و زبوں۔ فطلی کا احساس ہوا تو لوٹے۔ آتوشناس کے مشورے پر صوبیدار پر ہند کا مروجہ کارآمد نسخہ آزمایا اور شکست فاش دی۔ شکست کے بعد ہم نے اس سے ہفت ہزاری بعد دقت وصول کیا۔ شام کو آتوشناس کچھ اور منصب داروں کو لایا جو بالترتیب پنج ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزاری تھے۔ کئی روز گفتار رکھتا تب کہیں دس ہزار روپیہ وصول ہوا۔ دیکھتے دیکھتے صوبیداروں کی قیمتیں گرنے لگیں۔ لوگ پنج صدی، پونے دو صدی، ایک سینکڑی اور پچاسوی تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ بڑے لالچی ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی ہزاری بہت چلایا کہ وہ ہزارہ کا رہنے والا ہے لیکن ہم نے اپنا اصول ترک نہیں کیا۔

لاہور سے روانگی

چاہیے تو یہ تھا کہ ان علاقوں میں چند روز زہ کر داد عیش و کامرانی دیتے مگر یہاں کی پرانی رسم ہے کہ وہ سیاح جو رزۂ خیبر سے آتے ہیں انھیں سیدھے دلی جانا پڑتا ہے۔ راستے میں کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔

جہلم، چناب، راوی عبور کر چکے تھے، ستلج کو عبور کیا اور پنجاب کے پانچویں دریا کو بہت ڈھونڈا۔ خبر ملی کہ بیاس تو پہلے ہی ستلج سے مل چکا ہے، سخت مایوسی ہوئی۔ مصاحبین نے دست بستہ عرض کی کہ ملک کا دستور ہے حملہ آوروں سے اس علاقے میں ضرور لڑتے ہیں۔ اس کے لیے پانی پت، تراوڑی وغیرہ کے میدان مخصوص ہو چکے ہیں۔ ہم نے فرمایا کہ لڑیں تو تب اگر مقابلے میں کوئی فوج آئی ہو، معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے کیونکہ اگر اہل ہند اس علاقے میں نہ لڑیں تو پھر کہیں نہیں لڑتے۔

محمد شاہ کو ہماری تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا، ایک مرتبہ تو اس نے ایلچی کو لفافے سمیت شراب کے مٹکے میں دھکیل دیا اور بولا۔ ایں ایلچی بے معنی غرق مے ناب اولیٰ۔ کسی ایلچی نے حافظ کا یہ مصرع صحیح کرنا چاہا تو محمد شاہ نے اسے بھی مٹکے میں دھکیل دیا۔ آدمی بامذاق معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں تحفہ دینے کا نتیجہ

دلی سے ایک درباری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ تحفے تحائف سے لدا ہوا تھا اس لیے ہم نے بلا لیا۔ بولا یا شہنشاہ اسنا ہے کہ آپ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے اس طرف تشریف لائے ہیں۔ جہاں تک آب و ہوا کا تعلق ہے اس ملک کو یہاں ختم سمجھیے اس سے آگے سخت گرمی پڑتی ہے۔ رعایا کی التجا ہے کہ آپ دو کروڑ کی حقیر رقم بطور سفر خرچ قبول فرما کر

یہاں سے رخصت فرما جائیں۔ ہمیں رضامند پا کر وہ نابکار بغلیں بجانے لگا۔ ڈانٹا تو معلوم ہوا کہ یہاں کا رواج ہے۔ ایک تو یہاں کے رسم و رواج نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ واپسی کے لیے سامان بندھوا رہے تھے کہ اُلوٹاس نے شبہ کرا دیا کہ اہل ہند [illegible] محبوب نسخہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رقم ہمیں تحفتہً پیش کی جا رہی ہے۔ شام کو وہی درباری مجلسیں جھانکتا ہوا پھر حاضر ہوا اور [illegible] چلنے کی ترغیب دینے لگا۔ عجیب و غریب لوگ ہیں۔ اُلوٹاس نے اصل وجہ بتائی جب دربار مذکور میں پہنچ کر انعام [illegible] ہوا تو کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ خان بہادر کا خطاب کسی غریب کو مل گیا۔ اس نے جل بھن کر دھمکی دی کہ ٹھہرو! ابھی لاتا ہوں [illegible] بادشاہ کو۔۔۔

ہم نے سوچا کہ اب اتنی دور آ گئے ہیں تو دلی دیکھ کر جائیں گے۔ کرنال کے مقام پر محمد شاہی فوج دکھائی دی جو ہمیں دیکھتے ہی ادھر اُدھر ہو گئی۔ ہم نے کہلوا کر بھیجا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس جنگ کو تاریخ میں پانی پت کی تیسری لڑائی یا کرنال کی پہلی لڑائی [illegible] نہ ملے۔ اس پیغام پر باقیماندہ فوج بھی بھاگ نکلی۔

قطب صاحب کی لاٹھ

نعل اقبال دلی کے باہر ہوا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس نادر شاہی جھنڈے گاڑے گئے۔ یہ لاٹھ قطب صاحب [illegible] تعمیر کردہ ہے لیکن اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ پتہ نہیں قطب صاحب کا ارادہ کیا تھا۔ فرمانبردار خاں نے عرض کیا کہ غالباً قطب صاحب آسمان تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن تجویز کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بصد وقت اوپر تشریف لے گئے۔ واقعی بہت اونچا مینار ہے۔ آسمان یہاں سے کافی قریب ہے۔ ستستانے کے بعد نیچے تشریف لائے۔

غلہ آوری اور برادرم محمد شاہ کی ہماری ذات سے عقیدت

صبح سے محمد شاہ اپنا لشکر لے کر سامنے آیا ہوا تھا مگر ابھی تک سعادت زیارت سے مشرف نہ ہوا تھا، دوپہر کو ایک [illegible] لہراتا آیا اور معروض ہوا کہ محمد شاہ صاحب نے دریافت کیا ہے کہ حملہ کرنے کا کس وقت ارادہ ہے۔ ہم نے پوچھا [illegible] حملہ کیسا؟" ایلچی نے عرض کیا۔ "خداوند نعمت وہ نوعرصے سے آپ کے حملے کے منتظر ہیں، اتنے دنوں سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر حملہ نہ ہوا تو سب کو سخت مایوسی ہوگی۔ کل بارش کی وجہ سے لشکر کا کھانا نہ پک سکا اور پھر یہ کہ چلی آتی ہے کہ وہ رہا منیجر سے آنے [illegible] بس بس! آگے ہمیں پتہ ہے۔" ہم نے اسے ڈانٹا۔

مجبوراً ہم نے حملے کا حکم دے دیا لیکن لڑائی کا لطف نہ آیا۔ وہ لوگ فوراً تتر بتر ہو گئے۔ ہر شہر کے دروازے ہمیں [illegible] ہوئے نوعمر بیٹی محمد شاہ نے پھولوں کا ہار پہنایا، گھوڑے سے اُتر کر بغلگیر ہوئے۔ اس کے بعد دو دن تک محمد شاہ کا کوئی پتہ نہ چلا۔

دلی میں نازل ہو کر ہم نے اور بندگان درگاہ نے خوب دادِ عیش دی کہ شیرہ سیاحاں ہے۔ حمام گئے، الحمد للہ کہ آج پورے [illegible] سال کے بعد غسل فرمایا۔ صبح سے شام تک تخت طاؤس پر بیٹھ کر مشغل خورد و نوش و خوش فعلیوں اور خوش گپیوں سے اپنے دل کے [illegible] کو ہلکا کرتے اور رعایا کو اپنے دیدار سے فیض یاب کرتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمارے جیسا صاف باطن اور ذیک دل بادشاہ

تاریخ میں کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سکندر نے پورس سے جو سلوک کیا اس سے کہیں بہتر سلوک ہم نے عزیزی محمد شاہ سے کیا۔ ہر چند کہ اس کی شکست مزاجی میں نہ بھائی تھی اس کو مانند اپنے عزیز کے سمجھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے ہماری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی اپنے بزرگ کی کرتا ہوگا۔

ہمیں شاہی مہمان خانے کے بہترین حصے میں ٹھہرایا گیا جو مرہٹوں کے لیے مخصوص تھا۔ عزیزی محمد شاہ نے شام کو ہمارے لیے مسواکیں، لباس شب خوابی، سلیپر، چادریں اور غلاف بدلوائے۔ یہ اور بات تھی کہ ہم راستہ بھول گئے اور نہ جانے کہاں پوستین سمیت سیڑھیوں پر سو گئے۔ لال قلعہ باہر سے تو سیدھا سادا سا قلعہ معلوم ہوتا تھا لیکن اندر نفیس و نازک عمارتوں اور خوشنما باغوں کی بھول بھلیاں میں ہمیں گائیڈ کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ ہماری آمد کی خبر پاکر (غالباً ہمیں متاثر کرنے کی غرض سے) حکومت ہند نے امتناع شراب کے احکامات جاری کر دیے تھے لیکن عزیزی کی وساطت سے ہمارے سپاہیوں کے لیے پینے پلانے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔

تختِ طاؤس

ایک دفعہ جب ہم تواتر دس گھنٹے تختِ طاؤس پر بیٹھے رہے تو عزیزی بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تختِ طاؤس سے آپ کو از حد اُنس ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا اس درجہ طویل قیام تختِ طاؤس کی وجہ سے ہے تو جشنِ مارو شن دلِ ماشاء۔ آپ اسے بخوشی لیجا سکتے ہیں۔"

ایسے خلوص و محبت سے کس کا دل نہ پسیج جاتا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہم جب یہاں سے عازمِ ایران ہوئے تو تختِ طاؤس ہمراہ لے جائیں گے۔ ہم انکار کر کے اس کا دل نہیں دُکھانا چاہتے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا ـــــ "دلی کو اپنی ذات بے مثال سے محروم کرنے کی تاریخ سے مطلع فرما دیا جائے تاکہ اہلِ دلی کو مطلع کر دیا جائے۔ وہ اس دن کے لیے گھڑیاں گن رہے ہیں ـــــ"

"کیوں گھڑیاں کیوں گن رہے ہیں، کیا وہ ہم جیسے مشفق بزرگ کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں؟" ہم نے غیض و غضب میں فرمایا۔

"جی نہیں، آپ نے غلط سمجھا۔ وہ الوداعی پارٹیوں کا انتظام کرنا چاہتے ہیں ـــــ" وہ بولا۔

"ہمیں ان گلیوں کو چھوڑنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں جن کے متعلق کوئی استاد ذوقؔ شعر کہیں گے۔" ہم نے فرمایا۔

"یوں ٹھہرنے کو آپ چھ ماہ، سال، دس سال ٹھہریے بلکہ ایران کا وارا نظامِ دلی کو ہنوز اچھی طرح سے ملتفس ہوا۔"

"دیکھا جائے گا ـــــ" ہم نے بھی محبت سے فرمایا۔

وہ گلقندوالا قصہ

بات کچھ بھی نہ تھی۔ مغلئی دسترخوان کی رسمیں ہیں تیز معلوم ہوئیں تو حملے کے مرتبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ بمشکل کوئی بادام مغز کھا سکے ہوں گے کہ فرمانبردار خان نے بڑی چابکدستی سے مرتبان ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس معمولی سے واقعہ پر لوگوں نے نہ جانے کیا کیا افسانہ تراش لیا۔ ہمیں ہرگز علم نہ تھا کہ مرتبان میں حلوے کی جگہ گلقند ہے اور اگر علم ہوتا بھی تو کیا فرق پڑ جاتا۔

ہنوز دلی دور است

اس فقرے کو ہم نے اہلِ دلی کا تکیہ کلام پایا۔ جب ہم خیبر میں تھے تو سنا تھا کہ ہمارے لیے ہنوز دلی دور تھی، جب ظاہر

پہنچے تب بھی معذرت ہی۔ لال قلعے میں پہنچ کر بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہنوز دلی دور است۔ اچھا بھئی چلو دلی دور است، لیں!

محمد شاہ کا دربار

مسز محمد شاہ لال قلعے میں اس دھوم دھڑکے سے پہنچی ہیں کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہاتھی دنگے فساد میں ہمیشہ ان کا دھ رہتا ہے۔ ملک کی خارجی اور اندرونی پالیسی (جب القاب سے ہوتی ہے) وہ خود ترتیب دیتی ہیں، یہاں تک کہ اعلیٰ حکاموں کی پوسٹنگ وغیرہ بھی یہ خود ہی کرتی ہیں۔ وہ فارسی، عربی، سنسکرت اور مدراسی بول سکتی ہیں۔ لیکن دیگر بیگمات کا خیال ہے کہ وہ کچھ ایک زبان بھی نہیں۔ کہتیں روپے کو بیگر بلات کا ہمیشہ کچھ اور ہی خیال ہوا کرتا ہے) درباری بیگمات سے بے حد زچ ہیں۔ ایک برچھیں جہاں بیگم نے برچھی کو دیکھ کر چوبدار درباری جامہ ایجاد کیا۔ دین نے شلوار کو ساری میں ضرب دے کر دو پٹہ تقسیم کر دیا اور غرارہ دریافت کیا۔ تعجب ہے کہ یہ خیال اسے علی الصبح غرارے کستے وقت آیا۔

صبح شام شہر کی چیدہ چیدہ خواتین حاضر ہو کر آداب بجا لاتی ہیں اور شہر کی دوسری چیدہ چیدہ خواتین کے بارے میں تازہ ترین خبریں سناتی ہیں۔

عزیزی محمد شاہ بھی لال قلعے ہی میں کہیں رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کا بادشاہ ہے لہٰذا اپنے تئیں شہنشاہ ہند کہلاتا ہے۔ نگہبن خواب دیکھتا ہے، تین لباس پہنتا ہے، رجعت پسند ادب اور تنزل پسند شاعری کا گرویدہ ہے لیکن حرکتیں سب ترقی پسند کرتا ہے۔

کل وزیر جنگ نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ عزیزی محمد شاہ خوش ہو کر بولا۔ اب دب کا بیشتر حصہ خود مختار ہو چکا ہے۔ جتنے صوبے اور ریاستیں خود مختار ہوں گے اتنا ہی ہمارا کام کم ہو جائے گا۔ ملک کے ریاستوں میں بٹنے ہی کی ریاستہائے متحدہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

عزیزی کے تعلقات مرہٹوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ جب مرہٹے ہمکار ہوتے ہیں تو سیدھے دلی آ جاتے ہیں۔ پچھلے ماہ آئے تھے تو نربدا، چنبل اور مالوہ کے علاقے لے کر ٹلے۔ خیر ہمیں کیا عزیزی جانے اور اس کا کام۔

ہندی فوج کو دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوتی، لڑنے جاتے ہیں تو پالکیوں میں بیٹھ کر۔ میدان جنگ میں ڈھال ملازم اٹھاتا ہے، ہر وقت صلح کے خیال میں۔ ہر سپاہی کی وردی مختلف ہے، کہ نال میں ہم سے لڑنے آئے تو جیسے عید کے کپڑے پہن رکھے تھے ہمیں یاد نہیں پڑتا۔ بھئی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔

مینا بازار اور درہم

محمد شاہ کے بزرگوں کے وقت سے رسم چلی آتی ہے کہ موسم بہار میں لال قلعے میں مینا بازار لگتا ہے جس میں طرح طرح کی دوکانیں سجائی جاتی ہیں، دکانوں سے زیادہ بیگمات سجتی ہیں اور مختلف اشیا بازار سے چوگنے نرخ پر خریدتی ہیں۔ ان دنوں تو ذرا سے بچے بازار لگ جاتا ہے۔ ہماری طبیعت حاضر تھی۔ محمد شاہ سے مینا بازار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے ٹالنا چاہا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بزرگ بھی ہیں۔ وہ بولا کہ اگر آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو دو دن سمندِ شوق کو لگام دیجیے۔ اس مینا بازار کے ختم ہوتے ہی ایک مہم کے

مینا بازار کا انتظام کرا دیتا ہوں جس میں سب مرد ہی مرد ہوں گے۔ پوچھا کہ ہم زنانہ شو میں کیوں نہیں جا سکتے۔ بولا اس میں بیگم صاحبہ یا شاہ ہند کے کسی کا گذر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے فرمایا کہ کچھ دیر کے لیے ہمیں بادشاہ ہند ہی سمجھ لیا جائے۔ آدمی عقلمند تھا مان گیا۔ ہمارا فرزند علی قلی خاں باتیس سال کا ہونے کے باوجود اپنے کب کو بالغ سمجھتا ہے' اپنے ہم جنسوں کی صحبت کی بجائے عورتوں میں اٹھنے بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہے ہمارے ساتھ مینا بازار جانے پر مصر ہوا۔ دیکھا کہ ہر طرف نازنینان گل بدن رنگ برنگے ملبوس پہنے چہلیں کرتی ہیں۔ نہ ننگا ہیں نہ بچی ہیں' نہ دوپٹے کا خیال ہے' دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا (آج صبح بھی ایک مرتبہ خون اترتا تھا) ہمارے بارے میں سب کو علم ہو چکا تھا' ہمیں گھیر لیا گیا۔ ہمارے دستخط لیے گئے' ساتھ ساتھ مناسب اشعار لکھنے کو کہا گیا' ہم سے طرح طرح کے پریشان کن سوالات پوچھے گئے۔

ارادہ ہوا کہ کچھ زنانہ سامان آرائش یہاں سے جانے کے لیے خریدیں پھر سوچا ہمارے پہنچتے پہنچتے کہیں فیشن نہ بدل جائے۔

ایک ماہ روز نظر پڑی کہ کچھ سامان لیے جاتی ہے۔ ایک دکان کے سامنے اس نے آواز دی 'علی!' علی! کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے علی قلی خدا جانے کہاں سے بھاگتا ہوا آیا اور اس کا سامان اٹھا لیا۔

"تم قلی ہو ——؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں —— بالکل ——" علی قلی نے جواب دیا۔

اگرچہ ہم علی قلی کے اس قسم کے قلی بن جانے پر خفا تھے مگر اس کی حس مزاح پر حیرت ہوئی کیونکہ ہمارا خاندان اس حس سے بے بہرہ ہے۔ ہم میں خود مذاق برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ کچھ دیر بعد جب قلعی کا ازالہ ہوا تو نازنیں بے حد محظوظ ہوئی اور بڑی معصومیت سے پوچھنے لگی: "آج شام کو آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کوئی خاص کام نہیں" علی قلی نے جواب دیا۔

"مست قلندر صاحب کے عرس پر ایک سرکس آیا ہوا ہے" وہ بدستور معصومیت سے بولی۔

"میں پہلے شو کے لیے دو نشستیں بک کرا لوں گا اور باہر ٹکٹ گھر کے پاس انتظار کروں گا۔ خدا حافظ امید ہے آپ مجھے گھور رہے ہیں۔" علی قلی بھاگا۔

شام کو ہم اس کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ آئینے کے سامنے کھڑا مونچھیں تراش رہا ہے' ہاتھ پونس کی تو بولا عرس پر جا رہا ہوں۔ ہم نے پوچھا ٹکٹ کی قیمت کون دے گا۔ اس کے منہ سے نکل گیا' چچا محمد شاہ نے دو سیٹیں بک کرا دی ہیں۔ پوچھا دوسری کس کے لیے ہے تو چپ ہو گیا۔

"نامعقول! ایسے ہجوم میں جا کر خواہ مخواہ سکینڈل کروائے گا۔" ہم نے گرج کر کہا۔ "کچھ اپنی پوزیشن کا خیال کر ——"

"آپا جان میں وعدہ کر چکا ہوں ——" اس نے ایسے عدم تشدد مانا نداز سے کہا کہ ہم لوٹ آئے۔

ہندی کلچر

ہندی کلچر کی بے حد تعریفیں سنی تھیں چنانچہ دیکھنے کا شوق تھا۔ ملکہ کی ایک جھلک ہو سکتی تھی۔ نوابزادگان کو وقت پر سوجھتی نہیں' عورتوں محمد شاہ سے ذکر کیا' وہ بولا کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے انگلی کلچر سنا ہوگا وہ البتہ مشہور ہے۔ ہم مصر ہوئے تو

کہنے لگا آپ میری سنائی باتوں کا یقین نہ کیجیے، ویسے ہمارے ہاں چند ایک باتیں واقعی شہرۂ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی قدیمی دواخانے جن کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں۔ دوسرے قدیم روایات بن کے لیے بھیس بدل کر شہر میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گئے، ایک جگہ ایک شخص ملا جو کہ مدرس تھا، بھینسوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھینسیں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سپاہی چلے میں بہت سے حضرات بیٹھے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ مینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص کو بامشقت معلوم ہوتا تھا جو ٹوٹی میں پانی لیے ناک ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکام شہر ایک پرندے کو کھینچ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرندہ اڑتا تھا۔ ایک نہایت ضعیف بزرگ قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ مجھ شاہ کے متعلق ہم کہہ نہیں سکتے البتہ ہم ازحد محظوظ ہوئے۔

علی قلی کی گستاخی اور ہمارا تخیل

آہستہ آہستہ برخوردار علی قلی اور اس لڑکی کا قصہ مشہور ہوتا جا رہا تھا، سوچا کہ اس معاملے کو فوراً ختم کیا جائے چنانچہ اس کے گھر میں گئے۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال گنگھریالے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا "ابا جان! معاف فرمائیے دیوانہ کھٹکھٹائے بغیر اندر آنا موجودہ آداب کے خلاف ہے۔"

ہمیں سخت غصہ آیا یہ نئی پود ہمیں آداب سکھائے گی، یہ لڑکا دن بدن بگڑتا جا رہا ہے۔

"ہم تجھے جگالی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں ——— جب سے دلی آیا ہے، وقت منہ چباتا رہتا ہے ——— کیا ہے تیرے منہ میں ———؟"

"پان کھا رہا ہوں ——— کسی نے دیا تھا ———" وہ بولا۔

"یہ کسی کون ہے؟ وہی مونس والی لڑکی تو نہیں ——— ؟ وہ تو بے حد معمولی سی ہے ———" ہم نے فرمایا۔

"ابا جان اس کی ٹھوڑی پر جو خوشنما تل ہے وہ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آجکل کے نوجوان خوشنما تل پر عاشق ہو کر سالم لڑکی سے شادی کر بیٹھتے ہیں ———"

"ابا جان محبت بری چیز ہے۔" وہ سرد آہ کھینچ کر بولا۔

"تو سپاہی ہے تجھے تلوار اور گھوڑے سے محبت کرنی چاہیے۔ ہم خود گھوڑوں کو چاہتے ہیں۔ گھوڑے جب پیار کریں تو ساریوں کو رنڈیوں کی فرمائش نہیں کرتے۔"

"ابا جان! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ——— اس سے ———"

"خبردار گستاخی کرتا ہے۔ جانتا نہیں کہ تو نادر شاہ ابن شمشیر ابن شمشیر کی اولاد نا خلف ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ دادا جان کا نام شمشیر تھا، شمشیر شاہ ———"

"ابے گستاخ! شمشیر سے مراد تلوار ہے، سمجھا؟"

"سمجھ گیا ——— ابا جان کیا آپ مجھے چار روپے آٹھ آنے دے سکیں گے سرکس کے لیے؟"

ایسے نالائق کو ہم اور کیا کہہ سکتے تھے؟

ہمارا اصلاحات رائج کرنا

صاحب صدر محترم بردار خاص معروض ہوا کہ شہنشاہوں کا رواج رہا ہے کہ رعایا کی بہبودی کے لیے جو نئی اصلاحات نافذ کرتے ہیں۔ ذرا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی چند مفید اصلاحات عمل میں لائیں تاکہ اہل ہند ہمیں رہتی دنیا تک یاد کریں۔ ہم حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں ہماری ہر حرکت میں اہل ہند کے لیے کوئی نہ کوئی اصلاح پوشیدہ تھی جب دیکھا کہ وہ سمجھا ہی نہیں چھوٹا منہ کافی غور و خوض کے بعد مندرجہ ذیل فہرست مرتب فرمائی:

۱۔ دہلی کو پھر دارالحکومت بنایا جائے۔ وہاں سے قطب تک دس دس میل کے فاصلے پر عالیشان سرائیں تعمیر کرائی جائیں تاکہ حملہ آوروں کو کسی وقت کا سامنا نہ ہو۔ سڑک پر جگہ جگہ "خوش آمدید" نصب کیا جائے۔ ساتھ ہی ایک شکمکھولا جائے جو وہ سرحدی ملکوں میں بشوا شامت کے نذرانے لینے لوگوں کو ہند میں آنے کی ترغیب دے۔

۲۔ بیاس اور جمنا کے درمیان ایک وسیع علاقہ خشک اور غیر آباد پڑا ہے اس قطعے کو سیراب کرنے کے لیے ایک عظیم الشان دریا کھدوایا جائے۔

۳۔ ہند کے تاریخی مقامات ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کو بڑی قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاج محل آگرے میں ہے۔ مینار دہلی اور لاٹ لاہور میں۔ ان سب تاریخی عمارات کو منہدم کرا کے دلی میں ایک مرکزی مقام پر دوبارہ تعمیر کرایا جائے تاکہ سب کچھ ایک وقت دیکھا جا سکے۔

۴۔ ہر سال رخصت اکھاڑنے کا مرحلہ بڑے زور شور سے منایا جائے۔

۵۔ قطب صاحب کی لاٹ کا نام تبدیل کر کے اگلے حملہ آور کے آنے تک نادر شاہ کی لاٹ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو حملہ آوروں کے نام بآسانی یاد رہ سکیں اور تاریخ بند مرتب کرنے میں آسانی ہو۔

وہ اصلاحات گنانے بیٹھیں جو ہم نے اس مختصر سے قیام میں نافذ کرائیں تو بے شمار ہیں۔ ہمیں یاد بھی نہیں رہیں۔ مثلاً بارہ دری کی جگہ تیرہ دری بھی تعمیر کرائی جائیں۔ جنگل میں منگل ہی نہیں بدھ بھی منایا جائے وغیرہ وغیرہ۔

محبت اور شادی کے متعلق ہمارے خیالات

ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی سے اور شادی کو محبت سے دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں لیکن نوجوان بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کے تجربے سے مستفیض نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی مول لے بیٹھتے ہیں۔

اکثر شاہد ہے ہیں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے پچھتاتے تھے وہ شادی کے بعد بھی خوب پچھتاتے ہیں۔ ہم کبھی نہیں پچھتائے حالانکہ ہم کسی زمانے میں بڑے بانکے البیلے نوجوان مشہور تھے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ برخوردار علی شادی پر تلا بیٹھا ہے تو ارادہ ہوا کہ اسے من مانی کرنے دیں، کیا یاد کرے گا لیکن ان ہی دنوں ہم ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہوئے جو ہمارے جیسے بزرگ کی شان کے شایاں ہرگز نہ تھی۔ وہ یہ کہ ہم چھپ کر کسی کی

باہمی تصنیف کے حامی نہیں ہیں' اس روز نہ جانے کیونکر یہ برداشت کیا اور ہوٹل سے ان دونوں کی گفتگو سنی۔

لڑکی نے برخوردار علی قلی کی آمدنی کے متعلق پوچھا۔ علی قلی نے بتایا کہ والد رہا کہ والد مرگ شہنشاہ ہیں۔ وہ بولی "شہزادوں کی تو ... کے فضل سے یہاں بھی کوئی کمی نہیں' ہر قسم کا نوجوان شہزادہ ہے بلکہ غیر شہزادہ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"ہمارے ملک میں تیل کے چشمے ہیں۔" علی قلی کا یہ کہنا تھا کہ لڑکی کی باچھیں کھل گئیں۔

"تمہارے کنبے کے متعلق آقی پوچھ رہی تھیں تم متمول ہو؟"

"متمول وغیرہ کا پتہ نہیں' ویسے ہمارا خاندان تو شیراز سے متعلق ہوتے ہیں ..." علی قلی بولا۔

"بہرحال ہمارے کنبے والے ایران سے تمہارے چال چلن کی تصدیق کر لیں گے۔"

"چال تو میں ابھی چل کر دکھا دیتا ہوں ..." علی قلی نے بھولپن سے کہا ... "رہ گیا چلن' شادی کے بعد ایران چلو گی تو وہاں دیکھ لینا۔"

"ایران جانا تو ذرا مشکل ہے کیونکہ امی جان مجھے لے جا چکی ہیں' وہ کہتی ہیں کہ شہزادہ علی قلی ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ جایا کرے گا۔ یا یوں ہو کہ آپ جان شہنشاہ محمد شاہ سے مل کر تمہیں کوئی ریاست الاٹ کرا دیں۔"

"یہ تو بہت بھی اچھی ہے ..." وہ نامختلف بولی۔ "لیکن اگر میں ایران چلا گیا تو تم اداس رہا کرو گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں کافی شہزادوں کا آنا جانا ہے۔"

علی قلی بگڑنے لگا۔ "تم پرسوں شام کس شہزادے کے ساتھ ہوائی کے مغربے گئی تھیں؟"

"وہ تو بھائی جان کے دوست ہیں۔ ان کی پالکی بالکل نئے ماڈل کی ہے' تمہارے ساتھ پیدل چلنا پڑتا ہے۔ شام کا وقت خراب ہو جاتا ہے۔"

ہم یقیناً گفتگو سنے بغیر تشریف لے آئے۔

علی قلی کا علاج

ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ لڑکی بہت زیادہ ماڈرن خیالات کی ہے' بیچارے علی قلی کو وہ نگینی کا ناچ نچا ٹھگی کہ زندگی بھر یاد رہ جائے گا۔ ہم نے برخوردار خان فیلسوف سے ذکر کیا' اس نے ہنسنے کی بات کہی' جی کہ وہ دونوں محض فلرٹ کر رہے ہیں' سنجیدہ کوئی بھی نہیں ہے۔ علی قلی لڑکی سے ہمیشہ شام کو ملتا ہے اور شام کو اس کے سانس میں سے رنگیں کی بو ہوتی ہے جسے وہ الائچی یا پان سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روز اس کی پوستین سے پوست کی کافی مقدار برآمد ہوئی۔

ہمارا تجربہ ہے کہ غروب آفتاب کے بعد قندیلوں کی جھلملاتی روشنی میں سب لڑکیاں حسین معلوم ہوتی ہیں خصوصاً چند گھونٹ ... نہیں چڑھا لینے کے بعد۔

ہم نے درویش کامل شیخ بولیا شجر پوری کا نسخہ نکالا جو انھوں نے محبت اُتارنے کے سلسلے میں بتایا تھا۔ اسے علی قلی پر آزمایا اور تیر بہدف پایا۔ شام ہوتے ہی علی قلی کو کہیں باہر کام پر بھیج دیا جاتا' "پنیا پلانا چھڑوا دیا گیا۔ لڑکی لگاتار علی الصبح اسے دکھائی گئی' سیج کی

روشنی میں جب ملی خاں نے لڑکی کی اصلی شکل بغیر میک اپ کے دیکھی تو بہت سے راز ہائے نہاں آشکار ہوئے۔ چند ہی روز میں ایسا بد ظاہر کہ لڑکی سے کوسوں دور بھاگنے لگے۔ دل کا مرض ہی نہ کہتا تھا بلکہ ایک روز معروض ہوا کہ میں تارک الدنیا بننا چاہتا ہوں ہم نے اسے منع کر دیا۔ شیخ بڑا تجربہ کار ہے بقیہ نسخے بھی استعمال کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہند کے بادشاہ گر

ہند کے وہ بادشاہ گر سید برادرز (حسین علی خاں اور بہ نہیں کہ یا علی خاں) تقریباً ہر روز پریس کانفرنس منعقد کرتے اور انواع و اقسام کے بیان دیتے۔ چونکہ پریس ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے ملک کی سیاست پر پورا قابو تھا۔ دونوں بھائی اکثر دورے پر رہتے تھے اس لیے ہماری خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، ایک روز ہم نے بازار میں ایک بورڈ دیکھا جس پر "اصلی شہنشاہی بادشاہ گران ملکت و ہند" لکھا تھا۔ اوقات و ملاقات اور مشورے کی فیس بھی درج تھی۔ ہم نے انھیں اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا اور انھیں بلا کا چست و چالاک و چار سو بیس پایا۔ کاش کہ ہم ایسے سمارٹ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتے۔ محمد شاہ سے کہا کہ ہمیں ایک جوڑی بادشاہ گر درکار ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ ان ہی کے دم سے تو دلی میں رونق ہے۔ للہ انھیں چھوڑ جائیے گا اگر البتہ حاضر ہیں؟

"وہ تو ہم ملتان سے خرید لے سکتے ہیں ـــــ" ہم نے فرمایا۔

ایک رفیقِ دیرینہ سے ملاقات

چاندنی چوک سے گذر رہے تھے کہ شور و غل سنائی دیا، دیکھتے ہیں کہ بہت بڑا جلوس آ رہا ہے، آگے آگے ہاروں سے لدا ہوا ایک شخص ہے کہ شکل اس کی زمانہ ساز خاں سے ملتی ہے یہ زمانہ ساز خاں ہی تھا۔ ہمیں پہچان گیا، معانقہ کیا، معلوم ہوا کہ ملک کے بڑے لیڈروں میں سے ہے۔ خدا کی شان کہ یہی زمانہ ساز خاں کبھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا اور بھیڑوں کی اون تراشتا آج اس شان و شوکت سے نکلتا ہے کہ شہنشاہ دیکھیں تو رشک کریں۔ شام کو ہم نے اسے مدعو کر کے اس کی عزت افزائی فرمائی اور اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا کہ اس کی زندگی قربانیوں کا مرقع رہی ہے، ملک اور قوم کی خدمت کر کے اس رتبے کو پہنچا ہے۔ شراب کا دور چلا تو بہت جلد آؤٹ ہو گیا۔ ہمارے دوبارہ استفسار کرنے پر اصلی بھید کھلا۔ اس نے اقبال کیا کہ ایران سے یہاں آ کر بکریوں کی اون تراشنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پوسٹر چسپاں کرنے پر ملازم ہو گیا۔ ایک روز شومئی قسمت سے کوئی پوسٹر لگاتا ہوا گرفتار کر لیا گیا۔ صاحب پوسٹر سے جیل میں تعارف ہوا۔ رہائی کے بعد انھوں نے ایک سیاسی جلسے میں بلایا۔ سٹیج کے قریب دھواں دھار تقریر سننے میں ہمہ تن گوش تھا، دیر خاک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، کہ لاٹھی چارج کی مہیب صدا کانوں میں پڑی، کھلبلی بھر میں افراتفری مچ گئی، چنانچہ مخالف سمت میں جست لگائی اور اتفاقاً سٹیج پر جا پہنچے، کھڑا پایا۔ گرفتاری شروع ہوئی تو غلطی سے لیڈروں کے ساتھ دھر لیا گیا۔ جیل میں سیاسی قیدیوں والا سلوک ہوا جو کہ نہایت تسلی بخش تھا، رہائی ہوئی تو بینک نے جھنڈوں، بینڈ باجوں، نعروں اور آتشبازی سے استقبال کیا، شہر بھر میں جلوس نکلا۔ گھر پہنچا تو بالکل جی نہ لگتا تھا، اگلے ہفتے سیاسی جلسے میں دانستہ طور پر سٹیج کے قریب رہا، لاٹھی چارج ہوتے ہی خود لیڈروں میں گھس گیا تاکہ گرفتاری کے وقت آسانی سے دستیاب ہو سکے۔ بڑے گھر میں قیام و طعام کا انتظام گھر سے

لاکھ درجے بہتر تھا اپنا کچھ تقریباً ہر ماہ یہی تماشا ہوتا۔ یہ بلک بھی اسے بارہا دیکھ کر نوٹس لینے لگی، اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ آہستہ آہستہ وہ بچہ ڈیڈ سا بنتا جا رہا ہے۔ اب اس نے سنجیدگی سے کام شروع کیا کتابوں سے تقریریں نقل کرنے لگا۔ آئینہ کے سامنے مشق شروع کر دی۔ خدا نے دن پھیرے اور وہ لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔

ہم نے یہ سنا تو رشک و حسد کے جذبات محسوس فرمائے۔ پھر سوچا کہ موجودہ پوزیشن بھی کوئی خاص بُری نہیں ہے فرمایا رہنے دو بس ہوا کہ "برخوردار ماں علی قلی خاں کچھ کچھ پروفیسری سا معلوم ہوتا ہے، کہیں نہ اس کو اسی لائن میں ڈال دیں۔" ہم نے فرمایا کہ علی قلی خاں پروفیسر بننے والا ہے۔ یہ تو جب چاہے لیڈر بن سکتا ہے۔ وہ ملتمس ہوا کہ یہ بھی درست ہے لیکن فی زمانہ لیڈری افضل ترین پیشہ ہے، ہم نے بات کاٹی اور فرمایا کہ نہیں لیڈری نمبر دو ہے اور پیری نمبر ون فرمایا۔

ہمارا مقامی سیاست میں حصہ لینا

ان دنوں الیکشن زوروں پر تھی۔ اُلو شناس معروض ہوا کہ ہم دلی میں اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کسی ٹکٹ پر کھڑے ہو جائیں انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بادشاہ گروں سے مشورہ لینا بیکار تھا کیونکہ الیکشن کے معاملے میں وہ بالکل یوں ہی تھے۔ ایک ایک حلقہ پر لاتعداد امیدواروں کو نامزد کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات امیدواروں کی تعداد رائے دہندگان سے زیادہ ہو جاتی۔ بالفعل یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں محمد شاہ بھی تھا۔ فرمانبردار خاں نے جب معمول نہایت مایوس کن خبریں سنائیں، جب ہم نے اس کو بُرا بھلا کہا تو وہ بھی مان گیا کہ واقعی ہم شہر میں بے حد ہر دلعزیز ہیں اور الیکشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ شخص آہستہ آہستہ ہمارے مزاج سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔

سات امیدواروں سے دو کو زیر کیا گیا، تیسرے کو ڈرا دھمکا کر بٹھایا گیا، چوتھے کو صفر بنا کر باہر بھجوانا پڑا، دو خاں، رجب علی بنکے ایک کو زوہ کو جب کرایا تو مانا، دوسرے نے مشکوک حالات میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ راستہ شماری شروع ہوئی، فقیر بردار خاں نے شہر بھر کی دعوت کی، لوگوں کو تحفے اور نقد دیا، راستے دینے والوں کو طرح طرح سے خوش کیا۔ اتنی خاطر تواضع کے بعد بھی کوئی بدتمیز نہ مانتا تو اسے ڈنڈے کے زور سے منوایا جاتا کہ ہم سچ مچ ہر دلعزیز ہیں۔ ہم جیت تو گئے لیکن اخراجات کی تفصیل دیکھی نہ جا سکی۔ بیان ہوئے، افسوس بھی ہوا کہ ناحق ذرا سی خوش وقتی کی خاطر اتنا روپیہ اور وقت برباد کیا۔ معلوم ہوا کہ ہند میں ہر صاحب دولت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشن لڑے۔ سیاسی معاملات میں یہ لوگ سنجیدہ بالکل نہیں ہوتے۔ نتیجے سے زیادہ وقتی ہنگامے کی پروا کرتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ملک ملک کا رواج ہے صاحب۔

دلی میں سیٹل ہونے کا ارادہ

اُلو شناس نے مشورہ دیا کہ دنیا میں یوں مارے مارے پھرنے کی بجائے کیوں نہ ہم ایک بھی ہی مملکت میں باقاعدہ سیٹل ہو جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حیثیت مانند ایک رضیوجی کے رہی ہے۔ ہم نے عزیزی محمد شاہ سے ذکر کیا اور رائے لینے کے لیے اپنا قصہ

الاٹ کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا "لال قلعے میں تو ہم رہتے ہیں، آپ قطب صاحب کی لاٹھ الاٹ کرا لیجیے یا شاہی مسجد۔

ہم نے انکار فرمایا اور اپنے مہاجر ہونے کی اہمیت بتائی۔ وہ بولا "ہم لوگ بھی تو مہاجر ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ معاشی مہاجر ہیں اور ہم نو وارد ہیں جنھیں اب تک نہیں بسایا گیا۔ اس نے گستاخانہ کہا "یوں تو حضرت آدم بھی مہاجر تھے کہ بہشت چھوڑ کر آئے تھے۔

ہمیں سخت غصہ آیا لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ بات ہے ہندیں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ پہلے جیسا غصہ ہی نہیں آتا لیکن محمد شاہ کو اس گستاخی کی سزا اسی شام کو مل گئی۔ آتوشناس بھاگا بھاگا آیا، بولا محمد شاہ خزانے میں ہے اور زرد جواہرات ادھر اُدھر چھپا رہا ہے۔ ہم فوراً موقع پر پہنچے، ہمارے دیکھتے دیکھتے اس نے ایک زرد سی چیز اپنی پگڑی میں چھپالی۔ ہند کے مزاج کے مطابق ہم نے ازراہ مزاح فرمایا کہ آج سے محمد شاہ اور ہم بھائی بھائی ہیں لہٰذا ہم نے وہ دونوں اپنی پگڑیاں بدلیں گے۔

محض اتفاق تھا کہ اس کی پگڑی سے کوہ نور ہیرا برآمد ہوا۔

ہندی وزرا سے شکر رنجی

آتوشناس اور محمد شاہ کے وزراء کی ناچاقی کی وجہ دو کروڑ کی وہ رقم تھی جو شاہی ایلچی ہمارے لیے کرنال میں دے کر آیا تھا۔ وزیر کا اصرار تھا کہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ آتوشناس انکار کرتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ رقم دو کروڑ نہیں ڈھائی کروڑ تھی۔ ایلچی اسی کشمکش میں اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ ہم نے محمد شاہ سے فرمایا کہ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے لہٰذا شاہی خزانے سے رقم چکا دی جائے۔ رقم ادا کر دی گئی لیکن شکر رنجی نہ گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ اپنے وزیروں سے ڈرتا ہے، بولا اہلِ دربار کی التجا ہے کہ اس مرتبہ آپ سے رسید لکھوالی جائے۔ ہم مان گئے۔ ڈھائی کروڑ کی رسید تیار کی گئی۔ ہم نے دستخط شروع کیے۔ ابھی چوتھی مرتبہ ہی اپنا شہرہ لکھا ہوگا کہ وہ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ کاغذ جھوٹا ہے۔ دستخط مختصر ہونے چاہئیں۔ عزیزی محمد شاہ کے دستخط تو بے حد مختصر ہیں، اس نے صرف حروف میں محض "ایم۔ ایس رنگیلا" لکھا۔

اب کمبخت محرر کہیں سے آمرا، معروض ہوا کہ محاسبہ اعلیٰ کے اعتراض سے بچنے کے لیے رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ چپکایا جائے۔ ٹکٹ لگا یا تو معلوم ہوا کہ یہ غلط ٹکٹ تھا، محکمہ مالی کا ٹکٹ ہونا چاہیے۔ پھر کسی نے کہا کہ ایک آنے کا نہیں دو آنے کا ٹکٹ لگنا چاہیے۔ مجبوراً اپنی جیب سے دو آنے دیے۔ اس دفتری کارروائی سے بہ بیت بندرہ سی ہو گئی اور ساڑھے چار کروڑ کا لطف نہ آیا۔

"ایسے لاجواب وزیر تم نے کہاں سے حاصل کیے؟" ہم نے پوچھا۔

"وزیرستان سے!" وہ بولا۔

"اور یہ وزیر آباد کیا ہے؟"

"یہ یونہی ہے۔"

ایک باکمال بزرگ

قطب الدین خاں جہانگیر ثانی کی شادی پر گئے، دولھا کی جب درگت بنی۔ عورتیں پہلے تو اسے بُرا بھلا کہتی رہیں، پھر زدوکوب

کہنے لگیں اور وہ تھا کہ چپ چاپ بیٹھا تھا، سوچا کہ ان بن ہو گئی ہے لیکن معلوم ہوا کہ شادی کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ لاحول پڑھی۔

نکاح سے قبل ہم نے دولہا سے دریافت کیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تاکہ پوری کر دی جائے۔ وہیں ایک لنگوٹی پوش بزرگ کو دیکھا کہ لمبا سا عصا ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھے ہیں کسی کو علم نہ تھا کہ یہ رہتے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں لیکن کہیں شادی ہو تو ضرور آتے ہیں۔ نکاح شروع ہوا تو زور زور سے آگئے۔ جب دولہا نے "قبول کیا" کہا تو بزرگ نے ڈنڈا اچھال کر "چانس گیا" کا نعرہ لگایا اور خاتب ہو گئے ہر شادی میں وہ اسی طرح کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ ہند میں ایسے ایسے بالکمال بزرگ بھی موجود ہیں۔

مینا بازاروں کی بھرمار

اب تو مینا بازار ہر ہفتے ہوتا، ملک کے مختلف حصوں سے خواتین آ کر مختلف سامان خریدنے کے بہانے آتیں اپنی دختران وغیرہ کو بھی ساتھ لاتیں۔ نہ جانے کس نے اڑا دی تھی کہ بانو خدا نخواستہ ہم ایک اور شادی کر لیں گے یا خود اعلیٰ قلی خاں مثنیٰ کرا لے گا لیکن ہم خواتین سے دور ہی رہتے۔ برخوردار علی قلی کو بھی دور دور رکھتے ہم شادی بیاہ کے بالکل قائل نہیں ہیں۔

خواتین سے دور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ان کے قریب رہ کر ہمیں یہ بے تکلفانہ انداز اپنانے اور انگلی سے ناک چھو کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ روزانہ گفتگو میں ہمارے منہ سے غیر شعوری طور پر "اُف اللہ، توبہ، ہائے، ٹکوڑا وغیرہ جیسے کلمات بھی نکل جاتے جس سے بعد میں سخت پشیمانی ہوتی۔ ہم زیورات، کپڑوں اور ساس ہو کے قصیدوں میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا اٹھتے، بات بات پر لڑنے کو تیار ہو جاتے۔ چنانچہ جب کسی خاتون نے مینا بازار میں ہم سے حملہ آوری کی وجہ پوچھی تو ہم نے پہلے تو جھینپ کر بازار میں اسے کوسنے دیے کہ اگر ہم نہ آتے تو کوئی اور آ جاتا۔ پھر فائنل منگا کر وہ تار کا لفیٹ (مسلط خط) دکھایا جو ہندی اردو میں تھا جس میں لکھے تھے اور ہمیں حملہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ہماری حملہ آوری کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے جو فرمانبردار خاں کو یاد ہو گی)

جنوبی ہند سے وفد

جنوبی ہند سے وفد برائے نادر یار جنگ بہادر آیا۔ ہم بہادر منہ ور ہیں، بہک کا بھی شوق ہے لیکن یار وغیرہ کسی کے نہیں ہیں۔ انھیں گلہ تھا کہ خیر سے آنے والے حملہ آور دلی تک آتے ہیں اور وہیں سے ہو رہتے ہیں، جنوب کو بھولے سے بھی نہیں نوازتے۔ ہم چونکہ سیٹل ہونے کے اہم مسئلے پر غور فرما رہے تھے اس لیے ہندوری ظاہر کی۔ انھوں نے التجا کی کہ شبیہ مبارک کی ایک تصویر ہی عنایت فرمائی جائے تاکہ کیلنڈروں، جنتریوں میں چھپوا سکیں۔ ہندی بادشاہ تصویر اتروا تے وقت ہاتھ میں ایک پھول پکڑ کر سونگھتے ہیں۔ ہم نے بدقت تمام کی اور دونوں ہاتھوں میں دو پھول پکڑ کر سونگھے۔

ایک ترقی یافتہ خاتون

ہمارا اور محمد شاہ کے دربار کی ایک ترقی یافتہ خاتون کا قصہ بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے

کہ ہمیں اس سے لگاؤ تھا۔ دراصل ہمیں تمباکو، شراب، عصمت اور دیگر فحشیات سے بچپن سے نفرت رہی ہے ——— خاتونِ موصوف کو گانے بجانے کا شوق تھا اور ہمیں گانے بجانے سے تشنج ہو چلا تھا۔ دربار میں اس نے "نئے تاب و تواں دارم" نے طاقت فرسا والی رباعی کچھ ایسے انداز سے گائی کہ یار لوگوں کو شبہ ہوا اور ناخواہی اڑنے لگیں۔ شروع شروع میں تو ہمارا خیال اس کی جانب رہا لیکن پھر "آفتاب" کے کھانے پر سنبھل گئے۔ اس نے بتایا کہ بالائی طبقے میں لڑکیوں کا ایک مدرسۂ فکر ایسا بھی ہے جو جہیزیں تو کرتی ہیں نوجوانوں سے اور شادی کرتی ہیں بوڑھے امیروں سے خواہ ان کی پہلی بیویوں کی تعداد کتنی ہی ہو کبھی کبھار بوڑھے کے پروگرام میں شریک ہو گئیں لیکن زیادہ وقت کزنوں کے ساتھ گذارا۔

ایسا کرنے میں وہ اپنے آپ کو اس لیے حق بجانب سمجھتی ہیں کہ نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے اور بوڑھوں کے پاس ہے اور باقی چیزیں آنی جانی ہیں۔

ایک روز ہم چڑ گئے، اس نے ایک غزل گائی جس کے شروع کے بول تھے ؎

ساٹھویں سال میں قدم آیا ۔۔۔ زلفِ مشکیں میں پیچ و خم آیا
آمد آمد ہوئی جوانی کی ۔۔۔ غمزہ و ناز و دل ستانی کی

یہاں ساٹھ برس کی عمر میں اکثر لوگ سٹھیا جاتے ہیں۔ ہم ساٹھ کے نہ تھے مگر سمجھ گئے کہ وار ہم پر ہوا ہے، دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے رہے لیکن قطعی رائے قائم نہ کر سکے۔ فرمانبردار خاں سے اپنی شکل و صورت کے متعلق دریافت کیا اس نے حسبِ معمول نہایت گستاخانہ مایوس کن جملے کہے طیش میں آکر اسے مرتے مرتے بچا گئے۔ پھر خیال آیا کہ فرمانبردار خاں تو پہلے سے ہی مرا ہوا ہے چنانچہ اسے معاف کیا اور ڈاکٹر شناس کو بلایا۔ وہ نک خوار دست بدستہ معروض ہوا کہ روئے پُر نور پر وہ پُر ہیبت جلال طاری ہے کہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھتیں لہٰذا شکل و صورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے بھی ہماری تسلی نہ ہوئی۔

پھر ہمیں معلوم ہوا کہ سارے معاملے میں مسز محمد شاہ کا ہاتھ ہے۔ محمد شاہ خود ترقی پسند ہے لہٰذا خاتونِ موصوف میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے، عورتوں کا حسد مشہور ہے، مسز محمد شاہ ہمیں اس عمر میں لے دوڑنا بنانا چاہتی ہیں کہ ہم اس طرح حسینہ کو اپنے ہمراہ ایران لے جائیں۔ ہم بھانپ گئے اور اس سے دُور دُور رہنے لگے۔ خاتون مذکور ہماری بے اعتنائی سے چراغ پا ہو گئی اور ایک جلسے میں ہمارے رجعت پسند ہونے کا اعلان کر کے ہم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا۔

خیر رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت!

جامعۂ فرقانی

آج صبح مُلّا فرقان اللہ بن پُرہان اللہ کہ نظامی جامعۂ فرقانی کا صدر ہے آستانِ بوسی کے لیے حاضر ہوا اور ملتمس ہوا کہ جامعہ ہم کو ایک اعزازی سند دے کر عزت افزائی (اپنی) کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ میں پورا کورس چھ برس کا ہے۔ بعض فارغ البال اور نیک نفس والدین کے بچے یہ کورس بارہ سال میں کرتے ہیں۔ ان طلباء کو علیحدہ کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی بچہ کورس کے اختتام سے پہلے بھاگ جائے تو اس کو صرف علامہ کی سند ملتی ہے، کورس پورا کرنے

تو علامۃ الدہر کہلاتا ہے۔ دوسری سند یعنی مثلاً ابوالبرکات، ابوالفضائل، ابوالفضیلت عموماً سرکاری محکموں، جامعہ کے معلمین کے دوستوں اور ہمارے جیسے سیاحوں، تاجروں اور جملہ آوروں کے لیے وقف ہیں۔ عزیزی محمد شاہ دو مرتبہ ابوالبرکات ہے اور تین مرتبہ ابوالفضیلت۔

جامعہ ہر سال چار سو علامۃ الدہر بناتا ہے جو عموماً بیس پچیس روپے ماہوار کے منشی یا کسی تاجر کے منیم بن جاتے ہیں۔ منشی بننے کے کوئی چار پانچ مہینے بعد ان کے والدین کو شادی کی اطلاع ہونہار فرزند کی نہیں، لکھ پڑھ جاتی ہے۔ شادی کرنے وقت شکل صورت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاتی (کیونکہ اس ملک میں شکل صورت نہیں ہوتی) صرف روپے پیسے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ عجیب تماشا ہے کہ شادی میں لڑکے والوں کے علاوہ ایک کثیر کی بھی توقع رکھتے ہیں، یہ بھی چاہتے ہیں کہ سسرال والے انھیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سمندر پار بھیج دیں تاکہ وہ خوب داد عیش دے سکیں۔ ہمارے خیال میں یہ اتنہا درجے کی کم ہمتی ہے۔ تبھی اس ملک میں پہاڑ جیسی لڑکیوں کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوتی جو لڑکوں کی ہوتی ہے۔

جامعہ میں ہماری تقریر

اعزازی سند کے سلسلے میں ہمیں خواہ مخواہ تقریر کرنی پڑی حالانکہ تین پہلے سے خوبصورت تیار کیا گیا تھا اور نہ ہم تیار تھے۔ پہلے مولانا فرقان اللہ جن بہ بلائی اللہ نے ہماری ذات کا تعارف یوں کرایا:

"حضرات! کیسا روشن سعید جامعہ کی زندگی میں آیا ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ صاحب کی ذات والا صفات کا نزول ہوا ہے۔ شاہ صاحب کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ آپ نے جس سلسلے میں دلی تشریف لانے کی زحمت گوارا کی ہے وہ اب واضح ہو چکا ہے۔ سنا ہے کہ جناب شاہ صاحب بین الاقوامی سطح پہ ایرانی اور ہندوستانی روپے کی قیمت پہچاننے آئے ہیں۔ آپ کی علمیت شبہ مبارک سے ظاہر ہے آقا صاحب پہلوی زبان کے ہر پہلو سے ماہر ہیں، انشہنشاہی سے پہلے آپ کا شغل ـــــ خیر جانے دیجیے ـــــ ان کی تقریر کو خاموشی سے سنا جائے کہ جنھ آپ شہنشاہ ہیں اور آپ کو اپنی بھی جامعہ مدظلہا سے کچھ علاقات مقصود تھی جو اتفاق سے اس ملک میں مقیم نہیں ہیں لیکن ہماری شامت اعمال ـــ معاف کیجیے ـــــ اچھا تو حضرات ـــــ مولانا نادر شاہ صاحب ـــــ"

ہم کو اس بدتمیزی پر بخت غصہ آیا کہ ہمارے تئیں کبھی آقا کہا ہے تو کبھی مولانا! ایک بات پہ قائم نہیں رہتا۔ یہ شخص دانستہ طور پر ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ اچھا اسے سمجھیں گے۔ ہم تالیوں کے شور میں اٹھے اور فرمایا:

"پیارے اطفال، معلمین حضرات و پرنسپل مولانا لبیب اللہ! آپ نے ہم کو یہاں مدعو کر کے جامعہ کی جو عزت افزائی کی ہے اس کے لیے ہم آپ سب کو ممنون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ آپ کو یہ موقعے روز روز کہاں میسر ہوتے ہیں کہ ہم سا شہنشاہ آپ کو اپنی خوش کلامی سے تفیض کرے۔ اقلاً تو ہمیں آپ حضرات کی زبوں صحت پہ تعجب ہوتا ہے، رونا بھی آتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ یہاں کوئی دو ہزار کی تعداد میں بیٹھے ہیں۔ بخدا ہمیں ٹڑھ سو کے قریب لگ رہے ہیں۔ پرسوں دربار میں کوئی کارپنٹر میں گنڈھا کے کی مثل ایک انگوٹھی میں سے گذارا گیا تھا، دوسری طرف سے لڑکے کو جھٹکے سے کھینچا گیا تو کارپنٹر خود بھی انگوٹھی میں سے گذر گیا۔ اس قدر دھان پان انسان ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھے، یہ آپ کی غذا کا قصور ہے یا آب و ہوا کا۔ آپ کے چہروں پر کچھ ایسا جمود اور بے حسی ہر وقت لگی ہے جیسے آپ ہر چیز سے مطمئن ہیں۔ آپ ہی کیا رہے ہیں زندگی بھی یہاں کر رہے ہیں۔ آپ کے قبرستانوں میں کتبے تک غلط ہیں (ہم نے بلیک بورڈ پر لکھنا شروع کیا) مثلاً:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

ساٹھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

یہ فقرہ ہے اس کی بجائے یوں ہونا چاہیے:

شیخ خدا بخش مرحوم

فلاں سنہ میں پیدا ہوئے

پچاس سال کی عمر میں انتقال فرمایا

ساٹھ برس کی عمر میں دفن ہوئے۔

حضرات، اطفال! ہم ابراہی سے بڑی بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔ خیال تھا دشمن کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے، کابل میں آئے تو سوچا بچے نہیں زندہ کوب کریں گے۔ جیب کترے تو ارادہ ہوا کہ ان سے کشتی لڑیں گے لیکن یہاں کی آب و ہوا کو اس درجہ سکون پرور اور بافت دوں کہ اس سدا نک با انماق، وضعدار، غریب و نزار پایا کہ دن بھر قیلولہ کرتے اور یار لوگوں سے گپیں اڑانے کا شغل اختیار کر لیا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کا اثر تو نہایت صلح جویانہ ہے۔ یہ خون کو بھی ٹھنڈا کرتی ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دشمن نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ مفت کی لڑائی بھڑائی سے آخر فائدہ؟ سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہند کی آب و ہوا اور بھی گئی گذری ہے لیکن ہم اور آگے نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں آپ کی عنایات پر، آپ کی قومی، ولایات بے حد شاندار ہیں، آپ نے کسی اجنبی کو مایوس نہیں کیا، کئی سو سال سے آپ کا شغل بیرونی لوگوں سے حکومت کروانا ہے اور تو اور آپ نے خاندانِ غلاماں سے بھی حکومت کروائی ہے اور وسعتِ قلب کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کو ایک روپے کی نقل کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے، یعنی آپ بھیڑ چال چلتے ہیں۔ (یہاں ہم نیچے سے اونچے اور بھیڑ چال چل کر دکھائی)

آپ کے ادب و موسیقی کے چرچے ہم نے بہاڑ کے اس پار سنے تھے۔ آپ کے ہاں تقریباً ہر شخص شعر کہتا ہے اور تخلص کرتا ہے۔ یہ آب و ہوا اور یہ صحت بخش کہ آپ کی ہے شعر و شاعری کے لیے نہایت سازگار رہی ہے۔ آپ کی موسیقی کے کیا کہنے، پچھلے ہفتے لال قلعے میں چار پانچ آدمیوں کو قوالی گاتے سنا، وہ تو خیر خوب سمرد ھنے اور وجد میں آکر تالیاں بجاتے۔ یہ لوگ بے سمر دا ہیں، گاتے وقت ایک کان پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں، غالباً مدرسہ سے کان سے جنے کھلا بھوڑتے ہیں ضرور بہرے ہو جاتے ہوں گے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ گانے کے بہانے طرح طرح سے ہمارا منہ چڑاتا تھا، ہماری طرف عجیب و غریب اشارے کرتا تھا۔ ہمیں غیض و غضب آیا ہی چاہتا تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ کچھ راگ گاتا ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے ہاں ہر وقت کا راگ جدا جدا ہوتا ہے۔ آپ کی موسیقی کا مطالعہ کر کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہاں صبح صبح ہر شخص بیزار ہوتا ہے، غالباً رات کو آپ زیادہ فشہ کر جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ ہوا کہ علی الصبح سرود لے بیٹھے لیکن وقت کے راگ نے غمگین کر دیا، رات کو عبادت کا قصد کر رہے تھے کہ وقت کے راگ سے متاثر ہو کر رنگ رلیاں شروع کر دیں۔

حضرات! حبہ ہم پشاور سے آگے آئے تو ہمیں بتایا گیا کہ سکندر یونانی کے زمانے میں یہاں بہت بڑا جنگل تھا۔ مبارک ہو کہ آپ نے بیشتر جنگلات کو صاف کر دیا ہے۔ آپ کے نزدیک درخت کا صحیح مقصد اس کو کاٹ ڈالنا ہے۔ ہم نے گاؤں میں بچوں کو چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے تفریحاً درخت کاٹتے دیکھا ہے۔"

ہماری تقریر جو کہ بے ربط تھی مُلّا فرقان اللہ کی گستاخی کا منہ توڑ جواب تھی۔ ہم دیر تک بولتے رہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اور کیا کچھ کہا۔ اچانک چند بدتمیز طلبا کی جماعتوں اور غراٹوں نے ہمیں چونکا دیا اور ہم بیٹھ گئے۔

سوالات اور جوابات

مُلّا فرقان نے اکھڑ کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا "اور شاہ سے سوال پوچھے جائیں تو آپ ان کا مناسب جواب دیں گے ——"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک کونے میں کھسر پھسر ہونے لگی "کیا آپ ملوکیت پسند ہیں؟" پوچھا گیا۔

"ہم تو اتفاق الملوکیت پسند ہیں۔" ہم نے جواب دیا۔

"تو کیا آپ شہنشاہ پسند ہوئے ——" کسی اور نے پوچھا۔

"شہنشاہ پسند؟" ہم نے مسکرا کر کہا "ہم خود شہنشاہ ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں شہنشاہی بیکاری چیز نہیں ——" سوال ہوا۔ "جب ہم سب کے سب ایک جیسے ہیں" ایک برخوردار بولے۔

"ہاں!" ہم نے فرمایا "جسمانی لحاظ سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اوپر والی سزا میں، ہم نے اپنے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، فرق ہوتا ہے۔"

"صاف صاف بتائیے قبلہ آپ دائیں جانب ہیں یا بائیں جانب ——"

یہ سوال ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ہم نے اسی طرح مسکراتے ہوئے (مقرر کو ہمیشہ مسکراتے رہنا چاہیئے) جواب دیا "ہم شہنشاہ نما تو سب کے بائیں جانب ہیں اور مُلّا فرقان اللہ کی داہنی جانب ——"

"کیا آپ ایران سے آئے ہیں ——؟"

ایسے آسان سوال پر ہم بڑے خوش ہوئے "ہاں ہاں برخوردار! اور کیا تم ہندوستان میں رہتے ہو؟"

"شہنشاہی سے پہلے آپ کا ذریعۂ معاش کیا تھا ——؟" ایک طرف سے آواز آئی۔

اگر یہ ہم سے کافی عرصہ پہلے پوچھا گیا ہوتا تو ہمیں سوچنا پڑتا لیکن اس سوال نے ہمیں سنبھال لیا۔ ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ شدید غصہ سے ہمارا جسم کانپنے لگا۔ ہم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میرا ذریعۂ معاش تلوار تھا۔" اور تلوار کے لفظ پر ہم نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ ہمارے اس جواب سے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ہم نے اپنی بات جاری رکھی "میں نے اپنی تلوار سے بہت سے سر قلم کیے ہیں۔ میں نے اپنی تلوار سے بہت سے سر قلم کیے ہیں۔ میں نے اپنی تلوار سے بہت سے سر قلم کیے ہیں۔" ہم نے تین بار دہرایا۔ "اور اب میں اپنی تلوار سے تمہارے سر قلم کروں گا۔" ہم نے اپنی تلوار نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہم نے تلوار نکال لی۔ ہال خالی ہو گیا۔ صرف مُلّا فرقان اللہ اور ہم رہ گئے۔ ہم نے تلوار لہرائی۔ مُلّا فرقان اللہ کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ہم نے تلوار کا وار کیا۔ مُلّا فرقان اللہ کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ

بھیج کر پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ شاہی اتھی کے خورد و نوش پر نصف سے زائد ماہانہ نیلام ہو چکا ہے۔ ہم نے دوبارہ دربار میں بلوا کر عزت افزائی کے بہانے ایک اور اتھی (جو سفید تھا) مرحمت فرمایا۔ ہفتے عشرے کے انتظار کے بعد خبر ملی کہ ملا فرقان اللہ نے خودکشی کر لی اور کیفر کردار کو پہنچا۔ ہمارے ساتھ کوئی سمجھتا کہ گا ویسا ہی ہوگا۔

اہلِ ہند کو گستاخیوں کا صلہ

ہم نے وہ فقرہ کیا کی مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذہانتی تنقید بھی ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گذشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعاؤں میں جاگ کر گذارنا پڑیں چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔ شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے، اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یا خواہ مخواہ کی کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقرا کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت ملی ہوئی کہ شہباز خاں آتوشناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں جنھیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

ہم دو ہزار ایرانی سپاہی لال قلعے میں رکھا کرتے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکیں، مفسدوں نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ ہم انھیں ہر شام مقفل کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ان سپاہیوں کو قلعے کے اندر چھوڑا گیا۔ ہمارے کچھ سپاہی چاندنی چوک سے گذر رہے تھے ان پر آوازے کسے گئے اور ٹماٹر، شلجم وغیرہ پھینکے گئے، ایسی گستاخی واردات کی اطلاع ہمیں ملی، ہم اسپِ زرد (یہ خطاب ہمارا دیا ہوا تھا) پر سوار ہو کر شہر میں گئے تاکہ رعایا کو شرفِ دیدار بخش کر ان کی غلط فہمی دور کر دیں۔ اب یہ مشہور ہو گیا کہ اصلی نادر شاہ تو بہشت کو سدھار چکے ہیں، یہ کوئی اور شخص ہے۔ جو بہروپ بھرے ہوئے ہے۔ ہم تختِ طاؤس پر بیٹھے تھے کہ دور سے "نادر شاہ مردہ باد" کے نعرے سنائی دیے، اسی وقت غیض و غضب میں تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے دو ہزار سپاہیوں کو کھولا اور تلوار کھینچ کر حکم دیا کہ تلوار کے دستوں سے لاٹھی چارج کرو۔ یہ تھا وہ "قتلِ عام" ——— ہم چاہتے تو باقاعدہ تلواریں استعمال کرا سکتے تھے۔ گرمی سخت تھی۔ ہم قمیص اتار کر موتی مسجد میں حوض کے کنارے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بیٹھے رہے۔

قتلِ عام

چنانچہ صاحب قتلِ عام شروع ہوا، ہمارے سپاہیوں نے فقط اہلِ شہر کو زدوکوب کیا تھا اس کے باوجود لاتعداد لوگوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اگلے روز ایک بزرگ آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور دردناک لہجے میں گویا ہوئے ——— کسے را زمانہ کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی ———

یہ شعر ہم نے پہلے سن رکھا تھا، چنانچہ ہم نے مسکرا کر دوسرا مصرع ——— مگر کہ زندہ کنی خلق را دوبارہ کشی ——— سنا کر ظاہر کر دیا کہ ہمیں پرانی فرسودہ شاعری زیادہ متاثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں شاعری کی جدید قدروں کا قدردان پا کر انھوں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر ایک آزاد نظم پڑھی جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی سوائے ایک مصرعے کے جس میں وہی تلوار و نیام میں ڈالنے کو کہا گیا تھا۔ ہم

جاگتے رہے تھے، گرمی زیادہ تھی، ہمارا دل ایسا اٹھا بغلگیر ہونے کی نیت سے آگے بڑھے کہ بزرگ جلدی سے آداب بجا کر چت ہو گئے۔ خیر، اب تلوار میان میں ڈالنے کی کوشش جو کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاتھ میں تو شہباز خاں کی تلوار تھی، ہماری تلوار تو پہلے ہی میان میں تھی۔ گویا کہ سارا قتلِ عام ہی غلط ہوا تھا۔ ہم نے فوراً منادی کرا دی کہ پہلا قتلِ عام غلط ہوا ہے بلکہ ہوا ہی نہیں کیونکہ تلوار تو میان سے ذرا نہیں نکلی۔ چنانچہ اس مرتبہ وہ سرا صحیح قتلِ عام شروع ہوا جو کافی کامیاب رہا۔ دراصل فریقین کو کافی ریہرسل مل چکی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس کے بعد ایک مختصر سا قتلِ خاص بھی کر ڈالیں جو اُمرا کے لیے ہو۔ پھر سوچا اہلِ حق اس قسم کے تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں، تیمور کا قتلِ عام بھی دن رات تک ہوتا رہا تھا بھلا ہمیں یہ کب خاطر میں لائیں گے۔

شام کو وہی بزرگ آئے، ایک اور آزاد نظم سنائی (جو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی) اور معافی کے خواستگار ہوئے، ہم بھی مسجد میں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک چکے تھے، مسکرا کر معاف فرمایا اور ازراہِ تلطف انھیں بغلگیری سے سرفراز فرمایا، وہ فوراً بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو پسلیوں میں درد کی شکایت کرتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، شاید ہماری بغلگیری کا نتیجہ ہو۔ آئندہ محاظ رہیں گے انشاء اللہ بساری تعالیٰ کار ساز ہے۔

ہم پر کیبل ڈلوانے کی کوشش

شام کو دریائے جمنا کے کنارے مچھلی پکڑنے کی نیت سے بیٹھے تھے، مچھلیاں تھیں کہ جلالِ شاہی سے قریب نہ پھٹکتی تھیں۔ اتنے میں ہوا چلا تھا، اچانک ہم نے اپنے اُوپر کیبل کا دباؤ محسوس فرمایا، سوچا کہ کوئی ہمارا پرستار ہے جو خنکی کا خیال کرتے ہوئے کمبل اُڑھا لایا ہے، چنانچہ خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن ہمیں بالکل ڈھانپ دیا گیا، ہمارا دم گھٹنے لگا، گستاخ آوازیں سُنیں تو معلوم ہوا کہ کوئی شرارت ہے، ہڑبڑا کر اٹھے۔ دونوں لفنگوں کو پکڑ کر بغلوں میں دبایا ہی تھا کہ انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر سعادت دارین پائی۔ نیا ملک ہے، خبردار رہنا چاہیے۔

واپسی کا قصد

ایک کباڑیئے کی دکان پر پوستین دیکھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے، فرغانہ، دراخاں کی آنکھوں میں، ہم کبھی پوستین کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنے چوڑی دار پاجامے اور جالی دار کُرتے کو۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پوستین ہماری ہی تھی، اس قدر تنگ ہو چکی تھی کہ کوشش کرنے کے باوجود نہ پہن سکے۔ پہلے سے ہمارا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ دن بھر طرح طرح کے خیالات دل میں آتے رہے۔ دلی کے قیام نے ہمیں کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ ہم موٹے ہو گئے ہیں، بات کو ہر اُٹھے لیتے ہیں، صبح کی چاء اور دلتا کو خوشی کے بغیر ہضم سے نہیں اُٹھتے۔ قیلولے کی عادت قبیحہ ہمیں شام تک بیزار رکھتی ہے، ہماری رنگت سنولاتی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہندی شاعری میں سانولا، سنوریا، کالیا وغیرہ کو پسند کیا گیا ہے تاہم یہ پسندیدگی قابلِ کشش نہیں کیونکہ ہندی شاعری ہے تو عورت کی زبانی لیکن شاعر سارے مرد ہیں اور پھر ہم نے جنوبی ہند کے باشندوں کو بھی دیکھ پایا تھا جن کے آباؤ اجداد کبھی اچھے بھلے ہوں گے۔ ادھر ملک میں محبوب دھاچوکڑی مچی ہوئی ہے۔ ہماری تقریباً ۲۰ قتلِ عام سے پبلک دشمن بن گئی ہے۔ ہر روز کہیں بھوک ہڑتال ہو رہی ہے تو کہیں ستیہ گرہ۔ کمبل ڈالنے کے حادثے نے ہمارا موڈ قطعی طور پر خراب کر دیا ہے۔ چنانچہ پیٹل ہونے کے خیال پر لعنت بھیجی اور کوچ کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ہمارا دلی سے تشریف لے جانے کا حال

خدائے فضل سے سفر راہ کافی تھا کہ راستے میں اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے فاندان حضرت محمد شاہ کو اجازت دے دی کہ اگر اس کی نظر میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو ہم بطور تحفہ لے جا سکتے ہوں اور خلطی سے یاد نہ رہی ہو تو بے شک ساتھ باندھ دے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ فال تھا ب خالی خالی معلوم ہو رہا ہے حقیقت یہ تھی کہ لال قلعہ ہمیں بھی خالی خالی سا معلوم ہوتا تھا۔

اب فرودہ سماء ہو کر دہ دیوار پر حسرت کی نظر ڈال ہی رہے تھے کہ ہمیں بیچ سے گھوڑے سے نیچے آ گئے۔ اس بے ایمان گھوڑے کو ہم نے زیادہ نہ پڑھا لیا ہے۔ امیر ہی طور پر اہل ہند کو والپس دے دیا اور سید ہی محمد شاہ سے فرمایا کہ اس انسان ناشناس کو خطاب سے محروم کرنا تشنیع ہے جتنا یا ہے۔

کابل میں والیٔ کابل سے نجات

والیٔ کابل ہماری خدمت میں ملتمس ہوا کہ آپ ہند سے ہمارے لیے جو تحفے لائے ہیں وہ ہمیں عنایت فرمائیں ورنہ مروت سے بعید ہوگا۔ ہم نے سمجھایا کہ یہ ہدایا وہ ہیں جو بادشاہ نے تحائف جو وہ دیکھ رہا ہے بادشاہ کے لیے بھیجے ہیں جن سے ہم موتے دم تک تجاہ نہیں ہو سکتے البتہ کچھ چیزیں ہیں جو ہمارے کام کی ہو سکتی ہیں۔ والیٔ کابل عاقل نہ ہوتا تھا عجیب بیوقوف آدمی ہے دنیاوی دولت کی ہوس اس کو بہت ہے۔ جتنا سمجھایا کہ آدمی کو خدا سے کو لگانی چاہیئے دنیا آنی جانی ہے۔ شیخ چلی کی مثال پیش کی کہ دنیا داری سے مستغنی ہو ترک الدنیا بنے بیٹھے ہیں۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ گستاخانہ بولا۔ آپ خود تارک الدنیا کیوں نہیں ہو جاتے۔ بہت کہا کہ ہمارے حالات مختلف ہیں مدت تک پر تارک الدنیا بھی بن کر دکھا دیں گے۔ جب نہ مانا تو ہم نے ٹال دینے کو فرمایا کہ تو خود سیاحت پر کیوں نہیں چلا جاتا۔ آدمی سیانا تھا جان گیا کہ پچھلے چالیس پچاس سال کی دولت تو ہم سمیٹ چکے ہیں اب وہ ہند گیا تو کر کری ہوگی۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ آخر زاد راہ پر دش اس کو پانچ شتر نازی، چند اسپ باکمال دو عدد مقامی مینڈھے دو من کلغنہ لال قلعہ کا کچھ بوسیدہ و زنجیر، فرنچی پنجرے میں ہند ایک ہندی کو لالچ دے کر سرفراز کیا اور اس عزیمت سے چھوڑ کر ہماری جان چھوٹی۔

ختم شد

تمت

ہمارا خلد میں نزول

جس بات کا ڈر سے خدشہ تھا آج وہی ہو کر رہی۔ چند ناہنجاروں نے تنہا پا کر گھیر لیا اور ہمارا کام تمام کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہند سے ایران واپس پہنچ کر ہم اس نئی سیاحت پر شوئے عراق نجف کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنی ناکہاں جانا مرگ پر بے حد قلق ہے کیونکہ اس میں مشیت ایزدی ہرگز نہ تھی، اگر ہم فرمانبردار خاں کا کہا مان لیتے اور رات کے گئے تنہا باہر نہ نکلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ——

ع عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

دیکھیے انجمانی بنتے ہیں یا خلد آسمانی یا کچھ اور، ہمارے متعلق یہاں طرح طرح کی مایوس کن افواہیں اڑ رہی ہیں۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

سعادت حسن منٹو

عجب لگتی بہار اور عجب سیر لگتی۔ یہی جی میں آیا کہ گھر سے نکل، ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چلا ـــــ باغ پہنچنے سے پہلے ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بازار اور کچھ گلیاں طے کی ہوں گی اور میری آنکھوں نے کچھ دیکھا بھی ہوگا۔ پاکستان تو پہلے ہی کا دیکھا بھالا تھا پر عجب سے زندہ باد ہوا وہ کل دیکھا۔ بجلی کے کھمبے پر دیکھا۔ پرنالے پر دیکھا، شہ نشین پر دیکھا، چھجے پر دیکھا، غرضکہ ہر جگہ دیکھا اور جہاں نہ دیکھا وہاں دیکھنے کی حسرت لیے گھر لوٹا۔

پاکستان زندہ باد ـــ یہ لکڑیوں کی ٹال ہے ـــ پاکستان زندہ باد، فوٹو گرافر مہاجر ہیئر کٹنگ سیلون۔ پاکستان زندہ باد یہاں تالے مرمت کیے جاتے ہیں ـــــ پاکستان زندہ باد، گرما گرم چائے ـــــ پاکستان زندہ باد، بیمار کپڑوں کا ہسپتال ـــــ پاکستان زندہ باد، الحمدللہ کریہ دکان سید انوار حسین مہاجر جالندھری کے نام الاٹ ہوگئی ہے۔

ایک مکان کے باہر یہ بھی لکھا ہوا دیکھا ـــــ پاکستان زندہ باد ـــــ یہ گھر ایک پارسی بھائی کا ہے..... یعنی حضرت کہیں اسے بھی نہ الاٹ کرا لیجیے گا۔

صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر لگتی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی، میں نے کہا چلو لسی ہی پیتے ہیں۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل تو رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا "یہ اُلٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا "دیکھتے نہیں ہو؟"

میں نے دیکھا ـــ پنکھے کا رُخ قائداعظم محمد علی جناح کی رنگین تصویر کی طرف تھا جو دیوار کے ساتھ آویزاں تھی ـــ میں نے زور کا نعرہ لگایا "پاکستان زندہ باد" اور لسی پیے بغیر آگے چل دیا۔

بند دکان کے تھڑے پر ایک آدمی بیٹھا پوریاں تل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا ابھی پرسوں میں نے اس دکان سے چپل خریدے تھے یہ پوری والا کدھر سے آگیا۔ خیال آیا شاید کوئی دوسری دکان ہو لیکن بورڈ وہی تھا، سامنے وہی مصالحات میں بھلسا ہوا مکان تھا جس کی نیم ساتی میں بجلی کا پنکھا جھک رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا، آگ جلانے میں اس سے بھی کافی مدد ملی ہوگی۔ پوری والے نے مجھے مخاطب کیا اور کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ بابو جی! گرما گرم پوریاں ہیں۔"

میں نے کہا: "بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جہاں تم بیٹھے ہو یہاں جوتوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی ——"

پوری والا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر مسکرایا "یہ جوتوں کی دکان اب بھی ہے لیکن وہ نو بجے شروع ہوتی ہے اور میری صبح چھ بجے سے شروع ہوتی ہے اور ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی سڑک پر کانچ کے ٹکڑے بکھیر رہا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بھلا آدمی ہے۔ اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف دیں گے اس لیے سڑک پر سے چن رہا ہے لیکن جب میں نے دیکھا کہ چننے کے بجائے وہ بڑی ترتیب سے انھیں ادھر اُدھر گرا رہا ہے تو میں کچھ دُور کھڑا ہو گیا۔

جھولی خالی کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی ایک درخت تھا۔ اس پر ایک بورڈ لگا تھا —— "یہاں سائیکلوں کے پنکچر لگائے جاتے ہیں اور ان کی مرمت کی جاتی ہے۔"

میں نے فقرہ نوٹ کر لیے۔

دکانوں کے ساتھ بورڈوں میں ایک خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ پہلے قریب قریب سب انگریزی میں ہوتے تھے۔ اب کچھ دکانوں پر نام اور تختیاں اُردو لباس میں نظر آئے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔

تختیوں کے خط بھی اور نام بھی جاذب نظر تھے۔ مثال کے طور پر "آرائش" ظاہر ہے کہ دکان میں آرائش سے متعلق سامان ہوگا ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس کی پیشانی پر عربی رسم الخط میں "ماسٹر" لکھا تھا۔ آگے چل کر ایک دکان تھی جس کا نام "پاپوشیانہ" تھا، یعنی جوتوں کا آشیانہ۔ ایک دکان کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا "زمرد" ضرور قلفیوں کی دکان ہوگی۔

میں نے خوش ہو کر پاکستان زندہ باد کہا اور چلتا رہا۔

چلتے چلتے سائیکل کے چار پہیوں پر ایک عجیب وضع کی ہاتھ گاڑی دیکھی۔ پوچھا "یہ کیا ہے؟" جواب ملا "ہوٹل" چھوٹا پھرتا ہوٹل تھا۔ چپاتیاں پکانے کے لیے انگیٹھی اور توا موجود، اچار، سالن تیار، شامی کباب تلنے کے لیے فرائی پین حاضر، پانی کے دو گھڑے بف، لیمونیڈ کی بوتلیں، دہی کا کونڈا، لیموں نچوڑنے کا کھٹکا، گلاس پلیٹیں حتیٰ کہ ہر چیز موجود تھی۔

کچھ دور آگے بڑھا تو دیکھا ایک آدمی چھوٹے سے لٹھے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا لٹھا دھوبی کا ہے اور اس نے ایک روپے کا نوٹ گنوا دیا ہے۔ میں نے اس ظالم کو جھڑکا اور کہا "کیا ہوا، بچہ ہے۔ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ہی تو ہوگا، ایک روپے کا نوٹ، کہیں گر پڑا ہوگا۔ خبردار جو تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔"

یہ سن کر وہ آدمی مجھ سے اُلجھ گیا اور کہنے لگا "تمھارے نزدیک ایک روپے کا نوٹ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ ہے لیکن جانتے ہو کتنی محنت کے بعد یہ کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ ملتا ہے آج کل ——" یہ کہہ کر وہ پھر اس بچے کو پیٹنے لگا۔ مجھے بہت ترس آیا جیب سے ایک روپیہ نکالا اور اس آدمی کو دے کر بچے کی جان چھڑائی۔

چند قدموں ہی کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک آدمی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر کہا "روپیہ دے دیا آپ نے اس خبیث کو؟"

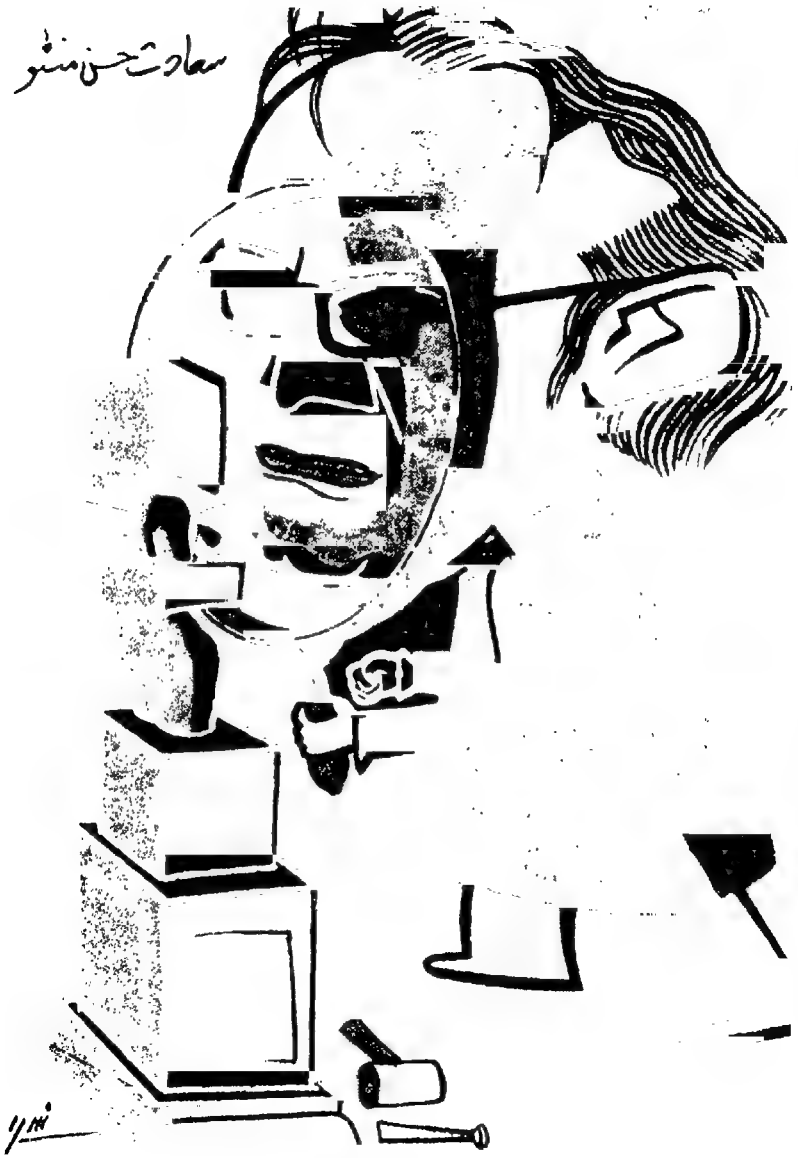
سعادت حسن منٹو

میں نے جواب دیا "جی ہاں! بہت بُری طرح پیٹ رہا تھا بیچارے کو۔"

"بیچارہ اس کا اپنا لڑکا ہے۔"

"کیا کہا؟"

"باپ اور بیٹے دونوں کا یہی کاروبار ہے۔ روز چار روپے روزانہ اسی ڈھنگ سے پیدا کر لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔" اور قدم بڑھا دیے۔

ایک دم شور سا برپا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں کاغذ کے بنڈل لیے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔ تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں ——— دلی میں ہوتا چلی گیا ——— لکھنؤ میں فلاں لیڈر کی کوٹھی پر کتوں نے حملہ کر دیا ——— پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی "کشمیر دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔"

سینکڑوں ہی اخبار تھے۔ "آج کا تازہ" "تازہ ترین" ——— "آج کا تازہ" "ابھی ابھی" ——— "سنسنی پاکستان" "سنسنی ہندوستان"

اخبار فروش لڑکوں کا سیلاب گذر گیا تو ایک عورت نظر آئی۔ عمر یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ۔ سفید اور سیاہ صورت ایک ہاتھ میں تھیلا تھا، دوسرے میں اخباروں کے بنڈل۔ میں نے پوچھا:

"کیا آپ اخبار بیچتی ہیں؟"

مختصر جواب ملا "جی ہاں!"

میں نے دو اخبار خریدے اور دل میں اس اخبار فروش عورت کا احترام لیے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کتوں کا ایک غول نمودار ہوا۔ بھونک رہے تھے اور ایک دوسرے کو جھنجھوڑ رہے تھے پیار کر رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کیونکہ پندرہ بیس ہوتے ایک کتے نے مجھے کاٹ کھایا تھا اور پورے چودہ ٹیکے سی سی کے ٹیکے مجھے پیٹ میں جھنکوانے پڑے تھے۔

میں نے سوچا کیا یہ سب کتے بیاہ کیے ہیں یا وہ ہیں جو یہاں سے جانے والے اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی بھی ہوں ان کا خیال تو رکھنا چاہیے۔ جو پاہ گیے ہیں ان کو پھر سے آباد کیا جائے اور جو بے آقا ہو گئے ہیں ان کو ان کی نسل کے اعتبار سے ان لوگوں کے نام الاٹ کر دیا جائے جن کے کتے اس پار رہ گئے ہیں ——— اور جن کا کوئی والی وارث نہیں ان کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ ان ہی سے اپنا شغل پورا کرتے رہیں۔

کتوں کا غول چلا گیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے قدم بڑھانے شروع کیے

میں نے ایک اخبار کھولا اور اسے دیکھنا شروع کیا۔ سرورق پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر تھی تین رنگوں میں۔ ایکٹرس کا جسم عریاں تھا۔ نیچے یہ عبارت درج تھی:

"فلموں میں بے حیائی کا مظاہرہ کیسے کیا جاتا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اوپر کی تصویر سے ہو سکتا ہے۔"

میں نے غصہ دل ہی دل میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اخبار کو فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

دوسرا اخبار کھولا۔ ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑی۔ مضمون یہ تھا:

"میں نے جل اپنی سائیکل لائیڈز بنک کے باہر کھڑی کی۔ کام سے فارغ ہو کر جب لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سائیکل پر پہلی گدی کسی ہوئی ہے لیکن نئی غائب ہے۔ میں غریب مارا جاؤں عمر صاحب سے نئی ہو براہ کرم مجھے واپس کر دیں۔"

میں جب مسکرا کر راہ راست پر آ کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

چند گزوں کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی مکان دکھائی دی۔ اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا میں نے دل میں کہا: اس مکان کو آخر کار کسی طرف سے ٹھنڈک پہنچ ہی گئی۔"

دو تین سائیکلیں دیکھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد۔ مرد چلا رہے تھے اور ایک ایک برقع پوش عورت پیچھے کیریر پر بیٹھی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد ایک اور اسی قسم کی سائیکل نظر آئی لیکن برقع پوش عورت آگے ہینڈل پر بیٹھی تھی۔ وفعتہً غروب کے جھٹکے سے سائیکل پھسلی۔ سوار نے بریک دبایا۔ پھسلنے اور بریک لگنے کے دو ہی عمل سے سائیکل الٹ کر گری۔ میں دوڑ امداد کے لیے۔ مرد عورت کے برقع میں لپٹا ہوا اور عورت بچاری سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے سائیکل ہٹائی اور اس کو سہارا دے کر اٹھایا ——— مرد نے برقع میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھا اور کہا: "آپ تکلیف لے جائیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ عورت کے سر پر ٹوٹہ ہاسید چادر برقع اٹھا یا اور اس کو ہینڈل پر بٹھا ..... میں نے دل میں کہا کہ آگے سڑک پر غروب کے کوئی اور چھلکا نہ پڑا ہو۔

تھوڑی ہی دور دیوار پر ایک اشتہار دیکھا جس کا عنوان بہت ہی سنسنی خیز تھا: "مسلمان عورت اور پردہ"

بہت آگے نکل گیا۔ جبکہ جانی پہچانی تھی مگر وہ بت کہاں تھا جو میں دیکھا کرتا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے جو گھاس کے تختے پر استراحت فرما رہا تھا پوچھا: "کیوں صاحب یہاں ایک بت ہوتا تھا وہ کہاں گیا؟"

استراحت فرمانے والے نے آنکھیں کھولیں اور کہا: "چلا گیا۔"

"چلا گیا ——— آپ کا مطلب ہے اپنے آپ چلا گیا؟"

وہ مسکرایا: "نہیں اسے لے گئے۔"

میں نے پوچھا: "کون؟"

جواب ملا: "جن کا تھا۔"

میں نے دل میں کہا: "لو اب بت بھی ہجرت کرنے لگے ——— ایک دن وہ بھی آئے گا جب لوگ اپنے اپنے مُردے بھی قبروں سے اکھاڑ کر لے جائیں گے۔"

یہی سوچتے ہوئے قدم اٹھانے لگا تھا کہ ایک صاحب [redacted] طرح ٹہل رہے تھے [redacted] نہیں۔ یہیں ہے اور محفوظ ہے۔"

میں نے پوچھا: "کہاں؟"

انھوں نے جواب دیا: "عجائب گھر میں۔"

میں نے دل میں دعا مانگی: "اے خدا وہ دن نہ دکھیو کہ ہم سب عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہو جائیں۔"

فٹ پاتھ پر ایک دیہاتی مہاجر اپنے صاحب زادے کے ساتھ سیر فرما رہے تھے۔ صاحبزادے نے ان سے کہا: "آجا جان! ہم آج چھولے کھائیں گے۔"

آباجان کے کان کھڑے ہو گئے: "کیا کہا؟"

برخوردار نے جواب دیا: "ہم آج چھولے کھائیں گے۔"

آباجان کے کان اور کھڑے ہو گئے: "چھولے کیا ہوا اچھے کہو۔"

برخوردار نے بڑی معصومیت سے کہا: "نہیں آباجان! بچے دلی ہی ہوتے ہیں۔۔۔ یہاں سب چھولے ہی کہتے ہیں۔۔۔"

آباجان کے کان اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا لارنس باغ پہنچ گیا۔ وہی باغ تھا پرانا لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی۔ صنف نازک تو خیر تب قریب پھٹکتی نہ تھی۔ پھول کھلے ہنستے تھے۔ کلیاں چٹک رہی تھیں، ہلکی ہلکی فضا میں خوشبو تیر رہی تھی۔ میں نے سوچا عورتوں کو کیا ہوا ہے جو گھر میں قید ہیں۔ ایسا خوبصورت باغ، ایسا سہانا موسم، اس سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتیں۔۔۔ لیکن مجھے فوراً ہی اس سوال کا جواب مل گیا جب میرے کانوں میں ایک نہایت ہی بھونڈے سے اور سوقیانہ گانے کی آواز آئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب میں نے لارنس باغ کی روشوں پر بھٹی بھٹی نگاہوں والے گوشت کے بے ہنگم لوتھڑوں کو محو خرام دیکھا تو مجھے دکھ ہوا اور اس دکھ میں، صاف ہو گیا جب میں نے سوچا کہ پھول بیکار کھل رہے ہیں، کلیاں بے مطلب چٹک رہی ہیں۔ یہ حوران کی طرف دیکھے بغیر چلے جا رہے ہیں۔ یہ حوران کے تعلق سے بالکل بے خبر ہیں۔ کہ ان کی جگہ اس باغ کے بجائے کوئی ذہنی خانہ نہیں، کوئی مدرسہ نہیں جہاں ان کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھولی جائیں، ان کی روحوں کے زنگ آلود تالے توڑے جائیں۔ اگر کوئی ایسا نہیں کر سکتا، میرا مطلب ہے اگر انسان کا ذہن ہی حاجز ہے ان انسانوں کے ذہن کی اصلاح کرنے میں تو کیا وہ انھیں چڑیا گھر میں نہیں رکھ سکتا؟ بدلا رنس گارڈن ہی میں نام ہے۔

میری طبیعت مکدر ہو گئی۔ باغ سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک صاحب نے پوچھا: "کیوں صاحب! یہی باغ جناح ہے؟"

میں نے جواب دیا: "جی نہیں یہ لارنس باغ ہے۔"

وہ صاحب مسکرائے: "آپ چڑیا گھر سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی ہاں!"

وہ صاحب ہنس پڑے: "قبلہ! جب سے پاکستان قائم ہوا ہے اس کا نام باغ جناح ہو گیا ہے۔"

میں نے ان سے کہا: پاکستان زندہ باد۔ وہ اور زیادہ ہنسنے لگے۔ میں لارنس باغ میں چلے گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں واقعی چڑیا گھر سے باہر نکل آیا ہوں۔

حقا کہ بیا بغفو بہشت و دوزخ برابر است — رفتن بہ باغ مردمی ہمسایہ در بہشت

ہم ایک موٹر خریدیں گے

احمد ندیم قاسمی

کہتے ہیں موٹر سازی کے کارخانوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہو رہا ہوگا۔ ہماری قسمت میں تو وہی کھڑکھڑاتے ہوئے پہیوں والی، بے ڈھنگی سی ٹمٹم ہی لکھی ہے۔ جس پر سوار ہو کر انسان کی فوقِ خودی اور غرورِ نفس کو کچھ اس طرح ٹھیس پہنچتی ہے کہ جی میں آتا ہے ابھی جا کر موٹر میں سوار ہو جائیں، اور ٹریفک کے اصولوں سے بے پروا ہو کر شکم مول سے ٹکراتے، بیلوں کو ٹھکراتے، سائیکلوں کو کچلتے نکلتے کوڑا پھانکنے والے بھلے مانسوں کو پیستے ہوئے کہیں نکل جائیں ——— بہت دور، جہاں ٹمٹموں کا نشان تک نہ ملے۔ جہاں موٹر ہی موٹر ہوں سرپٹ بھاگنے والے۔ شیشے کے بنے موٹر۔ ٹمٹم پر بیٹھتے ہی اکثر اس قسم کے خیالات ہمارے دل میں آتے۔ اور کئی دفعہ ہم نے اس ٹوٹو جال پر بیٹھے ہوئے اپنے آپ کو موٹروں پر نظر کرتے ہوئے محسوس کیا۔ لیکن پہیے کی اچانک چیخ یا ٹٹو کے اچانک بیٹھ جانے سے اکثر ہمارے یہ خواب مادی دنیا کے شور و شغب میں کھو جاتے ہیں، اور ہم کو چپ چاپ دو انٹ پیسے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔

لیکن بارہا یہ ہے کہ ہم ایک موٹر خریدیں گے۔ ایسا موٹر جس میں ڈرائیور کی سیٹ عام سطح سے ڈیڑھ گز اونچی ہوگی تاکہ دنیا کو معلوم تو ہو سکے کہ مشین کے ناخدا کہاں تشریف فرما ہیں۔ ورنہ یوں تو ہر ایرا غیرا مال روڈ پر اڑتا پھرتا ہے۔

موٹر خرید کر پہلے ہم اپنی اہلیہ محترمہ کو مبارک باد دیں گے۔ ان کے لئے موٹر کی پچھلی سیٹ ریزرو کر دی جائے گی۔ شاید اس طرح ان کی پیشانی کی شکنیں کم ہو جائیں گی اور ہمیں کھانا وقت پر مل جایا کرے گا ——— ما بعد شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا جائے گا کہ آج جناب ..... صاحب نے موٹر تبدیل کیا ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ منٹ دو منٹ کے بعد اپنے اردگرد دیکھتا جائے۔ ورنہ اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو صاحب موصوف اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ کیونکہ مالک موٹر کو حق حاصل ہے کہ وہ کائنات کے جس حصے میں چاہے موٹر چلائے۔

اس کے بعد پٹرول میں عرقِ گلاب اور روح کیوڑہ ملا کر انجن میں ڈالا جائے گا۔ موٹر کی پچھلی سیٹ پر سگ کو ریشم کی رسّی سے باندھ کر بٹھا دیا جائے گا۔ کیونکہ رفتار کی تیزی یا کسی حادثہ سے ان کے باہر جا پڑنے کا خطرہ ہو گا۔ ہم خود چکر تمام کر کے گھاٹیوں گے، اور موٹر کا پنجر بجتا ہوا آگے بڑھے گا۔ آخر یہ خاموش شہر ہیلے انجنوں والے موٹر کس کام کے ہیں۔ چپکے سے کھسک جاتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ کوئی صاحب ادھر سے موٹر پر سوار نکل گئے۔ ہمارا موٹر چیختا چلاتا، دھاڑتا اور ہنکتا ہوا

لہ اس مضمون میں موٹر کا لفظ مطلقاً صیغۂ مذکر میں استعمال ہوا ہے۔

چلے گا۔ سڑک پر یقیناً تماشائیوں اور اہل ذوق حضرات کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں گے۔ ہم ہر ایک سے سلام لیتے جائیں گے مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر۔ یاران بجا بجا کر۔ اور پھر کسی پنیٹر کی دوکان پر جا کر رک جائیں گے۔ اور وہاں سے اس مضمون کے دو تختے بنوا کر موٹر کے آگے پیچھے لٹکا دیں گے:

"جو صاحب موٹر میں سوار ہونا چاہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں"

اس طرح سیاسی دنیا کی عظیم الشان تحریک سوشلزم کا پرچار بھی ہوتا رہے گا اور آنے والی نسلیں بھی ہمیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا کریں گی۔

جہاں "کیپ لیفٹ" (بائیں جانب رہو) لکھا ہوگا، وہاں ہم موٹر کو دائیں طرف سے لے جائیں گے۔ جہاں "موٹر زد سے پرے" لکھا ہوگا وہاں "ڈیڑھ سو" لے جائیں گے۔ جہاں "نو پارکنگ ہیر" کا تختہ لٹک رہا ہوگا۔ وہیں موٹر کھڑا کریں گے۔ آخر دو آنے کی لکڑی کے ایک معمولی سے تختے کے وہ واسطے سے ڈر کر ہمارا چار ہزار روپے والا موٹر کیسے رک سکے گا؟ جہاں پانچ میل رفتار کا حکم ہوگا وہاں پچاس میل پر چھوڑ دیں گے۔ جہاں "آہستہ چلاؤ" کا حکم ہوگا وہاں ساٹھ ستر۔ اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار پر چلائیں گے۔ اول تو انشاء اللہ ہم اسے لٹنے ہی نہ دیں گے۔ اور اگر لٹ بھی گیا تو پھر سید حا ہو سکتا ہے۔

یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ موٹر گیرج میں کیوں رکھے جاتے ہیں۔ کیا ان کے مالکوں کو ان کی یاد نہیں ستاتی؟ ہم تو موٹر کو اپنے پاس سے، ایک پل کے لئے بھی جدا کرنا گوارا نہ کر سکیں گے۔ کھاٹ کو اس کے انجن سے باندھ کر سو رہیں گے۔ ورنہ اس کے اندر ہی پڑے رہنے میں کیا حرج ہے۔

جو لوگ آج کل ہمیں ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہماری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ ہمارے موٹر کو شہر کے دیگر موٹروں میں ایک امتیاز خصوصی حاصل ہوگا، اور اس طرح ہم جدھر جائیں گے ہمارے لئے راستہ صاف ہوگا۔ ٹریفک کے اصول ہماری مرضی کے تابع ہوں گے۔ قوت دنیا کی سب سے بڑی نگران ہے۔ کیا آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا ایک دفعہ ایک مسافر ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک شیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ آتے ہی کم بخت نے مسافر کی گردن دبوچ لی اور کہنے لگا "بتا تیرا انڈے دیتا ہے یا بچے دیتا ہے؟" مسافر جانتا تھا کہ شیر جھٹ کنگ آف جنگل اپنی قوت کے بل بوتے پر اس کی معلومات کا امتحان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس نے موجا کہ اگر میرے منہ سے کوئی ایسا ویسا لفظ نکل گیا جس سے بادشاہ سلامت کی بادشاہت کو ٹھیس پہنچے تو دم بھر میں شیر خیر مکمل کر دے جائے گا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "حضور نیز مرضی کا مالک ہے۔ کبھی انڈے دے دیتا ہے اور کبھی بچے دے دیتا ہے۔" اور اس طرح اس کا چھٹکارا ہوا۔ موٹر خرید لیں تو ہماری مثال اسی شیر کی سی ہوگی۔

موٹروں کا طوفان جذب دنیا کی عزت سے ہم خیر جذب کا لے لوگوں کی طرح اٹھا چلا آرہا ہے۔ کتنے ہیں قیامت کے دن داد حشر کے سامنے۔ شخص اپنے اپنے موٹر میں سوار ہو کر حاضر ہوگا۔ اس طرح پروردگار کو دو جہاں کا تعداد گیرج بنوانے پڑیں گے۔ جس نے کن سے دو عالم کی تخلیق فرمادی۔ اس کے آگے دس بارہ کروڑ سنکھ گیرج بنانے میں کیا دیر لگے گی۔ لیکن بیچارے فرشتوں پر قیامت آئے گی اس کا تصور کرتے ہی دماغ میں موٹر چلنے لگتے ہیں۔

آہ ——— موٹر ——— موٹر! اکثر چاندنی راتوں میں جب فضائے خموش میں ہزاروں قدرت کی دلفریب تیز نگاہیں بے نقاب ہو کر رقص کرتی ہیں جب کائنات سکوت کے پردوں میں چھپ کر مستقبل کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ جب چوراہوں سے ٹریفک کے سنتری چلے جاتے ہیں جب

مال روڈ پر اکّے ڈنکے موڑ اڑاتے ہوئے سامنے سنہرے دھوم غباروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ جب کسی تنگ گلی میں بے روزگار گریجویٹ یونیورسٹی کی کسی بھیپ کی۔ روشنی میں بیٹھ کر کسی بھیگی کی ایجنسی کے لئے درخواستیں لکھا کرتے ہیں۔ جب قدرت کے "انکار و حوادث" اور "مطالبات" کے لشکر یعنی کالجوں کے برجود نغمہ نوجوان خواب میں کروٹیں اور ڈوبوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ اس وقت۔ اکثر ہم خیال ہی خیال میں موٹر میں سوار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا موٹر زمین کو چھوئے بغیر فراٹے بھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم چلے جاتے ہیں ——— دور دھندلے افق کے پار ——— لامتناہی وسعتوں میں ——— اور پھر ہولناک فضاؤں کو چیرتے ہوئے ——— تاروں کو چھوتے ——— کہکشاں کی یخ سڑک پر تیرنے لگتے ہیں۔ نورانی سنتری ہمیں آگے سے سیٹ جیت کر راستہ دیتے جاتے ہیں۔ کائنات سنہرا غبار بن کر ہمارے موٹر کے پہیوں سے لپٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ہم اُڑتے جاتے ہیں۔ بڑھتے جاتے ہیں، اور آخر چاند کے مرمریں قرص سے ٹکرا جاتے ہیں ——— ! اور جب ہماری آنکھ کھلتی ہے تو یکلخت ہم فرش پر سے اٹھا کر کھاٹ پر ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہوتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں "ہمارے موٹر کو نقصان تو نہیں پہنچا؟" اور جواب ملتا ہے کہ "آج آٹا ختم ہو گیا ہے میری بالیاں گروی رکھ کر کچھ پیسے لے آؤ" نکھٹو ——— آہ ——— قدر ناشناس دنیا۔ تیرے یا کس ہمارے لئے ایک موٹر بھی نہیں، تیری گھٹیوں کو آگ لگے۔ تیرے پہیے جل جائیں، تیری سائیکلیں پنچر ہو جائیں، تیری ریلیں پٹک جائیں، تیرے ہوائی جہاز زمین سے چمٹ جائیں تیرے پاس ہمارے لئے ایک موٹر بھی نہیں ——— ایک موٹر ——— یا ایک موٹر کا نمونہ ——— یا ایک موٹر کا پنچر ——— جو صرف ریسک سکتا ہو ——— جو صرف کھڑا رہ سکتا ہو ——— ایک موٹر ——— بس ایک موٹر!

لیکن پھر بھی ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ایک موٹر خریدیں گے اور جس طرح پہلے بیان کر دیا گیا ہے ہم اُسے اسی نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلایا کریں گے۔ اگر وہ کبھی الٹ کر ٹوٹ گیا تو ہمارے احباب کا یہ فرض ہوگا۔ کہ اس کے پُرزے لندن کے عجائب گھر میں لے جائیں جن کے پاس سنگ مرمر کے ایک تختہ پر موٹر کی مشکل بنا کر نیچے یہ حروف کندہ کرائیں:۔

"ایک ایسے گریجویٹ کے موٹر کے پُرزے جس نے اپنے موٹر کے خرچ نفس کی
خلافت کے لئے ٹریفک کے اصولوں کی مخالفت کی اور آخری ماہ میں
شہید ہو کر حیاتِ جاودانی پائی۔ خدا کرے اسے آئندہ زندگی میں ایک موٹر نصیب ہو!"

دماغ چاٹنے والے

ابراہیم جلیس

میرے ملاقاتیوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں جن کے بارے میں رہ رہ کر مجھے خیال آتا ہے کہ کاش ان سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ یا کاش اب ان سے میری راہ و رسم منقطع ہو جائے۔ یہ غور رہے کہ پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملتا ہوں تو عادتاً یہ ضرور کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ یہ جملہ تو بارہا کہی ہے۔ اس کے معنی و مفہوم اور اس کی اہمیت پر غور کئے بغیر محض زبان سے نکل جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس جملے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے اور اس سے بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی ——— ویسے اب میں سچ سچ بتا دوں کہ اب تو ان ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بے حد کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ذرا ڈھیٹ بن کر ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں کہ صاحبان ——— میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوئی تھی، اور نہ اب ہوئی ہے، اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے نحوست گزیدہ ہوں کہ مجھے معاف کیجئے اور خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیجئے۔

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں نہیں شاید میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں، تب بھی، یا نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرأت ہی نہیں ہے جس کی بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی ——— اس دنیائے آب و گل میں اخلاقی جرأت کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے، جتنی کہ اخلاقی بزدلی کو حاصل ہے۔ اخلاقی بزدلی کے لئے دل گردے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اخلاقی جرأت رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن چونکہ جیسے دل گردے بہت کمزور ہیں اور نظر تاتن آسان بھی ہیں۔ اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے تکے پن بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر از راہِ انصاف آپ فرمائیے کہ سید شاہ ضیاء الحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے؟

مجھے اپنے دوست محمد ریاض خاں پر بے حد غصہ آتا ہے کہ جس نے سید شاہ ضیاء الحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس دن بھی سید شاہ ضیاء الحسن سے کسی شخص کا تعارف ہوگا وہ دن اس شخص کے لئے یقیناً ایک منحوس دن ہوگا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس منحوس دن کے علاوہ روز بروز

منحوس گھڑیوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ سید شاہ ضیاء الحسن روز بروز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اس سے دور بھاگتا ہوں وہ اتنی ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے۔ مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے اپنی شکست مان کر بھیڑ دانت کھول کر مسکرانا پڑتا ہے، اور پھر میں پوچھتا ہوں ——

"اوہ! سید شاہ ضیاء الحسن صاحب۔ کہئے مزاج تو اچھے ہیں؟" اب پھر کچھ نہ پوچھئے۔ سید شاہ ضیاء الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے تو پھر گھنٹوں چلتی رہتی ہے۔ ڈکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آپ بیٹھئے اور اپنے صبر و ضبط کا امتحان دیتے رہئے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہی ہوگی۔ سید شاہ ضیاء الحسن کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ وہ دو دو تین تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کر سکتا ہے اور سننے والے چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں تو یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ جبھی تو لوگ اپنے زخم جگر کو دیکھنے کی بجائے ہمہ تن گوش ہو کر بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ سید شاہ ضیاء الحسن کبھی یہ جاننے یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آپ کس موڈ میں ہیں۔ وہ اس کی کہی پر حاضی کرے گا کہ آپ کو بخار اور درد سر ہے۔ یا آپ اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں اسے تو بس یہ خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا دلچسپ باتونی یا ایک اچھا مجلسی آدمی ہے۔ اسی لئے وہ باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی باتیں ہر موضوع کی باتیں، ایران کی باتیں، توران کی باتیں، مہمل باتیں، بیکار باتیں —— ضیاء الحسن باتیں ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ مگر! نزدیک سے بغور دیکھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مخاطب کا دماغ چاٹ رہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ اذیان کے حلق میں زبان اسی لئے جڑی گئی ہے کہ وہ باتیں کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی باک نہیں ہے کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاء الحسن جب کبھی ملتا ہے تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتا ہے کہ "نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ بس ادھر سے گزر رہا تھا سوچا، تم سے دو ایک منٹ کے لئے باتیں کر لوں"

اب سنئے اس کی دو ایک منٹ کی باتیں ——

"ارے بھئی —— کچھ سُنا تم نے —— ابھی ابھی ایک بڑا افسوس ناک واقعہ ہوا۔ وہ موہن لال ہے نا —— چلتی موٹر سے گر پڑا۔ بیچارے کو بڑی سخت چوٹ آئی"

میں پوچھتا ہوں ——

"کون موہن لال ——؟"

وہ حیرت سے کہتا ہے —— "ارے موہن لال کو نہیں جانتے۔ ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے۔ تم اس سے کبھی ملے ہی نہیں۔ موہن لال بے چارا ایک بڑا پیارا دوست ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کا بھانجا۔ بڑا دلچسپ بنس مکھ —— بالکل ڈپٹی دیا نرائن کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل —— ہے ہے۔ ڈپٹی دیا نرائن کی کیا تعریف کی جائے۔ ابھی ابھی پھیل جولائی میں وہ سورگباش ہوئے ہیں —— بڑی حسرت ناک موت تھی ——" ہاں اس حسرت ناک موت پر خوب یاد آیا۔ وہ بے چارا قمر الدین بھی تو مر گیا۔ اس کی موت بھی بڑی دردناک تھی۔ قمر الدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے۔ بے چارے کے چھ سات چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔

ارے ہاں بھئی۔ تمہارے چھوٹے بچے کا مزاج اب کیسا ہے، کون سے ڈاکٹر کا علاج کروا رہے ہو۔ آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر ہے ہی نہیں۔ سب نیم حکیم خطرہ جان ہیں۔ اب تو یار میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں اور کاپی پڑھانے والے بھی ڈاکٹر ہیں۔ اس پر ایک بات یاد آگئی۔ وہ جو ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ بڑا خوددار آدمی تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں دو ہی خوددار آدمی دیکھے ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر فاروق حسین۔ دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ۔ تم نے محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک بار انہوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ رئیس نے دوکان کے باہر ہی سے موٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ ——

"اے میاں طبلے والے، ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے"

محمد قاسم خوددار آدمی تھا۔ اس نے ویسے ہی دوکان میں ہی بیٹھے بیٹھے کہا ...

"غرض پڑی ہے تو موٹر سے اتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناپو۔ یہ ہے خودداری ——— تجارت کرتا ہے۔ زاد پیشہ آدمی ہے۔ وہ بھلا کسی رئیس کا ذلیل کیوں ہو۔ وہ تو اس وقت ... ارے بھائی جلیس، اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ہاں یار بیٹھو ——— کہاں جا رہے ہو، بیٹھو بھئی بیٹھو۔

مگر میں نے جواب دیا کہ مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔ معاف کرنا ضیاء الحسن میں محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کی داستانِ خودداری پوری طرح نہ سن سکا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اُن صاحب سے ملنا ضروری ہے اور اب گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

اس کے بعد میں وہاں سے سرپر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوں۔ یہ بالکل تجدیت ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب سے ملنا ہے۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے زخمی موہن لال یا اُن کے خوش مذاق، زندہ دل ماموں ڈپٹی دیا نرائن آبخانی یا چھوٹے چھوٹے بچوں والے مرحوم فرالدین یا ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات اور خوددار طبلہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے موہن لال جیسے میں جانتا تک نہیں۔ بھئی اگر موٹر سے گر پڑا تو میں کیا کروں، ڈپٹی دیا نرائن بڑے خوش مذاق اور زندہ دل آدمی تھے، تو ہوں گے۔ فرالدین کی موت بڑی حسرت ناک تھی تو بھئی اس کی موت میں میرا کیا دخل ہے ——— ڈاکٹر فاروق حسین نے استعفیٰ دے دیا، تو میرا کیا بگڑا۔ محمد قاسم طبلہ والے اگر خوددار ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے تو ان سے طبلہ درست نہیں کرانا ہے۔

مجھے صرف ایسے ضیاء الحسن ہی سے شکایت نہیں ہے۔ بلکہ ضیاء الحسن کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے یہ ارادۂ سخن ضیاء الحسن کے سگے یا رشتے کے بھائیوں کی طرف نہیں ہے بلکہ میرا ضیاء الحسن کے پیشے کے بھائیوں یعنی ضیاء الحسن کی طرح دماغ چاٹو لوگوں سے ہے۔ دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔

سید سناء ضیاء الحسن کے ایک ہم پیشہ بھائی ابوالفضل صاحب ہیں۔ یہ ابوالفضل صاحب کسی ضلع کی ایک تحصیل کے اسٹیشن ماسٹر ہیں۔ اپنی کسی نہ کسی کارروائی کے سلسلے میں ہر اتوار، ارے پندھواڑے شہر آتے رہتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں:

"میاں تم کب آئے؟"

میں جواب دیتا ہوں "جی میں تو یہیں ہوں۔ عرصے سے یہاں رہتا ہوں۔ میں تو پانچ سال سے کسی جوہڑ سے بھی باہر بھی نہیں گیا۔"

وہ فرماتے ہیں "اوہ، وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو بمبئی میں ہیں۔" میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بمبئی میں نہیں ہیں۔" وہ مضمحل ہو جاتے ہیں "ارے کوئی تھے نا میاں تمہارے بمبئی میں؟"

اب میں اُن سے کس طرح بحث کروں۔ اس لئے مجبوت ہوٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں "اچھا آپ عابد حسین کو پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹرس گئے۔" حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور یہیں ایک دفتر میں ملازم ہیں، وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں "ہاں میں نے کہا تھا نا۔ اچھا اب آپ کیا کر رہے ہیں۔" جی تو چاہتا ہے کہ دوں، جھک مار رہا ہوں۔ مگر چونکہ وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں اس لئے جواب دیتا ہوں۔ "جی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔" فرماتے ہیں "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا۔ آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے؟" ایسے سوال کے بعد اپنا اور اُن کا جی ایک کر دینے کو چاہتا ہے۔ مگر انسان ایک بندۂ مجبور ہے اور وہ نہ صرف تحصیل کے پیشکار ہیں۔ مگر میرے بزرگوں کے ملنے جلنے والے بھی ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں تو ادھر کہئے ہوئے سوالات ہر مرتبہ دہراتے ہیں اور دو تین گھنٹے مسلسل برابر دماغ چاٹتے رہتے ہیں مگر پرسوں میں نے انہیں پڑا چکر دیا۔ وہ شہر آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پکارا

"میاں۔ ارے ٹھہرو۔ ٹھہرو بات تو سنو۔"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کئے اور نام پلی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے مظہر جاہی مارکیٹ جانا تھا۔ ضیاء الحسن کے تیسرے برادر عزیز ایک بڑی بزرگ بھی محکمہ مالگذاری کے پنشن یافتہ منتظم ہیں۔ انہیں بڑھاپے کی وجہ سے جلدی نیند نہیں آتی۔ اسی لئے بے خوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گزارتے ہیں۔ رونا تو رات کو کھانے کے بعد آجاتے ہیں اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔۔

"سناؤ بابا۔ آج اخبار میں کیا لکھا ہے؟"

میں کوئی حافظ اخبار تو نہیں ہوں۔ اس لئے عموماً اخبار اُن کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ مگر وہ اخبار ہوں کا توں واپس کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا ہوں۔ اس میں کیا رکھا ہے، کچھ تو سناؤ۔ اسٹالن ہندوستان پر کب حملے والا ہے؟"

میرا ارادہ ہے کہ کسی دن جب میرے صبر و تحمل کا پیالہ چھلک جائے گا تو میں اُن سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ قبلہ نہ تو اسٹالن کو بادلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا آموختہ پڑھوں۔ آپ پنشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنتے رہئے۔ میرا جہاں وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرا دماغ کہاں اتنا خالی ہے کہ آپ بیٹھے چاٹا کیجئے۔ حضرت مجھے سونے دیجئے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اپنی بزرگی یا میری سعادت مندی سے یہ نہ سہی جائز فائدہ تو نہ اٹھائیے۔

ضیاء الحسن کے ایک چوتھے ہم مشرب آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انہیں ہرفن مولا کہتے ہیں۔ مگر انہوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے نقاش، بہت اچھے افسانہ نگار، بہت اچھے مصور، بہت اچھے گویے اور بہت اچھے لطیفہ گو ہیں۔ بلیرڈ تو خیر بھی بہت اچھا کھیلتے ہیں۔ آج کل ناچ بھی سیکھ رہے ہیں۔ مگر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ "سنانے کے رخ" میں گرفتار ہیں۔ جب کبھی میں انہیں نظر آجاتا ہوں تو بس پکڑ کر زبردستی موٹر میں بٹھا سیدھا گھر لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے جائے سگریٹ پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔ چائے پی کر پہلا ہی سگریٹ جلاتا ہوں کہ وہ اپنی تازہ نظم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ بات بے بات واہ واہ کہنے لگتا ہوں۔ پندرہ بیس تازہ منظومات کا اسٹاک ختم ہو گیا تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا بیگ لے آئے۔ اب افسانے شروع ہوتے ہیں۔ روحانی افسانے، سیاسی افسانے، تاریخی افسانے، جاسوسی افسانے۔

دو بج گئے۔ اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے کھاتے بیس اپنی نگارشات اور ان کی شانِ نزول زیرِ بحث آجاتی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد بچے کھچے مقالے، تقریریں، اقتباسات، ڈائری، کچھ بڑے لوگوں کے خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے بچے۔ اب پانچ بج گئے۔ شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ نثر نظم کے سے دانی پروگراموں کے لئے موزوں نہیں ہوتا اس لئے لطیفہ گوئی اور ہیبت بازی شروع ہو گئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا کھاتے کھاتے ٹیبل ٹاک ہونی ہے، نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت اور ستانا طاری ہو جاتا ہے۔ مگر اس پر بھی معصومی کے ٹھکانے دکھانے لگے۔

"یہ تاج محل ہے، یہ غلستان ہے، یہ سیم جو نیر کی تصویر ہے۔"

"یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔ جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے۔"

"میری یہ تیندوے کی تصویر ——— اب کے سال بیسی کی آرٹ اگزیبیشن میں بھیجی جانے والی ہے۔"

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ دو بجے سے موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ پھر رات کے پانچ بج گئے۔ اب ٹیبل ٹرنگ برعیرون جانے لگے۔ یہ مجلس راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب ہی کسی ٹاپے سے مرغ بول پڑا۔ ایک مسجد سے سوذان کی اذان گونجی۔ فرمایا "اب سو جاؤ۔ دیکھا تم نے۔ آرٹسٹ کو گردشِ شام و سحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اچھا، ارے تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا شفق کا نظارہ کر لوں۔"

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ ——— مگر شاید میں نہ سو سکتا ہوں اور نہ سو چ سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے سر میں جتنا کچھ مغز تھا، آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا ہے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

اب مجھے یہ کرنا چاہئے کہ جب بھی مجھے دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے تو پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو نصیحت کر آؤں۔ تاکہ پھر میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے گا تو پھر گردشِ شام و سحر کی خبر ہی نہ ہو گی۔

ضیاء الحسن صاحب کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں۔ بہت بچپن سے میرے ساتھ برزمی جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ اپنے بابا کی کپڑے کی دوکان پر بیٹھ گئے۔ پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ اس کا

رام کشن جی کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے۔ اپنے کاروباری خط و کتابت پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے لے کر اپنی لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا بار بار دہرایا جانے والا جملہ یہ ہے:

"بھئی تم علم و ادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کروں؟

"کیا چھوٹے لڑکے کو جا کے اسکول میں بھیج دوں، یا اپنے سرکاری مدرسہ میں ہی شریک کراؤں؟

"کیا راج پھوڑے کا آپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں؟

"کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی لگوا دوں؟

"کیا حقہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں؟"

غرضیکہ رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے کے لئے کوئی نہ کوئی صلاح مشورہ کرنے ضرور آتے ہیں اور محض اس لئے کہ میں بقول ان کے علم و ادب کے خوب چرچے کرتا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا وہ ضیا مالحسن نے، بینٹنکا تحصیل نے، بڑی بزرگ نے، آرٹسٹ نے، اور خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے۔ اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہئے اس لئے اب مجھے معاف کیجئے اور اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

قصّہ پہلے درویش کا

اے حمید

پہلے درویش نے دوسرے درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور اپنے قصّے کی ابتدا غالباً غالب کے اس شعر سے کی کہ۔ ؎

اچھے عیسےٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

تینوں درویش اس شعر پر چونک کر تے ہوئے اٹھے اور پہلے درویش کا سر مونڈنے لگا۔ پہلے درویش کی پگڑی کھل گئی۔ اس نے پگڑی باندھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا:

"بھائیو! اس غلام کمتر پر کی داستان بڑی المناک ہے اس فدوی نے "شام سویرا" کے ایڈیٹر نے اسے محض اس لیے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا کہ اسے پڑھ کر کاتب کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میری داستان غریب کمزہ ایک ایسے شہر کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے جو ہم سے تھوڑی دور ہے۔ ہمارے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ میں پہلی مرتبہ اس شہر میں وارد ہوا تو شرافت آدمیوں کے لباس میں ملبوس تھا جاتا ہوا اسٹیشن پر ہی پکڑ لیا گیا اور جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ دوسری مرتبہ میں گرہ کٹ کے بھیس میں وارد ہوا تو ریلوے اسٹیشن پر ہی خوب آؤ بھگت اور چاؤ بھگت ہوئی۔ لوگوں نے ذرا محبت سے میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے کہ میرا چہرہ ان میں چھپ گیا اور جیب میرا چہرہ چھپ کیا تھا ایک آدمی نے ذرا عقیدت سے مجھے جو کر میری دونوں جیبیں کاٹیں اور ان میں سے بٹوؤں کے بل نکال کر لے گیا۔ ایک اور آدمی مجرم کو چھپتا ہوا دیکھ کر طرف بڑھا۔ قریب آکر اس نے اپنے رومال سے میری داڑھی مونچھ جھاڑی اور اس پر ایک بوسہ دیا اور جیب سے سونے کا ل کر کھانے لگا۔ میں نے پوچھا:

"بھائی یہ بوسہ اور بھوسہ کیا ہوا؟"

اس پر وہ مرد بدنگام لیکن خوش کلام یوں بولا:

"وہی جو غمزہ اور شوخ غمزہ ہوتا ہے۔"

میں دماغ ہی دماغ میں اس آدمی کی عقل پر دنگ رہ گیا۔ اتنے میں لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر لے آئے۔ باہر آکر ان میں سے ہر ایک نے مجھ سے باری باری مصافحہ کیا اور میرے گلے سے اپنا اپنا ہار اتار کر چلتے بنے۔

ابھی ابھی ایک تانگہ میرے قریب سے گزرا جسے دیکھ کر میرے کنپٹیوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس لیے کہ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک لمبے تڑنگے گھوڑا جیسوں والا لڑکا دونوں سر پر ہاتھ رکھے اونگھ رہا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کیا الٰہی مٹ نہ جائے دو دل ـــــ یہ میں کہاں سے شہر میں آگیا ہوں۔

خیر تو میرے بھائیو! میں وہاں سے ایک بازار کی جانب چل پڑا۔ ایک جگہ مجھے کچھ بھیڑ نظر آئی۔ پاس جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کتا زمین پر منہ جھاں سا بیٹھا ہے اور اس کی ٹانگ میں سے خون بہہ رہا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اسے ایک آدمی نے کاٹ کھایا ہے۔ قریب تین چار کتے کھڑے تھے۔ ایک کتے نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے دوسرے کتے سے کہا:

"اسے فوراً ٹیکے لگوانے چاہئیں۔"

آناً فاناً کہ میں چپکے سے ایک طرف کھسک گیا۔ کیونکہ میرے آس پاس بہت آدمی کھڑے تھے۔

بس بازار سے گزر رہا تھا وہ کافی بارونق تھا۔ دونوں طرف کی دکانیں خوبصورت اور آراستہ پیراستہ تھیں چونکہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اس لیے لوگ بوقت دوپہر ریستورانوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ریستوران کے دروازے پر چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

"یہ ہوٹل رمضان شریف کے احترام میں بند ہے۔

نوٹ: کھانا کھانے کے لیے پچھلی گلی سے تشریف لائیں۔"

میں ابھی بورڈ پڑھ ہی رہا تھا کہ زوردار دھکا کھا کر آدمی بھاگتے ہوئے نکلے اور سامنے والی گلی میں گم ہو گئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو دکان کی چٹائی پر سرخ الفاظ میں لکھا تھا:

"یہاں بھاگتے چوروں کی لنگوٹیاں کھلی ہیں۔"

میں وہاں سے بھاگنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی لنگوٹی کا خیال آگیا اور میں پہلے سے بھی زیادہ آہستگی سے چلنے لگا کچھ دور چلنے پر میں نے دیکھا کہ دو آدمی کسی بات پر بڑی گرما گرمی سے جھگڑا کر رہے تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہنے لگا:

"میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

دوسرے آدمی نے بڑی لاپرواہی سے کہا:

"دیکھوں گا جب تو اینٹ سے اینٹ بجاؤ گے۔"

اس پر پہلے آدمی نے آگے بڑھ کر سڑک پر سے دو اینٹیں اٹھائیں اور انھیں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ بجانے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور ایک طرف چل پڑا۔ بس پھر کیا تھا دوسرے لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اسی ہجوم میں اچانک ایک کم سن لڑکا ایک بزرگ صورت آدمی کی کرتہ سے چمٹ کر کھیلتا ہوا باہر نکل آیا اور آنکھیں لال کرتے ہوئے گرجا:

"ابا جان میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر سے باہر نہ نکلا کریں مگر آپ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔" اس بزرگ صورت آدمی نے مسکرا کر اور کان پکڑتے ہوئے کہا:

"بیٹا جان! میں تو زعفران خریدنے آیا تھا۔"

لڑکے نے کان چھوڑ کر اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا اور کہا:

"اب سیدھے گھر جائیے اور اسکول کا سبق یاد کیجیے ——— مائی گڈنس! کیسے والدین سے سابقہ پڑا ہے!"

میرے ہم شکل اور میرے ہم عقل بھائیوں کی کاہلی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ششدر رہ کر رہ گیا اور وہاں سے جلدی جلدی بھاگ نکلا۔ آگے بڑے چوک کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ لگا تھا جس میں سے پانی مائی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر باہر نکل رہا تھا۔ فوارے کے نیچے ایک پرندہ بیٹھا تھا جو اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ اس کے اوپر ایک اور پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا۔ نڈر و دلیر کے ہاتھ میں پڑا ہے انھیں تول رہا تھا۔ فوارے کی داہنی جانب میں نے سبز سبز گھاس پر ایک بچے کی بہار سے اور معصوم صورت گڈے سے بچے کو دیکھا جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور خود بخود ہنس رہا تھا۔ بچہ مجھے اس قدر پیارا لگا کہ میں جو کبھی بچوں کو پیار نہیں کرتا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا:

"ہیلو بے بی! ہیلو سویٹ بے بی! اور ہیلو گڈی! بسکٹ کھاؤ گے؟"

بچے نے اچانک کھلونے ہاتھ سے رکھ دیے۔ نیکر کی جیب سے لاہور بری فروم والی عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بھاری آواز میں بولا:

"مسٹر! مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

اے اللہ کے رسولؐ! یہ تو سنا تھا کہ میری پگڑی اچھل کر مجھ سے دور جا گری جب میں وہاں سے بھاگنے لگا تو بچے نے ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھا ؎

کھلونے دے کے مجھ کو بہلایا گیا ہوں
میں خود "لایا" نہیں "آیا" گیا ہوں

میرے حواس ابھی اپنے ٹھکانے پر نہیں آئے تھے۔ میں انھیں ٹھکانے پر لانے کے لیے ایک تانگے پر جا بیٹھا۔ جب میرے حواس مکمل طور پر جمع ہو گئے تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس ہی دستار اور عمامہ پوش ایک بوڑھے بزرگ نشہ رفع فرما ہیں اور کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا سر کتاب نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو ان سب سے ذرا وہ باتیں ہی کر لوں۔ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"کیوں صاحب آج موسم کیسا ہے؟"

دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے کان صاف کرتے ہوئے اپنا سوال پھر دہرایا۔ جواب میں حسب سابق خاموشی طاری رہی۔ میرے تیسری مرتبہ استفسار کرنے پر وہ بزرگ کتاب پرے ہٹا کر مجھے قہر بھری نگاہوں سے گھورنے لگے۔ انھیں دیکھ کر میرے تانگے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ بزرگ نہ تھے بلکہ چوسنی لیے ہوئے جلدی جلدی شہد چوس رہے تھے۔ میں وہاں سے سر پر جوتے رکھ کر بھاگا اور شہر کی سب سے بڑی سڑک پر آ کر دم لیا۔ لیکن یہاں آ کر عجیب ہی تماشا دیکھا۔ چوک میں ٹریفک کا سپاہی بے شمار سائیکل سواروں کے درمیان کھڑا ان کا چالان کر رہا تھا۔ اگرچہ دھوپ کافی روشن تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کا محض اس لیے چالان ہو رہا تھا کہ وہ صبح کے وقت بغیر بتی کے سائیکل چلا رہے تھے۔ ایک کوچوان میری پگڑی دیکھ کر تانگہ میرے پاس لا کر بولا:

"داتا کے دربار چلیے گا جناب؟"

میرے انکار کو جوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا:

"سستا سمجھ کے میں پہنچا دوں گا۔ بندرہ بارس یا دو کا گھوڑا ہے۔"

میں نے ٹور کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ گھوڑے نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولا:

"جھوٹ بکتا ہے۔ میں صرف ایک بارس پاور ہوں۔"

ابھی یوں شام ہو رہی تھی میرے درویش بھائی! میرے دل کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ رات کہاں گزاری جائے گھوڑے گھومتے گھومتے شہر کی چہار دیواری میں آ گیا۔ یہاں ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ شبلے بج رہے تھے اور قوال جھوم جھوم کر یہ دوہا بار بار پڑھ رہے تھے ؎

اک ماجرا سناتا ہوں میں حسن و عشق کا
"لیلیٰ" کا ایک عاشق دیوانہ قیس تھا
بدقسمتی تھے دونوں کے مرقد جدا جدا
لیکن وہ دونوں قبروں سے آتی تھی یہ صدا
کیا؟
تیرے کھڑے تے کالا کالا تیل وے
وے منڈیا سیالکوٹیا!

پہلے قوال اٹھے تو ایک اور قوال صاحب تشریف لائے جو ہارمونیم ماسٹر تھے۔ انھوں نے بیٹھتے ہی گانا شروع کر دیا ؎

میں نے لاکھوں کے کوٹ ایسے سگریٹ تیے لیے

اس پہلے ہی مصرع سے لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اٹھ کر ناچنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے کوٹ پھاڑ ڈالے درزی قوال کے سامنے آ کے بڑھے اور ان کی آواز میں سارے کوٹ جمع کر کے لے گئے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے اور کھسکنے لگا۔

اے میرے پیارے چوتھے درویش! اس سے پیشتر کہ میں کہانی کا آخری حصہ بیان کروں، تو اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر بگلے کا ایک سگریٹ نکال کر مجھے پلا تاکہ میرے حواس باطنیہ حواس خمسہ سے لطف اندوز ہوں!"

اس پر چوتھے درویش نے رونی صورت بنائے ہوئے بگلے کا سگریٹ نکالا اور پہلے درویش کو دیا۔

بگلے کے سگریٹ کا کش کھینچ کر پہلا درویش ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا اور اپنی داستان بیان کرنے لگا:

"بھائیو! شام ہو چکی تھی۔ میں نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ اس شہر میں شام کے وقت خوش حال لوگ دستر خوان پر کھانا چن کر مہمانوں کی تلاش میں گلیوں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی امید میں میں بھی گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک کسی نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور دو آدمی مجھے اٹھا کر کسی چوراہا ہوٹل میں لے گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھلا کر ایک نے پستول نکال کر باہر رکھ دیا اور باقی دونوں آدمی کرسیاں کھینچ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا:

"ہمیں کھانا کھلاؤ یا ہماری گولیاں ٹھنڈی کرو۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ انھوں نے اس دوران میں طرح طرح کے کھانوں کا آرڈر دیا اور کھا پی کر بل میرے حوالے کر کے

چلتے بنے۔ میں نے اٹھتے ہوئے بل ہوٹل کے منیجر کے حوالے کر دیا اور ہوٹل کے منیجر نے مجھے حوالہ پولیس کر دیا اور پولیس مجھے حوالات میں لے گئی۔ اتفاق دیکھیے کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے کلاہ میں ایک قیمتی پتھر جڑا ہوا ہے۔ اسے بیچ کر میں نے جوہری سے ساڑھے گیارہ روپے وصول کیے۔ پانچ روپے حوالات کے داروغے کو دیے، پانچ روپے میں اس لوگوں کا بل ادا کیا جو میرے لیے تلاش میں رات کو کلبوں میں گھوما کرتے ہیں اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر پاک ٹی ہاؤس میں جا بیٹھا اور چائے پینے لگا۔

میرے بالکل سامنے ایک لمبے ناک والا آدمی پلیٹ میں برف ڈالے اس کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ ایک اور آدمی آئس کریم میں کھیرے کے قتلے ڈال کر نوشِ جان کر رہا تھا۔ کچی ہوئی آئس کریم اس نے اپنے بٹوے میں ڈالی، نوٹ کے قتلے کھول کر دو پیالے کانوٹ کالا بل پر رکھ کر ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان ٹرکا چائے کی پیالی سامنے رکھے زار زار رو رہا تھا اور بار بار ایش ٹرے اٹھا کر اس میں آنسوؤں کے موتی گن رہا تھا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے اسے چائے کے پیالے میں ڈال کر بجھایا۔ ادھر ادھر دیکھ کر ایش ٹرے جیب میں ڈال کر ہوٹل سے باہر نکل گیا جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے عین اوپر لکھا تھا:

"براہِ مہربانی سگریٹ پیالوں میں مت بجھائیے اور اگر آپ
اس کے نہ پر مجبور ہیں تو جوتے کو کیجیے ایش ٹرے ہیں لگائیے۔"

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ دو گنجے سروں والے لمبا تڑنگے آدمی اندر آئے۔ بڑی احتیاط سے بیرے کو گھور بیٹھ کر انھوں نے ایک پلیٹ بکری کے مغز کا آرڈر دیا اور جب مغز آیا تو بڑی خاموشی سے مغز کھانے لگے۔ اس ہوٹل سے باہر نکل کر میں نے سوچا کہاں جاؤں؟ کدھر جاؤں؟ دو اور بیرے میرے پاس سے گاتے ہوئے گذر گئے ؎

من کا پنچھی بول اٹھا ہے
بول بچن تیری جیب میں کیا ہے ——— جیب میں کیا ہے؟
تیری جیب کی بات نہ پوچھ
ہائے کوئی پیسہ نہیں

. . . . . .

اب میرے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہ تھی چنانچہ میں نے بے منزل بے مقصد گھومنا شروع کر دیا۔ عدی شاہ کے سامنے باغ میں مجھے دو پولیس کے سپاہیوں نے روک لیا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کہا:

"پہلا ورویش!"

میرا اتنا ہی جواب سن کر وہ مجھے پکڑ کر تھانے لے گئے اور آوارہ گردی کے جرم میں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا اس حوالات میں میری ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جو قتل کے جرم میں وہاں رات بھر کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام

یہ تھا کہ اس نے ایک آدمی سے نیکی کی تھی اور پھر اس آدمی کو دریا میں ڈال دیا تھا۔
رات بھر میں اس آدمی سے ڈر کر ایک کونے میں دبکا بیٹھا رہا اور وہ آدمی چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔
"نیکی کر دریا میں ڈال۔"
خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ باہر نکل کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے دُم نکل آئی ہے
میں نے جلدی سے اسے دبایا اور اسٹیشن کی طرف بھاگ اٹھا۔ کہیں گاڑی نہ جا رہی تھی۔
میری گھڑی کو لاگا چور
مسافر بھاگ نڑا

.....

اور اے میرے درویش بھائیو! اب میں نے اس نکتے میں اگر دم لیا ہے اور انشاء اللہ اسی جگہ دم دوں گا۔"
یہ قصہ سن کر دو درویش تو ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور تیسرے درویش نے اچھل کر کہا:
"بھائی! خدا کے لیے مجھے یہ قصہ قلمبند کر دے۔ میں نیا نیا اخبار کا اڈیٹر ہوا ہوں۔"
ہوں! قریب الاختتام پہلے درویش کے قصے کا!

جشنِ جمہوریت کی ایک دوپہر

غلام احمد فرقت کاکوروی

گورستانِ میدانی، یعنی لکھنؤ کے چند مشہور میں دور تک قبروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ درمیان میں جو حصہ قبروں کی زد سے بچا ہوا ہے۔ اس پر چھوٹی چھوٹی چوکیوں کو ملا کر کچھ اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ اس نے چبوترے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس چبوترے پر ایک میلی کچیلی دری بچھی ہے۔ چوکیوں کے پستہ قد پایوں میں ہتھکڑی ہوئی چار چھوٹوں برابر ایک سفید چادر اس طرح تان دی گئی ہے کہ اس نے خود بخود شامیانے کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے ہیں۔ اس ننھے منے چبوترے پر گنتی کے چار پانچ افراد بیٹھے کہ بارش یا دھوپ سے اپنے کو کم و بیش محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ بقیہ ساتھ مترددقتی اور کرم خوردہ افراد جو اس وقت اس گورستانی محفل میں مشکل سے سمانے نظر آتے ہیں۔ مختلف ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہیں۔ ان کثیف الجثہ حضرات کے چہرے اور ڈھیلے جسم تناک سمجھوں سے کافور کی بو آنے لگی ہے۔ تین چار حضرات شامیانے کی بغل میں بیٹھے پرانے گرگی ڈیلوں کو توڑ توڑ کر ننھی ننھی کنکریوں میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس ٹولی کے عقب میں کچھ فاصلے پر چار عرقِ کشیدہ جسم اپنی مدد، چرس اور گانجے کی نگاہیوں کو ملی اور غوارہ کرانے میں مصروف ہیں۔ ایک جگہ پر بڑی سی دیگ میں چائے کی بھنی بن رہی ہے۔ اور بھوڑے مٹھوٹے وقفے سے کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر اس میں جھانک بھی لیتے ہیں تاکہ باتوں کی جھک میں بھنی کی تیاری اور عدم تیاری سے باخبر رہیں۔ اتنے میں قبرستان کے پھاٹک سے کچھ لوگ کندھوں پر شاہی وقتوں کے کرم خوردہ دو شالے ڈالے ہاتھوں میں عصا اور بغل میں کاپیاں لٹکائے داخل ہوتے ہیں۔ وضع قطع سے یہ لوگ اس گروہ کے معزز معلوم ہوتے ہیں۔

قبرستان کے پھاٹک پر دنتی کا ایک بڑا سا سائن بورڈ آویزاں ہے جس پر جشنِ جمہوریت کی جلی حرفوں میں اطلاع ہے چنانچہ ہر نووارد پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر اس سائن بورڈ کو اس طرح پڑھتا نظر آتا ہے جس طرح سینما کے علتی تماشہ گاہ میں داخل ہونے سے پہلے گیلری کی تصاویر پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ کچھ لوگ سپاٹ قبروں پر چادریں بچھائے بغل میں کاپیاں

دیکھے سینک سلائی پونڈوں کو ہاتھ روک روک کر احتیاط سے تراش رہے ہیں کہ گوتوں کی سبزی چھریوں
کی زد سے محفوظ رہے اسی میں ایک صاحب افیون کے فضائل بیان فرما رہے ہیں!

منے۔ پڑ کہیئے گا میر صاحب، اس معبودِ حقیقی نے چنبیلا جامی کیا شے پیدا کی ہے۔

میر صاحب۔ اے حضرت کیا کہنے۔ فوشدارہ کہتے "بل کن" آب بقا۔

منے۔ حضور والا اس کے فضائل کے لئے دفتر چاہیں رنگت یہ نکالے، قوت یہ بخشے۔ علم یہ سکھائے۔ شب زندہ دار دل و دماغ حاضر۔ پھر پیتے ہی رگ رگ میں طاقت دوڑ جائے۔ عضو عضو میں خون کے عوض طاقت نظر آئے۔

میر صاحب۔ ارے یہاں یہ کرامت کہاں شیں بیان کرتے کہ چاہے ہوش نہ باقی رہے مگر دن زمین سے مل جائے مگر نیند کا آنا حرام۔ ادھر جسکی پی اُدھر مراقبہ میں گئے۔ پھر انعام پر نگاہ کیجئے تو یعنی کہ افیونی کی موت پر تو فرشتوں نے رشک کیا ہے، قبلۂ عالم اہبیل میں دیکھئے تو جگہ جگہ، اس کا ذکر آیا ہے۔

آگے بڑھ کر فضا میں طلسم ہوش ربا گھوم رہی ہے۔

صف آرائی شروع ہوئی، میمنہ و میسرہ و قلب و جناح و ساقہ دکھیں گاہ چودہ صفیں مثل سد سکندری کے آراستہ ہوئیں سواروں کے آگے پیادے جنگ کے آہنی دیوار فوج تھے۔ سوار دریائے لشکر میں موج در موج تھے۔ گھوڑے برابر تھوتھنی سے تھوتھنی اور پچھے سے پچھاڑ، دُم سے دُم، سم سے سم ملائے ہوئے تھے۔ نقیب جو آگے بڑھ آتا تھا اس کو پیچھے ہٹاتے تھے گئے ہوئے کو آکے بڑھاتے تھے دم بدم باجے زور زور بجتے تھے۔ مرکب الف ہوتے تھے۔

(واہ واہ سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک ساتھ فضا میں یہ آوازیں ارتعاش کرتی سنائی پڑتی ہیں)

"یہ سوچ کر ایک تیر اٹھا کر تخت سے شدید کے مارا کہ سینے کے پار ہو گیا۔ غلغلہ اس کے مرنے کا برپا ہوا۔ افراسیاب نے اپنے ہاتھوں کو ملا، برقیں دسموں سے نکلیں سے لپک کر گریں اور پھر ہمراہیان شدید کے خونخواری کو جلا کر خاک کر دیا۔ بھی دیر تک شور و غل رہا۔ جب دیر تک ہوا افراسیاب گنبد پر آیا۔ حیرت نے تعظیم کی افراسیاب نے کہا اے حیرت یہ تھا رابیانی ہمارا پہلا سحر تھا کہ شدید آب میں نہ تھا۔ یہ تمھاری ذات سے اتنا بڑا لشکر میرا ہلاک ہوا؟

(پھاٹک کی سیدھ میں کچھ ناصلہ پر بعض حضرات بحث و مباحثہ میں مصروف ہیں)

ایک۔ اماں۔ دتی سنا کہ کوئی شاہ صاحب پیر محمد صاحب کے ٹیکے پر ٹکے ہیں اور مردے زندہ کرتے ہیں۔

دوسرا۔ تھیں واللہ۔

تیسرا۔ سنا تو میں نے بھی ہے بل کن یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ پرسوں فتو کی لڑکی کی خبر آگئی کہ وہ مر گئی، باپ بھائی کا جو حال تھا نہ پوچھو۔ اماں فضل بائی والے کے بڑے لڑکے فجو کو تو بیاہی تھی، مجو کا بُرا حال تھا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے پاس سب اس کی میت کو لے گئے دوسرے دن شام کو لڑکی چل چکی آگئی۔

چوتھا۔ اچھا تو آج پلیٹنوں میں چل کر دیکھیں گے واللہ یہ تو معجزہ ہو گیا۔ معجزہ۔ کچھ تفصیل بھی معلوم ہوئی۔

تیسرا۔ یہ مرزا صاحب بیٹھے تو ہیں۔ اماں مرزا چھوٹا۔

پہلا۔ اماں ہاں مرزا صاحب بیان کرنا۔

(کئی آدمی فی فی کھسک کھسک کر قریب آجاتے ہیں)

مرزا صاحب۔ بھائی صاحب وہ شاہ صاحب یہاں کی مخلوق تو ہیں نہیں۔ کہیں سے دورب کی طرف کے ہیں۔ مگر پرسوں جو مجھے ملے کیا بتاؤں قسم قرآن کی پروفیسر معشوق علی بھی اس کے آگے مات۔ جب سے بچے ہیں ایک خلقت انہیں دیکھنے چلی آرہی ہے۔ اماں وہ بھیڑ ہے کہ معاذ اللہ سنا ہے کہ دن دن کھانی پڑتے ہیں۔ ادھر شام ہوئی۔ ادھر نائب۔ صرف معصوم خواتین کو نظر آتے ہیں حالانکہ کبھی وخت (وقت) اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔

پہلا۔ اماں فجو آنی لڑکی کا واقعہ بیان کر دے۔ ادھر ادھر کی اڑانے

مرزا صاحب۔ ذی چھری نکلے دم لو۔ سنی سنائی تو والدہ مجھے بھی یقین نہ آتا تھا آنکھوں دیکھی ہے تو جھوٹ بولنے والے پر خدا کی مار۔

دوسرا۔ وہ ہوا یہ کہ جونہی لاش شاہ صاحب کے سامنے رکھی گئی۔ انھوں نے پہلے تو اس کا سر اپنا اپنی خوف کیا۔ اس کے بعد فجو کے باپ اور اس کے خسر کو بلایا اور کچھ ان میں کہا۔ اس کے بعد رسی دور سے تو تو بنا رہا تھا۔ اس کے بعد جب ان دونوں نے ہامی بھر لی حلفہ حلفی ہو گئی تو شاہ صاحب نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنا سر کاٹ لیا۔ قسم قرآن کی یہ دیکھ کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ پھر اسی حالت میں ایک بکرا جوان شاہ صاحب کے سر ہونے بعد حاضر تھا۔ اس کا سر کاٹ لیا۔ اس کے بعد اپنے دھڑ پر بکری کا سر رکھا اور بکرے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس پر دونوں ہی خوب اچھلے کودے گتھم گتھا ہوئی۔ ہوتے ہوتے دونوں کے سر سے ایک شعلے زرد رنگ کی گرمی جو نہایت جھلملی تھی۔ ایسی تیکلی کہ کو ہر شب تاب اس کے آگے مات۔ رفتہ رفتہ اس روشنی کا ڈھیر بن گیا اور اس ڈھیر کو اچانک ایک چڑیا نے جو جھپٹ کر نہ جانے کہاں سے آگئی تھا لیا۔ بس مفت چڑیا کو شاہ صاحب نے جھٹ پکڑا۔ اسکا کباب سیخ کیا۔ اتنے میں جو دیکھتے ہیں تو شاہ صاحب کے سر اندارد۔ خواص انھیں کا سر تھا شاہ صاحب نے جھٹ کباب لے فجو کی لڑکی کے منہ میں رکھ ہی تو دیا۔ کباب کا منہ میں رکھنا تھا کہ وہ اللہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی

ایک دوسرے کی آواز۔ اماں جھوٹے سر لے اڑا والا چھوٹے۔

دوسری آواز۔ اماں جھٹن صاحب کہاں تھے؟ واللہ تمھاری قسم میں تو خود وہیں بیٹھا تھا۔ پچھلے سال نہیں ملے تھے۔ تب کا دن اور آج کی گھڑی ہے کہ عید کا چاند ہو گئے۔ پھر پچھلے اتوار جہانی مرزا سے بھی پالی میں ملاقات نہیں ہوئی۔ اور آج بھی کچھ نہیں دکھے نظر پڑنے تھے (نکالی ٹرھلتے ہوئے) لو ایک پیمانہ ابھی بعض صاحب پی کر گئے ہیں صبح ہی ہو اور ہمیں بھی پلا دو۔ واللہ مدت سے تمھارے ہتھ کے بنے ہوئے چھینٹوں کو ترس گئے۔ یاد ہیں بنے تواب کی معمل والی صحبتیں اماں کیا زمانہ تھا (بغل میں ایک سیاحی کا شانہ ہلا کر) فجو صاحب دیکھتے ہو یہ کون صاحب تھے اسے سامنے آرام پارکھ رہے ہیں

فجو صاحب۔ بھئی ہاں بلا لحاظ کیا۔ میں نے تو توبہ ہے قرآن کی بھی مار ہے۔ ان سے میل ملاقات ترک کر دی اب کہ جاؤ تو یہ حضرت ندارد اماں ہم تو کہتے ہیں زندگی چند روزہ ہے۔ بغض بول کر گزار دو نہ جانے کس وقت دنیا سے چل آئے۔ مرزا آج جشن آزادی کے موقع پر پوسٹر کے ذریعہ اتفاک ہمارے اس جلسہ کی ہنگامہ خیزی۔ اور یہ آج یہاں دکھائی پڑتے۔ اماں ہاں ذی تو بتا نا کہ جلسہ ہے کے بجے سے ۱۲ بجے مجھے بٹیر کو گولی کھلانا ہے۔

وہبی صاحب۔ اماں خیر تو ہے نصیب اعداء یہ بیڑہ پر کیا افتاد گزری۔

تجو صاحب۔ پرسوں شبی صاحب کے بیڑے سے شد کرنے میں بیڑہ مکھی کھا گیا شب بھر طبیعت بدمزہ رہی صبحوں (صبح) پھر بظاہر چاق چوبند تو ہو گیا۔ مگر اب بھی وقفہ سے ابکائی آجاتا ہے۔ حالانکہ مکھی کھلاتے تب میں نے دن سے اوٹھاوہیں قے کرادی تھی۔

ایک آواز۔ حضرات اب جلسہ شروع ہونے جا رہا ہے۔ آپ سب ادھر شامیانے کی طرف کھسک آئیں۔

دوسری آواز۔ ہمدرد یا۔ آتے ہیں۔ ذرا نکالی دھوئیں۔

تیسری آواز۔ لو صاحب جلسہ تو شروع ہو گیا۔

چوتھی آواز۔ اماں اچھے آغا چل کر ذرا ان کی بھی سن لو۔

پانچویں آواز۔ اماں تمہیں قسم ہے ذرا دیکھو تو ہر شخص چوکی پر بیٹھنے کے لئے کتنا بے چین ہے بھئی کیا خفا سا شامیانہ تان رکھا ہے۔

تیسرا۔ اماں برس برس کے دن تو ایک بدھی ہے کہ کسی بانس ہی داس پر ٹانگ دی ہوتی۔

پہلا۔ واہ تم کیا پیٹ بھروں کی سی باتیں ہیں۔ بیڑوں کی کاکن کے دام میسر نہیں چلے ہیں ادھی بدھی نصب کرنے۔ اماں دیکھتے ہو شامیانے کا تڑچہ کس مشکل سے نکلا ہے۔

چوکی پر کی ایک آواز۔ حضرات اب جلسہ شروع ہونے جا رہا ہے۔ میں اس کی صدارت کے لئے اچھے آغا صاحب کا نام پیش کرتا ہوں۔

(سامعین کی چاؤں چاؤں کے ساتھ)

ایک آواز۔ لو بیٹھ صاحب رہ گئے۔

دوسری آواز۔ کیوں صاحب دولہے جانی آغا صاحب سے کس چیز میں کم تھے۔ جو انھیں صدر نہیں بنایا گیا۔

تیسری آواز۔ اماں کیا جھک جھک لگا رکھی ہے۔ نکلے دفعت اب بیٹھے سے رہے۔ خوشی کے موقع پر بے فضولی کی باتوں سے کیا حاصل۔

چوتھی آواز۔ اچھا صاحب آپ جلسے سے باہر نہ ہوں لیجئے ہم چپ ہوئے جاتے ہیں۔ اب جو زبان سے بولے اس پر تین حرف۔

شامیانے سے صدر کی آواز۔ چھٹن صاحب۔ آپ کچھ فرمائیں گے؟

چھٹن صاحب۔ (باقر مرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ جو ایک طرف چوکی پر پیر لٹکائے بیٹھے ہیں)

مرزا صاحب۔ واللہ پہلے آپ شروع ہوں۔ میرا نمبر تو آپ کے بعد ہی ہوگا۔

باقر مرزا۔ جناب صدر نے تو آپ سے درخواست کی ہے نہ کہ اس ناچیز سے۔

صدر۔ مرزا صاحب واللہ معاف فرمایئے گا قسم ہے قرآن کی آپ کچھ اس طرح کیری کی طرح پتوں میں چھپے چھپائے بیٹھے تھے کہ آپ تک نگاہ ہی نہیں گئی تو پھر آیئے نا۔

چھٹن صاحب۔ (مرزا صاحب سے) واللہ بس اب شروع ہو جایئے کچھ کلمات آپ فرمادیں کچھ کھڑے ہو کر میں کہہ دونگا۔ پھر تو اچھے آغا اپنا حق ادا ہی کریں گے۔

مرزا صاحب بڑے تکلف سے اٹھ کر پہلے تو ہر چہار طرف جھک جھک کر کورنش اور تسلیمات عرض کرتے ہیں۔ پھر صدر جناب

ہو کر اشارہ سے اجازت لیتے ہیں۔

صدر۔ بسم اللہ۔

مرزا صاحب۔ جائیو! آج پورے ایک سال کے بعد ہم لوگ دوبارہ یہ جشن جمہوریت منانے کی غرض سے اپنے آبا و اجداد کے اس پرانے قلعے پر جمع ہوئے ہیں، گرد و پیش مرنے والوں کی روحیں نہ شرمائیں تو ایک بات عرض کروں۔ وہ کہ اس پچھلے ایک سال کے عرصہ میں ہمارے بہت سے ساتھی ہم سے بچھڑ کر پیوند خاک ہو گئے تاہم اس بات پر جو قدرے بھی اظہار مسرت کریں کم ہے کہ اگرچہ وہ پاک روحیں ہم میں موجود نہیں تاہم وہ ہم سے دور بھی نہیں۔ وہ ہم عاشقان سادق میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہم میں موجود ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ہم ہیں اور ان حضرات میں اگر بعد ہے تو صرف گز دو گز کا کہ ہم اوپر بیٹھے جشن آزادی منا رہے ہیں اور وہ اپنی ڈھائی گز کی قبروں میں بیٹھے جشن کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے جیتے کی حکومت سے وفاداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے! جلسے سے واہ واہ سبحان اللہ، نعم قرآن کی کیسا گوشہ نکالا ہے جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور مرزا صاحب جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔

حضرات! حکمرانان حکومت مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ عرض کروں کہ ہم اور ہمارے جملہ رفقا جو میں سے بیشتر اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں ان کو حکومت سے صرف اس بات کا شکوہ ہے کہ جب سے ہمارے دیس کے نیتاؤں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی ہے اس وقت سے کانوں کے دام بہت بڑھ گئے ہیں جس کے سبب ہماری پالیا ہے روانق ہو کر رہ گئی ہیں۔ پیٹ بھر کا کھانا میسر نہ ہونے کے سبب ہمارے اکثر چوٹی کے بیرگزر گئے اور ہمارا ان ہے۔ باقوں کی طرف سے ہم اس جشن آزادی کے موقع پر حکومت سے داد رسی کے طالب ہیں وہ ضروری چیزیں جس سلسلہ میں یہ عرض کرنے کی ہے کہ خانہ زمینداری کے معاملے میں عمائدین حکومت کی طرف سے جو اقدامات عمل میں لائے جا رہے ہیں ان کی ضرب ہم پر براہ راست ہم ہی وفاداروں پر پڑ رہی ہے۔ جبراً وجود مالی مشکلات کے آپ کی ہر خوشی کو اپنی خوشی اور ہر غم کو اپنا غم تصور کرتے ہیں کیونکہ بڑے بڑے زمیندار جن کے علاقوں میں ہر فصل میں بیڑوں کا شکار لگتا ہے۔ ان کے مٹنے کے سبب ہمارے ہاتھ بالکل کٹ کر رہ گئے ہیں ہم تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ ہماری حالت ایک یتیم بچے کی سی ہو گئی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ اچھے بیڑ انا میں آنا بند ہو گئے ہیں کبھی آٹھ دس آنے کو ملتا تھا یقین جانئے کہ اب وہ پانچ سات روپے میں بھی میسر نہیں آتا۔ درحقیقت زمینداروں کی تباہی ہماری تباہی ہے اور ہمارے مظلوم طبقے کی تباہی زمینداروں کی تباہی ہے۔ کیونکہ نواب اعلیٰ صاحب اور بھوسے نواب صاحب جن کے سالہا سال سے چوٹوں پر اقواریں ہوا کرتی تھیں خانہ زمینداری کی آواز سنتے ہی بند ہو گئیں اور حضور یہ واقعہ ہے کہ خانہ زمینداری کا اعلان کر کے سرکار نے نہ صرف زمینداری کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ سارے ڈوبے بھی ڈبو دیئے ہیں۔ ہمارے بیڑوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے مگر جب عمائدین حکومت کو یقین دلاتے ہیں اور وہ چاہے اسے باور کریں یا

نہ کریں مگر اس مادی دنیا سے گزرنے کے بعد زیندار پھر زیندار ہی رہتا ہے خواہ اس جوہ و تشنہ و گزرنے والوں کا کچھ بھی حال کیوں نہ ہو۔ چنانچہ عرض کرتا ہوں ؎

مرنے کے بعد بھی نہ ریاست کی بو گئی
دو گز زمین پا کے زمیندار ہو گئے

(چہار جانب سے سبحان اللہ۔ مکرر ارشاد، ماشاء اللہ قسم قرآن کی طبیعت خوش کر دی، واللہ مرزا کیا کیا حق ادا کرتے ہے زور کی آوازیں بلند ہوتی ہیں)

ایک زور کی آواز۔ مرزا صاحب باواللہ میری نہیں ہوئی پھر ارشاد ہو (مرزا صاحب جھک جھک کر اور دوہرے ہو ہو کر شعر کو دہراتے جاتے ہیں اور سلام کرتے جاتے ہیں۔

تو اس سلسلہ میں مجھے آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا ہے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جہاں ہماری سرکار کی طرف سے ملک کے گوشہ گوشہ میں بڑے بڑے فارم اور بڑے بڑے مرغی خانے کھولے جانے کی اسکیم ہے وہاں کچھ فارم ایسے بھی کھولے جائیں جہاں دم ہلانے والوں کا شجرہ نسب کی بھی پیڑیں حاصل کر سکیں۔

ایک آواز۔ صفت، کچھ انیون چرس، مدک اور گانجے والوں کی زحمتوں پر بھی روشنی ڈالتے چلیے۔

مرزا صاحب۔ سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے، تو جن دوسری چیزوں کی طرف میں ارباب حکومت کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادھر بعض حضرات نے مجھے آن کر بتایا کہ ادھر کچھ نشے پانی پر بھی سرمایہ کی طرف سے بندشیں عائد ہوئی ہیں جس کے سبب دوکانداروں نے انیون چرس، مدک اور گانجے سے شوق رکھنے والوں کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ جو سراسر برطانیہ کے وعدہ میں بھی نہیں تھیں۔ عنقریب پر محصول بڑھ گئے ہیں، افیون بازاروں سے عنقا ہو گئی ہے جس کے سبب ہمارے بہت سے رفقاء کا شیشۂ حیات منقطع ہو گیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذہ ہم کو داغ جدائی دے گئے جن کے سبب ہم ان کے فیضان صحبت سے محروم ہو گئے۔ لہٰذا اس جشن آزادی کے موقع پر ہمارا عالیہ ہے کہ گورنمنٹ سوسائٹیوں اور گاؤں پنچایتوں کے ذمہ داروں کو سرکاری طور پر توجہ دلائی جائے کہ وہ اس فن میں ہم کو سوسائٹیں پنچایتیں اور پیڑیوں کی دادا دادو کے لئے یہاں شہروں اور دیہاتوں میں مرغیوں کے ہسپتال قائم کئے جائیں۔ وہاں پیڑیوں کے لئے بھی سرکاری شفا خانے کھولے جائیں اور ان شفا خانوں میں ہمارے ان آدمیوں کو جگہیں دی جائیں جنھوں نے اپنی عمر کے بہترین حصے پیڑیوں پر ریاض کرنے میں صرف کر دیئے ہیں۔

(صف سامعین سے سبحان اللہ، واہ واہ، کیا نکات بیان کر رہے ہو۔ مرزا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور فاضل مقرر گھوم گھوم کر ہر آواز پر دوہرے ہو ہو کر سلام کرتا ہے)

کئی آوازیں۔ جزاک اللہ، جزاک اللہ۔

مرزا صاحب۔ (سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے، تاکہ ہمارے طبقہ کو جو اس وقت ہر کہ ہمہ آزاد ہوئے ہمارے نیتاؤں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور آئی۔ اور ہماری غلامی کی بیڑیاں کٹیں۔

صدر۔ (مرزا صاحب سے) واہ! کیا چلہ نکال رہے ہو۔ قسم قرآن کی ختم تقریر پر چھٹن صاحب کے ہاتھوں کے بنے ہوئے دو چھینٹے میری طرف سے۔

(سامعین میں سے کئی آوازیں۔ مرزا صاحب دو چھینٹے ختم تقریر پر چھٹن صاحب کے ہاتھوں کے بنے ہوئے میری طرف سے بھی قبول فرمائیے گا)

مرزا صاحب۔ (سلسلہ کلام کو ختم کرتے ہوئے) ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

(سامعین کی صفوں سے یہ ایک شور اور ایک غل غپاڑہ ہوتا ہے اور "واللہ مرزا صاحب حق ادا کر دیا۔ کیا تیور سے تقریر کی ہے" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور "سبحان اللہ اور واہ وا" کے ساتھ مرزا کی پیٹھ تھپتھپائی جاتی ہے)

صدر۔ (سامعین سے مخاطب ہو کر) نواب چھٹن صاحب جو ہمارے شہر کے مشہور و معروف بیرسٹر ہیں و..... اور بیرسٹروں کے معالج خصوصی بھی ہیں۔ آپ کے سامنے اپنے زریں خیالات پیش کریں گے۔

چھٹن صاحب۔ (اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر اور صدر سے مخاطب ہوتے ہوئے) بھائی مجھے معاف کرو۔ اب کون سا گورنمنٹ مرزا صاحب نے چھوڑا ہے جس پر بولا جائے بہرحال آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں (جھک کر سلام کرتے ہوئے اور اشارے سے اجازت طلب کرتے ہوئے)

صدر۔ بسم اللہ چھٹن صاحب۔

چھٹن صاحب۔ بھائیو! میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ مجھے شراب کی بندش کے سلسلے میں صرف اتنی سی بات عرض کرنا ہے کہ ادھر بعض اضلاع سے میرے دوستوں کے خطوط آئے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ وہاں سرکار کے حکم سے شراب کی خرید و فروخت موقوف ہو گئی ہے حتیٰ کہ بیئر وں کے نتیجے میں وہ بچے برانڈی کی صورت ہوتی ہے تو سونے کے جام بھی برانڈی بہتر نہیں آتی۔ تو حضرات حکومت کے اس اقدام کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے کیونکہ اس موذی شے کا استعمال شرعاً جائز اور مذہباً حرام ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اتنی بھی سختی نہ کیا کہ جو تڑپ تڑپ کر مر جائیں مگر دو بوند شراب نہ ملے۔ چنانچہ پرسوں کانپور سے بڑے آغا نے لکھا ہے کہ ان کا پیارا بیئر برانڈی دو بوندیں میسر نہ آنے کے سبب باوجود ظلف عدم ہونے کا پیارا مرحوم کی چہیتی ہوئی بلیاں آپ کے سامنے ہیں وہ اس وقت کم از کم ہماری ہمدرد ہیں بڑی مروت ہے۔ نتیجہ یہ تھا لہٰذا اس کے اس طرح تڑپ کر مر جانے کا میری دانست میں کیا اپنے کیا پرائے سبھوں کو غم ہوا۔ جلسہ گاہ میں ظلماتا سناٹے کی آوازیں۔ لہٰذا اس ضمن میں حکومت کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ اتنی سختی بنی نوع انسان کو گوارا کر لے گا۔ مگر پرندوں کے بس کی بات نہیں جو وہ ان سختیوں کو برداشت کریں۔ وہ تو اپنی جان ہی سے گزر جائیں گے

ایک صاحب۔ (صف سامعین میں کھڑے ہو کر) جناب چھٹن صاحب آپ کی اطلاع غلط ہے۔ دو خانوں میں بعد وابستہ قت اور سرجگہ شراب مل سکتی ہے۔ یہ خبر حکومت کے کسی بدخواہ کی اڑائی ہوئی ہے کہ پیاروں شراب نہ ملنے کے سبب مر گیا مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا کوا بیٹھ گیا تھا جس کے سبب دم گھٹنے سے اسکی وفات واقع ہوئی اس بات کو صاف فرما جائے۔

چھٹن صاحب۔ اچھا کیا آپ نے اس غلط فہمی کی وضاحت فرما دی بہرحال میں حکومت سے اپنے اس بیان کو واپس لیتا ہوں اور اب اپنی

تقریر ختم کرتا ہوں۔ نیز جناب صدر سے درخواست کرونگا کہ وہ اس انجمن میں اگر کوئی شکایت رہ گئی ہو تو بتا کر ہم کو شکریہ کا موقع دیں۔ چار بجے تک نواب صاحب کے یہاں جشنِ آزادی کے سلسلے میں پارٹی ہے۔ اور اس وقت ڈھلائی کیجئے گا یہیں۔

صدر۔ حضرات۔ ان تقریروں کے بعد جو جناب مرزا صاحب اور چھٹن صاحب نے کیں اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں آپ کے قیمتی وقت کو ضائع کروں جب کہ چار بجے آپ سب حضرات کو نواب صاحب کے یہاں بھی چلنا ہے تاہم طلسم ہوشربا میں ایک مقام پر بے ثباتی عالم کے باب میں بہادری اور جرأت کی تلقین کی گئی ہے چنانچہ اس عبارت کی روشنی میں آپ کو چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس وقت آپ نے مطالبات کی دھن میں جو ہنگامہ برپا کیا ہے یہاں طلسم ہوشربا میں ایک جگہ آیا ہے۔

"تلوار کی آنچ شعلہ بن کے گلے سے دونوں بہتے ہیں سر و گردن میں لاگ ہے یہی غضب کی آگ ہے۔ زندگی و دونوں کا نام ہیں نام کر لوانے نوجوانو! لڑ بھڑ کر مرو مرو۔ جس کا قدم ڈگمگایا وہ کہیں آبرو نہ پائے گا۔"

یہ ٹکڑا میں نے طلسم ہوشربا سے آپ حضرات کے سامنے اس غرض سے پیش کیا کہ اس وقت ہم کو اپنے آباؤ اجداد کی پرانی روایات کو زندہ رکھنا ہے۔ ان کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنا ہے۔ اسی کے لئے مرنا اور اسی کے لئے جینا ہے اور جدید سرکاری کی بادِ حوادث کے جھونکوں سے مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے۔ اس وقت ہم کو پورے عزم اور بے باکی کیساتھ اپنے مطالبات حکومت کے روبرو پیش کرنا ہیں۔ خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اتنے میں ایک شخص نے قبرستان کے پھاٹک سے جلسہ گاہ میں باآواز بلند اعلان کیا "امان بھاگو۔ دوڑ آگئی کسی بدبخت نے مرزا کی تقریر کی پوری پوری رپٹ چوکی پر کرادی۔" یہ سننا تھا کہ جلسہ گاہ میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ گرتے پڑتے افیونی، مدکے اور چرسیٹے کابکیں اور پیالیاں چھوڑ کر قبروں کی آڑ اور جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ جلسہ ختم ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دو مسلمان سپاہی تعزیہ بگڑیاں باندھے۔ اپنے کسی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھتے عین اسی وقت پھاٹک کے قریب سے گزر رہے تھے۔ بس وقت کہ جلسہ گاہ میں آغا صاحب کی تقریر ہو رہی تھی۔

ٹائم ٹیبل

احمد جمال پاشا

جب اسکول کھلے کئے پڑھائی شروع ہو گئی اور سبق یاد کرنے کا زمانہ آیا تو رفتہ رفتہ ہم نے بھی طے کیا کہ اب تھوڑا بہت پڑھنے لکھنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ پروگرام سے میرا مطلب بہرحال یہ ہوا کرتا ہے کہ ایک ایسا نظام حیات جو عملی جدوجہد کا ایک ایسا زندہ جاوید نمونہ ہو جس سے طالبعلموں کی آنے والی نسلیں ابدالآباد تک فیضیاب ہوتی رہیں اور جس میں اگر مناسب حد تک تبدیلیاں گوارا کر لی جائیں تو وہ ہر قسم کے پیشہ ور اور پراپیرٹیٹ حضرات و خواتین کے لیے قابل قبول ہو سکے جو عملی زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے رہنے کے باعث کچھ اس قسم کی کتابیں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" "کامیابی آپ کے قدم چومنے کے لیے بیقرار ہے" "معرفت چھناٹل بکسیمز اینڈ پبلشرز" "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" "رہنمائے روزگار یا قصہ" "مکمل مرغی خانہ" "رضیہ کا شاہی درستر خوان" "کرامات آٹو واش کا لاجواب یعنی ساجن موہنی" پڑھنے کے عادی سے ہو جاتے ہیں اور خالی وقت میں وہ یا میں پھلانگ لگانے اور خودکشی کرنے کے تازہ ترین طریقوں پر غور کرتے رہتے ہیں۔

اس پروگرام میں اتنی رعایت ضرور کی جاتی ہے کہ یہ پچھلے سال سے ذرا مختلف ہو ورنہ یا تو اسکول بن کر نہ رہ جائے۔ اسکول اسے میری مراد یہ ہے اپنے اسکول سے ہے جہاں بیس سال سے وہی پرانا چہرا اسی گھنٹہ بجاتا ہے جس کی کھڑی کی سوئیاں نقلی ہیں اور وہ من و عن ڈھنگ کرتا ہے۔ اسی سبب اکثر گھنٹہ بھی اونگھ جاتا ہے اور اس کے چوکنے پر کبھی گھنٹہ وقت سے پینتیس اور کبھی بعد میں بجتا ہے جس سے اسکول کا سارا نظام اوقات درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر لڑکے یا اساتذہ کرام اونگھ جائیں تو کسی کا کچھ نہ بگڑے گا مگر اس کے اونگھنے سے تو پورا اسکول اونگھ جاتا ہے۔ گھنٹہ تو اسکول کے سب سے ذمہ دار فرد کو بجانا چاہیے جو اسکول کے اعمال و افعال کا مجاہدہ ہو اور وہ فرد واحد سوائے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کون ہو سکتا ہے۔ نانوں اور اعلیٰ تعلیم کے مارچ پریونٹ فرض پرنسپل صاحب، ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹس یا ڈائس چانسلر حضرات ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ان سے اور ہونے والے بیشمار فائدے کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرح ایک چپراسی کی تنخواہ بچا لیں گے جس کو آج کل فیشن کی اصطلاح میں چھوٹی پوسٹ کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے اور شہرت کا باعث ہو سکتا ہے "اسکولی" میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جن کا یاد داشت سے براہ راست تعلق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جہاں تک ہم کو اور ہمارے دوستوں کو یاد پڑتا ہے ہمارے اسکول کے شمال میں جو ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے

جس کے سامنے "بورڈ" لگا ہوا ہے اور اندر جل میں دوا، دوچار خوانچے والے بھی اپنا سودا فروخت کرنے کے شوق میں جمع ہو جاتے ہیں اور کثرت سے شور ہوتا ہے۔ اسی شور کے سر پر وہ کمرہ ہے جسے عوض عام میں "اردو کلاس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی چھت اس کے وہ احمد مولوی صاحب ہیں جو جمع سے آکر پڑھانا، اونگھنا اور لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی گوشے پر بھاری یادداشت کی تہمت ہے کہ یہاں پر ہمارے بچپن سے اردو پڑھائی جاری ہے مگر مسلسل دیکھنے کے بعد بھی آج تک فیصلہ نہ کر سکے کہ کون پڑھا رہا ہے اور کون پڑھ رہا ہے۔ تقریباً اسی قسم کی شاگلیں ہیں۔ دوسرے گوشوں سے دوسرے مضامین کے بارے میں آسانی سے عل جاتی ہیں مگر اس کچھ کہا اس وجہ سے نہیں جاتا کہ اسی اسکول نے بڑے بڑے نامور پیدا کیے اور پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔

میرا یہ خود کاشت پیدا گرام ایک باضابطہ ٹائم ٹیبل کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس ٹائم ٹیبل سے مختلف ہو سکتا ہے جو عموماً اسکول والے زبردستی طلبا کے اوپر لاد دیا کرتے ہیں۔ اسکول والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نہایت انسان کامل قسم کا ٹائم ٹیبل پیش کرکے کچھ فاضل سے ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت مقرر کر دیا گیا ہے اس کے آس پاس گھنٹہ ضرور بجے گا انداز سے تھوڑی دیر پہلے یا بعد لڑکے ضرور آئیں گے۔ اگر ماسٹر صاحبان غیر ارادی طور پر آگئے ہیں تو وہ وقت گذاری کے طور پر ادھر اُدھر کے بے ربط سوالات، ریاضیات حاضرہ پر تبصرے، موسم پر رنگ کمشنری، ہیڈ ماسٹر وغیرہ کے اعمال و افعال پر بہت سخت نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ (جو اگر ہم لوگ کریں تو ضرور حرام خور کہلائیں) بار بار بے اختیار اپنے معصوم ہونے کا یقین دلانے کی ناکام کوشش کریں گے۔ ایسے موقعوں پر کچھ یہ ہے کہ اگر تھوڑا بہت شور ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ اس قسم کی "فتری" کارروائیوں میں اگر تھوڑی سی تبدیلی محسوس بھی ہوتی ہے تو وہ فن کے اعتبار سے ورنہ تکنیک تو بالکل وہی رہتی ہے مثلاً بڑی جماعتوں میں غیبت کرنے والے کے منہ سے بجائے کے اندر خاص طور پر اور جماعت کے باہر عام طور پر "نطق" "استدلال" "ہیئت" "فقد" "شعور" "لاشعور" اور بے شعور وغیرہ جیسے مہم اصطلاحیں سنی دیتی ہیں اور عام طور پر اس کا اثر آنے والے اشخاص پر بہ حیثیت مجموعی بہت برا اثر پڑتا ہے۔

یہ تو عمل ہوا اور اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اس پر عمل بھی کرنا چاہیں تو کبھی لڑکے غائب اور کبھی استاد، اجتماع ضدین کے اس عمل میں سارا سال گذر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ اسی ٹائم ٹیبل کو نئے کاغذ پر ٹائپ کر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا ہے تاکہ تازہ دماران بساط بھی پچھلی بہاروں سے مفت میں فیض یاب ہو سکیں۔

اس قسم کے ٹائم ٹیبل سے ہم کبھی علاقہ رکھیں ہیں میں صبح سے شام تک ایک ہی استاد، ایک ہی لڑکے اور ایک ہی قسم کے کمرے ہونے کے سبب ہم علم کی اصطلاح میں نتھے چہروں کو بالکل ترس جاتے ہیں۔ استاد لڑکوں کی نقل و حرکت سے نالاں، لڑکے استاد کی صورت سے بیزار مگر دونوں ایک دوسرے سے رحم کے طالب، ایک کو دوسرے کے فعل پر رحم آ رہا ہے مگر فعل جاری ہے۔ کیونکہ ٹائم ٹیبل بتاتا ہے کہ اگر سورج نکلنے سے پہلے بھیج دیے گئے ہو تو اب کم سے کم چراغ جلے تو گھر لوٹو۔ یہ ٹائم ٹیبل کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہ عام طور پر ٹائم ٹیبل ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ریلوے کا ٹائم ٹیبل جسے خریدنے کے بعد آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا مصرف کیا ہو جس کی وجہ سے ہم نے ان لوگوں کو اکثر شک و سند کی نگاہ سے بھی دیکھا ہے جو اس کو سونگھ کر سارے دن کی آنے اور جانے والی ٹرینوں کا نامچہ زبانی لکھ دیتے ہیں۔ اس قسم کے ٹائم ٹیبل پر سوائے عمل کے سب کچھ ہو سکتا ہے اور عمل اس وجہ سے نہیں کہ یہ عمل سفلی کے متراد[illegible] سمجھا گیا ہے جو ہونا کاہی کی صورت میں [illegible] کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے نقل سے عمل کی نوبت آنے ہی نہیں پاتی۔

ہاں تو ایک تو ہوا یہ ٹائم ٹیبل جس کو ہم زیادہ سے زیادہ دیکھتے دیکھتے کسی نہ کسی دن پنسل سے نوٹ کر لیتے ہیں یا پھر کسی لڑکے سے نقل مل جاتی ہے۔ مگر اس نقل سے عمل کا کچھ کردار نہیں اُبھر پاتا یعنی اس کے بعد بھی جس دن جماعت میں سب کے سامنے ڈانٹ پڑنے سے ہم کو اپنی بے قاعدگی کا احساس ہو جائے کہ ہم غلطی سے حساب کے بجائے جغرافیہ کے کلاس میں اپنے کو پا رہے ہیں یا ہیں سیکنڈ پیریڈ اور اٹھائے فرسٹ ایر سے جا رہے ہیں یا حالی گھنٹے میں تواریخ کی کلاس لگنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں اور تواریخ کے گھنٹے کو خالی بھر کر گھر کھانا کھانے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے وقتوں پر اگر ہنسی اڑ جائے، سب کو ہنسا دیکھ کر ہم بھی ہنس دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج پھر گھر جا کر ہم کو ٹائم ٹیبل کی اصلاح کرنا ہے نا کہ اپنے ایک ذاتی اور کامیاب قسم کے پروگرام بنانے میں حتی الامکان مدد مل سکے۔ ایسے آزمائشی دور میں جبکہ ارادہ پکا، نیت صاف، دل حرکت عمل پر آمادہ ہو ترقی کرنے کی خواہش بہ اور ہو کر انگڑائیاں لیتی ہو اور اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ نچلا نہ بیٹھنے دیتا ہو تو گھر پر سارا وقت اس ٹائم ٹیبل کی نذر ہو جاتا ہے جس کو ہم نے کبھی اسکول میں نقل کیا تھا اور جس کی خدمت میں اب ہم ایک کامیاب ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے مصیبت کے دن رہتے نہیں رہتے اور کسی کی محنت اکارت نہیں جاتی اور آخر کار ہماری یہ سیاہی بہانہ بھدو جد رنگ لاتی ہے۔ وہ ٹائم ٹیبل کسی سبز الماری یا کرسی کے نیچے کسی پرچے، کتاب، کاپی کے ٹائیٹل پیج پر سجا کر شہنا یا اقتصادیات کی کاپی کے اس مقام پر بالکل بیچ جا بنا میں جہاں پر ہم نے حساب کے گھنٹے میں کاٹنا گولا کھیلا تھا اور پچھلی اتوار کو اسی صفحہ کے بائیں طرف دھوبن کے کپڑے لکھے تھے۔ ہم کو ہمارا گذشتہ ٹائم ٹیبل مل جاتا ہے جس پر مسلسل غور و فکر کے بعد اکثر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ آخر یہ کیا گیا ہے۔ خود اپنی عبارت ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ لکھا کچھ ہوتا ہے اور پڑھنے میں کچھ آتا ہے۔ اس قسم کی بہم عبارتوں کا پڑھنے لکھنے پر بھی بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے ناشدنی مرقعوں پر وہی حصہ سب سے بہتر رہتا ہے جو جلدی میں لکھنا بھول گئے تھے مثلاً ایک بالکل ہوائی سی بات ہے کہ اب یاد کیا جائے کہ انٹرول کہاں ہے؟ باوجود اس کے کھو جانے کے ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ کہیں نہ کہیں بیانٹرول بھی ضرور تھا مگر جو شخص دن میں تین چار انٹرول منانے کے لیے یوں بھی اصلی انٹرول کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اصلی انٹرول اس کو کہتے ہیں جس کا وقفہ مختصر اور بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے مگر اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر کوئی روک ٹوک تھام نہیں ہوتی مگر اس وقت تو انٹرول کی تلاش خود ایک انٹرول ہے۔

غرض ایک تفصیلی چھان بین، تنقید، تحقیق، غور و فکر کے بعد ہمارے ذہن میں عین ہمارے رجحانات کے مطابق ایک نہایت ہی واضح نقشہ اس پروگرام کا بن گیا جس کے نہ ہونے سے ہم کو اپنی زندگی عرصے سے نہایت فضول معلوم ہونے لگی تھی اور اکثر اس کے مصرف پر جما پنے دل میں غور کرتے اور دماغ سے سوالات کرتے اور جواب نفی میں آتا۔ تن بدن میں مایوسی کی ایک لہر کو دوڑتا پاتا ہے اختیار اپنی بے بسی کا خیال آ دھمکتا ہے۔

اس پروگرام نے ہمارے خون کی روانی میں ایک تیزی پیدا کر دی، ایسی تیزی جس نے نوجوانوں کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیا لہٰذا بے اختیار اکڑ کر بیٹھ گئے۔ دو چار بار بے اختیار پہلو بدلے، عجب عجب منہ بنائے، کیں اگر کوئی ہم کو اس وقت دیکھتا تو قطعی یہ اندازہ لگا لیتا کہ اس وقت ہم بے حد خوش و خرم ہیں۔ ایسی فطری خوشی جو طبیعتوں کو موسیقی کی جانب مائل کر دیتی ہے۔

چنانچہ شگون کے طور پر ایک آدھ سیٹی بھی بجا ڈالی اور اس کی دُھن پر ایک غلیظ سا گیت بھی چھیڑ دیا کیونکہ سر کے اوپر سے ایک طیارہ جا تو چکا تھا اور اب جو کچھ رہ گیا تھا اس کی حیثیت دفتری خانہ پُری سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ اس وجہ سے اس کے انجام دینے میں اب ہم قطعی جلد بازی سے کام لینا نہ چاہتے تھے اس لیے ہم نے طبیعت کو لطیف بنانے کے لیے نہانے ہی میں اپنی بہتری سمجھی نہانے کے بعد بہترین کپڑے پہنے، اخبار دیکھا، کون فلم کہاں لگا ہے۔ ایک دیکھا ہوا فلم دیکھنے کی خواہش دوبارہ بیدار ہوئی سائیکل اٹھائی، سینما کا رُخ کیا۔ موڈ اچھا اور طبیعت آمد پر تھی اس لیے سائیکل کا ہینڈل چھوڑتے اور سائیکل بالکل ایسی چلنے لگی جیسے "پاکستانی سیاست"۔ پھر جلد ہی اس کی باگ قابو میں لانے کے لیے ہینڈل کو دوبارہ اپنی کمان میں لے لیا۔ راہ گیر بھی محظوظ ہو گئے اور تماشائی بھی مشغول۔

فلم دیکھ کر لوٹے تو ایک قسم کی تکان سی محسوس ہوئی اس لیے پروگرام اونگھنے میں تیار کرنے کے ارادے سے سو گئے۔ شب و روز اسی طرح گذرتے رہے۔ ایک ماہ کی مسلسل محنت، لگاتار غور و فکر کے بعد ہم نے ایک پروگرام تیار کر لیا "ٹائم ٹیبل" تو ہم پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ اس میں اول تو ہم نے یہ خیال رکھا کہ پچھلے سال جو غلطیاں امتحان پاس کرنے کے سلسلے میں ہم سے سرزد ہو گئی تھیں ان کے دوبارہ ہونے کا احتمال نہ رہے۔ غلطیاں ہونا بُرا نہیں لیکن اگر غلطی کی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ اس میں شرمندگی کا موقع تو نہ رہتا ہے ورنہ کچھ مناسب نہیں رہتا۔

ہمارا یہ ٹائم ٹیبل جنگی پیمانے پر تیار کیا گیا تھا اس میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے بارے میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ پروگرام کیا اچھا خاصا کمفیوژر تھا جس کا نفاذ "مارشل لاء" کیا گیا تھا۔ اس ٹائم ٹیبل میں جس قدر بھی مضبوط سے مضبوط سے ممکن ہو سکتے تھے ہم نے اپنے آپ کو دے ڈالے تھے۔ اپنی صحت اور اصلاح کا کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا تھا کہ یہ ٹائم ٹیبل ہے یا کسی لیڈر کی الیکشن سے قبل ہونے والی تقریر۔ بہرحال کچھ حسب ذیل سا تھا مثلاً روزانہ:

۴ بجے (صبح کاذب) زن سے اٹھ بیٹھنا (اگر ممکن ہو تو ۳ ہی بجے سے)؛ اگر بیدار ہونے کے روزمرہ میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو بیداری کے لیے متبادل گھڑی کا الارم لگا دیا جائے یا غسل خانے کا پائپ کھلا چھوڑ دیا جائے

(ہر طرح ناکامی کی صورت میں چوکیدار کو آواز لگانے کی ہدایت کر دی جائے)

۴ تا ۵: اٹھ کر ضروریہ سے فراغت حاصل کرنے، غسل کرنا، عبادت کرنا

۵ تا ۵:۱۵: میل بھر کی دوڑ اور صبح کی سیر (واپسی پر چنے کا پانی پی کر پڑھنے بیٹھ جانا)

۵:۱۵ تا ۷: دل لگا کر پڑھنا

۷ تا ۷:۲۵: ناشتہ کرنا

۷:۲۵ تا ۹: وہ تمام مضامین پڑھ ڈالنا جو آج اسکول میں پڑھائے جائیں گے اور اسکول کا کام کرنا

۹ تا ۹:۴۵: کھانا کھا کر کپڑے تبدیل کر کے کتابیں کاپیاں وردیت کر کے اسکول روانہ ہو جانا تاکہ ٹھیک ۱۰ بجے اسکول پہنچ جائیں۔

۱۰ تا ۴: اسکول میں، جس میں انٹرول میں کھیل اور خالی وقت میں مطالعہ فطرت میں دلچسپی لینا، اخبار پڑھنا، جن استادوں کے پاس امتحان کی کاپیاں جانے کا احتمال ہو ان سے تعلقات استوار کرنا ان کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا وغیرہ وغیرہ ایک مدت تک

۰۰-۴ تا ۱۵-۰۴ : اسکول سے گھر واپس آنا، کپڑے تبدیل کرنا۔

۱۵-۴ تا ۳۵-۰۴ : سیر و تفریح

۳۵-۴ تا ۰۰-۰۷ : رات کے کھانے کے لئے سب: وہ سب پڑھ لکھا جو آج پڑھایا گیا تھا۔

۰۰-۸ تا ۵۰-۸ : رات کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنا

۵۰-۸ تا ۵۰-۱۲ : مسلسل سبق یاد کرنا۔

۵۰-۱۲ تا ۰۰-۴ : صبح : سونا۔

ہفتہ کے دن اسکول سے واپسی پر گرسنیا یا بیچ دیکھنے چلے جائیں یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کے لیے وقت دیا جائے۔ ہوم ورک وغیرہ کا ایک آدھ چکر لگا لیا جائے تو مناسب ہوگا لیکن مناسب یہ ہوگا کہ جتنی امکان پرہیز کیا جائے۔ اتوار اور چھٹیوں میں درسیاتی وقفہ ۱۰ تا ۴ ہی میں امتحان کے پرچے تیار کر کے الگ سامنے رکھ کر ان کی مشق کرنا، حل شدہ پرچے پڑھنا، گیس ورک تیار کرنا، ماسٹر صاحب کے اسپارٹ ٹیسٹ پرچے وغیرہ

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ایک ایسا جامع پروگرام تھا کہ اس کو محض دیکھ کر ہی بڑی مسرت ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر اس ٹائم ٹیبل کے کچھ حصوں پر عمل کرنے کی بھی کوشش نہ کی گئی نہ جانے کیسے کیا ہوا پھر کیا نہیں جا سکتا مگر آنا ضرور ملا ہے کہ اسی غور و فکر میں رفتہ رفتہ سال تمام ہوا اور جو کچھ نتیجہ برآمد ہوا اس سے رونا، رونا ہو چکنے پر مجبور کر دیا کہ اس "ٹائم ٹیبل" میں کیا ایسی چیزیں چھپی رہ گئی تھیں جن کو اگر شامل کر دیا جائے تو ایک کامیاب "ٹائم ٹیبل" تیار ہو جائے جس پر عمل کر کے یہ اپھلڈ دن ایچ کا بیانا کامنہ دیکھ سکے۔

حصّة نظم

اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ شاعر

(محمد عبداللہ قریشی)

ہنسنے اور ہنسانے کے لئے مخصوص دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ بے وقوف کبھی صحیح طور پر ہنس نہیں سکتا۔ اُردو شاعری میں جب سے غوں غاں شروع ہوئی ہے ہنسی کی باتوں پر شاعر ہنسنے اور رونے کی باتوں پر روتے چلے آئے ہیں اس لئے دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ ظرافت بھی ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اُردو ادب و شعر کے چمن پر ایک بہار ہمیشہ طاری رہی ہے۔ دبی دبی مُسکراہٹوں سے دل کی کلیاں چٹکتی اور بلند قہقہوں سے زعفران زار کھلتے رہے ہیں۔ اور جب تک دُنیا قائم ہے یہ باغ اسی طرح لہلہاتا رہے گا ؎

ظریفانہ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہجو، ہزل، طنز، تحریف، تمسخر اور بدیہہ گوئی وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ میں نے اس مقالے میں ہر قسم کے شاعروں کا تذکرہ کیا اور اُنکے کلام کے نمونے دیکر ان پر مختصر سا تبصرہ لیا ہے۔ اس میں ان شاعروں کے پہلو بہ پہلو جو اس میدان کے شہسوار ہیں وہ قابلِ ذکر شاعر بھی آ گئے ہیں جنہوں نے محض سیر و تفریح کی غرض سے اس دشت کی سیاحی کی ہے۔ تاہم یہ جائزہ مکمل نہیں ؎

اس مضمون کی تقسیم یُوں سمجھئے کہ قدماء کا دور میر جعفر زٹلی سے شروع ہو کر ریختی گو شعراء پر ختم ہو جاتا ہے۔ اودھ پنچ کے اجراء سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی ان دونوں دوروں کے درمیان سنگ میل ہیں۔ ان سے لیکر موجودہ پود تک یہی دور چلا آتا ہے۔ رنگ و آہنگ میں جو جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں اُن کا ذکر اپنی اپنی جگہ آئیگا مختصر یہ ہے

؎ چراغ سے چراغ جلتے رہے ہیں مگر ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

جعفر زٹلی

اردو ظریف جعفر زٹلی کو پہلا ظریف شاعر یا ہزالی مانا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ عالمگیر اورنگ آخری دور ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں دربار کی زبان فارسی تھی اور اردو کا رواج بہت کم تھا، اس لیے ان کی شاعری میں زیادہ تر فارسی کے الفاظ بلکہ پورے پورے مصرعے پائے جاتے ہیں جہاں تک اس دور کے ماحول سے پتہ چلتا ہے اس میں انسان جس سے خواہ وہ فحش ہی کیوں نہ ہو مزاح دنا انتخاب نہیں کی جاتی تھی۔ نثر و نظم دونوں میں محض کا اور بالکل ایک سا ہے۔ زٹلی بھی ہجو بات سے احتراز نہ کرتا بلکہ بادشاہ اور شہزادے تک کو نہ چھوڑتے تھے۔ انھوں نے اپنے نام سے جو مضمون شروع لکھا ہے اس میں بے سبب کی بھونڈی اصطلاحات کو بھی نظم کیا ہے۔ شعر و سخن کے میدان میں بھی انھوں نے اوچھی اختراعیں اور نئے نئے محاورات استعمال کیے ہیں۔

(اردو ادب میں طنز و مزاح از رفیقت کاکوروی صفحہ ۵۹)

میر جعفر زٹلی حقیقت میں ایک ظریف عوامی شاعر تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کا آبائی وطن دلی تھا یا ناگور۔ نواب شجاع میر بخشی ۱۷۰۹ء میں بعہد شاہ جہان پیدا ہوئے اور ۱۷۵۹ء میں جوان سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اصغر شور و سخن سے فطری لگاؤ تھا پھپھی کی اشعار موزوں کرنے لگے اور رفتہ رفتہ فنا فی الشعر ہو گئے۔ چونکہ استعمار میں سوقی اور طرافت کٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے لوگ ہنسنے کرتے تھے

میر جعفر نے ابو اسحاق الطعمہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ بھی ایک پرانے ہزالی تھے اس لیے آپ نے بھی یہی رنگ اختیار کر لیا اور اس میں ایسے کامل الفن ہوئے کہ ان کی شاعری اور ہزالی کا ایک خاص معیار قرار پا گیا۔ افغان کی بات ہے کہ ابو اسحاق الطعمہ ایک بار استاد کے لڑکے اس کے تعلیم دینے سے عاجز آ گئے تھے۔ میر جعفر بھی استاد کے سخر رسیدہ اور آفت کنندہ تھے۔ انھوں نے استاد کے خلاف پہلے تو کئی نظم بعنوان مذاہ کے عنوان سے لکھی پھر لکھا۔ تعجب یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے میر جعفر کو بیک بینی و دو گوش اپنے مکتب سے نکال دیا۔

میر جعفر نکل تو گئے مگر ممند نماز کو اک اور تازیانہ ہوا۔ گویا بارود کو آگ لگ گئی۔ فوراً ایک کھجوا نامہ لکھا۔ جس میں مولوی صاحب کی جی کھول کر ہجو کی۔ اس کا ابتدائی بند یہ ہے ؎

کہتا ہوں کھجوے نامے کو نادر سخن ستی — سُن مرحبا کہو کے مجھے اس بچن ستی
مشہور ہے یہ بات کفوے زمن ستی — کھجوے کو شیخ جی نے ڈبا دی تھی فن ستی
قِس کا کروں بیان سفو جان و تن ستی

کھجوا نامہ جیسا کہ تذکرہ خندۂ گل میں لکھا ہے ایسا مشہور ہوا کہ شہزادہ کام بخش کے کانوں تک پہنچا اور میر صاحب طلب ہوئے چونکہ نظم میں ہجو کے ساتھ ہی ظرافت کی خوشگوار چاشنی بھی موجود تھی۔ اسی کے اثر سے خوش ہو کر شہزادہ نے موچھل کی خدمت میر جعفر کو دے دی۔ جب یہ معلوم

جعفر زٹل نہایت اچھے شاعر ہیں تو شہزادہ نے انعاماً ان سے ایک غزل کی فرمائش کی انھوں نے تعمیل ارشاد کی اور غزل کہی جس میں سے ایک دو شعر یہ ہیں:

از عاشق بیچارہ مکن نخسۂ و گفتگو ۔۔۔ تا کے بود ایں گرمیٔ بازار جو سے تو

تا چند کنی عشوہ بریں رنگ گلابی ۔۔۔ یہ رنگ پتنگے کا دن چار جو ہے تو

شہزادہ نے غزل پسند کی اور اس کی بدولت میر صاحب کی عزت ایک حد تک بڑھ گئی۔ مگر خالی عزت سے کام نہیں چلتا ضرورت کے وقت دولت سے کچھ ان کی امداد کی جاتی ملکہ نہ ہوئی۔ میر جعفر کا دل بہت کڑھا اور اب ان کو شہر چھوڑنے کی حد تک بات ہو گئی انھوں نے فوراً اس حد تک کی جھلکی جس کے چند شعر یہ ہیں:

توبہ ازیں وسوسۂ مور چھل ۔۔۔ دمبدم از دمدمہ بازاں و جنگل

توبہ ازیں مسکن روزن فراخ ۔۔۔ روز و شب آوازۂ ہیں ہیں پٹاخ

توبہ ازیں مسکن پر شور و شر ۔۔۔ مرحلۂ پر خطر و خوف و ڈر

پرچس و خانساماں بہ ز نوکری ۔۔۔ نیزہ حسنہ و بہتر ازیں نوکری

جعفر ازیں کوچہ دریں مور چھل

شرم حضوری کجن و لوث پل

شہزادہ کو جب اس بھوکا حال معلوم ہوا تو دل بھر آیا۔ جب ان کو خوشی ہوتی تو انھوں نے شہزادہ کو لے ڈالا جو ملی اور ہجو لکھی ایک شعر یہ ہے:

زہے شاہ دالا گہر کام بخش ۔۔۔ ارچی بزو کمرہ و پچی دہ بخش

اس کے بعد نوکری سے بیزار ہوئے اور دکن کا سفر کیا۔ مگر وہاں بھی روزگار نہ ملا تو لکھنؤ آ کر یہ غزل کہی

تنہا شدی اندریں سفر کہ جعفر اب کیسے بنے ۔۔۔ افتادی اندر بحر و بر کہ جعفر اب کیسے بنے

در بیکسی تا بودۂ با درد و غم آلودۂ ۔۔۔ مفلس شدی و در بدر کہ جعفر اب کیسے بنے

از ہجو آں سلطان خود کردی پریشان جان خود ۔۔۔ درماندۂ بے بال و پر کہ جعفر اب کیسے بنے

اسباب غم برداشتی تخم فلاکت کاشتی ۔۔۔ اکنوں کجا آں سیم و زر کہ جعفر اب کیسے بنے

اتفاق سے جس زمانہ میں یہ پریشان روزگار دکن کی خاک چھانتے پھر رہے تھے اسی زمانہ میں نواب کو کلیان کے ستارہ کی مہم پر گئے۔ جعفر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نذر کا ایک رقعہ لکھا نواب پر بڑا اثر پڑا۔ اپنے یہاں ملازم رکھ لیا مگر صرف کھانا ملتا تھا نہ کپڑا مقرر ہوا اور نہ کپڑا بنانے کے لیے کوئی پیسہ ملا۔ مجبوراً ایک مظلوم عرضداشت لکھی ؎

حضور جہاں شاہ گیتی پناہ — ز بیداد جواں زمل داد خواہ
جواں پڑ گئیں در قبا و ازار — نئی آئی مشکل بہ دلی دیار
ادھی رات تن بیچ اٹھی کلبلی — چوں دیدم کہ فوجاں جواں کی چلی
لڑائی پڑی جواں سے وقت رات — جواں کا چلا منہ اور چلا میرا ہات
رکت کی جویں میری پیاسی پھریں — کہ حیران و ہلکان مجھ کو کریں
لہو میرا پی پی کے موٹی ہوئیں — بغل بیچ دشمن مری ہو رہیں
جواں مارتے مارتے شب گزشت — ولے یک جواں از میاں کم نگشت

کروڑوں جوئیں اور اکیلا منم
دونوں ہاتھ سے تا کجا می زنم

خیر اتنا ہوا کہ برخواستی منظور ہوئی اور کپڑے بنوا دیے۔ مگر چند روز بعد اور اسباب چھین آئے اور یہ وہاں سے بھی جدا ہو گئے۔

پیر صاحب کی زندگی نہایت مفلسی اور مفلوک الحالی پریشان روزگاری میں بسر ہوئی۔ مگر وہ زمانہ کی زبردستیوں سے عاجز آکر کبھی ہیچ نہ اٹھتے تھے۔ بلکہ نہایت آزادی اور خوشدلی سے ان تمام سختیوں کو برداشت کرتے تھے۔ اسی طرح ان کا مشغلہ شاعری خاص کسی کی مدح و ذم کا پابند نہ تھا وہ ذاتی خصومت کی بنا پر کسی کی ہجو نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اس سے تفریح و انبساط مقصود ہوتا تھا۔

میر جعفر کی شادی بدمستی سے ایک بدصورت اور بدسلیقہ عورت سے ہوئی۔ اس نے ان کی زندگی تلخ کر دی۔ اپنی مصیبت کا رونا اس طرح روتے ہیں ؎

کھول گھونگٹ کیا دیکھوں بیچ — دھنپت بیٹھا گھونگٹ بیچ
لاکھ روپیہ مہر بندھایا — ایسا مہنگا دھنپت پایا
گھونسی گھانسی لنڈی منڈی — منہ ایسا جوں سانپ کی گنڈی

بالوں کا کیا کروں احوال — جیسے خچر کی ہوئے یال
دانتوں کا کیا کروں بچار — ٹوٹے پھوٹے اور اجاڑ
ہونٹوں کا کیا کروں بیان — جیسی کہ نانبائی کی نان
بات کہے پر نہ آئے بول
جیسے باجے پھوٹا ڈھول

اور پھر چند دن بعد ؎

بھگڑا رگڑا ایسا پسارا — مارے جوتے مار گئے مارا
دے دھما دھم ادھر ادھر — اب میں مولا جاؤں کدھر
انجر پنجر ٹوٹن لاگے — مردے زندے سوتے جاگے
بجلی ہے یا آگ بگولا — جیسے نام خدا کا بھولا
نت اٹھ گھر کے باسن پھوٹے — آگ لگان پانی کو روٹے
کام کرے تو ایسا کرے — چولہے کی ہانڈی کھنڈی دھرے
جیسا مجھ کو ناچ نچایا — جیسا کیا میں ویسا پایا
جعفر پیارے اب کیا کیجے — تن من دھن تقدیر کو دیجے
کرم میں لکھا تھا سو پایا
ناحق میں یہ نند مچایا

اُن کی ظرافت اگرچہ ہزل کے درجہ پر پہنچ گئی ہے اور خوش طبعی مسخرا پن کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مسخرا پن ہو ظرافت ہو ہزل ہو کچھ ہو اس درجہ کی ہے جس کا جواب بڑے بڑے اہل کمال نہیں دے سکتے۔ اُن کے ایک لفظ میں ظرافت اور خوش طبعی کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے۔

جس زمانہ میں میر جعفر کولکتاش کے یہاں رہتے تھے ایک روز یہ اتفاق پیش آیا کہ مرزا سلمان کی اہلیہ مرزا سے ناراض ہو گئیں۔ میر جعفر کو خبر ہوئی۔ یہ جانتے تھے کہ مرزا کی بیوی اُوپنے گھرانے کی عورت ہے اور یہ دہیل ہیں انھوں نے چند قطعے لکھ ڈالے جو یہ بھی ہیں۔ سامانِ تفریح بھی۔ پند و نصائح بھی۔ عبرت بھی۔

جعفرا در جہاں معاذ اللہ — ہر کہ محتاج نان زن باشد
نتواند کہ ضبط بنشاند — گرچہ عفریت و اہرمن باشد

جعفرا مفلسے کہ زن بہ کند — آہ آں زن زنست مردک خر
آرزوے دلش بہ دل ماند — خود پئے نان خراب و رسوا تر

بہ زن کردن در افتادم بگرداب پریشانی — دل و دین رفت و نسیاں شد رہ و رسم سخندانی
بلے خوش گفتہ مصرع جعفرا ایں از رہ فطرت — چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

مرزا سلمان کو جب خبر ہوئی تو بہت بگڑے اور کولکتاش خاں کے پاس پہنچے۔ میر جعفر کی سخت سے سخت شکایت کی مگر انھوں نے ہنسی میں ڈال دیا اور ٹال دیا۔

اسی موقع پر کولکتاش خاں نے غنیم کو سخت شکست دی۔ اور بہت کچھ مالِ غنیمت پایا۔ جب مالِ غنیمت تقسیم کیا تو آدھا مالِ جنگ شاہی میں بھیج دیا اور آدھا سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بیچارے سپاہی تو تھے نہیں کہ کچھ ان کو بھی ملتا۔ میر جعفر کو سخت رنج ہوا۔ نواب کے پاس پہنچ کر کہا کہ مجھ کو بھی حصّہ دلوایئے۔ کہا تم سپاہی نہیں۔ مرد میدان نہیں پھر حصّہ کیسا۔ خیر اُس وقت تو جعفر خاموش ہو گئے۔ مگر دوسرے دن انہ قصیدہ کیا ہوا رستم نام لکھ پہنچے۔ اور نواب کو سنایا۔ حریہ ہے۔

من آں رستم وقت روئیں تنم — کہ دہ پا پڑا زمشتِ خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر — برآرم و ما از سرِ مور تیر
کنم گردنِ پشہ را در کمند — مگس چند را من درآرم بہ بند
بپوشم اگر جوشنِ جنگ را — ہزیمت دہم پسوے لنگ را

بہ صد حلہ بالِ مگس بر کنم — فطار دو صد سور بر ہم زنم
دریں دو رثانی رستم منم — تناسا بہ گرز گراں بشکنم
چناں بشکنم رستۂ خام را — کہ مازم محل رستم و سام را
تہمتن منم گر کشم تیغ خشم — تراشم بہ اعضب یک مو ز سیشم
چو بینندہ اشوم نر کشد کمند — چوں از گربہ سر شعلہ گر کرکند

بیا جعفر این قصۂ کوتاہ کن
بہ ہمت جناب سخی راہ کن

اتفاق کی بات ہے کہ میر صاحب جب برطرف ہو چکے تھے اسی وقت ہیرا نی رمنلہ فوج مطلوب ہو کر دشمنوں کے ملک واپس کر دیا گیا ہے کوتوال خاں کو ڈاسد ہوا اور ایسے بگڑے کہ میر صاحب کو ٹھوا دیا۔ اس طرح میر صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ دو نظمیں لکھیں جس میں سے ایک میں اپنی شان استغنا کا ذکر کیا دوسری میں نوکری کی برائیاں بیان کیں جانکہ دوسری نظم یہ ہے :-

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہو دے کمر کی — تب بھول جائے چرکنی یہ نوکری کا ضبط ہے
ہر روز مجرا اٹھ کریں درکار یک سو کر پڑیں — بے شرم ایسے اڑھ میں یہ نوکری کا ضبط ہے
دس بیس میں جھگڑے کیجے یہ نوکری کا ضبط ہے — دس بیس مجرے میں گئے دس بیس بخشی نے لیے
اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا ضبط ہے — صاحب عجوب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے
یارا ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا ضبط ہے — ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں

ایک مرثیہ میر صاحب کے ہاں چوری ہو گئی اور پھر بھی ہاتھ لگ گئی۔ اس قصہ میں نظم کہی۔

دلاور مفلسی سب سے اکڑ رہ — بحالِ بے کسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ — پھٹی گیک باندھ کر سب سے اکڑ رہ
اگر شلور نبا شد کس کو غم ہے — لنگوٹا باندھ کر سب سے اکڑ رہ

ایک دفعہ لوگوں نے ملوا دی کہ کوکلتاش خاں سے بعض جرائم کی درخواست کرو انھوں نے ہرگز منظور نہ کیا اور یہ نظم لکھی :-

اے تو نگر ایں محل آبشورہ تا بکے — شربت قند و گلاب کورہ کورہ تا بکے
کج کلاہ و قرب شاہی عز و جاہ دبدبہ — پاندان نقرہ و زریں کٹورہ تا بکے
کُلُّ شیٔ ھالکٌ جعفر زباں را بند کن — ایں سخنہائے زُل پھک اپھکوڑہ تا بکے

اورنگ زیب کی وفات پر میر صاحب نے دو مرثیے لکھے ایک نہایت متین ہے دوسرا اُن کے رنگ کا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :-

اورنگ زیب مر گئے نیکی جگت میں کر گئے — تخت اور چھپر کھٹ دھر گئے آخر فنا آخر فنا
متواخذا کی یاد میں رکھا اورنگ آباد میں — خبر ہیں گئیں بغداد میں آخر فنا آخر فنا

مذکرہ مخزنِ جاوید میں لکھا ہے کہ جب اعظم شاہ تخت نشین ہوئے تو شعرا کے ساتھ میر صاحب نے بھی سکہ نظم کیا اور وہ نہ صرف بادشاہ کو پسند ہوا بلکہ خاص و عام کو پسند آیا۔ بادشاہ نے انعام میں خلعتِ فاخرہ اور ہاتھی اور ایک لاکھ روپیہ دیا۔ مگر ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچنے بھی نہ پائے اور تمام روپیہ راستہ ہی میں صرف کر دیا۔

میر صاحب کے کلیات میں اگرچہ فحش بہت زیادہ ہے پھر بھی وہ انواع و اقسام ظرافت نظم و نثر سے مملو ہے چنانچہ

۱۔ گھنگنو نامہ مزاحیہ میں اردو کے محاورات اور ضرب الامثال کا محل صرف نہایت خوبی سے بتایا گیا ہے۔

۲۔ رقعات نثر میں ہیں ملا رمے اور طرح طرح کی شوخیوں کا وہ عالم ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

۳۔ عدالتی تقریریں نثر اپنے خاص الخاص رنگ میں جن میں ملانمے۔ ظرافت شوخیاں اپنے اپنے محل پر سبھی کچھ ہیں۔

۴۔ مزارت نامہ جس کو شاہی یا دو اشتوں اور تزک کے طرز پر مرتب کیا ہے اور اس میں ضرب الامثال کو اس صورت سے صرف کیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۵۔ مصطلحاتِ زمانہ۔ یہ لغت کے طریق پر ہے۔ زمانہ کی رسم و رواج اور ضرورت کے موافق اس میں الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں اگرچہ اس کو دیکھ کر میر صاحب کے کمال ظرافت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ مگر اس کی ایجاد کا سہرا غالباً بیدل زاکانی کے سر ہے۔ اُن کی لغت بھی اُن کے کلیات میں شامل ہے۔ ان کے علاوہ اور اقسام کی نثر بھی پائی جاتی ہیں۔

حصہ نظم۔ جس میں ظرافت، واقعات، ہجویات، رقعات، دستور العمل، پند و نصائح، رجز، نوحہ جات، مسئلے، غزلیات، مورچھل نامہ، کچھوے نامہ مسدس، نظر نامہ مراثی، پیش نامہ، تضمین قطعات، اُردو و فارسی سبھی کچھ ہیں اور ہر ایک اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔

اگرچہ اُن کا کلام اُن کے رنگ میں سراپا انتخاب ہے مگر ضرورتاً تھوڑا سا انتخاب پیش کرتا ہوں :-

انتخاب دستور العمل

ہر زن کہ باشد جنگجو۔ در چال مثلے مو بمو — دارد بہ شوہر گفتگو اس نار سے انکار بہ
جو رولڑا کا گر بود پہ خوف و ڈر آں گھر بود — وہ گھر سدا ابتر بود اس گھر سے گنگا پار بہ
جو نار لچکے چال میں سسکی بھرے ہر حال میں — کالا تو ہے کچھ دال میں از قرب او نہ نہار بہ
جو رانڈ ہو کاجل کرے چھپے چندن پر من دھرے — چوڑی پہن مندی کرے بر گردنش تلوار بہ
گھوڑا جو اسواری نہ دے صاحب طلب سائی نہ دے — بیٹا جو وہ یاری نہ دے ایں ہر سہ زن فی النار بہ
سسرا جو ہو دل تنگ جی ممسک حسین و سنگ جی — دامادِ سے بیباک جی اس سے سگ مردار بہ

جعفر بہ بوستانِ جہاں دم غنیمت است — شادی نصیب گر نشود غم غنیمت است
دو پیازہ و کباب نہ باشد اگر ترا — زاں ماک خام بھجیہ شلغم غنیمت است
گر اسپک صفا نبود رو بہ کاہ تو — یک نچھر گدھری پالم غنیمت است
آواز شوہرہ نرسد گر بگوش تو — آواز بول بیگم و خانم غنیمت است
تربوز و خربزہ نبود گر میسرت — یک سبز پھانک کھیرۂ بالم غنیمت است

ہجو مرزا خدا یار بیگ

زہے قدرتِ پاک پروردگار — کہ مرزا خدا یار مارا پچھاڑ
کروں اب خبر شہر و بازار کو — لگی آہ میری خدا یار کو
خدا یار پر صبر میرا پڑا — کہ تالاب پر یہ بکھیڑا پڑا

بدست حریفاں گرفتار شد — بہ پشت و سرش مشت و پیزار شد
چہ مرزا چہ رفتار و گفتار او — چہ آواز پیزار و دستار او
نڑاتڑ سڑاسر لگی لا گنے — مٹک چال مرزا لگے بھاگنے
پکڑ باندھ کر جب مرنڈا کیا — کشندس کا تال گنڈا کیا
دریغا چہ صورت چہ دستار او — چہ پاجامۂ چوڑیاں دار او
چو ایں ماجرا جان با باشنید — ندادو دوادو پیا پے رسید
رہے جان با با شرافت مآب — کہ کوا اچھڑایا لگڑ سے شتاب
جہاں میں کروں آج میں بومڑی — کہ گیدڑ کے منھ سے چھٹی لومڑی
خدا یار مسکیں دہما دہم کٹا — بلیا کے نیچے سے چوہا چھٹا

مدح حسن معشوق

جعفر چہ ہپسی باشد و کس باغ کی مولی — بر سن تو جبریل گرفتار جو ہے سو
با تیرِ انا کافی و بر نیتی تغافل — امروز مجھے مار نہ اے یار جو ہے سو

جعفر زٹلی نے ایسا کیا — کہ مکھی کو مل مل کے بھینسا کیا

کشتی جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است — ڈبکو ڈبکو می کند دریک توجہ پار کن

کھکڑ لکا دیوار کو جعفر کر اب کیا کیجئے — خطرہ پڑا بازار کو جعفر کر اب کیا کیجئے
گھوڑا تو تیرا لنگ ہے کوئی نہ تیرے سنگ ہے — چلنا پڑا بازار کو جعفر کر اب کیا کیجئے

جعفر اشکر کن کہ در عالم — جا بجا نام تو زٹلی شد
شہرت مرد بہتر از ہر قسم — ہر کہ گم نام زیست ملی شد

سودا

مرزا محمد رفیع سودا جن کی شیوا بیانی کی شہرت دور دور تک ہو چکی تھی اپنے معاصرین کا نام لے دیا نام مرزا محمد رفیع کے زندہ تھے جو کابل سے دہلی میں آکر تجارت پر بسر اوقات کرتے تھے۔ وہ سترہ سو کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور اپنے زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے بعد شعر و شاعری میں شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ فرصت کی جو دولت انہیں مزاجی سے شاہ عالم بادشاہ کے دربار سے حاصل ہوئی اس کے طفیل انہوں نے قصیدہ کو اپنی آمد کا ذریعہ بنایا۔ خاندانی تمول کی وجہ سے ان کی زندگی میں فارغ البالی تھی۔ وہ اپنے ہم عصروں کی طرح آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ وہ لکھنؤ پہنچے جہاں ویرانی کا عالم تھا۔ آصف الدولہ کی وفات کے بعد وہ فیض آباد چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی شاہی نوازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ عالم بیتاب سے پہلی بار لکھنؤ میں ۱۷۹۵ء میں ملے اور ۱۷۹۵ء میں یہیں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

میر انیس کے پردادا میر ضاحک سے خدا معلوم کس بات پر چل گئی کہ ادھر اُدھر دونوں فقرے چوٹوں کی بھرمار رہنے لگی۔ سودا کی ذاتی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ایک اکھڑ کے سو سو جواب دیتے تھے اور انہیں سے ان کی ظرافت مزاجی اور نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے۔ سودا و زمانہ سے میر ضاحک کی محنت تو ضائع ہو گئی۔ سودا کی کہی ہوئی جو ایک ہجو موجود ہے۔ ہمارا خیال ہے یہ ترجمہ ہے میر ضاحک کی ہجو میں ہے ؎

جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام — کیوں کیا کرتا ہے ہجو خاص و عام
آپ کو کہتا ہے تو سید ہوں میں — جد مرا پوچھو تو ہے خیر الانام
پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں — ہو اگر ختم رسالت کا کلام
کون ہے تیری سیادت کا مقر — جانتے ہیں خاص سے ہے تا عوام
تیرے والد کو ہوئی تپ ایک سال — تب حکیموں نے یہ تشخیص تمام
وق سمجھ کر یہ دوا تجویز کی — شیر خر با قرص کافر ایک دام
مول لے اک مادہ خر پینے لگا — ہر سحر اس شیر خر کا بھر کے جام
آخر کار اس مرض کے بھی لئے — وہ جو مادہ خر تھی اُس کی آئی کام

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر
رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہو میر

سُن تو نمک کے نصف انسان نصف خر — ہم نے کیا سید نہیں دیکھے مگر
بیش و کم تجھ میں نہ دیکھا عقل و حمق — نطفہ کی ترکیب کا ہے یہ اثر
گھر سے اپنے کھا کے جاوے جس کے ہاں — جاتے ہی مانگے ہے اس سے ماحضر
عقل کہتی ہے کہ کھائے پر نہ کھا — حمق کہتا ہے کہ ہیضے سے نہ ڈر
سید اے میر مشدّث آپ کو — کہنا اتنا ہو کے بے خوف و خطر

ریم سوزاکِ پدر ہے تو شہد پسر
رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہو میسر

ایک دوسری ہجو جو میر ضاحک کے متعلق لکھی ہے اس کا ایک بند دیکھئے۔ بنات پناہ مانگتی ہے ظرافت انگشت بدنداں ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا — بے وجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
مجلس میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا — تب شیخ سدو اس پر غصہ کو کھا کے آیا

بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

میر ضاحک کی ہجو میں ایک مخمس کی ابتدا اس بند سے ہوتی ہے ؎

یا رب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر — ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولّد ہو اگر بچہ بندر — گلیوں میں نچاتا پھرے وہ شہر کے اندر

روٹی تو کما کھاوے کسی طرح مچھندر

بڑھاپے کی شادی پر ایک مخمس لکھا ہے جس سے ان کی انتہائی ظرافت کا پتہ چلتا ہے :۔

نائن کہے ہے شرم سے دوہرا ہے سرنگوں — اب کیونکر تیل روئے مقدس کو میں ملوں
شانہ کروں میں ریش کو یا وسمہ سے رنگوں — جی کی امان پاؤں تو اک بات میں کہوں

منہ کو کالا کر ۔ اپنا اگر تو بہتری چاہے

القصہ شیخ جی کی جو حرمت خدا گنوائے　　بارہ برس کی چھوکری بیاہ جا تے لائے
آئے دولھن کے گھر سے جو مقنع میں منہ چھپائے　　جیسا ہمارے کہنے کو خاطر میں وہ نہ لائے

اپنے کیے کو ویسا ہی پاتے ہیں شیخ جی

جو رو کہے ہے شیخ سے اے شیخ تم سنو　　کچھ سوچے کو تم نے دی ہے دغا چکے ہو رہو
میں جانتی ہوں تم کو کہ تم فیلسوف ہو　　سودا زیادہ کیا کہے ہے بات گو مگو

جیسے میں تیسے جوتیاں کھاتے ہیں شیخ جی

کسی مولوی نے فتویٰ دے دیا کہ گوشت حلال ہے۔ سودا کو ظرافت کے لیے اتنا سا اشارہ کافی ہوا۔ فوراً ایک ہجو لکھ ڈالی اور وہ واہ واہ کیا سنائی کہ سننے والوں کے دانتے کھڑے ہو گئے ہیں:۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے　　کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امر و نہی میں کرنا محال ہے　　جو فقہ داں ہیں سب کو یہ اُن کا خیال ہے

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

حامی انھوں کے قول کا ہووے ہے چاند خاں　　اور دوسرے میں کہا کہوں اک اپنے مہرباں
کچھ شک رہا ہے کوے کی حلت کے درمیاں　　ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

یارو لبسو ہو تم اسی دیر خراب میں　　بیٹھا اٹھا کرو ہو سدا شیخ و شاب میں
حلت لکھے ہے زاغ کسو بھی کتاب میں　　جتنی کتب ہیں فقہ کی اُن کے جواب میں

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

غزوی ایک پنجابی شاعر تھے۔ رسمی معلومات شاعرانہ تھی، پھکی خاصی تھی۔ اتفاق سے اُن سے اور سودا سے کچھ بحث ہو گئی۔ سودا نے اس حریف کی اتنی ہجو کی کہ عاجز آ گیا۔

جہاں میں کون بناتا ہے اُلو بننے کا — کسی سے بن کوئی آتا ہے اُلو بننے کا
بہت ہی جان کھپاتا ہے اُلو بننے کا — بنا مجھی کو یہ آتا ہے اُلو بننے کا
کہ ذوی جگ میں کہاتا ہے اُلو بننے کا

کیا ہے خرچ بنانے میں اُس کے میں یہ ہنر — نہیں ہے اصلی و نقلی میں فرق ذرہ بھر
جو اور بوم ہو سو مادہ یہ لگے ہے نر — جو راہ باٹ میں آتا ہے صبح و شام نظر
کہے ہے خلق وہ جاتا ہے اُلو بننے کا

ہیں کاریگر ہوں اناڑی کا سب پہ ہے ظاہر — جو کچھ کہے کوئی کرتا ہوں پیٹ کی خاطر
وہ یوم بننے میں گر نقص سے ہو کچھ ماہر — تو اُس کی شکل کروں اور جانور کی پھر
عجیب شور مچاتا ہے اُلو بننے کا

غرض کہ اسی طرح ایک مولوی صاحب کشمیری کی ہجو میرزا قتیل کی مذمت مرزا فاخر مکین کا خاکہ مولوی ندرت کشمیری کی لڑکی کی مذلیل اور لطیفہ اُن کے بہاں موجود سے جو برجستہ طوالت کے ساتھ لکھی جائیں۔

اگرچہ یہ کہنا زیادتی ہے کہ ہجو بھی داخل ظرافت ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہجو کا بھی تمام سخنوران اور شعرا طعن و طنز و تشنیع کے ذرایع کام میں لاتا ہے اور اسی سے ایک صورت ظرافت کی پیدا ہو جاتی ہے۔

گھوڑے کی ہجو میں سودا نے اپنے عہد کے فوجی نظام پر جو طنز کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اُڑ گئے ہیں دانت — جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی پڑے ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ جو تلاشے اُس کا سین — پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے — شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

گھوڑے کی سستی

اک دن گیا تھا مانگنے یہ گھوڑا برات میں — دولھا جو بیاہنے کو چلا اُس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید — تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ بار دار

پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں — شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

مرہٹوں کی فوج سے مقابلہ کے لیے گھوڑے کا مالک اس پر سوار ہو کر جس شان سے نکلا تھا اس کی تصویر اس طرح اتاری ہے ۔

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں — دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ — ٹک ٹک سے پاشنہ کی مرے پانوں تھے فگار
آگے سے تو بڑا اسے دکھلاتے تھا سیس — پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

میدانِ جنگ میں پہنچنے پر جو کیفیت گذری ؎

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر — دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل — لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف — القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے کا مالک مفلسی کی وجہ سے دانہ تک فراہم نہیں کر سکتا ؎

نے دانہ و گیاہ نہ تیمار نے سیس — رکھتا ہوں جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار
ناطاقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیاں — فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقشِ فعلِ زمیں سے بجز فنا — ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ تو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد — امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

گھوڑے کی بھوک کی شدت ملاحظہ ہو ؎

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر — دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا — چوکے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ سپار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ — ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹیکے ہے بار بار

اس کی ناتوانی کا حال ؎

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے — مچھیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار
نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں — دھونکے ہے دم کہ اپنے کو جوں کھال کو لہار
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ — خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

میر

خدائے سخن میر تقی میر کے تفصیلی حالات اور واقعات کے لیے ذکرِ میر، فیضِ میر، نکات الشعراء، کلیاتِ میر، آبِ حیات اور گلشنِ کا وبستانِ شاعری ملاحظہ فرمائیے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے بزرگ حجاز سے ہجرت کر کے دکن پہنچے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات میں آئے پھر آگرہ میں قیام کیا۔ میر وہیں ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دہلی چلے آئے۔ انھیں کے زیرِ سایہ پرورش پائی اور تعلیم و تربیت حاصل کی۔ جوان ہوئے تو نواب آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے۔ برسوں وہاں رہے اور نوّے برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔

میر نہایت نازک مزاج، خود دار، خود پسند، بیحد قانع اور مستغنی شخص تھے۔ ہر صنفِ شعر پر قادر تھے۔ تمام اساتذۂ فن نے ان کو اُستاد تسلیم کیا ہے۔ چھ دیوان غزلوں کے، دو واسوخت، کئی مخمس اور مثنویاں مثلاً شعلۂ عشق، دریائے عشق، جوشِ عشق، معاملاتِ عشق، خواب و خیال، شکار نامہ، اژدر نامہ اور تذکرہ نکات الشعراء ان کی یادگار ہیں۔

میر نے سودا کی طرح ہجویں بھی لکھی ہیں مگر سودا سے کمتر درجہ کی ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا "میر نے ذاتیات کے جھگڑوں میں الجھنے کی بجائے اپنے ماحول کو ہجو کا نشانہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے گھر کا جس انداز سے مضحکہ اڑایا ہے اور جس طرح ہنسے اس کی جزئیات پر نظر غائر ڈالی ہے۔ وہ بیحد قابلِ تعریف ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ "گھر" کی یہ ہجو میر کے رنگِ طبیعت کے عین مطابق ہے لہٰذا یہاں وہ اپنی شاعری کے مقام بلند پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ میر دراصل نہاں خانۂ دل کے شاعر ہیں اور اپنے شعر میں ماحول کی حکمرانی کی بجائے داخلی طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے "گھر" میں ایک لحظہ کے لیے جھانکتے ہیں تو دراصل اپنے نہاں خانۂ دل میں جھانک رہے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل کے انتشار اور بے قراری کی طرح "گھر" کی ابتری اور بے ترتیبی بھی ان کے لیے دلچسپی کا موجب ہے۔ اور یہاں ان کے قلم میں وہی

... پیدا ہوتی ہے جو ان کی غزلیات کا طرۂ امتیاز ہے۔ علاوہ ازیں "گھر" کی اس مجموعیت کے مطالعے سے میر کی وسیع المشربی کا بھی احساس ہوتا ہے ... وہ خود کو شاذ و نادر ہی مسخرہ بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ "ہزل و مزاح" (صفحہ ۲۰۰) اس مثنوی کے چند شعر دیکھئے ؎

کیا کہوں تیرا اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زندان ہے — سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے مائٹ — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا تھے مہ سقف چھلنی تمام — ہوئے ہیں آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
ایک حجرہ جو گھر میں ہے دانتی — سو شکستہ ترا دل عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھر ہے کسی چھچھوندر کا — شور ہے کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے — لیہ جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
ڈب کے مرنا ہمیشہ مدنظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے — برے ہے اک خرابی گھر در سے
ایک چھپر ہے شہر دلی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں — سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے — سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان — ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ڈھیلی

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو — پائے پٹی لگائے کونے کو
ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے — جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے
دو طرف سے تھا کتوں کا رستا — کاش جنگل میں جا کے میں بستا
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کوٹھا برجل ہوا تھا بیٹھ گیا — پانی جز جز میں اس کی بیٹھ گیا

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا!
گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

میر اپنے گھر یا ماحول کا نقشہ کھینچنے میں جتنے کامیاب ہیں، افراد کی ہجو کہنے میں اتنے ہی ناکام ہیں۔ بعض بعض ہجوؤں میں تو وہ فحش اور گالی گلوچ کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور خاصے اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہجویں اثر سے خالی ہیں۔ "خواجہ سرا" اور "بلاس رائے" کی ہجویات میں یہ کیفیت نمایاں ہے۔ ہجو کول کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

اک ہے پُرخور آشنا بے پیر — سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر
صد منی دیگ ہے شکم اس کا — نفس اژدہا ہے دم اس کا
آنت شیطان کی ہے اس کی آنت — دانت اس کا ہے ہاتھی کا سا دانت
گال کلچے سے پھر توے سے سیاہ — کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ
توند کالی جو کھول جائے لیٹ — آہنیں ہے تنور اس کا پیٹ
راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی — چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی
کھینچے باورچیوں کے کیا کیا ناز — کتری گئی اس کے چوتڑوں پر پیاز
خام طمعی سے اک کرے ہے آہ — دیکھ کر شب کو نان ہالۂ ماہ
کھانے پر جب وہ جی چلاتا ہے — لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے

بھوکا کتا

بھوک کا بوڑھا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
دہر کا جلتا آگ سے ماؤں — بھوک اس کی جلے تو میں جاؤں
جب مرے گا وہ بھوک کا روگی — روٹی تو شے کی روٹی میں ہوگی
کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے — مرگیا ہو دے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جائے
گور میں بھی کفن گل جائے

مُرغ باز

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مرغ لے بغل میں آتے ہیں
جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے — ان کی صد رنگ بد زبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ایک کے منہ میں مرغ کی منقار ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے تیکھی نظروں سے سب تکنے لگے
طرفہ سنگامہ طرفہ صحبت ہے بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ
لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

لشکر

جس کسی کو خدا کرے گمراہ آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ آ دی
فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس چیتھڑوں بن نہیں کسی کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ ہتھیار، سامان جنگ
مفلسی سے رہا ہے کس میں حال خورش و خواب ہیں گے خواب و خیال
چار دن عمر کے ہوئے ہیں وبال زندگی اپنے طور پر ہے محال
مرگ ملتی نہیں ہے خاطر خواہ

"بحر نا اہل" میں اپنے کسی حریف سے وہ دو دو چونچیں کی ہیں ؎

سنو اے اہل سخن بعد از سلام چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام
کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے

شاعری کو میری ہو گئے جانتے — تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — دردمند و عاشق و درویش تھا
پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ
ایسے کتنے ہیں جواب شاعر بنے — مدتوں یہ ٹنڈے آنے مجھ کنے
ایک میرے طرز پر کہنے لگا — دوسرا پیرو مرا رہنے لگا
سارے عالم میں مری دھن چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا
مدعی میرا ہوا یہ بے سمر — مردۂ صد سال سا بے نور تر
کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود — قلیۂ دو روز سے بھی بدنمود
باپ اس کا سخت نادان نادرست — کوڑی کی سی گندی بلی قاق و ست
مستی اس کی ساری اب جھڑ جائے گی — دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی
ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے — چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے
ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی — پودنے کی سی ہے اس کی ضامنی
یہ قبول خاطر و لطف سخن — دے ہے کب رب کجے خدائے ذوالمنن
ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور — اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور
میں نے الٹی اجگروں کی دم میں صف — ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف
رکھتی ہے میری شرافت اشتہار — گو یہ ناہید کہے ہے کیا چمار
بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر — شاعری بھاتا کیا خالہ کا گھر

نا مبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے
اُلّو ہے اور اُلّو کی مادہ بھی ہے

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے انھیں اس قسم کی بچوں کہنے پر مجبور کیا گیا۔ ورنہ وہ اسے دل سے پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے طرز زندگی اور طرز احساس کو سماج کے طرز زندگی کے مقابل رکھ کر دونوں کا موازنہ کرتے تھے اور فیصلہ بھی اکثر اپنے خلاف کرتے تھے۔ وہ اپنے اوپر ہنستے بھی تھے اور اپنے آپ پر طنز بھی کرتے تھے۔ ایسا طنز نہیں جس میں تلخی اور بیزاری شامل ہو۔ بلکہ یہ طنز میر کی سب سے انفرادی اور سب سے ممتاز چیز ہے۔ یہاں ناکردہ دونوں حقیقتوں کو ایک جگہ ملا دیتے ہیں۔ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی تسلیم کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کی اہمیت اور برتری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کرتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے بھی ہیں اور اپنے آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اس طنز میں اپنے آپ سے مایوسی اور نفرت نہیں ملتی بلکہ اپنے آپ سے لطف لینے کی صلاحیت[1] ہے اب آپ میر کے کچھ شعر ایسے سن لیجئے جن کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے

کہتا تھا کسی سے کچھ نکتا تھا کسی کا منہ — کل میر کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دوانہ تھا

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میر صاحب کو دیکھئے جو بنے — اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

کسو وقت پاتے نہیں اس کو گھر — بہت میر نے آپ کو گم کیا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

شور و شغب کو راتوں کے ہمسائے تمہارے کیا رویئے — ایسے فتنے کتنے اٹھیں گے میر جی تم جو سلامت ہو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی — میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

میر صاحب رُلا گئے سب کو — کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں — تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

---

[1] مضمون "میر جی" از محمد حسن عسکری مطبوعہ ساقی میر نمبر ص ۲۷۵

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم میں عجب حال ہو گیا

وحشت ہے بہت میرؔ کو مل آیئے چل کر
کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

چل ہم نشیں کہ دیکھیں آوارہ میرؔ کو ٹک
خانہ خراب وہ بھی آج اپنے گھر رہا ہے

سودا ہو، تپ ہو، میرؔ کو تو کیسے کچھ علاج
اس تیرے دیکھنے کے دوانے کو عشق ہے

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

کس طرح میرؔ جی کا ہم تو بہ کرنا مانیں
کل تک تھے داغ مے کے سب ان کے پیرہن پر

انشا

سید انشاء اللہ خاں، حکیم ماشاء اللہ خاں کے فرزند تھے۔ ان کے بزرگ بخصد اشرف سے ہندوستان آکر دہلی میں بس گئے تھے اور اپنے علم و فضل کی بدولت درباروں، رسائی حاصل کر کے سلسلۂ امرا میں داخل ہو گئے تھے۔ سید انشاء اللہ خاں کی ولادت نواب سراج الدولہ کے عہد میں ۱۷۵۶ء اور ۱۷۵۸ء کے درمیان مرشد آباد میں ہوئی۔ مولانا عبدالحی گل رعنا میں فرماتے ہیں:۔

"ان کے والد ماشاء اللہ خاں فضیلت علمی کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی۔ یہ بھی بلا کے ذہین تھے۔ تھوڑے دنوں میں فارسی اور اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کر لی۔ طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی۔ شاعری کی طرف آئے تو آمد ہی کی طرح آئے۔"

شاہ عالم کے زمانہ میں انشا باپ کے ہمراہ دہلی آئے اور شاہ عالم کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔ اس وقت ——— (۱۷۸۲ء-۱۷۷۱ء) سلطنت کا شیرازہ لٹ رہا تھا۔ دربار نام کا دربار تھا۔ باقی اللہ کا نام۔ چار و ناچار چند روز نباہی اور اپنی خوش مذاقیوں اور گل افشانیوں سے اس وادیٔ خزاں رسیدہ کو گل و گلزار بنائے رکھا۔ یہاں سے طبیعت اچاٹ ہوئی تو لکھنؤ

کا رُخ کیا جہاں شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ نے باپ کے درباری ہونے کا لحاظ کر کے تعدی اور غربت کے آنسو پونچھے۔ مگر چند روز بعد نواب سعادت علی خاں کے دربار میں پہنچے اور اس قدر مقرب ہوئے کہ نواب کو ان کے بغیر کسی وقت چین ہی نہ آتا تھا۔ لکھنؤ کی فضا نے انشاء کے بگڑے ہوئے مذاق کو جو دہلی کی صحبتوں میں خراب ہو چکا تھا ایسا نواز اکہ ان کے اصلی جوہر مسخرہ، پھکڑ اور شہدپن کے غبار میں چھپ گئے۔

لکھنؤ میں انشاء اور مصحفی میں بڑے معرکے ہوئے جن کی تفصیل آبحیات اور دوسرے تذکروں میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:۔

"ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور ساز و باز کی گرم بازاری ہمیشہ رہی۔ ہر منہ چڑھا صاحب دوسرے کے اکھاڑنے اور جمانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حوقلیں اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشاء، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اوّل الذکر شاعرانہ چشمک رہی۔ بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ اور فحش و پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشاء نے وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں بھی ہو جاتی ہیں۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آئی۔" (مقدمہ تذکرہ ریاض الفصحا)

انشاء کی طبیعت ہنگامہ پسند ضرور تھی لیکن لکھنؤ میں اس معرکہ کی ابتدا خود مصحفی کی طرف سے ہوئی۔ مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا جس میں لکھنؤ کے مروجہ مذاق کے مطابق عجیب توالی و ردیف کی طرح دی گئی۔ مصحفی نے غزل کہی جس کا مقطع تھا ؎

تھا مصحفی بہ مائل گریہ کہ پس از مرگ ۔۔۔ تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

کسی نے اس شعر میں تصرف کر کے یوں کر دیا ؎

تھا مصحفی کا ناجو چھپانے کو پس از مرگ ۔۔۔ تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

مصحفی سمجھے کہ یہ انشاء اور ان کے ہواخواہوں کی شرارت ہے۔ انھوں نے ایک فحریہ غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری ۔۔۔ نادان ہے جس کو مجھ سے ہو دعوائے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجان شعر کو ۔۔۔ برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

اک طُرفہ خر سے مجھ کو پڑا کام ہے کہ ہائے ۔۔۔ سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

اے مصحفی ز گوشہ خلوت بروں خرام
خالی است از برائے تو خود جائے شاعری

انشاؔ کی طبیعت اس وقت تک صاف تھی۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر مصحفی کے پاس غلط فہمی رفع کرنے گئے۔ لیکن مصحفی نے ویرانی سے جواب دیا واپس آ کر انشاؔ نے بحر طویل میں مصحفی کی ہجو کہہ ڈالی۔ یہ اس مناقشہ کی ابتدا تھی اس کی انتہا وہ ہوئی جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

اسی زمانہ میں ایک اور مشاعرہ ہوا۔ مصحفی نے غزل کہی جس کا مطلع ہے :-

سر مشک کا تیرا تو ہے کافور کی گردن ۔۔۔ نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

انشاؔ نے ایک طویل قصیدہ دیں اس پر اعتراضات کیے۔ بعض شعر یہ ہیں ؎

سن لیجئے گوشِ دل سے مری مشفقانہ عرض ۔۔۔ مانندِ بید غصہ سے مت تھرتھرائیے

کیا لطف ہے کہ گردنِ کافور باندھ کر ۔۔۔ مُردے کے پاس زندوں کو لا کر سلگائیے

ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں ۔۔۔ دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائیے

آخری شعر میں در پردہ مصحفی پر چوٹ ہے جو بقول آزاد مسی لگاتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے دانت سیاہ تھے۔ اس کے بعد انھیں ردیف قوافی میں خود غزل کہی ہے ؎

آئینے کی گر سیر کرے، شیخ تو دیکھے ۔۔۔ سر خر کا، منہ خوک کا، سگ کی گردن

توڑوں گا جو نمِ بادۂ انگور کی گردن ۔۔۔ رکھدوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصدِ جوانشاؔ ۔۔۔ تو توڑے جھٹ بلعم باعور کی گردن

مصحفی کب چپ رہنے والے تھے۔ انھوں نے جواب میں ایک قطعہ لکھا اور خود انشاؔ کی غزل پر بہت سے اعتراضات وارد کیے۔ غرض مناقشہ نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اور مصحفی کے شاگردوں میں سے گردؔم اور منظؔر کے علاوہ اور بھی بیانؔ رنگیؔن کے ایک مثنوی "گرم جلا پخہ" لکھی جس کے جواب میں انشاؔ نے بھی ایک مثنوی لکھی اور اس میں مصحفی کے ساتھ غریب مصحفی کو بھی شامل کر لیا۔ ایک باقاعدہ جلوس مرتب کیا گیا۔ ایک شخص ہاتھی پر بیٹھا ایک کڈے اور گڑیا کو لڑاتا جاتا تھا اور شعر پڑھتا جاتا تھا۔

مصحفی کے ہوا خواہوں نے بھی جلوس کا جواب جلوس سے دینا چاہا مگر شہر کے کوتوال نے روک دیا۔ مصحفی کی شکایت پر نواب وزیر آصف الدولہ نے انشاؔ کو لکھنؤ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ انشاؔ حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے ہی تھے کہ ربیع الاوّل ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ کا انتقال ہو گیا اور یہ پھر لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ کی فضا کے متعلق انشاؔ خود دریائے لطافت میں میر غفرؔ غنی کی زبان سے فرماتے ہیں:-

"جب سے دلّی چھوڑی ہے کچھ ہی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو کہو تو اس میں کچھ لطف نہیں رہا۔ مجھ سے سننے نہ سنانے میں استاد میاں ولی ہوئے۔ ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبروؔ اور میاں ناجیؔ اور میاں عالمؔ

پھر جب بستر مرزا یفیع سودا اور میر تقی میر صاحب، پھر حضرت میر درد صاحب جو میرے بھی اُستاد تھے وہ لوگ قسمت پر رگئے تو لوگوں کی قدر دانی کو نخلعت بھی جاں بخش تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے کچھ کرے ویسے ہی شاعر ہیں اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ ہو چلا ہے تم تاثیر، صحبت اثر۔ سبحان اللہ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تمھارا خان مان کس دن شعر کہتا تھا اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے اور وہ دوسرے میاں متصفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھیے کہ ضرب زید عمراً کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو اپنا حق بادیاں، حسرت انارین چھوڑ کے شاعری میں آگے قدم رکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے پیچھے آگے پری زاد تھے۔ ہم بھی گھورنے جاتے تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے۔ مرزا مغل جان جانی کے روزے کو نام رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے معمار یار علی اسب کا بیٹا انوری تخلص کا آپکو تاڑ جاتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔"

میر انشاء ضرورت سے زیادہ شوخ اور ظریف تھے۔ بعض اوقات حد اعتدال سے بڑھ جاتے تھے۔ اس لئے ۱۸۱۰ء میں نواب سے بگڑ گئی اور اس نے حکم دے دیا کہ دربار کے سوا کہیں نہ جائیں چنانچہ دربار میں بھی بن بلائے نہ آئیں۔ اسی پابندی کے عالم میں ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔

انشاء کی تصانیف میں دریائے لطافت سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کلیات میں ایک فارسی، ایک اُردو اور ایک بے نقط دیوان مثنویاں قصیدے، رباعیاں وغیرہ شامل ہیں۔ سب میں ان کے تسمخر اور مزاح کی شان موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشاء ظرافت ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ وہ اگر اس کے سوا کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی ان کا علم و فضل اتنا ہی مسلم ہوتا جتنا اب ہے۔

انشاء کی شاعری کے متعلق مولانا آزاد کی اس رائے کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاورہ کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشتراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہو گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی ہے وہاں ٹھکانا نہیں۔"[1]

ان کی ظرافت کے اقسام گنانا ایک قسم کی دانستہ فضلی ہے۔ جو شخص بات بات میں ظرافت کے دریا بہائے، کوئی کہاں تک اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ پھر بھی رسمیت کو ان کے ظریفانہ انداز کا سب سے بڑا نمونہ سمجھئے۔ بعد ازاں ماڑواڑی وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ بہر صورت ہم ان کی ہر قسم کی ظریفانہ شوخیوں میں سے کچھ نمونے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ نظم کا حصہ شروع کریں۔ اُن کے کچھ لطائف لکھے دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے از راہ تکلف و تصنع نہ تھا بلکہ ان کی فطرت یہی تھی۔ ان کا وجود اُن کی ہستی محض ہنسانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ جس رنگ میں کوئی شعر کہتے ہیں۔ یا جس قسم کی ظرافت سے کام لیتے ہیں اس میں کسر باقی نہیں رکھتے۔ کیا مجال کہ کہیں اعتراض کیسا نظر بھر کر دیکھنے کی بھی گنجائش نکل آئے کوئی فضلی سرزد ہو۔ معاذ اللہ۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر انھوں نے اسی رنگ میں مشق کی ہے۔ اور یہی رنگ عمر بھر رہا ہے۔ وہ انتہا کے شوخ، حاضر جواب تھے۔ چنانچہ چند لطیفے درج کرتا ہوں۔

ایک دن نواب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے صافہ یا پگڑی علیحدہ رکھ دی سر گھٹا ہوا تھا نواب کے دل میں جو ترنگ اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر تچھے سے ایک ٹپ دی۔ آپ نے جلدی ٹوپی سر پر رکھ کر کہا۔ بزرگوں کی نصیحت پر عمل نہ کرنا بڑی بُری بات ہے۔ نواب

---

[1] تذکرہ خندۂ محفل

نے کہا کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ سنا تھا نگے سر کھانا کھانے سے شیطان دھوپ لگتا ہے۔

ایک مرتبہ نواب نے دفتر والوں کو حکم دیا کہ بھئی سب خوشخط لکھو اور جو کوئی غلطی کرے گا فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ اتفاق کی بات ایک بڑے قابل مولوی صاحب نے فرد حساب میں اجناس کا سین جیم ول کر اجنا لکھ دیا۔ نواب صاحب نے کہیں دیکھ لیا۔ مولوی صاحب نے اس کے معنی بتانا شروع کیے اور تاویلوں کے انبار لگا دئے۔ نواب نے انشاء کو اشارہ کر دیا۔ انشاء نے یہ رباعیاں نظم کر کے پڑھیں اور مولوی کو روپیہ دلوا دیا۔

اجناس کی فرد پر یہ اجنا کیسا — یہاں ابر لغات کا گرجنا کیسا
گو ہوں اجنا کے معنے جو چیز اُگے — لیکن یہ نئی اڑج اچنبا کیسا

اجناس کے بدلے لکھئے اجنا کیا خوب — قاموس کے عد کا گرجنا کیا خوب
از روئے لغت نئی اپج لے لی ہے — اس تان کے بیچ کا اچجنا کیا خوب

اجناس کے موقعہ پہ اجنا آیا — سلمائے علوم کا یہ بجنا آیا
اجنا چیرے ست کاں برو یدز میں — یہ تخم لغت کا لو اچنبا آیا

نواب نے کہیں رونا رکھا تھا اور یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی نہ آئے پہرہ لگوا دیا تھا مگر انشاء کو کوئی ضروری کام تھا۔ آخر عورتوں کا بھیس بدل ناک پر انگلی رکھ نواب کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ نواب نے چونکہ حکم دے رکھا تھا کہ کوئی نہ آئے۔ اب یہ پہنچے ذرا بیتوری پر بل آئے انھوں نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

میں تو کہتی تھی نہ رکھ لے مرے پیارے روزہ — بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

ایک مرتبہ لب دریا چلے جا رہے تھے ایک حویلی نظر آئی جس پر یہ تاریخ لکھی تھی ؎

حویلی علی نقی خاں بہادر کی

کسی نے کہا کہ انشاء دیکھو کیا تاریخ کہی ہے ذرا اسے رباعی تو کر دو تو انھوں نے فی البدیہہ کہا ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی — نہ سم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کس لُر کی — حویلی علی نقی خاں بہادر کی

فائق جو ان کے معاصر تھے انھوں نے انشاء کی ہجو کہی انشاء نے صلہ میں پانچ روپیہ دیئے اور کہا ؎

فائق بے حیا چو ہجو من گفت — دل من سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم — دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

گیان چند ساہوکار کی ماڑواڑی میں ایسی ہجو لکھی ہے کہ تلوار تیز معلوم ہوتی ہے جس سے اس کی عزت تک کا خون بہا دیا گیا ہے۔ بھڑوں، مکھیوں وغیرہ کی ہجوؤں میں پوری پوری مثنویاں نظم کر دیں۔ مجھے تو ایسے ہی مجھے وہ واہ کیاں کہیں کہ تو یہی تو ہے۔ افسوس کہ ہمیں کوئی بھی ضروری نہ تھا کہ وہ جب ہزل یا ظرافت یا ہجو کا ارادہ کرتے تبھی ایسے شعر کہتے نہیں غزل کہتے اس وقت بھی یہی عالم تھا۔ قصیدہ لکھتے تو بھی یہی رنگ غالب رہتا دو چار شعر اس قسم کے سنئے اس کے بعد رنگینی کا رنگ دیکھئے۔

لیا گر عقل نے منہ میں دلِ بیتاب کا کنکا — تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا کنکا

صنم خانہ میں جب دیکھا بت و ناقوس کا جوڑا — لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا
یہ سچ سمجھو کہ انشاء ہے جگت سیٹھ اس زمانہ کا — نہیں شعر و سخن میں کوئی اس کی ساکھ کا جوڑا

دلِ ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا — ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا
سنایا رات کو قصہ جو میر رانجھے کا — تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

رات وہ بولے مجھ سے ہنسکر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں — میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقلع میرا تیرا میل نہیں

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے — یہ تو بیچاری آپ ننگی ہے
ڈرو وحشت کی دھوم دھام سے تم — وہ تو ایک دیوی دنگی ہے

خیال کیجئے کہ کیا آج کام میں نے کیسا — جب اُن نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا — جب دم سے آکھوں گا صاحب سلام میرا

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں راجہ کے کنڈ پر — بن کر مہنت گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر
راجہ جی ایک جوگی کے چیلے پہ عشق ہیں آپ — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لنڈ منڈ پر

جو چاہے تو مجھ سے ہنسوڑے کی خیر
تو یوں دیکھ اس گھوڑے جوڑے کی خیر

کہ اوے نشے کے مرے رخش کو
میاں ساقی اس سلفے کوڑے کی خیر

ہنسایا جو میں نے تو بولے نہیں
نظر آتی کچھ اس نگوڑے کی خیر

لگا بیٹھ انشا کو ٹھوکر تو ایک
ارے اپنے سونے کی توڑے کی خیر

واقعی کافور ہو جائے اگر فلفل نہ ہو
راہ دکھا کر چین کیا آوے کنہیا جی بغیر

اس شخص پہ اصلا نہیں نواب کی پھبتی
جس پاس کہ سو لاکھ روپے کا بھی نہیں ملک

یہ چند بھاگ کر کسی کونے میں دب رہے
تبت یدا ابی لہب پڑھ کے اک عزیز

واللہ مورے بھاگنے کا یہی سبب رہے
لوگوں نے ڈھونڈ کر انھیں پوچھا تو بولے آپ

ان مال ہوے یعنی سو وہ مکسب رہے
ہے مالہ و ما کسب آیا فقر آن میں

مُنہ کار ہی کی فکر یہی روز و شب رہے
اہل و عیال کھائیں پئیں پھر کہاں سے کچھ

اور تان کر چپاخ سے اک دھول مارے
جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اُتار لے

کر اپنے شیش محل میں ہی ڈنڈ کرتے ہیں
یہ آپ سمن پہ اپنے گھمنڈ کرتے ہیں

کوئی چور آوے اور اس کی کوئی گردن مارے
پہ جو بوڑھا سا ہے دربان تمھارا اے کاش

مطرب کو ڈوم کہتے ہیں بولے کہ دوم ہے
آمادہ ہیں جو تازہ ولایت سوراست کو

ہے جھوٹی کی سی صورت یہ ڈرانی آپ کی
کیوں نہ لڑکے سب کہیں ہوا تمھیں اے شیخ جی

دکھلاتی ہے مجھے دنب الفار کی شبیہ
ہر دم یہ موجھ آپ کی اے شیخ تکیہ ریش

وہی پی کہاں وہی پی کہاں یہی ایک رٹ ہے جو ہے سو ہے ۔۔۔ مہاراج چوٹ سی لگتی ہے مجھے اس پپیہے کی ٹیر سے

سانولے پن پر غضب ہے دھج بسنتی شال کی ۔۔۔ جی میں ہے کہہ بیٹھئے اب جے کنہیا لال کی

غرضکہ اسی طرح بات بات میں ظرافت اور شوخ پن کرتے تھے۔ ریختی ان کا کوئی خاص رنگ نہ تھا بلکہ اپنے دوست میاں رنگین دہلوی کے اتباع میں تفنن طبع کے طریق پر یہ بھی لکھ ڈالی۔ اور لکھی تو ایسی اور اتنی لکھی کہ آج پورا ایک دیوان موجود ہے۔ ان کی ریختی میں معنوی حیثیت سے یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ جہاں صاحب کی طرح تصنع اور آورد سے سراسر پاک ہے۔ خاص دلی کی بیگمات کا روزمرہ ہے۔ اکثر اشعار ایسے ذومعنی ہیں جو ریختی اور ہزالی دونوں رنگوں کا نمونہ ہیں جنہیں دیکھنے والے خود سمجھ سکیں گے۔

میں کیا کہوں دوگانا اُس کل کے دوڑنے سے ۔۔۔ جو لال ہو گیا ہے اس پانوں کی تلی کا

ہاتھوں سے تیرے میں تو کمبخت عاجز آئی ۔۔۔ جو کام ہے نگوڑا تیرا سوہلی کا

انشاء سوائے اپنے اللہ کے جہاں میں ۔۔۔ ہے کون کھونے والا اس دل کی بیکلی کا

اللہ کرے سلامت جم جم رہے یہ بیڑا ۔۔۔ ہے جس کے دم قدم سے دنیا کا سب بکھیڑا

تھام تھام اپنے کو رکھتی ہیں بہت سا لیکن ۔۔۔ کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا

اپنے کوٹھے پہ کچھ اس ڈھب سے رقیلا کہ مری ۔۔۔ لے گیا جان اڑا ایک کبوتر والا

ہے یہ سختی کونسی منزل انشاء اس کا نام بتا ۔۔۔ ڈر سا میرے دل کے اندر اس منزل میں بیٹھ گیا

اپنا جو دکھاتا ہے ہمیں زور نگوڑا ۔۔۔ صدقے اسے کر ڈالئے در گور نگوڑا

میں بیچ پڑوں کیوں نہ جو لے انگلی میں اپنی ۔۔۔ ڈالے مسل انگلی کی مری پور نگوڑا

تو قیامت بے سُری ہے حد بُرا تیرا گلا ۔۔۔ خوش نہیں آتا ہمیں بی فاختہ تیرا گلا

[illegible] آئیں تو کیسی رونق ہے [illegible] ہے اپنا تو [illegible]

[illegible] کوئی [illegible] [illegible] ہے [illegible]

فرقت سے [illegible] [illegible] ہے [illegible] کی

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

بس باتیں ہری ہری لے چٹ پٹ — اے وہ گانا تو ایک ہے نٹ کھٹ

دم دلاسا جسٹ نہ دے آگا — چل ہمی ذرا رہ پرے بھی ہٹ

چوٹ کی دل کو لگ گئی انشا — جب سنی اُس کے پاؤں کی آہٹ

انشا سے ملتے کیوں نہیں جسٹ ہو بھلا تو دیر کیسا — جی ہی پہ کھیلے ہو تو پھر لوگوں سے ڈرتے ہو جسٹ

سارے بھوتوں سے بچے ہے یہ مرا خواجہ غیب — مجھ کو گھوڑا ہی کرے ہے یہ مرا خواجہ غیب

کالے بادل نہ گھر آتے تو ارے او لوگو — آبرو آج مری جسٹ میں کیوں کھوتی ہے

کان کی لو میں گھسی موٹی سی بالی کیونکر — جس کا ہو سوئی کے ناکے سے بھی نتھنا سوراخ

بلائیں میں نے جو لیں اُن کی کل چٹاخ پٹاخ — تو کس مزے سے کہا بگڑ کے چل گستاخ

اری پی ایک ہی عیار ہو تم — ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم

میں تو کچھ کھیل نہیں ہوں تیرے کوئی — جو نہ کھیلے گی تو پانی جان تیری بولیاں

[illegible] [illegible] [illegible]

رات بھر اپنا ترستا ہی رہا جی باجی — اب تو نوبت بجی اٹھو اجی باجی باجی
اے لو اس کوٹھری میں میرے ڈرانے کے لیے — اک عبا اوڑھ کے بن بیٹھی ہیں حاجی باجی

ناحق ناحق مجھے جلاتی کیوں ہے — گھر میں مرے آگ لینے آتی کیوں ہے
آئی تو نہیں ٹھہرتی یہ رنجش ہے — بے فائدہ یاں تو آتی جاتی کیوں ہے

متفرقات

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر — فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

ملک شیخِ سیہ رُو کے تبسم کو نہ دیکھو — معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہنستا ہے تو اگرم

ہے شیخِ سیہ چہرہ جو مجلس میں پھدکتا — یاروں کو ہے یاں روٹی کے لنگور کی سوجھی

دیا نامۂ سید انشا تو ان نے — دبستر جڑی اک سرنامہ پر پر

گھر سے باہر تمھیں آنا ہے اگر منع تو آپ — اپنے کوٹھے پہ کبوتر تو اڑا سکتے ہیں

کالی بلا کی شکل بنا کر جھپٹ نہ جا — میں نے کہا کہ دور ہو مجھ کو نہ تھام چھوڑ

بڑی داڑھیوں پہ نہ جا دلا، یہ سب آہوؤں کے ہیں مبتلا — یہ شکار کھیلے ہیں برملا انھیں ٹٹیوں کی تو آڑ ہے

انشا تو اینڈتے ہیں پڑے میکدے کے بیچ
کہیو سلام زاہدِ شب زندہ دار کو

مصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے والد کا نام ولی محمد اور دادا کا شیخ درویش محمد تھا جو موضع اکبر پور کے رہنے والے تھے۔ مصحفی ۱۱۷۴ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں تکمیل شاہجہان آباد میں ہوئی۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ دہلی اور لکھنؤ پہنچ کر دور ہو گئی۔ یہ ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء کے قریب نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ دلّی سے آنے والے بہت سے شعرا فیض آباد اور لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے۔ مصحفی ایسے آئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے اور آخر یہیں ۱۲۶۹ھ / ۱۸۲۵ء میں انتقال کیا۔

مصحفی شاعرانہ کمال اور علم و فضل میں اپنے معاصرین میر، سودا اور انشا وغیرہ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ میر انشا کی وساطت سے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں داخل ہوئے اور کچھ دن ماہر بھی مقرر ہو گئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں ان کی شاعری کا سکّہ جما اور دوسرے باکمالوں کے ساتھ لوگوں کی زبانوں پر ان کا نام بھی آنے لگا۔ اس پر ان کے معاصرین رشک کرنے لگے۔ حسد و نفاق سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ باہم چپقلش رہنے لگی۔ پہلے ظرافت اور پھر ہجو کے ناپاک اور گندے ہتھیار استعمال ہوئے۔ سید انشا کی شوخیوں اور بے اعتدالیوں نے ان کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ وہ کچھ کہلا کر چھوڑا کہ آج ان کی نزل اور ہجو گوئی کا استاد مانا جاتا ہے۔

انشا اپنی رنگین مزاجی، بذلہ سنجی اور زمانہ سازی کی وجہ سے مرزا سلیمان شکوہ کے مزاج پر حاوی تھے۔ مصحفی سے بگڑے تو اپنی چکنی چپڑی خوشامدانہ باتوں سے مرزا سلیمان شکوہ کو بھی ان سے بددل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تنخواہ کم کر دی۔ اس پر غریب بڈھے نے جل کر یہ شعر کہے ؎

چالیس برس کا ہے یہ چالیس کے لائق	تھا مرد معمّر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے	ہم بھی تھے کہیں روز شمس پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرّر	ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اس واقعہ کے بعد انشا اور مصحفی میں رنجش کی ایسی گرہ بیٹھ گئی کہ بات کا بتنگڑ بن گیا اور ہجوؤں کا لٹھ مار اتنا کھچا کہ توبہ ہی توبہ۔

مصحفی تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے ناقد بھی تھے۔ ان کے اردو اور فارسی شعرا کے تذکرے اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ نہایت ذکی، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ غزلوں کی عزلیں کہہ کر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ان کا دستور تھا کہ جہاں کوئی مشاعرہ ہوتا یہ بہت سے شعر اسی زمین میں کہہ کر رکھ لیا کرتے اور پھر گاہکوں کے ہاتھ حسبِ حیثیت شعر فروخت کر دیتے۔ اس کے باوجود تین تذکرے، چھ دیوان اردو کے اور ایک دیوان فارسی کا ان کی یادگار ہیں۔

یہ کلیات میں شاعرانہ تعلّی کی بیشتر مثالیں قصیدوں، غزلوں، قطعوں اور رباعیوں میں ملتی ہیں اور انھیں محض رسمی کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل مصحفی ایک شدید ذہنی اور نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھے۔ تعلّی جو محض جذبۂ خود پرستی کی تسکین کے لیے ایک ذریعۂ اظہار رہے لیکن یہاں محض خود پرستی کا دبا ہوا جذبہ ہی اُبھرنے کے لیے بے چین نظر نہیں آتا بلکہ معاصرین سے چشمک، ان سے مقابلہ، کبھی ان کی شہرت اور قبولِ عام کا اعتراف، کبھی ان کی ہجو کی دھمکی، کبھی ان کے میدان کو مکمل کرنے کا اعلان کہیں ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کے لیے دلیلیں اور شواہد اور اس سلسلہ میں ان کی تضحیک اور ہجو غرض طرح طرح کی کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک طرف خاص طور سے میر اور مرزا ہیں۔ دوسری طرف مصحفی اور ان کے شاگردوں میں گرم اور منتظر ہیں۔ یہ دونوں شاگرد وہی ہیں جو انشاء کے معرکے میں بھی پیش پیش تھے تیرہ ان کے شاگردوں سے براہِ راست کبھی بدمزگی کا موقع نہ آیا۔ لیکن سودا کا رنگ عام طور پر لکھنؤ اور دلی میں دونوں جگہ یکساں طور پر معقول تھا اور مصحفی خود بھی اسی رنگ کو اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی طبیعت میں وہ شگفتگی تھی جو سودا کو فطرت نے بخشی تھی نہ ایسا کوئی مرقّی اور سرپرست انھیں نصیب ہوا کہ اس کی داد و دہش یا کم از کم سرپرستی انھیں ایک طرف فکرِ معاش سے فارغ کر دیتی اور دوسری طرف ان کے حریفوں کا منہ بند ہو جاتا۔ مصحفی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں ان کے ساتھ بڑی ناانصافی اور ظلم ہوا ہے۔ وہ معاصرین میں اپنے علم و فضل اور فنی لیاقت کے اعتبار سے کسی کو اپنا مقابل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ واقعہ ہے رنگین اور انشاء کو چھوڑ کر اس وقت کوئی دوسرا شاعر اس علم و فضل کا مالک نہ تھا ــــ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ قدردانی سے محروم رہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے انھوں نے تعلّی کا یہ انداز اختیار کیا۔ وہ چاہتے تو ہجو گوئی پر بھی اتر آتے۔ لیکن اس کا انھوں نے بار بار اعتراف کیا ہے کہ ان کے بس کی بات نہیں۔ شاید ایسا کہہ لیتے تو ان کی طبیعت کی تلخی اور الم کی کسی حد تک کم ہو جاتی۔" (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۲۶-۲۲۷)

اس پر ستم یہ ہوا کہ ان کی منکوحہ بیوی ایک لڑکی جن کر مر گئی۔ اس کے بعد مصحفی نے ایک "زن مدخولہ بے نکاح و منعۃ" سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن اس کے چال چلن سے گھبرا کر قطع تعلق کر لیا۔ ایک تیسری عورت سے رشتہ جوڑا تو وہ کوچہ گرد نکلی اور چند روز بھی گھر کی چار دیواری میں نہ بیٹھ سکی۔ اس نے کسی وقار کے بہکانے سے مصحفی سے جدائی طلب کی۔ ان دونوں عورتوں میں سے ایک کا نام شاید عصمت تھا جس کے متعلق مصحفی کہتے ہیں ؎

ہے حیف تو یہ کہ با جمال چوں حور، عصمت اور ہووے مائل فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں برعکس نہند نام زنگی کافور

اے کاش نہ ہم ایسی محبت کرتے اور کچھ کرتے تو صبر و طاقت کرتے
گر ہے یہی بے کلی تو اک دن یارب مر جاویں گے یونہی عصمت عصمت کرتے

اس کے بعد ایک اور عورت سے بقول خود زنا سے بچنے کے لیے متعہ کیا۔ لیکن اس سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس محرومی پر اپنے فرزندانِ معنوی یعنی نظم و نثر کے دفتر دیکھ کر ہی خوش کرتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مصحفی کی طبیعت میں تلخی اور زہرناکی اور بڑھ گئی اس کے باوجود ان کے کلام میں ظرافت کے بھی قہقہے سنے جا سکتے ہیں ؎

کیوں نہ ول نظارگی کا جائے لوٹ　　لکھنؤ میں حسن کی بندی ہے پوٹ

آزاد نے لکھا ہے کہ ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب کی شوخیٔ طبع کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس غزل کے چند ظریفانہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

پانی بھرے ہے یاد و یہاں قرمزی و شالا　　لنگی کی سج وہ کھا کر سقنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے　　کافر کا نشۂ حسن ہو جائے ہے دوبالا

دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں　　لنگی کے رنگ سے جب اس تک کمر ہو لالا

اس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا　　چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا

سرگرم سیر گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا　　نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا

چپنے عاشق نہ کیوں اس کے ممولے　　کہ چشم شوخ اس کی ہے ممولا

جزاک اللہ بنایا تو نے صیاد　　قفس میں از پئے بلبل ہنڈولا

انشاء کی مذورانہ اور تہم ظریفیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو مصحفی نے یہ رجز کہہ کر انشاء کو چڑایا ؎

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بہ شدت　　وہ شخص ہے واللہ کہ مجنوں مرے آگے

میں گوز سمجھتا ہوں خدا اس کی صدا کو　　گر بول اٹھے اونی کی چوں چوں مرے آگے

قدرت ہے خدا کی کہ ہمیں آج وہ شاعر　　طفلی میں جو کل کرتے تھے غل غوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفی ہے خامہ مرا بھی
گو خصم بنے اسود افیوں مرے آگے

اپنی پرانی چارپائی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

یہ جو ہم پاس چارپائی ہے　　گور ہے یا کنواں ہے کھائی ہے

پٹی پائے تمام ناہموار — اور بانوں کی جھول جیسے کہ غار
ڈھانچے سے اس کا بسکہ اول جلول — کہیں سل بیٹھتی نہیں ہے چول
پائے ہیں کہنگی سے زرد و سیاہ — سیرووں کا ہے حال پھر بھی تباہ
بسکہ ہے ڈھلڈھلی دوپیچ ولچر — چول کو روز چاہیے پچر
اور ستاہوں جس دن ادوائن — اک ذرا اس گھڑی تو جائے ہے تن
لیک جس وقت اس پہ پاؤں دھرا — جیسے کوئی کنوئیں میں آن گرا
بان کی اس کے کیا کروں تعریف — تھا وہ بافندہ بسکہ ذات شریف
چھید رکھے ہزار بانوں میں — دیں گرہیں بے شمار بانوں میں
گر گدیلے کا اس پہ ہو بستر — تو بھی چبھتی ہے پھانس جوں نشتر
آکے جب رات اس پہ سوتا ہوں — کرکے ضامن کو یا دروتا ہوں
یہ وہی ناتواں پلنگڑی ہے — جس کو کہتے ہیں لولی لنگڑی ہے
نیچے اونچے جو اس کے ہیں پائے — ہیں معطل زمیں پہ پڑوائے
بسکہ دل اس سے خوش نہیں ہوتا — مارے غصہ کے میں نہیں سوتا
جب کہیں آدھی رات جاتی ہے — اونگھ کے مارے نیند آتی ہے
کیونکہ اس پر کوئی دوگانہ ہو — گر رہے مجھ سا جو یگانہ ہو
طول میں میرے قد سے ہے کمتر — عرض میں میرے تن سے ہے لاغر
ایسی جب تنگ چارپائی ہو — بس مسافر کی کیا سمائی ہو

اب بھی جانے تو گھر کو خالی کر
مصحفی اس سے بوریا بہتر

یہ تو مصحفی کی چارپائی تھی، اس میں کھٹملوں کی افراط کا حال سنئے:۔

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط — تلخ ہے ان سے اپنا خوابِ نشاط
کافروں نے یہ سر اوٹھایا ہے — سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
بسکہ بے چین ہوں میں ان کے ہات — نیند آتی نہیں ہے ساری رات
دم بدم کروٹیں بدلتا ہوں — اِدھر اُدھر پڑا اُچھلتا ہوں
پائنچہ میں کبھی گھس آتے ہیں — کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں
مارتا جاتا ہوں انھیں جوں جوں — کان پر ان کے رینگتی نہیں جُوں
لہو پی پی زلیں ہوئے موٹے — ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے
الغرض شام سے ہو تا شب بیدار — کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار
مارے جو موٹے موٹے چُن چُن کر — چھینٹ کا تھان بن گئی چادر
گھسے دیوار پر جو کرکے تلاش — کر دیا گھر کو خانہ نقاش
ہے بجا بسکہ زیں پہ زیادہ — کہئے راون کی ان کو گر اولاد
دوڑنے میں زبسکہ ہیں چالاک — میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں — گھاٹیوں میں سے نکلے جاتے ہیں
ان کی بوسے دماغ عاجز ہے — بلکہ دودِ چراغ عاجز ہے

دشمنِ جاں یہ مصحفی کے ہیں
تشنہ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

اب مصحفی کے مکان کی حالت دیکھیں

اپنے رہنے کا جو ملا ہے مکاں — ہے بعینہٖ وہ صورتِ زنداں

اس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر — سیر بلدا کی وہاں کرے ہے نظر
نہ تو روزن نہ اس میں جالی ہے — دن رہے جیسے رات کالی ہے
جلئے پول اس کے در کے آگے ہے — جو ہر مغز کو جلائے ہے
خاکبازی ہے اس کی چھت کا کام — خاک اس سے جھڑا کرے ہے دم
گر نظر جائے جانب دیوار — نظر آتی ہے چینٹیوں کی قطار
رات دن جی صفا کو ترسے ہے — اپنی قسمت کی خاک برسے ہے
گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے — اپنی صورت کو بھول جاتا ہے

مصحفی جائے سینہ چاکی ہے
گھر نہیں یہ تو برج خاکی ہے

آخر میں مصحفی نے اپنی ناخوشگوار زندگی کی جس طرح ہنسی اڑائی ہے وہ ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں — تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے — بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں — باطن میں ولے کریم کے نوکر ہیں
یہ عید نہ بقرعید نہ روزے نہ دھار — ہم بھی عجب اک نعیم کے نوکر ہیں

دی بانٹ محل میں چن چن کے تنخواہ — اور ہم کو بہانوں میں ہی ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

دیئے آغا نے روپے چالیس گر — فوت تنخواہ کر گیا یہ خبر
بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی — مصحفی ہاتھ گر لگے کچھ بھی

رنگین

سعادت یار خاں رنگین کے والد ملا عباس بیگ خاں ۱۱۳۹ھ میں نادر شاہ کی فوج کے ساتھ توران سے ہندوستان آئے اور دلی پہنچ کر ترقی کرتے کرتے ہفت ہزاری کا منصب اور اعتقاد جنگ کا خطاب حاصل کیا۔ رنگین ۱۱۵۸ھ میں بمقام سہ ہند پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن دلی میں بڑی فارغ البالی اور عیش اور آرام میں گزرا جس کی جھلک رنگین کے مزاج اور افتادِ طبع میں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کیے اور شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۱۷۵ھ میں مکمل ہو گیا۔ اس وقت سعادت یار خان سپاہی تھے۔ اس کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے ریاست بھرت پور چلے گئے اور وہ سال وہاں گزار کر ۱۱۷۲ھ میں لکھنؤ پہنچے جہاں وہ شاہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

رنگین ایک آزاد منش، لاابالی اور عیش پرست انسان تھے۔ خواہ اور انعام واکرام سے ان کا شاہانہ خرچ چلتا تھا۔ نو سال کا عرصہ لکھنؤ میں گزار کر نواب آصف الدولہ کی وفات (۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ) کے بعد وہ یہاں سے نکلے اور چند سال مرشد آباد، ڈھاکہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں کی سیر کرتے اور پھرتے پھراتے گوالیار پہنچ کر خانہ جوشی سندھیا کے ملازم ہو گئے۔ نواب کا خلاب اور نرجی پٹن کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ ایک بڑے علاقے کی سند بھی مل گئی۔ جس کی آمدنی سے اپنا اور رسالے کا خرچ نکال کر باقی رقم سرکاری خزانے میں داخل کرتے۔ چھ سال خوب مزے میں بسر ہوئی۔ پھر میں چکر تھا۔ یہاں سے دل اُچاٹ ہوا تو چلے میر افضل علی خاں نیاز کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہاں سے مختلف شہروں میں گھومتے پھرے۔ تیس سال تک آزاد و زندگی بسر کرنے کے بعد وہ باندہ پہنچے۔

اب ان کی عمر تقریباً ستر برس کی ہو چکی تھی۔ انھوں نے باندے کے قیام کی فرصت کو غنیمت جانا اور سارے کلام نظم و نثر کو مرتب کرنا شروع کیا۔ انڈیا آفس کی لائبریری میں کئی قلمی نسخے موجود ہیں جو رنگین نے اپنے ہاتھ سے باندے میں بیٹھ کر لکھے تھے۔

اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں پیامِ اجل آ پہنچا اور ۸۱ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ رنگین کو ۶۶ سال کا طویل زمانہ مشقِ سخن کے لیے ملا۔ ان کے مجموعۂ کلام میں لاکھوں اشعار اور بے شمار اردو و فارسی نثر کے رسالے موجود ہیں۔ ان کی لیاقت، ہمہ گیری اور زبان دانی کا یہ عالم تھا کہ وہ بلا تکلف عربی، ترکی، فارسی، اُردو، پنجابی، پوربی، گجراتی، مرہٹی، پشتو اور کشمیری وغیرہ بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے اور تقریباً ۱۲ زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔

رنگین کی ذاتی اور گھریلو زندگی نہایت رنگین اور دلچسپ تھی۔ ان کے تعلقات ہر طرح کے لوگوں سے تھے۔ طبیعت شوخ تھی۔ بذلہ سنجی ظرافت کا رنگ ان کے کلام سے ٹپکتا ہے۔ ہزل اور رنگینی میں ایک نہیں پورے دو دیوان آبخمہ اور دیوان انجمنہ موجود ہیں جو ۱۲۲۲ھ میں مرتب ہوئے۔ دیوان آبخمہ کا جو قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے اکسٹھ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کے شروع میں فارسی کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے جو کسی کوک شاستر کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ نظم کے حصے میں پہلا اور چوتھا قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے۔ جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

نہ پوچھے تو کیوں سزاوار طوق لعنت کا
تو واقف اس سے ہے جو کام ہے شرارت کا

لعنت میں کوئی شریک نہیں تیرا دوسرا　　جتنے ہیں زندی باز تو اُن کا ہے پیشوا

باقی نظمیں اور قطعے بھی نہایت فحش اور رکیک ہیں۔ دیوان انگیختہ اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور اخلاقی اعتبار سے یہ کوئی زیادہ مستحسن نہیں۔ اس میں ریختی کی ایک سو بارہ غزلیں ہیں۔ رباعیات، فردیات، قطعات، مسدس اور مخمس اس کے علاوہ ہیں۔ رنگین نے ایک شعر میں اپنے آپ کو ریختی کا موجد اور اس کو منہ چڑانے والا بتایا ہے ؎

ریختی کہنی اجی رنگین کی یہ ایجاد ہے　　منہ چڑاتا ہے مرا انشا جیا کس واسطے

اس کے باوجود ان کی ریختی میں شاعری کا کوئی بڑا کمال نہیں البتہ اس سے ایک طرف اس ذہنی زوال اور پستی کا پتہ چلتا ہے جس میں اس وقت کا معاشرہ گر چکا تھا اور دوسری طرف اس نفسیاتی کمزوری کی نشاندہی ہوتی ہے جو عام طور پر صحت مند انسانوں کے بس ہو جانے پر انسانی جذبات کو غلط راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ انہار خیال کے اس غیر فطری ذریعے سے طوائفوں کی زبان کی نزاکت و نفاست اور ان کے خاص محاورات محفوظ کیے گئے ہیں۔ حمد اور نعتوں کے یہ اشعار دیکھئے ؎

واری ترے جاؤں میں خالق ہے تو خلقت کا　　کیا مجھ سے بیان ذرہ ہوئے تیری قدرت کا
کچھ مجھ کو گناہوں کا خطرہ نہیں محشر میں　　چھوڑوں گی نہ میں دامن خالق قیامت کا
اب آٹھ پہر تجھ سے مانگوں ہوں دعا یہ میں　　بندی کو پڑے ہو کار رنگین کی نہ چاہت کا

مجھ پہ طوفان نہ رکھ چاہ کا چل دُور دوا　　جھوٹ سے منہ کا مزا جائے گا اُڑ نور دوا
ایک تو شکل ڈرانی سی تری ہیجا سی　　قہبہ یوں گھور کے دیدے مجھے مت گھور دوا

رات باتوں میں یہاں تو نے گزاری آتا　　صدقے تیرے کسی ڈھب سے اُسے لاری آتا
سوچ اس کا نہ ہو گر مجھ کو تو پھر کس کو ہو　　جانتی تو نہیں کیسا پاؤں ہے بھاری آتا
آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے مجھے اس کی چاہ　　روز و شب رہتے ہیں اشک آنکھوں سے جاری آتا
ہونی جو ہووے سو ہو بندی ملے گی شرطی　　وصل کی اس سے زباں اب تو میں ہاری آتا
اُٹھتے ہی صبح کو آجاتی ہے رنگین کے پاس　　کہیو سب حال مرا میں ترے واری آتا

چلو چل کر قطب صاحب میں جھولا ڈال کر جھولیں
دوگانہ مینہ برستا ہے مہینہ ہے یہ ساون کا

کروں قربان میں پشواز کو جالی کی کرتی پر
دوگانہ مجھ سے اُٹھ سکتا نہیں ہے بوجھ دامن کا

ہلا کر سر کیا کر بات تو مجھ سے نہ ہنس ہنس کر
زنا خی مارتا ہے مجھ کو ڈورا تیری گردن کا

جوانی سے وہ پھل پائے الٰہی حسن نظر میری
وہ کون انسان ہے جو شش نہیں رنگیں کے جوبن کا

نیند آتی نہیں کمبخت دوانی آجا
اپنی بیتی کوئی کہہ اپنی کہانی آجا

ہاتھ پر تیرے مُوئے کس کے ہے چھلّے کا داغ
دی ہے یہ کس نے تجھے اپنی نشانی آجا

بال ماتھے کے جو ڈورے سے لیے ہیں تو نے
شکل لگتی ہے بڑی آج ڈرانی آجا

غم ہے رنگیں کو نہ میرا یونہی اس کے پیچھے
مفت برباد ہوئی میری جوانی آجا

جان دی راہِ محبت میں الٰہی صد شکر
بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر

زخم کھا کر جو میں تڑپا تو لگا یوں کہنے
اچھا اچھا تو تڑپ کر مری تلوار کو توڑ

ہر تمنا ہے گر دل ہی پر اس کی تو سلیماں نے ڈال
ایک دل کے لیے مت خاطر دلدار کو توڑ

جب کہا میں نے کہ میرے گھر چلو
تب مری گوئیاں نے اے رنگیں پکار

گال پر اُنگلی کو رکھ کر یوں کہا
میں ترے گھر جاؤنگی اے دور پار

دوڑی لینے کو میں اسے کس دم
پاؤں میں میرے موچ آئی کب

ہرگز آتی نہیں ہے سانچ کو آنچ
پیش جاوے گی یہ بُرائی کب

کل جو میں نے کہا زنا خی سے
جی میں آتا ہے تجھ سے کیجے عیش

تو لگی کہنے یوں وہ اے رنگیں
بس بس اب مجھ کو مت دلاؤ یہ لیش

زہر کر دیتی ہے وہ کھانے کو اٹھا کر مجھ سے روز — آج سے میں ساتھ اس کے کھانا کھاؤں دور پار
کیا گئی گزری ہوں میں ایسی کہ جاؤں دوڑ کر — اور منا کر ساتھ اپنے اس کو لاؤں دور پار
اُس نے ہمسائے میں آ کر گھر لیا تو کیا ہوا — اب اسے آواز میں اپنی سناؤں دور پار

کہاں تک سنوں کان تو اُڑ گئے — تری سنتے سنتے حکایات روز
گئے ہیں مرے گھر میں سب تجھ کو تاڑ — کیا کر نہ رنگیں اشارات روز

یارب شبِ جدائی تو ہرگز نہ ہو نصیب — بندی کو یوں تو چاہے تو کولھو میں پیل ڈال

تیس دن میں کسی سے ملتی نہیں — ہوں ملاقاتِ گاہ گاہ سے خوش

بھیجتا روز ہے رنگیں مجھے پیغامِ سلام — اور میں آگاہ ہوں اس حرف و حکایات سے کم

کوئی پیس کر خوب سی لال مرچیں — ترے دونوں دیدوں میں بھر جائے آتوں

یوں بولتی ہوں بول بڑا خاک چاٹ کر — گوئیاں کی طرح جھاڑو کی تیلی نہیں ہوں میں
ہیں حرفتیں بھری مری رگ رگ میں کوٹ کر — رنگیں تری طرح سے رنگیلی نہیں ہوں میں

اب تجھ سے خدا سمجھے تو ہے زہر کی اگ گانٹھ — تجھ پر کہیں پٹکی پڑے درگاہ کی گوئیاں

بولے وہ آؤنگے کب میں نے تب ان سے یہ کہا — بندی ہرگز نہیں اب تک کہیں مہمان گئی
زہر لگتی ہے مجھے تیری یہ چھیل بازی — یاں ترے آنے سے باجی تجھے پہچان گئی

غزل ۔۔۔

مارا پتھر پہ سر اور سینے پہ پھتر مارا — پر ترا دل نہ ملا ہم نے بہت سر مارا
دل کو رنگین کے لیا یوں تری اُلفت نے وہیں — باز نے جوں کوئی رنگین کبوتر مارا

نشاں رہ جائے ہے مردوں کا باقی — گیا فرہاد لیکن بے ستوں ہے

یہ جو بیماری ہے اپنی عشق کہتے ہیں اسے — زر نہیں رجعت نہیں، وحشت نہیں، سودا نہیں
بے سرانجامی ہے جاوے شیخ کعبہ کس طرح — خر نہیں، خرقہ نہیں، ٹوپی نہیں، کرتا نہیں

چنے ہم نے دانتوں کے ہوتے نہ پائے — بنے پوپلے تب چنے ہاتھ آئے

رنگین نے مخمس رنگین کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں دو منظوم خط اور تین داستانیں ہیں۔ ایک حصہ میں چھکو عوائد ہجر بیان کی گئی ہے۔ آغاز میں اپنی جوانی اور خوبصورتی کا تذکرہ ہے۔ پھر عشق طاری ہونے کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن جب وہ کج ادائی کرکے ثابت ہوتی ہے۔ تو دل کو سمجھاتے ہیں کہ تم ایسی بے سلیقہ اور بھدی عورت پر جان دیتے ہو جس کے خستہ مکان سے بدبو آتی ہے اور جس کا سر

کہوں کیا سر کو اور موہائے سر کو — کوئی کھسٹائے جیسے ناریل کو
یہ تھا اس اوہری پیشانی کا عالم — کہ دیکھے سے جسے تنگی کرے دم
ہوائیں دیکھ ان کانوں کو حیراں — جذامی کے سے تھے سوجے ہوئے کان
بہم تو دیکھ یوں اوس کی بھوؤں کو — کہ چھپکلیاں لڑے ہیں جس طرح دو
زبس پڑ بال تھے آنکھوں کے اندر — تو یوں دیکھے تھی جیسے گھور کے بندر
یہ تھی پر ناک رخساروں میں بیٹھی — کہ جوں ہو مینڈکی جوتے پہ بیٹھی

زبان کی تشبیہ بہت ہی فحش ہے۔

زخ ایسی تھی جیسے پکا پھوڑا — ذقن جیسے کہ پھوڑے پر دو وڑا

کہ اس کی جدھر دیکھو ادھر تھی | بغل سے چوتڑوں تک سب کمر تھی
عجائب اوس اُجالی کی تھی لگیا | غرض یہ ہے کہ جالی کی تھی لگیا
نظر آتی تھیں اس میں چھاتیاں یوں | کہ اَرنے اوپلے جالی بچ ہوں جوں

سبع سیارہ رنگیں کا تیسرا حصہ سبحۂ رنگیں کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک سو رباعیاں ہیں جو سب کی سب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی بجو میں ہیں۔ چند ایک حسب ذیل ہیں ؎

معروف تو ہے شعر و سخن کا محتاج | پر بجو کو خلق کی وہ موجود ہے آج
اس کی وہ مثل ہوئی بقول رنگین | چوہا نہ سمائے بل میں اور باندھے چھاج

معروف کے پاس ہے نہ سیم اور نہ زر | اوقات بسر کرتا ہے وہ اپنی بشر
رنگین ہے ان دنوں یہ صورت اُس کی | کانا ٹٹو ہے اور بدھو ہے نفر

معروف یہ چاہتا ہے کعبے جا کر | حج کر کے یہاں کہائے حاجی آکر
سُن کر یہ قصد اس کا رنگین نے کہا | بلی چلی حج کو لاکھ چوہے کھا کر

معروف

یہ وہی معروف ہیں جن کی بجو میں سعادت یار خاں، رنگین نے سبحۂ رنگیں نامی کتاب میں پوری ایک سو رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کا نام نواب الٰہی بخش خاں تھا اور یہ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر کے چھوٹے بھائی تھے۔ دہلی میں رہتے تھے۔ درویشوں اور صوفیوں کی مجالس میں اُٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے آخری عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر کے عبادت الٰہی میں مصروف رہنے لگے تھے۔ شعر و شاعری کا ابتدا سے شوق تھا۔ مولانا آزاد نے آبحیات میں انھیں ذوقؔ کا شاگرد بتایا ہے حالانکہ وہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتے اور ذوقؔ کے استاد بھائی تھے۔ انھوں نے دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ جو ہنوز طبع نہیں ہوئے۔ ۱۲۵۳ھ میں انتقال ہوا۔

معروف کوئی تعریف شاعر نہ تھے لیکن انھوں نے دیوانوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی کتاب تسبیح زمرد کے نام سے ترتیب دی ہے جس میں سو شعر ہیں اور تمام کے تمام معشوق کی سبزہ رنگی کی تعریف میں ہیں۔ اس التزام اور ندرت کی وجہ سے وہ ظرافت خیز اور تفریح طبع کا سامان بن گئے ہیں۔

کسے تھا سبزہ رنگ اک عالم بھر سے اپنے جینے کا — نشانی گر تو ہوتا یہ چھلا خضر مینے کا

بلکہ سبزہ رنگ ہے قاتل مرا — نت ہرا رہتا ہے زخم دل مرا

کون یہ لے کے ہاتھ میں سبز کمان آگیا — ابر و ئے سبزہ رنگ کا پھر مجھے دھیان آگیا

حرف سبز اب ترے منہ سے ہے نکلتا بے ڈھب — سبزہ رنگ آج ہے تو زہر اگلتا بے ڈھب

قتل کی کچھ مرے سبزہ رنگ کر تدبیر آج — دل مرا چاہے ہے سیر سبزۂ شمشیر آج

سبزہ رنگوں کے فریبوں میں دل آیا بے طرح — عشق نے پھر سبز باغ اس کو دکھایا بے طرح

جبکہ طفل میں اماموں کا بنایا تھا فقیر — تھا اسی دن سے دعا گو سبزہ رنگوں کا فقیر

دلامت دوڑ تو ان سبزہ رنگوں کی صفائی پر — پھسل جاتا ہے اکثر آدمی کا پاؤں کائی پر

کائی مل دو تم مجھے آگے خدا شاہی ہے بس — دل جلوں کو سبزہ رنگوں کے یہی کافی ہے بس

دھیان میں یوں ہوں سبزہ رنگ کے عزق — جوں نشے میں ہو کوئی بھنگ کے عزق

تری سبزہ رنگ ایسی صورت ہے صاف — زمرد کی گویا کہ صورت ہے صاف

سبزہ رنگوں پہ نہ اپنا ہو کہیں جی مائل — اس برس رنگ ہے نوروز کا سبزی مائل

کیوں غش نہ سبزہ رنگ پر دل سے مدام ہوں — میں حضرت امام حسنؑ کا غلام ہوں

آج یہاں کل وہاں گزرے یوں ہی جگ میں — کہوے ہے ہر سبزہ رنگ اس سے ہری جگ میں

کہتے ہیں معروف کو ایک دفعہ معلوم ہوا کہ بھورے خاں آشفتہ نے ایک شعر کہا ہے جس میں ہری جگ کا لفظ آیا ہے (جو ایک جانور ہوتا ہے) اس وقت تک یہ لفظ ان کے ذہن میں نہ آیا تھا اس لیے سوروپیہ دے کر یہ لفظ ان سے خرید لیا اور موزوں کیا۔

اے سبز رنگ ہاتھ سے لے میرے پان تو — یہ برگ سبز تحفۂ درویش جان تو

چمن میں زہر لگتی ہے مجھے آواز طوطی کی
یہ حالت غم میں ہے ان سبز رنگوں کے مرے جی کی

سبزہ رنگوں سے محبت ہے مجھے دن رات کی
چاہتا ہوں ہر جگہ سرسبزی اپنی بات کی

اس بڑھاپے میں بھی کم ہوویں گے لہری ہم سے
سبزہ رنگوں سے چھنا کرتی ہے گہری ہم سے

یارب سبزہ رنگوں سے اب دل میں غم بھر آیا ہے
کیجو خیر اس بستی کی یہ سبز قدم پھر آیا ہے

دور طراوت آنکھوں میں ہے دائم چھاتی ٹھنڈی ہے
یاد میں سبزہ رنگوں کے دل کیا ہے سبزی منڈی ہے

بقا

شیخ بقاء اللہ خاں بن حافظ لطف اللہ خاں خوش نویس اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ اُردو میں شاہ حاتم اور فارسی میں مرزا فاخر مکیں کے شاگرد تھے۔ مولوی عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ سخن شعرا میں انھیں غلطی سے میر درد کا شاگرد دیکھا ہے۔ ابتدا میں مکیں تخلص کرتے تھے۔ بعد میں بقا بن گئے۔ ترک وطن کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہیں میر اور سودا سے معرکے ہوئے مگر دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اسی بنا پر ہجو کہنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ بے حد خوش مذاق اور ظریف الطبع تھے اس لیے نوک جھونک میں ظرافت کا رنگ پیدا کر کے نئی روح پھونک دیتے تھے۔ بعض مہذب ہجوؤں کے چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ میر تقی میر نے یہ شعر لکھا ؎

لے دن گئے کہ آنکھیں ندیاں سی بہتیاں تھیں
سو کھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبہ

بقا کو گمان پیدا ہوا کہ میر صاحب نے اُن کے ان دو شعروں سے دو آبہ کا مضمون اڑا لیا ہے ؎

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے
دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابی میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

بس پھر کیا تھا بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ یہ قطعہ لکھ ڈالا ؎

میر نے گر ترا مضمون دو آبے کا لیا
اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو

اے خدا میر کی آنکھوں کو دو آبہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

اس کے بعد تیسرے ایسی چل گئی کہ ایک اور قطعہ کہا ؎

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر — اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھریے — ہر گلی کوچے کام شاعر کا

ایک جگہ میر اور مرزا دونوں کو لے ڈالا ہے ؎

میر و مرزا کی شعر خوانی نے — بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا جب کہ ہم نے زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

تھے ہم استاد ترے در پہ ولے بیٹھ گئے — تو نے چاہا تھا کہ ٹالے نہ ٹلے بیٹھ گئے

آئینہ دیکھ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں — اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

میر ضاحک

میر ضاحک کا نام میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ تھا۔ میر حسن دہلوی کے والد اور میر انیس کے پر دادا تھے۔ علم عربی و فارسی کے عالم و فاضل تھے۔ نظم و نثر خوب لکھتے تھے۔ بعایت فہم، درویش مزاج، ایک خوش گل ہیئے، مزاح پسند، ہزل دوست، بذلہ سنج اور نکتہ رس تھے۔ ترک روزگار کر کے نہیں پنشن سالی آزادانہ زندگی بسر کی۔ موسیقی سے رغبت اور شعر و شاعری کا شوق تھا۔ نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ مگر ناقدری نے دل توڑ دیا تھا اسی وجہ سے قدیم رنگ عاشقانہ ترک کر کے ہزل گوئی اختیار کر لی تھی۔ مگر اس میں بھی زبان عجیب و غریب ایجاد کی تھی جو بقول میر حسن آدم سے لے کر اب تک کسی نے استعمال نہ کی ہو گی۔ مولوی ساجد اور مرزا سودا کی ہجوؤں میں جو لاثانی طبع اور قدرت زبان کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ اہل زمانہ سن کر پھڑک گئے۔ مگر افسوس کہ ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ چالیس پچاس شعر سے کم کی غزل اور ہزلی نہ کہتے تھے۔ اس کے شروح میں تھوڑی سی نثر بھی ضرور رکھتے تھے۔

ان کی غزلوں کے چند اشعار قاضی عبدالودود صاحب نے بڑی تلاش سے فراہم کئے ہیں وہ حاضر ہیں ؎

ضاحک کا کلام

یا ایہا المتلائکہ[1] کرّوبیوں[2] کا مکہ ۔۔۔ مُنہ تو پچی پر آئشہ فرو یکا تیرہ[3]

درپیش اگر روزِ اجل آہ نہ ہوتا ۔۔۔ قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیکھئے اصلاحِ خدائی کو وہ لیکن ۔۔۔ کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

اس آن تھمے آنسو جس آن کہ ڈوبا جی ۔۔۔ تب جان سے ہم اٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

..... کشافِ حقائق و نکاتِ توحید ۔۔۔ آں راکبِ دوشِ احمدی شاہ شہید
خود معنیٔ آیاتِ کلامِ الٰہی است ۔۔۔ تفسیرِ حسینی است بقرآنِ مجید

افسوس دلا کہ غمگساراں رفتند ۔۔۔ سیمیں زبان و گل عذاراں رفتند
چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار ۔۔۔ در خاک چو قطرہائے باراں رفتند

جب سے اس طفل پریوش نے چھپائیں آنکھیں ۔۔۔ بس مرا چل نہ سکا رو کے سجائیں آنکھیں

چھدائے کان انھوں نے بالیاں پہنی ہے سنتے ہیں ۔۔۔ دوانے ان کے بالے ہیں کہ اب تک تنکے چنتے ہیں

فلک پر چاند دیکھا آج سے ماہِ محرم ہے
غضب باغِ جہاں میں صبح سے آئی شبِ غم ہے
زباں بلبل کی اور پُرنم چشمِ شبنم ہے
لبوں پر گل کے بھی ضاحک نہیں اب تو تبسم ہے

---

[1] جمع ملک [2] جمع کروبی۔ [3] جمع بکسری۔

میر حسن دہلوی

اُردو شاعری کی تاریخ میں میر حسن کا خاندان عدیم المثال ہے۔ وہ مذکرہ شعرائے اُردو میں اپنے متعلق خود لکھتے ہیں کہ "میری اصل ہرات سے ہے۔ شجرہ نسب یہ ہے۔ میر حسن بن میر ضاحت بن خواجہ عزیز اللہ بن میر امامی۔ میر امامی فوراللہ مرقدہ ہفت اقلیم اور فاضل متبحر تھے بہ سبب فضیلت تاسیحان آباد میں تشریف لا کر اپنے زمانے کے لوگوں میں بڑا مرتبہ پایا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز کا تعلق شاعری سے خاندانی ہے۔ کوئی آج کی بات نہیں۔ بچپن ہی سے شعر کو قبلی کی طرف میلان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے طرف کے موافق اس فن میں استعداد قبولیت عطا فرمائی۔ اصلاح سخن میں نے میر ضاحت سے لی ہے۔ لیکن ان کی طرز کو میں کما حقہٗ نباہ نہ سکا اور دیگر بزرگوں مثلاً خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کی پیروی اختیار کی۔ شروع جوانی میں گردش روزگار زمانہ نیچار کے باعث کہ ہرگز کسی سے وفا نہیں کرتا ہے لکھنؤ اور فیض آباد پہنچا۔ بارے طلف جناب والا جنگ بہادر دام اقبالہ کی قدردانی سے معاش کا تھوڑا بہت سہارا ہو گیا..... فقیر نے اس مدت میں قریب رات آٹھ ہزار شعر کہے۔ ایک ترکیب بند اور ایک مثنوی رموز المعارفین لکھی ہے۔ جسے لوگوں نے بہت پسند کیا ہے اور وہ بہت مشہور ہے۔"

ان کے والد میر غلام حسین ضاحت بھی بڑے پایہ کے عالم، تیز فہم مزاح پسند، بذلہ گو اور نکتہ سنج بزرگ تھے۔ یہ وہی ضاحت ہیں جن کے متعلق مرزا رفیع سودا نے ہجو لکھی ہے۔ سودا کا کلیات تو موجود ہے جس میں ان کی ہجو بات پائی جاتی ہیں۔ ضاحت کا کلام ضائع ہو گیا۔ البتہ میر حسن کی نظمی کلیات میں سودا کی ہجو موجود ہے۔ میر حسن نے باپ کی طرف سے جواب دے کر حق پدری تو ادا کر دیا ہے۔ لیکن ہجو میں وہ سودا سے بھی زیادہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں اور پھکڑپن پر اُتر آئے ہیں۔

میر حسن نے ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۰ برس تھی، میر انیس انہی کے پوتے تھے۔

مثنوی سحر البیان میں جو ۱۱۹۲ھ کے بعد کی تصنیف ہے۔ میر حسن نے اپنے وطن سے بے وطن ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھنؤ کو بہشت یعنی دوزخ کہا تھا لکھتے ہیں ؎

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں — نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
بہت میں گرچہ اہل اللہ اس جا — ملے جا گہ جو بد ہوں تو کریں کیا
زبس یہ ملک ہے میڑ پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پہ گھر ہوا میں — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
نہیں یہ لکھنؤ یہ ہے زمانا — زمانے پر عبث رکھا بہانا

عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی
گھسے پستی ہے اور گاہے بلندی

ہر اک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے
ہوا کا بھی مشکل واں گزر ہے

ہوا ہے راہ چلنا سب کو دشوار
خطر ہے گر پڑے سر پر نہ دیوار

جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر
پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

لکھوں کیا چوک کی تنگی کا احوال
کہ ہے خانہ چل گنتا نہیں چال

کسی سودے کو واں گر کوئی جائے
خدائی ہو تو پھر جیتا گھر آئے

زلیں کوفہ سے یہ شہر ہم عدو ہے
اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے

عجب کیا ہے اگر حاتم یہاں آئے
تو تاروں کی طرح وہ سوم ہو جائے

سوائے تو وہ خاک اور پانی
یہاں ہر جنس کی دیکھی گرانی

میر حسن کی تصانیف سے مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار آدم، مثنوی قصر جواہر اور مثنوی رموز العارفین چھپی ہیں۔ کلیات ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور اس کی تقسیم اصناف سخن کے اعتبار سے اس طرح ہے۔

(۱) غزلیات (۲) مثنویات (۳) قصائد (۴) رباعیات (۵) مثلثات (۶) ہجویات (۷) متفرقات مثلاً ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس وغیرہ (۸) فردیات۔

مثنویاں چھوٹی اور بڑی مل کر تعداد میں گیارہ ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں اشعار کی مجموعی تعداد گیارہ اور بارہ ہزار کے درمیان ہے۔ عام طور پر میر حسن اپنی مثنوی سحر البیان کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ویسے ہی شاعری میں ان کا کوئی درجہ نہیں۔

کمترین

کمترین کا نام میر غلام حسن تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ کمترین نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی سرکار میں ملازم تھے اور اپنی استعداد کے موافق شعر خوب کہتے تھے۔

میر تقی میرؔ پر تذکرہ میں لکھنے ہیں کہ ہزل کی طرف ان کی طبیعت کا میلان بہت زیادہ تھا۔ وہ خود بھی اوکی "ہجو ہائے رنگین" کہتے تھے۔ کسی نے ایک شہر آشوب بھی لکھا جس میں ہر قوم کی ہجو کی۔ اس کے یہ چند شعر تذکرہ میر تقی میں درج ہیں ؎

فوجِ خصم گن کر مشلچن نے کہے ۔۔۔ تو بھی نہیں رہتی دو شاخہ بن دیئے

پلائیں مغت نصرانی تو تاڑی ۔۔۔ اگاڑی اصطبل کے جا پچھاڑی

یہ متصدی نہیں ملتے اگر بھانڈوں سے راتوں کو ۔۔۔ تو کیوں پیسے کماتے ہیں یہ نقلیں کر براتوں میں

دیکھو پکوان والی کی مزاحنیں ۔۔۔ خصم کے روبرو دیتی ہے شانیں

کہے بیر، دو گے ہم کو نازک بدن پیارے ۔۔۔ تم بادشاہ ہند ہو ہم کمتریں پیارے

ھُدھُد الشعرأ

عبدالرحمٰن نام تھا اور بوربک وطن۔ کسی وجہ سے دہلی آئے۔ حکیم آغا جان صاحب عیش کے پڑوس میں مکان بنا اور وہیں لڑکے پڑھانے لگے۔ عجیب وضع قطع تھی۔ گھٹا ہوا سر، اس پر لمبی لمبی چٹیاں بالکل کھٹ بڑھیا معلوم ہوتے تھے۔ کان میں بقول شخصے صحیفہ ندرت لٹکائے۔ دوشاخہ نوکدار زاویہ نما داڑھی پر چنبیلی کا تیل ملے اپنی جھونجھ میں خوش و خرم رہتے تھے۔ حکیم صاحب نے ہدہد تخلص تجویز کیا۔ ان کی فرمائش سے کبھی کبھی نغمۂ بے ہنگام بلند کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہادر شاہ کی تعریف میں یہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا ؎

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کروں ۔۔۔ تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھونسلا کر دوں

جو آکے ریز کرے میرے آگے موسیقار ۔۔۔ تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں

جو سرکشی کرے آگے میرے عما آکر ۔۔۔ تو اس کے فوج کے پرشکل نیولا کر دوں

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لیے ۔۔۔ فلک کہے ہے مقدر میں باجرا کر دوں

بہادر شاہ نے طائر الارا کہیں، شہپر الملک، ہدہد الشعرأ، منقار جنگ بہادر کے خطاب عطا فرمائے اور سات روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ایک مرتبہ مکان نہ ملتا تھا آپ نے یہ عرضداشت نظم کر ڈالی ؎

جز تیرے شاہِ تشنہ کہہ کس کے آگے روئیے
کس سے کہیے جا کے یہ غم کو ہمارے کھوئیے

تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار
ہیں بجا کرنے سمندِ طبع کو یاں پوئیے

حیف آتا ہے کہ فنِ شعر میں کیوں کھوئی عمر
کاش کہ ہم سیکھتے اس سے بنانے بوئیے

سنگلاخ ایسی زمیں ہے دیکھ اے دل تا کجا
فکر کیجیے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے

رشتۂ عمرِ شہنشاہِ جہاں ہووے دراز
یا خدا کھلتے رہیں جب تک جہاں میں سوئیے

دیدے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے
مارتا پھرتا ہے ٹاپک ٹوئیے

ایک دفعہ تنخواہ زیادہ۔ انھوں نے نظم کی۔ ٹانک موڑ کر دربار کے ایک معزز عہدہ دار میر سامان راجہ دیبی سنگھ کی معرفت ایک ریزولوشن گزران دی ؎

جہاں میں آج دیبی سنگھ تو راجوں کا راجہ ہے
خدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آج راجہ ہے

سلیماں نے ترے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی
تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجہ ہے

تکلم اہلِ جہاں کے سب ہیں شکرانے بجا لاتے
دمامہ جا کے تیرا گنبدِ گردوں پہ باجا ہے

کسی کو دے نہ دے تنخواہ تو مختار ہے اس کا
مگر ہدہد کو دے دے کیوں یہی ہدہد کا کھاجا ہے

دو قطعے ملاحظہ فرمایئے ؎

ہدہد کا مذاق ہے نرالا سب سے
انداز ہے اک نیا نکالا سب سے

سر دفتر لشکرِ سلیماں ہے یہ
اڑتا ہے سخن میں بالا بالا سب سے

راست آئینوں کو نفرت ہے کج آئینوں سے
تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا

آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہدہد آیا
غل ہوا پیشرو ملکِ سلیماں نکلا

حکیم آغا جان عیش کے اشارہ پر ہدہد بلبلانِ سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں ایک بے معنی غزل پڑھی اور کہا کہ غالب کے انداز میں لکھی ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

مرکزِ محور گردوں پہ لبِ آباب نہیں ناخنِ قوس قزح شہپرِ مضراب نہیں

غالبؔ تو مومنؔ کو نہیں دے سکے ہوں گے۔ مومنؔ خاں مومنؔ وغیرہ نے ہدہد کے شکار کو ایک باز تیار کیا۔ اس نے بازی دکھائی مگر اس کا رنگ نہ جم سکا۔ ہدہد نے اس کے بھی پر نوچے اور بڑے فخر کے ساتھ کہا ؎

جسے کہتے ہیں ہدہد وہ تو نخچیروں کا دادا ہے مقابل تیرے کیا ہو تو تو اک جرہ کی مادہ ہے

گر اب کے باز بڑی میداں میں آئی سامنے تیرے تو دم میں پر نہ چھوڑوں گا یہی میرا ارادہ ہے

مقرر باز جو اپنا تخلص ہے کیا تو نے ہوا معلوم یہ اس سے کہ گھر تیرا کشادہ ہے

ادب لے بے ادب اب تک نہیں تجھ کو خبر اسکی کہ ہدہد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

چند روز کے بعد باز تو اڑ گچھو ہو گیا لیکن یار لوگوں نے ایک کالا بھجنگا تیار کر کے اس کا تخلص رآغ رکھا۔ ہدہد نے اس کوے کی بھی خبر لی اور وہ کائیں کائیں کرتا ہوا غائب ہو گیا۔ ہدہد نے اس کی جو میں یہ شعر لکھے ؎

جو آیا ہے عدو اب کے بدل کوّے کی اس کی ہے پانوں سے تا سر وہی خو کوّے کی

وہی کاں کاں وہی کیں کیں وہی ٹیں ٹیں اس کی بات چھوڑی نہیں ہاں اک سرِ مو کوّے کی

پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوّا ہوگا پھر جو معلوم کیا ہے یہ بہو کوّے کی

بن کے کوّا جو یہ آیا ہے تو اے ہدہد شاہ دُم لٹر دینے کو کچھ کم نہیں تُو کوّے کی

شاکر ناجی

محمد شاکر نام تھا اور ناجی تخلص۔ شاہ جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ اہلِ سخن نے انھیں طبقہ اوّل کے ارکان میں شمار کیا ہے۔ محمد شاہی دربار کے ایک رکن امیر خاں تھے۔ یہ ان کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے۔ مگر نہایت تیز مزاج اور شوخ طبع راہ چلتے سے اُلجھتے اور جس کے گرد ہو جاتے اسے بیچا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ناجی" ایک جوان تھے آبا۔ رو۔ سپاہی پیشہ۔ مزاج زیادہ تر ہزل کی طرف مائل تھا۔ میاں آبرو کے معاصر تھے۔ میں نے ان سے دو ایک ملاقاتیں کی ہیں۔ اپنی ہزل کے اشعار خود پڑھتے تھے۔ لوگوں کو ہنساتے تھے ..... خود نہیں ہنستے تھے۔ کبھی کبھی تبسم فرماتے تھے۔ وطن شاہ جہان آباد تھا جوانی ہی میں جہاں سے رخصت ہو گئے۔"

میر حسن نے بھی ان کی طبع ظریف اور لطائف و ظرائف کا تذکرہ کیا ہے۔

صاحبِ گلی نادر شاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت تاجی زندہ تھے۔ مولانا آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں:۔
"تاراجی چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربارِ دہلی کا رنگ، شرفا کی خواری، بیچوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور ناز پروری کو ایک طوفانی محشر میں دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس وقت وہ ہندوستان کے ہاتھ آئے۔"
یہ وہی آزاد نے مجموعہ نغز سے کو نقل کیے ہیں۔ اس شہر آشوب میں نادر شاہی حملے سے دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم کیا ہے اور ہندوستانی فوج کی بزدلی اور عسکریت کے زوال پر طنز و تعریض بھی کی ہے ؎

لڑے جو تو برس میں ان کو پیتے تھے — دعا کے زور سے دائی دوا کی جیتے تھے
شرابیں کھرکی کالے منہ سے پیتے تھے — نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہر کلیں بازو اوپر طلا رکی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ہٹنا تھا — کہ میں نشان کے ہاتھی اپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا — ملے تھے دھان جو لشکر تمام چبانا تھا
نہ ظرف و طبخ و دکاں نہ غلہ و بقال

بعض تذکروں سے چند دیگر متفرق اشعار جن پر تاجی کی شوخ مزاجی کی مہر لگی ہوئی ہیں ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر لفظی نوعیت کے ہیں ؎

بے نوالوں سے نہ مل اے موکر مت پیچ کھا — موند سر لڑکوں کو کرتے ہیں وہ اپنا بالکا

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تک بہلا — چلی جاتی ہے فرائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

اگر ہو وہ بت کافر کبھی اشنان کو نکلا — بھنور میں دیکھ کر جمنا سے غوطے میں جا نکلا

نہ تو کو یار کو کہ خط رکھاتا یا منڈاتا ہے — مرے نشہ کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے

جو کوئی کچھ کہے پگھل جاوے — شمع رہتی ہے ہمارا موم کی ناک

نہیں تو بوسہ نہ دیجئے کہا نہ کہہ کے دیا — جنھوں سے وعدہ کیا ہے انھیں چاہتے ہیں

انا الحق بولنے لگتا ہے اس کے زخم کا بسمل — کٹاری آبدار اس شوخ کی منصور خانی ہے

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے ۔۔۔ یہ تو طالب زر کے ہیں واں خدا کا نام ہے

جان ہے جو ڑا ہے دلبر ہے ۔۔۔ پر یہ مشکل کہ طالب زر ہے

لب جاں بخش آگے تیرے سخن ۔۔۔ جو مسیحا کا نام لے خر ہے

جہاں دل بند ہو ناجی کا واں آوے خلل کیونکے ۔۔۔ رقیب لاولد ناصح گویا لڑکوں کا باوا ہے

اس کے رخسار دیکھ لیتا ہوں ۔۔۔ عارضی میری زندگانی ہے

ملنے کو نوخطاں کے اعظ برا کہے ہے ۔۔۔ نجھول ہیں یہ باتیں ہم خوب جانتے ہیں

لیکن حسن دیکھ کر پی کا ! ۔۔۔ رنگ گل کا مجھے لگا پھیکا

تری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو ۔۔۔ ہمارے سینے میں تو دا ہوا ہے تیروں کا

نہ پوچھو خود بخود ہے عارض خورشید کی خوبی ۔۔۔ لیا ہے ذرہ ذرہ حسن مہرویاں سے کو چندا

مت کر آزاد دام زلف سے دل ۔۔۔ بال باندھا غلام ہے تیرا

محبت سوں علی کی دیکھ ناجی ۔۔۔ ہوا ہے دل مرا اب حیدرآباد

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی ۔۔۔ جنھوں کی آن پہنچی لڑمرے وہ ایک چھلے پر

آج تو ناجی سجن سے کر تو اپنا عرض حال ۔۔۔ مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہوتی ہو سو ہو

زلف کیوں کھولتے ہیں دن کو صنم ۔۔۔ مکھ دکھایا ہے تو نہ رات کرو

وظیفہ راگنی کے ذکر میں زاہد اکفر ہے پڑھنا ۔۔۔ نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

نظیر اکبر آبادی

شیخ ولی محمد نام تھا اور نظیر تخلص۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے باشندے تھے۔ ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۳۰ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس ہنگامے میں دہلی سے نکلے اور آگرہ پہنچے۔ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آگرہ میں روضہ تاج گنج کے قریب رہتے تھے اور معلمی بر بسر اوقات کرتے تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں نوکتابیں لکھیں۔ ۲۶ صفر ۱۲۱۱ھ (۱۶ اگست ۱۷۹۶ء) کو آگرہ میں انتقال کیا۔ عبدالغفور شہباز نے اپنی کتاب زندگانیِ نظیر میں ان کے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔

نظیر نہایت خلیق، وضعدار، صلح کُل، زندہ دل اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ جوانی میں نہایت شوقین تھے۔ شہر کے تمام میلے ٹھیلوں، کھیل تماشوں، جلسے جلوسوں میں شرکت کرتے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ زبان پر قدرت اور تخیل میں بلا کی وسعت و دور کی تھی۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز اور احساس و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔ وہ نہایت ذہین، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بات بات پر بڑی بڑی نظمیں کہہ دینا ان کے نزدیک معمولی بات تھی۔ اشیاء کے ہر رُخ، ہر پہلو اور زاویہ کو پیش نظر رکھنے میں البتہ کمال حاصل تھا۔ شہر کی مشہور چیزوں، کھانوں، عمارتوں، میلوں، تماشوں، تہواروں، بازیگروں وغیرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر مصوری اور جزئیات نگاری کا حق ادا کیا۔ دنیا کی بے ثباتی، اہل جہان کے طور طریقوں، رسم و رواج، دولت، مفلسی، جوری، بیاتی، تماش بینی، بھنگ، چرس، دموں کے تغیر و تبدل اور مناظر قدرت کو کئی کئی رنگوں میں پیش کر کے ہمہ گیری کا ثبوت دیا۔

نظیر کے ہاں لفظوں کی وہ افراط ہے کہ ایک ذخار دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ معانی کی وہ بہتات کہ شمار موتیوں کا انبار نظر آتا ہے۔ بیان کی سلاست ایسی کہ کہیں رکاوٹ کا نام نہیں۔ بندش کی وہ چستی کہ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے تصویر کشی اور محاکات کا یہ عالم کہ جب تاج گنج کے روضہ کی تعریف ہم پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اس کے ایک ایک نقش و نگار اور ایک ایک جالی کو دیکھ لیتی ہیں۔ جب ژکچھ والے کی تعریف نظر آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک تلنگر کان چھدوائے سر پر بڑا سا بگڑ باندھے ہاتھ میں موٹا سا سوٹا لیے، پیچھے کی نکین کپڑے اس کو نچا رہا ہے اور اپنے سوٹے سے اس کو سدھا رہا ہے۔ دنیا کی بے بقائی اور عالم کی بے ثباتی کے اشعار سامنے آتے ہیں تو دل کو یقین آ جاتا ہے کہ روپیہ، پیسہ، دھن دولت، مال و اسباب سب ہیچ ہم اور ہماری خواہشات لایعنی، ہماری بود بے بود، ہماری ہستی عین نابود۔ دیوالی کی تعریف پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ در و دیوار پر چراغاں ہے۔ مٹھائی کی دوکانیں سجی ہوئی ہیں۔ بھڑ بونجے کھیلیں بیچ رہے ہیں۔ دنیا کی رسم و رواج کے پابند رومالوں میں کھیلیں باندھ باندھ کر لیجا رہے ہیں۔ جواری اپنے اپنے اکھاڑوں میں اترے ہوئے ہیں۔ چھ، نو، آٹھ کے داؤں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شوقین مزاج گھوم رہے، بازار کی رونق کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ بعض بڈھے اپنے بچوں کی اُنگلی پکڑے دکان دکان، کھاتے پیتے پھر رہے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ غرضکہ اسی طرح ہر ایک نظم میں جزئیات سے بحث کرنا نظیر کا خاص حصہ ہے۔" (تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۲۹ - ۴۲۸)

نظیر کو اُردو کی نیچرل شاعری کا موجد مانا جائے یا نہ مانا جائے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے فن تقابل و تماثل کو اُردو میں

نظیر کے سوا شاید آج تک کسی دوسرے نے نہیں برتا۔ ان کی ظرافت کا کمال یہی بات ہے۔ سیدھے سبھاؤ کہہ دینے میں ہے۔ وہ "بقول نیاز فتحپوری چٹکلہ باز تھے۔ دل کی لگی سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اُردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔ انھیں ہنس مکھ کردار کرنا خوب آتا ہے۔

نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے۔ اچھا اس لیے کہ اس میں ہر قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے۔ اس کا مزاج ترا ہی خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاق صحیح کو ناگوار نہ ہو بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فن کار کی طرح انھوں نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ نفسیاتی طنز کی بہترین مثال ہے۔ اردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جا سکے۔ سودا کے طنز کی دنیا بہت تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نامحدود ہے۔ سودا کا فن طنز کافی ہے۔ ظرافت اس کا ایک رنگ ہے۔ نظیر کا فن ظرافت کافی ہے۔ طنز اس کا آہنگ ہے۔ نظیر نے کسی کی ہجو نہیں کی۔ ان کے لہجے میں نرمی اور دھیما پن ہے۔ سودا خاکہ بنا کر رنگ بھرتے ہیں اور کسی رنگ کا آسا دھبہ ڈال کر تصویر کو مضحک بنا دیتے ہیں۔ نظیر آئینہ بند ہیں۔ انھوں نے چاروں طرف آئینے نصب کر کے ایک چیز کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ ان پہلوؤں کا تضاد چٹکیاں لیتا اور گدگداتا ہے اور ہماری حس لطیف کو چھو جاتا ہے۔ نظیر نے ایک، شاعی کی طرح جس طرح دنیا کو دیکھا دوسروں کو دکھایا۔ ان کی نظر سیر کرتی، ہر منظر سے لطف اُٹھاتی اور ہر کیفیت سے حظ حاصل کر لیتی ہے۔ نظیر کی ظرافت ہلکی پھلکی اور خوشگوار ہے۔ وہ سنجیدگی کو خوشی پر، تعریف کو طعن پر، مسرت کو کھٹکوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

نظیر کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے۔ ان کا اجتماعی شعور بہت تیز تھا۔ سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے۔ وہ ایک ہوشیار رفتہ زن کی طرح فساد کو دیکھ کر رفتہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نظر میں تکیانہ گہرائی نہیں۔ وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے۔ انھیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں۔ وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے فساد پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے۔ زندگی کی رنگا رنگی کو انھوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے۔ ان کے مکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں غضب کی وسعت ہے۔ نظیر کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے مقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعرا نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا نظیر نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا۔ لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لیے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ ننگا کر سکتے ہیں تشہیر کر سکتے ہیں لیکن سر بازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انھیں گوارا نہیں۔[1]

ذیل کے اشعار میں ملا پر تعریض ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ملا جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں — حلوا کہیں کہیں وہ چپاتی اڑاتے ہیں
مفلس کوئی بلاوے تو منہ کو چھپاتے ہیں — شکر کا حلوا سنتے ہیں تو دوڑے جاتے ہیں
کہتے ہوئے یہ دل میں اہا ہا ری شب برات

وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے — یہ آئے دیکھئے داڑھی لگائے سن کی سی

---

[1] "اردو شاعری میں طنز" از شوکت سبزواری مطبوعہ علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر (۱۹۵۳ء) مع اضافہ

نظیر اکبرابادی

نظیر نے بعض اضافات اور پُر آہنگ الفاظ کی صوتی کیفیت سے بھی مزاح کا رنگ رچایا ہے۔ اس کی ان کے یہاں بیشمار مثالیں ہیں۔ عام عورتوں کی بولیاں انسان کے اضطراری بولوں کی طرح مضحک ہوتی ہیں۔ صوتی اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ نظیر نے ان سے بھی کام لیا اور کہیں کہیں کوں کوں، کڑکڑ، رمی سمی، ہی ہی، ہا ہا، ہو ہو سے کلام کو چٹپٹا بنایا۔ لفظی رعایتوں کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں۔ "کلیجک نہیں کرمجگ ہے یہ" یہ نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے۔" "کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں۔" اس کی چند مثالیں ہیں۔

انوکھی تشبیہات کے استعمال سے بھی ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ لکڑی کی چند تشبیہیں ملاحظہ ہوں :-

فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں — مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے — سیدھی ہے سو وہ یار و رانجھے کی بانسری ہے

نظیر کی ظرافت اگرچہ ہزل اور بعض دفعہ فحش کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر ان کے الفاظ کا چناؤ اور خیالات کی تازگی اس کو بے مزہ اور پھیکا نہیں ہونے دیتی۔ ان کی طویل نظموں کے جستہ جستہ ٹکڑے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :-

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال غوث قطب ولی آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہی ہے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کیے — حتیٰ کہ اپنے زور و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا — شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بڑھاپا

آگے تو یہ پریزاد یہ کہتے تھے ہیں گھیر
آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آکے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر
جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے
وہ کونسے گڑھ ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے نے کیے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے دم اڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تندرستی

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں
پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں و یا فاقہ مستیاں
سب عیش اور مزے ہیں جو ہوں تندرستیاں
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

فقیروں کی صدا

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا — دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا — دولت جو ترے پاس ہے نہ کام آئے گی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائے گی بابا

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات — کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں خیرات
دینے سے اسی کے ترا اونچا رہے ہے ہات — اور یاں بھی تری گذرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائے گی بابا

داتا کی تو مشکل کبھی آکی نہیں رہتی — چڑھتی ہے پہاڑوں کے اوپر ناؤ سخی کی
اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اسے کی — تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آوے گی سختی
خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبوائے گی بابا

دُنیا کے تماشے

کھول ٹک چشم تماشا یار باشی پھر کہاں — یہ شکار و صید یہ شکرے و باشی پھر کہاں
مال و دولت سونا رُوپا تو دماشے پھر کہاں — دم غنیمت ہے بھلا یہ بود و باشی پھر کہاں
دیکھ لے دنیا کے غافل یہ تماشے پھر کہاں

خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے — آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے — شاہ مسرور غنی شاہ و گدا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے

[illegible] خوشا [illegible] راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے — اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
اولیاء انبیا اور رب کی خوشامد کیجئے — اپنے مقصد و غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام — وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانا نے کہا ہے یہ دام — خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہولی

ملنے کا ترے رکھتے ہیں ہم دھیان ادھر دیکھ — بھاتی ہے بہت ہم کو تری آن ادھر دیکھ
ہم چاہنے والے ہیں مری جان ادھر دیکھ — ہولی ہے صنم ہنس کے تو اک آن ادھر دیکھ
اے رنگ بھرے نو گل خندان ادھر دیکھ

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا — کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا — ان سب جگہوں کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آ کر پھسل پڑا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلتی زمیں خوار — عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار — گرنے کا مکر کر کے اچھل کود ایک بار
اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی ۔ ہمّا جو پا لکی ہے تو ہے دال نا لکی
آٹے ہی دال سے ہے درستی یہ حال کی ۔ اس سے ہے سب کی خوبی جو ہے حال قال کی
سب چھوڑو بات ملّا و پیر و موالی کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

جب آدمی کے پیٹ میں جاتی ہیں روٹیاں ۔ پھولے نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رُخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں ۔ سینہ اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں
پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے ۔ یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ۔ ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں ۔ کیا کہنے کہ ان کے نعمتیں سو بہتریں ہیں
کپڑے بھی ان کے تن پہ نہایت مہین ہیں ۔ سمجھیں ہیں اس کو وہ جو بٹے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے ۔ پیسے ہی کا فقیر بھی کرتا سوال ہے
پیسہ ہی فوج پیسہ ہی جاہ و جلال ہے ۔ پیسے ہی کا تمام یہ رنگ روال ہے
پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

پیارے تھا رے اور تو عاشق ہیں نوجوان — اک ہم ہی بوڑھے سب سے ہیں اور پیر ناتواں
وہ تو رہیں گے ہم ہیں کوئی دن کے میہمان — بس سب کو چھوڑ ہم سے ملو کس لیے کہ جاں

پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است
از شارخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

یہ نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملیں سو کھا جا — تاش اور بادلے میں اکبار جگمگا جا
پاپی بخیل مت بن داتا سخی کہا جا — اک دم تو اپنا ڈنکا من مانتا بجا جا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جب ملی روٹی ہمیں سب نور حق روشن ہوئے — رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے — اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے — حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

تازگی جی کی اور ترے تن کی — واہ کیا بات کورے برتن کی

جھمکا نظر آتا ہے ہر اک عیش کی شے کا — دنیا میں عجب روپ جھلکتا ہے روپے کا

مرشد و مولا سے پوچھا میں نے اے پیر زمن — میری کچھ لگتی نہیں اللہ سے دل کی لگن
سن کے بولے وہ بتائیں ہم تجھے اس کا جتن — جا شتاب اور جلد سبزی لیکے اک دو چار من

کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

جب یار چلا اور ٹھ کے کالا سا دوشالا — کمبل کو ادھر ہم نے بھی کاندھے پہ سنبھالا
جا مل گئے اور دل کا بھی ارمان نکالا — مفت اس کے رقیبوں کا کیا خوب سا کالا
کیا وصل کی رکھتی ہے کرامات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آ کے کھسنتا — اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنتا
ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کر کے نچنتا — اور سنس کے کہا یار سے لے لکڑ بھونتا
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا
تھے اپنے گلے میں تو کنی من کے پڑے ہار — اور یار کے گجرے بھی تھے اگ دھون کی مقدار
آنکھوں میں نشے لے کے اُبلتے تھے دھواں دھار — جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے ملکار
اوروں کی بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

نوچی اور نائکا کی لڑائی

مرتی نہیں بنیا یہ گزرتی نہیں ڈہڈو — اور قہر خدا سے بھی یہ ڈرتی نہیں ڈہڈو
لب اپنے دزا بند یہ کرتی نہیں ڈہڈو — کیا سخت خرابی ہے یہ مرتی نہیں ڈہڈو

ایسا جو مرے پاس لگے جائے گی جھانپو — اک روز مجھے گھر سے نکلوائے گی جھانپو
سب کھا چکی اب مجھ کو بھی کیا کھائے گی جھانپو — وہ کون سا دن ہو گا جو مر جائے گی جھانپو

نظیر کی نظموں کے مقابلے میں غزلیں کمی قدر پھیکی ہیں۔ پھر بھی چند منتخب اشعار جن پر شوخی اور ظرافت کی چھاپ ہے یہاں درج کیے جاتے ہیں

لو نہ ہنس ہنس کے تم اغیار کے گلدستوں سے
اتنی ضد بھی نہ رکھو اپنے جگرخستوں سے

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

کہا جو تم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو
کہا کہ اس لیے تم یاں جو غل مچاتے ہو

کہا لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمدم
کہا کہ تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو

کہا جو حال دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر
کہا غلط ہے یہ باتیں جو تم بناتے ہو

کہا جتاتے ہو کیوں ہم کو روز ناز و ادا
کہا کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو

کہا کہ عرض کریں ہم پہ جو گزرتا ہے
کہا خبر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو

کہا کہ روتے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا
کہا سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو
جس کی فوید پونچی ہے رنگ بسنت کو

ہیں ہنس کے اس لیے منہ چومتا ہوں غنچہ کا
کہ کچھ فشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی

نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

جان صاحب

میر یار علی نام، میر امن لکھنوی کے فرزند اور نواب حاشور علی خاں لکھنوی کے شاگرد تھے۔ نہایت ہنس مکھ، ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ جب تک لکھنؤ میں رہے پریشان حال رہے۔ ۱۸۵۷ء میں مجبوراً ترکِ وطن کر کے دلی چلے گئے۔ مگر وہاں بھی پاؤں نہ جم سکے۔ بھوپال پہنچے تو وہاں بھی بدنصیبی ساتھ رہی۔ آخر دانہ پانی نے زور کیا اور نواب کلب علی خاں کی قدردانی رام پور کھینچ لے گئی۔ پھر وہیں رہ پڑے اور ۱۲۹۰ھ ۶۳ برس کی عمر پا کر وہیں پیوندِ زمیں ہوئے۔

جان صاحب نے شروع ہی سے ریختی گوئی کی مشق کی اور اس کے سوا دوسری کسی صنف میں کوئی شعر نہیں کہا۔ وہ مشاعروں میں بھی بالکل زنانہ جاس بیٹھ کر جاتے اور اس انداز سے پڑھتے کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ ہو جاتے۔ اس کے باوجود ان کی ریختی میں آمد کم اور زیادہ ہے۔ اسی تکلف کی وجہ سے رنگینی اور انشاء کی سی روانی اس میں پیدا نہیں ہوئی۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں ؎

وہ تھے استاد ان سے جان صاحب تجھ کو کیا نسبت
کیا پر نام روشن ریختی نے تیری نسبت کا

لفظی حاشیئں ان کے یہاں اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض اوقات کلام بے مزہ ہو جاتا ہے۔ فواحشات کا بھی زور شور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان عرصہ تک چھپتا خوفناک بند رہا۔ آخر انتخاب شائع ہوا۔ بقول مولانا عبدالباری آسی "اس میں شک نہیں کہ باوجود اس آورد اور تکلف کے ان کے یہاں بیگماتی زبان لکھنؤ کے روزمرہ، شیرینی، عورتوں کے محاورات، رسوم و رواج کا اس قدر ذکر ہے کہ متقدمین میں کسی کے یہاں بھی نہیں۔" (تذکرہ خوش گو ص ۴۸۳)

جان صاحب کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

خالی کے جینے میں وہ خالا نہیں رہتا
در گور مرے پاس زالا نہیں رہتا

سلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت
سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

کھلا جنگل میں آکر حال ان چڑیوں کی چوں چوں کا
ہر اک عاشق کو دیتی ہیں یہ پرسا اپنے مجنوں کا

تم اگر دو گے نہ تن پیٹ کو روٹی کپڑا
کیا خدا کے بھی نہیں گھر میں ٹھکانا میرا

بچی کے واسطے جو کھلونے منگائے ہیں
گھر والا گھر کو کہتا ہے بتخانہ ہو گیا

دلوایا شب برات میں مردوں کا فاتحہ
ٹوٹے گھڑے پہ بدھنی پہ مٹکے مٹھور پہ

نہ دیکھ دولھا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر
نئی نویلی دلھن ہے بچی ابھی تو دو چار دن حیا کر

نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے متاعِ رنڈی کو گھر میں ڈالا
بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر

لگائی سوسن نے ایسی مسی کہ جیسے بطخ نے کھائی کیچڑ
کسی نے مارا ہے منہ پہ پتھر نہیں یہ آئی ہے پان کھا کر

نصیب سیدھا اگر ہے میرا بھگتی نکلے گی کھاٹ اس کی
وہ سکھ نہ پائے گی جس نے بھیجا ہے الٹی پٹی تمھیں پڑھا کر

ہوں میں بڑھیا پہ جوانوں کے گلے کاٹتی ہوں — اب بھی یہ کند چھری ہے مرے دو چار سے تیز

ملا تھا ایک ہی لیلیٰ کو اے دو مجنوں — ہزاروں اس سے تو وحشی ہمارے پھرتے ہیں

نہ جاؤ تم پڑوسن کے بھیجو میرے بھائی کو — لگے ہیں درد، مرتی ہوں بلا لائے وہ دائی کو

میں گری تو بھی گرا پانوں نہ تیرا ٹوٹا — تیرے دل کو تو کل آئی مرا پہنچا ٹوٹا
قند والوں کے محلے میں گئی تھی مصری — کھا کے ٹھوکر جو گری پانوں کا گٹا ٹوٹا
اے گل اندام یہ خوشبو جو چلی آتی ہے — شاید عطار کے کیوڑے کا قرابا ٹوٹا
کھا گئی بوٹ چرا کے تو یہاں تک مارا — سر پہ باندی کے مرے پانوں کا جوتا ٹوٹا
باغ کا میوہ اسے توڑ کے سب بھیج دیا — جان صاحب ہے بڑا ڈال کا آیا ٹوٹا

خدا نے پدمنی کو قوم میں ان کی کیا پیدا — بڑا ہر ایک سے رتبہ نہ کیوں سمجھیں چمار اپنا

چوری ہوئی پتا نہیں ملتا ہے مال کا — گھر گھر اجی کروں گی گلہ کوتوال کا
زینب النساء کی طرح میں کہتی ہوں وہ غزل — مردوں سے ہو جواب نہ میرے سوال کا
ہمسائی میرے سر کی قسم آئیو مت ذرا — کونڈا کروں گی جمعہ کو سید جلال کا

کیا ہوا چل دور ہو تجھ سے موئے — بیاہ میرا اور ہی جا ہو گیا

جب سے سایہ جن کا ان کو ہو گیا — بی پری خانم کو سودا ہو گیا
خوب بھرکایا تھا اس کو سوت نے — میں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہو گیا
مجھ سے موتی کھو گیا جو ہر کا جو — کل تھا جھوٹا آج سچا ہو گیا

بل بہت کرتا تھا تکلے کی طرح
ایک ہی جھٹکے میں سیدھا ہو گیا

فوج کا طوفان ہیں آنکھیں مری
جس جگہ میں روئی دریا ہو گیا

گھوڑی حمایتی نے عراقی کے ماری لات
بکنے سے مری زبان سے یہ ہاں نکل گیا

بے تے کی مولوی نے فضیلت کی لاگ سے
دق ہو کے مدرسے سے الف خاں نکل گیا

نہ پھینکا ڈھیلا نہ کھنکا رے چپ چلے آئے
کسی کے گھر میں کوئی بے خطر نہیں آتا

لڑائی جھگڑا بکھیڑا کرے بلا میری
رہیں وہ کسبی کے گھر مجھ کو شر نہیں آتا

خصم کا مال تو ہے یار کو کھلا رنڈی
ہیں تو لاکھ کا گھر خاک کو نہیں آتا

گرگٹ کی طرح کالا کبھی لال ہو گیا
غصہ سے مرد وے کا عجب حال ہو گیا

فوروزی جان پورے وہ دن اب کہاں رہے
بچہ تو جنتے جنتے تجھے سال ہو گیا

کیچڑ میں کوڑی دیکھیں تو دانتوں سے لیں اٹھا
اے اشرفی زمانہ بھی کنگال ہو گیا

آرزو بندی کی ہے خالق سے اک دن میری سوت
کھائے پھل تلوار کا اور پھول سونگھے ڈھال کا

رفی خانم بھونک کر خالی نہ کر اپنا دماغ
بے ادب لڑکا تھا کتا بن گیا سسرال کا

کوٹھے پہ چڑھ کے رنڈی کرتی ہے تو جو کنگھی
میں سچ خوب سمجھی یہ بھی ہے جال تیرا

کوئی تو آ پھنسے گا الو مؤا نگوڑا
ہے جعل ساز بھری ہر بال بال تیرا

تف اس بہادری پہ بنا مردوا ہے کیوں
چھوڑا پڑا تھا میں نے ترا دل دہل گیا

کیں جس کے آگے باتوں میں مہرن نے گرمیاں
پتھر کا دل بھی موم کی صورت پگھل گیا

مالن ہے نو بہار بنی موتیا کا پیڑ — دانوں سے ٹھنڈیوں کے بدن سارا پھل گیا
تصویر ان کی دیکھ کے آنسو نکل پڑا — بچہ ہی تھا کھلونے پہ آخر مچل گیا

کہتی ہوں دل میں جب سے مجھے تو نظر پڑا — خالق بچائے جانِ بلا کو نظر پڑا
ہوتی تھی عید ہم کو سمندر میں اس گھڑی — ٹھہرا جہاز جب کوئی ٹاپو نظر پڑا
جس مردوے کے پیچھے مرا گھر ہوا خراب — برسوں کے بعد پھر وہی اُلّو نظر پڑا

خصم و دیور و ساس کا اے ہوا چوسر کا پانسہ ہے — بدی جس سے کرے گا سامنا ہوئے گا ذلت کا
لگا میٹھا برس جب سے یہ صورت زہر لگتی ہے — کہیں مشاطہ کر پیغام اب مصری کی نسبت کا
بدل لی آنکھ طوطے کی طرح میں ٹیں لگا کرنے — اُڑے دُنیا سے جلدی نام ایسے بے مروت کا
پڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کو — کیا خانہ خراب اس کو دکھایا کوچہ اُلفت کا

کلوا رفی پہ مرتا ہے تف اس کی ریش پر — قاضی کے گھر میں کیوں نہ ہو پھر چاشراب کا
اماں خدا کے گھر میں جو ہوتا ہمارا دخل — پانی کے بدلے مینہ برستا شراب کا

اس کو اس باغ میں جیتا ہی میں گڑوا دیتی — میرا شمشاد پہ قابو جو صنوبر چلتا
شوم نیوں سے جلا ہوں سے جو چوسر کھیلے — چال وہ مجھ سے مکے گو کی نہ کیونکر چلتا

پکا نہ تھا کچا تھا وہ جن لے پری خانم — کل سر پہ چڑھا آج نگوڑا اُتر آیا

گئی تھی دیکھنے باجی میں سورج کنڈ کا میلہ — بچی ہوں بستی پستی مردوں کا یہ ہوا ریلا
مجھے کسبی سمجھ کر گھورتا ہے دیکھو میلے میں — مہینوں لڑکا باجی میری گودی میں جو ہے کھیلا

جو سنتا مرتا ہے فرہاد لوگو شیریں پر
وہ بس کی گانٹھ تھا خسرو بھی نہ کہا جاتا

میں بات کرتی جو اپنوں میں تم سے اے صاحب
ذلیل ہوتی تو بندی تمھارا کیا جاتا

کس کے تم غم میں بن گئیں مُردہ
اُونٹی در گور کیا یہ حال ہوا
تو صنوبر سے دوستی کر کے
موئے شمشاد کیا نہال ہوا

کھانا چرا کے خوب نہیں ہاں سے پان کا
منہ کی کہیں کھلائے نہ چسکا زبان کا
بیڑا تو بی اٹھایا خدا سرخرو کرے
سرسبز ہوں پتہ جو لگے خاصدان کا

پیٹ سے اچھے نکالے تم نے پاؤں
ایک گھر سے دوسرا پیدا کیا

کھیرا لکڑی کیا بچوں کو مری بھابی نے
ان کو وہ کوسنا اب تک نہیں بھیّا بھولا

اے ہُوا پتھر کا دل ہے اس موئے بے پیر کا
تھا نکھٹو گھر میں خالق کے مری تقدیر کا
کیا کیا ہے دھوپ میں باندی نے سر اپنا سفید
آج تک آیا نہ شیریں کو پکانا کھیر کا
اشرفی خانم کی چوری اے پری خانم کھلی
ہے بنایا توڑ کے تو ڑا مری زنجیر کا

پیسہ تھا پاس رہتے تھے ہر آن آشنا
یا دُور دُور کرتے ہیں اے جانِ آشنا

کرتا رہا وعدہ تو یونہی دھوکے دھڑی کا
مانوں گی میں اقرار نہ اب ایک گھڑی کا

دور بھی کر او ماما کلو
کوسا ہوگا کوسا ہوگا
سوکھا سا کھا گورا گورا
کملو کا گھر والا ہوگا

بچی جو موئی میری داماد بہت رویا — مرنے پہ کھلی الفت ناشاد بہت رویا

ٹیسوں کا بال بال پہ اب تھا نہ ہوگیا — کنگھی جو کی تو سوج کے پریشانہ ہوگیا
لیلیٰ اسی تو نے پائی ہے کیا ٹوٹی کلموہی — مجنوں کی طرح مردوے دیوانہ ہوگیا

طے کیا عشق کا جھگڑا نہ کسی قاضی نے — اس عدالت میں مواکوئی نہ عادل آیا

کہدی مہتاب سے مہرن نے ملاقات کی بات — پیٹ کی ہلکی ہے اک دن نہ بچی رات کی بات

رات کو خواب میں لیلیٰ نے کہا بندی سے — تو نے پھر زندہ کیا نام مرا میرے بعد
سچ میں کہتی ہوں نبی بخش بُرا ہے داماد — رکھے عزت مری بچی کی خدا میرے بعد
کارخانہ میں خدا کے ہے کسے دخل بُوا — بچہ تم پہلے جنیں بیاہ ہوا میرے بعد

مرجاؤں تو نہ آئے وہ بندی کی گور پر — کیا ہوں گدھی میں جان دوں بہرام گور پر

جو ہران کے کھلے ہیں بہوؤں پر — چھریاں نندیں ہیں اور کٹاری ساس
بولوں بڑھ کر تو ذبح کر ڈالے — ہے وہ جلاد بی ہماری ساس

بدزبانی نہ کرو ان سے بڑی بوڑھی ہیں — ساس سسروں سے دلہن جان ہے درکار لحاظ

ہر کسی سے نہ اُلجھ جانؔ بقولِ آتشؔ
بات بڑھ جاتی ہے کھو دیتی ہے تکرار لحاظ

نازنین

مولوی عبدالغفور نساخ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ یہ تخلص علی بیگ دہلوی کا تھا جو ذوق کے شاگرد تھے اور جان صاحب سے بہتر ریختی کہتے تھے۔ مگر تذکرۂ صابر کا مصنف نازنین کو عورت قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "غلط نعمان اداشناس کی نظر میں یہ تخلص ہے مرزا علی بیگ نام جوان خوش اسلوب رستم توان بزور و قوت سہراب طاقت کا۔ نازنینان کشور جمال اس کے جبر یوسفی پر اگر زلیخائی کا دم بھریں کچھ دور نہیں اور نازک نہالان گلشن حسن اس کے گل رخسار کی نازکی سے اگر آب کو غنچۂ برگ ریز تصور کریں تو کیا عجب ہے۔ اس کے خم کے آگے زور آزمایان ورزش خانہ طاقت کا سر جھکتا ہے۔ اور اس کے نعرۂ مردانہ کے سامنے شیر ژیان بیشۂ شجاعت کا دم بند ہوتا ہے۔ اس جیدہ آفریں شعبدہ ایجاد با ناز و انداز دلفریب طرازی و عشوہ سازی گاہ عشاق بے قرار سے لطف کے پردہ میں جان کا خواہاں ہونا اور گاہ اختیار نامحرم کی بغل میں بے تکلف سونا۔۔۔ وغیرہ" بہرحال یہ صاحب ۱۲۷۵ھ تک دہلی میں زندہ موجود تھے۔ صاحب دیوان تھے لیکن اب دیوان ناپید ہے۔ صرف تذکروں میں کلام ملتا ہے۔ استاد ذوق کے قطعۂ تاریخ کے لفظ لفظ سے محبت و عقیدت کا آبشار ٹپکتا ہے ؎

نہیں نازنین رنج کرتی کسی کا — گیا جب سے یار اور حسرت سے کھوئی
بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے — اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی
خصم جب موا لونڈیوں کو رلایا — کہ اس پردہ میں نام رکھے نہ کوئی
ولیکن مجھے کاملوں سے ہے الفت — غم ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی

لکھی ان کی تاریخ اور بہ ہوا غم
میاں ذوق کو میں ہوا آپ روئی

اسی رنگ میں ایک اور قطعہ دیکھئے ؎

نازنین اتنا بھی ہرجائی پن — یہ تمہارے آگیا کیا دھیان میں
روز اک دھگڑے کی ہیں مہمانیاں — روز رہتی ہوں اسی سامان میں

ریختی میں عریانی زیادہ ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تا کا
بوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

میں اپنے سر کو دھوتی ہوں بوا اور یہ تماشا ہے
موا بیٹھا ہے کیا خوش خوش کہ دن آیا تقاضا کا

کوئی بیٹھا ہو تجھے ہے کام اپنے کام سے
اے نگوڑے آدمی کیا تو تو حیواں ہو گیا

سونا کبھی شوہر کو میسّر نہیں ہوتا
عورت انھیں باتوں سے ترا گھر نہیں ہوتا

اے زنانی مردوا ہے بدگماں
تو نہ کر باتیں ہمارے کان میں

دس گھر تو چھپٹ چکے ہیں کہاں تک کروں خصم
کس جا بٹھائے دیکھئے اب آسماں مجھے

بیگم

تذکرہ چمن انداز اور ماہ درخشاں میں لکھا ہے کہ ان کا نام رشک محل تھا۔ پنجابن تھیں جو واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے متاع میں آئیں۔ اور پھر انتزاع سلطنت کے بعد بادشاہ کے ہمراہ کلکتے چلی گئیں۔ وہیں انتقال ہوا۔ ریختی کہتی تھیں۔ چند شعر جو تذکروں میں ملتے ہیں درج کیے جاتے ہیں ؎

نہ بھیجوں گی سسرال میں تم کو خانم
نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمہارا

مری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو
یہ احساں ہے سر پر وگانا تمہارا

ہوا بال بیکا جو مرزا ہمارا
تو پھر سنگ ہے اور شانا تمہارا

گھر سے گانے کے وگانا مری مہمان گئی
میں یہ انگاروں پہ لوٹی کہ مری جان گئی

(تذکرہ خنجرۂ گل صـ ۱۲۹)

عصمت

یہ تخلص امجد علی خاں کا تھا جو حسین علی خاں لکھنوی سنا گر د محمد علی خاں بیتاب کے فرزند تھے اور ریختی نہایت عمدہ کہتے تھے تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۳۳۲ میں ان کے چند شعر لکھے ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

جو کم سنی میں دیکھ چکی مست ہزار کے
بیٹھے گی کب بھروسے پہ وہ ایک یار کے

پی تم نے کیوں کنوار پنے میں چبائے پان
موتی سے دانت بن گئے دانے انار کے

نرگس کی چھوکری کا وہ دیدہ ہوائی ہے
کندن کو سارا دے دیا گہنا اتار کے

نتیجہ لے ہوا اچھا نہیں مردوں کی صحبت کا
کھلے گا نو مہینے بعد گل اس عیش و عشرت کا

نہ لیتی نام تک ہرگز نکھٹو کا کبھی ماما
مگر کچھ پاس ہے مجھ کو بڈھے بوڑھوں کی عزت کا

نگوڑے شیخ نے پھر آج افیوں لے کے کھائی ہے
میں ڈرتی ہوں ہوا پھر سامنا ہوگا قیامت کا

تری خاطر میں گھر سے دن دہاڑے آتی ہوں ورنہ
کسی نے آج تک آنچل نہیں دیکھا ہے عصمت کا

محسن و عنقا

یہ دونوں تخلص خانپور کے محمد محسن خاں کے تھے جو ریختی گو تھے اور عرصہ تک لکھنؤ میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ دیوان چھپ ہے۔ ان کے کلام میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی زبانوں کے لطف کے ساتھ سماج پر طنز، شوخی، شرارت، رمز، کنایہ سب کچھ موجود ہے فواحشات کم ہیں۔ خیالات انوکھے اور طرز بیان میں جدت ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے ؎

ہوتا بسم اللہ سے آغاز ہے دیوان کا
راز سربستہ ہے وہ باجی درِ قرآن کا

ابنِ مریم تھا ثنا خواں باعثِ قرآن کا
کیوں نہ ہو قرآن پر قربان دل انسان کا

پہلے نفرت تھی بُوا پھر اس سے الفت ہوگئی
ہوگیا یوسف بھی شیدائی زلیخا جان کا

چشمِ یکتائی سے دیکھو تم اگر سمجھی اسے
خالقِ اکبر ہے مطلب رام اور بھگوان کا

گلشنِ نعتِ نبیؐ میں بلبلِ دیوانہ وار
ہے ترانہ سنج محسنؔ اس گلِ یزدان کا

سراپا عصمت ہیں اور حیا ہیں ہے شرم باجی شعار اپنا
وہ بھڑوا ننگا ہے مسخرا ہے بنا نہیں ہم نوج یار اپنا

ہے یاوبندی کو بھی وہ لٹکا پھنسے گا بھڑوا وہ بھٹکا بھٹکا
نہیں نگوڑے کا کچھ بھی کھٹکا، ہو کوئی دشمن ہزار اپنا

بگاڑوں گی میں بھی حال گھر کا، وہ ڈالیں مجھ پر وبال گھر کا
کھلائیں رنڈی کو مال گھر کا، نکالیں مجھ پر غبار اپنا

ہے آنے ڈولی کھلا ہوا بی، امام باڑہ بھی کربلا بھی
نگوڑے لٹتے ہیں کیوں بواجی حساب کرلیں کہار اپنا

پھر گیا طبلہ بجانے آج گوہر جان کا
کیسا ننگا ہے نگوڑا باب چندر بھان کا

خاک گائے گا نگوڑا شیخ اپنی بزم میں
جانتا سُر ہی نہیں بھڑوا جو اپنی تان کا

کیوں نہ رنجیدہ ہو محسنؔ دو مہینے سے بُوا
خط نہیں لاہور سے آیا الٰہی جان کا

عجب بلا میں پھنسی ہوں گونیاں میں اس نگوڑے سے دل لگا کر
یہ دونوں پھوپیں جو رات سوئی ہوں میں پلک سے پلک لگا کر

کھلے ہیں ایام حیدری کے پڑی ہے گھر میں وہ شیخ جی کے
جلائیں گے ہم چراغ گھی کے ضرور مسجد میں آج جا کر

بلا کی شوخی زبان میں ہے ستم کا جادو بیان میں ہے
وہ موہنی آن بان میں ہے کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

بنائے کیا کیا دزیر بیگم، نگاہ خونی کے تیر بیگم — بنایا دل کو اسیر بیگم، کمان ابرو چڑھا چڑھا کر
بگاڑتی کیوں ہے اپنا جوبن، ہے چند روزہ ہوائے گلشن — نہ سرمہ مسی نہ پان ساقن، اری دیوانی خدا خدا کر
بہار گلشن جہاں ہے اس میں، ادائے بلبل نہاں ہے اس میں — وہ عنقا بیگم زباں ہے اس میں کہ مار ڈالا لبھا لبھا کر

کرے گا خاک مرا آنکھ اور ناک کی شرم — نہ جس کی آنکھ میں مطلق ہو ماشا کا لحاظ

وہ الٹے الٹے سبق سنائے کہ مار ڈالا جلا جلا کر — بگاڑا کسبی نے ان کو باجی سکھا سکھا کر سکھا سکھا کر
بڑا یہ بیگم ہے لکھنؤ کی، بڑی ہے دھوم اس کی گفتگو کی — ذرا جو آنکھ اس سے وہ بدو کی تو اس نے مارا جلا جلا کر
سگھڑ سیانی تو ہو کے جانی، خراب کرتی ہے زندگانی — جوانی ہوتی تو ہے دوانی، مگر نہ یوں شرم بھون کھا کر
کہاں سے لائے گا دم مرا وہ، بڑا ہی دمباز ہے بڑا وہ — سراپا سلفہ مرا ہوا وہ، چرس نکوڑی اڑا اڑا کر
ہو روبرو کی کہ دو بدو کی، نگوڑی ہے بات آبرو کی — اڑا کے دہلی میں لکھنؤ کی، بگاڑا کیا کیا بنا بنا کر
یہ ریختی ہے پری ہے یا گل، زباں ہے باجی کی مست بلبل — سرور میں ہے بہار سنبل، شمیم محسن اڑا اڑا کر

حسین بھی ہیں جوان بھی ہیں، جبیں پہ شاہی نشان بھی ہیں — ادائیں بانکی ہیں آن بھی ہیں، واری ان کو نہ ٹال گویا
سخن کی دلھن بہار پر ہے، بہارِ مضمون ابھار پر ہے — کلام محسن نکھار پر ہے غزل کی حسرت نکال گویا

ناچنا رنڈیوں کے سامنے ننگا ہو کر — زیب دیتا نہیں مرشد کو یہ آقا ہو کر
جائے گا شیخ نگوڑا، ہوا سیدھا ہو کر — شوخیاں کرتا ہے مجھ سے ہوا کٹنا ہو کر
کر لی مغلانی کی بھی چھوکری رسوا ہو کر — باز آتا نہیں دولھا میرا بوڑھا ہو کر
جب سے کنجڑن کو کیا شیخ نے شیدا ہو کر — رہ گیا سوکھ کے انچور کا چھلکا ہو کر
کیا کہوں کو کلا بیگم کی کہانی گویاں — پڑ گئی زاغ کے بس میں موئی عنقا ہو کر

کچھ نہیں شاعر گستاخ سے امید وفا　　لگتا محسن ہے مجھے زہر کی پڑیا ہو کر

پڑی نگوڑی چمار کے بس، کمار کے بس　　بجائے واحد ہزار کے بس، مگر نہ ہرجائی یار کے بس
نہ اوج کی سرحدیں آپ جائیں، نہ مار کاوں کی آپ کھائیں　　نہ دیدہ و دستہ آپ آئیں ہمارے گیسو کی مار کے بس
ہوا تھا گوہر سے پھر چھڑکا مہے خام پارا بڑی لڑاکا　　کوئی نہ بندا بُوا خدا کا، ہوا ایسی بے شرم نار کے بس
نہ آئی چمپا کلی نہ مالا ہے کب سے چمپت نگوڑی خالا　　ہمارا زیور کھٹائی ڈالا، ہو نوچ کوئی سنار کے بس
فدا جو ہم اس سوار پر ہیں، تو خالہ وہ کب قرار پر ہیں　　ذرا وہ پھولوں کے ہار پر ہیں، میں ریش انور کے خار کے بس

ہیں چلتے پرزے کرتے ہیں ہر بات کا لحاظ　　حرکات کی بھی فکر ہے سکنات کا لحاظ
مانا کہ پردہ والی سے کچھ بات ہی نہیں　　کیوں بات بات پر ہے مسمات کا لحاظ
کرلو صفائی باجی کہ دولھا ہیں بے خطا　　کرتے نہیں عدو کی روایات کا لحاظ
افسوس تو یہی ہے کہ عفت ابو انہیں　　محسن نگوڑے مارے کو کچھ بات کا لحاظ

بس اسی غم میں ہمارا کج دل تاریک ہے　　وہ نہیں بھڑوا جلانے کا سر مد فن چراغ
دولھا بھائی گر پڑیں، ٹھوکر لگے یا چوٹ آئے　　کیوں نہیں رکھتی ہو دُلہن تم پس چلمن چراغ

دکھاؤ تن تن گھڑی نہ موہن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
ہے چند روزہ یہ حسن و جوبن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
نہ رہ تو بیگم ہوا کشیدی، جو رکھے رنڈی مواد شیدی
تو تو بھی جا جا کے کھیل ساون، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے
یہ مسخ پردہ میں گاڑ باجی، کسی سے مت تو بگاڑ باجی
اٹھے گا یا وفا سے چلمن، گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

کھیل سمجھا ہے سفر بھڑوا عدم آباد کا
حوصلہ دیکھو تو گوئیاں اس دلِ ناشاد کا

کبھی کے گھر سے لگا کر بھیجتے ہو پان تم
واہ کیا کہنا ہے مرزا آپ کی اس یاد کا

بات تو شیریں کی رکھ لی تھی ہزاروں میں ہوا
گو بابا سے پھٹ گیا سر بھی میاں فرہاد کا

ہونے دے ڈھول خالی شیخ جی تم
خوب ہم نے بجا بجا دیکھ

دے گی وہی کبوتری انڈے میاں کے گھر
ہو جس لنڈوری کو کہیں آرٹیاں نصیب

آج دا روغہ کی کل ڈپٹی کی
رتبی گوہر کو ہے بیگار رہبت

جیتے جی شرم نہ محسن کو جب آئی گوئیاں
خاک آئے گی نگوڑی کو حیا میرے بعد

روٹی کپڑے کو بھی اب بیگم ہوا محتاج ہے
آ گئی تھی چال میں ڈپٹی کلکٹر دیکھ کر

تربت پہ آ کے بھڑوے نے ماری جو یہ لات
سو سو قدم پہ جا پڑے تختے مزار کے

نہ مارو شیخ کو بے موت باجی
نگوڑا آپ ہی وہ مر رہا ہے

نہ نکلے گھر میں ڈولی کے بھی پیسے
بڑا نواب کا سالا بنا ہے

بناتا ہے مو اول بے کے باتیں
بڑا محسن نگوڑا سخنور ہے

اکبر الہ آبادی

آپ طنز و ظرافت کی شاہراہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورا نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے مشہور قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری سکولوں میں پائی اور انگریزی کی واقفیت اپنے شوق اور محنت سے حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے ۱۸۸۸ء میں جج کے عہدے پر پہنچ گئے۔ آخر حکومت سے خان بہادر کا خطاب حاصل کرکے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ الہ آباد یونی ورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ بڑے خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ شوخی اور ظرافت ان کی سرشت میں شامل تھی اور اس کا اظہار بات بات میں ہوتا تھا۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال فرمایا۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں اپنا کلام وحید بیاں کو دکھایا کرتے تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سمجھ کر کہ اب لکھنؤ میں چمکنا مشکل ہے۔ اس بادہ سے سبک کر فلسفہ، سیاست اور تصوف کی راہ پر پڑ گئے اور اس کے لئے مغربی تمدن کی بے راہ روی پر تنقید کا ایسا نیا میدان ڈھونڈ کر اس کے موجد بھی ہوئے اور خاتم بھی۔ ۱۸۷۵ء میں جب منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے ہفتہ وار اودھ پنچ نکالا تو اس میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ نثر میں بھی شگوفے چھوڑے لیکن اقلیم شاعری میں تو یہ زمین ایسی اپنائی کہ شعلہ حقیقی دعویدار اس تک پہنچا نہ ہوا بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت کو مسلسل ہنسوں نے پکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے، اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔ قوم نے ان کو جانا ملا اس حیثیت سے کہ وہ رلاتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں، ملک نے ان کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔"

طنز و مزاح اکبر کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انسان کی طنز مجبور انسان کی دل شکنی کرنے والی طعن و تشنیع نہیں بلکہ گفتار کی گرمی سے بجلی بن کر گرتی ہے۔ ظرافت بھی ان ہزاروں اور فحاشوں سے بالکل الگ ہے جن کے دیوانوں کا سرمایہ ان کی ہزیان سرائی اور بزخرافات ہیں۔ وہ دلوں کو خوش کرتے، چہروں پر تبسم لانے مگر جذبات سفلی کو بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ "جوانی تک شوخی جوان رہی۔ مگر کا آفتاب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی، صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی۔ حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا۔ سوز عشق نے سینہ کو گرمایا۔ ذوق عرفان نے دل کو تڑپایا اور نور معرفت کی شعاعیں خود ان کے مطلع قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھیں قریب تھا کہ چکا چوند میں پڑ جائیں۔" یہی تو بات ہے کہ ان کی ظرافت نہ صرف ظرافت ہے بلکہ پند و نصائح اور قومی، مذہبی، تمدنی، معاشرتی زوال، رسوم، تاریخ، سیاست وغیرہ کا مکمل اور مصفیٰ آئینہ ہے۔ ان کی چٹکیوں اور گدگدیوں سے دل کو ایک بھی خوشی اور روح کو صحیح فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اور یا آدمی اس سے اچھا اثر قبول کرتا ہے۔ حق باتوں کی تلخی اور پند و نصائح کے زہر کو خوش بیانی اور مزاح نے شہد و شکر کے شربت کی مانند ایسا خوش مزہ اور گوارا کر دیا ہے کہ اس سے کبھی سیری نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طنز و ظرافت اور طعن و تشنیع سے اکبر نے اصلاح قوم کا جو کام کیا ہے وہ کسی دوسرے سے نہ ہو سکا۔

اکبر نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اپنے مخصوص رنگ میں نہایت لطیف ظریفانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ خود مذہب کے پابند تھے۔ اس پر مشرقی وضع کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اس لیے آپ کے کلام میں وہی جذبہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ان تمام باتوں کے خلاف جنگ آزما ہے جن کا تعلق بدذاقی، اندھا دھند تقلید، بے تمیزی اور تنگ نظری سے ہے وہ جہاں مغرب کی کورانہ تقلید کی مخالفت کرتے ہیں وہاں ان لوگوں کے بھی خلاف ہیں جو مذہب کی آڑ میں دنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان کے تعلقات، رباعیات اور غزلیات میں ظرافت کی وجہ سے انگریزی الفاظ کا کافی استعمال ہے۔ نئی اور انوکھی تشبیہات ہیں۔ مخصوص محاورے، فقرے، قافیوں کی بہار ہے۔ پھر خاص خاص مضامین کو ادا کرنے کے لئے خاص خاص الفاظ اور علامتیں ہیں مثلاً برہمن، شیخ، سید، اونٹ، گائے، گرجا، کلیسا، مندر، بت، صنم، چیر، حرم، تبلہ، کالج، اصاحب، برہمن، لالہ، بدھو جین، ٹوپی، ٹیٹی، ریل، انجن وغیرہ اور یہ عام چیزیں ادبی نقطۂ نظر سے اس لیے اہم ہیں کہ اکبر نے انھیں بڑی قدرت، چابک دستی اور ہوشیاری سے مخصوص اصطلاحی حیثیت دے کر استعمال کیا ہے۔ ان میں ایک سلیقہ اور نفاست بھی ہے اور خوبی و نظافت بھی۔ سرسید کی تحریک، کانگرس، مخالفت کا مدعی، علی برادران، یونی ورسٹی کی تحریک، متوسط طبقے کی بدلتی ہوئی معاشرت، ہندی اردو کی کشمکش، مسجد و مندر کی آویزش، غرض اس دور کی کوئی تحریک اور کوئی تنقیدی مسئلہ ایسا نہیں جس کی دلکش اور غیر فانی تصویر اکبر کے کلام میں موجود نہ ہو۔

"سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے، لیکن جتنا کہہ جانے میں جری تھے اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، چھپانے میں محتاط تھے۔ قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی اور جو اتنے معتقد و باادب نہ تھے وہ تو سمجھتے ہیٹ میں خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے۔ خیر ظرافت اس خاص غرض کے لیے یعنی سرِ حال کے لیے، اخفائے خیال کے لیے ان کے ہاتھ میں ایک اچھے نفاذ کا بڑے کام آلہ تھا۔ جو کچھ وہ کہتے تھے، جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے اسی پردہ میں سنا جاتے۔ کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی، ہندو و مسلم، سنی و شیعہ، سب کی صحبتوں میں اور مسجد اور مندر، کالج اور مدرسہ، خانقاہ و میکدہ، ٹاؤن ہال اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، باغ اور دوڑ کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے، ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے۔ اسے جھانکتے، تاکتے، اس کو جانچتے اس کو بھانپتے۔ ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے، لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے کہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پایا کہ نکتہ چیں کس جانب ہے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گزرتے۔ کہیں کہیں مطلبِ عہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں۔ ایک جگہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو کچھ آئیں فطرتاً ۔۔۔ دوستوں سے التجا ہے کریں اس کو معاف

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار ۔۔۔ شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

"موسم کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور "ہواؤں" سے مراد خانوادی شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔

ایک جگہ فرمایا: "منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں انھیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جریدہ نے ہماری حرص و ہوس اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارے لیے ایک جال بچھا دیا ہے جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں اور تحکومی و تنزل کے خار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

لہ کلیاتِ اول میں ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر ۔۔۔ جال کھنچے گا کھال کے اندر

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا — لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں — ہر سو اچھل رہے ہیں اور چو ہو رہے ہیں
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو — اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھے گا کلاکِ حسرتِ دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا رونے سخن ہمیشہ اپنی ہی ملت کی جانب رہتا ہے۔ نعلیم اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ یا دن اگر نہ ہو تو رات چاہے کس چیز پر؟

سرکار نامدار کے بعض "بنکنام" محکموں اور سرشتوں کی ذہانت، طباعی، قوت خلاقی کے مشاہدہ سے یہ طریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے اور محکمہ پولیس کی کارگذاریوں کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؛ اس کے اسلاف صدہا برس یاری کی کو تلاش کرتے آئے ہیں، آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی راہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی معدوم کا اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ پتہ چلایا جائے؟ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال — خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے۔ کر کا حال ایسا اچھوتا اور نادر سٹرٹیجیکٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا؟ مگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کے لیے مخصوص تھوڑے ہی تھا جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم ہر رسم کے بڑے بڑے بین و قباب سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ کر دیتے۔ (مقالات ماجد)

اکبر کے یہاں ہر قسم کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اوّل وہ ظرافت جو ہر زمانہ اور ہر دور میں قائم رہنے والی ہے۔ دوسری وہ جو ہنگامی واقعات اور زندگی کے تقاضوں سے متعلق ہے تیسری وہ جو محض تفریحی ہے اور جس سے ہر طبقہ کے افراد محظوظ ہو سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اگرچہ بذلہ سنجی کا عنصر زیادہ ہے مگر اس کو زیادہ تر طنز یا مزاح کی تخلیق میں حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بیشتر حصہ کلام کا وہ ہے جس میں اسلوب خیال اور مواد پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ رعایت لفظی، محاورہ بندی، ترکیب کی ندرت، قافیہ کی جدت، انداز بیانی اضافتی آمیزش اور دوسروں کے اشعار میں تحریف و تصرف سے طنز کا بھرپور وار کرنے میں خاصی مدد لی گئی ہے۔

علامہ یوسف علی کے خیال میں اکبر نے مغربی تہذیب کے خلاف پر زور الفاظ میں مشرق کی آواز تو بلند کی، مذہب کے زوال پر دلی رنج کا اظہار بھی کیا۔ ریاکاری اور بے ہودگی کے خلاف اپنے جذبات منظر عام پر لانے کی کوشش بھی کی لیکن تمدنی ابتری کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ حالانکہ اکبر سرکاری ملازمت کی جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان سے یہ توقع رکھنا ہی عبث ہے کہ وہ کھل کر کوئی بات کہتے یا اصلاحی لائحہ عمل پیش کرتے پھر بھی انھوں نے طنز و مزاح کے پردے میں ان رجحانات کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا جو ان کی دانست میں قابل مذمت تھے اس طرح ان کی پوشیدہ طنز نے جس میں روح افزا گداز ہے مغربی تہذیب کے سیلاب کی تندی اور تیزی کو روک کر اس

میں وسیع پیمانہ پر ملی اور ادبی، تمدنی اور مذہبی روایات کو یکسر فنا ہونے سے بچا لیا۔
اکبر کی کلیات سے طنز و ظرافت کے چند نمونے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:۔

صدی سوڈانی کے جہاد کے بعد مصر کو انگریزوں کے پنجے چھڑانے کی خاطر عالم پاشا نے مصر میں جہاد کا اعلان کیا۔ ہندوستان کا سرحدوں پر بھی جہاد کے فتوے شائع ہوئے۔ یورپ کے سیاست دانوں نے جہاد کو ہوا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا وہ طبقہ جو سرکار پرست اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھا جہاد کے بارے میں عجیب و غریب توجیہات کرتا تھا جن میں سے اکثر لغو ہوتی تھیں اکبر نے برق طبسا والی نظم لکھ کر اس پر بڑی کامیاب طنز کی ہے:۔

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار — ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید — قد رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں — گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے — دل کش آواز کہ سن کر جسے بلبل چہکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں — سرکشی ناز میں ایسی کہ کورز جھک جائیں
آتش حسن سے تقوے کو جلانے والی — بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی
پہلو نے حسن بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق — ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی — سر بھتے تمکین کے جس گت میں وہ گت بج رہی
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا — یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار — دولت و عزت و ایماں تیرے قدموں پہ نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے — ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی — ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — جھکے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے ٹکراتے ہیں

گل کھلانے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

دشمن صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دل زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لوح جہاں راحت روح
اب زمانہ پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح

شجر طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالد جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہر تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفوۂ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
وہ دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیر مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم
تو نکالو دل نازک سے یہ شبہ اور یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبسٹر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سُناؤں تجھ کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر ایم اے کرے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت ہیں بن جائیں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہر چرن داس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

۱۸۹۵ء

عدو کی شست سے بچتے نہیں ہیں — یہ کالے ہیں مگر کوّے نہیں ہیں

اب تو پھیپھس کر دیا اور چل دئے گو دام کو — جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں

اب بی اے کی طلب تفسیر کا کس کو خیال — فکرِ روزی ہو رہی ہے فخرِ رازی اب کہاں

رئیس لیڈروں پر طنز

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے — محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

نہ سرگرمی پولس کی ہے نہ جاری مارشل لا ہے
کوئی شورش نہیں ہے ہر طرح سے خیر سلا ہے

بہ کلکتہ کی شوخی اور ڈھاکہ کی ادا سنجی
وہ اک فرشی کبڈی ہے یہ افغانی گیند بلا ہے

سید سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جا بجا ترے حال تباہ کا

سمجھا ہے تو نے جبر و تقدیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا

ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا

شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حسبِ جاہ کا

اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر
کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا

یورپ کا پیش آوے اگر آپ کو سفر
گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا

وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی
وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا

آوے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی
جس سے خجل ہو نورِ رخِ مہر و ماہ کا

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کی چاہ کا

نوخیز و دلفریب گل اندام نازنیں
عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا

رکھئے اگر تو ہنس کے کہے اک بتِ حسیں
ویل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا

اس وقت قبلہ بھک کے کروں آپ کو سلام
پھر نام بھی حضور جو لیں خلفاء کا

پتلون و کوٹ و بنلہ و بسکٹ کی دھن بندھے
سودا جناب کو بھی ہو ترکی کلاہ کا

ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے کہتے ہیں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

۱۹۷۷ء

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی — شاید ترے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

مسلمانوں نے خود ہی مقاماتِ مقدسہ فتح کرا کے ترکی کو تباہ کیا۔ پھر وندے کرو لایت پہنچے۔ اس پر اکبر نے یہ طنز کی ؎

بھائی کی ٹانگ توڑتے ہیں — غیروں کے ہاتھ جوڑتے ہیں

تعلیم کی خرابی کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اس کا سب سے زیادہ اثر ذکور سے زیادہ اناث پر پڑتا ہے ؎

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہیں وہ لیڈی اور ناچنے کو ریڈی

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے فقطے کو شیعہ سُنّی — بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی

بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انھیں فرنگی کے پاس پہنچے — وہ بولا بس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو وہ بھی نیٹو

فنا نے آخر یہ سن کے سب کی کہا کہ تم سب ہو سخت غفلت — سمجھ لو اس کو کہ تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی — اونٹ پہ چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

شیخ کہتے ہیں کہ پیروں کی پرستش بھی ہے فرض — ماسٹر کہتے ہیں اللہ کو بھی یاد نہ کر

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں — اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو چھوڑ دے — کھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو کہ نہ ہو

ممبری سے آپ پر تو وائرنس ہو جائے گی — قوم کی حالت میں اس سے کچھ جلا ہو یا نہ ہو

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا — جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

پردے کا کیا ہے خود اڑنگا پیدا — خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا

کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے — نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

کہا یہ فخر سے واعظ نے دیکھو سادگی میری
نہیں شوقِ نمایش کچھ پہنتا ہوں گزی گاڑھا
کہا اکبر نے میں بھی یونہی کر لیتا نمود اپنی
عطا کرتا خدا مجھ کو جو یہ تن توش یہ داڑھا

ایسا شوق نہ کرنا اکبر
گورے کو نہ بنانا سالا
بھیا رنگ یہی ہے اچھا
ہم بھی کالے یار بھی کالا

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل
وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہدیا میں نے کہ ہے یہ صاف بات
دیکھ لو تم زن پہ زر غالب ہوا

پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ یہ
دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

پکا لیں بیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پخ
اور شیخ کے گھر میں پنچکانے کی ہے پخ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجئے
گو اُس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے پخ

تہمد پہ ہے شہد و حقارت کی نظر
پتلون پہ غصہ و شرارت کی نظر
بہتر ہے یہی کہ ننگے پھرئے اکبر
شاید پڑ جائے اُن کی رغبت کی نظر

جوش چکے مری غزلیں تو بولے لاچندہ
جو سہنا یا ہے اتنا تو تھوڑی لید بھی کر

اٹھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز
بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

آپ کی فرقت میں کل میں رات بھر سویا نہیں
لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اوجالے پہ چوکتا بھی نہیں

چپکوں دنیا سے کس طرح میں
عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں
قومی چندے کدھر سمائیں
کالج نے کہا کہ تو مد ہوں میں

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

حال دنیا سے بیخبر ہیں آپ
گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہ زمزم کے آپ بینڈک ہیں
شیخ جی کو جو آگیا غصہ
گلے کہنے یہ پھینک کر دھا
ہے تمہاری نمود بس اتنی
جس طرح ہو پڑی پہ پڑ پہ لید

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں
اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بخوف
لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو اتریں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا مسخ گوٹی کر دیا پتلون کو

اضافہ ہوئی مجھ سے گندم پہ مے ——— یہ پوتے سے بھی اک خطا ہو گئی
یہ تھی قیمتِ رزق تیرے جو دانت ——— غرض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

رہا کرتا ہے مرغِ فہم شاکی ——— نئی تہذیب کے انڈے میں خاکی
چھری سے اُن کی کٹوا کر فلک نے ——— خدا جانے ہماری ناک کیا کی
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے ——— کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

سوال اب یہ عبث ہے جب سے پتلونوں کی ارزانی ——— چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کچھ یوں ہیں ہے پرسش گر بچوں کی ——— سڑک پہ مانگتے گلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم و دین و تقویٰ کی ——— خوبی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

شیخ صاحب دیکھ کر اُس مس کو ساکت ہو گئے ——— ماسٹر صاحب بہت کاہ در بھتے چیت ہو گئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا ——— آپ بی۔ اے پاس ہیں تو بندہ و بی بی پاس ہے

کہتے ہیں حرج کیا ہے جو بار یک ہے وہ پل ——— بائیسکل پہ گزریں گے ہم پل صراط سے

ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دوست ——— داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

کچھ شک نہیں کہ حضرتِ واعظ ہیں خوب شخص ——— یہ اور بات ہے کہ ذرا بے وقوف ہیں

اُردو کے تین رُبع کے مالک ہندو ہیں ——— پھر کیا سبب جو اُس سے اُنھیں انحراف ہیں
یعنی اُردو ہے چیز انھیں کے مذاق کی ——— اُردو کے تین جزو یہی صاف صاف ہیں

شاہدانِ مغربی کرتے نہیں مجھ کو قبول
ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر آپ کالا لوگ ہیں

واسطہ کم ہو گیا اسلام کے قانون سے
دب گئی آخر مسلمانی مری پتلون سے

اب کہاں تک بتکدے میں صرف ایماں کیجئے
تا کجا عشقِ بتانِ سست پیماں کیجئے
ہے یہی بہتر علیگڈھ جا کے سیدے کہیں
تم سے چندہ لیجئے ہم کو مسلماں کیجئے

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیمِ نسواں سے
بجز اس کے کہ بابا اور بھی گھبرائیں ماں سے

ان کو کیا کام ہے موت سے
اپنے رخ سے یہ مکھ نہ موڑیں گے
جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر نبض کو نہ چھوڑیں گے

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے
شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

دم بکا کے بوسہ لوں گا رخ رشک ماہ کا
چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

پردہ و کی رانے سن کر بیبیاں کہنے لگیں
اب ہمارے وارث ایسے ہی نکوڑے رہ گئے

جو وقتِ ختنہ میں چیخا تو نائی نے کہا ہنس کر
مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی۔اے ہو گئے

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علی گڈھ کے حوالے

قصۂ منصور سنکر بول اٹھی وہ شوخ مس
کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

نکالا شیخ کو مجلس سے اس نے یہ کہہ کر — یہ بے وقوف ہے مرنے کا ذکر کرتا ہے

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے لیلیٰ — کس کو سونپیں تجھے اللہ نگہبان ترا ہے

میرے لیے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام — اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں — پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

فتنہ قائم ہے مگر وہ مذہبی تعلیم گم — مہر ابراہیم باقی دین ابراہیم گم

میری گردن پہ ہیں شیطان کے احسان بہت — ترک لاحول پہ مجبور ہوا جاتا ہوں

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ — گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے — کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور — کہ ترکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہ دل سے ہم کوستے ہیں مگر — کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

کریما بہ بخشائے برحال بندہ — کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

عمر گزری ہے اسی بزم کی طرازی میں — دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

اذانوں سے سوا بیدار کون انجن کی سیٹی ہے — اسی سے شیخ بیچارے نے پہچانی اپنی پیٹی ہے

گل پھینکے ہیں یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے بحرِ وسائس بھلا کچھ تو ادھر بھی

وہ تو گرجا پر رُکا اور یہ گیا کعبہ کو پھاند
شیخ کا ٹٹو تو انجن سے بھی بڑھ کر تیز ہے

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

کچھ الہ آباد میں سامان نہیں بہبود کے
یہاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

کاش کرلے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور
کیک تو روز ہے اک رات تو بھنجن بھی سہی

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوج سے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ریشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ میزاست ولپیٹ

ہوا آج حسنِ خارج جو میرا سوال
کہا میں نے صاحب سے با صد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ
وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ

یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی
مگر اس قصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہلِ یورپ میں بھی ذکر ہے
تو بیشک جہنم بھی ہے کوئی شے

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں — مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشہ کو کیا کریں
فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر — کہنے لگا بتائیے تیشے کو کیا کریں

شراب اڑتی ہے مجلس میں رواں ہے خون تقوے کا — مزا ہے اب تو رندوں کو نہ مفتی ہیں نہ قاضی ہیں

نام اللہ و رسول اب تو میں کم سنتا ہوں — پہلے رائج تھے یہ الفاظ مسلمانوں میں

یاد کرتا ہے گزشتہ بااثر لاحول کو — شیخ کو طعنے دیا کرتا ہے شیطان ان دنوں

مجال کیا کوئی کہہ دے خوشامدی مجھ کو — اسی سبب سے بہت سہل ہے جناب کی مدح

لاکھ روئے کورہے جاتے ہیں اللہ و رسول — دیر کا کورس برہمن نے مگر کم نہ کیا

اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا — خدا کا کام ہے لطف و کرم کرنا شفا دینا

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اس کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

غریب اکبر نے بہت پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا — نقاب الٹ ہی دی اس نے یہ کہکے کہ ہی لے گا مرا موا کیا

مولوی ہو ہی چکے تھے نذر کالج اس سے قبل — مُنّا فقا ہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں — لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور — بچے دہن خوشی سے خود اپنی برات میں

چرخ نے پیش گیشن کہدیا اظہار میں — قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ — اب بھاگنا ضرور ہوا خور کیا کریں

مفتی شرع نہ ہوں لیڈر اسلام تو ہیں — بوسے مسجد نہ سہی کپ کے گلفام تو ہیں

اس شرط پر ہم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی — قبریں ملیں وہ کرے تزئین اُن کی ہم کریں

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں — ینگ بدھو وارث اسلام ہیں

میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا — نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہے تو مانوں

جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں — مارچ میں بلبل ہوں تو جولائی میں پروانہ ہوں

قاعدوں میں حسن معنی گم کرو — شعر میں کہتا ہوں مجھے تم کرو

خوب لڑوایا ہم دل کھول کر — مار ڈالا رادیوں نے قوم کو

---

۱۵ | جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر — ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

وہ دل کو محو کلیسا بنا کے چھوڑیں گے — اس اونٹ کو خر عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے
کریں گے شوق سے مسلم غذا میں مے داخل — شراب کو بھی ہر یسا بنا کے چھوڑیں گے

کمیٹی میں چندا دیا کیجیے — ترقی کے ہتھے کیا کیجیے

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے — صرف تعویذ اور گنڈا ہے
کیا ہے باقی جناب قبلہ میں — کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے — پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

تہذیبِ نو کا بجز ہے ملمع کی گھسیٹ سے
حضرت بھی کام لینے لگے مار پیٹ سے

نجد کے نغمے کہاں ان ٹھمریوں کے سامنے
دیس کو جس نے بھلایا یہ وہی کھماج ہے

سیٹھ جی کو فکر تھی ایک اک کے دس دس کیجئے
موت آ پہونچی کہ حضرت جان واپس کیجئے

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جان
خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی
نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

یہ مصرع قافیے ہی کے لیے ہے خوب اے اکبر
جو اُجڑا لکھنؤ کچھ تم نہیں پیرس تو باقی ہے

ان کو بسکٹ کے لئے سوجی کی تھیلی مل گئی
کیمپ میں غل مچ گیا مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

شکم سے حضرتِ انساں نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

تھے معزز شخص لیکن انکی لائف کیا کہوں
گفتنی درج گزٹ باقی ہے سب ناگفتنی

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی
اب تک میں بچا تھا آج پی لی

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مریدا آوارہ ہیں
بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں اُن کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر "استاد جی" نہ ہوں

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے
مسجد سے ہم نکل گئے گیہوں کی چاٹ میں

دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب دیکھ کر — بھوکا کڑھ رہے ہیں صاحب نے یہ کیا ہے

بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں — کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

قوم پر ممبری کا فیصلہ ہوا — کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا
شیخ جی مر گئے کمیٹی میں — غل مچا نائمہ نجیب ہوا

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا — اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ نیچر — جغرافیہ میں عرش کا نقشا نہیں ملا

خدا کی راہ میں اب ریل چل گئی اک دن — جو جان دینا ہو انجن سے کٹ مرو اک دن

وصل کا اُس بت خود بیں سے کوئی ہنٹ لایا — صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

رسماً تو ایک بوسہ ہے کافی دمِ وداع — لیکن مزا جو آئے تو دو تین کیوں نہ لیں

شیطان نے ترکیبِ تنزل یہ نکالی — ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

کافی ہیں آپ دوں کو قوانین گورنمنٹ — مذہب کی ضرورت تو غریبوں کے لئے ہے

دل میں اب نورِ خدا کے دن گئے — ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

دلیری سکھاتی ہیں ہم کو یہ کہہ کر — جہنم سے ڈرنا بڑی بزدلی ہے

برگڈ کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے — مغرب کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو — جب توپ مقابل ہو تو تلوار نکالو

ضبطی پرچہ تو حید ہوئی فیر یہ ہے — قل ہو اللہ احد ضبط نہیں خیبر یہ ہے

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی — آسماں اب پھٹا ہتا ہے مولوی کش مولوی

جج کو کیونکر پائیں کارستانگی کو چھوڑ کر — اتنی کثرت ہو جو چوہوں کی تو بلی کیا کرے

شیخ جی کے دو نو بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب — فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

باپو ہمیں نکل گئے اس عہد میں تو خیر — رہنا پڑا ہے نیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا — کہ وہ جامہ سے باہر ہے یہ پاجامہ سے باہر ہے

تعلیم اس کی اچھی جو گھر میں اپنے خوش ہو — مذہب اسی کا بہتر جس کو پولس نہ پکڑے

ملاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے — جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چھپکے

حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا — شکر کر روٹی تو گیہوں کی رہی

نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور چھرمٹ ہے

وہاں سینے میں قرآں تھا یہاں سینے میں بکٹ ہے

شبلی

مولانا شبلی مئی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے جو حنفی عقیدہ کے پابند تھے۔ اسی مناسبت سے ان کے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی نے ان کا نام نعمانی رکھ دیا۔ انھوں نے اپنے دور کے تمام رائج طریقوں سے علما اور فضلا سے تعلیم حاصل کی جن میں مولانا فاروق چریا کوٹی مولانا فیض محسن سہارنپوری اور مولانا احمد علی محدث سے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹ سال کی عمر میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ سفر حج کیا۔ واپسی پر ۱۸۷۶ء سے ۱۸۹۸ء تک اعظم گڑھ کے اطراف میں رہتے جہاں وکالت کا امتحان دیا۔ ملازمت بھی کی اور تجارت و زمینداری کا کام بھی کیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اپنے علمی اور ادبی مشاغل کو برابر جاری رکھا۔ کافی عرصہ سرسید احمد خاں کی صحبت میں رہے۔ علم و ادب کا شوق انھیں ہندوستان سے باہر بھی لے گیا۔ چنانچہ الفاروق کی تصنیف کے سلسلے میں انھوں نے مصر، شام اور ٹرکی کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ بڑی مشکل الآرا کتابیں لکھیں جن پر شعر العجم، المامون، الغزالی، موازنہ انیس و دبیر، علم الکلام اور سیرت النبی بڑی اہمیت کی مالک ہیں۔ جنوری ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا شبلی علم و فضل کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ اگرچہ مولوی تھے لیکن خشک ملا نہ تھے۔ اپنے منصب اور پیش نماز امامی کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہمیشہ سنجیدہ، متین اور وضعدار رہتے تھے لیکن ان کی سنجیدگی کسی مفلس کی سنجیدگی نہ تھی۔ وہ خود ہنس سکتے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے۔ دونوں سے بے تکلف تھے۔ ان میں مذاق بھی تھا اور جرأت رندانہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فطری شوخ طبعی اور شگفتہ مزاجی رنگ لائے بغیر نہ رہتی تھی۔ چنانچہ اس کی کچھ کچھ جھلکیاں ان کے مکاتیب میں مل جاتی ہیں ــــ "شبلی کے خطوط میں قومی شعور کے گہرے سائے ادبی دلچسپیاں، کتابوں پر تبصرے، کشمیر کی خاطر، جذبات کی برانگیختگی، عورتوں کا حسن، موسیقی اور مصوری کہ نہیں ہے؟ غرض ان کے ہاتھوں میں جا کر بھلا بن جاتی ہے۔ ان کے خطوط میں ہوا ہے جنھیں ہیں لطیف اشارے ہیں۔ کہیں پرسے گرتے ہیں اور کہیں اُٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں" (تنقیدیں از ڈاکٹر خورشید الاسلام صفحہ ۲۳)

مولانا شبلی کا دور مشرق و مغرب کی آویزش، ایشیا اور یورپ کی ٹکر، قدیم و جدید کی جنگ، علما اور انگریزی دانوں کی کشمکش، سیاسی علمبرداروں کی ابتدا اور سائنس و مذہب کے محاربات کا دور تھا۔ اس فضا نے انھیں ایک خاص نقطۂ نظر سے سوچنے اور استدلالی و فکری عینک سے صداقت کو پرکھنے کی طرف راغب کیا۔ اس بنا پر ان میں خود اعتمادی اور وثوق کا رنگ پیدا ہوا اور وہ مغربی کی خامیوں پر مدلل نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں طنز و تعریض کا عنصر بھی اُبھر آیا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "شبلی ایک زبردست مناظر کی طرح مخالف کو بے دست و پا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہیجان خیز فقروں کے ذریعے مخاطبوں کے دماغ کو سحر اور مرعوب کر لیتے ہیں اور بالآخر اچانک ایک ضرب کاری لگا کر یا بڈبول کر مخالف کو مغلوب بلکہ مفلوج کر دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے کارگر سجیدہ طنز و تعریض سے کام لیتے ہیں"۔

(نقد و نظر صفحہ ۱۵۵)

شبلی کی کامیاب طنز کے نمونے دیکھنے ہوں تو "شبلی اور حالی کی معاصرانہ چشمک" والا مضمون ملاحظہ فرمائیے جو مہدی افادی نے

لکھا ہے اور افادات مہدی میں موجود ہے۔ نظموں میں وہ ایک خاص انداز سے مسائل حاضرہ پر طنز کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظمیں زیادہ تر الہلال، زمیندار اور عبدہ میں کشاف اور دوسرے کالموں سے شائع ہوئیں اور اپنی جذباتی اپیل اور طنز یہ کیفیت کے باعث بے حد پسند کی گئیں ۔۔۔ شبلی نعمانی کی ان طنزیہ نظموں میں مزاح کے عناصر بے شک کچھ زیادہ نہیں اُبھرے۔ تاہم تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کی سعی میں انھوں نے بالعموم کامیابی حاصل کی ہے۔ یوں بھی صحافت کی دنیا میں ذہین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہنگامی واقعات پر طنز کرتے وقت ایک ایسا خاص انداز اختیار کیا جائے کہ بات ملک کے زیادہ سے زیادہ افراد پر اثر انداز ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر شاعر قادر الکلام ہے اور اس کے طنزیہ لہجے میں زہرناکی کے وہ عناصر موجود نہیں جو عمل کو تڑپا دیں تو اس کے دل اور قلم سے نکلی ہوئی بات دور دور تک اثر کرے گی۔ شبلی نعمانی کی بہت سی طنزیہ نظمیں اس قبیل کی ہیں کہ اگرچہ ان کا موضوع ہنگامی واقعات کے سوا اور کچھ نہیں تاہم ان کے پس پشت خلوص کا ایک ایسا بھرپور احساس ہے کہ وقت گزر جانے کے باوجود ان کا اثر زندہ و تابندہ ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو نمونہ تو صحافتی مزاح کی پیش کرتی ہیں لیکن جن کے ڈانڈے ادبی مزاح سے بھی جا ملتے ہیں۔" (اردو ادب میں طنز و مزاح از ڈاکٹر وزیر آغا صفحہ ۳۰۵)

قومی کی چند زندہ رہنے والی نظمیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں جن میں وہ ندوۃ العلماء کے اختلافات کو "جنگ زرگری" "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو "درس گاہ وفا کا خاں"۔ "مسلم لیگ" کو بے کار اور بے عمل جماعت اور "سینۂ ملک پر بھاری سل"، "مسلم لیگیوں کی حکام رسی اور خوشامدانہ حکمت عملی کو "قعر سجدہ ہائے سہین نماز" اور لیگ کے مطالبہ سوئٹ ایبل نکتہ ست کو فلاں کی منزل اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ کر ہدف طعن بناتے ہیں

مولویوں کا شغل تکفیر:-

ایک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ — کچھ حالت یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں — ہر چند ابھی مائل اظہار نہیں ہیں
تقلید کے پھندوں سے چھوٹے جاتے ہیں آزاد — وہ لوگ بھی جو داخل احرار نہیں ہیں
جو نام سے اسلام کے ہو جاتے ہیں برہم — ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں
افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا — یا ہیں تو بقول آپ کے دیندار نہیں ہیں
کیا آپ کے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد — کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں؟
جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوء ادب ہے — کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں تھے

مولانا شبلی کانگریس کے حامی ہونے کی وجہ سے سرسید کے سیاسی مسلک کو پسند نہ کرتے تھے۔ مسلم لیگ چونکہ علی گڑھ والوں ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آئی تھی۔ اس لئے وہ اس کے مخالف تھے۔ لیگ کے ابتدائی اجلاسوں میں چند قرار دادیں منظور کی جاتی تھیں جن میں لجاجت اور التجاؤں کا زور ہوتا تھا اس واسطے اس کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔

پونا میں لیگ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ لیکن کوئی موزوں صدر دستیاب نہ ہوتا تھا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد رائٹ آنریبل سید امیر علی کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ صدارت قبول کریں۔ لیکن عین وقت پر وہ بھی تشریف نہ لائے۔ مولانا شبلی کو طنز کا اچھا خاصا موقع ہاتھ آگیا اور انھوں نے ذیل کی نظم کہی ؎

اغماض چلتے وقت مروّت سے دُور تھا — اس وقت پاس آپ کا ہونا ضرور تھا
ہر چند لیگ کا نفسِ واپسیں ہے اب — اس ہستی دو روزہ پہ جس کو غرور تھا
وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ ہی — ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چُور تھا
وہ دن گئے کہ تبکدہ کو کہتے تھے حرم — وہ دن گئے کہ خاک کو دعویٰ نور تھا
وہ دن گئے کہ شارعِ اوّل کا حرف حرف — ہم پایۂ کلام سخنگوئے طور تھا
وہ دن گئے کہ فتنۂ آخر زماں کے بعد — گویا کہ اب امامِ زماں کا ظہور تھا
اب معترف ہیں دیدہ وران قدیم بھی — اس نقشِ سیمیا میں نظر کا قصور تھا
اس دستِ مرتعش میں نہ تھی قوتِ عمل — اک کاسۂ تہی پہ سرِ پُرغرور تھا
یہ لمعۂ سراب نہ تھا چشمۂ بقا — یہ تیر کی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا
آئینِ ہند کی میں تملق کی شان تھی — اخلاق و صدق شائبۂ مکر و زور تھا
ان کی دکان کی وہ ہوا اب اکھڑ چلی — جن کے گھروں میں جنسِ وفا کا وفور تھا
اب یہ کھُلا کہ واقفِ سر تھا اسی قدر — جو جس قدر مقامِ تقرب سے دور تھا
ہر دم برادرانِ وطن کی بُرائیاں — ظاہر ہوا کہ فتنۂ ارباب زور تھا
سب مٹ گیا سیاست سی سالہ کا طلسم — اک ٹھیس سی لگی تھی کہ شیشہ یہ چور تھا

لے دے کے رہ گیا تھا سہارا بس آپ کا — یہ جسم مُردہ منتظر نفخ صور تھا
امید تھی کہ اب کے بدل جائیں گے اصول — مٹ جائے گا نظام میں جو کچھ فتور تھا
ہو گی کچھ اب نظامِ حکومت پہ گفتگو — بس دن کا منتظر کہ ہر اک باشعور تھا
دیں گے براہ دانِ وطن کو پیامِ صلح — آویزشِ عبث سے ہر اک دل نفور تھا
یہ کیا ہوا کہ آپ نے بھی بے رخی سی کی — کیا آپ کو بھی رازِ نہاں پر عبور تھا
یا یہ سبب ہوا کہ پراگندہ تھا مزاج — از بسکہ "آستانہ" میں شورِ نشور تھا

ممکن ہے اور بھی ہوں کچھ اسبابِ ناگزیر
یہ سب سہی پہ آپ کو آنا ضرور تھا

اس نظم میں طنز اتنی شدید اور تبرز ہے کہ ایک بار تو بڑے سے بڑے مخالف کے پاؤں بھی اکھڑ جاتے ہیں ؎

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم — برہم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن
میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن؟
کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن

خیر میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں وہ ہوں — آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن
آپ نے شملہ میں جا کے کی تھی جو کچھ گفتگو — ماحصل اس کا فقط یہ تھا پس از تمہیدِ فن
سعیِ بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق — اُس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہرِ پنجتن
یعنی جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار — لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی سرکارِ زمن

لیکن اب تو آپ کی بھی کھلتی جاتی ہے زباں — آپ بھی اب تو اڑاتے ہیں وہی طرزِ سخن
اب تو مسلم لیگ کو بھی خواب آتے ہیں نظر — اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن

ملک پر اپنی حکومت چاہتے ہیں آپ بھی
تھا یہی تو منتہائے فکر یارانِ وطن

آپ نے بھی اب تو نصب العین کھا ہے وہی
کانگرس کا ابتدا سے ہے جو موضوعِ سخن

آپ بھی تو جادۂ دستور سے اب ہیں منحرف
اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی ہے شکن

جب یہ حالت ہے تو پھر ہم پر ہے کیوں چشم عتاب
منکرِ بودن و ہرزہ مستاں زیستن

خطاب بہ احرار

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا
قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد

لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر
ٹوٹ جائے گا طلسمِ اثرِ استبداد

ہاں مگر ایک گزارش بھی ہے یہ قابلِ غور
یہ تو فرمایئے اس باب میں کیا ہے ارشاد

بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن
شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد

آیہ قابلِ نشتر تھا یہ مانا لیکن
دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد

آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا
خیر جو کچھ تھا مگر جمع تو تھے کچھ آزاد

اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توجیہِ خیال
نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشہ و زاد

خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد

ذرّے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا
یوں ہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد

نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا
یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیشِ نہاد

بھاپ پُر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہوگا فصّاد

سرسید کی سیاسی روش پر چوٹ ؎

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سیدِ مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں مگر یہ ہے کہ تحریکِ سیاسی کے خلاف
ان کی جو بات تھی آور دتھی آمد تو نہ تھی

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کرتب کی؟
یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بنا ڈالی ہے

ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی
"حال" بھی آئے گا اتنک تو یہ قوالی ہے

کثرتِ تعداد کے باوجود ہندوستانیوں کی بے دست و پائی پر دیکھئے کس خوبصورتی سے چوٹ کی ہے کہ اس نظم کا ایک مصرع ضرب المثل بن گیا ہے ؎

اک روز جرمنوں نے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اُس پر یہ لطف ہے کہ وہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل
آئیں شناس شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٰ غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیز اندک و بسیار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اسلاف کے لب و لہجہ پر طنز کرتے ہوئے "جزر و مد" کے عنوان سے جو نظم مولانا نے لکھی تھی اس کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید
سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟

رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ اندازِ کلام
اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟

اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر
اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟

نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئینِ سخن
بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہے کہ نہیں؟

جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ
کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں

شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط
اس میں اُن پر بھی کہیں تو کوئی زد ہے کہ نہیں

پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری
اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں

فیصلہ کرنے سے پہلے ہیں ذرا دیکھ تو لوں
"جزر" جیسا تھا اسی زور کا "مد" ہے کہ نہیں

لائل مسلم ایسوسی ایشن

جنگِ بلقان کے زمانہ میں جبکہ ہر طرف طرابلس و ٹرکی کے مسلمان بھائیوں سے اظہارِ ہمدردی ہو رہا تھا اور مسلمانوں کی دشمن طاقتوں کے خلاف غیظ و غضب کا دریا موجزن تھا بمبئی میں ایک لائل مسلم ایسوسی ایشن قائم کی گئی جو انگریزوں کی وفاداری کا راگ الاپتی تھی۔ اس انجمن کے ارکان و شرکا کی تعداد تو ۲ تھی لیکن انگریزی اخبارات "ٹائمز" بابیز انگلشمین وغیرہ اس کی کارروائیوں، عہدیداروں اور تجویزوں کو بڑی آب و تاب سے نمک مرچ لگا کر شائع کرتے تھے جس اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا شبلی بمبئی تشریف لے گئے اور اس ایسوسی ایشن کا چرچا سن کر ذیل کی نظم لکھی جو سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور عوام کے قہقہہ نے لائل مسلم ایسوسی ایشن کا خاتمہ کر دیا ؎

ایک دن تھا کہ وفاداریِ مسلم کی متاع
ہر جگہ عام تھی اور نرخ میں ارزانی بھی

یک بیک ہو گئی ہنگامۂ بلقان میں گم
قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی

ہاتھ لگنے کا تو کیا ذکر پتہ تک نہ ملا
ڈھونڈھنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی

ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے شانِ وکن
کہ ترے تاج میں ہے طرۂ سلطانی بھی

تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا
جس کا مشتاق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی

یہ الگ بات ہے اوروں کو وہ آئے نہ نظر
گو اسی زمرہ میں ہے شبلیِ نعمانی بھی

انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں مشرکِ سجدہ کرتے ہوئے کانپور کی ایک مسجد کا کچھ حصہ مسمار کر دیا تھا جس پر بڑا ہنگامہ ہوا، گولی چلی اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ مولانا نے اس موقعہ پر کئی پرجوش نظمیں لکھیں جو ضبط ہو گئیں۔ شہید ہونے والوں میں چند معصوم بچے بھی تھے۔ جن کے متعلق حکومت کے کارندے عجیب عجیب توجیہیں کرتے تھے۔ مولانا نے اس پر تعریفیں کرتے ہوئے جو نظم لکھی اس کا یہ شعر آج تک لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے ؎

عجب کیا ہے جو خونخواروں نے سب سے پہلے جانیں لیں ۔۔۔ یہ بچے ہیں انھیں تو جلد سو جانے کی عادت ہے

حکومت نے اس آگ کو بجھانے کے لئے بعض علماء سے اپنے حق میں فتوے حاصل کئے جنھوں نے کہا کہ جو حصہ گرایا گیا ہے وہ دراصل مسجد ہے۔ اسے مسجد کہنا غلطی ہے۔ علماء کے اس اختلاف پر مولانا نے تجزیہ و تعبیر کے عنوان سے اس طرح چوٹ کی ؎

ہمیں جس چیز نے کھویا وہ تفریق و تجزی تھی ۔۔۔ یہی وہ شے ہے جو بربادیٔ مسلم کے درپے ہے

مگر اب تو در و دیوار تک اس کا اثر پہنچا ۔۔۔ وضو خانہ الگ اک چیز ہے مسجد الگ شے ہے

مولانا بعض اوقات خوش طبعی کا ثبوت بھی دیتے تھے چنانچہ ۱۹۳۵ء میں وہ کسی کام سے الہ آباد گئے۔ اس وقت ان کی ٹانگ اپنی ہی بندوق سے زخمی ہو چکی تھی۔ اکبر الہ آبادی نے انھیں کھانے کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خاص رنگ میں لکھا ؎

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی ۔۔۔ بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی

تکلیف فرماؤ آج کی رات ۔۔۔ کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

حاضر ہو جو کچھ دال دلیا ۔۔۔ سمجھو اس کو پلاؤ قلیا

مولانا نے معذرت کرتے ہوئے جواب میں یہ دلچسپ پیرایہ اختیار کیا ؎

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال ۔۔۔ لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں ۔۔۔ حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا ۔۔۔ اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ

جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

مولانا حالی

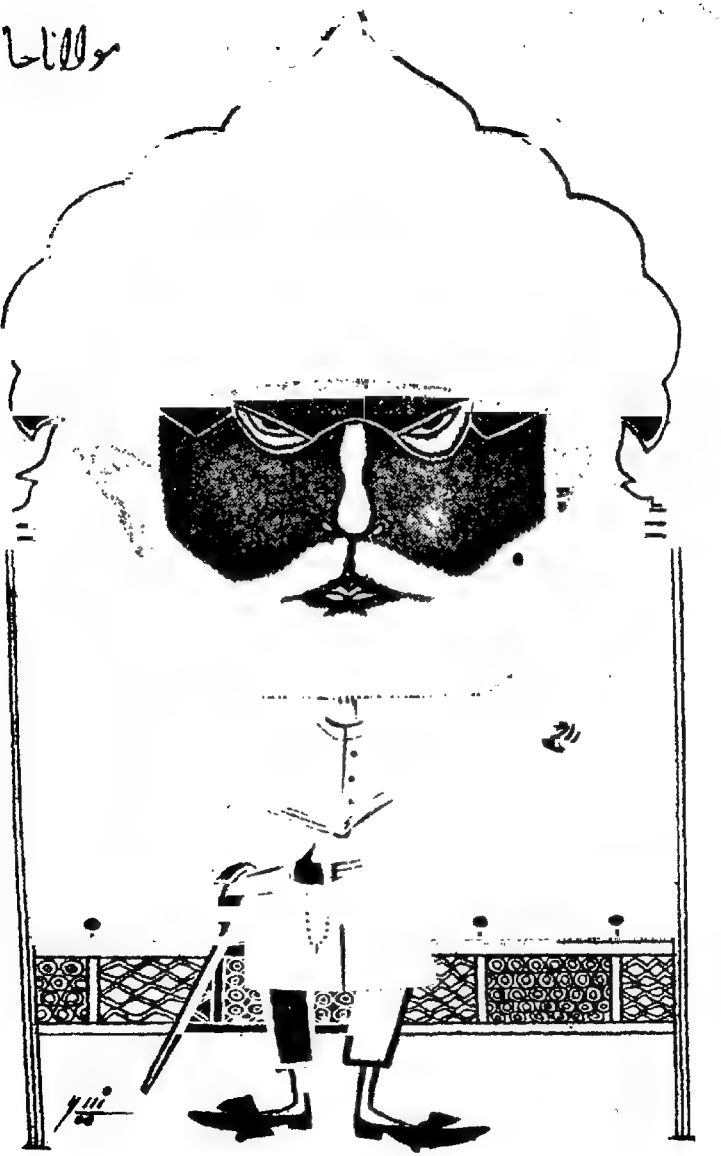

بعض غزلوں کے یہ شعر بھی دیکھئے جن میں کسی قدر شوخی ہے ؎

خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا — لحد تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی — یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

تین دن کے لئے ترک مے و ساقی کر لوں — واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال — ورنہ حاسد تیری خاطر سے یہ بھی کر لوں
اے نکیرین قیامت ہی پہ رکھو پرسش — میں ذرا عمر گذشتہ کی تلافی کر لوں
دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے وگرنہ شبلی — خوب گذرے فلک دوں سے جو یاری کر لوں

اہل ثروت سے یہ کہدو کہ مبارک ہو تمہیں — للہ الحمد ابھی ملک میں ہیں رائے فروش

احرار کا طریق عمل ہے اگر یہی — پھر کامیابیوں کا بہت انتظار ہے

اسی قسم کے اشعار کی بنا پر جو مولانا نے ایک خاص وقت مخصوص سیاست اور موضوع پر لکھے ان کو طنز نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا اصل میدان یہ نہیں تھا۔ اس رنگ کو بعد میں مولانا ظفر علی خاں نے زیادہ گہرا کیا۔

حالی

مولانا الطاف حسین حالی انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے اور خواجہ ایزد بخش کے فرزند تھے۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع تھا کہ نو سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ علم و ادب کا شوق فطری تھا۔ ۱۸۵۲ء میں گھر بار چھوڑ دہلی چلے گئے اور مولانا نوازش علی سے تعلیم حاصل کی۔ غدر کے ہنگامے کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ شاعری میں اگرچہ غالب کے شاگرد رہے مگر امیر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میں رہنے کا اچھا موقع ملا جس سے ان کے علمی و ادبی ذوق کو اور بھی جلا ہوئی۔ ملازمت کے سلسلہ میں دلی کے علاوہ لاہور میں بھی رہے مگر یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے ؎

رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو اس دنیا سے رحلت فرمائی اور پانی پت میں درگاہ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے احاطہ میں جگہ پائی۔

حالی مصنف بھی تھے، نقاد بھی اور شاعر بھی۔ انھوں نے سرسید کی فرمائش پر مسدس حالی (مد و جزر اسلام) لکھی جو ان کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیاتِ جاوید کے علاوہ ان کے مقدمۂ شعر و شاعری کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا کی طبیعت میں سادگی، خلوص اور شرافت تھی۔ وہ بڑے پاکباز اور نیک دل انسان تھے۔ ان کی ہر بات میں یہی نیکی، خلوص اور دردمندی پائی جاتی ہے۔

حالی کا کلام بظاہر تصنع سے خالی ہے۔ غدر ان کے لئے ایک ایسا نفسیاتی سانحہ تھا جس نے ان کی سادہ زندگی کو خوشی سے محروم کر دیا۔ ان کے لبوں پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ دکھیں جاتی ہے لیکن اس مسکراہٹ میں صرف افسردگی ہی نہیں ملتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ پر طنز کر رہے ہیں یا اندرونی خلش اور دل کی تپش ہے جو مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر شعور رشید الاسلام "حالی کے کارنامے خون جگر ہیں لیکن ان میں جگر کی رنگینی اور خون کی گرمی نام کو نہیں۔" (تنقیدیں صفحہ ۱۰۲)

اس کے باوجود "طنز و ظرافت میں انھوں نے کمال دکھایا ہے، مگر ظرافت کو مسخرہ پن، ہزل یا فواحشات کی حد تک نہیں جانے دیا۔ بلکہ بدیہہ گوئی، اور بذلہ سنجی تک محدود رکھا، یگانہ ظرافت کی تصویر کھینچ کر دکھا دی اور اس متانت کی وہ صورت بنا دی جس پر سے عمدہ اداروں شوخیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ جہاں تک طور کیا جائے مزاح اور خوش دلی کے پیرایہ تبسم کی بے تعداد تصویریں نظر کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ ظرافت سے حقیقی مقصود ظرافت حاصل ہوتا ہے۔ بعض جگہ عبرت کو اس انداز سے ظرافت کا جامہ پوش کیا ہے کہ دیکھنے والا اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اس کے آنسو بھی ساتھ ہی نکل آتے ہیں۔

وہ لوگ کثرت سے ہیں گے جن کے یہاں صرف الفاظ کے رنگ و روغن سے ظرافت کے مجسمے چمکائے جاتے ہیں اور ان کے حاصل سے سخت نفرت کی جاتی ہے۔ مولانا حالی کے یہاں وہ قالب بے جان اور مجسمہ بے روح نہیں ہیں۔ ان کی ظرافت کو گدگدیاں کیجئے یا چٹکیاں، دل و دماغ اس سے مسرور ہو جاتا ہے اور روح کیف نشاط سے مخمور۔ مگر ظاہری متانت کبھی جانے نہیں پاتی۔" (خندۂ گل صفحہ ۱۹۲-۱۹۱)

چند نمونے ملاحظہ فرمائیے ؎

ہوئی رعنائیِ جوانی کی بہار آخر حیف — طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں — جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت سے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ — سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر — نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں — لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر — کیجئے درد جدائی کی کبھی نقل دلالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل — قبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

مولانا کے طنز کی بہترین مثال "کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" والی نظم ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دو ملازم۔ ایک کالا اور گورا دوسرا — دوسرا پیدل۔ مگر پہلا سوار رہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں روانہ — کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت — کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے قے کو بہت مسلمان کی — آکے گھوڑے سے دیا سائیس نے اس کو اتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی — چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس — ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے ڈولی کی سنی جب سرگذشت — تہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض — اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے — کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند — کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار

ایک کالا پیٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

اور دیکھئے ؎

کہتے ہیں ایک امیر زادے کو — تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیر زادوں میں — لازمی ہیں وہ اس میں بھی سب تھیں

واہ وا سنتے سنتے یاروں کی ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں جبکہ تھے ساتھ سب بلیس و قریں
مشق تیر اندازی میں تھا مصروف کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا تیر آماجگہ کے کوئی قریں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تودہ پہ ہو کے جا بیٹھا لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چلا کر کوئی تجھ کو جنوں ہے اے مسکیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے ان بے پناہ تیروں کی کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھ کو پھر پھر کے شش جہت میں حضور امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ کس لئے سید سے صاف اے حضرت والا نہیں
آپ بھی نام خدا ہیں تارک صوم و صلوٰۃ اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں
چشم بد دور آپ کا بھی جبکہ ہے مشرب وسیع پھر یہ سید پر تبرا آپ کو زیبا نہیں
سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے بات یہ ہے سن لو صاحب تم سے کچھ پردا نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں بلکہ ساری کوفت اس کی ہے کہ میں ویسا نہیں

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اس کی جب یہی دیکھی گئی روش پوچھا کسی نے اس سے کہ اس کا سبب ہے کیا

بولا کہ عادت اس لئے کی ہے یہ اختیار — چھٹ جائے تاکہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
ہیلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک — آتا تھا مانگنے میں بہت بھی کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار — ہمت سے عجز سے بھی ملتا نہیں ٹکا

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا — کب تک اے نادان یہ حبِ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ — ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح — زر لٹانا راہبگاں اور اس قدر
آج ہی گویا نصیبِ دشمناں — آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

فقیہہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف — تو دی چراغ سے اس کو بہ آب و تاب مثال
کہا فقیہ، استدلار باللسان ہے ضرور — جہاں ہو آتش تصدیق و روغن اعمال
کہا کسی نے کہ نکلا ہے ان دنوں اک تیل — نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اس کے — فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطہ ملعون تھا یہی جس کی بدولت — تھا دل میں خدائی کا خیال اس کے سمایا
ہیں بھی اسے اک باغی طاغی کے علی الرغم — اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خصیب ایک غلام حبشی تھا — جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنت مصر کی باگ اس کے حوالے — نااہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
باڑی[1] گئی بہ ایک برس نیل کی رو میں — یہ حادثہ آس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون — ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اٹھایا

---

[1] کپاس کا کھیت

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ کشور — مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی حکومت
لیکن بخلاف اس کے ہے عورت کا جہاں راج — واں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاندار — قبضہ میں ہے واں عورتوں کے دولت اکنت
اور سر پر ہے عورت کے جہاں افسر شاہی — سمجھو کہ ہے اس ملک میں مردوں کی حکومت

غیبت کرنے والوں کی ہجو مولانا ایک رباعی میں اس طرح فرماتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر و ہاں — خوبی کوئی باقی نہیں ہم اُمت میں

فضول اور بے مقصد شاعری کو مولانا "تپ دق" اور خلاف تہذیب شعر کہنے والوں کو "جہنمی" سمجھتے تھے ایسے ہزلگو کی نسبت ان کا فتویٰ ہے ؎

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے میں جتنے قلی اور نفر ہیں — کمانی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گو تیے ہیں دوں کی نوکِ نظر میں — ڈنڈالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہیف فقط علم افتا ہمارا

حالی جیسے ثقہ عالم جب بزم رندان میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے جبہ و دستار کو ایک گوشہ میں رکھ کر شیخ واعظ و محتسب پر اس طرح پھبتیاں اڑاتے ہیں ؎

مان لیجئے شیخ جو دعویٰ کرے — اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیسا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

دیکھئے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو آتش دوزخ سے بہاں کو تم نے — یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

واعظو دین کا خدا حافظ — انبیا کے ہو تم اگر وارث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز — سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث
آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی — ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

شیخ اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی — بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ — قدر قلیل ہے سب مال و منال دنیا
گویا کہ حرص اس کی اس سے بھی نہیں ہے — ہے جس قدر فراہم پاس اس کے مال دنیا

اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر — سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

افسوس اہلِ دیں بھی مانندِ اہلِ دنیا — خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر — اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمھارا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجئے گا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں — پر آیا جب امتحان کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح — فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

جب تک کہ نہ ہو دشمن اخواں پکا — ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں جس سے — سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

پوچھا جو کل انجام ترقی بشر — یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انساں میں عیب — ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب نکر

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم — سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت — یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ — کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں — سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرتد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد — یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

واعظ آتا ہے تو آنے دو اسے — پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا
آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت — اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم — ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

واعظو! ہے ان کو شرمانا گناہ — جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ
چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے — بستر اکیوں اپنا چھکواتے ہیں آپ

خبر بھی ہے تمھیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر — ہیں آپ جو نسے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

وعظ میں گل کترتے ہیں واعظ — منہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض

کوئی بات ویسی نہیں تجھ میں لیکن — سنا ہے کہ ہوتے ہیں عیسا رواعظ

زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

ریاض خیرآبادی

سید ریاض احمد نام، ریاض تخلص تھا۔ ان کے اجداد کرمان شاہ (ایران) کے رہنے والے تھے۔ عزیزوں کے حملے کے وقت ان خانوادے کے بعض افراد شاہی ملازمت میں منسلک ہو کر ہندوستان آئے اور رسنا پور، بارہ بنکی اور خیرآباد وغیرہ علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ریاض ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں بمقام خیرآباد پیدا ہوئے لیکن ان کے بچپن اور جوانی کا زمانہ گورکھپور میں گزرا جہاں ان کے والد سید طفیل احمد سرکاری ملازم تھے۔ ریاض کے مشہور شعر ہیں ؎

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے ۔۔۔ بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا ۔۔۔ نصیبوں میں لکھا ہے خاکِ گورکھپور ہو جانا

ریاض مدرسہ عربیہ کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر شاعری میں پہلے اسیر کے اور اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔ زندگی کی ابتدا پولیس کی ملازمت سے کی، لیکن جلد ہی ملازمت ترک کر کے اخبار نویسی شروع کر دی۔ سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں "لمع رخشاں" کے نام سے ایک مطبع قائم کر کے "ریاض الاخبار" اپنے وطن خیرآباد سے جاری کیا اس کے بعد وہیں سے روزانہ "تار برقی" نکالا۔ ۱۸۸۹ء میں خیرآباد ہی سے شعر و سخن کا ایک ماہنامہ "گلدستہ ریاض" جاری کیا لیکن ۱۸۹۱ء میں ریاض الاخبار کو مستقل طور پر گورکھپور میں منتقل کر دیا۔ ۱۸۹۳ء میں "غنچۂ" اور "عطر غنچہ" ۱۸۹۵ء میں روزنامہ صبح کلی اور پھر گلچیں جاری کیا۔

ان اخباری ذمہ داریوں کے ساتھ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۱ء میں ریاض نے رسالوں کے دو ناولوں لوز آف فی جرم اور مس ایلن پسی کا ترجمہ (انگریزی نہ جاننے کے باوجود) "جرم محبت اور نظارہ" کے نام سے کیا۔ ایک ناول کا سلسلہ "فصہ پریز" کے عنوان سے "ریاض الاخبار" میں شروع کیا مگر وہ مکمل نہ ہو سکا۔ ناول نما شاعری بھی ان کی یادگار ہے۔

ریاض نے ۲۰ جولائی ۱۹۳۳ء (۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ) کو ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ ایک فقرہ گفتار شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے نثار، خطیب سحر کار، رند وضعدار، مسلم وشیدا اور وطن کے سچے پرستار بھی تھے۔ ان کی طبع رواں کسی بات کی پابند نہ تھی۔ وہ تغزل کے بادشاہ، تمثیلات کے امام، انیلم نازک خیالی کے شہریار، بلند پایہ طنز نگار اور ثقہ مزاح نویس بھی تھے۔ ان کی میٹھی میٹھی چٹکیاں، دلآویز چٹکلے، دل میں پیوست ہو جانے والے طنز و تعریض کے تیر، انوکھی اور چٹکتی ہوئی اصطلاحیں، بولتے ہوئے محاورے، گذشتہ زمانہ کی بناوٹ دینے والے جملے اور شوخ اشعار ہر قسم کے حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔

"انشا پردازی کے سلسلے میں ریاض کے دو معرکے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پہلا معرکہ اودھ پنچ اور اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین مرحوم سے ہوا۔ اودھ پنچ سے جو لوگ واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس اخبار سے ٹکر لینا کیا معنی رکھتا تھا۔ اس کے طنز اور ظرافت کا جواب

دینے کے لئے سجاد میں کی ذہانت، شوخی اور برجستگی درکار تھی۔ ریاض کے قلم نے اس سلسلے میں بڑی بڑی جولانیاں دکھائیں۔

دوسرا مورچہ میرٹھ کے مشہور اخبار عوج، نداء اور اس کے ایڈیٹر سے رہا اور مورچہ اودھ پنچ کی طرح اس مرتبہ بھی میدان ریاض کے ہاتھ رہا۔ ان معرکوں ہی کی بدولت ریاض کی انشاء، نازی کی شہرت ہوئی۔ اس دوران میں انھوں نے نہ کبھی ذاتیات کو بیچ میں آنے دیا اور نہ کبھی عامیانہ زبان و بیان کو دخل دیا۔ اخبار نویسی کا معیار بلند رکھا۔ ریاض کی تحریروں میں ایسا لطف تھا کہ پڑھنے والے اس کے لیے بیتاب رہتے تھے"۔

(لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۶۲۱)

عقیل احمد جعفری نے ریاض کے مختلف مضامین جمع کرکے "نذر ریاض" کے نام سے شائع کئے ہیں۔

میرا رنگ مختلف کے رنگ تغزل کی پیروی کرتے ہوئے ریاض نے خود غزل میں ایک بیساختگی، فطرت کیا ہیں غیر معمولی، شوخی، معاملہ بندی، نکات کاری اور فلسفیانہ تحلیل و تجزیہ، معرفت و حقیقت، سان استغنا اور طنز و ظرافت وغیرہ عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ شوخی اور نیم یات تو ان کے وہ لہجے محبوب ہیں جو انھی دو محوروں پر ان کی بیشتر غزلیں گردش کرتی ہے۔ مولوی سبحان خاں عظیم گڑھیوری لکھتے ہیں:

"مرحوم ریاض احمد میرے پاؤں تک اس قدر شوخ تھے کہ نہیں بٹھانا چاہتے تھے مگر یہ نہیں سکتے تھے۔ میں نے گروہ کے پچاس شاعروں کا کلام اول سے آخر تک دیکھا ہے جس میں ان کا ابتدائی، متوسط اور آخری دور سب شامل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے یہ ابتدائی کلام ہے۔ اب متانت آرہی ہے اب متانت آگئی۔ لیکن ریاض کی شوخی کا قدرت کی طرف سے اساسی رنگ تھا جو کبھی چھپکا نہ پڑا"۔

ان کا دیوان ریاض خیراباد کے نام سے اور اشعار کا انتخاب "مینا نہ ریاض" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دیوان کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۸۰ صفحات میں اور اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار چھ سو پچاس کے قریب ہے۔ دوسرا حصہ مختلف اصناف سخن کا مجموعہ ہے۔ یہ ۲۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ریاض کے یہاں قدامت کے ساتھ وہ انبساط، وہ شوخی، وہ تمکنت، وہ دلکشی اور رندانہ مضامین کی افراط ہے کہ بعض نقادوں نے خرابات ریاض کو مطالعات ریاض کا نام دیا ہے۔ ان کے دیوان میں کم و بیش ۱۳۶ شعر شراب کے موضوع پر ہیں۔ جن لوگوں نے ریاض کو دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ "وہ بکسر بہار تھے۔ بذلہ سنجی ان کی فطرت سے دو لیعت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا کلام بھی دلچسپ و شوخ ہے ان کی ساری زندگی فکر، عیش و مستی میں بسر ہوئی ہے۔ شیخ اور زاہد پر جو طنز انھوں نے کئے ہیں وہ ایسے دلنشیں اور لطیف ہیں کہ شاید اس کی داد خود محتسب بھی دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے اسلوب بیان میں شوخی ہے۔ اس شوخی میں محاورات اور روزمرہ کا بھی بڑا دخل ہے۔ زاہد و محتسب کی نورانی صورتیں جیتی پھرتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ یہی میخانہ کا جو نقشہ وہ پیش کرتے ہیں، اس کو پڑھ کر انسان ایسی فضا میں پہنچ جاتا ہے جہاں فردوس کی ہوائیں کوثر و تسنیم کی روانی، ساغر و مینا کی کھنکیں اور طوبیٰ کا ترنم ساری کائنات پر چھایا ہوا ملتا ہے۔ اس فضا میں جب وہ واعظ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

ارے واعظ کہاں کا لامکاں عرش بریں کیسا　　چڑھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

زبردست سے بڑا، ساغر تک بھی سوچنے لگتا ہے کہ ذرا بڑھا کہ آسمان تو کروں کہ کہاں پہنچتے ہیں" (علی گڑھ میگزین طنز و مزاح نمبر صفحہ)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ریاض کی رندی و سرمستی صرف ان کی شاعری تک ہی محدود تھی۔ خود انھوں نے زندگی بھر شراب کا ایک قطرہ تک

نہیں لکھا تھا۔ وہ روزہ اور نماز کے پابند بڑے پکے مسلمان تھے۔ ان کی پارسائی ایسی تھی جیسے جنت میں رہ کر کوئی شخص طہور سے دشمنی رہے۔

توبہ کے پاس نہ رہ کالب کوثر مجھ کو — آج پینے کو طبیعت مری چاہی کیسی

اپنی تصویر انھوں نے ان اشعار میں کھینچی ہے ؎

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن — ریاض آپ کو کچھ نہیں جانتے ہیں

کچھ عجب طرح کے ہیں رند ریاض — آپ پیتے نہیں پلاتے ہیں

رندانہ مزاجی کی وجہ سے ریاض واعظ کی پگڑی اچھالتے اور اس پر طنز سے مسکراتے ہی کہ وہ کم نظر اور کوتاہ بین مجاز کے طلسم سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں نہیں آنا چاہتا بلکہ ظاہر پرست ریاکار اور اہل فریب ہے ؎

توبہ کے گھر میں روز رہی مہماں شراب

ان کی شستہ و لطیف اور سبک شوخ نگاری کے چند نمونے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے ؎

دست شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاض — بیٹھ کر یاد خدا میں جھومتا جاتا رہا

یاں وہ لے دے ہوئی آکہ الٰہی توبہ — ہم سمجھتے تھے کہ محشر میں تماشا ہوگا

یہ دن ہے حشر کا ہو کر رہے گا وہ جو ہونا ہے — اسے جھوٹے کچھ اب قول و قسم سے ہو نہیں سکتا

چھپ کے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے — بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا

مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا — جب دام دے کے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش — سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

چن چن کے آج شیخ نے انگور کھائے — اب کیا رہا ہے تاک کا حاصل نکل گیا

نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی — قرض پی آئے اک دکان سے آج

جناب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا — مزا بھی تلخ ہے کچھ بُو بھی خوشگوار نہیں
حنا لگا کے پہنچتے ہیں گلرخوں میں ریاض — کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یہ اُلجھے ہیں رندوں سے کیوں شیخ صاحب — بڑھاپے میں کیوں داڑھی رنگوا رہے ہیں

شب کو میخانے میں کیوں پہنچے تھے اے حضرتِ شیخ — کہئے اچھی تو کٹی قبلۂ حاجات کی رات

اک ٹیپ ماری زور سے زاہد کے لے ریاض — اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں
بوتل کا کاگ زور میں توبہ کو لے اُڑا — ہم گل چلوں کے ہاتھ کی گولی رُکی نہیں

شیخ صاحب کیا چھپا کر لے چلے رومال میں — کچھ نہ کچھ حصہ رہے یاروں کا بھی اس مال میں

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید — ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

اٹھواؤ میز سے مے و ساغر ریاض جلد — آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

ریاض آئے تو لوگوں نے میکدہ میں کہا — کہاں یہ آج بزرگ فرشتہ خو آئے

اہلِ حرم میں جا کے بنا آج شیخِ وقت — کافر ریاض پیرِ کلیسا کہیں جسے

آئے میخانے میں جب مسجد جامع سے ریاض — ساتھ ہی آپ کے قبلہ سے گھٹا بھی آئی

ہر بزم واعظ سے وہ بنا پڑا — وہ تم سے سوا تھا تن و توش میں

واعظ انگور میں ہے دخترِ رز رو بہ نقاب — آنکھیں پھوٹیں جو اُدھر تاک لگائے کوئی

ہمارا عیب کھلتا ہے نہ کھلتی ہے چھپی بوتل — ہمارے کام کیا کیا جامۂ احرام آتا ہے

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ — بہانے اتنی کہ ساقی کہیں نہ نقاب ملے

منہ زیرِ تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا — بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں ٹھونسا

کاتبِ اعمال نکلے کام کے — مل گئے دو دو شریکِ الزام کے

اتر گئی سرِ بازار شیخ کی پگڑی — گرہ میں دام نہ ہوں گے ادھار پی ہوگی

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں نہانے کے — ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے
بانس پر میکدہ میں تجھ کو چڑھایا اے شیخ — پھر بھی اونچے تری مسجد کے منارے نکلے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے — ہجومِ حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے

چھیڑ کر مجمعِ زہاد کو بڑھتا ہوں ریاضؔ — کہنہ مسجد کے عوض ہو نہ مرمت میری

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی — میکدے سے اب پرانی جائے کی

اُتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا — طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا
ناصح کا منہ ہو بند چکھا دو شرابِ خلد — ساقی ذرا ریاضؔ کی بوتل اٹھا تو لا

سُن کے یہ قبلے سے ابرا اٹھے تو پینا ہے ثواب — لٹ رہا تھا میکدے میں ہم نے بھی لوٹا ثواب

آ گئے کچھ بڑھ کر ملے گی مسجد جامع ریاض — اک ذرا مڑ جائیے گا میکدے کے در سے آپ

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات — اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

یہ مئے تلخ ترے منہ سے لگی ہے کہ نہیں — سچ بتا دے اے زاہد کبھی پی ہے کہ نہیں

کیا ادھر ہو کے بہار ہے کوئی دریائے شراب — جھومتی قبلے سے کیا مست گھٹائیں آئیں

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے — پی آئے تو چھپ بیٹھ رہے یاد خدا میں

آئیں گے جب فرشتے تو منہ کھلے گا اس کا — بوتل کوئی چھپا کر رکھ دے مرے کفن میں

شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا — ہے بہت ہی بدمزہ اچھی نہیں

بڑے موقع سے تھی ہر چند وہ جنت سے باہر تھی — حرم سے ہٹ کے رستے میں ملی مے کی دکاں مجھ کو

جھومتی قبلے سے آئی تھی ستم ڈھانے کو — لو گھٹا جھک کے اڑا لے گئی میخانے کو

دیر توبہ نہیں جو بند بھی ہو — کھلا ہر وقت میخانے کا در ہے

کیسا پینا کہاں کی توبہ! — اب میں ہوں خدا ہے بیخودی ہے

شرما و ریاض میکشی سے — لمبی ڈاڑھی ہے ہاتھ بھر کی

شیخ جی میکدہ وہ جنت ہے — تم بھی جا کر جوان ہو جاتے

شور واعظ کم نہیں ہوتا ہے تو للکارے — اک ذرا او قلقل مینا بلند آواز سے

یہ میکدہ یہ بھیڑ یہ انبوہ یہ ہجوم ، ہم تو نکل کے کھو گئے خانقاہ سے

شریک ہے میں کیا ہوگا آبِ زمزم بھی ریاض نے پسِ توبہ کبھی جو پی ہوگی
ہجوم دیکھ کے سمجھے یہ روزِ محشر ہم کھلی دکان کسی مے فروش کی ہوگی

خدمتِ میخانہ کرلے ورنہ شیخ رائگاں یہ زندگانی جائے گی
پینے آئیں تو فرشتہ خود ریاض حور کے دامن میں چھپائی جائے گی

شراب خانے میں ہے رنگ میکشوں کا وہی نہ خانقاہ نہ وہ اہلِ خانقاہ رہے
توبہ کرکے آج پھر پی لی ریاض کیا کیا کمبخت تونے کیا کیا

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں

کہتی ہے اے ریاض دراز ی ریش کی ٹٹی کی آڑ میں ہے مزا کچھ شکار کا

گاندھی بھی اپنے کام میں آندھی سے کم نہیں کم ہوں تو کام دیں یہ نسیمِ بہار کا

بوتل چرا کے لاتے تھے ہم میکدہ سے روز موقع ملا تو رات کو خم بار سر بنا

ہزاروں عیب چھپاتی ہے میری ریشِ سفید چرائے کوئی خم مے مجھے بتا دینا

خم سے نہ ہوں وہ سر میں چلو میں سر ہوں یہ ظرف شیخ کا ہے یہ مجھ خاکسار کا

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی وہ سر پہ لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

وہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی
راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

بن کے مہماں ایک رندِ روزہ دار آنے کو ہے
شام ہونے کو ہے میرے گھر اوہار آنے کو ہے

میکدے میں عید مجھ مفلس کی ہو جائے تیاں
دے کے اک چلو کوئی لے تیس روزوں کا ثواب

اس شیخِ کہن سال کی اللہ ری بزرگی
جنت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا

اے پیرِ مغاں دخترِ رز عمر رسیدہ
بوڑھا ہوں مے نورِ نظر چرخِ کہن کی

کالی گوری کوئی نہ چھوڑی
افیوں کھا کر پی لی۔ توبہ

کس شوق سے شریکِ جماعت ہوئے تھے ہم
دیکھا سلام پھیر کے تو شیخ جی نہیں

سر ہے ترا بجائے سبو جھوٹ کیوں کہوں
واعظ حرام چیز کبھی ہم نے پی نہیں

سایہ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے
آج شیشے میں اسے ہم نے اتارا کیسا

قرض لایا ہے کئی بھیس بدل کر شاید
مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا

کم بخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا
واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

اچھوتے جام ہیں منت کسے کچھ انگ رکھے
کسے پلائیں کوئی پارسا نہیں ملتا

محفلِ وعظ میں بیٹھا سرِ منبر واعظ
لا کے خم کوئی بٹھا دے نہ سرِ خم مجھ کو

شیخ صاحب سوئے میخانہ ریاض آتے ہیں آج
فرشِ راہ میکدہ دستار رہنے دیجئے

جلوۂ ساقی دمے جان لئے لیتے ہیں　　شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیئے لیتے ہیں

نہ ہوں راہ میخانہ کس طرح زاہد　　یہ بادل جو سر پہ مرے چھا رہے ہیں

کعبہ میں نغمہ آئے جو صبح اذان دیتے　　میخانہ میں راتوں کو ان کا بھی گزر دیکھا

کھٹا اٹھتے ہی پوچھا ریں یہ ہم پر　　ارے واعظ کہاں تک ہم پیے جائیں

ہم رند سمجھتے ہیں اسے انجمن وعظ　　جس بزم میں ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا
میخانہ میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر　　مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

جام چھلکانے لگے بھر کر مئے کوثر سے آپ
حضرت واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

اپنی بڑی بڑی اور کھڑی مونچھوں کے بارے میں جو کبھی بل کھاتی ہوئی کبھی تنی ہوئی ایک وقت کئی انچ کی تھیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

چوٹیاں جتنی تھیں چھوٹی ہو گئیں　　میری مونچھیں ان کی چوٹی ہو گئیں

وضع رندانہ رہے ریش رہے صاف ریاض
خوف کی چیز ہے اس وقت مسلماں ہونا

اقبال

جلانے کتنے رمال رگس۔ یعنی بے نوری پر روتی رہی پھر کہیں، جا کر ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ اقبال پیدا ہوئے ——— ایک کامیاب تعلیمی زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں بیرسٹری فیصلہ انگلستان روانہ ہوئے۔ وہاں مشہور مستشرق پروفیسر براؤن انگلستانیہ سے استفادہ کیا۔ جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر انگلستان آکر بیرسٹری کی سند لی۔ ۱۹۱۱ء میں ان کو ٹرنٹ ہال سے سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۸ء اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اقبال ایک وسیع النظر شاعر تھے انھوں نے فلسفۂ مشرق و مغرب دونوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ فارسی ادب کے بھی عالم تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو اپنا ہم نوا بنا کر سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری میں ایک آفاقی پیغام ہے۔ انھوں نے خود نگہ کو نئی راہوں کی نشان دہی کی ہے۔ اقبال کا نغمہ جہانی اور زندگی سے بھرپور ہے۔ ان کی تصانیف زبان زد عام اور بہت سی خواص و عوام میں۔

اقبال بنیادی طور پر مفکر و فلسفی ہیں اگر چہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے طنز و ظرافت کو کبھی مستقل موضوع یا فن کی حیثیت سے نہیں اپنایا لیکن ان کا کلام طنز و ظرافت سے خالی بھی نہیں۔ انھوں نے سماج کی بے لچک اور مسائل سیاست کی طرف سے برتی جانے والی انسانی غفلت پر متعدد جگہ آپ ہا پر طنز کے نشتر چلائے ہیں اور ان کی نام نہاد شاعری کی طرح ان کی ظرافت بھی ایک بڑے تعمیری مقصد کی حامل ہے انھوں نے صرف انھی چیزوں پر انگلی رکھی ہے جو بطور خود قبیح و مذموم ہیں اور انھی چٹکلوں کو موردِ الزام قرار دیا ہے جو عقل کے نزدیک قابلِ مذمت ہیں ——

طنز و مزاح سے ان کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ذاتی و شخصی مخالفت نہیں بلکہ ان لطائف و نوادر کی اصلاح ہے جو قومی زندگی کے راستے میں روڑے اٹکائے ہوئے تھے ابتدا میں بے شک ایک وقت ایسا آیا کہ انھوں نے اکبر الہ آبادی کی پیروی کی اور انھی کے رنگ میں کہا مگر بہت جلد اس رنگ کو ترک کر دیا کیونکہ اقبال کی بلند نظر ہنگامی فقروں کے مطالعے کی محل نہ ہو سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں "گڑھا" کے نام سے چند "پکوڑے" تل کر پیش کیے۔ یہ قطعات مرعوب انگریزی کی طرف سے شائع ہوئے۔ تب احسن لطائمی نے اس طرز کا نام "اکبری اقبال" رکھا اور اسے پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں جن کا نام خدا اقبال ہے اور وہ ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں، شعر بناتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پڑھ بھی کر لیتے ہیں۔

میں نے ان کو آدمی اس طرح سے کہا کہ لوگ بیرسٹری میں لگتے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کیونکہ وہ مجھ سے بیوقوف نہ بنائے بیٹھیں ورنہ میں اقبال کو بیکار خاک نہیں سمجھتا اور ان کے پہلے کو آدمی زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بقیہ ہوں مگر ان کی بیسٹرسٹ فقط ان کے بیوی بچوں یا ان کے لیے بارگ ہو جو ان کو گود چڑھا کر مچھیوں والا مقلد پر پوز دیتے ہوئے پیسٹر کہتے ہیں۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی، بیرسٹر اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی۔ پر میں اقبال کو بھی دیکھا ہے اور رندنی اقبال کو بھی مگر کبھی آدمی نہیں پایا۔ وہ ازل سے حیوان ہیں اور ہمیشہ ابدی کے نشان ہیں۔

ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو کڑوا جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہندکے کسی انسان میں نہیں۔ برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مکھی بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ٹھوکنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے۔

اقبالؔ بھی ایک پروانہ ہے جو ان دیکھی شمع کا دیوانہ ہے۔ مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر زبان جھونے آتے ہیں۔

اقبالؔ ہمیشہ آسمان پر اُڑتے ہیں۔ زمین پر کبھی آتا ہوتا ہے تو اس زمین میں جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبالؔ کہاں ہیں؟ ہم ان تک کیونکر پہنچیں؟

ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبالؔ زمین پر آئے اور چند جملے ان کی زبان میں سُنائے جو زمانہ کی زبان کہلاتے ہیں۔ جن کا نام اکبرؔ ہے، جو الہ آباد میں بیٹھ کر اللہ کی آیتیں لکھتے ہیں۔ اکبرؔ کے ہم زبان ہو کر بولنا آسان بات نہیں ہے۔ اکبرؔ اشارات ربانی کے حامل ہیں۔ اکبرؔ کو گویا کرنے والا پہلے آنکھ سے دکھاتا ہے پھر قلم سے لکھواتا ہے اکبرؔ کی ہر بات زمین آسمان کو ایک کر دیتی ہے، ہر قول وہ وجود لے کر آتا ہے جس کو انگریزی میں کیرکٹر کہتے ہیں۔ اکبرؔ نے اس دھوپ میں بال سفید کیے ہیں جس نے اسلامی سلطنت کا پان خشک کر دیا۔ اقبالؔ نے اکبرؔ کی زبان میں جو کچھ کہا وہ اکبرؔ ہی اقبالؔ ہے۔ خلقت اس کو دیکھتی ہے کہ اقبالؔ نے کس حد تک اکبرؔ کی روش کو نباہا ہے اور اکبرؔ کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبرؔ کی زبان میں بولتے بولتے اقبالؔ کی زبان میں بھی آیا ہے۔ خدا خیر کرے دیکھیے ان حروف کے پردہ سے کیا نکلنے والا ہے۔

ہندوستان کی بے قراری میں کام کی باتیں دو کار ہیں جن میں تماشے ہوں اور چلنے کے لیے راستہ ہو۔ عبرت کے لیے دل خوش کن آگاہی اور تنبیہ ہو۔ اکبرؔ اقبالؔ کا ابتدا سے یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبالؔ نے اور طریق سے کہا اور اکبرؔ نے اور پیرایہ سے۔ اس نظم میں جو شیخ مرعوب رقم صاحب کے ذریعہ شائع ہوتی ہے اقبالؔ نے اکبرؔ کی نقش قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کے تیز بہاؤ کی حقیقت پر لکچر دے۔ جو جہیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ "کشتیاں چکنا چور کی، بادل اٹھیں گے اور زمین پر مینہ برسائیں گے" فضول ہے۔ جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیا کرتا ہے۔ اس واسطے میں اس نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اصلی شان کی دلیل ہے۔"

اب وہ اشعار دیکھیے ؎

مشرق میں اصولِ دین بن جاتے ہیں مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں

رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پتلے
واں ایک کے تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
"پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند!
غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

انساں ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے
جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ تتنی
تقریر کو کھڑی ہو کلو میاں کی بیوی
پردھان ہو سبھا میں بنسی کی دھرم پتنی

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر
ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے بیری
خفیہ پولس میں جب سے صد ہو گئی ہے قائم
ہندو ہیں پیڈ افسر مسلم ہیں آنریری

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مارو ینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریداری فقط
آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ! میرے فرش پر نہ رینگ
کہنے لگے کراونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا کوئی اسینگ

کہی ابھی نقیبِ انجمن نے
وہ سمجھے گا اسے جو کارواں ہے

خدا واحد ہے وہ ناظم ہیں اپنے
وہ عملی میں ہمارا آسماں ہے

وہ ہفتہ تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانہ میں
ماہ کا مہتاب کا خدا کا نبی کا ڈر

دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانہ میں
مضمون نگار بیوی کا سی آئی ڈی کا ڈر

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

فکرِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا لیا
تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

جنابِ شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی
عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لیے

ہمارے تخت میں تو جینا بتر ہے مرنے سے
جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لیے

زوال میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا
"کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کے لیے"

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفعِ مرض کے واسطے بل پیش کیجئے

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اے شیخ و برہمن! سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گروں نے کتنی بانڈی سے ان قوموں کو ٹے پکا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں — ووٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت — بنائے خوب آزادی کے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ — نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں — پرانے جھونپڑوں میں ہو ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا — کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

اکبر کے طنز میں تلخی اور تمسخر کا انداز زیادہ نمایاں تھا مگر کوئی پیغام نہ تھا۔ اقبال نے اپنے کلام میں سنجیدگی اور ظرافت کا ایک ایسا امتزاج پیدا کر لیا کہ وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ زندگی کے مدوجزر اور نشیب و فراز دیکھتے دکھاتے رہے اور اپنا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی شاعری میں عالمگیر انسانی مسائل پر تنقید کر کے ایک ناگوار چیز کو گوارا بنا کر پیش کیا اور اپنے سنجیدہ مگر شگفتہ مذاق کی بدولت طعن و طنز میں بھی ایک قسم کا تقدس پیدا کر دیا۔

انھوں نے اجتماعی زندگی کے مصائب کو بے نقاب کرنے میں کہیں شدت، زہرناکی، تلخی اور شوریدگی کو اپنے اوپر حاوی نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طنز کی نشتر کاری دل کے پار نہیں ہوتی بلکہ صرف کسک سی پیدا کرتی ہے۔ اسے پڑھ کر ہم اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہوتے اور تاریک زندگی میں روشنی حاصل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دین کی محدود تعبیر اور امامت کے مفہوم کی تنگی پر اس سے زیادہ تنقید کیا ہو سکتی ہے ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

لیکن لہجہ کی مدردی نے اس کو معاندانہ حسب جوئی اور نکتہ چینی کی بجائے لطیف طنز میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کے یہاں شروع سے آخر تک تنقید کے پہلو نمایاں ہے۔ وہ اپنے مقصد کے اظہار میں پوری دلسوزی اور خلوص سے کام لیتے ہیں۔ ان کی فطری تحمل مزاجی اور اعتدال پسندی کی وجہ سے ان کی طنز یہ شاعری میں سنجیدگی زیادہ اور ظرافت کم ہے۔ وہ اپنے شکار پر وار کرتے ہیں عموماً بالواسطہ طریق اختیار کرتے ہیں۔ ان کی نظم "نصیحت" اس کی بہترین مثال ہے اس میں انھوں نے طنز کا ایک انوکھا پیرایہ اختیار کیا ہے ؎

میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا — عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل — دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے — تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود — پالسی بھی تری چیپیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے — پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن — اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پروردہ ترے ملک کے اخبار بھی ہیں — چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے — تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی — تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں — پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو مذاقِ پرواز

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

سُن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا　　بات جو بگڑی ہے بناؤں جو نہ ہو فاش یہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا کوئی آیا نہیں

اور پنجاب میں ملتا کوئی استاد نہیں

اقبال کی طنز یہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بالکل درست فرمایا ہے کہ "سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج اقبال کی شاعری کا امتیازی نشان ہے۔ وہ کہیں بھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے بلکہ بڑے سنجیدہ انداز میں اور اک تبسم زیر لب کے ساتھ زندگی کی ناہمواریوں کو اُجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ خدا سے شکوہ کرتے وقت، ابلیس اور انسان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہوئے، ملا کی سرشت پر چوٹ کرنے کے دوران میں وہ کہیں بھی ظرافت کو مسخی جذباتیت کے حوالے نہیں کرتے بلکہ ایک متفکر کے دھیمے تبسم کی رفاقت میں پیش کرتے اور حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اقبال کی طنز کو اس دائروں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی حوض کی سطح پر ایک کنکر کے ارتعاش سے نمودار ہوتے اور حلقہ در حلقہ بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طنز کا پہلا نشانہ ان کی اپنی ہی قوم ہے لیکن یہاں وہ کھلے کی باتیں کسی کھردرے اور نصیحت آموز انداز سے پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے پیار سے اپنے پُر شفقت لہجے کے شانوں پر رکھ دیتے ہیں اور جب باتیں کرنے لگتے ہیں تو نرم اور خوبصورت الفاظ کے عقب میں طنز کے زہر آلود تیر چھپتے چلے آتے ہیں اور ناظر ان کی چبھن کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی نظمیں "نصیحت" "ملا اور بہشت" اسی زمرے میں شامل ہیں۔

اقبال کی طنز کا دوسرا دائرہ مغربی تہذیب کی ساری بے اعتدالیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ جب مغربی ہوا کے طوفانی تھپیڑوں سے اپنی تہذیب کے تناور درختوں کی ٹہنیوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ ؎

شفق نہیں مغربی افق پر یہ بہتے خوں ہے یہ بجھتے خوں ہے

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوشِ وامروز ہے فسانہ

مے خانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں　　لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

اس دوسرے رائے میں نمودار ہونے والی طنز کے متعلق یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ مزاح سے بے نیاز نظر آتی ہے اور اگرچہ یہ چیز اصولاً طنز یہ کلام کی خلاف ورزی ہے تاہم بیان کا تیکھا پن بات کی تلخی کو قابلِ برداشت ضرور بنا دیتا ہے۔

اقبال کی طنز کا آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اقبال ایک متفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تفہیم پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خالقِ کائنات سے ان کا براہِ راست خطاب اپنے اندر زندگی و بیباکی لیے علاوہ طنز کے بہت تیز نشتر بھی یہاں رکھتا ہے اور اس کلام کے مطالعے کے بعد ناظر یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ اس نے بہت بلندی پر سے زندگی کے نشیب و فراز پر ایک نگاہ ڈالی ہے ؎

اگر کج رَو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟　　مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر — مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے سارا جہانِ روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

یہ "حرفِ شیریں" — خالقِ کائنات سے مخاطب ہونے کا یہ البیلا انداز قطعاً اقبال کا اپنا انداز ہے لیکن شاید اس انداز کی کامیابی کی اصل وجہ وہ ظرافت ہے جو ان اشعار میں ایک برقی رَو کی طرح دوڑتی ہے اور جو ناطقہ کے لبوں پر بھی ایک شریر سا تبسم پیدا کر دیتی ہے۔"

(اردو ادب میں طنز و مزاح صفحہ ۱۱۹-۱۲۱)

ان اشعار میں دیکھیے یورپ کی بے پناہ چالوں اور اس کے بے ثمر منصوبوں پر کتنی گہری طنز ہے ؎

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

مسولینی اپنے حوالوں اور مفروضوں کو منہ توڑ جواب دیتا ہے اور ان کی اصل فریبِ سیاست اور تہذیب کی پردہ دری کرتا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم — بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں بھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں — ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم — تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے رجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں — راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوسنی کی آبیاری میں رہے — اور تم دنیا کے بحر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تو نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام — تو نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تختِ تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی!
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

سنہ ۱۹۲۷ء میں لاہور کے شاہ عالمی دروازہ کے باہر ایک مندر تعمیر ہوا اس کے قریب ہی ایک بڑے چبوترے پر مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہندوؤں نے یہ دیکھا دیکھی رات ہی رات میں وہاں ایک مسجد کھڑی کر دی۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اقبال نے اس موقعہ پر مسلمانوں کے جذبہ جوش پر مسدس ذیل لکھی کہی ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

چند اور طنزیہ نمونے ملاحظہ فرمائیے ؎

رات مجھ سے نے کہہ دیا مجھ سے — ناز اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو — صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ وار ہے رحمت — پی گیا سب لہو اسامی کا

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے — کردار بے سوز گفتار واہی

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز — طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مرد مجاہد وہ مومن آزاد — خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نماز غلام

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوّف ہو وہ اسلام کر ایجاد

کہا اقبال نے شیخ حرم سے — تہِ دیوارِ مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
ہے جن میں غلاموں کے یہی تربیت اول
موحیٔ قی و صورت کرنی علم نباتات

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں ملّا ہو غازی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے — حریتِ افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدہ پارس — چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر — چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و بہشت و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملّتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منوّر کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندہ میں گرفتار

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں بجھ کے مسجد میں جب وقتِ قیام آیا

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہر تھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد محکمۂ ڈاک و تار کے افسر اعلیٰ تھے۔ ۱۸۹۲ء میں علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس محکمے میں ملازم رہے۔ پھر ۱۸۹۵ء میں علی گڈھ جا کر بی۔ اے کی سند لی وہیں نواب محسن الملک سے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے۔ ان سے سفارشی خط لے کر حیدرآباد دکن گئے جہاں کچھ عرصہ فوج میں رہے۔ فوج سے دارالترجمہ میں پہنچے اور چند ہی دنوں میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہو گئے۔ یہ تعلقات، فساد لندن، سنہری گھونگنا اور لارڈ کرزن کی تالیف خیابانِ فارسی کا اردو میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے خوب شہرت حاصل کی۔ مہتمان علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے اور ہوم سیکرٹری کے عہدے تک ترقی کی۔ یہاں انھیں جن لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا ان میں سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی، عزیز مرزا، سرشار، ڈاکٹر سید حسین بلگرامی، نواب عماد الملک، نواب فخر الملک، نواب مرزا خاں داغ دہلوی، مولوی محمد ظہور علی بدایونی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق شامل ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں کو حیدرآباد کی فضا راس نہ آئی مجبوراً انھیں وطن واپس آنا پڑا۔

یہاں ان کے والد وزیر آباد سے ہفتہ وار اخبار زمیندار جاری کر چکے تھے یہ بھی اس میں شریک ہو گئے اور اسے سر پر اٹھا لائے۔ لاہور اور اس کے اطراف کی تنگ اور گنجل بازار کا نیز رکی مسجد کے واقعے نے عہدہ کا کام کیا۔ اخبار روزانہ چھپنے لگا اور مولانا ظفر علی خاں کے زور قلم سے گویا بجلیاں برسنے لگیں۔ اس وقت وہ نوجوان تھے بال و بیدگی کا سیسہ سر زمین میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں بیتنے لگیں۔ ۴۰ بلکہ پاپا۔ اب آتش بیاں خطیب، بیباک صحافی، نامور انشاء پرداز، زبردست سیاست دان اور پنجاب کے سب سے بڑے لیڈر بن چکے تھے۔ ان کے دل میں قوم کا بیحد درد تھا۔ وہ مسلمانوں کا دکھ درد محسوس کرتے۔ ہر مصیبت میں کام آتے۔ ہر آگ میں کود پڑتے اور اپنی جرأت، بیباکی اور آزادیٔ رائے سے بے شمار مسائل کو فضا میں علاطم برپا کر دیتے تھے۔ وہ سراپا حرکت و حرارت تھے۔ ان کا ایک ایک لمحہ ہنگامہ خیزیوں میں گزرتا تھا صحافت، سیاست، خطابت، شاعری اور تالیف و ترجمہ کے معرکوں میں وہ پیش پیش رہتے تھے اور یہی روشن مستقبل ان کے لیے طے ہو جاتا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی زمیندار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور مولانا ظفر علی خاں کرم آباد میں نظر بند ہو گئے۔ وہاں سے ایک ادبی ہفتہ وار پرچہ "ستارۂ صبح" نکالا مگر وہ جلد غروب ہو گیا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی زمیندار پھر اپنی صحافت پر نمودار ہوا۔ ساتھ ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کی مہم شروع ہوئی اور کانگرس اور خلافت کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ مولانا نے ان تحریکوں میں سرگرم حصہ لیا اور اب جو ضبطیوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ چلا تو چلتا ہی گیا۔ مولانا کی مجموعی قید کوئی بارہ سال کے قریب ہو گی۔ آخری عمر میں مرکزی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے تھے۔ آخر طویل علالت کے بعد ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو یہ ساز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جذبۂ توحید سے سرشار تھے۔ اسلام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی گوارا کرتے تھے۔ مسلمانوں کو ہر جگہ سربلند دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریز کو بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ اس سے ہر میدان میں ٹکر لی ہر معرکہ میں اس سے دست و گریباں ہوئے۔ اس کی یاد میں جانی و مالی نقصان بھی اٹھایا۔ کئی بار پریس کی ضمانت ضبط ہوئی۔ سالہا سال تک جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند رہے لیکن ان کے عزم و ہمت

ظفر علی خان

...ں دن نہ آیا۔ بس چند کو غلط سمجھا اس کی ڈٹ کر مخالفت کی لیکن جس بات کو صحیح جانا اس کی آئندہ حمایت میں پوری جرأت سے سینہ سپر ہو گئے۔ انھوں نے سرگرم سیاست میں حصہ لیا۔ پرسیاسی جماعت سے رشتہ جوڑا لیکن اپنی شخصیت اور اعتدال کو ہر جگہ قائم رکھا۔ اصول شورش کاشمیری کا خوش رنگ گلاب بن گئے ...ہوا۔ اس سے نکلے تو دو انفجار مجلس تحفظ کی روح رواں تھے لیکن کنارہ کشی اختیار کی تو اپنے ہی ہم عصروں سے دور دور ہاتھ کھینچ لیے۔ احرار کی ...ب تھائی لیکن شہید گنج کے کدال سے گرا بھی۔ ...ی۔ انتہا پسندی کی بیداد بھی لیکن جب بڑھاپے ...لنگ میں تھک ہار کر تنہا بیٹھ گئے اور اس کو ...ہ عاجزانہ سمجھی مگر طبیعت کا انداز جوں کا توں رہا۔

مولانا حافظ علی خاں نظم و نثر میں ایک بدیع اور خاص طرز کے موجد تھے۔ انداز بہت شگفتہ، شوخ، پُرطنز اور رعایتی۔ تھا نظموں کے ...عنوان جو بے حجابات، نگار ستان، بہار ستان، چمنستان وغیرہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ بیشتر نظمیں ہنگامی نازلی بیداد رہیں لیکن ان کا انداز آج ...ہے پاہ ہے کہ ان کو اگر وشاعری کے بندھنے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ پاکیزہ زبان اور صحیح محاورات کے استعمال سے ...یسی ہی مشکل، کھردری اور بنجر زمین کیوں نہ ہو فوراً پانی کا چشمہ رواں دیتے تھے۔ قافیے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرت بیان سے انھیں اوزان و بحور کی زنجیروں میں باندھ لیتے۔ اکثر نظموں میں قافیہ ہی مضمون کا رہبر ہوتا ہے ان کے یہاں جذبات روحی قسم کے ہیں۔ ...عریف اور تعریض ——— مولانا کے لعنت و محسن تھے جن کی سنان میں انھوں نے نظمیں لکھیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی فہرست بہت ...ویل ہے جو ان کے طنز و تضحیک کا نشانہ بنے۔ ان میں اکثر اپنے لکھے ہوئے کو سی وقت مولانا کے سپرد کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے کلام کا بیشتر حصہ خود طنز کا مرتبہ رکھتا ہے۔ یہ بھول شورش کاشمیری تک نہیں سکتے ہیں کا سوال ہے ان کا کوئی معاصر اور جماعت ان کے قلم سے نہیں بچی یہاں تک کہ عطاء اللہ شاہ بخاری، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، گاندھی جی، جواہر لال نہرو بھی ان کے قلم کی زد میں آ چکے ہیں۔ اور جماعتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی حال عقیدوں اور نظریوں کا ہے۔ اس طرح بلکہ تضحیک میں ان کا جواب نہیں۔ اس میدان میں انھوں نے اچھے اچھوں کی دستار فضیلت کے پیچ کھولے اور ...ے بڑوں کو جھاڑ دیا۔ ...ں شائستہ چست کیا ہے۔

مولانا سے پہلے تجو کا اس نوع شخصی یا ذاتی تھا جس کی بنیاد میں سفلہ پن اور تعصب کے ہاں ملتی ہیں یا پھر اجتماعی طنز جس کے موجد خاتم اکبر الہ آبادی ہیں۔ ظفر علی خاں نے سیاسیات میں ہجو کو استعمال کیا اور اس کی ہنا قومی و ملکی مقاصد پر رکھی۔ گو ان میں ذاتیات کا زہر بجھایا ہے اور یہ ایک لبدی تقاضا ہے لیکن اس اقدار و لفظ و ربط کے باوجود اس میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اجتماعی ہے۔ ان ہجوؤں میں جن کا اصل نشانہ ...رطانوی ڈیلومیسی، ہندو بنیا پن، غلامانہ ذہنیت اور اپنوں کی کاسہ لیسی ہے۔ کہیں کہیں دشنام بھی ہے لیکن تلخ نوائی کے باوجود بعض اچھی نظمیں ہیں ...لچسپ استعارے، محکم تشبیہیں اور دلآویز کنایے بھی ملتے ہیں۔ ہر ایک قاری ان کی درشتی کو محسوس کرتا ہے اور بعض ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں لیکن ...ثر نہیں پڑھتے، وہ پڑھتے ہیں۔

اس قدرت کلام پر مولانا نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ ...ان کے ابا و صحت تک ایک ادارہ رہا۔ کئی آئے اور کئی گئے ——— عبداللہ العمادی، محی الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خاں میکش اور نصراللہ خاں عزیز ہر سب اپنے اپنے وقت پر زمیندار کی وجاہت کے ستون رہے۔ بعض نے علیحدگی اختیار کی تو شور و محن اور تضحیک و ذہن کا ڈول ڈالا لیکن مولانا کے شباب کا زمانہ تھا جیسا سامنے آیا مانے کھا گیا۔

عجیب زمانہ تھا مسلمان ہر نئی تحریک خلافت کے نتیجوں سے متنفر ہو کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے ———

مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں اور خواجہ غلام الثقلین یہ بڑے بڑے قلمی معرکے ہو چکے تھے۔ روزنامہ "انقلاب" مرحوم ان معرکوں کی دل آویز فصل تھا۔ سالک نے انقلاب پر چوٹ کی ؎

مجموعہ انقلاب کا اقبال و فنون ہیں

انھیں شبہ تھا کہ انقلاب کے اجداد میں علامہ اقبال اور ملک فیروز خاں نون کا ہاتھ ہے۔ بس اس پر ایک معرکہ گرم ہو گیا۔ انقلاب کے ہم نواؤں میں پیارے مدیرانِ لاہور یعنی تہرو سالک کے علاوہ "آئینہ"، "نجیبہ"، "حفیظ"، "ایڈیٹر" اور ان کے ساتھی ——— ادھر نہا ظفر علی خاں ——— ادھر افکار و حوادث ——— ادھر فکاہات ——— وہاں کئی لکھنے والے "کوئی" "نظر لکھ" رہا ہے کوئی "افتتاحیہ" اور کوئی "انکار و حوادث" کے محمل سے پتھر برسا رہا ہے ——— اور مولانا ہیں کہ چپ لکھی پڑھ رہے ہیں ——— ایسے معرکوں میں مولانا کا ادبی نام "قاش" ہوتا ——— پھر ایک نام نہیں کئی نام ——— ادھر "افتتاحیہ" لکھا ادھر "فکاہات" اور پھر "سنگلاخ" سے "سنگلاخ زمین" نئے نئے "قوافی"، "نئی نئی ردیفیں" اور پوری "جوابی نظم" ——— "گاہے ماہے دوست" نے بھی ہاتھ بٹایا اور ایک آدھ دفعہ "اختر شیرانی" نے بھی مکاس کے نام سے چند نظمیں کہیں ——— مگر ظفر علی خاں بلا کے شہسوار تھے ——— لڑائی تیز ہو گئی "اعلان کیا ———

زمیندار ایک آپ اتنے مگر اوجِ صحافت پر
یہ اک نکلا لڑے گا آپ کی ساری پلٹنوں سے

اب خطرے بازی شروع ہو رہی ہے "صور پھونکے" جا رہے ہیں "معرکے" ہو رہے ہیں۔ ادھر "طعنہ" لوٹا جا رہا ہے "ادھر سے جواب آں غزل" آ رہا ہے۔ کہیں سے "طنز" گرم ہو رہا ہے "کہیں سے "طنزِ آتش فشاں" ——— اور پھر ایک آدھ دن کی بات نہیں "ہفتوں" یہ دور رہا ——— حریفانِ بذلہ سنج حریفانِ دشنام ہو گئے تو بات "طلاق" سے قطع پر آ گئی ——— "تحریم" چونکہ ہے اور مولانا فاتح ——— ؎

ہم تھے حریفِ بذلہ و دشنام کے حریف

ایکا ایکی دیکھئے کیا ہیں کہ "خاوند" پھر کر ہو گیا۔ مولانا نے لکھا ؎

انقلابات ہیں زمانے کے ——— تہرو سالک کے انقلاب کو دیکھ

اب جو معرکہ اٹھایا تو شاعرہ ہو گیا ——— ایک غزل، دو غزلہ، سہ غزلہ ——— نظم در نظم کی ڈھائی ——— "انقلاب" کے سبھی ساتھی ادبی اور مولانا کے نام رفیقِ سیاسی ——— سالک نے لکھا:

"خلافت کی بلیاں مار کھا بانو چنے پر آمادہ ہیں"

مولانا نے جواب دیا:

"کیوں حضرت! خلافت کے ابو ہریرہ یعنی مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق کیا ارشاد ہے ———؟"

اور پھر یہ معرکے محض تہرو سالک تک ہی محدود نہ رہے ——— ان کا دائرہ پورے ہند و ستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض حوادث و فتائح پر ایسے برجستہ شعر کہے ہیں کہ ان کا جواب نہیں "شعر اور یوں کی بعاوت" سے متعلق "زمیندار" میں "افتتاحیہ" لکھا تو اس کا سرِ آغاز تھا ؎

جنگ کا کب ہے سلیقہ کسی شنواری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

کسی مسئلہ میں مشرقی راج سے بھڑ گئے ... قلم اٹھایا، اداریہ لکھا اور عنوان میں یہ شعر ؎

کیوں کر اس کی نگہ ناز سے بچا ہوگا
زہر وہ اس پہ بتاکید کہ پیا ہوگا

ایک زمانہ میں علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی، اب جو اختلاف کی ہوا چلی تو عمارت ہی بیٹھ گئی ؎

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ
ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کی ضد
منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر
مرہٹی اور بمبئی کے موٹے موٹے گدھ

اور پھر ایسے ایسے قافیے نکالے کہ مضمون سے قطع نظر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ——— علامہ اقبال سے برابر دوستانہ تعلقات رہے۔ ایک زمانہ میں جب علامہ اقبال نے روزنامہ "احسان" کے ظفر علی خان نمبر کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا کہ "مولانا کا ظرف بھی فلک کی تمنا رہے" لیکن سائمن کمیشن کی آمد پر مولانا ان کی تواضع بھی کر چکے تھے ؎

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کا کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے
کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے
آبرو ملت کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

گاندھی جی کے ہر کارنامے کو ان کے قصیدے لکھے، مثلاً ؎

پروردگار نے کہ وہ ہے منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ ارزاں کر دیا

لیکن رو ملے تو بھر بے نہیں ۔ ۔ راہ پر لطیفہ دل کیا ۔

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساہوکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

(اقبال کی شاعری ساحات سے بھرا ہوا ہے ۔
(نقوش شخصیات نمبر)

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جو ۱۹۳۵ء کو ، استعمار کی بھینس کو انڈا فراہم دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

صدر اعظم کی سخاوت میں نہیں ہم کو کلام — لیکن ان سے پوچھتے ہیں ہم کہ تم کو کیا دیا
کاغذی گھوڑا دیا ہم کو سواری کے لیے — اک کھلونا بھیج کر بچوں کا دل بہلا دیا
اپنے پینے کے لیے شمپین بھر لی جام میں — ہند کے نادانِ دردآشام کو ٹھرا دیا
میوہ خوری کے لیے چننے لگے جب گل نیز — رکھ لیے تو دمغز، چھلکوں پر ہمیں ٹرخا دیا
بھینس استعمار کی گابھن ہوئی مدت کے بعد — اور بڑی دقت سے اصلاحات کا انڈا دیا

(۱۲ جنوری ۱۹۳۵ء)

اخبار مفت پڑھنے والے نوٹ داروں پر بالواسطہ چوٹ کرتے ہوئے مراسلہ نگار لکھتے ہیں ۔

پھٹکری سے تجھ کو مطلب ہے نہ ہرے سے غرض — رنگ بے داموں ہی اس دامن میں چوکھا آئیگا
کارڈ اک بیرنگ لکھا ہے نمونے کے لیے — بند ہو کر ڈاک میں اخبار مفت آجائے گا
اک نئے پرچے کی میں ہر روز کر لیتا ہوں سیر — یوں ہی قاصد سال بھر نامے پہ نامہ لائیگا
کونڈی ڈنڈا مجھ رنگیلے کا سلامت چاہیے — بھنگ ہر ہیلے مرا داتا مجھے پلوائے گا
ہے غرض پرچے سے مطلب اس کے مالک سے نہیں — مجھ کو اس سے کیا وہ اس کو کس طرح چھپوائے گا
کاغذی کا بل کرے گا کس طریقے سے ادا — اور چھپائی کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا
فرض ہے اس کا صبوحی میری پلوائے مجھے — بالیاں بی بی کی بیچے پر چپ بھجوائے مجھے

(۶ دسمبر ۱۹۱۶ء)

مولانا کے چند تازہ شاعری کا تمسخر اڑاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کہہ لیتے ہیں آزؔ شعر لیکن ملتا نہیں پڑھ کے ان کو آنند
ہے شعر وہی جو چٹکیاں لے دل میں کسی پدمنی کی مانند
یہ نکتہ سنا تو سر کو دھن کر فرمانے لگے بٹی یا نند
ہے آزؔ کی نظم کا یہ نقشہ دندانِ تو جملہ در و ہانند
چشمانِ تو زیبا ابروانند

(۱۰ جون ۳۴ء)

جب مولانا چھیڑ چھاڑ پر آتے تو اس موضوع کی باتیں کرتے ؎

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند اور آگے آگے لالہ کے ان کی بہو گئی
پوچھا جو میں نے لالہ لالٹن کہاں گئی؟ نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چو گئی
میں نے دیا جواب انھیں از رہِ مذاق کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی
کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجیب اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی بو گئی
"چوؔ" ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
میں نے کہا کہ "چو" سے اگر ہے مراد جُو پھر یوں کہو کہ تا بہ لبِ آب جُو گئی
کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بُو گئی
لطفِ زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی
ہندی نے آ کے حیم کو چے سے بدل دیا چوآتی کہسار میں گلشن سے جُو گئی
لہجہ ہوا درشت زباں ہو گئی کرخت لطفِ کلام و شستگیٔ گفتگو گئی
معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی
افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر مستی اڑی شراب سے پھولوں سے بُو گئی

فوق

منشی محمد الدین فوق کشمیری الاصل تھے۔ فروری ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا، سیالکوٹ میں جا کر بیرسٹاری کا کام شروع کر دیا۔ پھر چند دن بعد انہوں نے وکالت اختیار کر لی۔ ۱۹۰۰ء میں اپنا ہفت روزہ اخبار پنجہ فولاد جاری کیا جو ۱۹۰۶ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا جو ۱۹۱۰ء میں ہفت روزہ اخبار کشمیری بن گیا۔ ۱۹۳۳ء تک کشمیر اور اہل کشمیر کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۱۰ء میں رسالہ طریقت جاری کیا جو چار سال تک رہا۔ ۱۹۱۷ء میں رسالہ نظام جاری کیا مگر وہ جلد بند ہو گیا۔

منشی محمد الدین فوق ایک وقت شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ مؤرخ بھی تھے اور صحافی بھی۔ ان چاروں حصوں میں انھوں نے نام پیدا کیا۔ آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۷۰ کے قریب ہے۔ کشمیر کا یہ سب سے بڑا دانا اور مؤرخ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

فوق صاحب سے ایک شخص انسان کی طرح زندگی کے سارے عمار انہار نویسی کی یا تاریخ پر میں بہانا میں لکھیں۔ ایک مؤرخ میں جس قسم کی متانت ہونی چاہیے وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لیکن متین اور سنجیدہ ہونے کے باوجود جب کبھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھتے تو اس وقت آپ کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اخبار نویس کی حیثیت سے بھی آپ کو قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں لطائف و ظرائف کے نام سے آپ کے اخبار میں ایک مستقل کالم ہوتا تھا جس پر آپ کا یہ شعر درج ہوا کرتا تھا ؎

رونی صورت ہو کوئی لاکھ ہنسا دیں اس کو

دل پھڑک جائے لطیفہ وہ سنا دیں اس کو

آپ کی تالیفات میں "دوکانداروں، ڈاکٹروں اور مریضوں کے لطیفے" اور "استادوں شاگردوں کے لطیفے" بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ لطیفہ گوئی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

کبھی کبھی حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر آپ طنز و مزاح کے تیر بھی برساتے تھے جو بے حد کامیاب ہوتے تھے۔ اس قسم کی کشمکش کا سب سے آپ "شکنتلا کشمیر" کو بیدار کرنے کا کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں خاص قسم کی لطیف طنز و ظرافت پائی جاتی ہے مگر آپ کی طنز و ظرافت سمجھنے کے لیے الفاظ کی غوابت کے پردے ہٹانے اور ہر واقعہ کا پس منظر جاننے کی ضرورت ہے اور یہ بات آپ نے خود ہی ہر نظم کی ابتدا میں بیان کر دی ہے۔ اگر یہ سمجھ میں آجائے تو آپ کی طنز و ظرافت پوری طرح دل میں اُتر جاتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

۱۹۱۹ء میں لاہور کی نکلسن روڈ پر میسرز ہیمر کلنگ سیلون کے نام سے مسٹر ہیمر کلنگ نامی ایبل روکان تھی جس میں مس وائٹ ایک نوجوان خوبصورت یورپین لڑکی انگریز عورتوں کے بال سنوارنے پر ملازم تھی۔ ایک پنجابی نوجوان، اس کو دیکھ کر ریشہ خطمی ہو گئے، ربط ضبط بڑھایا کچھ بے تکلفی بھی پیدا کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ عشق کی گستاخیوں کو اس سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہ دی۔ فوق صاحب نے اس واقعہ پر مندرجہ ذیل اشعار لکھے ؎

اتفاقاً کل میں جا نکلا نکلسن روڈ پر — جس جگہ تھے جمع کچھ نظارے سائٹ کے لیے

سیر کے واسطے ہیر کا سیر راہ اک وہاں سیلان ہے — شب تو شب جو وقف ہے دن کو بھی لائٹ کیلیے
اک مس کہ جس کہ ہے مست شباب حسن و عشق — بوالہوس مرتے ہیں جس پہ لائٹ کے لیے
جب اسے دیکھا جبین ناز پر بل آ گئے — گفتگو جب کی ہوئی تیار فائٹ کے لیے

تخلیہ جا ہا تو فرمایا کہ قسمت نے خود شناس!
کوششیں بیکار ہیں کالے کی وائٹ کے لیے

شہر آشوب قسم کی ایک نظم کے چند شعر ۔

گر زبان فوق سے ہو کچھ بیان کاشمیر — ہے یقیں بے چین کر دے داستان کاشمیر
میر بزم فتنہ و شر و اعتظان کاشمیر — عاملان شرک و بدعت عالمان کاشمیر
ظلم تو آئین ہے اور لب کشائی جرم ہے — بہر خاموشی بنی گویا زبان کاشمیر
خون کثرت دیکھنا ہو تیغ قلت سے اگر — دیکھیے آ کر کبھی محشرستان کاشمیر!
ظالموں نے استخوان و پوست تک چھوڑا نہیں — کھا گئے کشمیر کو سب میہمان کاشمیر
ایک عالم ہے ثناخوان خطۂ کشمیر کا — ہم کو قسمت نے بنایا نوحہ خوان کاشمیر
چاہیے تو اک اردلی گھٹڑی میں سب کے باندھ لے — ہیں بظاہر رشک صد رستم جوان کاشمیر
ہے ازل ہی سے یہاں ترک تشدد پر عمل — ہیں سبق آموز گاندھی سا کمان کاشمیر
قوم غافل کس طرح بحر فنا میں بہہ گئی — کچھ خبر ہے تجھ کو اے آب روان کاشمیر!
مٹ گیا احساس حریت اڑی روح عمل — ہیں غلامان غلام آزادگان کاشمیر
کوئی بات اسلام والوں کی نہیں آتی نظر — عالم اسلام بکھا گو جہان کاشمیر
مال اور بیگار فارسٹ و مجوزہ اور پولیس — اتنے دشمن اور اک جان کسان کاشمیر

تیغِ جوہر دار برسوں تک رہی قومی نشان
کانگڑی ہے یا پھر اب بس اب نشانِ کاشمیر

نام ہی کے رہ گئے سلطاں سلاطین پہاڑ
نام ہی کے اب ہیں راجے راجگانِ کاشمیر

چیز لینے ہی نہیں دیتی کبھی کشمیر ہیں
قہر آلودہ نگاہِ پاسبانِ کاشمیر

کیا شگفتہ پھول کیا غنچہ بند کلیاں سب ہیں خشک
رحم کر اب اے جفائے باغبانِ کاشمیر

کشمیر میں عام طور پر رشوت کا نام "ناس مشکہ" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اور کچھ نہیں تو نسوار اور چائے کے لیے ہی کچھ دیتے جاؤ اسی بنا پر رشوت چوٹ کی گئی ہے

کل ایک بی۔ اے پاس مجھے سیر میں ملے
لکھ پڑھ کے بھی جو زیرو زبر سے تھے بے خبر

پٹھو کی طرح پیٹھ پہ بستر کا بوجھ تھا
بستر بھی تھا دریدہ، ملیدہ، غلیظ تر

یہ بوجھ اور مخنی سا آپ کا وجود
بوڑھوں کی طرح جھک گئی تھی آپ کی کمر

دو دن سے پیٹ میں کوئی دانہ گیا نہ تھا
یہ حال اور پیش تھا لولاب کا سفر

پوچھا کہ جا رہے ہو کہاں ہانپتے ہوئے
بولے کہ تجھ کو میری لیاقت کی کیا خبر

طے کر لیے ہیں مرحلے کالج کے اور اب
میں جا رہا ہوں عہدۂ فارسٹ گارڈ پر

میں نے کہا کہ بی۔ اے کی مٹی نہ کر پلید
یہ انتہائے علم اور یہ بوجھ یہ سفر

تنخواہ گارڈوں کی ہے چودہ کہ پندرہ
وہ بھی ملے گی جنگلوں میں گھوم گھوم کر

بولا وہ بی۔ اے پاس نہ راکھا سمجھ مجھے
رکھنے تو دے قدم مجھے جنگل میں لحظہ بھر

سب جانتے ہیں اور ہو تم بھی یہ جانتے
تنخواہ پر کبھی نہ ہوا ہے نہ ہو گذر

تنخواہ بھی اگر نہ ملے کچھ تو غم نہیں
پرناس مشکہ کی جو اجازت ہو بے خطر

پھر دیکھیے بہار کہ کیسی بہار ہو
پھر دیکھیے کہ گارڈ ہوں یا ریچ آفیسر

یہ ناس مشکہ وہ ہے کہ جس کی امید پر
پیدل چلا ہوں آؤں گا موٹر میں بیٹھ کر

اس نظم میں اپنے عہد کے صاحبِ اقتدار طبقہ پر نہایت گہری طنز ہے۔

خلقِ نادار کی بھی سُن زاری
نام تیرا ہے خالقِ باری

پی گئے خون تیرے بندوں کا
جن کو بخشی ہے تو نے سرداری

ہم ترے خوف سے سدا لرزاں
وہ ازل ہی سے محوِ خواری

ان کی تفسیر میں ہماری روزی پر
چھین کر لے گئے زمیں ساری

ان کا سرمایہ اپنی پامالی
ان کی تفسیر اپنی ناداری

خون اتنا سفید ہے ان کا
روزِ روشن میں ہے سیہ کاری

بے زری اپنی کاشفِ ہر عیب
ساتر الغیب ان کی زرداری

شغل ان کا تکبر و نخوت
کام ان کا ہے معصیت کاری

کوئی رشتہ میں ہو غریب اگر
اس کے رشتہ سے ہیں یہ انکاری

ان کے کتوں کو نعمتیں حاصل
تیرے بندوں کو ذلت و خواری

ٹوک سکتا نہیں کوئی ان کو
ڈر سے خاموش خلقِ بے چاری

ابھی حرکت میں کیا نہ آئے گی
میرے اللہ تیری قہاری

ہم غریب اور تو غریب نواز
ہے تجھی سے امید غم خواری

ایک ننگِ انسانیت کی ہجو۔

سُن اے محسن کُش و احساں فراموش
نماز و روزہ و ایماں فراموش

تو ننگِ خاک و آب و آتش و باد
بباطن حشر بظاہر آدمی زاد

تو ننگِ خاندان و ملت و دیں
بد آموز و بد انجام و بد آئیں

بدل کر ذات اے بدذات تو نے
بنایا دن کو کالی رات تو نے

ترے ہاتھوں سے نالاں باپ تیرا — نہ لے ڈوبے یہ تجھ کو پاپ تیرا
نہ خوش ہو اس قدر مرگِ پدر سے — یہی امید رکھ اپنے پسر سے
ترا جسد و بدن خوراکِ ناپاک — ہو تیرا نامۂ اعمال کیسا پاک
ترے افعال سب دوزخ کا ایندھن — ترے اعمال سب دوزخ کا ایندھن
وطن کا فخر تھے تیرے سلف سب — سلف وہ جن کا تو ہے نا خلف اب
پولس والوں کو یار اپنا بنا کر — زمینداروں پہ رعب اپنا بٹھا کر
کرایا ایمان و دین اپنا گنوا کر — زمینِ غیر پر قبضہ جما کر
بنا پھرتا ہے رانی خاں کا سالا — کبھی سمجھے گا تجھ کو حق تعالیٰ
سنبھل اے زادۂ بطنِ کنیزک — خدا کے خوف سے بے خوف کب تک
مکافاتِ عمل پائے گا اک دن — گلِ اقبال مرجھائے گا اک دن
گر اے شیطان تو انسان ہوتا — نہ یوں فرعونِ بے سامان ہوتا
نہیں گو حق پہ مائل اب ترا دل — نہ اتنا غیرتِ حق سے ہو غافل
کرے گا تیری کج رانی کو سیدھا
کبھی پیدا کوئی موسےٰ بھی ہوگا

متفرق شوخ، شگفتہ اور ظریفانہ اشعار

کھانا نمک بھی اور نمک داں بھی پھوڑنا — جی چاہتا ہے بھیج دیں اب لام پر تمھیں
پتلے ہو تم تعصب و فسق و فجور کے — کہنے کو سب خوشامدی آمد دیں بشر تمھیں

بات کیا چاہیے جب مفت کی محبت ٹھہری — اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

انجام ظلم کا کبھی اچھا نہیں ہوا
سو بار ہم تو کہہ چکے سر پیٹ کر انھیں

بیداد و جور و قہر رعایا پہ جو کریں
کہتے ہیں کاشمیر میں سب داد گر انھیں

معلوم ہو حقیقتِ دروغِ جنابِ فوق
کشمیہ کا بسنتی دیں گو رنگا کر انھیں

مٹ گئی حرفِ غلط کی طرح سب لکھا پڑھا
قیس نے ہم درس پہلی ہو کے آخر کیا پڑھا

اُبل پڑنے پہ آمادہ ہیں چشمے دیدۂ تر کے
جسے طوفاں سے بچنا ہو سمندر پار ہو جائے

تماشا ہو اگر تو بھی کسی پر بیاں دے ظالم
مزا ہو گر مسیحا بھی کبھی بیمار ہو جائے

خدا ہی آبرو رکھے تو رکھے فوق اس گھر کی
میاں ہو جس کا جاہل اور ہو انپڑھ خواں بی بی

ان کی حکومتیں ہیں اپنی اطاعتیں ہیں
دربارِ خاص ان کا دربارِ عام اپنا

کیوں سوءِ ظن نہ رکھے اس کو بھلا ملازم
عرضی پہ جس نے لکھا محمود نام اپنا

گیا لاحول کے پڑھتے ہی شیطاں
اڑی تو یہ کھلا بوتل کا جب کاک

قحط جائے گا تو جائے گی وبا
سانحہ سالے ہی کے سالی جائے گی

ضعفِ معدہ کی شکایت ہے مجھے
ایک کالی نیسہ کھالی جائے گی

تیغ تو اب قبضے سے آزاد ہے
پر یہ کیا تم سے سنبھالی جائے گی؟

کیوں ثمر دے گا نہ باغِ اتحاد
"پھوٹ" گر اس سے نکالی جائے گی

میرے گھر بھی آئے گا روانہ کوئی
یا مجوزہ ہی میں سالی جائے گی

فوق کو کشمیر میں جانے تو دو
اس کی توبہ آزمالی جائے گی

جب "خزاں" پر فتنہ تیغے طمطراق سے کھلے
چر گئے میری امیدوں کی چراگاہیں تمام

گردہ گرما و گدا و گور کی اذاں سے
خطۂ لاہور بھی اب خطۂ طلمان ہے
ان میں آخر کیا بچے گی جن کے اخبارات میں
اک طرف لاحول ہے اور اک طرف شیطان ہے

لاحول نام سے ایک اخبار ایک مسلمان کے اہتمام میں گجرات سے اور شیطان نام سے ایک اخبار ایک ہندو کے اہتمام میں لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ جون ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔

نہ کیڑا ہو اس میں کوئی ڈیڑری کا
مری تھوک کا امتحاں کیجئے گا
اگر روز کے دردِ سر سے ہے بچنا
تو واعظ کو پیرِ مغاں کیجئے گا

زمانہ کے سوئے ہوئے جاگ اٹھے
مرے کُمبِ کرن کو بھی کوئی جگا دے

بھاگتا پھرتا ہوں آبادی سے میں
شاعری ہے یا کوئی خفقان ہے
رہزنِ انساں ہے خود انسانیت
آدمی کا آدمی شیطان ہے

جو اقربا ہیں اپنے عقرب مثال ہیں وہ
جو یار ہم نے دیکھے وہ یار مار دیکھے

ایک وقت تھا کہ کشمیر کے تمام شہروں پر کانگڑا ہی چھایا ہوا تھا۔ فوق صاحب نے ۱۹۲۳ء میں اس سیاسی قنوطیت پر اپنا غصہ ان الفاظ میں چوٹ کی ہے:

چل گئے وہ چال "ماموں بھانجا" کشمیر میں
قافیہ ہے تنگ "عمو جان" کا کشمیر میں!
کاش کچھ ان کے دلوں میں بھی خدا کی یاد ہو
گونجتی ہیں "یا خدا" کشمیر میں
ہو گئیں ٹھنڈی مرے اہلِ وطن کی گرمیاں
"کانگڑی" کی جگہ ہے اب "کانگڑا" کشمیر میں
کافروں سے بھی ہے بدتر وہ مسلماں کے لیے
میر زادہ ہو کہ کوئی میرزا کشمیر میں

خونِ مسلم تیغ مسلم سے جہاں ہو رات دن
کی یزیدوں نے وہ پیدا کربلا کشمیر میں

قوموں نے گیت چھیڑے گیتوں نے ساز بدلے　　اپنی وہی ہے لو لو اور وہ ہی تسکنا را

ڈھاکہ کے مچھروں کی شکایت ؎

نمرود کی طرح نہ کیسا تھا کبھی غرور　　کیوں تنگ کرتے ہیں مجھے مچھر تمام رات

بیدار طالبی میں مری شک ہے وجہ کفر　　ڈھاکہ میں آکے جاگا ہوں اکثر تمام رات

آزاد ہی رہے یہ تہ دام آکے بھی　　اُٹھتے رہے مسہری کے اندر تمام رات

دشمن حقیر بھی ہو تو سمجھو نہ تم حقیر　　جاری رہا یہ مصرع زباں پر تمام رات

جوشؔ ملسیانی

پنڈت لبھو رام صاحب جوشؔ قصبہ ملسیاں ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی پیدائش یکم فروری ۱۸۸۲ء کو ہوئی آپ نے جس دیہاتی فضا، جس غیر ادبی ماحول اور جن ناسازگار حالات کے ماتحت تعلیم و تربیت حاصل کی اس کو دیکھتے ہوئے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا لائق شاعر اور قابل ادیب ہونا محض عطیۂ الٰہی ہے بلیغیت سادگی پسند ہے۔ اس اور وضع قطع سے دیہاتی سادگی کی جیتی جاگتی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود نہایت رنگین شعر کہتے ہیں۔ شاعری میں داغ مرحوم کے شاگرد ہیں اور زبان کی نوک پلک کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

ان کے کلام میں اس قسم کی کاہی شاعری کے نمونے تو نہیں ملیں گے جو ہزل گو حضرات کا طبع نظر ہے اور جس میں صرف ہا یا نہ مذاق اور بازاری لہجۂ کلام اختیار کر کے پھکڑپن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن انھوں نے بعض بعض جگہ محض زبان کے اُلٹ پھیر سے ایسی شگفتگی، شوخی، ظرافت اور تازہ دلی کا ثبوت دیا ہے کہ بے اختیار لبوں پر تبسم رقصاں ہونے لگتا ہے۔ سماج کی اکثر خامیوں اور کمزوریوں پر طنز بھی کی ہے مگر طنز کی تندی اور تیزی کو الفاظ کی متانت میں چھپا کر مزاح سے تعریف کا پہلو نکال لیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے بعد آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ؎

جناب جوشؔ جو مشہور تھے ارباب دانش میں　　بڑے آشفتہ دل نکلے بڑے شوریدہ سر نکلے

ان کو شوقِ تن تنا تن تن تنانا　　مجھ کو ذوقِ فاعلاتن فاعلات

بنگلہ ہی نہیں گور بھی انساں کے لیے ہے　　یہ مٹیا محل بھی اسی مہماں کے لیے ہے

شعر خوانی ہم نوائے چنگ ہے　　داد لینے کا یہ اچھا ڈھنگ ہے

اہلِ مغرب کے فریب آباد میں　　صلح کا چرچا پیامِ جنگ ہے
آپ گورے ہیں تو ہم کالے سہی!
عیب کیا ہے اپنا اپنا رنگ ہے

دل لے کے کہتے ہیں کہ نوشتہ اس کی دیکھئے　　ایسا نہ ہو کہ بعد میں جھگڑا اکرے کوئی

اسیرِ حرص نہ ہو کیوں حریصِ طول امل　　وہ چاہتا ہے کہ رسّی ذرا دراز رہے

کمیٹی کی پرچی سلامت رہے　　غریبوں کا یہ آسرا ہو گئی

تپشِ دل میں ہے آہ و زہ کے ساتھ　　مہینا جون کا ہے جنوری میں

روز کے ملنے میں یہ ڈر ہے انھیں　　دلبری نوکری نہ ہو جائے

راہِ عدم میں چوری اتنا کرم کرے　　چپکے سے لے اڑے مری گٹھڑی گناہ کی

لب پہ توبہ ہاتھ میں جامِ شراب　　رندیٔ ارباب تقویٰ دیکھیے

ہم جانتے ہیں کہ پارسائی کیا ہے　　اس کے لیے وجہ لب کشائی کیا ہے
پی جائیں جسے نام خدا کا لے کر　　اس جامِ شراب میں بُرائی کیا ہے

محشر میں سُن رہا ہوں صدا واہ واہ کی　　یا رب ملی یہ داد مجھے کس گناہ کی

بڑھیں عاشقوں کی وہ ارزانیاں　　محبت کا سودا گراں ہو گیا

پرتگالی کا میں دلدادہ نہیں اے ساقی!　　انڈیا میڈ اگر ہے تو دکھا کون سی ہے

جو اور مدعا ہو وہ کہیے جناب شیخ
یہ "چھوڑیے" کی صدا چھوڑ دیجئے

پہلا سا اب وہ حسنِ تکلم نہیں رہا
ہر روز بھانت بھانت کی سنتے ہیں بولیاں
عریاں کیا ہے شاہدِ مضموں کے جسم کو
مد کی ہوئی ہیں آج حسینوں کی چولیاں
اے وائے شاعری کہ تخلص مسیح ہے
لیکن جو شعر ہیں وہ مریضوں کی ڈولیاں

یقیں اے دل نہ کر تو حضرتِ واعظ کی باتوں کا
یہ لمبی داڑھیوں والے بڑے عیار ہوتے ہیں

وہ شست باندھ کے کہتے ہیں لیجئے حضرت
یہ تیر آپ کلیجے کے پار دیکھیں گے

پہلی ہی ضربِ آہ سے چکرا گیا فلک
سچ ہے کہ سوسنار کی اور اک لہار کی

اے شیخ گو نہیں ہیں کوئی ذی شعور ہم
اتنا تو جانتے ہیں کہ تم بے شعور ہو

وعظ تو میں نے سن لیا اب یہ مجھے بتایئے
آنکھیں اگر وہ سامنے ذوقِ نظر کو کیا کروں

اب اس فسانے سے کیا حاصل کہ رہبر خود غرض نکلا
پرائی آس جو تکتے ہیں اکثر خوار ہوتے ہیں!

غم جو کھاتا ہوں تو مجھ کو کھائے جاتا ہے یہ غم
کھاؤں گا پھر کیا میں دنیا بھر کا غم کھانے کے بعد

زمانہ حال کے برہمنوں پر کتنی اچھی فقرہ ہے ؎

بڑے شکی ہیں بڑے وہمی پھر اس پہ یہ قیامت ہے
نہ ہاری ماننے والے نہ جیتی ماننے والے

کوئی راہِ مخفی پنہاں نہ تھا جن کی نگاہوں سے
وہی اب اونٹ کو بیٹوں میں ہیں پہچاننے والے

فرانمی میں خدا جانے کہاں تک پاؤں پھیلاتے
جو اتنی تنگ حالی میں ہیں لمبی تاننے والے

بنا لیتے ہیں صافی اپنی دستارِ فضیلت کو
بہم مل بیٹھتے ہیں جب یہ گاڑھی چھاننے والے

عدل یہ تھا کہ سُن والوں سے بھی ہوتی بازپرس
کیوں فرشتوں کو اسیرِ چاہِ بابل کر دیا

نمازِ صبح سے پہلے نہ کی تدبیر چھٹکے کی
تمہارے گھر میں فریادی رہی تقدیر چھٹکے کی

وہ مدح کی کہ سُنتے ہی قاصد ہوا ہوا
ہم نے اڑا اڑا کے کبوتر بنا دیا

اے کاش اس کو مجھ کو باہم گلے ملا دیں
وہ آدمی یہاں کے وہ آدمی وہاں کے

فوق کا تمسخر اڑایا ہے دیکھیے ؎

خالقِ خلق نے پرکار کو گر بھر کھولا
دائرہ کھینچ دیا ناف کا نقطہ لے کر

گر کبھی بے کار رہا بازوئے نیّاط کے ساتھ
ناپیے آپ ہی حضرت اسے رسّا لے کر

ڈوب جانے کا جنھیں خوف ہے گردابوں میں
مشک پر تیرتے ہیں نام وہ اس کا لے کر

رستہ مر گھٹ کا تو ہے اور طرف کو اے جوشؔ
یہ کدھر جاتی ہے صحت کا جنازہ لے کر

تم اب تو جوشِ سیہ کاریوں سے باز آؤ
تمہاری ڈاڑھی میں حضرت سفید بال آئے

غیر کی تصویر پہ کہتے تمہیں اشعار ہم
بے زباں پر کیا کریں تیغ زباں کا وار ہم

دوبارہ وہی بات کیوں پوچھتے ہو
اگر تم کو ثقلِ سماعت نہیں ہے

بحث مذہب کا نتیجہ کچھ نہیں — جہنم صغریٰ و کبریٰ کے سوا

تقریر بجا طلوں میں اثر خیز چاہیے — تحریر سخت جاں ہے چھری تیز چاہیے

اب ناچنے گانے میں برائی نہ رہی — عریانیٔ تن پہ جگ ہنسائی نہ رہی
آوارگیٔ طبع سے نفرت تو کجا — ظاہر کی بھی انگشت نمائی نہ رہی

ہالنڈ سے کاسہ گدائی کا نہ چھوٹا ایک دن — اور نہ سے تاج شاہی کے ہیں دعویدار ہم

آیئے ہر نوجواں کے دوش پر — تندرستی کا جنازہ دیکھیے

منحصر قوت بازو پہ ہے دولتمندی — دیکھ لو زور میں موجود ہے زر ۲/۳
ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہ کہیں کون — جس کو کہتے ہیں مدراس میں ہے ڈر ۲/۳
ظالم خوف کرو آہ کو سمجھو نہ حقیر — لفظ اللہ میں ہے اس کا اثر ۲/۳
کھوٹی منزل کیے دیتی ہے ندائے شام شباب — راہ رو کا ابھی باقی ہے سفر ۲/۳

آج کل گرمی کی ہے قہار گرم — ہر طرف ہے حشر کا بازار گرم
جل گیا جی شعلۂ آواز سے — مولوی صاحب کی ہے گفتار گرم
آتا ہے کچھ کچھ کے خلقت کا ہجوم — برف والوں کا ہوا بازار گرم
دوستوں کی سرد مہری دیکھ کر — اشک نکلے آنکھ سے دو چار گرم
ٹھنڈی آہیں تھیں یہ کچھ آتش نہ تھیں — آپ اتنے کیوں ہوئے سرکار گرم
سر میں سودائے دوئی دل میں بخار — ہے مزاج کافر دیں ہار گرم

ہمارے عشق نے مفہوم لفظوں کا بدل ڈالا
کہ جو دم پر بتا دے ہم اُسے ہمدم سمجھتے ہیں

حشر کا اے حضرتِ واعظ یہی مفہوم ہے
زندگی کے بعد دیکھیں گے تماشا ایک اور

آپ بے وجہ مدعی کیوں ہیں — آپ کا اس سے مدعا کیا ہے

ظریف لکھنوی

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی حضرت صفی لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے اور انہی سے مشورۂ سخن لیتے تھے طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ ان کی زندگی فوجانہ فضاؤں میں بسر ہوئی۔ وہ تفریحاً شعر کہتے تھے، مقصد ہنسنا ہنسانا اور سماجی بے اعتدالیوں کو نشانۂ طنز بنانا تھا۔ وہ جب کوئی بات اپنے ظریفانہ رنگ میں کہہ کر کہتے تو لوگوں کی لبوں پر مسکراہٹیں پیدا کر دیتے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت سے متاثر ہو کر مشاعروں سے ایک نیا رنگ یعنی مزاحیہ مشاعرے کا رواج پڑ گیا۔ اب وہ قبر کا کونا آباد کر چکے ہیں۔

میونسپل الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کو نام نہاد رہبری اور قومی ہمدردی کے بہانے اپنی عزت اور آبرو داؤ پر لگا کر دیوانہ وار ووٹ کی تلاش میں جو دربدری حاصل ہوتی ہے اس کا نقشہ ظریف نے ایک مسلسل نظم میں کمال طنز و ظرافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

واہ بی میونسپلٹی جان کیسا کہنا ترا — تو نے چکی لیلیٰ کی عاشق تیرا مجنوں کا چچا
اپنی خودداری کو کھو کر تجھ پہ جو عاشق ہوا — پھر زبانِ حال سے اس کو یہی کہتے سُنا

بس کہ دیوانہ شدم عقل رسا در کار نیست
عاشقِ میونسپلٹی را حیا در کار نیست

اس کے بعد ووٹ طلب کرنے والوں کے لئے جو پورے چار سخت مقامات آتے ہیں ان کی تصویر کشی کی ہے۔

سب سے پہلے ان کو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا — شیخ بدھو نام تھا اور تھا جُلاہا قوم کا

وہموقی باندھے مرزئی پہنے تنا بیٹھا ہوا　　اک سڑا مٹی کا حقہ پی رہا تھا کی ادا

جانتے ہی تسلیم کی جب اس کو باصد احترام
منہ کو ٹیڑھا کر کے بولا "کو ہے بالیکم سلام"

اس جگہ سے اُٹھ کے گھر پر آیا صاحب کے گئے　　دس برس ناکام رہنے پر رہے تھے جو بی۔ اے

رہیے ہیں تھے ملازم خود بھی تھے چلتے ہوئے　　آپ کی تنخواہ تو کم ٹھاٹھ تھے لیکن بڑے

انگلش اسٹائل پہ رہنے کا جوان کو شوق تھا
بوٹ بیڑی پاؤں میں کالر گلے کا طوق تھا

دیکھ کر صورت کو ان کی اس طرح کہنے لگے　　آئی ایم ویری ہنگری میک میٹ جلدی لیجیے

چرا دھر ٹلے اُدھر ٹلے گنڈی کو دیکھ کے　　اپنے کتے سے کہا کم اون ان سے گو اوے

پھر کہا یو آر گنڈی ڈیٹ بٹ نو بولڈ مین
تم کو اپنی ووٹ کیسے دیگا صاحب اولڈ مین

اس نظم میں بعض جگہ معنوی اور ظاہری بے ربطی کا جو عیب انتزاع بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب پرنسپل الکشن کے امیدوار ایک مولوی صاحب کی خدمت میں ووٹ کے لیے حاضر ہوتے ہیں تو وہ مولوی صاحب اُردو کا کمال دکھاتے ہیں۔ ظاہر ہے الکشن ان کے نقطۂ نظر کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں:

ووٹ دینے دوں گا عوض میں آپ کچھ خیرات کے　　لتنے ہی ملتے ہیں مجھ کو وعظ کے تلقین کے

حضرت والا تو خود پابند ہیں آئین کے　　اس سے کم لینا مراد دے ہری تو ہین کے

ہاں یہ ممکن ہے کہ کچھ تقلیل فرما دیجیے
ہے یہ کارِ خیر پس تعجیل فرما دیجیے

اس مشاعرہ کے عنوان سے ان کی جو نظم ہے اس کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ اس میں انھوں نے "مقامی بولی" کو اپنے اشعار میں جگہ دے کر

اور ہیئت کے مسائل کی ایک مخصوص نوعیت کی مدد سے نہ صرف کرداروں کو اُبھارا ہے بلکہ مقامی رنگ کو بھی واضح کیا ہے ؎

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آجکل حد سے سوا — چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب تو اسّی فیصدی ہیں مبتلا — مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہدِ ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آ گئی جانِ علوم

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنسِ عجیب — جو سُنانے کے لیے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب — شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضے کے قریب

چاہتا ہے سب سُنا دوں بوکھوں اکسال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

طرح کا مصرع نہیں بجلی کی ہے اک بیڑی — جڑ طرحی شاعروں بے حال اس نے غزل اک ڈھال دی
دعوتِ شعر و سخن اب دل لگی ہے دل لگی — سال میں جتنے ہیں دن تعداد ان سے بڑھ گئی

جس جگہ شرکت نہ کی جائے وہی آزردہ ہے
سب کو خوش کرتا پھرے شاعر ہی کا دل گردہ ہے

تیری پالی دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں عوام — گرد تیرے ملائفے کے اک گنور دل اژدہام
وہ غزل پڑھنا خوش الحانی سے تیرا وقتِ شام — واہ وا کا شور پھر جھک جھک کے وہ تیرا سلام

جمع ہوتی ہے تجھے ساری خدائی دیکھنے
طرح کے مصرع کے دانے پر لڑائی دیکھنے

اس طرح تعریف کرتے ہیں تری اکثر گنوار ؎
بھائی مولا بخش جس بستی میں ہم آباد ہیں — اس جگہ سا شاعر بڑے بڑھیا ہیں ماد رجاد ہیں

اہلِ سبھوں میں سیکھ بدلو اک جگت استاد ہیں — اُن کو ہر موکے کی گجلیں منہ جبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
ساجھوں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

پیسے والوں کی سمجھ میں آگئی ہے اب یہ بات — صرف بے جانا ہی گانے کا ہے بالکل واہیات
جب کوئی محفل خوشی کا ہو کہیں پر ہو برات — منعقد بزمِ سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات

پہلے اربابِ نشاط آتے تھے گانے کے لیے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لیے

ظریف زبانِ اُردو کے سچے ہی خواہ تھے۔ وہ ان لوگوں کے سخت خلاف تھے جو نئی روش اختیار کر کے اُردو کو خراب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ظریفانہ رنگ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہتے تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں اس قسم کے اشارے ملتے ہیں چند ملاحظہ ہو

علم میں جھینگر سے بڑھ کر کامراں کوئی نہیں — چاٹ جاتا ہے کتابیں امتحاں کوئی نہیں
لکھنؤ دہلی انہی شہروں پہ کیا موقوف ہے — ہر جگہ اہلِ زباں ہیں بے زباں کوئی نہیں

یا تو کپڑے بھی پہنا کر کبھی دکھلا دو ہمیں — یا تو باندھا نہ کرو شمع کا عریاں ہونا
ما مقیماں وہ دریا پہ سپیرا پڑھنا — ان کے چہرے کا وہ غصّہ سے گلستاں ہونا

صفت تو دیکھیے ہر چند ہمت خود ستائی ہے — زنانہ بہ پہن کر حجامہ مردانہ آتا ہے

ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر — ستم بھی کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں

"سفرنامۂ عراق" ان کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ان کے رنگِ سخن کے تمام پہلو نمایاں ہیں۔ یہ سفر مشتورات کا نکلا ہے تو خالص بیگماتی زبان میں ہے۔

بیوی کی جھاڑو ایسے موئے بدمعاش پہ — اُتر سے یہاں پہ کوئی کہاں اس کی لاش پر

ذکر کا ذکر کیا ہے تو اس کی زبان پوربی ہے۔ وہ ملازم سخت نالاں ہے کہ اس کو جہاز کے خلاصیوں میں لٹوانس دیا گیا ہے اور اس کی

کوئی نہیں سنتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

کھلاسیں ہیں کون سنت ہماری بات ہے
کپتان سے کہی تو سر پھاڑ کھات ہے

اور جب خود اپنا تعارف نظم کرتے ہیں تو اپنی زبان ہے اور اپنا بیان ؎

اسٹیشنوں کی بھیڑ بھی اک یادگار تھی
عورت پہ مرد، مرد پہ عورت سوار تھی

ذیل میں ان کے ظریفانہ کلام کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے ؎

جنوں میں کیوں چلا میں دوڑ کر چھو لا جو دم میرا
حماقت کی نشانی بن گیا نقشِ قدم میرا

شمیمِ زلفِ مشکیں سونگھ کر تکسیر پھوٹی ہے
ترے بالوں کی بو سے ناک میں آیا ہے دم میرا

وفورِ شوق میں معشوق کو دے نے چکتا ہوں
کوئی خلوت سرائے ناز میں دیکھے ادھم میرا

میاں فرہاد و مجنوں شیخ چلی ہیں جو لڑتے ہیں
یہ کہتے ہیں عرب میرا وہ کہتے ہیں عجم میرا

بگولے ناچتے تھے نجد میں اور قیس عریاں تھا
یہ سب کیا تھا فقط لیلیٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا

مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصورِ جانساماں تھا
خیالِ یارِ جنٹلمین کی صورت سے مہماں تھا

جنوں اک شعبدہ تھا میرے خاک اڑتے ہوئے دل کا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

ظریف اس کو طلسمِ بحر ہستی کیسا نظر آتا
جو عاشق ان کا کچھوے کی طرح سر در گریباں تھا

خیالی ہجر میں فرضی مریضِ غم کا مر جانا — یہ سب کیا ہے سلامت جھٹکے پل سے اُتر جانا
دولتی سے سمندِ ناز کی غیروں کا مر جانا — یہی تو ہے ملویے کی بلا بندر کے سر جانا
رُخِ روشن کی جُھرّی حُسن کا گویا ٹھہر جانا — قیامت ہے کسی معشوق کا سن سے اُتر جانا
مری آہوں کی توپوں کا وہ خالی خولی سر ہونا — وہ ان کا لاٹ صاحب کی طرح غیروں کے گھر جانا

ہجر کی گھڑیاں گنا کرتے ہیں عاشق رات بھر — یہ حسیں معشوق بنتے بنتے گھنٹہ گھر بنے

جب سے عاشق ہو گئے اس بُت پہ چوکیدار تک — سونے والو جاگتے رہنا صدا دینے لگے
چھوٹے عاشق اس سے بڑھ کر اور کیا دیتے ثبوت — ہو گئے گندہ دہن بوسے وفا دینے لگے
جب مسیحا سے نہ اچھے ہو سکے بیمارِ غم — ہو کے کھسیانے سبھوں کو سنکھیا دینے لگے

کوئی دل بیمار کو ڈانٹے کہ ٹھہر بھی — او نٹھالی کے بنگن تو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
گہ رُخ پہ نقاب اس کے ہے گہ ہاتھ میں تلوار — معشوق وہ معشوق جو مادہ بھی ہو نر بھی
سُن لیجے بغیر اس کے ہے تشبیہ بھی نازک — عیسیٰ ہیں اگر آپ تو اک پالیے خر بھی
تحریر کا عنواں نئی تہذیب نے بدلا — معشوق کے القاب میں ہے مائی ڈیر بھی
یہ حُسنِ نرالا ہے کہ دو عضو ندارد — معشوق وہ ہے جس کے دہن بھی ہو کمر بھی
کہتی ہے مدام صاحبِ مقدور کی اولاد — تر کہ ملے ہم کو ارے جلدی کہیں مر بھی

بلبل کہو تم شوق سے ایسے شعرا کو
اک چونچ بھی جس کی ہو ظریف اور ہوں پر بھی

دور تک آہ قفسیوں کو بھگا آتی ہے — مچھر اُڑ جاتے ہیں جس وقت ہوا آتی ہے

نفع اتنا تو ہوا اس مڈیکل کالج سے　　تیرے بیمار کے پینے کو دوا آتی ہے

رنگ غصہ میں بدلتے ہیں وہ گرگٹ کی طرح　　حسن کی اپنے دکھاتے ہیں کرامات مجھے

دال دھوئی ماش کی کھالی ہے نازک خوئے دوست　　بالش و بستر سے مجھ کو آ رہی ہے بوئے دوست
کم حقیقت نیش زن اغیار ہیں بیٹھے ہوئے　　دیکھ لو دیکھے نہ ہوں تم نے اگر پیہ ئے دوست

جناب شیخ گئے اسپتال بہر علاج

ملاحظہ ہو ذرا یہ ادائے رندانہ

مؤذن کی صدا سن کر جو مست ناز چونک اٹھا

تو یہ سمجھا کسی بلی نے پکڑی ٹانگ ٹیاں کی

کیا کرتے ہیں استعمال جو کھانے میں پاپڑ کا

رہا کرتا ہے ان کے پیٹ میں اک شور گڑبڑ کا

کہا معشوق کو قاتل تو بھنگی کیوں نہیں کہتے

یہ کیا جلاد ہو سکتا ہے مہتر ہو نہیں سکتا

فلک نما ہے بلندی میں آبلا دل کا　　جواب شیش محل ہے دو منزلا دل کا
حوادثات کی چپتیں بہت کراری ہیں　　کہیں دماغ نہ ہو جائے پلپلا دل کا

ظریف حشر میں ہوگی تلاشئ اعمال
فرشتے کھول کے دیکھیں گے پوٹلا دل کا

احمق پھپھوندوی

مصطفےٰ خان نام، احمق تخلص، لاہور ضلع آباد کے رہنے والے تھے۔ وہیں سے میٹرک کیا۔ کچھ عرصہ کالج میں پڑھا بھی۔ پھر انگریزی میں لقد ہوت کر کے بیٹھ گئے۔ کہتے تھے کہ بچپن ہی سے ان کا خواجہ افت مائل ہونے لگا تھا۔ ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ ان کا بھی ایک مطب تھا۔ وہ بھی ڈاکٹری کرنے لگے۔ اس وقت سے سیاسی مضامین کو بھی دلچسپی سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا پہلا مضمون جو شائع ہوا وہ بھی مزاحیہ تھا۔ یہ مضمون لکھنؤ کے ایک مقامی اخبار میں چھپا تھا۔ اس کے بعد وہ باقاعدگی سے مضامین لکھنے لگے۔ ۱۹۳۵ء کو ان کا پہلا مجموعہ

احمق پھپھوندوی کی شاعری میں ایک خاص قسم کے کشمکش محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ ہر چیز سے ڈرتے ہیں۔ ڈر ہی ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ ان کا کلام بھی ایک خاص قسم کے اضطراب سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے اکثر اشعار وجدان کی گہرائی اور مذاق سلیم کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ کبھی سیاست کو کبھی مذہب کو اور کبھی سماج کو اپنے ظریفانہ انداز میں نشانہ بناتے ہیں۔ ان کا انتخاب پیش خدمت ہے۔

نئی صدا بندیاں ہونے کو ہیں آئینِ گلشن میں
لہو بلبل سے اب انڈے نہ رکھے آشیانے میں

پچھتر لاکھ اک بیکار مد میں صرف کر دیں گے
رعایا کے لیے کوڑی نہیں بس کے خزانے میں

جو زاں ہے تو ہے ان کی متاعِ آبرو ورنہ
ذرا سی پیچ بھی بے حد گراں ہے ٹن ٹنانے میں

جفا و ظلم نصب العین ہو کا جس حکومت کا
یقیناً خاک ہو جائے گی وہ ٹھوٹنے ٹانے میں

وہ اک روٹی جو ہم کو برہمن مشکل سے دیتا ہے
ہزاروں بت ہوا کرتے ہیں اس کے دانے دانے میں

دلِ دیوانہ اپنا مبتلائے زلفِ پیچاں ہے
بہر صورت ہمارے جیل میں جانے کا ساماں ہے

ہوئے ہیں نامزد جب سے بڑے صاحب کے دفتر میں
جنابِ شیخ کا سینہ تجلی زارِ عرفاں ہے

طے کر چکے منازل تہذیب و ارتقا کے
ڈالیں اب اہلِ یورپ دنیا میں خوب ڈاکے

ناسوتیوں کے آگے لاہوت کے مسائل
آئے ہیں شیخ صاحب شاید کچھ آج کھا کے

سختی جہاں کئی سے اینٹھے جو خاں بہادر
بولی اجل اکڑنا اب تم لحد میں جا کے

ہے فکرِ عیش و راحت اے شیخ تجھ کو ناحق
آیا تو ہے فقیری تقدیر میں لکھا کے

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ہو نہاں ہشیار کو مدہوشِ وفا کر دے
کس طرح سے پھر لڑکے ایماں پہ رہیں قائم
وہ برقِ کلیسا جب اسکول میں لچکے
کیا فرض ہے ہم اس پہ ایماں ہی لے آئیں
ہر وہ شبِ مہمل جو فوٹو ریوٹر دے

وعدے نے عہدِ وفا عشق نے دشمن ہو گیا
وصل میرا رہ گیا ان سے کہ مس ہو گیا

یہ مجھ کو بھی امید اس بزم کے میری نہیں
ان کے ہاں کتے کی عزت ہے مگر میری نہیں

پڑھاتے ہیں انہیں تعلیم انگریزی کی ہوتی ہے
جناب شیخ کو بھی فتنہ انگیزی کی ہوتی ہے

شیخ ہی کیوں دردِ دیا موجودِ یا مفقود ہے
آپ کا مقصود راہِ عشق میں موہوم ہے
جس کے گھر میں کل کے کھانے کے لیے موجود ہے
آج وہ فرعون ہے شداد ہے نمرود ہے
کیا ہوا ہم کو اگر نانِ شبینہ بھی نہیں
آپ کی خاطر تو اے صاحب مُمَ زنو جو ہے

اللہ اللہ کس قدر سہمے ہوئے رکھتے ہیں پاؤں
خاکِ عاشق کیا ہے گویا جرمنی بارود ہے
کہتے ہو کھا جائیں گے کچا تمہے دل کو یہ کیا
وہ بھی ہے اک ناشپاتی یا کوئی امرود ہے

میرے سنبھالنے کی فکر یں تو بعد کی ہیں
پہلے ذرا تم اپنا پتلون تو سنبھالو
شام و عراق و ٹرکی سب ہیں تمہاری خاطر
مرقد کی فکر کیسا ہے چاہو جہاں بنالو

بھاگنے کی ہے یہاں راہ نہ پٹنے کی سکت
آہ لائی ہے کہاں حسرتِ دیدار مجھے
میں وہ پنڈت ہوں کہ اس نور کے اکثر عہراج
دور سے دیکھ کے کرتے ہیں نمسکار مجھے
آج کل مدِ نظر ہے مجھے صحت کا خیال
ورنہ پینے سے تو ہرگز نہیں انکار مجھے

خدمتِ قوم فروشی کو دعا دیتا ہوں ورنہ اک عمر سے تھی حسرتِ دربار مجھے

کھڑے ہو کر جنھیں پیشاب کرنا بھی نہیں آتا
وہ ناحق کرسیوں پر بیٹھنے کی مشق کرتے ہیں

یہ شوخی یہ شرارت یہ ادا آئی کہاں ان میں
مسوں کے جانے والے کہہ جو دل پر تے ہیں

وہ گل رخسارِ جاں کے باغ میں بلبل چہکتے تھے
اب ان کی قبر کا سبزہ گھسے اور بیل چرتے ہیں

گئے وہ دن کہ چمپا اور نرگس کی بہاریں تھیں
اب اب یا سیٹ ہے اس انجمن میں یا فوٹو رہتے ہیں

رقیبِ روسیہ کی صورت و سیرت معاذ اللہ
بلا تشبیہ وہ انگور کی اولاد بد ہے

سنبھل او آسماں تیلوں کے تھیلے ذرا کس لے
کہ میری آہِ سوزاں اب مکے سے بارہ ہے

خدا کی شان کپڑا ابھی ہمیں بدنما نہیں آتا
کفن کے واسطے بھی احتیاج ماپ کی ہے

پڑھ کے انگریزی دماغ اس کا فلک پر ہو گیا
جانتا ہے خود لو باور چی کہ ہلکا ہو گیا

صحبتِ صالح میں رہ کر ہو گئی اصلاحِ حال
میں گدھا تھا شیخ کے پاس آئے ٹٹو ہو گیا

خانۂ دل میں تمہاں یار رہنے دیجیے
اس مکاں کا بہ کرایہ دار رہنے دیجیے

باوجود اس اتقائے خاص کے بھی شیخ جی
بارہا پکڑے گئے ہیں اس کے گلہ جاتے ہوئے

ایسے وعدے سے تو اچھا تھا کہیں انکارِ دل
وہ جینے ہو گئے ظالم کو ٹرخاتے ہوئے

گلِ عارض پر ترے بلبلِ شیدا کی طرح
ایک آتو بھی تو کہ بخت خواں خواں نہ ہوا

چمن جب نذرِ صرصر ہونے والا ہے تو اے بلبل
یہاں یہ گھونسلے کس واسطے تو نے بنائے ہیں

جناب شیخ کی دستار ہے یادِ امنِ تقویٰ
کوئی شے یکدمے میں اُڑ رہی ہے بھیاں ہو کر

لڑکپن ہی میں جن کو دل چرا لینے کی عادت ہے
ڈگیتی پر بھی آجائیں گے وہ شاید جواں ہو کر

کہہ رہا ہے یہ آپ کا انکار
نوبت آئے گی ہاتھا پائی کی

ہائے تقریبِ وصل کیا ہوگی
ان کو عادت نہیں نہانے کی

سچ تو یہ ہے کہ شیخ جی تم نے
کاٹ لی ناک پارسائی کی

آنکھوں نے رو کے نام ہی بالکل ڈبو دیا
گنگا کا گھاگرا کا اٹک کا چناب کا

شیخ اشتہار بانٹتے پھرتے ہیں شہر میں
نیلام ہونے والا ہے ٹھیکہ شراب کا

اور رکھا کیا ہے مجھے پالش کا صلہ کیا ملتا
حضرتِ بوٹ کی سرکار سے ٹھوکر کے سوا

قدر موزوں کو جانتا ہوں مگر
شاعری مجھ کو کر نہیں آتی

تیری نگہ کے واسطے اسفندیار تو نہیں
دل ہے ہمارے پاس سنگر فالتو نہیں

ہم اور رعوضِ مطلب ان سے عدو کے گھر میں
دیکھیں تو بال کتنے رہتے ہیں آج سر میں

دل جس پہ مبتلا ہے بس ہے وہی دل آرا
مانا ہیں داغ رخ پر مانا ہے گنج سر میں

کہتے نہ تھے کہ دیکھو دشمن سے دور رہنا
اب کیا بتائیں تم کو کیوں درد ہے کمر میں

ڈر ہے جناب آتش جوتے نہ کھائیں اک دن
چھپ چھپ کے روز قبلہ جاتے ہیں ان کے گھر میں

جوش ملیح آبادی

شاعرِ انقلاب شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیر احمد خان بشیر اور دادا نواب محمد احمد خان احمد مرحوم دونوں اچھے دیوان شاعر تھے۔ جوش کے پردادا نواب سید امداد حسین بہادر تہور جنگ، نیز محمد خان گویا (شاگرد رضا علی) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جوش نے شعری فضا میں آنکھ کھولی اور شاعری کی گود میں پرورش پائی۔ ابتدا میں حزیں لکھنوی سے اصلاح لی لیکن بعد میں اپنے وجدان و ذوق ہی کو رہبر بنا لیا اور اس فن میں کمال حاصل کیا۔ اب ان کا شمار عصرِ حاضر کے ان شعرا میں ہے جو نظم و نثر دونوں پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں:

روحِ ادب، اوراقِ سحر، مقالاتِ نثر، جذباتِ فطرت، آوازۂ حق، جنون و حکمت، سنبل و سلاسل، جوش و فرش، نگار و نشاط، حسین اور انقلاب، شاعر کی راتیں، آیات و نغمات، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، عرفِ آخر، سیف و سبو، پیغمبرِ اسلام، اشارات وغیرہ۔

تقسیمِ ملک سے پہلے جوش دہلی سے ماہنامہ "کلیم" نکالتے تھے۔ تقسیم کے بعد "ماہنامہ آجکل" کے چیف ایڈیٹر ہو گئے مگر بھارت میں اپنا مستقبل تاریک دیکھ کر ۱۹۵۵ء سے کراچی آ گئے ہیں اور پاکستان کے شہری بن گئے ہیں۔

جوش کے کلام میں شکوہِ الفاظ کے ساتھ ساتھ شیرینی، رنگینی، سلاست اور نرمی ہے۔ حقائق و معارف، حسن و عشق، خوبیات اور طنزیات غرضیکہ کیا نہیں ہے۔

طنز میں ان کی ایک مخصوص روش ہے جس کا اظہار نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ان کی طنزیات میں جوش و خروش اور نزاکت و متانت زیادہ اور لطافت و گداز کم ہے۔ وہ عموماً اور شیخ کی پگڑی خصوصاً اس لیے اچھالتے ہیں کہ وہ ان کی رندی کے راستے میں روک ثابت ہوتے اور ان کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ البتہ وہ مہاجن کے حرص و ہوا کا مذاق اڑانے اور افسانہ کی عالمگیر بنیا جو دیہات کے مضحک پہلو دکھانے میں عموماً کامیاب نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کی طنز و مزاح کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

زاہد، ذوقِ معرفت دکھا دے مجھ کو
یہ کس نے کہا ہے کہ سزا دے مجھ کو

کافر ہوں! ہوئی یہ تو مرض کی تشخیص
اب اس کا علاج بھی بتا دے مجھ کو

قد کی لمبائی سے اک عذاب کمر جھولی ہوئی
سر پہ چھٹیا مُردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی

کہنیاں ٹیکے کے اندر وزن سے دھنستی ہوئی
چست صدری دائرہ پر تو ند کے پھنستی ہوئی

ہنس کے غوطے آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا

(مہاجن)

الاماں خانقاہ کی دنیا — معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند — یاں توکل ہے حرص کا پابند
یاں قناعت سے عارفانِ خدا — کام لیتے ہیں سکہ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال — ہر بُنِ مُو ہے ایک دستِ سوال
کون بہتر ہے ایزدِ باری — ان کا تقویٰ کہ میری میخواری (خانقاہ)

ہر سائنس کو وقفِ صدر شرارت کر دیں — اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ امیروں کے گناہ ہیں گناہ — دولت انھیں دے دو تو قیامت کر دیں

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا — مرحبا اے نازک اندامانِ کالج مرحبا
انکھڑیوں میں عشوۂ ترکانہ در کھولے ہوئے — سینٹ کی خوشبو میں روحِ ناز پر تولے ہوئے
خال و خد سے جذبۂ صنفِ نازک آشکار — لرزنی چہروں میں زن بننے کے ارماں بیقرار
الاماں! یہ زینتیں مونے ہیں گو اترے ہوئے — ذوق ہے گھنگرو کا گیٹس پاؤں میں پہنے ہوئے
ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار — اور ٹھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار
پاؤں رکھتے ہو دمِ گلگشت کس کس ناز سے — اے میں قرباں رن میں نکلو گے سی انداز سے

شغلِ زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمھارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

(نازک اندامانِ کالج)

اک دن جو بہر فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ — پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زہاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ — ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الہ

برپا ضمیرِ زمد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا

ہاتھ اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے — آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادہ ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے — دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک بیسکے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

زاہد صدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے — انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حسن کی گرمی سے جل گئے — کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے

افتادہ دیں کعبہ کا دیوار ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

(افتادہ حالقاد)

اے ہم نشیں فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ — رہ داد جامِ بخشی پیمانِ مغاں نہ پوچھ
ربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ — کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

کیا کہہ سکا نہ گل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

ابھرے تو جوششِ بادہ گساراں نہیں رہا — بادل گھرے تو نغمۂ رامشاراں نہیں رہا
راتیں کھلیں تو رقصِ نگاراں نہیں رہا — غنچے کھلے تو مجمعِ یاراں نہیں رہا

کوئی سبیلِ بادہ پرستی نہیں رہی
مستی کی رات آئی تو ہستی نہیں رہی

عاشق جو وصلِ یار سے خورسند ہو گیا　　فالج گرا دماغ پہ دل بند ہو گیا
اُترا بخارِ عقل کو طاعون ہو گیا　　پیدا ہوا لہو تو جگر خون ہو گیا

بخیہ ہوا تو اور بھی چادر اُدھڑ گئی
بندھن کھلے تو جسم کی رگ رگ اکڑ گئی

چلنے لگی نفست　　پہ چھری انتقام کی　　چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمان ہی کی بات چلی اور نہ رام کی　　گدی سے کھینچ گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بولکھلا گئے منہ کھولنے لگے
انسان بولیساں وہ نئی بولنے لگے

سرو سہی نہ سازِ سنبل نہ سبزہ زار　　بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم نہ جوانی نہ جوئبار　　گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گلعذار

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

(مائلؔ آزادی)

شادؔ عارفی

خان احمد علی شادؔ سنہ ۱۹۰۳ء میں ریاست لوہارو میں پیدا ہوئے لیکن تمام عمر رام پور میں رہے۔ سماج ان کی تصنیف ہے۔ نظم اور غزل دونوں میدانوں میں سنبھال سنبھال کر قدم رکھتے اور نئے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں خوبصورت الفاظ کے پردے میں بڑی لطیف اور نازک طنز ہوتی ہے اور ہلکی ہلکی ظرافت بھی۔ ایک غزل اور ایک نظم نمونے کے طور پر پیش ہے ؎

میں پڑوسی ہوں بڑے دیں دار کا　　کیا بگڑتا ہے مگر مے خوار کا؟
ہم وطن کے ہیں وطن سرکار کا　　حکم چلتا ہے مگر زردار کا

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے — "کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا"
یہ "چھپورا شخص" پہچانے اسے؟ — خون ہے اس میں کسی سرکار کا
پھر رہا ہے ناک کٹوائے ہوئے — ہاتھ رتبہ شاعرِ دربار کا
سو گئی ہو جیسے گھوڑے بیچ کر — ہے وہ عالم قسمتِ بیدار کا
واں کسی انصاف کی امید کیا — ہو بڑا ٹھڑا جہاں سرکار کا
بعض احمق تک رہے ہیں آج بھی — آسرا گرتی ہوئی دیوار کا
سب سے پی رہا ہے آج تک — شیخ بھی ہے "آدمی کردار کا"

مجھ سے بہتر ہیں مرے اشعار رشتا
باڑھ کاٹے نام ہو تلوار کا

آپ کی تعریف

یہ مدرس ہیں کسی اسکول کے

پانچ بچے ایک بیوی ایک ماں — ہیں مامانہ بہت ہیں اکم کماں؟
ان کے جوتے بغیر گر سیتے نہیں — سول بھی غائب اگر فیتے نہیں
ٹیوشن چاہیں تو کر سکتے نہیں — سر کھپا کر پیٹ بھر سکتے نہیں
لوٹ کر آئے ہوں جیسے دھول میں — یہ مدرس ہیں کسی اسکول میں

حافظِ قرآن ہیں قاری ہیں یہ

گھر پہ کچھ بچوں کو دو آنے سبق — قرأت و تجوید پر سعی ادق
پاؤں میں جوتا نہ کپڑا تن پہ ہے — نیستی چھائی ہوئی مسکن پہ ہے
لیتے ہیں صدقاتِ عیدالفطر بھی — رہتی ہے دو روٹیوں کی فکر بھی

قوم سے مایوسِ غم خواری ہیں یہ
حافظِ قرآن ہیں فنکاری ہیں یہ

معتصم باللہ نامی مولوی

آپ ہیں پرہیزگار و نیک خو
غسل کی تعلیم ترتیبِ وضو

اب تہجد چاشت جب اشراق تب
ہے تیمم کا مگر اطلاق کب

یہ صلہ اس درس اس تدریس کا
خرچ سو کا اور وسیلہ تیس کا

عہدِ نو میں ہیں سپردِ مفلسی
معتصم باللہ نامی مولوی

"لکھنؤ ٹائپ" پروفیسر ہیں آپ

اچکنیں گرمی ہیں اور جاڑے میں سوٹ
فخرِ آبا پر قصد سے جھوٹ موٹ

روز دو گھنٹے تو لیتے ہیں کلاس
اور باقی کے فیل ہو جائیں کہ پاس

پانسو تنخواہ اور "لاجنگ فری"
ہائے تنظیمِ وطن کی زرگری

حافظِ قرآن سے بہتر ہیں آپ
لکھنؤ ٹائپ پروفیسر ہیں آپ

یہ کروڑی مل، ہزاری لال ہیں

ڈاکٹر بھی ہیں طبیب و دید بھی
مطمئن ہیں ان سے بجز و بد بھی

ماہرِ امراضِ چشم و بے سند
ہوں اگر روشے بتاتے ہیں "رمد"

نذرِ پنجے بن نہیں ملتا دماغ
مفت کا پرچار کو را سبز باغ

آدمیت سے نرے کنگال ہیں
یہ کروڑی مل، ہزاری لال ہیں

ڈالیے یہ سب دوائیں صبح و شام

جی نہیں، ہو گی نہ مُرتی دور کیوں
پھٹ گیا یہ زخم کا انگور کیوں؟

اس میں پنکی اس میں وہائٹ پینٹ ہے
ہر دوا مخصوص ہے پیٹینٹ ہے
"رھو بوز" یہ ہے تو وہ "ساور ڈراپ"
تاکہ اصلیت سمجھ پائیں نہ آپ
سگرٹوں پر جن کے رکھ چھوڑے ہیں نام
ٹالیے یہ سب دوائیں صبح و شام
"مال" پہ ٹی۔ بی کلینک ان کا ہے

آپ کو تھی عالمِ بالا میں دق
داخلِ فطرت ہے جرثوموں کی شق
منتقل ہو کر رچی میں باپ میں
آپ کے دادا سے آئی آپ میں
پھیپھڑوں کا "اکس رے" کرائیے
فیس کیا حاجت ہے اچھا لائیے
مشورہ بہ طرح مہلک ان کا ہے
"مال" پہ ٹی۔ بی کلینک ان کا ہے

حرص کی دق کھائے جاتی ہے انھیں

یہ جو الجھن آپ کو دانتوں کی ہے
سب خرابی آپ کو دانتوں کی ہے
ہر مسوڑھا پیپ سے بھر پور ہے
دو روپے فی دانت کا دستور ہے
بدنما چہرے کا غم کیوں کیجئے
ایک ——— تبسم نہ بنوا لیجئے
نت نئی جالیں سکھاتی ہے انھیں
حرص کی دق کھائے جاتی ہے انھیں

ہیں تو بی۔ اے "نام ایم اے خان" ہے

یہ شکایت ہے خدا سے آپ کو
کیوں نہ مغرب سے اُتارا باپ کو
عقدِ "کالی ماں" سے فرماتے نہ یہ
اور مشرق میں جنم پاتے نہ یہ
ناچتے جا جا کے "رائل بال" میں
پھانستے شہزادیوں کو جال میں
ان کی "رنگت" پہ "توا" حیران ہے
ہیں تو بی۔ اے نام ایم اے خان ہے

لائے ہیں لندن سے بوڑھی میم ساتھ

ڈالیاں تجھے سفارش، اے شباب — آئی۔ سی۔ ایس کو کلیدِ فتح باب
"فیملی ممبر" بنے تھے اس کے ماں — چشمِ مغرب میں شعورِ سن کساں
الغرض پلٹے جو صاحب اپنے گھر — تھے یہ "ناکارہ سلیپر" ہمسفر
آپ سے پہلے ملا تو اس سے ہاتھ — لائے ہیں لندن سے بوڑھی میم ساتھ

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت ۱۸۹۱ء میں پونچھ (کشمیر) کے ایک گاؤں میاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں لاہور آگئے۔ یہاں انہوں نے کالج کا امتحان دیا اور صحافت کو پیشہ اختیار کر لیا لیکن کچھ دنوں بعد کلکتہ جا کر اخبار نویسی ترک کر دی اور عملی زندگی شروع کر دی۔ وہاں انہوں نے استعفا دیا اور پیغام وغیرہ جرائد میں ادارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کونسل کے نام سے ۱۹۳۲ء میں ہفت روزہ نکالا۔ ۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خان، فضل حسین، احسان، احمد شاہ، شہباز، شیرازہ، تہذیب، ہمدرد، ادیب، اخبارات کے ادارتی عملے میں شامل ہوئے اور ہمدرد میں کام کیا اور ہمدرد ہی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔

دوسری جنگ کے شروع میں فوجی اخبار کے ایڈیٹر ہو کر برما اور ملایا گئے۔ مختصر واپسی کے بعد روزنامہ امروز کی ادارت سنبھالی۔ امروز سے کو یہاں سے مستعفی ہو کر ریڈیو پاکستان میں فوجی پروگرام مرتب کرنے پر ملازم ہو گئے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد نوائے وقت میں "میرا صفحہ" کالم لکھنے لگے۔ اس دوران میں آپ کا دل کا عارضہ ہو گیا اور آپ ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

حسرت ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ بے مثال مزاح نویس اور طنز نگار بھی تھے۔ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ سیاست کے نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف تھے اس لیے ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور ترک کی سیاسی نزاکتوں پر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب روشنی ڈالتے اور سیاسی شخصیتوں کے بظاہر سنجیدہ مگر چھپے ہوئے مضحک پہلو نمایاں کرنے میں کمال کر دکھاتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے متعدد رسالے تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں:

جواہر پنجاب جدید، مرد دیدہ، مرد ڈاکٹر، کیلے کا چھلکا، تبرے کے خطوط اور مقالات وغیرہ۔ پہلی اقبال کشمیر اور مرگ مشتاق اسلم بھی آپ کی چند قابل ذکر کتابیں ہیں۔

حسرت طنز و مزاح کی تخلیق میں مبالغہ، مواز، واتمہ، یذکر سبقی، جگت بازی، تحریف و تصرف اور لفظی الٹ پھیر وغیرہ تمام ہتھیاروں سے کام لیتے اور ٹکسالی زبان استعمال کرتے تھے اس لیے ان کے طنز و مزاح میں ہر قسم کے رنگ ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر نثر ہی میں لکھتے تھے لیکن جب کبھی موڈ میں آتے تھے تو ان کے مزاحیہ کلام میں اشعار بھی ٹپک پڑتے تھے۔

اتحاد پارٹی کی شان میں چند ٹپے دیکھیے ؎

تیرے گورے گورے گال — اتحاد پارٹی
تیرے لمبے لمبے بال — اتحاد پارٹی
تیرا یار ترسیندر ناتھ — اتحاد پارٹی
سارے ووٹ تیرے ساتھ — اتحاد پارٹی

جب یہاں ممتاز دولتانہ اور یہاں عبدالباری یکے بعد دیگرے عدم تعاون کے مرتکب ہوئے تو حسرت نے یہ مزیدار کمیت لکھا :

چنا جور گرم

میرا چنا ہے سب سے نیارا — جس کو کھائے عالم سارا
مذنبی، متصدی، چٹواری — بما، فسنا عبدالباری

چنا جور گرم

میرے چنے کا ڈھنگ نرالا — اس کو کھائے قسمت والا
اس کے کاٹک طرے والے — یعنی ہپ ہپ ہرے والے
سارے نہاجر اور انصاری — چیمہ، لدھیانوی، عبدالباری

چنا جور گرم

حسرت کا انداز تخاطب شستہ و رفتہ ہونے کے علاوہ نہایت شگفتہ ہوتا تھا۔ وہ جب کسی پر چوٹ کرتے تو ان کی طبیعت کھل کر جوہر دکھاتی۔ ایک رسالے میں ہمارے یاں ادب لطیف اور بلیٹک ورس کا بڑا چرچا تھا لیکن اس مال کی کھپت اس کی پیداوار کی متحمل نہ ہو سکی حسرت نے اس منحوس ادب کا مذاق اڑاتے اڑاتے کئی طنزیہ نظمیں گھڑ ڈالیں۔ ایک نظم دیکھیے ؎

چٹیں لکھتے تھے جب اخبار میں ہم
تو مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر
سنا ہے کیا کہا انگور نے آلو بخارا سے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
یہ بھینسیں، آہ یہ بھینسیں!
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے جن کی جگالی کے
مرے کمرے کی تنہائی میں اکثر آ نکلتی ہیں
لیے شبنم کی چادر اور کفن نرگس کے باوا کا
کہا موسن نے مچھر سے
کہ میری روح کا نغمہ مرے صندوق میں ہوگا
میں بھول آیا ہوں گچھا چابیوں کا آج دفتر میں
ہوا مدت سرت اپنے مجھ کو حصہ آپ لے بیتے
کسی کا کیا بگڑ جاتا مرا لاہور ہو جاتا

مجید لاہوری

مجید لاہوری کا خاندانی نام عبدالمجید چوہان اور تخلص نام نہاد لاہوری تھا۔ ۱۹۱۴ء میں بمقام گجرات پیدا ہوئے اور ۲۶ جون ۱۹۵۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ زریعہ معاش صحافت تھا۔ کراچی سے پندرہ روزہ نکلدان نکالا تھا اور روزنامہ جنگ میں فکاہی کالم "حرف و حکایت" لکھتے تھے۔ نثر و نظم کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ باقی کتابیں ابھی یہ مطبوعہ ہیں جن کے نام یہ ہیں: تصویریں، غزلیں، کان نمک (مزاحیہ نظمیں) نمک پارے (مزاحیہ مضامین)، دود آسمان (غزلیات)، جنت نمک و کلام، سفرنامہ۔

مجید لاہوری کی متین شاعری بھی اگرچہ بے حد فنی رہے مگر انھوں نے مزاحیہ نظم و نثر میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ وہ طنز و مزاح کو شیرو شکر کر کے ملک کے ہنگامی واقعات اور معاشرے کے بعض نقائص اور غیر صحت مند رجحانات کو بدف ملامت بناتے اور پھر لپیٹ دار کرتے ہیں۔ نظر اور نثر کے جوہر سے بھی کام لیتے ہیں لیکن ان کے پاس موضوعات اور مواد کی کمی نہیں۔ وہ اپنے خیالات کو دلکش انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ——— خنڈہ ایکٹ، روم ہمارے کے بعد آزادیوں کا دور ہے، دستور جن رہا ہے، گدھے، اک پیسے میں چار دیکھو، دے خدا کی راہ ہیں، گل شیر خاں کو ووٹ دو، یہ کیسی آزادی، گڑبڑ، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں، نئے بھکاری، ملک اپنا ہے راج اپنا ہے، کل بھی ہم آزاد تھے آج بھی آزاد ہیں،

بنام جہاں دار جہاں آفریں، حمید مبارک۔ موضوعات کی اچھی اور کامیاب نظموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

"مکمل ایک منسٹر دل" ان کی بہترین طنزیہ نظم ہے جس میں انھوں نے ہمارے حکمراں طبقہ کی اس ذہنیت کا خاکہ اڑایا ہے جس کے تحت وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور یہ جانے بوجھے کہ پبلک میں ٹھٹھا اڑانا اور مذاق سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ؎

مرغیوں پر بھی میں کر سکتا ہوں اظہارِ خیال
اور ساتھ ہی بھی ہوں غل میں گرفتارِ مقال

بیس کے گھوڑوں پہ بھی تقریر کرتا ہوں میں
اکبر و اقبال کی تفسیر کر سکتا ہوں میں

ہو میونسپلٹی کا ہو یا دندان سازی کا کمال
یا غبانی ہو کہ ہو رندی و رازی کا کمال

بات پھولوں کی ہو یا توپوں کے ڈھالنے کا بیاں
چاٹ ہو یا مرثیے کی کہ ہوا رُدو زباں

بوعلی سینا کی حکمت بات افلاطون کی
ایگریکلچر ہو یا شق ہو کوئی قانون کی

داغ کا دیوان ہو یا ہو وہ ایٹم بم کا راز
ماہی گیری ہو کہ ربط و ضبطِ محمود و ایاز

مسئلہ تاریخ کا ہو یا بحث علم کا
غلہ کا قحط ہو کہ ہو قصہ قسم کا

کشتنی فولاد ہو یا شربت و سیب و رطب
ہے ضروری سب پہ پیری جائے کا اظہار ہو

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
شوق ہے دل میں مگر قرآن کی تفسیر کا

جتنے بھی شعبے ہیں ان سب پر ہوں میں چھایا ہوا
ہوں منسٹر مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تقسیم کے بعد ہمارے معاشرے کو جن سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑا ان کا خاکہ اس طرح اڑاتے ہیں ؎

ہلاکت خیزیوں کی یہ بھلائی ہے جہاں میں ہوں
نہ آیا ہے نہ باوا اسے نے نائی ہے جہاں میں ہوں

بس اک شے موت ہے جو نیر سے ملتی ہے بے راشن
وگرنہ ساری چیزوں کی گرانی ہے جہاں میں ہوں

ابھی تک "پگڑیوں" میں ہے شکوہِ تاجِ سلطانی
ابھی تک شوتوں کی حکمرانی ہے جہاں میں ہوں

ابھی ہیں چور بازاری کی سینہ زوریاں باقی
غریبوں مفلسوں کا خون پانی ہے جہاں میں ہوں

ماڈرن آدمی کا ایک بہت پرانے شاعر نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم کی کتنی اچھی پیروڈی ہے۔

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ — وہ بھی ہے آدمی کہ ملا جس کو گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ — وہ بھی ہے آدمی جو اٹھائے ہے سر پہ کھاٹ

مر بڑھیں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
رکھشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(پیروڈی اب اتنا آسان کام نہیں رہا جتنا آگرہ بننے سے پہلے تھا۔ اپنے بھرپور تاثر کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی۔ اس میں انھوں نے بعض نمودار عناصر زندگی کی فریب کاریوں کا یوں ذکر کیا ہے کہ وہ فرد و مکلف کی ترقی و بہبود کے نام پر سادہ لوح عوام کو لوٹنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔)

مجھ کو دلاتا دلا! ہوگا تیرا بھلا! مجھ کو دلاتا دلا!

اے پلاٹوں کے مالک تری خیر ہو — اے لائسنسوں کے مالک تری خیر ہو
کوئی کوٹھی دلا، کوئی پرمٹ دلا! — چھاپہ خانہ دلا، کارخانہ دلا!
پمپ پٹرول کا یا سینما دلا! — بس نہیں کوئی تو بس کا اڈہ دلا!

قوم کے نام پر مجھ کو دلاتا دلا
ہوگا تیرا بھلا

بام گردوں پہ تیرا ستارہ رہے — زندگی میری کیوں بے سہارا رہے
میرے کشکول میں لیڈری ڈال دے — کر ٹکٹ مرحمت ممبری ڈال دے
کوئی مل یا جننگ فیکٹری ڈال دے — کوئی ہوٹل کوئی کمپنی ڈال دے

قوم کے نام پر مجھ کو دلاتا دلا!
ہوگا تیرا بھلا

عالم رنگ و بو میں تو پھولے پھلے — نام کا تیرے دنیا میں سکہ چلے

مجيد
الاهوري

یا قیادت دلا یا صدارت دلا　　یا وزارت دلا یا سفارت دلا
گنج بخشا! تو گنج سعادت دلا　　اپنے خادم کو تو بہرِ خدمت دلا

قوم کے نام پر مجھ کو داتا دلا

ہوگا تیرا بھلا

تجھ کو شاد اور آباد رکھے خدا　　خوب چشمہ ہو جاری ترے فیض کا
کوئی پرمٹ ملے، کوئی ٹھیکہ ملے　　کوئی امپورٹ لائسنس اچھا ملے
جاہ کی بھیک عہدے کا صدقہ ملے　　کچھ تو مالِ غنیمت کا حصہ ملے

قوم کے نام پر مجھ کو داتا ملا!

ہوگا تیرا بھلا

شفیع عقیل صاحب نے "مجید لاہوری" نامی کتاب میں تجنیس کے بہت سے نظم و نثر کے نمونے جمع کر دیے ہیں اور ان کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں زیادہ کی گنجائش نہیں، صرف چند متفرق اشعار دیکھیے جن میں دراوڑا سے تصرف سے انھوں نے باپ کو ماں سے کما پہچاری ہے ؎

نوٹ ہاتھوں میں وہ رشوت کے لیے پھٹتے ہیں
"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے"

معرکہ "چالو" ہے ووٹوں کی طلبگاری کا　　"امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا"

"بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے"　　اور پھر اس میں مہاجر کو بسایا چاہیے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا "گداگری"　　کچھ "لیڈری" ذریعۂ عزت نہیں مجھے

کیا ہے "مولوی گل شیر" نے "چیلنج" بھولو کو　　ادا ہو شکریہ کس طرح امریکا ترے گھی کا

خدا کے واسطے مجھ کو منسٹری دے دو — "مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے"

ہر طرف جاری ہیں "کرسی" کے لیے سرگرمیاں — آ گئی اپنی سیاست میں بھی گرمی "جون" کی

"یہاں پکڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں" — نہ جائیں واعظ و دیں دار دن یونٹ آ کھیلی ہیں

"سیاست بے ضیافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" — "ڈنر" ہالوں میں جس میں سیاست کی کچھ کہتے ہیں

زاہد کو سکھاوتے ہے آداب پہ مجلس کے — پیتے ہیں شراب اوّل کھاتے ہیں کباب آخر

گدھوں پہ لاد کے ہم بوجھ "ذمہ داری" کا — یہ کہہ رہے ہیں کوئی آدمی نہیں ملتا

علّامہ حسین میر کاشمیری

سالِ پیدائش ۱۸۹۱ء ہے۔ اس وقت زندگی کی بیسویں بہار دیکھ رہے ہیں۔ تعلیم ثانوی مراحل سے آگے نہ بڑھ سکی مگر عربی فارسی اردو اور انگریزی میں اچھی خاصی استعداد رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک ہفت روزہ اخبار مرتب کر کے اس کی تین چار درستی کاپیاں اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اس پر پرنٹ لائن اور رجسٹرڈ نمبر ایل نقل مطابق اصل درج ہوتا تھا اس طرح ان کی معصوم ہابی کا یہ شاندار نتیجہ کسی اچھے اخبار کی جاذبِ توجہ پیروڈی بن جاتا تھا۔

پونے نو سال ریلوے کے تار گھر میں کام کرنے کے بعد حبِ ہجرت کی تھپکی شروع ہوئی تو سب کچھ چھوڑ کر کابل جا پہنچے مگر نہایت کامیابی سے سپا ہوتے اور اس نقل و حرکت کی مختصر روئداد مرتب کر کے داستانِ ہجرت کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی۔ اس روداد کے مضمون نویسی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ "کشمیری بچے کا قومی گیت" کے عنوان سے اقبال کے قومی ترانے کی پیروڈی روزنامہ سیاست کے اخبار کے ہمراہ پیش شائع ہوئی۔ زمانہ اور تعلیمی گزٹ میں بھی دو ایک مضمون چھپے۔ زمیندار میں چھوٹی چھوٹی خبریں مراسلوں کی صورت میں لکھیں۔

ان دنوں تحریک خلافت خوب زوروں پر تھی اور امرتسر اس کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ان کے رفقاء نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر اس میدان میں ڈٹے ہوئے تھے مگر چند آزاد جو لوگ کہلاتے تھے قومی بیت المال کو شیرِ مادر سمجھ کر گناہ و ثواب کا خیال کیے بغیر خوب گلچھرے اڑا رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر آپ نے طنز و مزاح کے حربوں سے کام لیا اور ضیافت کمیٹی کے نام سے ایک مختصر سی مجلس مرتب کر لی۔ یہ دراصل خلافت کمیٹی کی پیروڈی تھی۔ اس کا سب سے پہلا شکار ایک

تیسرا آرٹیکل جس کا عنوان تھا:

"آل انڈیا ضیافت کانفرنس"

اس میں لکھا تھا کہ اکتیس نومبر کو رات کے بارہ بجے ایک عظیم الشان جلوس نکلے گا جو شہر کے مختلف حصوں سے گذرتا ہوا قبرستان میں ختم ہوگا وہاں مقامی مُردہ سیمیں تازہ قبروں پر بیٹھ کر کھسوٹیں گے اور اپنے نام نہاد مذہبی وقار کی آڑ میں محاسبہ سے بچ کر جو فرد اس متعفن کو طلوع آفتاب تک جاری رکھیں گے۔ اس کے بعد کانفرنس کی کارروائی شروع ہوگی ——— جلوس کی موٹریں سوار ہونے کی آسان ترکیب ——— تین مرکزی مہمانوں کے ساتھ تین سو مقامی میزبانوں کی شرکت ——— یا دو خوری کے مستند طریقے" چند خوری کو تم ٹھکیس سے منسوخ رکھا جائے" ایک اہم مطالبہ "اشتہار کی پمپوائی اور کاغذ وغیرہ کا خرچ بارہ روپے سکہ لیبر کے لیے بید کے کی قیمت تین سو روپیہ ——— ایک پولیٹیکل ڈکار سے چھ ہزار روپیہ نقد وغیرہ وغیرہ۔

طنز و مزاح کا یہ شعبہ بے حد نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ عوام کی اکثریت میں آماندہ و خاسہ کا احساس پیدا ہوگیا اور یہ بات رفتہ رفتہ ستر اصل خلوت کیشی تک جا پہنچی۔ وہاں سے ایک وفد جو مولانا محمد علی، مولانا عرفان اور ایک اور صاحب پر مشتمل تھا، امرت سر پہنچا اور انھوں نے ڈاکٹر کچلو سے ملنے کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور ایک تحریر رپورٹ مرتب کی

اس کے ساتھی آپ نے اخبار ضیافت پنج جاری کیا اور طنز و مزاح کے پرچے میں خوب چاندماری کی۔ رحمن انصاف سے مولانا ظفر علی خاں امرت سر کتے، وہ ان کی مصلحتوں سے واقف ہو کر انھیں زمیندار میں لے آئے۔ یہاں ترجمہ کی مشق بھی ہوگئی اور آپ انواع و اقسام کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن بھی دینے لگے۔

علامہ حسین سرور اپنے نئے شاعر کے کلام میں تعریف کر کے اسے اپنا لیتے کا ڈھب خوب جانتے ہیں آپ کی مزاح نگاری کا پیش منظر تو موٹا پاؤ، قورمہ قیمہ، بریانی، کوفتے، مُرغِ مسلم جیسے مرغن کھانے ہوتے ہیں لیکن، اس کا پس منظر ایک ترکش ہوتا ہے جس کے ترکش میں تیر ہوتے ہیں مشرق و مغرب کی سیاست، ہندوستان کی داخلی و خارجی حکمت عملی، غرض پرست ملکی لیڈروں، دکاندار صوبیوں اور نمائشی پیروں کو نشانہ بنا لیتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ شاعری جدید خرافت کی خوبیوں سے معمور ہوتی ہے۔ ایک نقاد کے خیال میں "سچ تو یہ ہے کہ ان کے علم و فضل پر ان کی مزاحیہ نگاری نے پردہ ڈالا اور مزاح نگاری کے لیے ان کی مجبور مزدوری سنگِ راہ بن رہی ہے"

(بہار ستان صفحہ ۲)

اقبال کی مشہور نظم "مرغِ اسیر کی فریاد" مانگ وارا میں موجود ہے اس کی پیروڈی "لیڈر کی فریاد" ملاحظہ فرمائیں ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ — وہ کانگرس کے چندے وہ سب کا مل کے کھانا

وہ آشرم کے بھوجن وہ سیر موٹروں کی — پھولوں میں لد کے آنا پھولوں میں لد کے جانا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — وہ دیویوں میں مل کر بھارت کے گیت گانا

بھارت پجارنوں کو بلوا کے آشرم میں — چرخے کی شان لے کر تکلے کے گن بتانا

آتا ہے یاد مجھ کو .....

۱۹۳۶ء کی جالندھر ڈویژن کے دوران میں حکومت کی طرف سے جا بجا مشاعرے ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ لائل پور ٹورسٹ کلب ہال میں ہوا جس میں حضرت جگر مرادآبادی نے ایک غزل پڑھی جس کی ردیف تھی "ہوتی جاتی ہے" اور قافیہ تھا "عالم" (عالم وغیرہ)۔ طلسم کے "تخلیص" آپ نے اس کی پیروڈی کر ڈالی اور شام کی نشست میں یہ غزل سنائی ؎

قیامت ہے کہ زورِ اشتہا کم ہوتا جاتا ہے — نظامِ جسم کم کھانے سے برہم ہوتا جاتا ہے
بڑھائی میں متخن کی یہ عالم ہوتا جاتا ہے — کہ روزِ عید بھی روزِ محرم ہوتا جاتا ہے!
مدارِ روزگارِ سفلہ پرور! تا مشا کن! — نصیبِ احمقاں مرغِ مسلم ہوتا جاتا ہے
مجھے تیتر کھلا کر جان ڈالی جسمِ مُردہ میں — ترے ہوٹل کا بٹلر ابنِ مریم ہوتا جاتا ہے

گرائے کوفتوں کے بم یہاں کس رشکِ ہٹلر نے
ہمارا پیٹ بھی قصرِ بنگھم ہوتا جاتا ہے

جنگی پیسٹی کے سلسلے میں ایک بہت بڑا سرکاری مشاعرہ لاہور کے منٹو پارک (اقبال پارک) میں بھی منعقد ہوا۔ اس وقت کے وزیرِ تعلیم مرحوم عبدالمجید سالک صدرِ مشاعرہ تھے۔ جب علامہ کا نام پکارا گیا تو آپ نے اس لہجے کے ساتھ "ذیلی انقلابات" تو آپ آئے دن مشاہدہ فرماتے رہتے ہیں اب ذرا "انقلابِ آسمانی" کی جھلکی سی کیفیت بھی ملاحظہ فرمائیں" یہ غزل پڑھی جس کے پانچویں شعر میں سائمن کمیشن کی سفارش پر ملنے والے ڈومی نین سٹیٹس کا خلاصہ ہے ؎

کیا خبر تھی انقلابِ آسماں ہو جائے گا — قوسِ قزح نصیبِ احمقاں ہو جائے گا
ظلمتِ باطل کے دامن میں چھپے گا نورِ حق — دال کی آغوش میں قیمہ نہاں ہو جائے گا
کیک بسکٹ کھائیں گے الّو کے پٹھے رات دن — اور شریفوں کے لیے آٹا گراں ہو جائے گا
کنٹرول اس کے لبِ شیریں پہ گر یوں ہی رہا — کھانڈ کا شربت نصیبِ دشمناں ہو جائے گا
اے مجھے تیتر نہ ڈر باورچیوں کی قید سے — پیٹ میرا تیری خاطر آشیاں ہو جائے گا
اے سکندر مرغ کا ہے شوربا آبِ حیات — خضر بھی اس کو اگر پی لے جواں ہو جائے گا

جب یہ کہتا ہوں کہ کچھ سامانِ دعوت کیجئے
وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ "ہاں ہو جائے گا"

حکیم مشرق علامہ اقبال صوبائی کونسل کی کمپنسل کے ممبر ہوئے تو علامہ حسین بیہ نے ان کے مزاحیہ اشعار کی یاد تازہ کرڈالی۔ صرف تین شعر دیکھیے ؎

ہم حجرے کے مکینوں کا دل کونسل میں جا اٹکا ہے
واں ورشن روز گورنر کے یاں حشر کا ہر دم کھٹکا ہے
انگریز کے خوانِ نعمت پر گر قاب ہو مرغ مسلم کی
اے شیخ و برہمن مت پوچھو قربانی ہے کہ جھٹکا ہے
مسجد میں گیدا بائی نے کوٹھی سے نکالا پہنے
اقبال بچارے ڈوڈی کا اس وقت ادھر میں لٹکا ہے

مولانا عبدالمجید سالک نے جریدہ صلاحت کے دنوں میں ایک نہایت ہی شاندار اور بلند پایہ نظم ارشاد فرمائی تھی جو اس طرح شروع ہوتی تھی ؎

تمھیں سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

حضرت علامہ کو یہ نظم بہت پسند آئی اور آپ نے اسی کے ردیف قافیہ کو لے کر پیڈوں کا تانگی تانا کے عنوان سے مندرجہ ذیل ہیر ڈوڈی کہی ؎

تمہی سے اے شکم ورو تو ہے اور پرات ہے — تمھاری تو دمابہ قدورا سیاست ہے
تمھاری ہی ڈکار سے خروشِ شش جہات ہے — نہ یافتی مجاہدو تمھاری کیا ہی بات ہے
جو تم نہ ہو تو بے ضیا یہ ساری کائنات ہے

کرو جو بزم میں کبھی نمائشِ دلاوری — تو کانپ جائے میز پر رکابی اور طشتری
جو گردنِ پرند پر رواں ہو تیز تر چھری — تو جذبۂ شکم وری یہ کہہ اٹھے "ہری ہری"
بٹیر کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

جو کوفتوں کو دیکھ کے تو نیرنی کو چیٹ کیا — جو شوربے پہ آگرے تو مالی ایک مٹ کیا

کلوا سے لے کتا گلو کا دم تم نے جھٹ کیا　　قضا جو لائی ہیضے کو تو اف کیا نہ بٹ کیا
قضا سے بھی جو نہ ڈرے وہ پٹیوں کی ذات ہے

کباب مرغ سے اگر بچی ہوئی ہو شتری　　تو اس کو کھا کے فربہی میں مستقل ہو لاغری
گھٹیں جو چند لطفیں بڑھیں جہاں میں اُنتی　　کٹیں جو چند مرغیاں تو قوم کی ہو زندگی
لہو جو ہے خروس کا وہ قوم کی زکوٰۃ ہے

کہا میں تیغ زن وہی کریں جو ذبح مرغیاں　　چھری سے کھائے خوف ہو چلائے کیسے گولیاں
دفاع ملک کی وہی اٹھائے ذمہ داریاں　　جو کھائے سُرخ کوفتے پیے سفید یخنیاں!
غلام ہے وہ فطرتاً جو وقف دال بھات ہے

اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم "اے مسیح کہیں لے چل" کے تو نے پر "اے پیٹ کہیں لے چل" اور "ہوالاثر حقیقت" جیسا نہ ھری کی نظم "یوں وقت گزرتا ہے فرحت کی تمنا میں" کے تتبع میں "یوں وقت گذرتا ہے روٹی کی تمنا میں" بھی آپ کی پیروڈیاں ہیں۔ دہلی کی غزل آپ نے ۱۹۲۰ء میں کہی۔ رخلد (ریاست) کے طرحی مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ اس کا ایک ایک شعر اشتہا انگیز اور نقش معدہ کو تیز کرنے والا ہے۔

بحر فلزم جو بنے چائے کا دریا ہو کر　　عکس خورشید نظر آئے گا قلچا ہو کر
اُترے مہتاب زمیں پر جو پراٹھا ہو کر　　آسمہ چرخ بریں آئے کچوڑا ہو کر
اڑکے بیٹھے جو کوئی ریگ کا چمچہ ہو کر　　پائے گا اپنی مرادیں بدِ طولیٰ ہو کر
ہو نہ مغرور سرِ دار پہ چڑھ کہ منصور　　چڑھ گئے سینکڑوں یاں سیخ پہ قیمہ ہو کر
اے طبیبو! کوئی تجویز نکالو ایسی　　چائے نسخوں میں لکھی جائے بنفشا ہو کر
کہ فقط خواب میں بھی تو جو برہمن کھالے　　توڑ دیں تپ کو ترے آلو بخارا ہو کر
عقد بریانی کا جس وقت متیخن سے ہوا　　لُٹ گئے مفت میں واں شیخ چھوہارا ہو کر

اپنی ہستی سے گزر جا ہے جو دنیا میں فروغ　　قدر شلغم کی ہوئی دیگ میں کشتہ ہو کر

پیشتر ہستی مطلق سے مقامات فنا
بچۂ مرغ نے طے کر لیے انڈا ہو کر

ایک غزل کے تین شعر ؎

مدتوں کھاتا رہا ناداریٔ ملت کا غم
تب ملے جا کر کہیں شب دیگ کے شلغم مجھے

المدد اے جذبۂ مرغ مسلم! المدد
آج ڈربے میں مچلتا ہے ذرا تو تھم مجھے

اپنے مطبخ کا بناؤں آشپزی میں نظم
گر کہیں مل جائیں ہنڈیا برگ یا دیسم مجھے

ایک غزل کا مطلع ؎

میں شہید دیگ ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری!
خانساماؤں کے کندھوں پر اٹھے میت مری

ایک غزل کا حاصل غزل ؎

آرزو انگیز ہے جاناں کے مطبخ کی فضا
جو دھواں چمنی سے اٹھا عشق پیشہ ہو گیا

خضر تمیمی

میاں مولا بخش خضر تمیمی ایم اے۔ ایل ایل بی ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر لاہور آکر اسلامیہ کالج سے ایم اے اور لاء کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ اس کے بعد کئی روزناموں مثلاً احسان (۱۹۲۹ء) جمہور (۱۹۳۰ء) حریت اور ہفتہ وار جہاں نما اور ماہنامہ خیال لاہور میں کام کیا۔ طبیعت مزاح کی طرف زیادہ مائل ہے۔ شیرازہ اور نگلدان وغیرہ مزاحیہ پرچوں میں آپ کی اکثر تحریفات شائع ہو کر مقبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ نثر میں آبِ حیات کی پیروڈی خاص طور پر قابلِ تعارف ہے۔ آپ کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومتِ پنجاب کے محکمہ دیہات سدھار و پنچایت نے آپ کو اپنا تعلیمی افسر مقرر کیا۔ اس سلسلے میں آپ پنجاب کے گاؤں گاؤں پھرے۔ جگہ جگہ تبلیغ کی اور دیہاتیوں کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی محکمہ کے ترجمان اخبار پنچایت بھی مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء کی مسلم لیگ تحریک اور جنگِ آزادی میں آپ نے جو قابلِ قدر خدمات انجام دیں وہ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں۔ آپ ٹلنڈر کے قلمی نام سے نوائے وقت میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ لاء کالج لاہور میں لکچرار بھی رہے۔ اب وکالت کرتے ہیں اور اچھے قانون دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ کی بیشمار تحریفات میں سے چند یہاں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے آپ کے رنگ طبیعت کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا

مرزا محمد رفیع سوداؔ کا ایک شہرۂ آشوب ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے — دعوٰی نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
گھوڑا ہے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے

خضر تمیمی نے اپنی نظم "کال کا سماں" میں اس کی پیروڈی کی ہے اور اپنے زمانے کا نقشہ کھینچا ہے ؎

اے خضر عجب رنگ پہ نیرنگِ جہاں ہے — آنکھوں تلے ہر وقت قیامت کا سماں ہے
از بسکہ گرانی کا یہاں سکہ رواں ہے — سر اپنا بھی اب دوش پہ اک بارِ گراں ہے

جینے کے تصور سے بھی ہوتی ہے گرانی
قحطِ عشق پہ اور جائے جہنم میں جوانی

مزدور جو ہیں ان کے لئے کام ملے ہیں — اور مال تجارت کے بہت دام ملے ہیں
صنعت کو بھی کچھ اوج کے ایام ملے ہیں — دولت کے تو دیدار یہیں عام ملے ہیں
پردے میں فراغت کے مگر قحط نہاں ہے
یا دھوپ کے ہوتے ہوئے بارش کا سماں ہے

اب آئے کہاں اطلس و کمخواب کی چادر — اک چادر عصمت ہے یا ہے آب کی چادر
جی میں ہے پہن لیجئے بس خواب کی چادر — یا شب کو چرا لیجئے مہتاب کی چادر
جیتے ہوں تو ملبوس ہوں عریانی تن سے
مر جائیں تو آزاد رہیں ننگ کفن سے

چینی گئی ایسی کہ وہ باہر سے نہ گھر میں — افسوس کہ اب زہر ہوا شیر و شکر میں
اس لب پہ شکر خند نہیں آج نظر میں — شیرینی بھی باقی نہیں اشعار مختصر میں
کہتا ہے کہ یہ فن سخن کھیل نہیں ہے
تر کیسے زباں ہو کہ یہاں تیل نہیں ہے

• ہاتھ کی روانی • مختصر قطعی کو ایک لاجواب نظم ہے۔ یہ حضرت اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم "آپ لوڈر" کی پیروڈی ہے۔ اس میں کسی شیر و شکر خوان دوست کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے ؎

یہ ہے آج ہی رات کی داستاں — کہ تھے مہماں میرے اک مہرباں
غریبانہ کھانوں کو وہ دیکھ کر — ہوئے صورت باز کچھ تیز پہ
مجھے ٹالنا اس کا شوار ہے — کہ دور نظر کا یہ اصرار ہے
دکھاؤں میں حضرت کے کھانے کا ڈھنگ — مکھوں ان کے طوطے اڑانے کا رنگ

مگر کس طرح ماجرا یہ لکھوں — کہوں بھی تو یہ بات کیونکر کہوں
قلم کانپتا ہے وہ آہی نہ جائیں — اور ہڈی سمجھ کر چبا ہی نہ جائیں
زباں بند تیس دانتوں میں ہے — کہ پھر شور کچھ ان کی آنتوں میں ہے
جو تھیں وقتیں کہہ چکا زیرلا — غرض دیکھئے ہاتھ ان کا چپلا
پلیٹوں میں ہلچل مچاتا ہوا — وہ چمچے سے چمچا لڑاتا ہوا
پلاؤ میں سالن ملاتا ہوا — وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ بوٹی پہ چڑھ کر لپٹتا ہوا — وہ روٹی سے بڑھ کر چمٹتا ہوا
فقط شوربے سے کھسکتا ہوا — مربے سے جا کر لپکتا ہوا
گیا دال پر دندناتا ہوا — وہ مرچوں سے دامن بچاتا ہوا
وہ پھیکے سے چلو بناتا ہوا — وہ آلو کو اُلو بناتا ہوا
سویوں پہ سو جاں سے مرتا ہوا — ادھر لاڈو لڈو سے کرتا ہوا
پسند اس پسندے کو کرتا ہوا — تو چٹنی پہ چٹخارے بھرتا ہوا
سموسے میں خود کو سموتا ہوا — ادھر کھوئے کے ہوش کھوتا ہوا
جلیبی پہ یاں پیچ کھاتا ہوا — کٹورے کہیں کھنکھناتا ہوا
یہ برفی کا دل برف کرتا ہوا — بورزے کا منہ زرد کرتا ہوا
پلاؤ پہ پل پل کے آتا ہوا — تو پھرنی[1] پہ پھر پھر کے آتا ہوا
نوالے سے کشتی بناتا ہوا — اور حلوے کے گولے اڑاتا ہوا
وہ کھلتا ہوا اور جمتا ہوا — وہ بلستا ہوا اور مڑتا ہوا

[1] اصل لفظ فیرنی ہے۔ شاعر نے پنجابی تصرف کیا ہے

وہ جبڑوں میں بوٹی مسلتا ہوا — اُسے پن چبائے نگلتا ہوا
وہ کلّوں سے تیلے بناتا ہوا — اور آنکھوں کو پیچھے چھپاتا ہوا
لبوں پر زباں کو پھراتا ہوا — لپٹتے ہوئے پھیل جاتا ہوا
سسکتا، ہمٹتا، سرکتا اِدھر — لپکتا، لہکتا، لٹکتا اُدھر
بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا — وہ غازی ہے یوں کھانا کھاتا ہوا
سمجھ کر مرے گھر کو جانے نہ فا — نہ تلّہ، نہ تلّہ، نہ جنید زجا
غرض اس طرح ہیں مرے مہرباں — اس اب دیکھیں شاعر نکتہ داں

وہ سوتا، وہ اکبر کا آبِ وضو
یہاں خفقہ کی ہے زبانی کا زور

سارنگی اور طبلہ

یہ چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم "ہوگی اور ناظر" کی پیروڈی ہے ۔۔

دنیا بھر کے بے نکروں نے کل بزم سرود سجائی تھی
کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ، کیا سارنگی گھبرائی تھی
بسمل کی رگِ جاں بنتی تھیں طاؤس کی تاریں لرزش سے
چائے کا پیالہ دور میں تھا حقے نے دھوم مچائی تھی
رندوں نے جھنڈے گاڑے تھے زہاد نے ڈیرے ڈالے تھے
اس دیر و حرم کی محفل میں، موسیقی کانے آئی تھی
یاں اشکوں سے پُرسارنگی واں پیچ و تاب میں تھا طبلہ
گر صبر کی زباں یاں چلتی تھی واں ہاتھوں کی بن آئی تھی

واں نقاب کے ابر گرجتے تھے نعروں کی پھواریں پڑتی تھیں
یاں ہر دل پر موسیقی کے کہرے نے قنات لگائی تھی
اڑتی تھیں فضا بھر میں تانیں تھی چال صبا کی مستانہ
قسمت سے بچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر دیوانہ
سارنگی بولی طبلے سے تم یونہی شور مچاتے ہو
اے منہ پھٹ طبلے دیوانے کیوں کان ہمارے کھاتے ہو
آواز تمہاری کوسے سی اور شکل بھلاوے ستی ساوتری
ان میٹھی میٹھی تانوں کے تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو
لعنت ہے تمہارے جینے پر آرام نہیں عزت بھی نہیں
ہیں کودوں میں جا پھلتی ہوں تم سے اپنا پیٹ چلاتے ہو
ہے خام ابھی تک عشق ترا کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
یا تان اڑی اک میٹھی سی واں تھام کے دل رہ جاتے ہو
ہیں راج دلاری البیلی ناری ہوں پریم کنھیا ہوں
تم سونڈی کاٹے مردک ہو ہر جا پر دھکے کھاتے ہو
تہذیب تمھیں منظور نہیں ادب عقل کہیں دستور نہیں
تم بھیم کی تانوں میں باہر کیوں آپے سے ہو جاتے ہو
نازوں سے پلی شہزادی ہوں میں ناری محلوں والی ہوں
تم جبس دوام کے قیدی ہو صندوقوں میں ٹھونسے جاتے ہو

جب سارنگی نے طبلے سے یوں دل لگنی کا کلام کیا
کچھ دیر تو وہ خاموش رہا پھر بھابھی جاں کو سلام کیا
یوں کہنے لگا سارنگی سے جلتی پر تیل گراتی ہو
ہم رنج و الم کے مارے ہیں تم آگ اور لگاتی ہو
عشاق سے منہ پھیرا کیوں پھر تم نے ہمیں آگھیرا کیوں
رہنے دو اسے چپ مجبورا کیوں میری زباں کھلواتی ہو
میں زنجبار کا شہزادہ میدان میں آکر ضیغم سا
جب ایک دہاڑ لگاتا ہوں تم پردوں میں ڈر جاتی ہو
ہیمان وفا جس سے باندھوں میں پاس اسی کے رہتا ہوں
تم ہرجائی ہو ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو
کچھ الف ہے سینہ کوبی میں سر پھوڑنے میں ہم مستوں کو
بی! یہ تو عشق کے زیور ہیں تم یونہی ہم کو بناتی ہو
عزت پہ ہماری حرف زنی! اللہ غنی اللہ غنی!
وہ وقت بڑی بی بھول گئیں جب ان اپنے کھواتی ہو
میں تیری شمیم نغمہ کو مانند نسیم اڑاتا ہوں
یہ میری تھاپ کی برکت ہے دل بزم میں مسلے جاتی ہو
جب لڑکے مل کر گاتے ہیں خان کی تانیں اڑاتے ہیں
ہاتھوں سے میز بجاتے ہیں تم یاد کب ان کو آتی ہو

ہے ملکہ موسیقی سے مجھے نزدیک تریں تجھ سے رشتہ
ہم راہ پہ تجھ کو لاتے ہیں جب لے میں بھٹک سی جاتی ہو
میں آذر عشق کی تابش سے دل محفل کے گرماتا ہوں
طاؤس طلنبورے کو تجکو دن میں تارے دکھلاتا ہوں
یہ سن کر شمس الدین ڈورے تلوا میسا دا پل جائے
یاں طبلہ تڑپتا رہ جائے سارنگی روتی رہ جائے
چمکار کے سارنگی سے کہا تم سیدھی سادھی بھولی ہو
زیبا نہیں گر یوں منہ میں تنے انجانوں کی سی بولی ہو
طبلے کے وکیل مطلق نے واں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں خوں کی لہروں سے گر محفل بھیر میں ہولی ہو
تم زنجیبار کے شہزادے سارنگی سارنگی ٹھہری
بھبتی ہی نہیں شہزادوں کے گر ایسی بولی ٹھولی ہو
خاموش ہوئیں بی سارنگی اور طبلہ صمٌ بکمٌ بھتا
یوں جیسے کسی نے زباں اپنی کوثر کے آب دھولی ہو
القصہ بچھڑے دوست ملے نے جھگڑا اٹھانے ٹکڑہ تھا
نے تن تنانا تن تن تن نے تاکڑ تاکڑ دھیا تھتا

عاشق محمد غوری

پروفیسر عاشق محمد غوری لاہور کے مکیم محمد جلال الدین کے فرزند ہیں۔ تاریخ پیدائش ۲ ستمبر ۱۹۱۱ء ہے۔ فارسی، انگریزی اور اردو میں اباؤں کے ایم۔ اے ہیں۔ مشغلہ درس و تدریس ہے۔ ۱۹۳۵ء میں سکاچ مشن کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۶۲ء سے دیال سنگھ کالج میں نیس شعبۂ فارسی ہیں۔ نہایت خوش اور ستیں آدمی ہیں۔ شاعری سے جو ہیں لگاؤ ہے۔ پرانی تاروں کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے جدید شاعری کے علاوہ اکثر صدا اسے امتیاز باندھ کر تے رہتے ہیں۔ اصول سے سمجھوتہ دلی قدروں سے انحراف کرنے والے بے راہ رو شاعروں کو راہ پر لانے کے لئے پیروڈی کا حربہ استعمال کیا ہے اور اس میں وہ خاصے کامیاب ہیں۔ وہ "قلندر کے نوٹ" سے مضحکہ اڑا کر پیش کرنے کے علاوہ بھی ہلکی پھلکی ہجو بھی ملاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی تخلیقات بہت سے غیر معمولی دلچسپی اور حاضر جواب کا حامل ہیں۔ ذوالفقار یہ آسان الفاظ میں ان تخلیقات کو معیار بنانا چاہتے ہے کہ تحریف کے کسی جائزے میں بھی انھیں نظر انداز نہ کیا جا سکے۔

حاذق قریشی نے ایک نظم سلمیٰ لکھی تھی۔ پروفیسر عاشق محمد غوری نے اس کی پیروڈی کرکے اصل کی جدیدیت کا بڑی بے رحمی سے مضحکہ اڑایا ہے۔ ذیل میں دونوں نظمیں ملاحظہ فرمائیے:۔

سلمیٰ	کتا
میں نے اک تصویر بنائی	میں نے اک دن کچھ پکائی
نیچے لکھا نام کسی کا	اُس کی خوشبو پاکر آیا
سلمیٰ	کتا
سلمیٰ شرم و حیا کی دیوی	کتا شرم و حیا سے عاری
پیکر اک اخلاص و وفا کا	پیلر کو یا حرص و ہوا کا
سلمیٰ	کتا
جانے کب چپکے سے سلمیٰ	جانے کب چپکے سے کتا
آ گئی سب کی آنکھ بچا کر	آ گیا سب کی آنکھ بچا کر

بندر	اندر
سب چیزوں سے ہاتھ اُٹھا کر	سب چیزوں سے دھیان ہٹا کر
اپنی اس تصویر کی کر لی	میری تھی جو کھیر کی تھالی
چوری	کھالی
کہلی! خوب رہا یہ دھوکا	کہتے! خوب رہا یہ دھوکا
تم نے تو اک چیز چرائی	تم نے تو اک چیز ہے پائی
نقلی	نقلی
اصل ہے دل کے آئینے پر	کھیر ہے اندر الماری میں
کاغذ پر تھی نقل اُتاری	تھالی میں تھی بیچ جمائی
یوں ہی	یوں ہی
اُس کو نہیں چوری کا خطرہ	اُس کو نہیں کتوں کا کھٹکا
ہمت ہے تو اُس کو اڑاؤ	ہمت ہے تو اُس کو اڑاؤ
آؤ	آؤ

(صادق قریشی)

(عاشق محمد خوری)

اقبال نے بچوں کے لئے ولیم کوپر کی ایک نظم اردو میں منتقل کی تھی جو "ہمدردی" کے عنوان سے بانگ درا میں موجود ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے ؎

تنہی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا

پروفیسر عاشق محمد خوری نے اس کی ہو بہو نقل اتار کر ہمارے لئے ہنسی کا سامان فراہم کیا ہے اور کھجوری ہمدردی کا مذاق اڑایا ہے ؎

گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا　　ملا تھا کوئی اداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　جوئیں چننے میں دن گذارا

پہنچوں کس طرح ایمکاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر ملّا کی آہ و زاری — اُلّو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — احمق ہوں اگرچہ میں تمھی سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں سیش یہ گھونسلا کروں گا
اللہ نے مجھ کو دی ہے منزل — اک رات یہیں کرو بسیرا

اُلّو ہیں وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

غالب کی ایک غزل میں تضمین کے ذریعے خرافت کا رنگ بھرا ہے۔ صرف دو بند دیکھیے:۔

اس بُت نے سے مدعا کیا ہے
میں نے تجھ کو بھلا کہا کیا ہے
تجھ پہ نازل ہوئی بلا کیا ہے
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

منہ میں ہر وقت پان رکھتا ہوں
جیب میں کپسٹان رکھتا ہوں
ناک رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاشش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"

اختر شیرانی مرحوم کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کی پیروڈی میں معاشرے کی بعض نرالیوں پر طنز کی ہے ۔

او دیس سے آنے والے بتا

برسات میں دلدلی بنتے ہیں سب کوچہ و بازار اب کہ نہیں
کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں پیراہن و شلوار اب کہ نہیں
دو چار قدم جو چلتا ہے گرتا ہے وہ دس بار اب کہ نہیں

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن کی گلیوں میں راتوں کو کتے بھونکتے ہیں
اور ان کی عف عف بھوں بھوں سے بیچارے بچے چونکتے ہیں
کیا اب بھی سلمیٰ کے دادا دن رات دمے سے ہونکتے ہیں

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی سحر دم کچھ جوتے مسجد سے چرائے جاتے ہیں
بیچارے غازی بے جوتے چپ چاپ گھروں کو آتے ہیں
رستے میں کوئی مل جائے انہیں تو جھینپتے ہیں کتراتے ہیں

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن میں ایسے ہی شام اور سویرا ہوتا ہے

کیا دن کو روشنی موتی ہے راتوں کو اندھیرا ہوتا ہے
اور مچھلیوں کا دریا میں یا پیڑوں پہ بسیرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی مرحوم ہی کی ایک غزل تھی "دیکھے کوئی بہارِ گلستانِ آرزو" اس کی پیروڈی میں نئے نئے قافیوں کی بہار دیکھئے ؎

مژدہ ہو آج تم کو مریضانِ آرزو — لاحق مجھے بھی ہو گیا یرقانِ آرزو
مائل ہوا ہے اک بتِ ترسا پہ دل مرا — گرجے میں جا بسا ہے مسلمانِ آرزو
سب کاروبار چھوڑ کے سڑکیں ہوں ناپتا — دیتا تھا کچھ نہ کچھ مجھے تاوانِ آرزو
ملا کے وعظ کا ہوا اثر مجھ پہ کس طرح — سر پر مرے سوار ہے شیطانِ آرزو
میرا رقیب بجھ سے مرنے کے ہے قریب — پُرحسرتوں سے اس کا ہے ارمانِ آرزو
گردن مروڑ ان کی یا دانے کھلا نہیں — چلا رہے ہیں دیر سے مرغانِ آرزو
میرے جنون نے اسے لینے دیا نہ چین — وہ چین جس میں ہے تو ہیں جانانِ آرزو

مجروحِ عشق ہو کے رہے گا وہ سنگدل
عاشق نے بھی ہے سونت لی کرپانِ آرزو

اکبر لاہوری

آپ ۱۹۱۰ء میں بھی راجپوتوں کے ایک گاؤں مرل پار میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں لاہور سے دس بارہ میل کے فاصلے پر واہگے روڈ کے اس پار واقع ہے۔ آپ کے والد مولوی ابراہیم خاں جو پولیس انسپکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اردو، عربی، فارسی کے عالم ہونے کے ساتھ اردو اور پنجابی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ایک ضخیم جلد میں ہیر رانجھا کے قصے کو از سرِ نو نظم کیا ہے۔ اکبر لاہوری کو دراصل شعر و شاعری کا ذوق اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ تعلیم و یال سنگھ کالج لاہور اور پونی ورسٹی لا کالج میں پائی۔ جنوری ۱۹۳۵ء سے صوبائی مجلسِ قوانین سے وابستہ ہیں۔ آج کل

ہسسٹنٹ سیکریٹری ہیں۔

آپ طنز و مزاح کے لئے کوئی خاص موضوع تلاش نہیں کرتے۔ زندگی کے روزمرہ واقعات میں جو کچھ پیش آتا ہے اسی کے متعلق کچھ کہہ دیتے ہیں۔ پھینے پھبانے کا زیادہ شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم نام ہیں۔

جب آپ اسمبلی کی تقریروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے تو ملتان کے ایک سید صاحب کا نام سن سن کر تنگ ہوتا تھا۔ ہر سوال کے ساتھ پورا نام سر قرار داد کے ساتھ پورا نام اور ہر ترمیم کے ساتھ پورا نام۔ مگر ان کا نام بہت طویل تھا۔ "مخدوم زادہ خان بہادر سید ——" سے تو خیر شروع ہوتا تھا لیکن نام کے بعد دو اب لفظ زائد لکھنے ہوتے تھے۔ ترجمے کے علاوہ بار بار سطر ڈیڑھ سطر نام کی نذر ہو جاتی تھی۔ آپ نے محض نام کی طوالت سے تنگ آ کر کہا:۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد — سنتے آئے ہیں بزرگوں کی یہ رٹ
آج لمبی راہ پر چلتا ہے کون — ہوں نظر کے سامنے جب شارٹ کٹ
دیکھ لو خادم نہ کہلائے کبھی — پیرزادے بن گئے "مخدوم" جھٹ

اسمبلی کے ممبر صاحبان دن رات آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بعض وطن دوست اس سے پریشان بھی ہوتے تھے۔ آپ نے ایسوں کی تسلی کے لئے کہا:۔

آ بتا دوں تجھ کو اے ہمراز، اک رمز حیات — جس کو سن کر رہبران قوم بھی کہہ دیں کہ "ہاں!"
لڑنے بھڑنے کے لئے پیدا کیا انسان کو — ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

یہ حضرات کسی سے اپنی نکتہ چینی سن کر برافروختہ ہو جایا کرتے تھے۔ اصلاح احوال کی طرف کم متوجہ ہوتے تھے۔ آپ نے چند مصرعوں کا مکالمہ لکھا:۔

فراش: — حضور، ہال کا قالین ہے بہت گندہ
جو حکم ہو کسی ماہر سے صاف کروالیں
قانون ساز:۔ — ٹھہر کہ مجلس قانون بیٹھنے کو ہے
اُسی سے کیوں نہ یہ قانون پاس کروا دیں

ہمارے ہاں کے قانون کو جو نندہ کہے
وہ بدزبان سزا پائے اور ڈنڈ بھرے

اسی حال بعض انتظامی شعبوں کا تھا۔ مستعد، پرجوش اور زرد سند، بلکہ زیم مردہ کے حس اور بے خیالی افسروں کی افسری کے بوجھ تلے کراہ رہے تھے۔ اس پر آپ نے کہا:۔

حافظے کے زمانے میں کچھ لوگ حماقت سے — یا لان گدھے والا بکس دیتے تھے گھوڑے پر
اور جس کی اذیت سے سنتے ہیں کہ وہ گھوڑا — رہتا تھا مصیبت میں چلتا تھا تو رک رک کر
اکبر کے زمانے کا دستور نرالا ہے — دیکھا کہ گدھے صاحب اسوار ہیں گھوڑے پر
اور لطف یہ ہے کوئی فریاد نہیں سنتا — چابک پہ بکر چابک، ہنٹر پہ ہنٹر

تم دیر سے مانوس ہمارے تو یہ نا ہے
وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

ایک دن اخبار میں نظر آیا کہ ایک نادار کنگال عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے فاقوں سے تنگ آکر خود کشی کا اقدام کیا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب بہادر نے اسے پچاس روپیہ جرمانہ کر دیا۔ اس پر آپ نے کہا:۔

ایک روٹی کے نہ ملنے سے ہوا مایوس وہ
اور ڈھونڈی اپنے ہاتھوں ہی سے مرگ ناگہاں
کل عدالت نے سنایا اس کو اپنا فیصلہ
جمع کر واسے خزانے میں وہ فوسو روپیاں
ساتھ ہی اکبر سزا یہ دی ہے مجرم مجنون کو
جج کو فاضل اور اسلامی کہوں قانون کو

اگلے دن ماڈل ٹاؤن میں ایک بھینسے نے آدمی کے ٹکر ماری اور آدمی ہلاک ہو گیا۔ آپ نے اس پر کہا:۔

اِک بھینسے اور انسان کے ٹکراؤ میں یہ نکتہ پنہاں ہے
جو مر جائے وہ بھینسا ہے جو مر جائے وہ انساں ہے

ہمارا ماحول کچھ ایسا ہے کہ لوگ اپنی پیش رفت کے لئے چاروں طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کا یہ خیال ہے کہ میں اپنی جگہ کی نسبت اوپر والی جگہ کے زیادہ موزوں ہوں۔ وہ حکام کو جا جا کر پریشان کرتے ہیں کہ سات نام چھوڑ کر مجھے ضرور انسان اسامی پر لگائیے۔ اس رجحان پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

راجہ کے دربار میں جمعیت بھانت بھانت کے لوگ — کچھ راجہ کے لاڈلے، کچھ پرجا کے بوگ
اک منڈل کے منتری، ایک بھار پردھان — اک جنتا کی جوت ہیں، اک سینا کا مان
ہر گھوڑے کی پیٹھ پر اک افسر اسوار — صوبے داروں سے بھرا راجہ کا دربار
ہر ماتھے کی ریکھ میں راجہ کا پرتاپ — کون اُٹھائے چھتر کو تھامے کون رکاب؟

اتنے راجہ بن گئے، پرجا نظر نہ آئے
اکبر اب یہ سمجھے ہے تو پرچار ہو جائے

سینماؤں میں سگریٹ کی بندش ہوئی تو آپ نے بعض سگریٹ نوشوں کی بے چارگی پر اس طرح طنز کیا ؎

دو چار کش لگا کے جو سگریٹ بجھے دیکھنا — دیتا سرور قلب کو سوز و گداز غم
سگریٹ ہوا ہے بند تو دل کا یہ حال ہے — جیسے کہ پڑھ رہا ہوں دو رکعت نماز غم

اپنا اپنا قاتل

ایک غالبؔ تھے کہ قاتل نے کیا قتل اُن کو — اور کی قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ایک اکبرؔ ہے کہ اُس پر بھی آفت بیتی — لیکن اس عہد کے قاتل کی ریا سے توبہ
کی مرے قتل کی اخبار میں تردید اُس نے — اور کرا دی مرے احباب سے تائید اس نے

نازش رضوی

سید امام علی نازش رضوی یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں جنگ عظیم کے دوران آپ نے ایران اور عراق عرب میں سرکاری خدمات انجام دیں اور ۱۹۲۱ء میں وطن واپس آکر صحافت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۸ء تک آپ بلکش، بہار رشتمان، نازیانہ، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، روزنامہ سیاست اور جمہور وغیرہ اداروں میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد کامل دس سال پنجاب دائرس ریڈیو فون کمپنی کے دہلی دفتر میں شعبۂ ادب اور نشر و اشاعت کے رکن رہے۔ دہلی اور لاہور کے قیام میں آپ نے چھ تالیفات کیں جن میں حرب و ضرب، بزم و رزم، روح المعانی اور سرمایۂ نازش تو سیاسی و ملی نظموں، غزلوں، گیتوں اور رباعیوں پر حاوی ہیں۔ باقی دو مجموعے ایٹم بم اور دیگر افسانے اور شاہ صاحب کا ناتمام مزاحیہ افسانوں پر مشتمل ہیں۔ شہادت نامۂ کارزار اور رنگین افسانے ابھی زیر طبع و تالیف ہیں۔

نازش صاحب اخبار نویسی کے زمانے میں تو ضرور تھا اور بعد میں فرمائشی پرارٹنگ۔ ملاسہ پیازہ۔ ایٹو فواس سلاٹر ازی۔ اور منھو دھوئی کے قلمی ناموں سے "ہمدرد، سیاست، کلدان، ریاست، نازیانہ، امروز، ایشیا، اور نوائے وقت وغیرہ میں مزاحیہ نظمیں لکھتے رہے جن کا مجموعہ "مزاح و عبرت" کے نام سے مرتب ہوا تھا اور اس کا دیباچہ چراغ حسن حسرت، جو ہم نے لکھا تھا مگر وہ گذشتہ طوفانی برسات میں سیلاب کی نذر ہو گیا۔ اس وقت جو چند نمونے دستیاب ہو سکے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے طنز و مزاح میں "عبرت" شامل ہے جس سے وعظ کی سی صورت پیدا ہو گئی ہے اور طرافت دب کر رہ گئی ہے۔ اس سے مخاطب صرف مسکرا سکتا ہے۔ نازش صاحب کے نزدیک جس تقریر پر ہنستے ہنستے چہرے کا حلیہ بگڑ جاتا ہے وہ مزاح کے ذیل میں نہیں آتا۔ دیکھئے موجودہ جوبازاری، یعنی جھوٹ اور لوٹ پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ملے کچہری میں اک روز شیخ خیراتی — ہے اک زمانے سے ان کی مری علیک سلیک
نہیں ہے جھوٹی گواہی سے اجتناب انھیں — کیا نہ آج تک اس پر مکر کسی نے اعتراض
علاوہ اس کے امیروں سے ہیں یہ سپلائر — کہ مال کرتے ہیں یہ ان کی حسب منشا پیک
نوجس میں فائدہ وہ کام کر گزرتے ہیں — کبھی فرنٹ میں جا کر نہیں یہ ہوتے ہیک
جہاز جاتے ہیں ہر سال سونا لانے کو — یہ بزنس آج تک ان کی کبھی ہوئی نہ سلیک
یہ حج کے دن بھی ہیں "لبیک" کے عوض کہتے — خدا کے گھر میں فقط "ربنا" بلیک! بلیک!"

فتنہ پرور واعظ کے بارے میں اقبال کے ایک ایک مصرعہ کی تضمین اس طرح کی ہے ؎

واعظ اس دور کے بیچارے مسلمانوں کو — آئے دن دعوتِ پیکار و جدل دیتے ہیں
وعظ میں تیغ زباں کے یہ دکھا کر جوہر — زندہ افراد کو پیغامِ اجل دیتے ہیں
کر کے لڑنے کے انھیں یاد یہی صدہا اے دوست — یعنی اس شان سے یہ درسِ عمل دیتے ہیں
الٹی فرماتے ہیں یہ شرح کلامِ ربی — "مسجود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں"

انسان جس طرح انسان کی قربانیاں فوج فوج کر کھا رہا ہے۔ اس پر طنز ہے ؎

زعمے میں اہلِ علم کے پھر مدتوں کے بعد — کوا بچارا آ کے پھنسا ہے الٰہی خیر
فتوے فقیہ شہر نے اب تک نہیں دیا — لیکن غریب کوے کا ہے اب سے حال غیر

کہتے ہیں اہلِ فقہ کا ہے اس پہ اجتماع — اس کا مباح ہونا بڑی نیک فال ہے
سودا بھی کہہ گئے ہیں کئی سال پیشتر — ملا تقی کے باغ کا کوا حلال ہے

اس دورِ ظلم و جور میں کوے کا ذکر کیا — اس میں تو آدمی کے لئے بھی نہیں فلاح
پھر حلتِ طیور پہ ہو بحث کس لئے — انساں کا گوشت جبکہ بہ طور رہے مباح

زمانہ حال کے صوفی کی ہجو ؎

اے فسوں گر تری باتوں میں ہے جادو کا اثر — تو وہ ہے دم سے ترے زندہ ہوا سحر قدیم
نقرئی ریش کا وہ جال عیاذاً باللہ — رات دن جس میں پھنسا کرتے ہیں اہلِ زر و سیم
تو چلاتا ہے اس انداز سے تزویر کا تیر — زد میں آجاتا ہے اس کی ہو مسافر کہ مقیم
سرمگیں آنکھ تری جذب و کشش کا مرکز — جس کے اک ادنیٰ اشارے پہ فدا عقلِ سلیم

تیری اعجاز بیانی قم عیسیٰ کی حریف — ہیں ترے حسنِ تکلم میں سب انداز کلیم
کیا یہی مسلکِ درویشی ہے او دشمن فقر — کیا حقیقت میں طریقت کی یہی ہے تعلیم
اپنا کردار بدل آہ میں سچ کہتا ہوں — آج افعال سے تیرے دلِ ملت ہے دو نیم

تو وہ قطرہ ہے صدف نے جسے مردود کیا
تو کہاں اور کہاں آبرو نے دُرِ یتیم

غزل

حسن الفت کا راز کیا جانے — ناز پرور نیاز کیا جانے
یہ غلط ہے کہ اس زمانے میں — مولوی ساز باز کیا جانے
غزنویت میں گم ہوئے بابری — قدر اپنی ایاز کیا جانے
میری درگت کا راز وقت سرود — کوئی طبلہ نواز کیا جانے
اپنے گھر کی خبر نہ ہو جس کو — وہ میرے دل کا راز کیا جانے
خمِ ملت میں حسابِ باری کا — ہر کوئی بندہ نواز کیا جانے

آج سہ پیازہ کے بغیر یہاں
کوئی اوصافِ پیاز کیا جانے

پنڈت ہری چند اختر

ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم زیادہ تر لاہور میں حاصل کی۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم اے پاس کیا۔ ابتدا ہی سے ادب و شعر کا ذوق تھا۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ساری عمر ادبی محفلوں کی جان رہے اور دوستوں کے لیے قہقہوں کا سامان فراہم کرتے رہے۔

ابتدا میں تین چار سال اخبار نویسی کی۔ ہفتہ وار "پارس" کو پارس بنایا۔ "پھول" اور "تہذیب" میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ پنجاب، بمبئی، مرکزی محکمہ اطلاعات، جنگی ہیڈ کوارٹر اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے اور دہلی یا غازی آباد میں رہنے لگے تھے۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو انتقال ہوا۔

پنڈت ہری چند اختر نہایت خوش ذوق، محفل فہم، پختہ کار اور باکمال شاعر، زبان اور فن کی باریکیوں کے ماہر، لطیف و نفیس مزاح کے مالک اور حسِ مزاح میں انشاء جیسے ہم پلہ تھے۔ وہ لطائف و ظرائف کی پوٹ، بے حد خوش طبع، زندہ دل، شائستہ اور بامذاق انسان تھے۔ ان کی شاعری جذبہ و تاثر اور چند نظموں سے زیادہ نہیں مگر جو کچھ کہا کسی دوسرے کے لئے کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ مزاحیہ شعر کہنے والوں کے لئے دوسروں کے کلام کی پیروڈی لکھنے اور شعرائے پڑھنے کی نقل اتارنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ افسوس کہ ان کا کلام حاصل نہ ہو سکا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ابھی تو یہی دیکھنا چاہتا ہوں — نہیں چاہتا ان کو یا چاہتا ہوں
مری نیتوں پر نظر رکھنے والو — بتا دو کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں
نہ سمجھا کوئی جس کو وہ حرف ہوں میں — غلط ہو چکا ہوں مٹا چاہتا ہوں
میں سمجھا وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں — وہ سمجھے کہ میں کچھ کہا چاہتا ہوں

زمانے کو کیا دیا دینے والے — ہمیں تو نے تڑخا دیا دینے والے
زمانے کو تو پیں بھی دیں مال و زر بھی — ہمیں تو نے چرخا دیا دینے والے

بیٹھتا ہوں تو درد اٹھتا ہے — درد اٹھتا ہے بیٹھ جاتا ہوں

کہا ہم چین کو جائیں، کہا تم چین کو جاؤ — کہا جاپان کا ڈر ہے، کہا جاپان تو ہوگا
کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ — کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا
کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں، کہا تم اونٹ پر بیٹھو — کہا کوہان کا ڈر ہے، کہا کوہان تو ہوگا

چلو چل کر دکھا لائیں تمھیں شیگور کی داڑھی — بڑی ہی شان کی داڑھی بڑے ہی زور کی داڑھی

نعمتوں کو دیکھتا ہے اور ہنس دیتا ہے دل — محو حیرت ہوں کہ آخر کیا ہے میرے دل کے پاس

سید محمد جعفری

سید محمد جعفری اس دور کے ذہین ترین طنز نگار شاعر ہیں۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور اب ایک ذمہ دار افسر ہیں۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ہماری معاشرتی کمزوریوں کے لئے ایک بیرحم آئینہ ہے ؎

وہی کہتے ہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

ان کے طنز میں کہیں تلخی نہیں ہے، حلاوت بھی ہے اور شعور بھی۔ وہ افراد کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ اداروں اور اجتماعی زندگی کی خامیوں پر انگلی رکھتے اور اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات پر کچھ اس انداز سے ہنستے ہیں کہ پڑھنے والا مزے لیتا اور ان کے ہمنوا ہو جاتا ہے۔ وہ غالب اور اقبال کے مصرعوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے شوخیوں میں رچے ہوئے ذوق کی بدولت ظرافت میں دل آویزی اور انوکھا پن پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے طنز میں شگفتگی اور زندہ دلی ہے۔ وہ جس نظام سے کل پرزہ ہیں اس کے خلاف بھی متواتر احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ لال فیتہ، بیوروکریسی، موٹی موٹی سفارشیں، فائلیں، سیاسی نعرے، غرض کالا بازاری، آزاد شاعری، یواین او اور بھنگیوں کی ہڑتال غرض کوئی چیز ان کی زد سے باہر نہیں۔ وہ جب ان اقتدار پسندوں کو دیکھتے ہیں جن کا حلق اخوت اور مساوات کے سیاسی نعرے لگاتے خشک ہو جاتا ہے لیکن ان کا عمل یہ بھی اس کے برعکس ثابت رہتا ہے تو وہ اپنی نظم "وزیروں کی نماز" میں نماز کے خالص سیاسی اور خود غرضانہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے یوں طنز کرتے ہیں ؎

عید اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہ کثیر — جبکہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر

وہ مصلوں پہ مساوات تھے جن قسمت پر — تھے "ریز رو" اُن کے مصلے پہ مساوات کے پیر

آج کل یہ ہے نماز، اور کبھی وہ تھی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

صفِ اوّل میں کھڑے تھے جو خدایانِ مجاز — یہ امیر اور یہ غریب اور یہ نشیب اور یہ فراز

تجھ سے اے خالقِ کل چھپ نہیں سکتا ہے یہ راز — تو حقیقی، وہ مجازی مجھے دونوں سے نیاز

"آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں"
کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے
ساتھ لائے تھے مصلّٰی وہ بچھایا ہم نے

دور سے چہرہ و زیروں کو دکھایا ہم نے
ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے

"پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"
کون کہتا ہے کہ ہم لائقِ دربار نہیں

ذکر خطبے میں وزیروں کا جو پایا ہم نے
آسمانوں کو زمینوں سے ملایا ہم نے

کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہم نے
سامری کی طرح بچھڑوں کو سجایا ہم نے

خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انسان کی نظر
"مان لیتا کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر"

یو این او کی کارگذاری پر جعفری سے بہتر طنز شاید کسی اور نے نہ کی ہوگی۔ صرف دو بند ملاحظہ فرمایئے۔ اس نظم کی پوری فضا میں غالب کے مصرعے جس آب و تاب سے جگمگا رہے ہیں اس کی داد نہیں دی جا سکتی ؎

یو این او کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے
وعدۂ فردا پہ ٹرخانے کے فن میں فرد ہے

گرچہ پٹواتا فلسطین میں خود اپنی زد ہے
ایسی قوموں سے خفا ہے جن کی رنگت زرد ہے

کتنا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

ڈالئے اس کے گزشتہ کارناموں پر نظر
وادیٔ کشمیر کے قضیہ کو ٹالا کس قدر

فیصلہ کا وقت جب آیا تو بولا حیلہ گر
"لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر

ایسی باتوں سے وہ "مہرد" بدگماں ہو جائے گا"
یہ نہیں سوچا کہ بدنامِ جہاں ہو جائے گا

جعفری نے کراچی کا نقشہ بھی اس کے تقریبی خدوخال میں پیش کیا ہے۔ یہ خدوخال اگر مضحکہ خیز ہیں تو اس میں جعفری کا کیا قصور؟

مزید رونین بنا دیکھئے ۔۔۔

اے کراچی کھٹمل اور مچھر کے وطن
سب کو یہ دو نعمتیں ملتی ہیں تجھ سے تحفتاً

اور شہید ناز ہو جاتے ہیں کتنوں پر حسین
کب تلک ہم سے تغافل کب تلک اے بانکپن

سرد مہری اور گرمی کا تری کیا آسرا
سندھ موسم کی وزارت کی طرح موسم ترا

تیرے بازاروں کی رونق اور شہروں میں کباب
حسن سے شرما کے بجھ جاتی ہیں اکثر بجلیاں

پر دلِ وحشی کو مل سکتی نہیں پھر بھی اماں
آ کے لٹ جاتا ہے بازاروں میں بھولا پہلوان

پھر نہ وہ گل کام آتے ہیں نہ کوئی داؤ پیچ ۔۔۔
مار دی دنیا ہے مرغانِ عشق کی آنکھوں میں بیچ

میں ترے نگار خانے میں بہت سی بولیاں
اس میں چپ بیٹھی ہے تنہا طوطی شیریں بیاں

یعنی وہ اردو جو حیرت کیلئے آئی تھی یہاں
جنگ آمادہ ہیں اس بیگم سے گھر کی باندیاں

اس کی قدر و منزلت سے دل ترا بیگانہ ہے
"گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے"

بھنگیوں کی ہڑتال کا ایک منظر دیکھئے ۔۔۔

بھنگیوں کی آجکل ہڑتال ہے
کہتہ و مہتہ کا پیٹ اعمال ہے

گردشِ دوراں نے ثابت کر دیا
رفعِ حاجت بھی بڑا جنجال ہے

ضبط کی حد پر کھڑے ہیں شیخ جی
سانس کھینچے ہیں مگر منہ لال ہے

پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں سیٹھ جی — جیسے دھرتی میں بہت سا مال ہے
آگیا روکے سے رُک سکتا نہیں — اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے

ہر گلی کوچے کی اپنی جھیل ہے
ہر جگہ دہلی میں نینی تال ہے

اب کلرک کے کردار کا مطالعہ کیجئے ؎

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو — لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر اٹھایا بٹھایا کلرک کو — افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو

مٹی گدھے کی ڈال کے اس کی سرشت میں
داخل مشقتوں کو کیا سرفوشت میں

پھر اسی جنت میں جو بلائے گیا اسے — حوروں نے کچھ مذاق کیا کچھ ملک ہنسے
حیران تھے ملک کہ کیسے پُرسے پھنسے — ہاتف نے دی صدا کہ یہ کچھ دن یہیں بسے

آدم کا رف ڈرافٹ ہے کب تک سنبھلے گے تم
اپروو ہو کے آیا تو سجدہ کرو گے تم

جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر — تھا ان کی زندگی کا سہارا روٹین پر
ٹی اے وصول کرنے کو اترا زمین پر — لفظِ کلرک لکھا تھا لوحِ جبین پر

ابلیس راستے میں ملا، کچھ سکھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ میں، انٹر لکھا دیا

ظریف جبلپوری

۲۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو بمقام کٹنی (ضلع جبلپور) میں پیدا ہوئے۔ والدین نے حامد رضا نام رکھا لیکن بچپن ہی سے ظریفانہ شعر کہنے کی بدولت ظریف مشہور ہو گئے۔ نسیم بھرت پوری رشتہ میں ان کے دادا کے بھتیجے تھے۔ ظریف اپنے وطن ہی میں میٹرک، انٹرنس، ٹریننگ سروس میں منسلک ہیں۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ لکھتے ہیں اور مصرعوں میں جادو بھر دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جنگ اور ہندوستان اور ہندوستان کا مادرِ وطن، طنزیہ، لیکن شاعر دفیرہ مشہور ہیں۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے تمام اشعار میں جنگ، گرانی، سیاست پر طنز اور چھیڑ چھاڑ ہے۔

ہماری قبر کے کتبے چرا کے لے گئے ہیں ۔۔۔ ہے کنٹرول کی لکڑی گراں نہیں معلوم؟

پھانسی منصور کو لگائی ہے ۔۔۔ وہ سمجھتا ہے نیک ٹائی ہے

فردوس تک کے در کھلے ماہِ صیام میں ۔۔۔ اور وہ اگر نہ تھا تو خدا ہی وہ نہ تھا

عشق میں اور کیا ہو حبسِ دوام ۔۔۔ ہجر خود انڈیمان ہے پیارے

ہم آپ ہوں گے نہ ہوگا عدو رہے کی کمی ۔۔۔ کہ جیسے تانگے میں اک بم نہیں تو کچھ بھی نہیں

آپ کی یاد بن گئی اکسیر ۔۔۔ خاک میں مل گئی ہماری یاد

سونا مہنگا ہے تو پھر تانبے کے سکے ہی سہی ۔۔۔ نوٹ اور وہ بھی پھٹا ہو مجھے منظور نہیں

کیا نمک اٹھ گیا زمانے سے ۔۔۔ پھیکا پکوان کھا رہا ہوں میں

کیا نمک پاشی کرے جب سے نمک پر کنٹرول ۔۔۔ ہنس رہے ہیں زخمِ دل خالی نمکداں دیکھ

عقلیں درست ہو گئیں مہنگائی کے سبب ۔۔۔ سب بیوقوف جنگ میں چالاک ہو گئے

کیا سیاست ہے کہ ہیں وہ جنگ سے بیزار بھی — فیر کی جانب بھی ہیں اور غیر جانب دار بھی

کپڑا دیوش ہے عریانی چھپائیں کب تک — چند اک دن میں لنگوٹی بھی اُتر جائے گی

کپڑا اگر ملے تو گریباں بھی چاک ہو — کیسے پھروں میں چاک گریباں کئے ہوئے

میرے بالوں سے وہ اُلجھتے ہیں — ان کی زلفوں میں پھنس گیا ہوں میں

ڈھونڈتے ہیں وہ میرے سجدوں کو — سنگِ در پر بڑی کھدائی ہے

اک خیر ہوئی کہ پا لیا دس سال کی سزا — اب کوئی درمیان میں حائل نہیں رہا

ہیں تو پٹ ہی لوں گا تم منہ سے "ہاں" تو کہدو — آخر عدد عدد ہے یا تیس مار خاں ہے

زاہد و رند دونوں یکساں ہیں — اپنی اپنی مگر طبیعت ہے

ترے ایمان کی نیا بھٹکتی پھرتی ہے زاہد — کبھی کوثر کی موجوں میں کبھی گنگا کے دھاروں میں

محفل کی عنایت سے ظریفِ سخن آرا — وہ داد ملی ہے کہ کھجایا نہیں جاتا

ان سے ملنے کو جو پوچھا تو تنک کر بولے — تم تو سنتے ہی نہیں کہہ تو دیا عید کے دن

پڑھتے پڑھتے ہو گئے کالج سے اوورایج ہم — نوکری کرنے کا بھی اب ہم کو ڈر جاتا رہا

دریائے ظرافت میں ہلوخاں کچھ ایسا ظریف اٹھ آتا ہے — اشعار ہمارے سن سن کر سب ہی ہا ہا کرتے ہیں

شبِ فراق جسے عاشقی میں کہتے ہیں — وہ رات خود نہیں آتی بلائی جاتی ہے

ہجوم عاشقاں دیکھا جو دروازے پہ وہ بولے
ہمیں یہ ٹیم تو آل انڈیا معلوم ہوتی ہے

ہوا کو ایجوکیشن جب سے رائج انڈیا بھر میں
ہر اک تعلیم کا ہ اندر سبھا معلوم ہوتی ہے

مجھے دفتر سے اور گھر سے تو فرصت ہی نہ ملتی تھی
گئے پھر کب کہے آخر کراماً کاتبیں میں نے

بتایا اس طرح پر لطف قصہ اپنی الفت کا
فسانہ تھا کسی کا اپنی باتیں ٹھونس دیں میں نے

عشاق سلف میں اور ہم میں تعلیم کے باعث فرق یہ ہے
وہ ہجر میں رویا کرتے تھے ہم ہجر میں گایا کرتے ہیں

جسے چاہیں اپنا دل دیں کہ یہ دل تو ہے ہمارا
نہ عدو کا اس میں جھگڑا نہ تمہارا کچھ اجارہ

تجھے مر کے بھی نہ چھوڑوں کہ ظریف زندہ دل ہوں
اسے یوں سمجھ لے ہمدم تو ندی ہے میں کنارہ

وہ دل میں گھس رہے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں
کہ سنگاپور میں جاپان داخل ہوتا جاتا ہے

الفت کے معجزے جو دکھانے لگا ہوں میں
ناصح کو راہ عشق پہ لانے لگا ہوں میں

جھکانے کو ہر در پہ سر کو جھکا دوں
نمائش کا سجدہ عبادت نہیں ہے

ضمیر جعفری

سید ضمیر جعفری بھی اس دور کے اچھے طنز و مزاح نگاروں میں ہیں۔ آپ اسلامیہ کالج لاہور کی پیداوار اور شیرازہ کے ابتدائی لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی نظم "وبائے الاٹمنٹ" کا ایک بند دیکھئے ؎

لوکل مہاجرین پہ تازہ نکھار دیکھ — مونچھوں کے تاؤ دیکھ نظر کی بہار دیکھ
موڑ پہ اڑ رہا ہے وہ تُلّا کمہار دیکھ — ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
اے مرحبا یہ حسنِ ادائے الاٹمنٹ

ان کے طنز و مزاح کا ایک اچھا نمونہ "عورتوں کی اسمبلی اور وزارت" ہے۔ اس میں ایک فرضی مزاحیہ مجلس کا نقشہ پیش کر کے نسوانی فطرت کے بعض مخصوص رجحانات پر چوٹ کی گئی ہے۔ چند بند توجہ طلب ہیں ؎

بولو کو تو دیکھو نہ کہنا نہ پاتا — فقط اک عزارہ فقط ایک چھاتا
نہیں کچھ بھی نامِ خدا آتا جاتا — بجٹ ہاتھ ہیں جیسے مھون کا کھاتا
ادھر ممبری چھڑ گئی ممبری سے
ادھر طفل رونے لگے گیلری سے

بہ آوازِ شور و شغب بولتی ہیں — بہ اندازِ غیظ و غضب بولتی ہیں
نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں — یہ جب بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں
شہادت کی انگشت اقبال پر ہے
کبھی ناک پر ہے کبھی گال پر ہے

سیپیوں میں گوٹے کناری کی باتیں — بسو کی کفایت شعاری کی باتیں
پڑوسن کی پرہیزگاری کی باتیں — غرض ہر بیاہی کنواری کی باتیں

بلیڈ اور ٹائی پہ "کٹ" ہو رہی ہے
مگر عطر و ریشم کی سہ ہو رہی ہے

فرقت کاکوروی

غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔ اے بھی اس دور کے تحریف نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ آپ دہلی کالج میں تاریخ کے لکچرار ہیں۔ آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ مداوا (تنقید)
۲۔ نارواد (ترقی پسند مصنفین کے خاکے)
۳۔ صدف و بدف (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
۴۔ اردو ادب میں طنز و مزاح (تاریخ اور تمام مزاح نگاروں پر تبصرہ)
۵۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

مداوا اور نارواد میں آپ نے جدید شاعری کا خاکہ اڑایا اور ترقی پسند شاعروں کے کلام کی پیروڈی کر کے ان کے رنگ کو اتنا تیز کر کے پیش کیا ہے کہ صحیح صورت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تحریفات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ اکثر مضامین پر شعوری کاوش کی زیادتی اور بے ساختگی کی کمی نظر آتی ہے۔ اور بعض مضمون نقل بن کر رہ گئے ہیں۔

نارواد کا ایک نمونہ دیکھئے۔ سلام مچھلی شہری کا تعارف کراتے ہوئے کہ ——"آپ سلام ہیں اور آپ کی شاعری علیکم السلام ہے سرورست آپ کی شاعری پر تفکر کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن جب یہی شاعری اردو میں باقاعدہ ترجمہ ہو کر آئے گی تو یقیناً ایک اضافہ ہوگی۔ اس وقت دنیا ہمارے اس نوجوان شاعر، ادیب اور مفکر کے مرتبے کا صحیح اندازہ لگا سکے گی —— وغیرہ" ان کی ایک نظم کی پیروڈی اس طرح کرتے ہیں:۔

بنگال کی رقاصہ

ناچتے ناچتے —— پائل کے بغیر
جسم عریاں ہی رہے

شعلہ افشاں ہی رہے

ناچئے ناچئے ——

بھوک اور موت کا رقص

میرے بنگال کا رقص

ناچئے سوچتی کیا ہیں —— اُٹھئے

آپ بنگال سے کب آئی ہیں

نغمہ و رقص کا پیکر بن کر

جسم کو بیچئے —— پتھر بن کر

ناچئے۔ ناچئے ——

میں پاگل ہوں ——

یوں ہی بکا کرتا ہوں ——!

راجہ مہدی علی خاں

دورِ جدید کے جن شعرا نے زندگی اور سماج کے چبھتے ہوئے مسئلوں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا۔ ان میں راجہ مہدی علی خاں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تعلق رکھتے اور پیدائشی شاعر ہیں۔ ان کی والدہ شاعری کی دنیا میں ج۔ ب صاحبہ کے نام سے معروف ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں ماہنامہ عالمگیر سفینہ وارخرام، تہذیب نسواں اور پھول وغیرہ کے اداروں میں کام کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے تھے۔ اب تک وہیں ہیں۔ مضراب ان کی تصنیف ہے جس کی نظموں میں بقول ڈاکٹر وزیر آغا "بعض حقائق کو طنز و مزاح کے خواب پرستوں کی ذہنی اڑان کو رد کرنے کی تیاب واضح سمی نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کی نظم "چور اور خدا" میں اگر دعا کی جذباتیت کو طنز بنایا گیا ہے تو "کانے کے آنسو" میں محبت کی سستی جذباتیت کو رسوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر جب وہ ان باتوں سے ذرا ہٹ کر ٹھوس حقائق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو "ابھی چلے آپ" اور "ملاقاتی" جیسی تخلیقات معرضِ وجود میں آنے لگتی ہیں اور طنز کی نشتریت تیز تر ہو جاتی ہے لیکن اس کے سلسلے میں راجہ صاحب کی بہترین نظم "ایک چہلم پر" ہے جس میں انتہائی خوبی اور جرأت سے سماج کی بعض دلچسپ رسوم کے

منصف چلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ میری دانست میں اس نظم کی حیرت انگیز کامیابی کا راز ان ناہمواریوں میں بھی ہے جو بڑی بی کے الفاظ اور کردار سے پیدا ہوتی ہیں:۔

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

کسی سے بھی رکھی نہ اس نے عداوت
کہ پیشہ تھا اس نوجواں کا شرافت

ہمارے محلّے میں وہ جب بھی آتا
خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا

نہ رو رو کے بے حال ہو اے دلہن تُو
نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو!

وہ جنت میں خوشیاں منانے گا مت رو
وہ حوروں سے اب دل لگانے گا مت رو

وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا
مگر دے گیا ہم نے دل کو سہارا

نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجہ پہ چلتی ہے آری

رہنے ذرا کرم چسا دل تو لانا
ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی تو لانا

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

منگانا ذرا شوربا اور حسا لہ
بڑھانا ادھر کو ذرا یہ پیالہ

ہمارے محلّے میں وہ جب بھی آتا
خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا

پڑا ہے پاؤں میں گھی ڈالنے کا
خدا تو ہی حافظ ہے میرے کلّے کا

دلہن سے کہو آہ اتنا نہ روئے
بچاری نہ بیکار میں جان کھوئے

ارمی بوٹیاں تین سالن میں تیرے
یہ چھیچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

دلہن گھر میں چورن اگر ہو تو لانا!
نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا

نہ کر ہین اتنے ناز و اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

راجہ مہدی علی خاں کی ایک اور نظم "اس سے اور اسی سے" بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس سے کسی قسم کی نکتہ چینی کئے بغیر روداد اور حقیقت کے تصادم کو محض دو تصویروں کی صورت میں پیش کر کے کامیاب طنز کی گئی ہے ؎

زمیں کے چاند ترا حسن آسمانی ہے — ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے
نہ ہے نصیب کہ تو ہو مری شریک حیات — ہو تیرے جلووں سے رخشندہ زندگی کی رات
ہے میرے اجڑے ہوئے گھر کو انتظار ترا — تو اے بہار اسے آ کے رشک خلد بنا
گھر آؤں گا جو سر شام ہو کے میں بے حال — نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گال
گلے میں ہو گے ترے ہار میری باہوں کے — چمک اٹھیں گے ستارے تری نگاہوں کے
کرے گی زندہ مجھے تیری دلنشیں گفتار — مرے چمن میں ہمیشہ رہے گا حسن بہار
کھلے گی دل کی کلی روح شادماں ہو گی — بہشت ہو گی اسی گھر میں تو جہاں ہو گی
قدم نہاد و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

(۲)

خدا کے واسطے کھولو بھی آ کے دروازہ — میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاج شریف — تو پنکھا جھلئے ذرا اٹھ کے کیجئے تکلیف
یہ چارپائی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے — بھلا اکتی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے
الٰہی کون یہ پانی کا دے گا اتنا بل — خدا کے واسطے کر نل کو بند اے کاہل
چپاتیاں میرے اللہ سب کی سب کچی — تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی
بس اٹھ بھی اب گئی ایسا برا تو حال نہیں — یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں

دبا دے پیر مرے اٹھ کے اللہ بھی اٹھ اوست

خوجی

رتن ناتھ سرشار

اس افسانہ (فسانۂ آزاد) کی اصل شخصیت (ہیرو) آزاد ہے ..... اس کے ساتھ خوجی ایک سخرہ ہے جو ایک شیدا باز (اب کے معاجیں) میں شامل تھا۔

"خوجی یا خواجہ بدیع الزماں یا خواجہ بدیعا ایک فیشن شخص ہیں۔ بوڑھے ہیں مگر وہ اپنے آپ کو جوان اور کبھی بالکل لڑکا سمجھتے ہیں۔ کمر ہو اتنے کہ اگر ہوا چھو جائے تو گر پڑیں۔ دبلے پتلے ایسے کہ کوئی بچہ چپت جڑ دے تو سات لڑھکنیاں کھائیں۔ بدصورت اس قدر کہ کوئی دیکھ لے تو ڈر جائے مگر سمجھتے یہ ہیں کہ میں نہایت مٹوا تازہ، نہایت طاقتور، نہایت خوبصورت ہوں۔ حوصلہ ایسا کہ ہزار مرنبہ پٹے، جوتیاں کھائیں، مگر غم نہ تک کہ کمر توڑنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ ساتھ ہی عقلمندی کا بھی دعویٰ ہے۔ حالانکہ پرلے درجہ کے بیوقوف ہیں۔ آپ خیر سے شاعر بھی ہیں اور کسی جگہ تک سے مگر تک طلسم بلیغ جہاں رہتے۔ فارسی خوب بولتے ہیں اتنی خوب کہ کبھی تو سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ بات بات پر نیز دلیاں نکالنا آپ کا خاص وصف ہے حالانکہ قوت کی کبھی خواب میں بھی شکل نہیں دیکھی۔ بہادری کا یہ عالم ہے کہ مدتوں کے پیچھے، اور بھاگتوں کے آگے"۔ بہت مدت کی اور وہ بھی عمر میں ایک مرتبہ تو ڈرتے ڈرتے کسی مردے کے ناک کان کاٹ لیئے۔ غرض کہاں تک بیان کیجئے، خواجہ صاحب کی ذات میں دنیا بھر کی ہمدرد حماقتیں جمع ہو گئی ہیں:

..... خوجی انیسی آدمی ٹکی کا نام سنتے ہی ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے کہ خدا ہی خیر کرے۔ ہم سمجھے تھے کہ وں لگی کرتے ہو۔ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ تنگ توڑ چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو۔ میاں تم نا کھہ عالم و فاضل سہی بھڑ کے ہی تو ہو۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش آپ کی اور دعویٰ یہ کہ شیر کی جا کر دیسیوں سے لڑیں گے۔ لے تیری قدرت۔ میاں ہوش کی دوا کرو، عقل کے ناخن لو ..... ایک ذرا سی چنے کے برابر گلہری پڑے گی تو ٹائیں سے مر جائیے گا۔ آپ کو کبھی سورپنے پر چانے کا تجربہ اتفاق نہیں ہوا۔ اے میاں خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ تو بلی پڑی یہ مر گیا۔ گھوڑے کی پیشانی پر جو دھم سے گرا۔ دائیں بائیں کی آواز بادل کی کڑک کی طرح گونجتی ہے۔ قریب سے پتا ہی کھڑا ہے اور ایک دفعہ ہی لوٹ گیا۔ توپ کا گولہ آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ کوئی ٹھٹھا اور سر ٹکڑے ..... دس دس آدمیوں کو۔ بھیجے ہی دیکھئے اڑا دیا۔ لو یا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اور جو گیا تلوار چلنے لگی تو اف اور بے ہوش۔ جان جاتی ہے ..... ہم بھی وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑا ہی ہے۔ ..... ارے توبہ ارے توبہ خدا بھلے مانس کو جنگ کے میدان سے بچائے۔"

میاں خوجی میں ایک وصف یہ تھا کہ بے سوچے سمجھے، بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو، یہ چمٹ ہی جائیں گے

غصہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے، کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصہ بھی زالا تھا۔ ان کو جب غصہ آتا تو شہ زور پر جوان کو اٹھا کر پھینکے تو اٹھارہ لڑھکنیاں کھائیں

لہ مولانا تاجور نجیب آبادی ، پیش لفظ خوجی کے کارنامے)

پاہے کچھ نہ نکل جائے مگر یہ رخانہیں چھوڑتے۔

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر، جھاڑ پونچھ کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے، مگر ممکن کیا کہ ذرا اف کریں وہی تیور وہی دم خم۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ ان کی ٹنڈی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھرکس ہی نکل گیا۔ پھر بھلا ان کو تاب کہاں ہو آتش بہ بھبھکا اور تیسرے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا یہ دبلے پتلے مہین آدمی ہوئے کہ چھو نکے میں اڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دبوچی اور لگا دے زمین پر پھینکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی چودھان سے چھٹ گئی اور لگی ہاتھا پائی ہونے۔ اس نے ایک گھونسہ جمایا اور ان کے پیٹ پکڑ کر پھینکا تو چاروں شانے چت۔ وہ پھر تڑ سید گئے، ایک اُدھر ایک اُدھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ یہ مہرا۔ سے جیت، بات، ہا میں یوں مٹھے سے کا لڑے سے بھلا کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی آپ نے چلانا شروع کر دیا قسم بہ باجان کی جو کہیں چھلاوا پاس ہوتا اس وقت ان دونوں کی لاش پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہئے خدا کا اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے دور میں آپ رہا ورنہ اتنی قرولی بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ ہات ترے کی نا بکھار کھڑا تو رہ گیدی وہ زخمی ...“

سخوجی اور ایک ڈاکٹر کی دو دو چمکیں :-

خوجی :- (ڈاکٹر سے) کیوں میاں ڈاکٹر کہاں ہیں اس وقت؟

ڈاکٹر :- آپ اپنا مطلب کہیئے۔

خوجی :- ابھی تو تم سے کیا واسطہ عجیب قطع کے آدمی ہو۔ دخل در معقولات دینا کیا معنی تم بس اتنا بتا دو کہ ڈاکٹر کہاں ہیں؟

ڈاکٹر :- لاحول ولا قوۃ

خوجی :- لاحول ولا قوۃ

ڈاکٹر :- کوئی ہے نشہ لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے۔

خوجی :- کوئی ہے بھئی لاؤ ہم ان کی خبر لیں گے۔

کمپونڈر :- ابھی کیا کب کب لگائی ہے۔ یہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں میاں۔

خوجی :- آداب عرض کرتا ہوں .....“

سراہیں بے بجاؤ کی پڑیں گانجوجی کی اکثر فوں وہی رہی :-

”ایک دن پچھلے پہر سے گھنٹوں نے میاں خوجی کا ناک میں دم کر دیا ..... افیمی آدمی ... ایک دفعہ پینک میں آئے تو ان حضرت نے پنڈلیوں کو بھڑ کی طرح بھنبھوڑ کھایا اور انھوں نے پینک سے چونکتے ہی غل مچایا ... تو آس پاس کے لوگوں کی نیند حرام ہو گئی چور کا گمان ہوا۔ لینا جانے نہ پائے۔ چور۔ چور۔ ارے میاں کہاں؟ کدھر کس رخ؟ لینا پکڑ لیا ہے۔ دیکھو بچے رہنا، بھئی ساوند ہوشیار ... ارے یہ بڑا مچا ہوا ہے ... میاں خوجی نے جو لینا لینا جانے نہ پائے، چور چور کی آواز سنی تو خود بھی غل مچانا شروع کر دیا کہ ہائیں! ہائیں! خبردار جانے نہ پائے ... او چور اڑ گیدی ٹھہر! سنا! یہ خیر ہی نہیں ... کہ یہ شکوہ حضرت ہی نے چھوڑا ہے ... قد تو حضرت کا ماشاء اللہ پون اپنے کا اور دم خم یہ کہ ... قرولی کی حضرت نے عمر بھر صورت بھی نہ دیکھی ہوگی مگر بات بات پر قرولی اور قرابینے کی فکر رہتی ہے کوئی اس سخرے سے آنا پر چھے کہ اب قرابینے کا فش کہاں؟ شیر بچہ باندھتے آپ نے کس کو دیکھا؟ قرولی کس کی کمر میں نظر آئی مگر ان کو بک دینے سے مطلب ہے۔ خیر میاں خوجی جو گرمائے تو چھپر کٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لپک ہی پڑے ... گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں کہ لینا۔ لینا ... لپکے تو بھٹیاری کو ڈپٹ لیا اور فرمایا کہ تو ہی چور ہے۔ بھلا بے بھلا پکڑ لیا۔

ہے۔ بیاری نے کہا میاں کچھ خبر ہے برش کی باتیں کرو۔ اتنے میں آپ نے دوڑنا شروع کیا۔ پٹنک میں سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے۔ دوڑ دو۔ تے ٹھہر کر جھکتے ہیں تو ڈاڑھوں۔ میاں خوجی آگے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈ سے چنا چور ہو گئے۔ کمہار نے للکارا کہ ابے چور۔ [1] شیخ کہتے تھے کہ اس نے آن کر دبوچ لیا اور پکارنا شروع کیا کہ ارے دوڑیو رے کمالیو یوں ... سب کے سب دوڑ پڑے کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی ٹھیکرا ہے کوئی لٹھ۔ بیدھڑک گھستا آتا ہے کوئی للکارتا ہے ... اندھیری رات لٹھ اور ڈنڈا ٹوٹ پڑا۔ اچھا ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی ... بے بچاؤ کے حضرت پر پڑنے لگیں۔ یار لوگوں نے رسّا لے کے ہاتھ لگائے ... خوجی کی مٹی بھولی ... خوب پیٹ پاٹ چکے تو ایک سیانے نے کہا کہ ذرا ٹھہرو تو۔ خوجی ہیں جو اس کوٹھری میں پانچ سات روز سے ٹکے ہوئے ہیں۔ یہ داغ جدائی کا تو معلوم ہوا کہ یہ ہندی کے باشندے میاں خوجی ہیں ...!

الغرض میاں خوجی کی جان بچی تو لاکھوں پائے۔ کچھ تو مار کھا کر بچی۔ اخیر پنچہ الگ ہو گئے۔ سب لوگوں نے مہربانی کا ہاتھ کر خوب سہلا دیا تو میاں خوجی چلے ...

اب تو میاں صاحب جیسے تیسے ہوئے چلے آتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ بات تو سچی کہی کہ بڑا آزار دیتا ہے ... مردود چارپائی پر اٹھا کر کیا لادے ہوئی تھی ... بڑھاتے بڑھاتے میاں آزاد کی گلی [2] ... چلے آئے۔ مگر آنکھوں کے آگے بھی نہ سوجھا کہ آزاد کھڑے ہیں۔ جب قریب پہنچے تو میاں آزاد نے یوں کہا ... خیر ہم کو تو پہنچے گا لیکن دنیا میں یہ تو بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے۔"

خوجی:- ہاتھ پاؤں! ہونہہ یہ لڑنے کی سلاخیں ہیں۔ آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندہ درگاہ نے کیا کیا جوہر دکھائے۔ پچاس آدمی گھبرے ہوئے تھے۔ ایک کم ایک ڈھائی۔"

راوی:- درست۔ اس وقت آپ کو اتنا ہی تو ہوش تھا کہ آدمی گنتے بیٹھے ... مار سے چیتوں کے بولا تو گئے تھے۔ مگر بے حیائی بلا دور بھاڑ پوچھ کر میدان میں موجود۔

خوجی:- واللہ میں اس وقت کچھ جھجکی بنا تھا ... بس یکبارگی ہو گیا۔ آدمی اس شانے کو اور دس اس شانے کو لپکے تھے اور میں جو اس شانے لپکے تھے اور میں جو پھر اتو کسی کو خبر نہ ہوئی۔ میں یہ گرا کسی کو لے یہ مارا۔ کھٹ سے چھپ کھٹ کی پٹی پر ... دو چار میں سے ایک آ کے بڑھا۔ کے لہی تو پڑے۔ دس پانچ کی پڑی پسلی چکنا چور کر دی۔ یہ ڈھیلا بھائی وہ بھروسا۔ ادھر نکلا اُدھر اُدھر۔ جو سامنے آیا اس نے نیچا دیکھا جو مزا چڑھا ... ضدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ آدمی لکھا تو دیکھئے۔

راوی:- خدائی بھر کا جاں تو نہ ایسی کو خوب معلوم ہے مگر آپ کو اپنی تو ہم ہی دیئے دیتے ہیں۔ بے غیرت جو تی خور اسا بھر میں تو اس سرے سے اس سرے تک کوئی میں لفظ نہیں آتا۔ ... ڈپٹنگ پر ہیں تکار:"

جس طرح پٹنگ نے کہا سے میاں خوجی کی ہوا بگڑنی شروع ہوئی۔ کہ ٹھیس نواب کی ایک ملازمہ پر از عفرانی نے دی کہ کسی طرح تو مسکے رکھنا اور اسی پٹنگ کی یہ وقعت کا کچھ بس بھی ہو گئے اور ساتھ والوں کی طبیعت اور دکت بڑائی۔ دل پر کہرا، بزاز اور از عفرانی کا خوف بیٹھ گیا۔ ہوا پر سوار ہونے کی ترکیبوں میں جہاں یہ خوف نمایاں ہے وہاں آپ کی دوسری کمزوریاں بھی ظاہر ہوتی ہیں جو ان کے کردار کا ایک اہم جز ہیں۔

---

[1] چور کو پکڑا یا۔

پہلی شرط :- ——— قرولی ہم کو ضرور لے دیجئے اور ایک قرابتچہ بھی ہمارے پاس رہے ....

دوسری شرط :- برس بھر کے صرف کے لیئے افیم ایں جانب کو دیجئے۔ میں اپنے لاڈ سے لاد کھیپوں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اصلی مروت اتنا غفیل ہو جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی نہیں، مگر بندۂ درگاہ بے افیم پیئے ایک قدم نہ چلیں گے۔ وہاں پردیس میں افیم ملے یا نہ ملے کہاں ڈھونڈھتے پھریں گے۔

تیسری :- اتنا بتاؤ یہ کہ وہاں پر از عمر فانی کی سی ٹرینیں دیونیاں تو نکرنہ آئیں گی؟ ہوں تو بندہ ابھی سے رخصت ہوتا ہے۔ خدا حافظ، اف ذوہ ۱۱ کیا کہ کہ لائیں نکلی ہیں اور کیا تان کے لگے بازی کی ہے کہ پلیٹفارم ہی ہلا ڈالا۔ روح پر صدمہ ہے واللہ روح پر!

چوتھی :- سلام ہم سب تمام عمر ناتریں گے اور جو جہاز پر کہار ہوئے تو ہم بس ڈوب ہی مریں گے۔ اجی اتفاق ہے ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم۔ کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا ٹوٹ گیا تو کہار اکھر منجھر بنی الگ کر دے گا۔ لہٰذا کہاروں کی صحبت آج سے القط

پانچویں :- جس رئیس کی صحبت میں جہاز آتے ہوں گے وہاں ہم نہ جائیں گے۔ اس میں لالہ عین سکھ ہوں یا لالہ بلدیو۔ اجی جہاز تو ٹھہرے زمین کے گز۔ سب کہیں گھما چاہیں، مگر ہم ہمت دیکھ بھال کر جائیں گے۔

چھٹی :- جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کا بھی موسم تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کابلی برس پہنچا دے۔ ذرا یہ دریافت کر لیجئے گا۔

ساتویں :- ٹٹو پر ہم سوار نہ ہوں گے۔ اس میں چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

آٹھویں :- بیٹھے پلاؤ روز پکیں

نویں :- ہم کو میاں ٹوچی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب قبلہ کہا کیجئے۔

دسویں :- مرد چیے پر ہم نہ جائیں گے۔ بس باورچی خانہ کا انتظام ہمارے تعلق رہے۔ اور لوٹ مار میں جو کچھ بھی ہاتھ آئے وہ بھی ہماری تحویل میں رکھا جائے۔

گیارہویں :- حسن آرا کے نام ایک خط روز لکھنا اور ہر خط میں ہماری طرف سے بندگی بلکہ دعا۔

بارہویں :- گولی کھانے کے تین گھنٹے قبل اور مرنے کے دو گھڑی پیشتر ہمیں اطلاع کر دینا۔

تیرہویں :- جو ہم خدانخواستہ جنت میں داخل ہوں تو تلاش کو ہندوستان بھیجوانا اور جہاں والا مہ پور کی لاش دفن ہے وہاں ہی دفنانا۔ لیکن ہم کو خود ہی نہیں معلوم کہ یہ بزرگوار مرے کب اور دفنائے کہاں گئے اور رہتے کون؟ آپ ذرا پتا لگا لیجئے گا اور قبر برابر بنوا لیجئے گا اگر ان کی نیز ہٹے تو کسی قبرستان میں جا کر جو سب سے بہتر قبر بنی ہو اسی کے قریب ہم کو بھی دفنانا اور لکھ دینا کہ ان کے والد ماجد کا مزار شریف ہے!

چودھویں :- چلنے کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔ اس وقت یہاں استغراق کی کیفیت ہوتی ہے اتنی شرطیں اگر قبول ہوں تو خیر، ورنہ نہ خوشی نہ میاں آزاد!"

حاجی بغلول

منشی سجاد حسین

حاجی صاحب نے سفرِ حج کی زحمت تو خدا انخواستہ کسی خواب میں بھی نہ اٹھائی تھی، ہاں طامس کوک کی بدولت ہزارہا بندگانِ خدا کو اللہ کے گھر کا چالان ضرور دلوایا تھا۔ یہی حاجی صاحب آپ کے زویہ گھر پیچیم کم سے کم ایک حج تو جبتیا کر دینے کو کافی تھا۔ پس اگرچہ بہار سے جنابِ خدا کی عنایت سے صرف بمبئی تک۔ کیونکہ حاجی تھے، مگر یہ سفر ایسا مقبول ہوا تھا کہ واپسی کے بعد ہی سے خلقت نے بے روپے سمجھے، محض چند زمزم ہواں، سبزہ ست کی گٹھریاں، خرمہ اور نین تو اور روغن بلسان کی شیشہ سے دریا کی تعاریف، ناخداؤں کی مہربانی، دریائے شور کی کہانی، جہازیوں کی چند اصطلاحوں اور ان کی چند بدسلوکیوں کے قصے سن کر سبز عمامے، لمبی پوشاک اور سولی ڈاڑھی میں معلم اور حاجیوں کو صحیح محاج دیکھ کر نے کی دستاویز پر صادق علی المومنین خیرا۔ مہر مسند باضابطہ سرٹیفکیٹ یافتہ حاجی اور وہ حاجی جس کو حج اکبر نصیب ہو چکا ہو، مان رکھا تھا۔

اس لقب نے کچھ تو لوگوں کی لاپروائی اور ضعیف الاعتقادی اور بہت کچھ حاجی صاحب کی پنشن نفیس سعی بلیغ سے ایسی شہرت حاصل کی تھی کہ نام نامی اسم گرامی کا جزو لاینفک ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ادب ناشناس، زبان کا قابل بدون اس مقدس شاخ کے نام لینا تو سننے والوں کو اس کی بے ادبی پر سخت تعجب ہوتا، اور خود بدولت تو جامۂ نیلین سے باہر نیلی پیلی آنکھیں بحرِ احمر کی پھلیاں، ڈاڑھی کے بال وہیل کی مونچھیں، چہرہ آفتاب ملک عرب کی طرح تمتمایا ہوا، منہ پر بحرِ ظلمات کی طرح کف بے پایاں، مزاج میں مدوجزر کی بلا جیزی، جریب زیر تری لے کر بلا احرام و عمرہ اس پر اس طرح جھپٹ پڑتے کہ منا اور مروہ کے دوڑنے والے بھٹڈی رہ جاتے۔ اگر ننھی منی ٹھگنوں پر قدمی چال کے باعث اس تک دسترس نہ ہو سکتی تو کسی طرح ناقل نہ فرماتے۔ اس تکلیف فرمائی اور اہتمام بلیغ کا سبب صرف نرفیع ذاتی نہ تھا بلکہ اس جیسے کا بخار بھی ہوتا تھا، جو آپ کے والدین خصوص والد بزرگوار اور جناب مولوی بدرالدجیٰ صاحب پر بڑا تھا جنھوں نے پیدائش سے کئی سال قبل بپرپٹگی بطور صغیر قبل الذکر آپ کا نام نامی اسم گرامی الیسار رکھ چھوڑا تھا جسکی بزرگی مادر شفقت بڑی اتاؤ اور محلے کے گستاخ بازاری لونڈوں کے ہاتھوں ایسی ہوئی تھی کہ بدون لفظ حاجی فکائے نام لینا بالاتفاق جمہور نہایت گستاخی قرار دیا گیا تھا۔

نیچر نے بھی صورت شکل بنانے میں توجہ خاص مبذول رکھی تھی۔ شکل اور لوگوں کے آپ کی تعمیر ٹھیکیدار کے سپرد نہ کی تھی بلکہ دستِ خاص کی صنعت تھی۔ سر اگرچہ چودہ انچ کے دور سے بال دو بال ہم اندھا، مگر گدی کی جانب بہت اونچا ماہو لال کی چڑھائی کی طرح، پیشانی کی طرف ڈھلا ہوا۔ پیشانی پست تیجے کی جانب جھکی اور چھوٹے مگر بے پیں درخت اک۔ آنکھوں پر شنل سائبان جس پوش۔ آگے کو ابھرے ہوئے۔ مبنی نشاندہ قلت

وضع سے ایسی مختصر بنی تھی کہ بالکل معدوم، جتنے صرف تہ خانے کے روشندان، اوپر کا لب چھوٹا، نیچے کا جبڑا مع زخماں آگے کو ابھرا ہوا، دانت کی ہڈیاں بڑی، اوپر کے بہ نسبت نیچے کی بڑائی بڑی، اس پر رسولی ڈاڑھی نور علی نور، چہرے کو لرک دار بنائے ہوئے، پتلی گردن اس قدر مختصر کہ بیٹھی مقدس ہاتھ اپنی جمہ اعتقاد آرزوؤں کے گنج شہیداں یعنی سینہ، پر جادب کش، بازو اور ہاتھ فی المجلہ ڈھیلے، شانے ڈھیلے والنگلیاں لمبوترہ کہ مین گٹھڑیاں، مشکم مبارک کا بیضاوی دور سینے سے سوا، ٹانگیں چھوٹی موٹی، اوپر کا دھڑ بڑا دانہ خوری کی طرح پوقدمی چال۔ یوں تو حضرت کے انسان ہونے میں کسے محل شک ہو سکتا ہے، مگر سر عین بحکمت اساس میں اختلاف تھا۔ منقولی پر نظر اعتبار از راہ اس نسبت آپ کا سلسلۂ نسب بلا شائبہ بواسطہ حضرت آدم سے ملاتے اور معقولی انسان اور لاینحہ کے سلسلۂ گسستہ کی ایک کڑی بناتے مگر اس میں کلام نہیں کہ وقت غیظ غضب جب حاجی صاحب لب پاں خوردہ کھول کر کسی آفت زدہ پر چوٹ کرتے اس وقت ڈارون[1] کے مسئلے کی طرف دل بیتی ہو جاتی ....

.... فرائض نہی کے ادا و قضا کا نیا سبق کھانا کھولنا کچھ نہ رہتیں۔ ہاں کبھی کبھی اگر ایسی بلاؤں میں پھنستے تو صرف ایک کلی پانی کر کے بے وضو نماز ادا کر لی چھینٹوں کی چھٹی ہو گئی۔ تارک الصلوٰۃ کے الزام سے بچے۔ مسلمان سے اور آپ سے باپ مارے کا بیر تھا۔

.... آپ جانتے اس طرح مجمع ظرافت قدوم صمیمیت لزوم سے چلبک جلسے اور خوش طبع مزاجوں کے پریسیڈنٹ مجمع کے نکر خالی رہ سکتے؟ بڑا ہی بے ضابطہ وہ جلسہ ہوتا جہاں حضرت رونق افروز نہ ہوتے اور انتہا کی پھبکی کے لیے مزہ وہ محفل شمار کی جاتی جس میں آپ اپنی مضحک صورت و سیرت سے چہل پہل نہ پیدا کرتے۔ پریسیڈنٹ چیئرمین اور اسپیکر تک میں یا نہ آئیں مگر حضرت ضرور صدر کرسی پر ڈٹے ہوں گے۔ اب اب نشاط، اتانہ اہل محفل ہنوز جمع بھی نہ ہوئے، بلکہ ابھی فراش ٹیگیرے شامیانے کی ڈوریاں کھینچ رہے ہیں، فرش کی تکمن خال رہے ہیں اور آپ کی سواری ڈھیکی کرتی، آپہنچی پھر لطف یہ کہ دنیا کا کوئی مسئلہ معاملہ آپ بلا واقفیت و اجازت پھندیت بیڑ کی طرح بولنے کو موجود۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی تجویز پیش اور آپ مخالفت یا گم سے کچھ نہ پیش نہ فرمائیں۔ محفل میں گانے والوں کو بے وقت چیزوں کی فرمائش سے زچ کر دیتے۔ صبح کا وقت اور شام کھیان کی فرمائش، دوپہر رات اور بھیرویں پہ اصرار .... اگر کبھی کوئی صدا پسند آئی تو چوتھے کی تال ورنہ جب تک گانا سنتے سارنگیے طبلچی پر اکثر اغراض کی بوچھار فرماتے رہتے۔ کون رسیا اتنے بڑے کہ عمر بھر آپ کو سہا رے گا، ہا، ہا، دھا، نی کے موضوع لہ کے ادراک کی لیاقت نہ آئی۔ راگ راگنی کس جانور کا نام ہے۔ اس پر ناٹک ہونے کا عوامی کہ امجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا آپ کے نزدیک طفل دبستان:۔۔۔"

لکچر

صبح گجرم جبکہ متادرہ یعنی شمس عالم افروز نے نقارۂ گیتی پر چوب شعاع لگائی اعلان کر دیا کہ ہر عاقل و فرزانہ مجنون و دیوانہ حسب حاجت گاہ دنیا کی سیر و تفریح کو نکلے .... اعلان ہو گیا خلق خدا کی ملک بادشاہ کا آج پانچ بجے شام کو جناب آپ بڑے بھاری المناقب، مولوی قاضی، مفتی، منشی، سیاح جہانیان جہان گشت جہاندیدہ صاحبی بلغ العلی صاحب کل مدنی، تم لکھنوی قطع کے متعلق لکچر موعود دیں گے۔ ہاں اور بہت سی باتیں دین دہ دنیا کے متعلق تبائیں چلو چلو، خود اور اپنے ساتھ دوست احباب، انڈوں، بچوں، چینکی پوڑوں صاحب سلامتیوں، جان پہچانیوں، ایرے غیرے پچکلیانیوں، اڑوسیوں پڑوسیوں، اہل محلہ، راہ چلتوں کو لیتے آؤ پھر ایسا موقع عمر بھر نصیب نہ ہوگا۔ کرم دھم۔ کرم دھم۔"

---

[1] اس حکیم کی رائے ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے۔

اس اعلان ظرافت کی آواز حاجی صاحب کے بڑے بڑے کانوں تک بھی کہیں پہنچ گئی۔۔۔ ضبط قرار نے راہ فرار لی۔ ریشے ریشے میں سیماب داخل ہوا۔۔۔ اور آپ اچھے خاصے بوکھل ہو گئے۔

آج کئی گھنٹے منہ ہاتھ دھونے سر اگانے ڈاڑھی میں کنگھی کرنے بوتراغ مقدس عطار نے میں صرف فرمانے اور سامنے آئینہ رکھ کے عمامے سے بہت دیر تک گاؤزوریاں کیں، باندھا کھولا، پھر باندھا پھر کھولا۔ مگر کسی طرح پیچوں کی چن نہیں بیٹھتی جہاں چاہیئے وہاں آتا ہی نہیں۔۔۔ کئی دفعہ سر سے اتار تخت پر دے پٹکا آخر اٹھا کر کے آئینہ ہٹا دیا۔ پھر لے بیٹھے۔۔۔ عمامہ الجھاؤ میں دماغ بگڑ میں آخر جب بہت الجھن بڑھی تو اماپ شاپ جس طرح بن پڑا سر پر فوندا دیا۔ ہر چہ آید بگزرد کہہ کر لپیٹیں کا مصدر گرا اٹھ چلے سر سے بلا ٹلی۔ ڈاڑھی پر کئی دفعہ ہاتھ پھیر کے جو یہ نیتوانی پر خیال لگایا رومال سے جو تلے کی گرد جھاڑ کے بائیں کندھے پر ڈالا اور چل کھڑے ہوئے کرسیاں بچھیں کچھ سجی نہ جمی تھیں کہ آپ بطور تعمیر قبل الذکر جا پہنچے اور بیدھڑک صدر کی کرسی پر جائداد صدوہ ٹی کی طرح قابض ہو گئے۔ زہے قسمت ان کی جن کو اس روز زیارت نصیب ہوئی، ایک پچکی ہوئی ایک پچکی ہوئی گھڑا کرسی پر دھرا تھا زمین سے ایک ٹانگ دو اور دوسری اپنے اٹھی ہوئی۔ عمامہ سبز ہے یا خراب کے گیند پر گھاس کی ڈاٹ لگی ہے۔ کرسی پر انسان ہے یا پانی پر جلوہ آتشہ ہوا۔ آپ کہہ لے تو لے، کمبخت سر پر رکھے آگو وار جھکے بندوق کے گھوڑے کی طرح ڈیڑھ پائے پر چڑھے مستعد بیٹھے ہیں۔

۔۔۔ جب ۔۔۔ لوگ امید سے زیادہ آ چکے۔ حضرت نے بلا اجاز صدر و فقریہ تمہیدی کرسی چھوڑی، جو سب ٹیکی۔ عبا کے دامن آگے سے درست کئے۔۔۔ ریش مبارک پر مکرر سہ کر ہاتھ پھیرا۔۔۔ رومال سے منہ پونچھا، کھانسے کھنکھارے، جماہی لی، کئی دفعہ منہ کھولا اور بند کیا بالآخر یوں آغاز شروع کی۔

۔۔۔ کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم (گھبراہٹ میں الرحمٰن الرحیم کی تخفیف بول دی) المجد کہتا ہے یہ حقیر پر تقصیر کیا نام کہ شیخ فردوسی گلستان میں کہہ گئے ہیں ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق ۔۔۔ کہ یاراں فراموش کردند عشق

(وقفہ)

آج کل کیا نام کہ پانی نہیں برستا (سکوت پانچ منٹ) قحط پڑ گیا ہے بڑا افسوس ہے کچھ نہیں پیدا ہوا کھانے کو کہاں سے آئے؟ بلقرار فقرے (اونٹ کے منہ کو زیرا (چیرز) اس ملک سے برکت کی باتیں اٹھ گئیں۔ نہ کھلی سی برسائیں ہوتی ہیں نہ گرمی ہوتی ہے نہ جاڑا، اور نہ کیا نام کہ باپ کو بھائی بیٹے کو بہن، دوست کو دوست نہیں پوچھتے۔ (وقفہ تین منٹ) بھائیو غور کرو کون کون باتیں کمی جانیں۔ تم سب سمجھدار ہو سمجھا جاؤ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوستی بڑی عمدہ بات ہے اور اس میں شک نہیں ایک مدت سب کو کرنا چاہیئے زمانہ برا لگا ہے کیا نام کہ دوست برائیاں کرتے ہیں۔ تم ہے اللہ پاک کی بھاوے ملک عرب میں غلہ تو کم ہوتا ہے مگر دوستی زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ شام کے مردے کو کب تک روئے (چیرز) کیا نام کہ بس دیکھ لیا سب کو۔ اس ملک میں بڑی خرابیاں ہیں۔ اسی سے دوستی محبت کسے نہ ہونے سے دل میں خلش نہیں ہوتی۔ لوگ دوست کو بنا کر مزے لیتے ہیں اور جلا جلا کر لطف اٹھاتے ہیں (وقفہ سات منٹ) کیا نام کہ میں آپ سے کہوں بات یہ ہے جو خیال کرنا چاہیئے۔ کیا نام کہ (وقفہ پانچ منٹ) ہاں تو میں کیا کہتا تھا؟ ایک آواز آگے آئی آیت۔

.... حاجی - پھر کیا نام کہ اس میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟

قامر و سخن نہ گفتہ باشد　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد
دو بیشہ گماں مبر کہ خالیست　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

کیا نام کہ دیکھئے وکیل بیرسٹر لوگ ایک ادنیٰ سی بات کو کتنا بڑھاتے ہیں، مقدمہ والوں کا کتنا روپیہ برباد کرتے ہیں اور ایک بات اور کہوں -

آتا جاتا کچھ نہیں کرنے چلے تقریر ـــــ مقدمہ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے اور صلاح دیدیتے ہیں بلکہ مقدمہ چوپٹ کرا دیتے ہیں بلکہ عرضی دعویٰ تک صحیح لکھنا نہیں جانتے - مل کا ہارے گل کا جیتے - خدا کی عنایت سے ایک دفعہ اس ناچیز حاجی کو اتفاق ہوا، پرائیویٹ صاحب نے ایسا ڈبویا کہ تھاہ نہ ملی - کیا نام کہ کتا پڑھے اونٹ کاٹے (دو قعدہ تین منٹ) پس یاروں ان سے دور بھاگو - یہ سب روپیہ کھا لیتے ہیں آدمی فلہ کہاں سے لے سب تو سوت نہ کپاس کوئی سے لٹھم لٹھا کرتے کرتے خرچ ہو جاتا ہے (دو قعدہ سات منٹ) کیا نام کہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے میں تمہارا رازق ہوں - وہ تو کھانے کو دے ہی گا سب کچھ کھانے کو پیدا کیا گیہوں، مٹر، جو، چنا، اناج اور میوہ ترکاری گھاس پھوس، جنگل پہاڑ، دریا سمندر - بھیڑ بنے چیتے، لومڑی، کتا، بلی - فہامی آلاء ربکما تکذبان - تو کس کس بات سے انکار کر سکتے ہو شکر کرو کیا نام کہ شکر ؎

اویم زمیں سفرۂ عام اوست　　بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اور اس نے تمہارے واسطے کیا نام کہ گھر بار، صحن کچھ، چھپر پلنگ (چھپر کھپر پل) جھونپڑے - مچان بھٹ، بانبی سب دیئے ہیں رہم اور اس کی نعمتوں پر شکر کیجئے (دو قعدہ لاتعناہی)

کچھ تو اس معقول تقریر - زعفران زار کشمیر کے اثر اور کچھ طول طویل سکوت اسے لوگ سمجھے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا، اسپیچ تمام شد کا رحاجی نظام شد - کئی منٹ انتظار کر کے کئی جلد باز اٹھ کھڑے ہوئے اور باوجود حاجی صاحب کی "ہاں ہاں" کے جلسہ خود بہی برخواست ہو گیا کرسیوں، بنچوں کی چرخ چوں سے حاجی کو وحشت لوگوں کے اس طرح اٹھ کھڑے ہونے پر بے حد نفرت ہوئی، خیالات میں پراگندگی بذیان، زبان میں لکنت آئی اور بڑی بات یہ کہ وہ ایک نے یہ صدا سنائی حضرت اب تکلیف نہ فرمائیے - جلسہ برخواست ہو گیا، حاجی نے پھر ایک دفعہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا، صرۂ دماغ کے کھونے سے ٹٹول ٹٹال کر ایک آدھ ریزگی نکالی - گرفتاوان سخن و صیرفیان اسپیچ فہم و فراست کے دیوالہ نکل جانے کے خوف سے دکان بڑھا چکے تھے - مجبور و ناچار سکۂ قلب کی طرح واپس دل ہی میں رکھ لی اور داہنے بائیں نیچی نظروں سے دیکھتے رومال سے منہ پونچھتے مجمع کو چیرتے نہایت ناخوش و برہم، چیتھڑوں سے جان سے خفا اس طرح رفو چکر ہوئے کہ دوست احباب نیا مذہب تلاش ہی کرتے رہے۔

"معاف فرمایئے؟" آپ بولے "یہ محض احساس کی بات ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قدرت نے آپ کو طبیعت پر جبر کی طاقت عطا کر رکھی ہے۔ لیکن نیاز مندوں کی نگاہ سے کوئی بات اوجھل نہیں رہ سکتی۔ آپ نے سنا ہوگا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ ہزار چھپائیں۔ لاکھ ہنستے چمکتے نظر آئیں۔ لیکن چہرہ کسی وقت دل کے راز داشتگاف بھی کر دیا کرتا ہے۔ ہم اپنی معصومیت کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہمیں جب آپ کے پیارے بچوں کا خیال آتا ہے تو اس وقت جو ہم پر گزرتی ہے وہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں....."

"جی حضرت! خانصاحب نے مسکرا کر پوچھا "کیا ہوا ہمارے بچوں کو؟"

"قبلہ!" آپ نے جواب دیا۔ "ہمیں بچوں کا فکر کیوں نہ ہو۔ ہوئی اور شدنی تو ہر وقت ساتھ لگی ہے۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ نصیب اعدا اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو پھر ان معصوموں کا کیا ہوگا۔ زمانے کا رنگ بھی تو آپ سے کچھ چھپا نہیں۔ سگوں کی آنکھیں پھیرتے دیر نہیں لگتی کہ خدا کے فضل و کرم سے آپ کے ہاں دولت کا ریل پر ستا ہے۔ لیکن کرنا تے تو ساری آپ ہی کی ہے پھر دولت تو ڈھلتی چھاؤں ہے۔ اس کا کوئی اعتبار بھی تو نہیں کوئی بھی قیامت تک آپ کی ہی دلیز کھوٹے بیٹھی رہے گی۔ اللہ تعالےٰ قرآن عظیم میں فرماتے ہیں کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ اور اتنا تو آپ بھی جانتے ہیں کہ موت کسی کو اطلاع دے کر نہیں آتی۔ کوئی اڑچ کوئی کل۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ آپ بنک میں روپیہ رکھتے ہوں گے۔ لیکن بنک بھی جب چاہے دیوالیہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کا بیمہ ضرور کروالیں۔ آپ کے مرنے کے بعد پسماندگان کو ایک معقول رقم مل جائے گی اور آپ کے جہاد دینے کا جو صدمہ انھیں ہوگا اس کی کچھ نہ کچھ تلافی بھی ہو جائے گی۔"

"بہت اچھا" خانصاحب نے پیچھا چھڑانے کو کہا "سوچوں گا۔"

"لاحول ولا قوۃ!" مرزا جی بولے "کب سوچیں گے آپ، آپ دیکھ رہے ہیں کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہے۔ اور گورستان والوں کی چاندی ہو رہی ہے۔ پھر آپ تو ماشاءاللہ کاروباری آدمی ہیں۔ یہ سودا بھی کر دیکھئے....."

"سودا کیسا؟" خاں صاحب نے ٹوک کر پوچھا۔

"جی واہ!" مرزا جی نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے بہتر سودا اور کیا ہوگا۔ بیس پچیس ہزار کا زندگی کا بیمہ کروالیں۔ شاید دو ایک قسطوں کے بعد ہی وارے نیارے ہو جائیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"اجی مطلب تو بالکل صاف ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج کل حضرت ملک الموت علیہ السلام چھاپہ پکڑے بیٹھے ہیں۔ کون جانے جو آپ بھی کوڑے کرکٹ کیطرح نپیت میں آجائیں۔" مرزا جی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

خاں صاحب نے مسکرا کر رجھ کالیا اور مرزا صاحب نے کہا۔

"موسم کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہوئے تو ہم یہ کہیں گے کہ آپ بچوں کی زندگی کا بیمہ کر ڈالیں۔ آپ جانتے ہیں بچے کھلے نہ پینے کے معاملے میں احتیاط نہیں کرتے۔ آجکل جس نے کھانے پینے میں بے احتیاطی کی وہیں کو چ کا ڈنکا بھی بجنے لگا۔ آپ تو ماشاءاللہ بڑے سیانے آدمی ہیں۔ اگر آپ سوچیں تو یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہی ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ لیکن اگر ایک دو کی آہی گئی تو وہ امر بیل ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ دم مارے۔ اگر بچوں کی زندگی کا بیمہ ہو چکا ہوگا تو گھر بیٹھے آپ کو اتنی بڑی رقم مل جائے گی یہ تجارت سے سال بھر میں بھی نہ ہے۔ بچوں کا کیا ہے۔ بچے تو خدا اور بھی دیدیگا۔ دیکھئے حضرت! یہ باتیں آپ کے سوچنے کی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سودا کر دیں میں بھی چٹک ہوتی ہے اور

آپ کو خدا نے جو عروج عطا کیا ہے آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ ساری برادری آپ سے جلتی ہے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ دوکان اور گھر اور گھر میں جو مال اسباب ہے اس کا بجلی بیمہ کروالیں۔ کون جانے کسی وقت کوئی حاسد رات کے اندھیرے میں چنگاری ہی ڈال جائے اور سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے۔ لیکن اگر بیمہ کروا رکھا ہوگا تو ایک بار چھوڑ ہزار بار جلے۔ اجی روز جلے۔ آپ کو پیسہ ہی کو۔ اصل سے زیادہ رقم تو آپ کو مل ہی جائے گی۔ حضرت! آج دنیا میں نہ کوئی مروّت داری کو دیکھتا ہے۔ نہ کسی کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ آج پر دھان وہ ہے جس کے پاس دولت ہے۔ دانا ؤں کا قول ہے کہ عقلمند کو بس اشارہ کافی ہوتا ہے۔

اس عارضانہ تقریر کا اثر جو خانصاحب پر ہوا ہوگا۔ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

قاضی جی

شوکت تھانوی

(ڈرامہ برائے ریڈیو)

اجمل:۔ "جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں۔"

بیوی:۔ "کون اجمل بھائی؟ میں آرہی ہوں ذرا بال سنوار لوں۔"

اجمل:۔ "واعظ ہوتے ہوئے آداب عرض بھابی۔ کیسے کیسے یاد فرمایا تھا اور ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟"

بیوی:۔ "کیا بتاؤں میں تمہیں بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ لوگ سمجھتا کس طرح ہیں کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے؟"

اجمل:۔ "فلم کمپنی پر قبضہ؟ آخر کیا معلوم کہ فلم کا کاروبار کیسا ہوتا ہے اور ہم کو صرف"

بیوی:۔ "یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی کی بھرپور چیز سے۔ دو دن تماشے دیکھے ہوئے کہ ہو گیا ہے کہ فلم کمپنی کا مل گئی تو جیسے دنیا پا لی۔ دیکھئے"

اجمل "مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟"

بیوی:۔ "اللہ جانے فلم کمپنی خود (ہی) کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے تھے۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر چھوڑوں گا خدا جانے کیا کیا۔ پاگل پلاؤ پکا کرتے ہیں۔"

اجمل:۔ "اور تشریف کہاں لے گئے ہیں؟"

بیوی:۔ "جاتے کہاں۔ اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تو یہیں کچھ سمجھا خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آجائے۔"

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی:۔ "اہاہا۔ اجمل صاحب یہی ہوتے ہے دھوبی سے پاس میلے کپڑے ضروری مشورے کرنا یہی تو ہم دونوں میں ہے۔ ... اجمل بیاہ ہوا میں سارے سیانا پن کی کمر دست پلڑ جھوکے وہ تر کیب ٹھکانے لگ جاتی ہے جو ہم خدا کی سونے کی کان سمجھ سونے کی طا"

اجمل:۔ "اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے۔"

بیوی:۔ "فلم کمپنی کھل۔ یہی ہے۔"

قاضی جی:۔ "کھل رہی ہے یا پر کھبو کہ بس کھل گئی۔ خدا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ بیٹھے سونا بنانا اور دیکھ لینا یہ د
دیکھ جائیں گے دن پلٹ جائیں گے موٹریں اڑائے پھرو گے موٹریں۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل بھائی اگر زندگی کو یا میں بے برباد کر دی اور
ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جیب قبر میں پیر لٹک چکے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔"

اجمل:۔ "یہ تو درست ہے مگر بتلا آپ سے اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ؟"

قاضی جی:- "بھئی بیوی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عورتیں بہت سی صلاحیتیں انسانی ہوا ایسی ہوتی ہیں جن کا اُس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جو تیاں چٹخاتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے نہ ہی میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا کہ میں دراصل تھا ہی اس کام کے لئے آپ کو حیرت ہوگی کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا کام میں نے کر لیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم۔"

اجمل:- "یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ؟"

قاضی جی:- "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہو سکتا ہوں مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آ رہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفر اللہ۔"

اجمل:- "استغفر اللہ؟"

قاضی جی:- "نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے برخ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ ہی طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں چند ہوں میں پاگل ہو گیا ہوں ارے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بھڑاخر کرنا چاہیے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے۔"

بیوی:- "میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لئے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔"

قاضی جی:- "ملاحظہ فرمایئے آپ کی حماقت؟ خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو۔ جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دیں گے اس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اس بامعقول شوہر کی قدر و عزت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا اتفاق؟"

اجمل:- "اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے؟"

قاضی جی:- "بھی تو خوبی ہے۔ اس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک بڑا سا ٹانگہ ہے۔ جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اس میں زنانی سواریاں ہیں اور وہ تانگہ نہایت تیزی سے ایک سنسان سڑک سے گزر رہا ہے اندر تانگے والا گاتا جا رہا ہے۔"

لمبی چوڑی سڑکوں پر۔ ہاں پر۔ ہاں پر۔ میرا تانگہ فر فر جائے
میرا تانگہ فر فر جائے میرا گھوڑا ہنس کھائے
دم لہرائے چال دکھائے
لمبی چوڑی سڑکوں پر۔ ہاں پر۔ ہاں پر۔ میرا تانگہ فر فر جائے
پھول سی ہلکی ہلکی سواری میں ہوں ہلکی

بیوی:- "(ہنس کر) بھئی اللہ۔ بس خدا ہی تم پر رحم کرے۔"

قاضی جی:- "لاحول ولا قوۃ۔ اگر اس طرح سنو گی تو میں سمجھے کی نہ ہے نہیں۔ (بھئی اللہ اور ادئی اللہ شروع کر دیا تم کیا جانو فلم کے گانے اسی طرح ہوتے ہیں۔ یہ گانا جب سازوں کے ساتھ چلتی ہوئی دھن کی شکل میں آئے گا تو دیکھئے گا کہ کیا قیامت ہوتا ہے۔"

اجمل:- "بھائی ذرا سی لیجئے دیجئے مجھے تو بیحد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج ہی مجھ پر وا ہوئے ہیں۔"

قاضی جی: "ارے صاحب ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ دم بخود رہ جائیں گے سن کر۔ خیر کانوں کو چلنے دو ان کا لطف تو سازوں ہی پر آئے گا۔ مگر کہانی سنو کہ کس قیامت کی ہے تو صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا جا رہا ہے کہ ایک موٹر پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری تکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قیامت کا سماں ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اسی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور اپنی عالیشان کوٹھی میں لے آتا ہے اور تیمارداری کرتا ہے وہاں صاحب ایک انقلاب ہوتا ہے کہ اس کو ہوش آجاتا ہے۔"

بیوی: "ہنس کر) لو اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے؟"

قاضی جی: "میچہ بخیر تم کو تو نکتہ چینی سے سلطنت ہے، مگر خدا کے لئے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو۔ یہ فلم پر لطف ہونے کی توقع ہے تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے۔ الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب؟ وہ کہتا ہے میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑتا ہے؟"

بیوی: "تو کیا پوری کہانی سنا دوگے اس وقت؟"

قاضی جی: "بیٹے یہ ہوئی ہے قدر افزائی میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پیری تلمیذ کا سلسلہ جاری ہو گیا ہوگا مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کھایا نہ بھینس بولی گویا بھینس نے کوئی معمولی جواب دیدیا خیر تم سے تو توجہ کو اسی قسم کی توقع تھی۔ مگر اں میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری کے ساتھ کہدیں کہ کس قیامت کی روانی ہے اس قدر تالیاں بجیں گی اس مکالمہ پر کہ تم ہی صدف انزادگی مجھ پر سے کہ خدا مجھ کو نظر بد سے بچائے رکھے۔"

اجمل: "یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ میں نے کہانی کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی والوں کی دو چیزوں پر تو تم نہیں ہو جاتی۔ سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی ایسا کام بھی اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے؟"

قاضی جی: "نہ سہی ہمارے بھئی نہیں کیا ہے تو نہ سہی اب کریں گے اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو کر دنیا منہ دیکھ کر رہ جائے گی اور فرض کرلو کہ نصیب دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا؟"

بیوی: "ہاں اور کیا تمہارے لئے تو ایک تماشہ ہو گیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک قانون کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی؟"

قاضی جی: "بیٹے لے آئیں وہ کھا پھر اکر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقلمند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا مگر معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان۔ پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام ہو گیا اور اگر پاکستان کو آپ میرے لئے کر دیں تو بھی

بیوی:۔ "تمھیں کیا کہنا چاہیئے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو؟"

قاضی جی:۔ "تمھارے لئے یہ مشکل تو نہیں تم خود ارادے سے اس طرح باتیں کیا کرو جس سے مجھ کو یقین آئے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے میں تو کانپ جاتا ہوں۔ تمھاری زبان سے ملک اور قوم جیسے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں، میری رفیقۂ حیات ہیں۔ میری شریک غم ہیں مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے آپ اخبار بین گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کرتی ہیں وہ نہایت مہمل جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ نقاشی کی ہے زندگی بھر اب بتلایئے میں نقاشی کیسے کر سکتا ہوں؟"

بیوی:۔ "اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری کیوں نہیں کرتے؟"

قاضی جی:۔ "ڈاکٹری (قہقہہ لگا کر) بھئی کیا مخول کی پوٹ بیوی ملی ہے ہم کو بھی یعنی میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں جس کو یہ تمیز نہ ہو کہ نبض انسان کی گرمی میں ہوتی ہے یا بغل میں اس کو جناب ڈاکٹری کا مشورہ دے رہی ہیں؟"

بیوی:۔ "بس ٹھیک ہے اسی طرح تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فلم کس چڑیا کا نام ہے۔ پھر آخر فلم کمپنی کے تیکھے کیوں پڑے ہو؟"

قاضی جی:۔ "یہ تو صاحب قائل کرنے کا نہایت ہی بیہودہ طریقہ ہے کہ خوامخواہ دیکھ قائل کیا جائے مگر تم خود ہی دیکھ لو کہ آخر میں نے کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ گانے تیار کئے ہیں یا نہیں۔"

بیوی:۔ "خدا کے لئے یہ کہانی یا یہ گانے کسی کو سنانا بھی نہیں لوگ مذاق اڑائیں گے۔"

قاضی جی:۔ "کیا مطلب یعنی اس قدر مہمل ہیں جب تم اپنی حقیقی۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خاص اپنی بیوی ہو کر ایسی باتیں کہہ رہی ہو تو مجھ کو کسی اور سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ وہی سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی پہ ہے ہاتھ ـــــ نہ ـــــ نہ۔ وہ تو فارسی میں ہے کہ سعدی از دست خویشتی فریاد۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے۔ میرا کیا ہے لعنت بھیجو فلم کمپنی پر۔ آج سے اگر کسی فائدے کی بات کا ذکر بھی کروں تو تھپڑ سے میری اوقات پر۔"

(غصہ میں چلے جاتے ہیں)

کشکول

محمد علی جوہر

اگر نرم دل، بیک ناوک مطلق بجستہ لارڈ اروِن ہم ہندوستانیوں سے فرماتے کہ تم بڑے ضدی ہو، بڑے منہ سوا تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے تم کشتی اور گردن زدنی ——— لیکن کوئی کہاں تک تم سے لڑے جھگڑے، لو یہ تمہارا سوراج، اب جاؤ ہمارے سامنے سے پھر اپنا کالا منہ ہمیں نہ دکھانا، تو ہم سے تم نے کیا بگاڑا تھا، ہم خوش خوش ان کے دردولت سے چلے جاتے اور پھر کبھی ان کی دہلیز پر قدم نہ دھرتے، مگر انہوں نے ایک گالی بھی نہیں دی، کسی کو برا، بھلا نہیں کہا، نہایت تہذیب، نہایت متانت، نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ مجھے آپ حضرات کے ساتھ بے حد ہمدردی ہے۔ کاش! میں آپ کی درخواست رد نہ کرتا مگر کیا کروں، سخت مجبور ہوں، آپ کے جتنے بھی نمائندے ہیں ان میں ایک سے ایک بڑھ کر طبیب حاذق ہے، وہ سب یہی کہتے ہیں کہ آپ کے منہ میں سیاسی حقوق کی کھیل اثر کر نہ جائے، یقیناً فاقہ کشی کی تکلیف آپ کو بعد محسوس ہوتی ہوگی اور آپ میری اور میرے رفقائے حکومت کی شکم سیری پر ضرور رشک کرتے ہوں گے مگر الجھا سی رائے ہے کہ ہم کو تکلے سے موت آئے لیکن آپ کو یہ مرض مبارک نہ ہونے پائے بلکہ آپ ایک سوکھے ٹکڑے کو ترس ترس کر جان توڑ دیں۔ امید ہے کہ آپ بالکل اب مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ خدا حافظ!

اس پر کوئی کہے تو کیا کہے؟ مگر یہی لارڈ اروِن کی ابتدائی سادہ لوحی نہیں ہے، بلکہ انتہائی ہوشیاری ہے۔ "میں بھی ہندوستانیوں سے یہی کہوں گا کہ تمہارا خدا حافظ!

اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی ہے، ایک خرابی ہو تو اصلاح کی جائے، جب بہ حرف خرابیاں ہی خرابیاں نظر آ رہی ہوں، تو ہجوم یاس سے متاثر نہ ہونا نہایت مشکل ہے۔ کسی سلطنت میں ایک بار کچھ اس قسم کی بارش ہوئی کہ جس پر ایک بلند بھی بچ گئی وہ فاتر العقل ہو گیا، کوئی پگڑیے پھاڑنے لگا، کوئی لوگوں کو مارنے لگا، کوئی گالیاں بکنے لگا، کوئی تماشا کرنا چلنے لگا۔ غرضیکہ عالم و عامی، شریف، رذیل، اعلیٰ و ادنیٰ کوئی بھی اس ولولہ انگیز سے نہ بچ سکا۔

بادشاہ اور وزیر تخلیہ میں کچھ گفتگو کر رہے تھے، ان کو نہ اس عجیب و غریب بارش کی کچھ خبر تھی، نہ ان پر ایک چھینٹ پڑنے پائی تھی، جب وہ خلوت سے باہر نکلے تو چوب داروں اور خدمت کاروں کو مست پایا۔ افسوس کو حکم دیا کہ اس گستاخی کی خدام بارگاہ کو سزا دی جائے، اور اسے بادشاہ اور وزیر پر ہنسنے لگے۔ کوتوال کو حکم دیا کہ سب کی مشکیں کس لے، تو اس نے خود بادشاہ کو گرفتار کرنا چاہا، اعلیٰ حضرت پریشان ہو کر حرم سرا میں تشریف لے گئے کہ کچھ دیر وہیں دل بہلائیں مگر وہاں اور شہزادی خواجہ سرا اور باندیاں بھی رنگ میں نظر آئیں اس کا ذکر کرنے

سے بقول بعض اہل دوا کا اشتہار دینے والوں کے "تہذیب مانع ہے"۔

بادشاہ اسٹیٹ پاؤں زمانہ سے مدوا نے میں آئے اور وزیر باتدبیر سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کیا جائے؟ اس نے کچھ دیر تامل کیا، پھر کہا جہاں پناہ! مجھے بارش کا پانی پینے کا بہت شوق ہے، جیسے گھر کے پرنالے کے نیچے دو گھڑے بھرے رکھے ہیں، ایک حضور سے ڈال لیں ایک میں ڈال لوں۔ پھر ہم بھی ان ہی سب کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر ہمیں کوئی بھی دیوانہ نظر نہ آئے گا۔ ایک عام میں سب ہی ننگے

بعض وقت یہی جی میں آتا ہے کہ چھوڑو سارے دھندے۔ قصر حکومت کی دیوار پر بچہ سقائی کرو اور گورنری نہ سہی تو ایگزیکٹو کونسلری ہی سہی اور وہ بھی نہیں تو ایک منشی ہی سہی مرو۔

ہندو مسلم اتحاد کیسا؟ تم بھی بے پھاٹک کے ہوی کھیلو۔ گاندھی یوں ہی کہلاتے ہو خود بھی دینے لگو۔ کیسی کانگرس اور کس کا سوراج، کیسا چرخہ اور کہاں کا کھدر؟ سب پر لعنت بھیجو۔

(۳۰ر جنوری ۱۹۲۶ء)

آج مسٹر اسمبلٹ وزیر ہند نے کہا کہ ہند کے قانون کا مسودہ لے کر ولایت گئے ہیں جس کا حشر معلوم ہے کہ کیا ہوگا؟ اسے ایسے شخص کے سپرد کیا جائے گا جو پارلیمنٹ کے مسودات قانون کی غلطیاں درست کرتا ہے۔ اس کی مثال تو بعینہٖ اس شخص کی سی ہے جو راستہ میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا تھا، لوگوں نے پوچھا کیا تلاش کرتے ہو؟ کہا کہ بھائی ایک نعل مل گیا ہے، تین ہوں اسی طرح مل جائیں تو گھوڑا خرید لوں۔

گویا مسودہ قانون میں صرف دو تین غلطیاں نہ رہیں گی تو مسودہ ضرور فوراً پاس ہو جائے گا۔

(۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

لکھنؤ کے اشتہاریں شاہ سلیمان صاحب پھلواری کا نام بھی درج ہے۔ اللہ اللہ اس پھلواری میں بھی مدت کے بعد پھول آئے ہیں۔

(۲۸ر ستمبر ۱۹۲۵ء)

نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں اس صوبہ کا نام صوبہ جات متحدہ رکھا گیا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اس سے زیادہ صوبہ جات نو متحدہ کے نام کا کوئی صوبہ پنجاب کے سوا مستحق نہ ہوگا۔

(دیکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

یورپ پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اور عام خیال ہے کہ ہر مسلمان کا گھر سو دو سو بیویوں اور باندیوں کی حرم سرا ہے۔ اس لئے یورپ کی شوقین لڑکیاں جی کی طبیعت یوں مکار کو سینما میں دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے، اس لئے نئی دنیا کے حسن و عشق کی کلب بنانا چاہتی ہے جس کا نام مشرق ہے اور اس نئے راستہ کی داسکوڈاگاما ہونے کی خواہش مند ہیں جو "اس امید" سے ہو کر ایک مسافر کو مشرق تک پہنچاتا ہے۔

(۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۶ء)

لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں جن کا اصل صاف یہ ہے کہ "ایک پیسہ لوں گا ایک گالی دوں گا" یا جن کی آمدنی کا مدار ان کے

سے اشتہارات میں چھپ کے پڑھنے ہی سے نہیں بلکہ چھاپنے سے بھی بہتوں کا بھلا ہوتا رہتا ہے

مولانا شوکت علی راقم الحروف کے بڑے بھائی ہیں۔ لیکن اگر بعض مہربان دوستوں کے اس خیال کو مان لیا جائے تو راقم الحروف ان چند مستثنیٰ میں سے ہے جو پورپ دیکھ کر انگریزی شاعر کے قول کے مطابق "ترکوں کی طرح کسی بھائی کو تخت کے نزدیک نہیں آنے دیتی"

راقم الحروف اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو کتابی سمجھتا رہا ہے مگر اس کی ہستی اس قدر بڑی ہے کہ کسی طرح وہ ایک معمولی انسان کے دائرہ پر نہیں آ سکتے اور یہ خیال جس قدر ان کے حجم کے متعلق صحیح ہے اس سے کچھ زیادہ ان کی روح کے متعلق درست ہے۔

ایک ایسا شخص جو چار سی چکے کی ملاش کو روزانہ چھ چھ ارتبہ وفد خلافت کے سہ منزلہ بالاخانہ پر کھینچ کر لے جایا کرے اور روزانہ سو یا دو کانوں کا چکر لگا کر سے اور وہ وہ آدمی (یا عورتیں) دکان سے لے جا کر، یا تیں، روپیہ دے، دوکان کھلوا کر، یقیناً ایک متحرک پہاڑ ہے اور ان کی قوت سے جو اس پہاڑ کو متحرک کرتی ہے۔ اس وقت سب بالوں سے ہو جاتے ہیں، اس وقت تمہارے ایک ہستی ہے جو ہم سب کی مردہ میدان ازسرنو جان ڈالا کرتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ ہم سب نے خلافت کے لئے کام کیا ہے لیکن اگر ہر جماعت کی تہ میں سچائی تلاش کی جائے تو جس طرح مراٹھوں کے خود مختار بادشاہ بالاجی بھاجی راؤ ہم نے اپنے تاریخی نوٹ بک میں جو "قانونی مجموعہ سلطنت" کا بار بار ذکر کرتا تھا کہ دیا کہ "سلطنت! وہ تو میری نوات ہے" اسی طرح شوکت بھی کہہ سکتے ہیں کہ "یہ کام تو تنہا میں نے کیا ہے" کیونکہ تنظیم خلافت کی بنیاد بھی وہی تھے اور اٹھتا بھی وہی ہیں۔

فی الحقیقت انہی نے اس تحریک کو شروع کیا اور آج بھی جب کہ سیٹھ چھوٹانی کی بدولت اور رشدھی و تنگھٹن کا مسلمانوں پر اثر دیکھ کر پس پردہ کام کرنے والے ہاتھ سے بے خبر لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ تحریک خلافت کا خاتمہ قریب آ لگا ہے۔ شوکت نے تن تنہا گاندھی جی کی طرح اس عام رزن کو زندہ مضبوط اور تر و تازہ رکھنے والے بازوؤں پر سنبھال رکھا ہے وہ خواہ اور کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر ایک مضبوط اور صدی نیز مرد ہیں اور جس ہنس کو اور ہنسا کر لوگوں کو لوٹنے کا راز کچھ الجھیں کو معلوم ہو۔

(۲۴ راگست ۱۹۲۵ء)

آج ہاجہ کے متعلق باجہ سے بھی بلند آواز ان مسلمانوں کی ہوتی ہے جو مشکل سے کبھی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے ہوں گے اور گئو کشی کے لئے بعض اوقات وہی آج سب سے زیادہ جوش کا اظہار کرتے ہیں جو کل تک ہمارے ساتھ ولایت میں خوب بیف اڑائے کا گوشت، اٹھا کتے تھے۔

(۲ دسمبر ۱۹۲۵ء)

فکاہات

ظفر علی خاں

اہل آئرلینڈ اپنی ظرافت و بذلہ سنجی کے لئے بڑا نیز بھر میں مشہور ہیں اور یہ ملکہ ان میں خداداد ہے۔ لکھے پڑھے تو ایک طرف رہے وہاں کے اجڈ گنوار بھی بے ساختہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سن کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دلکشا مذاق وہی ہے جس میں چٹخ ٹھمانی کا سا تدرتی ابال موجود ہو۔ جس کا رنگ قندیل کی طرح خود بخود جھلکے۔ بناوٹ آئی اور اس کی سب لطافت جاتی رہی۔

کچھ دنوں آئرلینڈ کی ایک میونسپل کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا تھا جس کا لطف لاثانی شنیدنی و قابل داد ہے۔

"حکم ہوا کہ ایک نیا جیل خانہ طیار کیا جائے۔ اور اس کے لئے تمام مسالہ پرانے جیل خانہ کے ملبے سے حاصل کیا جائے۔ لیکن جب تک اس نئے محبس کی عمارت طیار نہ ہو لے پرانے محبس کی عمارت بدستور قیدیوں کی حکومت کے لئے کام میں لائی جاتی رہے۔"

یہ تو میونسپل کمیٹی کے روشن خیال اراکین کا لطیفہ تھا۔ اب ایک گنوار کی چھیڑی کی بانگی ملاحظہ ہو جو اس نے ایک قہوہ خانہ میں حاضرین کی پہیلیاں دہری کرنے کے لئے چھوڑی تھی:۔

قہوہ خانہ میں چند امریکی گویے بیٹھے ہوئے تھے، دو بوشراب پی رہا تھا۔ ایک گویے نے جو لاف زنی کے فن میں یکتائے روزگار تھا، باتوں باتوں میں اپنے تجانِ بادہ پیما سے کہا کہ پرسوں رات میں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنی رسیلی تانیں اڑانی شروع کیں تو حاضرین پر وجد کا ایک عالم طاری ہو گیا اور انہوں نے مجھ پر اتنے گلدستے پھینکے اور اس قدر پھول برسائے کہ میں اس خرمن گل میں دب گیا۔ اور اگلے دن اگر میں چاہتا تو گل فروش کا ایک کارخانہ انہیں پھولوں کے ڈھیر سے کھول دیتا۔

ایک آئرش گنوار سے جو اس میز پر بیٹھا ہوا چرٹ کا دھواں اڑا رہا تھا امریکن گویے کی یہ شیخی نہ سُنی گئی، اور وہ بے تحاشا بول اٹھا کہ اس کمال میں تو میں تم سے کہیں بڑھا ہوا ہوں۔ پہلی مرتبہ جب میں نے کھلے میدان میں مجلس کو گانا سنایا تو اس کے صلے میں انہوں نے مجھے ایک دو منزلہ مکان دے دیا۔

امریکن: ۔ بڑی توپیں ہو گئے ہو۔ دو منزلہ مکان دے دیا اور گانے کے صلے میں، کیا لغویات ہے!

گنوار: ہم اسی میں لغویات کی کیا بات ہے ہیں نے گلنا بھی گایا اور اس کے صلے میں مکان بھی پایا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مکان مجھے ایک ایک اینٹ کی دل گنت قسطوں میں ملا ہو۔

صفائی کی طرف سے ایک وکیل صاحب فریق ثانی کے گواہ پر جرح کر رہے تھے۔ ان میں اور گواہ میں جو نوک جھونک ہوئی اسے ہم بہ قلم کئے بغیر نہیں رہ سکتے

وکیل: آپ کا بیان ہے کہ دیوار آٹھ فٹ بلند ہے اور آپ زمین پر کھڑے تھے۔ کوئی سیڑھی بھی نہ تھی جس پر آپ چڑھے ہوں۔

گواہ: جی ہاں۔ میں اب تک اسی بیان پر قائم ہوں۔

وکیل (اس انداز سے کہ جس پالا اپنے جیت لیا): تو پھر براہ کرم یہ ارشاد فرمایئے کہ جب آپ کا قد پانچ فٹ سے کچھ ہی نکلتا ہوا ہے تو آپ آٹھ فٹ بلند دیوار پر سے کس طرح ملزم کے حرکات و سکنات کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔

گواہ (نہایت دل جمعی سے): جناب اس دیوار میں ایک روزن بھی ہے۔

حضرت میاں میرؒ کا فیض باطن ہندوستان سے نکل کر ترکستان تک کو اپنا حلقہ بگوش ارادت بنا چکا ہے۔ بدخشان کے رئیس، علماء و صدر الافاضل ملا شاہ بدخشی تک حلقہ ارادت میں داخل ہو چکے ہیں جن کی عمارت و نقوش انہیں حضرت میاں میر کی خلافت سرافراز کراتا ہے۔

لاہور میں وہ صاحب سجادہ ہیں۔ ولی عہد سلطنت شاہزادہ دارا شکوہ کو ان سے خاص ارادت ہے جو خود بھی صوفیانہ مزاج رکھتا ہے۔ مگر ملا بدخشی کو اس کی کرکتیں پسند نہیں

حضرت کی زیارت کے لئے وہ ایک بار اکبر آباد سے لاہور آتا ہے اور آستانہ خانقاہ پر جبین ارادت گھستا ہے۔ چلتے وقت اپنے لئے روحانی ہدایات کی درخواست کرتا ہے۔ جس پر ملا شاہ بدخشی فرماتے ہیں ؎

اے بندہ پائے دل مشو غافل — رے دو خفتہ چشم و پائے در گل مشو
عزم سفر مشرق و رو در مغرب — اے راہ رو بہشت بہ منزل مشو

طوبیٰ

دانۂ بار و در میری نکتہ چینی ہو گئی — لو مری ٹھوکر بھی ماڑھی ہو گئی
لوگ کہتے ہیں کہ کالج ہو گیا بد طوار — بات جو تھی ہی نہیں پہلے اب یقینی ہو گئی
جو تیوں میں دال بٹتی ہے سبھی کے سامنے — یہ مثل تک دنیوی تھی آج دینی ہو گئی

بلند اکاہو گیا جل پڑنے ہی طبلہ پہ تھاپ
اور خیر "موری کھیریا" کی ثنا یقینی ہو گئی

حیرت کدۂ لاہور

پرنسپل ہنری مارٹن کے محیر العقول کارنامے
انجمن حمایت اسلام کا پُراسرار سکوت

دلم بہ پاکیٔ داماں غمچہ می لرزد — کہ بلبلاں نہ مستند و باغباں خاموش

غلامی کی روح کو مژدہ ہو کہ لاہور میں پھر پور ہو گیا اور دنیا جہان کے بربط اور چنگ اور رباب اور دغوں ابراہیم عادل شاہ کے پردۂ سوز و سرور سے منتقل ہو کر اسلامی کالج لاہور میں جمع ہو گئے ۔۔۔

مطرب خوشنوا کجا تازہ بتازہ نو بہ نو

بنتے ہیں کہ غنا منبتِ نفاق ہے۔ کم از کم اسلامی روایات تو ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ رات دن کا تجربہ اگر موسیقی کے نفاق اندوز ہونے پر شاہد نہ ہو تو کم از کم اس بات کا تو گواہ ہے کہ جہاں یا جہاں پر بیلے نغموں کی زیر و بم سے دل و دماغ میں ارتعاش پیدا ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ مطرب کی صدائے سامعہ نواز صاعقہ ریز مشعل ہوئی تو بہیمیت کدۂ دل کے چھوٹے بڑے تمام جذبات رقص والہانہ ہو گئے ۔ باور نہ آئے تو ایک دن گیٹی تھیٹر میں جا دیکھئے ۔ رات بھر جناب معلم الملکوت ہمرکاب ندر ہیں تو سہی ۔

لیکن کہاں کا اسلام اور کیسی انسانیت ۔ سنّت پالائے طاق ۔ کتاب حوالۂ جزدان ۔ تجربہ و مشاہدہ پا در ہوا ۔ یہاں تو اصرار ہے کہ مسلمانوں کے اس دار العلم میں نصاب تعلیم یہاں فزکس اور کیمسٹری تاریخ اور ریاضی ، ادب اور انشا سے مزین ہو ۔ وہاں اس کا طرۂ منشور قوالی و طبلہ نوازی بھی ہو کہ عمر خیام اور محقق دوانی کے ساتھ ہا مبدہ تازہ ریز کا ہونا بھی شلث ارتقائے مارٹینی کا نادیۂ الراس ہے ۔

جناب مارٹن صاحب کے ایک حاشیہ نشین پیرزادہ عبدالرشید صاحب ایم اے انقلاباتِ زمانہ سے تین ہفتہ اور محض تین ہفتہ کے لئے ریوانہ ہوسٹل کے ہنگامی منتظم مقرر کر دئے جاتے ہیں ۔ ریاستے تادیب و تخلق میں جو عظیم الشان کارنامے جناب پیرزادہ صاحب کی قوتِ تدبیر سے اس عرصہ مدت میں سرمایہ اندوز بعون و ظہور ہوئے ہوں گے ان کی تفصیل سے تو ہم آشنا نہیں لیکن اتنا عزور جانتے ہیں کہ کالج کے مدارج ابتدائی کے چند طلبہ نے ان کارناموں کی یادگار میں آپ کو ایک سپاسنامہ پیش کرنا چاہا اور از بس کہ سپاسنامہ کی منبت اس سطحے سناسے والے کفش زرّیں کی متزنانہ مشاطعت کے بغیر کامل و مکمل نہ ہو سکتی تھی جس نے حکومت عالیہ کے چمن نیاز پر تیوریاں چڑھائے دی تھیں اور یہ ہی تیوریاں تھیں جنہیں پیرزادہ صاحب کے زمانۂ اڈمنسٹری میں رسالہ "طریقت" کے ایک بایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مضمون نے پیدا کیا تھا ۔ اس لئے عزور ہوا کہ ایک مجلس عیش و طرب بھی برپا کی جائے جس میں قوالوں سے خلافت ، اخلاق گائے گوائے جائیں ۔ طبلہ بجوایا جائے اور وہ دھما چوکڑی مچوائی جائے کہ اللہ دے اور بندہ لے ۔

ہم کو معلوم ہوا ہے کہ کالج کے کسی عہدہ دار کو کالج کی طرف سے انجمن حمایت اسلام کے شعبۂ تعلیم کی مجلس منتظمہ کے دستور اجرا و استصواب کے بغیر کسی قسم کا کوئی ایڈوانس نہیں دیا جا سکتا اور اس بارہ میں مجلس صوفیہ کا باب باقاعدہ رزولیوشن کتاب الاحکام میں محفوظ ہے ۔ یہ تو خیال نہیں ہو سکتا کہ مسٹر مارٹن اپنے مددگار خاص جناب پیرزادہ صاحب بہادر کے مست و مسرور زمانۂ منتظمی ریوانہ ہوسٹل کی عدیم النظیر و انقید المثیل عرق ریزیوں پر اس درجہ لوٹ ہو گئے تھے کہ کالج کے آئین و ضوابط کے انقیاد کی حس بھی اس شیفتگی کے محرکوں میں

نہ کر سکی۔ کالج کمیٹی کے احکام منسوخ ہوتے ہوں تو ہوا کریں۔ کمیٹی کا ضابطہ ٹوٹا ہے تو ٹوٹا کرے لیکن پیرزادہ عبدالرشید کو تین ہفتہ کی عرضی وسیط خدمات جلیلہ کا صلہ ایک قیامت تھی جو آئے بغیر ٹل ہی نہ سکتی تھی۔

سپاسنامے کی ترتیب و گذارش اور بزم عیش کی تمہید و آرائش روبظاہر جداگانہ لیکن یہ باطن جزائی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جن کی تفصیل کسی قدر شرح و بسط کی متقاضی ہے۔

ملح لندن

۱۹۱۰ء

ایک پادری صاحب لڑکپن کے ایک مدرسہ میں انجیل کا اعلان لینے کے لئے تشریف لائے۔ ایک لڑکی نے جس کا سن بارہ تیرہ سال ہوگا سب سے اچھا جواب دیا۔ پادری صاحب نے خوش ہو کر جیب سے ایک چمکتا ہوا پنس نکالا اور انعام کے طور پر لڑکی کے حوالے کیا۔ اتنے میں ایک خوبصورت والا "انشاء برن کی قتل" پکتا سا ہوا سیب پر سے گذرا۔ لڑکی دوڑی ہوئی گئی اور اپنے پنس کی نعل لے کر چلی بجاتے ہوئے آئی۔ پادری صاحب اپنی "احمقانہ لمائی" کا یہ دنیوی حشر دیکھ کر بے حد ملال ہوئے۔ اور غم زدہ لہجے میں لڑکی سے فرمانے لگے کہ بیٹا! تبلیغ دین مسیحی کے متعلق میں نے تم سے جو سوال پوچھے تھے۔ تم نے ان سب کا برجستہ و برمحل جواب دیا۔ اسی لئے میں نے تمہیں ایک پنس انعام دیا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ تم۔ تم تبلیغ فنڈ میں داخل کر کے اپنی معصومیت ہندی کا ثبوت دو گی لیکن افسوس تم نے مجھے پگھلتیوں میں اڑا دیا۔ لڑکی کس بھولے پن سے جواب دیتی ہے کہ فضول! نیت تو میری بھی یہی تھی کہ حضور کا مفت کیا ہوا انعام تبلیغ فنڈ ہی میں داخل کروں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس رقم کو نعلی جوتیوں اور خوچہ والا یہ تم فنڈ میں داخل کر دے۔ بات ایک ہی ہے۔

ایک لاٹ پادری صاحب ایک مرتبہ گرجا کے منبر پر کھڑے ہوئے تقریر فرما رہے تھے۔ ارادت کیشوں کا ایک جم غفیر ذوق شوق سے وعظ سن رہا تھا۔ وعظ کا موضوع یہ تھا کہ خدا و ند خدا ہمارے آسمانی باپ ہے یہ انسان کو کوئی ذلولی انعام اپنے خزانہ غیب سے عطا فرمانا چاہتے جس پر اسے گھٹنے ٹیک کر شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس پر کلیسیا نیوں میں سے ایک نوجوان سر مجلس بے ساختہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ جناب واعظ کو یہ فعلہ نے اپنی طرف متوجہ کیا اور آپ نے فرمایا کہ تم پر خدا ورآج کرم کی برکت آسمان سے ایسی نازل ہوئی ہے جو تمہیں یوں وجہ میں سے آئی۔ اب تو تمہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے۔

نوجوان نے نہایت سادگی اور متانت سے جواب دیا جی ہاں مجھ پر تاج گجرو مہ خداوند خدا کی۔ ایک چھپاتی ہوئی برکت نازل ہوئی علی الجمع سب میں حاضری لگانے کے لئے بال خانے سے نیچے اترے تو نیچے پہنچتے ہی توشہ خانہ میں تشریف لے گئے۔ اس صاحب بھی تشریف لے گئے۔ یہ ماجرا دیکھ کر ایک چھیڑا پڑا ہوا تھا۔ اس سے بالکل بوریا تو اڑا اڑا کر لیں اور سر رہنے پاؤں اوپر تلا بازیاں کھاتی ہوئی سیڑھی سے چلتے دم پر آ رہیں۔ خدا، خدا کا شکر ہے کہ ان کی ایک ٹانگ شریف بھی ٹوٹ گئی۔ اور اس وقت وہ شفاخانے میں پڑی ہوئی مزے سے علاج کرا رہی ہیں۔

افکار و حوادث

عبدالمجید سالک

یورپ سے آئے دن اس قسم کی خبر یں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں ہر سے زیادہ طویل القامت انسانوں کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے یا پست قامت لوگوں نے اپنی جماعت کو منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان انجمنوں میں عام لوگوں سے لے کر بڑے بڑے معززین تک شامل ہیں۔ ہندوستان میں ابھی انجمن سازی اس قدر تک نہیں پہنچی لیکن کچھ مدت گزری ہے یہ لطیفہ ہوا تھا کہ ایک کانے صاحب نے ایک جماعت فراہم کی تھی۔ وہ قصہ سنیے۔

ان ایک چشم گل صاحب کو جو دل لگی سوجھی تو آپ نے چپ چاپ گھر میں بیٹھ کر ان کانوں کے نام کانوں کی ایک فہرست تیار کی۔ پھر جانچ کر ان میں بڑے بڑے معززین اور سرکاری افسر بھی شامل تھے۔ آپ نے ان سب لوگوں کے نام دعوت نامے جاری کر دیے اور اپنے مکان میں کھانے پر مدعو کر لیا۔ یہاں تک کہ فہرست ملانے اور کھانا کھلانے پر جو آدمی مقرر کیے وہ بھی سب کانے تھے۔

وقت مقررہ پر کانوں کی بھار شروع ہوئی۔ جب تک صرف ایک دو کانے کسی کو یہاں خیال نہ آیا لیکن جب چالیس پچاس کانے جمع ہو گئے تو ایک دوسرے کو کانا دیکھ کر بلا ٹکٹ آنکھ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ بعض کو اس مضحکہ خیز حالت پر غصہ بھی آیا لیکن وہ یہ سوچ کر پی گئے کہ چلو اس مجمع میں کوئی ایسا شخص تو نہیں جو انھیں غصہ دلا کر چشمی کی دوسری آنکھ پھوڑ دے۔ پھر خفت دیکھیے۔

جب تمام مہمان جمع ہو چکے تو کانا چشمی کانے میزبان کے حکم سے کانے مہمانوں کے ہاتھ دھلانے لگا۔ کانا تو تھا ہی کانا پانی کی دھار ایک طرف سے ڈالتا تھا۔ مہمان کے ہاتھ کے بجائے اس کے کپڑوں پر جا پڑتی۔ اس نے تاؤ کھا کر ہنستی سے کہا "حضرت میں آدھ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں دیا کیجیے"۔ ہنستی نے برجستہ جواب دیا "کیا کروں صاحب دونوں پھوٹ گئی ہیں۔ لیکن یہ بھی کچھ کم نہیں کہ ایک آپ کی سلامت ہے"۔

وہ معزز چشم صاحب اس گستاخی کی تاب نہ لا سکے اور اٹھ کر ہنستی سے ایک بڑھوی۔ اس وقت بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہ تھا سب کانے پوری مساوات سے ساتھ اس دعوت میں شریک ہوئے تھے۔ ہنستی نے بھی ترکی بہ ترکی ہاتھ سے جواب دیا۔ پھر تو کیا شروع ہوئی کانوں کانوں سنیے بچاؤ کر دیا اور کھانا کھانے لگے۔ ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ شاعر نے کانے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کا جو محاورہ باندھا ہے وہ یوں بھی دزدیدہ ہی ہوتی ہے۔ شاعر نے شاید کسی کانے محبوب ہی کی شان میں یہ مصرع کہا تھا کہ ع

آہا بود کہ گوشۂ چشمے بما کند

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اسی شہر کے لوگوں نے اس عجیب و غریب دعوت کے متعلق سن گن پائی۔ انھوں نے کیا کیا کہ تین چار بڑے بڑے ہنڈے روشن کر کے باہر گلی میں رکھ دیے اور بہت سے لوگ کانوں کی دعوت کا نظارہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ جب یہ لوگ

کھانا کھا کر اور اپنے جسم پر میان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو ایک ہجوم انتظار کے لیے موجود تھا۔ بعض بدتمیزوں نے ان سے بھی کہا لیکن واحد العینوں کی یہ جماعت ایک طرف آنکھ پھاڑ کر گھنٹوں ان کا انتظار کرتی رہی۔

لیمین کانگو سے ایک خبر موصول ہوئی ہے کہ وہاں کے مردم خور وحشی آئے دن پٹی کلشنہ کو پکا کر کھا گئے۔ مداحا نے اور مردم خوروں کی حس ذائقہ کو لیا ہو گا۔ جب کہا! پٹی کلشنہ اس قدر لذیذ اور مرغوب الذائقہ ہوتا ہے تو پکا ہوا بھی یقیناً ہو گا۔ مزا نہ ہو گا پر شاید مرغیوں کی طرح ان مردم خوروں کو بھی پٹی کلشنہ پکانے کا بھی خاص نسخہ معلوم ہو۔

کانگو کی بیماریاں اس دن آپس میں باتیں کر رہی ہوں گی۔ کیوں بی پیچش صاحبہ آج تمہارے ہاں کیا پکا ہے؟

"بہن آج تو ایک ڈپٹی کلشنر پکایا تھا۔ کوئی لفٹ نہ کرتا تھا سارے میں ڈھنڈورا پیٹ دیا۔"

"ہاں بہن ہمارے ہاں بھی کچھ نہ کچھ پکا ہی ہے تو کبھوں نے کیا پکایا ہے؟ تو چلیے بتلائے دیتی ہوں ایک پادری پکایا تھا۔ آج سے شام تک شدید آنتوں پر رہی کہ بخشو بٹیاں نہیں کہ ہم چھوڑ دیں۔"

"واہ کتنی ہوں گی؟ واہ بہن۔ وہ پادری کوئی پٹھا لچپنس ہو گا نہ نکلے۔ مرے سے کہے آیا تو نکل آیا۔ ایک جوان جہان پٹی کلشنر پکڑ کر لائے تھے۔ بس زرا سا پیچ دے کر پکانے ہی لگی کہ ہاتھ آ گیا اور وہ اونچا کھا کر ایسے خوش ہوئے کہ انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ بہن جو جیرہ کہیں روز روز ملتی ہیں۔ کب جیسے تیسے ڈپٹی کلشنر آئے اور کب پکے۔"

"بہن ڈپٹی کلشنر کے بھی فوجداری سے ہی دن ہوں گے۔ وحشی مردم خوروں پر تو پڑتے پڑتے اور ان کا صفایا کر دو۔ افسوس ہے ان لوگوں کو آدم خوری سے ذوق تھا اور نہ خالباً آدم خوروں کا گوشت ہی اچھا ہوتا ہے ورنہ بڑے مزے کی ضیافت رہتی اور یہ گوشت ڈبوں میں بند ہو کر ولایت تک بھیجا جاتا۔"

واقعہ نہایت ہولناک ہے لیکن پٹی کلشنہ کو پکا کر کھانا بہت دلچسپ ہے۔ آئندہ ڈپٹی کلشنروں کو کسی قدر احتیاط سے رہنا چاہیے اگر کہیں لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا گوشت مزے دار ہوتا ہے تو چند روز میں نسل ہی منقطع ہو جائے گی۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کوئی حکیم صاحب تھے جنھوں نے پردہ نشین عورتوں کی نبض دیکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ رسی کے ایک سرے سے پردہ نشین خاتون کی کلائی باندھ دیا جاتا اور دوسرا سرا پردے کے باہر حکیم صاحب تک پہنچا دیا جاتا۔ حکیم صاحب آبائی ہیں اس فن کے واجبی سے واقف تھے کہ رسی پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور نسخہ لکھ کر دے دیتے تھے۔

ایک دن یاروں کو دل لگی سوجھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے حکیم صاحب کو بلا کر لے گئے۔ گھر کے اندر رسی کے ایک سرے سے ایک بلی باندھ دی اور دوسرا سرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھما کر عرض کی کہ حضور مریضہ کی نبض ملاحظہ کیجیے۔

حکیم صاحب نے رسی پر انگلیاں رکھیں اور فرمانے لگے کہ مریضہ کچا گوشت کھا گئی ہے اور وہ ابھی ہضم نہیں ہوا۔ یاروں بے اختیار ہنس دیے اور حکیم صاحب کے کمال شناسی کے قائل ہو گئے۔

اب رہی کا ایک واقعہ سنیے۔ ایک سرکاری دفتر کا چپراسی اپنے کسی مرض کے علاج کے لیے دفتر سے چھٹی لے کر رہی کے ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب نے اس کا قارورہ معائنے کے لیے طلب کیا۔ ایک بھنگن نے پیالے میں اس کا قارورہ لیا اور جب وہ پیالہ اٹھائے ڈاکٹر صاحب کی طرف جا رہی تھی، راستے میں ٹھوکر لگنے سے پیالا گر کر ٹوٹ گیا۔ بھنگن باز پرس کے خوف سے کانپ اٹھی۔ اس نے غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے کہا گیا ایک اور پیالا کہیں سے لے کر اس میں خود پیشاب کیا اور یہ قارورہ ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھ آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر اس قارورے کا معائنہ کیا اور نتیجے کے کاغذ پر لکھ دیا کہ مریضہ حاملہ ہے اس کو ہسپتال سے چھٹی دے دی جائے۔ وہ پرچہ وارڈ میں پہنچا۔ انچارج نے "چھٹی دے دی جائے" کا حکم دیکھ کر چھٹ چپراسی کو ڈسچارج سرٹیفکیٹ دے دیا۔

جب چپراسی یہ سند عمل لے کر اپنے دفتر میں پہنچا تو بعض کلرکوں نے اس سے پوچھا کہ تم اتنی جلدی کیونکر آ گئے تو چپراسی نے وہ پروانہ دکھایا۔ اس پر دفتر میں وہ قہقہے لگنے لگے کہ خدا کی پناہ۔ چپراسی بیچارہ پریشان کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آخر بعض کلرکوں نے پوری تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ قارورہ بھنگن کا تھا اور بھنگن حاملہ تھی۔

ایک اعرابی سے کسی نے پوچھا: "تم کھاتے کیا ہو؟"

جواب دیا: "اونٹ!"

پوچھا: "پیتے کیا ہو؟"

کہا: "اونٹ!"

"اوڑھتے کیا ہو؟"

"اونٹ!"

"بچھاتے کیا ہو؟"

"اونٹ!"

"مکان کاہے کا بناتے ہو؟"

"اونٹ کا!"

"جلاتے کیا ہو؟"

"اونٹ!"

"سواری کیا ہے؟"

اونٹ!"

سوال کرنے والا پریشان ہو کر کہنے لگا: "یہ اونٹ اونٹ کی رٹ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

اعرابی نے جواب دیا: "اونٹ کا گوشت کھاتا ہوں، اونٹنی کا دودھ پیتا ہوں، اونٹ کے بالوں کے کپڑے پہنتا ہوں، انہی کو اوڑھتا ہوں اور بچھاتا ہوں۔ اونٹ کی کھال کا خیمہ بنا کر اس میں رہتا ہوں، اونٹ کی مینگنیاں جلاتا ہوں، اونٹ پر چڑھتا ہوں، اونٹ ہی بیچتا ہوں اور اونٹ ہی خریدتا ہوں۔ اونٹ ہی میری دنیا اور میری زندگی ہے۔"

ایک فوجی نامہ نگار کا بیان ہے کہ میں نے آسام میں ہر طرف بانس ہی بانس کا جنگل دیکھا۔ سب سے پہلے میری نظر بانس کے ایک دروازے پر پڑی۔ دروازے میں سے اندر داخل ہوا تو بانس کا بنا ہوا ایک احاطہ تھا جس میں بانس ہی کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں جھونپڑیوں میں گیہوں بانس کی میزیں اور بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں جو بید بانس کی نرم چھال کے بنے ہوئے گدے سے بچھے تھے۔

صرف یہی نہیں بلکہ باورچی خانہ میں مرغی کے پروں سے بھی بانس ہی کی قوکریوں میں بند تھے اور مرغی کے انڈے بھی بانس کا ایک کلاس خانہ پڑا تھا جس میں گھی ڈال رکھا تھا اور اس کا ڈھکنا بھی بانس ہی کے ٹکڑے کا بنا ہوا تھا۔ آگے چل کر میں نے پانی کے نل دیکھے۔ وہ بھی بانسوں کے ٹکڑے جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ پاخانوں کی نالیاں بانس کے چھوٹے چھوٹے سنہری پل۔ حوض جس طرف دیکھا بانس ہی بانس نظر آئے۔

یعنی بانس سونے کے بیٹھنے اٹھنے، کھانے، حلانے، باندھنے اور پاکوپار نے میں خوب کام دیتا ہے۔

اس فوجی نامہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ بانس کھانے کے کام بھی آتا ہے۔ مثلاً بانس کا سالن۔ بانس کا اچار۔ جو بانس صرف چند گھنٹے کا اگا ہوا اور نرم ہو اس کو تراش کر پانی میں راٹ لیتے ہیں۔ پھر اس کے قتلے کاٹ کر اور نمک مرچ مسالہ ڈال کر سالن پکا لیتے ہیں اور بانس کا اچار تو ہر افغان نے کبھی نہ کبھی کھایا ہے اچھا خاصا لذیذ ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے آسٹریلیا میں انعاموں میں لڑکوں سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ اونٹ اور بانس میں کیا فرق ہے؟

بعض شہروں میں لیڈروں سے جلوس اونٹ پر نکالے جاتے ہیں اور بعض اخبار نویس بھی لیڈروں کو خوب بانس پر چڑھاتے ہیں۔ لہٰذا اونٹ اور بانس کا تعلق ہماری ملکی سیاسیات سے ظاہر ہے۔ اگر یہ شخص پہلے ہی اونٹ پر سوار ہوا ہوتا سے بانس پر چڑھانا بیکار ہے لیکن ہر حالی لیڈروں سے بشرط عجز و انکسار کرنے ہی پڑتے ہیں۔

مثلاً ہمارے ایک اخبار نویس جاتی آج سے کئی سال پیشتر ہز شاہی دربار گئے تو وہاں کے لوگوں نے گاڑی یا موٹر کی بجائے انھیں اونٹ پر سوار کر کے ان کا جلوس نکالا۔ اس جلوس کے آگے آگے ایک نوجوان رسالہ نہایت لمبا سا بانس اٹھائے جا رہا تھا' جس کے اوپر خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا۔

لہٰذا ہماری سیاسیات میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں ..... اونٹ اور بانس!

چند سال ہوئے پہلے پہل یورپ سے اور پھر ہمارے ملک کے مختلف حصوں سے 'بدیلِ جنس' کی خبریں آنے لگیں۔ اب ترکی سے خبر آئی ہے، ابھی حال ہی میں ایک لڑکی کو پڑھانے پڑھاتے مرد بنا دیا گیا ہے۔

یہ ماجرا دیکھ کے آئے تھے نر ہو گئی

اور اس کے بعد اس نے مردانہ لباس پہن کر ڈاکٹری سرٹیفکیٹ لے لیا کہ وہ مرد ہے۔

اب ڈیرہ اسماعیل خان سے خبر آئی ہے کہ وہاں ایک سکھ صاحب کی شادی ہوئی۔ بڑے چاؤ چوچلوں سے ایک چاند سی بہو بیاہ لائے۔ جب سسرال پہنچی تو پہلی ہی رات سردار لاڈا سنگھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ ان کی بیوی بیوی نہیں بلکہ بیوا ہے۔

سکھ اپنی بات چیت میں ہر بات کو ذو معنی بنا لیا کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں والڈ ال وہ تیل ہیں ہم نے اکثر سنا کہ سکھ قیدی مٹی کو کھا کا کہتے ہیں لیکن مونث کو مذکر بنانے میں ڈیڑھ سو سردار جی نے کمال کر دیا کہ بیوی بھی لاتے تو مذکر ہی لاتے۔

اب یہ دونوں میاں بیوی حیران ہیں کہ کریں تو کیا کریں اور اگر نہ کریں تو کیا کریں۔ بقول میرزا غالب ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ کر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

وہ بار بار دلی سے پوچھتے ہیں تو ہر اسے وصل کروں آدمی بار بار سے فصل کروں آدمی۔ وہ بیچاری گم سم ہے کچھ جواب نہیں دیتی۔ مگھ گرودوارہ پربندھک کمیٹی کو اس بھگتی نا بھگتن کا معاملہ فوراً اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔

یہ سن کر کلیجہ منہ کو آگیا کہ بنگال میں آموں کی فصل تباہ ہو گئی ہے اور یو۔پی میں بھی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ اللّٰھم اٰتنا فی الدنیا والآخرہ۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی شامت ہے۔ جو قوم کفرانِ نعمت کرتی ہے وہ نعمت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ ایک دوسرے کو نہایت خلوص و دریا دلی سے آموں کے ٹوکرے بطور تحفہ بھیجتے تھے۔ دلوں سے دعائیں نکلتی تھیں اور آموں کی فصل میں برکت پڑ جاتی تھی۔ آج خست کا دور دورہ ہے لہٰذا فطرت بھی خسیس ہو رہی ہے۔

مولانا لطف اللہ خان عزیز نے جو کبھی مدیر مدینہ (بجنور) کی حیثیت سے یو۔پی میں گنگا کنارے آم کھایا کرتے تھے لاہور سے ایک اخبار "زمزم" کے نام سے جاری کیا ہے۔ پالیسی تو وہی دھوتی پرشادوں کی سی ہے بعینہٖ آپ سب معمول کا ٹکسی ماتح ہوئے ہیں۔ لیکن اس سیاسی بادِ مخالف کے باوجود آموں کے بے حد رسیا ہیں اور یہی ذوق ان کے اور ہمارے درمیان مشترک ہے۔ زمزم جاری کرتے ہی آپ نے اس میں آیات کا ایک کالم قائم کر دیا ہے جس میں سب سابق آم اور گڑ اور خربوزے کی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔

اسی کالم سے معلوم ہوا کہ کوئی صاحب آم کے بجائے پنجاب میں خربوزہ کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، وہ خربوزے کی کیا کیا خصوصیات شمار کراتے ہیں:

"ہر گاؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ بیل کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹھنڈا پانی پیتا ہے۔ زمین اس کو چھاتی سے لگا کر رکھتی ہے۔ اس کا رنگ کتنا خوش ما ہوتا ہے۔ اس کے اندر گٹھلی نہیں ہوتی۔ گلا نہیں پڑتا۔ اس کا چھلکا آسانی سے نہیں اڑتا۔"

لیکن تقریباً یہی خصوصیات کھیرے اور ککڑی میں بھی موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بدمذاقی کسی کے باوا کی جاگیر نہیں۔ مولانا حس کو دے۔ جس پھل کے نام کا جزو اوّل "خر" ہو۔ اس کو پھلوں کا بادشاہ قرار دینے والا انسان تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔

خربوزے کو گھر میں تو پہلے ہی کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ہر دلعزیزی کی بنیاد ریت پر ہے جہاں پانی کا ایک چھینٹا پڑا یہ بنیاد بہہ گئی اور خربوزے صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہو گئے اور اگر کہیں کہیں باقی بھی رہے تو چھوٹ کی شکل میں اور چھوٹ ہی وہ چیز ہے جس نے ہندوستان کو غیروں کا غلام بنا رکھا ہے۔

آم کی مقبولیت کی بنیاد سیمنٹ پر ہے۔ جتنا پانی پڑتا ہے اتنی ہی مضبوط اور پائدار ہوتی جاتی ہے۔

کیا آپ نے کبھی سنا خربوزے کا نام لیتے ہی گدھے کا خیال آتا ہے؟ صرف اس لیے نہیں کہ اس کا جزو اوّل خر ہے بلکہ خربوزے کے حمل و نقل کے لیے بھی زیادہ تر گدھے کام میں لائے جاتے ہیں اور آم؟ آم کی بہنگیاں (یعنی یہ تو بہشت انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر آتا ہے۔

حرف و حکایت

سندباد جہازی

دیر بھارت کی روایت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کی۔ اس میں ایک رباعی کے دو مصرعے بھی تھے۔

مے خواہی تند و تیز و انگہ بسیار
ایں باید فروش ساقی کوثر نیست

ہر چند کہ مولانا نے ان مصرعوں کا ترجمہ انگریزی میں کر دیا تھا لیکن مدراسی اور بنگالی ممبر سمجھے تو یہ سمجھے کہ کسی تند و تیز قسم کی وہسکی کا ذکر ہے جو جنت ہی میں ملتی ہے اور باذاماملتی ہے۔

مولانا آزاد کا معاملہ تو یہ ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تقریر ہو یا تقریر ایک آدھ شعر ضرور لائے ہیں اور جب تک شعر نہ آئے انھیں خود بھی لطف نہیں آتا۔ چنانچہ آج بھی جبکہ پوری پارلیمنٹ میں ان کی زبان کی نکتہ طرازیوں کی داد دینے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنی پرانی وضع پر قائم ہیں ؎

حلقۂ پیر مغاں از ازل در گوش است
ما بمانیم کہ بودیم بہاں خواہد بود

مولانا کی وضع داری مسلم لیکن وہ یہ انداز کب تک نبھائے جائیں گے۔ کہاں ہندوستان کی پارلیمنٹ اور کہاں ساقی کوثر کا ذکر۔ رجل گراں اور پیر مغاں کی حکایت۔ شحنہ و محتسب کی داستان۔ ان لوگوں کی تربیت مختلف قسم کے ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کا انداز نگاہ اور ہے۔ اسلوب فکر اور۔ انگریزی میں ہزار سمجھانے کی کوشش کیجئے ان کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ یہ اسی شراب کا ذکر ہے جو یورپ سے آتی ہے اور پلو مریا بھولا رام کے ہاں ملتی ہے۔

از فرنگ آمدہ شہ فراواں شد است

مشہور لطیفہ ہے کہ ایک صاحب بہادر اُردو سیکھ رہے تھے۔ ایک موقعہ پر اُن کے سامنے میر کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُن کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

صاحب بہادر نے فرمایا ہم سمجھ گیا۔ ہم لوگ میر صاحب کو تیل خانہ بھیجنا مانگتا۔ جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے ہندوستان کی پارلیمنٹ کے اکثر ممبران صاحب بہادر سے بھی کئے گزرے نکلیں گے۔

پاکستان اگرچہ اس معاملے میں غنیمت ہے لیکن سچ پوچھئے تو اگر پاکستان کی پارلیمنٹ میں بھی فارسی کے اشعار پڑھے جائیں تو بہت کم لوگ انھیں سمجھ سکیں گے۔ اور تو اور اس معاملے میں مغربی پنجاب کی اسمبلی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ فارسی پڑھتے ہیں وہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کے ممبر نہیں بنتے بلکہ تیل بیچتے ہیں یا لڑکوں کو پڑھاتے ہیں یا محکمہ کی کرتے ہیں اور ایک اچکن ایک کوٹ اور دو پتلونوں میں ساری عمر گزار دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جو لوگ قانون ساز مجالس کے ممبر بنتے ہیں سکنڈری اور وزارت کے عہدوں تک جا پہنچتے ہیں۔ وہ فارسی نہیں پڑھتے۔ شعر نہیں سمجھتے اور ان میں تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہیں پڑھتے اور کچھ نہیں سمجھتے۔ پڑھیں اور سمجھیں تو تقریریں کیونکر کر سکیں۔ سوالات کا جواب کیسے دے سکیں۔ دنیا میں بعض کاروبار ایسے بھی ہیں جنھیں خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے کے لئے ان سے بے خبر ہونا ضروری ہے۔

ایک واقعہ یاد آگیا کہ کسی اپنے کھانے کے نوجوان نے ملازمت کی درخواست دی جس میں لکھا تھا کہ میں فلاں جاگیردار کا بیٹا ہوں۔ فلاں نواب صاحب میرے ماموں ہیں۔ اور فلاں جج صاحب میرے چچا ہوتے ہیں۔ میرے پردادا ضلع کے حاکم تھے اور ان کے دادا کو شاہی عہد میں پنج ہزاری منصب حاصل تھا۔ جس افسر کے پاس یہ درخواست پیش کی گئی تھی اس نے یہ کہہ کے درخواست واپس کر دی کہ ہمیں نسل کشی کے لئے نہیں بلکہ کلرکی کے لئے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ سنا ہے کہ یہ صاحبزادے کچھ عرصے کے بعد اپنے صوبے کی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔

۱۹ مارچ

جنگ نامۂ وزارت

بدہ ساقی آں مے کہ تادم زنیم — قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
مجھے بادہ مشکبو کر الاٹ — مے رعنواں کا سبو کر الاٹ
عسس سے ہے زنّار مکتب سے تر — ہیں دونوں پڑے مست اور بے خبر
ہے مفتی و شیخ اور میر و وزیر — کمند ہوا و ہوس کے اسیر
ہے واعظ عمارت کے خوابوں میں گم — تو ل کے نوٹوں سرابوں میں گم

فقیہوں کو ہے کارخانوں کی فکر — دوکانوں کی فکر اور مکانوں میں فکر
پلا ساقیا آب یاقوت رنگ — کہ اب جو دولت ہیں معدوم جنگ
تجاہل سے مستی اٹھا کر پلا — شکایوں کی مستی ملا کر پلا
وہ اہل مسجد اٹھے رہ گئے میر — بھی دیکھتے ہیں لڑائی کی سیر
سبک باش و رطل گران کو اٹھا — کہ فاش فتواں ہے نام پدہ
اس نے ہے چھیڑا سیاہی ٹاگ — کہ جتی ہیں تو ہیں پرستی ہے آگ
ادھر دلستانہ تبسم سیاہ — سپہد اگر ان زریں کلاہ
لئے ساتھ میلوں ہوا نوں کی فوج — وہ مدوں کے لشکر فسانوں کی فوج
غرور شہی سے نظر تا بہ لب — کہ دامن آگ ہی چاک چاک
وہ فیروز خاں نون مرحوم جبری — نگاہوں میں ہے جس کی افسونگری
جسے یاد ہے سب کہانی کے ڈھنگ — کہانی کے ڈھنگ کہنے کے ڈھنگ
کرامت علی فرد شکر ستلون — جسے مانتے ہیں سب اہل فن
سیال اور جھنگ بار اور کھرل — چلے زور کہہ کہہ کے طبل دہل
لئے پلٹنیں اور رسالے چلے — گئی سانولی سانولے چلے
چلے اور پرچم اٹھائے ہوئے — نگاہوں سے آنکھیں لڑاتے چلے
کوئی ان میں تھا سند سور کی یادگار — کوئی رستم اور کوئی اسفندیار
کوئی ان میں پورنما ہے کہاں کا — جتیا سکا ہے کوئی لاؤ کس کا
ادھر نواب امدوٹ دولیر — وزارت کے پیشے ماغ دلیر
شجاعت میں کیا شہامت میں فرد — بڑھا جانب عرصہ گاہ نبرد
جلو ساتھ اس کے وہ فرزند من — لئے نام اور محمد حسن
مبارک علی اور دوستی بڑھے — کئی مست ہاتھیوں ہاتھیوں کی فوج
چلیں جس کی جانب یہ بپھرے ہوئے — ادھر بھی ہوس اور واہ بھی ہوس
ہے کاندھے پہ ہر جنگ کرنا اداں — دعا گو ہیں ہم لیکن زباں
بہ حل چلے یارب کوئی غلط بحث — میری بھی ہو گفت گستاخ ہی
وزارت ملے یا صدارت ملے — کوئی مال بہ تجارت ملے
الٰہی مجھے بھی سکندر بنا — کہ دنیا بہ جنگ بر حال ما

ہوا گرم ہنگامۂ کار زار — نظر آنی دشوار راہِ فرار
وہ گالی کے چھڑے وہ طعنوں کے تیر — کئے آن کی آن میں دل کو چیر
مسلسل اڑھائے مسلسل شکنج — دہن باد کردہ سر تا رواج گنج
بڑا لطف اس ہاتھا پائی میں تھا — مزا کرسیوں کی لڑائی میں تھا
لڑی بڑھ کے جا کر جا گیر سے — لیا کام نیزے کا تدبیر سے
اُدھر خوب کرسی سے کرسی لڑی — مری سمت سے کس میری لڑی
بڑھے دونوں جانب سے آتش بیان — بیانوں کی توپوں نے باندھا سماں
بہت خوب اہبار والے لڑے — مکالمے سے بڑھ کر مکالمے لڑے
نہ پانی کو پوچھے نہ چولھے میں آگ — مگر خوب کھیلے سوٹی میں پھاگ

بلا ساقیا بادۂ اہل قسام — بلند صادے مے ارغوانی کلجام
مے احمریں نے کھلائے چمن — بیاد شہید ان خونین کفن
ہوا ختم جب کرداری کا دور — لڑانے کا دور اور لغاری ڈور
اٹھا اور ان سے تیغ وصال چھین لے — یہ ووٹوں کے گرگ گراں چھین لے

میرا دور ہے اور تیرا دور ہے
زمیں اور ہے آسماں اور ہے

میں ۱۹۲۹ء میں پہلی بار علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُن دنوں وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کوٹھی کے صحن میں ململ باندھ کر تپائے چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے سامنے کرسیاں بچھی تھیں۔ جو آتا کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتا۔ اہل محفل میں ہر قسم کے ہر طرح کے تھے۔ شاعر، ہمدرد نویس، ادیب، فلاسفر، سیاسیات کے طالب علم۔ غرض یہ کہ مختلف سیاسیات شروع ہوتی۔ بیچ میں اُپ تھم ہوں کے قہقہے اور درمیان میں گالی بھی ذکر آ جاتی۔ یہ محفل بالعموم ۱۰ بجے رات ختم ہوتی۔ اور دو سے دو ستوں کی طرح ان میں بھی علامہ اقبال کا معمول سب سے وہ تھا یعنی انھوں نے یکے بعد دیگرے ایسے فقرے چست کئے کہ محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

علامہ اقبال کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ اور کبھی کبھی طبیعت لڑاتی تو پھبتیاں پر پھبتیاں اور لطیفوں پر لطیفے کہتے چلے جاتے لیکن ان پھبتیوں سے محض خوش وقتی مقصود تھی۔ نہ اُن کے دل میں کسی کے خلاف عناد یا دشمنی کا جذبہ۔ عامۃ وہ دوسروں کا دل کھانا چاہتے تھے وجہ یہ کہ جن لوگوں پر پھبتیاں کہی جاتی تھیں وہ خود بھی داد دیتے تھے ایک صاحب پر جو علامہ کے خاص نیازمندوں میں تھے سب سے زیادہ پھبتیاں کہی جاتی تھیں یعنی جب سے زیادہ پھبتیاں انہی پر کہی جاتی تھیں۔ ایک دفعہ ان کے بعض احباب نے ان سے کہا تم اپنے آپ کو علامہ اقبال کے خاص دوستوں

ہیں سے سمجھتے ہو لیکن ان کے ہاں جو تمہاری حیثیت ہے وہ بھی معلوم ہو گئی ہے۔ یہ لطیفہ سننے کے بعد وہ گھر میں بیٹھ رہے۔ علامہ اقبال کو معلوم ہوا تو انھیں منانے کے لئے ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ انھیں جب خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحب مجھے منانے کے لئے میرے ہاں آنا چاہتے ہیں تو وہ بیتاب ہو کے خود علامہ کے ہاں پہنچے۔ علامہ اقبال نے پہلے تو ان سے معافی مانگی اور کہا کہ افسوس میری زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس پر آپ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ پھر ایک دم پھبتی اڑی کہ وہ ہے اختیار ہنس پڑے۔

ایک دفعہ گورنمنٹ کالج کے کچھ طلبا حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب پڑھنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ہم تو سمجھتے ہیں کہ پردہ ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ ان دنوں مائیکل نے لندن کالج کے طالب علموں میں بیٹھ کر شیکسپیئر کے ڈرامے پڑھنے شروع کئے تھے۔ بعض طلبا تو لب سڑک تک استقبال کرنے گئے تھے۔ اتفاق سے یہ طلبا بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اقبال پہلے تو ان کی باتیں سنتے رہے پھر کہنے لگے کہ آپ تو چاہتے ہیں کہ عورتوں کو پردے سے نکالا جائے اور میں اس فکر میں ہوں کہ لڑکوں کو بھی پردے میں بٹھا دیا جائے۔

علامہ اقبال نے پرانے خادم علی بخش کا بیان ہے کہ وہ شروع شروع میں علامہ کے ہاں ملازم ہوا تو شہر والوں کے طور طریقوں سے ناواقف تھا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا کہ جا بازار سے تازہ توں کا مرہبہ لے آ۔ سامنے سے مہر بھی کہیں بتا توں کا مرتبہ کہاں سے ملتا۔ دکاندار پتا نہیں کیا کہہ رہے کا نام سنتے تھے اور ہنستے تھے۔ علی بخش سے ان کا یہ معاملہ خرچ رہا ایک دن یہ سوال پیش ہوا کہ علی بخش کی مونچھوں کی رکنت کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ کم سے کم سو ہونی چاہئیں۔ کسی نے کہا نہیں کم سے کم ہزار ہونی چاہئیں۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ علی بخش کی مونچھیں موجود ہیں۔ ان سے پوچھ لو۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک دفعہ "مناوی" بھیجی۔ ڈاکٹر اقبال کو ہندوستان کا خاصا اعظم سمجھتا۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے پاس فاسفورس کا تیل بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھٹنے میں درد تھا۔ انھوں نے فاسفورس کا تیل استعمال کیا۔ درد دم ہو گیا۔ انھوں نے خواجہ صاحب کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ لکھا "یہ نے جو تیل بھیجا تھا میں نے اسے استعمال کیا اور مفید پایا۔ دوسرے دن "مناوی" میں ڈاکٹر صاحب کا یہ خط چھپ گیا۔ اس کے ساتھ جلی حروف میں چار عالی عنوان تھا۔ فاسفورس کے تیل کے متعلق ہندوستان کے شاعر اعظم کی رائے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی لیکن میں نے مناوی لے کر دونوں پرچے انھیں دکھائے تو ہنس کے کہنے لگے خواجہ صاحب بھی سچے ہیں۔ فاسفورس کا تیل استعمال کرنے سے پہلے میں کچھ نہیں تھا۔ اس تیل نے مجھے شاعر اعظم بنا دیا۔

۲۲ اپریل

سچّی باتیں

عبدالماجد دریابادی

خوب گزرے گی جو .....

"پیکنگ ۱۱ راگست۔ چین کی شمالی حکومت نے آج سے غالیچہ کی اور بافتہ کی لکیریں دیکھنے کا پیشہ اختیار کرنے کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اور یہ حکم دے دیا ہے کہ یہ پیشہ اور اس سے متعلق دوکانوں اور کارخانوں کو فوراً بند کر دیا جائے۔ یہ حکم چین ایونگ نیوز میں شائع ہوا ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ شہر میں اس وقت ۸۸ غالیچہ گھر ہیں"

مطلب نہیں۔ جو چین کی مقامی سرکار اس جوتشی دشمنی پر تل گئی۔ ایسی ناقدری پر کارے محمد دوستو! نوجوان سنسکرت دانوں کو خود ہی باہر چلا آنا چاہیئے اور رسید ھے ہندوستان پہنچ کر اس صوبہ کا انتخاب چاہیئے جہاں کا وزیر اعلا اپنی جوتشی نوازی میں نام پائے ہوئے ہیں! خام اس زمین پر رکھیں تو عجب نہیں کہ ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں اور قدر دانی کے مزے اٹھائیں۔ ہندی جوتشیوں اور چینی کاہنوں کا سنگھٹن ایک قابل دید سماں پیدا کرے گا۔ ہند و چین کے اتحاد کا ایک نیا منظر! یہ قول شخصے

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے تین دانے دو!

(۲۹ راگست ۵۸ء)

"اُمّتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں"!

ایکیہ کا مشہور اور بین الاقوامی رسالہ لائف ۴ راگست ۵۸ء پیش نظر ہے۔ صفحہ ۳۰ سے صفحہ ۳۹ تک نو صفحوں کے ایک ایک کالم ۱۔ ایلیہ (سن فرانسسکو) میں ایک بادشاہ ۔۔ ان کی تین وقتی شبانہ داشتاؤں کی تصویروں اور تذکرے کے لئے وقف ہیں بادشاہ نے ایک شب چھوڑ کر جب وہ اپنی شادی شدہ جنسیہ کے ہاں مہمان رہے۔ باقی تین انیس شب کی تین حسیناؤں کے ساتھ کھانا کھا کر اور رقص کر کے گزاریں۔ اور ان مست لڑکیوں نے شاہ کے دلکش موسنے کا بیان۔ بڑ کو دیا ـــــ پہلی مس (عمر ۲۵ سال)، سے شاہ نے استعارہ کی زبان میں فرمایا کہ میں تمہارا پرستار ہوں، دوسری مس (عمر ۲۵ سال)، نے جا شہنشاہ دل میں اپنی تصویر دیکھنے کا کاروبار کرتی ہیں تجربہ کے بعد کہا کہ "یہ بادشاہ بڑے اچھے رقاص ہیں" تیسری مس صاحبہ (عمر ۳۰ سال)، تجربۂ شبانہ کے بعد یوں گویا ہوئیں کہ "ہم کھاتے ناچتے رہے۔ بادشاہ بڑے اچھے قصہ گو ہیں۔ مجھے تو بے تکلفی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ بادشاہ ہیں، اور میں انہیں یور خستی کہہ کر خطاب نہ کرتی"

اس ساری داستان کے بعد آخر میں صرف اتنا سن لیجئے کہ شاہ ذی شان کوئی فرنگی نہیں، آپ ہی کی ملت کے ایک رکن رکین

شاہ محمد رضا فرمانروائے ایران ہیں!

بے بس سرکار

ریلوے وزیر کی زبان سے راجہ سجھا ہیں:

"جون کے مہینے بھر میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس بمبئی سے مدراس صرف ایک دن اپنے صحیح وقت پر پہنچی!"

کیا کوئی مخالف اگر انتظام ملک کے بدنام کرنے کو کوئی بہتان گڑھتا تو وہ اس حقیقت حال سے کچھ زیادہ ہوتا؟ اور پھر نہیں ریلوے وزیر صاحب نے اسی راجہ سجھا ہیں فرمایا:

"میں نے ریلوے کے افسروں کو بلا بھیجا ہے کہ مجھ کو تار دیا کریں جس سے وقت کی پابندی میں صد فیصدی نہیں تو کچھ تو ہونے لگے!"

سبحان اللہ! یہ کوئی شوکت نظامی کوئی مرزا سداسہا نہ سودیشی بل نہیں لگتا ہے ہیں۔ ریلوے کے سب سے بڑے ذمہ دار افسر ملک کی سب سے زیادہ ذمہ دار مجلس کے سامنے بڑی مجبوری سے فرما رہے ہیں کہ وقت کی پوری پابندی تو ہمارے بس کی بات ہی نہیں! وہ تو گئی انگریزوں کے ساتھ، اب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی بہت غنیمت ہے! قناعت کی اس بے بسانہ زبان میں مطالبہ کس سے کیجئے بے بس سرکار سے کیوں کیا ہوگا!

اناڑیوں کا علاج

پلاننگ کمیشن کے ممبر شری مان نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے "ہمارے ہر وزارتی دسم سے پانچ سالہ پلان میں بھی ختم ہونے نظر نہیں آتی۔ یہ وہ رقم ہے جو اس پلان کے تحت ۵۰ لاکھ اشخاص کے لئے روزگار مہیا کیا جانے والا ہے لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہوا اور صرف ۲۵ لاکھ اشخاص کو روزگار مل سکا!"

لیکن علاج جب اناڑیوں سے پالا پڑے میں ہوگا۔ اور یہ اناڑی اپنے زعم و پندار میں اپنے کو طبیب حاذق ہی سمجھے گا تو مرض کے دور ہونے کی عوض ہی اخذ کیا ہے، روزافزوں بے روزگاری یا ہولناک کرتوتی، اس کے اسباب ذہنی سے کہیں زیادہ "مصنوعی" یعنی انسان کے اپنے ہاتھ کے پیدا کئے ہیں، جن نظام تمدن و نظام تعلیم میں بے پناہ ہوس کا نام "ترقی" رکھ دیا گیا ہو، جہاں ہر قسم کے سلاف کو مہارتوں عالی کا طمطراق لیا گیا ہو، جہاں عزت و تکریم صرف زر و مال کی بنا پر ہوتی ہو، اور جہاں کے فلسفۂ اخلاق میں قناعت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو وہاں توقع کس قسم کے علاج کی کی جا سکتی ہے؟

(۲ ستمبر ۵۸ء)

حاصل تہذیب ادبی نگر

کیمبرج ۲۰ اکتوبر۔ کیمبرج یونیورسٹی کے طلبہ کے پر "دہشت" کے الزام شائع کیا ہے۔ یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے جرائم خلاف وضع ذہنی کرنے والوں کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یونیورسٹی بدنام ہو جائے گی۔ پرچہ نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے کہ اب تو لوگ عام طور سے اس بات سے واقف ہو گئے ہیں کہ کیمبرج میں اس عمل کا ارتکاب کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔

وہ کہیں اور کا نہیں۔ خاص اخاص مرکز علم و تحقیق، دانش گاہ اعظم کیمبرج ہے۔ خطابی کے بعد غیر فطری اس کا نمبر آتا ہی تھا۔

حرام آمدنیاں، شراب خواریاں، بے حجابیوں کے بے انداز نظارے، خوفِ آخرت سے یکسر اغماض، اور اس اغماض پر فخر، فحش کاری کے بے شمار کمالات یہ سب آخر اور کس منزل پر پہنچاتے ہیں؟ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے۔ حیرت اس پر نہیں، حیرت اس پر ہے کہ اس سے بہت زیادہ کیوں نہیں پیش آ رہا ہے۔ دنیا کو یاد رہے اور تو سب یاد رہے کہ ہر خدا فروش تہذیب اور ہر لادینی تمدن کا یہی انجام دیرسویر ہو کر رہنا ہی ہے۔

چار بیوڑھیاں

لندن سے خبر لکھنو کے چوتھے جنتے میں موصول ہوئی کہ ہاؤس آف لارڈز (پارلیمنٹ کے دارالامراء) میں پہلی بار چار بیگمات بطور ممبر داخل ہوئی ہیں۔ جدوجہد اس "حق" کے لئے سالہا سال سے جاری تھی۔ دارالامراء کے مرد ممبر برابر اس کی مخالفت پر اڑے ہوئے اور کہتے رہے کہ دارالعوام والے جو چاہیں اپنے ہاں کریں۔ ہم اپنے دارالامراء کی توہین اور ذلت اس میں سمجھتے ہیں کہ کوئی عورت ممبر ہو کر ہمارے ہاں نشست کرے۔ زمانے کی ہوائی مخالفت کوئی کب تک اور کہاں تک کرتا۔ آخر مردوں کو اپنی عقل ٹھوکنی پڑی۔ اور عورت تاریخ میں پہلی مرتبہ برطانیہ کے دارالامراء کی ممبری۔ شام وغیرہ تو یہ مبارک قدم پہلے ہی اٹھا چکے ہیں۔ باقی بیست و پس ماندہ ملک جو اب تک عورت کو ممبری کے حق سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں کی بیگمات کو مبارک ہو کہ اب ان کی غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹنے کا بھی وقت آ پہنچا۔

لیکن اس خوشخبری کے ساتھ یہ کچھ عجیب سی بدشگونی بھی شامل ہے کہ جن چار محترمات کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہے، ان میں سے کوئی بھی اپنے شباب کی منزل میں نہیں۔ بلکہ جو سب سے کم سن ہیں وہ بھی ۵۵ سال کی ہیں۔ اور باقی کی عمریں تو ۶۰، ۶۲ اور ۶۴ کی ہیں!

عید ہوئی ذوق وے شام کو

(۸ نومبر ۲۵۸ء)

جیب وزیر اعظم کا خون کھولا

وزیر اعظم نہرو کی تقریر الہ آباد میں ۴ نومبر کو (بہ حوالہ قومی آواز)

"عورت کو پردہ میں دیکھ کر میرا خون کھول جاتا ہے۔ میں پردہ کو نیچا نظر کرتا ہوں۔ جیب میں اپنی کسی بہن کو نیچے سے جھانکتا ہوں تو میرا خون کھول جاتا ہے۔ پردہ میں رہنے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ عورتیں ملکی تعمیر میں حصہ نہ لیں۔"

آپ نے سن لیا کہ آپ کے وزیر اعظم کا خون کس پر کھولتا ہے ——— فلمی بیسواؤں پر نہیں، تھیٹر والیوں پر نہیں، گا بجا کر، ناچ تھرک کر ہزارہا مردوں کے سامنے بے محابا اپنے تمام عریاں جسم کی نمائش کرنے والیوں پر نہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثر کی تو عزت افزائی ہی طرح طرح پر ہوتی رہتی ہے۔ یہ خون ان افسانہ طراز اخباروں پر نہیں کھولتا جو برابر ان کی ہندوستانی تقریروں کو "ہندی" تقریریں کہہ کر چھاپتے رہتے ہیں۔ ان کا خون کھولتا ہے تو ان بیچاریوں پر جو اپنی عفت و ناموس کی خاطر اب تک حجاب و نقاب کی پابند ہیں یا ہمارے وزیر اعظم اپنی ذات سے بیسیوں شریف انسان ہیں، اور جن بڑی حد تک مسلمانوں کے حق میں انصاف اور ہمدردی کرنے والے۔ اس کے بعد ان پر کسی حد تک بھی نکتہ چینی قدتاً قلم کو شاق گذرتی ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اصلاحی قدروں کے تحفظ کا جذبہ ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ (۵ دسمبر ۲۵۸ء)

(ہفت روزہ "صدق جدید" لکھنؤ)

سرِ راہے

یہ "سپیشل مرونس" کہ چرچل نے مسٹر روز ولٹ کی معرفت ہندوستان کو آزادی دینے کا وعدہ کیا ہے اور ضامن کامریڈ سٹالین ہیں۔ درست ہی معلوم ہوتی ہے۔ تین چار دن ہوئے "علی الصباح ایک صاحب تشریف لائے شکل صورت اور حیئت کذائی سے "کامریڈ" ہی معلوم ہوتے تھے۔ شانِ نزول پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ ذہمت ہو تو کچھ ضروری باتیں کہنی ہیں۔ ہم نے یہ عرض کی کہ اس وقت تو ذہمت نہیں۔ پھر سہ پہر کو سہی جب سہ پہر کو بھی مصروفیت کا عذر کیا تو ایک طرح سے دھرنا ہی مار کر بیٹھ گئے۔ مجبوراً وقت بستہ پوچھنا پڑا کہ حضور کا نہایت "اہم مشن" کیا ہے؟ فرمایا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا چاہیئے۔ ہم نے گزارش کی کہ اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان آزاد ہو تو کیسے؟ نہایت سادگی سے فرمایا کہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کیجئے۔ ہم نے ذرا شبہ کا اظہار کیا تو یہ مژدہ سنایا کہ ترقی پسند دنیا آپ کے ساتھ ہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت کو بین الاقوامی مسائل سے بہت دلچسپی ہے اور اس حد تک دلچسپی کہ ان کے خیال میں کم از کم مشرق میں اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے ان کے مشورہ سے ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی ہوگا ان سے پوچھے بغیر نہیں ہوگا۔ سٹالین سے بہت دوستی ظاہر کی اور کہا کہ سٹالین سے میں ملا تھا اور اسے ہندوستان کا مسئلہ اس طرح سمجھایا ہے کہ وہ بالکل ہمارے ساتھ ہے سٹالین نے ایک پیغام بھی مجھے دیا ہے جس میں ہندوستان کے لئے قومی حکومت کا مطالبہ کیا گیا ہے کسی مناسب وقت پر میں اسے شائع کر دونگا۔

ہم نے بیچ "کامریڈ" صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ سٹالین کا بیان شائع کرنے سے پہلے پروفیسر عبدالمجید صاحب کو ضرور دکھا لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ڈکشنری کھول کر بیٹھ جائیں۔ سٹالین آخر روسی ہے۔ بیان میں انگریزی کی دو چار غلطیاں ضرور نکل آئیں گی۔ پروفیسر صاحب ایک بیان دھر گسیٹیں گے اور ٹریبیون اسے چھاپ دے گا۔ اور خدشہ ہے کہ کہیں اتحادیوں کے تعلقات نہ بگڑ جائیں۔ بات معقول تھی۔ اس لئے انھوں نے یہ مشورہ قبول کیا۔ اب وہ پروفیسر صاحب کی تلاش میں ہیں۔ اور جب تک پروفیسر صاحب بیان کی غلطیاں درست نہیں کر دیتے ہم محفوظ ہیں۔

ان کامریڈ کی فکر صرف ایک "ڈاکٹر صاحب" دیکھے۔ فرق یہ ہے کہ وہ ہندوستان سے باہر کے مسائل ہیں ذرا کم دخل دیتے

ہیں۔ عرصہ ہوا ان سے ملاقات ہوئی تو زمانہ کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "لنگوٹ سے توبہ تکلیف تھی۔ جب کوئی پیچیدہ مسئلہ ہوتا تھا وہ ہلا تکلف بلا بھیجتا تھا اور وہیں کرتا تھا جو ہم کہتے تھے۔ دیوار سیاہی اور ذرا اکھڑ سا آدمی ہے۔ سخت ضرورت کے بغیر بلاتا نہیں۔ اور بھی بلائے جانے کے ہم عادی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملات روز بروز خراب تر ہو رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے پاس بہت سے جنگی نقشے تھے اور ایک پنسل۔ بار بار ان نقشوں کو کھولتے تھے اور پنسل لگا لگا کر بتاتے تھے کہ دو سال بعد ہٹلر یہاں سے حملہ آور ہوگا۔ مسولینی یہ چال چلے گا۔ آخیر زیادہ سے بڑھیں گے۔ اٹلی یہاں مات کھائے گا۔ اور ہر پانچ منٹ بعد ٹھنڈا سانس بھر کے کہتے تھے کہ افسوس ہماری یہ بصیرت رائیگاں جا رہی ہے۔ اپنی حکومت ہوتی اور اس طرح جنگ درپیش ہوتی تو وہ نقشہ بناتا کہ دشمن سٹی بھول جاتا۔

اور بات واقعی افسوس کی ہے کہ ایسے ایسے اہل کمال ہندوستان میں موجود ہیں جو سائیں۔ ہٹلر اور چرچل کو برسوں درس دے سکتے ہیں مگر کسی کی نظر ان کے جوہر کراں مایہ پر نہیں جاتی۔ کوئی کسی ہسپتال میں کمپونڈر ہے تو کوئی بالکل بے کار۔ قومی حکومت ہوتی تو یہ لوگ روس۔ امریکہ اور انگلستان میں سفیر ہوتے اور سفارت خانے میں نہ سہی کسی اور "خانے" میں تو ضرور ہوتے۔ اس طرح تباہ حال تو نہ پھرتے۔

سہروردی صاحب چین جا رہے تھے تو بڑا شور تھا کہ نون صاحب بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔ چین سے ہم چینی کے توسط سے متعارف تھے۔ عام قاعدہ بھی یہ ہے کہ جب کسی کے ہاں مہمان جاتے ہیں تو اپنے ساتھ کوئی میٹھی چیز لے جاتے ہیں۔ مگر پاکستان میں ان دونوں چینی کی کمی ہے اس لئے سہروردی صاحب نون ہی کو ساتھ لے جا رہے تھے کہ شکر پارے نہ ملے، نمک پارہ ہی سہی ع

گندم اگر بہم نہ رسد جو خیمت است

لیکن نون صاحب کے چین جانے کے سلسلہ میں یا تو وہ شور اشوری تھی یا یہ بے سبی کہ سہروردی صاحب نون کے بغیر ہی چین سدھارے۔ کم سے کم منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے تو یہ تو شہ ضروری تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت میں سہروردی صاحب کو خیال آیا کہ پاکستان کی ترکیب میں "نون" ضروری ہے ——— لیکن جس نون کو وہ نون اعلانیہ سمجھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ نون غنہ ہے۔

نون غنہ اور نون اعلانیہ میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے اور نون سے نقطہ خارج ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ نون صاحب وزیر خارجہ ہیں اور وزیر خارجہ کا کام عام طور پر حریفوں کو بے نقط سنانا ہے۔

اس نکتے کو اگر کوئی سمجھا ہے تو سہروردی صاحب نے جب ان کے فارمولے پر نکتہ چینی کی گئی تو وہ چینی کے ساتھ ساتھ نکتہ بھی لے گئے جس سے لوزان اعلانیہ لوزان غتہ بن گیا لیکن وہ ہمارے منہ کا مزہ پھیکا کر گئے۔ گویا ہم چینی کو رو رہے ہیں اور سہروردی صاحب نکتہ چینی کو۔

اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ سہروردی صاحب چین سے لوٹتے ہوئے کچھ چینی اپنے ساتھ لے آئیں۔ کوئی تو ایک کارخانہ چینی سے درآمد کر ہی لیتے ہیں۔ چینی آجائے گی تو ملک کا سیاسی مفاد ٹھیک ہو جائے گا۔

سہروردی صاحب کے چین جانے پر ان کے بعض احباب چین بجبیں ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سہروردی صاحب چین گئے تو ہیں۔ لیکن شاید وہاں انھیں مکمل چین نصیب نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ دعوت ان کے دو پیش روؤں کو راس نہ آئی۔ محمد علی بوگرا نے دعوت قبول کی سی کھلی وزارتی زائل کی پیاں بول گئی۔ اور چوہدری محمد علی کی شہ افت و دیانت نے انھیں اتنا چین۔ لینے ہی نہیں دیا کہ وہ اطمینان سے چین جا سکتے۔ لیکن سہروردی صاحب بے خطر اس راستہ پر چل پڑے۔

یہ صحیح ہے کہ وزارت عظمیٰ کوئی چینا گوند نہیں کہ جو اس گدی پر بیٹھے وہ چپک کر ہی رہ جائے۔ لیکن شہید صاحب بھی طفل چوں چوں نہیں۔ جب تک وہ صحیح بنیادی اصولوں سے چین چیپڑ نہیں کرتے انھیں کوئی خطرہ نہیں۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

مولانا بھاشانی مرحوم دوسری بار باہر گئے تو ہوائی اڈے پر پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والوں کی تعداد پندرہ بیس ہزار بلکہ ایک روایت کے مطابق پچیس ہزار تھی۔ جلوس میں تو ان پر جو گلپوشی سو ڈیڑھ سو آدمی پر ہے کر رہی تھی انھیں سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا چنانچہ وہ رات کے دس بجے تک مصافحے کرتے رہے اور راہی جانے کتنے دنوں تک یونہی مصافحے اور معانقے کرتے رہیں گے۔ المختصر یہ ثابت ہے کہ ہم کسی بڑی جماعت کے امیر جمیعۃ عمر بھر بھی نہ ہوئے ورنہ ان مصافحوں اور معانقوں میں مر لئے ہوتے۔

بعض پرانے لیڈروں کو جنھوں نے عدم تعاون کی کھریا کا زمانہ دیکھا ہے، جلوس تھلے مصافحے اور معانقے کرنے کا کچھ ایسا ڈھب آگیا تھا کہ دن بھر میں دو تین جلوس نکلواتے تھے، ہزاروں عقیدت مندوں سے مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے اور ماتھے پر بل تک نہیں پڑتا تھا۔ ہم نے ایسے بزرگ بھی دیکھے ہیں کہ انھیں مصافحہ تو خیر معلوم ہوتے تھے لیکن لیڈری جو ہاتھ آئی تو اچھے خاصے معلوم ہونے لگے۔ جلوس اور جلسے انھیں خوب راس آئے۔ اپنے نام کے ساتھ زندہ باد سن کر سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ مصافحہ اور معانقہ کرتے تھے تو یکلی سی کوندجاتی تھی۔ مصافحہ تو خیر کیا بری چیز ہے معانقہ کی کیفیت تھی کہ داہنی طرف ذرا جھک کر بائیں پر آئے اور وہاں سے اس طرح صاف نکل گئے کہ بڑے بڑے پیسنی توڑ بلکہ کمر توڑ معانقہ کرنے والے منہ تکتے رہ گئے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

تو وہ ایک حد تک درست ہے لیڈری میں نزاکت کی بجائے پھرتی اور معانقہ کرنے کی مشق کی ضرورت ہے۔

بعض لیڈروں کی تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جلسے یا جلوس کو زیادہ عرصہ ہو جاتا تھا تو یہ مرض "عدم جلوس" میں مبتلا ہو جاتے تھے اور یہ مرض جب مزمن ہو جاتا تھا تو کسی بڑے سے بڑے جالینوس سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا تھا اور معجون اسطوخودوس بھی بالکل بے کار ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس لئے جلسے کثرت سے ہوتے تھے۔ جلوس بھی کثرت سے نکالے جاتے تھے۔ جلسوں کا انتظام بڑے سلیقے سے کیا جاتا تھا۔ یہ بات پہلے طے ہو جاتی تھی کہ اللہ اکبر کا نعرہ کب لگایا جائے، نذرہ باد کے نعروں کے لئے کون کون سے موقعے موزوں ہیں۔ اس مرض کے لئے جلسہ گاہ کے مختلف حصوں میں نعرہ لگانے والے کھڑے کر دیئے جاتے تھے وہ موقع بموقع اس انداز سے نعرے لگاتے کہ سارے اہل جلسہ ان کی پیروی کرتے تھے۔

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں پنجاب کے ایک مشہور لیڈر گجرات کے قومی کارکنوں کو تار دے دیئے تھے لیکن بہ تار وقت پر نہ پہنچے۔ ان کی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو کوئی شخص استقبال کے لئے موجود نہیں تھا۔ انھوں نے تلی سے سامان اٹھوایا اور ویٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ پھر ایک شخص کے ذریعے گجرات کے کانگریسی اور خلافتی کارکنوں کو پیغام بھیجا کہ "مجھے آکے لے جاؤ" گجرات میں سب لوگ بے خبر بیٹھے تھے۔ یہ پیغام پہنچا تو ہڑبڑا کر اٹھے اور جلسوں کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ خدا خدا کر کے شام کے وقت جلوس نیاز ہوا اور یار لوگوں نے لیڈر کو گجرات پہنچایا اور اس طرح وہ مرض عدم جلوس میں مبتلا ہوتے ہوتے بچا۔

۱۹۲۰ء کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگرس اور جمعیت خلافت کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے۔ کانگرس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو کا جلوس بڑی دھوم سے نکلا۔ مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے خلافت کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی کا جلوس بڑی شان و شوکت سے نکالا۔ اسی زمانے میں پنجاب کے بعض لیڈروں کو خیال آیا کہ ہمارا جلوس بھی نکلنا چاہئے ورنہ کہیں عارضہ عدم جلوس لاحق نہ ہو جائے۔ کلکتہ میں پنجابیوں کی دردسر دہی کی دو کانیں ہیں۔ مارتسر کے کچھ لوگ شال فروشی بھی کرتے ہیں۔ جب کانگرس اور خلافت کے جلسے قریب الاختتام تھے تو بعض پنجابی لیڈروں کا ایک چھوٹا سا جلوس نکلا۔ کسی نے پوچھا یہ کس کا جلوس ہے؟ جواب ملا پنجاب کے لیڈروں کا۔ اس نے دوبارہ پوچھا اب تک یہ جلوس کہاں تھا؟ پاس سے کسی نے کہا کارنگر کے پاس تھا۔ اس نے وقت پر بنا کر نہیں دیا۔ عید تو پیچھے پڑی اسی کا نام ہے ایک پر زور قہقہہ بلند ہوا۔ راقم الحروف اگرچہ پنجاب کے لیڈروں کی جرأت اور ہمت کا قائل رہا ہے لیکن کلکتے والوں کی بات سن کر بڑا افسوس ہوا۔

حرف و حکایت

احمد ندیم قاسمی

سنا ہے سابق پنجاب کے علاقے میں چینی کی پیداوار بڑھ گئی ہے اور مرکزی حکومت کا ذہن چینی کی طرف سے اصلاح موصول ہوئی ہے کہ وہ جو ہمسے تقلیدِ دشمن میں چینی دینے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ وعدہ وفا ہونا ضروری ہے لیکن چینی موجود نہیں ہے اس لئے چینیوں کی ہنسی بجا ہے۔ اور چینی بجا ہیں ہونے یا نہ ہونے کے بجائے چینی پر اثر آنے کے بجائے چینی کا انتظار کرو۔ تو کہ چینی ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ چینی کا آنا اسی طرح یقینی ہے جس طرح موت کا آنا یقینی ہے۔

ہم سفروں نے پہلے چینی خوروں کو مشورہ دے چکے ہیں کہ چائے میں چینی ڈالنے کے لئے پہلے سے بجائے ڈراپر کا استعمال شروع کر دیجئے۔ اور مہمان کے لئے چائے بناتے وقت اس سے یہ پوچھنے کہ آپ کتنے چمچے پسند فرمائیں گے۔ چینی سے بھرے ہوئے ڈراپر کو بڑی نزاکت کے ساتھ انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے مقام کر اور گردن کو ذرا سا خم دے کر استفسار فرمائیے: "آپ چینی کے کتنے ذرات استعمال کرتے ہیں؟" مہمان بڑا بے تکلف اور منہ پھٹ ہو تو کہہ دے ایک سو ذرات سے کیا آگے جائے گا اور مزہ ہو کہ چینی کے ایک سو ذرات چمچے کا ایک چوتھائی پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔

اس جاہلی تمامی کا قصہ تو آپ نے سنا ہوگا جس کا باپ انتقال کر گیا تو دیہات کے لوگ اس کے پاس چاند کی تاریخ پوچھنے آنے لگے۔ حساب کتاب کا تو اتا پتا تھا۔ اس لئے اس نے دکان کے کونے میں اپنے پلنگ کے ایک طرف کھلے منہ کا ایک برتن رکھ دیا۔ اور جب نیا چاند نکلتا تو اس نے برتن میں بکری کی ایک مینگنی ڈال دی۔ دوسرے دن دوسری مینگنی شامل کر دی اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب کوئی اس سے چاند کی تاریخ پوچھنے آتا وہ بڑی وقار داری میں انگڑائی لیتا۔ ہاتھ بڑھا کر برتن میں پڑی ہوئی مینگنیاں گنتا اور تاریخ بتا دیتا۔

چند روز کے بعد نہ جانے ایک بکری کو کیا سوجھی۔ کہ وہ اس برتن میں بہت سی مینگنیاں بھر کر چلی گئی۔ شام کو کوئی دیہاتی چاند کی تاریخ پوچھنے آیا تو قاضی نے انگڑائی لے کر ہاتھ لٹکایا۔ اور پھر جیسے مراقبے میں چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد حیران ہو کر بولا "اٹھانویں؟ اٹھانویں کیسے؟" اور قاضی بولا "یہ تاریخ بھی میں نے خدا کے خوف کے مارے بتائی ہے۔ ورنہ میرے حساب سے تو آج چاند کی پانچ سو

بہترین تاریخ نکلتی ہے ——— دو چمچے چائے پینے والوں کے حساب سے چاہے انھیں آپ کے ڈبا پر میں سے تین چار ہزار ذرا بہ چینی کی ضرورت ہو۔ مگر وہ بھی خدا کے خوف کے مارے ایک سو سے آگے نہیں بڑھیں گے آزما کر دیکھ لیجئے۔

کچھ دنوں سے چینی کی کچھ ایسی کیفیت ہو رہی ہے کہ اگر ہماری حکومت مانے تو جلدی جلدی سے چینی کا ایک آدھ من محفوظ کر لے اسے بجائے گھر میں منتقل کر دے۔ تاکہ آئندہ نسلیں جب کتابوں میں چینی کا ذکر پڑھیں تو اسے گڑ نہ سمجھ بیٹھیں۔ چینی کو فوری طور سے نوادرات میں شامل کر لینا بے حد ضروری ہے اور محکمہ آثار قدیمہ اس کار خیر کو جتنی جلدی اپنے ہاتھ میں لے لے اتنا اچھا ہے۔ وقت آنے والا ہے جب اعزہ و احباب خوشی کی تقریبوں پر ایک آدھ چمچہ چینی سونے کی ڈبیوں میں بند کر کے پیش کیا کریں گے اور تحفے قبول کرنے والے جب ڈبیا کھول کر اس میں چینی کا حسین ذخیرہ دیکھیں گے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ سان کی آواز بھرا جائے گی اور وہ بڑی رقت سے کہیں گے "یہ اتنی بڑی قربانی! یعنی آپ میرے لئے چینی ایسی چیز کا پورا چمچہ لے آئے ہیں۔ نہیں میں اس قابل کہاں میری طرف سے بچہ اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر دیجئے گا۔ شکریہ"

یکم دسمبر ۱۹۵۶ء

نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم "پری کا سراپا" پڑھتے ہوئے ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ نظیر کے محبوب اور عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کے درمیان کافی سے زیادہ مماثلتیں اور مشابہتیں موجود ہیں اور اگر نظیر آج کے محبوب کا مقابلہ اس کے ماضی سے کر رہا ہے تو عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کا مقابلہ پرانی مسلم لیگ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس پر ہم نے اس ساری نظم کا جائزہ لیا۔ بعض تبدیلیاں کیں۔ بعض نئے الفاظ گھڑے۔ اکثر مصرعوں کو یونہی رہنے دیا اور اس طرح عوامی لیگ کے سرکاری گروپ کا سراپا تیار ہو گیا۔ جو آپ کی ضیافت طبع کے لئے حاضر خدمت ہے:۔

ویسی ہی فارن پالیسی مغرب کو جھکاوٹ ویسی ہی — قدموں سے ٹکراؤ ویسی ہی اپنوں سے کھچاؤ ویسی ہی
بالوں میں سیفٹی ایکٹوں کی افشاں کی سجاوٹ ویسی ہی — پلکوں کی جھپک پہلی کی پھرت سرمے کی کھلاوٹ ویسی ہی
تیور ویسے ہی بگڑے سے تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہی

بے درد سی اور بے پرواسی چنچل سی اور تھکیلی سی — دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ان نرم رسیلی باتوں میں اک شے ہے سخت کٹیلی سی — آنکھیں ہیں کہ مسلم لیگیں ہیں کچھ سرخ سی اب کچھ پیلی سی
نظروں کی چڑھاوٹ ویسی ہی آنکھوں کی گراوٹ ویسی ہی

بغداد کا پٹکا باندھے ہوئے سیٹو میں بیٹھ کے آئی ہے — اپنی ہی زباں کو لہرا کر اپنی ہی زباں کھا جاتی ہے
ب سو سو شکوے کرتی تھی اب ہنستی ہے اور گاتی ہے — اب اس کی سانسوں سے بھی مسلم لیگ کی آواز آتی ہے
زلفوں کی کھلت، پٹی کی چیت، چوٹی کی کندھاوٹ ویسی ہی

اس کا فر ہینی اور نخہ کے انداز قیامت شان بھرے — اور گھر سے چاؤ نخدا میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ باتوں سے جیبیں بھرنے اور وعدہ سے دامان بھرے — چہرے پر لہو تو بر سے جوئے آنکھوں میں بہادر خاں بھرے
بندے کی لٹک جھٹکے کی جھک، بانے کی ہلاوٹ ویسی ہی

لپک کے جھپکیں ان باہوں کی یاد ہیں آج کہوں کیا کیا ۔۔۔ ہلکے سے ملنا بازو کا دھیرے سے وہ انگڑائی کا
(مٹھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہی چھلوں کی چھلاوٹ ویسی ہی)

وہ کافر دھج جی دیکھ جسے خود مسلم ایک بھی لرزے ۔۔۔ پازیب کڑے پائل گھنگھرو کڑیاں جھڑیاں کچھ بچے نوڑے
ہر جنبش میں سو جھنکار بپا ہر ایک قدم پر سو جھمکے ۔۔۔ وہ چلبل چال جوانی کی، اودی اڑی، نیلے پیلے،
(نقشوں کی کھنک، ڈاس کی جھنک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہی)

اک شور قیامت ساتھ چلے، نکلے کافر جس دم بن ٹھن ۔۔۔ بل دار کمر، رفتار غضب، یک ایک قدم سو سو تھمکن
مذکور کروں کیا اب یارو اس سنورج کے کیا کیا چنچل پن ۔۔۔ کچھ ہاتھ ملیں، کچھ پاؤں ہلیں، کچھ ٹھوکر کھا بازو، تھ تھ کب تن
(بھولی تو نہ ہوگی ایک تھیں، نکلی کی نجاوٹ ویسی ہی)

کیا بات کہی؟ — سو بار کہے، جو بات کہوں تب تم سمجھے ۔۔۔ رو ٹھے مجھے سو سو لاکھ منائے میرے باتوں میں لڑکے ٹھاتوں میں
بیٹھی تو بے اوپچی کرسی پر، آ — آن نکیلی رہے ۔۔۔ چنچل، چلبل، منچلی، چلکے، مرکھنے، ٹھٹھکے ہنس ہنس کے
(تمغوں میں وہی دو فنانیت گٹھوں کی اڑاوٹ ویسی ہی)

چلکی لے کر کہنی مارے، چھیڑے، جھڑکے، پھر روٹھے بھی ۔۔۔ ہر آن چہ خوش "ہر دم" چپ "ہر بات پہ کہہ دے" اچھا جی"
تن تن کر جو تقریریں کیں، وہ دابس لے کر بیٹھ رہی ۔۔۔ سو کوس پر سے ہٹ جاتی ہے بات آتی ہے جب مطلب کی
(رمزیں بھی وہی، نخرے بھی وہی، باتوں کی بناوٹ ویسی ہی)

اُف اس پہ حکومت ناعالم، وہ عالم ایک کہاں بادے ۔۔۔ کر پردہ منہ سے دور کرے تو نشہ کبھی چکر آجاوے
جب ایسا حسن بھبھوکا ہو، ایسا تاب بھلا کیونکر لاوے ۔۔۔ وہ تھرم الیگ کا سا اسا جو دیکھے دیکھ لے عش کھاوے
(گالوں کی دمک، ماتھے کی چمک، زلفوں کی زلاوٹ ویسی ہی)

کچھ ناز و ادا، کچھ غمزہ ری، کچھ شرم و حیا، کچھ بانکپن سا ۔۔۔ کچھ آمد حسن کے موسم کی، کچھ فاتر حسن رہا گدرا
کچھ شور جوانی، ٹھٹھے کا، جی سند ھیے ہلاب پایا نا ۔۔۔ اپنا بھی اسے لیے ہوش بہیں، کیا سوجھ ہو اس کو دنیا کا
(چاٹے میں وہی کیک کا مزا، آٹے میں ملاوٹ ویسی ہی)

جب ایسا حسن کا دریا ہو، کس طرح نہ لہروں میں بہیے ۔۔۔ ہم ڈوبے جاتے ہیں ایسے اس سیر و جہاں کو بھی چھوڑے
اپنے ہی کسے کی لاج نہیں اب اس سے آگے کیا کہیے ۔۔۔ گر وال نہ پہنچے دریا کو ملی سنگے ہی پڑ کر سو رہیے
افسوس وطن پر چھائی ہے اب کے بھی تھکاوٹ ویسی ہی

۱۷ دسمبر ۱۹۵۶ء

ہم نے بعض ارباب کراچی کی زبانی سنا ہے کہ "صاحب" ہمیں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ آنی جانی تو آتی ہی چلی جاتی ہیں۔ مگر نہیں آتیں تو مہینوں تک نہیں آتیں" اور ان ارباب کراچی سے ہم نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ ذرا لاہور تشریف لائیے اور ایک آدھ پلڑا کر دکھائیے مگر اتنی، حقیاط ملحوظ رہے کہ بتیس دھاریں بخوشحالی اور وصیت نامے مرتب کر کے تشریف لائیے کا لہور مگر لاہور میں کراچی کی سی (عام سے) عامی بس نہیں چلتی۔ یہاں آمی یا اومنی بس چلتی ہے اور اہل لاہور کا کہنا ہے ؎

کراچی میں تو کبھی کبھی ایک ہی بس اسٹاپ پر ہر بس سروس کی ایک ایک نمائندہ بس آ کھڑی ہوتی ہے اور یوں بھی ہوا ہے کہ ایک مسافر کا دا ہنا بازو ایک بس میں رکھا ہے تو بایاں دوسری بس میں، سنٹ میری بس کی ایک سیٹ پر ورج ہے تو ٹانگیں چوکھٹی بس میں کھڑی ہیں، اور یا قیامتہ دھڑنے یا کچنی بس کے انتظار میں بس سٹاپ کا کھمبا تھام رکھا ہے۔ یہاں لاہور میں تو یہ کیفیت ہے کہ والدین نے بچے کو پرائمری اسکول جانے کے لئے بس اسٹینڈ پر کھڑا کیا مگر جب تک بس آتی بچے کی داڑھی مونچھیں نکل آئیں، اور والدین اسے دولہا بنانے کے لئے گھر بلا لائے۔

کہتے ہیں ایک غریب مسافر کی چادر چوری ہو گئی۔ تلاش بسیار کے باوجود جب چادر دستیاب نہ ہو سکی تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چادر کے غم میں آئندہ سے داڑھی نہیں منڈوائے گا۔ ایک روز اس نے سر راہے ایک پچھتر سالہ بزرگ کو دیکھا جس کی داڑھی اس کی ناف تک پہنچ رہی تھی۔ قریب جا کر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا "قبلہ۔ کیا آپ کا پورا بستر کھو گیا ہے؟" سو بسوں کے معاملے میں کراچی والے صرف ایک چادر سے محروم ہوتے ہیں۔ مگر بے چارے اہل لاہور تو اپنا اوڑھنا بچھونا سب کچھ کھوئے پھرتے ہیں۔

آج ہی صبح کا واقعہ ہے۔ وہ صبح جس کے بارے میں حضرت جوشؔ نے کہا ہے ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

بس اتنا سا فرق ہے کہ یہ صبح ۲۰ جولائی کے سورج کی دھوپ میں نہا کر نکلی تھی۔ ہم پون گھنٹے تک ایک بس سٹاپ پر کھڑے دل ہی دل میں کائنات قدیر کے سامنے ایک مکالمہ بولتے رہے جب تک ایک بس ہمارے سامنے آ کر رکی۔ ہم نے دیکھا بس میں جتنے آدمی بیٹھے ہیں اس سے زیادہ کھڑے ہیں اور یوں ٹھنس کر کھڑے ہیں کہ اگر دروازے کے پاس کسی مسافر کے چیونٹی کاٹ لے تو پچھلی بس کے آخری سرے پر کھڑا ہوا مسافر محسوس کرے۔ غرض پوری بس کے مسافر یک جان و یک سو کے فریب غالب ہو رہے ہیں۔

ناگاہ بس کا دروازہ کھلا جیسے علی بابا والی انگریزی فلموں میں "کھل جا سم سم" کہنے پر غار کے دہانے پر رکھی ہوئی چٹانیں کڑکڑاتی ہوئی ہٹتی ہیں۔ پھر بس میں سے ایک مسافر اترا۔ اترا کیا، برآمد کیا ہوا ٹپک پڑا اور پکارا "پانی"۔ ہم لپکے اور قریب کے ایک ہوٹل سے پانی لے آئے۔ اس کے چہرے پر چھڑکا۔ اس کے سر میں ٹپلایا اور اس سے "مزاج شریف" پوچھے۔ بولا "نانی"۔ "ہم اس شارٹ ہینڈ" بولی کو نہ سمجھ سکے۔ مگر قریب ہی کھڑے ہوئے ایک آدمی نے وضاحت کر دی "بے چارے کو نانی یاد آ رہی ہے"۔ سب نے ہمدردی سے نیم بے ہوش مسافر کی طرف دیکھا تو وہ نہایت ضعیف آواز میں بولا "نانی" اس نے اس لفظ کی ترجمانی کی "یعنی جب انسان اومنی بس پر سوار ہوتا ہے تو اس کے سامنے انسان کی نانی کا نقشہ کچھ جاتا ہے"۔ پھر کسی نے نیم دراز مسافر سے پوچھا "کہاں سے چلے تھے آپ"؟ مسافر بولا "نانی"۔ اس لفظ کی شرح یوں کی گئی "کسی پولیس چوکی سے چلے ہیں۔ پولیس اسٹیشن نہاں ہوتا ہے تو پولیس چوکی نمایاں ہوتی"۔ مگر پھر کسی کی آواز آئی "بھائیو۔ اسے ہسپتال لے چلو۔ مجھے یقین

(روزنامہ امروز، لاہور)

آنکھیں میری باقی اُن کا

جو لوگ پرانے لاہور سے آشنا ہیں انہیں یاد ہوگا کہ یہاں فقیروں کی ٹولیاں پَو پھٹنے سے پہلے نظر آتی تھیں، یا جمعرات کو فجر کی نماز سے دس بجے دن تک ـــ کبھی کبھار کوئی خیرات کو بھی آواز دیتا گذر جاتا تھا۔ مگر فقیر منگل اور سنیچر کو گلیوں میں صدا دیتے، مسلمان فقیر جمعرات اور جمعہ کو ـــ صبح اُنکو خُلقِ تو فقیروں کے دعائیہ فقرے کانوں میں پڑتے۔ رنگا رنگ دعائیں۔ چیدہ چیدہ بھلے، منتخبہ مصرعے، بعض کے بول، حمد کے الفاظ، اللہ، سوئی کی صفات، غرض دعاؤں کی پھلواری لگی ہوتی ـــ ایک طرف سے آواز آتی "اللہ ہی دے گا، مولا ہی دے گا۔ دوسری سمت سے بول گونجتا "آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا" ـــ ایک فقیر پکارتا ہوا نکل جاتا "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" دوسری طرف سے کانوں میں قند گھل جاتی "کس شان کی سرکار ہے سرکارِ محمدؐ"۔

یہ یہ فقیر ـــ پہرے ورے سے فقیر نظر آتے، اُن کے لب و لہجے اور ظاہر و باطن سے پتہ چلتا کہ مانگتے اور دن کاٹتے ہیں ـــ

آج فقیروں کا وہ طبقہ ہی منتشر ہو چکا ہے۔ نہ اُن کی آوازیں نہ اُن کے چہرے اور نہ وہ دعائیہ اسلوب، زمانہ کے ساتھ گداگری نے بھی ترقی کی ہے۔ ـــ مطلب ہے صبح کو پیر، بلّا لے رہے فقیر دو زیرو۔ گئے خال خال رہ گئے جو کونا کھدرے ہیں ـــ انہوں نے اپنے لئے خاص خاص گلیاں اور خاص خاص مکان چُن رکھے ہیں، وہیں صدا دیتے اور جمعرات کے کر چلے جاتے ہیں ـــ اُن کی جگہ عجیب الغریب فقیروں نے لے لی ہے۔ آپ ابھی ابھی ہمارے مخاطب کے فقیرانہ سوال سے کشمکش رہ جائیں گے۔ اللہ العالمین کس سے واسطہ پڑا ہے۔ فقیر ہے یا دوست ـــ بھی جا، مخاطب نے سوال کی نوعیت سے مغالطہ ہونے لگتا ہے کہ شاید آپ کسی دوست یا عزیز سے ہم کلام ہیں۔ وہ آپ سے اپنی بپتا کہہ رہا ہے۔ اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس کا بالغہ ٹالیں۔

مثلاً آپ تنہا چلے جا رہے ہیں ـــ سامنے سے یا عقب سے آواز آئے گی ـــ "السلام علیکم" آپ نظریں اٹھا کر یا پلٹ کر دیکھیں گے ـــ وعلیکم السلام ـــ فرمائیے مزاج شریف۔ جی ہی جی میں آپ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ آپ اس "اجنبی" چہرے کو بھولتے کیوں ہیں ـــ

سوال ہوگا ـــ بھائی جان سخت مصیبت میں مبتلا ہوں، روزگار نہیں ملتا، گھر میں بیوی بچے بھوکے پڑے ہیں، مفید پوش ہوں، ہر شخص کے

سامنے ہاتھ پھیلانے سے طبیعت گھبراتی ہے۔ آپ سے التجا کر رہا ہوں۔ کچھ اعانت کیجئے۔ ایک وقت کی روٹی مل جائے تو کرم ہوگا ——

آگے بڑھئے تو ملک اور باہر گیر سے مڈبھیڑ ہوگی۔ کوٹ پتلون میں ٹائی لگائے ہوئے ——— آپ سے تعلیم میں کچھ کمتا چاہتا ہوں ——— فرمائیے ——— بھی ذرا ٹھیک سے ہٹ کر۔ ہاں بھائی کہو۔ کیا بات ہے؟ ——— گھر بار مشرقی پنجاب میں لٹا آیا۔ ماں باپ وہیں قتل ہوئے ——— بہنوں کو آنکھوں کے سامنے ظالم لوگوں نے اُڑھ کر لیا ——— میں کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچا ہوں۔ بیوی کی کوشش کی کوئی چیز الاٹ ہو جائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ وہاں سے برباد ہو کر آیا تھا ——— یہاں بھی برباد ہو رہا ہوں، دنوں فاقے میں کٹ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی چہرہ جس سے شرافت متوقع ہو سامنے آجائے تو سوال کرتا ہوں۔ آپ کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ آپ کچھ دیں گے ——— بس دو چار روپے کا سوال ہے۔ دو چار دن گذر جائیں گے ——— اس قسم کا فقیر دوتی سے کر بھی ٹل جاتا ہے۔

مال روڈ کے تھوڑا فاصلے سے باہر ——— کوئی دس برس کا ایک لانبے قد کا فقیر کاندھوں پر بچہ اٹھائے مانگتا نظر آتا ہے۔ وہ کوئی مال ہی معلوم سے آیا ہے سارا منہ نمائی محتاجت، بار بار دو دن سے بچے بھوکے ہیں ہم ریفیوجی ہیں۔ راہ خدا مدد کیجئے ——— خدا آپ کو بہت دے گا ——— اللہ آپ کو چاند سا بیٹا دے گا، میرے بیٹے پر رحم کیجئے ——— چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ——— اور یہ صدا مسلسل کانوں میں پڑتی چلی جاتی ہے۔

آپ گھر میں بیٹھے ہیں، ایک مضبوط قسم کے بزرگ تشریف لاتے ہیں ——— سلام علیکم ——— کہو بھائی۔ بہاں۔ بیٹھئے۔ اچھے تو۔ یہ آغا صاحب کا مکان ہے جی ہاں فرمائیے۔ مجھے آغا صاحب سے ملنا ہے ——— میں بول رہا ہوں۔ مجھے، انہی سے ملنا ہے ——— جھوٹ بولنا تو ہمارا پیشہ ہے ——— ہے، آپ ہیں؟ معاف کیجئے پہچانا نہیں، وقت کے ساتھ نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔

خوش رہو بیٹے ——— بھرنے نقد یا ہے، نوکری کے قابل نہیں، بڑا لڑکا اقتضائے الٰہی سے فوت ہو گیا، فلاں محکمے میں اچھا خاصا سو روپے ماہوار پر ملازم تھا ——— چھوٹا بیٹا بی اے میں پڑھتا ہے اس کے داخلے کا سوال ہے۔ آپ کی تعریف سنی، پھر خیال آیا کہ آپ کے والد مرحوم سے بڑے گہرے تعلقات تھے، ہمیشہ عزت و احترام سے ملتے ——— بڑے نیک انسان تھے۔ کبھی نماز قضا نہیں کی، پابند صوم و صلوٰۃ، باغ و بہار ——— سوچ سوچ کر تمہارے ہاں چلا آیا ہوں، فرض نہ سمجھو، بھائی کی مدد خیال کرو، میری ڈوبتی کو دیکھو ——— جو جی چاہے کہہ لو۔ صرف بچے کے داخلے کے لئے مکمل سو روپے کا سوال ہے ——— اگر بچہ نیک رہا تو قرض اتار دے گا ——— ورنہ میں تو فقیر ہی تھا یہ احسان ساتھ لے جاؤں گا، اور یہاں ——— قیامت کے دن اس نیکی کا اعتراف کروں گا ———!!

اب آپ ہی فرمائیے، ایک ایسا شخص جو اس سے پہلے کبھی آپ سے نہیں ملا ——— آپ کے والد مرحوم کا دوست بنتا اور فلسفے کے ساتھ سوال کرتا ہے۔

——— یہ جان لینے کے باوجود کہ گداگر ہے، آپ کے لئے اس کے سوال کی سطح کتنی بلند اور آپ کے جواب کا لہجہ کتنا مختلف ہو جاتا ہے ———

مزید برآں فقیروں کا ایک اور گروہ بھی عام ہو گیا ہے ——— بعض دعا دینے اور صدا لگانے والے فقیر روپوش ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ گونگے فقیروں نے لے لی ہے، کئی فقیر خود زخم کر لیتے ہیں۔ اور اسے پھیلانے کے بعد راہگیروں کو متاثر کرتے ہیں ———

اس قسم کے فقیر لاہور میں زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اچانک ایک فقیر آ ٹپکے گا۔ منہ سے رال اور بدن کے لباس سے بدبو آ رہی ہوگی۔ آپ بھوکے ہوں گے، جو کچھ کھا رہے ہیں، وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ یا فقیر سے بھی کچھ دیں ——— اور رخصت کریں ———

گداگری کی ایک اور قسم راہ پا رہی ہے، اور وہ بچوں اور عورتوں میں ہے۔ باقاعدہ کچھ کنگھیاں اور سوئیاں لے کر راستہ راہوں کے باہر کھڑے ہوں ۔۔ بابو جی، کنگھیاں لے لو سوئیوں کا پیکٹ خرید لو وغیرہ۔ آپ انکار کریں، عذر ہے نہیں۔ اصرار ہوگا کہ نہیں کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، بھائی ہیں ۔۔ مجبور ہیں لے لیجئے۔ دو آنے قیمت ہے ۔۔ آپ انکار کر دیں کہ چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو ادھر سے انکار ہوگا۔ جی نہیں، میں فقیر نہیں، معاف کیجئے ۔۔ آپ انکار کر کے آگے بڑھ جائیے ۔۔ آواز آئے گی ۔۔

اچھا بابو جی، کا یا آنہ ہی دے دیجئے۔ کیا کریں صبح سے ایک پیسہ نہیں کمایا۔ بھائیوں کے لئے تیتے ہی لے جاؤں گا۔ بڑھیا ماں فاقے سے بیٹھی ہوگی ۔۔ وغیرہ۔

خانہ بدوشوں نے فقیر ختم ہو گئے۔ ان کی جگہ نئے فقیروں نے لے لی۔ جوانی صفات کے اعتبار سے ایک موزوں نام کے مستحق ہیں۔

بات یہاں تک نہیں رکتی فقیروں کی ان ٹولیوں میں اب برقعہ پوش عورتوں کا بھی اضافہ ہو گیا ہے کچھ سال تو برقعہ سفید رہا، اور سوالات بھی سیدھے سادے ہوتے تھے مہاجر ہوں مردکٹ مرے ہیں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کر رندہ نکل آئی ہوں خدا کے لئے مدد کیجئے ۔۔ التماس آپ کو دعا کیا دے گا ۔۔ آپ کے لئے بھائی جان کا لفظ خطاب پر اناز ہونے کے لئے کافی تھا ۔۔

بعض گداگر عورتوں نے دفتروں کا رُخ کرنا شروع کیا ۔۔ بیٹے دفتر کے مالک کا نام اور پتہ معلوم کر لیں، تب ملاقات کا حیلہ کریں، پھر ٹھائی اور سیدھے دفتر میں آگھسیں۔ شوہر بیمار ہے۔ بچے خورد سال ہیں۔ دوائی کے لئے پیسہ نہیں، دو دن سے فاقہ ہے۔ مدد کیجئے ۔۔ آپ اٹھنی دیں تو جواب ملے گا، بھائی جان میں گداگر نہیں، صرف بُرے وقت نے مجبور کیا ہے کہ آپ سے سوال کرنے چلی آئی ہوں ۔۔ اڑھائی روپے کا تو راشن آتا ہے یہ دھلہ بھیجے مرے پاس راشن کارڈ نہیں ۔۔ اور چودہ روپے کے یہ انگلش چاہئیں، عرض کر چکی ہوں کہ خاوند کئی ماہ سے بیمار پڑا ہے۔ پہلے بازار میں چھابڑی لگا کر وہ وقت کی روٹی نکال لیتا تھا، اب وہ کھوٹا ہی اکھڑ گیا ہے۔

فرمائیے آپ کیا جواب دیں گے ۔۔

کچھ دنوں سے کالے برقعوں نے بھی رنگ باندھا ہے۔ یعنی اکثر بھکارنیں کالے برقعے میں آنے لگی ہیں ۔۔ رکنی سب کی ایک سی ہوتی ہے۔ شوہر مر گیا ہے، چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے ہیں خاوند بیمار ہے لاچار ہوں۔ دوائی کے لئے پیسے نہیں، کچھ اعانت کیجئے۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور)

حرف و حکایت

مجید لاہوری

—— یہ دور "سلطانیٔ جمہور" کا ان معنوں میں نہیں ہے کہ ہم ہر اس "نقشِ کہن" کو جو ہمیں نظر آتا ہے، مٹا سکیں۔ لیکن یہ جمہوری "تقاضوں" کا دور ہے۔ اور ہم لوگ مداری کے "بچہ جمورا" کی طرح "بچہ جمورا" بن گئے ہیں۔ ہر بات جمہوری تقاضوں کے لئے ہوتی ہے۔ ہر آدمی کی آواز "پبلک آواز" ہے

اگر ہم کسی جماعت سے نکلتے ہیں تو —— جمہوری تقاضوں کے لیے۔
ایک نئی جماعت بناتے ہیں تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔
جب نئی جماعت نہیں چلتی تو پھر اسی جماعت میں آتے ہیں جس کو ہم کل تک "بھلا کہہ رہے تھے —— تو جمہوری تقاضوں کے لیئے۔
جماعت کی نئے سرے سے تنظیم کرتے ہیں —— تو جمہوری تقاضوں کے لیئے

انگریز کے دور کو تو ہم خلاف جمہوریت کہتے تھے اور اس کے ہر عمل کو ظلم و تشدد قرار دیتے تھے، مگر آج کے دور میں :-

دفعہ ۱۴۴ لگتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے
گولی چلتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے
لاٹھی چارج ہوتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے
سیلفی ایکٹ لگتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیے۔
مارشل لا لگتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

دوسری طرف ان تمام اقدامات کی مخالفت اور شہری آزادی کی حمایت ہوتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لیئے۔

غرض یہ ہے کہ ——

ہمارا چلنا چرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا سب جمہوری تقاضوں کے لیئے ہے۔

دوسری جمہور کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جمہور کم اور مشکور زیادہ ہے۔ اور اب تو ہر جلسہ ایک ڈراما ہے جس کا نام ہے "جمہور، عرفِ مشکور"

کراچی کا آرام باغ "جہانگیر پارک" "منظور باغ" اور "منظور پارک" ہے۔
لاہور کا مزنگ دروازہ ——— "منظور دروازہ" ہے
پشاور کا چرک یادگار ——— "چرک منظور" ہے
راولپنڈی کا کمپنی باغ ——— "منظور باغ" ہے

غرضیکہ ہر وہ مقام جہاں عمرا میلے ہوتے ہیں، جلسہ گاہ نہیں۔ بلکہ "منظور گاہ" ہے۔ وہاں سے کوئی بھی مایوس ہو کر نہیں آیا۔ جو قرارداد پیش کیجیے، لوگ کہتے ہیں:۔

"منظور ہے!"

"منظور ہے!"

آپ ہر ضلع میں دو جلسوں کا انتظام کیجیے، ایک جلسے میں یہ قرارداد پیش کیجیے کہ:۔

"اس ملک میں صحیح معنوں میں جمہوری نظام قائم ہونا چاہیئے ——"

اور اس کی حمایت میں تقریریں کرائیے کہ ڈکٹیٹرشپ تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے عوام کی بھلائی نہیں ہوتی، اقتدار چند لوگوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے، وہ مزے کرتے ہیں، عوام بھوکے مرتے ہیں، جاگیرداری، سرمایہ داری ختم کرو اور زمین، صنعت اور دوسری چیزوں کو قومی ملکیت بناؤ۔ وغیرہ

آپ یقین کیجیے لوگ قرارداد سے اتفاق کریں گے اور جب صدر کہے گا

"منظور ہے؟"

یہ طرف سے آوازیں آئیں گی:۔

"منظور ہے"

"منظور ہے!"

دوسرا جلسہ آپ ڈکٹیٹرشپ کی حمایت میں کیجیے اور اس میں یہ قرارداد پیش کیجیے:۔

"اس ملک میں ڈکٹیٹرشپ قائم ہونی چاہیئے، کیونکہ ہمارا ابھی جمہوری نظام کے اہل نہیں ہیں"

اور اس قرارداد کی حمایت میں بھی تقریریں کرائیے کہ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ ہم جمہوریت کے اہل نہیں ہیں۔ ہمارے معدودے چند لوگوں کی غلامی کے سبب جمہور سب الیسی قبیح چیز کو سمجھ نہیں سکے۔ ہمیں اپنے فرائض کا احساس نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے مفاد کے لیے قوم کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ چور بازاری، یہ اسمگلنگ، یہ رشوت ستانی، یہ ذخیرہ اندوزی، یہ ناجائز منافع خوری سب اس وجہ سے پھل رہی ہیں کہ کوئی مضبوط ہاتھ اس کو روکنے کے لیے نہیں ہے، چونکہ ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، اگر ان کے خلاف کارروائی ہوتی ہے تو سفارشیں پہنچ جاتی ہیں چونکہ حکومت کرنے والے ان لوگوں سے ووٹ لیتے ہیں اس لیے ان کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے۔ لاہور میں مارشل لا کے دنوں میں سب چیزیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ پنجاب میں امن کامیاب رہا۔ مہنگائی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد آپ یہ کہیئے کہ ترکی میں اتاترک مصطفیٰ کمال جیسا آدمی پیدا ہوا جس نے چند دن میں اس "مردِ بیمار" کو زندہ کر دیا۔ سب "ڈکٹیٹرشپ" کی برکت تھی۔ ہٹلر نے اپنی قوم کو

زندہ کیا، اسٹالن اپنے ملک کا عوامی ڈکٹیٹر تھا، اس نے روس کو زندہ کر دیا۔

صدرِ صدر جلسہ اعلان کریں :-

"بھائیو! یہ قرار داد آپ کو منظور ہے؟"

اس پر ہر طرف سے آوازیں آئیں گی

"منظور ہے"

منظور ہے!"

صدرِ جلسہ اگر کہیں گے :-

"کوئی صاحب اگر اس کے خلاف ہوں تو ہاتھ کھڑا کر دیں"

یقین کیجئے کہ ایک ہاتھ بھی اس کے خلاف نہیں اُٹھے گا۔ شاید اس ڈر سے کہ جب سب لوگ "منظور ہے" کہہ رہے ہیں تو اختلاف کرنے سے کہیں بھرے جلسے میں "پٹائی" نہ ہو جائے۔ ہاں تو جب جمہور کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ہر رہبر کے ساتھ تھوڑی دور چلے اور رہبر کو نہ پہچانے تو پھر جمہوری تقاضوں کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے، وہ سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی کی زبان میں "سب چلے گا"

کیوں؟

اس لئے کہ ——— نہ کوئی روکنے والا ہے

نہ کوئی ٹوکنے والا ہے

جمہوری تقاضے ——— زندہ باد!

(ہفت روزہ نکلدان، کراچی)

اُردو ادیبوں کے دلچسپ لطائف

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مشاہیر اردو کے بعض نہایت دلچسپ و پرلطف اور ظرافت سے متعلق سوانح عمریوں اور ادبی تاریخوں میں اس کثرت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو تلاش کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو یقیناً ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ مگر اتنی زحمت کس کے پاس رکھی ہے جو کچھ سامنے آیا بغیر کسی ترتیب کے ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں۔ اس مختصر مجموعہ لطائف میں جو کہ نہایت لطیف و شستہ بھی ہیں اور پاکیزہ مزاح کے بتہ بھی ہوں گے۔ ان کے مطالعہ سے جہاں قارئین کرام کو اپنی خطا حاصل ہوگا وہاں نراہت و تشحر کا مرض بھی معدوم ہو جائے گا!

سرسید احمد خاں

جب سرسید احمد خاں نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع کی اور جدید تقاضوں کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر لکھی تو ان کے خلاف سخت طوفان برپا ہوا۔ ان کو ملحد، کافر، دہریہ، نیچری وغیرہ خطاب دیئے گئے۔ ان کے مددگاروں اور دوستوں کا بھی برا حال کیا گیا۔ مولانا حالی نے مقابلہ میں خیالی اور وہمی جیسے حریف اکھاڑے میں اتارے گئے۔ مرحوم حالی کے جواب میں، مسدس حالی وغیرہ کتابیں لکھی گئیں۔ سرسید کو تو خیر جانے دیا گیا کہ خطاب مرحمت فرمایا گیا تھا اور مدینہ تک سے سرسید اور ان کے رفقاء کے لئے کفر کے فتوے چھپوا کر کوشش و کاوش سے منگوائے گئے اور سادہ لوح مسلمان میں شائع کئے گئے۔ انہی علمائے کرام میں سے ایک مولوی علی بخش صاحب العصر و گرکھپوری تھے جنہوں نے محض سرسید کے خلاف علمائے دین سے فتویٰ لانے کے لئے سفر حج کا قصد فرمایا۔ جب فتویٰ لے کر واپس آئے تو سرسید نے ان کے متعلق لکھا۔

"مولوی علی بخش ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا۔ سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا فرمے کہ کسی کو حاجی بنوا دیا۔ کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے ؎

یاراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ایک مرتبہ چندہ جمع کرنے کے لئے سرسید پنجاب آئے تو ایک جلسہ میں ان کا تعارف حاضرین جلسہ سے کراتے ہوئے پنجاب کے ایک مشہور رئیس اور خطاب یافتہ رئیس نے فرمایا۔ "یہ صاحب جن کا نام سرسید ہے اور جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں مسلمانوں کی

قومی کشتی کے ناکتخدا ہیں۔"

اس "ناکتخدا" کے لفظ پر ساری محفل ہنسنے لگی اور سرسید بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے (بے چارے نے بدحواسی میں بجائے "نافدا" کے "ناکتخدا" کا لفظ استعمال کیا)۔

۲۔ ایک مرتبہ سرسید، مولانا شبلی اور رشید احمد علی ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سرسید کا ایک بہت ضروری کاغذ گم ہو گیا تھا۔ وہ اسے بے حد تلاش کر رہے تھے۔ مگر ملتا نہ تھا۔ اتفاقاً مولانا شبلی کو وہ کاغذ الگ پڑا ہوا ملا۔ انہوں نے فوراً اس کاغذ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تاکہ سرسید کو دکھایا جائے۔ مگر سرسید جانب گئے کہ کاغذ شبلی دبائے بیٹھے ہیں۔ اس پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے شیطان اُسے اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے حضرت مولانا! ذرا دیکھئے کہیں میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے نیچے تو نہیں ہے"۔

۳۔ ایک دفعہ ایک شخص نے سرسید کو خط لکھا کہ اگر نماز میں جائے عربی عبارتوں کے ان کا اردو ترجمہ پڑھ لیا جایا کرے تو کوئی ہرج اور نقصان تو نہیں؟ سرسید نے جواب دیا "ہرگز کوئی ہرج اور نقصان نہیں صرف اتنی بات ہے کہ نماز نہیں ہوگی"۔

ایک شخص نے سرسید کو خط لکھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ میں جن کی لوگ تعریف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "ان کی ساری عمر قوم کی خیر خواہی اور بھلائی میں گزری"۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بزرگ آپ ہی ہیں، پس میری مشکل اگر حل ہو گی تو آپ ہی سے ہو گی"۔ سرسید نے اسے جواب لکھا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جس آدمی کو آپ نے خواب میں دیکھا تھا وہ غالباً شیطان تھا۔

ایک مولوی صاحب نے سرسید کو خط لکھا کہ میں معاش کی طرف سے بہت تنگ ہوں۔ عربی جانتا ہوں، انگریزی سے ناواقف ہوں کسی ریاست میں میری سفارش کر دیں"۔ سرسید نے جواب دیا کہ "سفارش کی میرے عادت نہیں اور معاش کی تنگی کا آسان حل یہ ہے کہ میرے تفسیر القرآن کا رد لکھ کر آپ چھپوائیں۔ کتاب خوب بکے گی اور آپ کی تنگی دور ہو جائے گی"۔

دلی میں ایک بہت مشہور طوائف رہتی تھی جس کا نام "شیریں" تھا۔ مگر اس کی ماں بہت بدشکل اور بدصورت تھی ایک مجلس میں یہ "شیریں" اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی۔ سرسید بھی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور ان کے برابر ان کے ایک ایرانی دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ شیریں کی ماں کو دیکھ کر کہنے لگے "مادر شکر بسیار تلخ است"۔ اس پر سرسید نے فوراً جواب دیا "کہ چہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد"۔

نواب محسن الملک

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سالانہ جلسہ میں مولوی رضی الدین مسلم نے ایک بڑی دردانگیز قومی نظم حاضرین جلسہ کو سنائی جسے سن کر ہر آنکھ پرنم ہو گئی۔ نظم کے خاتمے پر نواب محسن الملک نے اٹھ کر کہا "مولوی رضی الدین صاحب نے اپنا تخلص تو مسلم رکھا ہے مگر نظم ایسی سنائی کہ دوسروں کو مسلم کر دیا۔

اپنے ایک لکچر میں نواب محسن الملک نے یہ لطیفہ سنایا "اب سے پچاس برس پہلے ایسا زمانہ تھا کہ جو مولوی اور حافظ بنتے تھے وہی منصف اور جج بنائے جاتے تھے۔ گویا یہ عہدے صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ایک صاحب مفتی الٰہی بخش نامی

اتفاق سے منصف مقرر ہو گئے چونکہ عام طور پر یہ عہدہ مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہو گیا تھا اس لئے نام روبکاروں پر ان کے نام کے ساتھ مولوی حافظ خان بہادر لکھنے کا عادی دستور تھا۔ چنانچہ جب منشی بھولا ناتھ منصف مقرر ہوئے تو سررشتہ دار نے حسب عادت ان کے ساتھ بھی لکھا "روبکار از دفتر خان بہادر مولوی حافظ منشی بھولا ناتھ صاحب"۔ منشی صاحب نے روبکار دیکھی تو بھڑکے سررشتہ دار سے کہا "کم بخت تو نے مجھے مسلمان بنا دیا"۔ سررشتہ دار کیوں چوکتا۔ فوراً دست بستہ کہنے لگا "حضور منصف ہو جانے سے اس لئے آپ کے نام کے ساتھ اور کیا لکھتا؟"

---

۷ مولانا ذکاء اللہ

خان بہادر شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ دہلی کے بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے ٹھیک نو بجے اپنے گھر سے نکل کر کہیں جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب دہلی کے کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ ایک دن جو باہر نکلے تو سرسید کے لڑکے سید محمود اپنی گھڑی لئے ہوئے سامنے کے آگے ان کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ مولانا ذکاء اللہ نے پوچھا "میاں یہاں کیوں ٹہل رہے ہو؟" سید محمود نے جواب دیا "جی میں اپنی گھڑی کو ڈھونڈ رہا تھا اس لئے وہ بند ہو گئی۔ میں اب آپ کے انتظار میں ٹہل رہا تھا کہ اپنی گھڑی کا وقت درست کر لوں"۔

مولانا حالی

سرسید کے گروہ میں مولانا حالی بہت ہی سنجیدہ بزرگ تھے۔ مگر انہوں نے بھی ہمارے لئے خاصا سامان تفریح چھوڑا ہے۔ مولانا نے ۱۹۰۶ء میں ایک ان پڑھ کو اپنے ایک دوست کو بھیجا۔ غور سے پڑھئے، اس ان پڑھ نامہ میں کتنا لطیف طنز ہے:۔

المذہب:۔ اطلاق جنگ	الدین:۔ تقلید آبا و اجداد۔
العلم:۔ قصے اور بحثیں۔	الامتحان:۔ آزمائش لیاقت ممتحن
السیوسیٹی:۔ کارخانہ کھوک سازی۔	الکمیٹی:۔ وجہ موجہ برائے فیصلہ یک طرفہ
الانجمن ہائے اسلامیہ:۔ سیزۂ برشگال	الرئیس:۔ آنکہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر:۔ آنکہ نبی وست و فرصت دار باشد	المولوی:۔ آنکہ جمیع مسلمانان را از دائرہ اسلام خارج می کند۔
الواعظ:۔ آنکہ در تفریق بین المسلمین حظ نفس کند۔	

غالباً ۱۹۰۹ یا ۱۹۱۰ء کی بات ہے کہ مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے وکیل میرٹھ نے مولانا کو اپنی شادی میں پانی پت سے بلایا۔ شادی کے بعد مولانا حالی اور مولوی اسماعیل میرٹھی اور بعض دوسرے بزرگ پیچھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے مسکراتے ہوئے مولوی محمد یحییٰ تنہا سے کہا "اب آپ اپنا تخلص بدل دیں کیونکہ اب آپ تنہا نہیں رہے"۔ اس پر مولانا حالی نے فرمایا کہ "نہیں مولوی صاحب! یہ بات نہیں۔ تن تنہا تو یہ ابھی ہوئے ہیں"۔ اس پر تمام مجلس مولانا حالی کی جودت طبع پر حیران رہ گئی۔

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارن پور تشریف لے گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے پاس ٹھہرے جو بڑے زمیندار بھی تھے۔

گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک کسان آگیا۔ رئیس صاحب نے اس سے کہا کہ "یہ بزرگ جو آرام کر رہے ہیں ان کو پنکھا جھل"۔ وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چپکے سے رئیس صاحب سے پوچھا کہ "یہ بزرگ جو پلنگ پر سو رہے ہیں کون ہیں؟" میں نے ان کو پہلی مرتبہ یہاں دیکھا ہے"۔ رئیس نے جواب دیا "کم بخت! تو ان بزرگ کو نہیں جانتا حالانکہ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہو رہا ہے۔ یہ مولوی حالی ہیں"۔ اس پر غریب کسان نے بڑے تعجب سے کہا "جی کبھی بالی بھی مولوی ہوتے ہیں؟" (وہ کسان حالی کو بالی سمجھا جس کے معنی ہل چلانے والے کے ہیں)۔

مولانا لیٹے تھے۔ سو نہیں رہے تھے۔ کسان کا یہ فقرہ سن کر پھڑک اٹھے فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور رئیس صاحب سے فرمانے لگے "حضرت! اس تخلص کی داد آج ملی ہے"۔

مولانا حالی کے مقامی دوستوں میں مولوی وحید الدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سرسید احمد خاں) تھے۔ جب یہ پانی پت میں ہوتے تو روزانہ مولانا حالی کے پاس جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز صبح ہی صبح پہنچے۔ مولانا نے رات کو کوئی غزل کہی تھی وہ ان کو سنائی۔ سلیم سن کر پھڑک اٹھے اور کہنے لگے "مولانا! واللہ جادو ہے"۔ مولانا کے بالا خانے کے نیچے ایک کوٹھڑی تھی وہ مولانا نے ایک مجذوب فقیر کو رہنے کے لئے دے رکھی تھی۔ وہ مجذوب باہر گلی میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ جب اس کے کان میں یہ فقرہ پڑا تو بے اختیار چلا اٹھا "جادو برحق کرنے والا کافر"۔ مولانا نے مسکرا کر سلیم صاحب سے کہا "لیجئے مولوی صاحب سرٹیفکیٹ مل گیا"۔

مولوی وحید الدین سلیم

ایک مرتبہ حسب معمول سلیم مولانا حالی کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور مولانا سے پوچھنے لگا حضرت! میں نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے کہہ دیا "تجھ پر تین طلاق" لیکن بعد میں مجھے اپنے کئے پر افسوس ہوا۔ میری بیوی بھی راضی ہے مگر مولوی کہتے ہیں کہ طلاق پڑ گئی، اب صلح کی کوئی شکل نہیں۔ خدا کے لئے میری مشکل آسان فرمائیں اور کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میری بیوی میرے گھر میں دوبارہ آباد ہو سکے۔

ابھی مولانا حالی کوئی جواب نہیں دینے پائے تھے کہ مولوی سلیم اس شخص سے کہنے لگے کہ "بھئی یہ بتا کہ تو نے طلاق ت سے دی تھی یا ط سے؟"

اس شخص نے کہا "جی میں تو ان پڑھ اور جاہل آدمی ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ ت سے کیسی طلاق ہوتی ہے اور ط سے کیسی ہوتی ہے؟"

سلیم نے اسے سمجھایا کہ میاں یہ بتاؤ کہ تم نے قرأت کے ساتھ کھینچ کر کہا تھا کہ "تجھ پر تین طلاق" جس میں ط کی آواز پوری نکلتی ہے یا معمولی طریقہ پر کہا تھا۔ جس میں ط کی آواز نہیں نکلتی ت کی آواز نکلتی ہے۔

بے چارے غریب سوال کنندہ نے کہا "جی مولوی صاحب! میں نے معمولی طریقہ پر کہا تھا، قرأت سے کھینچ کر نہیں کہا"۔

یہ سننے کے بعد مولوی سلیم صاحب نے پورے اطمینان کے ساتھ اس سے کہا "ہاں بس معلوم ہو گیا کہ تو نے ت سے

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبائے زماں ان سے امید شفا لیکن خیالِ خام ہے

ایک مرتبہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اقبال کی ایک نظم اپنے اخبار میں چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ان کی ہجو ان الفاظ میں کہی ؎

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت نام محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

لندن کا ذکر ہے کہ جون ۱۹۰۷ء میں ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی۔ جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ وقتاً مس سروجنی داس نہایت پرتکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیورات پہنے ہوئے چھم چھم کرتی سامنے آن موجود ہوئیں اور آتے ہی اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میں تو صرف آپ سے ملنے یہاں آئی ہوں"۔ اقبال کی ظرافت کا شعلہ چمکا اور انہوں نے فی البدیہہ کہا "تو یہ جلسہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں سے زندہ سلامت باہر جا سکوں گا یا نہیں"؟

ولایت میں ایک مرتبہ چند انگریز پروفیسر کالج کے طلباء اور طالبات ایک قدیم باغ کی سیر کو گئے جہاں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں تعمیر کروا رکھی تھیں۔ منجملہ ان کے ایک مسجد بھی تھی جس کی دیواروں پر جگہ جگہ خدا تعالیٰ کے اسماء عربی رسم الخط میں کندہ تھے۔ سیر کرنے والے انگریزوں نے اقبال سے ان اسماء و آیات کا مطلب پوچھا۔ اقبال نے اس سے جواب میں کمال سنجیدگی اور بڑی متانت کے ساتھ ان کو یہ قصہ سنایا

"ایک تھا بادشاہ۔ اس کو ایک دن جنت کی ایک حور نظر آئی۔ جس پر وہ بُری طرح فریفتہ ہو گیا۔ اور اس سے کہنے لگا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ایک مسجد بنواؤ۔ بس اسی مسجد میں ہمارا نکاح ہو گا۔ بادشاہ نے نور کے حکم کے مطابق یہ مسجد بنوائی اور بادشاہ کا حور سے نکاح ہو گیا۔ اس مسجد کی دیواروں پر یہی قصہ عربی میں لکھا ہوا ہے"۔

جو ہندو و عیسائی اس وقت وہاں موجود تھے وہ تو اس گھڑنت کو سن کر مارے ہنسی کے لوٹ گئے۔ مگر اقبال نے ایسی سنجیدگی کے ساتھ یہ قصہ سنایا کہ مارے انگریز حاضرین کو اس کی سچائی پر یقین آ گیا۔

ایک دن ایک پیر صاحب اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاقاً اسی وقت ان کا ایک مرید بے چین اور مضطرب سا پیتا کا پیتا آیا اور پیر صاحب سے کہنے لگا "حضور کی آمد کی اطلاع مجھے ملی تو بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ حضور میری حالت بڑی خراب ہے۔ دو سو روپے کا قرضہ ہو چکا ہے۔ حضور میرے لئے دعا فرمائیں کہ یہ قرضہ ادا ہو جائے"۔ اور یہ کہہ کر دو سو روپے نذر کئے۔ پیر صاحب نے دونوں ہاتھ سینہ مبارک پر رکھ لئے اور ہاتھ اٹھا کر مرید کے لئے دعا کرنے لگے۔

یہ نظارہ دیکھ کر اقبال سے نہ رہا گیا۔ آپ نے بھی فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے دعا مانگنی شروع کی "خدایا! آج کل کے پیر گمراہ ہو گئے۔ انہیں ہدایت دے۔ اور اے خدا! آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں۔ یا الٰہی یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ دو سو روپے کا نہیں بلکہ دو سو دو روپے کا مقروض ہے"۔

اس پر پیر صاحب بہت برہم ہوئے۔ مگر اقبال نے کہا "میں تو یہ دعا اس وقت تک مانگے جاؤں گا جب تک تم یہ دو روپے مرید کو واپس نہیں دے دو گے"۔ آخر تنگ آ کر پیر صاحب نے دو روپے واپس کئے اور اقبال سے اپنی جان چھڑائی۔ بعد میں اقبال کے کہنے سے اُسے کہیں ذکر کر کر وا دیا۔ جس کے بعد اس کی مالی مشکلات دور ہو گئیں۔

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں اکثر اقبال سے ملنے ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اقبال کی رہائش انارکلی میں تھی اور ہم بھی انہیں ایام میں آباد تھیں۔ میونسپل کمیٹی نے ان کے لئے دوسری جگہ تجویز کی اور ان کو وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ اسی زمانے میں مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن اقبال سے ملنے کئی مرتبہ ان کے ہاں گئے مگر وہ نہ ملے۔ اتفاق سے کئی بھیروں کے بعد مل گئے تو مولوی نے مزاحاً کہا "اکبر صاحب جب سے طوائفیں ناکارہ سے اٹھواری گئی ہیں آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا"

اقبال نے فی البدیہہ کہا "مولوی صاحب! کیا کیا جائے آتا وہ بھی تو "وطن" کی نہیں ہیں"

ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ اقبال نے ہنس کر کہا "ذرا سنبھل کر رہا کیجئے، خدا کی ساری باتیں مان نہ لیا کرو۔ بعض باتیں وہ یہ بھی کہہ دیا ہے "میں نے اقبال کو یہ خوش خبری سنائی کہ میں ۱۹۳۰ء میں پھر دسمبر میں جاؤں گا اور ولی کو پھر یہ تخت بناؤں گا" اس پر اقبال نے کہا "ہم تو اس وقت کہاں ہوں گے، مگر آپ نہر پانی کو کہئے میرے لڑکے جاوید کو نہ بھولے اُسے تھوڑی کا علاقہ ضرور بخش دینا"

مرض الموت میں وہی شخص عیادت کے لئے آیا اور کہنے لگا "آپ نے مجھے بھلا تو نہ ہوگا" اقبال نقاہت کے باوجود ہنسے اور کہنے لگے "واہ! یہ آپ سے کس نے کہا بات کی، میں اور آپ کو نہ بھلائیں۔ ولی را ولی می شناسد"

فقیر سید وحیدالدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ ایک دن فقیر صاحب اپنے اسی عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر اقبال سے ملنے آئے۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ موٹر سے اتر کر اقبال کے پاس جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ ہنسنے میں اقبال کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور باپ سے کہنے لگی "ابا، ابا موٹر میں کتے آئے ہیں" اقبال نے آنے والے اصحاب کی طرف اشارہ کر کے کہا "نہیں بیٹا! یہ آدمی ہیں"

چوہدری شہاب الدین نہایت کامیاب وکیل، محلس قانون ساز کے ممبر اور کانپور مسلم لاء کالج کے پرنسپل لاہور کے میئر رہے تھے۔ رنگ بالکل کالا تھا۔ سب سے زیادہ ڈاکٹر اقبال کی پھبتیوں کا نشانہ غریب یہی بنتے تھے۔ اور اگر وہ برا مانتے تو کہہ دیتے کہ "بیٹی نہیں، دیکھتے ہیں نہ چوہدری لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے مجھے چھٹی کہنے سے نہ روکا کرو۔" اس میں سے بعض لطیفے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ایک روز چوہدری صاحب دیا دھوتی پہنے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے۔ انہیں دیکھتے ہی اقبال چونک کر بولے "آئیے چوہدری صاحب! آج آپ کالے ہی یہاں چلے آئے، کیونکہ سوٹ کالا اور چوہدری صاحب کے بدن کا رنگ ایک تھا۔

ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی۔ سہانا موسم تھا۔ پارٹی میں اقبال اور چوہدری شہاب الدین بھی موجود تھے۔ چوہدری صاحب نے از سر نو پاسفید لباس پہن رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر بے اختیار اقبال بول اٹھے "او، دیکھو! کیا چوہدری کتا گیا" (یعنی ذرا دیکھو تو سہی کیا اس نے کمیت میں بھینس کا کنٹر اگس گیا)۔

ایک دن رمضان کے مہینے میں چوہدری صاحب کی کوٹھی میں افطاری کی دعوت تھی۔ افطار کے وقت چوہدری صاحب نے ملازم کو آواز دے کر پانی مانگا۔ اس پر فوراً اقبال نے آدمی سے پکار کر کہا "دیکھو بھئی چوہدری صاحب کے لئے بالٹی میں پانی لانا"

چوہدری شہاب الدین نے اپنی جو کوٹھی لاہور میں بنوائی وہ بڑی عظیم الشان اور بہت چوڑی تھی۔ آٹھ بیس کنال زمین پر یہ کوٹھی بنوائی گئی تھی۔ اور ہر چیز اس میں بے حد بڑی رکھی گئی تھی جب بن کر تیار ہوئی تو چوہدری صاحب نے اقبال سے کہا کہ اس کوٹھی کا نام

کیا یکھنا چاہئے؟" اقبال نے بے ساختہ جواب دیا "ڈوبو محل"۔

جب چودھری صاحب بلدیہ لاہور کے صدر تھے تو اسی زمانہ میں مرتضیٰ، ملنگ حسرت پٹیالوی لاہور آئے۔ نواب مرزا بیخود سے ان کو بھی پرانا یک شاندار دعوت دی جس میں نامور شعرا مدعو کیا۔ اس موقع پر نواب صاحب نے اقبال سے کہا کہ آپ تمام حاضرین شہر کا تعارف مرزا مچھو سے کرائیں۔ چنانچہ اقبال نے تعارف کرانے کھڑے ہوئے۔ جب چودھری سماب الدین کی باری آئی تو کا تعارف ان الفاظ میں کرایا "یہ علی حضرت ایں خان بہادر چودھری شہاب الدین صدر بلدیہ لاہور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لاہور لاہور ہا شہر اس نہایت لطیف طنز کو چھوٹے صاحب تو نہ سمجھے مگر مجلس میں ایک دم قہقہہ لگا اور چودھری صاحب جل کر کوئلہ ایک دفعہ اقبال نے چودھری صاحب کے متعلق یہ قطعہ بھی سنایا:

ایک دن لاہور کے ہنگاموں اور جنگوں نے ہڑتال کر دی۔ اس پر چودھری صاحب نے طے کیا کہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کوئی ڈنر میں جمع کیا جائے۔ جب سب جمع ہو گئے تو چودھری صاحب نے ہمیشہ کی زبان میں تقریر شروع کی اور کہنے لگے، ابھی نے ابھی انہا ہی سکتے پائے تھے کہ اچانک ایک ہنگامہ کا نعرہ بلند ہونے لگا۔ اس پر مجلس نے سمجھے کو مخاطب کر کے کہا "ایسے چپ۔ اسے چپ ماموں، ماموں گئے"

شمس العلماء سید میر حسن شاہ (افسانہ ڈاکٹر اقبال)

ایک مرتبہ حضرت مولانا حکیم نورالدین شاہی طبیب ہمارے گھر میں سید میر حسن شاہ سے ملنے آئے۔ وہ بیری نکھروں کے متعلق آپ سے کہا سے تو شاہ صاحب نے مزاحاً جواب دیا کہ "آپ کے پاس ان سوال کا پورا جواب تھی نہیں ہے، اسے بھی تشنہ چھوڑ دیتے ہیں"۔ اس کے بعد اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر کہنے لگے "یہ ہے میرے پاس آپ کا بھیجا ہوا ایک خ میں نے آپ سے دو، پوچھی۔ آپ نے دوائی تو لکھ دی مگر یہ نہ بتایا کہ اسے کھانا ہیں۔ مونگ پھلی، تھوں کر لگا ہوں گھوٹ کر پی دیں۔ کروں۔ یہ دونوں کھا کر روٹی کھاؤں۔ مالٹہ کھاؤں۔ توڑ کھاؤں۔ یا ایک من مٹکو کر کھاؤں۔ حضرت یکجو صاحب کر کر کر نا دیں ہو گئے۔

ماٹر چنہ ای ایک خاص ڈسٹرکٹ انسپکٹر تعلیمات تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ اور بولنے کی مانند تھا وہ ایک د شاہ صاحب کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا جب آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور بجلی خوب چمک رہی تھی۔ ماٹر شاہ صاحب سے ملتے ہی کہنے لگا "دیکھئے آج موسم کیسا خوشگوار اور سہانا ہے"۔ شاہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا "پھر آپ تو کالی گھٹا میں کہاں آ گئے ہیں"۔

ایک روز شاہ صاحب سیالکوٹ میں بازار سے گزر رہے تھے۔ سبزہ ایک میوہ فروش کی دکان تھی۔ وہ کہنے لگا "شاہ صاحب! سردا بہت اچھا ہے لیتے جائیے"۔ شاہ صاحب نے فرمایا "بھئی ہمارا کیا ہے؟" اس نے جواب دیا "آقا نے" اس پر شاہ صاحب بیتابی میں کہنے لگے "سردا تو اچھا ہے۔ پر بندوں نہیں سردا" یہ کہہ کر آگے روانہ ہو گئے۔

اسی زمانہ میں سیالکوٹ میں ایک صاحب تھے منشی سردار محمد۔ وہ ذات کے قصاب اور پیشہ کے لحاظ سے عرضی نویس تھے۔ نہ معلوم کیا حادثہ گذرا کہ ان کو شعر کہنے کا چسکا پڑ گیا۔ اور اپنا تخلص انہوں نے جلوہ رکھا۔ شعر کیا کہتے تھے۔ یوں سمجھو کہ پکوڑے۔

ملا کرتے تھے۔ ان کے ایک ملنے والے خزانے میں کلرک تھے۔ اچھے خاصے لکھے پڑھے اور قابل آدمی تھے۔ جلوہ صاحب
بدوقت مرزہ ان کے پاس چلے جاتے اور اپنے اشعار سنا کر داد چاہتے۔ آخر تنگ آکر انہوں نے ایک روز ان کی ذات
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جلوہ صاحب! اگر آپ اپنی شاعری کے متعلق مجھ سے رائے پوچھتے ہیں تو صاف بات یہ ہے
کہ آپ کے اشعار سے مجھے تو کھجلی کی بو آتی ہے"۔

جلوہ صاحب ان کا یہ جملہ سن کر بڑے جھنجھلائے اور بڑے غصہ میں بھرے ہوئے شاہ صاحب کے پاس آئے اور ان کو اپنے
اشعار سنا کر پوچھنے لگے کہ شاہ صاحب سچ سچ بتائیں میرے اشعار کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے۔ فوراً بتائیں اور اسی وقت بتائیں"۔
شاہ صاحب نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے فرمایا "جلوہ صاحب! اگر آپ "فوراً" اور "اسی وقت" اپنے اشعار کے
متعلق میری سچی رائے پوچھتے ہیں تو ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ نے مچھروں کا بھیجا کر دیا ہے"۔ یہ فقرہ بھی شاہ صاحب نے
جلوہ صاحب کی ذات کی مناسبت سے چسپاں کیا۔ جلوہ صاحب بہت حواس باختہ اور پریشان خاطر ہو کر اٹھ کے واپس چلے آئے۔

مولوی ظفر اقبال شاہ صاحب کے شاگرد تھے۔ ایک دفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے
مولوی ظفر اقبال بھی وہاں پہنچ گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد اپنے استاد کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر شاہ صاحب کا جوتا
اٹھا لیا اور لے کر چلے تاکہ مسجد کے دروازے پر ان کو پہنا دیں۔ شاہ صاحب نے جو یہ دیکھا تو جھٹ لپک کر ان کے ہاتھ سے
جوتا چھین لیا۔ اور فرمانے لگے "یہ جوتا میرا ہے۔ کہاں سے لے کے چلے تھے؟"

ایک مرتبہ کالج میں سٹاف میٹنگ تھی۔ شاہ صاحب میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے۔ انگریز پرنسپل نے شاہ صاحب
کو گھڑی دکھا کر کہا "مولوی صاحب! آپ سے پورے دو منٹ انتظار کرایا"۔ شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "پھر کیا ہوا ہم نے بھی تو اس دنیا میں پورے تیس برس آپ کا انتظار کیا" (پرنسپل شاہ صاحب سے تیس برس چھوٹے تھے)۔

جس کالج میں شاہ صاحب ملازم تھے اس وقت اس کے پرنسپل ایک انگریز میکنگ نامی تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا
کہ آپ کالج کے اوقات سے پہلے مجھے عربی پڑھایا کریں۔ شاہ صاحب نے عربی پڑھانی شروع کر دی۔ پرنسپل کے مزاج میں
ظرافت بہت تھی۔ ایک روز شاگرد استاد سے کہنے لگا "شاہ صاحب! ایک بات پوچھوں؟ بشرطیکہ آپ برا نہ مانیں"۔ شاہ صاحب نے
فرمایا "ہاں کہئے کیا بات ہے"۔ پرنسپل نے کہا "بات یہ ہے کہ جب تک دن میں پانچ مرتبہ آپ کے خدا کو نہ پکارا جائے اس وقت
تک وہ راضی اور خوش نہیں ہوتا۔ اسی لئے آپ کی مسجد میں یہ بات لازمی اور ضروری ہے کہ پانچ وقت اذان دی جائے تاکہ اس
سے خدا خوش ہو"۔

شاہ صاحب نے بہت ہی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا یہ جواب دیا کہ "ہمارا خدا ایسا نہیں جو صرف آٹھویں دن
کی تھوڑی دیر کی ٹن ٹن سے خوش ہو جائے"۔ (اس کے بعد اذان کی صحت اور اس کے الفاظ کی بلاغت ایسے عمدہ اور دل نشین
پیرائے میں پرنسپل کو سمجھائی کہ بے اختیار وہ بول اٹھا "شاہ صاحب آپ گواہ رہیں میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں لیکن مصلحت
یہی ہے کہ اس امر کو اخفا میں رکھا جائے)۔

مولوی فیض الحسن سہارنپوری

جس زمانہ میں آپ دہلی میں مقیم تھے تو ایک روز سخت بارش ہونے لگی۔ مولانا اسی حالت میں درس سے فارغ چلے مگر اس ہیئت سے کہ پائنچے چڑھائے تھے۔ کتابیں بغل میں دبالیں جوتیاں اتار کر داہنے ہاتھ میں لے لیں۔ پاجامہ کو پائنچے پڑھا لیا اور بیچ سڑک میں بیٹھے ہوئے پانی سے درمیان چلنے لگے۔ دلی کے بے فکروں نے مولانا کو اس عجیب ہیئت میں ان کی رگِ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے مولانا کا مذاق اڑانا چاہا۔ اور سوچا کہ مولانا سے داہنے ہاتھ میں جو چیز ہے۔ جب سلام کریں گے تو یہ یقیناً اپنے داہنے ہاتھ کو سلام کا جواب دینے کے لئے اوپر اٹھائیں گے اور اس حرکت پر ہم ان اڑائیں گے۔ چنانچہ جب مولانا پانی کی بھینٹیں اڑاتے قریب آئے تو ان بے فکروں نے سوچی ہوئی سکیم کے مطابق بڑی سے لمبا "حضرت مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" مولانا جہاں بہت بڑے فاضل اور علامہ دہر تھے وہاں ان کی طبع ظرافت اور بدلہ سنجی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ نے فوراً بائیں ہاتھ سے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور داہنا ہاتھ جس میں جوتے تھے اٹھا کر اور ہلا کر کہا "مزاج شریف" اس فی البدیہہ جواب پر وہ سب لوگ نہایت شرمندہ اور مولانا آگے بڑھ گئے۔

ایک مرتبہ مولانا کو خود بھی بڑا خفیف ہونا پڑا۔ ہوا یہ کہ ایک مشاعرے میں سے رات گئے مولانا اور مرزا واپس آرہے تھے۔ اپنے اپنے گھر کے لئے وہ دونوں کو ایک تنگ گلی میں سے گزرنا پڑا۔ بیچ گلی میں ایک گدھا کھڑا تھا۔ راستہ رک گیا تھا۔ غالب نے اپنی عجیب سے جوتا ان کے ہاتھ میں تھی۔ گدھے کو ایک ضرب کیا۔ اس پر بطور مرجع کہا "مرزا صاحب! دلی میں گدھے بہت ہیں۔ غالب اس لفظ کو سمجھ نہ سکے تھے فوراً جواب دیا "ہاں باہر سے آجاتے ہیں" اس لطیف جواب سے مولانا بن نہ آیا اور خجالت کے چپ ہو گئے۔

ایک دن طلبا کو فلسفہ کا درس دے رہے تھے۔ مضمون یہ تھا کہ انسان کا خیال اضطراری ہے اختیاری نہیں ایک منٹ تک بغیر ارادہ اور خیال کے پہنچ جاتا ہے۔

تیسرے درس کے لئے طلبا کو لے کر مسجد سے نکلے۔ راہ میں ایک جگہ ناچ ہو رہا تھا اور بہت سے آدمی جمع تھے علم و فضل کے باوجود نہایت رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ طلبا کو چھوڑ کر ناچ دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ طلبا بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے "ہیں مولانا! کہاں یہ علم و فضل اور کہاں یہ ناچ رنگ" حرکت آپ کی بلند بارگاہ نیرنگ زبان کے شایاں نہ تھی جواب دیا کہ "ابھی نو پڑھ کر آئے ہو اَلتَّصَوُّرُ یَتَحَقَّقُ بِکُلِّ شَیْءٍ پھر مجھ پر اعتراض کیوں کرتے ہو۔ جاؤ اپنے اور مجھے ناچ سے لطف اٹھانے دو۔"

سہارنپور میں عیون ایک علاقہ تھی۔ بڑی باذوق، سخن فہم اور سلیقہ شعار۔ شہر کے اکثر ذی علم اور معزز وہاں پینے جایا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا بھی پہنچے۔ وہ پرانے زمانے کی عورت تھی حسب سے ناآشنا بھی نہایت سے چونہ کاٹ رہی تھی۔ مولانا اس کو اس ہیئت میں دیکھتے ہی واپس لوٹے۔ اس نے آواز دی "مولانا! آئیے۔ تشریف

چلے تو مولانا یہ فرما کر چل دیئے کہ "ابھی تو اپنے گھر بھی چھوڑ آئے ہیں"

ایک واعظ صاحب کو اپنے تقدس پر بڑا ناز تھا۔ ایک روز مولانا کو لے کر بیٹھ گئے اور لگے ان کی آزاد وضعی پر انہیں ٹوکنے۔ مولانا بیچارے خاموشی سے سنتے رہے۔ لیکن جب ان کی بند و نصیحت ختم ہی نہ ہوئی اور شیطان کی آنت کی طرح چلی گئی تو آخر صبر و ضبط کا پیمانہ لانا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور فی البدیہہ یہ اشعار واعظ صاحب کو سنائے ؎

ہم وہ نہیں کہ پڑھ کریں دن کو بیٹھ کر — اور حلوتوں میں کام کریں چھپ کے رات کو
تفضیح ہے خلافِ مروّت خلاف ہے — ورنہ دکھا دیں گر کو ہم پانچ سات کو

اس لطیفہ طنز کو سن کر حضرت واعظ دم بخود ہو گئے اور پھر کچھ نہ بولے۔ (حسن خیالی)

مولانا محمد علی جوہر

ایک مرتبہ مولانا عربی جبہ پہنے ہوئے اسمبلی کا اجلاس دیکھنے گئے۔ راستہ میں پنڈت مالویہ سے جو ان دنوں پارلیمنٹری اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ پنڈت مالویہ نے کہا "اچھا آپ ہیں۔ میں سمجھا تھا بھوپال ہیں" مولانا نے بیساختہ جواب دیا "جی ہاں اور مجلس میں مردوں کا کیا کام ہے" (حرف و حکایت)

جب کانگریس نے نمک بنانے کی تحریک شروع کی اور گاندھی جی نے مولانا کو بھی نمک بنانے اور سول نافرمانی میں حصہ لینے کی تو مولانا نے فرمایا "میں کیا نمک بناؤں گا۔ تو نے کہ میں دس سال سے سلہٹ ہو بار ہا ہوں (مولانا کو ویا بھیس کا عارضہ تھا)

ایک مرتبہ دہلی کے مفتی کفایت اللہ نے جو کانگریس کے زبردست حامی تھے۔ کسی "تو ہم پرستانہ" سوزش کے سلسلہ میں کانگریس سے بطور احتجاج علیحدگی کر لی اور اتفاق سے انہی ایام میں اپنی ایک تقریر میں مولانا کے متعلق کوئی غلط بات کہہ دی۔ جس پر مولانا نے خط مالک کو لکھا جس میں تحریر کیا کہ "میں آج سے مفتی کفایت اللہ کو مفتی کفایت اللہ کہا کروں گا۔ کیونکہ ان میں بعد و تشاکل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے میرے متعلق یہ افترا کیا ..... (یادِ ایام کہن)

مولانا شوکت علی

سیاسیات میں ہمیشہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا نام اکٹھا لیا جاتا رہا۔ اور علی برادران کے نام سے ان کو پکارا گیا کوئی وجہ نہیں کہ ادبیات میں ان کو اکٹھا کیوں نہ رکھا جائے۔ اگرچہ مولانا شوکت علی ادبی آدمی نہیں تھے۔

ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص کوثر ہے۔ آپ کے دوسرے بھائی محمد علی کا کیا تخلص ہے؟ کہنے لگے شوکر۔

اگرچہ مولانا عربی نہیں جانتے تھے مگر جب کبھی کوئی عرب آجاتا تھا تو اس سے عربی میں بات کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک نوجوان سر ہو گئے کہ جب آپ عربی نہیں جانتے تو عربی میں بات کیسے کر لیتے ہیں؟

اس پر مولانا بگڑ کر کہنے لگے "واہ! یہ کیا بات ہے۔ ہم عربی خوب جانتے ہیں" کسی لڑکے نے پوچھا "اچھا بتائیے گھٹنے

کانپور میں کیا کہتے ہیں؟ مولانا نے بے تامل جواب دیا "گھٹنا عرب میں ہوتا ہی نہیں"
اس مسکت و خیز جواب پر سارے لڑکے مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

(عربی میں گفتگو کرنے کا طریقہ مولانا کا یہ تھا کہ پہلے عربی کے دو تین شعر سنا نے الفاظ کہے اور پھر ہونکی رہ گئی اور آنکھوں کے بلیغ اشاروں سے پوری کر دی۔ مثلاً ایک عرب سے باتیں کر رہے تھے۔ یا شیخ المسلمون نا عُون (آنکھ فی کل عالم نا نون (انگلی فضا میں گھمائی، نفوس ناقش، نفوس ناقش، ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر (دونوں ہاتھ اللہ کی طرف اشارہ کر دیا)

مولوی عبدالحق

جب مولوی صاحب اورنگ آباد سے انجمن ترقی اردو کا دفتر دہلی سے آئے تو میں ایک مرتبہ جب دہلی گیا تو دریا گنج جا کر ملا۔ اور مولانا سے کہا کہ اگر پانی پت میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کوئی جلسہ کیا جائے تو کیا آپ تشریف لے چلیں گے۔ مولوی صاحب فرمانے لگے "اگر مجمع میں بھی اردو کی حمایت اور تعریف میں کوئی جلسہ منعقد ہو تو میں وہاں بھی خوشی سے جانے کو تیار ہوں"

اکبر الہ آبادی

کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان ایک مرتبہ الہ آباد گئی اور جانکی بائی طوائف سے مکان پر ملاقات کی۔ جانکی بائی نے اس کا خاطر تواضع اور آؤ بھگت کی۔ اس کے اعزاز میں رقص و سرود کا ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا۔ بڑے اچھے اچھے گانے والے گانے لگے۔ مثلاً صادق علی۔ وہ بے خیال۔ بے مثال۔ مشتری جان اور حیدر جان وغیرہ سب ہی آ گئے۔ اور رین دن تک خوب جب گوہر جان رخصت ہونے لگی تو جانکی میزبان سے کہا کہ میرا دل خان بہادر سید اکبر حسین سے ملنے کو بہت چاہتا ہے۔ جانکی آج میں وقت مقرر کر لیں۔ کل چلے جائیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن دونوں اکبر الہ آبادی کے ہاں پہنچیں جانکی بائی نے تعارف کلکتہ کی نہایت مشہور و معروف مغنیہ گوہر جان ہیں۔ آپ سے ملنے کا ان کو بے حد اشتیاق تھا لہذا ان کو آپ سے ملانے لے آئی ہوں۔ زیادہ نہیں۔ ورنہ میں ذہین ہوں نہ امام شوخ۔ نہ خوب اور نہ کوئی دل جو قابل زیارت خیال کیا جاؤں۔ یہ سن کر ہنس کر اکبر رہ گیا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کروں۔ خیر ایک شعر بطور یادگار لکھے دیتا ہوں۔ مندرجہ ذیل شعر ایک کاغذ پر لکھا اور گوہر جان کے حوالے کیا۔

خوش نصیبی میں بڑا کون ہے گوہر کے سوا ۔۔۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

خواجہ عشرت لکھنوی

ایک مرتبہ مدرسہ تکمیل الطب لکھنؤ کے چند طلبہ بیٹھے اس طبی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ جب غذا ہضم ہو کر جزو بدن بن جاتی ہے۔ خواجہ عشرت بھی بیٹھے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ آپ نے فی البدیہہ کہا ؎

حکما دیکھتے ہیں ہوتی ہے غذا جسم و بدن ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے (بزم خیال)

ریاض خیرآبادی

ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں ریاض کے پاس ہی ایک بزرگ تشریف رکھتے تھے۔ اگرچہ خفیہ طور پر پیر مغاں کی بیعت کیے ہوئے تھے مگر صورت بڑی متقی تھی۔ اور اسی لئے اکثر لوگ ان کو نہایت بزرگ اور واجب التعظیم سمجھتے تھے۔ خود ریاض کے والد ان سے بے تکلف سے ملتے تھے۔ مگر ریاض کو سب حقیقت معلوم تھی۔ شرارت جو سوجھی تو ان کی شان میں فی البدیہہ ایک مثنوی تصنیف کر کے نرین کو سنایا ؎

شہادت ریاض سے کسی سے لمبی ڈاڑھی ہے ہاتھ بھر کی

کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ شعر سنتے ہی وہ بزرگ صورت اس قدر آپے سے باہر اور برہم ہوئے کہ خدا کی پناہ۔ بے اختیار اٹھ کر مارنے دوڑے۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور بیچ بچاؤ کرا دیا۔ مگر اس جھگڑے نے ایسی خطرناک شکل اختیار کر لی کہ اس سے ڈر کر ریاض نے مدتوں مشاعرہ میں جانے اور شامل ہونے سے توبہ کر لی اور اس واقعہ کے بعد پھر کبھی کسی پر چوٹ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

(بزم خیال)

مولانا ابوالکلام آزاد

جب مولانا نینی جیل الہ آباد میں قید تھے۔ اس زمانہ کا ایک بہت مزیدار لطیفہ خود مولانا کے الفاظ میں سنئے :-

"جیل میں میری کوٹھڑی کے عین سامنے ایک دوسری کوٹھڑی میں کوئی چینی قیدی رہتا تھا۔ مگر زبان کی بیگانگی کے باعث دونوں آپس میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ جاتے تھے ؎

زبان یار من چینی و من چینی نمی دانم

اس چینی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں کس جرم میں ماخوذ ہوں۔ غالباً سوچتا رہتا ہوگا۔ آخر ایک دن اس سے نہ رہا گیا۔ میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ لہرانے لگا یعنی یہاں کیسے آئے ہو؟ میں کیا جواب دیتا خاموش رہا۔ تو اس نے پوچھا "اوپیم؟" یعنی کیا افیم کے مقدمہ میں پکڑے گئے ہو؟ میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے اپنے ہاتھ کو اپنے گلے پر چھری کی طرح پھیرا۔ یعنی کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پھر سر ہلایا۔ تو آخر اس نے پوچھا "گاندھی"۔ اس پر میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ گویا اس کے نزدیک گاندھی بھی ناجائز افیم اور قتل کی طرح جرائم میں داخل ہے۔"

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ڈاکٹر وزیر آغا کا معرکہ آرا کارنامہ

اُردو ادب میں طنز و مزاح

اُردو میں اپنی نوعیت کا پہلا نہایت گرانقدر اور جامع مقالہ

فاضل مصنف نے
طنز و مزاح کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے

قیمت چار روپے بارہ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اُردو، لاہور

ایم۔ اسلم کے نئے ولولہ انگیز ناول

خونی سفر اس ناول میں ہمارے تنگ دل اور متعصب ہمسایہ ملک کی سازش و دشمنی کے تاریخی پس منظر اور اس کے محرکات و مقاصد کا بڑا کامیاب جائزہ لیا گیا ہے۔ اکثر ہماقوں میں مسلمانوں کی نسل کشی کے لرزہ خیز واقعات کو بڑی عرق ریزی اور تحقیق کے ساتھ انگیز جوئیوں اور سیاستدانوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے سنسنی خیز خونی واقعات کی تلخی ایک نہایت ہی دلچسپ اور پاکیزہ رومان سے ساتھ ساتھ رفع ہوتی جاتی ہے۔ قیمت ۵/- روپے

فاتح مکہ اسلامی تاریخی ناول کے رنگ میں خواجۂ دوجہاں حضور کی سیرت مبارکہ کا ایک عظیم باب۔ قیمت ۴/-

صبا ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور فرماتے ہیں ۔۔۔ ناول میں بالکل انوکھا موضوع ہے پورے ناول میں ایک دلچسپی اور انہماک قائم ہے۔ قصہ کو اتار چڑھاؤ اور ایسا شائستہ رکھا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ صبا کے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اب قعر مذلت میں گرے گی مگر اُسے خوب سنبھالا ہے اور ایک شاندار کردار پیدا کر دیا ہے۔ قیمت ۴/۸

فولاد صحرا	۷/۸	ضرب مجاہد	۳/-	قرطبہ	۴/۸
رنگیلا مجاہد	۶/-	رقص ابلیس	۴/-	یہ جہانِ جاودانی	۴/-
خون شہیداں	۴/۸	خونِ مسلم	۲/۸	ہشتم لشکر	۶/۸
معرکہ بدر	۵/-	حنا	۲/-	شمسہ	۶/-
تیغ ابطالی	۵/۸	دوشیزۂ پاکستان	۶/-	خواب جوانی	۴/-
فاتح قسطنطنیہ	۵/-	نماز	۱۰/-	سلاطین	۵/-
جوئے خون	۴/-	درتوبہ	۳/۸	زلف بہار	۴/۸
فتنۂ تاتار	۵/۸	خون مزدور	۴/-	سیدھی لکیر	۶/۸
پاسبانِ حرم	۴/-	چراغ محفل	۶/-	اشک ندامت	۴/-
مرغ فارسی	۲/۸	ریحانہ	۶/-	جہنم	۴/-

شام و سحر	۱/-
آخری رات	۱/۸
سوز عشق	۱/-
شام غریباں	۱/۸
لاجواب الو	۱/۸
مرزا جی	زیر طبع
تیز نگاہ	
شمشیر ستم	
نغمہ	

نئے مصالحہ کے تحت تاجران کتب کا فائدہ براہ راست ہماری کتابیں ہم سے منگوائیں ہے

عام خریداروں کو محصول ڈاک فری کی۔ عایت۔

دارالبلاغ۔ محمد نگر۔ اقبال روڈ لاہور (مغربی پاکستان)